جنوری ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۱

مضمون نما

عرضِ حال	نور الحسن جعفری (صدر انجمن)	۳
اصطلاحی میدان میں انجمن ترقی اردو کی خدمات	ڈاکٹر عطش درانی	۷
ادیب کی "ہماری شاعری"	ڈاکٹر شمیم حنفی	۱۷
تخلیقی تحریر کے اوصاف	ڈاکٹر فہیم اعظمی	۲۳
یادوں کا سفر... جگر مراد آبادی	افتخار احمد عدنی	۳۱
رشید احمد صدیقی کے خطبات	پروفیسر نظیر صدیقی	۴۵
گلہائے رنگ رنگ		
دیت (ترکی کہانی)	عمر سیف الدین / ثروت صولت	۵۱
گن گن تارے (بنگلہ گیت)	کوی جسیم الدین / ڈاکٹر وفا راشدی	۵۹
پال رابسن سے (ترکی نظم)	ناظم حکمت / مشتاق احمد	۶۰
ارغوانی روشنی (عربی کہانی)	محمد الغربی الخطابی / قطب اللہ	۶۱
بلوچی ادب میں تحقیق و تنقید	پروفیسر عبد الخالق بلوچ	۶۵
رفتارِ ادب	....	۶۹
گرد و پیش	......	۷۷
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۵
حروفِ تازہ	......	۹۳

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ـــــ ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ مُلک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

قومی سیرت ﷺ کانفرنس ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۳ء)

ماہ ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۳ء) میں وفاقی وزارت امور مذہبی کی جانب سے ایک قومی سیرت ﷺ کانفرنس کا انعقاد ہوگا۔ جس کے لیے مندرجہ ذیل صدارتی انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس مقالاتِ سیرت ﷺ کے مقابلے میں خواتین و مرد اور مضمون نویسی کے مقابلے میں طلبہ حصہ لے سکیں گے۔

(۱) موضوع مقالات برائے مرد حضرات

دور حاضر میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی ضرورت اور اس کے لیے عملی تجاویز۔

(۲) موضوع مضامین برائے خواتین

سماجی برائیوں کے انسداد کے لیے خواتین کا کردار۔ تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

(الف) کل پاکستان مقابلے کے لیے تین انعامات رقم پانچ ہزار، تین ہزار اور دو ہزار روپے۔ علی الترتیب۔

(ب) دو انعامات ہر صوبہ اور ہر مقابلے کے لیے۔ رقم تین ہزار اور دو ہزار روپے علی الترتیب

(ج) ایک ایک انعام وفاقی علاقہ اسلام آباد اور آزاد کشمیر کے لیے۔ رقم تین ہزار روپے

(۳) موضوع مضمون نویسی برائے طلبہ

اصلاح معاشرہ میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں .... تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

تین انعامات کُل پاکستان مقابلے کے لیے .... رقم پانچ ہزار، تین ہزار اور دو ہزار روپے علی الترتیب۔

۲۔ بڑوں کے مضامین کم سے کم دس سے پندرہ فل اسکیپ صفحات، اور طلبہ کے مضامین پانچ سے سات صفحات پر مشتمل ہونے چاہئیں، جو تحقیقی اور ادبی معیار کے مطابق اور متنازع مواد سے مبرا ہوں۔

۳۔ مضامین اردو یا انگریزی میں لکھے گئے ہوں۔

۴۔ مقابلے میں حصہ لینے والے صاحبان مسوّدے کی چار کاپیاں (بہ شمول اصل کاپی) نام، پتے اور فون نمبر کے ساتھ ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء تک وفاقی وزارت مذہبی امور اسلام آباد کو ارسال کر دیں۔ مضامین مطلوبہ شرائط پر پورے نہ اُترنے یا وقتِ مقررہ پر موصول ہونے کی صورت میں مقابلے میں شامل نہ ہو سکیں گے

اے۔ اے حقانی
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایس)
ٹیلی فون نمبر: ۸۲۵۷۳۵

نورالحسن جعفری
صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

عرضِ حال

تقریباً دو سال بعد قارئین کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا ہے انسان کے خارجی اور داخلی حالات لمحے کو سال اور سال کو لمحہ بنا دیتے ہیں۔

گلشن کی نئی عمارت میں منتقل ہوئے ہم کو تقریباً ڈیڑھ سال ہوئے ہیں۔ نئی جگہ پر آنے کے بعد انجمن کے اراکین نسبتاً سکون کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ انجمن کا پرانا دفتر اردو کالج سے ملحق تھا اور شہر میں جو شورش کی فضا ایک عرصہ سے قائم تھی تعلیمی اداروں پر اس کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔ انجمن کے اراکین ذہنی دباؤ کے باوجود وہاں آخری وقت تک کام کرتے رہے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انتظامیہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ مولوی صاحب کے مسکن کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ لائبریری کو سخت خطرہ تھا انتظامیہ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا لیکن ان کے سامنے بھی بے شمار مسائل تھے اور انجمن کی حفاظت ان میں سے صرف ایک مسئلہ تھا۔ پرانی عمارت اب بھی ہماری تحویل میں ہے اور وہاں ہماری مطبوعہ کتابوں کا گودام ہے انشاء اللہ حالات کی بہتری کے ساتھ ہم اس عمارت میں چھوٹی سی لائبریری اور دارالمطالعہ قائم کریں گے۔ اس عمارت کے ساتھ انجمن کا جذباتی لگاؤ ہے کیوں کہ اس جگہ مولوی صاحب کی ابدی آرام گاہ ہے۔

انجمن کے مالی وسائل فی الحال ہماری روزمرہ کی ضرورت کے لیے کافی ہیں لیکن آئندہ ترقیاتی منصوبوں کے لیے ناکافی ہیں۔ انجمن کے پاس گلستان جوہر میں ۴۰۰۰ مربع گز کا ایک پلاٹ ہے جس پر انجمن کے شایان شان ایک عمارت بنانے کا منصوبہ ہے جس میں انجمن کی لائبریری اور دفاتر کے لیے جگہ ہو اور جلسوں کے لیے ایک ہال جس میں ڈھائی تین سو آدمی آرام سے بیٹھ سکیں ابھی اس پر کام شروع نہیں ہوا ہے۔ ایک سرسری اندازہ ہے کہ اس کے لیے تقریباً دو کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی اور تقریباً دو سال میں کام مکمل ہوگا۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی فی الحال اس کے لیے ہم صوبائی حکومتوں اور وفاقی حکومت اور صوبائی گورنروں سے ان کی صوابدیدی گرانٹ سے اعانت کے لیے درخواست کریں گے۔ صدر پاکستان نے لائبریری کے لیے سات لاکھ روپے کا ایک عطیہ دیا تھا انشاء اللہ ۹۳ء میں مارچ اور اپریل کے دوران متولیان کا ایک وفد اس کام کے لیے متعلقہ حکومتوں سے رابطہ قائم کر کے ملاقات کی درخواست کرے گا تاکہ ہم منصوبہ کی تفصیلات سے ان کو آگاہ کر سکیں اس تین ماہ میں ہم کو ایک مسودہ تیار کرنا ہے جس میں انجمن کی تاریخ پاکستان میں اس کی اہمیت اور عمارتی منصوبہ کی تفصیلات ہوں گی۔ "قومی زبان" کی پشت پر جس عمارت کا نقشہ شائع ہوتا ہے وہ قائداعظم کمپلکس کے ایک مختصر پلاٹ پر مجوزہ عمارت کا تھا۔ یہ منصوبہ اب قطعی طور پر بدل گیا ہے۔

قائداعظم کمپلکس میں حکومت کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ صرف تین اداروں کو جگہ دی جائے گی۔ قائداعظم اکادمی، انجمن ترقی اردو پاکستان اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی بنی بھی اور تقریباً تین سال تک میٹنگیں ہوتی رہیں اور جنرل ضیاء الحق صاحب مرحوم نے مجوزہ عمارت کے ماڈل کی منظوری دے دی تھی اور PC-۱ پروفارما بھی بن گیا ہے تاکہ حکومت کی منظوری حاصل کرلی جائے اور عمارت کی تعمیر کے لیے رقم مختص کردی جائے۔

یہ کام ابھی التوا میں پڑا ہوا ہے۔ وزارت تعلیم کے کسی چھوٹے سے افسر نے یہ اعتراض کردیا ہے کہ "انجمن ترقی اردو ایک نجی ادارہ ہے اس کو کمپلکس میں جگہ نہیں مل سکتی۔" میں نے فائل خود دیکھی ہے جناب غلام اسحاق خاں صاحب نے بہ حیثیت وزیر خزانہ اپنے نوٹ میں لکھا تھا انجمن ایک قومی ادارہ ہے جس کو کمپلکس میں جگہ ملنا چاہیے سترہ ادارے تھے جو جگہ چاہتے تھے آخر میں صرف تین اداروں کے لیے صدر پاکستان نے منظوری دے دی اور عمارت کے ماڈل بھی اسی حکم کے تحت بنائے گئے۔

میں متعدد بار اس سلسلے میں سیکریٹری وزارت تعلیم سے مل چکا ہوں دو سیکریٹری تبدیل ہوگئے۔ موجودہ سیکریٹری جناب ہمایوں مفتی رسول صاحب سے میں نے نومبر میں ملاقات کی اور ان کو تمام کوائف سے آگاہ کیا اور متعلقہ کاغذات ان کی خدمت میں پیش کردیے گئے ہیں۔ انھوں نے نہایت دلچسپی سے میری باتیں سنیں اور وعدہ کیا کہ وہ خود ہمدردی سے اس معاملہ پر غور کریں گے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ سال ۹۲-۹۳ء میں اس کیس میں کچھ پیش رفت ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ اس کا PC-۱ پروفارما حکومت سے منظور ہوجائے منصوبہ کی تکمیل کے لیے تقریباً چار سال چاہیے لیکن انشاء اللہ ہمارا یہ خواب کبھی نہ کبھی پورا ہو جائے گا۔

ہماری تجویز ہے کہ کتب خانہ جاریہ گلستان جوہر میں رہے اور تحقیقی لائبریری اور انجمن کے مخطوطات قائداعظم کمپلکس میں رکھے جائیں گے۔ یہ تو متولیان کا مجوزہ منصوبہ ہے اس میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے۔

انجمن کی کارکردگی کے بارے میں قارئین اپنی رائے خود قائم کرسکتے ہیں میں کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں بہت سی خامیاں ہیں جن کے لیے میں اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔

کسی دفتری نظام میں خطوط کا جواب فوراً ملنا چاہیے انجمن کتابیں فروخت کرتی ہے اگر آرڈر موصول ہو تو فوراً تعمیل ہونی چاہیے ان دونوں معاملات میں انجمن کا نظام کمزور ہے۔ کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں اب ہم نے ایک ادارہ سے معاہدہ کیا ہے جو فروخت کا واحد تقسیم کنندہ ہوگا۔ امید ہے کہ اب کتابوں کی فروخت کا کام بہتر ہوسکے گا۔ دفتری نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ گرانی بڑھ رہی ہے۔ ہماری تنخواہیں حکومت کے اداروں کی تنخواہوں کے مقابلہ میں کم ہیں۔ دفتر میں کام کا دباؤ بھی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ اچھے کارکن دستیاب نہیں خصوصاً ٹائپ کار اور کلرک۔ اس وجہ سے کام میں تاخیر ہوتی ہے۔

انجمن نے سن ۹۱ء اور ۹۲ء میں حسب ذیل نئی کتابیں شائع کیں۔

(۱) "مقالاتِ برنی" (حصہ دوم)، (۲) "اردو ادب کی تحریکیں" اشاعت ثانی، (۳) "سرسیّد کا تعلیمی منصوبہ اور اس کی معنویت"، (۴) اصطلاحاتِ بنکاری"، (۵) داستان سحرالبیان"، (۶) مضامین غلام ربانی"، (۷) قومی یک جہتی اور پاکستان

فی الحال ہم نے انجمن کی پرانی مطبوعات کو دوبارہ شائع کرنے کا پروگرام بھی شروع کیا ہے۔ اور حسب ذیل کتابیں اس پروگرام کے مطابق شائع کی جارہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر شائع ہوچکی ہیں۔

(۱) "نوادرالالفاظ"، (۲) "روسی ادب" دو حصے، (۳) نفخ الطیب"، (۴) "جوامع الحکایات"، (۵) "الف لیلہ و لیلہ" سات حصے،

(۶) "تنقید عقل محض"، (۷) "تاریخ ایران بہ عہد ساسانیاں" دو حصے، ((۸) "تاریخ الحکما"، (۹) "میر تقی میر"، (۱۰) غالب کے خطوط" جلد اوّل، (۱۱) "اردو تنقید کا ارتقا"، (۱۲) "سعادت یار خاں رنگیں"۔

"قومی زبان" کا معیار تسلی بخش ہے اور دسمبر ۹۲ء سے اس کی اشاعت بر وقت ہوگئی ہے۔ یعنی مہینہ کی پہلی تاریخ کو۔ امید ہے کہ آئندہ اس میں تاخیر نہیں ہوگی۔

سہ ماہی "اردو" کی اشاعت تسلی بخش نہیں تاخیر کے علاوہ اس کی طباعت بھی ناقص تھی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ قارئین نے اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں کی کم از کم مجھے اس سلسلے میں کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے خود اس بات کو محسوس کیا اور مشیر ادبی سے درخواست کی کہ وہ اس کام پر توجہ دیں اب ان کو انتظامی کاموں سے آزاد کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنا پورا وقت علمی کاموں پر صرف کر سکیں امید ہے کہ "اردو" بھی وقت پر شائع ہونے لگے گا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ علاقائی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ بلوچی اور پشتو افسانوں کا انتخاب ہم کو اب تک نہیں مل سکا اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ انجمن خود اپنے ذرائع سے انتخاب کی ذمہ داری قبول کرے تاکہ یہ مجموعہ شائع ہو سکے۔ ہم سندھی ادب کی تاریخ بھی انجمن کی طرف سے شائع کرنا چاہتے ہیں اس کام کے لیے دو تین نام زیر غور ہیں امید ہے کہ اگلے مالی سال میں یہ کتاب شائع ہو جائے گی۔

"اصطلاحات بنکاری" کی اشاعت میں بہت دیر ہو گئی اس کا مجھے احساس ہے لیکن اب یہ کتاب طبع ہو گئی ہے۔ ایک اہم کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔

دوسرا اہم علمی کام جو مکمل ہو گیا ہے وہ قدرت نقوی صاحب کی مرتبہ "ہندی اردو" ڈکشنری ہے۔ امید ہے کہ اس کی طباعت کا کام بھی جون تک مکمل ہو جائے گا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بابائے اردو کی لغت میں ہم جو تقریباً دس ہزار نئے الفاظ شامل کرنا چاہتے تھے وہ کام اب تک مکمل نہیں ہو سکا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ ڈکشنری کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جائے لیکن فی الحال تو یہ نئے الفاظ ایک ضمیمہ کی شکل میں موجودہ ڈکشنری کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔

اردو کے محسنین کے اعزاز میں جلسے کرنے کی روایت انجمن ترقی اردو نے شروع کی تھی خوشی کی بات ہے کہ اکادمی ادبیات نے بھی اس کام کو آگے بڑھایا اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادیبوں کے اعزاز میں بھی جلسے کیے۔ جنوری ۹۱ء کے بعد ہم نے حسب ذیل حضرات کے اعزاز میں جلسے منعقد کیے۔

جناب شان الحق حقی صاحب، جناب تابش دہلوی، پروفیسر ممتاز حسین، جناب جلیل قدوائی۔

بابائے اردو لیکچر: ہماری کوشش تو یہ ہے کہ ہر سال مولوی عبدالحق صاحب کی برسی کے موقع پر یادگاری خطبہ کوئی اہل علم عطا کریں اور وہ شائع ہو لیکن ان میں ہم کو کامیابی نہیں ہوئی۔ کراچی کے حالات، اہل علم کی ذاتی مصروفیات اور ویزا کے مسائل کی وجہ سے دقتیں پیش آتی ہیں۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی صاحب نے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں جمالیات کے پروفیسر ہیں "سرسیّد کے تعلیمی منصوبہ" پر خطبہ دیا تھا۔ جو شائع ہو گیا اس سال جو صاحب ہندوستان سے تشریف لانے والے تھے وہ انتظامی دشواریوں کی وجہ سے نہ آسکے۔

اب انشاء اللہ ہم اپریل میں اس خطبہ کے لیے انتظام کر رہے ہیں ہماری خواہش یہ ہے کہ کراچی کے علاوہ لاہور، اسلام آباد،

پشاور اور کوئٹہ میں بھی انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ ہر سال منعقد ہو جائے۔ متولیان اس سلسلے میں منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ان تمام شہروں میں انجمن کے رفقا موجود ہیں جو انتظامی امور کی ذمہ داری احسن طریقہ پر قبول کر سکتے ہیں۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور رابطے کا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اخبارات میں کبھی کبھی علاقائی سیاست دانوں کے بیانات آتے رہتے ہیں کہ پاکستان پر ایک قلیل تعداد کی زبان ٹھونس دی گئی ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے اس سے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے صوبہ سرحد میں اس کو سرکاری کام کے لیے استعمال کیا گیا۔ اہل پنجاب نے اردو کی بہت خدمت کی ہے اور سندھ کے محققین کی رائے ہے کہ اردو کی پیدائش اور ابتدائی نشو و نما سندھ میں ہوئی۔ وقت کے ساتھ پاکستان کی اردو زبان میں تبدیلی آتی جائے گی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہوتے جائیں گے۔ اردوئے معلیٰ یا لکھنؤ کی زبان صرف کتابوں تک محدود ہو گی اس کی تاریخی اور علمی حیثیت باقی رہے گی لیکن اردو زبان کا قدیم "معیار" نہیں ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبان کا ایک نیا "معیار" قائم ہو جائے گا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے انجمن ترقی اردو کو علاقائی زبانوں کے تراجم سے دلچسپی لینی چاہیے اور انشاء اللہ اس سلسلے میں ایک مربوط پروگرام تیار کیا جائے گا۔ ایک دارالترجمہ کا منصوبہ زیر غور ہے اور امید ہے کہ اس سلسلے میں پیش رفت کریں گے۔

ڈاکٹر عطش درانی

اصطلاحی میدان میں انجمن ترقی اردو کی خدمات

اصطلاحات سازی کو اس کی علمی بنیادوں پر استوار کرنے اور ابتدائی اصطلاحات کو اس کی تکنیکی اور فنی بنیادیں فراہم کرنے میں انجمن ترقی اردو کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس انجمن کا آغاز انہی دنوں میں ہو گیا تھا، جب علامہ اقبال کی "علم الاقتصاد" طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ علمی اعتبار سے ہم اسے سر سیّد کی سائنٹیفک سوسائٹی کی صدائے بازگشت؛ اور دہلی کالج کی باقیات میں استوار قرار دے سکتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ میں ایک مجلسِ تحفظ اردو قائم ہوئی، جس نے میک ڈونل کے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا، جو اس نے سر سیّد کی وفات کے دو سال بعد ناگری رسم الخط کو لازم کرنے کے سلسلے میں دیا تھا۔ نتیجتاً علی گڑھ کالج کے معتمد محسن الملک تحفظِ اردو کے کام سے دست کش ہو گئے تو عملاً سر سیّد کی کوششیں بھی دم توڑ گئیں۔ البتہ اسی راکھ سے انھوں نے دو تین سال بعد اپنی تعلیمی کانفرنس میں ایک شعبۂ علمیہ استوار کیا اور اس کے مقاصد کی صداقت کے لیے انجمن ترقی اردو قائم کی گئی۔ یہ انجمن دہلی کے اجلاس میں جنوری ۱۹۰۸ء میں بنائی گئی۔ اس کے پہلے صدر ٹامس آرنلڈ اور سیکریٹری مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ (۱)

۱۹۱۲ء تک انجمن علی گڑھ میں رہی۔ چونکہ اس کے اکثر ارکان حیدر آباد دکن میں تھے، اس لیے عملاً انجمن کا دفتر بھی حیدر آباد منتقل ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک حبیب اللہ خان شروانی اس کے سیکریٹری رہے۔ ۱۹۰۹ء سے مولوی عزیز مرزا سیکریٹری ہوئے ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کے اجلاس میں مولوی عبدالحق کو سیکریٹری نامزد کیا گیا۔ چونکہ مولوی صاحب اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیم تھے اس لیے انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ (۲)

مولوی صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے استعفیٰ دے دیا تو ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر دہلی میں منتقل کر دیا گیا۔ سر تیج بہادر سپرو اس کے صدر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں مولوی صاحب کراچی آ گئے اور یہاں انجمن ترقی اردو پاکستان کی داغ بیل ڈالنا شروع کی۔ انجمن ترقی اردو ہند اس سے الگ رہ گئی۔ دونوں انجمنوں کا کوئی انتظامی اور شخصی تعلق باقی نہ رہا۔ (۳)

پاکستان میں انجمن کو ۱۹۴۸ء ہی میں رجسٹرڈ کرا لیا گیا اور ۱۹۵۰ء میں اس کی مجلس نظماء نے مولوی عبدالحق کو انجمن کا صدر بھی منتخب کر لیا جو اپنی وفات (۱۹۶۱ء) تک دونوں منصب نبھاتے رہے۔ (۴)

بھارت میں انجمن ترقی اردو ہند کا احیاء ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اس سلسلے میں آل احمد سرور نے مولوی ابوالکلام آزاد کی دلچسپی، توجہ اور کوششوں کا اعتراف کیا ہے۔ (۵) معتدد افراد اس سے منسلک رہے آج کل ڈاکٹر خلیق انجم اس کے سیکریٹری ہیں۔

مولوی عبدالحق کے بعد پاکستان میں اختر حسین انجمن کے صدر اور جمیل الدّین عالی معتمد مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۳ء سے قدرت اللہ شہاب اور ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۵ء سے نورالحسن جعفری انجمن کے صدر ہیں۔ (۶)

اگرچہ کراچی اور دہلی کے علاوہ الہ آباد، علی گڑھ، لاہور اور سرگودھا کی طرح کئی شہروں میں علیٰحدہ علیٰحدہ انجمن ترقی اردو موجود رہی لیکن اصطلاحات سازی کے ضمن میں زیادہ تر کام مولوی عبدالحق کی انجمن ترقی اردو (حیدر آباد، دہلی اور کراچی) نے انجام دیا یا قدرے اصطلاحی اشاریوں کی صورت میں علی گڑھ میں ملتا ہے۔

الف: اصطلاحات سازی کے لیے انجمن کی عمومی کوششیں!

یہاں انجمن کی خدمات پر تفصیلی روشنی تو نہیں ڈالی جاسکتی البتہ اس کے ان کارناموں کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے جو اس نے اصطلاحات سازی کے میدان میں انجام دیے۔

انجمن میں اصطلاحات سازی کے بنیادی کام پر توجہ مولوی عزیز مرزا کے دور میں دی گئی۔ رنگون کے ایک تاجر حاجی احمد داؤد نے اس ضمن میں تعاون کی ابتدا کی۔ انھوں نے تین ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تو اس کام کی داغ بیل ڈالی گئی۔ (۷) بعد ازاں خود مولوی عزیز مرزا نے بھی اصطلاحات سازی کے سلسلے میں اپنا مقالہ لکھا جو ماہنامہ "المعلم" مارچ ۱۹۲۲ء حیدر آباد دکن میں شائع ہوا۔ اس دور میں اصطلاحات سازی کا کتنا کام ہوا، اس پر کوئی وضاحت نہیں ملتی البتہ کتابی اشاریوں کی صورت میں اصطلاحات نگاری مولانا شبلی کے دور میں ضرور ہوئی تھی لیکن یہ باقاعدہ اصطلاحات سازی قرار نہیں دی جاسکتی۔ انفرادی مترجمین نے اپنی کتابوں میں اصطلاحات وضع کرنے کا کام کیا ہے جیسے "فلسفہ تعلیم" کے مترجم خواجہ غلام حسین نے کیا۔ یہ کتاب اسی دور میں شائع ہوئی۔

انجمن کے علمی کاموں کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۰ء میں ہوا، جب مولوی عبدالحق نے ان کے لیے باقاعدہ مجالس بنا کر کام شروع کیا۔ انھی دنوں میں جامعہ عثمانیہ میں اصطلاحات سازی کا کام ہونے لگا تھا۔ مولوی عبدالحق دونوں میں رہنمائی کا کام انجام دے رہے تھے۔ اس لیے ہم ان دنوں میں انجمن اور جامعہ عثمانیہ کے کاموں کو مشکل ہی سے علیٰحدہ علیٰحدہ لکھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ سید ہاشمی لکھتے ہیں: (۸)

> "مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کی طرف سے اہل علم کی جماعتیں الگ قائم کیں اور ایسی لگاتار محنت و سعی سے جو انھی کا حصہ ہے، مختلف علوم کی اصطلاحات کو مرتب کر کے چھپوایا۔ ان کی کئی بار ترمیم و تصحیح کرائی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ انجمن کے اجلاسوں میں، دوسرے علمی جلسوں میں، پھر رسالہ "اردو" کے صفحات میں ان علمی اصطلاحات پر جو عالمانہ مباحث اور مقالات شائع ہوتے رہے انھیں جمع کیا جائے تو ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔"

کتابی اشاریوں کی صورت میں انجمن کی پہلی کتاب "فلسفۂ تعلیم" از ہربرٹ سپنسر، ترجمہ از خواجہ غلام الحسنین بھی قابلِ ذکر ہے یہ مولانا شبلی کے دور میں طبع ہوئی، جس میں تعلیمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ رائے دینے والوں میں علامہ اقبال بھی شامل ہیں، انھوں نے اس ترجمے کی بڑی تعریف کی۔ تیسری بار یہ کتاب اورنگ آباد سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب "القمر" مولوی راحت حسین کی تالیف ہے جس میں انھوں نے علم ہیئت سے متعلق کئی اصطلاحات کا ترجمہ کیا۔ دوسری دفعہ یہ ۱۹۱۷ء میں طبع ہوئی۔ (۹) ایک اور کتاب "فلسفہ جذبات" از مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی انہی دنوں شائع ہوئی۔ اس کے ابتدائی ابواب ۱۹۱۲ء میں "الہلال" میں شائع ہوئے تھے، جن پر علمی بحث چل نکلی۔ (۱۰)

قیام پاکستان سے قبل اصطلاحات سازی میں انجمن کے مندرجہ ذیل آٹھ مجموعے شائع ہوئے۔

۱۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ (حصّہ اوّل) اورنگ آباد دکن، ۱۹۲۵ء (متفرق علوم)
۲۔ اصطلاحات عمرانیات (حصّہ اوّل) اورنگ آباد دکن، ۱۹۲۵ء
۳۔ اصطلاحات طبیعیات (حصّہ اوّل) اورنگ آباد دکن ۱۹۲۵ء
۴۔ اصطلاحات کیمیا (حصّہ اوّل) اورنگ آباد دکن ۱۹۳۸ء
۵۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ (حصّہ دوم) دہلی، ۱۹۴۰ء (عمرانیات، معاشیات، تاریخ، سیاسیات)
۶۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ (حصّہ سوم) دہلی، ۱۹۴۰ء (طبیعیات)
۷۔ فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں (آٹھ جلدیں) دہلی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء
۸۔ اسٹینڈرڈ انگریزی اردو لغت، مولوی عبدالحق ۱۹۳۱ء

قیام پاکستان کے بعد کراچی سے انجمن کی مندرجہ ذیل چھ مطبوعات شائع ہوئیں۔

۱۔ اصطلاحات علم ہیئت، ۱۹۴۹ء
۲۔ اصطلاحات جغرافیہ، ابرار حسین قادری، ۱۹۴۹ء، کراچی
۳۔ فرہنگ اصطلاحات بنکاری، ۱۹۵۱ء، کراچی
۴۔ فرہنگ اصطلاحات کیمیا، ۱۹۵۳ء
۵۔ فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں (پہلی پانچ جلدیں طبع نو) ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء
۶۔ مصطلحات علوم و فنون عربیہ (۷۸-۱۹۷۶ء)

علم ہیئت اور جغرافیہ کی اصطلاحیں دہلی ہی میں طبع ہوئی تھیں اور مولوی عبدالحق کے ہمراہ کراچی آگئیں اور ان پر کراچی کا نام چسپاں کیا گیا، اصطلاحات پیشہ وراں کی طبع نو کی گئی۔ مولوی صاحب کے لغت میں بھی اصطلاحات کا ایک وافر ذخیرہ موجود

ہے۔

اصطلاحی اشاریوں کی صورت میں مندرجہ ذیل چودہ کتابیں ہمارے سامنے آتی ہیں: "طبیعیات کی داستان" کراچی (۱۹۵۱ء)، "اضافیت" کراچی (۱۹۵۲ء)، "ہمارے مزدور" دہلی (۱۹۴۰ء)، "مبادی سائنس" حیدر آباد (۱۹۴۰ء)، "طبقات الارض" لکھنؤ (۱۹۶۶ء)، "دیباچۂ صحت" اورنگ آباد دکن، "ہمارے بنک" دہلی (۱۹۴۳ء)، "مکالمات سائنس" دہلی (۱۹۴۰ء) "سیر افلاک" کراچی ۱۹۵۲ء)، انواع فلسفہ" علی گڑھ (۱۹۵۲ء) "اطلاقی سماجیات"، علی گڑھ (۱۹۵۲ء)، "سیاسیات کے اصول" (جلد اوّل) علی گڑھ (۱۹۵۲ء)، (دوم) علی گڑھ (۱۹۵۲ء)، (جلد سوم) علی گڑھ (۱۹۵۵ء)، "حیوانیات" دہلی (۱۹۴۲ء)، "ابتدائی جراثیمات" کراچی (۱۹۵۶ء)۔ مزید براں جناب جمیل الدّین عالی کی سرکردگی میں پینگوئن کی لغات DICTIONARY OF ECONOMIC کے تیسرے ایڈیشن ۱۹۸۴ء کو بنیاد بنا کر معاشیات اور بنکاری کی اصطلاحات کا ایک کشاف تیار کیا گیا جو ہنوز قلمی شکل میں محفوظ ہے۔ اس میں اصطلاحات سازی کی تشریحات اور تعریفات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بقول جمیل الدّین عالی "یہ ان کی نگرانی میں نیشنل بنک کی طرف سے تیار کیا گیا تھا۔" (۱۱)

ب: علم اصطلاحات سازی کی بنیادیں:

اردو میں علم اصطلاحات سازی کی باضابطہ طور پر بنیادیں انجمن ہی نے رکھیں۔ مولوی عزیز مرزا کے مقالہ کے علاوہ وحید الدّین سلیم کی کتاب "وضع اصطلاحات" (۱۹۲۹ء) اور مولوی عبدالحق کی کتابیں "اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" (۱۹۴۹ء) اور "اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس" (۱۹۵۱ء) اس ضمن میں خاطر خواہ کوششیں ہیں۔ مزید برآں انجمن کا علمی جریدہ سہ ماہی "اردو" بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس میں متعدد ایسے مقالات شائع ہوئے ہیں جن کا موضوع اصطلاحات سازی تھا ان میں وحید الدّین سلیم کے مقالات "اصول وضع اصطلاحات" اپریل ۱۹۲۱ء، "اصطلاحات علمیہ" جولائی ۱۹۲۲ء، اکتوبر ۱۹۲۲ء، جنوری ۱۹۲۳ء اور جنوری ۱۹۲۹ء، عبدالرحمان بجنوری کے مقالات "اصطلاحات علمیہ" شمارہ جنوری ۱۹۲۲ء، جولائی ۱۹۲۲ء اور مولوی عبدالحق کے مقالات اصطلاحاتِ علمیہ شمارہ جنوری ۱۹۲۲ء جولائی ۱۹۲۲ء اور "اردو میں علمی اصطلاحات"، جنوری ۱۹۴۵ء قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اصطلاحات بھی ہیں اور مباحث بھی دیے گئے ہیں۔ عبدالرحمان بجنوری، وحید الدّین سلیم اور مولوی عبدالحق کے اصول بھی انجمن کی کارگزاری قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اصطلاح سازی میں انجمن کے اصول بیان کرنے سے پہلے مولوی عزیز مرزا کے انجمن ترقی اردو کے دیے گئے مفید مشورے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اصطلاحات سازی کے مسئلے پر صائب مشورہ شامل تھا، جو آج بھی اردو کے حق میں اسی طرح قابلِ عمل ہے، انھوں نے کہا کہ اس کام کے تین طریقے ہوسکتے ہیں۔ (۱۲)

۱۔ ایک یہ کہ جملہ اصطلاحات کا ترجمہ اپنی زبان میں خواہ مترادف الفاظ ہوں یا نہ ہوں، کیا جائے۔

۲۔ دوسرے جن الفاظ کا ترجمہ اپنی زبان میں بآسانی ہو، ان کا ترجمہ کیا جائے اور جن الفاظ کا ترجمہ ایک لفظ میں نہ ہو سکے، وہ اصل الفاظ خواہ اسی شکل سے یا شکل بدل کر لے لیے جائیں۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ کہ تمام اصطلاحات بجنسہ اپنی زبان میں منتقل کر لیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں ان تینوں پر جزواً جزواً عمل ہوا ہے۔ تمام اصطلاحات کے ترجے کی کوششیں بھی ہوئیں، دخیل اور مورد الفاظ بھی سامنے آئے اور انگریزی سے الفاظ بجنسہ بھی لیے گئے۔

انجمن ترقی اردو کے علمی کام ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوئے تھے۔ وحید الدّین سلیم کی کتاب "وضع اصطلاحات" کی اشاعت (۱۹۲۹ء) کے بعد مولوی عبدالحق نے جو انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی تھے اور دارالترجمہ کے ناظم بھی، انجمن کی طرف سے بھی اصطلاحات کا آغاز کیا۔ انجمن کے اصولوں کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: (۱۴)

(۱) اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے۔ اصطلاحات کے بنانے میں دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے میں ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے ناموزوں نہ ہو۔

(۲) اصطلاحات بنانے کے لیے عربی، فارسی، ہندی میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو یعنی جو مروج اور موزوں ہو۔ الفاظ دوسری زبان کے لے سکتے ہیں لیکن ان الفاظ سے اشتقاق یا ترکیب کے ذریعے جو الفاظ بنائے جائیں گے وہ اردو صرف و نحو کے بموجب ہوں گے۔ یعنی لفظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں۔

(۳) حتی الامکان مختصر لفظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کر سکیں۔

(۴) جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسماء سے مصادر بنائے جاتے تھے (بدلنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ)، اسی طرح اب بھی حسبِ ضرورت اسماء سے افعال بنا لیے جائیں۔

(۵) ترکیب میں انہی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو اب تک ہماری زبان میں

مستعمل ہیں مثلاً ہندی لفظ کے ساتھ عربی، فارسی کا جوڑ اور عربی، فارسی سابقوں اور خصوصاً لاحقوں کا میل ہندی الفاظ کے ساتھ مثلاً دھڑے بندی، اگال دان، بے کل وغیرہ۔ یا عربی قاعدے سے فارسی، ہندی الفاظ کے اسم کیفیت جیسے رنگت، نزاکت کے طرز پر نراجیت، پردیسیت وغیرہ۔

(۶) ہماری زبان کی ایسی اصطلاحیں جو قدیم سے رائج ہیں اور اب بھی اسی طرح کارآمد ہیں، انھیں برقرار رکھا جائے البتہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں اور رائج ہو گئی ہیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کی رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے، انھیں ترک کر کے ان کی بجائے دوسرے مناسب لفظ وضع کر لیے جائیں۔

(۷) ایسے انگریزی اصطلاحی لفظ جو عام طور پر رائج ہو گئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں، انھیں بدستور رہنے دیا جائے۔

(۸) بعض انگریزی اصطلاحیں جو پہلے زمانے میں اس وقت کی معلومات کی رو سے تجویز کی گئی تھیں اور حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں، ان کے بجائے ایسے لفظ تجویز کیے جائیں جو جدید تحقیق کی رو سے صحیح مفہوم ادا کر سکیں۔ اس میں انگریزی الفاظ کی تقلید نہ کی جائے۔

انجمن ترقی اردو کے قیام اورنگ آباد کے ان اصولوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کا جامعہ عثمانیہ کے اصولوں سے اشتراک نظر آتا ہے لیکن ترکیبات میں فارسی، ہندی، عربی ہندی کا میل بھی قبول کیا گیا اور سابقہ ذخیرۂ اصطلاحات پر بھی نظر ثانی کی جاتی رہی اور نئی اصطلاحات تجویز کی گئیں۔ تاہم یہ طریق کار ہمیں انجمن کے پاکستانی دور میں زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اگرچہ انجمن نے علم الاصطلاحات پر بھی توجہ دی اور وحید الدین سلیم کی خدمات حاصل کیں لیکن اصطلاحات کے نقطۂ نظر سے بہت کم کام ہوا۔

(ج) اصطلاحات نگاری (مجموعے اور اشاریے)

انجمن کے اصطلاحی مجموعوں میں "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تین حصوں میں شائع ہوا۔ بعد

ازاں عمرانیات، طبیعیات، کیمیا، ہیئت وغیرہ لے مجموعے انہی سے الگ کر کے شائع کیے گئے ہیں، اس کی جلد اوّل ۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد دکن سے شائع ہوئی۔ اس میں ہیئت، نباتیات، معاشیات، برطانوی انتظام، دستوری تاریخ، انگریزی تاریخ، یونانی تاریخ، منطق، الجبرا، جیومیٹری (مخروطیات)، ٹھوس جیومیٹری، مثلثات، تفرقی مساوات، شماریات، مابعدالطبیعیات، نفسیات، طبیعیات، سیاسیات آثار قدیمہ اور حیاتیات کی اصطلاحیں شامل کی گئی ہیں۔ دیباچے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ چونکہ "دارالترجمہ" (جامعہ عثمانیہ) کی نظامت بھی انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری کو تفویض کی گئی، اس لیے یہ مجموعہ دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ (۱۴)

ان میں ہیئت اور نباتیات کی اصطلاحیں انجمن نے خود مرتب کی تھیں۔ نباتیات کی اصطلاحات حاجی عبدالرحمان خان فرسٹ اسسٹنٹ امپیریل اکنامک بوٹنسٹ، پوسا نے مرتب کیں۔ بعد میں دارالترجمہ نے بھی اس فن میں کچھ اصطلاحیں مرتب کیں جو بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہیں۔ ان اصطلاحات کی تدوین میں انجمن نے سات اصولوں کو ملحوظ رکھا تھا جن کا اصل الاصول یہ تھا کہ "اصطلاح زبان کے سانچے میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو۔" چنانچہ اس لحاظ سے انجمن نے: (۱) تمام زبانوں یعنی عربی، فارسی، ہندی، ترکی سے مدد لی (۲) کسی خاص زبان کے قاعدے کی پابندی نہیں کی یعنی اردو صرف و نحو کے مطابق ترکیب سازی کی گئی، (۳) اختصار کو ملحوظ رکھا گیا، (۴) اسماء سے افعال بنائے گئے جیسے برق سے برقانا وغیرہ، (۵) سابقہ ذخیرے کو برقرار رکھا گیا، (۶) مروج انگریزی اصطلاحات کو قائم رکھا گیا، (۷) اصطلاحات کے بدلنے پر ترجمے کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی۔ (۱۵)

اصطلاحوں کو عام فہم بنانے کے لیے انجمن نے ہندی ترکیبوں کو بخوبی استعمال کیا ہے۔ مثلاً OSTRACIA M کا ترجمہ "دیس نکالا" AUTONOMY کا "سوراج" ANARCHY کا "نراج" COMBINATION کا "ملاپ" TRIQUETROUS کا "تدھارا" TABESCENT کا "جھری دار" STUPOSCUS کا "سنیلا" UNICOSTETE کا "اکرگا" LARVE کا "پھلروپ" PUBA کا "منجھ روپ" ASEXUAL کا "اجاتی" COPNOSEPALOUS کا "مل پتیا" وغیرہ ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا ہندی ترکیبات والی اصطلاحیں مروج نہیں ہو سکیں۔ لیکن اس کے باوجود عربی فارسی سے گریز مشکل ہوا۔ مثلاً ریاضی اور فلکیات کی اصطلاحیں دنیا بھر میں عربی سے آئی ہیں۔ زیادہ تر اصطلاحات عمومی الفاظ ہیں جو کئی مضامین میں مشترک ہیں۔ تراکیب میں اردو حروف اضافت "کا کے کی" بھی عام طور پر مستعمل ہیں۔

"فرہنگ اصطلاحات علمیہ" کا حصہ اوّل ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۱۴ صفحات کا اغلاط نامہ اس کے علاوہ ہے۔ دوسرا حصہ ۱۹۴۰ء میں دہلی سے شائع ہوا، جو ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں عمرانیات، معاشیات، تاریخ و سیاسیات کی اصطلاحیں شامل ہیں، تیسرا مجموعہ بھی ۱۹۴۰ء ہی میں دہلی سے ۹۰ صفحات میں شائع ہوا۔ یہ طبیعیات کی اصطلاحوں پر مشتمل ہے۔ ان میں اصطلاحات سازی سے زیادہ اصطلاحی ترجمے پر زور دیا گیا۔ (۱۶) لیکن بعض ترجمے بھی لفظی ہیں مثلاً ABNORMAL کے لیے "غیر معیاری" جب کہ "غیر متوازن" ہونا چاہیے اسی طرح AGGRESSION کے لیے "جارحیت" کی بجائے "دراز دستی" وغیرہ۔

ان مجموعوں کی اصطلاحات کو الگ الگ بھی شائع کیا گیا، ان میں "فرہنگ اصطلاحات کیمیا" جو ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی تھی، نظرثانی کے بعد کراچی پاکستان سے ۱۹۵۳ء میں پھر شائع کی گئی۔ پہلی اشاعت میں ۲۳۰۰ اصطلاحیں تھیں جن میں ۶۲۵ کا اضافہ کیا گیا۔ اس کام میں میجر آفتاب حسن صاحب نے بھی انجمن کا ہاتھ بٹایا۔ ان اصطلاحات کی تدوین میں مندرجہ بالا سات اصولوں کے

علاوہ بھی چند دیگر اصول پیشِ نظر رکھے گئے۔ اصل الاصول البتہ وہی رہا کہ اصطلاحات سازی کے لیے ماہرین زبان اور ماہرین فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ: (۱) ہندی، عربی اور ہندی فارسی ترکیبات کو جائز سمجھا گیا۔ مثلاً بے حد سمجھدار، اگالدان، یگانگت، رنگت، نراجیت وغیرہ (۲) علوم کے نام کے لیے LOGY کی جگہ "یات" کا لاحقہ استعمال کیا گیا۔ GRAPH کے لیے "نگار" METER کے لیے "پیمانہ"، SCOPE کے لیے "نما" وغیرہ کے لاحقے استعمال کیے گئے۔ (۳) اصول ترخیم کے تحت دو الفاظ کے مابین حروف حذف کر کے اختصار پیدا کیا گیا۔ مثلاً نخست + مایہ = نخزمایہ، خشت + طلا = خش طلا، نرم + آب = نرماب یا ہوا + آمیزہ = ہوامیزہ، (۴) اگر کوئی اصطلاح پہلے کسی اور علم میں بھی مستعمل ہے تو اسے دوسرے علم میں لینے سے گریز نہیں کیا گیا۔ وغیرہ (۱۷) فلکیات جسے "فرہنگ اصطلاحات علم ہیئات" کا نام دیا گیا ہے، دہلی میں طبع ہوئی تھی جن پر بعد ازاں کراچی (۱۹۴۹ء) کے نام چسپاں کیا گیا۔ اس پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور اکبر علی صاحب استاد جامعہ عثمانیہ نے نظر ثانی کی تھی۔ یہ وہی اصطلاحات ہیں جو پہلے مجموعے (۱۹۲۵ء) میں شائع ہوئی تھیں، البتہ اب ان پر نظر ثانی کر کے نئے تراجم بھی پیش کیے گئے ہیں مثلاً پہلے ABERRATION OF LIGHT کا ترجمہ "انحرافِ نور"، "مغالطتہ الضو" اور "ضلال الشعاع" کیا گیا تھا۔ "اب انحرافِ نور" اور ضلالت نور" رہنے دیا گیا۔ AIR کے ترجمے میں دوسری بار "کرۂ باد" کی اصطلاح حذف کر دی گئی۔ (۱۸)

"اصطلاحات جغرافیہ" ایک انفرادی کوشش ہے، جسے پروفیسر ابرار حسین قادری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مرتب کیا تھا۔ انھوں نے وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق کے اصول اپنے پیشِ نظر رکھے تھے۔ البتہ حیدر آباد دکن کی اصطلاحات اور اصولوں کو مسترد کیا۔ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں۔ (۱۹)

> "حیدر آباد کی اصطلاحات کی ڈکشنری اور بہار گورنمنٹ کی تیار کرائی ہوئی ایک مختصر فہرستِ الفاظِ جغرافیہ بھی استعمال کی مگر ان سے کچھ زیادہ مدد نہ مل سکی...... اہلِ فن کی مصطلحات جو حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی ہیں ان کو بھی دیکھا لیکن وہ اصطلاحات علمی کتابوں میں استعمال نہیں کی جا سکتیں۔"

اصطلاحات سازی میں انھوں نے عربی، فارسی ترکیبات پر زور دیا ہے البتہ "گلیشیر"، ہوری کین" جیسے چند الفاظ انگریزی سے بعینہ لیے ہیں۔ کہیں کہیں ہندی اور مقامی ترکیبات نظر آتی ہیں، مثلاً "پنکھاڑ" (FJORDS) "اکاس" (FIRMAMENT)، "جھکاؤ" (INCLINATION) وغیرہ۔ بعض الفاظ کی جمع عربی اصول پر بنائی گئی مثلاً "پیشگیات، ادائیات، رسالیات" وغیرہ۔ اصولِ نحو پر بعض ترکیبات ترجمہ کی گئیں مثلاً طلاخش (طلا+ خشت) نیز (VOYAGE کے لیے) "سفراب" اردو ذخیرۂ اصطلاحات میں ایک خاطر خواہ اضافہ ہے، جو اسی طرح سفر + آب کا مرخم ہے۔ LOGAN کے لیے تیاب (تہ + آب) وغیرہ۔ ہرجانہ، جرمانہ کی طرح ROYALITY کے لیے "مالکانہ" وضع کیا گیا ہے۔ سابقہ ذخیرۂ اصطلاحات سے بھی بعض اصطلاحات لی گئیں جو شاید مستعمل نہیں ہو سکتیں مثلاً "کر گیری یا کروڑ گیری (CUSTOM کے لیے)" "تنقیح" (AUDIT کے لیے) وغیرہ۔ کیوں کہ یہ اپنے مخصوص سلطانی دور کی پیداوار ہیں اور اپنا مخصوص پس منظر رکھتی ہیں۔

اصطلاحات نگاری کے ضمن میں فلکیات کی ایک کتاب، "سیر افلاک" قابلِ ذکر ہے، جسے مرزا محمد رشید (پرنسپل گورنمنٹ

کالج کیمبلپور) نے تالیف کیا۔ اس کے صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۸، ستاروں، برجوں، مجموعوں کے انگریزی، عربی اور اردو نام دیے گئے ہیں۔ اردو نام دراصل عربی اصطلاحات کا لفظی ترجمہ ہے۔ مثلاً "عقرب (بچھو)، الغول (بھوت) وغیرہ (۲۱) اسی موضوع پر "مہ و انجم" مصنف مارٹن ڈیوڈسن مترجم ثنا الحق صدیقی، کراچی سے ۱۹۶۱ء میں طبع ہوئے۔ اس میں "فرہنگ اصطلاحات علم ہیئیات" ہی سے مدد لی گئی ہے۔ البتہ بعض اصطلاحیں انھوں نے خود بھی وضع کی ہیں۔ خود لکھتے ہیں۔ "اگر کسی اصطلاح کا ترجمہ مجھے کہیں سے بھی نہ مل سکا تو میں نے خود کوئی مناسب لفظ لکھ دیا۔" (۲۲) ان کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات میں چند قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں اضافتوں سے گریز ملتا ہے مثلاً دور بین نگاہ والے (LONG SIGHTED) سورج کا پہلو (LIMB OF SUN) وغیرہ۔

انجمن ترقی اردو، کراچی نے ۱۹۵۶ء میں محمد احمد حامی کی کتاب "ابتدائی جراثیمیات" شائع کی، جس کے صفحہ ۸۱ تا ۸۶ پر اصطلاحات کا اشاریہ دیا گیا ہے۔ کتابیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے انجمن ترقی اردو کی "فرہنگ اصطلاحات کیمیا" اور رسالہ "سائنس" شمارہ : ۲۵ میں شائع شدہ "فرہنگ اصطلاحاتِ حیاتیات" سے استفادہ کیا تھا۔)۲۳) ان کی مرتبہ اصطلاحات پر انجمن کا اثر زیادہ نظر آتا ہے مثلاً ACID کو "ترشہ" اور ACTIVITY کو "عاملیت"۔ تاہم بعض مقامات پر سائنٹفک سوسائٹی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں جیسے HEMICELLULOSE کے لیے "نیم سیلولوز" کی اصطلاحات انہی کے امتزاجی رجحان کا اظہار کرتی ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) نے ۱۹۴۲ء میں محشر عابدی کی کتاب "حیوانیات" شائع کی تھی۔ جس کے آخر میں ۲۳ صفحات میں شرح (GLOSSARY) کے نام سے اصطلاحات کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس میں مولف کے ذاتی رجحانات نظر آتے ہیں۔ ہوائی خانے (AIR SACS)، انسان نما بندر (ANTHROPAIDAE) خارش کا کیڑا (ITCH-INSECT) بے ریڑھ حیوان (INVERTEBRATE) بے خولی گھونگھا (SLUG) جیسی اصطلاحیں ان کی تخلیقی سطح کا اظہار کرتی ہیں البتہ بعض نباتیاتی اصطلاحات مثلاً انسپیکٹا، امیبا، اینی لیڈا، اینولیٹا، بریکیوپوڈا، ایفی میرا، پوری فیرا جیسے الفاظ بجنسہ استعمال کیے ہیں، جن کا ترجمہ باآسانی ہوسکتا تھا۔ (۲۴)

انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے ہارون خان شروانی کی کتاب "سیاسیات کے اصول" تین حصّوں میں شائع کی۔ حصّہ اوّل اور دوم ۱۹۵۲ء میں اور حصّہ سوم ۱۹۵۵ء میں۔ ہر جلد کے آخر میں گیارہ بارہ صفحات میں سیاسی اصطلاحات مرتّب کی گئی ہیں۔ ان میں بھی انجمن کے عمومی اصولوں کی جھلک ملتی ہے۔ یعنی فارسی، عربی کے ساتھ ہندی ترکیبیں سوراج، نراج، وغیرہ کا استعمال۔ لیکن علی گڑھ سے شائع ہونے والی دیگر کتب مثلاً "اطلاقی سماجیات" اور "انواع فلسفہ" میں عربی، فارسی کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔

انجمن کے اصطلاحی مجموعوں (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) کا بیشتر حصّہ اردو سائنس بورڈ لاہور کی "فرہنگ اصطلاحات" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خصوصاً "اصطلاحات جغرافیہ"، "ہیئت"، "بنکاری"، "فرہنگ اصطلاحات" (مختلف غیر مطبوعہ) ایک اندازے کے مطابق انجمن کا مرتّب کردہ یہ ذخیرہ ایک لاکھ سے زائد اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ (۲۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں اصطلاحات سازی اور اصطلاحات نگاری کے میدان میں انجمن نے خاطر خواہ خدمات انجام دی ہیں، جو بنیادی، دور رس اور قابلِ استفادہ ہیں۔ اردو اصطلاحات کی تاریخ میں انھیں تادیر یاد رکھا جائے گا۔

حواشی

(۱) بحوالہ: سید ہاشمی فرید آبادی ("پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو" کراچی: انجمن ترقی اردو (۱۹۵۳ء)، ص ص: ۱۱ تا ۱۳

(۲) ایضاً، ص ص: ۲۴ تا ۱۶ و ۲۰

(۳) ایضاً، ص ص: ۹۲، ۹۵، ۱۹۶، ۲۱۶

(۴) ایضاً، ص: ۲۳۳

(۵) ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ادارے مجلہ "علم وآگہی" خصوصی شمارہ، ۷۴-۱۹۷۳ء کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج، ص: ۲۳۶

(۶) ایوب صابر، "پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان (۱۹۸۵ء)، ص: ۵

(۷) سید ہاشمی فرید آبادی، محولہ بالا، ص: ۱۹

(۸) محولہ بالا، ص: ۲۷۱

(۹) ایضاً، ص: ۲۳

(۱۰) دیکھیے ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر "الہلال" کی تحریک اصطلاح سازی "اخبار اردو" اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۱ء ص ص: ۴۵ تا ۴۸

(۱۱) مقتدرہ قومی زبان، ہیئت حاکمہ کی رودادیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان (۱۹۸۷ء)، ص: ۴۹۴

(۱۲) مولوی محمد مرزا، انجمن ترقی اردو کا فرض "المعلم" حیدر آباد دکن جلد سوم، نمبر ۹، اردی بہشت ۱۳۳۶ف (مارچ ۱۹۲۶ء) ص: ۶ تا ۷

(۱۳) مولوی عبدالحق، محولہ بالا، ص ص: ۳۹ تا ۴۱ نیز اصول وضع اصطلاحات، "سائنس"، کراچی، جلد ۲۴ شمارہ ۲۵، ۱۹۵۳ء ص ص - ۱۱ تا ۱۲۰

(۱۴) انجمن ترقی اردو، فرہنگ اصطلاحات علمیہ، اورنگ آباد دکن، (۱۹۲۵ء) ص: ۳

(۱۵) ایضاً، ص ص: ۳ تا ۴

(۱۶) بشیر احمد، اصطلاحوں کی بناوٹ کا ترجمہ، "ہماری زبان" دہلی ۲۲ جولائی ۱۹۹۰ء ص: ۱

(۱۷) انجمن ترقی اردو فرہنگ اصطلاحات کیمیا (کراچی) ۱۹۵۴ء، دیباچہ از مولوی عبدالحق ص ص: IV تا VI

(۱۸) فلکیات، کراچی، ۱۹۴۹ء ص ص: ۱ تا ۳

(۱۹) انجمن ترقی اردو فرہنگ اصطلاحاتِ بنکاری، کراچی (۱۹۵۱ء) ص: XI

(۲۰) انجمن ترقی اردو فرہنگ اصطلاحات بنکاری، کراچی (۱۹۵۱ء) ص:

(۲۱) مرزا محمد رشید، سیر افلاک، کراچی (۱۹۵۲ء، ص: ۲۲۱

(۲۲) مارٹن ڈیوڈسن، مہ وانجم، کراچی (۱۹۶۱ء) حرف اوّل، ص: ۷

(۲۳) محمد احمد حامی، ابتدائی جراثیمیات، کراچی (۱۹۵۲ء) ص: ۸۰

(۲۴) محشر عابدی، حیوانیات، دہلی (۱۹۴۲ء) ص ص: ۱۲۸+۲۳

(۲۵) ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، اردو اصطلاحات سازی (کتابیات) اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۷۵ء، دیباچہ ص: ۹

قومی زبان (۱۷) جنوری ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر شمیم حنفی

ادیب کی ہماری شاعری

یہ چلن عام ہے کہ اپنی ادبی روایت کے پس منظر میں ادب کی تفہیم اور تنقید کا جائزہ لیتے وقت حالی، آزاد اور شبلی کے دور سے نکل کر ہم سیدھے ترقی پسند تحریک کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ تنقید میں امداد امام اثر، وحید الدّین سلیم، چکبست، دتاتریہ کیفی، سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، حامد حسن قادری، بجنوری، عظمت اللہ، ڈاکٹر زور، نیاز، مسعود حسن رضوی ادیب اور رشید احمد صدیقی کے انفرادی کارناموں کا کچھ تذکرہ تو ہو جاتا ہے۔ مگر ہم نے بیسویں صدی کے پہلے تیس پینتیس برسوں کو ادبی ثقافت کے ایک علاحدہ دور اور ایک منفرد منظر نامے کے طرز پر دیکھنے کی کوئی باقاعدہ کوشش آج تک کی ہی نہیں۔ اگر اس دور کو سمجھ بھی لیں تو تصوّرات کے سلسلے کی ایک نسبتاً کمزور اور غیر اہم کڑی کے طور پر۔ قطع نظر اس کے کہ یہ دور تنقید کے دو بڑے ادوار یعنی آزاد، حالی اور شبلی کے دور اور آل احمد سرور، احتشام حسین اور کلیم الدّین احمد کے دور میں تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس دور کی معنویت کے کچھ اور بھی پہلو ایسے ہیں جن پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ:

۱۔ اسی دور میں تحقیقی تنقید اور تخلیقی یا تاثراتی تنقید کے کچھ بہت اچھے نمونے سامنے آئے۔ ان کی نوعیت آزاد اور حالی کے عہد کی تنقیدوں سے مختلف تھی۔

۲۔ اس دور کی تنقید مجموعی طور پر ہر طرح کے نظریاتی تسلّط سے آزاد رہی۔

۳۔ اس دور میں ادب کی تفہیم اور تجزیے کا عمل ایک انفرادی سرگرمی کے طور پر زیادہ نمایاں ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی مذہب اور روایت کے سیاق میں بھی اس کی معنویت پہلے سے زیادہ روشن ہوئی۔

۴۔ اس دور میں تنقید لکھنے والوں کا کوئی حلقہ نہیں بنا ایک رومانیت کو چھوڑ کر کوئی اور ایسا تصوّر نظر نہیں آتا جسے مختلف نقادوں کے ایک حلقے میں قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل رہی ہو اور چونکہ رومانیت کے بنیادی رابطے شخصی اور انفرادی ہیں اس لیے اس دور کے رومانی نقادوں (مہدی افادی، سجاد انصاری، بجنوری، نیاز) کی شناخت کے پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔

۵۔ بعد کے زمانوں میں تنقید کے جو نظریات اور مکاتیب مقبول ہوئے ان میں سے اکثر کے ابتدائی نشانات اس دور کی تنقیدوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نفسیاتی تنقید، عملی تنقید، فلسفیانہ تنقید، جمالیاتی تنقید، تحقیقی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، عروضی اور کلاسیکی تنقید، تہذیبی اور سماجیاتی تنقید کی کئی ایسی مثالیں اس دور کی تنقیدوں میں ملتی ہیں جو ہمارے عہد کے مکاتب کی طرح متعین اور اختصاصی تو نہیں ہے لیکن بیسویں صدی کے پہلے تیس برسوں میں جن نقادوں نے شہرت پائی ان میں سے اکثر

مغربی اصول اور نظریات کی آگاہی بھی رکھتے تھے اور اپنی اصناف اور روایات پر ان نظریات کا اطلاق کر سکتے تھے۔

ایسی ہی کئی اور باتیں بھی اس دور کی تنقید کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ یہاں ان کی طرف اشارے کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ تنقیدی معیاروں، رویوں، خیالوں کی جیسی رنگا رنگی ہمیں اس صدی کے ابتدائی تین دہائیوں میں دکھائی دیتی ہیں، اس سے ایک خاصے کشادہ فکر، روادار اور متحرک ادبی کلچر کی تصویر ابھرتی ہے۔ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مجموعی تناظر کی وسعت کے باعث اس دور کے لکھنے والوں میں ایک ساتھ مکالمے کی کتنی بہت سی سطحیں موجود تھیں۔

ادب پڑھنے والے اور ادب کی تعبیر و تشریح کا مشغلہ اختیار کرنے والے زندگی کو چاہے ایک ہی زاویے سے دیکھتے رہے ہوں مگر ادب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے وہ بیک وقت کئی زاویوں سے کام لیتے تھے۔ معاشرہ منظم بہت تھا.... کہ نظامِ اقدار کم و بیش یکساں تھا اور اپنی معاشرت، اپنے ماضی، اپنے مجموعی تہذیبی اور علمی مقاصد کے سلسلے میں لوگ بالعموم ہم خیال تھے۔ اس دور کے نقادوں میں اختلاف تھا تو زبان و بیان کے معاملے میں ہر ایک کی اپنی ترجیحات اور انفرادی میلان اور مذاق کی بنیادوں پر۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کی باہمی چپقلش اور نوک جھونک اپنی جگہ پر، مگر تنقید لکھنے والوں کے یہاں مختلف قسم کے تجربوں سے انہماک آمیز شغف ایک جیسا تھا۔ تنقید اُن کے لیے ایک ذریعہ تھی ادب سے لطف اندوز ہونے کا اور چونکہ ادب کی تخلیق اور تعبیر اس عہد کی عام تہذیبی سرگرمی کا حصہ تھے اس لیے اپنی علمیت کو بھی وہ ادبی ذوق کی ترویج کا ایک واسطہ بناتے تھے۔ ان کی تنقیدیں علمی مباحث سے بوجھل نہیں ہوتی تھیں۔ اُن کے احساسات کی دنیا بھی اسی لیے بہت بھری پُری نظر آتی تھی۔

یہ ایک طرح کی بازیافت تھی اپنی سرگزشت کے ایک گم شدہ تجربے کی۔ بیسویں صدی کے اصلاحی میلانات نے ہماری اپنی روایت کے کئی عناصر اور بہت سی بنیادوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ پھر آزاد، حالی اور شبلی نے تنقید کو جس درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا اور سماجی و سائنسی علوم کی افادیت اور شعر و ادب پر اُن کے تفوق کا غلغلہ جس طور پر بلند ہوا تھا اس کے نتیجے میں ہمارا ادبی کلچر اپنی عوامی بنیادوں سے دھیرے دھیرے کچھ کٹتا جا رہا تھا۔ ادب کی فہم رکھنے والے بھی ادب کو کارِ بیکاراں قسم کی چیز سمجھنے لگے تھے۔

بیسویں صدی کے ساتھ خاص کر دوسری دہائی کے ختم ہوتے ہوتے عقلیت کا غرور ٹوٹنے لگا۔ خود ہمارے یہاں ادب کی مقصدیت اور افادیت کے تصور کو لوگ شک کی نظر سے دیکھنے لگے اور بیرونی اصولوں کی گرفت سے آزاد، خود مختار ادبی رویوں کی آباد کاری کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہوا۔ یہی دور صنفِ غزل کے احیا کا بھی ہے۔ اجتماعی ترقی اور تعمیر کے جوش میں کچھ باتیں جو بھلا دی گئی تھیں اب پھر سے دوہرائی جانے لگیں۔

"ہماری شاعری" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں چھپا۔ ادیب کی زندگی میں کل ملا کر اس کتاب کے بارہ ایڈیشن شائع ہوئے، آخری ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں۔ گویا کہ سینتیس (۳۷) برس کی مدت میں جس تواتر کے ساتھ "ہماری شاعری" کی مختلف اشاعتیں سامنے آئیں اس دور کی کوئی اور کتاب اس طرح کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکی۔ "ہماری شاعری" کا خیر مقدم ہر حلقے میں کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اسے مقدمہ شعر و شاعری کا تکملہ کہا۔ ڈاکٹر عابد حسین کے خیال میں "اس کتاب کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ذہنی آزادی کی اُس تحریک کا ایک اہم حصہ تھی جو ہمارے ملک میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے شروع ہو چکی تھی۔" غرض کہ اُس زمانے میں ہماری شاعری نے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد اردو تنقید کی سب سے فکر انگیز کتاب کی حیثیت اختیار کر لی۔ ادیب کے معاصرین میں اپنی وسعت مطالعہ، طباعی، بصیرت اور تجزیہ کاری کے لحاظ سے ممتاز اصحاب کی کمی

نہیں تھی۔ ان میں سے کئیوں کا ذکر ادبی تنقید کے سلسلے میں ادیب سے زیادہ عام ہے۔ (امداد امام اثر، عبدالسلام ندوی، عبدالحق، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی) مگر ادیب کا یہ امتیاز نمایاں اور بے مثل ہے کہ اس دور کے ادبی کلچر کی ترجمانی اور اس کلچر میں اپنی قبولیت کے لحاظ سے وہ سب میں آگے ہیں۔ اس صورت حال کے اسباب پر غور کیا جائے تو ایک ساتھ کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں:

آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کرنے والوں میں یہ ایک عام غلط فہمی رواج پا چکی ہے کہ مشرقی مزاج تجزیے کے عمل سے مناسبت نہیں رکھتا۔ کلیم الدین احمد تذکروں سے وہ کچھ طلب کر رہے تھے جو ان تک بیٹسن اور لیوس کے توسط سے پہنچا اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ تذکروں کے زمانی اور ذہنی سیاق کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے مشرقی شعور نقد کے بارے میں عمومی رائے انھوں نے قائم کی تھی، کم و بیش اُسی رائے کی روشنی میں انھوں نے اردو کی پوری تنقیدی روایت کا محاسبہ کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے بے شک مشرقی ذہن تجزیے سے زیادہ تحسین اور تاثر آفرینی کا عادی رہا ہے اور اُسے ایک مظہر کے مختلف عناصر کو الگ الگ کرنے سے زیادہ دلچسپی نہیں ایک دور سے مربوط کر کے دیکھنے میں رہی ہے، لیکن سنسکرت، عربی، فارسی شعریات میں ادب کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے جذباتی و نفسیاتی عوامل کا بہت گہرا تجزیہ بھی ملتا ہے ہماری شاعری میں ادیب نے بھی سرسری رائے زنی کے بجائے استدلال کا طریقہ اپنایا اور اپنے نکات زبان و بیان کے علاوہ مختلف انسانی جذبوں اور تجربوں کی منطق کے حوالے سے پیش کیے۔

ادیب نے استدلال کا جو طریقہ اور اسلوب اختیار کیا اس کی خوبی یہ ہے کہ ہمارے شعور کی اوپری پرتوں کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ ہمارے احساسات سے بھی قائم رہتا ہے ان کی تحریریں پڑھتے وقت سوچنے اور محسوس کرتے جانے کا عمل بیک وقت جاری رہتا ہے شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ تحقیقی اور علمی مسئلوں کے علاوہ ادیب کو انسانی جذبوں اور احساسات سے خاص دلچسپی تھی۔ اسٹیج اور ڈرامے پھر مراثی کی تحقیق و تنقید سے ان کے انہماک کے اسی رویے کا اظہار ہوتا ہے ہماری شاعری کے مباحث انسانی شعور کی کارکردگی اور ہمارے اجتماعی نظام جذبات کی نوعیت سے یکساں طور پر متعلق ہیں۔

مبہم تاثرات کا مفہوم متعین کرنے کی کوششیں حالی اور شبلی نے بھی کی تھیں حالی نے تہذیب کے بیرونی مظاہر کے پس منظر میں اور شبلی نے وجدانی تقاضوں اور تحریکات کے سیاق میں۔ مقدمہ شعر و شاعری، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم میں تاثر کی ایسی کئی صورتوں اور بصیرتوں کا اظہار ہوا ہے جنھیں اصطلاحوں میں ڈھالنا آسان نہیں۔ ادیب نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور شعر کی خوبیوں کے دو گروہ بنائے معنوی اور لفظی۔ اصلیت، سادگی، جوش کے ساتھ ساتھ انھوں نے بلند خیالی، باریکی، تڑپ کا مفہوم اور حسی و فکری دائرہ استدلال کی سطح پر بنانے کی جستجو کی چنانچہ اس واقعے کے باوجود کہ ادیب لفظوں کی ترتیب، قواعد، زبان، اصولِ بیان، تشبیہہ سازی کا خاصا پرانا اور روایتی تصوّر رکھتے تھے، ان کی تنقیدی تحریریں شعر کی فکری، حسی، جذباتی خوبیوں اور اس کے لسانی۔ اسلوبیاتی، صوتی اوصاف کا تجزیہ ایک ساتھ پیش کرتی ہیں۔

ادیب کے نزدیک:

> کامل شعر اُسے سمجھنا چاہیے جو عروضیوں کے نزدیک بھی شعر ہو اور منطقیوں کے نزدیک بھی یعنی جس پر عروض اور منطق دونوں تعریفیں صادق آئیں اس لیے کامل شعر کی تعریف یا شعر کی کامل تعریف یہ ہوگی کہ موزوں اور بااثر کلام کو شعر کہتے ہیں۔

(ہماری شاعری)

اور موزونیت کی تعریف یہ ہے کہ:

کلام ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے جن کو ادا کرتے وقت آواز میں ایک خوبصورت تسلسل یا ترنم پیدا ہو جائے اور جن میں باہم ایک لذت، ایک تناسب اور توازن ہو۔

(ہماری شاعری)

اس سلسلے میں ایک اور اقتباس پر نظر ڈالنا بھی کارآمد ہوگا شاعری کیا ہے؟ اس کی وضاحت ادیب نے ان لفظوں میں کی ہے کہ:

"شاعری جذبات کی ترجمانی ہے اور انسان کے گہرے جذبات فطرتاً موزونیت اور موسیقیت، کے ساتھ ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔"

گویا کہ ادیب نے تجربے، بیان اور آہنگ کو ایک اسرار آمیز وحدت کے ترکیبی اجزا کے طور پر دیکھا ہے سب سے گہرے جذبات وہ ہوتے ہیں جن کی تہہ میں افسردگی اور ملال، روپوش ہو اور یہ جذبات سب سے زیادہ مؤثر اُس صورت میں ہوتے ہیں جب شعر کہنے والا اپنے سے اضطراب کو ایک نغمے میں منتقل کر دے ادیب نے شعر کی داخلی ہیئت اور اس کی خارجی ہیئت کے امتزاج سے صورت پذیر ہونے والی اکائی پر توجہ دی ہے اسی لیے ان کا مجموعی رویہ شاعری کے فن کا روایتی تصور رکھنے والوں سے الگ اور نئی شعریات سے قریب تر ہو جاتا ہے۔

"ہماری شاعری" میں کچھ اور بھی ایسے نکتے زیر بحث آئے ہیں جن کا ذکر ادیب کے پیشرووں کے یہاں نہیں ملتا اور جن تک رسائی کی کوئی شہادت ہمیں ادیب کے کسی معاصر کی تحریر میں بھی نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر انگریزی شاعری اور مشرقی شاعری (اردو) کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ادیب نے لکھا تھا:

انگریزی شاعری کا عام موضوع ہے کائنات (نیچر) اور اس کا تعلق انسان سے۔ اردو شاعری کا عام موضوع ہے انسان اور اس کا تعلق اپنے بنی نوع اور خدا سے۔ دونوں کی منزلیں جدا جدا اور راستے الگ الگ ہیں پھر حالاتِ سفر کیوں کر یکساں ہو سکتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغرب کے متصوفانہ مزاج رکھنے والے دانشوروں کے ایک حلقے نے مشرقی اور مغربی روایت کی تفریق تقریباً اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر کی تھی۔ اس حلقے کی طرف سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ مغرب کو اپنی نجات کے لیے آئندہ مشرق کی دکھائی ہوئی یہی راہ اختیار کرنی ہوگی اور یہ کہ آنے والے زمانوں کے ادب کا بنیادی مسئلہ انسان اور ایک مابعدالطبعیاتی غیبی طاقت کے رابطوں پر مبنی ہوگا یہ بحث نہ بنیادی طور پر فلسفے اور سرّیات کا ہے یہاں اس کی طرف اشارہ یوں ضروری تھا کہ ادیب کی فکر میں مغرب اور مشرق کو دو متوازی میلانات اور جذبہ واحساس سے دو مختلف نظاموں کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی ایک واضح کوشش نظر آتی ہے اس سلسلے میں انھوں نے فلسفے اور علوم کی اصطلاحوں کے بغیر براہِ راست انداز میں اور عام انسانی سطح پر دو تہذیبوں اور ان تہذیبوں سے وابستہ دو ادبی روایتوں کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے "ہماری شاعری" اس لیے ایک ہمہ گیر ثقافتی تناظر اختیار کر لیتی ہے اور اس کتاب کا مطالعہ محض ادبی تنقید کا مطالعہ نہیں رہ جاتا۔

ادیب کے مجموعی ادبی کارناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں جذبات کے کلچر کی تفہیم و تعبیر سے خاص دلچسپی تھی۔ داخلی شاعری کی سمجھ کے معاملے میں بھی وہ اپنے زمانے بالخصوص لکھنؤ اسکول کی روایت کے عام شارحین سے بہت آگے تھے۔ ادیب اس رمز سے آگاہ تھے کہ انسانی ذہن کی اعلیٰ تر صلاحیتوں اور تقاضوں کی نوعیت اصلاً لفظ اور بیان سے آگے کی چیز ہے۔ حسن بیان حسن خیال کے بغیر کسی دور رس اور پائیدار نتیجے تک نہیں پہنچتا۔

دنیا میں جو کچھ رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے اگر خوشی، غم، محبت، عداوت، نفرت، خوف، ہمدردی وغیرہ یہ سب جذبے ناپید ہو جائیں تو دنیا میں ایک سناٹا چھا جائے۔

شاعری جس کا مقصد ہی جذبات کا اظہار اور احساسات کا اشتعال ہے، اس کے لیے پیرایۂ نظر کا فطری ہونا کسی دلیل اور بحث کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔

اس نوع کے نکتہ آفریں بیانات "ہماری شاعری" میں جا بجا ملتے ہیں اس ضمن میں ادیب کی بصیرت اور طریق استدلال کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ اگرچہ ہماری شاعری بہتوں کے نزدیک جواب آں غزل (مقدمۂ شعر و شاعری) کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ادیب کا لہجہ کہیں بھی مناظراتی یا جارحانہ نہیں ہے مشرق و مغرب کے میلانات کا تقابل بھی وہ صرف انھی اصولوں اور افکار کے حوالے سے کرتے ہیں جو مشرق سے یا مغرب سے مخصوص ہوں۔ ادیب کے یہاں یہ شعور بھی ملتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے ادبی معیار اور تنقیدی تصورات کا بہت ساحصّہ نسل انسانی کے دماغ اور اس کے عمل سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس پر غور و فکر بھی عام انسانی سطح پر کی جانی چاہیے اور ہر مسئلے کو مشرق و مغرب کی آویزش میں الجھانا درست نہ ہوگا۔

اسی متوازن، ہمہ گیر اور شعریات کے بنیادی ضابطوں سے نسبت رکھنے والے رویے نے ادیب کے مقدمات کو ہر ادبی حلقے کے لیے لائق توجہ بنایا۔ جدید اور قدیم یا دلی اور لکھنؤ کے تنازعے سے اوپر اٹھ کر ہماری شاعری کے حقیقی موقف کو سمجھنے کی جیسی کوششیں سامنے آئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادیب اس کتاب کے واسطے سے تنقید کا ایک اساسی فریضہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ یہ فریضہ ہے تنقید کے ذمہ ادبی ذوق کی تربیت اور اپنے معاشرے میں ایک آزادانہ ادبی شعور کو عام کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری کو حالی کی تنقید کے جواب سے زیادہ اس کے تکملے کی صورت میں قبول کیا گیا۔ اس کتاب کے کم سے کم دس ایڈیشن اُس دور میں شائع ہوئے جسے روایتی تصورات سے رہائی اور ایک نئی بوطیقا کی تلاش کا دور کہنا چاہیے یعنی ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۴ء کے عرصے میں۔ یہ ترمیلانات سے قطع نظر ترقی پسند تحریک کے عہد عروج میں بھی یہ کتاب عام ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ یہ واقعہ قدرے حیران کن ہے کیوں کہ ادیب کے ذہنی اور جمالیاتی رویے ترقی پسندی کے معیار سے مختلف ہی نہیں، منحرف بھی تھے لیکن جیسا کہ یہاں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہماری شاعری تنقید کے اوّلیں اور بنیادی فریضے کی کماحقہ، ادائیگی کے باعث بحث طلب ہونے کے باوجود متنازعہ نہیں سمجھی گئی اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے ادیب نے لکھا تھا:

> شعر کا صحیح ذوق، سخن فہمی کا ملکہ اور نقدِ شعر کی قوت پیدا کرنا، اور اردو شاعری کا روشن رخ نمایاں کر کے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہوں میں اُس کا وقار قائم کرنا اس تصنیف کے اہم مقاصد ہیں۔
>
> (ہماری شاعری)

یب کو غالباً خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ ہماری شاعری نہ تو کسی طرح کا بیان صفائی ہے نہ مغربی روایت پر مشرق کی، ادبی

روایت کی برتری کا کوئی دعویٰ۔ بے شک، اس کے بہت سے حصے اردو کی کلاسیکی شاعری سے وابستہ تصورات کی وضاحت پر مشتمل ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ ادیب نے اپنے بہت سے مقدمات کو مشرق و مغرب کے بحث سے بالاتر بھی رکھا ہے۔ چنانچہ ہماری شاعری کا انتساب انھوں نے اسٹی ولسن، سعدی اور محمد حسین آزاد کے نام کیا ہے جو تین مختلف ادبی روایتوں کے ترجمان ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وضاحتی اور امتزاجی تنقید کے اس اعلیٰ نمونے کے طور پر "ہماری شاعری" کی اہمیت سے قطع نظر، اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی برقرار رہے گی کہ اردو تنقید کی تاریخ میں انسانی حواس اور جذبات کے تماشے کا احاطہ کرنے والی یہ پہلی اہم کتاب ہے جس نے اپنے معروضات کا حوالہ بھی اردو شاعری کو ہی بنایا۔ شبلی کی شعر العجم ظاہر ہے کہ اپنے موضوع کے باعث اس قصے سے الگ ہو جاتی ہے اور حالی کے مقدمے میں غیر ادبی مقاصد کا جبر اس درجہ حاوی ہے کہ ان میں اپنی روایت کے معروضی مطالعہ کی صلاحیت دب کر رہ جاتی ہے۔ حالی اردو کے سب سے بڑے نقاد تھے، لیکن اپنے کام کا کچھ حصہ وہ آنے والے زمانوں کے لیے چھوڑ گئے تھے اس کی طرف پہلا موثر قدم ادیب نے اٹھایا۔ چنانچہ ہماری شاعری کے تاریخی رول کی اہمیت بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی

تخلیقی تحریر کے اوصاف

کسی بھی فن پارے کی تعریف و تنقید کے وقت ہم اس مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں کہ تحریر کو تخلیق کہا جائے یا نہیں۔ عام طور سے ہمارے ذہنوں میں تخلیق کے اوصاف کے بارے میں کوئی صاف تصور نہیں ہوتا۔ ہم شاعری اور فکشن کو تخلیق کہتے ہیں اور دوسری تحریروں کو تصنیف۔ اگر فکشن یا شاعری میں کوئی تعمیری یا ترمیمی عمل تخلیق سے پہلے یا بعد ہوتا ہے تو اُسے خالص تخلیق کو داغ دار کرنے کا عمل سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تخلیق اور تعمیر کا فرق متعیّن کرنا ایک مشکل عمل ہے اور ہمارے پاس اس کے کوئی اصول نہیں ہوتے۔

جدید ادب میں سب سے پہلے تخلیقی تحریر کے خدوخال متعیّن کرنے کے بارے میں غور کیا گیا۔ جدید تر ادب یا ساختیات نے تقریباً ہر طرح کی تحریر کو ایک ہی زمرے میں رکھا اور ادب میں صنفیں متعین کرنے سے بھی انکار کیا۔ سرریلیوں نے خود حرکی تحریر کا نظریہ پیش کیا جس میں ارادے یا ارادی تعمیر کو کوئی دخل نہیں تھا۔ فکشن اور شاعری دونوں کو تخلیقی ادب کہا گیا کیوں کہ دونوں میں سمبلز، علامتوں اور تجرید کے استعمال نے انھیں خالص ادب بنا دیا اور واقعہ نگاری (REALISM) سے الگ کر دیا۔ کچھ ادیبوں نے فکشن کو شاعری کی طرح تخلیقی ادب ماننے سے انکار کیا۔ شروع ہی سے شاعری کو الہام والقاء کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا اور فکشن کا تصور تخلیقی الفاظ کے باوجود واقعات نگاری کا تھا اس لیے فکشن اور شاعری کو بریکٹ کرنا مشکل تھا۔ ساختیاتی فکر نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ کوئی تحریر ان معنی میں تخلیقی نہیں ہوتی کہ وہ بالکل نئی ہو اس لیے کہ کچھ بھی بالکل نیا نہیں ہوتا۔ ساری تحریریں پہلے سے لکھی ہوئی تحریروں کے بیچ سے نکالی جاتی ہیں اور سب پیداوار ہوتی ہے۔ ایک امریکی نقاد جینی پیریسیئر پلاٹل (JEANINE PARISIER PLOTTEL) لکھتا ہے۔

> "ایک تخلیقی رائٹر پیدا کرنے والا (PRODUCTIVE) رائٹر ہوتا ہے۔ اُس میں ایسی چیز پیدا کرنے کی قوت ہوتی ہے جو نہ نقالی ہو اور نہ تالیف۔ اور اگر ایسا ہے تو ناول نگار اور نقاد دونوں تخلیق کار ہیں۔ ادب، آرٹ، میوزک اور سائنس میں یہاں تک کہ ہر جگہ جہاں زندگی کے آثار ہیں، ہر عمل اور ہر متن دوسرے عمل اور متن سے مل کر پیدا ہوتا ہے..... ہر تحریر ایک ہی طرح کی ہوتی ہے، چاہے وہ تنقید ہو یا غیر

تنقید اور دونوں کا ماخذ ایک ہی ہوتا ہے یعنی نشانیات وضع کرنا جس سے الفاظ اور آوازیں واضح طور پر ریکارڈ کی جاسکیں۔"

اس طرح جدید تر ساختیاتی فکر نے "تخلیق" کے جدید اصطلاحی معنی کو بدل کر پیداوار کر دیا جس سے تخلیق کے NOTHINGNESS سے وجود میں آنے کا تصور تو نہیں رہا اور اس میں تحقیق و تعمیر کا دخل ظاہراً طور پر زیادہ ہوگیا، لیکن اس پیداواری عمل کے اور بھی مضمرات ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

مغرب کے ایک نقاد روبن سیکلٹن نے ایک شاعر کے شعر کہنے کے عمل کو دو اسٹیجز میں تقسیم کیا ہے۔ اُس کے مطابق شروع شروع میں شاعر تمثال اور اُس کے اظہار کے لیے علامتیں ارادی طور پر وضع کر کے اپنے اشعار میں شامل کرتا ہے، لیکن جب وہ وژن یا رویا یا وجدان کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو تمثال اور سمبلز غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر اُس کے اشعار میں شامل ہونے لگتی ہیں۔ اس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا سفر تعمیر سے شروع ہو کر تخلیق پر ختم ہوتا ہے۔

ہمارے دور کے اکثر رائٹرز جن میں زیادہ تر حقیقت نگاری یا صحافت سے وابستہ ہوتے ہیں واقعات و حادثات کے "تخلیق نو" کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے جس طرح ڈرامے کو نقالی یا (MIMESIS) کہتے ہیں کیوں کہ اُس کے واقعات اور کردار اصل واقعات اور کردار کی نمائندگی (REPRESENTATION) کرتے ہیں۔ اگر "تخلیق نو" کی اس اصطلاح پر غور کیا جائے تو تخلیق کے معنی جدّت یا اوریجنیلیٹی کے بجائے، نقالی اور تکرار کے رہ جاتے ہیں۔

"تخلیق" کا مترادف انگریزی لفظ "CREATE" ہے اور عام استعمال میں اس لفظ کے سطحی معنی لیے جاتے ہیں مثلاً
"CREATE FAVOURABLE CONDITIONS" "CREATE VACANCY" "CREATE INTEREST"

وغیرہ اور اس طرح "تخلیق" کے معنی اجاگر کرنے، تعین کرنے اور وضع کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن آرٹ اور ادب میں ہم "تخلیق" کے معنی کچھ اور لیتے ہیں۔ یعنی "وجود میں لانے" یا تخیل (IMAGINATION) سے پیدا کرنے کو "تخلیق" کہتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی فن پارے میں اوریجنلٹی ہو تو وہ تخلیقی تحریر ہوتی ہے۔ اور اس طرح تخلیقی تحریر ایجاد کے قریب آجاتی ہے۔ کسی بھی ایجاد میں یہ ضروری نہیں کہ اُس کی بنیاد، اُس کی پروسیس اور اُس کا میٹیریل سب کچھ نیا ہو۔ تجربہ گاہ میں کسی نئے وائرس اور اُس سے پیدا ہونے والے مرض کے بارے میں تجربہ کے بعد معلومات حاصل ہوں تو وہ دریافت ہوگی اور اُس مرض کو ختم کرنے کے لیے جو دوا یا انجکشن بنے گا وہ ایجاد کے زمرے میں آئے گا ادب میں بھی تحقیق اور دریافت کے بعد ایسی تحریر وجود میں آسکتی ہے جس میں اوریجنیلیٹی ہو اور وہ تصنیف و تالیف ہوتے ہوئے بھی تخلیقی تحریر ہوسکتی ہے مثلاً مولانا حالی نے کچھ مغربی اصولوں کی دریافت اور اطلاق کے بعد اردو ادب میں نئی سائنٹیفک تنقید کی بنیاد ڈالی۔ ان کی تحریر کو ہم یقیناً تخلیقی تحریر کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ اُٹھایا جاسکتا ہے کہ پہلے سے موجود مواد پر ایجاد کی بنیاد ہے تو کیا ادبی تحریر بھی پہلے سے موجود مواد کو منظم کر کے، تعمیر کے عمل سے گزار کر اور نئی باتیں پیدا کر کے تخلیق ہوسکتی ہے؟

ساختیات کے مطابق اس کا جواب "ہاں" ہوگا لیکن جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ تخلیق صرف NOTHINGNESS سے وجود میں آسکتی ہے اور اُس کے لیے پہلے سے دیے ہوئے مواد پر انحصار نہیں کرنا چاہیے وہ ایجاد کو یا پہلے سے دیے ہوئے مواد میں نئی بات پیدا کرنے کو تخلیق نہیں کہیں گے بلکہ اُسے دریافت اور تعمیر و توسیع کے زمرے میں لائیں گے۔ ہم اس مضمون

میں آگے چل کر بتائیں گے کہ کس طرح تخلیق کے لیے پہلے سے موجود مواد کا نہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

شاعری میں ایک پرانی اصطلاح "آمد" و "آورد" کی ہے جو تقریباً تخلیق اور تعمیر کے مترادف ہوتی ہے۔ آمدِ وژن کی پیداوار ہوتی ہے۔ روائتی غزل میں عنوان نہیں ہوتا اور ہر شعر ایک خیال کو پیش کرتا ہے اور مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے غزل میں "آمد" کی گنجائش بہت ہوتی ہے لیکن ارادی طور پر متعین کیے ہوئے اصول یعنی بحر، قافیہ اور "الفاظ و ترکیب کے معائب و نقسائص سے بچنے کی کوشش "آورد کو دعوت دیتی ہے۔ کہنہ مشق شاعروں میں جو زبان کے استعمال پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں یا جو معائب سے بچنے کے اصولوں کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے، اور وجدان کے اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں شاید آمد ہی آمد ہو، لیکن آورد کی دخل اندازی ناممکن نہیں ہوتی۔ آمد کا ایک اور مطلب لیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ آمد صرف MOOD یا INTENTIONALITY سے متعلق ہے۔ موڈ کی اصطلاح تو پرانی ہے لیکن "INTENTIONALITY" کی اصطلاح نئی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر پر شاعری کرنے کا موڈ طاری ہو اور وہ شعر کہنے پر ذہنی طور پر تیار ہو۔ اگر آمد کا مطلب صرف شعر کہنے کا موڈ ہے تو دراصل شاعری کے تخلیقی یا تعمیری ہونے میں آمد کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن بہت سے شاعر آمد میں موڈ اور اُس کے بعد کہے ہوئے اشعار کو بھی شامل کرتے ہیں۔ مسلسل یا ایک موڈ کی غزل میں ایک ہی خیال یا تجربہ کا پہلو تمام اشعار میں ہوتا ہے ایسی غزل نظم سے بہت قریب ہوتی ہے اور اگر اس کا عنوان متعین کر دیا جائے تو نظم ہی کے زمرے میں آجاتی ہے حالانکہ اس کی ہیئت میں غزل کے روایتی قواعد کار فرما ہوتے ہیں اور اگر اس نظریہ کو قبول کیا جائے کہ غزل کی ابتدا قصیدے کی تشبیب ہے جس طرح جاپانی ہائیکو کی ابتدا تونکا کے پہلے تین مصرعے ہیں تو غزل مسلسل ہی اس صنف کا اوّلین فن قرار پائے گی۔ ایک بات اور قابلِ توجہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو روائتی غزل میں عشق، وصال، ہجر، ظالم، مظلوم، امید، یاس سب ایک ہی موڈ یا خیال کی کڑیاں ہوتی ہیں۔ ہاں اگر غزل میں عشق و محبت کے علاوہ دوسرے موضوعات شامل ہوں مثلاً غمِ روزگار، زندگی کی تلخیاں، معشوق کے علاوہ دوسرے دشمنوں کا گِلا مثلاً جو پیشہ ورانہ حسد رکھتے ہیں، طنز، تقدیر کا گِلا، فطرت اور واقعیت نگاری، وغیرہ تو اُس میں مختلف طرح کے خیالات و تلازمات، تصورات، واقعات، امکانات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسی غزل میں آمد بھی ہو سکتی ہے اور آورد بھی۔ آمد غیر ارادی اور آورد ارادی عنصر ہوتا ہے۔

ارادی اور غیر ارادی کی اصطلاحات شعوری اور غیر شعوری کی جگہ اس لیے استعمال کی گئی ہیں کہ شعوری اور غیر شعوری غلط العام ہے۔ شعور کا ہر تحریر میں شامل ہونا ضروری ہے۔ غیر شعوری کیفیت میں کوئی تحریر وجود میں نہیں آسکتی ہاں تحریر ارادی اور غیر ارادی ہو سکتی ہے ارادی تحریر میں تعمیر کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور غیر ارادی میں عفویت یا القا کا۔ غیر شعوری حالت صرف اُس کو کہہ سکتے ہیں جس میں "تحت الشعور" یا "لاشعور" فعّال ہو۔ یہ خواب، وجدان، سرسام اور سکران کی صورت میں ممکن ہے اور اس میں ریشنیلٹی یا منطق بالکل "دخل انداز" نہیں ہوتے۔ کلام یا پیرول ممکن ہے مگر تحریر ممکن نہیں، ہاں ایسی کیفیت گزر جانے کے بعد خود اس حالت سے گزرنے والا اگر کچھ یاد کر سکے یا وجدان، سرسام اور سکران کی حالت میں کوئی دوسرا متکلم کی گفتگو ضبط تحریر میں لاسکے تو وہ تحریر بڑی حد تک تخلیق کے زمرہ میں آجاتی ہے لیکن اس کی معنویت کا متکلم یا خواب دیکھنے والے سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا۔ وہ صرف ایک میڈیم ہوتا ہے۔ اس بحث سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسی تحریر جس میں ارادے، مقصد، موضوع، منطق یا کرونولوجی کے تسلسل کے اصول کی پابندی نہ ہو۔ تخلیقی تحریر کہلائے گی مگر ہم آگے دیکھیں گے کہ تخلیقی تحریر میں یہ اوصاف اُس کی تخلیقیت کو مکمل نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے کچھ اور عوامل ضروری ہیں لیکن اس سے پہلے تخلیقی

اور تعمیری تحریری فرق کو اور واضح کرنا ضروری ہے۔ ہم یہ سب جانتے ہیں کہ جس تحریر میں مقصد، افادیت، ارادے، اور موضوع کے حدود کے عنصر شامل ہوں گے وہ تعمیری ہوگی۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ فکشن نگاری یا شاعری کے دوران داخلیت کی رَو شاعر یا فکشن نگار کو اصل موضوع سے ہٹا دے اور وہ کہانی یا نظم ختم کرنے کے بعد یہ محسوس کرے کہ اس کا عنوان وہ نہیں جو پہلے سے متعین کیا گیا تھا اور جس کی جانب تحریر کا رخ تھا۔ تو کیا ایسی حالت میں تحریر تخلیقی ہو جائے گی؟ اگر غور کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید ایسی تحریر یا شاعری کے کچھ حصے تخلیقی ہو سکیں مگر متن کی مجموعی حیثیت تعمیری ہوگی۔ ساختیاتی فکر کے مطابق اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر سگنیفائڈ کا تعین پہلے کر لیا گیا اور سگنیفائرز کو سیگنیفائڈ کے مطابق وضع کیا گیا تو تحریر تخلیقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ساختیات ہی کے حوالے سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ساختیات میں تو تخلیق ہوتی ہی نہیں اس لیے کہ سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا ہوتا ہے اور بعد والے صرف پیدا یا پروڈیوس کرتے ہیں۔

ساختیاتی فکر میں تحریر لکھتی ہے، لکھنے والا نہیں۔ تحریر پروڈکشن ہوتی ہے اور قاری کنزیومر، تو کیا پیدا کرنے کا عمل تخلیق نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو اُس میں کون سا ایسا عنصر ہے جو اُسے دوسری پیداوار سے الگ کرتا ہے؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اگر تحریر میں موضوع اور مقصد یا سگنیفائڈ کا تعین پہلے ہو جائے اور سگنیفائرز سگنیفائڈ کے لیے وضع کیے جائیں تو تحریر تخلیقی نہیں ہوتی مگر اُسے پیداوار تو کہہ سکتے ہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ہمیں ساختیاتی فکر کے ایک پائیونیر رولاں بارت کے اس اصول کا حوالہ دینا پڑے گا جس کے تحت لکھنے والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے .... اکروین (ECRIVAIN) اور اکریونت (ECRIVANT) ۔ ECRIVAIN کسی مقصد کے تحت نہیں لکھتا۔ وہ لکھتے وقت سگنیفائڈ کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ وہ کائنات کے بارے میں بھی نہیں سوچتا، وہ کائنات تشکیل کرتا ہے۔ اُس کے لیے لکھنے کا فعل غیر مستعدی یا INTRANSITIVE VERB ہوتا ہے ایسی تحریر کو بارت نے رائٹرلی (WRITERLY) تحریر کیا اور اکریونت کی تحریر کو READERLY کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ WRITERLY تحریریں تخلیقی تحریر کے اوصاف پر پوری اُترتی ہیں۔ لیکن اگر سب کچھ پروڈکشن ہے اور اکریوین کے یہاں اوریجنیلیٹی نہیں ہے تو ہمیں WRITERLY تحریروں کو تخلیقی کہنے میں تامّل ہوتا ہے اور بارت کے یہاں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بارت کے اس قول سے کہ سب کچھ پہلے سے لکھا ہوتا ہے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر وزیر آغا نے جوناتھن کلر اور ٹرنس ہاک کے حوالے سے یہ نتیجہ نکالا کہ بارت کا مطلب صرف "شعریات" سے تھا یعنی یہ "شعریات" پہلے متعین ہوتی ہیں اور ہر فن پارہ اُن "شعریات" کے مطابق ہوتا ہے ورنہ تخلیقی عمل رک جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا پروڈکشن یا پیداوار کو تخلیق سے الگ نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ رولاں بارت کا مطلب صرف "شعریات" سے نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ کوئی فن پارہ خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ اگلوں نے لکھا ہے ہر فن پارہ اسی پر اضافہ ہے۔ کوئی فن پارہ اپنے ثقافتی نظام اور ادبی نظام سے باہر آج تک نہیں لکھا گیا اور نہ لکھا جا سکتا ہے اور اگلوں کے لکھے ہوؤں میں شعریات، ادبی نظام سبھی شامل ہوتے ہیں جناب شمس الرحمٰن فاروقی اس معاملے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکروین (ECRIVAIN) کی تحریر میں تخلیقی اوصاف ہوتے ہیں لیکن اکروینت کی تحریر تخلیقی نہیں ہوتی۔

روسی فارملزم یا ہیئت پسندوں کا نظریہ اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے حل کرتا ہے۔ اُن کے مطابق تخلیقی فن پارے میں شعری زبان (POETIC LANGUAGE) ہوتی ہے اور دوسری تحریروں میں معمولی زبان ORDINARY

LANGUAGE شعری زبان تحریر میں OSTERNENE یا اجنبیت پیدا کرتی ہے اور وہی تخلیقی تحریر ہوتی ہے اگر روسی ہیئت پسندوں کی بات مان لی جائے تو اسلوب ہی سب کچھ ہوتا ہے یعنی زبان اور الفاظ کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے؟ کیا زبان کو ایسی کھڑکی بنایا گیا جس میں سے دنیا کو دیکھا جاسکے؟ اگر ایسا ہے تو تحریر تخلیقی نہیں ہے لیکن اگر شعری زبان اور اجنبیت عنصر موجود ہے تو وہ تخلیقی تحریر ہے۔ اب یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا نثر میں بھی شعری زبان استعمال کی جاسکتی ہے۔ اگر نہیں تو کم سے کم افسانے اور فکشن کو تخلیقی تحریر کے دائرے سے خارج کرنا ہوگا۔

ژاں پال سارتر نے نثر کو خیال کا ذریعہ (VEHICLE FOR THOUGHT) کہا تھا اور شعری زبان کو "کچھ اور" کہا تھا۔ ژاں پال سارتر کی زیادہ تر نثری تحریریں مقصدی ہیں کیوں کہ اُن کو اُس نے اپنے نظریات کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اس میں اُس کی ارادی اور شعوری جہت نمایاں تھی۔ لیکن کئی کلاسیکی، جدید اور ساختیاتی ادیبوں نے نثر اور نظم میں بہت کم فرق سمجھا ہے۔ کولرج نے کہا تھا کہ نثر نگاری الفاظ کو بہترین طور سے استعمال کرنا ہے اور شاعری بہترین الفاظ کو بہترین طور پر۔ یعنی اگر نثر میں بھی بہترین الفاظ بہترین طور پر استعمال ہوں تو اس کی زبان بھی شاعرانہ ہوتی ہے۔ ورڈس ورتھ نے کہا تھا کہ "بہت سی پیچیدگیاں تنقید میں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ شاعری اور نثر کو ایک دوسرے کی ضد کہا جاتا ہے برخلاف اس فلسفیانہ نقطۂ نظر کے کہ شاعری واقعیت یا سائنس کی ضد ہے۔" سیسل ڈے لیوس (CECIL DAY LEWIS) نے کہا تھا کہ "شعری ناول اور بیانیہ شاعری میں فرق صرف فارم کا ہے۔" جین تباد یو (JEAN THIBAUDEAU) کہتا ہے "ناول اور نظم میں صرف طوالت کا فرق ہے۔ نظم ایک صفحہ کی ہوتی ہے اور ناول ایک والیوم کا۔" اس لیے اگر نثری تخلیق میں جس میں فکشن شامل ہے شعری زبان استعمال کی جائے، یا فلابیر کے تتبع میں بہترین الفاظ بہترین طور پر استعمال کیے جائیں تو فکشن اور شاعری دونوں تخلیقی تحریر کے زمرے میں آجائیں گے۔

تخلیقی تحریر کی ایک اور مثال "تخلیقیت" کی تحریک میں شامل شعرا میں ملتی ہے۔ تخلیقی تحریر کے تمام اوصاف کو سمجھنے کے لیے اس تحریک کے بارے میں کچھ جاننا ضروری ہے۔ یہ تحریک ۱۹۱۶ء کے لگ بھگ پیرس میں شروع ہوئی تھی یہ CREACIONIS تخلیقیت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کا دائرہ ہسپانیہ اور لیٹن امریکہ کے ہسپانوی زبان بولنے والوں تک پھیلا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا بانی فرانسیسی شاعر پیر رورڈی (PIERRE REVERDY) تھا لیکن یہ زیادہ تر ریاست چلی کے شاعر ونسنٹ ہودوبرو (VINCENT HOIDOBRO) کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ اُسی نے اس کا مینیفسٹو تیار کیا تھا۔ اس کا اثر اس دور کے AVANT GARDE شعرا پر بہت زیادہ تھا۔ تخلیقیت پسندوں کا خیال تھا کہ شاعر اپنی کائنات خود تخلیق کرتا ہے ایسی کائنات جو فطری کائنات سے ماورا ہو۔ وہ اپنی شاعری میں غیر مانوس تمثال اور علامتیں بروئے کار لاتے تھے اُن کی تجریدی شاعری سمبالسٹ تحریک کے زعما سے بھی آگے تھی۔ اُسی دور میں ارجن ٹائنا میں جدید لکھنے والوں کی ایک تحریک ULITRAISTA کے نام سے شروع ہوئی تھی جس کا پیونیر مشہور فکشن نگار جورج بورخے (JORG LUIS BORGES) تھا۔ تخلیقیت پسندوں کا خیال تھا کہ خالص ادب وہی ہے جو خیالی دنیا کا تصور پیش کرے۔ یہ تحریک زیادہ دیرپا نہ تھی لیکن اس نے تخلیقی ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے اردو ادب میں بھی تخلیقیت شناسی پر نظام صدیقی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مضامین لکھے تھے۔ ان کے یہاں بھی بنیادی بات یہی تھی کہ تحریروں میں خالص ادب اور اور بجنیلٹی تخلیقیت کی پہچان ہیں مگر تخلیقیت بہت کم ہوتی ہے اس موضوع پر نظام صدیقی کی تحریریں راقم الحروف کے مطالعہ میں بہت کم آئیں ورنہ یہ پتہ چلتا کہ

اردو ادب میں تخلیقی تحریر کے متعین کرنے میں کن عناصر پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے پتہ ضرور چلتا ہے کہ اردو ادب میں "تخلیقیت" کے اہم اصولوں کا تعارف ہو چکا ہے۔

آسمانی کتابوں کے حوالے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "کُن" (BE) سے دنیا تخلیق ہوئی ہے اور خالقِ حقیقی نے اسے دیکھ کر اس کے حُسن کی تعریف کی۔ خلیفہ یا انسان کی تخلیق ایک ارادی عمل تھا جس میں ڈیزائن بنایا گیا اور پھر اُس میں روح پھونکی گئی۔ پھر آدم کی تعمیر ہوئی، لیکن "کُن" اور تعمیر انسانی دونوں کو تخلیق کہا گیا گویا عمل تخلیقی ہو یا تعمیری ناموجود سے وجود میں آنا ہی تخلیق ٹھہری۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تخلیق ہو یا تعمیر دونوں تخلیق کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ تحریر بالکل نئی اور اوریجنل ہو۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی تحریر ان معنی میں اوریجنل ہوتی ہے کہ اس میں ارادے کا بالکل دخل نہ ہو۔ یہاں ہمیں زور پولے (GEORGE POULET) کی تھیوری کا حوالہ دینا پڑے گا جس کا ذکر اُس کی کتاب "قرأت کی مظہریات" (PHENOMENOLOGY OF READING) میں ہے۔ پولے کہتا ہے کہ "منشائیت (INTENTIONALITY) ہر تحریر میں ہوتی ہے۔ مگر یہ "منشائیت" یا ارادہ کیا ہوتا ہے اسے بھی پولے نے خود ہی واضح کیا ہے۔ پولے کے مطابق منشائیت سے مراد مصنف یا خالق کا ارادہ نہیں بلکہ اس عمل کی ساخت ہے جس کی رو سے شعور کسی شے کا ادراک یا تصور کرتا ہے اور وہ چیز وجود پاتی ہے۔ ادراک کا فلسفہ بھی یہی ہے جسے کوانٹم فزکس کی تھیوری نے بھی ثابت کیا ہے۔ حالانکہ ہم اپنے عقیدے کی وجہ سے خالقِ حقیقی کے شعور اور ادراک پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ ان سب سے ماورا ہے لیکن تشبیہہ و تمثیل کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "کُن" میں بھی خالقِ حقیقی کی "منشائیت" یا شعور و ادراک شامل تھے اور یہ کائنات کے مجتمع ہونے اور ظہور پذیر ہونے کی دلیل ہے۔ صرف عمل میں فرق رہ جاتا ہے۔ یعنی "کُن" کی "منشائیت" اور تخلیق آدم کی "منشائیت" میں عمل کا فرق تھا جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریروں میں اسلوب کا فرق ہوتا ہے۔

عام طور سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیق کے وجود میں آنے کے بعد تخلیقی عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ایک غزل کہنے کے بعد یا ایک افسانہ یا ناول لکھنے کے بعد تخلیق کار کا کام بظاہر ختم ضرور ہو جاتا ہے لیکن تخلیقی عمل نہیں رکتا۔ خالقِ حقیقی کے "کُن" کے بعد بھی اور انسانی تخلیق کے بعد بھی یہ عمل تغیر تبدل، تطور و ارتقاء کے طور پر جاری ہے۔ انجیلِ مقدس میں "GOD RESTED THE SEVENTH DAY" یا قرآنِ حکیم کے مطابق "ثم استویٰ علی العرش" کا مطلب یہ نہیں کہ کُن کا عمل ختم ہو گیا۔ بلکہ یہ عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ CHAOS اور COSMOS کا نظریہ بھی ہمارے ادراک (PERCEPTION) کی پیداوار ہے ورنہ CHAOS اور COSMOS میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب تغیر و تبدل، تطور و ارتقاء کے عمل کا حصہ ہیں۔ ساری کائنات میں، یہاں تک کہ اسپیس میں بھی یہ عمل جاری ہے۔ ہمارے دور کے ایک فلسفی ہنری برگساں نے بھی اپنی کتاب "تخلیقی تطور" (CREATIVE EVOLUTION) میں تخلیقی عمل کے جاری و ساری رہنے کا نظریہ پیش کیا ہے۔

بالکل یہی بات تخلیقی تحریر پر صادق آتی ہے۔ تخلیق کار کے قلم سے نکل کر سب سے پہلے خود تخلیق کار کی قرأت کے عمل سے گزرتی ہے۔ پھر وہ قاری اور نقاد کے پاس پہنچتی ہے۔ اور اُس میں معنی کے نئے نئے گوشے نکلتے رہتے ہیں۔ ایسے گوشے جو تخلیق کار کو تخلیق کرتے وقت نظر نہیں آئے تھے اور اس عمل کے دوران تخلیق کی مزید تعمیر ہوتی رہتی ہے، تشریح و تنقید کے

ذریعے معنوی تعمیر جو تخلیق کا حصہ بن جاتی ہے۔ پرانی داستانوں کی شعریات اب دریافت ہو رہی ہیں۔ غالب نے اپنی تخلیقات کی شرح خود لکھی مگر تخلیقی عمل ختم نہیں ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی "تفہیم غالب" اب لکھ رہے ہیں میر کے کلام کی شور انگیزی جس کا ادراک خود میر نے کیا تھا شمس الرحمٰن فاروقی کے "شعر شور انگیز" کے ذریعہ اب ظاہر ہو رہی ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تخلیق کی ضد تعمیر نہیں ہے بلکہ نقل (MIMESIS) یا تالیف ہے، یا پھر READERLY، مقصدی، یا افادی تحریر ہے جو تالیفی اور نقالی کے عمل کے بعد اپنا کام ختم کر دیتی ہے اور حوالوں اور تاریخ میں انھیں معنی کے ساتھ باقی رہتی ہے جو مصنف نے انھیں پہنائے تھے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نام نہاد حقیقت نگاری، واقعہ نگاری، تحقیقی تحریر، افادی تحریر، تخلیق کے زمرے میں نہیں آتیں چاہے زبان، بیان، اطلاع اور علمیت کے اعتبار سے اُن سے فی الوقتی فائدہ یا حظ کیوں نہ حاصل ہو۔

جہاں تک تنقیدی عمل کا تعلق ہے تو اُسے بھی تخلیقی عمل کہا جا سکتا ہے بشرطیکہ اُس کا کام محض اقداری تنقید یا (VALUE JUDGEMENT) نہ ہو بلکہ متن کی معنویت کے نئے نئے گوشے تحلیل کے ذریعہ تلاش کیے جائیں تنقید میں تقریظ اور تنقیص کا عمل بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ تحلیل کے ذریعہ متن کو نئے معنی نہ دے اور اس طرح تخلیق کو وسعت نہ دے سکے تو تخلیقی تحریر کے زمرے میں نہیں آتی۔ ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ تخلیق منطق اور کرونولوجی کے تسلسل کو ہمیشہ برقرار نہیں رکھتی، اُس میں وقت اور زمانے کا تعین ہوتا بھی ہے تو اُس کا اطلاق جامعیت کا حامل ہوتا ہے اور وقت اور زمانہ محض ٹائپ کے طور پر شامل ہوتا ہے اس میں بہت سی تجریدی، ایبسرڈ اور غیر منطقی باتیں بھی ہوتی ہیں، اور علامتوں اور سمبل بھی جن کا ابلاغ سے براہ راست تعلق ہو ناضروری نہیں ہوتا لیکن تنقید عام طور سے منطقی ہوتی ہے اور تحلیل کے ذریعہ تحریر کے معنی کو وسعت دینے میں منطقی عمل کارگر ہوتا ہے سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ منطقی عمل سے گزری ہوئی تحریر تخلیق کے زمرے میں کیسے آ سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر منطقی عمل سے گزری ہوئی تنقید فن پارے کے بطن سے نئے معنی نکالتی ہے، ان کہی یا التوئی میں ڈالی ہوئی بات کو اجاگر کرتی ہے تو وہ تخلیق کو وسعت دینے کے عمل کے مترادف ہے۔ لیکن اگر تنقید اقداری پرکھ کے ذریعہ سطحی معنی ظاہر کرتی ہے جیسے کتابوں کے تبصروں میں اکثر ہوتا ہے، تو وہ تخلیق نہیں ہوتی بلکہ تکرار (TAUTOLOGY) تک محدود ہوتی ہے لہٰذا ہم تمام تنقیدی ڈسپلن یا تنقید کو تخلیق کے زمرے میں نہیں لا سکتے۔ کبھی کبھی یہی بات فکشن اور شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔ خالص واقعاتی اور صحافتی اسلوب میں لکھی ہوئی کہانیاں تخلیقی نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح موضوعاتی اور معروضی شاعری بھی تخلیق نہیں کہلائی جا سکتی ان کی ساخت اکہری ہوتی ہے اور تخلیق کبھی اکہری نہیں ہوتی۔

فکشن اور شاعری کے علاوہ دوسری اصنافِ ادب کو تخلیقی عمل کے جاری رہنے اور کثیر المعنویت کے معیار پر پرکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انشائیہ کو اسلوب کے اعتبار سے اور LOOSE SALLY OF MIND کے بہاؤ کی وجہ سے جس میں خاک کے ذرّات کے ساتھ ساتھ سونے کے ذرّات بھی مل جاتے ہیں، تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں معنویت، اسلوبیاتی جدّت اور تخیل و تصوّر کا تیز بہاؤ ہی اسے انشائیہ بناتا ہے ورنہ ایسی تحریر انشا پردازی تک محدود ہو کر رہ جائے۔ خاکے اپنے موضوع، ہیئت اور کردار کی صفات کی وجہ سے محدود ہوتے ہیں۔ اُن کے اسلوب اور لکھنے والے کے تخیل و تصوّر کے ذریعہ اُن میں جمالیات تو پیدا کی جا سکتی ہیں مگر ان کو تخلیق کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا کیوں کہ ان میں تخلیقی عمل کے ذریعہ معنویت

ہمیشہ پیدا نہیں کی جا سکتی۔ قاری عام طور سے انھیں ایک بار پڑھتا ہے اور نقاد ان کی تحلیلی تنقید تو کر سکتا ہے مگر ان میں جدّت اور معنویت نہیں پیدا کر سکتا۔

ادبی مضامین کو بھی تصنیف، تالیف اور تحقیق کے عمل تک محدود رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ ایک تو مضامین میں منطق کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور پھر ان کے معنی کو بھی ایک ہی بار سمجھا جا سکتا ہے۔ مضامین میں مقصد اور افادیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان میں علمیت اور اطلاعیت کا خاص وصف ہوتا ہے۔ زبان و بیان میں ندرت ہو سکتی ہے اور بہترین الفاظ بھی بہترین طریقے سے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس نظریہ سے قاری انھیں بار بار پڑھ سکتا ہے مگر ان کی معنویت کو وسعت نہیں دے سکتا۔ ان کا شمار ایسی حقیقت نگاری میں ہوتا ہے جس میں علمی سطح ضرور بلند ہوتی ہے۔ اختلاف اور اتفاق کی بھی گنجائش ہوتی ہے مگر مضامین تخلیقی عمل کا اضافہ نہیں ہوتے، اس مضمون کے حوالے سے کسی نئے اصول اور نظریے کی بات بھی آتی ہے تو وہ دوسری منطقی تحریر کے ذریعہ۔

مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کسی تحریر کو تخلیقی تحریر کے زمرے میں لانے کے لیے ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ اُس کی زبان شعری ہو، معمولی اور صحافتی نہیں۔

۲۔ اُس میں معنویت کی تہیں ہوں جسے قاری اور نقاد عرصے تک دریافت کرتے رہیں اور اُسے جدید معنی پہناتے رہیں یعنی تخلیقی عمل جاری رہے۔

تخلیقی فن پارہ صرف شاعری، فکشن اور انشائیہ میں ممکن ہے۔ تنقید تخلیقی تحریر کے زمرے میں آ سکتی ہے اگر وہ تحلیلی ہو اور فن پارے کی گہرائیوں میں جا کر نئی معنویت یا اَن کہی بات اور التوا میں ڈالے گئے معنی کی نشاندہی کر سکے۔ اس میں خود تنقید پر تنقید کے امکانات ہوتے ہیں اور اُس کی معنویت کو وسعت دی جا سکتی ہے۔ تعمیر تخلیق کی ضد نہیں ہوتی۔ تعمیری عمل تخلیقی فن پاروں میں پہلے یا بعد اضافی عمل کے طور پر شامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ تخلیقیت کی معنویت کے امکانات کو محدود نہ کرے اور ذاتی تعصب، مصلحت، افادیت یا ضرورتِ ابلاغ کے تحت تخلیقی جوہر کو مجروح نہ کرے۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں، جریدوں اور تحریروں سے استفادہ کیا گیا۔

انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (مائکرو پیڈیا)

میگزن کریم سٹی ریویو وسکانس یونیورسٹی۔ امریکہ ۱۹۸۳ء موسم سرما شمارہ

تاریخ فلسفہ۔ ول دوران

ساختیات اور اُس کے بعد۔ جون سٹرک

ادبی اصطلاحات کی لغت۔ جے اے کڈن

ساختیات اور نشانیات۔ ٹرنس ہاک

ماہنامہ "صریر" اپریل، مئی، جون ۱۹۹۱ء ستمبر ۱۹۹۲ء

ویبسٹر ڈکشنری ، القرآن الحکیم ، انجیل مقدس

افتخار احمد عدنی

یادوں کا سفر۔ جگر مراد آبادی

لاہور میں سول سروس اکیڈمی میں تربیت کے دوران جگر صاحب ایک دن بزرگانہ شفقت سے ملنے کے لیے آئے تو ساتھ میری بیٹی کے لیے ایک ٹافی کا ڈبہ بھی لائے۔ اُن کی اس شفقت کی میں اور میری اہلیہ دونوں بہت قدر کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں ان کے اس تکلف پر دکھ بھی بہت ہوتا تھا دکھ اس لیے ہوتا تھا کہ اُن کی کوئی آمدنی نہیں تھی۔ صرف مشاعروں میں جو نذرانہ پیش کیا جاتا تھا، اُسی سے اُن کا خرچ چلتا تھا۔ اُس دن میری چھوٹی بہن جن کی شادی کچھ ہی پہلے ہوئی تھی میرے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ہم نے اُنھیں جگر صاحب سے ملایا اور یہ بتایا کہ حال ہی میں ان کی شادی ہوئی ہے، ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس پر جگر صاحب کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ انھوں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ڈیڑھ سو روپے کی رقم نکلی اور وہ سب جگر صاحب نے میری بہن کو رونمائی کے طور پر دے دی ہم نے لاکھ احتجاج کیا۔ لیکن کوئی بات نہیں بنی۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب جسٹس منیر کی قیادت میں قائم ہونے والے کمیشن کی سفارشات پر سرکاری ملازمتوں کی تنخواہوں کا تعین کیا گیا تھا اور اعلیٰ ملازمتوں کے لیے تین سو سے گیارہ سو روپے تک مشاہرہ مقرر کیا گیا تھا۔ ہم لوگ زیر تربیت تھے اور صرف تین سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ ہم تو کسی کو رونمائی میں پچاس روپے دینے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ میری اہلیہ نے اور میں نے رات جگر صاحب کی اس شاہ خرچی کا بڑا غم کیا میں نے سوچا کہ اگر میں کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ہوتا تو کم از کم جگر صاحب کی خاطر ایک مشاعرہ ہی کرا دیتا۔ لیکن ایک زیرِ تربیت افسر تو اختیارات سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ اس کی اگر کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے تو یہ کہ وہ کسی بڑے زمیندار یا دولتمند تاجر کا مفید مطلب داماد ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ میں شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس اہلیت سے بھی محروم تھا۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ کسی کم صورت بیٹی کا متمول باپ جگر صاحب کے اعزاز میں مشاعرہ کرانے پر آمادہ ہو جاتا اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

دوران ملازمت جگر صاحب سے میری ملاقات ۱۹۵۳ء میں مری میں ہوئی۔ میں وہاں ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گیا تھا اور ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ فضلی صاحب اس زمانے میں آزاد کشمیر کی ریاست کے لیے حکومت پاکستان کے ریزیڈنٹ تھے۔ اُن کے لیے ایک سرکاری کوٹھی راولپنڈی میں تھی اور ایک مری میں۔ اُس زمانے میں وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ مری میں مقیم تھے جگر صاحب اُن کے مہمان تھے۔ ڈھاکے میں مجھے جگر صاحب کے فضلی صاحب کے خاندان سے تعلقات کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا اس لیے کہ وہ وہاں [illegible]عروں میں گھرے رہتے تھے۔ ڈھاکے میں ہر طرح کے اور ہر علاقے کے شاعر تھے، مشرقی

پاکستان کے، مغربی پاکستان کے، ہندوستان کے۔ ان دنوں مشرقی پاکستان اور ہندوستان میں ویزا اور پاسپورٹ کی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے ہندوستان کے شاعر کثرت سے آتے تھے۔ لیکن مری سطح سمندر سے سات یا شاید آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہونے کے سبب شعر و شاعری کی فضا سے خاصہ اونچا ہو گیا ہے۔ ڈھاکے، کراچی اور لاہور کی طرح مری کے مزاج میں شاعر نوازی نہیں ہے۔ نہ وہاں ایسے لوگ گرمیاں گزارنے جاتے ہیں جنھیں شاعری سے ذوق ہو اور وہ شاعروں کو اپنے ہاں ٹھہرائیں، اور نہ شاعر اتنے خوش حال ہوتے ہیں کہ کسی ہوٹل میں جا کے ٹھہریں، اور نہ اتنے بدذوق ہوتے ہیں کہ ایسی بستی کا رخ کریں جہاں کوئی شعر سننے پر تیار نہ ہو، لہٰذا شاعروں کے فقدان سے مری میں جگر صاحب کا سارا وقت فضلی صاحب کے خاندان والوں کے ساتھ گزرتا تھا۔

فضلی صاحب کے خاندان میں سب سے اہم کردار اُن کی ایک بہن کا ہے۔ وہ فضلی صاحب کے علاوہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ عمر کے علاوہ عقل، تجربے اور زمانے کی اونچ نیچ کی سمجھ میں بھی سب سے بڑی ہیں۔ ان کا حکم پورے گھر پر چلتا تھا، وہ سفید و سیاہ کی مالک تھیں، فضلی صاحب کے علاوہ کسی کو اُن سے اختلاف کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی، مہمان داری کی ساری ذمہ داری بھی انھوں نے اُٹھا رکھی تھی۔ لہٰذا فضلی صاحب کے مہمان اور دوست اُن کا خاص خیال رکھتے تھے۔ سوائے اکّا دکّا مستثنیات کے۔ جیسے اختر حمید خاں، جن کی شخصیت میں جبرالٹر کی چٹان کا سا استحکام ہے، یا مولوی عبدالحق جو اردو زبان کے مفاد کے علاوہ کسی چیز کو خاطر میں لانے پر تیار نہیں تھے، لیکن ایسے دُھن کے پکّے فضلی صاحب کے دوستوں میں کم تھے۔ لہٰذا ان کی یہ خاص بہن ہر ایک سے اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ فضلی صاحب اور ان کی بیگم کے ہمدرد وہ سب انھیں آپا کہتے تھے۔ اور اب بھی جب کہ اُن کے اختیارات کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ہے سب انھیں آپا ہی کہتے ہیں۔ فضلی صاحب کو جگر صاحب سے بڑی محبت تھی اور وہ تھے بھی بہت لائق محبت شخصیت کے مالک لہٰذا گھر کے ہر بڑے چھوٹے کے دل میں اُن کی جگہ تھی۔ خاندان کی منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے جگر صاحب کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی آپا ہی کی ذمہ داری تھی۔ جسے انھوں نے بہ طریق احسن نبھایا۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا اُسے پُر کرنا آسان نہیں تھا۔ پان، قوام، تمباکو اور چائے یہ سب چیزیں انھوں نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے شروع کی تھیں۔ لیکن پان اور چائے کے شغل سے سارا دن تو نہیں گزارا جا سکتا۔ لہٰذا وقت گزارنے کے لیے انھوں نے تاش کھیلنے کا انتخاب کیا۔ رفتہ رفتہ تاش کھیلنے میں ان کا انہماک اتنا بڑھا کہ تاش کھیلنے والے اُن کی ضرورت بن گئے۔ ڈھاکے میں تو ان سے ملنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان میں سے چار پانچ آدمی ہر وقت تاش کھیلنے کے شوقین مل جاتے۔ لیکن مری میں تو شاعروں کا قحط تھا۔ ادب کے قدردان برائے نام تھے۔ لہٰذا تاش کھیلنے والوں کی کمی صرف فضلی صاحب کے خاندان والے یا اُن کے ملاقاتی ہی پُر کر سکتے تھے۔ وقتاً فوقتاً چائے کا انتظام کرنے کے علاوہ تاش کھیلنے والوں کا بندوبست بھی آپا کی ذمہ داری بن گیا۔ چنانچہ قریب کے گھروں میں رہنے والی چند خواتین جن کی فضلی صاحب کے ہاں آمد و رفت تھی اس کام پر لگا دی گئیں کہ وہ جگر صاحب کے ساتھ تاش کھیلا کریں۔ اگر کسی دن کوئی تاش کھیلنے کے لیے دستیاب نہ ہوتا تو پھر یہ خدمت بھی آپا ہی کو انجام دینا پڑتی۔

تاش کے سلسلے میں جگر صاحب نے اپنے لیے رمی جیسے سہل اور سادہ کھیل کا انتخاب کیا تھا۔ اگر وہ خدانخواستہ برج کا انتخاب کر لیتے تو انھیں تین اچھے کھیلنے والے کہاں سے ملتے۔ اور ویسے برج ہے بھی ایسا شعر دشمن کھیل کہ حضرت کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو شعر کا اچھا ذوق رکھنے کے ساتھ برج کے ماہر ہوں۔

بات یہ ہے کہ برج میں کمال حاصل کرنے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ خاصے شعر کُش ہوتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ جو شخص بہت چاق و چوبند، حاضر دماغ، ہر بات پر نظر رکھنے والا نہ ہو وہ کبھی برج جیسے کھیل میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، وہ حاضر و موجود کا بندہ ہوتا ہے، اگر وہ غائب اور ممکن کے خیال میں پڑا تو گیا کام سے۔ اور شاعری نام ہے تصوّر میں گم ہونے کا۔ امکانات کے سراب سے دھوکہ کھانے اور یادوں میں ڈوب جانے کا۔ ایسا شخص بھلا برج کے قریب کیسے جا سکتا ہے؟

برج کا اچھا کھلاڑی تو دوسروں کے پتّے اٹھانے کے بعد اُن کے تاثرات سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ ان کا ہاتھ کیسا ہے؟ پھر جب وہ کال کرتے ہیں تو وہ اندازہ یقین تک جا پہنچتا ہے۔ جب کھیل شروع ہوتا ہے تو وہ ہر گرتے ہوئے پتّے کا حساب رکھتا ہے، کھیل کے ہر مرحلے پر وہ یہ جانتا ہے کہ کس کے ہاتھ میں کس رنگ کے کتنے پتّے ہیں۔ گویا اُس کا دماغ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ کمپیوٹر اور تو دنیا کا ہر کام کر سکتا ہے۔ لیکن شعر کہنا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک صفت ہوئی اچھے برج کھیلنے والے کی۔ دو اور صفات بھی ہیں جو کسی اچھے شاعر کی نہیں ہو سکتیں۔ ایک دھوکہ دینا، دوسرے دھونس سے مرعوب کرنا۔ غلط کال دے کر وہ دوسروں کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ انھیں بانس پہ چڑھا کے بڑی بلندی سے نیچے گراتا ہے غلط پتّے پھینک کر حریفوں کو مغالطے میں ڈال کے اُن کا کھیل خراب کرنا اس کا شیوہ ہوتا ہے اس کے علاوہ دھونس دینے میں بڑا ماہر ہوتا ہے۔ ہاتھ میں کچھ نہ ہو پھر بھی ایسی کال دے گا کہ حریفوں کے اوسان خطا ہو جائیں۔ اور کھیل ختم ہونے پر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے تو ایسا تجزیہ کرتا ہے کہ سب کا بخیہ اُدھیڑ دے۔ بھلا ایک اچھے شاعر میں یہ خوبیاں کہاں جمع ہو سکتی ہیں۔

یہ مضمون لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اقبال اور فیض جیسے شاعر تو برج کے پاس سے بھی نہیں گزرے ہوں گے۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق کے لیے میں نے مشفق خواجہ صاحب کو فون کیا۔ خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ تحقیق میں ایک بہت منفرد مقام حاصل کرنے کے باوجود وہ اہلِ تحقیق کے بوجھل لہجے اور خشک طرزِ فکر سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ ان کی گفتار اور تحریر میں بلا کی شوخی ہے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اقبال اور فیض نے کبھی بھول کر بھی اس کھیل کی طرف رخ نہیں کیا۔ انھیں اپنی عزت بہت عزیز تھی۔ اگر یہ دونوں شاعر کبھی برج کھیلے ہوتے تو خواجہ صاحب کو ضرور معلوم ہوتا کہ انھوں نے اس کھیل میں کیسی فاش غلطیاں کیں۔ کیسے حضرت جیسے استادانِ فن کے بے رحم تجزیے سے شرمندہ ہوئے اور کب برج کی میز سے اُٹھائے گئے۔

خواجہ صاحب کی تحقیق کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ ادیب کی خوبیوں سے زیادہ اس کی کمزوریوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ تعلّی کے ذریعے ہر شاعر اپنی خوبیاں بہت مبالغے کے ساتھ خود ہی بیان کر دیتا ہے، جو کسر رہ جاتی ہے وہ اس کے مداح پوری کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس کی بشری کمزوریوں پر نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ہم ایک انسان کی حیثیت سے اُسے عزیز رکھیں۔ کسی عقیدے یا نظریے سے تو کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ یہ خواجہ صاحب کا احسان ہے کہ وہ شاعروں اور ادیبوں کی کمزوریوں پر روشنی ڈال کر انھیں پڑھنے والوں کے قریب کر دیتے ہیں، اور ان کی محبت کا ایک اَن مٹ نقش دلوں پر مرتسم کر دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مجھے بتایا کہ جگر صاحب رمی جیسے سیدھے سادے کھیل میں بھی ہیرا پھیری سے نہیں چوکتے تھے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہوا تو انھوں نے دو چار بہت ثقہ اور معتبر لوگوں کے حوالے دیے کہ میں چاہوں تو اُن سے تصدیق کر لوں۔ لیکن میں نے اس تصدیق کو ضروری نہیں سمجھا اس لیے کہ مجھے خواجہ صاحب کی خوش فکری کا کچھ تجربہ تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں ایک محفلِ سماع منعقد ہوئی۔ اس میں ظ۔ انصاری میرِ محفل تھے۔ اس لیے نذریں انھیں پیش کی جا رہی تھیں۔ محفل کے ختم ہونے پر نذروں کی رقم انھوں نے قوالوں کو دے دی۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا آپ نے دیکھا ظ۔ انصاری نے آدھی

رقم اپنی جیب میں ڈال لی اور صرف آدھی قوالوں کو دی اسی طرح جالبی صاحب کے ہاں قوالی کی ایک اور بزم سجی جس میں میرِ محفل فیض صاحب تھے۔ اس میں نذریں بڑی دریادلی سے پیش کی گئیں۔ خواتین کی فیاضی دیدنی تھی۔ جب محفل ختم ہوگئی تو خواجہ صاحب نے کہا۔ فیض صاحب نے بھی وہی کیا جو ظ۔ انصاری پہلے کر چکے تھے۔ آدھی رقم قوالوں کو دی، آدھی خود رکھ لی۔

یہ اہلِ تحقیق بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ جالبی صاحب سماع کی محفلوں کا انتظام کر کے شاعروں اور ادیبوں کو نذرانے وصول کرنے کے چکر میں ڈالتے ہیں۔ اور خواجہ صاحب ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے کر حیرت انگیز نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ تحقیق کی وہ ارفع سطح ہے جس کا تعلق حقایق اور واقعات سے گزر کر امکانات اور میلانات سے ہے۔ یہ دونوں حضرات شاعروں اور ادیبوں کو غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار کر کے ان کے تاثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اُن تاثرات کی تفہیم کی خاطر اُن سے کچھ اعمال منسوب کر دیتے ہیں، تاکہ عام آدمی اُن کے دکھ اور محرومی کا خاطر خواہ ادراک حاصل کر سکے۔ مثلاً ظ۔ انصاری جن کا غالب شناسی میں بہت منفرد مقام ہے۔ جب یہ دیکھیں کہ غالب کے اشعار کی تشریح میں خونِ دل تو وہ جلائیں اور ایک غزل سنا کے داد اور اس کے ساتھ ایک معقول رقم قوال لے جائیں تو وہ اسے ضرور بہت بڑی ناانصافی قرار دیں گے۔ جیسے ہی اس خیال کا پر تو محقق کی نظر سے گزرا اس نے نذرانے کی رقم کی مساوی تقسیم کا منظر دکھا کے اس کی عکاسی کر دی۔ یا جب فیض جیسا شاعر یہ دیکھے کہ لوگ اس کی غزلوں پر دل کھول کر نذرانے دے رہے ہیں تو اس کے دل میں یہ خیال گزر سکتا ہے۔ شعر میں نے کہا، پسند سننے والوں نے کیا۔ یہ قوال بیچ میں کہاں سے آگیا کہ ساری داد سمیٹ کر لے جائے۔ محقق جس کی نظر ایک فن پارے سے زیادہ تخلیقی تحریک پر ہوتی اس خیال کے آتے ہی شاعر کے باطن میں اُتر جاتا ہے۔ اور پھر اس خیال کی تجسیم اس طرح کرتا ہے کہ نذریں آدھی شاعر نے رکھ لیں اور آدھی قوالوں کو دے دیں۔

چند روز ہوئے مشفق خواجہ صاحب نے ایک پُر تکلف دعوت کی جس میں کم از کم چار مہمانوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ ان کے اعزاز میں دی گئی ہے۔ کھانے کے بعد جب فکرِ فردا کے اسیر جا چکے اور کچھ سخن شناس جو محوِ غم دوش تھے باقی رہ گئے تو خواجہ صاحب نے چاہا کہ ایک شعری نشست ہو جائے۔ شعر کہنے والے صرف چار تھے جن میں سے دو کو شعر سنانے میں تامّل تھا۔ ایک سحاب قزلباش کو اور دوسرے ڈاکٹر وحید قریشی کو۔ سحاب قزلباش نے جب سے نثر لکھنی شروع کی ہے وہ شعر کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں۔ اور ڈاکٹر وحید قریشی جو صاحبِ دیوان شاعر ہیں شعر سنانے کو ایک محقق کے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی کا تعارف اس طرح کرایا کہ اس سے خوش ہو کر دونوں شعر سنانے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب مردوں کے سحاب قزلباش ہیں۔ ان دونوں میں مماثلت یہ ہے کہ وزن اور جسم دونوں میں عام آدمیوں کی نسبت بہت معتبر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک نغز گو شاعر سے مماثلت پر اور سحاب قزلباش ایک محقق دانشور سے نسبت پر ناز کرنے میں حق بجانب تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ایک شعر سے اور سحاب قزلباش نے ایک غزل سے محفل کو نوازا۔ حقی صاحب نے اپنے دھیمے انداز میں کچھ کلام سنایا اور اس کے بعد ضمیر جعفری صاحب کی باری آئی تو اُن کے لیے تو غالب پہلے ہی کہہ گئے ہیں "اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"

ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد اب میں پھر برج کی طرف آتا ہوں۔ اس کھیل کا مزاج ہی ایسا "اوکھا" ہے کہ کوئی شاعر اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اقبال، جگر اور فیض تینوں نے اس سے اجتناب کیا۔ میر صاحب تو کبھی اس کھیل کے قریب نہ پھٹکتے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہماری شاعری اتنی کم مایہ ہے کہ اس کھیل سے بالکل ہی عاجز ہو جائے ایک شاعر ہمارا ایسا بھی گزرا

ہے جو برج کیا پوکر اور فلیش کو بھی اپنے وجود کے ایک گوشے میں اُتار لے۔ اس نابغۂ روزگار کا نام تھا اسد اللہ خاں غالب۔ غالب برج پر اگر میں کچھ لکھوں تو اس مضمون میں جگر صاحب کے لیے گنجائش نہیں رہے گی کیوں کہ "قومی زبان" کے ادارۂ تحریر نے مجھ پر آٹھ دس صفحے کی پابندی لگا دی ہے اس کے علاوہ میرے غالب شناس دوست آج کل امریکہ گئے ہوئے ہیں ان کی عدم موجودگی میں غالب پر کچھ لکھنا اُن سے بے وفائی کے مترادف ہوگا لہٰذا میں غالب اور برج کے موضوع سے جگر اور رمی کے ذکر کی طرف آتا ہوں۔ لیکن اس مراجعت سے پہلے غالب کا ایک شعر آپ کو سنا دوں اور پھر آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ غالب کا اس پیچیدہ کھیل سے کیا رشتہ ہے۔

سخن سادہ دلم را نفریبد غالب
نکتۂ چند زپیچیدہ بیانے بمن آر

سیدھا سادا کلام میرے دل کو اسیر کرنے سے قاصر ہے۔ (یہ رمی جیسے آسان اور سادہ کھیل کی نارسائی کا ذکر ہے) میرے لیے تو ایسے پیچیدہ بیان کے جو صرف خواص کی پہنچ میں ہو کچھ دلفریب نکتے لے کے آ۔ (یہ برج کے اسرار کا ذکر ہے جس سے یا تو غالب واقف تھے یا اس زمانے میں حضرت ہیں)

سخن سادہ سے کیا بات بنے گی غالب
کوئی نکتہ، کوئی پیچیدہ بیاں دے مجھ کو

جگر صاحب کے کلام میں جو روانی ہے وہی ان کے پسندیدہ کھیل رمی کی بھی خصوصیت ہے۔ اس میں صرف یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کس رنگ اور کس ترتیب کے پتوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے۔ باقی تمام پتے غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ انھیں اٹھاتے رہیے اور پھینکتے رہیے۔ تا آنکہ آپ کا ہاتھ پورا ہو جائے۔ غیب سے مضامین کی طرح پتے آتے رہتے ہیں، انھیں ہاتھ میں رکھنے یا پھینکنے میں کوئی تردد یا تامل نہیں کرنا پڑتا۔ حسرت جب چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن کر سکتے تھے تو جگر صاحب کو رمی کی محویت کس طرح فکر سخن سے باز رکھ سکتی تھی ہو سکتا ہے کہ اگر میں مشفق خواجہ صاحب کے تاثراتی انداز میں تحقیق کروں تو ممکن ہے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ جگر صاحب کا رمی میں انہماک ایک تخلیقی عمل تھا جس سے وہ اپنے پسندیدہ مضامین کو اپنے لاشعور میں اتارتے جاتے تھے اور ناپسندیدہ خیالات اور مشاہدات کو غیر ضروری پتوں کی طرح پھینکتے جاتے تھے۔ اس طرح دو تین دن رمی کھیلنے کے بعد وہ بغیر کسی ریاضت کے ایک دلنشین غزل کہہ دیتے تھے۔ گویا شراب چھوڑنے سے ان کی زندگی میں جو کمی ہوئی تھی اسے رمی نے پورا کر دیا تھا۔

آپا کہتی ہیں کہ ایک دفعہ کچھ بے فکرے جگر صاحب سے ملنے آئے۔ معلوم نہیں وہ شاعر تھے، یا جگر صاحب کے مداح تھے، یا صرف رمی کے شوقین تھے۔ بہرحال ان کے آنے سے جگر صاحب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے خواہش کی کہ انھیں فضلی صاحب کی کوٹھی سے متصل دو کمروں کی چھوٹی سی اضافی تعمیر (آنیکس) میں منتقل کر دیا جائے فضلی صاحب ان دنوں مری سے مظفر آباد یا راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ آپا نے بخوشی جگر صاحب کو وہاں منتقل کرنے کا بندوبست کر دیا۔ تین چار دن ایسے گزرے کہ اس چھوٹے سے گھر میں ہر وقت رمی کی نشست جمی رہتی تھی۔ آپا کی ذمہ داری بس اتنی تھی کہ وہ دو تین گھنٹے بعد چائے فراہم کرتی رہیں اس اثنا میں آپا رمی کھیلنے والوں کو جمع کرنے کی فکر سے آزاد رہیں۔ جب وہ بے فکرے، چلے گئے تو جگر صاحب اضافی عمارت سے اصل عمارت میں واپس آ گئے۔ ایک دن یہ حادثہ ہوا کہ رمی کھیلنے کے لیے کوئی بھی نہ مل سکا۔ مجبوراً جگر صاحب نے آپا

ہی کو کھیلنے کی دعوت دی۔ آپا کھیلنے کو تو بیٹھ گئیں، لیکن وہ اپنی انتظامی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئیں، کھیل کے دوران وہ باورچی کو بلوا کر اُسے ہدایات دیتی رہیں، بچّوں کو شرارتوں سے باز رکھتی رہیں، بیماروں کو وقت پر دوا پینے کی تاکید کرتی رہیں، جگر صاحب کو کبھی ایسی ہمہ جہت شخصیت سے رمی کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کی انتظامی استعداد سے ایسے مرغوب ہوئے کہ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کون سے پتے انھیں رکھنے ہیں اور کون سے پھینکنے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہارتے چلے گئے۔ اور جب تک بیزار ہو کر آپا نے کھیل بند نہیں کر دیا وہ ہارتے ہی رہے۔ یہ ہار جگر صاحب کے لیے سنگین سانحے سے کم نہ تھی۔ دوسرے دن انھوں نے اس ہار کو اتارنے کے لیے آپا کو پھر رمی کھیلنے کی دعوت دی آپا نے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے معذرت کی۔ تیسرے دن فضل صاحب نے آپا سے کہا کہ تم سے رمی میں ہار کے جگر صاحب اتنے پریشان ہوئے کہ رات کو سو نہ سکے۔ لہٰذا تم اُن سے رمی کھیلو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ کھیل کے دوران بچے یا نوکر پریشان نہ کریں۔ چنانچہ آپا نے بہت سعادت مندی سے فضلی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا جگر صاحب اپنے پتوں پر پوری توجہ مرکوز کر کے کھیلے اور جیت گئے۔ اور پھر انھوں نے آپا کو رمی پر ایک لیکچر دیا۔ جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ رمی کو تاش کے اور کھیلوں پر کیا فوقیت حاصل ہے۔

یہ بہت دنوں کی بات ہے، لہٰذا اب آپا کو یہ یاد نہیں کہ جگر صاحب نے رمی کی کیا خوبیاں گنوائی تھیں۔ بہر حال میرا تاثر یہ تھا کہ ان کا لیکچر کچھ ایسا ہی تھا جیسے غالب کے اشعار آم کی تعریف میں۔ تاش کا فخر و اعتبار رمی گلشنِ لہو کی بہار رمی۔

مری میں جگر صاحب کے قیام کا تذکرہ فضلی صاحب کے السے شی اُن کتے عنبر کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ عنبر سیاہ رنگ کا بہت رعب داب والا کتا تھا۔ فضلی صاحب کے خاندان والے سب اس کی قدر کرتے تھے، عنبر کی موجودگی میں کسی چوکیدار کی ضرورت نہیں تھی۔ آس پاس کے کتے بھی اس سے بہت ڈرتے تھے رفتہ رفتہ اس نے اپنا دائرہ اختیار اتنا وسیع کر لیا کہ اگر فضلی صاحب کے گھر سے دو تین کوٹھیاں چھوڑ کر بھی کوئی کتا بھونکے تو وہ اس پر جارحانہ حملہ کر کے اُسے خاموش کر دیتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ باہر جو نکلا تو شام تک واپس نہ آیا، رات کو اس کی تلاش مشکل تھی، دوسرے دن اس کی تلاش میں مری کا کونا کونا چھانا گیا، لیکن وہ نہ ملنا تھا نہ ملا پورے گھر پر ایک اداسی کی فضا طاری ہو گئی۔ حد یہ ہے کہ جگر صاحب نے اس کے غم میں رمی کھیلنے کے لیے کسی ساتھی کی فرمائش بھی نہیں کی۔ چوتھے روز وہ گھسٹتا ہوا زخموں سے چور گھر پہنچا اُسے فوراً کتوں کے اسپتال میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کو انتہائی تشویش ناک قرار دے کر اسپتال میں داخل کر لیا ہوا یہ تھا کہ اس کی جارحیت کے جواب میں اس علاقے کے تمام کتوں نے اس کے خلاف اتحاد کر لیا تھا، اور ایک روز اُسے للکار کے کسی ایسی جگہ لے گئے جہاں کوئی اس کی مدد نہ کر سکے اور وہاں وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے تین روز تک وہ وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔ پندرہ بیس روز اسپتال میں علاج کے بعد بہتر ہو گیا۔ فضلی صاحب کے مری سے راولپنڈی جانے کا زمانہ آ گیا آپا نے کہا جب تک عنبر ٹھیک نہ ہو جائے وہ مری سے نہیں جائیں گی۔ وہ گھر کی منتظم اعلیٰ تھیں۔ ان کے بغیر خاندان مری سے پنڈی منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ دو تین دن اس تشویش میں گزرے کہ اب کیا کیا جائے۔ جب جگر صاحب کو اس خاندانی مسئلے کی سنگینی کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ وہ عنبر کی صحت یابی تک مری میں رہیں گے۔ جگر صاحب کے اس فیصلے سے مسئلہ حل ہو گیا۔ پورا خاندان منتقل ہو گیا۔ فضلی صاحب کی والدہ اور ان کے چھوٹے بھائی جگر صاحب کی تواضع کے لیے مری میں ٹھہر گئے۔ جگر صاحب دو ہفتے مری میں صرف عنبر کی خاطر رہے، وہ روز اسپتال جاتے تھے، فضلی صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالودود فضلی عنبر کے لیے دودھ، اس کی مرغوب غذا اور دوائیں لے کر جگر صاحب کے ساتھ جاتے تھے۔ کتنا خوش نصیب تھا وہ کتا جس کی عیادت کے لیے جگر جیسا شاعر روز اسپتال جاتا تھا۔ اس کارِ خیر میں جگر صاحب نے فضلی

صاحب کے چھوٹے بھائی کے ساتھ رمی کھیل کے گزارہ کیا۔

عنبر کو شاعری کی دنیا سے ایک اور نسبت بھی ہے جس زمانے میں زہرا نگاہ شاعری کے افق پر ایک نو عمر شاعرہ کی حیثیت سے اُبھر رہی تھیں، انھیں راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ فضلی صاحب کے گھر پہ ٹھہریں۔ جس کمرے میں اُن کا قیام تھا وہ اوپر تھا جب وہ درمیانی کمرے سے گزر کر جس میں سیڑھیاں تھیں اوپر چڑھنے لگیں تو عنبر نے اپنی خوفناک آواز میں بھونک کر اُن پر حملہ کیا۔ ان کا پیر پھسلا اور وہ نیچے گر گئیں۔ میں نے آپا سے پوچھا کہ فضلی صاحب جیسے بامروّت شاعر کا کتا ہوتے ہوئے آخر عنبر نے ایک شاعرہ پر حملہ کیوں کیا تو انھوں نے اُسے بے قصور ثابت کرنے کے لیے یہ وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ سیڑھیوں والے کمرے کے وسط میں ایک کھال بچھی رہتی تھی۔ وہ اس ہرن کی کھال تھی جسے فضلی صاحب نے بڑی محبت سے پالا تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کی کھال کو بہت انہماک سے ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا۔ گھر کے سب لوگ اس کھال کی خصوصیت سے واقف تھے کوئی اس پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ زہرا نگاہ اوپر جاتے ہوئے اس کھال پر سے گزریں تو عنبر سے نہ رہا گیا۔ اس نے صرف بھونک کر اُن کو اس کھال کی اہمیت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ یہ سمجھیں کہ اُس نے اُن پر حملہ کیا ہے۔ وہ نیچے گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ آپا نے پانی کے چھینٹے دیے۔ شربت کے کچھ گھونٹ پلائے تب زہرا کو ہوش آیا یہ بے ہوش ہو جانے والی بات زہرا نگاہ کو یاد نہیں ہے بہرحال اس صورت میں عنبر کا جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس جرم کی پاداش میں ہی عنبر پہ یہ قیامت گزری ہو جب آس پاس کے سب کتے ایک متحدہ محاذ بنا کے اُس پہ ٹوٹ پڑے تھے۔

مری کے قیام کے زمانے میں جگر صاحب کو میں نے بہت خوشگوار موڈ میں پایا حد یہ ہے کہ میں نے اُن سے تصویریں کھنچوانے کی فرمائش بھی کی۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے، ممکن ہے میں تلاش کروں تو ایک دو تصویریں مجھے مل بھی جائیں۔ ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اپنی کون سی غزل سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس غیر متوقع سوال سے جگر صاحب کچھ پریشان سے ہوئے ان کے لیے یہ مشکل تھا کہ کسی ایک غزل کو اپنے پورے کلام پر فوقیت دیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا کہ شاعر کے لیے اس کا کلام اولاد کی طرح ہوتا ہے، اور اولاد میں تفریق نہیں کی جاتی۔ میں نے کہا بہرحال مجھے جو آپ کی غزل سب سے زیادہ پسند ہے اس کے کچھ شعر سناتا ہوں اور پھر میں نے یہ شعر سنائے۔

سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے
وہ لبِ نے نواز کیا جانے
ناخنِ عشق کتنے ٹوٹ گئے
گرہِ نیم باز کیا جانے
آئینے کی نزاکتیں ہے ہے
دستِ آئینہ ساز کیا جانے

معلوم ہوتا تھا جیسے جگر صاحب کے تازہ کلام کے ماحول نے ان کے ذہن کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا کہ یہ غزل اُن کی یاد میں دھندلا گئی تھی۔ وہ ایک دُور کی آواز کی طرح ان اشعار کو سنتے رہے، انھوں نے کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ اگر یہ اُن کے

اپنے شعر نہ ہوتے تواُن کی نزاکت کے بارے میں کچھ کہتا لیکن شاعر کو اس کے کلام کی خوبیوں کا احساس دلانا بڑی جسارت ہوتی، لہٰذا میں نے صرف پہلے شعر کو پڑھ کر صبر کیا۔

سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے
وہ لبِ نے نواز کیا جانے

جگر صاحب کو بھی نے نواز کی طرح یہ نہیں معلوم تھا کہ سننے والوں پر ان اشعار سے کیا گزر سکتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں جب لاہور میں گلبرگ کا علاقہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ ہمارے دوست عاشق مزاری نے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ایک بہت پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ انھوں نے بڑے شوق سے گلبرگ میں مکان بنایا تھا۔ اور یہ تقریب شاید گھر آباد کرنے کے سلسلے میں تھی۔ عاشق مزاری ایسی زندہ اور تابندہ طبیعت کے مالک تھے کہ ان کے بارے میں کبھی فرصت سے لکھوں گا اس دعوت میں ایک بہت خوش ذوق خاتون شریک تھیں جو سری نگر سے آئی ہوئی تھیں۔ ان کا پورا خاندان لاہور میں آباد تھا صرف وہ اکیلی اپنے شوہر کے ساتھ کشمیر میں رہتی تھیں۔ ہمارے سول سروس کے ایک ساتھی جنھیں انگریزی بولنے اور طنز آمیز باتیں کرنے کا بہت شوق تھا اُن خاتون سے اُلجھ گئے۔ وہ خاتون انگریزی بولنے میں اُن سے کم نہیں تھیں۔ اور طنز کا جواب طنز سے دینا جانتی تھیں۔ کھانے کے دوران ان دونوں کی گفتگو خاصی تلخ ہوگئی۔ میں نے اردو میں مداخلت کر کے بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔ اس امید میں کہ اردو میں یہ دونوں فریق اپنا جارحانہ انداز برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ خاتون نے تو اردو میں مجھ سے بات کر کے انگریزی میں اپنی جوابی کارروائی سے دستبردار ہونے پر آمادگی کا اظہار کیا، لیکن ہمارے ساتھی جو اس نزاع میں اپنی برتری ثابت کرنے پر مصر تھے کسی طرح انگریزی میں اپنے تیز اور ترش حملوں سے باز آنے پر تیار نہ تھے۔ کھانے کے بعد جب ہم سب ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھے تو یہ معرکہ پھر شروع ہوگیا۔ عاشق مزاری اور اُن کی بیگم اور ساتھ ساتھ اُن کے خاتون کی بہنیں اس صورتِ حال سے سب ہی پریشان تھے۔ ہمارے دوست جو انگریزی کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے جب کافی کی پیالی میں دودھ اور شکر ڈالنے کے لیے رکے تو میں نے ان خاتون سے فرمائش کی کہ آپ اتنی اچھی آواز کو بحث میں کیوں ضائع کر رہی ہیں کوئی غزل کیوں نہیں سناتیں میرا یہ کہنا تھا کہ ان کی چھوٹی بہنوں نے بڑے زور سے اس فرمائش کی تائید کی۔ انھوں نے کہا باجی سے غزلیں ضرور سنیے یہ ترنم سے بہت اچھی غزلیں سناتی ہیں۔ پوری محفل نے تائید کی تو بحث کا دروازہ بند ہوگیا۔ اُن خاتون نے آرام سے کافی پی کر فیض کی یہ غزل شروع کی "کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے" ایک تو ان کی آواز بہت اچھی تھی دوسرے غزل کا انتخاب بہت خوب تھا، تیسرے جس طرز میں انھوں نے یہ غزل سنائی وہ عام طرزوں سے خاصہ مختلف تھا۔ ان کی غزل سرائی کا عجیب تاثر ہوا۔

وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی وہ سارے عنوان وصال کے سے، فیض کے اس مصرعے کے بعد تو ہمارے دوست کی ساری بحث ایک لغو اور لایعنی بکواس معلوم ہونے لگی غزل ختم ہوئی تو خاتون کو بہت داد ملی اور مزید غزلوں کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے فیض کی تین غزلیں اور سنائیں۔ جتنی بد مزگی سے محفل کا آغاز ہوا تھا اتنی ہی خوبصورتی سے اس کا اختتام ہوا۔ محفل کے بعد ان خاتون اور خاص کر ان کی بہنوں نے میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ میں نے غزل کی فرمائش سے ان کی بہن کو ایک بحث کے عذاب سے بچایا۔ انھوں نے کہا ہمیں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں آج کی اس بد مزا شام کے بعد باجی آئندہ لاہور آنے سے توبہ ہی نہ کر لیں پھر انھوں نے ماڈل ٹاؤن میں اپنے گھر پر مجھے بڑے اصرار سے مدعو کیا۔ دو تین دن بعد وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ خاتون

آرٹسٹ بھی ہیں میں نے ان کی تصویروں کی ایک چھوٹی سی نمائش کا بندوبست بھی کر دیا۔ نمائش کے اختتام پر انھوں نے مجھ سے کہا میں اتنے سال سے پاکستان آ رہی ہوں، لیکن آج تک نہ میں نے فیض کو سنا نہ جگر کو سنا اور نہ زہرا نگاہ کو مجھے ان تینوں کا کلام سننے کی حسرت ہے۔

اتفاق سے ان دنوں جگر صاحب لاہور آئے ہوئے تھے۔ اُن کے اعزاز میں محفلیں منعقد ہو رہی تھیں، جن میں ان سے ملنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کوئنز روڈ پر جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ زہرا نگاہ بھی لاہور میں آئی ہوئی تھیں، اور اُن سے حضرت کی وساطت سے جن کا ان کے خاندان سے دیرینہ تعلق تھا اور جنھیں وہ احتراماً چچا کہتی تھیں، کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ جگر صاحب اور زہرا نگاہ کی حد تک تو میں ان کی حسرت پوری کر دوں گا، رہا فیض صاحب کا معاملہ تو شاید اس کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔ غرض چند روز بعد جگر صاحب، زہرا نگاہ اور حضرت میرے گھر آئے۔ کچھ مہمان تھے جن میں بعض سخن فہم تھے اور بعض صرف ان ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کے مشتاق۔ وہ خاتون حیران تھیں کہ ان کی حسرت اتنی جلدی کیسے پوری ہو گئی۔ جگر صاحب نے ایک کیف میں ڈوب کے تین چار غزلیں سنائیں چھوٹی سی محفل، جگر صاحب کی شخصیت اور ان کے سخن کا جادو یہ ایک یادگار تجربہ تھا۔ وہ خاتون جگر صاحب کے لحن کو جذب کرنے کی کوشش میں لگی تھیں۔ لیکن نظریں ان کی زہرا نگاہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں زہرا ایک نہایت نازک اندام لڑکی تھیں۔ چہرے پر ایک عجب حزن و ملال کی کیفیت نظر آتی تھی۔ آواز میں درد و گداز کا رچاؤ تھا۔ وہ خاتون ایک مصوّر کی حیثیت سے ان کی شخصیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور یہ جائزہ بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا لاہور سے رخصت ہونے سے پہلے وہ میرے گھر آئیں اور شکریہ کے طور پر مجھے ایک تصویر دے گئیں جس میں اس تاثر کا انعکاس تھا جو زہرا نے ان کے ذہن پر چھوڑا تھا۔ انھوں نے تصویر دیتے ہوئے کہا، یہ زہرا کی تصویر نہیں ہے، یہ اس تاثر کا عکس ہے جو انھیں دیکھ کر مجھ پر ہوا تھا۔ مجھے اس تصویر میں زہرا سے زیادہ دوستو یوسکی کے ایک ناول کی ہیروئن سونیا نظر آتی ہے۔

جو بے بسی اور بیچارگی کا ایک پیکر تھی۔ اس کے نیچے میں نے غالب کا یہ مصرعہ بھی لکھوا لیا ہے۔ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" حضرت نے الطاف گوہر کے ذریعے فیض صاحب کے گھر پر ایک محفل منعقد کرائی جس میں ان خاتون کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر فیض صاحب پر لکھتے وقت مناسب رہے گا۔

سری نگر روانہ ہونے سے پہلے وہ خاتون کئی دفعہ زہرا نگاہ حضرت کے اور میرے ساتھ ڈرائیو پر گئیں اس دوران گفتگو کم اور غزلیں زیادہ ہوتی تھیں۔ ایک غزل وہ سناتی تھیں اور ایک غزل زہرا۔ خواتین ایک دوسرے کو چونکہ داد نہیں دیتیں، لہٰذا داد دینے کا کام صرف حضرت اور میں کرتے تھے، ساتھ ساتھ حضرت کے چٹکلے بھی چلتے رہتے تھے۔ بہت خوشگوار شامیں گزرتی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے حضرت کو وہ غزل سنوائی جس سے عاشق مزاری کے گھر پہ محفل کا رخ بدل گیا تھا۔ "وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے" حضرت نے کچھ رسمی سے انداز میں داد دی۔ دوسرے روز انھوں نے بتایا کہ یہ وہ طرز ہے جس میں میری پر نانی اپنی زندگی کے آخری دنوں بہادر شاہ ظفر کی غزل سنایا کرتی تھیں۔

چند مہینے پہلے میں لاہور گیا تو معلوم ہوا وہ خاتون کشمیر چھوڑ کے لاہور میں آ بسی ہیں۔ میں نے انھیں فون کیا۔ گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اب نہ انھیں جگر یاد ہیں نہ فیض نہ زہرا۔ اگر کچھ یاد ہے تو بس حضرت کے جملے۔ ایسی صورت میں حضرت کی شخصیت کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ نہ کرنا ظلم ہوگا۔ انھوں نے کہا ایک روز جب ہم ڈرائیو کے لیے نکلے تو سامنے

سے آنے والی موٹر کی تیز روشنی کو دیکھ کر حضرت نے بے اختیار کہا تھا" بد تمیز نظریں نیچی کرو" یہ ایسی بات ہے جو بھلائی نہیں جا سکتی، میں نے پوچھا اگر میں اپنے کسی مضمون میں آپ کا نام لکھ دوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا" خدا کے لیے میرا نام نہ لکھیے گا، اور جو چاہیں لکھ دیں۔"

۱۹۵۶ء کے اواخر میں میرا تبادلہ ڈیرہ غازی خاں ہو گیا۔ وہاں میں نے ہنگاموں سے لبریز تین سال گزارے۔ سب سے بڑا ہنگامہ جس سے میں دوچار ہوا وہ تمام سیاسی جماعتوں کا جو حکومت کے خلاف متحد تھیں ڈیرہ غازی میں راست اقدام تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں پہلی بار ڈیرہ غازی جیسے پسماندہ ضلع کو پہیہ جام ہڑتال کا ہدف بنایا گیا تھا۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جس صبر آزما مرحلے سے مجھے نمٹنا پڑا وہ میلہ مویشیاں کا انعقاد تھا۔ میں نے یہ کہہ کر کہ مجھے بیلوں، بھینسوں اور اونٹوں کے میلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے معذرت کرنا چاہی تو منتظمین نے کہا کہ ڈپٹی کمشنر کی خصوصی توجہ کے بغیر اس قسم کی کوئی تقریب ضلع میں کامیابی سے منعقد نہیں کی جا سکتی۔ جہاں دیدہ زمینداروں نے مجھے سمجھایا کہ اس قسم کے کام تو ڈپٹی کمشنر کے فرائض میں داخل سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ تذبذب کے بعد میں نے یہ شرط لگائی کہ اگر اس میلے کے ساتھ ایک کل پاکستان مشاعرہ بھی کیا جائے تو میں مکمل تعاون کے لیے تیار ہوں۔ زمینداروں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا، پھر تحصیلداروں سے رائے لی اور مجھے یقین دلایا کہ وہ مشاعرے کے مصارف برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ افسر مال اور تحصیلداروں سے میں نے بات کی جب مجھے یقین ہو گیا کہ مشاعرے کے انتظامات میں کوئی دشواری نہیں ہوگی تو میں نے ایک بڑا مشاعرہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ بندی میں میرے دوست انور شبنم دل نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں میں پڑھاتے تھے بھرپور حصہ لیا۔ اس مشاعرے میں وہ تینوں ہستیاں شریک ہوئیں جن کی حسرت ہماری کشمیری مہمان آرٹسٹ کو تھی یعنی فیض، جگر اور زہرا۔ اُن کے علاوہ لاہور سے شعرا کی ایک پوری کھیپ آئی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ احمد ندیم قاسمی آئے تھے یا نہیں، باقی سارے شعرا موجود تھے۔ حد یہ ہے کہ پشاور کے شعرا بھی شریک تھے۔ اُس زمانے کے مشاعرہ لوٹنے والے شعرا میں صرف سید محمد جعفری اور جمیل الدین عالی رہ گئے تھے۔ جعفری صاحب نے تو نہ بلائے جانے پر احتجاج بھی کیا تھا۔ میلہ مویشیاں کی نسبت سے انھوں نے کہا تھا۔ "یہاں شاعر وہی چلتا ہے جو دلکی بھی چلتا ہو۔" مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کے لیے تمام ریسٹ ہاؤس ریزرو کر لیے گئے تھے لاہور سے شاعروں کو لانے کے لیے ایک کار اور دو بسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک بس اس وقت پہنچی جب مشاعرہ اختتام کے قریب آ لگا تھا۔ نووارد شعرا کی خاطر مشاعرے میں جان ڈالنے کے لیے ضروری تھا کہ جگر صاحب اور فیض صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ اہلِ محفل کو ایک بار پھر اپنے کلام سے نوازیں۔ دونوں نے بخوشی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ زہرا نگاہ اپنی غزلوں کا کوٹہ پورا کر کے رخصت ہو چکی تھیں۔ مشاعرے کی صدارت کے لیے ہاشم رضا صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔ جو اس وقت بھاولپور ڈویژن کے کمشنر تھے۔ وہ سرکاری ذمہ داریوں کی وجہ سے نہ آ سکے مجبوراً مجھے صدارت کرنا پڑی۔ لیکن میری حیثیت صدر سے زیادہ منتظم کی تھی۔ پہلے تو مجھے یہ فکر تھی کہ لاپتہ ہونے والی بس کہیں دریائے سندھ میں تو نہیں ڈوب گئی۔ اس زمانے میں آمد و رفت کشتیوں کے اوپر بنائے جانے والے پل کے ذریعے ہوتی تھی اور ہر وقت کسی حادثے کا احتمال رہتا تھا۔ اور جب وہ بس رات ایک بجے کے قریب پہنچی تو یہ پریشانی ہوئی کہ ان شاعروں کو کس طرح نمٹایا جائے۔ اگر جگر صاحب اور فیض صاحب دستگیری نہ کرتے تو مشاعرہ اُکھڑ جاتا۔ ان دونوں کی وجہ سے ایک بس بھر شاعروں کو بھگتانے میں ہمیں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ اور شعرا اہلِ ڈیرہ غازی خاں کی خوش انتظامی سے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں

یہ دھڑکہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کے پہنچنے سے پہلے مشاعرہ برخواست نہ ہو جائے۔ نووارد شعرا کے بعد جگر صاحب دو غزلیں سنا کے رخصت ہو گئے اور پھر فیض صاحب نے محفل ہاتھ میں لے لی۔ وہ نظمیں سناتے رہے، اور لوگ دل کھول کے داد دیتے رہے۔ مجھے ڈیرہ غازی خاں کے عوام کی فیض شناسی اور فیض صاحب کی عوام نوازی پر بڑی حیرت ہوئی اور مشاعرہ ہماری توقعات سے بہت زیادہ کامیاب رہا۔ ڈیرہ غازی خاں والے اب بھی اس پینتیس سال پہلے کے مشاعرے کو یاد کرتے ہیں۔

فیض صاحب اس زمانے میں "پاکستان ٹائمز" کے مدیر تھے۔ ان کی واپسی سے پہلے میں نے ڈیرہ غازی خاں کے مسائل پر اُن سے گفتگو کی۔ جس مسئلے کا میں نے اُن سے خاص طور پر ذکر کیا وہ یہ تھا کہ ضلع کا رقبہ بہت بڑا ہے اور آبادی کم ہے۔ اگر ساٹھ ستر ہزار جفاکش کسان ضلع میں آجائیں تو کافی رقبہ زیرِ کاشت آسکتا ہے اور گندم کی پیداوار میں خاصہ اضافہ ہو سکتا ہے، فیض صاحب بڑی ہمدردی سے میری باتیں سنتے رہے اور جانے سے پہلے انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ضرور ساٹھ ستر ہزار جفاکش کاشت کار پنجاب کے مرکزی اضلاع سے بھیجنے کا بندوبست کر دیں گے۔ یہ میری خوش فہمی اور فیض صاحب کی خود اعتمادی کا کمال تھا۔ اگر مدبّر کے قلم میں اتنی طاقت ہوتی تو حالات کتنے مختلف ہوتے۔

اب میں جگر صاحب کی طرف لوٹتا ہوں جو اس مضمون کا موضوع ہیں۔ جب جگر صاحب نے جو کراچی میں فضلی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہمارے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ قبول کر لیا تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ ان کے قیام کے لیے کیا انتظام کیا جائے۔ میں انھیں اپنے ہاں ٹھہراتا تو سرکاری مصروفیت اور پھر میلہ مویشیاں کے بکھیڑوں سے مجھے اتنا وقت نہیں ملتا کہ میں جگر صاحب کی مدارات کا حق ادا کر سکتا۔ اہل ڈیرہ غازی خاں نے چونکہ میرے اصرار پر مشاعرے کی ذمہ داری قبول کی تھی میں نے ان کی دلچسپی کی خاطر فری اسٹائیل ریسلنگ کا اہتمام کیا تھا۔ اُس زمانے میں اس طرح کی آزاد کشتی بہت مقبول ہو رہی تھی جس میں امریکہ یورپ کے پہلوان اپنے فن کی اس طرح داد دیتے تھے کہ حریف کا مار مار کے کچومر نکال دیتے تھے اور پھر اس کچومر شدہ پٹے ہوئے پہلوان میں ایسی توانائی آجاتی تھی کہ وہ رستم کی طرح اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے حریف کا بھرتہ بنا دیتا تھا اس طرح کی کشتی ان دنوں صرف کراچی اور لاہور میں ہوتی تھی۔ پاکستانی پہلوانوں میں صرف گاما خاندان والوں نے اس طرح کی کشتی کو اپنایا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس خاندان کے آٹھ پہلوانوں کو دعوت دی۔ تاکہ کشتی کے مقابلے تین دن جاری رہیں اور لوگوں کے لیے ان ہنگامہ خیز مناظر کو دیکھنے کے بعد مشاعرے کا ثقافتی بوجھ اٹھانا آسان ہو جائے۔ یہ کشتیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ لوگ گھوڑے اور اونٹ کا ناچ بھول گئے۔ ڈیرہ غازی خاں کے دولڑکوں نے تو تین روز یہ تماشا دیکھ کر اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ ایک مہینے بعد اُن کی کشتی دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ ان آٹھ پہلوانوں کے لیے ایک مکان خالی کرایا گیا، پھر اس میں ان کی مطلوبہ غذا کا ذخیرہ فراہم کیا گیا، جو تین کے بجائے دو ہی دن میں ختم ہو گیا۔ جسے پورا کرنے میں خاصی دشواری ہوئی اس لیے کہ ڈیرہ غازی خاں کے بادام پہلوانوں نے قبل از وقت ختم کر کے انتظامیہ کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا بادام مظفر گڑھ سے اور اصلی گھی دیہات سے منگوانے کی ضرورت پڑی۔ اس کے علاوہ جلسہ گاہ کے وسط میں ان کشتیوں کے لیے خاص اکھاڑے بھی بنوانے پڑے۔ مجھے میلے، مشاعرے اور دنگل کے سلسلے میں تمام انتظامات کی نگرانی کرنا تھی لہٰذا میں جگر صاحب کی میزبانی پوری طرح نہیں کر سکتا تھا ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جگر صاحب کم از کم تین چار دن ہمارے مہمان رہیں۔ میرے ساتھی باری صاحب نے جو نہایت نفیس طبع اور خوش مذاق آدمی ہیں اور جو ڈیرہ غازی خاں میں اُس وقت پولیٹکل اسسٹنٹ تھے اپنی کوٹھی جگر صاحب کے لیے خالی کر دی۔ وہ کوٹھی ڈپٹی کمشنر کے مکان سے ملی ہوئی تھی اس طرح جگر صاحب کی رہائش کے لیے بہترین انتظام ہو گیا۔ اب سوال ہوا ان کی

میزبانی کے لیے کسی معقول اور مزاج شناس آدمی کے انتخاب کا۔ اس سلسلے میں میرے دوست شاکر حسن صاحب نے جو اس وقت ملتان میں متعین تھے میری بڑی مدد کی۔ میں جب ملتان جاتا تھا تو اُن کے گھر پر صابر دہلوی صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ طرح طرح کے قصے سناتے تھے۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ قادر الکلام اس لیے کہ خوش آواز لڑکیوں کو شاگرد بنا کے ان کے لیے غزلیں پہ غزلیں لکھتے تھے، اور ان کی آواز اور اپنے شعروں سے بالواسطہ مشاعروں پہ چھا جاتے تھے۔ یہ شاید وہی صابر دہلوی تھے جن کا ذکر ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے فراق پر اپنے مضمون میں کیا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے جوش اور فراق میں ایک قیامت خیز تنازعہ ہو گیا تھا۔ صابر صاحب نے مجھ سے فراق اور جوش کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ وہ اپنی نوخیز، خوش آواز شاگرد، شاعرات کے کلام کی خوبیاں گنوانے میں لگے رہتے تھے۔ البتہ ایک چیز پر انھیں بڑا ناز تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جگر صاحب کے انداز میں اُن سے بہتر کوئی نہیں پڑھ سکتا۔

اس نسبت سے جگر صاحب کی میزبانی کے لیے ان سے زیادہ مناسب شخص کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بخوشی اس خدمت کے لیے جگر صاحب کی آمد سے ایک دن پہلے ڈیرہ غازی خاں آ گئے۔

جگر صاحب جب آئے تو ان کے ساتھ ایک بہت منفرد شخصیت والے شاعر بھی تھے۔ میں اُن سے واقف نہیں تھا۔ وہ تھے جناب اشک رامپوری۔ جگر صاحب نے مجھے فضلی صاحب کا خط دیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں جگر صاحب کے ساتھ اشک رامپوری کو بھیج رہا ہوں یہ بہت قابلِ احترام بزرگ ہیں۔ غضب کا شعر کہتے ہیں۔ تم ان کا خاص خیال رکھنا۔ فضلی صاحب اگر یہ تاکید نہ بھی کرتے تب بھی میں ان کے احترام میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ اوّل تو ان کا جگر صاحب کے ساتھ آنا ہی کافی تھا۔ دوسرے ان کی شخصیت میں عجب دلکشی تھی۔ کھلتا ہوا رنگ، خوبصورت چہرہ، نہایت مناسب تراش کی داڑھی اور لمبے بال، تصوف اور شعر کا حسین امتزاج جس کا کمال گیارہ سال بعد میں نے بابا ذہین شاہ صاحب کی ذات میں دیکھا۔ اشک صاحب کے ہوتے ہوئے جگر صاحب کی تنہائی دور کرنے کے لیے کسی اور کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی صابر دہلوی نے حقِ خدمت اس طرح ادا کیا کہ میں ان کا بہت ممنون تھا۔ جگر صاحب بھی ان کی خدمت گزاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک رات کھانے کے بعد میں نے ان کی تعریف میں یہ کہہ دیا کہ انھیں اپنے شعروں سے زیادہ اپنے پڑھنے کے انداز پہ ناز ہے کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ یہ بالکل آپ کی طرح پڑھتے ہیں۔ اس کا جواب جگر صاحب نے ایسا دیا کہ بیچارے صابر دہلوی شرمندہ سے ہو گئے۔ انھوں کہا "ہاں ممکن ہے میرے طرز میں پڑھتے ہوں۔ لیکن لہجے کی شائستگی کہاں سے لائیں گے۔"

ڈیرہ غازی خاں میں جگر صاحب کے چار روزہ قیام کے دوران مجھے ان کے لیے رمی کا انتظام کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ممکن ہے اشک رامپوری سے گفتگو میں وہ اتنے محو رہے ہوں کہ وقت گزاری کے لیے انھیں کسی اور شغل کی ضرورت نہیں پڑی۔ یا ہو سکتا ہے وہ صابر دہلوی کے ساتھ دو تین گھنٹے رمی کھیل لیتے ہوں۔ لیکن میں نے انھیں کبھی اس کھیل میں مصروف نہیں دیکھا۔ ہوتا یہ تھا کہ دوپہر کو میں جگر صاحب کے پاس کھانے کے وقت چلا جاتا تھا اور رات کو جگر صاحب، اشک رامپوری اور صابر دہلوی میرے ہاں تشریف لے آتے تھے۔ رات کی یہ محفلیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ دو دفعہ جگر صاحب نے اپنا کلام بھی بغیر کسی فرمائش کے عطا کیا۔ میں نے ان کی چار غزلیں ٹیپ بھی کر لی تھیں۔ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزلوں کے مقابلے میں ان کی ریکارڈنگ بہت اچھی ہوئی تھی۔ لیکن بد قسمتی سے کسی خوش ذوق نے وہ ٹیپ اڑا لیا۔ اس زمانے میں کیسٹ کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ دو غزلیں جو ٹیپ ہوئی تھیں وہ مجھے یاد ہیں ایک غزل تو انھوں نے کئی سال پہلے کراچی کے ایک مشاعرے

میں پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

اس غزل کا طرز اتنا شگفتہ اور آسان ہے کہ جب ہم ۱۹۵۲ء میں ٹریننگ کے سلسلے میں کنیڈا گئے تو ایک محفل میں کنیڈین لڑکوں اور لڑکیوں نے ہمیں اس غزل کے دو شعر سنائے جو انھوں نے ہمارے کسی ساتھی سے سیکھ لیے تھے۔

دوسری غزل یہ تھی جسے جگر صاحب ان دنوں بہت کیف میں پڑھتے تھے:

صیاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے
پرواز اسیر پر پرواز نہیں ہے

ڈیرہ غازی خاں میں جگر صاحب کی آمد ایک بہت بڑی عنایت تھی۔ لیکن اس میں میرے لیے پریشانی کا سامان بھی تھا۔ اور وہ پریشانی یہ تھی کہ میرے خاندان کے ادبی پس منظر کا مجھ سے کہیں زیادہ علم جناب اشک رامپوری کو تھا، وہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کی زندگی سے مجھ سے زیادہ واقف تھے، ان کے شعر انھیں بہت یاد تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا، اس لیے کہ یہ علم تو ان کے دیوان اور تذکروں سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ شیفتہ کے بیٹے محمد علی خاں اشکی کے اشعار بھی سناتے تھے۔ اور ان کی صاحبِ دیوان بیٹیوں ثروت اور مسرت کے شعر بھی انھیں یاد تھے۔ ان کے مقابلے میں، میں اپنے خاندان کی ادبی روایت سے بہت کم واقف تھا۔ ان کے سامنے مجھے اپنی کم علمی پر بڑا تاسف ہوتا تھا۔ میں موضوعِ سخن کو بدلنے کے لیے غالب کا سہارا لیا کرتا تھا۔ میرے غالب شناس دوست کہا کرتے ہیں کہ غالب ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کی دوا ہیں۔ اور میں اس میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ وہ ہر دوا کا توڑ بھی ہیں۔ غالب کے شعروں ہی سے میں اپنی کم علمی کو چھپاتا رہا۔ جب میں نے کراچی میں اپنے بڑے بھائی اکرام صاحب سے پوچھا کہ یہ اشک رامپوری ہمارے خاندانی پس منظر سے اس طرح کیسے واقف ہوئے۔ انھوں نے کہا تم انھیں نہیں جانتے؟ یہ اچھن صاحب ہیں، ہمارے دور کے رشتہ دار ہیں۔ ہمارے خاندان کی اس شاخ سے ہیں جو رامپور میں آباد ہے۔ میں نے کہا آج تک کہاں تھے۔ میں نے تو انھیں رامپور میں کبھی نہیں دیکھا انھوں نے بتایا کہ وہ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ وہاں سے وہ جرمنی چلے گئے، اور وہیں بس گئے۔ اور کسی طرح واپس آنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جب آئے تو بالکل مغربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پھر پیر صاحب گولڑہ شریف کی اُن پر نظر پڑ گئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ان کے ساتھ چلے گئے۔ تو یہ تھے اشک رامپوری پھر میری سمجھ میں آگیا کہ اشک رامپوری کے جن دو شعروں کو میں نے حاصل مشاعرہ سمجھا تھا ان کے پیچھے کیا اسرار کی دنیا تھا:

اک دن وہ مل گئے تھے سر رہگزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھیے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں

چند سال بعد جب مجھے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میں بڑے اشتیاق سے اُن سے ملنے کے لیے گولڑہ شریف گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا

کہ ان کا انتقال ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ وہاں وہ اچھن صاحب کے ہی نام سے مشہور تھے۔ اور انھیں بڑی محبت سے یاد کیا جاتا تھا۔ میں دیر تک ان کی قبر پہ کھڑا انھیں یاد کرتا رہا۔

جگر صاحب نہ آئے ہوتے تو مجھے اشک رامپوری سے ملنے کا اتفاق بھی نہ ہوتا۔ اب یہ لکھتے ہوئے میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ جگر صاحب ڈیرہ غازی خاں کے قیام کے زمانے میں رمی سے کیوں بے نیاز رہے۔ رمی تو وہ اس وقت کھیلتے ہوں گے جب انھیں بات کرنے کے لیے کوئی صاحبِ دل نہ ملتا ہوگا۔ اشک رامپوری کے ہوتے ہوئے انھیں کیا کمی محسوس ہوئی ہوگی۔ اچھن صاحب پر جو گزری تھی اپنے شیخ سے وابستگی میں جگر صاحب بھی اس کا تجربہ کر چکے تھے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ جگر صاحب پر تصوف کا غلبہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رسالت مآب ﷺ کی محبت میں وہ ڈوب گئے تھے۔ روضۂ اقدس پر ان کی حاضری کی مختلف روایتیں میں نے سنیں ہیں وہ سب بارگاہِ رسالت ﷺ میں ان کی مقبولیت کی گواہی دیتی ہیں۔ "اک رند ہے اور مدحت سرکارِ مدینہ"

ڈیرہ غازی خاں میں جگر صاحب کے چار روزہ قیام کی یاد میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی

رشید احمد صدیقی کے خطبات

ایک طویل مدت سے میں اس خوش گمانی میں مبتلا رہا ہوں کہ پاکستان میں مجھ سے بڑا رشید شناس اور رشید پرست اور کوئی نہیں ہے میں نے اپنی رشید شناسی کا ثبوت ۱۹۵۶ء میں رشید احمد صدیقی پر ایک مضمون شائع (نگار لکھنؤ) کر کے دیا تھا جس کے بارے میں رشید احمد صدیقی کے سب سے بڑے ممدوح ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا کہ رشید صاحب پر اس سے بہتر مضمون ان کی نظر سے نہیں گزرا اور میں نے اپنی رشید پرستی کا ثبوت گزشتہ بائیس سال کے دوران میں یوں دیا کہ رشید احمد صدیقی کے غیر مدون مضامین کے دو مجموعے (۱۔ نقش ہائے رنگ رنگ ۲۔ شیرازۂ خیال) شائع کیے جو اب نایاب ہو چکے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کی طباعت میں میرے ایک نہایت محترم اور مخلص دوست لطیف الزماں خاں (ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج ملتان) نے بڑی مدد دی تھی۔ ایک مدت تک میں ان کی مدد کو صرف نظیر نوازی پر محمول کرتا رہا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے والا دراصل رشید احمد صدیقی سے عشق کے معاملے میں میرا رقیب بھی ہے اور آگے چل کر وہ رشید احمد صدیقی پر ایسے کام کرے گا جو میرے کاموں پر سبقت لے جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے مالی محدودات کے باوجود رشید احمد صدیقی کی مزید غیر مدون تحریروں اور نایاب تصانیف کی طباعت کا بیڑہ اٹھالیا اور اس وقت تک ان کی دو چیزیں شائع کرنے میں کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس سلسلے میں وہ دو مجموعے اور بھی شائع کرنے والے ہیں۔ اگرچہ وہ پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے رشید احمد صدیقی کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا لیکن جس جامعیت کے ساتھ وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں غالباً اس جامعیت کے ساتھ کوئی اور انجام نہ دے سکے۔

غالب کے بعد اردو کے کئی عظیم اور ممتاز ارباب قلم کے خطوط کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان ارباب قلم میں جمال و کمال کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں شک نہیں کہ اردو میں غالب سے بڑا مکتوب نگار اب تک پیدا نہیں ہوا اور ان سے بڑا مکتوب نگار (اپنی تمام مکتوب نگارانہ خوبیوں کے اعتبار سے) شاید ہی کوئی پیدا ہو لیکن غالب کے بعد جن دو ایک بڑے مکتوب نگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں ان میں رشید احمد صدیقی کا نام ضرور آئے گا۔ کیا عجب کہ غالب کے بعد وہی سب سے بڑے مکتوب نگار ٹھہریں لیکن افسوس ہے کہ ان کی اس ممکنہ (نہ کہ مسلّمہ) عظمت کے باوجود ان کے خطوط کے مجموعوں پر سنجیدہ گفتگو نہیں ہو رہی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب ہم لوگ سنجیدہ معاملات میں بھی سنجیدہ رہے کہاں؟

زیر تبصرہ کتاب پر تصانیف رشید احمد صدیقی نمبر ۲ لکھا ہوا ہے اور اس کتاب کی پشتی جلد پر رشید احمد صدیقی کی ۸ زیر طبع

تصانیف کا اعلان کیا گیا ہے۔ اتنا بڑا منصوبہ کسی بڑے ادارے کا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن رشید احمد صدیقی کی تمام خوش نصیبیوں کے باوجود ان کی بد نصیبی یہ ہے کہ ان پر جتنا کام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (جس کی خدمت اور عظمت کو اجاگر کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ رشید احمد صدیقی کا ہے) میں ہونا چاہیے تھا یا پھر جتنا اور جیسا کام برصغیر کی بڑی یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے تھا یا پھر ان کی تصانیف اور تحریروں کی طباعت اور حفاظت کی طرف جتنی توجہ خود ان کے پڑھے لکھے صاحبِ ثروت بیٹوں کو دینی چاہیے تھی یہی نہیں کہ اب تک ان میں سے کوئی بات نہ ہو سکی بلکہ اس کے ہونے کے آثار تک نظر نہیں آتے۔ رشید احمد صدیقی کی وفات کے بعد ہندوستان میں ان پر رسالوں کے دو ایک اچھے نمبر (بالخصوص "تحریر" کا رشید احمد صدیقی نمبر مرتبہ مالک رام) نکلے۔ مجھے تو اس صدمے سے بھی گزرنا پڑا ہے کہ جب میں رشید احمد صدیقی کے غیر مدون مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کے بعد اس کی طباعت کے لیے کسی ناشر کی جستجو میں تھا تو اردو کے ایک یونیورسٹی پروفیسر دوست نے مجھ سے کہا۔ تمھیں شاید ہی کوئی ناشر ملے۔ یہاں..... رشید احمد صدیقی کی وہ اہمیت نہیں ہے جو ہندوستان میں ہے۔

یہ بات کم از کم اردو کے ایک پروفیسر کو نہیں کہنا چاہیے تھی۔ رشید احمد صدیقی اردو ادب کی ان گرانمایہ شخصیتوں میں سے ہیں جن کی اہمیت اور عظمت پر ہندوستان کی تقسیم کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ڈال سکتی۔ ان کے بغیر نہ ہندوستان کا اردو ادب مکمل ہو سکتا ہے نہ پاکستان کا۔

رشید احمد صدیقی کی اہمیت اور عظمت صرف یہی نہیں کہ وہ اردو کے بہت بڑے صاحبِ اسلوب ادیب ہیں ویسے ان کی عظمت کا صرف یہ پہلو انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ اردو ادب کی اس دیو پیکر نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اکثر لکھنے والے صاحبِ اسلوب ادیب تھے۔ رشید احمد صدیقی کے ارد گرد صاحبِ اسلوب ادیبوں میں مہدی افادی، سجاد انصاری، ناصر دہلوی، خلیقی دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، مولانا مودودی، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، مولانا صلاح الدین احمد جیسے لوگ موجود تھے۔ نوجوانوں میں آل احمد سرور اور خورشید الاسلام ابھر رہے تھے۔ ان دونوں کے بعد مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود ابھرے۔ اور اب اللہ کا فضل ہے کہ کوئی بھی صاحب اسلوب ابھرتا نظر نہیں آتا۔ ادیب اور شاعر کا مقابلہ صرف اپنے معاصرین سے نہیں ہوتا۔ اس کا مقابلہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں سے رہا کرتا ہے۔ اگر آپ رشید احمد صدیقی کو ماضی، حال اور مستقبل کے صاحب اسلوب نثر نگاروں سے ٹکرا کے دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ان کی کور کسی سے دب نہیں رہی ہے۔ ان کے اسلوب میں وہ طاقت اور توانائی ہے جو ماہ و سال کی گرد آسانی سے جذب کر سکتی ہے۔ ان کے اسلوب کی تازگی اور دلکشی آج بھی باقی ہے۔ میں ان کے اسلوب کی خوبیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لطیف الزماں خاں نے زیر تبصرہ کتاب کے دیباچے میں میرے مضمون کا خلاصہ نکات کی شکل میں لکھ دیا ہے۔ ان نکات میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ رشید احمد صدیقی اردو کے ان چند صاحبِ اسلوب ادیبوں میں سے ہیں جن کے اسالیب ذہن و ذوق کی ممکنہ تبدیلیوں کے باوجود اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے لطف و لذت سے کوئی ادب شناس اور صاحبِ ذوق اپنے آپ کو محروم رکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔

رشید احمد صدیقی اردو ادب کی مروجہ اصطلاحوں کے مطابق ایک مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوئے اور آخر تک مشہور و مقبول رہے۔ لیکن میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ وہ ایک مزاح نگار سے بڑے شخصیت نگار تھے اور اب زیر تبصرہ کتاب کی روشنی میں یہ سوچنا بھی غلط نہ ہوگا کہ خطبات نگاری میں ان کا پایہ شخصیت نگاری سے بھی برتر ہے۔ اگر رشید احمد صدیقی کے پورے

قد و قامت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے خطبات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ خطبات ادب کی کون سی قسم ہیں؟ اب تک خطبات کا تعلق ادب کی کسی مسلّمہ صنف سے نہیں رہا ہے۔ لیکن جس طرح انسانی زندگی کی ضرورت اور انسانی تہذیب کے نشو و نما کے نتیجے کے طور پر ادب میں نئی نئی چیزیں آتی جارہی ہیں اور ان کی بدولت ادب میں نئی اصناف کا اضافہ ہوتا جارہا ہے (مثلاً رپورتاژ یا ملاقات نگاری یعنی ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویوز) اسی طرح عہد حاضر کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی نے تحریر کی ایک نئی شکل خطبے کو جنم دیا ہے۔ خطبے مختلف مواقع پر دیے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے جلسۂ تقسیم اسناد سے لے کر بڑے ادیبوں اور شاعروں کے یادگاری جلسوں میں وقت کے کسی نہایت ممتاز ادیب یا مفکر سے جو لیکچر دلوایا جاتا ہے اسے خطبہ کہتے ہیں۔ خطبہ دینے کا شرف ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا۔ رشید احمد صدیقی اپنی ادبی زندگی کی ابتدا سے لے کر آخر تک نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے گئے۔ ان کے قدر دانوں میں علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کا نام سر فہرست ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ طرح طرح کے اعزازات سے نوازے گئے۔ ۱۹۶۳ء میں حکومت ہند کی طرف سے انھیں "پدم شری" کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۸ء میں میر اکادمی کا انعام دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں غالب کی شخصیت اور شاعری پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (جو ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے) دیا گیا۔ اردو اکادمی اتر پردیش نے ۱۹۷۳ء میں اردو کی خدمت کے سلسلے میں سب سے بڑا انعام دیا۔ ۱۹۷۶ء میں جامعہ اردو علی گڑھ نے ڈکتور ادب (پی ایچ ڈی) کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

اپنی عمر کے ساتھ ساتھ وہ اتنے ممتاز اور معتبر ہوتے چلے گئے کہ زندگی کے آخری دور میں ہندوستان کے بڑے بڑے علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں نے انھیں خاص خاص تقاریب میں صدر یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا۔ ایسے مواقع پر رشید احمد صدیقی نے وزیروں اور سفیروں کی طرح رسمی خطبے نہیں دیے بلکہ ایسے خطبے دیے جن میں ان کی تمام عمر کا علم، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، غور و فکر اور بصیرت عکس انداز ہے۔ پھر یہ کہ انھوں نے وہ خطبے پوری محنت سے لکھے اور اس طرح لکھے کہ ان میں ان کے منفرد اسلوب کی تمام خوبیاں اور دل آویزیاں جگمگا رہی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے ۱۷ خطبات پر مشتمل ہے۔ لیکن سولھویں خطبے (۱۹۷۵ء) کا عنوان ہے "ایک خطبہ جو دیا نہ جاسکا" یہ خطبات اردو زبان، اردو ادب، جدید غزل، غالب کی شخصیت اور شاعری، یوم اقبال، علی گڑھ...... ماضی و حال اور بہت سے تہذیبی مسائل پر مبنی ہیں۔ رشید احمد صدیقی فکر و نظر کی نئی جہتوں سے ناآشنا نہیں تھے۔ لیکن ان کی ہمدردیاں بڑی حد تک ان اقدار کے ساتھ تھیں جو مفید ہونے کے باوجود ہر دلعزیز نہیں رہیں ان اقدار کی حمایت اور وکالت میں رشید احمد صدیقی نے اپنے اسلوب کی ترغیبی قوتوں سے جس طرح کام لیا ہے وہ ان کا ایک کارنامہ ہے جس کا مشاہدہ اس کتاب کے ہر صفحے میں کیا جاسکتا ہے۔ آئیے لگے ہاتھوں دو چار نمونے یہاں وہاں سے دیکھتے ہی چلیں۔

> "کسی قوم، ملک یا معاشرہ، تہذیب اور شعر و ادب کے صالح اور صحت مند ہونے کا انداز اُس سلوک سے کیا جاتا ہے جسے وہ اپنی عورتوں کے لیے محفوظ و ملحوظ رکھتا ہے۔ جدید عورت اپنی آزادی اور ترقی کے بارے میں آج چاہے جتنا حسن ظن رکھتی ہو سنجیدگی سے سوچے اور زمانے کی سمت و رفتار کا جائزہ لیتی رہے تو محسوس کرے گی کہ در حقیقت اسے وہ طمانیت خاطر اور وقعت نصیب نہیں ہے جو وہ چاہتی ہے اور جو

اس کا حق بھی ہے۔ موجودہ دور میں جب اس کے منشا کے مطابق آزادی حاصل ہے اس نے اپنی تقدیر اور تصویر کو سدھارنے سنوارنے میں اتنا پایا نہیں ہے جتنا کھویا ہے .... اس کی حیثیت گلزار نسیم کی بکاؤلی سے زیادہ نہیں جو بالاخر ایک موقع پر کس حسرت واندوہ سے تاج الملوک سے اعتراف کرتی ہے، جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں۔"

"انھوں نے اپنے کلام کی طرح اپنی پہلو دار شخصیت سے ہر طبقے اور ہر مسلک کے عزیزوں اور دوستوں سے کیسے کیسے ویرانے آباد کر لیے تھے۔ غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی کی معمولی سے معمولی باتوں کو اکثر اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے زندگی کے بڑے بڑے حقائق انہی معمولی باتوں کی کھلی، چھپی یا بدلی ہوئی شکلیں ہوں جن کو ہنسی خوشی انگیز کرنے اور کرتے رہنے میں انسان کی بڑی جیت ہے ....

"مجھے معلوم نہیں جس زندگی سے کل آپ کا سابقہ ہوگا وہ آپ کو کیا انعام دے گی یا انتقام لے گی۔ البتہ چاہتا یہ ہوں کہ دونوں حالتوں میں آپ اسے گوارا نہ کریں کہ انعام آپ کو خرید ے، یا انتقام آپ کو پست کر دے ......"

خطبات کا یہ مجموعہ رشید احمد صدیقی کی تصانیف میں ایک عظیم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی طباعت کے لیے ہمیں لطیف الزماں خاں اور مہر الہی ندیم دونوں کا ممنون ہونا چاہیے اور رشید احمد صدیقی کی آئندہ تصانیف کا منتظر رہنا چاہیے۔

عمر سیف الدین ترجمہ / ثروت صولت

دیت

کوجہ علی قفس میں بند ایک تربیت یافتہ شیر کی طرح اپنی دکان کے اندر جس میں دروازے کے علاوہ کہیں اور سے روشنی نہیں آسکتی تھی تن تنہا، رات دن ہتھوڑا چلاتا اور چنگاریاں اڑاتا رہتا تھا۔ جسمانی طور پر وہ ایک طویل القامت، چوڑے چکلے پہلوان کی طرح تھا۔ پنجے بھاری اور بازو قوی تھے۔ وہ اس تاریک کمرے میں دس سال سے کچے لوہے کو پیٹ پیٹ کر جو تلواریں بناتا چلا آرہا تھا، ان کی وجہ سے اس کا نام نہ صرف اناطولیہ کے طول و عرض میں بلکہ سارے رومیلی (۱) اور سلطنت عثمانیہ کے تمام سرحدی علاقوں میں مشہور ہو چکا تھا۔ حتی کہ استنبول میں بھی ینی چیری (۲) سپاہی وہی خنجر، تلوار اور نیزے خریدتے تھے جن پر "عملِ استاد علی" لکھا ہوتا تھا۔ وہ تلوار کو آب دینے اور دھار لگانے کے فن کا ماہر تھا۔ اس کی تلواروں میں اتنی لچک ہوتی تھی کہ وہ دوہری ہو جاتی تھیں لیکن ٹوٹتی نہیں تھیں۔ یہی خوبی اس کے بنائے ہوئے خنجروں اور چاقوؤں میں تھی۔ ایسی تلواریں اور خنجر کوئی دوسرا شخص نہیں بنا سکتا تھا۔ یہ اس کا مخصوص راز تھا جس سے کوئی دوسرا واقف نہیں تھا۔ اس کام میں کوئی مددگار اور ساتھی بھی نہیں تھا۔

کوجہ علی کم گو شخص تھا، زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ تلوار، لوہے اور آگ کے علاوہ اس کی گفتگو کا کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ فروخت کے موقع پر سودے بازی بھی نہیں کرتا تھا۔ خریدار جو قیمت دیتا تھا وہی لے لیتا تھا۔

کوجہ علی اپنی دکان سے باہر بہت کم جاتا تھا۔ اس کی بھٹی صرف جنگ کے زمانے میں بجھتی تھی۔ اس موقع پر وہ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد پھر واپس آجاتا تھا اور اپنے کام میں پہلے کی طرح مصروف ہو جاتا تھا۔

شہر میں اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ جلاد کے ہاتھ سے بھاگا ہوا شریف انسان تھا، کوئی کہتا تھا کہ وہ ایک غریب انسان تھا اور اس کا کوئی پیارا مر گیا تھا جس کے غم میں وہ ترک دنیا پر مجبور ہو گیا۔ لیکن وہ جس پروقار انداز، جس سکون و اطمینان سے متوازن اور معقول گفتگو کرتا تھا وہ اس قسم کی باتوں کی تردید کرتی تھی۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور یہاں کہاں سے آیا ہے۔ لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ کوجہ علی موٹے سے موٹے اور سخت سے سخت لوہے کو ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کر مکئی کے پتے کی طرح باریک بنا دیتا تھا اور یہ کہ اپنے فن میں ماہر تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے

سنے گئے تھے کہ ذوالفقار کا راز اس کو معلوم ہے۔ کوجہ علی کی موجودگی ہر شخص کے لیے باعث افتخار تھی اور ہر شخص اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف کرتا تھا۔ کوجہ علی نے یہ فن کسی دوسرے سے نہیں سیکھا تھا۔ وہ خود ہی اس کا موجد تھا۔

جو لوگ اس سے زیادہ واقف تھے ان کا کہنا ہے کہ کوجہ علی ابھی بارہ سال کی عمر کا تھا کہ کسی نے اس کے باپ کو جو ایک سخت مزاج بیلر بے (صوبیدار) تھا قتل کر دیا تھا اور وہ یتیم ہو گیا تھا۔ اس کا چچا وزیر تھا اور بہت دولت مند تھا۔ اس نے کوجہ علی کو اپنے پاس رکھ کر اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تاکہ وہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو سکے۔ لیکن کوجہ علی کسی کا احسان نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ اپنے چچا کے گھر سے فرار ہو گیا اور ایک آوارہ گرد انسان کی طرح پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کو ناپتا ہوا مختلف ملکوں اور شہروں کے چکر لگاتا رہا۔ آخر میں مشرقی ترکی کے شہر ارض روم میں ایک بوڑھے لوہار کے پاس ملازم ہو گیا۔ تیس سال کی عمر تک اناطولیہ میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا جہاں اس نے کچھ دن نہ گزارے ہوں۔ لیکن اس نے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ کسی کا احسان نہیں لیا۔ وہ محنت سے جی نہیں چراتا تھا اور اپنی روزی خون پسینہ ایک کر کے کماتا تھا۔ دولت کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جتنا کماتا اس پر قناعت کرتا اور مگن رہتا۔ ایک تخلیقی کام کرنے والے انسان کی طرح اس نے دولت کے لیے اپنے فن کو استعمال نہیں کیا بلکہ فن کو ترقی دے کر اپنے ذوق کی تسکین کی۔ تلوار کی دھار پر آب چڑھانا اس کا دلپسند مشغلہ تھا۔

کوجہ علی، جنگوں میں رضاکار کی حیثیت سے شرکت کرتا تھا اور جب اس موقع پر ینی چری سپاہیوں اور سگبانوں (۳) سے اپنی بنائی ہوئی تلواروں کی تعریف سنتا تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ اگر وہ زندگی بھر اسی طرح کام کرتا رہتا تو نہ معلوم کتنے ہزار غازیوں کو نہ ٹوٹنے والی تلواریں، ڈھالوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے نیزے، زرہ کو کاٹنے والے خنجر بنا کر دیتا۔ وہ جب کام کے وقت اپنی اس خدمت پر غور کرتا تو دل ہی دل میں خوش ہوتا، چہرے پر مسکراہٹ آجاتی، سندان (۴) پر ہتھوڑے کی رفتار تیز ہو جاتی اور ہر طرف چنگاریاں اُڑنے لگتیں۔

وہ صبح کی نماز کے بعد سے دس گھنٹے تک برابر کام میں لگا رہتا۔ کبھی ہتھوڑا چلاتا، کبھی لوہے کو بھٹی میں ڈالتا، کبھی ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی میں ڈالتا، آگ کے شعلے بجھنا شروع ہوتے تو ان کو بھڑکاتا۔ جب آذان کی آواز کان میں آتی تو کام بند کر دیتا۔ ہتھوڑا رکھ کر پسینہ پونچھتا۔ دروازے پر آتا اور ایک چادر کندھوں پر ڈال کر باہر نکل جاتا۔ دکان کے دروازے میں تالا ڈالنے کی ضرورت اس نے کبھی محسوس نہیں کی۔ بس دروازہ اچھی طرح بند کر دیتا اور میدان میں واقع مسجد کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس نے اکثر عصر کے وضو سے مغرب کی نماز پڑھی۔ جب ایسا موقع آتا تو وہ صرف ہاتھ دھونے پر اکتفا کرتا۔

مسجد شہر کے ایک کنارے پر واقع تھی۔ اس سادا سی مسجد میں صرف غریب طبقے کے لوگ آتے تھے۔ مینار میں سڑک کی طرف ایک چھوٹی سے کھڑکی تھی۔ موذن اسی میں سے سر باہر نکال کر اذان دیتا تھا۔

ایک دن کوجہ علی جب مغرب کے وقت مسجد میں گیا تو اس نے وہاں معمول سے بہت زیادہ لوگوں کو بیٹھے دیکھا۔ روزانہ مسجد میں صرف تین مشعلیں جلتی تھیں، لیکن اب رمضان کے مہینے کی طرح ہر طرف مشعلیں روشن تھیں لوگ دروازے تک بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ قونیہ سے دو درویش آئے ہیں اور وہ عشاء کی نماز تک مثنوی پڑھیں گے۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کوجہ علی گھر واپس نہیں آیا۔ وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ مسجد ہی میں بیٹھا رہا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ "مثنوی سننے سے ذرا طبیعت بہلے گی۔" اس نے سوچا۔ چنانچہ وہ درویشوں کے روح پرور نغموں کو خشوع و خضوع کے ساتھ سنتا رہا۔ مثنوی کے اشعار پر وہ صاحبِ دل انسان کی طرح بار بار وجد میں آجاتا تھا۔ وہ معنی اور مطلب نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ مولانا روم کی

مثنوی فارسی زبان میں تھی اور اس کی زبان ترکی تھی، لیکن زبان کا آہنگ اور درویشوں کا ترنم کے ساتھ پڑھنے کا انداز ایسا تھا جو کوجہ علی کو سرمست کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے خون میں گرمی پیدا ہو گئی اور سارے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ قریب تھا کہ اس کی زبان سے اللہ ہو، اللہ ہو کا نعرہ بلند ہو لیکن جذبات کی شدت کی وجہ سے آواز گلے سے نہیں نکلی۔ اسی حالت میں اس نے عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر مسجد سے نکلا لیکن دکان کی طرف جو اس کا گھر بھی تھی نہیں گیا۔ نیند غائب ہو چکی تھی۔ گرمیوں کی رات تھی۔ تارے چھٹک رہے تھے اور سنہرے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر سے اُدھر تیر رہے تھے۔ وہ اُس راستے پر چلتا رہا جو بستی سے مویشیوں کی منڈی تک جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک پُل آ گیا جس کے نیچے ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ وہ پل کے کنارے بنی ہوئی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ چشمے کے پانی میں تاروں کا عکس پڑنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پانی کے اندر کے پتھر جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوں۔ کنارے پر تاریکی میں ایک درخت پر بلبل چہچہا رہی تھی۔ کوجہ دیر تک مست و بے خود کھڑا رہا وہ اپنے آپ میں کھو چکا تھا۔ مثنوی نے اس کے دل کے تاروں کو ہلا دیا تھا۔ کافی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ اچانک پیچھے سے گرجتی ہوئی آواز آئی۔

"تم کون ہو؟"

اس آواز کے ساتھ وہ خواب کے عالم سے بیدار ہوا۔ پُل کے دوسرے کنارے پر نظر ڈالی تو دو تین سائے اس کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔

"اجنبی نہیں ہوں۔" اس نے بے اختیاری میں جواب دیا۔

"آخر ہو کون؟"

"علی ہوں۔"

"کون علی؟"

اب سائے قریب آ چکے تھے۔ جب وہ کوجہ علی سے دو تین قدم دور رہ گئے تو انھوں نے پہچان لیا۔

"کوجہ علی کوجہ علی۔"

....

"ارے تم ہو استاد علی؟" ایک نے کہا۔

"ہاں میں ہوں علی۔" اس نے جواب دیا

"تم اس وقت یہاں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاید تمھارا ہتھوڑا پانی میں گر گیا ہے۔" .... کوجہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ لوگ شہر کے صوباشی (پولیس سپرنٹنڈنٹ) کے آدمی تھے اور گاؤں کا گشت کر رہے تھے۔ جب کوجہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا تو ان کو حیرت ہوئی۔ راتوں کو آوارہ پھرنے والے لوگ ان کی نظر میں چوروں سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ اگر کوجہ علی کے علاوہ کوئی اور شخص اس موقع پر پکڑا جاتا تو پولیس کے یہ سپاہی اس کی ڈنڈوں سے اچھی طرح مرمت کرتے۔ لیکن وہ "استاد علی" کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کے ساتھ بد سلوکی نہیں کی۔

"استاد کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" افسر نے سوال کیا۔
"نہیں"
"تو پھر آدھی رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ عشاء کی نماز کے بعد ادھر اُدھر پھرنا ہمارے آقا کو پسند نہیں۔"
"ہاں معلوم ہے۔"
"تو پھر تم یہاں کس کی تلاش میں ہو۔"
"کسی کی تلاش میں نہیں۔"
علی کے جواب مختصر تھے، اس نے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ وہ زیادہ بات کرنے کا عادی بھی نہیں تھا۔ لیکن افسر شریف تھا اور جانتا تھا کہ علی ایک باعزت اور شریف انسان ہے۔ اس لیے اس نے صرف یہ کہا کہ
"اچھا اب اپنے گھر جاؤ، ادھر اُدھر نہ پھرو۔"
کوجہ علی واپس ہو گیا۔ اس کے قدم گھر کی طرف تیزی سے اُٹھ رہے تھے لیکن اس کے دل و دماغ میں مثنوی کے اشعار کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ بلبلوں کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ دور مویشیوں کے باڑے سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جب دُکان کے سامنے پہنچا تو دروازہ کسی قدر کھلا نظر آیا۔ کچھ دیر خیالات میں گم اسی طرح کھڑا رہا۔ سوچنے لگا کہ دروازہ تو اس نے سختی سے بند کر دیا تھا، پھر یہ کیسے کھل گیا، شاید ہوا سے کھل گیا ہو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دکان میں سندان اور ہتھوڑے کے سوا اور کون سی قیمتی چیز تھی جسے کوئی چراتا۔ اور یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو کسی کے کام کی نہیں تھیں کہ چور ان کو اُٹھانے کی زحمت مول لیتا۔ وہ اندر چلا گیا لیکن اندر سے کواڑ میں چٹخنی لگالی۔ پولیس کی مداخلت کی وجہ سے وہ ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس طرح شہر میں رہنا اور قید کی زندگی گزارنا دونوں برابر ہیں لیکن کیا کیا جائے دیہات میں روزگار نہیں۔ اسی حالت میں تھا کہ نیند کا غلبہ ہوا۔ اس نے ایک کونے سے ریچھ کی کھال نکالی اور اس کو بچھا کر لیٹ گیا۔

(۲)

کوجہ علی، گہری نیند سو رہا تھا کہ دروازے کھٹکھٹانے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔
"کون ہے؟" اس نے نیم غنودگی کی حالت میں پوچھا۔
صبح ہو چکی تھی اور کواڑوں کے شگافوں سے دن کی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کوجہ علی اس طرح گہری نیند کبھی نہیں سویا تھا۔ ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے اُٹھ جایا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور جوتے پہنے بغیر دروازے پر جا کر چٹخنی کھول دی سامنے بڑی بڑی مونچھوں اور اونچی ٹوپی والا پولیس افسر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے سندے کی ٹوپی پہنے دو آدمی اور کھڑے تھے۔ کوجہ علی نے حیرت کے ساتھ ان پر نظر ڈالی۔ معاملہ کیا ہے اس نے دل میں سوچا۔
"علی استاد ہم تمھاری دکان کی تلاشی لیں گے" پولیس افسر نے کہا۔
"کس لیے۔" علی نے پوچھا۔
"آج رات بوداک بے کے مویشیوں کے باڑے میں چوری ہو گئی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" علی نے جواب دیا۔

"ہم اسی سلسلے میں تمھاری دکان کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ جن لوگوں نے بھیڑ کو چرایا ہے انھوں نے اس بھیڑ کو پل کے جو ذبح کیا تھا اور جو رقم چرا کر لے گئے ہیں اس میں سے کچھ تھیلی میں وہیں چھوڑ گئے تھے" افسر نے وضاحت کی۔

"ارے بھائی: اس سارے واقعہ سے میرا کیا تعلق ہے؟" علی نے پوچھا۔

"اس تھیلی کے سکّوں میں سے ایک سکہ آج صبح تمھاری دکان کے سامنے ملا ہے۔" ذرا اپنی دہلیز پر نظر ڈالو، یہاں خون کے دھبے بھی موجود ہیں۔"

علی نے اپنے دروازے کی صاف ستھری دہلیز پر نظر ڈالی تو واقعی وہاں خون کے دھبے موجود تھے۔

"میں نے پچھلی رات تم کو پُل کے اوپر کھڑے دیکھا تھا۔ تم وہاں کیا کر رہے تھے؟" افسر نے پوچھا۔

علی نے اس مرتبہ بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور پولیس افسر سے کہا۔

"آئیے تلاشی لے لیجیے"

افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ دُکان میں داخل ہوا۔ جب وہ بھٹی کے پاس پہنچا تو چیخ پڑا۔

"یہ ہے یہ ہے۔"

علی نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ زمین پر ایک کھال پڑی ہوئی تھی جس کو تازہ تازہ ادھیڑا گیا تھا۔ علی حیران رہ گیا۔ کیا ہوا، کیسے ہوا۔ پولیس کے سپاہی نے فوراً کھال کو اٹھالیا۔ ابھی تک گرم تھی۔ سپاہی اور ساتھ آنے والے لوگ کبھی پولیس افسر کو یکھتے کبھی استاد علی پر نظر ڈالتے۔

"بتاؤ چرائی ہوئی رقم تم نے کہاں چھپائی ہے۔؟" پولیس نے غضبناک انداز میں علی سے پوچھا۔

"میں نے کوئی رقم چوری نہیں کی۔"

"انکار مت کرو۔ بھیڑ کی کھال تمھاری دکان سے برآمد ہوئی ہے۔"

"یہ کھال میں نے یہاں نہیں رکھی۔"

"اگر تم نے نہیں رکھی تو کس نے رکھی؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

کوجہ علی دراصل زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ رات کو جب پولیس افسر نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ پُل پر کیا کر رہا ہے تو اس نے اس وقت بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا یہ طرز عمل اس کے خلاف جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں بوداک بے نے پانچ سو بھیڑیں فروخت کر کے جو رقم حاصل کی تھی وہ بھی باڑے سے چوری ہو گئی تھی اور چوروں نے باڑے کے چوکیدار کو رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ دوسرے دن اس چوکیدار نے حاکم شہر کے سامنے بیان دیتے ہوئے ایک چور کو علی کی شکل اور صورت جیسا بتا دیا۔ رات کو دیر تک اپنے گھر کے باہر رہنا، بھیڑ کی کھال کا گھر کے اندر ملنا اور چوری کی ہوئی تھیلی کی رقم میں سے ایک سکّے کا علی کے دروازہ کے پاس دیکھا جانا ایسی شہادتیں تھیں جن کی موجودگی میں علی کا الزام سے انکار کرنا بے معنی تھا۔ یہ شہادتیں علی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ چنانچہ قاضی عدالت نے چوری کے الزام میں اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ کوجہ علی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ فیصلہ سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ لیکن اب تقدیر

کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کھڑا ہوا اور بلند آواز میں قاضی سے درخواست کی:
"جناب عالی! میرا ہاتھ نہ کاٹا جائے بلکہ سر قلم کرنے کا حکم دیا جائے۔"
اس نے ساری عمر میں پہلی مرتبہ درخواست کی تھی۔ لیکن قاضی ایک منصف مزاج حاکم تھا، اس لیے اس نے انکار کرتے ہوئے کہا:
"نہیں میرے فرزند! تم نے کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔ اگر تم چوکیدار کو قتل کر دیتے تو تمھارا سر قلم کیا جاتا۔ سزا جرم کے مطابق دی جاتی ہے۔ تم نے صرف چوری کی ہے۔ اس لیے صرف ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حق یہی ہے اور شریعت بھی یہی کہتی ہے۔"
کوجہ علی کو سزا کی تکمیل ہونے تک ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ علی کے لیے اس کے ہاتھ اس کے سر سے زیادہ قیمتی تھے۔ لچکدار تلوار بنانا اور اس کو آب دینا ان ہی دو ہاتھوں کا کام تھا۔ وہ غازیوں کے لیے یہ کام دولت کمانے کی خاطر نہیں کرتا تھا بلکہ اپنا فرض سمجھ کر کرتا تھا۔ اس کو اپنے کام سے غیر معمولی عشق تھا۔ لیکن اب وہ کمرے میں قید قصاص کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے محبوب کام سے محروم ہو جانے اور لولا ہو کر زندگی گزارنے کا خیال اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ چونکہ اس نے دولت کمانے کی کبھی کوشش نہیں کی اس لیے بازو کی دیت ادا کرنے کے لیے اس کے پاس رقم بھی نہیں تھی۔
شہر کے تمام لوگ کوجہ علی جیسے ماہر استاد کا ہاتھ کاٹے جانے کے اندیشے سے رنجیدہ تھے۔ ہر شخص اس کو پسند کرتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت، جوانمرد اور محنتی انسان تھا اور ایک ایسے شخص کا ساری عمر ایک لولے آدمی کی طرح زندگی گزارنے کا تصور سب کے لیے تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ فوج کے سپاہیوں نے جن کے لیے وہ دستی تلواریں تیار کرتا تھا آپس میں مشورہ کر کے اسکو بچانے کی تدابیر پر غور کیا۔ وہ بستی کے سب سے دولت مند آدمی حاجی محمد کے پاس گئے۔ یہ شخص ایک قصاب تھا اور قارون کی طرح دولت کا مالک تھا۔ لیکن بہت کنجوس اور خسیس تھا۔ اس نے فوجیوں کی اس تجویز پر کہ وہ کوجہ علی کے ہاتھ کی دیت ادا کر دے دیر تک غور کیا پہلے تو طرح طرح کے نخرے کیے، منہ بنایا، انکار میں سر ہلایا۔ لیکن آخر میں سوچا کہ فوج والوں کو خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اس نے کہا:
"چونکہ آپ لوگ اتنا اصرار کر رہے ہیں، اس لیے میں علی کے ہاتھ کی دیت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے۔"
"وہ کیا ہے؟" سپاہیوں نے پوچھا۔
"اس کو زندگی بھر بغیر کسی معاوضہ کے میری خدمت کرنی ہوگی۔" اگر اس کو یہ شرط منظور ہے تو میں اس کے ہاتھ کی "دیت" ادا کر دوں گا۔"
"ٹھیک، بالکل ٹھیک" سپاہیوں نے کہا۔
سپاہی پولیس چوکی پہنچے اور حاجی قصاب کی شرط کوجہ علی کو بتائی۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہ قصاب کا کام نہیں کر سکتا۔ اس پر لوگوں نے سمجھایا کہ قصاب کا کام کرنا تمھارے لیے کیا مشکل ہے تم نے اس قدر جنگوں میں حصہ لیا، تلوار چلائی پھر تمھارے لیے بندھی بھیڑ کو زمین پر گرا کر ذبح کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ لیکن کوجہ علی کے لیے کسی شخص کا احسان لینا اور زندگی بھر کسی کی غلامی کرنا، ایک بد ترین عذاب تھا۔ اس نے نوجوانی میں اپنے چچا کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کیا تھا اور عیش و آرام کی زندگی پر لات مار کر غربت کی زندگی گزارنا پسند کیا۔ اب قسمت کی ستمگری دیکھو کہ اس کو ایک کنجوس قصاب کی غلامی کرنا پڑ رہی

ہے۔ سپاہیوں کا اصرار جاری تھا۔ انھوں نے علی کو سمجھایا کہ حاجی قصّاب کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو گئی ہے اب وہ اور کتنا جیے گا۔
ں کے مرنے کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اپنا کام پھر شروع کر دینا اور ہمارے لیے تلواریں اور نیزے بنانا اس لیے استاد اب زیادہ
ت سوچو اور حاجی قصاب کی شرط تسلیم کر لو۔

سپاہیوں کے مسلسل اصرار پر آخر کار کوجہ علی راضی ہو گیا۔ حاجی قصاب نے اس کے ہاتھ کی دیت ادا کر دی اور اس طرح اس
کا ہاتھ کٹنے سے بچ گیا۔

(۳)

حاجی قصّاب نے جس دن کوجہ علی کے ہاتھ کی دیت ادا کی تھی، اس نے اسی دن سے کوجہ علی کو کام میں لگا دیا۔ حاجی قصّاب بڑا بد مزاج اور چڑ چڑا انسان تھا۔ ہر وقت بڑ بڑاتا رہتا تھا۔ کنجوسی کی وجہ سے کبھی کوئی نوکر نہیں رکھا۔ کوجہ علی کے آجانے کے بعد اس نے ساری ذمہ داریاں کوجہ علی کے سپرد کر دیں اور خود کام کرنا چھوڑ دیا۔ دکان کے ایک کونے میں چبوترہ بنا کر اس پر چٹائی ڈال دی تھی اور اسی پر بیٹھا حکم صادر کرتا رہتا تھا۔ کوجہ علی صبح کی نماز سے کئی گھنٹے پہلے اٹھتا اور بکرا منڈی جاتا جو بستی سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ وہاں سے جانور خرید کر لاتا، ان کو ذبح کرتا، کھال اتارتا پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گوشت لٹکاتا اور دن بھر اس کو فروخت کرتا۔ مغرب کی نماز تک وہ مصروف رہتا اس کے بعد کبھی تو بُلگر (۵) کا شوربا دیا جاتا۔ صرف شوربا، کھانے کی کوئی اور چیز ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی حاجی قصّاب اپنا بچا ہوا کھانا اس کے سامنے کر دیتا تھا جیسے کتے کو دیا جاتا ہے۔ رات کو دکان بھی وہی دھوتا تھا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹنا، پانی بھروانا حتّی کے گھر کے باغیچے میں کھاد لانا اور بچھانا بھی اُسی کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔

کوجہ علی صرف بُلگر کے شوربے اور بچی کھچی روٹی سالن پر کئی دن تک خدمت کرتا رہا۔ لیکن کام سے زیادہ اس کے لیے حاجی قصاب کے طعنے تکلیف کا باعث تھے۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ وہ علی کو اپنا احسان نہ جتاتا ہو۔

اے علی! میں نے تیرے ہاتھ کی دیت ادا کی ہے۔ اے علی! تو میرا غلام ہے، اگر میں دیت ادا نہ کرتا تو تو لولا نظر آتا۔ یہ جملے حاجی علی کے تکیہ کلام بن گئے تھے کوجہ علی چاہے کتنی ہی محنت و مشقت سے کام کرتا اس کو یہ جملے دن میں ایک دو بار ضرور سننا پڑتے۔ حاجی کو اپنی اس نیکی کا بار بار ذکر کیے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ وہ ہر حکم کے ساتھ اپنی گندی داڑھی، بد صورت شکل اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے کوجہ علی کو نیچے سے اوپر تک دیکھتا اور کہتا:

"یاد رکھو! تم میرے غلام ہو۔"

یہ جملے سن کر علی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ لیکن سوائے خاموشی کے اور کیا چارہ تھا۔ جانور کی کھال اتارتے وقت، خریداروں کے لیے گوشت کاٹتے وقت اور دوسرے کاموں کو انجام دیتے وقت اس کے کانوں میں یہی طعنے گونجتے رہتے تھے اور وہ سوچتا رہتا تھا کہ اس عذاب سے کس طرح نجات پائے۔ لیکن کسی فیصلے تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس نے تو کبھی کسی پر انگلی تک نہیں اٹھائی، کسی کو برا بھلا نہیں کہا۔ وقار و قناعت کے ساتھ زندگی گزاری، لیکن اب حاجی قصّاب کی صورت میں ایک بلا اس پر نازل ہو گئی ہے۔ وہ بھاگنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح اس کی عزت پر حرف آتا تھا۔ لوگ اس کو واقعی چور سمجھنے لگتے۔ لیکن حاجی کے جملے اس کے لیے موت سے زیادہ سخت ثابت ہو رہے تھے۔

(۴)

حاجی قصاب کا غلام بنے علی کو ایک ہفتے پورا ہو گیا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ وہ علی الصباح مویشیوں کی منڈی گیا اور بھیڑیں خرید کر لایا۔ مسلخ میں ان کو ذبح کیا، کھال اتاری اور دکان میں ان کو کاٹ کاٹ کر گوشت کے ٹکڑے اوپر لٹکا دیے۔ وہ دکان کے بائیں طرف رکھے ہوئے بڑے سے کالے پتھر پر چھرا تیز کر رہا تھا۔ حاجی قصاب اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ جب چھرا تیز کرنے کے بعد علی نے بڑی ٹانگ کاٹنا شروع کی تو حاجی قصاب آ گیا۔

"ابے یہ کیا کر رہا ہے؟" حاجی قصاب نے نہایت کرخت آواز میں پوچھا۔

"ٹانگ کاٹ رہا ہوں۔" علی نے جواب دیا۔

"ابے سست، کاہل! صبح سے ابھی تک بس اتنا کام کیا ہے؟"

علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس نے اس مرتبہ حاجی قصاب کو گھور کر دیکھا۔ علی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "آج تک کسی نے اس کو سست اور کاہل نہیں کہا تھا، لیکن یہ شخص اس کے ساتھ صرف بد زبانی ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کی تحقیر کر رہا ہے۔" اس نے دل میں سوچا حاجی قصاب نے جب علی کو گھورتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنی اصلیت پر اُتر آیا اور کہنے لگا:

"مجھے گھور کیا رہے ہو! شاید تم بھول گئے کہ تمھارے ہاتھ کی دیت میں نے ادا کی تھی۔ اگر میں دیت ادا نہ کرتا تو آج تم لولے نظر آتے۔"

کوجہ علی نے طعنے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھسیانے انداز میں مسکرانے لگا۔

پھر یہ کہتے ہوئے کہ "ہاں لولا نظر آتا" وہ تیزی سے مڑا، اس کا رنگ پہلے سرخ ہوا پھر زرد، اس نے ایک بڑا سا چھرا اٹھایا۔ اپنی آستین چڑھائی اور پھر وہی ہاتھ گوشت کاٹنے والی لکڑی پر رکھ دیا اور دائیں ہاتھ سے چھرے کی ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ہاتھ کٹ کر الگ ہو گیا۔ حاجی قصاب نے دہشت سے آنکھیں پھیر لیں۔ علی نے اپنا کٹا ہوا پنجہ دوسرے ہاتھ سے اٹھایا اور اس کو حاجی قصاب پر پھینکتے ہوئے کہا:

"لو! جس ہاتھ کی تم نے دیت دی تھی وہ ہاتھ واپس لے لو۔"

پھر اس نے کٹے ہوئے ہاتھ پر اپنی آستین سے گرہ لگائی اور دکان سے نکل گیا۔

جس طرح لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا اسی طرح کسی کو یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ کہاں گیا۔

حواشی

(۱) اناطولیہ، ترکی کے اس علاقے کو کہتے ہیں جو ایشیا میں ہے۔ یورپ میں ترکی کی مقبوضات کو رومیلی کہا جاتا تھا۔

(۲) سلطنت عثمانیہ کی پیدل فوج کو "ینی چری" یعنی نئی فوج کہا جاتا تھا اور یہ دنیا کی پہلی باضابطہ فوج سمجھی جاتی ہے جس کی تشکیل چودھویں صدی کے شروع میں ہوئی تھی۔

(۳) سلطان کے کتّوں کا رکھوالا، یہ سگبان۔ ینی چری فوج کا ایک حصہ تھے۔

(۴) لوہے کا وہ ٹکڑا جس پر ہتھوڑے سے لوہا کوٹا جاتا ہے، نہائی بھی کہتے ہیں۔

(۵) اُبلے اور کوٹے ہوئے گیہوں کا شوربا۔

تخلیق: جسیم الدین ترجمہ /ڈاکٹر وفا راشدی

گن گن تارے

ڈوب چلے آکاش پہ تارے
رات کٹی ہے گن گن تارے
ٹوٹ گئی ہے آس پریتم
کیسے بجھے گی پیاس پریتم
رات کٹے گی تارے گنتے
میں تو ہوئی نراس پریتم

دور ہوئے تم مجھ سے ایسے
موج جدا ہوں جوں ساحل سے
رات ہے کالی بھپرا دریا
ناؤ بھی ٹوٹی جاؤں میں کیسے

میں تو ہوئی برباد پریتم
کس سے کروں فریاد پریتم
غم ہی تیرا ہے جیون ساتھی
ہائے رے یہ بیدار پریتم

کھولنے دو کالے بالوں کو
پھوڑنے دو غم کے چھالوں کو
بیت گئے وہ سکھ کے سمے اب
چھیڑنے دو دل کے نالوں کو

ڈوب چلے آکاش پہ تارے
رات گئے ہے گن گن تارے

(جسیم الدین کے گیتوں کا مجموعہ "رنگیلا نا ٹر ما نجھی" سے براہ راست)

ناظم حکمت / احمد مشتاق

پال رابسن سے

وہ ہمیں ہمارے گیت نہیں گانے دیتے رابسن
شاہین، گلوکار، نیگرو بھائی
وہ نہیں چاہتے کہ ہم اپنے گیت گائیں

وہ ڈرتے ہیں رابسن
پَو پھٹنے کے سمے ڈرتے ہیں اور دیکھنے سے
سُننے سے ڈرتے ہیں اور چھونے سے
وہ محبت کرنے سے ڈرتے ہیں
جیسی محبت ہمارے فرہاد نے کی
(یقیناً تمھارا بھی کوئی فرہاد ہوگا رابسن
کیا ہے اُس کا نام؟)

وہ ڈرتے ہیں بیج سے، دھرتی سے
بہتے ہوئے پانی سے
اور ایک دوست کے ہاتھ کی یاد سے
جو کسی رعایت کسی کمیشن کسی سود کا طالب نہیں
ایک ہاتھ جو کسی بے چین پرندے کے مانند اُن کے ہاتھوں میں کبھی نہیں ٹھہرا

وہ ڈرتے ہیں، نیگرو بھائی
ہمارے گیت انھیں ڈراتے ہیں رابسن

عربی افسانہ

محمد العربی الخطابی/قطب اللہ

ارغوانی روشنی

میرے جسم پر لاتعداد خراشیں پڑی ہیں اور ہاتھ میں ایک گہرا زخم ہے۔ میں نے زخم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، آہستہ آہستہ رینگ کر میں گھنے زیتون کے درخت کے نیچے آگیا ہوں اس کی شاخیں زمین کو چھو رہی ہیں۔ میں اس کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہوں پھر چاروں طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ چاند کی روشنی وادی میں پھیل رہی تھی۔

مجھے شدید بخار ہے، فضا بھی بہت گرم ہے۔ لو چاند پہاڑی کی اس جانب سے جھانکنے لگا اس کی روشنی میں پوری وادی نہا گئی۔ سامنے ایک چشمہ ہے ایسا لگتا ہے کہ اس میں خون کی آمیزش ہو۔ میرے زخم سے خون رس رہا ہے حالانکہ اس پر میں نے کپڑا لپیٹ رکھا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ اُف..... آج تو مجھے ہر چیز خون میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی ہے۔

میرے ساتھی کہاں گئے؟ کیا وہ لوگ راستہ بھٹک گئے! نہیں نہیں شاید میں ہی بھٹک کر یہاں آپہنچا ہوں۔

میرا سر چکرا رہا ہے۔ بخار بڑھتا جارہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس چاندنی رات میں فضا کیوں اتنی گرم ہے۔

میرے پُرسکون اور اجڑے گاؤں کی تصویر ذہن کے پردے پر ابھرتی اور ڈوبتی ہے ایک لمحہ کے لیے بھی میں اسے بھلا نہیں پا رہا ہوں۔ گاؤں کے پاس سے ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے اس سے ہمارے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ لیکن، آج کیا بات ہے اس کا پانی بھی مجھے سرخی مائل نظر آرہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسانی جسم کی رگوں میں سے وہ بھی کوئی رگ ہو۔ کاش آج میں اس کے کنارے ہوتا۔ شدید خواہش ہو رہی ہے کہ چُلّو میں بھر کر اس کا پانی پی کر شکم سیر ہو جاؤں۔ ایک دو قطرہ اس زخم پر بھی ٹپکالوں لیکن میرا بخار بڑھتا جارہا ہے اور تاحد نظر مجھے اس ارغوانی روشنی کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔

سعیدہ..... میری جان میرا چاند تو کہاں ہو گی تو ہی اس ندی سے چند قطرے میرے منہ میں ٹپکا دیتی اور میرے زخموں کو اس سے دھو ڈالتی لیکن تو کیسے ہاتھ لگائے گی اس پانی کو۔ اس میں تو خون بہہ رہا ہے۔

ارے تو رو رہی ہے؟ سعیدہ..... یہ کیا ہے۔ جس دن میں تم سے جدا ہو رہا تھا اس دن تو تمہاری آنکھوں میں نمی بھی نہیں آئی تھی۔ تم نے کہا تھا جاؤ میں تمہاری راہ دیکھوں گی۔ تم نے کتنے وعدوں کو نبھانے کا عہد کیا تھا اور آج رو رہی ہو.... تمہاری آنکھوں سے آنسو نہیں خون جاری ہے۔ سعیدہ، ندی کے پانی کی طرح، چاند کی روشنی کی طرح..... سارا گاؤں خون میں نہا گیا ہے۔

مجھے یاد ہے۔ سب اچھی طرح یاد ہے رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا، میں گھر سے مسلح ہو کر چپکے سے باہر آگیا تھا چاند اس رات پورے آب و تاب پر تھا، لیکن اس کی روشنی ارغوانی نہیں تھی۔ نرم سفید دودھیا تھی اور..... شاید..... ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے..... سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ہاں ہاں..... یاد آیا پھر میں گاؤں کے چاروں طرف پھیلے ناگ پھنی کے باڑ کو عبور کر کے دور چلا آیا پیچھے مڑ کر دیکھا تو..... اُف..... میرے خدا تم میرا تعاقب کر رہی تھیں گاؤں چاندنی میں کسی کالے دھبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہاں تم میرے سامنے تھیں۔ تمھارے سر پر سفید رومال بندھا تھا۔ سفید..... کہ سرخ یا چاندنی کی طرح ارے..... ہر چیز تو سرخ ہو رہی ہے۔

میرا سر کیوں چکرا رہا ہے۔ تمھیں بتاؤ سعیدہ..... بولو نا..... اس دن بھی تم نہیں بول رہی تھیں، صرف تمھاری بڑی بڑی کشادہ آنکھیں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے تمھارے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کیا کہا تھا تم نے..... ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے۔ سر بوجھل ہو رہا ہے۔ سارا منظر میرے لیے ایک بوجھ محسوس ہو رہا ہے ہاں..... شاید تم نے کہا تھا۔ جاؤ بہادری دکھاؤ، میں تمھارا آخری سانس تک انتظار کروں گی یہی آخری الفاظ یاد ہیں اس کے بعد میں وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گیا تھا۔

میں سعیدہ کو چاہتا ہوں، اپنے وطن سے پیار کرتا ہوں اور دونوں کا مطالبہ ہے کہ میں ایک سورما بنوں میں ایسا ہی کروں گا پھر سعیدہ کتنا خوش ہوگی میرے کارنامے سن کر وہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو اس زخم پر پھیر کر فخر سے کہے گی۔ واقعی تم جواں مرد ہو تم نے تو دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے میں اس وقت بھی اس کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر رہا ہوں۔ ارے..... اس کا ہاتھ سرخ ہو گیا۔ لیکن کیسے؟ ہاں..... پٹی سے جو خون رس رہا ہے۔ اس نے آج بھی وہی لباس پہن رکھا ہے سفید سنگ مرمر جیسے چکنے اس کے ہاتھ وہی کشادہ کجراری آنکھیں۔

اس دن میں نے کہا تھا۔ سعیدہ..... تھوڑی دیر اور رکو صبح ابھی دور ہے وہ بولی تھی نہیں..... ہرگز نہیں صبح بہت قریب ہے۔ تم صبح کی ہی تلاش میں تو ہتھیار لے کر نکلے ہو۔ لیکن میں تم کو جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا ہوں پھر نہ جانے کب گھر لوٹ کر آؤں۔ وہ چپ چاپ میرے پاس ندی کے کنارے بیٹھ گئی تھی اس نے میری طرف پیار سے دیکھا اور میں اس کی آنکھوں کی گہرائی میں اترتا چلا گیا پھر میرا دل تیزی سے دھڑکا..... میں جہاد پر جا رہا ہوں۔ میرا وطن مجھے آواز دے رہا ہے میں اُٹھ گیا اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے بالوں کو برابر کیا اور آہستہ سے بولی..... "جاؤ جواں مرد بنو!"

میرے ساتھی کہاں چلے گئے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میرے ساتھ تھے کتنا شدید معرکہ تھا، دشمن نے پوری طاقت سے حملہ کر دیا تھا اور ہم نے اس کا اسی طرح جواب دیا تھا، انھیں ناکامی ہوئی تھی۔ دوسری جانب چیخ و پکار اور شعلے نظر آرہے تھے۔ ہماری بندوقیں برافروختہ ہو گئی تھیں، محفوظ چٹانوں میں ہم نے مورچہ بندی کر لی تھی۔ کچھ لوگوں نے ایک اونچے ٹیلے سے دشمنوں پر گولے پھینکے تھے۔ ان کی بھاری بھرکم گاڑیوں کو برباد کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن وہ جہاز جو آن واحد میں نہ جانے کہاں سے آگئے تھے گولے بارود سے لیس ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے پھر دھماکوں نے کان کے پردے پھاڑ دیے اس کے بعد کیا ہوا..... مجھے نہیں معلوم کچھ پتہ نہیں یہ زخم کیسے لگا اور کس طرح میں گھسٹ گھسٹ کر یہاں آ پہنچا یہ کون سی جگہ ہے؟

کبھی کبھی میرا بچپن بھی مجھے بہلانے آجاتا ہے۔ پھر میں ۲۰ برس پیچھے چلا جاتا ہوں۔ غریب گاؤں کے معصوم بچے، کیسے

لیے کھیل کھیلتے ہیں۔ گاؤں کی ندی میں نہانے جاتے ہیں پھر انجیر توڑنے دوڑتے ہیں بھاگتے ہیں ایک دوسرے کو دوڑاتے ہیں کھیتوں میں چھپتے ہیں، ٹیلوں پر چڑھتے ہیں اور جب تھک کر چور ہو جاتے ہیں تو ہنستے ہوئے گھروں کو واپس آتے ہیں تاکہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا یا انجیر کے چند دانے حلق سے نیچے اتار لیں۔

گاؤں کی جھونپڑیوں اور کچے مکانات کے رہنے والوں کے پاس کچھ بھی تو نہیں جو اپنے اوپر اور بچوں پر خرچ کر سکیں ان کے لباس اور تعلیم کا انتظام کر سکیں یہ لوگ ہر چیز کے محتاج ہیں۔ کھیتوں پر دوسرے ملکوں سے آنے والوں نے قبضہ کر لیا ہے، نارنگی کے باغات اب اپنے نہیں رہے، مغربی ممالک کی منڈیوں کے حق میں گروی ہیں، بس صرف مزدوری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں جس سے پیٹ بھر کی روٹی بھی نہیں ملتی ہے۔

یہ سر کا درد کیسے دور ہوگا۔ ذہن کے پردے پر مختلف قسم کی تصویروں کے بننے بگڑنے کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ان منحوس جنگی جہازوں کے بازو کب ٹوٹیں گے..... کچھ لوگ کہتے ہیں اپنے آپ، ارے..... یہ ناممکن ہے وہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کل نیا سورج اُگے گا جو روشنی لے کر آئے گا۔ اور گاؤں میں خوشیاں بکھیر دے گا۔

میرا زخم..... سعیدہ..... میرے سر کا درد، میرے گاؤں کے معصوم بچے۔ گروی رکھا ہوا میرا وطن، اور اور..... اور..... اور ....ر........و........ا........

مضمون صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھیں

پروفیسر عبدالخالق بلوچ

بلوچی ادب میں تحقیق و تنقید

ادب میں تقدم اور بنیادی حیثیت "تخلیق" ہی کو حاصل ہے۔ ادبی تخلیق خواہ وہ کسی بھی نوعیت اور کسی بھی درجے کی
ب کی داغ بیل ڈالتی ہے اور سرمایۂ ادب کی ابتدائی تعمیر کرتی ہے، تہذیبی روایات اور ثقافتی ورثوں کو محفوظ کرتی اور نئی
ں تک منتقل کرتی ہے۔ تنقید و تحقیق کی منزلیں بعد میں آتی ہیں۔ ادبی تخلیقات کے تاثرات کا تجزیہ اور اس کی توجیہ، تعبیر و
بح وغیرہ تنقید کی راہیں ہموار کرتی ہیں ان کی دریافت، زمانی تعین، تنقیح، فنکاروں کا حقیقی تعارف، زمانی و مکانی رشتوں
ہ کی چھان بین، تحقیق کی جولاں گاہ بناتی ہے اور بتدریج تحقیق و تنقید کے اصول اخذ و متعین ہوتے رہتے ہیں۔ ایک لحاظ سے
ید کو تخلیق کا ہمرکاب بھی کہا جاسکتا ہے کہ تخلیق کار میں حاسۂ انتقاد بھی ہوتا ہے اور یہی حاسۂ انتقاد و رطب و یابس بس میں
قدر تمیز کراتا ہے اور ادب پارے کی نوک پلک درست کراتا ہے۔ لیکن یہ حاسۂ انتقاد منضبط تنقید کا پیش رو نہیں کہلا سکتا۔

تنقید و تحقیق کے ان داخلی محرکات کے ساتھ ساتھ خارجی محرکات بھی ہوتے ہیں، جو دوسری زبانوں کے ادب سے غیر
ی یا شعوری استفادہ کہلا سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر موضوعاتی اور فنی اعتبار سے ادبیاتِ عالم کے عناصر ترکیبی میں خاصا اشتراک
ہے اس لیے تنقید و تحقیق کے اصول کا اطلاق سرِ ادب پر خاصی حد تک ہو سکتا ہے چنانچہ ترقی یافتہ ادب سے ادبی تنقید و تحقیق
اصول بھی اپنائے جاسکتے ہیں۔ تحقیق، تنقید اور تحقیق کے شعبوں میں چراغ سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ بلوچی زبان خاصی
م زبان ہے۔ اس کے ڈانڈے پہلوی سے جا ملتے ہیں بلکہ بعض لسانی شواہد اس سے بھی قدیم تر ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن عرصہ
سے ضبطِ تحریر میں نہ آسکی۔ خانہ بدوش معیشت نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کرائی۔ قبائلی نظامِ حیات اور خانہ بدوش
ت کے تقاضے ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں، کہ وہ امور جنھیں تہذیبی چونچلوں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے نہیں ابھرتے لیکن
ت و احساسات کی کارفرمائیاں تو شدّت سے ہوتی ہی رہتی ہیں اور عقلیت پسندی RATIONALISM کی روک ٹوک بھی
ں ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی انفرادی مسرتوں اور شادمانیوں، حسرت و الم یا قبائلی کامرانیوں فخر و ادعا، محبت و نفرت وغیرہ اپنے اظہار
ور تیں پیدا کر ہی لیتے ہیں چنانچہ لوک گیت، لوک کہانیاں، وجود میں آتی ہیں۔ سرداروں کو خوش کرنے اور صلہ و انعام پانے
لیے ان کے اصلی یا مفروضی کارناموں کے گیت گائے جاتے ہیں اور اسی طرح جنگ نامے، رزم نامے یا راسو تخلیق ہوتے رہتے
۔ تمام زبانوں کی ادبیات کا آغاز کم و بیش اسی طرح ہوا ہے۔ بلوچی ادبیات کا نقطۂ آغاز بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا
ن و ادب کے فروغ و ارتقاء کے لیے جو لوازم ضروری ہوتے ہیں۔ بلوچی ادب اس سے محروم رہا ہے۔

بلوچی زبان کی بد قسمتی تو یہ رہی ہے کہ وہ ۱۹۴۰ء تک معرض تحریر میں نہ آسکی۔ اس کا شعری سرمایہ سینہ بہ سینہ ہی زندہ رہا۔ بلوچی کی رزمیہ، بزمیہ اور عشقیہ شاعری کا یہ عظیم سرمایہ بلوچ شعراء کی صدیوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سے بیشتر اب تک زیور طبع سے اراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے بلوچ ادب تمام تر اسی سرمائے پر مشتمل رہا ہے۔ بلوچ حکومتوں کی سرکاری اور علمی زبان فارسی رہی ہے۔ اس لیے بلوچی زبان کے پنپنے کے وہ محرکات پیدا نہیں ہو سکے جو اسے علمی و ادبی زبان کے اعلیٰ درجے پر فائز کر سکتے۔ انگریزوں کے دور میں بھی بلوچی کس مپرسی کا شکار رہی اور بلوچی ادب شاعری کی تنگنائے سے نہ نکل سکا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کراچی اور کوئٹہ میں بلوچی ادبی دیوان اور بلوچی اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ بلوچی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا لیکن یہ کتب قدیم شاعری اور لوک کہانیوں ہی پر مشتمل رہیں۔ حکومتِ بلوچستان نے رسالہ "اولس" جاری کیا جس میں بلوچی کے نثری مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح بلوچی نثر نگاری عام ہونے لگی۔

پاکستان سے پہلے بلوچی زبان میں نثری سرمایہ نہیں تھا اس لیے ادبی تنقید اور ادبی تحقیق کو کوئی راہ نہیں کھل سکی۔ پرانے حکمرانوں نے عوام کی خواندگی کو بھی قابلِ التفات نہ سمجھا، ان کی تعلیم جدید علوم سے روشناس کرانے، ادبیاتِ عالم سے واقف ہونے اور استفادہ کرنے کے مواقع بہم پہنچانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ پیش رفت ضرور ہوئی کہ بلوچ معاشرے کے لیے تعلیمی ترقی کے امکانات روشن ہو گئے اور بلوچستان حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کی بدولت بلوچ معاشرہ بیرونی دنیا سے متعارف ہو سکا۔ دینی، فکری، علمی و ادبی سفر کی راہیں کھلنے لگیں۔ بلوچی شاعری ہی نے جدید اثرات قبول نہیں کیے بلکہ نثر کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ سنجیدہ مضمون نگاری کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔

بلوچوں کی ادبی تاریخ کی تدوین بھی ہونے لگی اور بلوچی شاعری پر اظہار خیال بھی۔ جستہ جستہ مضامین میں بلوچی شاعری یا بعض شعراء کے کلام کے جائزے، تبصرے بھی لکھے جانے لگے۔ کچھ ادبی تنقید کی طرف بھی سرسری سی توجہ ہوئی۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے غلغلہ نے ادب کو زیادہ قابلِ التفات بھی تو نہیں رکھا۔

بلوچی زبان و ادب کی رسمی تدریس و تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ادبی سرمائے کو بڑھانے اس میں "RATIONALISM" کی راہیں نکالنے اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کرنے کی وہ افادیت نہیں نظر آتی جو بڑی محرک بنتی ہے۔ اس کے باوجود ادبیات کے کچھ شیدائی اس حق کو ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

بلوچی ادبیات میں تنقید کی جولانگاہ زیادہ وسیع تو نہیں اس کے اسباب بدیہی ہیں۔ جو کچھ ادبی تنقید نظر آتی ہے اس میں میر گل خان نصیر مرحوم، سید ہاشمی مرحوم، آزاد جمالدینی مرحوم، عبداللہ خان جمالدینی ...... وغیرہ کی کاوشیں نمایاں ہیں۔ میر گل خان مرحوم کے سوا جتنے دانشوروں کا نام لیا گیا ہے ان کے جستہ جستہ تنقیدی مضامین شائع تو ہوتے رہے ہیں لیکن تنقیدی مجموعوں کی ترتیب یا تالیف و تدوین اور اشاعت کی کمی نے جراُتِ رندانہ کی ہنوز منتظر ہیں جس کی بظاہر خاصی کمی نظر آتی ہے۔ رسالہ "اُلس" میں جو جستہ جستہ تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں وہ بھی کسی مرتب، مؤلف اور ناشر کا انتظار کر رہے ہیں۔

سردار خان گیشکوری کی بلوچی کی ادبی تاریخ کی دو ضخیم جلدیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور ابھی مصنف کی امورخانہ کاوشوں کا سلسلہ جاری ہے لیکن یہ انگریزی زبان میں ہیں اور بیرونی دنیا کو بلوچی ادبیات کی تاریخ سے روشناس کرانے کا بہت عمدہ وسیلہ ضرور ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں کھٹکتی ہیں۔ تعینِ زمانی کی قطعیت کی کمی، ادبی اقدار کے تہذیبی و معاشرتی محرکات کے عمل و رد

عمل کے جائزے کے فقدان کی وجہ سے ادبی تاریخ تشنہ رہ جاتی ہے اگر اس پر تنقید اور تحقیق کی چھوٹ بھی ہوتی تو اس ادبی تاریخ کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی اور پھر اس کے بعد اس کا بلوچی ترجمہ ہو جاتا تو بلوچی زبان و ادب میں گراں بہا اضافہ ہوتا۔

میر گل خاں نصیر مرحوم کی شخصیت بڑی قد آور ہے وہ بلوچی کے ممتاز ترین شاعر بھی ہیں۔ مورخ اور نقاد بھی۔ انھوں نے بلوچوں کی تاریخ بڑے معروضی اور حقیقت پسندانہ انداز سے مرتب کی ہے۔ بلوچی شاعری سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی نثری تصانیف کی زبان اردو ہے۔ ان میں بلوچی شاعری سے متعلق تین کتابیں ہیں۔ "بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی"، "بلوچی کی رزمیہ شاعری" اور "بلوچی کی عشقیہ شاعری"۔ اوّل الذکر کتاب کو تنقید کے ذیل میں تو نہیں لایا جاسکتا، تاہم اس میں شاعری کے پیرائے میں بلوچوں کے جو تاریخی واقعات اور تفاصیل بیان ہوئی ہیں۔ ان کی بڑی اچھی توضیح مل جاتی ہے اور ضمنی طور پر بعض نامور شعراء کے کوائف ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات بھی زیر بحث آگئی ہیں۔ میر صاحب مرحوم کی کتابیں "بلوچی کی رزمیہ شاعری" اور "بلوچی کی عشقیہ شاعری" ان کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ میر صاحب نے فنِ شاعری سے نظریاتی بحث بھی کی ہے اور بلوچی کی کلاسیکی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے، یہ تجزیہ تاثراتی نہیں، خاصی حد تک معروضی ہے۔ اسے ہم سائینٹیفک تنقید کے ذیل میں بھی لاسکتے ہیں۔ انھوں نے بلوچی شاعری کے محرکات، تہذیبی و معاشرتی عوامل کا اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ رزمیہ شاعری کے لوازمات سے بھی بھرپور بحث کی ہے اور بلوچی رزمیہ شاعری کے جائزے میں موضوع کی وضاحت کی ہے اور زبان و بیان کی خصوصیات کو بھی ابھارا ہے۔ بلوچی رزمیہ شاعری کی زبان و بیان کی امتیازی حیثیت سے غالباً پہلی بار میر صاحب مرحوم ہی نے واشگاف انداز میں پیش کی ہے اس کتاب میں بلوچی رزمیہ شاعری اپنی تمام خصوصیات و محاسن کو سمیٹ کر سامنے آجاتی ہے۔ "بلوچی عشقیہ شاعری" میں بلوچی اصنافِ سخن سے بھی بحث ہے۔ زبان و بیان کے تغیرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سادگی سے تصنع تک کے شعری سفر کو بھی اجمالاً بیان کیا ہے اور عشقیہ شاعری کے اجزائے ترکیبی، تصور حسن، وارداتِ قلبی، کوائف نفسیاتِ محبت، حسن کے خارجی بیان، سراپا، لب و رخسار، کاکل و گیسو، لباس، زیورات وغیرہ کے بیان میں شاعرانہ ندرتوں، زبان و بیان کی خوبیوں، تشبیہات و استعارات کی دل آویزیوں کی بھی وضاحت کی ہے بیشتر مقامات پر ان کی تنقید میں تجزیاتی و تشریحی رنگ پیدا ہو جاتا ہے اس کتاب کو بلوچی کی عشقیہ شاعری کی سچی تفسیر اور اچھی تنقید قرار دیا جاسکتا ہے...... لیکن یہ تینوں کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ شک نہیں کہ اس وجہ سے ان کی افادیت بڑھ گئی ہے اور پاکستان بھر میں بلوچی شاعری سے روشناس ہونے اس کے خد و خال کو سمجھنے، اس کے ذریعہ سے بلوچوں کو اور ان کے کوائف کو سمجھنے کی سہولت ہوگئی ہے اور قومی ہم آہنگی کا ایک بالواسطہ ذریعہ ہوگیا ہے۔ تاہم اگر ان کتابوں کا بلوچی ترجمہ ہو جائے تو بلوچی ادب میں بیش قیمت اضافہ ہو جائے گا۔

جہاں تک ادبی تحقیق کا تعلق ہے، بلوچی زبان میں اس کا کوئی خاطر خواہ شعبہ نظر نہیں آتا۔ ادبی تاریخیں اور تنقیدی مضامین تو ہیں بلوچی کے نامور شعراء کے کلام کی ترتیب اور ترجمے کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے لیکن "خانہ بدوش اشعار" بھی ملتے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کی گئی کہ ان کا اصل خالق کون ہے۔ بہت سے نامور شعراء کی شخصیت اور حالات سے متعلق افسانوی باتیں زیادہ ہوئی ہیں، تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہنے والی کلاسیکی شاعری کی تنقیح کی طرف توجہ نہیں کہ ایسی بھی شاعری ہے جس کے متعلق حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا خالق کون ہے، جن افراد سے اسے منسوب کیا جاتا رہا ہے وہ شخصیتیں شاعر تھے بھی یا نہیں یا محض شاعر کے بعض افراد کے متکلمانہ اندازِ بیان کی وجہ سے انھیں شاعر قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن پر غور و خوض تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نونہال دینیات

حکیم محمد سعید بہ تعاون حکیم محمد نعیم الدّین زبیری
پانچ حصے صفحات ۱۹۴ مجموعی قیمت -/۷۵ روپے
بیت الحکمت۔ بند مراد خاں مدینتہ الحکمت کراچی

نونہال دینیات، ۵ حصّوں پر مشتمل بچّوں کی دینی معلومات کے لیے درسی کتب کا ایک سلسلہ ہے جو محترم حکیم محمد سعید صاحب نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ دین اسلام کے جو چار شعبے عقیدہ، عبادات، معاملات اور سیاستِ مُدن ہیں اُن میں سے پہلے تین شعبوں کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اور اُن کی ترتیب میں پوری طرح قرآن حکیم کا تتبع کیا گیا ہے۔ یعنی سب سے پہلے بچوں کی توجہ عقیدہ کو درست کرنے کی طرف مبذول کی ہے۔ پھر عبادات کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔ ان میں بھی سب سے پہلے نماز کو لیا ہے اس لیے کہ عبادات میں یہ دین متین کا اوّلین رکن ہے اور کفر اور اسلام کے درمیان اس کی حیثیت حدِ فاصل کی سی ہے۔ نماز کے بعد زکوٰۃ کے اور پھر حج کے مسائل بتائے گئے ہیں لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود روزہ کا بیان کہیں نہیں دکھائی نہیں دیا۔ حالانکہ یہ دین کا نہایت اہم رکن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رکن سہواً چھوٹ گیا ہے ورنہ جہاں چوتھے حصہ کے آخر میں روزہ کھولنے کی نیت دی گئی ہے۔ اور دوسرے حصّوں میں فطرہ، عقیقہ اور جہاد کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اتنے اہم رکن کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

یہ طریقہ نہایت مستحسن ہے کہ پہلے حصہ سے ہی معاملات کو درست رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ معاملات کی درستی ہی سے حسنِ معاشرت پیدا ہوتی ہے اس لیے ضروری اور لازمی ہے کہ شروع ہی سے بچّوں کی ان خطوط پر تربیت کی جائے .... یہ سلسلہ پہلے ہی حصہ سے شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ اقدام نہایت صحیح ہے اس لیے کہ بچہ کو ماں، باپ اور استاد سے واسطہ تو نہایت کمسنی سے ہی پڑ جاتا ہے لہٰذا ان کے ادب و احترام سے اُس کو شروع ہی سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ نقش گہرا ہوتا جائے۔ پھر آپس میں میل جول اور لین دین کا معاملہ آتا ہے اُس کے لیے اتفاق، محبت و اخوت، ہمدردی، سخاوت، امانت و دیانت اور دیگر نیک خصائل سے بچہ کو واقفیت دلانا اور اُن پر عمل کرانا ضروری ہے۔ زبان نہایت سادہ، سلیس اور بچّوں کے معیار کے مطابق استعمال کی گئی ہے۔ انداز بیان بھی عام فہم ہے، فلسفیانہ یا منطقیانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا بلکہ اگر کسی بات کو مؤثر بنانا مقصود ہے تو اس کے لیے اُسوۂ رسول ﷺ اور اولیاء اللہ کے واقعات سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ سچ پوچھیے تو بچّوں کے لیے یہی

طریقہ احسن اور فطری ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بعض مقامات پر بزرگانِ دین کے سلسلے میں بعض موضوع روایات پیش کر دی گئی ہیں جیسے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دورِ اسلامی میں حسنِ اخلاق کے اعلیٰ نمونے اور صحیح واقعات بہ کثرت موجود ہیں تو پھر موضوع روایات کے سہارے کی ضرورت کیوں پیش آئی..... یہ بات بھی بُری طرح کھٹکی ہے کہ بعض خلفاء کے لیے بادشاہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً حصہ اوّل کے صفحہ ۱۵ پر ہارون الرشید جیسے دیندار اور پابند شریعت انسان اور اُس کے دو بیٹوں امین، اور مامون کو بجائے خلفاء کے بادشاہ بتایا گیا ہے حالانکہ ان تینوں کا تعلق خلافت بنو عباس سے تھا۔ نہ اُن کے زمانے میں خود انھوں نے اور نہ کسی اور نے اُن کو بادشاہ کہا اور نہ اس وقت تاریخ کی کتابوں میں اُن کو بادشاہ لکھا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بادشاہ اور شہنشاہ کے الفاظ صرف ذاتِ خداوندی کو زیب دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی قریب تک بڑی بوڑھیاں جب بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں تو وہ اس طرح شروع کرتی تھیں "کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا، ہمارا تمھارا بادشاہ خدا۔" اب بھی ضروری ہے کہ بچوں کو یہی تصور دلایا جائے اور بتایا جائے کہ خلافت کا منصب ملّتِ مسلمہ کے لیے کتنا اہم تھا۔ جو ۱۹۲۴ء تک قائم رہا اور اُسی کی وجہ سے مرکزیت قائم رہی۔ جب سے یہ ختم ہوا ہے اُسی وقت سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔

کتابیں مجموعی طور پر بہت اچھی ہیں۔ نہایت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہیں اور سائنس اور ٹیکنکل ایجوکیشن پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے جو اخلاقی اور دینی خلا پیدا ہو گیا ہے اُس کو پُر کرنے کے سلسلہ میں اس طرح کا لٹریچر بچوں کے لیے تخلیق کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

ثناء الحق صدیقی

چند ایران شناس

پروفیسر کبیر احمد جائسی

صفحات ۱۹۹ قیمت = /۸۰ روپے

ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ (انڈیا)

"چند ایران شناس" پروفیسر کبیر احمد جائسی کی فارسی زبان کے شعر و ادب سے اردو زبان کے قارئین کو روشناس کراتے رہنے کی سعی پیہم کی تیسری کڑی ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی خود بھی فارسی زبان و ادب کے مانے ہوئے محقق اور اُستاد بھی ہیں اور فارسی کے قدیم اور جدید ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ کتاب زیر نظر سے پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) کی فرمائش پر وہ یان ریپکا کی کتاب "HISTORY OF PERSIAN LITERATURE" کے تاجیکی ادب پر یرژی بیچکا کے تحریر کردہ ایک طویل باب کا ترجمہ کر چکے ہیں جسے انجمن ہذا نے ۱۹۷۷ء میں "تاریخ ادبیات تاجیکستان" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب کی دوسری کتاب "جدید تاجیکی شعرا" ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہی سے شائع ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کی یہ تیسری کتاب ہے جو ایران کے فارسی ادب پر چار غیر ایرانی لیکن فارسی اور دری زبان کے عالمی سطح پر تسلیم شدہ ماہرین اور محققین کے مطالعوں پر مشتمل ہے۔

فارسی ادبیات اور سماجیات کے مذکورہ بالا ماہرین میں سے احمد آتش کا تعلق ترکی سے، ایساندرو بوزانی کا اٹلی سے، میخائل

زند کا اسرائیل سے اور یرژی بیپکا کا تعلق چیکوسلواکیہ سے ہے۔

کتاب زیر تبصرہ ان چار محققین کے ایرانی ادب پر تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے عالمانہ کارناموں کو متعارف کراتی ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ان غیر ایرانیوں کے ایرانی ادب سے انہماک اور گہرے مطالعوں پر بڑی محنت سے مواد جمع کیا ہے اور بڑے شگفتہ انداز میں اردو ادب کے قارئین کے لیے ایسی کتاب تصنیف کر دی ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں ایرانی ادب اور شعریات کی قدیم اور جدید تاریخ سے پورے طور پر متعارف ہو جاتے ہیں۔

"چند ایران شناس" اگرچہ بنیادی طور پر ایرانی ادب کے چار ماہرین کی ایرانی ادب سے متعلق کاوشوں پر مبنی ہے، لیکن پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ان چاروں حضرات کے دوسرے ادبی اور تاریخی کارناموں کا بھی جا بہ جا تذکرہ کر کے کتاب کی افادیت کو مستحکم کر دیا ہے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی یہ عالمانہ کاوش بلاشبہ ایسا وقیع کام ہے کہ پاکستانی قارئین ادب کو اس کتاب سے مستفیض کرانے کے لیے پاکستان میں بھی اس کی اشاعت کا انتظام ہونا چاہیے۔

پروفیسر عتیق احمد

مثنوی طلوع سحر

پیرزادہ عاشق کیرانوی

صفحات ۱۵۰ قیمت =/۶۰ روپے

پاکستان ریڈرز گلڈ پوسٹ بکس نمبر ۸۷۵۷ کراچی

مثنوی لکھنے کی روایت اردو ادب میں بہت قدیم ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی "سحرالبیان"، دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" اور مرزا شوق کی "زہر عشق" اردو کے ہر طالب علم کے علم میں ہے۔ لیکن انھیں ادوار، جن میں مذکورہ مثنویاں تحریر ہوئیں ڈھونڈنے سے کم معروف مثنویوں کی ایک خاصی تعداد دستیاب ہو سکتی ہے جس کی اہمیت بھی کم نہیں۔

جیسے شاعری کی دوسری اصناف میں وقت کے ساتھ ساتھ موضوعات میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں، عین اُسی طرح مثنوی بھی ان تبدیلیوں سے دو چار ہوئی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری اور اُن کے دیگر معاصرین کے ہاں، فلسفیانہ آہنگ، دوری مزاج اور عصری تقاضے شامل ہو گئے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر مثنوی ذات سے نکل کر کائنات تک آ پہنچی ہے۔

جناب پیرزادہ عاشق کیرانوی کی مثنوی "مثنویِ طلوع سحر" اسی سلسلے کی ایک تازہ تحریر ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں مثنوی کی روایت کو بڑے قرینے سے برتا ہے۔ "مثنوی طلوع سحر" کا آغاز حمد سے ہوتا ہے، حمد کے بعد نعت رسول ﷺ اور منقبت سے گزر کر مثنوی کے پہلے حصّے کا اختتام ہوتا ہے۔ دوسرے حصّے میں ایک لڑکا سراج اس منظر میں داخل ہوتا ہے۔ اتفاق سے صاحبِ کتاب کا نام بھی سراج الحق عثمانی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کتاب کے دوسرے حصّے میں زورِ بیان اور تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ لڑکا خود مصنف ہو یا کوئی فرضی شخص، وہ بے راہ روی اور جہل سے علم کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ علم اُس کو بہت سی خوبیوں سے مالا مال کر دیتا ہے اور بالآخر وہ خود فہمی کے سفر پر چل پڑتا ہے۔ خود فہمی یہ سمجھاتی ہے:

پڑھ کر یہ واقعات جہاں کو ملی خبر
میری ہی داستان ہے میری نگاہ میں

عاشق صاحب ایک پُرگو شاعر اور مولانا ضیاء القادری بدایونی کے شاگرد ہیں ان کی مطبوعہ کتب کی تعداد گیارہ ہے۔ نو کتابیں زیر طبع ہیں ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک کتاب "ایک غزل" لکھی ہے جو طباعت کے مرحلے میں ہے۔ اس میں ایک ہی غزل ہے اور یہ غزل بہ قول مصنف ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

(ا۔ س)

اردو کا اپنا عروض

ڈاکٹر گیان چند جین
صفحات ۹۶ قیمت = /۱۵ روپے
مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور

"اردو کا اپنا عروض" ڈاکٹر گیان چند جین کی ۹۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب، اردو عروض کی تفہیم کے سلسلے میں ایک مفید کوشش ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو عروض کو عربی فارسی روایات کی بے جا گرفت سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور اس بات کے حق میں ہیں کہ اردو عروض کا اپنا تشخص سامنے آنا چاہیے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

"موجد عروض خلیل نے عربی شاعری کو دیکھ کر عروض وضع کیا۔ میر نے بھی اردو شعرا کے تجربات، اجتہادات اور ترمیمات پر نظر رکھی اردو عروض کو اردو شعر کے دوش بدوش لا کھڑا کیا ہے اس میں سب سے اہم اُن ہندی او زان کو عروض کا جزو لاینفک بنایا ہے جنھیں اردو شعرا استعمال کر رہے ہیں........"

ہندی بحر کے باب میں ڈاکٹر صاحب نے ہندی بحر کی ۳۲ حرفی اوزان فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن کا ذکر کیا ہے اس بحر کی مطابقت میں نظیر اکبر آبادی کے اس شعر کا حوالہ ہے:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندی کی یہی بحر تال ودیا میں سولہ ماترے کے تتالہ پر سوفی صد پوری اُترتی ہے۔ دھادھن دھِن تا، دھادھِن دَھن نا، تاتِن تِن نا، دھادھِن دھِن نا۔ اسی طرح انھوں نے بحر رجز مستفعلن، مستفعلن مستفعلن، مستفعلن مستفعلن، مستفعلن مستفعلن مستفعلن یا مستفعلان کا اطلاق حالی کے اس شعر پر کیا ہے:

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

اس کے لیے جو تال "معدن الموسیقی" میں تحریر کی گئی ہے وہ اکتالہ اور جھت تال ہے تال و دیا اور شاعری میں اس طرح کی اور بھی مطابقیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

بہر حال ڈاکٹر گیان چند جین کی یہ مختصر تصنیف عروض کے سلسلہ میں اہل علم پر سوچ کے بہت سے دروازے کھولتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ان مساعی کو پہلا قدم کہا ہے اس سمت میں اگلا قدم بھی آنا چاہیے۔

(ا۔ س)

نیا مکان

کمال مصطفیٰ

صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۰۰/- روپے

ارتقا مطبوعات A/۱۰ ولایت آباد ۱۰ منگھوپیر روڈ کراچی ۱۶

بہت دنوں تک تو ذہن میں کمال مصطفیٰ اور مصطفیٰ کریم دونوں افسانہ نگاروں کی شناخت میں گھپلا ہو جاتا تھا۔ کبھی مصطفیٰ کریم کو کمال مصطفیٰ اور کبھی کمال مصطفیٰ کو مصطفیٰ کریم سمجھ لیتا تھا بعد میں ذہن کو باور آیا کہ یہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔

کمال مصطفیٰ نے اپنی کتاب "نیا مکان" کے شروع میں دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں افسانے کو کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں ہونا چاہیے کے بحث میں مفید نکات پیش کیے ہیں اس لیے یہاں اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> "میری رائے میں افسانے کا بنیادی خیال ہی اُس کا اسٹائل یا طرز تحریر کا تعین کرتا ہے اور یہ نفس مضمون ہی جدید اور روایتی افسانے میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ لیکن افسانہ خواہ روایتی ہو یا نیا قاری کے لیے ابلاغ کا مسئلہ نہیں بننا چاہیے۔"

چونکہ افسانے سے متعلق یہ آرا ایک افسانہ نگار کی ہیں اس لیے اس سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے تعارفی کلمات میں کمال مصطفیٰ کو خواب اور حقیقت کے درمیان کا افسانہ نگار کہا ہے۔ واقعی قاری نیا مکان میں شامل اکثر افسانے کو پڑھتے ہوئے اس کیفیت سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس افسانے کی تفہیم کے کئی پیمانے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "نیا مکان" کا بوڑھا دراصل وقت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، جس میں ازل ابد کا تسلسل ہے جس کے اندر صدیاں بند ہیں اور وقت کا سیل جاری و ساری ہے اس سیل کے درمیان اشیا تعمیر ہوتی ہیں، لوگ اس تعمیر کی خوشی مناتے ہیں، پھر بہ مرور زمانہ اس میں زوال و انہدام آجاتا ہے، پھر ایک دو صدی بعد تاریخ کی نشاندہی پر لوگ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں، اسے مٹی کی تہوں سے دریافت کرتے ہیں، اس کی دریافت کی خوشی بھی تعمیر کی خوشی سے کم نہیں ہوتی۔ اس کی ایک اور تفہیم یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہر عمر رسیدہ فرد ماضی کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماضی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

کمال مصطفیٰ کا پہلا افسانہ ..... اور پری ۱۹۵۹ء میں "ادب لطیف" میں شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھتے ہی کافکا کی 'ایک چھوٹی سی کہانی' کی طرف دھیان جاتا ہے جس میں چوہے بلی کا مکالمہ ہے اور بالآخر بلی چوہے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ لیکن .... اور پری ایک

جداگانہ تناظر رکھتی ہے اس میں کاٹھ کباڑ کی کوٹھری لاشعور ہے، اور لاشعور سے خواب کا رشتہ گہرا ہے، لاشعور کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ خواب بھی ہے۔ چنانچہ کمال مصطفےٰ کی یہ کہانی خواب اور حقیقت کے درمیان سفر کرتی ہے۔ لیکن اس کا ابلاغ مجروح نہیں ہوتا۔ اور قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔

کمال مصطفےٰ نے اپنے افسانے "یہ خانہ بدوش لوگ" میں دو نکات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اوّل یہ کہ انسان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنا خانہ بدوش زندگی کے مترادف اور انسانی ارتقاء کا ایک حصہ ہے۔ استقرار، قیام اور بود و باش کے لیے تعمیر مکان اور ملکیت سو طرح کے خرخشے اپنے دامن میں رکھتی ہے اس افسانے کی ابتدا خانہ بدوش زندگی سے ہوتی ہے اور اختتام بھی اسی پر ہوتا ہے۔ افسانہ کے سیاق و سباق سے ایک اور مفہوم مترشح ہوتا ہے وہ یہ کہ ضرورت سے زیادہ ادراکِ وجود بھی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔

کمال مصطفےٰ کے افسانوی مجموعے "نیا مکان" میں کل سترہ افسانے شامل ہیں جو تیس برسوں کے دوران لکھے گئے ہیں، افسانے لکھنے کی یہ رفتار اگرچہ دوسروں کے مقابلے میں کم ہے لیکن اس کمیت میں تشنگی کے بجائے وفور کا احساس ہوتا ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔

(ا۔ س)

اب

مقیم اور غیر مقیم پاکستانیوں، فرموں اور کمپنیوں کو

فارن کرنسی اکاؤنٹس

کھولنے کی مکمل آزادی ہے

اہم خصوصیات:-

اہلیت: مقیم اور غیر مقیم پاکستانی، فرمیں، کمپنیاں، غیر ملکی افراد اور غیر ملکی کمپنیاں۔

کرنسی: امریکی ڈالر، پونڈ اسٹرلنگ، جرمن مارک اور جاپانی ین۔

ڈیپازٹس: بیرون ملک سے موصول ہونے والی رقومات، ٹریولرز چیکس، فارن کرنسی نوٹس اور فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس سے حاصل کردہ زر مبادلہ۔

منتقلی/ترسیل: دنیا کے کسی بھی حصے میں رقومات کی آزادانہ اور بلا بندش منتقلی/ترسیل۔ فارن کرنسی نوٹ اور ٹریولرز چیکس بھی جاری کئے جاسکتے ہیں۔

بندشوں سے مستثنیٰ: فارن ایکسچینج کنٹرول سے آزاد، حصول رقم کا ذریعہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس اور زکوٰۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ۔

قرضے: ان کھاتوں کے عوض پاکستانی روپے میں قرضے کی سہولت۔

منافع: بین الاقوامی مالیاتی مراکز کے مقابلے میں زیادہ شرح منافع جو بلحاظ مدت ۵۰۰ء۷ فیصدی سے ۶۲۵۰ء۱۰ فیصدی سالانہ تک ہوسکتا ہے۔

فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولئے۔ چند قدم پر ہماری برانچ موجود ہے

حبیب بینک لمیٹڈ

پرخلوص خدمت کی نصف صدی

پاکستان میں ہماری مجاز شاخیں

سندھ

سینٹرل برانچ، کراچی
بہادر آباد، کراچی
نرسری، کراچی
اسٹیٹ لائف بلڈنگ، کراچی
صدر برانچ، کراچی
سیف ڈپوزٹ والٹ، کراچی
ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای، کراچی
کارپوریٹ برانچ، کراچی
اسٹیشن روڈ، حیدرآباد
لب مہران روڈ، سکھر

پنجاب

دی مال، لاہور
باغبانپورہ، لاہور
سرکلر روڈ، لاہور
ایل۔ ڈی۔ اے برانچ، لاہور
مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور
پیکو را ماسینٹر، لاہور
شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
بالمقابل ہائی کورٹ، لاہور
برانڈرتھ روڈ، لاہور
واپڈا ہاؤس، لاہور
سٹی برانچ، اٹک
پی اے سی کامرہ، ضلع اٹک
فرید گیٹ، بہاول پور
مین برانچ، ڈیرہ غازی خان
مین بازار کلاں، ڈیرہ اسماعیل خان
سرکلر روڈ، فیصل آباد
ڈی گراؤنڈ برانچ، فیصل آباد
بینک اسکوائر، گوجرانوالہ
جی۔ ٹی روڈ، گوجرانوالہ
سرکلر روڈ، گجرات
مین بازار، ہری پور
سی۔ ڈی۔ اے سوک سینٹر، اسلام آباد
اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
کارپوریٹ برانچ، اسلام آباد
پی ٹی وی ہیڈ کوارٹرز، اسلام آباد
۷/۱۔G انڈسٹریل ایریا، اسلام آباد
شہید روڈ، جھنگ صدر
رام دین بازار، جہلم
ریلوے روڈ، قصور
حسین آگاہی ملتان
کارپوریٹ برانچ، ملتان
کینٹ برانچ، ملتان
بنک روڈ، مردان
بینک اسکوائر، مینگورہ
منڈی روڈ، اوکاڑہ
شاہی روڈ، رحیم یار خان
سٹی برانچ، راولپنڈی
کینٹ برانچ، راولپنڈی
ایس۔ ڈی۔ وی برانچ، راولپنڈی
سٹی برانچ، سیالکوٹ
ایف۔ ایم۔ الہٰی بلڈنگ، سیالکوٹ
ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای برانچ، سیالکوٹ
ٹرنک بازار، سیالکوٹ
جناح چوک، ساہیوال
کچہری بازار، سرگودھا
پی۔ او۔ ایف، واہ کینٹ
مین بازار، وزیر آباد

سرحد

سٹی برانچ، پشاور
کینٹ برانچ، پشاور
تہکال بالا، پشاور
مین بازار، میرپور (آزاد کشمیر)

بلوچستان

کیپلیکس برانچ، کوئٹہ
جناح روڈ، کوئٹہ

manhattan/BBDO

ہڑپّہ سے برآمد ہونے والا ایک منقش مٹکا

تہذیب کا چمن زار اِس پھول کی دین ہے

کپاس کے پھول سے حاصل ہونیوالی روئی کے پارچے کی صنعت انسانی تہذیب کے اولین کارناموں میں ہے، دریائے سندھ کی وادی میں پائے جانے والے ۵ ہزار سال قبل کے آثار اس کے شاہد ہیں۔

آج بھی روئی کو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کی علامت کہا جا سکتا ہے۔ جس پر ہماری سب سے بڑی صنعت اور ہر جہتی ترقی کا دارومدار ہے۔ ملک کی بہت بڑی آبادی کی معاش، روئی کی کاشت، کاروبار اور متعلقہ صنعت پر انحصار رکھتی ہے۔

کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان اس بات کیلئے کوشاں ہے کہ ہماری یہ سب سے بڑی تجارتی فصل برابر ترقی کرتی رہے اور ملک کے لیے مزید نفع بخش ثابت ہو۔

کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر ساتویں اور آٹھویں منزل شاہراہ فیصل
پوسٹ بکس ۳۷۳۸ کراچی پاکستان کیبل ایکسکو ٹلکو
ٹیلیکس ۲۶۲۸ ۔ ایکس کوٹ پی کے ۲۴۶۹۲
فون: ۵۲۰۱۶۱-۵ ۔ فیکس: ۹۲-۲۱-۵۱۴۹۶۸

گردوپیش

...ن میں چینی ادیبوں کے وفد کی آمد

۲۵ نومبر کو اکادمی ادبیات پاکستان کراچی شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان اور اکادمی ادبیات پاکستان کے مجلہ ...یات" کے چیف ایڈیٹر خالد اقبال یاسر کی رہنمائی میں چینی ادیبوں کا آٹھ رکنی وفد انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے دفتر میں ...سگالی کے دورے پر آیا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن نے فرداً فرداً چینی مہمانوں کے مختصراً کوائف پیش کیے۔ پھر انھوں نے معتمد اعزازی ...ن جناب جمیل الدین عالی کے ایما پر مقامی حضرات کا جو اس تقریب میں موجود تھے چینی مہمانوں سے تعارف کرایا۔ بعد ازاں ...ن کے معتمد اعزازی نے چینی ادیبوں کے وفد کو مخاطب کر کے کہا "میں اکادمی ادبیات کا ممنون ہوں جس نے اپنے پروگرام ...آپ کی یہاں تشریف آوری کو شامل کیا۔ میں انجمن کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں" وفد میں شامل ایک چینی ...نے معتمد اعزازی کے جذبات کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔

جناب معتمد اعزازی نے "انجمن ترقی اردو کی تاریخ کے بارے میں مختصراً مہمانوں کو بتایا۔ جس میں کتب خانہ خاص و عام، ...ی کے مخطوطات، انجمن کی طرف سے اردو کالجوں کی تعمیرات اور مطبوعات کا ذکر کیا گیا تھا۔

آخر میں جناب معتمد اعزازی نے چینی دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اگر آپ ہمارے لوگوں کے دلوں کا خفیہ طور پر ...ے کرائیں تو دوسرے ممالک کے بارے میں اُن کے جذبات کیا ہیں اس کا تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن چین کا شاید ہی کوئی مخالف ...اب آپ یہ سمجھیے کہ اپنے دوستوں میں اور اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔

جناب معتمد اعزازی کے جواب میں چینی وفد کے قائد نے کہا کہ ہم بھی آپ کو اپنا دوست جانتے ہیں، دس دنوں سے ہمیں ...ل رہا ہے کہ ہم جیسے اردو کی دنیا میں زندہ ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ چینی زبان اور اردو زبان کو قریب سے قریب تر لایا جائے اور ...کے لکھنے والوں کا آپس میں تبادلہ و تعارف ہو۔ جب ہر میدان میں ہماری رفاقت موجود ہے تو ادب میں بھی کوئی ایسی صورت ...رہنا چاہیے۔

تھوڑی دیر تک چینی ادیبوں اور پاکستانی ادیبوں کے درمیان تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ پھر انجمن کی جانب سے چینی مہمانوں کے ...ز میں دیے جانے والے ظہرانہ میں سب لوگ شریک ہوئے۔

چینی وفد میں شامل ادیبوں کے مختصر کوائف قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ یون خوچھون

محترم یون خوچھون ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ صوبہ ھُنی لونگ جیانگ کے رہنے والے ہیں۔ اوخان یونیورسٹی کے شعبہ چینی زبان و ادب سے گریجوٹ ہوئے۔ ۱۹۶۴ء سے ان کے مضامین چین کے مختلف اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ انھوں نے شاعری اور نثر سے تخلیقات کا سلسلہ شروع کیا اور بعد میں رپورتاژ لکھنے پر زیادہ توجہ دینے لگے۔

اہم تصانیف: نثری مجموعہ "۷۹ء کی جنگ میں جو میں نے لکھا"، "رپورتاژ"، "صوبائی پارٹی کمیٹی کے فرسٹ سیکریٹری"، "تخفیفِ فوج"، "بڑے بڑے سرمایہ کار" وغیرہ۔

ان کو کئی تصانیف پر پورے ملک اور فوج کی طرف سے مختلف انعامات ملے۔ "رپورتاژ"، "دریا کے اُس کنارے پر ایک ستارہ ابھرا" پر ان کو ۸۲۔۱۹۸۱ء کے پورے ملک کے بہترین رپورتاژ کا انعام ملا اور "صوبائی پارٹی کمیٹی کے فرسٹ سیکریٹری" پر ۸۴۔۱۹۸۳ء کا پہلا انعام حاصل ہوا۔

وہ چینی عوامی فوج آزادی کے اشاعت گھر برائے ادب و فن کے ڈپٹی ڈائریکٹر رہے اور ماہنامہ "چینی عوامی فوج آزادی کا ادب و فن" اور ماہنامہ "قراقرم" کے ڈپٹی چیف ایڈیٹر رہے۔ اب چینی عوامی فوج آزادی کے جنرل پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے ثقافتی بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور چین کے "رپورتاژ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نائب صدر اور "چین کے حقیقی واقعات کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی کونسل کے رکن ہیں۔

۲۔ چنُو کان

محترم چنُو کان ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء سے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ وہ فوج میں ادب و فن کی تخلیق کرتے رہے اور بعد ازاں وہیں ادب و فن کے شعبہ کے انچارج بن گئے۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جس کا عنوان "پہاڑ اور ندی" ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ادبی ماہنامہ "موشُی" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۶ء سے پیشہ ور ادیب کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ نثری مجموعہ "گلابی شاخیں"، نظموں کے تین مجموعے "دریائے تاتو کی یادیں"، سبز بادبان"، غامُنی پہاڑ کی روح رواں" رپورتاژ "جنوبی آسمان کا ستون"، "کشمکش حیات"، فلمی کہانی "غامُنی پہاڑ کا راھزن" قومی اور صوبائی سطح پر ان کو کل سترہ ادبی انعامات مل چکے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "دریائے تاتو کی یادیں" امریکی کانگریس لائبریری میں یادگار کے طور پر رکھا گیا ہے۔ ان کی کچھ مختصر نظموں کا انتخاب یونیورسٹی اور ہائی اسکول کی نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔

وہ ان دنوں صوبہ ُشی چھوان کی ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے صدارتی گروپ کے رکن ہیں۔

۳۔ چھئے یوں کوشی

محترم چھئے یوں کوشی دسمبر ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ نقاد ہیں۔ وہ جولائی ۱۹۵۹ء میں خواتین ٹیچرز ٹریننگ یونیورسٹی سے گریجوٹ ہوئے اور چینی زبان و ادب کے شعبہ میں پڑھاتے رہے۔ وہ نظریاتی ادب کا درس دیتے ہیں اور اسی پر تحقیق کرتے ہیں اور یونیورسٹی کے ادبی اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ خواتین ٹیچرز ٹریننگ یونیورسٹی کے لیکچرار اور ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے ہیں اور

فلسفیانہ معاشرتی سائنس سے متعلق تحقیقی اکیڈمی کے انچارج ہیں۔

۱۹۵۵ء سے انھوں نے نثر، انشائیہ، نظریاتی ادب اور ادبی تنقید سے متعلق موضوعات پر ایک سو پچاس مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے اسی مقالے ان کے مجموعے میں شامل ہیں مشہور مقالے یہ ہیں: "ادب اور جذبات"، "ادب برائے زندگی کی اصلیت"، "حقیقی زندگی کی عکاسی کا مسئلہ" وغیرہ۔ انھوں نے تین کتابیں لکھی ہیں: مجموعہ مقالات "ادبی مسائل پر بات چیت"، "جمالیاتی ادب کا مجموعہ"، فنکارانہ جذبات"، مجموعہ مقالات "ادبی تحقیق کے بارے میں گفتگو"۔

آج کل صوبہ کینٹن کے ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین ہیں۔

۴۔ شئی نیٹن

محترمہ شئی نیٹن ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئیں۔ صوبہ آن خوشی میں تھئے خوکاؤنٹی کی رہنے والی ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کے شعبہ چینی زبان و ادب کے مضامین کا ذاتی طور پر مطالعہ کیا۔ ایک کارخانے میں بیس سال تک کام کرتی رہیں۔ شئی نیٹن صاحبہ مزدور اور ہنر مند رہیں۔ چوالیس سال کی عمر سے ان کی ادبی زندگی شروع ہوئی۔ ان کا پہلا ناول ایک سوانحی قصہ ہے جس کا نام "صاحب کمال مصورہ..... چیانگ ای لیانگ کی سوانح عمری" ہے۔ یہ ناول بیس پچیس اخبارات اور رسالے میں شائع ہو چکا ہے اور ان پر فلم اور ٹی وی ڈرامہ بنایا گیا ہے۔ اب اس ناول کا ترجمہ جاپانی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہو رہا ہے۔ شئی صاحبہ کی دیگر نمائندہ تصانیف یہ ہیں: "موسم سرما اور بید مجنوں"، "خوبصورت دیوتا"، "نن (NUN) عبادت گاہ سے سرخ قالین تک"، "نامور اداکارہ سوشیوون" اور ناولٹ کا ایک مجموعہ "متروکہ عورت"۔ شئی صاحبہ کو کئی دفعہ صوبائی اور قومی سطح کے اخباری ادبی انعامات مل چکے ہیں۔

اب شئی صاحبہ صوبہ آن خوشی کے ادیبوں کی ایسوسی ایشن کی نائب چیئرپرسن ہیں۔

۵۔ سون او چھن

محترم سون او چھن ۱۹۳۸ء میں چھانگ چھون شہر میں پیدا ہوئے۔ ایک نامور نقاد ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں بیجنگ ٹیچرز ٹریننگ کالج کے شعبہ چینی زبان و ادب سے گریجویٹ ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں چینی ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے شائع کردہ رسالہ "ادب و فن" کے ایڈیٹر اور ادبی تبصرہ نگاری ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اب اسی ڈپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے نثر، ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ کالج کے زمانے سے وہ تبصرہ نگاری کرنے لگے۔ اب تک ایک سو سے زیادہ ناقدانہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ شائع شدہ مجموعوں کے نام: "ناول کے ارتقا پر ایک تبصرہ"، "ادب کا عبوری دور"۔

اب سون صاحب جدید چینی ادب کے مطالعے کی کونسل کے رکن ہیں۔

۶۔ چھن خوئی اینگ

محترمہ چھن خوئی اینگ ۱۹۴۶ء میں سنگاپور میں پیدا ہوئیں۔ اور شیامن یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئیں۔ کئی سال صحافت سے منسلک رہیں۔ گزشتہ دس برسوں میں چین کے سو سے زیادہ اخبارات اور رسالوں میں ان کے دو ہزار سے زیادہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ساٹھ مضامین پر انعامات حاصل کر رکھے ہیں۔ ان کے ایک سو بیس مضامین جو چین اور دوسرے ممالک کے ادبی

مجموعوں اور یونیورسٹی کی نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اب تک ان کے گیارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مجموعوں کے نام: "نامعلوم ستارہ"، "لوٹتی کوئل کی پکار"، "آبائی گاؤں کا چاند سب سے روشن ہوتا ہے"، "مہکتا سبزہ اور آسمان کا کنارہ"، "شیامن کے رہنے والے"، "اڑنے والا سارس"، "جنوبی علاقے کا چکارا"، "بانسوں کے پتے اور تین حضرات"، "پراسرار سبز جزیرہ"، "چھئن خوئی اینگ کی بہترین نثر کا مجموعہ" وغیرہ۔ "نامعلوم ستارہ" پر ان کو پورے چین کی بہترین نثری تصنیف کا اعلیٰ انعام ملا۔
اب محترمہ چھئن چین کے نثر نگاروں کی کمیٹی کی نائب صدر اور شیامن شہر کے ادیبوں کی ایسوسی ایشن کی چیئر پرسن ہیں۔

۷۔ چیانگ اے چھی

محترمہ چیانگ اے چھی ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئیں۔ صوبہ چھیانگ کی رہنے والی ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں اندرونی منگولیہ کے خود مختار علاقے کی ٹیچرز یونیورسٹی کے شعبہ چینی زبان و ادب سے فارغ التحصیل ہوئیں۔
اب محترمہ چیانگ چینی ادیبوں کی ایسوسی ایشن برائے تعلقات ممالک خارجہ سے متعلقہ ڈپارٹمنٹ کی سیکرٹری ہیں۔

۸۔ تھانگ منگ شنگ

محترم تھانگ منگ شنگ ۱۹۵۰ء میں صوبہ شینشی میں پیدا ہوئے۔ بیجنگ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرقی لسانیات اور ادب کے شعبہ کے استاد مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید بھی کرتے ہیں۔ اب تک پاکستانی ثقافت کے بارے میں ان کے تیس سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں اور پاکستانی ادب و ثقافت کے بارے میں آٹھ مقالات بھی لکھے ہیں۔ اردو ناول "خدا کی بستی" کا ترجمہ چینی زبان میں کیا ہے۔
اب محترم تھانگ منگ شنگ بیجنگ یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی لسانیات اور ادب کے اسسٹنٹ چیئرمین ہیں۔

انجمن میں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سلیم اختر کی آمد

انجمن کی دعوت پر ۲۱ نومبر ۱۹۹۲ء کو جناب مشفق خواجہ کی معیت میں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سلیم اختر انجمن کے دفتر میں تشریف لائے۔ غیر رسمی گفتگو کے دوران مختلف موضوعات پر اظہار خیال ہوتا رہا۔ یہ موضوعات بی۔ ایڈ کے امتحانات، کمپیوٹر کا نظام اور اُس کی کارکردگی وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ کمپیوٹر کے نظام نے کتابوں کی اشاعت کا کام آسان کر دیا ہے۔ آنے والے زمانے میں جب کمپیوٹر کی قیمت آج کے مقابلے میں کم ہو جائے گی تو طباعت و اشاعت کا ہر ادارہ اس سے فائدہ اٹھا سکے گا۔

بی۔ ایڈ کے امتحانات کی افادیت کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ اس کی افادیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں بی ایڈ پڑھنے والوں کو زیادہ تر تھیوری پڑھائی جاتی ہے اور جب طلبہ وہاں سے نکل کر عمل کی دنیا میں آتے ہیں تو درس و تدریس میں اس کا اطلاق ممکن اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر استاد اپنے انداز میں پڑھاتا ہے۔ ان ٹریننگ کالجوں میں جو درس دیا جاتا ہے وہ درس امریکہ کے طرز پر ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے ملک کی تعلیمی فضا وہاں سے بالکل مختلف ہے۔
اس تقریب میں مہمانان گرامی کے علاوہ جناب تابش دہلوی، ڈاکٹر حنیف فوق، جناب احمد ہمدانی، جناب مسعود احمد برکاتی،

ڈاکٹر مشرف احمد، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، جناب ذوالفقار مصطفےٰ اور انجمن کے اراکین موجود تھے۔
بعد ازاں انجمن کی جانب سے مہمانوں کی تواضع کا اہتمام کیا گیا۔

جناب شان الحق حقی کی ۷۵ ویں سالگرہ

اردو کی نامور شخصیت جناب شان الحق حقی ستارہ امتیاز کی ۷۵ ویں سالگرہ (پلاٹینم جوبلی) پر علمی و ادبی و فنی اداروں کی طرف سے ۲۳ نومبر ۱۹۹۲ء کو تقریب تہنیت و مذاکرہ کا انعقاد علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے لان میں ہوا۔ ان محرک اداروں کے نام انجمن ترقی اردو پاکستان، ادارۂ یادگارِ غالب، اربابِ قلم، اردو لغت بورڈ، ایوان اردو، آرٹس کونسل آف پاکستان، آرٹ کلکٹرز گیلری، پاکستان کونسل آف کلچر اینڈ آرٹس، پاکستان نیشنل اکیڈمی، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، مہران رائٹرز گلڈ اور ہمدرد فاؤنڈیشن ہیں۔

جلسے کی صدارت جناب حکیم محمد سعید چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن نے فرمائی مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر وحید قریشی تھے اور نظامت کے فرائض محترمہ شاہدہ حسن نے انجام دیے۔

جلسے کا آغاز قاری ظفر احمد کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب مختار زمن نے ایک خاکہ سا پڑھا جسے دلچسپی سے سنا گیا۔

جناب مسعود احمد برکاتی نے اپنے مقالے کا آغاز اس دلچسپ جملے سے کیا کہ جناب حقی صاحب اور سوویت یونین ایک ہی سال پیدا ہوئے۔ انھوں نے مشرقی و مغربی زبان کے ورثے سے اردو ادب کو مالا مال کیا، چانکیہ کی ارتھ شاستر اور انطونی کلو پترا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا کہ ہمارے درمیان جناب شان الحق حقی کا دم غنیمت ہے، وہ اُن شاعروں میں سے ہیں جو زبان و علم کو لمحہ بھر کے لیے فراموش نہیں کرتے وہ تخلیق کو علم کے لیے اور علم کو تخلیق کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے مقالے میں حقی صاحب کی شاعری اور افسانوی مجموعہ "شاخسانے" کے حوالے سے تفصیلی باتیں کیں اور کہا حقی صاحب کا پہلا تاثر ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مقالے "بیان حلفی" میں "حقی صاحب کی خود نوشت" (مطبوعہ "افکار" کراچی) کی وساطت سے نفسیاتی تجزیہ کیا۔ انھوں نے کہا کسی شخصیت کا سفر اخفا اور افشا دو کناروں کے درمیان ہوتا ہے حقی صاحب نے اپنی خود نوشت کو پنجرے کا پنچھی بنانے کے بجائے ماضی کا آزاد پکھیرو بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے جناب حقی کی تصنیف "جواہر مالا" کا ذکر کیا۔ جس میں حقی صاحب نے اپنا تخلص "ست رنگ" رکھا ہے۔ اور ابھی طباعت کی منتظر ہے۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے کہا کہ میرے ادبی ذوق کی ٹمٹماتی ہوئی شمع جو بجھی نہیں اُس میں حقی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ حقی صاحب کی علمی سرگرمیوں کے اس شد و مد سے جاری رہنے میں اُن کی بیگم سلمیٰ حقی کی رفاقتوں کو بھی دخل ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر وحید قریشی نے حقی صاحب کی کتاب "قہر عشق" پر مقالہ پڑھا "قہر عشق" ولیم شیکسپیئر کے شہرہ آفاق

ڈرامے انطنی کلو بترہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ انھوں نے کہا اس ترجمے میں بول چال کی زبان اور دلّی کے نسوانی لب ولہجہ کو بڑی خو سے برتا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حقی عورتوں کا مزاج جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن کلو بترہ کے اچّے مزاج داں ثابت ہوتے ہیں "قہر عشق" کو میں اردو کے چند بہترین ترجموں میں شمار کرتا ہوں۔

صدر جلسہ جناب حکیم محمد سعید نے فرمایا کہ اس موقع پر میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سارے کے سارے پہلے ہی معرض گفتگو میں آچکے ہیں۔ اب میں اپنی بات کسی ایسے ہی دوسرے موقع کے لیے چھوڑتا ہوں۔

اس موقع پر جلسے کے محرک اداروں کی جانب سے معروف شاعر جناب سبنم رومانی نے جناب شان الحق کی گلپوشی کی ڈاکٹر عالیہ امام اور ڈاکٹر عطیہ عرب نے پھولوں کے ہار اور گلدستے پیش کیے۔

انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی اور جناب حمید الدّین شاہد نے مل کر جناب حقی کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر نشان سپاس پیش کیا۔

جلسہ کے دوران میں جناب حقی نے سامعین کو اپنا تازہ کلام سنایا۔ جلسے کے اختتام کے بعد شرکائے جلسہ نے عصرانے میں شرکت کی جس کا انتظام مدعوعین جلسہ کی جانب سے کیا گیا تھا۔

اردو پوری قوم کے رابطے کی زبان ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی

آئین کے تحت قومی زبان اردو کے عملی نفاذ کے لیے تمام مواد اور ساز و سامان تیار کر لیا گیا ہے لیکن موجودہ حکومت نے بھی اردو کے نفاذ کے سلسلے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو کے نفاذ میں تاخیر ہو رہی ہے یہ بات مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہفتے کو کراچی میں ایک ملاقات کے دوران بتائی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بتایا کہ تیسری بار آئین کے تحت نفاذِ اردو کے لیے دی جانے والی مدت مکمل ہو چکی ہے انھوں نے بتایا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں نفاذِ اردو کے لیے بیس سال کی مدت مقرر کی گئی تھی اسی طرح ۱۹۶۲ء میں بھی آئین کے تحت ۲۰ سال کی مہلت دی گئی تھی۔ اور موجوزہ آئین کے تحت اگست ۱۹۸۸ء تک پندرہ سال میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کر دیا جانا چاہیے تھا لیکن اس میں بھی یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو کو دفتری زبان بنائے جانے کی صورت میں دفتری کارکردگی بڑھ جاتی ہے اور افسران سے لے کر نچلے درجے تک کے تمام ملازمین دفتری کاموں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں انھوں نے کہا کہ اردو کے ذریعہ عوام سے ہمارے رشتے مستحکم ہوتے ہیں اور اردو صرف مہاجروں کی نہیں بلکہ پوری قوم کے رابطے، رشتے اخوت اور بھائی چارے کی زبان ہے اور ملک کی یکجہتی اور بقاء صرف اردو سے وابستہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بتایا کہ نئی مجوزہ تعلیمی پالیسی میں بھی صرف اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش نہیں کی گئی ہے بلکہ اس میں منظور شدہ صوبائی زبان اردو یا انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ طبقاتی نظامِ تعلیم برقرار رہے گا اور جب تک ہم اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنائیں گے اپنے معیار تعلیم کو بہتر اور نقل جیسے رجحان سے نجات حاصل نہیں کرا سکتے انھوں نے بتایا کہ اسلامائزیشن کمیشن برائے تعلیم نے قومی تعلیمی پالیسی کو ذریعہ تعلیم اردو نہ ہونے کے باعث مسترد کر دیا تھا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی)

ٹر صبیحہ کے پہلے شعری مجموعے کی رونمائی

شمالی امریکہ کی مقبول اُردو شاعرہ ڈاکٹر صبیحہ صبا کے پہلے شعری مجموعے "چشم ستارہ شمار" کی تقریب رونمائی منعقد ہ۔ئی اس
ںب کے مہمانِ خصوصی پاکستان کے مشہور شاعر احمد فراز تھے۔ جب کہ صدارت اردو کے نامور شاعر و نقاد اور دانشور علی سردار
ری نے کی کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں اظہار خیال ڈاکٹر منظور شکوہ اور ڈاکٹر جمال قادری نے کیا۔

گ شاعر وفا براہی کا انتقال

بروز جمعہ ۵ دسمبر کی شب کو اردو کے بزرگ شاعر جناب سید شاہ محمد عالم وفا براہی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کو اورنگی کراچی کے
مشاعرہ میں سقوط مشرقی پاکستان سے متعلق ایک نظم پڑھنے کے دوران دل کا دورہ پڑا اور اس سے جانبر نہ ہوسکے ان کی نماز جنازہ
مسجد فاروق اعظم شمالی ناظم آباد میں ادا ہوئی اور سخی حسن کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر
ال تھی۔ وہ سانس کے آخری لمحے تک ادبی طور پر فعال رہے ان کا تعلق موضع باسوبندہ براہ ضلع پٹنہ سے تھا۔
غزلیات پر مشتمل اُن کا پہلا شعری مجموعہ "نکہت گل" مئی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا اسی سال ایک اور شعری مجموعہ "سحر نظر"
ا۔ بعد ازاں دسمبر ۱۹۵۲ء میں تیسرا شعری مجموعہ "شرارِ فطرت" زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ آخری شعری مجموعہ "شعاع نو"
۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔
وفا براہی صاحب ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

جنوری تا دسمبر ۱۹۹۲ء کے رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ برائے "قومی زبان"

معارف قرآن
علوم اسلامیہ
مطالعہ پاکستان
مطالعہ سائنس
فکر، فلسفہ حکمت
تاریخ، تہذیب، ثقافت
تاریخ، فن وادب
فارسی زبان وادب
اردو زبان وادب
ادب، مسائل و مباحث
لسانیات
تحقیق و تنقید
تنقید، فن تنقید
ترجمہ، فن ترجمہ
پاکستانی افسانہ
بچوں کا ادب
خود نوشت
سفر نامہ
خطوط

ملاقات
شخصیات
غالبیات
سر سید احمد خاں اور علی گڑھ
اقبالیات
مولانا محمد علی جوہر
مولانا حسرت موہانی
مولانا عبید اللہ سندھی
بابائے اردو مولوی عبد الحق
آغا حشر کاشمیری
اختر حسین رائے پوری
صادقین
عصمت چغتائی
فیض احمد فیض
احمد ندیم قاسمی
پرویز شاہدی
ڈاکٹر وزیر آغا
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
ڈاکٹر محمد باقر شمس

ڈاکٹر جمیل جالبی
عزیز حامد مدنی
صبا اکبر آبادی
تابش دہلوی
جیلانی بانو
مجید امجد
فرخندہ لودھی
رحمان مذنب
دلیپ سنگھ
شاہ عبد الطیف بھٹائی
دیگر علمی ادبی تعلیمی شخصیات
علمی ادارے، سوانح و تذکرے
تعلیم، تدریس، مسائل و مباحث
علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی، فلاحی ادارے اور تحریکیں
سیاست، صحافت، امور مملکت
موسیقی، مصوری، خطاطی و دیگر فنون
مطالعہ کتب

جنوری تا جون ۱۹۹۲ء کے رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ ترتیب حسبِ ذیل ہے۔

سہ ماہی ابلاغ پشاور جنوری، مارچ ۹۲ء
سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء۔ ۹۱/۱۷ء
سہ ماہی اقبال، لاہور جولائی ۹۱ء
سہ ماہی العلم، کراچی اکتوبر، دسمبر ۹۱ء جنوری، مارچ، ۹۲ء
سہ ماہی روح ادب، کلکتہ اکتوبر ۹۱ء مارچ ۹۲ء
سہ ماہی صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء جنوری، مارچ ۹۲ء
سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد جنوری، مارچ ۹۲ء
ماہنامہ آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ، اپریل، مئی، جون، ۹۲ء
ماہنامہ اخبارِ اردو اسلام آباد جنوری ۹۲ء عالمی اردو کانفرنس ماریشس فروری، مارچ، اپریل ۹۲ء
ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور عصمت چغتائی نمبر دسمبر ۹۱ء فروری، مئی، جون، ۹۲ء
ماہنامہ اردو نامہ، لاہور جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ اظہار، کراچی جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ افکار" کراچی جنوری تا جون ۱۹۹۲ء
ماہنامہ البلاغ، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، جون، ۹۲ء
ماہنامہ الولی، حیدر آباد سندھ جنوری، فروری، مارچ، ۹۲ء
ماہنامہ اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء خاص نمبر جون جولائی ۹۲ء
ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور جنوری، فروری، ۹۲ء
ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور، جنوری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ دائرے، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، ۹۲ء
ماہنامہ دریافت، کراچی جنوری، فروری، اپریل ۹۲ء
ماہنامہ تحریریں، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۹۱ء
ماہنامہ سائنس میگزین، کراچی فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ سب رس، کراچی جنوری، اپریل ۹۲ء
ماہنامہ صریر، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی ۹۲ء
ماہنامہ طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء جنوری ۹۲، صادقین فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء

ماہنامہ قومی زبان، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ کندن، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ ماہِ نو، لاہور جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ محفل، لاہور سالنامہ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی ۹۲ء
ماہنامہ مطالعۂ پاکستان، کراچی مارچ ۹۲ء کشمیر نمبر اپریل، جون ۹۲ء
ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ جنوری، اپریل ۹۲ء
ماہنامہ نردبان، سرگودھا مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ نگارِ پاکستان، کراچی جنوری، فروری، مئی، جون ۹۲ء
ماہنامہ نیرنگِ خیال، راولپنڈی فروری، اپریل ۹۲ء
ہفت روزہ ہماری زبان، دہلی ۱۵ جنوری، ۲۲ جنوری ۹۲ء

معارف قرآن

احمد ایاز، پروفیسر حافظ	سورۃ البقرۃ (۲۱) (آیت ۳۰)	حکمت قرآن، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۴۹
حمد ایاز، پروفیسر حافظ	سورۃ البقرۃ (۲۳) (آیت ۳۳)	حکمت قرآن، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۳
حمد ایاز، پروفیسر حافظ	لغات و اعرابِ قرآن سورۃ البقرۃ (۲۳) (آیت ۳۳)	حکمت قرآن، لاہور جون ۹۲ء ص ۵۱
خلاق حسین قاسمی، مولانا	خصوصیات صحابہ کرام، قرآن حکیم کی روشنی میں	حکمت قرآن، لاہور مارچ، اپریل ۹۲ء ص ۲۳
خلاق حسین قاسمی، مولانا	خصوصیاتِ صحابہ کرام، قرآن حکیم کی روشنی میں۔ ۳	حکمت قرآن، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۳
رشد اینڈ حمد، حافظ	تاریخ قرآن	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۶
سرار احمد، ڈاکٹر	سورہ آلِ عمران آیت ۱۸۵	حکمت قرآن، لاہور مارچ اپریل ۹۲ء ص ۳
سرار احمد، ڈاکٹر	کلمہ طیبہ کی مثال، سورہ ابراہیم کی آیات کی روشنی میں	حکمت قرآن، لاہور مئی ۹۲ء ص ۳
سرار احمد، ڈاکٹر	قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر	حکمت قرآن، لاہور جون ۹۲ء ص ۳
تنزیل الرحمن، ڈاکٹر	اصلاح معاشرہ کے قرآنی اصول	اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۸
ظ احمد یار، پروفیسر	لغات و اعرابِ قرآن۔ ۳۳	حکمت قرآن، لاہور مارچ اپریل ۹۲ء ص ۶۱
یب اللہ قریشی	رزق کا قرآنی تصور	حکمت قرآن، لاہور مارچ اپریل ۹۲ء ص ۷
یاء الدین اصلاحی	رحمتِ الٰہی کا قرآنی تصور اور مولانا ابوالکلام آزاد	معارف، اعظم گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۲۴۵
تی محمد شفیع، مولانا	خلاصہ تفسیر، سورۃ الاحقاف آیت ۱ تا ۶	البلاغ، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۹
تی محمد شفیع، مولانا	خلاصہ تفسیر، سورۃ الاحقاف آیت ۷ تا ۱۰	البلاغ، کراچی فروری ۹۲ء ص ۹
تی محمد شفیع، مولانا	خلاصہ تفسیر، سورۃ الاحقاف آیت ۱۱ تا ۱۲	البلاغ، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۷
تی محمد شفیع، مولانا	خلاصہ تفسیر، سورۃ الاحقاف آیت ۱۳ تا ۲۰	البلاغ، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۹
تی محمد شفیع، مولانا	خلاصہ تفسیر، سورۃ محمد ﷺ	البلاغ، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۷

علوم اسلامیہ

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوسعد اصلاحی	مولانا حمید الدین فراہی، بلند پایہ مفسر و ماہر قرآنیات	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص
ابوسعد	ضیق النفس	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
اخلاق حسین قاسمی	خصوصیات صحابہ کرام قرآن حکیم کی روشنی میں۔۲	حکمت قرآن، لاہور مئی ۹۲ء ص ۹
اسرار احمد پشاوری، پروفیسر	حضرت ام عمارؓ	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۴۳
اظہر احمد	امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲
اقبال قریشی	ملفوظات حکیم الامت اشرف علی تھانوی	البلاغ کراچی جون ۹۲ء ص ۵۵
بدیع الزماں	حامل قرآن کی ذمہ داریاں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
جنید خاں	تعلیمات نبوی میں تربیت اطفال	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص
حبیب صدیقی	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
خلیل الرحمن رحمانی	محسن انسانیت ﷺ کی درس گاہ	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۶۶
رشید احمد خاں، ڈاکٹر	سنت رسول ﷺ کی اہمیت	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۹
رشید احمد	جہاد کی اہمیت، قرآن حکیم کی روشنی میں	مطالعۂ پاکستان، کراچی ۳/۹۲ء ص ۳۴
زبیر اشرف عثمانی	احادیث نبوی ﷺ اور شہید کے فضائل و احکام	البلاغ، کراچی فروری ۹۲ء ص ۴۷
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	صوفیائے سندھ، الحاج حکیم غلام رسول مجددی	اظہار، کراچی جنوری، فروری ۹۲ء ص ۸
شبیر حسین زاہد	انسانی حقوق، سیرت طیبہ کی روشنی میں ۲	حکمت قرآن، لاہور جون ۹۲ء ص ۶۰
شبیر حسین زاہد	انسانی حقوق، سیرت طیبہ کی روشنی میں	حکمت قرآن، لاہور مارچ اپریل ۹۲ء ص
عبدالرشید ارشد، مولانا	قرآنی تعلیمات کو فروغ دیے بغیر اسلامی انقلاب ممکن نہیں	اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۹
عبدالرشید عراقی	امام ربیع بن صبیح بصریؒ	ترجمان القرآن، فروری ۹۲ء ص ۳۶
عزیز الرحیم دانش امدادی	دین کا جامع تصور، قرآن و حدیث کی روشنی میں (چوتھی اور آخری قسط)	البلاغ، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۷
علم الدین سالک، مولانا	اتحاد اور تنظیم قرآن و حدیث کی روشنی میں	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۸
محمد اسد، علامہ	اسلامی سوچ کی نئی راہیں	مطالعۂ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۸۸
محمد اقبال قریشی	ملفوظات حضرت اشرف علی تھانوی ۶	البلاغ، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵۱
محمد اقبال قریشی	ملفوظات حکیم الامت	البلاغ، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۸۹
محمد زبیر	تاریخ اسلام، چند حقائق چند گزارشات	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۷۰
محمود احمد غازی، ڈاکٹر	فقہ شافعی اور علم قواعد کلیہ	فکر و نظر، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۳
مختار زمن	ذکر محمد ﷺ	محفل، لاہور فروری ۹۲ء ص ۹۲
معین احمد علوی	بہرائچ کے بعض صوفیہ کرام	معارف، اعظم گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۵۳
مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مولانا	بیع مؤجل اور بیع مرابحہ	حکمت قرآن، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۱۱
ملا واحدی	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	الولی، حیدرآباد سندھ فروری ۹۲ء ص ۵
واصل عثمانی، مولانا	حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	البلاغ، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۱
وسیم الحسن	حج اسلام کی اجتماعی شان	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۹
وقار اشدی، ڈاکٹر	سندھ میں اسلامی تعلیم کا فروغ، اور مفتی عبدالغفور ہمایونی	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۷۵

سف القرضاوی، ڈاکٹر | سنتِ نبویہ سے اخذ و استفادہ کے اصول و مبادی | آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۲۴
رجمہ: ڈاکٹر حافظ احسان الحق

طالعہ پاکستان

رشد اندھڑ، حافظ | سندھ میں اسلام کی آمد اور محمد بن قاسم | اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۶۵

ے بی اشرف، ڈاکٹر | انقرہ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو و مطالعۂ پاکستان | اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۲ء ص ۱۳

بابر ایاز | نئے پاکستانی بنک | مطالعہ پاکستان، کراچی ۹۲/۳ء ص ۲۹

یل الرحمٰن، سیّد | تحریک پاکستان کے ایک عظیم رہنما، سلطان محمد شاہ آغا خان سوم | آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۷۱

ضوان علی، ڈاکٹر | نظریۂ پاکستان | اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۱۰

ضی الدین صدیقی، ڈاکٹر | بہادر یار جنگ کی خدمات | اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۶

ملیم خاں گمی | ہوا کارواں سوئے منزل، قرارداد پاکستان | ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۳

ناہ قاز | جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی | آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۴۷

نمیر ترمذی | علامہ محمد اقبال کا مطالعہ پاکستان اور حصولِ پاکستان میں کردار | اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۰

لی محتشم | قائداعظم کی شخصیت اور تحریک پاکستان | اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۲

کر اصغر خان | پاکستان اور معاشیات | مطالعہ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۹

عنایت اللہ نسیم سوہدروی، پروفیسر | سردار عبدالرب نشتر | تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۴

لام کبریا | پاکستان کی سائنسی میراث | مطالعہ پاکستان، کراچی ۹۲/۳ء ص ۵۶

ہرزانہ چیمہ | ۲۳ مارچ، یوم قراردادِ پاکستان | اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۱۵

ئداعظم | اجلاس لاہور میں قائداعظم کا تاریخی خطاب مارچ ۱۹۴۰ء | اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۳

شم نقوی | اردو ادب اور تحریک پاکستان ایک مذاکرہ...... | ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۱۲

یم سہسرامی، پروفیسر و ڈاکٹر | جنگِ آزادی کی ایک اہم دستاویز | دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۷

ارک علی، ڈاکٹر | پاکستان اور عمرانیات | مطالعۂ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۴

ید دہلوی | علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور تحریکِ آزادی | تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۵

کامران، ڈاکٹر
دیگر سائنسداں | پاکستان اور سائنس | سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵۰

مد شمس الدین، ڈاکٹر | قراردادِ پاکستان کا پس منظر | اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۵

دعلی خان، چودھری | تحریک علی گڑھ اور قائداعظم | تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۹

معزالدین، ڈاکٹر | پاکستانی تشخص اور ملی وحدت | اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۳۶

دواجد | اردو کی وطنی شاعری | اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۸۹

ورزمن | آزادیٔ کامل | اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۲۸

ر مرزا، پروفیسر | پاکستان اور ہمارے دانشورانِ کرام | اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۰

ین الدین عقیل، ڈاکٹر | تحریکِ پاکستان کے ایک ناقابلِ فراموش راہنما نواب سر سلیم اللہ | تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۳

یم سوہدروی، پروفیسر | ۲۳ مارچ ملی تاریخ کا سنگِ میل | تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۶

ار اشدی، ڈاکٹر | تواریخ ملتِ اسلامیہ کا ایک سنہرا باب | اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۹

اشم رضا | قائداعظم، چند ذاتی مشاہدات | اظہار، کراچی، مئی ۹۲ء ص ۱۵

Energy Supports Life

Our track record portrays a spectacular success story of energy exploration in Pakistan.

We've completed with satisfaction four decades of our dedicated services in the vital energy sector of the country.

We're Pakistan's premier petroleum exploration and production company; discoverers and producers of the country's largest gas field—Sui and pioneers of gas industry in Asia.

Our daily production of natural gas exceeds energy equivalent of 110,000 barrels of furnace oil. And we also produce substantial quantities of oil and LPG.

We have stepped up petroleum exploration through a number of joint ventures with leading oil companies.

Pakistan Petroleum Ltd.

NATIONAL PPL. 1..91-R

مقابلہ کتب برائے صدارتی انعامات

عنوانات: سیرت النبی ﷺ، نعتِ رسولِ مقبول ﷺ اور اسلامی موضوعات پر خواتین اسکالروں کی کتابیں

وفاقی وزارت مذہبی امور نے صدارتی انعامات برائے ۱۹۹۳ء مندرجہ ذیل مقابلہ کتب کا اعلان کیا ہے۔

(I) کتب سیرت ﷺ کا مقابلہ ..... علاقائی زبانوں میں

تین برس کے دوران (بارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵-۱۰-۱۹۸۹ء سے گیارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۰-۹-۱۹۹۲ء) علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی، سرائیکی، پوٹھوہاری، بالتی، شینا، ہندکو، کشمیری، گجراتی اور کھوار میں سیرت ﷺ پر لکھی گئی بہترین کتابوں پر بیس ہزار روپے کا انعام۔

(II) کتب نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کا مقابلہ .... علاقائی زبانوں میں

دو برس کے دوران (بارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ مطابق ۳-۱۰-۹۰ء سے گیارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۰-۹-۹۲ء) میں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں بہترین نعت کی کتابوں پر پندرہ ہزار روپے کا انعام۔

(III) اسلامی موضوعات پر خواتین اسکالروں کی کتب کا مقابلہ

بارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۲-۹-۱۹۹۱ء سے گیارہ ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۰-۹-۱۹۹۲ء کے دوران خواتین کی، اسلامیات کے موضوع پر اردو میں لکھی گئی کتاب پر تیس ہزار، بیس ہزار اور دس ہزار روپے (علی الترتیب) کے انعامات۔

مقابلے میں شرکت کے لیے منظور شدہ فارم پر بہ نام اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایس) وفاقی وزارت مذہبی امور ۳۱ مارچ تک موصول ہو جانا چاہیے۔ داخلہ فارم اور دوسری تفصیلات کے لیے اپنے پتے درج شدہ لفافے معہ ڈاک ٹکٹ بھیجنے ضروری ہیں۔

اے۔ اے حقانی
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایس)
ٹیلیفون نمبر: ۸۲۵۷۳۵

حروفِ تازہ

حیرتوں کی سرزمین
(سفر نامۂ امریکہ و کنیڈا) ۱۹۹۲ء

محسن بھوپالی

صفحات ۱۲۸ قیمت -/۱۰۰ روپے
ایوانِ ادب ۴ ایف ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

زندہ پانی سچا
(شاعری ۱۹۹۲ء)

ساقی فاروقی

صفحات ۲۹۵ قیمت -/۲۱۰ روپے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

ہم اجنبی ہیں
(شاعری ۱۹۹۲ء)

اشفاق حسین

صفحات ۲۰۸ قیمت -/۱۵۰ روپے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

فیض کے مغربی حوالے
(تنقید ۱۹۹۲ء)

اشفاق حسین

صفحات ۱۰۰۶ قیمت -/۴۵۰ روپے
جنگ پبلشرز ۱۳ سر آغا خاں روڈ لاہور

مرثیہ خوانی کا فن
(تحقیق ۱۹۸۹ء)

نیر مسعود

صفحات ۱۵۰ قیمت ۔/۶۰ روپے
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

اردو کا اپنا عروض
(عروض ۱۹۹۱ء)

ڈاکٹر گیان چند جین

صفحات ۹۶ قیمت ۔/۱۵ روپے
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

پتھر میری تلاش میں
(افسانے ۱۹۹۲ء)

فردوس حیدر

صفحات ۱۰۶ قیمت ۔/۱۲۵ روپے
پاکستان ادب پبلی کیشنز، کراچی

الکھ نگری
(ناول ۱۹۹۲ء)

ممتاز مفتی

صفحات ۹۹۸ قیمت ۔/۵۰۰ روپے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

یہ خواب سارے
(ناول ۱۹۹۲ء)

رضیہ فصیح احمد

صفحات ۳۹۸ قیمت ۔/۲۰۰ روپے
مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر، عبداللہ ہارون روڈ کراچی

رو برو
(انٹرویوز)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات ۱۴۳ قیمت ۔/۷۵ روپے
ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غنچہ آرزو
(شاعری ۱۹۹۱ء)

ابوالحسن خاں آرزو عظیم آبادی / مرتب ثاقف مظفر پوری

صفحات ۲۱۰ قیمت ۵۰/۰ روپے
۳/۱۰۵ فرقان آباد، بہار مسلم کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی
جمال الدّین افغانی روڈ کراچی ۵

وردِ نفس
(حمد و نعت ۱۹۹۲ء)

خواجہ ریاض الدّین عطش

صفحات ۴۸ ہدیہ ۲۰/۰ روپے
جاوید خان اسٹیٹ میڈیا
آر-۹۵- بلاک ۶ گلشن اقبال، کراچی

سوغات جنون
(شاعری ۱۹۹۲ء)

خواجہ ریاض الدّین عطش

صفحات ۳۰۴ ہدیہ ۱۲۵/۰ روپے
جاوید خان اسٹیٹ میڈیا
آر-۹۵- بلاک ۶ گلشن اقبال، کراچی

رنگ و آہنگ
(شاعری ۱۹۹۲ء)

خواجہ ریاض حسن انور

صفحات ۲۰۸ قیمت ۷۵/۰ روپے
سلمان پبلی کیشنز اے-۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ۷۵۸۵۰

جشنِ جنوں
(شاعری ۱۹۹۲ء)

خواجہ ریاض الدّین عطش

صفحات ۱۹۱ ہدیہ ۸۰/۰ روپے
جاوید خان اسٹیٹ میڈیا
آر-۹۵- بلاک ۶ گلشن اقبال، کراچی

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
Anne French

فروری ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۲

مضمون نما

جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے	ڈاکٹر حنیف فوق	۵
غالب اور تصوف	افتخار احمد عدنی	۱۴
غالب اور اقبال۔ ایک تقابلی تجزیہ	سید مظفر حسین	۲۷
غالب کی ظرافت	سجاد مرزا	۳۵
غالب اور اقبال	نثار احمد مرزا	۴۳
عصری معنویت کا استعارہ۔ سرسید	ڈاکٹر منظور احمد	۵۵
بابائے اردو ۱۹۴۲ء میں	ڈاکٹر لطیف الحسن	۶۱
گل ہائے رنگ رنگ		
سمندر کی تلاش (ایرانی کہانی)	ناصر ہاشم زادہ/ معین نظامی	۶۹
یہ کہانی کسی کو پتہ نہیں چلنی چاہیے (ایرانی)	طاہرہ رباحی/ معین نظامی	۷۱
نظمیں (سندھی)	[illegible] ترجمہ محسن بھوپالی	۷۳
رفتار ادب	....	۷۵
گرد و پیش	....	۸۱
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۷
حروف تازہ	....	۹۳

بدل اشتراک
فی پرچہ ۔۔۔۔ ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرون ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰ ۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

اب

مقیم اور غیر مقیم پاکستانیوں، فرموں اور کمپنیوں کو

فارن کرنسی اکاؤنٹس

کھولنے کی مکمل آزادی ہے

اہم خصوصیات :-

اہلیت : مقیم اور غیر مقیم پاکستانی، فرمیں، کمپنیاں، غیر ملکی افراد اور غیر ملکی کمپنیاں۔

کرنسی : امریکی ڈالر، پونڈ اسٹرلنگ، جرمن مارک اور جاپانی ین۔

ڈیپازٹس : بیرونِ ملک سے موصول ہونے والی رقومات، ٹریولرز چیکس، فارن کرنسی نوٹس اور فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس سے حاصل کردہ زرِ مبادلہ۔

منتقلی/ترسیل : دنیا کے کسی بھی حصے میں رقومات کی آزادانہ اور بلا بندش منتقلی/ترسیل۔ فارن کرنسی نوٹ اور ٹریولرز چیکس بھی جاری کئے جاسکتے ہیں۔

بندشوں سے مستثنیٰ : فارن ایکسچینج کنٹرول سے آزاد، حصولِ رقم کا ذریعہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس اور زکواۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ۔

قرضے : ان کھاتوں کے عوض پاکستانی روپے میں قرضے کی سہولت۔

منافع : بین الاقوامی مالیاتی مراکز کے مقابلے میں زیادہ شرح منافع جو بلحاظِ مدت ۵۰۰ء۷ فیصدی سے ۶۲۵۰ء۱۰ فیصدی سالانہ تک ہوسکتا ہے۔

فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولئے۔ چند قدم پر ہماری برانچ موجود ہے

حبیب بینک لمیٹڈ

پُرخلوص خدمت کی نصف صدی

پاکستان میں ہماری مجاز شاخیں

سندھ
سینٹرل برانچ، کراچی
بہادرآباد، کراچی
نرسری، کراچی
اسٹیٹ لائف برانچ، کراچی
صدر برانچ، کراچی
سیف ڈپوزٹ والٹ، کراچی
ایس آئی ٹی ای، کراچی
کارپوریٹ برانچ، کراچی
اسٹیشن روڈ، حیدرآباد
فریئر روڈ، سکھر

پنجاب
دی مال، لاہور
بادامی باغ، لاہور
سرکلر روڈ، لاہور
ایل ڈی اے برانچ، لاہور
مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور
پینوراما سینٹر، لاہور
شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
بالمقابل ہائی کورٹ، لاہور
برانڈرتھ روڈ، لاہور
واپڈا ہاؤس، لاہور
سٹی برانچ، اٹک
پی اے سی کامرہ، ضلع اٹک
فرید گیٹ، بہاولپور
مین برانچ، ڈیرہ غازی خان
مین بازار کلاں، ڈیرہ اسماعیل خان
[illegible] روڈ، فیصل آباد
ڈی گراؤنڈ برانچ، فیصل آباد
بینک اسکوائر، گوجرانوالہ
جی۔ٹی روڈ، گوجرانوالہ
سرکلر روڈ، گجرات
مین بازار، [illegible]
سی ڈی اے [illegible] سینٹر، اسلام آباد
اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
کارپوریٹ برانچ، اسلام آباد
[illegible]، اسلام آباد
[illegible]، اسلام آباد
شہید روڈ، جھنگ صدر
[illegible] بازار، [illegible]
ریلوے روڈ، قصور
حسین آگاہی، ملتان
کارپوریٹ برانچ، ملتان
کینٹ برانچ، ملتان
[illegible] روڈ، [illegible]
[illegible]
منڈی روڈ، [illegible]
شاہی روڈ، رحیم یار خان
سٹی برانچ، راولپنڈی
کینٹ برانچ، راولپنڈی
[illegible] برانچ، راولپنڈی
سٹی برانچ، سیالکوٹ
[illegible]، سیالکوٹ
ایس آئی ٹی ای برانچ، سیالکوٹ
[illegible] بازار، سیالکوٹ
جناح چوک، ساہیوال
[illegible] بازار، [illegible]
پی او ایف، واہ کینٹ
مین بازار، وزیر آباد

سرحد
سٹی برانچ، پشاور
کینٹ برانچ، پشاور
[illegible]، پشاور
مین بازار، میرپور (آزاد کشمیر)

بلوچستان
[illegible] برانچ، کوئٹہ
جناح روڈ، کوئٹہ

یوں تو ادبی منظر نامے میں غالب کا چرچا سال بھر ہی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس مہینے ان کی برسی کے موقع پر اندرون ملک اور بیرون ملک بطور خاص ان کی یاد منانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ادبی انجمنیں اور تہذیبی ادارے مذاکروں کا انعقاد کرتے ہیں اور ان کی طرف سے غالب کے موضوع پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ غالب کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً سوا سو سال ہونے کو آئے لیکن غالب کے اعترافِ عظمت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ اب تک ان کے فن و شخصیت کی پرکھ کے سلسلے میں لاتعداد مضامین، مقالات اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ہر سال اس میں بہ دستور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

انجمن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنے سہ ماہی رسالہ "اردو" (۱۹۲۱ء) میں غالب پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مشہور زمانہ مضمون سب سے پہلے شائع کیا تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر انجمن کے جریدے ماہنامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" نے ضخیم، وقیع اور شایانِ شان غالب نمبر شائع کیا۔ اسی تسلسل میں رسالہ "اردو" میں شائع ہونے والے مضامین کا ایک نادر انتخاب "غالب نام آور" (۱۹۶۹ء) کے نام سے چھاپا گیا۔

انجمن ترقی اردو کو چونکہ غالب سے نسبتِ خاص رہی ہے اس لیے آغاز کار ہی سے انجمن غالب پر کتب کی اشاعت کا اہتمام کرتی آئی ہے۔ "ہنگامہ دل آشوب"، "مہر نیم روز"، "گل رعنا معہ آشتی نامہ"، "سبدِ باغ دو در" کے بعد پچھلے چند سالوں میں "غالب کے خطوط" (جلد اول، دوم، سوم) از ڈاکٹر خلیق انجم، "غالب ایک مطالعہ" از پروفیسر ممتاز حسین، "دیوان غالب کامل" از کالی داس رضا گپتا اور "غالب آشفتہ نوا" از ڈاکٹر آفتاب احمد خاں چھاپے گئے ہیں۔

انجمن کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اس کے زیرِ انتظام شائع ہونے والا ماہنامہ "قومی زبان" ہر سال فروری کا شمارہ مرزا غالب کے نام مختص کرتا ہے۔ اس موقع پر قلمی معاونین کو غالب پر مضامین لکھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ زیر نظر شمارے میں بھی سابقہ روایت قائم ہے۔ نامور اہلِ قلم کے کئی تازہ مضامین شاملِ اشاعت ہیں جو غالب شناسی کے ضمن میں تازہ مواد فراہم کرتے ہیں۔

NIT

ایک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا

۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر

۲٫۲۵ روپے

فی یونٹ منافع کا اعلان

اپنے یونٹ یافتگان میں ۳٫ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔

سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔

یونٹ داروں کے لیے فوائد

سال خریداری	آغاز سال پر قیمت	منافع	گزشتہ قیمت پر اضافہ	کل یافت	فی صد
۱۹۹۱	۱۲٫۵۰	۲٫۲۵	۰٫۵۰	۲٫۷۵	۲۲٪
۱۹۹۰	۱۲٫۲۰	۲٫۲۵	۰٫۸۰	۳٫۰۵	۲۵٪

۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت خرید کردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ

صدر دفتر:

شاخیں:

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

United

PID-1-7/92

ڈاکٹر حنیف فوق

جنون ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

خسرو سے لے کر جوش، اقبال اور فیض تک بڑے اور اچھے شاعروں کے یہاں اشعار میں بھی ایسے نکات ملتے ہیں، جو ان کے نئی نقطۂ نظر کی غمازی کرتے اور ان کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ امیر خسرو نے شاعری کو علم سے بالاتر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ:

ایں کہ نام شعر غالب می شود بر نام علم
حجت عقلی دریں من گویم از عرفاں بود

اقبال نے تخلیق کے لیے بے تابیٔ جاں کو اہم قرار دیتے ہوئے شکایت کی تھی کہ:

کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

ہماری کلاسیکی فکریاتِ شعر نے، جن میں عربی اور فارسی روایاتِ شاعری شامل ہیں، معنی، حسنِ معنی اور معنی آفرینی کے لیے وسیع سرمایہ فراہم کیا تھا۔ چنانچہ جب حالی نے پہلی بار اردو میں نظریاتی تنقید کا آغاز کیا تو احتجاج میں بھی اس سرمائے سے بہت کچھ استفادہ کرتے ہوئے، جدید ادبی و معاشرتی امتزاجات کی نشان دہی کی تھی۔ ان کی یہ نشان دہی بھی نئی تعبیرات اور موجودات کی نئی فکری تشکیل ہونے کے باعث تخلیقی عمل کہی جا سکتی ہے۔ حالی خود ایک خلاق شاعر تھے۔ اور ان کی تنقید ایک تخلیقی جہت رکھتی ہے۔ لیکن جس طرح تخلیق میں تنقیدی نکات، خود علمِ تنقید کا بدل نہیں، اسی طرح تنقید کے تخلیقی اوصاف اسے ایک تخلیقی عمل کے درجے تک تو لے جاتے ہیں، لیکن ایک باقاعدہ صنفِ تخلیق نہیں بناتے۔ البتہ تخلیق و تنقید دونوں کو ایک دوسرے میں اثر و نفوذ حاصل ہے۔ اور ان کی جامعیت بعض اوقات اعلیٰ تنقیدی اور بڑے تخلیقی کارناموں کا سبب بن جاتی ہے۔ تنقید کے تخلیقی عمل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، راقم الحروف نے مطالعۂ ادبیات و علوم، انتخاب، ترتیب، تعبیر، نظارۂ زندگی، نظامِ اقدار اور بیان کے ایسے اوصاف کا ذکر کیا تھا جو تنقید کو تخلیقی سمت عطا کرتے ہیں۔ (سالنامۂ ادب لطیف ۱۹۶۰ء) پھر بھی تنقید اور تخلیق کے دائرے الگ الگ رہتے ہیں۔

یہ مطالعہ بھی بہت ضروری ہے کہ خود تخلیق میں جو تنقیدی نظر ملتی ہے، ہر بڑے لکھنے والے کے یہاں اپنے زمانے کے

الات و تصورات کے پس منظر میں اس کی کیا صورت رہی ہے؟ اس مطالعے سے بہت سے گوشے واضح ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تنقید اور تخلیق کی گہری وابستگی کے باوجود ایک کو دوسرے کے دائرے میں لانے کی کوشش دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ تنقید میں اس سے یک رُخی مطالعے یا تاثراتی طرز نگارش کو تقویت ملتی ہے اور تخلیق میں متوازیاتِ زندگی کی دریافتوں کے بغیر، تنقیدی بیانات بے رس اور بے جان رہتے ہیں۔

غالب نے متعدد مقامات پر تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں وہ اپنی ناقدانہ بصیرت کا اظہار کرتے ہیں، وہاں اکثر واقعی زندگی سے موجودات و کیفیات کی کوئی متوازی صورت بھی سامنے لے آتے ہیں۔ غالب شاعری کے شیوہ ہائے بیان میں سرآمد روزگار شمار ہوتے ہیں لیکن جہاں ان کا تخیل وسیع ہے وہاں ان کی تنقیدی نکتہ رسی بھی شاعری میں نئی جلوہ گری کرتی ہے۔ غالب کے نثر میں جو تنقیدی بیانات ملتے ہیں وہ بڑی حد تک شاعرانہ روایات کی تحلیل و توصیف اور اسالیب شناسی پر مبنی ہیں اور یہ نہ ان کی فکری رسائی اور نہ ان کے بے ساختہ اندازِ نثر کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نثری بیانات میں لفظوں کی پرکھ اور اسالیب کی شناخت کی کوششیں اہم سہی، ان میں اس نظارۂ زندگی کی جو تنقید کے لیے بھی ضروری ہے، وہ صفت نہیں ملتی جو تنقید یا تخلیق کو سرمایۂ دانش و اعتبار بناتی ہے۔ شاعر ہی نہیں نقاد بھی لفظی ساختوں سے الجھنے یا شاعرانہ زیبائی پیدا کرنے میں محدودات کا شکار ہوسکتا ہے۔ خود غالب پر رشید احمد صدیقی کے بہت مشہور بیان سے کہ جس میں غالب کو اردو اور تاج محل کے ساتھ مغلوں کی تہذیبی دین بتایا گیا ہے، اس حصے میں بھی جو غالب کے متعلق ہے۔ غالب کی ماضی کے علائق تہذیب سے وابستگی تو معلوم ہوتی ہے، ان کی شاعری میں عصری عناصر مزاحمت اور مستقبل کے علائم و رموز کے جو نقوش پائے جاتے ہیں۔ ان کا حال نہیں کھلتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود غالب کا رجحان فارسی شاعری میں اپنی فکری تازگی کے باوجود، بیان کی محافظہ کاری کی جانب رہا ہے۔ اس کے برخلاف اپنی اردو شاعری میں وہ بیان کے بعض ایسے اسالیب بھی اختیار کرتے ہیں جو روایت سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ گویا ان کی فکری بدت۔ اظہار کی بدت میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ غالب کے فارسی خطوط کے بجائے ان کے اردو خطوط اختراع فائقہ ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے یہاں صورت و معنی کا رشتہ ان کی اردو تحریروں میں مستحکم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ صورت و معنی کی ایسی یک جائی جو کسی ادبی شخصیت کی بہترین نمائندگی کرتی ہو، نثر و نظم میں الگ الگ دائرے رکھتی ہے اور دونوں میں روایت سے پوری واقفیت و وابستگی کے باوجود، لکھنے والے کی تحریروں کو رائج اسالیبِ اظہار یا پہلے سے قائم شدہ اوصاف کے حامل ہونے کی ضرورت نہیں۔

غالب کی شاعری، ذوق کی شاعری کے مقابلے میں زبان کی صفائی اور بیان کی روانی کے اعتبار سے کم تر ہے۔ اسی طرح مومن کی سی رنگینی اور نغمگی کی بھی غالب کی شاعری میں کمی ملتی ہے۔ لیکن غالب کی شاعری میں جو وسعتیں ہیں، وہ ذوق اور مومن کے اندازِ بیان میں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اظہار کے الگ الگ شیووں کے باوجود، فکری گہرائی میں، غالب کا اگر کوئی حریف ہے تو صرف میرؔ ہیں اور غالب نے کھلے دل سے میر کی اوّلیت اور بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن میر کے نظام اقدار کو ان کے دلِ دردمند کے ساتھ ساتھ، سلسلۂ روایاتِ تصوف کی وہ آسودگی حاصل ہے، جو ان کی اپنی الم انگیز کیفیتوں کو بھی ایک نقطۂ تطمین عطا کرتی ہے۔ غالب بھی فروغِ سخن کے لیے دل گداختہ کے قائل ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں مختلف تصورات کی آویزش، قدیم و جدید کی جنگ و جدال، جذبات و خیالات کی کش مکش اور متقاضیات کے تصادم نے جس کرب و اضطرار کو راہ دی ہے، وہ اپنی ترکیب

پذیری کے لیے نئی دنیا اور نئے انسان کا منتظر ہے۔ اسی لیے غالب کی شعری صورتیں نئے فکری نشانات کی حامل ہیں۔

غالب کی حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش کے لیے کہی ہوئی غزل کے اشعار پر ہی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس روایتی ماحول میں بھی غالب کی شاعری جو روایت سے منسلک بھی ہے۔ اپنے عصر کی آزمائش سے ہی نہیں، مستقبل کی گیر دار سے آواز ملا رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

یہ ایسے اشعار نہیں جو نرے شاعرانہ تخیل اور ذوق و شوق کے نتیجے میں وجود پا گئے ہوں بلکہ ان میں خارجی مظاہر، جذباتی کیفیات او شاعرانہ دانش کو باہم مربوط کر کے دور رس نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ غالب کے ایسے اشعار بھی جن میں تنقیدی بصیرتوں کی بجلیاں چمک رہی ہیں، تعداد میں کم نہیں، لیکن ان کا بڑا وصف یہی ہے کہ انھیں اکثر زندگی کی متوازیات سے آب و رنگ دیا گیا ہے ایسے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہنوز اک پرتو نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں — مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے — اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی — ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

یہی بار بار جی میں مرے آوے ہے کہ غالب — کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میزبانی

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے — یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں / انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا / گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ / پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے / نالہ پابند نے نہیں ہے

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے / آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر / کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد / پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں / دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر / شہپر رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاش دید نہ پوچھ / برنگ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں / ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے / خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ / دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے / جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں / ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے، ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام تنقیدی نکات "مگس کی قے" نہیں ہیں۔ ان میں اپنے ماحول و تہذیب سے وابستگی اور زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں کی شناسائی کے ساتھ ایک ایسی ذہنی قوت ملتی ہے جو تقلید کے سرتاسر خلاف ہے اور پیروکاری کے بجائے پیش قدمی کی خواہاں ہوتے ہوئے جامد خیالی کی جگہ آزادیٔ فکر کو مطمحِ نظر بناتی ہے۔

ادبی تنقید کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس سے زبانی اور نازبانی کی کچھ جہتیں واضح ہوتی ہیں۔ جدید تنقید نے ان کا تعلق ماحول اور معاشرے سے بھی قائم کیا ہے، لیکن بعض نفیٔ ادب کے دبستانوں کے علاوہ ادبی تنقید کے متعدد دبستانوں میں سے کسی نے ادبی تخلیقات کے محاکے اور قدر و قیمت کے تعین کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین حتمی اور آخری نہیں ہوتا اور پرکھنے کے پیمانے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن کسی نہ کسی معیار کی جستجو جاری رہتی ہے اور یہ جستجو خود اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نہ ہو تو خزف ریزوں سے ایوانِ ادب پر ہو جائے اور جواہر پارے خاک میں لوٹتے نظر آئیں۔ پھر معیار کی تلاش جاری رہے تو ادب کی جمہوریت بھی افراط و تفریط کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ ادب کی اس جمہوریت میں بنیادی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ یہی حیثیت، انسانی اقدار کی محرک بنتی ہے۔ البتہ کچھ ایسے تصورات بھی ملتے ہیں جو انسانی اقدار کی نفی پر مبنی ہیں۔ ان سے ہی نفیٔ ادب کی راہیں بھی نکلتی ہیں۔ ادب کے محاکے اور قدر و قیمت کے فیصلے سے عاری تصورات، نقد، دراصل زندگی کی فہم و دانش سے بھی انکار کرتے نظر آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ مطالعۂ ہیئت کے بہت سے دعووں کے باوجود سبک شناسی کا کام بھی افکار و اذہان کے تاریخی علم کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا اور کورے کاغذ سے روغن گل نہیں نکالا جاسکتا۔ پھر ادب کے قاری اور ادبی تخلیق کی قرات پر زور دینے والوں کے لیے، رابرٹ براؤننگ کا یہ بیان حد درجہ قابلِ توجہ ہے کہ کتاب کے پڑھنے کے لیے واقعی انسان ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ تخلیقی فکر کے دوسرے سرے پر قاری اور قاری کی انسانیت بے حد اہم ہیں۔ اگرچہ اس کے اپنے حدود بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مطالب جو اشعارِ غالب سے اخذ کیے جاتے رہے ہیں کیوں ان کے ہم عصروں کے کلام سے منسوب نہیں کیے گئے؟ اس کے باوجود ادب کی جمہوریت، دونوں سروں یعنی تخلیق کار اور قاری کی سطحوں پر انسانی اقدار کی پاس داری کو ملحوظِ خاطر رکھتی ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ کوئی بوطیقا اگر انسان کو

تخلیق سے خارج کر دیتی ہے تو کیا وہ کسی انسانی معاشرے کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اسالیبِ اظہار کی کلید لفظی ساختیات سہی لیکن معنی شناسی کی منزل، صورت شناسی سے آگے ہے۔ ادبی تخلیق پر غور کرتے ہوئے تجزیۂ صورت کو نچلی سطح اور ادراک معنی کو بالائی سطح قرار دے لیں تو نچلی سطح سے بالائی سطح تک پہنچنے کی کوشش بھی ملتی ہے اور اقدار کی پرکھ میں دونوں کی اہمیت ہے غالب نے کہا تھا کہ:

نہیں گر سرو برگ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اولین اہمیت تو ادراک معنی کو حاصل ہے لیکن وہ تماشائے نیرنگ صورت کہہ کر بہت سے تنقیدی گوشوں کی جانب اشارہ کر گئے ہیں۔

غالب کے تنقیدی نکات میں۔ ان کے اپنے اور دوسروں کے بعض اشعار کی پسندیدگی کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ذوق غالب کی تفہیم کے حدود وسیع ہو جاتے ہیں۔ غالب نے اپنے انتخاب و پسندیدگی میں کچھ اشعار لیے، کچھ چھوڑے، لیکن اس سے اختلاف اس لیے ضروری نہیں کہ غالب کی تنقیدی بصیرت، ذوقی میزات سے کام لیتی ہے۔ نظری مباحث کی پابند نہیں۔ غالب نے ذوق کے گھبرا کے مر جانے کی خواہش رکھنے اور مر کر بھی چین نہ پانے کے امکان سے دل تنگ ہونے والے شعر کو نہایت پسند کیا تھا، کیوں کہ یہ ان کے اپنے ذوقِ شعری کے قریب تھا لیکن ذوق کے اپنے رنگ کا غزل میں کوئی کامیاب ترین شعر ہو سکتا ہے، تو وہ شاید یہ ہے کہ:

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

اس شعر میں روایت کے تسلسل کے علاوہ۔ زبان کی خوبی اور ایک عاشقانہ کیفیت متشکل ہو گئی ہے۔ اس کے شاعرانہ تصوّر اور عاشقانہ تصویر میں ایسی خصوصیتِ تعمیم ہے جو دل پذیر اور دل گداز ہے۔ خیال کی اصل صورت سازی وہی ہے جو فن کے کسی تصوّر کے براہ راست اظہار کے بجائے۔ زندگی کی ایک متوازی صورت کو پیش کرتے ہوئے، بالواسطہ ایک بوطیقا کی بنیاد رکھتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

اس شعر کے سارے اجزائے بیان پہلے سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود اسے ندرتِ خیال اور متوازی صورت گری کی بہت اچھی مثال کہا جا سکتا ہے۔

صنفِ غزل میں شعر گوئی کا جو سامان اور سرمایۂ ساخت پایا جاتا ہے۔ اس سے ساختیت پسند بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں کہ دوسروں کے اقوال نقل کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ خود تلاش و تطبیق کا کام سرانجام دیا جائے۔ لسانیات کے زیر اثر زبان کے

متعدد مطالعات میں ساختیت اور پس ساختیت نے بھی ایک مطالعے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ادب کی تفہیم میں اسے بھی یک اوزار کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس سے ادب یا ادب پارے کی کلّیت تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض ترقی پسند (مثلاً پراگ اسکول) اور بعض رجعت پسند حلقوں نے اسے اپنے سماجی اور غیر سماجی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ لیکن یہاں اوّلین حیثیت پھر ان مقاصد کو حاصل ہو جاتی ہے، جن کے لیے یہ اندازِ تجزیہ ایک ذریعہ بنتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض لکھنے والوں نے علمی انداز سے ان مباحث پر قلم اٹھایا ہے اور بعض نے لسانیاتی مطالعوں سے زندگی کے فکر و فلسفہ کی جستجو کے پہلو نکالے ہیں۔ لیکن اُن کی اس دقتِ نظری سے الگ بعض عمومی بیانات کو بیساکھیوں کی طرح استعمال کرنے والے بھی ہیں وہ خواہ کسی زبان میں بھی لکھتے ہوں۔ ان کا مقصد نہ استعمار پسندی ہے نہ انقلاب آفرینی بلکہ بہتی ہوئی رو کے ساتھ روانی ہے لسانیات پر نظر کے لیے کسی مدرسانہ ادعا کے بجائے طالب علمانہ ذہنی تنظیم ضروری ہے اور اس پر کوئی قابلِ ذکر کام تو ایک عمر کی ریاضت کا متقاضی ہے اس کے باوجود اس کے ذریعہ صفت تخلیق کا تجزیہ اور جوہر تخلیق کی گرفت آسان نہیں کیوں کہ یہ انسان اور معاشرے کے گوناگوں تعلقات اور ندرت و بداعت کی متفاوت و مختلف جہات کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی لسانی مطالعات کا اپنا دائرہ ہے چنانچہ ایک جملے سے دوسرے جملے کس طرح پھوٹتے ہیں، بنی ہوئی قواعد اور رواں بیان و کلام میں کیا کیا فرق رونما ہوتے ہیں، اشارہ کنندہ اور موضوع اشارہ میں کیا نسبتیں ہیں، رمز و پیام کیا ہیں، اور ہر ادبی تخلیق کی اپنی قواعد ہے۔ یا وہ مقررہ قواعد سے انحراف پر مبنی ہے، ان سب سوالوں کا ناقص علمی انداز سے جواب دینے کی کوشش کی جاسکتی ہے اور بعض ملکوں میں کی گئی ہے۔ پھر ایک طرز ادا کی لسانی صورت، تصوراتی شکل سازی اور نوعی خصوصیت کا بھی غائر مطالعہ کیا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں جو محنت ہے اس کی وجہ سے اس جانب توجہ کرنے والے کم ہوں گے لیکن یہ سب مطالعات تفہیم ادب کے لیے سود مند بن سکتے ہیں۔ البتہ ادب کی شخصی، تاریخی، عصری اور مستقبل پر اثر اندازی کی حیثیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تہذیبی ارتقاء اور انسان کے تاریخی سفر سے مربوط ہیں۔ ادب نہ اپنے عصر سے بیگانہ ہوسکتا ہے، نہ غیر ذاتی بن سکتا ہے۔ اور نہ نقشِ خیال میں جو صورت فردا ہے، سے مٹایا جاسکتا ہے۔ اسے مٹانے کی تمام کوششیں غیر انسانی اور مخالفِ سماج رویوں کی جانب لے جاتی ہیں۔ پھر ادبی تحریر ایسی خود کار تحریر بھی نہیں کہ مشین سے خود بخود کھٹا کھٹ برآمد ہو جائے اور نہ کوئی گوریلا اتفاقاً و تصادفاً بار بار کی کاوش سے حروف تہجی پر ہاتھ مار مار کر مسجد قرطبہ یا ڈیوائن کامیڈی لکھ سکتا ہے۔ انھیں لکھنے کے لیے جس جوہر اور جذبے کی ضرورت ہے، وہ ایسی اساس ہے کہ جس کی گرفت اجزائے بیان کی تشریح اور تکنیک کے تجزیے کے بس سے باہر ہے۔

غالب نے پیش کردہ شعر میں فصلِ گل، جنون، وفا اور عشق کے پہلے سے موجود روایتی سرمائے سے جو کام لیا ہے۔ اس میں ان کے تخلیقی جوہر، تاریخی دانش، اجتماعی شعور، تنقید عصر اور تصور پسندی سب کی جھلک ملتی ہے۔ یہ کیسی نئی اور حیرت انگیز صورتِ حال ہے کہ وفا کے ہوتے ہوئے بھی دعوائے عشق بے بنیاد ہے۔ لیکن اس خیال کی متوازی صورت سازی غالب نے "جنون ساختہ و فصلِ گل" سے کر کے بیان کے دائرے کو وسیع کر دیا اور 'قیامت ہے' کے ٹکڑے سے خود اپنی میزانِ اقدار کے ساتھ حزنِ انسانیت کو نمایاں کیا ہے۔ اسے اگر ہم تخلیق پر منطبق کریں تو کیا ولولۂ تخلیق نہ ہوتے ہوئے صرف بنی بنائی صورتیں یا ان کے اجزاء جنھیں بعض حلقوں میں اساسیات ساخت کہا جاتا ہے، فن کا نقش جما سکتے ہیں؟ دراصل اس شعر میں وہ ایک حقیقت کے عاشقانہ پہلو کے اظہار سے بری ہوئے ہیں اور رومانی روایت کو رد کیا ہے خود عاشقی یا جذبے سے تہی دعوائے عاشقی پر جو طنز الب: روا رکھا ہے [illegible] کے لطائف و دقائق اقداری جہات رکھتے ہوئے۔ ندرتِ خیال اور ندرتِ اظہار دونوں سے سرو کار رکھتے ہیں۔

پہلے غالب نے ایک منقلب عشقیہ صورتِ حال کو پیش کیا ہے اور پھر اس کی متوازی صورت گری کا جادو جگایا ہے۔ جس میں وا
کاری کے خارجی موجودات کے ہوتے ہوئے، جنھیں فصل گل کہا جا سکتا ہے، وہ بنی بنائی، مصنوعی اور غیر حقیقی صورتِ جنوں
قیامت قرار دیتے ہیں۔ تخلیقی ولولے سے الگ ہو کر جنونِ ساختہ ایک ایسا میکانکی رویّہ ہے جسے غیر انسانی قرار دے سکتے ہیں غالب
نے اسے قیامت کہہ کر اپنے بشری غم کا اظہار کیا ہے۔

اردو شاعری اور خصوصاً غزل پر بڑا اعتراض یہی رہا ہے کہ اس میں روایات، علامات، تلمیحات، ترکیبات، مفروضات بلکہ تصوّرات تک کا ایسا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ شاعر کا کام صرف انھیں ترتیب دینا رہ جاتا ہے۔ لیکن اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہر بڑے شاعر نے اپنی عصری آگہی، انفرادی مزاج اور حسی لرزشوں سے تخیلات کے نئے سانچے ڈھالے ہیں اور ان کے حیات و کائنات کے تصورات بڑی حد تک اپنے پیش رووں سے مختلف رہے ہیں۔ مثال کے طور پر عاشقانہ دردمندی آتش کی قلندرانہ جسارت اور غالب کی ذہنی بلندی نے ان کے شعری افادات پر اثر ڈالا ہے۔ اردو شاعری میں غزل اور نظامِ غزل کو سامنے رکھا جائے تو گہری ساخت کی تلاش اور پسِ ساخت کی تفتیش کے بہت سے عقدے وا ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مغرب کے بعض جدید نقادوں نے قدیم عہد کی مشرقی تنقید سے فائدہ اٹھایا ہے اور آج اردو میں جدید کے نام سے پیش کیے جانے والے مغرب کے بعض تنقیدی تصورات مشرقی تنقید کے بیان اور اجزائے بیان کی ترجیحی اہمیت کی یاد دلاتے ہیں۔ البتہ اردو میں اقدار کی پرکھ پر مبنی تنقید سے جس رو کا آغاز ہوتا ہے وہ اپنی وسعت، سماجی علوم سے فیض یابی اور زندگی کے حوالوں میں قدیم طرزِ فکر سے مختلف ہوتی گئی ہے۔ لیکن اس کے لیے حالی کو مقدمہ لڑنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اور یہ مبارزت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنقید اور فکری تنقید کا عمل جاری رہنے سے ادبی ارتقاء کے عمل کو تقویت ملتی ہے اور مختلف تنقیدی نظریات کی کش مکش بھی زندگی کی کش مکشوں کی مظہر بن جاتی ہے۔ لیکن کسی ایسے نظریہ تنقید کا دم بھرنے والوں کے لیے کہ جس کی وابستگی ہمارے معاشرتی حالات سے کم ہو یا بالکل نہ ہو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ اس کے بیرونی مفکرین کی تحریروں کے اردو میں مفصل ترجمے کا کام سنبھالیں، پھر حسب توفیق ان کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنے ادب کی تحلیل و تطبیق کے نمونے پیش کریں کہ ان کے بغیر نرے دعووں سے بات آگے نہیں بڑھتی۔

غالب نے صریر خامہ کو نوائے سروش کہا تھا ایک زمانے تک ادب کے الہامی تصوّر نے اپنی حکومت قائم رکھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تخلیق کے انفرادی اور اجتماعی محرکات بھی سامنے آتے گئے۔ حافظ نے لطفِ سخن کے ساتھ ادب کی مقبولیت کو بھی خداداد بتاتے ہوئے کہا تھا کہ:

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

اس میں شک نہیں کہ لکھنے والوں کو اور بعض اوقات قبولِ عام رکھنے والوں کو حسد کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ غالب نے بھی حسد کو سزائے متاعِ سخن قرار دیا تھا۔ وہ اپنی شاعری کی کم مقبولیت کے شکوہ سنج رہے لیکن انھیں اس کے مانے جانے کا یقین بھی تھا۔ نظریۂ اضافیت ہو یا جدلیاتی کش مکش ان کا روپ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ فن، فلسفے اور سائنس کے وہ تصورات جو زندگی کی ارتقائی جدوجہد سے وابستہ ہیں، پردوں سے باہر آکر رہتے ہیں کہ ان میں انفرادی ریاضتوں کی تب و تاب، انسانی جدوجہد کی روشنی اور وقت کی سچائیوں کی جلوہ گری ملتی ہے۔ اغیار کا حسد ہو یا اظہار کی مشکلات ان سے گزرتے ہوئے قبول عام کا تصوّر جسے حافظ نے

...داد کہا ہے، فن کی ایک بلند منزل ہے کہ یہ مثبت فکر اور اثباتِ زندگی کو متحد کرتا ہے۔ غالب کی شاعری نے جو قانون باغبانی ...را لکھا تھا، وہ آج بھی دل نشیں ہے کہ اس سے زندگی کے ولولے تازہ ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنی شاعری سے جذبات، فطرت ...معاشرتی تصورات کو متحد الفکر کیا ہے۔

بہ جہاں گرمیٔ نگاہ ہُسنت زعشق
شورش اندوز غوغای ہزار ست بہار

(غالب)

قومی زبان (۱۴) فروری ۱۹۹۳ء

افتخار احمد عدنی

غالب اور تصوّف

دو مہینے پہلے میں لاہور گیا تو اشفاق احمد صاحب سے ان کے نہایت ہی منفرد ٹی۔ وی سیریل "من چلے کا سودا" پر انھیں مبارکباد دینے کے لیے ملا۔ وہ اس کامیاب سیریل کے اختتام پر خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان سے نظر آئے ہوا یہ کہ ان کے دوست، ان کی تخلیقی کاوشوں سے دلچسپی رکھنے والے جن کی رائے کو وہ خاصہ وزن دیتے ہیں اور تمام صاحبان نقد و نظر اُن سے ناراض تھے کہ انھوں نے کس وجہ کو حقیقت سمجھ کر سادہ دل لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سن کر مجھے احساس ہوا کہ جمیل الدّین عالی کے کالم یا تو ایک وسیع حلقۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں یا اس پر شدّت سے اثر انداز ہوتے ہیں کیوں یہ ہی بات عالی صاحب کچھ دن پہلے مجھ سے کہہ چکے ہیں۔

جمیل الدّین عالی کی والدہ کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا تھا۔ اس بیماری میں انھوں نے ایسی خدمت کی کہ مجھے بار بار حضرت بایزید بسطامی کا وہ واقعہ یاد آتا تھا کہ ایک رات اُن کی والدہ نے پانی مانگا اور جب وہ پانی لے کر گئے تو وہ سو چکی تھیں۔ بایزید رات بھر کٹورا لیے ہوئے کھڑے رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی آنکھ کھلے اور دوبارہ ان کو پانی مانگنا پڑے۔ اس رات انھوں نے اپنی عبادت بھی ترک کر دی۔ چھ سات مہینے وہ جناح اسپتال میں اپنی والدہ کی تیمارداری کے سلسلے میں فرش پہ سوئے۔ اور اس پریشانی اور صعوبت کی وجہ سے خود عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے۔ والدہ کے انتقال پر عالی ایک گھرے غم میں ڈوب گئے۔ اس غمزدگی کے عالم میں انھوں نے مجھے فون کیا اور اپنے گھر بلایا۔ فون کرنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے پوچھا بھئی یہ بتائیے تصوف میں غم کا کیا علاج ہے۔ میں نے کہا تصوف تو ہے ہی غم کا علاج۔ اور میں نے یہ اضافہ کیا کہ اگر اشفاق کا سیریل "من چلے کا سودا" ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں آپ سے کہتا کہ اُسے دیکھنا شروع کر دیں۔ اتفاق سے وہ اس کی دو قسطیں دیکھ چکے تھے خاصی بدمزگی سے بولے۔ یہ علاج تو بیماری سے بدتر ہے. معلوم نہیں اشفاق لوگوں کو کس بھول بھلیاں میں لے جائے گا۔ روشن خیالی کے اس دور میں توہمات کے پیچھے دوڑنا ایک قومی سانحہ ہے، میرا یہ مشورہ بہت زود اثر ثابت ہوا عالی صاحب غم واندوہ کی اُس دھند سے نکل آئے جس میں انھیں میری ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ نہ انھوں نے مجھ سے آنے کے لیے اور نہ میں نے اسے ضروری سمجھا. "من چلے کا سودا" اپنا کام کر چکا تھا۔ اب انھیں ساری فکر یہ تھی کہ کس طرح اشفاق احمد کی اصلاح کریں ایک ہفتے بعد جب میں لاہور میں اشفاق صاحب سے ملا تو معلوم ہوا کہ عالی صاحب انھیں ٹیلیفون کر کے بہت کچھ بُرا بھلا کہہ چکے ہیں۔ وہ اس صورت حال سے کافی پریشان تھے. اہلِ دانش کی اس یلغار نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں ان کے دفاع

لکھنا شروع کر دوں گا۔ لیکن اس سے انھیں کوئی اطمینان نہ ہوا۔ بھلا "جنگ" کے کالم کے مقابلے میں "قومی زبان" کے
ن کی کیا اہمیت ہے اور پھر انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ ایک چنا کیا بھاڑ جھونکے گا؟

شام کو مجھ سے ملنے کے لیے سلسلۂ تاجیہ کے کچھ سرگرم عقید تمند آئے۔ انھوں نے آتے ہی اس سیریل پر گفتگو شروع کر
میں نے کہا اگر آپ نے اس سیریل کو پسند کیا ہے تو اشفاق صاحب کو مدعو کریں اور اپنے تاثرات سے انھیں آگاہ کریں تاکہ
ں آئندہ اس قسم کے اور ڈرامے لکھنے کی ہمت ہو۔ وہ پورے سلسلے کو دعوت دینے لگے۔ میں نے مشورہ دیا کہ دو تین لوگ ہوں
تر ہے تاکہ آرام سے تبادلۂ خیالات ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے دعوت دے کر اشفاق صاحب کو اپنے گھر بلایا۔ رضیہ سلطانہ نے کھانا
اور وہ بھی اس اشتیاق کے ساتھ جیسے کسی عرس کا اہتمام کر رہی ہوں۔ ظفر ملک صاحب کے گھر میں دعوت تھی وہ اتنے خوش
ر جوش تھے کہ اگر ان کی بیگم کی نگاہوں نے ہلکی سی تنبیہ نہ کی ہوتی تو وہ گھر میں چراغاں کر دیتے۔ جب اشفاق صاحب آئے تو
ملک نے ان کے پرانے ڈراموں کے حوالے دے کر اور اہم مکالموں کے ٹکڑے سنا کر مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اور آخر میں یہ
ئش کی کہ اب وحدت الوجود کا مسئلہ بھی اپنے کسی ڈرامے میں صاف کر دیں۔ جب ان کے مطالبات بڑھتے چلے گئے تو اشفاق
ب نے کہا یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ یہ توقع کریں کہ میں آئنسٹائن کا نظریۂ اضافیت کسی ڈرامے میں سمو دوں۔ یہ میرے بس
بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابن عربی کی فصوص الحکم اور آئنسٹائن کا نظریۂ اضافیت دونوں ہی کسی کے بس میں
نے والی چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ظفر ملک کے اشتیاق، ان کی بیگم کی احتیاط اور رضیہ سلطانہ کے صرف ایک چبھتے ہوئے
ل سے انھیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ لوگ ان سے کیسی بھرپور توقعات رکھتے ہیں۔ مانا کہ اہل تنقید ہر فن پارے کو مغربی اقدار کی
ٹی میں جانچتے ہیں، مانا کہ اہلِ دانش نے ہمیشہ اہلِ دل پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے ہیں، لیکن انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ
کارگۂ حیات میں اہلِ دل بے یار و مددگار نہیں ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے اس سیریل پر اہلِ دانش کی
ار کے بعد ہی کہا ہو:

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

اگرچہ حرم دل کو تاراج کرنے کے لیے عقل نے ایک لشکرِ جرار تیار کر لیا ہے لیکن اس معرکے میں عشق تنہا تو نہیں ہے۔
م دل کو بچانے کے لیے ابابیلوں کے غول آجائیں گے۔ اور اس بات کا اشفاق صاحب خود تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ گوجرانوالہ سے
سو آدمیوں کے ایک قافلے کا کھانے کی دیگوں اور ڈیڑھ من گلاب کے ہاروں کے ساتھ لاہور صرف اس لیے آنا کہ وہ "من چلے کا
" لکھنے والے ادیب سے اپنی عقیدت کا اظہار کریں کسی طرح ایک اعجاز سے کم نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس سیریل پر مضمون
نے کا وعدہ میں کب پورا کر سکوں۔ لیکن یہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ تصوف یا غالب یا غالب شناسی پر لکھتے ہوئے اس کے کسی کردار یا
ئے کا ذکر چلتا رہے۔ "پرورش لوح و قلم ایسے ہی سہی"

فیض صاحب کے اس شعر کو جب بھی سنا یا پڑھا تو توجہ ہمیشہ دوسرے مصرعے پر رہی "جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں
لے" واقعی شاعر کا کام ہی یہ ہے کہ جو دل پہ گزرے وہ رقم کر دے۔ اور جریدۂ روزگار پہ اپنے نقوش مرتسم کرتا چلا جائے۔ آج پہلے
رعے کا ایک ٹکڑا جو لکھا تو "پرورش لوح و قلم" کی ترکیب کچھ عجیب سی لگی، میرے پاس تنقید کا ایک بہت آسان نسخہ ہے، اگر
ی کوئی چیز کھٹکتی ہے تو میں اُسے حضرت کی نظر سے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر میں حضرت سے "پرورش لوح و قلم" کی ترکیب کے

بارے میں سوال کرتا تو وہ بلا تکلف کہتے "میاں ہوش کے ناخن لو۔ لوح و قلم کو کیا تم نے کوئی بچہ سمجھا ہے کہ دودھ پلا کے اُسے جائے یا تعلیم سے نکھارا جائے پرورش ہوتی ہے بچوں کی، مسکینوں کی، ناداروں اور محتاجوں کی۔ انسانی سطح سے نیچے اترو تو انڈا دینے والی مرغیوں کی یا دودھ دینے والی گائے بھینسوں کی، یا سواری اور بار برداری کے جانوروں کی۔ تم نے لوح و قلم کو ان میں سے کس قبیل میں ڈالا ہے" میرا خیال ہے کہ اگر فیض صاحب زندہ ہوتے اور میں حضرت کے یہ ممکنہ تاثرات ان تک پہنچاتا تو وہ سن کر کچھ مسکراتے اور شاید پرورش کی جگہ کسی اور لفظ کا انتخاب کرنے پر مائل ہو جاتے۔ وہ حضرت کے انداز نظر سے خوب واقف تھے اس لیے کہ لندن میں کئی بار ان کے ہاں ٹھہر چکے تھے۔ فیض صاحب میں عجب فراخدلی تھی۔ میری بہن رفیعہ نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ جگر صاحب جب ان کے ہاں آئے تو فیض صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ جگر صاحب نے اُن سے کلام سنانے کی فرمائش کی، دوسری یا تیسری غزل میں کسی شعر کی بندش پر جگر صاحب نے کوئی اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح باندھا جائے تو بہتر ہوگا، فیض صاحب نے بڑی فراخدلی سے جگر صاحب کے مشورے کو قبول کر لیا۔ "پیدا کہاں ہیں ایسے فقید المثال لوگ"

اپنے موضوعِ سخن تک پہنچنے میں ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے۔ پندرہ دن پہلے نیپا میں ایک سرکاری قسم کی تقریب تھی میں پہنچا تو میرے پرجوش، خوش طبع اور بلند آہنگ دوست آفتاب احمد خاں نے ایک قہقہے سے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں بقدرِ ظرف ان کے قہقہوں میں شریک ہو کر اس غیر متوقع ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتا رہا اتنے میں ان کے ہم نام اور ہم مشرب ڈاکٹر آفتاب احمد نے جو ان کے برابر بیٹھے تھے "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" کہہ کر مجھ سے خطاب کیا اس قران السعدین سے مجھے اور بھی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا اگر "آفتابین" یکجا ہوں تو اور کیا چاہیے۔ قہقہوں کے درمیان جب میں نے دوسری مرتبہ "آفتابین" کہا تو ڈاکٹر آفتاب احمد نے اصلاح کرتے ہوئے کہا "آفتابین" درست نہیں ہے، تقریب چونکہ شروع ہونے والی تھی اس لیے میں چند کرسیاں چھوڑ کر اسی صف میں بیٹھ گیا، میں نے سوچا کہ واقعی آفتاب کے لیے جو فارسی لفظ ہے عربی کا تثنیہ درست نہیں ہے۔ پھر مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس غلطی کا ازالہ کس طرح کیا جائے اس سلسلے میں اقبال کا ایک شعر یاد آیا، اس شعر میں اقبال نے سعدی کی بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبال کو سعدی بیچارے سے کیا پرخاش تھی کہ ان کے مقبولِ عام کلیات کی تردید یا اصلاح کرتے رہتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ رومی کے ایسے عاشق تھے کہ ان کے علاوہ کسی اور کی خوبی ان کی نگاہوں میں جچتی ہی نہیں تھی، رومی کے آگے وہ بڑے ادب سے مرید بندی بن کر بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ عاشق کا محبوب کے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز ہونے کا صحیح اندازہ مجھے حضرت شہید اللہ صاحب کے ایک جواب سے ہوا تھا شہید اللہ صاحب انگریز تھے۔ ساٹھ ستر سال پہلے وہ اور ان کے بھائی فارسی کی عارفانہ رباعیوں اور کشف المحجوب کے ترجمے پڑھ کر حقیقت کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے۔ شہروں شہروں پھرتے رہے۔ بمبئی میں حضرت ذوقی شاہ صاحب سے ملے اور پھر ان کے ہی ہو گئے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ذوقی شاہ صاحب کے وصال کو تقریباً تیس سال ہو چکے تھے۔ میں شہید اللہ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کسی طرح اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا انگلستان سے کوئی تعلق ہے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی سرحد کا خوبرو پٹھان، دلی والوں کے لباس میں ملبوس، قلعۂ معلّٰی کی زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ جب میری حیرت میں کچھ کمی ہوئی تو میں نے ذوقی شاہ صاحب اور ان کے بڑے بھائی کے بارے میں نیازمندانہ انداز میں باتیں شروع کیں ان کی شفقت نے مجھے ایک غیر محتاط سا سوال کرنے کی جسارت دی۔ میں نے پوچھا کہ حضرت ذوقی شاہ صاحب کے وصال کے بعد آپ کی نظر کسی اور بزرگ کی طرف تو نہیں اُٹھی۔ انھوں نے ایسا خوبصورت جواب دیا کہ اس سے بہتر جواب [illegible]

قومی زبان (۱۷) فروری ۱۹۹۳ء

وہ مسکرائے اور انھوں نے صرف یہ شعر پڑھا:

ہمہ شہر پُرز خوباں منم و خیالِ ما ہے
چہ کنم کہ چشم بد خو نکند بکس نگاہے

ہر حسینوں سے بھرا ہے۔ لیکن میں ہوں کہ صرف اپنے محبوب کے خیال میں گم ہوں۔ نہ جانے میری چشم بد خُو کو کیا ہو گیا کہ
ر کی طرف اٹھنا گوارا نہیں کرتی۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں یہ شعر لکھ لوں۔ انھوں نے اجازت بھی دی اور ساتھ ہی قلم اور کاغذ بھی۔

اس کے برعکس بھی ایک حقیقت ہے۔ اس کے لیے ہمیں پھر اشفاق صاحب کی طرف چلنا پڑے گا۔ ظفر ملک صاحب کی
ت میں چونکہ میزبانوں میں دو خواتین تھیں انھوں نے سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا دعوت صرف اشفاق صاحب کو دینی چاہیے،
نو قدسیہ بھی ساتھ ہوئیں تو ممکن ہے وہ اُن کی مروّت میں اپنی کامیابی کو ان کے مشوروں کا نتیجہ بتائیں۔ اور کھل کے بات نہ
یں۔ یہ فیصلہ نہایت صحیح تھا۔ اس لیے کہ بانو قدسیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بڑی تکلفی سے ان کے بارے میں گفتگو
رہے۔ ایک اہم بات انھوں نے یہ بتائی کہ ایک روز ان کے بیٹے نے بانو قدسیہ سے شاید غالب کے کسی شعر کا مطلب سمجھنا
شعر میں معشوق کا لفظ استعمال ہوا تھا بیٹے نے ماں سے پوچھا معشوق کا کیا مطلب ہے۔ ماں نے جواب دیا وہ جس سے
کی جائے" بیٹے نے کہا یہ تو لفظی معنی ہوئے۔ مطلب بتائیے۔ ماں نے طرح طرح سے مطلب بیان کرنے کی کوشش کی مگر
تشفی نہ ہوئی۔ بات بڑھتے بڑھتے باپ تک پہنچی باپ نے بھی معشوق کا وہی مطلب بیان کیا۔ بیٹے نے کہا لو جی اردو کے دو
دیب ایک معمولی سے لفظ کا مطلب نہیں بتا سکتے ماں باپ دونوں لاجواب ہو گئے۔ اس سقراط صفت بچے کی جرح سے زچ ہو
ب کی تلاش میں دونوں موٹر میں بیٹھ کر حضرت فضل شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے جن کے فیض کی چھاؤں میں اشفاق
نے اپنا سیریل لکھا ہے۔ وہ ابھی موٹر پارک ہی کر رہے تھے کہ بانو تیزی سے اُتر کر حضرت کی طرف گئیں اور دور ہی سے
یا "معشوق کسے کہتے ہیں" فضل شاہ صاحب نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا "جس کا ناخوب بھی خوب لگے" کس قیامت کا
ہے یہ۔ دنیا کی تمام عشق و محبت کی داستانیں اس ایک کوزے میں سما سکتی ہیں۔

تصوف کی رعایت سے باتوں ہی باتوں میں دو بزرگوں کے جامع جوابات کا ذکر ہو گیا۔ اب میں پھر اقبال اور اپنے دو
ں" کی طرف لوٹتا ہوں۔ سعدی نے کہا ہے کہ دو سلطان ایک ملک میں نہیں سما سکتے لیکن دس درویش ایک کمل میں آسانی
جاتے ہیں۔ اس بات کو اقبال نے آگے بڑھا کے فلک شگاف بلندی دے دی وہ کہتے ہیں:

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجد
عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

عجیب بات نہیں ہے کہ ایک ولایت میں دو بادشاہ نہیں سماتے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ دونوں عالموں میں ایک فقیر
ماتا۔

یہ شعر خودی کی پہنائی اور قوت پرواز کی معراج ہے میں نے اپنے دو "آفتابوں" کو یکجا کرنے کے لیے اسی کا سہارا لیا۔ اور
زیر فکر کر کے نیپا کی تقریب کے دوران اسے اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا

عجب ایں کہ می خر امد بدو آفتاب یکجا

یہ کیا حیرت کی بات ہے کہ ایک فقیر دو عالم میں نہیں سماتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ چلتا ہے تو دو آفتاب اس کی جلو میں ہوتے ہیں۔

نیپا کی تقریب کے بعد سب مہمان کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ وہاں سے جب ہم تینوں ساتھ بر آمد ہو تو میں نے "آفتابین" پر اعتراض کے نتیجے میں موزوں ہونے والا شعر ہر دو آفتاب حضرات کو سنایا، دونوں اس سے محظوظ ہو۔ آفتاب قہقہہ انداز نے کہا" اسے لکھ دو" آفتاب تبسم ریز نے اصرار کیا کہ اس میں میری اصلاح کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے دو غالب شناس حضرات سے وعدہ کر لیا۔ اس طرح اس جملہ معترضہ سے میرا وعدہ پورا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے غالب کا ایک شع اس کا ترجمہ سنایا اور ایک غیر محتاط بات کہی جس سے ہنگامہ ہو گیا۔ لیکن میں ان دونوں کی غالب شناسی کے حوالے سے اب ک بات نہیں کروں گا۔ تصوّف کے موضوع کی سنجیدگی اس شعر کے مضمرات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ غالب کے شعر، اس کے تر ان دونوں حضرات کے تاثرات، اور ان پر مشفق خواجہ صاحب کے بصیرت افروز تبصرے کو کسی اور نشست کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں

چند دن بعد ایک دعوت میں آفتاب احمد خاں سے میں نے پوچھا کہ "دو آفتاب یکجا" والا شعر لکھنے کی جو انھوں نے فرمائش کی ہے اس سے غالب شناسی کا پردہ اُٹھ جائے گا اور سب جان جائیں گے کہ اس پردے میں کون بول رہا تھا۔ انھوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ تمھارے ہوتے ہوئے یہ قہقہہ لگانے والا ایک اور غالب شناس کہاں سے آ گیا۔ میں قہقہوں میں بات اُڑا دیتا ہوں، لیکن آخر کب تک۔ بہتر ہے کہ اب میرا نام لکھ دو، اس اجازت پر میں بہت خوش ہوا۔ لیکن دعوت ختم ہونے سے پہلے انھوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لی اور مجھ سے آ کے کہا۔ صرف ایک مضمون میں میرا نام ہو تو بہتر ہے کیونکہ کہ "دو آفتاب یکجا" والی ترکیب اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لیکن غالب شناس ہونے میں جو مزا ہے وہ آفتاب ہونے میں نہیں ہے، اور اس اجازت بالائے اجازت سے مجھے اور بھی خوشی ہوئی، اب جب چاہوں میں براہ راست ان کا حوالہ دے سکتا ہوں اور جب چاہوں انھیں پردے کے پیچھے بٹھا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ان کی خوشنودی کی خاطر انھیں یہ بتایا نیپا والے شعر میں میں نے کچھ ترمیم کر دی ہے۔ "عجب ایں کہ می خرامد بدو آفتاب یکجا" کو اس طرح بدل دیا ہے "عجب ایں کہ می نشیند بدو آفتاب یکجا" انھوں نے پوچھا اس میں کیا مصلحت ہے۔ میں نے کہا پہلے مصرعے میں آپ حضرات کا مرتبہ کم ہو جاتا تھا۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ آپ جیسے حضرات کسی فقیر کے پیچھے چل رہے ہیں تو یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اور ایسے بھی آپ دونوں کسی کو خاطر میں لانے والے نہیں ہیں۔ آپ بڑے سے بڑے فقیر کو قہقہوں میں اُڑا سکتے ہیں۔ اور ڈاکٹر آفتاب اس کا تجزیہ کر کے اس کا بخیہ ادھیڑ سکتے ہیں۔ اس پر آفتاب احمد خاں نے بہت زوردار قہقہہ لگایا دوسرے مصرعے میں یہ خوبی ہے کہ آپ دونوں کو برداشت کرنا فقیر کا امتحان بن جاتا ہے۔ وہ فقیر جو دونوں عالم میں نہیں سماتا اگر وہ آپ جیسے دو آفتابوں کو یکجا پا کر بھی اپنی جگہ بیٹھا رہے تو یہ اس کا اصل کمال۔ اس توجیہ سے آفتاب صاحب خوش ہوئے اور مجھے قہقہوں سے نواز کے رخصت ہو گئے۔

اب میں غالب اور تصوف کے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تصوف ایک دریائے ناپید اکنار ہے۔ اس کی تعبیر ہر دور کے احوال کے ساتھ بدلتی ہے۔ وہ ذات جو زمین اور آسمان کی پنہائیوں میں نہیں سما سکتی قلب مومن میں سما جاتی ہے۔ قلبِ مومن کی وسعت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس ذات کی طرح قلب مومن کی پنہائی بھی ہر تعین سے ورا ہے اور اسی طرح رشتے بھی شمار میں نہیں آ سکتے جو قلب کے اور اس ذات کے درمیان ہیں۔ اسی لیے تو صوفیا کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے راستے

قومی زبان (۱۹) فروری ۱۹۹۳ء

سانی کی طرح بے سہارہیں۔ اللہ کے چاہنے والے سب اپنی بساط اور اپنے مزاج کے مطابق اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک
رت موسیٰ علیہ السلام کا وہ سادہ گنوار تھا جو فرطِ عبودیت میں اپنے رب کے پاؤں دبانا چاہتا تھا اور جس پر ناراض ہونے کے باعث
سیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کو تنبیہ کی گئی تو دوسری طرف حضرت ابنِ عربی جیسے گنجینہ اسرار تھے جن کے رموز کی شرح آج تک نا
۔ سادگی اور حکمت کے ان قطبین کے درمیان ولایت کے بے شمار مظاہر ہیں۔ نہ تصوف کو پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے، نہ
کسی کسوٹی سے جانچا جا سکتا ہے، رندوں پر اکرام ہوتا ہے، عبادت گزاروں کو رد کر دیا جاتا ہے سبحہ خواں بے نیل و مرام رہ
۔ جذب و شوق میں اناپ شناپ بولنے والے سب کچھ پالیتے ہیں۔

الب اور تصوف کے موضوع پر غور کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے ایسے اشعار کو جو خدا، وجود، زندگی،
ر حکمت آفرینش کے مضامین پر ان کی فکر کی نمائندگی کرتے ہیں یکجا کر کے ان کے باہمی ربط کو سمجھا جائے اور ان میں
کے عنصر کی تلاش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے غالب کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام میں تصوف کی نفی کی ہے
ستدلال سے بحث کی جائے۔ میں یہاں اس دوسرے طریقے کو اختیار کرنا پسند کروں گا۔ اس لیے کہ اس وقت میرے سامنے
کری کے وہ خطوط ہیں جن میں انھوں نے تصوف کے حوالے سے غالب پہ خاصی سخت تنقید کی ہے وہ شمس الرحمٰن فاروقی
پنے ایک خط میں لکھتے ہیں "رامائن میں گرڑ پرندہ رام چندر جی سے کہتا ہے۔ کل یگ سب زمانوں سے اچھا ہے۔ اس
نتوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ صرف رام نام لینے سے معرفت حاصل ہو جائے گی۔" اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی
ندر جی اپنے نام کے اسرار سے اتنے ناواقف تھے کہ گرڑ نے اُن کو بتایا کہ صرف رام نام لینے سے معرفت حاصل ہو جائے گی ہو
لہ گرڑ نے خالق کائنات کا کوئی اور نام لیا ہو جس تک پہنچنے کے لیے ہر سالک بیقرار رہتا ہے خیر یہ تو ایک ضمنی سی بات
لے چل کر وہ یہ کہتے ہیں "اس قسم کی تعلیم سے بہت سے کاہل لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ عبادتیں بیکار ہیں، گپ، کافی ہے"
ینے کو حسن عسکری "گپ" قرار دیتے ہیں قرآن کریم کہتا ہے "اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ" جان لو کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں
ملتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی رو سے ذکر تمام عبادات اور اعمال سے افضل ہے۔ ایک حدیث ہے کہ جب
صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا ذکر جہاد سے بھی افضل ہے تو آپ نے فرمایا کہ ذکر اُس جہاد سے بھی افضل ہے جس میں لڑتے
ہد کی تلوار ٹوٹ جائے۔ گرڑ نے تو صرف یہ کہا تھا کہ رام نام جپنا ریاضتوں کا بدل ہو جائے گا حدیث کی رُو سے ذکر عبادتوں
ر اعمال صالحہ میں سب سے زیادہ مقبول عمل یعنی جہاد سے بھی افضل ہے۔

گپ" کے تسلسل میں وہ کہتے ہیں "چنانچہ سترھویں صدی سے انیسویں صدی تک بہت سے ہندو سنیاسیوں اور مسلمان
یں یہ فیشن جاری رہا کہ خوامخواہ "توحید بیان" کرتے پھرنے لگے" غالب نہ تو سنیاسی تھے نہ فقیر کہ خوامخواہ توحید بیان
رتے۔ سنیاسی اور فقیر اگر یہ کام کرتے تھے تو ان کو تو ایک پیشہ ورانہ ذمہ داری نبھانا تھی اس مجبوری سے یہ عمل کرتے
، غالب پہ ایسی افتاد پڑی تھی آگے لکھتے ہیں۔ "چنانچہ غالب کے زمانے میں توحید بیان کرنا، ایک بہت عام سی بات
الب نے زندگی میں کون سی عام بات اپنائی تھی۔ جو اس روش کو اپناتے۔ شاعری ' جسے ان کی زندگی مرکزی حیثیت
، انھوں نے اپنے لیے جو رنگ اختیار کیا وہ سب سے الگ تھا اور اسی سبب وہ مورد الزام ہوئے۔ خط لکھے تو اس انوکھے انداز
دو نثر کا مزاج ہی بدل دیا۔ انھیں اگر کسی چیز پہ ناز تھا تو وہ اپنی انفرادیت پر اردو دیوان کا آغاز حمد کے بجائے شکوہ و شکایت
[illegible]

لیے سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آتے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جو شخص عبادت میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا تھا وہ بیان کرنے میں جو بحیثیت سخنور اس کا اپنا میدان تھا کیوں کوئی عام شیوہ اختیار کرتا۔ اسے تو اہلِ خرد سے بھی پابستگی رسم و رہِ عام کی شکایت تھی:

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

اس توحید کے سلسلے میں خود غالب کے اپنے الفاظ دیکھیے "میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ "لاالٰہ اللہ" لاموجود الااللہ، لاموثر فی الوجود الااللہ" جو شخص تنہائی اور سکوت میں ان کلمات کا ورد کرے کہ کوئی معبود نہیں، کوئی موجود نہیں، کوئی فاعل نہیں سوائے اللہ کے اس کو روایتی بیانِ تصوف سے کیا نسبت اگر وہ کوئی بات کہے گا اپنے شعر میں تو وہ اس کے دل کی آواز ہوگی لاموجود الااللہ دل سے کہنے والا دنیا کی نیرنگی کو دیکھ کر عالم تحیر میں یہ فریاد کرے گا:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اب عسکری صاحب کے ایک اور خط سے اقتباس دیکھیے فاروقی صاحب کے اس سوال پر کہ فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کا غالب کے کلام پہ کیا اثر ہے کہتے ہیں "اگر مقصود صرف کلام غالب کو سمجھنا ہے تو اتنی دقیق، مشکل اور ضخیم کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے. یہ تو وہی مثل ہوگی کہ "کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا" اب ذرا اس سلسلے میں غالب کی عبارت دیکھیے۔ وہ ایک بزرگ حضرت غمگین کو اپنے احوال سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ہر قسم کے ذکر و فکر و ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن عربی کے ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے "الحق محسوس"، "الخلق معقول" یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں، میرا ایمان یہی ہے، باقی سب وہم ہے۔"

لیجیے غالب نے نقاد کی مشکل خود ہی حل کر دی جس چوہیا کی تلاش میں اسے پہاڑ کھودنا پڑتا وہ شاعر نے بغیر کسی زحمت کے پیش کر دی۔ لیکن یہ وہ چوہیا ہے جو پورے پہاڑ کا حاصل ہے اللہ کے وجود کا احساس ہی تصوف کی بنیاد ہے۔ اللہ کے قرب کا احساس، اللہ کے ہر شے پر محیط ہونے کا احساس۔ اللہ کے اپنے باطن کی گہرائیوں میں نہاں ہونے کا احساس، یہ احساس نہ ہو تو عرفان ناممکن ہے۔ اسی احساس کی درجہ بندی ہی سے ایک صوفی کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔

اسی خط میں وہ لکھتے ہیں "غالب کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ وہ وحدت الوجود ہی کو سارا تصوف سمجھتے ہیں۔ اور اس میں بھی سامنے کے مسائل لیتے ہیں اور مضمون بھی اکثر وہ ایسا چنتے ہیں جسے سن کر لوگوں کو ہنسی آئے "سبحان اللہ یہ کلام غالب کے بارے میں ایسی دریافت ہے جس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ غالب کے ہاں تصوف کے مسائل لطیفوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ کاش عسکری صاحب نے ایسے دو چار اشعار لکھ دیے ہوتے جنھیں پڑھ کر لوگ غالب کی کم فہمی پر ہنستے رہتے۔ یہ ادب کی بہت بڑی خدمت ہوتی۔

تصوف کیا ہے، اللہ کی محبت میں عارف دنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے، عقبیٰ سے بیگانہ ہو جاتا ہے، خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے،

یہ ہے کہ محبوب سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اپنی ذات میں جلوۂ الٰہی دیکھتا ہے، کبھی ہر ذرے میں اُسے دیکھتا ہے اپنی ذات میں اور حق میں وہ امتیاز نہیں کر سکتا، ہر ذرہ حق کا آئینہ بن جاتا ہے۔ یہی وحدت الوجود ہے۔

بررُوے شش جہت درِ آئینہ باز ہے

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

تصوف کے اس سامنے کے مسئلے پر کسی کو ہنسی آئی ہو تو وہ خدارا عسکری صاحب کے حق میں گواہی دے۔

وحدت الوجود کے علاوہ تصوف کی ایک بنیادی حقیقت رسول مقبول ﷺ کے مقام کا عرفان ہے جب عارف اپنے عروجی سفر میں شیخ سے رسول تک پہنچا ہے اور پھر رسول ﷺ کے فیضان سے اللہ تک پہنچایا جاتا ہے تو اُسے حقیقت محمدیہ کے اسرار سے آگاہی عطا ہوتی ہے، پھر وہ نور محمدی کی جلوہ گری کا مشاہدہ کائنات کی ہر شے میں کرتا ہے، موسم کے تغیر و تبدل میں، پھولوں کے کھلنے میں، کھیتوں کے لہلہانے میں، ہر چیز میں اُسے رحمت اللعالمین کا فیض جاری و ساری نظر آتا ہے۔

غالب نے اپنی مشہور نعت کے ایک شعر میں یہی بات بڑی خوبصورتی سے کہی ہے

دانی اگر بمعنی لولاک وا رسی

کز ہرچہ از حق است ازان محمد است

ترجمہ: اس کے سوا ہے معنی لولاک اور کیا۔ آیات حق ہیں جملہ نشانِ محمدی

تصوف کا یہ عظیم موضوع غالب کے دل و دماغ پر محیط تھا۔ اس پر اظہار خیال سے انہیں کبھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ مثنوی بیان معراج لکھی۔ ایک بہت اہم نعت لکھی۔ لیکن یہ محسوس کرتے رہے کہ نعتیہ شاعری کا حق ادا نہ ہو سکا۔ چنانچہ غزلوں میں جا بجا نعت کے شعر کہتے رہے۔ عشقِ رسول ﷺ میں بے اختیار شعر کہنے میں ان کا وہی انداز ہے جو حافظ کا تھا۔ کلام غالب میں حمد و نعت کی جلوہ گری پر ایک مضمون لکھتے ہوئے میں نے غالب کی کچھ غزلوں کے حوالے دیئے تھے جن میں وہ بے ارادہ حمد و نعت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک غزل میں جس کی ردیف غلط بود غلط ہے تغزل کے شعر کہتے کہتے وہ ایک شعر حمد کا کہتے ہیں اور ایک نعت کا:

آخر اے بو قلموں جلوہ کجائی کا نیجا

ہر چہ دادند نشان تو غلط بود غلط

اے طرح طرح کے جلووں میں اپنا اظہار کرنے والے تو کہاں ہے، ہم تیری ذات کی بابت بتائے گئے تمام نشانوں کو غلط پایا نعت میں کہتے ہیں۔

آں تو باشی کہ نظیر تو عدم بود عدم

سایۂ سرو روانِ تو غلط بود غلط

تو وہ یکتا ہے کہ تیری نظیر ہی ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ تیری قد موزوں کا کوئی سایہ تھا تو یہ بات غلط ہے، بالکل غلط۔

عسکری صاحب اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات میں محویت کو سامنے کے مسائل سمجھتے ہیں تو پھر ان سے کوئی شکوہ بیکار ہے۔ بابا ذہین شاہ صاحب نے حضور ﷺ کی ذات میں گم ہو کر ہی وحدت الوجود کا جلوہ دیکھا تھا۔ اور اس کی رنگارنگی نے ہی انھیں ابن عربی تک پہنچا کر فصوص الحکم کا شارح بنایا تھا۔ انھوں نے کیا خوب کہا ہے:

ہر ابتدا محمد، ہر انتہا محمد

حسن عسکری نے شاید ہنسی کا سبب غالب کی منقبت میں تشبیب کے بعد گریز کو قرار دیا ہو، وہ اس جملے کے بعد لکھتے ہیں۔
"غالب نے حضرت علیؑ کی منقبت میں جو قصیدہ لکھا ہے صرف اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ انھوں نے شیخ اکبر کی تعلیمات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گریز کے اشعار دیکھ لیجیے تشبیب لکھنے کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر جائیں۔ میدان ہی چھوڑ بھاگے یہی ایک مثال بتا سکتی ہے کہ غالب کے ہاں کتنا اور کیا تصوف ہوگا۔"

اس منقبت کی تشبیب صرف اردو اور فارسی ادب نہیں بلکہ عالمی ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے پہلا شعر ہی جس میں ایک حدیث قدسی کی جھلک ہے، تخلیق کے عمل میں انسان کی ثانوی حیثیت کا ماتم ہے۔ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمہ زیرو بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرقِ جنوں و تمکیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

غالب کی یہ تشبیب انسانی زندگی کے المیے پر ایک دردانگیز نوحہ ہے۔ اس کے بعد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ کہنے والا یاس میں ڈوب کے زندگی سے ہر امید قطع کر لے اور موت کا انتظار کرے۔ ایسے عالم میں کسی کی تعلیمات پر غور کرنا کام نہیں آتا۔ اس صورت حال میں کسی کی دستگیری ہی باعث نجات ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کے فیض سے ہی مایوسی کے گہرے بادل چھٹتے ہیں، اور امید کرم کی کرنیں ان کی زندگی کو روشن کرتی ہیں یہ عین ممکن ہے کہ زندگی کے تلخ تجربوں اور دنیا میں نامرادی کے مناظر کا غالب کی حساس فکر نے ایسا تجزیہ کیا ہو کہ وہ ناامیدی میں ڈوب گئے ہوں اور مایوسی کی ظلمات سے انھیں حضرت علیؑ کی توجہ نے نکالا ہو اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ اہلِ حق کبھی اپنے چاہنے والوں کو نامراد نہیں چھوڑتے۔

حضرت عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ انھوں نے تین ارواح جلیلہ کو تمام عالم میں متصرف پایا ہے اور ان میں سب سے پہلے حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ وہ وارث ولایت نبوی ہیں۔ ان کا فیضان تصوف کے تمام سلسلوں پر یکساں جاری ہے دوسری عظیم ہستیاں جو عالمی سطح پر متصرف ہیں وہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت بہاالدینؒ نقشبند کی ہیں۔ بابِ شہرِ علم ہونے کی حیثیت سے حضرت علیؑ عرفان کی دنیا میں تمام مجذوبوں اور سالکوں کے امام تو ہیں ہی، وہ دنیائے ادب میں اہل دل شاعروں کے بھی امام ہیں، یہ ان ہی کے عشق کی فیضان تھا جس نے حافظ، میر اور غالب کو اقلیم سخن کی فرمانروائی عطا کی۔ غالب کو حضرت علیؑ سے جو وابستگی تھی وہ کسی عقیدے کی بنا پر نہیں تھی وہ صرف محبت کی بنا پر تھی، ورنہ عقیدہ کی حد تک تو انھوں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جن میں شیعہ موقف سے ان کی بیزاری کا اظہار ہے۔

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں۔ کس نفس از جمل نہ زد، کس سخن از فدک نخواست بیکار بحث و جدل کو چھوڑ، اور تصوف کے میکدے میں چل، جہاں نہ کوئی جنگِ جمل کا ذکر کرے اور نہ باغ فدک کا۔

قومی زبان (۲۳) فروری ۱۹۹۳ء

اقبال کی بڑی نظموں کو ہم دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ سخت اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہیں یا کسی دردناک منظر یا حادثے سے غم و اندوہ میں ڈوب گئے ہیں اور پھر کوئی غیبی طاقت انہیں اس اضطراب اور اندوہ سے نکالتی ہے اہل حال کا یہ کہنا کہ رسالت مآب ﷺ کا فیض ان کی دستگیری کرتا تھا۔ انھیں رومی کی طرح کوئی شمس تبریز نہیں ملا ان کی زندگی میں شیخ کامل کی کمی کا مداوا عشق رسول ﷺ سے ہوا تھا جاننے والے کہتے ہیں ان کا رخ قومیت سے اسلام کی طرف حضور ﷺ کے فیضان سے مڑا تھا۔ جب وہ گہرے درد میں ڈوب جاتے تھے۔ تو مستقبل کا کوئی خوشنما منظر دکھا کے انھیں سہارا دیا جاتا۔ اور اس نظارے سے وہ اتنے شاد کام ہوتے کہ غالب کی زبان عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ بن کے نغمہ سنج ہوتے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آج بھی ہمارے ملک میں ایسے بزرگ ہیں جو ہزاروں میل کے فاصلے کے باوجود اپنے مریدوں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان سے آنے والے ان کے مرید بتاتے ہیں کہ کس وقت کس طرح ان کی رہنمائی کی گئی۔ حد یہ ہے کہ غلط خیالوں کی بھی اصلاح ہوتی رہتی ہے، جب پیر اپنے مریدوں کے حال پر ہر وقت نظر رکھتے ہیں تو حضرت علیؓ جو تمام پیروں کے امام ہیں کیوں نہ غالب جیسے شیدائی کی دادرسی کرتے۔ اگر اس پس منظر میں ہم غالب کی منقبت کو دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ گریز میں وہ خیال آرائی کیوں نہیں ہے جو تشبیب میں ہے، تشبیب میں ایک مریض اپنی تکلیفیں بہت درد اور کرب کے عالم میں بیان کر رہا ہے، اور گریز میں وہ ایک مسیحا نفس کے فیض سے شفایاب ہو کے اپنی احسان مندی کا اظہار کر رہا ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام اگر کسی نابینا کی فریاد سن کر اُسے بینائی عطا کر دیں تو وہ ایک ماہرِ امراضِ چشم کی طرح عملِ شفا کا تجزیہ نہیں کرے گا، وہ بینائی مل جانے پہ خوشیاں منائے گا۔ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں کہتے۔ یہ بیماری سے شفا اور نامرادی سے کامرانی کی طرف سفر ہے اگر حضرت علیؓ کسی کو اپنے دامنِ شفقت میں لے لیں تو پھر اُسے اور کیا چاہیے۔ اور وہ بھی اس کی تمام کمزوریوں کے ساتھ۔ مجھے گریز میں یہ شعر بہت اچھا لگتا ہے:

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی جس کا خریدار نہیں

یہاں ترکِ معاصی کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح فارسی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

بر لبِ یا علی سرابادہ روانہ کردہ ایم
مشربِ حق گریدہ ایم، عیش مغانہ کردہ ایم

یا علیؓ کہنے والی زبان کو ہم نے شغلِ شراب میں لگا دیا ہے، اس طرح ہمیں مشرب حق کے ساتھ عیشِ مغانہ بھی مل گیا

پرسوں مولانا اصلح الحسینی سے میں نے غالب کی منقبت کے بارے میں بات کی تو وہ کہنے لگے کہ حالتِ قبض کی کیفیات اتنی شدید ہوتی ہیں کہ سالک کا وجود آگ میں جھلسنے لگتا ہے۔ اس کیفیت سے ایک شیخ کامل کی توجہ ہی اُسے نکالتی ہے اور پھر اس کیفیت کی سختی کے سلسلے میں انھوں نے حضرت جنید بغدادیؒ کے دو شعر سنائے

یا مسعِرِی شَغَفاً یَا مُتلِفِی اَسَفاً

اے مجھے شفقت کے شعلوں میں جلانے والے اے مجھے حسرت میں تلف کرنے والے

لَواشئتَ آنزلتَ تعذیبی بمقداری
اگر تو چاہتا ہے تو میری برداشت کے مطابق مجھے عذاب دیتا
حاشاک مِن اَستغاثاتی و کیف وَقد
میں اپنی فریادوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور ایسا کیوں نہ کروں جب
اَولیتنی نِعَماً طاحت بِاَذکاری
تو نے مجھے ایسے نغمے دیے ہیں جن سے سب یادیں محو ہو گئیں۔

اولیا میں سید الطائفہ ہونے کی وجہ سے حضرت جنید بغدادی کو وہ استقامت حاصل تھی کہ وہ شفف کے شعلوں اور حسرت کی بربادی پر فریاد کر کے اللہ کی پناہ میں آجاتے ہیں اور اپنے نغموں پر شکر کرتے ہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، سالک کو اس وادی سے نکلنے کے لیے بڑے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

غالب کے کلام پر ایک اور اعتراض میرے ذہن میں کھٹک رہا ہے۔ بہت عرصہ ہوا فضلی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے غالب کے دو شعر پڑھ کے کہا تھا جس شخص نے یہ شعر کہے ہیں وہ تصوف کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

سرپائے خُم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
روسوئے قبلہ وقتِ منات چاہیے

یعنی بحسبِ گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

مولانا فضلِ حق خیر آبادی کی اس رائے کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے میں نے مولانا اصلح الحسینی، مشفق خواجہ صاحب اور اسلم فرخی صاحب سے بات کی۔ ان حضرات میں سے کسی کی نظر سے ایسی کوئی عبارت نہیں گزری تھی۔ لیکن یہ بات فضلی صاحب نے نہایت وثوق سے کہی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ رائے انھوں نے کسی خط یا کسی کے ملفوظات میں پڑھی ہو۔ اسلم فرخی صاحب کا خیال ہے کہ مولانا فضل حق صوفی سے زیادہ عالم تھے، اور عالم بھی نہایت متشدد قسم کے۔ وہ غالب کو آڑے ہاتھوں لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے یہ کہا ہو۔

میرا خیال ہے کہ ایک صوفی کی واردات کا اس سے زیادہ بلیغ ذکر نہ غالب کی کسی اور غزل میں ہے، نہ اردو کے کسی اور شاعر کے کلام میں۔ ایک سالک پر جو گزرتی ہے اس کی تمام روئیداد ان دو شعروں میں آگئی ہے، صوفیائے عظام کو چھوڑ کر اگر ہم صرف ادب کے حوالے سے ماضی کی طرف نظر کریں تو رومی اور خسرو کی زندگی کے تمام نشیب و فراز اور رنگا رنگی کی داستان ہمیں ان شعروں میں نظر آتی ہے۔

شمس تبریز کی ملاقات سے پہلے جلال الدین رومی ایک پیکر تھے زہد و اتقا کا، اور اس کے ساتھ ہی ایک مثالی نمونہ تھے علوم دین اور فلسفہ و حکمت کے عالم کا۔ شمس تبریز کی آمد نے ان کی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ درس و تدریس سے بیگانہ ہو گئے۔ عبادات سے لگاؤ جاتا رہا، شمس تبریز نے ہر رشتے کو کاٹ دیا۔ [illegible]

جنون نے سوز و ساز سے دیوانے روی کو دیوان شمس تبریز جیسی بے مثال کتاب دی اور جب محبت کی دیوانگی کم ہوئی تو شمس تبریز کے حکم پر مثنوی کی صورت میں قلب پر وارد ہونے والی حکمت کے خزانے لٹانے لگے۔ رومی کی زندگی کا ہر موڑ پیمانہ صفات کی گردش کا تابع تھا۔

میں بابا ذہین شاہ صاحب کی بدلتی ہوئی کیفیات میں نیرنگی صفات کا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ بعض وقت ان پر اس شدت کا سعر و خمار طاری ہوتا تھا کہ وہ ہر ایک سے بیگانہ ہو جاتے تھے اور جب وہ اس کیفیت سے واپس لوٹتے تھے تو پوری انجمن کی جان بن جاتے تھے۔ انھیں اپنے مقام کا پورا ادراک تھا۔ کس خوبی سے انھوں نے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے:

جس انجمن میں دلوں کے چراغ جلتے ہیں
اس انجمن میں چراغوں کی روشنی ہم ہیں

اس بے ہمہ دور باہمہ کے تغیر کے علاوہ بھی میں نے ان کی زندگی میں کیفیات کی تبدیلی کا منظر دیکھا ہے۔

یہ خیال آرہا ہے کہ ممکن ہے صرف پائے خم پہ سر رکھنے کو خلاف شریعت سمجھ کے مولانا فضل حق خیر آبادی نے غالب کے اس شعر کو ناپسند کیا ہو۔ وہ صوفی کے احوال کی تبدیلی کے عمل سے ناواقف تو نہیں ہو سکتے تھے۔ صوفی کی زندگی تو عبارت ہے تغیر احوال سے ہر آن اس پہ ایک نئی تجلی ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی تجلی سے روگردانی کر سکتا ہے، نہ کسی حال کے تقاضے کو ٹال سکتا ہے۔ غالب کے اس شعر پہ ہی اس مضمون کا اختتام ہونا چاہیے یعنی:

بحسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

the pioneers of
in Pakistan

سیّد مظفر حسین

غالب اور اقبال - ایک تقابلی تجزیہ

"بانگِ درا" کے دیباچہ سے شیخ عبدالقادر نے غالب اور اقبال میں بہت سی مشترک باتوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

تقریباً اسی سال کے فرق کے باوجود غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ دونوں کا قادر الکلام اور با عظمت ہونا، دونوں کی یکساں مقبولیت، دونوں کا اردو اور فارسی میں شعر کہنا، دونوں کی مرزا عبدالقادر بیدل کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش، دونوں کے کلام میں شوخی، ظرافت، حسنِ بیان اور روانی کی بہتات، اور دونوں کا جویائے اسرار ہونا۔ وغیرہ۔

غیر مشترک باتوں میں اقبال کا شاعر سے کہیں زیادہ مبلغ اور مصلح کا رول نمایاں ہے۔ غالب نے تو اپنی شاعری کو صرف "گنجینۂ معنی" کہنے پر اکتفا کی تھی:

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آئے

لیکن اقبال "محرم رازِ درون میخانہ" بن کر کائناتِ حیات کے فلسفیانہ رازوں کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ اور شاعری کو پیغمبری کا جز سمجھتے ہیں:

کہہ گئے ہیں شاعری جُزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

اقبال ہی نے دورِ جدید میں دقیق فلسفیانہ مضامین کو شعر میں ڈھالا یہاں تک کہ وہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ شاعروں کی صف میں پیغمبر اور پیغمبروں کی صف میں شاعر نظر آتے ہیں۔ جب کہ غالب کا فلسفیانہ تناظر محدود تھا جس میں تصوف کے حقائق و رموز کو موثر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اقبال میں نہ صرف رومی، نیٹشا، گوئٹے، ہیگل جلوہ گر ہیں بلکہ ان سب کی تنقید بھی ہے۔ بلا شبہ اقبال فلسفہ کو نہایت دل آویز انداز میں پیش کرتے ہیں بالخصوص فلسفہ خودی اور عشق کو بلکہ ایک طرح ان کی شاعری ہی

فلسفہ کا نچوڑ ہے۔

مرزا غالب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے کلام میں شیلے کی سی پرواز تخیل، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے کی عمیق النظری اور شلر کی بلند خیالی کے ساتھ مومن، درد اور سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اقبال کے کلام میں حافظ کا سوز، عمر خیام کی بے باکی، رومی کا فلسفۂ جہد و ارتقا، حالی کا جذبۂ قومی، شیکسپیر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پرواز فکر اور گوئٹے کی حکمت شعاری موجود ہے لیکن ان سب سے اہم بات یہ کہ وہ مستقبل کے شاعر تھے۔

من نوائے شاعرِ فرداستیم

دراصل غالب کا کمال یہ تھا کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ ادراک اور صوفیانہ نگاہ کے ساتھ ایک مصوّر کا نازک ہاتھ بھی تھا۔ ان کی صنعت پُرکاری و بے کاری صنعت ہے۔ وہ رندی ہونے کے ساتھ ایک صاف دل صوفی تھے اور ان کا قول تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اقبال ایک شاعر رنگین نوا ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کے مفکر اور مدبّر بھی تھے۔ غالب نے شاعری کو پیغمبری کے درجہ تک نہ تو لے جانے کی کوشش کی اور نہ اس کا دعویٰ کیا۔ ان کی شاعری میں علو خیال، فلسفہ حیات کے ساتھ تخیل کی بے باکی اور بے ساختگی ضرور ہے۔ وہ اپنے معاصرین مثلاً ذوق اور مومن سے اس اعتبار سے بہت بلند نظر آتے ہیں۔ مضامین حزن و یاس میں غالب کا مقابلہ جرمنی کے شاعر ہینے سے کیا جاسکتا ہے لیکن اقبال نے تو امید و آرزو کو فلسفہ و شاعری کی جان تصور کرتے ہوئے کہا:

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا ایک پیغام ہے
موت کی ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں ان کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

اقبال نے غالب کی طرح مصائب و آلام نہیں دیکھے جس میں تین ماہ کی قید بھی شامل تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں یہ کہا تھا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حقیقت یہ ہے کہ غالب میں اپنی مخصوص فلسفیانہ نہج کے علاوہ تین اور اہم خصوصیات تھیں۔ (۱) معاملہ بندی کی ندرت و لطائف (۲) چاشنی، ظرافت و طنز (۳) فکری سلاست بے تکلفی و سادگی۔ قابل غور یہ بات ہے کہ غالب کے بعد جو چار بڑے شاعر آئے یعنی داغ، اکبر، حالی اور اقبال ان چاروں میں یہ خوبیاں تقسیم ہوگئیں۔ چنانچہ داغ نے غزل سرائی میں معاملہ بندی کو اختیار کیا، اکبر الہ آبادی نے طنز و ظرافت کو اپنایا، حالی نے سادگی اور بے تکلفی کو معراج پر پہنچادیا اور اقبال نے دقیق فلسفے کو شاعری میں تبدیل کر دیا حتیٰ کہ وہ حکیم الامت اور شاعرِ مشرق کہلائے جانے لگے۔ گو اقبال نے داغ کی شاگردی کی اور ان کی وفات پر ایک پُر اثر نظم بھی لکھی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال نہ تو اربابِ نشاط کے شاعر تھے اور نہ رند مشرب تھے۔ ان کے تخیل کی نگینی میں کچھ استاد داغ کا دخل ہو لیکن اقبال نے غزل کو شاعری کا نصب العین نہیں بنایا تھا۔ تاہم اس صنف میں انھوں نے جو

کچھ کہا وہ مرزا غالب کی غزلوں کے پایہ کی ہیں۔ "بانگ درا" میں اقبال کی غزلوں کی تعداد ستائیس (۲۷) ہے۔ ہر چند کہ غالب کی نازک خیالی اور مخصوص ترکیبیں اقبال میں نہیں تاہم کچھ ناقدین نے اس صنف میں اقبال کو غالب کا جانشین ٹھرایا ہے نہ کہ داغ کا

غزل کو عاشقانہ راز و نیاز اور وارداتِ قلب کا اظہار کہا گیا ہے گو حافظ اور اقبال کے طفیل اس کا دامن وسیع ہو گیا ہے جامی کی غزلیات میں تو عارفانہ مطالب بھی غزل کے پیکر میں نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں تاہم اردو ادب میں غزل کے چہرے پر جیسا کہ آل احمد سرور کا کہنا ہے چند بد نما داغ بھی ہیں۔ غالب جیسے زندہ جاوید شاعر کے کلام میں جس میں انھوں نے زندگی کے ہر پہلو واقعات و واردات کی عکاسی کی ہے اور اخلاق، تصوف اور نظام کائنات کے حقائق کو موضوعِ سخن بنایا ان میں بھی گاہے گاہے فرط جذبات اور مستی کا اظہار ملتا ہے۔ بیشتر غزل سراؤں نے غزل کے ذریعے ایک خوش انداز فریب کو طرح دے کر حسن ویسی پیدا کی ہے۔ شاعری ایک باطنی تجربے کا روشن تخیل ہے۔ تجربے کا جوہر جتنا قیمتی ہوگا اسی قدر شاعری بھی قیمتی ہوتی ہے۔ جب کہ غالب کا انسان صرف ذہن رکھتا ہے اقبال نے اسے وحدتِ فکر اور ذوقِ یقین سے بھی نوازا ہے غالب کا محبوب ایک خیالی محبوب ہے جب کہ اقبال کا محبوب خود انسان ہے۔ غالب نے فرطِ محبت میں صرف یہ کہا ہے:

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

لیکن اقبال نے ایسی ایک سنجیدہ غزل میں کہا ہے:

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی لیلی بھی گئی

غالب کی تعلی تشبیہی تعلی تھی جس کی داد وہ خود "داغ دل" سرو چراغاں سے دے سکے:

دکھا دوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل ہے ایک تخم سرو چراغاں کا

یا

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

لیکن اقبال نے جو فلسفہ خودی سے سرشار تھے انسان کو خدا سے ہمکلام کروایا اور خدا کو انسانی رضا کا متمنی بھی بتایا ہے۔ اقبال کی غزل میں (یہاں اشارہ ان کی بال جبریل کی غزلوں کی طرف ہے) فکر انگیزی کے ساتھ وقار کا ایک پُرشکوہ لہجہ ہے۔ گو انھوں نے غزل کو اپنے دل کی دھڑکنوں کے اظہار سے کہیں زیادہ پیغام حیات کے اظہار میں صرف کیے اس لہجے میں کہیں تلخی و تندی، کہیں نرمی اور لجاجت، کہیں بلند نوائی، کہیں سوز و گداز اور کہیں عاجزی، نیازمندی ہے لیکن ہر جگہ ان غزلوں میں اقبال کی شخصیت ان کے خیال و جذبے کو ایک نئی شکل دیتی ہے۔ اور ہر مقام پر ایک شکل دوسری سے مختلف اور ایک لہجہ دوسرے سے جداگانہ ہے۔

اقبال نے یوں تو مضمون اور اسلوب کی جدت ترنم و تغزل کی روح میں ایک نئی انفرادیت پیدا کی لیکن ان کی چند غزلیں اتنی مقبول ہوئیں کہ عوام انھیں کوچہ و بازار میں گاتے رہے ہیں اور خواص نے ان کی پیروی میں غزلیں کہیں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یوں تو غالب کی مشکل پسندی کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عوام کے شاعر نہ تھے تاہم انھوں نے بہت سے اشعار نہایت سہل انداز میں کہے۔ ان کے بھی متعدد اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر رہے ہیں:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

ان اشعار میں جہاں جذبے کی رنگینی، خیال کی ندرت اور مشکل پسندی کے ساتھ شاعرانہ مبالغہ بھی ہے وہاں غالب کے تخیل کی بے ساختگی کمال پر ہے۔ دراصل شاعری کو حقیقت و مجاز، جذبہ، وجدان یا ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہوتی ہے۔ جمال الہیٰ ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ جہاں ملائکہ، کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہوتے ہیں شاعر یہی کام علی الاعلان کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے جہاں شاعری کے ذریعہ حسن و جمال عطا کیا ہے وہ اپنے وعظ نما اشعار سے مصلح یا مبلغ کا لہجہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ خلوص ان کے وعظ میں قوت کے ساتھ دل نشینی پیدا کر لیتا ہے۔ فکر اور تخیل کی ہم آہنگی ہی سے ایک حیات گیر فلسفہ تشکیل دیتے ہیں جو شاعرانہ حسن کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

غالب اور اقبال دونوں کے بیان میں بیدؔل کے بیّن اثرات ملتے ہیں غالب نے اس کا واضح اعتراف کیا ہے اور اردو میں انہی کا انداز اختیار کیا حالانکہ اردو اپنی سادگی میں بیدؔل کی خیال بندی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا مجبوراً انہیں فارسی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اقبال نے بھی کئی موقعوں پر بیدؔل کے دقیق اشعار کو پسند کیا۔ بیدؔل جن کا انتقال ۱۷۲۰ء میں یعنی غالب کی پیدائش سے ستر سال قبل اور اقبال کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ہوا مستغنی، بلند حوصلہ اور درویش منش تھے۔ تاہم وہ ایک باعمل صوفی ہونے کے باوجود جدوجہد، عزم و ہمت اور اثباتِ ذات کے قائل تھے۔ ان کا کلام حرکی عناصر سے لبریز ہے۔ غالب اور بیدل دونوں کے اجداد کا پیشہ سپہگری تھا۔ بیدل کو ذات الہیٰ سے بے پناہ محبت ہونے کے باجود یہ خیال تھا کہ جذبہ محبت ہی انسان کے ارتقائے ذات کا سبب ہے۔ مرزا بیدل نے ساری زندگی غنا اور توکل میں صرف کر دی۔ ایک مرتبہ انھوں نے شاہی ملازمت سے اس لیے استعفیٰ دے دیا تھا کیوں کہ وہ قصیدہ لکھنے کی فرمائش پوری نہ کر سکے تھے۔ بہت حد تک مرزا غالب میں بھی یہ جذبہ موجود تھا۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب اور بیدل کی ہم رنگی کی ایک مثال میں ان دونوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

گزشت مجنوں بہ وضع عریاں چو نالہ آزاد زیں بیاباں
تو ہم بہ ایں رنگ دامن افشاں کہ چین دامن کمر نہ گیرد

(مجنوں ایک نالہ آزاد کی طرح اس بیابان سے عریاں نکل گیا تو بھی لباس دنیوی سے اس طرح عاری ہو جا کہ کمر اور دامن میں کوئی ربط نہ رہے)

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بیدل قدما میں سعدی، حافظ اور رومی کے بڑے مداح تھے۔

اقبال نے تو رومی کو اپنا مرشد بتایا ہے اور حافظ کے شاعرانہ حسن کی تعریف کی ہے۔ اسرار و رموز میں اقبال پیر رومی کے بارے میں کہتے ہیں:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

"بانگِ درا" میں غالب کے عنوان کی نظم میں اقبال نے غالب کو "غنچۂ دلی" اور حافظ کو "غنچہ شیراز" کہا ہے۔ اقبال غالب کی شاعرانہ عظمت کو کئی طرح سراہتے ہیں:

تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشت فکر کے اگتے ہیں عالم سبزہ زار
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

اقبال کو اس امر کا افسوس ہے کہ اردو کی زلف کے لیے جو ابھی تک "منت پذیر شانہ" ہے غالب کی موت سے ایک نقصان عظیم ہوا ہے۔ اردو کے پھلنے پھولنے کے لیے غالب جیسے عدیم المثل شاعروں کی ضرورت باقی ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

وہ غالب کو مشہور شاعر گوئٹے کا ہمنوا و ہمسر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا ڈرامائی انداز بہت حد تک گوئٹے کا مرہون احسان ہے۔

شاعری دراصل محض حرف و آہنگ کا پیکر نہیں ہوتی۔ اس میں زندگی کی عکاسی اور تنقید بھی شامل ہے۔ وہ انسانی وجدان کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ بہ اعتبار فن شاعری ایک پُر اسرار اور پیچیدہ عمل ہے جو تخلیقی اور فنی اعتبار سے تخیل، زبان اور ماحول کی عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر بجنوری جو دیوان غالب کو الہامی تصور کرتے ہوئے ویدوں سے مشابہہ قرار دیتے ہیں

شاعری انکشافِ حیات ہے۔ وہ انسان کو خود آگاہی اور خود شناسی کا ادراک دیتی ہے۔

اگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہو تو اس میں کیا شبہ ہے کہ غالب ہی نے فن شاعری کو پستی سے نکال کر بلندی عطا کی اور بقول ڈاکٹر عبدالحق "اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔" بابائے اردو نے تو پروفیسر رشید صدیقی جیسے فن شناس اور ناقد کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جنھوں نے ایک مقالے میں غالب کی شاعری کو صرف "ہائے ہو اور ناؤ نوش کی ترجمان قرار دیا۔" وہ کہتے ہیں "تخیل کی بلندی اور بیان کا لطف جو مرزا غالب کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔" وہ مزید کہتے ہیں۔ "میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنھیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے کے کلام میں کیا مذہب اور اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے۔ مرزا غالب کا اثر اردو شاعری پر عجیب و غریب ہوا ہے اور رہے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال نے جو دنیا کو تصوّرِ فن دیا اور جس کی تعبیر خونِ جگر سے کی وہ انھی کی تخلیقی یکتائی کا حصّہ ہے۔ ان کی نظر میں خونِ جگر کا ہو جانا عملِ تسخیر کی تکمیل ہے۔ اور خونِ جگر بحیثیت علامت و اصطلاح تسخیرِ عشق کے بعد انسان کا تخلیقی جذبہ ہے۔ اگرچہ ایسے رموز و علائم کم از کم فن کی تعریف میں کسی اور اردو شاعر میں نہیں ملتے۔ تاہم اس معاملے میں غالب اقبال سے ایسے کچھ دور بھی نہیں۔ کیوں کہ غالب ہی نے کہا تھا:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

دراصل "جگر" کی اصطلاح غالب سے پہلے اتنی معنی خیز نہ تھی۔ اور انھی کے کلام میں "جگر" کا ایک خاص مقام ہے جو پہلے نہ تھا۔ جاوید نامہ میں اقبال نے خونِ جگر کی تشریح غالب ہی سے چاہی ہے اور غالب کا جواب ہے کہ سوزِ جگر سے جو نالہ تخلیق ہوتا ہے اس کی تاثیر کئی نوع کی ہو سکتی ہے۔ ہر ایک کو اس کے ظرف کے مطابق حصّہ ملتا ہے۔ کسی کو فنا کا مقام اور کسی کو بقا کا:

نالہ کہ خیزد از سوزِ جگر
ہر کجا تاثیر او دیدم دگر
قمری از تاثیر اُو وا سوختہ
بلبل ازوے رنگہا اندوختہ

اقبال نے شاعری کو ایک بلند پایہ اور درحقیقت انقلابی آہنگ عطا کیا۔ انھوں نے غزل میں بھی نظم کی سنجیدگی ترک نہ کی اور کہا:

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

گو اقبال کے براہِ راست مخاطب مسلمان تھے لیکن ان کا پیغام پوری انسانیت کے لیے ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کا مقام اتنا بلند

ہے کہ بقول غلام رسول مہر ہم اس کا آج تک صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ یقیناً قدرت صدیوں کے بعد ایسے انسان دنیا میں بھیجتی ہے جو ماضی اور حال کی ظلمتوں کو چیر کر مستقبل کو صاف اور روشن پیش کر سکیں۔ خود اقبال کے الفاظ ہیں:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال نے یوں تو "بلبل شیراز" کی مدح کی۔ ان کی شاعرانہ خوبی کو ساحری سے بھی تعبیر کیا اور ان کی عظمت کے متعرف رہے۔ جو بات دوسرے شعرا پوری غزل کہہ کر حاصل نہ کر سکتے تھے وہ حافظ محض ایک شعر سے حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن خود شاعری کے بلند نصب العین کی بنا پر اقبال نے حافظ کی شاعری کو دعوت مرگ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ اقبال نے لکھا:

"خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں۔ وہ ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراض زندگی کے منافی ہے بلکہ زندگی کے لیے مضر ہے۔ جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ حالت ان افراد و اقوام کے لیے جو زمان و مکاں کی اس دنیا میں رہے ہیں نہایت ہی خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے جسے وہ اپنے کمال فن سے شیریں بنا دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کو دکھ کا احساس نہ ہو:۔

ناوکِ اندازے کہ تاب از دل برد
ناوکِ او مرگ را شیریں کند

اقبال نے حافظ کی نجی زندگی کے متعلق نہیں بلکہ ان کے ادبی نصب العین کو بُرا بتایا ہے وہ حافظ کو صرف اس لیے منتخب کرتے ہیں کیوں کہ سکر آور ادب پیدا کرنے والے گروہ میں حافظ ہی سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ خود حافظ اور غالب میں چند چیزیں مشترک تھیں: دونوں کا غزل گوئی میں کمال حاصل کرنا، دونوں کا فارسی میں شاعری کا کثیر حصہ ہونا، دونوں کا مجاز اور حقیقت میں خوشگوار امتزاج، دونوں کا غم اور زیست کی بے ثباتی کے باوجود مستقل مزاجی اور خوش دلی سے زندگی کے چیلنج کو قبول کرنا۔ غالب نے اپنے ہی انداز میں کہا ہے:

جنون تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

گو غالب کو حافظ کی طرح لسان الغیب کا درجہ حاصل نہ ہوا تاہم وہ بادہ نوشی کے استثنا سے خود کو ولی سمجھتے تھے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حافظ ایران کے غزل سرا شعرا میں بزرگ ترین مرتبہ رکھتے ہیں اور خود اقبال نے ان کو ایک بہت اچھا شاعر مانتے ہوئے لکھا ہے:

از تخیل جنتے پیدا کند

وہ بلاشبہ سرور بادہ اور نشاط و طرب کی نغمہ سرائی میں یکتا تھے اور کم از کم مشرق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ مغرب میں بھی گوئٹے جیسے عظیم شاعر نے حافظ کی ہمنوائی میں تعریف و توصیف کے دفتر کھول دیے۔

غالب کا کلام جیسا کہ پروفیسر رشید صدیقی نے لکھا ہے "گنجینۂ معنی طلسم" ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں کوئی منظم فکر نہیں ملتی لیکن وہ فارسی اور اردو دونوں میں یکساں منفرد گو ان کا عوامی ادب سے کوئی تعلق نہیں وہ اردو کو ایرانی اور عجمی نسب دینے میں کامیاب ہوئے ان کا کلام موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کے اظہار میں ان کا مخصوص طرز بیان کارفرما ہے۔ گو ان کے ہاں جذبے کی شدت، حرارت نہیں تاہم ان کا بہترین کلام جذبے سے عاری بھی نہیں ہے۔ ان کی ذہنی پرورش بیدل، ناصر علی، نظیری، عرفی اور ظہوری کے دبستان سے ہوئی۔ فنی اعتبار سے وہ بلا کے چابکدست شاعر تھے اور انھوں نے خود اپنے لیے صحیح کہا:

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اقبال نے بھی غالب کی طرح اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہے۔ انھوں نے اسرار خودی کو شیخ بو علی قلندرؒ کی مثنوی کے انداز میں لکھا اور اس کے کچھ اشعار تو مولانا روم نے بہ عالم خواب لکھنے کی ہدایت کی۔ غالب سے بالکل ہٹ کر اقبال نے ایک نظام فکر اپنایا اور وہ اسلامی فکر کی پختگی اور استواری ہے۔ غالب شاید پہلے شاعر تھے جنھوں نے "غم روزگار" کی ترکیب استعمال کی وہ "موجہ گل"، "موجہ خیال" اور "گزرگاہِ خیال" کے بھی موجد تھے۔ شاعری کو مرزا غالب نے "نوائے سروش" بھی کہا۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اقبال کی طرح غالب ایک بڑے فنکار ہونے کے علاوہ ادبی نقاد بھی تھے جنھوں نے ہمیں فن شاعری کے اعلیٰ مقاصد سے روشناس کروایا۔ یوں ارسطو اور افلاطون بغیر شاعر ہوئے بھی تنقید کے بڑے ستون سمجھے جاتے ہیں لیکن کولرج، گوئٹے، آرنلڈ، ایلیٹ، غالب اور اقبال شاعر بھی تھے اور تنقید نگار بھی۔

سجاد مرزا

غالب کی ظرافت

غالب کی تخلیقات میں جو حسن کاری ہے وہ ہمیں دوسرے شعرا اور ادبا کے ہاں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ وہ فکری کائنات اور فن کے اندورنی ترکیبی عناصر سے قطع نظر صرف اپنے عنوانِ اظہار سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ ان کی نکتہ سرائی ہمیشہ ایک "ادائے خاص" کی حامل ہوتی ہے جو ان کی پوری شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور جو کسی دوسرے سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ فکر و بصیرت میں تو غالب ایک مجتہد کا درجہ رکھتے ہی ہیں لیکن ان کا "اندازِ بیان" بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے زبان اور اسلوب میں بھی ان کے اختراعات پر ان کی اپنی مہر ثبت ہوتی ہے۔

غالب کی نکتہ سرائی کی ایک خاص ادا ان کا طنز یا طنزیہ لہجہ بھی ہے۔ غالب کا طنز ان کی نفسیاتی دروں بینی پر دلالت کرتا ہے اور اس میں اکثر شوخی کی حد تک بڑھی ہوئی ہوشیاری اور پرکاری کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کا طنز عموماً عقلی ادراک و فکر کا پتہ دیتا ہے اور ہماری دماغی قوتوں کو چھیڑتا ہے۔

کسی تخلیق میں بلند درجہ کا ادبی اسلوب، شعوری کوشش سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ ہر لکھنے والے کی تحریر میں یہ ادبی اسلوب نظر آئے اور جب تک یہ خصوصیت حاصل نہ ہو، اس وقت تک کسی لکھنے والے کی تخلیقات، ادبی تخلیقات میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ اسلوب میں شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسلوب کو شناخت کیا جا سکتا ہے، وہ دل میں اتر جانے والی تاثیر کا حامل ہوتا ہے، وہ تاثیر حواس پر ایک گہرا اور باقی رہنے والا اثر اور نقش چھوڑتی ہے۔

غالب اردو ادب میں ایک نادر مظہر ہیں۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے لیے کسی ایک مضمون کی محدودیت میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں، سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے۔

غالب کی نثر ان کی شخصیت کی طرح بڑی ہی پہلو دار اور رنگا رنگ ہے۔ طنز و ظرافت، شوخی و مزاح ان کی فطرت اور شخصیت کا لازمی جزو ہیں۔ اسی لیے شوخی، طنز و مزاح جو ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے وہ ان کی نثر میں بھی اجاگر ہے۔ غالب کے خطوں میں دلکشی، شگفتگی، زندہ دلی اسی شوخی اور ظرافت سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب کی ظرافت خطوں کی محدود فضا کے مطابق ہے۔ غالب کے مخاطب کیوں کہ ذی علم لوگ تھے۔ اس لیے ان کی تحریر میں وقار اور علمیت کی پاسداری موجود ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر حال میں اور ہر موقع پر اپنی شائستگی، تہذیب اور فضیلت کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں

کچھ بزرگانہ رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔

مزاح نگار اپنی نگاہِ دور بیں سے زندگی کی ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھتا ہے، خود محظوظ ہوتا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ لیکن جس چیز یا شخص کو نشانہ بناتا ہے اس کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ کامیاب ظرافت وہی ہے جو ہنسانے کے ساتھ فکر کو بھی بیدار کرے..... غالب کے الفاظ میں مزاح نگار کے لب آشنائے خندہ مگر دل محیطِ گریہ ہوتا ہے۔

زبان و بیان کی بازی گری سے مزاح نگار شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں رعایت لفظی اور تکرار وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً غالب لکھتے ہیں:

"میاں! تمھارے دادا میاں تو امین الدولہ خان بہادر ہیں۔ میں تو تمھارا دلدادہ ہوں۔"

"صورتِ واقعہ سے پیدا ہونے والا بہترین مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہ ہو بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہو جائے۔"

طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کے فن کارانہ اظہار کو کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی کی ہنسی اڑانا ہوتا ہے لیکن مزاح بہرحال اس میں شامل ہوتا ہے۔ طنز کی اصل جولانگاہ سماج یا سوسائٹی کی برائیوں، کمزوریوں اور حماقتوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے مگر اس میں تہذیب، شائستگی اور ادبیت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیے۔

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔ "بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔"

طنز میں کبھی ایک فرد نشانۂ تمسخر بنتا ہے۔ کبھی تمام انسانوں اور سماج کی حماقتوں اور ناہمواریوں کو طشت از بام کیا جاتا ہے۔ ایسے میں طنز نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ لطیف فن کارانہ پیرایہ اظہار اختیار کرے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "طنز کرنے والا، مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔"

مزاح اور طنز میں فرق ہے۔ مزاح نگار اپنے قاری کو زندگی کی تپتی دھوپ سے بچا کر تھوڑی دیر کے لیے سایۂ دیوار میں لے آتا ہے۔ جب کہ طنز نگار بھٹکے ہوئے راہی پر زہریلے تیر چھوڑتا ہے۔ غالب کی نثر ظرافت نگاری کے فن پر پوری اترتی ہے۔ اعلیٰ ظرافت آنسوؤں اور قہقہوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجے کا مزاح ہمیشہ دردمندی سے پیدا ہوتا ہے۔

غالب نے بڑے بڑے مصائب جھیلے، بار بار زخم کھائے۔ جس تہذیب کی آغوش میں اس نے پرورش پائی تھی اسے خاک بسر ہوتے دیکھا۔ جن امیدوں کو خونِ جگر دے کر پالا تھا انھیں مایوسیوں کے بھیانک اندھیروں میں دم توڑتے پایا۔ ان کی شخصیت جو معنی آفرینی میں آسمان کی بلندیوں تک پرواز کرنے کی عادی تھی۔ اس سطح پر اتر آئی جہاں ہر وہ شخص اُترنے پر مجبور ہے۔ جو زخم کھا کھا کر زندہ رہتا ہے اور زندہ رہ کر زخم کھاتا ہے۔

اسی دردمندی سے غالب کی کشتِ طبیعت میں وہ زعفرانی پھول بھی کھلے جن کو غالب کی ظرافت کہا جاتا ہے۔ غالب سے پہلے ظرافت ذرا پست درجے کی تھی۔ اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سب سے پہلے ادبی ظرافت غالب کے یہاں نظر آتی ہے۔ غالب کی ظرافت میں جو اعلیٰ معیار نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں بے فکرا پن نہیں بلکہ ظاہری خوش طبعی اور زندہ دلی کی تہہ میں بھی ان کے تجربات اور جذباتِ درد کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی ظرافت کے سوتے ان کے درد و غم

سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں درد اور ظرافت کا یہی سنگم حقیقت میں کسی ادب پارے کو اعلیٰ ادب کا درجہ دیتا ہے۔ غالب کی ظرافت ان دونوں عناصر کا سنگم ہے۔ وہ سنجیدہ اور باوقار ظرافت کو غم کے مقابلے میں سپر بناتے ہیں یعنی ایک صورت میں تجزیۂ غم اور دوسری صورت میں مداوائے غم۔

ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں۔ "غالب کے خطوط میں جو شگفتگی پائی جاتی ہے اس کی تہہ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ظرافت ایک غمگین مگر باوقار اور باحوصلہ آدمی کی ظرافت ہے۔ ان کی ہنسی ایک بے فکرے آدمی کی ہنسی نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا دیا ہوا قہقہہ ہے جس نے کائنات کے نشیب و فراز پر غور کیا ہے۔"

غالب کی ظرافت دوستی اور مہر و محبت کے جذبے سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ مولانا حالی اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جایا کرتے تھے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔"

چنانچہ وہ دوستوں کی محفلوں کو یاد کرتے ہیں۔ ایک گرمیٔ ہنگامہ مطلوب ہے۔ اس تنہائی کی خلش کو دور کرنے کے لیے خطوط نویسی کا سہارا لیتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے سے جیتا ہوں۔

اس طلب و تمنا کے ساتھ غالب نے ظرافت اور خوش طبعی کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ان کی ظرافت نے صحیح عظمت حاصل کی ہے۔ اسی لیے رشید احمد صدیقی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں:

"اردو ادب میں طنز و ظرافت کی داغ بیل جس شخص نے ڈالی تھی وہ مرزا غالب تھے۔"

دراصل شوخی اور ظرافت غالب کی فطرت میں رچی بسی تھی۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ مثلاً

حکیم رضی الدین خاں جو غالب کے بڑے گہرے دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ غالب کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے غالب بھی وہیں تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے گلی سے گزرا گلی میں آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا "دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا" مرزا نے کہا "بے شک گدھا آم نہیں کھاتا۔"

لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ مولانا حالی کہتے ہیں۔ "ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے، حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔"

غالب کی یہی شوخیٔ تقریر، تحریر میں بھی نمایاں ہے۔ جس نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ غالب کی یہ ظرافت ان کے خطوں میں کئی انداز میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخوں میں خط لکھا۔ انھوں نے اس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں اس طرح لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے

ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو تم یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن
جواب لکھا ہے۔"

ایک اور جگہ شوخی ملاحظہ ہو۔ ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

نواب علاؤالدین خان کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی اور اس نظر سے کہ سیّد ہیں، درود اور موافق مضمون اس مصرع کے

سوئے اللہ واللہ مافی الوجود، سجود

ایک خط میں برسات کی شدت کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:۔

"دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بد تر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو مدِ نظر رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ ہو۔ مکتوب الیہ جس مرتبے کا ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے .... اپنے ایک دوست کو خط لکھا اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں غالب کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں:

"کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردا کرتی ہیں؟"

مرزا غالب کی یہ تحریریں دلچسپی اور لطفِ بیان کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ مولانا حالی "یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں۔

"مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں۔"

غالب کی یہ ظرافت کسی مسخرے کی ظرافت نہیں بلکہ ایک تجربہ کار، باوقار اور بلند پایہ ادیب کی ظرافت ہے۔ اس لیے یہ متانت کے پایہ سے کبھی نہیں گرتی۔ "ڈھول دھپہ قسم کی ظرافت ان کی نثر میں کہیں نہیں ملتی یہ ظرافت ان کے ہاں بڑا کام دیتی ہے۔ یہ انھیں قنوطیت کی جانب جانے سے روکتی ہے جس کی بدولت وہ درد و غم، رنج والم سب کچھ ہموار کر لیتے ہیں، یہی عطیۂ فطرت ہے رنج و غم کا بیان دیکھیئے، منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی صاحب: میں بھی تمھارا ہمدرد ہو گیا ہوں یعنی منگل کے دن یعنی اٹھارہ ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں

سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی، آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھوپھیاں، تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا، یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی ایک بار مر گئے!"

غالب طنز کا استعمال بھی کرتے ہیں مگر ان کے طنز میں نشتریت کم ہے اور طنز و مزاح کا نشانہ بھی وہ خود اپنی ذات کو بناتے ہیں: جیسے

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ہے۔ اب تو قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا کافر مرا، ہم ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام و عرش نشین، خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہِ قلم و سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "زاویہ ہاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

"آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت، نواب صاحب، نواب صاحب کیسے؟ اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو کہو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا؟"

غالب کی اس ظرافت میں بلا کا درد پنہاں ہے۔ انتہائی پریشانی کی حالت میں جہاں دوسرے رو پڑتے ہیں وہ صرف مسکرا دیتے ہیں۔ خوشی کے عالم میں بھی وہ بے اختیار نہیں ہو جاتے۔ ان کی ظرافت حقیقتاً یہاں توازن قائم رکھتی ہے۔

ایڈیسن کی طرح غالب صرف شوخ چھینٹوں کے قائل ہیں وہ ہلکی رنگ آمیزی سے اپنی تصویر بناتے ہیں۔ گہرے اور شوخ رنگ کے وہ قائل نہیں۔ تعزیت کے نازک موقعوں پر وہ ظرافت کو بڑی کامیابی سے نباہتے ہیں .... ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چناں جان کی تعزیت میں خط لکھتے ہیں:

"آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے میرے سامنے جو اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا، سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؒ سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ

مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں مری اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک...... کو میں نے بھی مار رکھا ہے، خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے باآں کہ یہ کوچہ چُھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں لیکن کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا..... جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔"

غالب کا عقیدہ تھا کہ کسی کی موت پر وہ روئے جسے خود نہ مرنا ہو اس طرح محبوب کے غم میں جان دینے کے بھی وہ قائل نہیں۔ وہ محبت میں مصری کی مکھی بننے کے قائل ہیں، شہد کی مکھی بننے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر قدرت دل بستگی کا ایک سامان چھین لیتی ہے تو وہ دوسرا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ کی وفات پر جو خط لکھا ہے، ان کے تسکین آمیز جملوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ ایک اور خط ملاحظہ کیجیے۔ اس میں بھی غالب ظرافت کے ذریعے بردباری کی تلقین کرتے ہیں۔

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی، ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل ہے۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّاں جان نہ سہی منّاں جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کی زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دُور وہی ایک حور، بھائی! ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

یہاں خط میں ظرافت غموں پر غالب آنا سکھاتی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی "رقعاتِ غالب" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ظرافت غالب کے حق میں رہبر کامل کا کام انجام دیتی ہے۔"

غالب کے خطوط میں ظرافت کا عنصر کئی صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ انھوں نے لفظی نقطہ آفرینی سے شوخی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یعنی ایک لفظ سے زیادہ معنی پیدا کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کی محرومیوں کا ذکر نہیں کرتے صرف اپنے مشاہدات کو

خط کے سانچے میں ڈھال کر مخاطب کو محظوظ کرنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط میں لفظی ہیر پھیر ان کی ذہانت کا کرشمہ ہے۔ خط دہی کا یہ طریقہ ان خطوں کو اور پُر لطف بنا دیتا ہے۔ خطوں میں نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ وہ نقالی سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں جیسے:

"وہ حسین علی خاں جس کا روز مرہ ہے، کھلونے منگوا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا۔"

ان کی تحریروں کے ڈرامائی عنصر میں بھی ظرافت کا پہلو ملتا ہے جو محض غرابت کی وجہ سے ہے۔ ڈرامائی عنصر دو صورتوں میں ہے مثلاً مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے درمیان مکالمات، سوال و جواب یا خود کلامی۔

غالب نے خطوں میں لفظی بازیگری سے جو لطف انگیزی کی ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً ایہام، ابہام، تناسب، استعارہ، تمثیل بالا ستعارہ، مبالغہ، صنعت تجنیس، صنعت عکس، ذو معنی الفاظ اور صنعتِ تضاد وغیرہ۔

غالب ایہام کے ذریعے مکتوب الیہ کو ماضی کی دھندلی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ باتوں کو مبہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جانے پہچانے لوگوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ان کو جانتے نہ ہوں۔ بعض جگہ صنعتِ ایہام تناسب ہے۔ بعض جگہ صنعت تجنیس سے بھی کام لیا ہے جیسے:

"میاں تمھارے دادا نواب امین الدّین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمھارا دلدادہ ہوں۔"

جب دوستوں کو خط نہیں ملتے تو لکھتے ہیں:

"ڈاکیے اب ڈاکو ہو گئے ہیں۔"

"غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔"

ذو معنی الفاظ کا استعمال دیکھیے:

"کون کہتا ہے کہ میں قید سے رہا ہوا ہوں پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔"

یہاں کالے سے مراد کالے خاں ہے جو غالب کے دوست تھے۔

منزل پیری کے سلسلے میں غالب کی شگفتہ بیانی دیکھیے:

"جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔ اس سے آگے یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔"

استعارہ در استعارہ بھی غالب کی نثر کا حصّہ ہے۔ ایک خط میں علائی کو لکھتے ہیں:

آٹھ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا (آگرے میں ننھیال میں) سات رجب ۱۲۲۴ھ میرے واسطے حکمِ دوام حبس ثابت ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت قرار دیا۔"

ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

"شوخی و ظرافت کے جو پہلو "خطوطِ غالب" میں ہیں وہ مکاتیبِ ابوالکلام میں نہیں"

"اردوئے معلیٰ کے حرفِ آغاز میں مرزا ادیب رقمطراز ہیں:

غالب اور کچھ بھی نہ ہوتے، صرف اپنے خطوط بطورِ یادگار چھوڑ جاتے، جب بھی انھیں بقائے دوام کے دربار میں جگہ مل جاتی۔"

بعض لوگوں نے غالب کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے خطوط کی بنیاد ظرافت اور بذلہ سنجی پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور غالب کی تحریر میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط ظرافت کی پاکیزہ اور ستھری چاشنی سے پر ہیں۔

"غالب کے خطوط کے ہر جملے سے جو دبی دبی شگفتگی پھوٹی پڑتی ہے وہ ان کی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے ہے۔"

غالب کی ظرافت ادب کا وہ لازوال سرمایہ ہے جس سے ہر زمانہ میں لطف اٹھایا جائے گا اور ان کی زبان کا چٹخارہ کبھی کم نہ ہوگا۔

اخذ و استفادہ:

۱۔ یادگارِ غالب۔ از حالی ۲۔ اطرافِ غالب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۳۔ غالب شخص اور شاعر۔ مجنوں گورکھپوری ۴۔ غالب فکر و فن۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ۵۔ رقعاتِ غالب عبدالسلام ندوی ۶۔ جہانِ غالب۔ کوثر چاند پوری ۷۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۸۔ خطوط غالب۔ غلام رسول مہر ۹۔ اردوئے معلیٰ۔ غالب

نثار احمد مرزا

غالب اور اقبال

کوئی بھی شاعر نہ تو اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دور سے پہلے کے شعرا سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہ بات دیگر شعرا کی طرح علامہ اقبال پر بھی صادق آتی ہے۔ علامہ اقبال جہاں دیگر شعرا سے کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ وہاں وہ غالب سے نہ صرف متاثر ہوئے ہیں بلکہ علامہ اقبال نے جن شعرا کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ان میں غالب کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

اقبال غالب سے متاثر بھی تھے اور اس کے مدّاح بھی۔ اور غالب اور اقبال میں مکمل طور پر نہ سہی مگر بہت حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اس مماثلت کی وجوہات کچھ بھی ہوں مگر اس کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر اس میدان میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ "بانگِ درا" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں۔

> "غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا۔ اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں۔ دوبارہ جنم لیا۔ اور محمد اقبال نام پایا۔"

گو کہ شیخ عبدالقادر نے غالب اور اقبال کے درمیان مماثلت کے لیے دونوں کے کلام ـــــ کے عملی نمونے پیش نہیں کیے۔ لیکن انھوں نے غالب اور اقبال کے کلام میں ایسی مماثلت محسوس ضرور کی ہوگی جس کی بنا پر انھوں نے اپنے مذکورہ بالا خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اگر کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کا صمیم قلب سے جوش و خروش کے ساتھ مدّاح ہو تو ازروئے نفسیات یہ لازم آتا ہے کہ مدّاح اور ممدوح میں کوئی گہری مشابہت ضرور ہے۔ ہر انسان اپنے ممدوح کی غیر شعوری طور پر تقلید کرتا ہے اور اندازِ نگاہ اور طرزِ کلام میں خود بخود کم و بیش مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی ایک پوری نظم غالب کے متعلق ملتی ہے۔ جو ستمبر ۱۹۰۱ء میں "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب "بانگِ درا" میں یہ نظم شامل ہے۔ اقبال نے ابتدائی دور میں جن شاعروں کے کلام سے بطورِ خاص استفادہ کیا۔ اُن میں غالب سرِ فہرست ہے۔ اور یہ نظم اس کی بارگاہ میں ایک ایسا

گراں بہا خراج ہے۔ جو کوئی دوسرا شاعر پیش نہ کر سکا۔

اقبال کے خیال میں غالب کی دو خوبیاں ہیں۔ ایک تخلیقی بلند خیالی جو حُسن کے کئی عالم تخلیق کرتی ہے۔ گونگے کو زبان دیتی ہے۔ مردے کو زندگی بخشتی ہے اور جامد میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ وہ حسن کی تلاش میں تھے جو دنیا کی ہر شے کے دل میں تلاش و جستجو کی صورت میں متمکن ہے اور اس کا اظہار انھوں نے ایسے الفاظ میں کیا جنھوں نے ہماری زندگی کو معنی دیے۔ جیسے چشمے سے پھوٹتے ہوئے پانی کا دھیما نغمہ پہاڑ کی یکسانیت اور جمود کو توڑ دیتا ہے۔ اور پورے ماحول کو زندہ کر دیتا ہے۔ دوسری خوبی ذہنی طور پر اُن کی بلندی تھی۔ جس نے اُن کے فنِ شعری کو پختہ کیا اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک اچھوتا رنگ پیدا کیا:

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

ایک بند میں اقبال نے غالب کو مشہور جرمن مفکر و شاعر گوئٹے کا ہمنوا قرار دیا ہے:

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ایک عرصے بعد اقبال نے "پیامِ مشرق" کے تمہیدی اشعار میں اپنا اور گوئٹے کا مقابلہ کیا ہے۔ جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ میں بھی تیری طرح کا مفکر اور صاحبِ بصیرت و وجدان شاعر ہوں۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ میں ایک مردہ قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ جو فقدانِ حیات کی وجہ سے میری قدر شناس نہیں اور تو نے ایک زندہ قوم میں جنم لیا۔ اگر غالب اور اقبال دونوں گوئٹے کے مماثل اور اُس کے ہمنوا ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں بھی باہم ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوں گے۔

غالب اور اقبال کی شاعری میں مماثلت کے ساتھ ساتھ دونوں عظیم مفکر شاعروں کی زندگیوں کے بعض واقعات میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جو کہ خالی از دلچسپی نہیں۔ روایت ہے کہ عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم سے جو مسلمان ہونے سے پہلے زرتشتی تھے۔ غالب کی ملاقات ہوئی اور دو سال غالب اُن کے ساتھ رہے۔ اور عین ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں غالب کو ایرانی فلسفے سے دلچسپی پیدا ہوئی ہو۔ اور وہ شہاب الدّین سہروردی مقتول کے خیالات سے متاثر ہوئے ہوں۔ جن کے تصورات زرتشتی ماخذ سے متمتع تھے۔

ایرانی عالم کے اثر ہی کا نتیجہ تھا کہ غالب فارسی محاورے سے شناسا ہوئے۔ اور بعد کو اس پر فخر کرتے تھے۔ شیعیت کی طرف اُن کا رجحان بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ خود کو ترک بتاتے تھے۔

اقبال کی زندگی بھی غالب کی زندگی کے مماثل ہے۔ ایک ایرانی عالم عبدالعلی ہروی لاہور آئے تھے۔ اور اقبال نے ان کی مذہبی تقریریں سنی تھیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں اقبال نے ان عالم کا ذکر کیا ہے۔ اور انھیں جیّد عالم مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "وہ ایک جیّد عالم ہیں۔ اگرچہ مذہباً ..... ہیں لیکن قرآن کا تفسیر تعجب ہے۔ کہ انتہائی عمدہ اور موثر کرتے ہیں۔ میں اکثر ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتا ہوں۔"

"پیامِ مشرق" میں علامہ اقبال نے "زندگی" کے موضوع پر ایک مباحثے میں دنیا کے چار عظیم شعرا کو جمع کیا ہے۔ دو شاعر مغرب میں سے براؤننگ اور بائرن اور دو مشرق سے غالب اور رومی۔ دنیا کے چار عظیم شاعروں کی اس نظریاتی بحث میں فنی طور

پر اقبال غالب سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ کیوں کہ یہ تمام مباحثہ انھوں نے غالب کے ہی رنگ میں لکھا ہے۔

شاعری کے بعض پہلوؤں میں غالب اور اقبال میں گو کہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن اقبال کے کلام میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جو غالب میں اگر کہیں ملتا ہے تو وہ تفکر اور تاثر کی ہلکی سی لہر ہوتی ہے۔ جو تلاطم خیز نہیں ہو سکتی۔ اقبال داغ کی تقلید سے تو بہت جلد گزر گیا لیکن غالب کا اثر زیادہ دیر پا تھا۔ افسوس کہ اقبال کا وہ کلام جس میں غالب کا اندازِ تخئیل تھا "بانگِ درا" میں شامل نہ کیا گیا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں انھوں نے جو نظمیں پڑھیں اُن میں جا بجا غالب کا اندازِ تخئیل اور اسلوبِ بیان پایا جاتا ہے۔ الفاظ، بندشیں، ترکیبیں، اضافتیں غالب سے بہت کچھ مماثل معلوم ہوتی ہیں:

نہیں منتِ کشِ تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

یا "نالۂ یتیم" کا یہ بند جو ۱۸۹۹ء میں انجمن کے جلسے میں پڑھی گئی:

آمد بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم
ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم
لذت رقص شعاع آفتاب صبح دم
یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم
رنگ کچھ شہرِ خموشاں پر جما سکتی نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

اس میں شک نہیں کہ غالب اور اقبال دونوں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی لاجواب شاعر تھے۔ غالب کی خواہش یہ تھی کہ نہ صرف اسے قادر الکلام شاعر تسلیم کیا جائے بلکہ جن خیالات کا اظہار وہ اپنی شاعری اور خصوصاً فارسی شاعری میں کر رہے ہیں۔ وہ تازہ بھی ہے اور جدید بھی۔ لہٰذا قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کی نوعیت الہامی کتب سے کم نہ سمجھی جائے:

غالب اگر ایں فن شعر دیں بودی
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودی

اپنی جس عظمت کا احساس غالب کو تھا۔ اسی عظمت کا اعتراف اقبال نے بھی برملا کیا ہے۔ فروری ۱۹۳۷ء میں یوم غالب کے موقع پر انجمن اردو پنجاب کے نام ایک پیغام میں اقبال نے کہا تھا "اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا۔ البتہ غالب کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج یوم غالب منا رہے ہیں۔ اُن کا پیغام یہ ہے "بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است" مرزا غالب آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کے وہ نوجوان جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے۔

غالب کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت آزادیٔ افکار ہے۔ جو رسم دنیا اور رواج زمانہ کے خلاف اُن کے شعوری احتجاج اور پرانی قدروں کی بجائے نئی قدروں کو قبول کرنے کے لیے ان کی ذہنی آمادگی سے واضح ہے۔ وہ اپنے یقین پر جمے رہنے اور اس کی وجہ سے مصیبت جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اسی خیال کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

غالب زندگی کے والا و شیدا تھے۔ وہ زندگی کو بامعنی اور بامقصد سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا میں بدی اور اس کے نتیجے میں بے اطمینانی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہر دور میں ہر جگہ نومیدی کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اسی زندگی سے حظ اٹھاتے ہیں اور تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کئی ایسے اشعار ہیں جن میں زندگی بسر کرنے کی بھرپور خواہش کا انھوں نے اظہار کیا ہے۔ مثلاً

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

زندگی گزارنے کا یہ جذبہ اکثر انسان کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ تو کیا یہ ضروری ہے کہ آدمی ثابت قدم رہے۔ تاکہ گمراہ نہ ہو۔ یہی بدی اور نیکی کی ازلی کشمکش ہے۔ جو آدمی کو اس پر تیار کرتی ہے۔ کہ وہ زندگی کو جیسی بھی ہے کلی طور پر قبول کرے۔ مگر آدمی کی جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اور مقصد کے حصول میں یہی جدوجہد اصل چیز ہے۔ اس کوشش اور جدوجہد میں گناہ کا سرزد ہونا اتنا بڑا جرم نہیں۔ جتنا کہ کوشش اور جدوجہد ہی نہ کرنا۔ غالب اس حقیقت کا شناسا ہے۔ وہ کہتا ہے:

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیاں می زنم

اقبال کے جاوید نامہ کے مندرجہ ذیل شعروں کا اس سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔

چوں بروید آدم از مشتِ گلے
با دلے، با آرزوئے در دلے

لذت عصیاں چشیدن کار اوست
غیر خود چیزے ندیدن کار اوست

زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست
تا خودی ناید بدست آید شکست

یورپ میں رہ کر علامہ اقبال نے یورپ کے سطحی جلووں کو بھی دیکھا۔ لیکن اس کے ساتھ علامہ اقبال نے یورپ کے باطن

پر بھی نگاہ ڈالی۔ لہٰذا اقبال کو یورپ میں عقل کی کرشمہ سازیوں کے ساتھ ساتھ اس تعمیرِ نو میں ایک خرابی کی صورت بھی نظر آئی۔ علامہ اقبال کو محسوس ہو گیا کہ یورپ کی ترقی اپنی جگہ پر مگر یورپ کی تہذیب کے گرویدہ ہونے کا انجام خطرناک اور عبرت انگیز ہے۔ اسی بات کا اظہار غالب بھی اپنے ایک قطعے میں کر چکا ہے:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ ناؤ و نوش ہے

پیام کے عنوان والی نظم میں دوسرے شعر میں اقبال کہتا ہے کہ عشق کی دولت ایک فضلِ الٰہیٰ ہے۔ جس کے حصول کا مدار محض کوشش پر نہیں ہے۔ یہ خدا کا کرم ہے اور اس فیض رسانی میں ادیان و ملل کی تفریق حائل نہیں:

شانِ کرم پہ ہے مدارِ عشقِ گرہ کشائی کا
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

اسی مفہوم سے ملتا جلتا شعر پہلے غالب بھی کہہ چکا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ کافر عشق کو ایک خداداد دولت ملتی ہے۔ جو محض سعی و کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی:

دولت بغلط نہ رسد از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

پیام کے عنوان والی نظم میں ہی اقبال کہتا ہے کہ تزکیۂ نفس اور ترقی روح کے لیے طبیعت میں سوز و گداز ہونا لازمی ہے:

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جانگداز دے

غالب پہلے ہی کہہ گیا ہے کہ روح پر سخن وری کے لیے بھی یہ لازمی شرط ہے:

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئے

شروع شروع میں اکثر صوفیہ کی طرح اقبال کی طبیعت پر بھی وحدت الوجود کا نظریہ طاری تھا۔ اس زمانے کی ایک نظم تقریباً پوری وحدت الوجود پر ہے:

چمک تیری نہاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تیری پستی
روانی بحر میں افتادگی تیری کنارے میں

جب کہ غالب شدت کے ساتھ نظریۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اُن کے اردو اور فارسی کلام سے جا بجا اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یورپ سے واپسی پر علامہ اقبال کی غالباً سب سے پہلی نظم "بلاد اسلامیہ" ہے۔ جو "مخزن" میں چھپی تھی۔ اس نظم کے بیشتر حصے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال زندگی کی بے ثباتی اور موت کی ہمہ گیری سے مغلوب ہو کر ایک انفعالی کیفیت میں ڈوب گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی اقبال غالب کا ہمنوا تھا۔ جو کہہ گیا تھا کہ انفعال سے زبونی ہمت پیدا ہوتی ہے اور زمانے سے عبرت حاصل کر کے زندگی کے متعلق قنوطی نظریہ پیدا کر لینا نفس کو کمزور کر دیتا ہے:

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

غالب اور اقبال دونوں کا فلسفہ رجائی ہے۔ اقبال نے ملت کی خستہ حالی پر ہمیشہ خون کے آنسو بہائے مگر اُن کے کلام میں کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملتا۔ کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی قوم کے روشن مستقبل سے ناامید ہوئے ہوں۔ بلکہ انھوں نے اپنی قوم کو ہمیشہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی اور اس کے نتیجے کے طور پر انھیں ایک روشن مستقبل کی بشارت دی۔ علامہ نے ملت کی خستہ حالی پر آنسو ضرور بہائے مگر اس کے روشن مستقبل کے لیے ہمیشہ پُرامید رہے۔ علامہ کا کلام ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جن میں اقبال اپنی قوم کے روشن مستقبل کے لیے پُرامید نظر آتے ہیں:

دیر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اِک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے۔ اس کے سینۂ خاموش میں

وادیٔ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے۔ یہ
خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے۔ یہ

علامہ اقبال کی طرح غالب کا زاویۂ نگاہ بھی رجائی ہے۔ فارسی میں غالب کا ایک نہایت حکیمانہ شعر اس کے رجائی نکتہ نظر کو واضح کرتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ حکیم مطلق کی رحمت کا اس سے اندازہ کرو کہ بیماریوں کے تمام علاج جماد و نبات میں ملتے ہیں۔ اور انھی کے عناصر سے دوائیں بنتی ہیں۔ لیکن مخلوقات کی تدریجی تکوین میں جماد و نبات پہلے نمودار ہوئے اور حیوانات جو امراض کا شکار ہو سکتے ہیں۔ بعد میں پیدا ہوئے رنج و مرض کے وجود سے پہلے فطرت نے علاج کے سامان مہیا کر رکھے تھے:

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازیں کیں در رسد آں راہیا ساختی

علامہ اقبال نے مرد مومن کا ایک نصب العینی تصور پیش کیا ہے۔ جو کہ قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔ جس میں انسان کامل نائب الٰہی اور مسخرِ کائنات ہے۔ اقبال چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی خودی کو مستحکم کر کے نیابتِ الٰہی کے درجے کو حاصل کریں لیکن اقبال یہ بھی کہتا ہے کہ ابھی انسانوں کو نصب العینی آدم کے لیے بے شمار مراحل طے کرنے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں بلکہ انتہائی محنت طلب اور مشکل ہے:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اسی زمین میں غالب کا بھی ایک شعر ہے۔ جس میں نصب العینی انسان بننے کی دشواری کو بیان کیا گیا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

علامہ اقبال کی ابتدائی غزلوں میں ایک شعر ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا عشق کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔ اور کیا آپ واقعی اس کی انتہا کے متمنی ہیں؟ اس کا جواب علامہ اقبال نے یہ دیا کہ آپ نے دوسرے مصرعے پر غور نہیں کیا کہ میں نے خود اس آرزو کو سادگی یعنی بے وقوفی کہا ہے۔ یہ جواب کچھ اس انداز کا ہے جو غالب کے اس شعر کے متعلق ایک صاحب نے دیا:

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا کہتے ہیں

معترض نے کہا کہ غالب فارسی دانی کے کمال کے باوجود ٹھوکر کھا گیا ہے۔ لفظ غلطیہا غلط ہے۔ صحیح لفظ غلطہا ہے۔ جواب دینے والے نے کہا عجیب بے وقوف ہو۔ غالب نے جان بوجھ کر غلط لکھا ہے۔ اسی لیے وہ خود کہہ رہا ہے کہ "غلطیہائے مضامین مت پوچھ" اس کے باوجود تم پوچھنے پر اصرار کرتے ہو۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اس شعر کے ساتھ مماثلت کے لیے غالب کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

ہر چند در مبدء فیاض بود آں من است
گل جدا ناشدہ از شاخ بداماں من است

اقبال خود بھی عشق میں اسی قسم کی وسعت چاہتا ہے۔ مگر غالب کا اندازِ بیان زیادہ لطیف ہے۔

"لالہ طور" کی پہلی رباعی میں اقبال نے تمام ہستی کو خلاق وجود کا عاشق بتایا ہے۔ اسی لیے ذرہ شہیدِ ناز ہے:

شہیدِ ناز او بزمِ وجود است
نیاز اندر نہادِ ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بسیمائے سحر داغ سجود است

اس کی تشریح میں غالب کے دو اشعار درج کیے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی کا شعر ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ہر ذرے کا رخ خدا کی طرف پھرا ہوا ہے۔ اگر کسی کی چشم بصیرت وا ہو تو اُسے خدا کی طرف جانے کے لیے کسی خضرراہ کی ضرورت نہیں صحرا کے ذرے ہی اس کی راہنمائی کر سکتے ہیں:

اے کہ ہیچ ذرہ راجز بہ تو روے نیست
در حاجت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

دوسرا شعر اردو کا ہے:

ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے
دیدۂ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

غالب کا ایک شعر ہے:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

علامہ اقبال کے ابتدائی فارسی کلام میں بھی یہ شعر ملتا ہے:

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز فردا ساختی

اقبال آخر تک عقلیت کی گرفت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے سوز و سازِ رومی کے ساتھ ساتھ پیچ و تاب رازی بھی موجود رہا۔ اسی کیفیت کے متعلق اس قطعے میں تضاد طبیعت کو بیان کیا ہے:

دماغم کافر زنار دار است
بتاں را بندۂ پروردگار است

دلم را بیں کہ نالد از غم عشق
ترا با دل و آئینم چہ کار است

اسی خیال سے ملتا جلتا خیال غالب کے ہاں بھی ملتا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اقبال کو عجمی یعنی فارسی شاعروں سے جو کچھ حاصل ہوا۔ اس کا اقرار اقبال نے کیا ہے۔ وہ اس کو اپنی طبیعت کا جزو سمجھتا ہے۔ مگر کلام کی اس ہم آہنگی کے باوجود نئے نظریات حیات اشعار میں ڈال دیتا ہے۔ جس سے فارسی شاعری زیادہ تر تہی:

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ نغمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اس کا مقابلہ غالب کی طبیعت سے کیجیے جو کہتا ہے۔ میری نہاد عجمی ہے اس لیے عربی میرے دل و دماغ میں سرایت نہیں کر سکتا:

رموزِ دین نہ شناسم، عجب مدار ز من
کہ دینِ من عربی و نہادِ من عجمی است

اقبال کہتا ہے کہ میرے نظریات، جذبات اور میرے کلام میں جو امتیازی خصوصیت ہے وہ میرے باطن میں سے ابھری ہے میں اس کے لیے خارجی ماحول کا محتاج اور رہینِ منت نہیں:

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو
یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طرب ناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

جب کہ غالب کہتا ہے:

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

لیکن اقبال خارجی بہار کے اشاروں پر نہیں بلکہ باطنی وجدان کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ میں دستِ صبا کا محتاج کیوں ہوں۔ میری فطرت خود نسیمِ سحری ہے:

فطرت میری مانند نسیم سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
کرتا ہوں سرخار کو سوزن کی طرح تیز

گلشنِ رازِ جدید میں اقبال کہتا ہے کہ جسم اور جان حقیقت مطلقہ کا خود اپنے چہرے پر ڈالا ہوا پردہ ہے۔ یہ پردہ ذوقِ حجاب نے نہیں بنایا۔ بلکہ ذوقِ اظہار و انکشاف نے بنایا ہے:

حقیقت روئے خود را پردہ باف است
کہ او را لذتے از انکشاف است

اس خیال کو غالب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے۔ پردہ ہے ساز کا

علامہ اقبال کے ابلیس کے متعلق خیالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو اقبال کی نظم "تسخیر فطرت" میں ابلیس سجدہ آدم سے انکار کی وجہ بڑے زور و شور سے بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو حرکت کا سرچشمہ بتاتا ہے۔

خدا کی مدح سرائی کرنے کے بعد وہ آدم کو بہکاتا ہے کہ تیری اس جنت میں کیا مزا ہے۔ ایک مسلسل سکون و نشاط و سرور کی ہم آہنگی نہ ضرورتِ عمل، نہ نشاطِ کار نہ مقصد کوشی۔ ایسی جنت میں تیرا ساز بے سوز ہے۔ انھی خیالات کا اظہار غالب نے بھی اپنے ان اشعار میں کیا ہے:

دراں پاک مے خانۂ بے خروش
چہ گنجائشِ شورشِ نا و نوش
سیہ مستیٔ ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں مسلمانوں کی تباہ حالی پر انھی کی زبان میں شکوہ کیا ہے:

اُمتیں اور بھی ہیں ان میں گناہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں جو تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اسی قسم کے خیالات کا اظہار غالب نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جاوید نامہ میں اقبال نے غالب کو طاہرہ اور منصور کے ساتھ فلک مشتری پر دکھایا ہے۔ اور ان کی شخصیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شورہا افگندہ در جانِ حرم
این نواہا روح را بخشد ثبات
گرمیٔ او از درونِ کائنات

غالب کی نوا کی یہی گرمی اُن کو اقبال کے سلسلے کا شاعر قرار دیتی ہے۔ غالب و اقبال کی نفسی مماثلتیں بھی کچھ کم قابلِ توجہ [illegible] کے ذہنی و فکر کے رخ بھی عام طور پر ایک ہی ہیں۔ اُن کے ادبی ارتقاء کے بعض واقعات، مثلاً اردو سے زیادہ فارسی سے

اعتنا اور اپنے افکار کے نئے نئے اسالیب و تراکیب کی اختراع وغیرہ بھی اُن کی ذہنی وحدت کا پتہ دیتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی و ادبی تربیت کے سرچشمے بھی ایک خاص حد تک مشترک ہیں۔ شعرائے عہد اکبری و جہانگیری کے کلام اور مغلیہ عہد کی روایات سے یہ دونوں شاعر یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کی کئی اور وجوہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمود سحر کو طلوعِ آفتاب سے ہوتی ہے۔

****

ڈاکٹر سلیم اختر

"عصری معنویت کا استعارہ"

...... سر سیّد احمد خاں ....

"صدیوں تک ہمارے ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا!"

حالی: حیاتِ جاوید

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر شخصیت محض فرد کی سطح سے بلند ہو کر ہیرو بن جاتی ہے یوں کہ صدیوں تک اس کی عظمت کے گُن گائے جاتے ہیں؟

سوال آسان مگر جواب مشکل۔ اس لیے کہ جواب کا درست تناظر مہیا کرنے کے لیے عصر اور اسی سے وابستہ شعور کی تشکیل کرنے والے سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اور اقتصادی عوامل کے ساتھ ساتھ معاشرہ سے مخصوص ممنوعات، قدغنوں اور ٹیبوز کا تجزیاتی مطالعہ بھی لازم ہو جاتا ہے اور پھر ان سب پر مستزاد ان تمام نفسی مدارج کو محدب شیشہ میں رکھ کر دیکھنا جن کی بدولت قطرہ گوہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ مطالعہ محض خارجی حالات کے گراف اور شخصی کوائف کا چارٹ مرتب کر دینے کے مترادف نہیں ہوتا کہ اس تصور کے لیے سائیکی کی بھول بھلیوں، شخصیت کے داخلی منطقہ اور باطنی خلا کا مطالعہ بھی لازم ہوتا ہے یعنی فرد / شخصیت / تخلیقی شخصیت کا اپنے عصر کے ساتھ وہ [illegible] رویہ جس کے باعث اس میں بیک وقت مرکز گریزی اور مرکز جوئی کے میلانات جنم لیتے ہیں اور اسی کی روشنی میں یہ امر بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ اکثریت کیوں مرغ باد نما بننے میں عافیت دیکھتی ہے اور چند سر پھرے کیوں اور کیسے زمانے کی ہوا کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ دراصل ہوا کا رخ موڑ کر شعور عصر میں تبدیلی لانے کی صلاحیت ہی میں شخصیت کی اہمیت مضمر ہوتی ہے یہ اہمیت وقتی اور عارضی بھی ہو سکتی ہے اور دائمی بھی! عارضی اہمیت بسا اوقات چڑھے سیلاب جیسی بھی ہو سکتی ہے۔ شخصیت کی پتنگ موافق ہواؤں کے دوش پر بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے تب اچانک ڈور کٹ جاتی ہے اور شاہانہ انداز سے اڑتی پتنگ محض رنگینی کاغذ کا بے جان پرزہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وقتی قبولیت واقعی وقتی مقبولیت ہی ثابت ہوتی ہے۔

آنگریس اگر موم کے پر لگا کر اُڑے گا تو بالآخر سورج کی تمازت اسے لے ڈوبے گی۔

برعکس صورت میں ایسی متنازعہ شخصیات بھی ملتی ہیں جن کی بغاوت عصر اور معاصرین کے لیے کڑوی گولی ثابت ہوتی

ہے۔ جو STATUS QUO کے سومناتھ کے آگے سر بسجود ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آنے والے زمانے کا خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنے خوابوں میں شریک کر لیتے ہیں اور یوں وہ آنے والے زمانے کے لیے بھی اہم قرار پاتے ہیں۔ ایسی شخصیات زناری ایام بننے کے برعکس وقت کی ایک جہت سے دوسری جہت میں زقند لگا کر حلقۂ شام و سحر سے ماورا ہو جاتی ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت اور اس کے اثمار مستقبل بلکہ مستقبل بعید کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ افکار پُر معنی ہوتے ہیں، سوچ راہنما ستارہ کا کام کر سکتی ہے تو تصوّرات باد بان بن جاتے ہیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر باغی محض بغاوت کی بنا پر ہی امر ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں! بغاوت کے ضمن میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ رہے کہ اس نے کن مسلّمات سے انحراف کیا، کن اقدار سے روگردانی کی اور کون کون سی روایات کے بُت توڑے۔ اس امر کا تعیّن اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ بیشتر بغاوتیں چائے کی پیالی کا طوفان ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو بیشتر باغیانہ نعرے محض تنے اعصاب سے چھٹکارے کا ایک انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ طے کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ بدلے معاشرتی حالات، تغیر، تہذیبی صورت حال اور برعکس اقداری تناظر میں شخصیت کے نظریات، تصوّرات اور افکار کی اہمیت برقرار رہتی ہے یا نہیں۔ محض نفی کا کلٹ بنا لینے سے بھی بات نہیں بنتی۔ کل کی صداقت آج کی صداقت اور پھر آج کی صداقت کل کی صداقت کی کسوٹی پر کھرا سونا ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اسی سے متذکرہ شخصیت کی ہر عصر کے لیے اہمیت، ضرورت اور افادیت طے پاتی ہے۔ غالب آج بھی ہم سے مکالمہ کرتا ہے، اقبال ممدوحِ عالم بن چکا ہے اور ہر تہذیبی کروٹ کے موقع پر سر سیّد احمد خاں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سر سیّد کی شخصیت اگرچہ متنوع جہات کی حامل تھی تاہم وہ غالب کے مانند شاعرانہ حسّیت پر استوار تخلیقی شخصیت کے حامل نہ تھے، ان کے پاس علامہ اقبال جیسا فلسفیانہ نظامِ فکر بھی نہ تھا بلکہ انفرادی حیثیت میں تو وہ شاید شبلی سے چھوٹے عالم تھے، محمد حسین آزاد کی مانند صاحب اسلوب نہ تھے نہ ہی حالی جیسی تنقیدی صلاحیت تھی اور یہ "لیکن" بہت بڑی ہے کہ ان خصوصیات کی نفی سے کچھ ایسا گیسٹالٹ بن جاتا ہے کہ وہ کئی امور کے لحاظ سے تو ان سب کے گرو ثابت ہوئے۔ دیکھا جائے تو اسی میں سر سیّد کی اہمیت مضمر ہے کہ وہ نہ صرف اپنے معاصرین کے لیے گرو ثابت ہوئے بلکہ مستقبل نے بھی ان سے یہ منصب نہ چھینا۔ واضح رہے کہ گرو/مرشد/معلم/اتالیق اپنے چیلے/مرید/شاگرد/طالب علم کی کردار سازی کرتے ہوئے شخصیت کے سونے کو کندن میں تبدیل کرتا ہے۔ گرو/مرشد/معلم کی جتنی بڑی شخصیت ہوگی اس کے چیلے/مرید/شاگرد کی شخصیت سازی بھی اسی نسبت سے پختہ، پختہ تر، پختہ ترین ہوگی اور پھر اسی تناسب سے اس کے ثمرات معاشرے اور زمانہ کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

۱۸۵۷ء کے بعد اہلِ ہند پر کیا بیتی اور کس طرح سے مسلمان احساسِ شکست کی پیدا کردہ خود ترسی کی دلدل میں پھنسے دروں بینی کا شکار تھے۔ اس صورت حال میں سر سیّد کے فعال کردار اور معلمانہ مساعی سے سب آگاہ ہیں لہٰذا ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ جسے میں نے فعال کردار اور معلمانہ مساعی کہا ہے دراصل یہی باعثِ نزاع تھی سر سیّد کے معاصرین کے لیے روایات و مسلّمات اور عقاید و تصوّرات کی لچھمن ریکھا الانگنا آسان نہ تھا۔ سر سیّد ہر معاملہ میں درست نہ تھے چنانچہ بدلے سیاسی حالات اور بالخصوص حصولِ آزادی کی تحریکوں میں شدت نے مغرب پرستی سے وابستہ تصوّرات اور انگریز سے مفاہمت کی تلقین کو غیر ضروری ثابت کر دیا لیکن ان جزوی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا کسی بھی مفکر یا مصلح کی ہر بات ہر وقت درست بھی تو ثابت نہیں ہو سکتی،

سرسید احمد خاں کی اصل اہمیت اس امر پر مبنی ہے کہ ماضی پرست ہونے کے برعکس وہ مستقبل کے داعی تھے۔ سرسید احمد خاں نے "مقاصدِ تہذیب الاخلاق" گنواتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا:

انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ آئندہ کی خبر اس کو نہیں ہو سکتی مگر گزشتہ زمانہ کے تجربہ سے آئندہ زمانہ کی امیدوں کو خیال کر سکتا ہے پس ہم کو اسی پرچہ کی بابت آئندہ زمانہ کی پیش گوئی کرنے کے لیے پچھلے حالات اور واقعات پر نظر کرنی چاہیے۔

(شمارہ: یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ) (۱)

ماضی پرستی اور قدامت پسندی مسلم سائیکی کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ چنانچہ ہر عہد کا مسلم معاشرہ روایات و مسلمات کی صورت میں ماضی کو سینے سے لگائے ملتا ہے اسی سے پدرم سلطان بود کا رویہ جنم لیتا ہے اور ملائیت کا ادارہ فروغ پاتا ہے۔ اس صورت حال پر علامہ اقبال نے بڑے بلیغ انداز میں تبصرہ کیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

۱۸۵۷ء کے بعد مسلم قوم سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور تعلیمی لحاظ سے تاریخ کے سب سے بڑے دوراہے پر گومگو کے عالم میں ٹھٹھکی کھڑی تھی وہ آئینِ نو سے ڈرے اور طرزِ کہن پہ اڑے تھے سرسید کا عظیم کارنامہ آئینِ نو کا نقیب بننے میں مضمر ہے۔ وہ خود مستقبل کے انسان تھے لہٰذا قوم کو مستقبل کے تقاضوں سے عہدہ براہی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جدید تعلیم اور سائنسی علوم کے فروغ کے لیے بھرپور مساعی، تہذیبی اور تمدنی صورتِ حال پر نکتہ چینی مذہب میں عقل اور عقاید میں استدلال پر زور اور "تہذیب الاخلاق" کا اجراء ..... (۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) انفرادی اہمیت سے قطع نظر ان سب کا اسی وسیع کل کے اجزا کے طور پر بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جو سرسیّد کی مستقبل بینی سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے محض جذباتی اسلوب اور ہیجانی نعروں سے کام لینے کے برعکس عقل، منطق اور سائنس کا سہارا لیا۔ انیسویں صدی کی تعلیمی سطح اور اسی سے جنم لینے والے ذہنی رویوں کے تناظر میں سرسیّد احمد خاں کی عقلیت، استدلالیت اور سائنس پسندی سرسبز نخلستان جیسی شاداب نظر آتی ہے۔ ذہنی پسماندگی کے عہد میں سرسید روشنی کا مینار نظر آتے ہیں اور یہ مینار تاریکی میں رینگنے والوں سے یوں خطاب کرتا ہے:

"ہندوستان میں ہمارے قوم کا حال اس زمانے سے بھی زیادہ بد تر ہے اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی، مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہلِ مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جن کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں، غلط اور بے اصول باتوں کی پیروی کرنا اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کیے ہوئے خیالات کو امورِ واقعی اور حقیقی سمجھ لینا اور پھر ان پر فرضی بحثیں بڑھاتے جانا اور دوسری بات کو گو وہ کیسی ہی سچ اور واقعی کیوں نہ ہو، نہ ماننا، لفظی بحثوں پر علم و فضیلت کا دار و مدار ان کا نتیجہ ہے۔" (۲)

سرسیّد کے زمانہ میں عمرانیات کے مباحث مقبول نہ تھے نہ ہی عمرانی تنقید کی اصطلاحات مروج تھیں مگر انہوں نے اپنے

تحلیلی ذہن کے تجزیاتی استدلال سے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لیا کہ ادب و انشا اور شعر و شاعری کو عصری شعور کا ترجمان ہونا چاہیے یوں انھوں نے ادب و نقد کو نئے تصورات دینے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے عصری تخلیقی میلانات پر کڑی تنقید کی:

"علم ادب و انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے..... فن شاعری جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی، مضمون تو بہ جز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کسی پیرایہ یا کنایہ و اشارہ یا تشبیہہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔" (۳)

اگرچہ سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کو "مسکین" (۴) پرچہ اور اپنے اندازِ نگارش کو "کج مج زبان" (۵) کہا تھا مگر اس مسکین پرچہ اور کج مج زبان کے ذریعہ سے سرسید نے عصری ادب کا منظر نامہ تبدیل کر دیا یوں کہ گلشنِ ادب کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوا بدل کر رکھ دی۔ وہ انگلستان کے ایڈیسن اور اسٹیل سے انشائیہ کا قلم لے کر آئے اور اسے "تہذیب الاخلاق" کی کشت میں سجا دیا، جن اصناف میں خود طبع آزمائی نہ کر سکے احباب کو ان کی طرف راغب کیا اور معاصر تخلیق کاروں اور بالخصوص شعراء کو قومی اور ملی مسائل کا احساس کرانے کی کوشش کی۔

سرسید احمد خاں نے سوشلسٹوں سے کہیں پہلے ادب برائے قوم/زندگی/افادہ کا تصور دیا۔ ادب میں مقصدیت کو ترقی پسند ادب کی تحریک سے مشروط کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ مباحث چھیڑے اور اصطلاحات استعمال کیں مگر جہاں تک اردو دنیا میں اس تصور کے اولین نقوش کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ سرسید تھے جنھوں نے سوشلزم سے ناواقف ہوتے ہوئے اور ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے باضابطہ آغاز (۱۹۳۶ء) سے کوئی پون صدی قبل ادب کو عصری تقاضوں کے تابع کرنے کی تلقین کی۔ ظاہر ہے کہ وہ ادب برائے زندگی، ادبی افادہ یا مقصدیت جیسی اصطلاحات استعمال نہ کر سکتے تھے کہ اس زمانہ میں یہ عنقا تھیں۔ لیکن ان سے وابستہ تصورات کا ادراک بذاتِ خود بہت اہم اور قابلِ توجہ ہے۔

سرسید نے کھڑے پانی جیسے معاشرہ میں افکارِ نو سے ہلچل مچا دی خود انھیں بھی اس کا احساس تھا کہ کھڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بدبو زیادہ پھیلے گی مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا۔" (۶) اور کیا پایا سرسید نے کافر دہریہ، ملحد، کرستان، نیچریا جیسے خطابات و القابات!

سرسید احمد خاں کے مدارج نشو و نما کا مطالعہ کرنے پر یہ دلچسپ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نہ تو وہ پیدائشی باغی تھے اور نہ ہی سائنس سے خصوصی رغبت تھی۔۔۔ نہ شعر و انشا کے بارے میں ان کے قومی تصورات واضح تھے اور تاریخ دانی کے باوجود بھی ملک و قوم پر اثر انداز والے تاریخی عوامل کا کوئی خاص ادراک نہ رکھتے تھے اسی لیے جب غالب نے سرسید کی مرتبہ "آئینِ اکبری"

۱۸ء) کی منظوم فارسی تقریظ میں اس کام کی اہمیت سے انکار کرتے ہوئے یہ لکھا:

مردہ پرور دن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

ریزوں کی سائنسی ایجادات کی اہمیت گنواتے ہوئے کلکتہ میں نئی زندگی تلاش کرنے کی تلقین کی تو یہ باتیں سرسیّد کو اتنی لگیں کہ تقریظ شاملِ کتاب نہ کی (تقریظ کلیات فارسی غالب میں شامل ہے)

سرسیّد نے سائنسی علوم کے فروغ کے لیے سائنٹی فک سوسائٹی (غازی پور ۱۸۶۳ء) قائم کی مگر ان کے اپنے سائنسی شعور پختگی کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۴۸ء تک وہ زمین کے ساکن ہونے کے قائل تھے اور اتنے قائل کہ ایک رسالہ "قولِ متین در دوارِ حرکتِ ں" (۷) کے نام سے قلم بند کر ڈالا اس ضمن میں سرسیّد کا استدلال اس نوع کا تھا:

"یونانی حکیم زمین کی گردش کے قائل نہیں ہوئے الاماشا اللہ! اور جو لوگ کہ گردشِ زمین کے قائل ہیں ان کے کان تک وہی اعتراض پہنچے ہیں جن کو خود یونانی حکیموں یا ان کے متبعوں نے رد کر دیا ہے۔" (۸)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرسیّد نے قدامت پسندی کی جس فضا میں جنم لیا وہ خاصی دیر تک اسی کا حصّہ رہے لیکن سرسیّد اور رین میں اسی امر سے فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مطالعہ، تحقیق و استدلال اور تنقید کے قائل تھے۔ اور اس ہی سے انھوں نے ایک کر کے بند دریچے وا کیے۔ خیالات میں تدریجی نشو و نما فطرتی ہوتی ہے اس لیے یہ پختہ بھی ثابت ہوتی ہے چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ "میا پیتھی علاج اور اس کے فوائد" جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے ملتے ہیں (۱۸۶۷ء) بالفاظ دیگر ان میں نئے خیالات موراتِ کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ جو مستقبل پسندی کی اساس فراہم کرتی ہے۔

تہذیبی کروٹوں، تمدنی تغیرات اور تغیر اقدار کے باوجود بھی سرسیّد جو زندہ رہے تو اسی باعث کہ انھوں نے طرزِ کہن پر ، کے بجائے عقل کی رہنمائی میں استدلال کی قوت کے ساتھ آئینِ نو کا پرچار کیا اور یوں ہر عہد کے لیے مرشد اور معلّم کا درجہ ں کر لیا۔ بظاہر سرسیّد حال کے مصلح نظر آتے ہیں مگر ان کے لیے حال محض لمحۂ موجود نہ ہونے کے برعکس تسبیحِ روز و شب کے ، دانے کے مترادف تھا اور حال کے لمحات مستقبل کے تارِ حریرِ دو رنگ میں پروئے منور موتی تھے۔

ی

مامینِ سرسیّد" مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی جلد دہم ص: ۱۳۹
مامینِ سرسیّد" جلد دہم ص: ۴۶
ناً ص: ۴۶-۴۷
ناً ص: ۱۰۴
ناً ص: ۴۰
ناً ص: ۵۱
یاب رسالہ "مقالاتِ سرسیّد" مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی جلد شانزدہم ص: ۴۸۷-۵۰۰ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
ناً ص: ۴۸۸

قومی زبان (٦١) فروری ١٩٩٣ء

ڈاکٹر محمد ظفیر الحسن

بابائے اردو۔ ١٩٤٢ء میں

پچھلے بیس بائیس سال میں جہاں دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں ہندوستان میں بھی ایک انقلاب آگیا۔ س انقلاب سے اردو ادب خاصا متاثر ہوا۔ خودداری، جدت پسندی، آزادی کی محبت، عوام کی بہتری، قومی چیزوں کا احیاء اور اُن کی ندردانی۔ انھوں نے "عروق مردۂ مشرق" میں خون زندگی دوڑا دیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اب محض ایک کتابیں شائع کرنے والی نجمن نہیں رہی بلکہ مقتضائے زمانہ سے اُس نے اردو کے تحفظ و اشاعت کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے جو نہایت ضروری تھا۔ (١)

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے جو کام کیا اس کا نام کبھی تحریک تھا۔ لیکن ب یہ تحریک تاریخ بن چکی ہے۔ اور اس لیے ان کی روداد حیات پیش کرنے کا عمل...... ایک تاریخی عمل ہے۔ (٢) جناب مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے فروغ کے لیے کبھی چین سے نہ بیٹھے ہمیشہ "پابہ سفر" رہے۔

ایک خط بنام منشی محمد علی تحریر فرماتے ہیں

> "میں ابھی لاہور اور جموں کے سفر سے واپس آیا ہوں .... تم کیا کہتے ہو۔ میں آج کل زمین کا گز بنا ہوا ہوں۔ پٹنہ، الہ آباد گیا وہاں سے آیا تو لاہور اور جموں جانا پڑا۔ ٢٥، ٢٦ دسمبر کو کانپور میں آل انڈیا اردو کانفرنس ہے وہاں جانا ہوگا۔ چین سے بیٹھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی پھر کام کا ہجوم"

١٩٤٢ء کے شروع ہوتے ہی بابائے اردو کو انجمن کے کاموں کے سلسلے میں متعدد مقامات کے دورے کرنے پڑے ۔ب ستور دوروں کے مصارف خود برداشت کیا کرتے تھے۔

٤ جنوری سے ٦ جنوری ١٩٤٢ء تک الہ آباد میں ہندوستانی کمیٹی کے اجلاس ہوئے ان میں شرکت کی اور مباحث میں حصہ یا۔ ٧ جنوری کی صبح کو "میاں صاحب" سید جواد علی شاہ صاحب متولی ریاست امام باڑہ گور کھپور کی دعوت پر الہ آباد سے گورکھپور شریف لے گئے۔ اسی دن ٩ بجے امام باڑے میں شہر کے مختلف لوگوں نے قبلہ مولوی صاحب سے ملاقات کی اور ١٢ بجے جناب سید

۳ بجے "میاں صاحب اسلامیہ کالج" کے طلبہ اور اساتذہ کے شدید اصرار پر مولانا نے کالج تشریف لے جا کر طلبہ کے سامنے ایک مفید اور اہم تقریر فرمائی۔ ۴ بجے جناب سیّد سجّاد علی صاحب سبز پوش رئیس اعظم گورکھپور نے قبلہ مولوی صاحب کو چائے پر مدعو کیا۔

۷ بجے مولوی صاحب ممدوح میاں صاحب کی نئی کوٹھی محی الدّین پور متصل ریلوے اسٹیشن تشریف لے گئے جہاں میاں صاحب نے انجمن کی عمارت فنڈ میں مبلغ پانچ سو روپے کا گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا۔ گونڈہ سے حضرت جگر مرادآبادی مولوی صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے۔

انجمن ترقی اردو (حیدرآباد) کے زیر اہتمام ساگر ٹاکیز میں ۱۷ جنوری کو گشتی کتب خانہ کے افتتاح کے موقع پر اردو کے ندردانوں کا ایک کثیر اجتماع موجود تھا۔ مولوی علی شبّر حاتمی صاحب بانی کتب خانہ نے تحریکِ صدارت کی اور اس کے بعد قائد ملت نواب بہادر یاد جنگ بہادر نے یہ کہتے ہوئے کرسیٔ صدارت کو زینت بخشی کہ:

> "حضرات! بابائے اردو، مولوی عبدالحق صاحب کی موجودگی میں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کوئی اور شخص اس کی صدارت کرے لیکن خود ان کے حکم اور اپنے نوجوان دوستوں کے مشورے کو مسترد نہیں کر سکتا۔" (۳)

قائد ملت (نواب بہادر یار جنگ) نے تقریباً پچیس سال کی عمر میں قومی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ انھوں نے سلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور پست اقوام میں اسلام کی تبلیغ پر اپنی کوششیں مرتکز کر دیں۔ معاشرتی اصلاح کے ساتھ ہی اسلامی علیمات کی تجدید کو بھی انھوں نے قومی نصب العین بنایا۔ قائد ملت کی اس قسم کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہونے لگا تھا..... سلم لیگ کے اجلاس پٹنہ (۱۹۳۸ء کے دوران قائد ملت حضرت قائد اعظم سے قریب ہوگئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کی نظر میں وہ قدر منزلت حاصل کر لی تھی جو کسی اور کو نصیب نہ تھی۔ (۴ الف) جلسہ کی ابتدا میں ماہر القادری صاحب نے نظم پڑھی۔ اس فریب میں اردو کے لیے خاص طور پر ایک مختصر ڈراما تیار کیا گیا تھا جس میں انگریزی اردو، سنسکرتی اردو، عربی اردو اور آسان اردو کے نمونے پیش کیے گئے تھے۔ "اردو زباں ہماری" کا ترانہ بھی پڑھا گیا۔ (۵)

اس کے بعد قائد ملت نے حاضرین کو مخاطب ہو کر اردو زبان کی خوبیاں بیان کیں اور فرمایا کہ اس زبان کا منشا ہی یہ تھا کہ ہم ب دوسرے کو باآسانی سمجھ سکیں۔ آپ نے اردو کی ترویج اور ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی ساعیٔ جمیلہ کا شکریہ اردو داں حضرات کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکیں گے۔ اور ہم پر اس احسان کا بار ہمیشہ رہے گا۔ (۴ب)

انجمن ترقی اردو (ہند) کا صدر دفتر اورنگ آباد (دکن) میں رہا اور یہاں کے لوگوں کو انجمن سے گہری وابستگی ہے۔ بابائے دو نے ۲۶ تا ۲۹ جنوری وہاں جا کر انجمن ترقی اردو (ہند) کی مقامی شاخ اور اس کے شبینہ مدارس کا معائنہ کیا۔

۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد میں "سلسلۂ حامیان اردو" کے متعلق ایک مشاورتی جلسہ ہوا اور اس کے قواعد و ضوابط مرتب یے۔ مولوی صاحب موصوف نے ایک خط مورخہ یکم فروری ۱۹۴۲ء بنام منشی محمد علی تحریر کیا:

"کل حامیان اردو کے قواعد مرتب کرنے کے لیے ہمارا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں چند قواعد بنائے گئے جس کی ایک نقل تمھیں بھیج دی جائے گی۔"

"حامیان اردو" کے نام سے جدید سلسلہ جو شروع کیا گیا اس کا چندہ صرف ایک روپیہ سالانہ رکھا گیا تاکہ کم استطاعت اصحاب بھی آسانی کے ساتھ اردو کی خدمت میں حصہ لے سکیں۔ یہ سلسلہ جنوری ۱۹۴۲ء سے شروع کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس نظما کو توقع تھی کہ ۱۹۴۲ء کے اختتام تک کم از کم پچاس ہزار حامیان اردو ضرور اپنی قومی زبان کی حفاظت، توسیع اور اشاعت کے لیے مقررہ چندہ ادا کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ (۶)

۲ فروری ۱۹۴۲ء کو بابائے اردو بھوپال پہنچے عمارت فنڈ کے لیے رقوم اور عطیات کی فراہمی کے متعلق با اثر اور اہل الرائے صحاب سے مشورہ کیا۔

۶ فروری کو دہلی سے مولانا غلام رسول مہر کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"میں ابھی کونسل آف اسٹیٹ سے واپس آیا تو آپ کا عنایت نامہ ملا۔ وہاں آج مسٹر پی۔ این سپرو نے ایک رزولیوشن پیش کیا تھا کہ اردو کی جس قدر کتابیں طبع ہوں ان کی ایک ایک کاپی انجمن ترقی اردو کو اور ہندی کا ایک نسخہ گرچانی سبھا کو دیا جائے۔" (۷) چنانچہ کونسل آف اسٹیٹ کے اجلاس میں آنریبل مسٹر سپرو کی یہ تجویز آنریبل مسٹر محمد حسین اور آنریبل مسٹر حسین امام کی تائید سے منظور ہو گئی کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے کہ "ملک میں چھپنے والی تمام ہندی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے کتب خانے میں اور اردو مطبوعات کا ایک ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کے لیے فراہم کیا جائے۔ (۸)"

COUNCIL OF STATE DEBATES
FRIDAY, 6TH MARCH ۱۹۴۲
VOL. I. NO. 4 (PH ۲۵۰-۲۵۳)
OFFICIAL REPORT
OF INDIA PRESS NEW DELHI

RESOLUTION *RE* SUPPLY OF HINDI AND URDU BOOKS TO THE HINDI SAHITYA SAMMELAN AND THE ANJUMAN TARAQQI-I-URDU

THE HONOURABLE MR. P. N. SAPRU (United Provinces Southern: Non-Muhammadan): Sir, I desire to move the following Resolution :—

"That this Council recommends to the Governor General in Council to take steps to so modify the law as to ensure that a copy of every work printed in the country in Hindi is supplied to the Library of the Hindi Sahitya Sammelan and of every printed work in Urdu to the Anjuman

araqqi-i-Urdu, in the same manner in which the works printed in Great Britain are presented the Library of the British Museum, the Bodleian and the Cambridge University Library.

THE HONOURABLE MR. HOSSAIN IMAM (Bihar and Orissa: Muhammadan): Mr. President, I have great pleasure in supporting the Resolution which has been moved by the Honourable Mr. Sapru. I do not think it is necessary for me to inflict a long speech on the House. But I do welcome this Resolution as it shows essential unity between the two languages of India. It is a welcome coincidence that the Presidents of both the organisations, one for Urdu and the other for Hindi, are Hindus and from the same city of Allahabad. The Anjuman Taraqqi-i-Urdu is under the distinguished Presidentship of the Right Honourable Sir Tej Bahadur Sapru and the Hindi Sahitya Sammelan under that of Dr. Amarnath Jha. Sir, the demand in this Resolution is one which would not cost the Government anything. They have only to make the necessary amendment in their Act in order to make it possible for these national organisations to receive the publications. The law as it stands at present is administered by the Provinces and it has no all-India effect. The copies that are published have to be delivered under the orders of the Local Government and they apply only to the locality of that particular Government. For instance, if the Delhi Administration were to pass an order that a copy of all publications in Urdu should be made over free of charge, it will have effect only in the Delhi area and it will not apply to other areas. It is, therefore, necessary that a comprehensive amendment should be made so that the Government of India may, by its action, make it compulsory for all the printers and publishers to make over a copy of the publication. In this connection I should like to remind the House that the Anjuman Taraqqi-i-Urdu, starting from a humble beginning 39 years ago, has now become a very extensive organisation. It has 232 branches, 64 night schools and it has published 170 books. It publishes three papers; one is a quarterly known as *Urdu* of 150 pages; the other is a monthly publication called "Science" of ... pages; and the third *Hamari Zaban*, "My Language", a fortnightly publication. There are 18 members of this organisation which contains such distinguished people, in addition to the Right Honourable Sir Tej Bahadur Sapru, as Dewan Bahadur Raja Narendra Nath, the President of the Hindu Mahasabha, Punjab, Raja Sir Daya Kishen Kaul, Colonel Sir Kailashnath Haksar in addition to others like His Excellency Nawab Colonel Hafiz Ahmad Sayed, Khan Sahib of Chhittari, the Prime Minister of Hyderabad. Sir, an organisation so distinguished and so honoured ought to get the moral support of the Government in whatever way they can possibly give it. I do hope the Government will see its way to accept this Resolution and give their help to this organisation if they require it and, when there is enough, to give money.

*THE HONOURABLE HAJI SYED MUHAMMAD HUSAIN (United Provinces West: Muhammadan): Sir, the object of this Resolution is so good from the point of view of the languages and culture of India that it does not require a good deal of support. I am sure that every Member of this House would support this Resolution.

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۴ فروری سے ۱۸ فروری تک لاہور میں قیام کیا۔ پنجاب کے لیے درسی اور نصابی کتابیں تیار کرانے کے سلسلے میں بعض واقف کار حضرات سے گفت و شنید کی۔ سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب سے

بھی ملے مرحوم کو انجمن سے ہمیشہ ہمدردی رہی جنھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ انجمن کے عمارت فنڈ کے لیے مؤثر اپیل شائع فرمائیں گے۔ لاہور، اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ آپ نے ایک دن اردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملاقات کی اور ان سے "حامیان اردو" کے سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ چنانچہ ان ایڈیٹروں نے ہر طرح اپنی امداد و حمایت کا یقین دلایا۔

لکھنؤ: صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ اردو کی ترقی و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے وہاں اردو کی حالت کسی لحاظ سے تسلی بخش اور قابل اطمینان نہیں۔ جب سے انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے منتقل ہو کر دہلی آیا [illegible] بابائے اردو کے زیر غور رہی۔ چنانچہ کتابوں کی طباعت و اشاعت کو فروغ دینے کے سلسلے میں یکم مئی ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ میں صوبے کے اردو ناشرین اہل مطابع اور بعض دوسرے حضرات کا ایک مخصوص جلسہ سنٹرل ہوٹل امین الدولہ پارک لکھنؤ میں منعقد کیا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے جلسے کی صدارت کی۔ اس پر حاضرین نے چند مفید اور قابل عمل تجویزیں مرتب کیں۔ (۹)

مئی ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو (دیناج پور) بنگال کی ابتدا ہوئی۔ اور مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے الحاق کیا گیا۔ ایک مدرسہ شبینہ بھی ہے۔ (۱۰)

۱۰ مئی ۱۹۴۲ء کو بچھراؤں ضلع مراد آباد تشریف لے گئے۔ وہاں انجمن کی ایک سرگرم شاخ ہے اس کے تحت بالغوں کے لیے ایک شبینہ مدرسہ بھی ہے۔ آپ نے مدرسے کا بھی معائنہ کیا۔ (۱۱)

۱۰ جون ۱۹۴۲ء کو اردو کالج دہلی (زیر سرپرستی انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس منتظمہ کا سالانہ جلسہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سابقہ جلسے کی کارروائی پڑھ کر سنائی گئی۔ گزشتہ برسوں میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی ذات خاص سے کالج کے مصارف میں جو مالی امداد فرماتے رہے اس کا شکریہ ادا کیا گیا۔ آپ نے کالج کی ترقی سے خوش ہو کر ۴۳-۱۹۴۲ء کے لیے بیس روپے ماہانہ کا اضافہ فرما کر مزید شکریے کا موقع عنایت فرمایا۔ (۱۲)

۱۸ جولائی کو حیدر آباد پہنچ کر پنجاب کے لیے سائنس کی نصابی کتابیں تیار کرانے کا انتظام کیا۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں انجمن کی دوامی امداد کے متعلق درخواست بھی کی۔

۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء کو سائنس کی ریڈروں کی ترتیب کے متعلق ایک مشاورتی جلسہ ہوا بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کئی برس سے ایک مبسوط لغت مرتب کر رہے تھے اسی لغت کی طباعت کے سلسلے میں ۲۴ اگست ۱۹۴۲ء کو نواب مہدی یار جنگ بہادر کے بنگلے پر ایک کمیٹی میں شرکت کی۔ بعد ازاں ۳ ستمبر اور ۱۱ ستمبر ۴۲ء کو حیدر آباد میں اصطلاحاتِ علمیہ کی کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کی۔ ۲۱ ستمبر ۴۲ء کو پونا جا کر بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ اور مرہٹی اتہاس انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ کیا۔ بعض قلمی کتابیں بھی دیکھیں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو حیدر آباد سے اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ عمارت فنڈ کے لیے ۱۰۷ وصول ہوئے۔ نظام گنج اورنگ آباد کے تاجروں نے ۲۲ اکتوبر کو اس مد میں ۵۰۱ صناعہ روپے پیش کیے۔ ۲۴ اکتوبر کو انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کے جلسے میں شریک ہوئے حامیانِ اردو کی تجویز پر بحث ہوئی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو حیدر آباد واپسی ہوئی۔ اور اسی روز انجمن کی دوامی امداد کی درخواست بابِ حکومت میں پیش ہوئی اور بالاتفاق منظور ہوئی۔ (۱۳)

نومبر ۱۹۴۲ء میں رانچی ضلع کے اندرونی علاقوں میں ایک مدرسہ موضع کوسی میں قائم کیا گیا۔ بہ مقام رانچی [illegible]

سے بھی زیادہ دور ہے۔ مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے۔ یہ مدرسہ مسلمانوں کے حلقے میں ہے۔ لیکن اس میں اب غیر مسلم طلبہ بھی آ رہے ہیں۔ (۱۴)

حیدر آباد دکن بسلسلۂ یوم اقامت خانہ الف جامعۂ عثمانیہ ایک غیر طرحی مشاعرہ ۷ و ۸ نومبر کی رات زیر صدارت بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سابق صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ منعقد ہوا۔ ممتاز شعرا شریک تھے۔ (۱۵)

۲۴ نومبر ۴۲ء کو جالنہ (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں باشندگان کی طرف سے ایک مقامی سینما گھر میں جلسے کا انتظام کیا گیا اس جلسے میں بابائے اردو نے اردو کی اہمیت اور افادیت پر ایک تقریر کی۔ اہلِ جالنہ نے انجمن کے عمارت فنڈ کے لیے عمارو پے پیش کیے۔

۱۴ دسمبر کو جالنہ سے واپسی ہوئی۔ اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے انجمن کو دوامی امداد چالیس ہزار روپے سکۂ عثمانیہ (سالانہ) کی منظوری مرحمت فرمائی۔ اور فرمانِ مبارک صادر فرمایا۔ بابائے اردو نے فرمانِ مبارک کی نقل حاصل کی۔

۱۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو نواب ناظر یار جنگ کے دولت کدے پر انجمن کا ایک جلسہ ہوا اس میں شریک ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنا عمر بھر کا اندوختہ انجمن کی نذر کر دیا مولوی ہاشمی فرید آبادی کے بقول:

> "یہ ۵۴ ہزار سکہ عثمانیہ (۴۷۰ ہزار روپیہ انگریزی) سے کچھ زیادہ رقم تھی اور اس اعتبار سے کہ ایک متوسط الحال فرد کی تیس برس کی سخت محنت کی کمائی تھی لاکھوں کی قیمت اور ایثار و فیاضی کی نادر مثال کا مرتبہ رکھتی ہے۔" (۱۶)

ایک خط مورخہ ۷ اپریل ۴۲ء میں تحریر فرماتے ہیں:

> "آدمی نہیں رہتا لیکن اس کا کام رہ جاتا ہے۔ میں نہیں رہوں گا لیکن انجمن ضرور رہے گی۔ اس لیے مجھ سے زیادہ آپ کو انجمن سے محبت کرنی چاہیے۔ (۱۷)

علامہ اقبال کا یہ شعر مصداق ہے ان کے نظریے کا:

"جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں"

حواشی

۱۔ ماہنامہ ہمایوں۔ لاہور ۱۹۴۲ء ص ۷۔ ۸

۲۔ ذکر عبدالحق مرتبہِ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ لاہور ۱۹۷۵ء ص ۹

۴ (الف۔ ب) ہفت روزہ قندیل۔ لاہور یکم جولائی ۱۹۵۶ء ص ۱، ۲۳
۵۔ ہماری زبان یکم فروری ص ۱۳ سالانہ رپورٹ ۱۹۴۲ء ص ۴۴۔ ۴۵
۶۔ سالانہ رپورٹ ۴۲ء ص ۴۵۔ ہماری زبان یکم مارچ ۴۲ء ص ۱۶ قومی زبان اگست ۱۹۷۰ء صفحات ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ مکتوب نمبر ۹
۷۔ مکاتیب عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی صفحات ۳۱۔ ۲۳۲
۸۔ ہماری زبان۔ ۱۶ مارچ ۴۲ء ص ۲
۹ و ۱۱۔ سالانہ رپورٹ ۴۲ء ص ۴۶
۱۰۔ ہماری زبان پہلی جولائی ۴۲ء ص ۸
۱۲۔ ہماری زبان پہلی جولائی ۴۲ء ص ۷
۱۳۔ سالانہ رپورٹ ۴۲ء ص ۴۷
۱۴۔ ایضاً ص ۳۶
۱۵۔ ہماری زبان یکم دسمبر ۴۲ء ص ۹
۱۶۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۱۳۔ ۱۱۴
۱۷۔ قومی زبان اگست ۱۹۷۱ء ص ۴۷۔ ۴۸

جدید ایرانی ادب سے!

ناصر ہاشم زادہ/معین نظامی

سمندر کی تلاش

میں راستہ نہیں جانتا تھا۔ ایک صاحب سے پوچھا تو انھوں نے کندھے اُچکاتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔ ایک اور شخص سے پوچھا۔ اُس نے ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ میں چل دیا۔ اگلے چوک کے پاس میں نے ایک اور آدمی سے پوچھا۔ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، پھیری لگانے والوں، بھنگیوں اور سپاہیوں سے پوچھتا پچھاتا، آخر کار میں وہاں پہنچ گیا دستک دی۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ میں کچھ دیر منتظر رہا، لیکن کسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے ہمسایوں اور بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھا۔ سب نے کہا: "معلوم نہیں!"

صرف ایک نوجوان نے کہا: "منتظر رہیں!"

میں منتظر رہا۔ کئی بار دروازے کھٹکھٹایا۔ کسی نے بھی نہ پوچھا: "کون؟" کہ میں جواب میں کہتا: "میں ہوں!"

وہ کہتا: "کیا کام ہے؟"

اور میں..... سچ مجھے کیا کہنا چاہیے؟ یہ تو میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ مجھے تیار رہنا چاہیے! میں نے دستک دی۔ بہت زور سے۔ بہت ہی زور سے۔ اب کی بار میں نے آوازیں بھی دیں۔ خوب چلّایا۔ ہمسائے کھڑکیوں سے جھانکنے لگے۔ کچھ لوگ سراسیمہ ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے اور میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے اس سے کام ہے!"

"کام کیا ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"بس اسی سے کام تھا!"

"میں پوچھ رہا ہوں کیا کام ہے؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

میں نے اسے اشتہار دکھایا۔

"اچھا تو آپ کو کمرہ چاہیے!"

ایک صاحب کہنے لگے: "میرے ہاں ایک بہت اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے۔"
پھر اور بھی کئی لوگوں نے یہی پیشکش کی۔ سب کے گھروں میں خالی کمرے تھے۔
ایک صاحب ذرا آگے آئے: "ہم سب نے اشتہار دے رکھے تھے، لیکن آپ صرف یہی دروازہ کیوں کھٹکھٹائے جاتے ہیں؟"
وہ میرے کالر کے بٹن سے کھیلے جا رہے تھے۔
"مجھے صرف ایسا کمرہ چاہیے، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہو!"
سب کو سانپ سونگھ گیا۔ انھوں نے حیران پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر کچھ ہنسنے لگے اور کچھ نے آرام سے گھروں میں داخل ہو کر دروازے بند کر لیے۔ کھڑکیوں سے سر غائب ہو گئے اور وہ بند ہو گئیں۔ صرف میں رہ گیا اور کچھ وہ لوگ جو ہنسے جاتے تھے۔ اُن کی ہنسی لحہ بہ لحہ تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ میں نے لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی پہلا قدم نہیں اٹھایا تھا کہ ایک شخص بولا: "سمندر! وہ بھی سیمنٹ اور لوہے کے اس شہر میں؟"
میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی ترحم آمیز کیفیت تھی۔ اُس کا لب و لہجہ بہت ہمدردانہ ہو گیا:
"سمندر تو سیمنٹڈ دیوار پر صرف ایک خوبصورت پینٹنگ ہے۔ میرے ایک کمرے کی دیوار پر جنگل کی پینٹنگ ہے۔ اور ایک خالی کمرے کی دیوار پر سمندر کی تصویر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں وہ کمرے آپ کو دے سکتا ہوں!"
"لیکن یہاں تو لکھا ہے کہ سچ مچ کا سمندر....."
وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا: "وہ تو پاگل تھا۔ پینٹنگ اور حقیقت کو ایک ہی سمجھتا تھا۔" اُس نے کچھ دیر بعد کہا۔
"وہ ہے کہاں؟"
"پاگل خانے میں!"
پھر وہ ذرا قریب آ کر کہنے لگا: "آپ کو ایسا کمرہ چاہیے، جس کی دیوار پر سمندر کی تصویر ہو، کیا ایسا ہی نہیں ہے؟"
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اٹھا: "ایسا ہی ہے! آپ کو سچ مچ کا سمندر نہیں چاہیے۔ آپ اچھے بھلے معقول آدمی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شہر میں سمندر نہیں ہے!"
اور اب میرے پاس ایک کمرہ ہے، جس کی دیوار پر سمندر کی تصویر ہے!

(ماہنامہ "ادبستان" جلد اوّل، شمارہ ہفتم، ۱۹۹۰ء)

قومی زبان (۱۷) فروری ۱۹۹۳ء

جدید ایرانی ادب سے!

طاہرہ ریاستی / معین نظامی

"یہ کہانی کسی کو پتہ نہیں چلنی چاہیے!"

بوڑھے کے قدموں کی چاپ نے محل کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پنچھیوں کو اُڑا دیا۔ وہ ہال میں داخل ہوا۔ اُس کی چال میں بہت خود اعتمادی تھی۔ پورا ہال تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف روشنی کا ایک ہالہ، پیانو پر مرکوز تھا۔ وہ روشنی میں آیا تو تماشائیوں نے سانسیں روک لیں۔ وہ کچھ دیر پیانو کے سامنے کھڑا رہا۔ پیانو درمیانے سائز کا تھا۔ بوڑھے نے اُسے صاف کیا۔ چند لمحے اُس کی نیلی نیلی آنکھیں براہ راست سامنے والے مخصوص کیبن پر جمی رہیں۔ پھر وہ لمبی لمبی انگلیوں سے پیانو بجانے لگا۔ اُس کی انگلیاں کبھی ٹیڑھی ہوتیں، کبھی سیدھی، ہر حرکت کے ساتھ اُن میں گہری جھُرّیاں پڑ جاتیں۔

کچھ تتلیاں ہولے سے پیانو پر آ بیٹھیں اور پھر ایک خوبصورت عورت کے سفید لباس کا دامن تھامے، اُڑنے لگیں۔ بوڑھا پُرسکون نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ اُس کے ہاتھ انھیں سہلاتے رہے۔ پیانو کے گیت کی مدھر آواز، لوگوں کو ماضی کے خوابوں میں لے گئی..... بہت پہلے کے دنوں میں، جب پیانو بجانے والا اپنی بیوی کی مشکوک موت کے بعد شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اور کسی کو بھی اُس کی کوئی خبر نہیں تھی!

لمحے، ٹھہرے ٹھہرے سے اور مختصر تھے۔ اچانک بوڑھے کا چہرا مُتغیّر ہو گیا۔ اُس کی عاشقانہ نگاہیں خشمگیں ہو گئیں۔ اُس کے ہاتھ بڑی سختی سے اوپر، نیچے اور دائیں، بائیں حرکت کرنے لگے۔ تتلیاں بھاگ گئیں۔ عورت کا سفید لباس، سیاہ ہو گیا۔ بوڑھے کی چوڑی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ ہونٹ بھنچ گئے۔ ہاتھوں کی حرکت میں لحہ بہ لحہ تیزی آتی گئی۔ پیانو کی آواز، شہر میں لوگوں کی دھڑکنوں سے گھل مل گئی۔ لوگ گروہ در گروہ محل کے ہال کی طرف چل پڑے۔ عورت آہنی سلاخوں کے پیچھے سے پیانو بجانے والے کو داد دیے جاتی تھی۔

اُس کے ہاتھ آہنی سلاخوں کو دبا رہے تھے۔ اُس نے ایک طویل قامت شخص کو ایک مُڑا تُڑا کاغذ دیا۔ بوڑھا، پیانو پر جھکا ہوا تھا۔ وہ مُڑے تُڑے کاغذ پر بار بار لکھا ہوا ایک ہی جملہ، ایک بار پھر پڑھ رہا تھا: "یہ کہانی کسی کو پتہ نہیں چلنی چاہیے! نہیں تو لوگ تمھیں مار دیں گے!"

بجاتا رہا۔ اچانک وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پیانو پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ پسینے کے قطرے اُس کی پیشانی سے ڈھلک کر چہرے پر آ گئے تھے۔ تماشائیوں کی نشستوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ہال کے دروازے مسلسل کھلنے اور بند ہونے لگے۔ بوڑھے کی خشمگیں آنکھیں، عورت کی لاش پر جمی ہوئی تھیں، جسے ایک صبح کو، دو نقاب پوش، دور کہیں تاریکی میں دفن کر رہے تھے!

پیانو سے فائروں کی آواز، لوگوں کا شور و غل اور ہزاروں گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں نکل نکل کر فضا میں پھیل گئیں۔

ہال لرزنے لگا۔ بوڑھا پیانو بجاتے ہوئے اپنی آخری توانائیاں تک صرف کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر بھی نہ رکا۔

کچھ دیر بعد جب ہال کے اندھیرے باہر بھاگے جا رہے تھے، تو اُس نے گیت کا آخری حصہ گنگنایا: "اب یہ کہانی ہر ایک کو پتہ چلنی چاہیے!"

پھر وہ اُسی طرح بوجھل بوجھل قدموں سے ہال کی ٹوٹی پھوٹی کرسیوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا، محل کی ویران دیوار عبور کر گیا۔ وہ چلا گیا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔

اب ہر کسی کو اس کہانی کا پتہ تھا۔

(افسانوی مجموعہ: "شطِ خیال" (THE FLOW OF FANCY) سے)

سندھی

میمن روشن تبسم / ترجمہ محسن بھوپالی

تمنا

مسافر تو مت بیٹھ اک خزاں دیدہ،
سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے
کہ یہ تجھ کو سایہ نہ دے گا!
محبت کے سارے شگوفے سبھی پھول
نفرت کی لُو نے جلا ڈالے ہیں
تو محبت کا جویا ہے
کوئی ہرا پیڑ دیکھ
اے مسافر یہاں سے چلا جا!
میں بھوتوں، چڑیلوں کا مسکن بنا ہوں
یہاں سے چلا جا
.... سفر کا یہ اسباب اٹھا
اپنی منزل کی جانب چلا جا
ہرے پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر
تو مجھے یاد کرنا
دعاؤں میں تو یاد رکھنا
میں سرسبز ہو جاؤں،
جب بھی مسافر یہاں آئیں وہ آرام پائیں
دعا تیری اے کاش مقبول ہو
پھر سے شاداب ہو جاؤں میں

زرد گلاب
(نثری نظم)

لوگ محبت کو کاغذی پھول سمجھ کر
کوٹ کے کالر میں... جوڑے کے دائرے میں
چند لمحوں کے لیے سجا کر
[illegible] کے باہر کوڑے دان میں
ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں
ان احمقوں کو کیا خبر
محبت سدا تازہ رہنے والا پھول ہے
قدردانوں کے ہاتھوں میں کبھی نہیں کملاتا
..... نیتوں کا فتور
محبت کو زرد گلاب میں تبدیل کر دیتا ہے!
بیوہ کی طرح پژمردہ کر دیتا ہے

مشورہ
(نثری نظم)

جھکنے سے ٹوٹ جانا بہتر ہے
معاشرے کے جابروں کے ہاتھوں سے ٹوٹ کر،
انسان جڑ سکتا ہے
لیکن جھکے ہوئے کندھے
دوبارہ نہیں اُٹھ سکتے
جھکنے سے ٹوٹنا بہتر ہے!

رُوئے زمین پر
انسان کا استقبال
انسان نے سب سے پہلا قدم جب رُوئے زمین پر رکھا تو درختوں نے لہلہاکر، نباتات نے
جھوم کر اور برگ و گل نے مسکرا کر انسان کا پُرجوش استقبال کیا۔
انسان نے چین محسوس کیا، وہ آغوشِ فطرت میں آچکا تھا۔ درخت اس کی غذا کا سامان
بنے اور نباتات اور گل و برگ اس کے درد کا درماں بنے۔ قدرتِ فیاض نے
رُوئے زمین کے چپّے چپّے پر نباتات پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کی غذا اور دوا کا اہتمام کر دیا ہے۔
سائنس کی عظمتوں اور ٹکنالوجی کی رفعتوں نے بھی آخرکار انسانِ ارض کو آغوشِ فطرت
میں جانے کے لیے آج بے چین کر دیا ہے۔
ہاں! انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ حتی الامکان دائرۂ فطرت سے باہر نہ جائے اور
نباتات سے اپنے علاج معالجے کا سامان کرے۔ ہمدرد نباتات کے عالمی میدان میں
گزشتہ کم از کم پچاس سال سے مصروف ہے اور دنیا کے ہر انسان کو ہمدرد نے دعوت دی ہے
کہ وہ آغوشِ نباتات میں آئے۔ آج دنیا نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔
ہمدرد فطری علاج کا حامی ہے۔ آج کی دنیا فطری علاج کی خواہاں ہے۔
ہمدرد کی نباتی پیش رفتوں میں ایک نہایت موثر پیش رفت
ہمدرد
جوشینا
مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
Hamdard
نزلہ، زکام۔ جوشینا سے آرام
ہمدرد
Adarts-JOS-1/92

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سیّد الطاف علی بریلوی
(حیات اور خدمات)

سیّد مصطفےٰ علی بریوی
صفحات ۴۸۰ قیمت =/۱۰۰ روپے
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۸

مشاہیر کے حالات کو تحریری شکل میں محفوظ کرنا دو اعتبار سے ضروری ہوتا ہے۔ اوّل ان کے کاموں اور خدمات کو سمجھنے اور کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے۔ دوم آئندہ نسلوں کے دلوں میں اُن کے نقوش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے۔

سیّد الطاف علی بریلوی بھی ہمارے رواں صدی کے مشاہیر میں سے ایک ہیں۔ اُن کی یاد تو اُس وقت تک قائم رہے گی جب وہ نشانات باقی رہیں گے جن پر اُن کی شہرت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ لیکن یہ بتانے کی پھر بھی ضرورت رہے گی کہ وہ اس مقام تک کیسے پہنچے۔ یہ دلکش مرقع اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اور اس کو تیار کرنے والے اُن کے بھتیجے صحیح جانشین سیّد مصطفےٰ علی بریلوی ہیں۔ صحیح پوچھیے تو یہ کام تھا بھی اُن ہی کے کرنے کا۔ انھوں نے سیّد الطاف علی بریلوی دامن تربیت میں پرورش پائی اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اُن کی نگاہوں کے سامنے گزرا۔ اُن کے نجی حالات اور علمی و ادبی نامے تمام تر اُن کے علم میں رہے۔ پھر جس مواد سے یہ مرقع تیار ہوا ہے وہ اُن کی دسترس میں تھا۔ غرض اس کام کی انجام دہی لیے جو سہولتیں اُن کو میسّر تھیں وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ انھوں نے ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا اور یہ کام نہایت سلیقہ سے انجام دیا۔ انھوں نے اپنے مربی و محسن کے حالات زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ پہلا حصّہ ۱۹۵۰ء تک کا جس کا تعلق آزادی سے پہلے ہندوستان سے ہے اور دوسرا حصّہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا جو پاکستان سے متعلق ہے۔ زیر تبصرہ کتاب حصّہ کی روداد ہے۔ اس کو ترتیب دینے کے لیے جو مواد درکار تھا وہ بہت کچھ بھارت میں رہ گیا تھا۔ اس لیے مولف کتاب کو کے حصول کے لیے بھارت کا پُر صعب سفر اختیار کرنا پڑا۔ انھوں نے یہ سب دقتیں اور دشواریاں جھیل کر مواد جمع کیا اور کتاب اس پہلے حصّہ کو ترتیب دیا۔ اس میں سیّد صاحب مرحوم کے خاندانی حالات، اُن کا زمانۂ طالب علمی، اُن کے غیر درسی مشاغل، کا ماحول، اُن کی ادبی زندگی کا آغاز، اُن کی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیاں نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ شروع میں انثار احمد علوی مرحوم کے تاثرات، "حرف آغاز" کے عنوان کے تحت دے کر اس لطیف داستان کو لطیف تر بنا دیا گیا ہے۔

طرح مکمل اور قابلِ مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ دوسرا حصّہ بھی جلد ہی اور اسی شان کے ساتھ منظرِ عام پر آئے گا۔
(ثناء الحق صدیقی)

کملی میں بارات

(دوہے)

عادل فقیر
صفحات ۱۶۰ قیمت = ۸۰/ روپے
مقبول اکیڈمی، دیال سنگھ مینشن۔ شاہراہ قائد اعظم۔ لاہور

عرش صدیقی ایک جانے پہچانے شاعر و افسانہ نگار ہیں۔ شعری مجموعہ 'دیدۂ یعقوب' اور افسانوی مجموعہ 'باہر کفن سے پاؤں' ادبی حلقے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ آخر الذکر کو آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔ اُن کے کئی بہت اچھے تنقیدی مضامین بھی منظرِ عام پر آکر داد حاصل کر چکے ہیں۔ عرش صدیقی کا ذہن زرخیز اور اَن تھک ہے۔ اب انہوں نے دوہے پر مشتمل ایک کتاب "کملی میں بارات" شائع کی ہے اس میں شامل دوہے اگرچہ خود عرش صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ صاحبِ تصنیف کی حیثیت سے ایک فرضی نام عادل فقیر آیا ہے ویسے دوہے کی مناسبت سے عادل فقیر بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں مجھے مشرقی بنگال کے ایک باؤل فقیر، لالن فقیر کی یاد آجاتی ہے جس کے گیتوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی متاثر کیا تھا۔

"کملی میں بارات" کا دیباچہ ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے دوہے پر یہ ایک تفصیلی اور جامع مضمون ہے۔ دوہے پر اس جامعیت کے ساتھ کم مضمون دیکھنے میں آئے ہیں۔ عرش صدیقی نے پہچان کے لیے مضمون کے آخر میں دوہے کی عام بحر فعلن فعلن فاعلن، فعلن فعلن فاع (فع) کو خواجہ دل محمد چھند کہا ہے اور فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع (فع) کو عالی چھند کا نام دیا ہے، عادل فقیر نے ان ہی دو چھندوں میں دوہے کہے ہیں۔ عالی چھند میں کہے گئے دوہے ۱۰۱ صفحے سے ۱۵۲ تک پھیلے ہوئے ہیں اور خواجہ دل محمد چھند کے دوہے صرف چھ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ عرش صاحب کا چوں کہ دوہوں کا گہرا مطالعہ ہے اس لیے "کملی میں بارات" کے دوہوں میں لب و لہجہ سے لے کر لفظیات تک دوہے کی اعلیٰ روایات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ "کملی میں بارات" میں شامل دوہوں نے موضوعات اور برتاوے ہر دو اعتبار سے ذہن و دل کو متاثر کیا ہے یہاں اس کتاب پر تفصیل سے باتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے اس لیے صرف ایک مثال دے کر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

"کملی میں بارات"

عادل خلقت شور مچائے، ہوا ہوئے سنجوگ
نفرت کے دشمن ٹکڑوں میں، بٹے ہوئے ہیں لوگ
حاکم اور محکوم سبھی کو ہے اُس گھر کی تلاش
جس پر سایہ افگن ہو، غم خواری کا آکاش
میرے پاس علاج ہے اس کا، سنو فقیر کی بات
کالی کملی اوڑھ لو سارے، کملی میں بارات

اوپر کے دوہوں میں وہ تلخ حقائق ہیں جس سے ہم سب گزر رہے ہیں۔ آخری دوہے میں اُس پریشانی کا علاج بتایا گیا ہے کالی کملی اوڑھنا سے مراد اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی سے ہے۔ آنحضرت صلعم کی ایک پہچان کالی کملی بھی ہے شاعر کہتا ہے اسے اوڑھ کر دکھ سے نجات مل جائے گی اور خوشیوں سے مالامال ہو جاؤ گے۔

دوہے کے موضوع پر "کملی میں بارات" قابلِ مطالعہ کتاب ہے اور اس سمت میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

(ا۔ س)

حیرتوں کی سرزمین

محسن بھوپالی

صفحات ۱۲۸ قیمت =/۱۰۰ روپے

"ایوان ادب" ۴ ایف ۵/۳ اے ناظم آباد

بظاہر "حیرتوں کی سرزمین" صاحب کتاب جناب محسن بھوپالی کے سفر امریکہ کی روداد نظر آتی ہے لیکن جب اس کے مطالعے سے گزریے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنہا محسن بھوپالی کے سفر کی روداد نہیں، بلکہ یہ حمایت علی شاعر، جون ایلیا اور محسن بھوپالی کے سفر امریکہ کی مشترکہ روداد ہے۔ اس سفر نامے میں نہ خواہ مخواہ تاریخ دانی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ اس کا دامن سیاسی ذکر سے بوجھل ہوا ہے نہ ہی اس میں غیر ضروری افسانہ طرازی اور منظر آرائی ملتی ہے۔ یہ سفر نامہ سیدھے سبھاؤ اپنی ابتدا کرتا ہے۔ اور خراماں خراماں اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ اس میں مختلف شہروں میں برپا ہونے والے مشاعروں کا تذکرہ ہے۔ اُن تذکروں کے درمیان امریکہ کے شہروں، وہاں کے ادب دوستوں اور وہاں کی ادبی محفلوں کے طور طریقے سے قاری کی غائبانہ ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ جتنی دیر کتاب پڑھتا ہے، اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی بہ نفس نفیس ان محفلوں میں موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ دیارِ غیر میں رہ کر انسان اپنی زمین اور زبان سے کتنی محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ دوری اُسے کس شدت سے اپنی زمین اور زبان کی اہمیت کا احساس کراتی ہے۔ مختصر یہ کہ محسن بھوپالی کا سفر نامہ بہت سی غیر ضروری تفاصیل سے پاک ہے اور ہر حال میں سفر کے مقاصد و محافل سے جُڑا رہتا ہے۔ کہیں کہیں امریکی شہروں کا بھی ضمناً ذکر آ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ایک نشست میں پڑھنے کی چیز ہو گئی ہے ہاں اس میں وہاں کے احباب اور چیدہ مقامات کی تصاویر نے اسے مزید رونق بخشی ہے۔

(ا۔ س)

سجاد ظہیر۔ تخلیقی و تنقیدی جہات

عتیق احمد

صفحات ۲۳۲ قیمت =/۸۰ روپے

اُجالا پبلی کیشنز، گلشن اقبال۔ کراچی

نومبر ۱۹۹۱ء میں سجاد ظہیر پر، عتیق صاحب کی ایک کتاب "بنّے بھائی" اُن کی شخصیت و فن کے مطالعے کے شائقین کے تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کر چکی ہے، جس میں برصغیر پاک و ہند کے نامور اہل قلم کے مضامین و مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ تقریباً

ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۹۲ء میں انھوں نے دوسری کتاب "سجاد ظہیر۔ تحلیقی و تنقیدی جہات" شائع کر کے، سجاد ظہیر کی حیات و کائنات پر مزید کارآمد مواد جمع کر دیا ہے۔ دونوں کتابوں میں فرق یہ ہے کہ عتیق صاحب اوّل الذکر کے مرتب اور آخر الذکر کے مصنف ہیں۔ پروفیسر عتیق نے آخر الذکر کتاب میں سجاد ظہیر کی تصانیف کا اُسی ترتیب سے جائزہ لیا ہے جس ترتیب سے وہ معرض وجود میں آئی ہیں۔ کتاب کے مشمولات کی ترتیب کے مطابق پہلے سجاد ظہیر کی افسانہ نگاری زیر بحث آتی ہے، پھر اُن کے ناولٹ "لندن کی ایک رات" پر محققانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور اس پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس رائے کی تصدیق بھی کی گئی ہے کہ "شعور کی رو کی تکنیک" کا استعمال پہلے "لندن کی ایک رات" میں ہوا ہے۔

پروفیسر عتیق نے اپنی اس کتاب میں سجاد ظہیر کا بحیثیت شاعر اور بحیثیت تنقید نگار بھی مطالعہ کیا ہے اور سجاد ظہیر کو ان کے شعری مجموعے "پگھلا نیلم" کی وجہ سے "نثری نظم" کے پیش رو میں شمار کیا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (۱۹۳۶ء) کے قیام اور اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں سجاد ظہیر کی سرگرمیاں اور اُن کی قائدانہ صلاحیت۔ کمیونسٹ پارٹی سے اُن کی وابستگی۔ برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی میں اُن کا مثبت کردار علاوہ ازیں اور بہت کچھ سجاد ظہیر کے حوالے سے پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایک بات اور وہ یہ کہ عتیق احمد کی اس کتاب کو اُن کی پہلی کتاب "بنّے بھائی" کے تسلسل میں پڑھیے تو پورے سجاد ظہیر کے مطالعے کی سبیل پیدا ہو جاتی ہے۔

ترقی پسندی کے حوالے سے برصغیر کے سیاسی سیاق و سباق کے بالاستیعاب مطالعے نے عتیق صاحب کو سجاد ظہیر کے فن و شخصیت کا جائزہ لینے میں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ عتیق صاحب کی دونوں کتابیں سجاد ظہیر پر اوّلین مساعی کا درجہ رکھتی ہیں اور بعد کے آنے والوں کے لیے راستہ بھی ہموار کرتی ہیں۔

(ا۔ س)

کلیاتِ واہب

تدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی

صفحات ۱۶۷ قیمت = ۱۰۰/ روپے

حلقہ فکر و نظر کراچی اے ۶۲ بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا کراچی

کسی شخص کے کلام کو ضائع ہونے سے بچالینا اور اُسے کتابی شکل میں شائع کر دینا ادب پر بہت بڑا احسان کرنے کے مترادف ہے۔ "کلیاتِ واہب" کی اشاعت بھی ایسا ہی ایک احسان ہے۔ اس کتاب کی تدوین ڈاکٹر ہلال نقوی نے کی ہے۔

جناب واہب ۱۸۸۷ء میں مظفر پور میں پیدا ہوئے، اس گھرانے میں شعر و ادب کا شروع سے چرچا تھا۔ اسی گھرانے کے چشم و چراغ میں علامہ جمیل مظہری کا نام بھی آتا ہے۔ خود واہب صاحب کے صاحبزادے جناب ثاقب مظفر پوری کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شعر و شاعری کی یہ روایت تنویر فاطمہ کے توسط سے آگے بڑھی ہے۔ مرثیہ پر اُن کا ایک کتابچہ شائع ہو چکا ہے۔

واہب مظفر پوری کی شاعری میں تصوف کی دھیمی دھیمی آنچ ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ خدا اور خودی کی رمز آشنائی سے کلام میں ایک لطف خاص پیدا ہو گیا ہے، اشعار کا تیور، قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اسی تیور سے اُن کا اسلوب شاعری بھی

متعین ہوتا ہے۔

واہب صاحب کی شاعری کو ایک اور رخ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جوان کے بہت حسبِ حال ہے وہ یہ کہ واہب صاحب کی شاعری کے عروج کا جو زمانہ ہے وہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۴ء تک متعین کیا جا سکتا ہے اس دور پر خواہ غزل ہو یا نظم علامہ اقبال کے اثرات غالب ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں کا مزاج خالص عشقیہ نہ بن سکا۔ جوان سے پہلے اور اُن کے زمانے میں بھی رائج تھا، انھوں نے دنیا کو غور و فکر کرنے کا چلن اپنایا خدا اور انسان اور کائنات کے رشتے پر نظر ڈالنے کی سعی کی۔ واہب صاحب کی شاعری کے ان متنوع رُخوں کو ان کے کلام میں ملاحظہ کیجیے۔

حسن کو درکار تھا عشقِ نکیمانہ ..
لازمی ٹھہرا عدم سے اس لیے آنا مرا

تجھے خدا تو خدائی کی آرزو نے کیا
بسر نام ملا ہم کو رنگ و بو نے کیا

دریائے طبیعت میں روانی ہے غضب کی
ٹکرائے گا تسنیم سے دریا مرے دل کا

قیمت مرے دل کی ہے رضا تیری رضا کی
ممکن بجز اس کے نہیں سودا مرے دل کا

ادراک جسے نفس کا حاصل نہیں ہوتا
اسرار حقیقت کا وہ حامل نہیں ہوتا

دل کے آنے کی جب گھڑی آئی
حسن خودبیں میں دلبری آئی

نغمۂ واہب نوائے غیب ہے
ایک صورت یہ بھی ہے پیغام کی

ہیں نظام ارضی و شمسی گواہ اس بات کے
کُن کے پردے میں ہیں واہب سرخوش افسانہ ہم

گردوپیش

پروفیسر عطاالرحمٰن کاکوی کی انجمن میں آمد

۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کو پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی انجمن میں تشریف لائے انجمن کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرا خوش گوار فریضہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے اپنے مہمان کا خیر مقدم کروں، یہ انجمن کے لیے بھی باعث افتخار ہے کہ بزرگ محقق پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی یہاں تشریف لائے۔ اس سلسلے میں، میں جناب عبدالجلیل بسمل کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پروفیسر موصوف کے یہاں تک آنے میں رہنمائی کی۔ جواب میں پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے کہا "مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ لوگوں نے مجھے انجمن میں آنے کی دعوت دی۔ انجمن سے میرا تعلق بہت قدیم ہے۔ اُس وقت سے جب جناب عبدالعلیم مظہری انجمن کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں صوبہ بہار کے دورے پر گئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے کہا ہمارے ہاں اب تو انجمن ترقی اردو کی بجائے انجمن بقائے اردو کی ضرورت ہے۔ اردو اکیڈمیاں بہت قائم ہو گئی ہیں، لیکن ان کے پلیٹ فارموں سے جو علمی کام ہونے چاہیے تھے وہ نہیں ہو رہے ہیں۔ لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔ بہار میں یو پی کی مناسبت سے اردو کے حالات بہتر ہیں بہ حیثیت مجموعی ہمارے ہاں کتابوں کی اشاعت پر توجہ کم ہے، گرانٹ کی رقم کا صرفہ انتظامیہ پر زیادہ ہو جاتا ہے۔ انجمن کی جانب سے پاکستان میں کام زیادہ ہو رہا ہے ویسے یہاں اس کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔

پروفیسر عطاالرحمٰن صاحب نے گفتگو کے دوران پی ایچ ڈی کے معیار کے سوال پر کہا کہ جن حالات میں ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کی جا رہی ہے وہاں معیار کا سوال ہی نہیں ہوتا، اب ڈگریاں ان کی ملازمت کی ضرورت بن گئی ہیں ہمارے ہاں کے گھروں میں بچے ہندی پڑھتے ہیں وجہ ظاہر ہے ہندی ذریعۂ تعلیم اُن کی روزی سے جڑا ہوا ہے۔

کچھ دیر پروفیسر صاحب سے فارسی کی تحقیق اور تحقیقی کتب پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ ہماری فارسی دانی کو ایران نے کتنا قبول کیا۔ جواب میں انھوں نے کہا بس اس قدر قبول کیا کہ امیر خسرو اور غالب وغیرہ کے متعلق لکھا۔ "بہترین شعرائے ہند است" اس پر جناب اسلم فرخی نے کہا ایران والوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔

جناب جلیل قدوائی نے کہا میں عظیم آباد کے اُستاد سخن شاؔد کا بہت قائل رہا ہوں۔ اس طرح شاؔد سے متعلق بات چل نکلی، پروفیسر کاکوی نے انکشاف کیا کہ سب سے پہلے شاد کا شعری مجموعہ مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا تھا۔ جناب بسمل نے کہا کہ جناب

عطاء الرحمٰن کاکوی کو شاد عظیم آبادی کی شاگردی کی سعادت بھی حاصل ہے۔
انجمن کی یہ تقریب اس لحاظ سے بڑی نمائندہ تھی کہ اس تقریب میں جامعہ کراچی کے شعبہ فارسی کے تقریباً تمام اساتذہ ڈاکٹر تفہیمی، ڈاکٹر روشن آراء، ڈاکٹر طاہرہ صدیقی، ڈاکٹر جعفر حلیم، ان کے علاوہ جناب جلیل قدوائی اور ان کی بیگم، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر ظفیر الحسن، ڈاکٹر فہیم اعظمی، جناب عبدالجلیل بسمل، جناب قسیم الدین اور جناب شکیل الرحمٰن (عطاء الرحمٰن کاکوی کے صاحبزادے) اور اراکینِ انجمن موجود تھے۔ تقریب کے اختتام پر شرکائے جلسہ کا چائے، ناشتہ سے تواضع کیا گیا۔

علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر ۱۹۹۲ء

۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو حلقۂ نگار و نیاز کی جانب سے "نگار پاکستان۔ علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر ۱۹۹۲ء" کا انعقاد نیپا آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ملک کے نامور شاعر و ادیب جناب احمد ندیم قاسمی نے فرمائی۔ اسٹیج پر ان کے ہمراہ جناب جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان، جناب حکیم محمد سعید، چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، ڈاکٹر منظور احمد وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، ڈاکٹر این اے بلوچ، ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری رونق افروز تھے۔ جلسے کی نظامت کے فرائض جناب امراؤ طارق نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔
ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا کہ نیاز یادگاری خطبے کی دسویں سالگرہ، نگار کی اکہترویں سالگرہ اور نیاز کی پیدائش کی ۱۰۸ ویں سالگرہ کے موقع پر ہم سارے اہلِ کراچی، اور بالخصوص اُن اہلِ قلم اور موقر اداروں کے شکر گزار ہیں جن کے تعاون سے دس سال سے نیاز یادگاری لیکچر کی یہ روایت جاری ہے۔ دس سال کے عرصے میں پاک و ہند کے ڈیڑھ پونے دو سو ادیبوں نے نیاز پر مضامین و مقالے تحریر کیے۔ علامہ نیاز حریت فکر و قلم کے علم بردار تھے اور تا حیات وہ اسی پر کاربند رہے۔ وہ فکر و دانش کی روشنی پچاس سال تک پھیلاتے رہے۔ انھوں نے کہا علامہ نیاز سرسید احمد خان، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال کے مکتب فکر کے صاحبِ قلم تھے۔ مولانا حسرت موہانی کے تو وہ ہم جماعت بھی رہے تھے۔
ڈاکٹر انوار احمد نے ایک جامع مقالہ "نگار کے وقیع کالم "استفسارات" کے حوالے سے پڑھا، انھوں نے بتایا کہ نگار کے صفحات پر یہ سلسلہ اگست ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر انوار نے کچھ استفسارات اور ان کے جوابات پڑھ کر سنائے انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ اردو میں خرد افروزی کی روایت نیاز و نگار کے توسط سے چلی۔ ڈاکٹر انوار نے کہا کہ علامہ نیاز کے ہاں بغاوت خاندانی وِرثے کے طور پر آئی تھی اُس موقع پر انھوں نے علامہ کا وہ قول دُہرایا جس میں کہا گیا ہے کہ سرسید احمد دنیا کی خاطر دین کے دام بجھاتے تھے اور میں دان کی خاطر دنیا کے دام بجھاتا ہوں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر انوار کا مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے سیر حاصل تھا۔

زاہدہ حنا نے اپنا مضمون "عورت اور فنون لطیفہ نمبر" کے حوالے سے پڑھا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ نیاز صاحب کسی فرانس میں پیدا ہوئے تو روسو اور والٹیر کہلاتے یہ ہماری خوش بختی ہے کہ نیاز فتح پوری ہم میں پیدا ہوئے، علامہ نیاز عقل و عشق کا سنگم تھے اور علامہ کا یہ قول دہرایا کہ خدا کی بڑائی ہی کیا کم ہے کہ اُس نے ذہین عورت پیدا کی۔

زاہدہ حنا کا یہ مضمون تاریخی سیاق و سباق رکھتا تھا، سامعین میں دلچسپی سے سُنا گیا۔

جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ تاریخ میں روسو، والٹیر اور ول ڈوران ایسی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے بُت شکنی کا فرض انجام دیا۔ علامہ نیاز بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ نیاز صاحب کے اقوال میں جستجو کا عنصر غالب ہے۔ نیاز صاحب کا مرتبہ تسلیم کیا جا چکا ہے، نیاز صاحب ایک فرد ہوتے ہوئے ایک ادارہ کی طرح یاد میں رکھے جائیں گے۔ عالی صاحب نے کہا کہ اپنے صدر صاحب کی اجازت سے میرا ارادہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے نیاز اسٹڈی سرکل قائم کیا جائے اور انجمن کے ہال میں اس کی ماہانہ نشستیں ہوا کریں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کے کنوینر ہوں اور میں خود اسسٹنٹ کنوینر کے فرائض انجام دیا کروں۔

ڈاکٹر منظور احمد نے کہا کہ یہ تو فرمان فتح پوری صاحب کی شفقت، محبت اور مروّت ہے جو مجھے آپ کے سامنے کھینچ لائی ہے۔ ورنہ میں خود کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہر حال، تین مقررین کے اظہار خیال سے جو باتیں سامنے آئی ہیں اُن کی روشنی میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ خدا کے خلاف کوئی کیا بات کرے گا، بات تو اُن آدمیوں کے خلاف ہوتی ہے جو خدا کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ساختیت پس ساختیت وغیرہ کا ایک پس منظر ہے، جس کا انحصار عقلیت پر ہے، عقلیت پر خاصی گفتگو مغرب میں ہوئی ہے۔ لیکن عقل صرف وہی نہیں جو ارسطو کہہ گیا، لفظ عقلیت کثرت المعانی ہے، یہاں عقلیت کا اختلاف دلیل سے کیا جاتا ہے، زور بازو سے نہیں۔ یورپ کی ثقافت لادینی ہے لادینی ثقافت سے مراد ہے وہ کام کیا جائے جس میں عقل بھی شامل ہو، اس وقت والٹیر کی یہ بات یاد آتی ہے کہ "تم مذہبی تو بن جاؤ لیکن درست مت پھیلاؤ یا پادری نہ بنو" ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہمارے ہاں فکری انقلاب کیوں نہیں آیا تو اس کا شافی جواب نہیں ملتا۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ ہو کہ ہماری فکر نے اشاعرہ یا اشعری مکتب فکر کو اپنا لیا اور معتزلہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اشعری مکتب فکر آمر ہے اور ایک حکم کو قبول کرنے والا ہے۔ اُس کے ہاں آمر و حاکم ہی عقل کُل ہے۔

سندھی، اردو، عربی کے اسکالر ڈاکٹر این۔ اے۔ بلوچ نے کہا کہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے "نگار یادگاری لیکچر" میں شرکت کا موقع فراہم کیا۔ اتنے بصیرت افروز مقالوں کے بعد اب میں اس میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو بہت پہلے سے قائم تھی میں اس کا ممبر بن گیا اور وہیں پہلی بار میں نے رسالہ "نگار" دیکھا علامہ نیاز کے سلسلے میں میری خوش فہمی کا اُسی زمانے میں آغاز ہو جاتا ہے۔

علامہ نیاز نے برسوں عقل و دانش کا چراغ "نگار" کے ذریعے ہندوستان میں جلائے رکھا، جب پاکستان بننے پر وہ یہاں منتقل ہو گئے تو یہاں بھی "نگار" کو حرز جاں بنائے رکھا یہیں وہ اللہ کو پیارے ہوئے ہم سب کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ علامہ نیاز سندھ کی سرزمین کو آسمان بنا کر آرام کی نیند سو گئے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب احمد ندیم قاسمی نے خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ علامہ نیاز نے پوری زندگی توہمات اور تعصبات کی بیخ کنی میں صرف کر دی۔ میں نے "نگار" کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ علم کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور فکری شخصیت کسے کہتے ہیں۔ میں "نگار" کے مندرجات کو پڑھتا نہیں، پی جاتا تھا "نگار" ہر دل عزیز پرچہ تھا، یہ رسالہ جامد سے جامد اور پتھر دل تک میں بھی اپنی راہ بنا لیتا تھا۔ اس کے مطالعہ سے انسان میں جستجو، تلاش، دریافت اور کُرید پیدا ہوتی تھی، علامہ نیاز کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ ان کے ادبی عقائد و فکر کا جائزہ جدید علوم کو پیش نظر رکھ کر کیا جانا چاہیے۔

اس موقع پر ہر سال کی طرح ہمدرد فاؤنڈیشن اور حلقہ نیاز و نگار کی جانب سے شیلڈ پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہمدرد فاؤنڈیشن کا سپاس نامہ ملتان یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو جناب انوار احمد کو جناب حکیم محمد سعید نے اور حلقہ نیاز و نگار کا سپاس نامہ جناب جمیل الدین عالی نے ڈاکٹر این۔ اے۔ بلوچ کو پیش کیا۔ صدر کا خصوصی تحفہ جناب احمد ندیم قاسمی کو ڈاکٹر منظور احمد نے پیش کیا۔

علامہ نیاز کے صاحبزادے ڈاکٹر سرفراز نیازی نے اپنے اور اپنی والدہ محترمہ کی طرف سے جلسہ کے انعقاد پر اظہارِ تشکر کیا۔

ہفتہ وار "راوی" انگلستان کا سیرتِ پاک سے متعلق انعامی مقابلہ

ہفتہ وار "راوی" بریڈ فورڈ کی تازہ ترین اشاعت کی اطلاع کے مطابق چار ججوں پر مشتمل جیوری نے سیرت پاک کے دوسرے سالانہ انعامی مقابلے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس فیصلے کی رو سے نعتیہ کلام پر اوّل انعام جگن ناتھ آزاد اور عطا عابدی (ہندوستان) اور حنیف اسعدی اور انور مسعود (پاکستان) کو دیا گیا اور مضامین پر خان محمد عاطف (ہندوستان) اور رفاقت حسین شاہ قادری (پاکستان) کو۔

اس انعامی مقابلے میں پاکستان، ہندوستان اور انگلستان سے ۵۲۴ شعرا اور نثر نگار حضرات کے نعتیہ کلام اور مضامین کو شامل کیا گیا۔ اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ اگرچہ انعام پانے والے پچاس سے زائد حضرات میں اکثریت پاکستان سے تعلق رکھتی ہے لیکن معیار کے اعتبار سے ہندوستان کے شعرا اور نثر نگار حضرات کی تخلیقات کو بھی جیوری نے بلند مرتبہ قرار دیا ہے۔

جہاں تک تقسیمِ انعامات کا تعلق ہے پاکستان اور انگلستان کے انعام براہِ راست "راوی" کے دفتر سے بھیجے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں انعامات اردو کے مقتدر جریدے ماہنامہ "شمع" نئی دہلی کے زیر اہتمام ایک جلسے میں انعام پانے والے حضرات کو پیش کیے جائیں گے۔

(نامہ نگار)

"ہارورڈ آرٹ میوزیم میں اسلامی ہند کے فنِ مصوّری کی نادر نمائش"

میساچوسٹس، ہارورڈ آرٹ میوزیم میں اسلامی اور بعد کے ہندوستانی فن کے کیوریٹر اسٹوارٹ کیری ویلچ کا کہنا ہے کہ مغل ہندوستانی فن اور بطور خاص شاندار مصوری دیکھنے والوں کو سولہویں صدی کی شاہی زندگی کی حقیقی تصویر پیدا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ انداز پوری دنیا میں مقبول ہے۔

ویلچ نے جو ہارورڈ یونیورسٹی میں سینئر لیکچرر بھی ہیں ۱۷ اکتوبر کو میوزیم کی سیکلر گیلری میں چھوٹے، نمائشی علاقہ میں مغل آرٹ کے مختصر لیکن اہم مجموعے کی نمائش "فن سلطنت، مغل ہندوستانی، مصوری، سولہویں و سترھویں صدی" کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی۔

اگرچہ پوری نمائش صرف ۳۰ فن پاروں پر مشتمل ہے تاہم ویلچ نے ایک حالیہ انٹرویو میں بتایا کہ اس کا معیار بلند اور خاص طور پر یونیورسٹی میوزیم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔

(خبر و نظر اسلام آباد)

محمد حسن عسکری کا ذخیرہ کتب بیدل لائبریری میں

مشہور ناقد پروفیسر محمد حسن عسکری کا ذخیرہ کتب و رسائل اُن کی بہن اور بھائیوں نے بیدل لائبریری کو بہ طور عطیہ دیا ہے۔ جس میں اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبان کی تین ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسائل شامل ہیں۔

سانحہ ارتحال

گزشتہ دنوں بزرگ شاعر جناب طفیل ہوشیار پوری کا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر اسی (۸۰) سال تھی۔ وہ ایک عرصے سے ماہنامہ "محفل" نکال رہے تھے۔
ادارہ اُن کے سانحۂ ارتحال پر دلی رنج کا اظہار کرتا ہے اور خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں دعا گو ہے کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

قومی زبان اردو کو اصل مقام کب ملے گا

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے، لیکن پاکستان بنے ۴۶ سال بیت چکے ہیں، اور اسے ابھی تک اس کا مقام نہیں مل سکا۔ جو بھی حکومت برسر اقتدار آئی ہے وہ قومی زبان اردو کو اس کا اصل مقام دلانے کا عزم تو کرتی ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ کسی حکومت نے عملی طور پر اقدامات نہیں اٹھائے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی زبان کو اپنے ہی وطن میں دورِ غلامی کی زبان پر فوقیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیوں کہ ابھی تک بیشتر سرکاری دفاتر اور عدالتوں کا کام انگریزی زبان میں ہو رہا ہے۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی۔ موجودہ حکومت نے مختصر عرصہ میں متعدد اہم اقدامات اٹھائے ہیں اگر یہ ملک میں قومی زبان کو بھی اس کا اصل مقام دلانے کے لیے سنجیدگی سے اقدامات کرے تو اس کی نیک نامی میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ جس طرح دنیا کے متعدد ممالک نے اپنی قومی زبانوں کو اوّل مقام دے کر ترقی کی منازل طے کی ہیں اسی طرح پاکستان بھی اپنی قومی زبان کو ذریعہ بنا کر ترقی و خوشحالی کی منزلیں مزید تیز رفتاری سے طے کر سکتا ہے۔ (اخبار اردو ۰۱۰)

ماہانہ منافع آپ کے ہاتھ میں۔ جمع شدہ رقم بھی محفوظ!

ماہانہ خوشحالی اسکیم

آپ ریٹائر ہو رہے ہیں یا ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ اپنے گھر کے خرچ، بچوں کی بروقت اسکول فیس یا دیگر ضروریات کو ہر ماہ بروقت سرانجام دینے کے لیے مسلم کمرشل بینک ماہانہ خوشحالی اسکیم سرٹیفکیٹ خریدیں جس میں آپ کی جمع شدہ رقم پر ہر ماہ انتہائی پُرکشش منافع آپ کو ملتا رہے گا جس سے آپ کا خاندان اپنے گھریلو اخراجات یا اور دوسری ضروریات کو بروقت پورا کر سکے گا۔ ہر قسم کی پریشانی سے نجات...
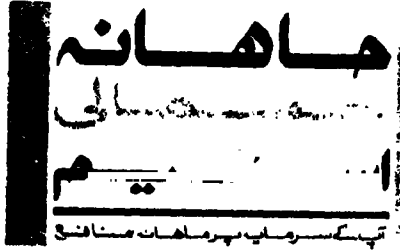
ایم سی بی ماہانہ خوشحالی اسکیم کی وجہ سے میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی گھریلو اخراجات سے مطمئن ہوں۔

ایم سی بی ماہانہ خوشحالی اسکیم سے میرے اسکول کی فیس بروقت ادا ہو جاتی ہے۔

میرے گھر کا خرچہ اب بروقت مل جاتا ہے اور کسی قسم کی تنگدستی نہیں ہوتی۔

انتہائی پُرکشش منافع

منافع کی گھر تک ترسیل

بروقت ادائیگی

ملک گیر سطح پر مسلم کمرشل بینک کی تمام برانچوں میں یہ سہولت

مسلم
کمرشل
بینک لمیٹڈ

278-9-91 The Circuit

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

مطالعۂ سائنس

مصنف	عنوان	ماخذ
اسلم پرویز	بینائی بچائیے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص ۳۳
اسلم پرویز	دیو پیکر درندے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۲۷
اسلم پرویز	دلی کی بدلتی فضا	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۲۷
اسلم پرویز	نیو کلیائی توانائی بطور معالج	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۲۸
افتخار احمد	کمپیوٹر بیسویں صدی کی ضرورت۔ ایک تعارفی جائزہ	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۰
اقبال الدّین	خلا میں ہماری پیش رفت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۴۰
باٹرن برگ، نوبل انعام یافتہ جرمن سائنس داں، ترجمہ: جاوید احمد	جدید سائنس میں قدیم مسائل کا حل	سائنس میگزین، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۰۷
چنگ یو	کوہ سلمانیہ کے جنگلات (اردو ترجمہ)	مطالعہ پاکستان، کراچی ۹۲/۳ء ص ۴۳
راجہ سلیم انور	تجزیاتی کیمیا	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۴۸
ریاض الدین احمد	زندہ پانی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۲۸
زاہد علی اشرف	انسان اور کائنات	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۲ء ص ۹۱
سعید الظفر چغتائی	سائنس تجارت اور معاشرت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۳۸
سہیل یوسف	عظیم سائنس داں، ڈاکٹر رضی الدّین صدیقی	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۹
سید قاسم محمود	اسلامی سائنس کے مغربی سائنس پر اثرات	سائنس میگزین، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹۷
عاصم محمود	روس کی سائنسی خدمات	مطالعۂ پاکستان، کراچی ۹۲/۳ء ص ۶۳
عبدالخالق خاں، ڈاکٹر	قرآن کا نظریۂ جوہر	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۷۰
عظیم شیخ	حیاتین کی دریافت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۱۵
عظیم قدوائی	دیو پیکر ایٹم شکن	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص ۲۵
عظیم قدوائی	بلانے سائنس تاب کاری	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۴

علی عباس ازل	انجانے عقیدے اور سائنس	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۴۳
علیم احمد	جدید فلکیات کے تیس سال	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹
کامران مجاہد، ڈاکٹر	بائرن برگ، جرمن سائنس داں	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۲۳
مجاہد کامران، ڈاکٹر	لینڈاؤ کی داستان، نوبل انعام یافتہ روسی سائنس داں	سائنس میگزین، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۴۵
محمد شریف خاں	مسلم یونیورسٹی برائے خواتین	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۷
محمد طاہر	مطالعہ سائنس۔ جذام	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۵۰
ترجمہ مرزا رشید جامعی	زمین، ایک زندہ سیارہ	سائنس میگزین، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۷۵
منیر احمد ساہری	سائنسی علوم کا فروغ بحوالہ تقریر صدر مملکت، غلام اسحاق خاں	سائنس میگزین، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۲۹
ناصر بشیر مومنال	ایکسرے اور حیاتیات	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۳۸

فکر و فلسفہ، حکمت

احمد ندیم قاسمی	پندرہویں صدی، ایک آزمائش ایک چیلنج	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۳
انور زاہدی	خوابوں کی اہمیت	دریافت، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۵
ایم ایم حسن	اکیسویں صدی کے لیے تریاق	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۳۴
جمیل الدین عالی	اسبابِ زوالِ امت	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۸۷
رب نواز مائل	حسن، طلبِ حسن یا وجود موجود کے طور پر	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۳۲
رشید ملک	انڈالوجی۔ ۷ آریا اور آریایت۔ ۲	فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۷
سیّد حامد	ظاہر و باطن	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص ۷
سید حامد	بچوں کی تربیت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جون ۹۲ء ص ۱۱
سیّد قاسم محمود	معرکۂ مذہب و سائنس	سائنس میگزین، مارچ ۹۲ء ص ۹
سیّدہ دردانہ پرویز	ایمانِ کامل اور عصرِ جدید	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۷۹
صفدر محمود، ڈاکٹر	زندگی کا پل صراط	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۵
ھزم	جب معاشرہ تنگ نظر ہوجائے	الولی، مارچ ۹۲ء ص ۵
علی عباس ازل	انجانے عقیدے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص ۱۵
غلام جیلانی برق، ڈاکٹر	حکایات و واقعات	محفل، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۳
قاضی قیصر الاسلام	اسلوب کے معانی	دریافت، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۸
قاضی قیصر الاسلام	مرکز سے محیط تک۔ ۳	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۵۲
قاضی قیصر الاسلام	ژاک دریدا ایک گفتگو	دریافت، کراچی فروری ۹۲ء ص ۲۳
قدیر الدین احمد، جسٹس ریٹائرڈ	اکیسویں صدی اور مسلمانوں کا مستقبل	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۱۲
قیصر تمکین	نئی دنیا کو خدا حافظ	افکار، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۲
مستقیم اصلاحی	سینما، ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ کی تباہ کاریاں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۲۱

تاریخ، تہذیب، ثقافت

آفاق صدیقی	اردو میں تاریخ نویسی کی روایت اور علامہ شبلی	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۴۴
احمد الطاف	معاشیاتِ سندھ کا پس منظر	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۳۰
اسلم صدیقی	عربوں کے نقوش و اثرات	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۱۰

میل احمد، ڈاکٹر	دور جاہلیت میں عربوں کی علمی حیثیت	آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۴۷
ید خاں	مسلم قیادت، مسائل اور ذمہ داریاں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جون ۹۲ء ص ۴۹
یبہ قاضی	سقوطِ حیدرآباد دکن	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۷۰
سن عابدی	انسانیت کا سفر آگے کی طرف ہے، پیچھے کی طرف نہیں	افکار، کراچی فروری ۹۲ء ص ۱۲
میل احمد	محمد علافی، قومی ہیرو یا باغی مسلمان؟	صحیفہ، لاہور جولائی ۹۱ء ص ۴۶
رشید احمد	مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ (آخری قسط)	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۱۱
ست محمد	قومی زبان اور قومی لباس	اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۵
سول طاؤس	سوویت انڈالوجی۔ ۴	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۶۷
ض الدین احمد	میڈیا کا نیا ذوق	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۲۲
د علی شاد	قدیم عراق اور خلائی مخلوق	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۱۱
د حامد	مسلمانوں کی ہوا خیزی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۹
د قاسم محمود	روس کا خاتمہ بالخیر، تاریخ کے تناظر میں ایک تجزیہ	مطالعۂ پاکستان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۴۹
ں بدایونی	بدایوں کی تاریخی، سماجی، ثقافتی اور ادبی اہمیت	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۴۱
علی رضوی، پروفیسر	حادثۂ روس ایک تجزیہ	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۲۴
الرؤف خاں	کچھواہہ بھگونت داس والیٔ انبیر	معارف، اعظم گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۲۸
الماجد دریابادی	غذا اور انفرادی و قومی سیرت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۱۳
الحمید صدیقی، پروفیسر	حیدرآباد میں تہذیب اور کلچر	سب رس، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۱
ان احمد	تاریخ کی کہانی	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۵۰
م اعظمی، ڈاکٹر	کلچر، منجمد یا متحرک	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵
م محمود	کشمیر اور اس کی تاریخ	مطالعۂ پاکستان، کراچی کشمیر نمبر اپریل ۹۲ء ص ۷۔۹۸
ن الدین افضل گڑھی	طہماس نامہ مسکین	العلم، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۵۷
فتحپوری، علامہ	عورت اور سندلی زندگی	نگار، کراچی جون ۹۲ء ص ۴۔۷۸
مسعود	اودھ کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۹
ث رامن	نظامِ دکن کے جواہرات	مطالعۂ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۵۹
مد بلوچ، ڈاکٹر	انسانی چہروں کا ارتقاء	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۱۷

یخ، فن و ادب

. بدایونی، ڈاکٹر	بدایوں کا علمی و ادبی ماحول، ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۵
سدید، ڈاکٹر	اردو ادب کی کثرتِ تخلیق کا سال ۱۹۹۱ء	صریر، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵۹
سعید	پشتو افسانہ	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۸
محمد خاں، ڈاکٹر	مرثیہ خوانی کا کمال	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۴۸
عامد بیگ، ڈاکٹر	۱۹۳۲ء کا افسانوی صحن	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۴۵
عامد بیگ، ڈاکٹر	داستان نگاری کی روایت اور اردو افسانہ	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۲

فارسی زبان و ادب

خورشید بانو شمع	شاہنامہ فردوسی کے چند حقائق	العلم، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۴۵
شعین مقدم صفیاری، دکتر	اقبال را با عرفانی شناختم	اقبال، لاہور جولائی ۹۱ء ص ۷۵
کلیم سہسرامی، پروفیسر، ڈاکٹر	بنگال کی پہلی فارسی کتاب	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵۱
محمد مہدی ناصح	معیار ارزشہای انسانی از نظرگاہ اقبال	اقبال، لاہور جولائی ۹۱ء ص ۵
نور السعید اختر، ڈاکٹر	رمز الریاحین [۱]	معارف، اعظم گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۵

اردو زبان و ادب

آغا ناصر	اردو کیوں نافذ نہیں ہوتی	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۳
ابن الحسن	مرگئی وکٹوریہ سب لاؤ لشکر چھوڑ کر	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۲۶
احسان الحق، ڈاکٹر	اردو عربی کے تاریخی و تہذیبی روابط	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/ ۹۲ء ص ۳۶۹
احسن بٹ	ہماری سرکاری زبان	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۷
احمد سجاد، ڈاکٹر	اردو ادب اور جدید طرز احساس	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۳
احمد قاسم ہیرا	ماریشس میں اردو ڈراما	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۵
احمد رفاعی، ڈاکٹر	علاقائی زبانوں کے حوالے سے اردو اور سندھی کے لسانی روابط	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۴۱
اسلام نشتر	متحدہ جرمنی میں اردو، ڈاکٹر منیر الدین احمد سے ملاقات کی روشنی میں	اخبار اردو، اسلام آباد مئی ۹۲ء ص ۸
اسلم فرخی، ڈاکٹر	اردو کے نفاذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۲۳
اسماعیل سعد، ڈاکٹر	اردو زبان کا معیار، بطور ذریعۂ تعلیم	اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۹
الطاف رسول	اردو زبان کی ابتدا اور اس کا ارتقاء	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۲۶
امین راحت چغتائی	اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۵
انصار ناصری	عدم نفاذ اردو، چند خیالات	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۹
انعام الحق کوثر، ڈاکٹر	اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۰
انور رومان، پروفیسر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوتی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۴
ایاز امیر ترجمہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا	سرکاری سطح پر انگریزی زبان کی بالادستی	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۸
ایم ایچ عسکری	ماریشس میں اردو ترقی پذیر ہے	اخبار اردو، اسلام آباد اپریل ۹۲ء ص ۱۸
این اے بلوچ، ڈاکٹر	نفاذ اردو کی راہ میں حائل رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۸
بیگم اختر جمال	اردو نافذ کیوں نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۵۰
پریشان خٹک، پروفیسر	اردو کے نفاذ میں رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۲۱
جابر علی سید	شیلے کی فرہنگِ اصطلاحات ادبی کا اردو ترجمہ	اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۲ء ص ۹
جاوید اقبال، ڈاکٹر (جسٹس ریٹائرڈ)	اسلامی تہذیب کے فروغ میں اردو زبان کا حصہ	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۳
جمیل جالبی، ڈاکٹر	اردو کا تہذیبی، لسانی اور سماجی تناظر	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۱۴

(۱) شیخ محمد میرزا بادی رمزی کا فارسی دیوان رمز الریاحین یکے از مخطوطات مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی مشمولہ انجمن ترقی اردو پاکستان (فارسی و عربی) مرتبہ سرفراز

جمیل آذر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۳
جیلانی کامران، پروفیسر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۲
حبیب الحق ندوی	اردو بحیثیت تیسری بڑی زبان	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۶
خادم علی ہاشمی، پروفیسر	اردو کیوں نافذ نہیں ہوتی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۲
خالد محمود	ہماری اردو اور اردو کمپیوٹر	صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء ص ۶۹
رشید امجد	نفاذ اردو	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۲۹
رشید نثار، ڈاکٹر	اردو کے نفاذ میں حائل رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۱
رمضان مرزا، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۳
ریاض صدیقی، پروفیسر	اردو اور ہمارا رویہ	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۴۲
سلیم اختر، ڈاکٹر	پاکستان میں نفاذ اردو	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۱
سید حامد	اردو کا استحصال	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۹
سید حامد	ہندوستان میں اردو کا مستقبل	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۸
سید سبط حسن رضوی، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۲۰
شاہد اقبال، ڈاکٹر	بہار کی دانشگاہ میں اردو تحقیق ۲	اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۲ء ص ۱۵
شاہد اقبال، ڈاکٹر	بہار کی دانشگاہ میں اردو تحقیق (آخری قسط)	اخبار اردو، اسلام آباد اپریل ۹۲ء ص ۱۶
شفیق شاہد	قومی زبان کی حیثیت	اخبار اردو، اسلام آباد مئی ۹۲ء ص ۱۱
شمیم احمد	اردو کیوں؟ رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۸
صابر سنبھلی، ڈاکٹر	اشاریہ مضامین ہماری زبان بابت ۱۹۹۱ء (پہلی قسط)	ہماری زبان، دہلی ۱۵ جنوری ۹۲ء ص ۸
صابر گودڑ	ماریشس کا اردو ادب	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۲۹
صابر اکبر آبادی	اردو شاعروں کی تخریب	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۰۶
ضیاء الحق شیخ	اسلام، تعلیم اور قومی زبان	اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۷
عبدالرؤف قریشی قاری	اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم	اخبار اردو، اسلام آباد مئی ۹۲ء ص ۱۲
عطش درانی، ڈاکٹر	اردو زبان کی ترقی کا پیش منظر، انگریزی اور تراجم کے حوالے سے	اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۲ء ص ۶
عطش درانی، ڈاکٹر	اردو لسان الارض ہے، اردو کی تشکیل و تسمیہ کا جائزہ	قومی زبان، مارچ ۹۲ء ص ۳۳
عطش درانی، ڈاکٹر	اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۶
علی محمد خاں، ڈاکٹر	اردو کی مقبولیت کے اسباب	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۲۱
عنایت حسین عیدن	ماریشس میں اردو کی تعلیم	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۲۵
فاروق حسنو	ماریشس براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور اردو نشریات	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۳
فاطمہ وصیہ جائسی	زبان اردو	ہماری زبان، دہلی ۲۲ جنوری ۹۲ء ص ۸
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۹
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	اردو زبان کی خود مکتفیت	صریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ہماری لسانی شخصیت اور اس کی تصویر	صریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۵
گل حمید بیکن	ماریشس میں اردو	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۱۶

ترجمہ: مسعود احمد چیمہ

قومی زبان (۹۲) فروری ۱۹۹۳ء

گلزار احمد، بریگیڈیئر ریٹائرڈ	پاکستان میں اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۶
محسن احسان	نفاذ اردو بطور دفتری زبان	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۴۷
محمد اسلام نشتر	برطانیہ میں اردو، حسین اختر سعید سے انٹرویو کے حوالے سے	اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۲ء ص ۱۸
محمد اظہار الحق	اردو کے نفاذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۷
محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر	نفاذ اردو کا مسئلہ	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۵
محمد صلاح الدین	پاکستان میں اردو......؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۴
مریم گوورڈ ترجمہ: ڈاکٹر انعام الحق جاوید	ماریشس ریڈیو، ٹی وی اور اردو	اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۸
مسعود احمد چیمہ	اصطلاحات مردم شماری و مطالعہ آبادی	اخبار اردو، اسلام آباد اپریل ۹۲ء ص ۸
مصطفےٰ علی بریلوی	قومی زبان اور رسم الخط کی اہمیت و افادیت	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۴
منور ابن صادق، پروفیسر	اردو کی ابتدا کے متعلق نظریات کا جائزہ	اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۵
منور ابن صادق	اردو کیوں نافذ نہیں ہوئی؟	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۳۶
میاں محمد اقبال	اردو زبان دفتری	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۱
میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو ذریعۂ تعلیم کے حوالے سے	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۷
نور الحسن جعفری	اردو کے نفاذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۰
ولی حمزہ نازش	اردو شاعری اور فلکی اصطلاحات	صحیفہ، لاہور جنوری، مارچ ۹۲ء ص ۸۷
یاسین رضوان، ڈاکٹر	نفاذِ اردو کی راہ میں رکاوٹیں	اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۲ء ص ۱۹

حروف تازہ

دو سخنہ
(شاعری ۱۹۹۲ء)

آصف رضا، رضی مجتبیٰ

صفحات ۲۱۶ قیمت -/۶۰ روپے
فرید پبلشرز، روم نمبر ۷ نوشین سینٹر نیو اردو بازار کراچی ۱

تمہارا شہر کیسا ہے
(شاعری ۱۹۹۲ء)

نیلما سرور

صفحات ۱۲۸ قیمت -/۹۰ روپے
کلاسیک۔ ریگل دی مال۔ لاہور

سحر کب ہوگی
(افسانے ۱۹۹۲ء)

سرور بخاری

صفحات ۱۵۹ قیمت -/۹۰ روپے
کلاسیک، ریگل، دی مال لاہور

چھلنی کی پیاس حصہ دوم
(شاعری ۱۹۹۲ء)

محب عارفی

صفحات ۲۴۰ قیمت -/۱۰۰ روپے
۱۰۶۲-۱۰۶۱ بلاک نمبر ۸ فیڈرل بی ایریا کراچی ۷۵۹۵۰

لبید بہاول پوری
(شخصیت و شاعری ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

صفحات ۲۱۷ قیمت -/۷۵ روپے
اردو اکیڈمی بہاول پور

ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد پروفیسر جگن ناتھ آزاد
(اقبالیات ۱۹۹۱ء)

صفحات ۱۰۹ قیمت ۵۰/۰ روپے
مکتبۂ دانش مزنگ لاہور

غزلیاں میر حسن مرتبہ: پروفیسر مظفر حنفی
(انتخاب و مقدمہ ۱۹۹۱ء)

صفحات ۱۹۲ قیمت ۵۰/۰ روپے
اردو اکادمی دہلی، دریا گنج نئی دہلی ۲

تھل دریا محمد فیروز شاہ
(مضامین ۱۹۹۲ء)

صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۰۰/۰ روپے
تجدید اشاعت گھر اسلام آباد

نوائے پریشان جگن ناتھ آزاد
(شاعری ۱۹۹۲ء)

صفحات ۱۹۲ قیمت ۶۰/۰ روپے
مکتبہ علم و دانش مزنگ لاہور

انشائے ہاشمی مرتبہ جلیل قدوائی
(خطوط ۱۹۹۲ء)

صفحات ۹۴ قیمت ۳۰/۰ روپے
سی ۵/۱ کوزی ہومز، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

جریدے

ماہنامہ "ماہ نو"

چیف ایڈیٹر ثمینہ پرویز ایڈیٹر قاسم نقوی
صفحات ۹۶ قیمت ۷/۰ روپے فی شمارہ
۱۳۲- اے حبیب اللہ روڈ لاہور

ماہنامہ "چہار سو" (معہ گوشہ ادا جعفری) (دسمبر ۱۹۹۲ء)
مدیر اعلیٰ: سید ضمیر جعفری، مدیر مسئول: گلزار جاوید
صفحات ۸۶ قیمت ۱۸/۰ روپے فی شمارہ
۴۵۶۹۔ اے گوالمنڈی، راولپنڈی ۴۶۰۰۰

سہ ماہی "مفیض"
مدیر اعلیٰ: محمد اقبال نجمی
صفحات ۲۲۴ قیمت ۵۰/۰ روپے
فروغ ادب اکادمی۔ ۸۰۱ بی سٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

ماہنامہ بدایوں (معہ گوشہ مہتاب ظفر)
مدیر: سعید الدین فریدی
صفحات ۹۴ قیمت ۱۵/۰ روپے
۴۳۵/۱۱ بی نارتھ کراچی ۷۵۸۵۰

ماہنامہ حور
مدیر اعلیٰ: خولہ قریشی
صفحات ۱۰۴ قیمت ۱۲/۰ روپے
۱۔ بی۔ ۳۸ گلبرگ iii۔ لاہور

ماہنامہ عصمت ۸۴ واں سالگرہ نمبر
مدیران: آمنہ نازلی، طارق الخیری، صائمہ خیری
صفحات ۱۹۰ قیمت ۱۵/۰ روپے
الاکو ہاؤس کمپاؤنڈ، عبداللہ ہارون روڈ کراچی

نگار پاکستان عورت اور فنون لطیفہ نمبر سالنامہ ۱۹۹۲ء
مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری
صفحات ۲۳۹ قیمت ۳۰/۰ روپے
سی۔ ۲۸ بلاک ۱۳۔ ڈی گلشن اقبال کراچی

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
MPI

کراچی

ماہنامہ قومی زبان

مارچ ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۳

بدل اشتراک
فی پرچہ ——— ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹ - بلاک ۷ - گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰ - فون: ۴۶۱۴۰۶

مضمون نما

تصاویر	....	۳
تحقیقی مقالہ کس طرح لکھا جائے؟	ڈاکٹر سید عطاالرحیم	۷
یونیورسٹیوں میں تحقیق	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۳
مجاز: شخصیت اور شخصیت سے فرار	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۱۸
محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر محمد علی اثر	۲۵
آگ کا دریا - ایک جائزہ	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۳۱
کچھ اردو ڈرامے کے بارے میں	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۱
سعودی عرب میں اردو شعر و ادب	نعیم حامد علی	۴۵
گل ہائے رنگ رنگ		
چاند اور روٹی (سندھی کہانی)	علی بابا / رفیق احمد نقش	۵۵
شباب (انگریزی نظم)	سیموئل اُلمین / عبدالعزیز خالد	۵۹
بچھڑے ہوئے لوگ (ہندی نظم)	نوراج / ظہیر مشرقی	۶۰
نیاروگ (ازبکی کہانی)	عبداللہ کاخر / ستار طاہر	۶۱
رفتار ادب	....	۶۷
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۷۳
گرد و پیش	....	۷۹
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۵
گزشتہ سال جدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ	شمیم صبائی متھراوی	۸۹

قومی زبان (۲) مارچ ۱۹۹۳ء

ملک میں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام بہتر بنانے کی غرض سے وزیراعظم کی حوصلہ افزا اسکیم کے تحت حبیب بینک بسوں، منی بسوں ٹیکسیوں وغیرہ کی خریداری کے لئے ۱۵ فیصد مارک اپ پر فراخدلانہ قرضے پیش کر رہا ہے۔ یہ قرضے ٹیکسیوں کے لئے ۵ سال کی مدت میں اور بسوں، منی بسوں اور کوسٹرز وغیرہ کے لئے ، سال کی مدت میں حکومت کی اعلان کردہ آسان شرائط کے مطابق واجب الادا ہوں گے ۔

کراچی
ڈائریکٹر جنرل کمیونیکیشنز
زون III ، ۲۲۳ ، ای۔آئی کالینر
راجہ غضنفر علی روڈ
کراچی ۔۔۔ ۷۵۵۰۰ ۔ فون : ۵۱۲۱۹۷

لاہور
ڈائریکٹر جنرل کمیونیکیشنز
زون II ، ۱۲۵۸ اے ، اپر مال روڈ ، لاہور ۔
فون : ۸۷۵۹۱۷ ۔ ۸۷۵۲۲۹

اسلام آباد
ڈائریکٹر جنرل کمیونیکیشنز
زون I ، بلاک ، ڈی ، پاک سیکریٹیریٹ
اسلام آباد ۔ فون : ۲۱۰۷۳

سندھ
جناب شرافت علی
سینئر وائس پریذیڈنٹ اینڈ آر بی ایم
پروونشل ہیڈ کوارٹر سندھ
کراچی ۔ فون : ۵۳۱۰۶۳

پنجاب
جناب حبیب اے ۔ مرزا
ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ
۱۔ ایل ۔ ڈی اے پلازہ ، خلیفہ شجاع الدین روڈ
لاہور ۔ فون : ۶۳۰۵۶۱۱ ۔ ۳۰۵۶۱۱

صوبہ سرحد/آزاد کشمیر
جناب مسلم الحق
وائس پریذیڈنٹ
پروونشل ہیڈ کوارٹر ، صوبہ سرحد
پشاور ۔ فون : ۲۷۶۱۹۸

بلوچستان
جناب اکبر حسین خان
وائس پریذیڈنٹ اینڈ آر بی ایم
پروونشل ہیڈ کوارٹر ، بلوچستان ۔ کوئٹہ
فون : ۷۰۹۷۲

سندھ
بولٹن مارکیٹ ، کراچی
ایم ۔ اے جناح روڈ ، کراچی
صدر ، کراچی
نجلے ہاؤس ، کراچی
ناظم آباد ، کراچی
عیدگاہ ، کراچی
جہان گوٹھ ، کراچی
شہید ملت روڈ ، کراچی
اسٹیٹ لائف ، کراچی
کریم آباد ، کراچی
بہادر آباد ، کراچی
شاہراہ پاکستان ، کراچی
وسیم کالونی ، کراچی
یاسین آباد ، کراچی
دہلی مرکنٹائل سوسائٹی ، کراچی
اقبال شہر ، کراچی
ناظمی ، کراچی
سٹی اسٹیشن ، کراچی
شو مارکیٹ ، کراچی
اسٹیشن روڈ ، حیدرآباد
ڈسٹرکٹ کونسل بلڈنگ ، حیدرآباد
سمہ روڈ ، نواب شاہ
جناح روڈ ، میرپور خاص
فیروز روڈ ، سکھر
بندر روڈ ، لاڑکانہ

بلوچستان
جناح روڈ ، کوئٹہ
کچلاک ، کوئٹہ
سیٹلائٹ ٹاؤن ، کوئٹہ
لورالائی
ژوب
سبی
خضدار سٹی
تربت
پنجگور
پسنی
گوادر

پنجاب
دی مال ، لاہور
باداہی باغ ، لاہور
سرکلر روڈ ، لاہور
گلبرگ اسکوائر ، لاہور
لیک روڈ ، لاہور
داتا دربار ، لاہور
علامہ اقبال ٹاؤن ، لاہور
شادمان کالونی ، لاہور
ماڈل ٹاؤن ، لاہور
وحدت روڈ ، لاہور
چنیوٹ سنٹر ، لاہور
مرکز ، لاہور
ایف جے ایم سی ، لاہور
بالمقابل ہائی کورٹ ، لاہور
باغبانپورہ ، لاہور
ڈیوس روڈ ، لاہور
ایل ۔ ڈی ۔ اے ، لاہور
ایمپریس روڈ ، لاہور
واپڈا ہاؤس ، لاہور
مین مارکیٹ ، گلبرگ ، لاہور
جیل روڈ ، لاہور
کینٹ ، لاہور
کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی ، لاہور
ماڈل ٹاؤن ، گوجرانوالہ
جی ٹی روڈ ، گوجرانوالہ
گلشن آباد ، گوجرانوالہ
جی ۔ ٹی روڈ ، لالہ موسیٰ
شاہدرہ
جی ۔ ایم حافظ آباد
غریب پورہ ، گجرات
ریلوے روڈ ، شیخوپورہ
مین بازار ، وزیر آباد
سٹی ، سیالکوٹ
کینٹ ، سیالکوٹ
ریلوے روڈ ، نارووال
سمبڑیال روڈ ، ڈسکہ
چوک شاہدرہ ، جہلم
جی ۔ ٹی روڈ ، گوجرخان
ریلوے روڈ ، چکوال
منڈی بہاؤالدین
سول لائنز ، سرگودھا
ڈسٹرکٹ کورٹ ، جھنگ
بینک اسکوائر ، خوشاب
بینک اسٹریٹ ، میانوالی
کوک ٹاور ، فیصل آباد
ایف ڈی اے ، فیصل آباد
سرگودھا روڈ ، فیصل آباد
رسالے والا
پیر محل
آر آر کالج
ٹاؤن ہال
منڈی ہلاہ
شاہ کوٹ موڑ
ننکانہ صاحب
مین بازار ، ٹوبہ ٹیک سنگھ
گرین مارکیٹ ، جڑانوالہ
جناح چوک ، ساہیوال
صدر ، ساہیوال
منڈی روڈ ، اوکاڑہ
غلہ منڈی ، پاکپتن
جناح چوک ، خانیوال
ریلوے روڈ ، قصور
کینٹ ، ملتان
حسین آگاہی ، ملتان
ممتاز آباد
شجاع آباد
گلگشت کالونی
سی ایس ، خانیوال
میاں چنوں ، مین بازار
مین بازار ، ڈی جی خان
ریلوے روڈ ، مظفر گڑھ
چوہدری روڈ ، لیہ
علی پور
کوٹ ادو
فرید گیٹ ، بہاولپور
غلہ منڈی ، بہاولپور
تحصیل بازار ، بہاولنگر
بلدیہ روڈ ، حاصل پور
شاہی روڈ ، رحیم یار خان

صوبہ سرحد/آزاد کشمیر
راولپنڈی/اسلام آباد
سٹی ، پشاور
بینک اسکوائر ، پشاور سٹی
چوک یادگار ، پشاور سٹی
تاجپورہ ، پشاور کینٹ
شعبہ بازار ، پشاور
سٹی ، اٹک
بازار کلاں ، ڈی آئی خان
بنوں گیٹ ، بنوں
ہنگو روڈ ، کوہاٹ
صدر ، پشاور
تحصیل بازار ، چارسدہ
چترال
بینک روڈ ، مردان
اسپورٹس کمپلیکس ، صوابی
مین بازار ، ہری پور
جناح روڈ ، ایبٹ آباد
ایبٹ آباد روڈ ، مانسہرہ
بینک اسکوائر ، مینگورہ
تیمرگرہ
مین بازار ، مظفرآباد
باغ
بینک اسکوائر ، میرپور
چوہدری بلڈنگ ، کوٹلی
مین بازار ، راولاکوٹ
مین بازار ، بھمبر
نیا بازار ، اسکردو
صدر بازار ، گلگت
آبپارہ مارکیٹ ، اسلام آباد
بینک روڈ ، راولپنڈی
کمیٹی چوک ، راولپنڈی

قرضوں پر فوری کاروائی کے لئے ہماری تمام نامزد شاخوں کو اختیار دے دیا گیا ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ
پُرخلوص خدمت کی نصف صدی

manhattan/BBDO

PID (Islamabad)

قومی زبان (۳) مارچ ۱۹۹۳ء

مارچ ہماری ملی زندگی میں عہد کرنے اور عہد نبھانے کا مہینہ ہے، اسی مہینے کی ۲۳ تاریخ اب سے ۵۳ برس پہلے ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی صورت میں پاکستان بنانے کا عزم کیا گیا تھا۔ اور جب چھ سات برس بعد پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بابائے قوم حضرت قائد اعظم نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے کے ایک جلسۂ عام میں پوری قوم کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ "اردو اور صرف اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی" بابائے قوم کو اس جانب اقدام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ اسی سال انتقال فرما گئے۔ چنانچہ بابائے قوم کا یہ وعدہ پسِ پشت ڈال دیا گیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بعد کے اربابِ اقتدار قوم سے کیے گئے قائداعظم کے وعدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فوری اقدام کرتے کیوں کہ ان میں سے بیشتر افراد قیام پاکستان کی جدوجہد میں بابائے قوم کے دستِ راست رہ چکے تھے اور ان سب کو پتا تھا کہ بنگال سے سرحد تک پاکستان کے حصول کی تمام تر لڑائی اردو زبان میں لڑی گئی، لیکن بہ وجوہ ایسا نہ ہوسکا اور قومی زبان کے نفاذ کا معاملہ ٹلتا رہا۔

۱۹۷۳ء میں جب ملک کا آئین بنا تو اس میں اس بات کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ اور اس کا مکمل نفاذ اگست ۱۹۸۸ء تک کر دیا جائے گا اس ہدف کے پیش نظر نفاذ اردو کے سلسلے میں صوبائی سطح پر بالخصوص پنجاب میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی اور اب حکومت کی جانب سے قومی زبان کے نفاذ کی اس معیاد میں بھی مزید کئی سال کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ معیاد کا بڑھایا جانا اگر نیک نیتی پر مبنی ہو تو قوم مزید انتظار کھینچ سکتی ہے لیکن اس سے اگر "لیت ولعل" کا پہلو نکلتا ہو تو یقینی تشویش کی بات ہے خدا کرے قومی زبان کے نفاذ میں تاخیر در تاخیر میں کسی "لیت ولعل" کا دخل نہ ہو۔

وقت آگیا ہے کہ ملک کے اربابِ حل وعقد بلاتاخیر قومی زبان کو ہر سطح پر رائج کرنے کا اعلان کر کے ۱۹۷۳ء کے آئین کو سرخرو کریں۔

دائیں سے بائیں: آصف فرخی، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر عتیق احمد، جمیل الدین عالی (معتمد اعزازی انجمن)، ڈاکٹر اسلم فرخی، فردوس حیدر،
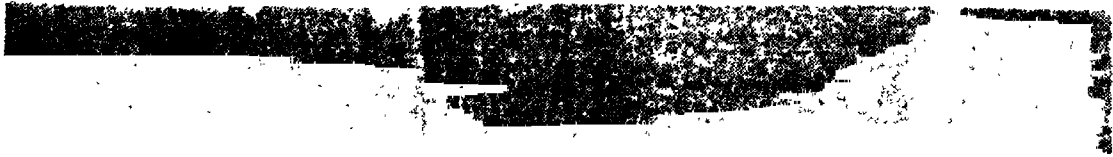
قومی زبان (۶) مارچ ۱۹۹۳ء

یو بی ایل میں

اپنے ڈپازٹ پر سب سے

زیادہ مُنافع حاصِل کیجئے۔

اب یو بی ایل پی ایل ایس ٹرم ڈپازٹ پر قومیائے ہوئے کمرشل بینکوں میں آپ کو سب سے زیادہ منافع پیش کرتا ہے۔

یو بی ایل آپ کو اعتماد دیتا ہے کہ آپ کی جمع شدہ رقم محفوظ ترین ہے۔ یو بی ایل کے اثاثے ۱۲۰ ارب روپے سے زائد کیپٹل اور محفوظ سرمایہ ۳ ارب روپے سے زائد ہیں۔ یو بی ایل کی کامیاب بینکاری کا تجربہ تقریباً ایک تہائی صدی کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی سہولت کے لئے ملک بھر میں ۱۶۵۰ سے زائد اور بیرون ملک ۲۸ مقامات پر برانچیں ہمہ وقت مصروفِ خدمت ہیں۔

قریب ترین یو بی ایل برانچ سے رجوع کیجئے۔

پی ایل ایس ٹرم ڈپازٹ کا [illegible]
(۳۰ جون ۱۹۹۲ [illegible])

۵ سال	۴ سال	۳ سال
۱۴٫۵۰ فیصد	۱۳٫۵۰ فیصد	۱۲٫۵۰ فیصد

۲ سال	۱ سال	۶ ماہ	۳ ماہ
۱۱٫۷۰ فیصد	۱۰٫۷۰ فیصد	۱۰٫۳۰ فیصد	۹٫۱۰ فیصد

یو بی ایل یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
– ترقی ہمارا شعار

UBL-3-92 ASIATIC
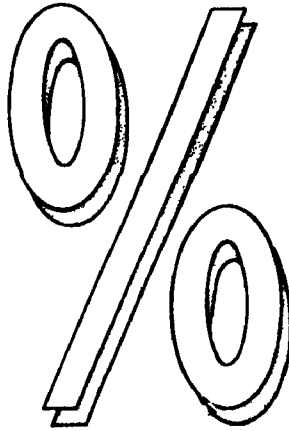
ڈاکٹر سید عطاء الرحیم

تحقیقی مقالہ کس طرح لکھا جائے؟

میرے مضمون کا تعلق پاکستان کی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے لیے لکھے جانے والے مقالات کی تکنیک سے ہے۔اس سلسلہ میں چونکہ مجھے تھوڑا بہت تجربہ ہے اس بنا پر چند گزارشات پیش کر رہا ہوں۔

ہمارے یہاں فنون میں لکھے جانے والے ڈاکٹریٹ کے مقالوں کا معیار بہت پست ہے۔ میں ان ہی کے تعلق سے بات کروں گا۔ اس میں اردو اور اسلامی کلچر کے مضامین کا ذکر ہوگا۔

سب سے پہلے تحقیقی مقالے کے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کر دوں۔

(ا) مقالے کی سب سے اہم چیز اس کے موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگر صحیح طور پر موضوع کا انتخاب ہو جائے تو گویا آدھا کام ہو گیا (یہ بات چھوٹے مضمون کے لیے بھی درست ہے) اس سلسلے میں ہمارے یہاں خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ اردو میں تحقیقی مقالات کے لیے جس قسم کے موضوعات منتخب کیے گئے اور جن پر ڈگریاں دی جا چکی ہیں وہ یہ ہیں۔

(I) اردو کی نثری داستانیں (II) اردو ناول کے بیس سال (III) اردو افسانے کا نفسیاتی تجزیہ، ان میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ پی ایچ ڈی کے مقالوں کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ ان پر کئی مقالات لکھے جا سکتے ہیں یا پھر ان پر کئی جلدوں میں کام ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں اسلامی کلچر کے ایک مقالے کا موضوع تھا "سرحد کا اسلامی ادب" میرا خیال ہے کہ یہ مقالہ وقت اور موضوع دونوں کا احاطہ نہ کر سکا ہوگا۔ اس پر کام کرنے والے کو ۷ برس لگ گئے۔ اس پر جو کام ہوا وہ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے زمانے کا تعین ضروری ہے۔ سرحد میں اسلامی ادب کے کتنے برسوں کی تاریخ۔ سو برس دو سو برس یا تین سو برسوں کا اسلامی ادب پھر کس زبان کا اسلامی ادب اردو، پشتو، فارسی، عربی، ہندکو وغیرہ۔ پتہ نہیں اس مقالے کی تیاری میں مقالہ نگار اور رہنما پروفیسر کو نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اس کے بعد بھی پاپڑ کیسے بیلے گئے۔ اچھے یا برے؟ سیدھے یا ٹیڑھے!

دوسری مثال میں اردو سے دوں گا ایک تحقیقی مقالہ "اردو افسانے کا نفسیاتی تجزیہ" میری نظر سے گزرا (چونکہ اس مقالے کا موضوع نفسیات سے متعلق تھا اس لیے اسے مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ ممتحن کی حیثیت سے نہیں۔ ویسے ہی) مجھے اسے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ ۸۰۰ صفحات پر مشتمل مقالہ حد درجہ بے ربط اور بے ترتیب تھا۔ اس میں اردو افسانے کا جیسا کچھ ذکر تھا اسے چھوڑیں کس میں تین ماہرین نفسیات فرائڈ، ینگ اور ایڈلر کا ذکر تھا۔ اس مقالے میں ماہرین نفسیات کے تصورات کا (مع ان کی زندگی کے حالات کے) مفصل ذکر تھا لیکن ان تینوں کے تصورات میں کسی باہمی تعلق کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان لوگوں کا الگ الگ ذکر تھا۔ پھر مقالے کے موضوع "افسانے کا نفسیاتی تجزیہ" کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ایک دو افسانہ نگار عصمت اور منٹو

کا ذکر تھا مقالے کا موضوع اس کا متقاضی تھا کہ اس میں یہ بتایا جاتا کہ ان ماہرین نفسیات نے ہمارے اردو کے افسانہ نگاروں کو کس طرح متاثر کیا اور ہمارے افسانہ نگاروں نے ان کے تصورات کو اپنے افسانوں میں کس طرح سمویا۔ پھر بھی ان صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی گئی۔

موضوع کے انتخاب سے متعلق میں ایک مثال مغربی یونیورسٹی کی پیش کروں گا۔ میرے ایک ساتھی غیاث الدین قریشی ۱۹۷۰-۷۱ء میں لیڈز یونیورسٹی میں انگریزی میں ایم اے کرنے گئے تھے۔ کورسز کے علاوہ ان کو ۵۰ صفحات کا ایک مقالہ بھی لکھنا تھا۔ انھوں نے ہیمنگ وے، کو منتخب کیا اور اس پر ۲۰۰ کتابوں کی ایک فہرست اپنے رہنما لکچرار کو پیش کی۔ وہ لکچرار ان سے عمر اور ڈیل ڈول میں آدھا تھا۔ اس نے اس فہرست پر ایک نظر ڈالی اور ان سے کہا "غیاث صاحب کیا آپ ان ۲۰۰ کتابوں کو اس وقت میں (یعنی ایک دو ماہ) جو آپ کے پاس ہے پڑھ سکیں گے اگر آپ نے ان سب کو پڑھ بھی لیا تو اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ اس میں مختلف لوگوں نے ہیمنگ وے پر مختلف انداز میں بحث کی ہے اس سے آپ الجھ جائیں گے کہ کس کی بات کو مانیں اور کس کی نہ مانیں؟ پھر آپ کو اپنے مقالے کے لیے موضوع کی تلاش کس طرح ممکن ہوگی؟ رہنما لکچرار نے ان کو مشورہ دیا کہ اس کتابیات کو الگ رکھ دیں (ہمارے محققین اور رہنما پروفیسر حضرات اسے نوٹ کر لیں) ہیمنگ وے پر دو تین بنیادی کتابیں لیں۔ ان کو پڑھیں۔ پھر ان میں سے کسی ایک موضوع کو چنیں، موضوع تلاش کرنے کے بعد ایسی کتابیں ڈھونڈیں جو اس مسئلہ سے بحث کرتی ہیں۔ پھر ان کو پڑھیں۔ ان میں اپنا نقطۂ نظر تلاش کریں اس موضوع کی تائید اور مخالفت میں جو کتابیں ملیں ان کو پڑھیں پھر اپنے مؤقف پر خوب غور کریں اور اس کے لیے دلائل تلاش کریں۔ اس طرح آپ کا مقالہ تیار ہو جائے گا۔ غیاث صاحب نے اس کی باتیں غور سے سنیں اور ان پر عمل کیا۔ انھوں نے ہیمنگ وے کے تقدیر (FATE) کے مسئلہ کو لیا اور اس پر اپنا مقالہ پیش کیا جو پسند کیا گیا۔

موضوع کے سلسلے میں اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ پی ایچ ڈی کے لیے میرا موضوع تھا "منطقی ایجابیت اور مابعد الطبیعیات" LOGICAL POSITIVISM AND METAPHYSICS اسے ہل یونیورسٹی (انگلستان) کے پروفیسر الن آر وائٹ نے منظور کر لیا تھا۔ جب میں ستمبر ۱۹۶۹ء میں HULL یونیورسٹی پہنچا تو پروفیسر نے پہلے ہی روز ایک گھنٹہ کا لیکچر دے ڈالا اور کہا کہ "تم کو ۶ ماہ اس موضوع کی راہ متعین کرنے میں لگیں گے۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ ۶ ماہ تک انھوں نے بہت سے مسائل پر پڑھنے کو کہا اس کے بعد مجھے پہلا باب لکھنے کو کہا۔ وہ باب بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی منطقی ایجابیت والوں نے مابعدالطبیعیات پر جس انداز میں تنقید کی تھی ان کا جواب دینا تھا۔ اس بنیادی باب سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے گئے اور مقالے نے ایک مربوط شکل اختیار کر لی۔

منطقی ایجابیت اور مابعد الطبیعیات بہت بڑا موضوع تھا۔ اس پر بہت سی جہتوں سے کام ہو سکتا تھا۔ لیکن پروفیسر نے اس بڑے موضوع کو ایک ذیلی موضوع میں بدل دیا یعنی منطقی ایجابیت والوں نے مابعد الطبیعیات پر جو تنقید کی تھی اس کا دفاع کرنا تھا اور ان کے اعتراضات کا مدلل جواب دینا تھا۔ اس میں مابعد الطبیعیات کی ایک نئی تعریف بھی مل گئی اور آخر میں ایک مابعد الطبیعیاتی مسئلہ (روح کی لافانیت) کو بھی پیش کیا گیا۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک بڑے موضوع کو کیسے ذیلی موضوع میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ پھر اس میں سے کسی ایک ذیلی موضوع پر پی ایچ ڈی کا کام کیا جاتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے بنیادی شرط ہے کہ یہ کام ایک بالکل نئے انداز میں کیا

جائے۔ اس میں کوئی نئی بات کہی جائے جو اہم اور وزنی ہو۔ اگر اس موضوع پر پہلے بھی کام ہوا ہے تو اس کی گنجائش رہتی ہے کہ اس میں اضافہ کیا جائے یا اسے بالکل نئے انداز میں پیش کیا جائے۔

(۲) ہمارے یہاں پی ایچ ڈی کے مقالے کی ضخامت کا تعین نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ شیطان کی آنت کی طرح ۶۰۰۔ ۸۰۰ صفحات تک پھیل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ضروری اور غیر ضروری مواد اس میں بھر دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں ۲۰۰/ ۲۵۰ صفحات سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک موضوع پر ان صفحات میں بہت معیاری کام ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں توجہ دینے کی ضرورت اور مقالے کی ضخامت کو متعین کرنا ضروری ہے۔

مقالے کے موضوع کے سلسلے میں میں نے جب اردو کے ایک استاد سے بات کی کہ آپ اتنے بڑے موضوع کیوں چنتے ہیں جن پر ایک نہیں کئی پی ایچ ڈی کے مقالے تیار کرائے جا سکتے ہیں تو انھوں نے اپنی دفاع میں کہا "اردو میں چونکہ بنیادی کام نہیں ہوا اس لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جاتے ہیں تاکہ بنیادی مواد جمع ہو جائے۔ اس کے بعد ہم ان کے ذیلی عنوانات پر کام کرائیں گے۔" میں نے کہا یہ طریقہ کار غلط ہے کیوں کہ بڑے موضوعات میں ایک سرسری سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ مواد بھی بالکل ادھوری سطح پر جمع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی بڑے موضوع کو ذیلی موضوعات میں تقسیم کیا جائے تو ان سے گہرائی اور گیرائی دونوں حاصل ہوں گے۔ پھر ایک موضوع جیسے "اردو ناول کے بیس سال" پر کام ہونے کے بعد کوئی ضروری نہیں سمجھتا ہے کہ اس کے کسی ذیلی موضوع پر کام کرے۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک ناول نگار پر الگ الگ کام ہو سکتا ہے۔

اردو کے سلسلے میں ہمارے یہاں ایک بڑی غلطی کی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ معاصر مشہور ادیبوں اور شعرا پر کام نہیں کیا جا رہا ہے۔ ان کی زندگی میں کام کرنے کے بجائے ان کی موت کا انتظار کیا جاتا ہے۔ حفیظ جالندھری، جوش، احسان دانش، فیض، منٹو وغیرہ پر اگر ان کی زندگی میں کام ہو جاتا تو بہت سا اہم، صحیح اور متعلق مواد ان کے توسط سے جمع ہو جاتا جو مستقبل میں لوگوں کے کام آتا۔ اب بھی ہمارے درمیان بڑے لوگ موجود ہیں جیسے پروفیسر احمد علی، احمد ندیم قاسمی جن پر کام ہو سکتا ہے۔ ہندوستان والے اس سلسلے میں ہم سے آگے ہیں ان کی یونیورسٹیوں میں بہت سے معاصر ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شعرا پر کام ہو چکا ہے۔ (جیسے فراق گورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) پاکستان کی یونیورسٹیوں کو اس سلسلے میں کوئی مثبت قدم اٹھانا چاہیے اور تحقیق کے لیے اگر کوئی اصول آڑے آئے (جیسے کسی ادیب کے مرنے کے ۵۰ سال بعد اس پر کام ہونا چاہیے) تو اسے بدل دینا چاہیے۔

ایک سب سے بڑی خامی ہمارے مقالہ نگاروں میں یہ ہے کہ ان کو لکھنے کا ڈھنگ نہیں آتا ہے نہ کوئی ان کو اس کی تربیت دیتا ہے۔ وہ ضروری اور غیر ضروری مواد میں تمیز نہیں کر سکتے ہیں۔ ایک موضوع پر انھیں جو کچھ مل جائے اسے بغیر کسی ترتیب یا نظام کے جمع کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مقالے کی ضخامت ۸۰۰ صفحات تک بڑھ جاتی ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کو کسی بھی صورت میں ۲۰۰/ ۲۵۰ صفحات سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ سائنس کے موضوعات میں یہ صفحات ۵۰/ ۱۰۰ تک ہو سکتے ہیں کیوں کہ وہاں کسی خاص نظریے پر کام ہوتا ہے اور اس کے لیے تجرباتی مواد مہیا کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے مولانا شبلی پر کام کیا۔ ان کا موضوع تھا "شبلی کا ذہنی ارتقا" انھوں نے شبلی کی حیات کو برسوں میں تقسیم کر دیا جیسے ذہنی ارتقا کا تعلق بھی سال بہ سال ہوتا ہے۔ ہر ہر سال میں انھوں نے جو کچھ کیا اور کہا ان سب کو جمع کر دیا اسے کسی نظام یا تصور کے تحت جمع نہیں کیا۔ پھر اگر ایک تقریر کا حوالہ دیا تو پوری تقریر لکھ دی حالانکہ اس تقریر میں چند جملے کام کے

ہوں گے نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقالے کی ضخامت بڑھ گئی لیکن اس کی افادیت گھٹ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے پی ایچ ڈی کے بہت کم مقالے چھپ سکے ہیں کیوں کہ اگر ان کو چھاپا جائے تو ان کی ضخامت کم کرنی ہوگی جو کام خود پی ایچ ڈی کا متقاضی ہوگا۔

میرے خیال میں اردو میں اس انداز پر کام ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص غالب کی نثر نگاری پر کام کرنا چاہے، یہ ایک موضوع بن سکتا ہے، لیکن اس میں سے ایک ذیلی موضوع غالب کی خطوط نویسی، ہو سکتا ہے اگر کوئی شخص اس کو پی ایچ ڈی کا موضوع بنائے تو اسے سب سے پہلے غالب کے خطوط کے مختلف مجموعوں کو جمع کرنا ہوگا اور ان کا مطالعہ کرنا ہوگا کون سا مجموعہ کس دور سے تعلق رکھتا ہے؟ خطوط کا جمع کرنے والا کون ہے اور اس کا غالب سے کیا تعلق رہا ہے؟ وہ خطوط کس ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں اور وہ غالب کی زندگی کی کس طرح عکاسی کرتے ہیں؟ اس میں کون کون سے واقعات ہیں جن کو خطوط لکھے گئے ہیں ان کا غالب سے کیا تعلق تھا؟ ان خطوط سے غالب کی شخصیت کا کون سا پہلو سامنے آتا ہے؟ اس دور کی معاشرتی زندگی کس حد تک ان خطوط میں منعکس ہوتی ہے۔ غالب کے انداز خطوط نویسی کا تجزیہ اور موازنہ دوسرے معاصرین سے کیا جا سکتا ہے۔ خطوط کے مختلف مجموعوں میں کیا کوئی ربط ہے؟ کہیں تضاد تو نہیں (مثلاً ایک واقعہ کو غالب نے مختلف انداز میں مختلف لوگوں کو لکھا ہے) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی جھلک ان خطوط میں کہاں تک ملتی ہے؟ کیا ان خطوط سے ان کی عظمت اور فکر کا اندازہ ہوتا ہے؟ کیا ان سے ان کی شاعری کا اندازہ ہوتا ہے؟ کیا ان کے خطوط نے اردو نثر کو متاثر کیا ہے؟ ان تمام مباحث کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس سے ایک اچھا مقالہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ صرف غالب کے خطوط پر ایک پی ایچ ڈی نہیں بلکہ بہت سے پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا سکتے ہیں کیوں کہ ان میں بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔

جہاں تک مقالے کی ہیئت FORM کا تعلق ہے اس کے لیے کتابیں ہیں جن سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم کتاب DESSERTATION FOR RESEARCH STUDENT BY KATE-B-PURABIAN UNIVERSITY PRESS CHICHGO

اس میں وہ تمام ضروری باتیں بتائی گئی ہیں جن کی مقالہ لکھتے وقت ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی مقالے کے موضوع کو مختلف ابواب میں کیسے تقسیم کیا جائے؟ حوالے کس طرح دیے جائیں؟ حوالوں میں صرف ضروری حصہ متن میں شامل ہو۔ باقی کو پاورقی FOOTNOTES میں دیا جائے۔ اقتباسات کس طرح دیے جائیں اور ان کو متن میں کس طرح لکھا جائے۔ مقالے کو مربوط شکل کس طرح دی جا سکتی ہے۔ ایک باب کو دوسرے باب سے اور ایک بحث کو دوسری بحث سے متعلق ہونا چاہیے۔ مقالے کا ایک ارتقائی عمل ہونا چاہیے آخر میں کتابیات کو کس طرح پیش کیا جائے۔

مقالے کے ماخذ تین ہوتے ہیں (I) بنیادی ماخذ (II) ثانوی ماخذ اور (III) دوسرے درجے کے ثانوی ماخذ۔ مقالے کی بنیاد بنیادی ماخذ پر رکھی جاتی ہے اور ثانوی ماخذ سے مدد لی جاتی ہے۔

مقالے کے لیے مواد جمع کرنا سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کو مختلف انداز میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک عام انداز تو کارڈ بنانا ہے جس میں کتاب اور مصنف کا نام، سن اشاعت اور شاعتی ادارے کا نام درج ہوتا ہے۔ مقالے کے مباحث اور ابواب کے تحت یہ مواد جمع کیا جاتا ہے۔ ہر مسئلہ کا ایک کارڈ بنایا جاتا ہے۔ اور ان مصنفوں اور کتابوں کو اس میں درج کیا جاتا ہے جو اس مسئلہ سے بحث کرتے ہیں۔ مصنف اور کتاب کے نام سے بھی کارڈ بنائے جا سکتے ہیں غرض جس قسم کی ضرورت ہو اس اعتبار سے کارڈ بنائے جا سکتے ہیں۔

دوسرے الگ الگ کاپیاں لے کر مقالے کے مختلف ابواب سے متعلق مواد جمع کیا جا سکتا ہے۔

مواد جمع کرنے کے لیے کتاب اور رسائل کا پڑھنا ضروری ہے۔ کتاب سے مواد جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب پر پہلے ایک سرسری نگاہ ڈالیں ان صفحات کو نوٹ کر لیں جن پر کام کا مواد موجود ہے۔ پھر ان اہم نکات کو بھی نوٹ کر لیں جو اس کتاب میں ملتے ہیں۔ جب آپ دوسری بار اس کتاب کو پڑھیں تب اس کے نوٹس لیں۔ خاص طور سے اگر آپ اس باب کو لکھ رہے ہیں تو یہ بہت ضروری ہے۔ جب کسی باب سے متعلق مواد جمع ہو جائے تو اس کو چھانٹیں اور ترتیب دیں۔ پھر مقالہ میں پیش کریں۔ کسی کتاب سے اگر کوئی اقتباس لیں تو بالکل صحیح طرح سے لیں اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی نہ کریں۔

مقالے کا موضوع ابتدا میں تو کچھ ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے کام بڑھتا ہے اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور اختتام پر بعض اوقات موضوع یکسر بدل جاتا ہے اور اختتام پر ہی مقالے کی حتمی صورت بنتی ہے۔ اس تبدیلی کا مکمل اختیار رہنما پروفیسر کو ہونا چاہیے ہمارے یہاں اعلیٰ تحقیقاتی کمیٹی بعض اوقات اس میں رخنہ ڈالتی ہے جو کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔

تحقیقی مقالے سے متعلق یہ چند گزارشات تھیں جو میں نے پیش کیں۔ ان سے اگر کسی کو فائدہ ہوتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

قومی زبان (۱۲) مارچ ۱۹۹۳ء

قومی زبان (۱۳) مارچ ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

یونیورسٹیوں میں تحقیق

خدا بخش پبلک اور نٹیل لائبریری پٹنہ، بر عظیم ہندو پاکستان کا ایک قدیم اور عظیم الشان کتب خانہ ہے، اور اب تو یہ علمی تحقیق کا ایک ایسا ادارہ بن چکا ہے جو کم از کم اردو ادب اور تحقیق و تنقید کے شعبے میں بر عظیم کی بہت سی جامعات سے بھی زیادہ وقیع اور ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کا سہ ماہی "جرنل" اردو کے چوٹی کے علمی مجلوں میں شمار ہوتا ہے علمی نوادر، غیر مطبوعہ خطوط، تصاویر، نایاب کتابوں اور دستاویزات کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی وساطت سے سامنے آیا ہے۔ یہ ادارہ متعدد قومی اور بین الاقوامی اجتماعات بھی منعقد کرا چکا ہے ان سب کاموں میں لائبریری کے بیدار مغز ڈائریکٹر ڈاکٹر عابد رضا کی مساعی کو بہت دخل ہے۔ اب انھوں نے پٹنہ ہی سے ادارہ تحقیقات اردو کے زیر اہتمام "معیار و تحقیق" کے نام سے ایک نیا تحقیقی و علمی مجلہ جاری کیا ہے، جس کا دوسرا شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

پیش گفتار میں بیدار صاحب نے بتایا ہے کہ ادارے نے قاضی عبدالودود کی یاد میں جس 'اردو ریسرچ کانگریس' کی بنا ڈالی، اس میں ہر سال یونیورسٹیوں کے اردو تحقیقی مقالوں کے جائزے کی بھی ایک طرح ڈالی گئی۔ دو تین سال میں اس طرح کے جو جائزے تیار ہوئے، انھیں زیر نظر مجموعے کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارے نے پچپن تحقیقی مقالوں پر نامور محققوں اور جامعات کے اساتذہ سے جائزے لکھوائے۔ پھر یہ جائزے متعلقہ مقالہ نگاروں کو بھجوا کر، ان کے جوابات بھی ساتھ ہی ساتھ شائع کر دیے گئے ہیں۔ کچھ جائزے بہت کاوش و محنت سے تحریر کیے گئے ہیں۔ مثلاً پروفیسر عتیق احمد صدیقی کے مقالے "قصائد سودا" کا جائزہ از ڈاکٹر محمد انصار اللہ (۵۶ ص) ڈاکٹر محمد زمان آزردہ کے مقالے" مرزا سلامت علی دبیر، حیات اور کارنامے" کا جائزہ از ڈاکٹر ذکیہ جیلانی (۳۷/۲ ص) ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے مقالے" حضرت شاہ اکبر داناپوری" کا جائزہ از شمیم منعمی (۹۰ص) ڈاکٹر عابد پشاوری کے مقالے "انشاء اللہ خاں انشاء" کا جائزہ از ڈاکٹر گیان چند (۱۴ص) وغیرہ...... اس کے برعکس بعض جائزے بہت مختصر اور سرسری ہیں۔ محض خانہ پری ..... بعض جائزوں میں تحقیق ہے نہ تنقید، محض تعارف...... ان جائزوں کے جواب میں بعض مقالہ نگاروں نے تو بالکل چپ سادھ لی اور باوجود بار بار کی یاددہانیوں کے، بے نیازانہ خاموشی روا رکھی۔ ایک صاحب نے اپنے مقالے پر ۵۸ صفحاتی جائزے کے جواب میں صرف یہ لکھا: "میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا، اور یہی مکرر عرض ہے۔" (ص ۱۲۱) ...... بعض تحقیق کاروں نے جائزہ نویس کی گرفت کو "منفی تنقید" قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں "نیک نیتی کو ہرگز ہرگز دخل نہیں" (ص ۴۱۵) بلاشبہ بعض جائزوں میں "منفی تنقید" کے جراثیم بھی نظر آئے ہیں یا کم از کم جائزہ نگار کے انداز سے، اس کی نیک نیتی مشکوک

ہوجاتی ہے (جیسے: عنوان چشتی کا جائزہ) ...... ایک صاحب نے جائزہ نگار کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھیں بار بار "عزیزی سلمہ" کہہ کر اپنی بزرگی کا احساس دلایا ہے۔ ایک صاحب نے کسی اعتراض کا جواب تو دیا نہیں مگر تنبیہ کی ہے کہ مستقبل میں ایسے تبصروں سے احتراز کریں ورنہ علم و تحقیق سے انصاف نہیں ہوگا (ص ۷۲۵) بعض بزرگوں نے اپنے اوپر تنقید کا بہت برا مانتے ہوئے شدید ردِ عمل ظاہر کیا ہے، مثلاً ایک صاحب نے جائزہ نگار کے لیے یہ شعر ارسال کرتے ہوئے، امید ظاہر کی ہے کہ ایڈیٹر، جائزے کے ساتھ اس شعر کو "ضرور شائع فرمائیں گے" (ص ۱۲۷)۔

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکّب، ابدالدّہر بساند

ایک اور بزرگ نے اپنی کتاب (ان کا مقالہ کئی بار چھپ چکا ہے) پر تبصرے کو ناپسند کرتے ہوئے کہا ہے کہ مبصر کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں۔ انھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو ہدایات دیں کہ اس طرح نہیں، اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔ یہ کتاب نصف صدی سے بار بار چھپ رہی ہے اور کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ آخر میں انھوں نے ازراہ تعجب یہ سوال کیا ہے کہ ریسرچ کانگریس نے یہ تبصرہ اپنے اجلاس میں پڑھنے کی اجازت کیوں دی؟ (ص ۴۷۷) ایک اور صاحب نے اپنے مبصّر کے "طفلانہ اعتراضات" کا دفاع ان الفاظ پر ختم کیا ہے: "اگر زبان اور ادب پر کچھ کام کرنا ہے تو بے علمی، بہتان تراشی، بددیانتی اور خفیف الحرکاتی کو ترک کرنا ہوگا" (ص ۶۱۷) مگر بعضوں نے بڑی فراخ دلی سے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا ہے، جیسے: "یہ ایک پردہ نشین خاتون ہوں، کالج میں پڑھاتی ہوں اور بے حد گھریلو ذمہ داریاں ہیں اس لیے یہ میرے لیے مختلف شہروں میں جاکر اپنے مقالہ "کلب حسین خاں نادر۔ حیات اور کارنامے" کے لیے مواد فراہم کرنا مشکل تھا" (ص ۵۸۸) ڈاکٹر گیان چند تو اپنی ایک ایسی "فاحش غلطی" ریکارڈ پر لے آئے ہیں، جو ان کے مبصّر کی نظروں سے بھی اوجھل رہی تھی (ص ۲۰۰) کھلے دل سے اپنی غلطی کے اعتراف سے انسان کی عظمت اور وقار میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے (مگر یہ بات کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے) بحیثیت مجموعی کئی حضرات (ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ) نے بڑے تحمل، حوصلے اور توازن سے جوابات دیے ہیں۔

آخر میں مجموعی جائزوں کی صورت میں تین مضامین اوّل: اردو ناول پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالے از ڈاکٹر ہارون ایوب (یہ بہت سرسری اور تشنہ ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کے تحقیقی مقالے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے: "صحیح معنوں میں تحقیق کا حق ادا کردیا ہے" (ص ۷۸۱) سبحان اللہ، یہ حق تحقیق ادا کرنا بھی کیسا سہل کام ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے ممنون دہلوی کا دیوان مرتب کرکے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے (ص ۶۴) فاعتبروا یا اولی الابصار دوم:) سودا کے کلام پر تحقیق از فرخ جلالی ...... سوم: "یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی رفتار" کا جائزہ از ڈاکٹر کلیم الحق قریشی .... اس میں بعض باتیں توجہ اور غور کے لائق ہیں، مثلاً: یونیورسٹیوں کے مقالوں کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو سوائے چند اور بہت کم مقالوں کے، باقی تمام مقالے ایسے ہوں گے، جو "تحقیق" کی عبرت ناک مثال ہوں (ص ۷۹۹) زندہ لوگوں پر تحقیقی کام ہرگز نہ کیا جائے (ص ۸۰۱) بقول مالک رام: "ایمان داری کی بات یہ ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں کوئی خاص تحقیقی کام ہوا ہی نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نہایت مایوس کن ہے" (ص ۸۰۳) اور سوال یہ ہے کہ اب تک کسی یونیورسٹی میں کسی مقالہ نگار کا مقالہ مسترد بھی ہوا ہے؟ (ص ۸۰۴) وغیرہ.....

یہاں ایک تصحیح ضروری ہے .... ہندوستان میں اردو ادب سے متعلق پی ایچ ڈی ڈگری کی پہلی سند ۱۹۳۱ء میں کلکتہ

یونیورسٹی سے موہن سنگھ دیوانہ کو تفویض ہوئی ان کا موضوع تھا:

CHARACTERISTICS AND TENDENCIES OF MODERN URDU POETRY ۱۸۶۷ TO ۱۹۲۵ء

(رام لال نابھوی، ہماری زبان دہلی ۸ اگست ۱۹۸۴ء، بحوالہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲، ۲۳)..... ڈاکٹر محمد صادق کی سند پہلی نہیں دوسری ہے۔ مزید برآں ان کے اصل مقالے کا عنوان:

MOHAMMAD HUSSAIN AZAD HIS LIFE AND WORKS

بعد ازاں اسے بہت سی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اردو میں بھی شائع کیا گیا۔

"معیار و تحقیق" کے اس شمارے میں جن ۵۵ مقالوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں سے صرف ۲ کا تعلق پاکستانی جامعات سے ہے اس طرح بنیادی طور پر یہ بھارت میں اردو کی ادبی و لسانی تحقیق کا جائزہ ہے۔ ادارے نے اس کی تلافی کی ایک صورت یہ نکالی ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ایک فہرست اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ایک جائزے کی بنیاد پر پاکستان میں اردو تحقیق کا ایک موضوع وار اشاریہ مرتب کر دیا ہے، جس سے (فہرست کی حد تک) پاکستان (کی جامعات و بیرونِ جامعات) میں ہونے والے تحقیقی کاموں کی نوعیت اور موضوعات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

اردو تحقیق کا یہ جائزہ اپنی نوعیت میں بالکل نئی چیز ہے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ اور (ایک لحاظ سے عبرت ناک) منظر نامہ ہے جسے جامعات کے اساتذہ، تحقیق کے ذمہ داروں اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے ادب دوستوں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ نئے تحقیق کاروں کو بھی اس جائزے سے اندازہ ہوگا کہ راہِ تحقیق کے نشیب و فراز کیا ہیں؟ اور اس راستے کے دو چار بہت سخت مقامات سے گزرنے میں کیا کیا احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار (اور ان کے رفقاء) اردو ریسرچ کانگریس کے انعقاد، اور اس سے متعلق لوازمے (مواد) کی فراہمی اور زیر نظر شمارے کی صورت میں اس کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اردو ادب اور تحقیق کے حوالے سے، انھوں نے یقیناً ایک بڑا اور اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

قومی زبان (۱۶) مارچ ۱۹۹۳ء

NIT

ایک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا

۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر

۲٫۲۵ روپے

فی یونٹ منافع کا اعلان

اپنے یونٹ یافتگان میں ۳٫ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔

سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔

یونٹ داروں کے لیے فوائد

سال خریداری	آغاز سال پر قیمت	منافع	گزشتہ قیمت پر اضافہ	کل یافت	فی صد
۱۹۹۱	۱۲٫۵۰	۲٫۲۵	۰٫۵۰	۲٫۷۵	۲۲٪
۱۹۹۰	۱۲٫۲۰	۲٫۲۵	۰٫۸۰	۳٫۰۵	۲۵٪

۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت خریدکردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ

صدر دفتر:

شاخیں:

United

PID-1-7/92

قومی زبان (۱۷) مارچ ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مجاز۔ شخصیت اور شخصیت سے فرار

مجاز بیسویں صدی کی جس دہائی میں پیدا ہوئے اس نے اردو کو متعدد اہم نام دیے ہیں سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری، اخترالایمان، فارغ بخاری، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، جذبی، فیض، راشد، میراجی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔ یہ عشرہ برصغیر کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں بھی اہم مقام رکھتا ہے یہ عشرہ ایک طرف سوویت یونین کے انقلاب کا عشرہ ہے اور دوسری طرف ہندو مسلم سیاست کے اتحاد کا عشرہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مجاز کی شاعری کے بارے میں اردو ادب کے تمام اہم ناقدوں نے اپنی گراں قدر آرا پیش کی ہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق، فیض احمد فیض، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، مجتبیٰ حسین، اسلوب احمد انصاری، خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر قمر رئیس، قاضی عبدالستار، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر آغا سہیل کے علاوہ متعدد نقادان فن میں سے بیشتر نے مجاز کو رومانی شاعر قرار دیا ہے۔ اگر رومان کلاسیکی مواد کے خلاف بغاوت کا نام ہے تو مجاز یقینی طور پر یورپی معنوں میں رومانوی شاعر ہے لیکن اگر رومانوی سے مراد نئی شعری "زبان" کی تخلیق ہے اور کلاسیکی شاعری کی ضد تو مجاز ایک روایتی شاعر ہیں اس طرح مجاز فیض احمد فیض کے اہم ترین وصف، روایتی لب و لہجہ میں نئے عہد کے روایت شکن خیالات پیش کرنے والے ایک کامیاب ہم عصر بھی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ فیض احمد فیض نے کراچی میں منعقدہ یوم مجاز (غالباً ۱۹۸۲) میں کہا تھا کہ مجاز ہی نے ہمیں یہ سکھایا تھا کہ انقلاب کو کس طور نغمہ بنایا جاسکتا ہے۔"

مجاز کا بنیادی کام انقلاب کی نغمہ گری ہے اور اس کام کے لیے انھیں جو عہد ملا وہ مجاز کے دوسرے ہم عصروں کی طرح بڑا لمحہ ہیجان تھا ۱۹۲۹ء میں بین الاقوامی معیشت جس خطرناک بحران کی شکار ہوئی تھی اسے پہلی بار دنیا کے ایک ملک کی دوسرے ملک کے ساتھ معاشی اشتراک کی ناگزیزیت کو محسوس کروایا تھا۔ خود ہمارے برصغیر میں مجاز کی پیدائش (۱۹۱۱) سے لے کر مجاز کے پہلے شعر (۱۹۲۹)

حسن کو بے حجاب، ہونا تھا
شوق کو کامیاب، ہونا تھا

تک کیا کچھ نہ ہو چکا تھا مجاز جب پیدا ہوئے تھے تو وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں دلی اور لکھنؤ کو اجڑتے دیکھا تھا۔ داغ و امیر کی شام دہلی، لکھنؤ رام پور کے ساتھ اقبال کی صبح لاہور کا منظر کچھ عجب عجب سا تھا ریشمی رومال کی تحریک، ہوم رول، شدھی سنگھٹن، روسی انقلاب ۱۹۱۷ء، خلافت تحریک کا بڑھتا ہوا شور جہاں برصغیر کی "بیداری" کا سبب بنا تھا وہ برصغیر کے بہ

جتی سماجی، معاشی و سیاسی مسائل بھی سامنے لاتا تھا۔

انگریزوں نے برصغیر کی جس انتظامی وحدت کی بنیاد ڈالی تھی وہ وحدت جذباتی سطح پر قابل قبول ہو چکنے کے باوجود جس نوع کے مسائل کو جنم دے رہی تھی وہ ہندوستانی قیادت بلکہ قیادتوں کی نکتہ رسی سے بالاتر نظر آتے تھے۔

روسی انقلاب، جنگ عظیم اوّل کے خاتمے اور خود برطانیہ میں لیبر حکومت کے قیام نے مجاز جیسے فطری طور پر رومانوی اور ترقی پسند کے ذہن میں زبردست تموج پیدا کیا اور انہوں نے یہ سمجھا کہ جیسے دنیا سکڑ کر اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں آچکی ہے۔ ایک زیرک نوجوان، آدرشوں میں پلا ہوا، انسانوں کی آزادی اور بین الاقوامیت کے خواب دیکھنے والا یہ سمجھا کہ غالباً وہ حیرتوں اور رازوں سے بھری دنیا کے بے کاشف اسرار بن کر آیا ہے اور یہ وہ لمہ ہے جبکہ وہ نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا بھر کو نجات دلانے والا ہے۔

مجاز نے اپنی عہد کی شکست وریخت، جس کی چاپیں لندن، پیرس اور نیویارک بلکہ نخاس تک آپہنچی تھیں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ اس نے روایتی غزل کے رس پر ریجھنے والے جوان کی دنیا ہی بدل ڈالی اردو شاعری نے اس صدی میں مجاز سے زیادہ نغمہ ریز ہر دلعزیز اور "خالص" شاعر پیدا نہیں کیا۔ اگر وہ اپنے جوش اور فکری بہاؤ کی تہذیب کر سکتے تو وہ اللہ اعلیٰ اردو شاعری کو کیا کچھ اور دے جاتے لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں پوری دنیا کی اتھل پتھل کو جس طرح سمجھا ہے وہ انھی کا حصہ ہے میرا خیال ہے کہ وہ انتہائی سیمابی وقت کی مناسبت سے انتہائی سیمابی لیکن تہذیبِ نغمہ کے ایک مخصوص CADENCE کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔

مجاز کا ذہن جس قدر پُرسکون نظر آتا ہے ان کی شاعری اسی قدر بے چین نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بہت خوبصورت جمالیاتی مساواتیں پیش کی ہیں۔ ان کی بعض نظمیں طوفانی دریا کی طرح بہتی ہیں جب کہ ان کی غزل ایک مدہم دریا کی اس روانی سے مشابہہ ہے جو ڈیلٹائی علاقہ سے مخصوص ہوتی ہے۔ مجاز کی نظم کا مزاج اور غزل کی مانوس تہذیب کا تقابلی مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نظم مجاز کی فکر، شعوری انتخاب اور PERSONA اور غزل ان کا تہذیبی وجود ہے اور یہی وہ کشمکش ہے جو مجاز کا طرۂ امتیاز ہے۔

"رات اور ریل" مجاز کی اہم نظم ہے مجاز نے اندھیری رات کے پس منظر میں روشنی اور تحرک کو جس طرح "محبوب دلنواز" بنایا ہے وہ ایک زیرک شاعر ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ شروع میں ریل ایک اکڑ بدمست نوجوان کی طرح ہے۔ "سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی، پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی، دامنِ موج ہوا میں پھول برساتی ہوئی، لیکن وہ علامت کے طور پر نمویاتی ہے اور اپنے تیور بدلتی ہوئی، رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی، غیض کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی۔" آگے بڑھتی ہے اور پھر نظم کا وہ موڑ آجاتا ہے جہاں ریل خود زندگی سے عبارت ہو جاتی ہے۔

دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی،
حال و مستقبل کا دلکش خواب دکھلاتی ہوئی،
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی،
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

اور پھر معاملہ عظمت انسانیت کے نغمے گانے تک آتا ہے اور ریل خود مجاز کی طرح شاعر آتش نفس بن جاتی ہے۔ اس نظم

میں مجاز نے رہل کو جمود و روایت شکن قرار دے کر پیار کیا ہے اور متعدد نقادوں نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ مجاز نے اپنے عہد کے تاریخی تقاضوں کی روشنی میں اپنی نظم کے لیے گھن گرج کے ساتھ نغمگی کے لہجے کا انتخاب کیا ہے وہ بالآخر نظم کے آخری شعر میں خود کو شاعر آتش نفس کہتا ہے جب کہ وہ اس نظم کے شروع میں ایک ایک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی، ایک مہربان صدا تھی، اس نظم کی شان بھی یہ ہے کہ یہ رفعت کہسار سے میدان میں آتی ہوئی شاعری کی طرف واضح اشارہ ہے اور یہ وہ موڑ ہے جب ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود شاعر نے رفعت کہسار اور میدان کا فرق قائم کر دیا ہے۔ "میدان" میں قدم رکھتے ہی رہل روایت شکن اور اندھیرے چیرنے والی روشنی بن جاتی ہے اب یہ جلال ہی جلال ہے، جلال کے ساتھ رفتار ہے اور رفتار کے ساتھ تبدیلی کا ناگزیر علم۔ لیکن اس پہلو کا شاعر جب تک "کہستانی" منزل میں تھا یا کہستانی منزل میں قیام فرما ہوا کرتا تھا تو اس کی غزلیات فانی بدایونی کے بجائے جن سے مجاز کا رشتہ تلمذ بھی تھا جگر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ملتی ہیں:

کمال عشق ہوں دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

تمھیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

(۱۹۳۱ء)

ہم نشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے

حسن کو نا حق پریشاں کر دیا
اے جنوں یہ بھی کوئی انداز ہے

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آواز شکستِ ساز ہے

ارباب جنوں پر فرقت میں
اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سواد الفت میں
کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے
اے شوق نظارا کیا کہیے
نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں

اے ذوقِ تصور کیا کیجیے
ہم صورتِ جاناں بھول گئے

جوانی اور یوں گِھر جائے طوفانِ حوادث میں
خدا رکھے، ابھی تو بے خودی کا دور ہے ساقی

مجاز کی جوانی "طوفانِ حوادث" میں گھری ہوئی تھی مجاز کی پوری نسل ہی طوفانِ حوادث میں گھری ہوئی تھی۔ برصغیر کو مجاز کی جوانی ہی میں پہلی بار بین الاقوامیت کی ناگزیریت کا احساس ہوا تھا۔ برصغیر اس احساس پر پریشان بھی تھا اور حیرت زدہ بھی، مجاز نے اپنی شاعری میں اس تحیّر اور وحشت کو یکجا کر دیا تھا جو ایک دل نازک پر وارد ہوا تھا۔ عجیب بات ہے کہ عین اس ہنگام میں جب مجاز "رات اور ریل" اور "انقلاب" جیسی نظمیں لکھ رہا تھا اور خود کو طوفانِ حوادث میں گھرا سمجھ رہا تھا۔ وہ اس قسم کے اشعار بھی کہہ رہا تھا:

ابھی رہنے دے دل میں شوق شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبت کا جنونِ خام رہنے دے

ابھی رہنے دے کچھ دن لطفِ نغمہ مستیٔ صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے، ابھی یہ جام رہنے دے

(۱۹۳۴ء)

اسی وقت وہ انقلاب میں اس نوع کی سطر بھی لکھ رہا تھا:

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مجاز کے حقیقی وجود جس کا اظہار غزل میں بطور خاص ہوا ہے نظم میں آتے آتے شعوری ہو جاتا ہے اور وہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں چھلانگ لگاتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی نہیں چوکتے جس کے بعد ہی وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خون
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

(۱۹۳۳ء)

ندھیری رات کا مسافر" میں:

جنوں کی فتنہ خیزی، حسن کی خونیں ادائیں ہیں

نظم "نوجوان سے" میں بھی اقبال کے رنگ میں کہتے ہیں:

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر

(۱۹۳۷ء)

آپ نے اندازہ لگایا کہ مجاز کے ہاں ا، ب، س، ش، ح، ج، خ، ف اور ق کی آوازوں کا وفور ہے اصوات کی تقسیم کا احساس، رخوشی اور سرمستی کے حق میں خلقی جھکاؤ کا درجہ رکھتی ہے، مجاز نے ان آوازوں سے نادانستہ طور پر بھرپور کام لیا ہے اور یہی وہ میدانی "لہجہ ہے جو کہستانی لہجہ کی ضد ہے لیکن مجاز ان اضداد پر حاوی نظر آتے ہیں، ان کی فکر غیر منقسم ہے لیکن ان کا بنیادی لہجہ پنے اصلی وجود کا غماز ہے جس کا اظہار غزل کے ذریعہ ہوا ہے۔ نظم جو زیادہ منضبط اور شعوری فکر سے عبارت ہے اپنے دامن میں عصر حاضر کی حشر سامانیوں کو پناہ دیے ہوئے ہے اور ایک طرح سے مجاز کا PERSIMA ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مجاز شبنم و شعلہ کا ایک سین امتزاج ہے جو "آہنگ"، "شب تار" اور "سازِ نو" میں سمٹ آیا ہے۔

"آہنگ" کے ایک حصے کا انتساب فیض اور جذبی کے نام ہے جو ایک طرح سے شیریں ذہنی ہی کے حق میں کلمۂ خیر ہے یہ ونوں مجاز کے "دل و جگر ہیں۔"

دوسرا حصہ سردار اور مخدوم کے نام ہے جو مجاز کے بقول اُن کے "دست و بازو" ہیں۔ دل و جگر اور دست و بازو کی علامتوں کا شعوری انتخاب بھی بہت اہم ہے۔

"شب تار" کا انتساب عصمت چغتائی کے نام ہے اور اس طرح مجاز کی کائنات کی اہم شخصیات سامنے آجاتی ہیں - ان شخصیات میں صرف جذبی اور علی سردار جعفری موجود ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ حضرات بھی شبنم و شعلہ اور نغمۂ انقلاب کے مصداق ہیں۔

مجاز کی شاعری ان کی زندگی کے دنوں کی طرح مقدار میں کم رہی لیکن یہ شاعری اپنے وقت کی رجحان ساز شاعری کے بعض اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہے۔ جو روح عصر میں سانس لیتے ہوئے ملتے ہیں۔ فیض نے مجاز کو "مطرب انقلاب" بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز فیض کی نظر میں بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہیں لیکن ان کے خیال میں مجاز کی غنائیت عام غنائی شعرا سے مختلف ہے مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے۔ مجاز بامعنی زندگی کے نشہ سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے۔ سجاد ظہیر کے لیے مجاز کی شاعری آہنگِ انسانیت کی بازگشت ہے۔ آل احمد سرور نے کہا ہے کہ مجاز کے پاس زندگی اور ادب کا ایک خاصا واضح تصور تھا وہ بڑے حسین خواب دیکھتا تھا، بعض بڑے حقائق کا بھی اسے احساس تھا مگر خوابوں کے اس رسیا کو جب حقائق نے چور چور کر دیا تو اس نے پلٹ کر کوئی وار نہیں کیا، خاموشی سے سپر ڈال دی،

سرور نے اسی بنیاد پر مجاز کو شہید رومانیت کہا۔

سیّد احتشام حسین نے بھی مجاز کے بارے میں بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ مجاز رومان سے انقلاب کی طرف آئے ان کی رومانیت میں سماج سے کٹ جانے، اپنی ذاتی مسرتوں میں کھو جانے اور ایک خیالی جنت بنالینے کی خواہش نہیں ملتی "آوارہ" صرف مجاز کی نمائندہ نظم نہیں "ہر رومانی بغاوت، حسّاس تفکر پسند اور مضطرب نوجوان کے تصورات کی آئینہ دار اور نمائندگی کرتی ہے۔" ممتاز حسین نے مجاز کو انقلاب کا صرف راہی نہیں بلکہ انقلاب کا رہبر قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ "حالی کے زمانہ سے لے کر دورِ حاضر تک ہماری قومی و ملی شاعری کے معتد بہ حصہ میں جو ایک قسم کی اکتا دینے والی خطابت پیدا ہو گئی تھی مجاز اس رجحان کا ایک شاعرانہ ردِ عمل تھا۔"

علی سردار جعفری نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ مجاز کی سیاسی و سماجی نظموں میں بھی ترنم ہے نغمگی ہے، مجاز کے لیے انسان سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ مقصد چیز ہے۔ میں نے اردو کے چند اہم اور مستند ادباء اور نقادوں کی آراء مشتے از نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں میرا خیال ہے کہ مجاز کے یہاں سب ہی نقادوں نے نغمگی پائی ہے۔ یہی ان کا اصل شعری جوہر ہے جو غزلوں میں بکھرا پڑا ہے اور نظموں میں بھی اس کے رنگ بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن نظموں کے خیالات روایت شکن اور عہد ساز ہیں آزادی ہر نوع کی غلامی سے آزادی اس شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ طرۂ امتیاز ہی مجاز کا بنیادی جوہر ہے وہ کس خوبصورتی کے ساتھ اپنے PERSONA میں اپنی حقیقی ذات PERSON لے کر آئے ہیں وہ غزل میں عقل کو فتنہ بیدار کہہ کر سلادینا چاہتے ہیں۔ اور نظم میں فتنہ بیدار کو دولت بیدار کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعری مجاز کے ذات سے فرار نہیں ہے بلکہ شاعری مجاز کے لیے اپنی شخصیت کا واضح اظہار ہے میرا خیال ہے کہ مجاز کی شاعری کا ابھی تک PERSONA اور PERSON کے حوالہ سے مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے جس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ بعض ترقی پسند ان کو فرائیڈ کے ساتھ شاعری کی فہم میں نفسیاتی عوامل سے رغبت پیدا نہ ہو سکی انسانی ذہن کا مطالعہ محض ایک فروعی ڈسپلن سمجھ لینے پر تن آسانی سے خواب اور تعبیر کے مباحث معرض التوا یا سرد خانے میں ڈال دیے گئے اور اس طرح مجاز جیسے نامراد عاشق اور باغی کی فہم کا ایک دروازہ بند کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں مجاز کی شعری لغت کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی ضروری ہے تاکہ اس شیرینی اور لطافت کا جو مجاز کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے تیکنیکی یا خالصتاً لسانی اوزاروں کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ لہجہ کی نغمگی بسا اوقات، اخفائے شخصیت کے کام آتی ہے جب کہ مجاز کے یہاں یہ خوبی، حیران کن حد تک افشائے راز کا کام کرتی ہے۔ اور راز یہ ہے کہ وہ درونِ ذات سے ایک عاشق خانقاہی اور بر سرِ عمل ایک باغی اور عملیت پسند ہے۔ جو اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے جیسے یہ سب کچھ اس کی مست خرامی کی راہ میں ناگوار کانٹے ہوں۔ لیکن مجاز اس اہم کام کو بھی ایک ایسے والہانہ انداز میں انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ معاً یہ خیال گزرتا ہے کہ:

نغمہ ہر آن نغمہ است

کے مصداق مجاز محض محمد حسن عسکری کے الفاظ میں خود ایک افسانہ نہیں بلکہ ایک سرمدی نغمہ ہے ایک ایسا نغمہ جو مزدور کے تیشہ اور نغمۂ سروری کے لحن کو ایک دوسرے میں اس طرح سموتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ دوست اور دونوں بیک دگر ضروری نظر آتے ہیں۔

۸۸۔ جب شخصیت اور شخصیت کے MASK میں فرق نہ رہے تو پھر انتہائی بنیادی فرق بھی شخصیت شناسی کا ذریعہ ... جانا

۔ مجاز جس مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بارے میں یہ گفتگو سن رہے ہوتے ہیں اس کا احساس ہی بذات خود اس درجہ کیف و سرور
، ہے کہ آئیے "ایک جام مجاز کے نام" اٹھاتے ہیں تاکہ صبح نو کا استقبال کیا جا سکے اور مجاز کے لیے جو شام، شام غریباں لکھنؤ پر
ہوئی تھی وہ اس صبح کا آغاز بن جائے جس کے وہ منتظر تھے۔
مجاز نے آزادی کے موقع پر کہا تھا:

ہر انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعیٔ جنوں خیر کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغازِ کار مرداں ہے

اگر مجاز کے لیے آزادی آغاز کار مرداں ہے تو پھر انجام کیا ہوگا۔ یہ ہے اس مجاز کا سوال جس کا دوسرا رخ PERSONA نظم کا
ر اور شعور ہے لیکن جس کی غزل اصل شخصیت کی دل آویزی اور لطافت ہے اور ان دونوں حدوں کا درمیان وقت ہے جو مجاز پر
نے جی مہربان نہ ہوا اور آج مہربان ہے تو اس قدر کہ انھیں بجا طور پر انقلاب کا مطرب قرار دیا جاتا ہے اس انقلاب کا جو ہمارے
نوں میں ہے اور اس انقلاب سے کہیں زیادہ حقیقی ہے جو اپنے غلط انداز وکلا کے ہاتھوں ناکام ہو چکا ہے مجاز شاعری سے جو کام
ا چاہتے ہیں وہ بہر طور ران کی شاعری کی تقسیم کا بنیادی حوالہ ٹھہرے گا اور اس موقع پر اگر بعض نقاد اصل فکر کو پس پشت ڈالنا
ہیں گے تو یہ سعیٔ مجاز شناسی میں اضافہ کا موجب نہ ہو سکے گی کیوں کہ عدم سے صرف عدم ہی پیدا ہوتا ہے وجود نہیں۔ لفظ سے
نی پیدا ہوتا ہے محض لفظ نہیں

قومی زبان (۲۴) مارچ ۱۹۹۳ء

قومی زبان (۲۵) مارچ ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر محمد علی اثر

محمد قلی قطب شاہ

(کتابیات)

ابو المظفر سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۵۵۰ء) کا تیسرا فرزند اور مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا تھا۔ وہ ۱۴ رمضان ۹۷۳ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۵۶۵ء کو گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ "ماہ نامہ" کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کی ماں "بھاگ رتی" یا "بھاگ رانی" ایک ہندو خاتون تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی پندرہ سال کی عمر میں ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں عمل میں آئی۔ محمد قلی نے کم و بیش اکتیس برس تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ حکومت کی اور سینتالیس سال کی عمر میں ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء میں انتقال کیا۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقت ور حکومت اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا دور حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حد تک امن و امان میں گزرا۔ یہ ضرور ہے کہ اندرون ملک اس کے مخالفین کے گروہوں نے وقتاً فوقتاً سازشیں کیں اور کبھی کبھی ہنگامے بھی کھڑے کیے لیکن محمد قلی کو انھیں کچلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اس کے زمانے میں ایران کے مشہور عالم میر محمد مومن حیدر آباد آئے ہوئے تھے، جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ سلطنت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔ یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی فکروں سے بے نیاز رہ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔ محمد قلی کی تعلیم و تربیت اپنے دو بڑے بھائیوں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی شاید اسی لیے نوجوانی کے زمانے میں وہ خود سر بلکہ آوارہ مزاج ہوگیا تھا، مورخین نے اس واقعہ کی تفصیل تاریخوں میں لکھی ہے۔ کہ کس طرح لڑکپن میں ایک بار جب کہ موسیٰ ندی میں طغیانی آئی ہوئی تھی، محمد قلی نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال کر گھوڑے پر ندی کو پار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد، ابراہیم قطب شاہ نے موسیٰ ندی پر وہ پل تعمیر کروایا تھا جو "پرانا پل" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدر آباد کا قیام ہے محمد قلی کی بلند خیالی ایک وسیع، منصوبہ بند اور متمدن شہر کی طلبگار تھی اس زمانے میں قلعہ گولکنڈہ کے اطراف آبادی بے ہنگم طور پر پھیلتی جارہی تھی۔ آبادی کی ضروریات

کے لحاظ سے یہ شہر ناکافی تھا چنانچہ محمد قلی نے شہر گولکنڈہ کے قریب ایک وسیع اور منصوبہ بند شہر کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا۔ چار مینار اس شہر کا مرکزی مقام قرار پایا۔ اس کے اطراف چاروں جانب سیدھی سڑکیں بنائی گئیں اور قرب و جوار میں شاہی محل تعمیر کروائے گئے۔ محمد قلی نے شہر کے قیام کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں موجود ہوں، چنانچہ اس شہر میں بے شمار بازار، خانقاہیں، مدرسے، مسجدیں، لنگر خانے، مہمان خانے، کاروان سرائیں وغیرہ بنائی گئیں۔ ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔

تمدنی اور سماجی نقطۂ نظر سے محمد قلی کا عہد حکومت، دکن کی تاریخ میں ایک یادگار دور سمجھا جاتا ہے۔ محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس مملکت میں بسنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان یگانگت، میل جول، اور بھائی چارگی کے جذبات نشو و نما پائیں۔ محمد قلی کی ماں (بھاگ رتی) تلنگانہ کی ایک خاتون تھی، کوئی تعجب نہیں کہ محمد قلی کے مزاج کی تشکیل میں اس کی ماں کا اثر بھی کارفرما رہا ہو۔ اس نے اس امر کی بھی کوشش کی کہ مملکت میں بسنے والے سارے طبقات کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔ دیوالی، بسنت اور ہولی کے تہوار قومی تقریبوں کے طور پر منائے جاتے تھے۔ یہ روایت تلنگانہ اور حیدرآباد کے عوام میں آج بھی رائج ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے، جس کا کلام عہد قدیم ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ نے جو رشتہ میں اس کا بھتیجا اور داماد بھی ہوتا ہے، اس کے کلیات کو مرتب کر کے ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں اس پر ایک طویل منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ کلیات میں اس مقدمے کو ۲۷ اشعار درج کیے ہیں سلطان محمد قطب شاہ کا بیان ہے کہ محمد قلی نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں:

مگر شہہ کہے شعر پچاس ہزار
دھرے وصف اپس سوکہن بہت عار

ڈاکٹر زور کے مطابق محمد قلی نے دکنی اردو اور فارسی کے علاوہ تلگو زبان میں بھی شعر کہے ہیں۔

۱۔ کلامِ محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ متون)

زور، محی الدین قادری۔ ڈاکٹر	کلیات محمد قلی قطب شاہ	سلسلۂ یوسفیہ حیدرآباد۔ ۱۹۴۰ء
سیدہ جعفر، ڈاکٹر	کلیات محمد قلی قطب شاہ	ترقی اردو بیورو دہلی۔ ۱۹۸۵ء

۲۔ انتخابِ کلامِ محمد قلی قطب شاہ

اکبر الدین صدیقی، محمد	انتخاب قلی قطب شاہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۲ء
اسلم، محمد رفیق	انتخاب معانی	چمن بک ڈپو دہلی ۱۹۷۸ء
ادا جعفری۔ غزل نما	محمد قلی قطب شاہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۸۸ء
ادا جعفری۔ غزل نما	محمد قلی قطب شاہ	پاکستانی ایڈیشن ۱۹۸۷ء
جاوید وششٹ	غزال رعنا	کتاب بھون دہلی ۱۹۶۶ء ۱۹۶۸ء

جاوید وششٹ	روپ رس	کتاب بھون ۱۹۷۰ء
چراغ علی، محمد، ڈاکٹر	اردو مرثیہ کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں	حیدرآباد اینڈ سنز حیدرآباد ۱۹۷۳ء
زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر	کلیات محمد قلی قطب شاہ (ہندی انتخاب)	ہندی پرچار سبھا حیدرآباد ۱۹۶۱ء
زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر	معانی سخن	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۵۸ء
سیدہ جعفر، ڈاکٹر	دکنی رباعیاں۔ (محمد قلی کی رباعیاں)	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد ۱۹۶۶ء
ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر	اردو غزل ولی تک۔ (انتخاب معانی)	بزم اشاعت اسماعیل یوسف کالج بمبئی ۱۹۶۱ء
غلام عمر خاں، ڈاکٹر	قدیم اردو شاعری۔ انتخاب (انتخاب محمد قلی)	شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۸۰ء

۳۔ محمد قلی اور اس کی شاعری سے متعلق کتابیں

جاوید وششٹ، ڈاکٹر	روپ رس	کتاب بھون دہلی ۱۹۷۰ء
جاوید وششٹ، ڈاکٹر	غزال رعنا	کتاب بھون دہلی ۱۹۶۸ء
جاوید وششٹ، ڈاکٹر	محمد قلی اور نبی کا صدقہ	کتاب بھون دہلی ۱۹۸۷ء
زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر	سلطان محمد قلی قطب شاہ (حیات محمد قلی قطب شاہ)	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۴۰ء
زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر	معانی سخن	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۵۸ء
شیروانی، ہارون خاں، پروفیسر	بھاگ متی کا افسانہ	حیدرآباد ۱۹۵۸ء
عبدالستار سید	ہندوستانی تہذیبی عناصر محمد قلی کی شاعری میں	حیدرآباد ۱۹۸۸ء
مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ	ساہتیہ اکیڈمی دہلی ۱۹۸۹ء
وقار خلیل	محمد قلی کی جیون کہانی	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

۴۔ محمد قلی اور اس کی شاعری سے متعلق مضامین (کتابوں میں)

اثر، محمد علی ڈاکٹر	دبستان گولکنڈہ (مرتبہ) محمد قلی قطب شاہ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد ۱۹۸۱ء	
اثر، محمد علی ڈاکٹر	دکنی شاعری تحقیق و تنقید۔ محمد قلی کی شاعری	حیدرآباد ۱۹۸۸ء
اثر، محمد علی ڈاکٹر	دکنی غزل کی نشو و نما۔ محمد قلی قطب شاہ	حیدرآباد ۱۹۸۶ء
اختر حسن	قطب شاہی دور کا فارسی ادب۔ محمد علی قطب شاہ۔	ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ۱۹۷۳ء
اقبال بلگرامی	زاویے۔ اردو غزل قطب شاہ سے میر تک	اورنگ آباد ۱۹۷۴ء
امیر اللہ شاہین، ڈاکٹر	تخلیق و تنقید۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء
امیر اللہ شاہین، ڈاکٹر	تخلیق و تنقید۔ محمد قلی اور مذہبی رواداری	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	ادبی تحریریں۔ ہندوستان محمد قلی کی نظر میں	ادارہ ادبیات حیدرآباد ۱۹۴۳ء
عبدالحق مولوی	قدیم اردو۔ کلیات محمد قلی	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۱ء
طیب انصاری	تحریر و تنقید۔ معانی جدید رجحانات کی روشنی میں	حیدرآباد ۱۹۶۹ء
قیوم صادق، ڈاکٹر	دکنی ادب۔ محمد قلی قطب شاہ	کرناٹک ادبی سرکل گلبرگہ ۱۹۸۸ء
ملنسار احمد	حرف اکتساب۔ محمد قلی کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر۔ بنگلور ۱۹۸۱ء	

۵۔ محمد قلی اور اس کی شاعری سے متعلق مضامین (رسائل میں)

آصفیہ خلیل	محمد قلی کے کلام پر ایک نظر	نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۴ء
آمنہ انصاری	قلی قطب کا یہ نگر	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء
اشر محمد علی، ڈاکٹر	محمد قلی۔ ایک جائزہ	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۷۵ء
اشر محمد علی، ڈاکٹر	محمد قلی کی غزل	سب رس حیدر آباد مارچ، اپریل ۱۹۸۶ء
اشر محمد علی، ڈاکٹر	محمد قلی کی غزل گوئی	ذوق فکر حیدر آباد۔ اپریل ۱۹۸۷ء
احمد جلیس	تہذیب کا معمار۔ محمد قلی	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
اکبر الدین صدیقی، محمد	کلام محمد قلی پر ایک نظر	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۶۱ء
اکبر الدین صدیقی، محمد	محمد قلی کی شاعری	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۶۴ء
انیس قیوم فیاض	محمد قلی کی شاعری	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۷ء
انیس قیوم فیاض	مرا شہر لوگاں سوں معمور کر	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۶ء
بلگرامی۔ سیّد علی	سلطان محمد قلی	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
تاج سلطانہ	مقبرہ، محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد مئی ۱۹۵۸ء
ثمینہ شوکت، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۷۲ء
جاوید وشسٹ، ڈاکٹر	محمد قلی کا رنگِ تغزل	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
جاوید وشسٹ، ڈاکٹر	محمد قلی اور نبی کا صدقہ	ہمایوں دہلی (سالنامہ) ۱۹۶۹ء
جاوید وشسٹ، ڈاکٹر	گولکنڈہ کی عید عہد محمد قلی میں	گلگن بمبئی اگست ۱۹۷۷ء
جمیل نقوی	قطب معانی	ماہِ نو کراچی اگست ۱۹۶۷ء
راجندر پرشاد	محمد قلی قطب شاہ کا اثاثہ	سب رس حیدر آباد مئی ۱۹۸۹ء
رحیم الدین کمال، ڈاکٹر	محمد قلی کی شخصیت اور عہد کا تجزیاتی مطالعہ	سب رس حیدر آباد ستمبر ۱۹۸۹ء
رفعت مبارز الدین	عطائی۔ عہد محمد قلی کا ایک گمنام شاعر	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۷ء
رشید ارشد	معانی کی شاعری پر ناقدانہ نظر	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء
زاہدہ ابوالحسن	محمد قلی کی شاعری	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	محمد قلی کی بارہ پیاریاں	سب رس حیدر آباد جولائی ۱۹۳۹ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	سلطان محمد قلی قطب شاہ اور تصوف	مجلہ نقش اولین ورنگل کالج جنوری ۱۹۴۰ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	ہندوستان محمد قلی کی نظر میں	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	حیدر آباد جیسا کہ محمد قلی قطب شاہ نے تعمیر کیا (انگریزی)	سب رس۔ حیدر آباد اپریل تا جون ۱۹۵۸ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	بھاگ متی اور بھاگ نگر	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۸ء
زور محی الدین قادری، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ کی شاعری	سب رس جنوری ۱۹۴۳ء
زینت ساجدہ، ڈاکٹر	محمد قلی اور اس کی شاعری	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۵۸ء
زینت ساجدہ، ڈاکٹر	حیدر آباد کے ادیب جلد اوّل	ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد
محمد قلی قطب شاہ کی شاعری از ڈاکٹر زور ۱۹۵۸ء		
سراج الدین سیّد، پروفیسر	دکنی دیس، دکنی بھاشا اور محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء

ین علی خاں	محمد قلی کا ایک غیر مطبوعہ فرمان	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۸ء
	محمد قلی اور علی برید	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۶۳ء
	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۶۳ء
	محمد قلی کا تمدن	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
ر، ڈاکٹر	دکنی تہذیب اور محمد قلی	قومی آواز نومبر ۱۹۷۷ء
ر، ڈاکٹر	محمد قلی کی شاعری	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء
ر، ڈاکٹر	محمد قلی کی شاعری	سب رس کراچی جنوری ۱۹۸۹ء
۔ حمید الدین	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۸ء
۔ حمید الدین	محمد قلی کی گنگا جمنی شاعری	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۶۲ء
سار	محمد قلی۔ شخصیت اور فن	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۶۳ء
مد، شاہ ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر	آہنگ گیا جون ۱۹۷۷ء
ضیاء الدین احمد ڈاکٹر	محمد قلی کی غزل	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
ر	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد جولائی اگست ۱۹۴۶ء
عاری، ڈاکٹر	معانی جدید رجحانات کی روشنی میں	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۶۶ء
ردلوی، ڈاکٹر	دکنی اردو محمد قلی کی شاعری کا تہذیبی پہلو از سیدہ جعفر	بمبئی ۱۹۸۷ء
یظ صدیقی	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد (مرقع دکن نمبر) جنوری ۱۹۳۹ء
، مولوی	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۶۲ء
، مولوی	کلیات محمد قلی (جز دوم)	اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۲ء
حمان ہاشمی، قاضی	محمد قلی کے کلام کی ادبی اہمیت	سب رس حیدر آباد جولائی ۱۹۷۱ء
لنساء، سیدہ	محمد قلی بحیثیت مرثیہ نگار	سب رس حیدر آباد دسمبر ۱۹۷۷ء
اشمی، ڈاکٹر	محمد قلی کی شاعری کا سماجی پہلو	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۸۴ء
ہاشمی، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ قومی یکجہتی کا علمبردار	سب رس حیدر آباد ستمبر ۱۹۸۹ء
انی	مقبرہ محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد ۱۹۵۸ء
زوانی	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد ۱۹۵۸ء
زوانی، مولوی سید	کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (جز اول)	اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۲ء
ں	محمد قلی اور نظیر	سب رس حیدر آباد نومبر ۱۹۷۱ء
ں	محمد قلی اور نظیر	سب رس حیدر آباد دسمبر ۱۹۷۱ء
ں	محمد قلی اور نظیر	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۷۲ء
سوامی مدیراج	محمد قلی اور دکنی تمدن	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
سوامی مدیراج	بھاگ متی اور محمد قلی	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۸ء
سوامی مدیراج	دکن کا ایک اولوالعزم سلطان	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۵۸ء
۔قدر	محمد قلی قطب شاہ اور واجد علی شاہ	آج کل دہلی جنوری ۱۹۸۴ء
چند نارنگ، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ	آج کل دہلی جنوری ۱۹۷۱ء
بیدار، ڈاکٹر	کلام معانی کا لسانی مطالعہ	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۷ء

محمد وزیر آبادی	گولکنڈہ کا پہلا شاعر بادشاہ	عالمگیر (عید نمبر)۱۳۴۹ھ
محمد یوسف احمد	محمد قلی کی ادبی خدمات	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۹۰ء
مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	محمد قلی کی زبان	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۶۴ء
مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد دسمبر ۱۹۴۲ء
مسیح الزماں، ڈاکٹر	محمد قلی کی مرثیہ نگاری کا تہذیبی پس منظر	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
معین الدین محمد	قلی اور رومانیت	سب رس حیدر آباد جنوری ۱۹۴۶ء
میراجی	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد جون ۱۹۴۱ء
میر حسن	کلام محمد قلی کے محرکات	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
میمونہ بانو، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ۔بحیثیت شاعر	ساوینر کالج آف لینگویجز حیدر آباد اگست ۱۹۷۵ء
میمونہ بانو، ڈاکٹر	محمد قلی۔بحیثیت شاعر	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۷۸ء
نصیر الدین ہاشمی	محمد قلی کے عوامی کارنامے	سب رس حیدر آباد فروری ۱۹۶۴ء
نصیر الدین ہاشمی	محمد قلی کی منظر نگاری	شہاب دسمبر ۱۹۴۲ء
نظام الدین مغربی	محمد قلی قطب شاہ کے چند عالی ہم عصر	سب رس حیدر آباد اگست ۱۹۸۵ء
وقار خلیل	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۷۹ء
وقار خلیل	حیات محمد قلی قطب شاہ	ذوق نظر حیدر آباد اپریل ۱۹۸۷ء

۶۔ منظومات

آقا فرخ شیرازی	محمد قلی قطب شاہ ذی شان	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
باقر امانت خانی	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۸۸ء
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	نوائے محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	محمد قلی کا پیام عوام کے نام	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۸۸ء
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	محمد قلی کے نام	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۷۲ء
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	نوائے محمد قلی	سب رس حیدر آباد مئی ۱۹۸۸ء
تاج قریشی	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۵ء
رحمٰن جامی	نذر محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد دسمبر ۱۹۸۳ء
سعد حسین سعد	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد اگست ۱۹۸۵ء
سید علی	محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۷۲ء
سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ	ذوق نظر حیدر آباد اپریل ۱۹۸۷ء
صلاح الدین نیر	قطب شاہ کی زبانی	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
عبد الغفار اسیر	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدر آباد مئی ۱۹۸۸ء
علی سرور	نذر قطب شاہ	سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۷۸ء
نجم آفندی	محمد قلی قطب شاہ	ذوق نظر حیدر آباد اپریل ۱۹۸۷ء
وقار خلیل	قطب اردو	سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۶ء
یعقوب عمر، ڈاکٹر	محمد قلی کی غزل کا آزاد ترجمہ	ذوق نظر حیدر آباد اپریل ۱۹۸۷ء

قومی زبان (۳۱) مارچ ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

آگ کا دریا..... ایک جائزہ

ہمارے اردو ناول کی دنیا میں "آگ کا دریا" کی حیثیت آج تک منفرد ہے اور غالباً اس کی ہمیشہ یہ ہی حیثیت رہے گی۔ خواہ اس سطح کا ایک دوسرا ناول وجود میں آجائے اس لیے کہ کسی بھی عہد کا رجحان ساز ناول ادب کے سفر میں کلاسیکل درجہ حاصل کر لیتا ہے اور کلاسیک زمان و مکان سے بلند ہو کر ہمیشہ ہر دور کے قاری پر ہر وہ حقیقت منکشف کرتا رہتا ہے جس کا روح عصر کے دائرہ میں رہتے ہوئے بتایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

"آگ کا دریا" برصغیر کی آزادی کے بارہ سال بعد وجود میں آیا۔ بارہ سال بعد تو گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں یہ تو پھر ادب کی دنیا ہے جہاں نئے نئے میلانات، رجحانات اور تحریکات کے تحت تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ اس ناول کی اشاعت سے قبل قرۃالعین حیدر کے دو ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غمِ دل" منظر عام پر آچکے تھے اور انھیں اہم ناول نگار کی سند عطا کر چکے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چند اور ناول نگار بھی اپنی حیثیت مستحکم کر چکے تھے۔ عزیز احمد کے دو ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "شام اودھ" رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا" شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" اور چند اور فن کاروں کے ناول یا ناولٹ فنی اور فکری سطح پر آزادی کے فوراً بعد مختلف رجحانات کی نمائندگی کر رہے تھے جن میں فسادات، ناسٹلجیا، تہذیبی زوال و اقدار کی شکست و ریخت، اقتصادی بدحالی اور استحصال زیادہ اہم تھے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے تو یہ ناول نگار اس کے دائرہ میں رہتے ہوئے پریم چند کے "گئودان" (۱۹۳۶ء) کے مقابلے میں ناول کو بلوغت اور رچاؤ سے ہمکنار کر چکے تھے۔ عزیز احمد اس کا مظاہرہ آزادی سے قبل "آگ" اور "گریز" میں اور عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" میں کر چکی تھیں۔ ان لوگوں کے یہاں بیانیہ کے داستانی پیٹرن PATTERN کے برعکس ماجرہ میں سرعت، مختلف تیکنکوں کے استعمال، نئے نئے موضوعات کے نکھرے ہوئے اسلوب میں اظہار، واحد متکلم کے قابلِ قبول استعمال اور وژن کے بیان کے لیے فکری مباحث کے بیانیہ میں ادغام جیسے فنی ذائقے کے چلن کا آغاز ہو چکا تھا جو کہ ناول کو ایک نیا موڑ عطا کرنے کے لیے ایک اہم بریک تھرو BREAK THROUGH ثابت ہو رہا تھا۔ خود سجاد ظہیر کا ناول۔ "لندن کی ایک رات" پلاٹ کے مقابلے میں کردار کی اہمیت، مروجہ طریقہ اظہار کے مقابلے میں (جہاں آغاز، نقطہ عروج اور رد نقطۂ عروج ANTI CLIMAX کا رائج ہوتا ہے) وقت کی حد بندیوں کے علی الرّغم فکر اور داخلی جذبات کا شعور کی رو کے تحت بہاؤ کی مشترکہ ندرت کے باعث ہیئت کا نیا شعور عطا کر رہا تھا۔

اس منظر نامہ میں قرۃ العین حیدر کے "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" اسی شعور کی پختگی کی دلالت کرتے تھے۔
"آگ کا دریا" کی تخلیق ۱۹۵۹ء سے تعلق رکھتی ہے۔ "سفینۂ غم دل" اور اس میں محض سات سال کا وقفہ ہے۔ سات سال کا یہ وقفہ غالباً قرۃ العین کی تخلیقی توانائی CREATIVE VITALITY کا حیرت انگیز اور یادگار عرصہ ہے جو "آگ کا دریا" جیسی تخلیق کو جنم دیتا ہے اور یہ امر مسرت کا باعث ہے کہ اس ناول کے بعد بھی انھوں نے اس توانائی میں ضعف نہیں پیدا ہونے دیا اور ہمیشہ تازہ دم ہونے کا اثر دیتے ہوئے۔ "آخر شب کے ہم سفر"، "گردش رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" جیسے ناول پیش کیے جن پر آج بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ "آگ کا دریا" کی منفرد حیثیت کو وہ آج تک عبور نہیں کر پائی ہیں۔ نقادوں کی اس قسم کی رائے اور فیصلے کے برعکس ان کا اپنا خیال یہ ہے کہ ناول کے حوالے سے انھوں نے اپنے فنی سفر میں ارتقا کے مزید سنگ میل عبور کیے ہیں لیکن یہ علاحدہ بحث ہے۔ کسی ادیب کی کون سی تحریر اس کی دوسری تحریروں کے مقابلے میں بالادست حیثیت اختیار کرتی ہے اس کا فیصلہ اکثر وقت کرتا ہے اور خود ادب کی اپنی حتمی رائے مستقبل میں اپنا اثبات وعدم اثبات کراتی ہے۔

"آگ کا دریا" نے اپنی اشاعت کے ساتھ ہی جو ردّ عمل پیدا کیا وہ کم ناولوں کے حصّے میں آتا ہے۔ یہاں اس کا تعلق اس منفی مہم سے نہیں ہے جو کچھ حلقوں نے عمداً چلائی جس کے نتیجے میں قرۃ العین حیدر انڈیا سدھار گئیں بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فن کے حوالے سے اس ناول کو مصنّفہ کے پہلے دو ناولوں کے مقابلے میں ایک سنگِ میل قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ اس کا وسیع کینوس ہے اس میں اتفاق سے تمام وسعتیں سما گئیں۔ اس میں ماجرہ کی وسعت ہے یعنی اس کا قصہ ڈھائی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس میں ایک سے کہیں زیادہ تکنیکوں سے کام لیا گیا ہے جن میں شعور کی رو کا تھوڑا بہت استعمال، معنویت سے معمور دیو مالائی حوالوں، وقت کی حشر سامانیوں، فلسفیانہ مباحث، مصنّفہ کے تبصروں، واحد متکلم اور واحد غائب، ماجرہ کی اٹھان میں یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔ نیز ماضی اور حال کی سیاسی و معاشرتی تاریخ کا پھیلاؤ ناول کے دامن کو اس قدر وسیع کرتا ہے کہ اس کے بعد دیگر اہم ناول نگار تاریخ کے تذکرے سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ناول تاریخیت کے ایسے رجحان سے آشنا ہوا جس نے اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر ہی اسے وہ بلندی عطا کر دی جس کی بنا پر یہ کہا جانے لگا کہ اب ناول بے بضاعتی اور کم مائگی کے حصار سے باہر نکل آیا ہے اور اس بلندی کی فہم حاصل کرنے کے لیے خود مصنّفہ کے اپنے الفاظ کی بڑی اہمیت ہے۔ روز نامہ "جنگ" لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے جو کہ "کتاب نما" دہلی کے جنوری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں بھی شائع ہوا انھوں نے بتایا کہ میرا اپنا خیال ہے کہ "آگ کا دریا" کے ذریعے تاریخیت کا رجحان پیدا ہوا ہے کہ لوگ تاریخ کو سمجھیں..... انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا کہ .....لوگوں نے اس طریقے سے لکھنا شروع کیا۔ پہلے طبقاتی کشمکش کی عکاسی کا رجحان تھا۔

قرۃ العین حیدر نے فکشن پر جس قدر عام فہم انداز سے تنقید لکھی ہے اور جتنے انٹرویوز دیے ہیں ان میں انھوں نے دیگر چند ناول نگاروں کی روش کے برعکس دعوے نہیں کیے ہیں اور نہ کبھی اپنے آپ کو ناقابلِ فراموش فنکار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کا انکسار اور مرتبہ انھیں ایسا کرنے سے روکتا رہا ہے۔ ابھی جو اقتباس دیا گیا ہے اس میں بھی دبا سا لہجہ ہے اور ایک سچائی کا اظہار ہے۔ "آگ کا دریا" کے بعد "اداس نسلیں" میں عبداللہ حسین نے زیادہ وسیع نہیں تو پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان تک کی تاریخ پر ماجرہ کو پھیلایا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے پانچ جلدوں کے طویل ناول "لہو کے پھول" اور رشیدہ رضویہ کے ناولوں "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں"۔ "اسی شمع کے آخری پروانے" وغیرہ۔ جمیلہ ہاشمی نے "تلاش بہاراں"۔ "دشت سوس"

غیرہ. نثار عزیز بٹ نے "نے چراغ نے گلے"، خدیجہ مستور نے آنگن. جیلانی بانو نے ایوان غزل۔ بلونت سنگھ نے کالے کوس" اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے "آگ کا دریا" کی تقلید میں "سنگم" میں تاریخیت کے فنی و تکنیکی پہلوؤں کو حسب ضرورت چھوٹے اور بڑے کینوس پر برتا ہے۔ ان فنکاروں میں ڈاکٹر احسن فاروقی کے فن سے متعلق تاریخیت کی "آگ کا دریا" کے مقابلے میں ثانوی حیثیت یہ ہے کہ انھوں نے "سنگم" میں برصغیر کی ۱۰۲۴ء سے قیام پاکستان کے چند سالوں تک کی تاریخ کے نو سو سالہ ادوار کی عکاسی کی ہے۔ اگر "آگ کا دریا" میں ڈھائی ہزار سال کی طویل ترین تاریخ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال اور چمپا کے حوالوں سے سامنے نہ آتی تو شاید ڈاکٹر احسن فاروقی بھی "سنگم" میں مسلم اور اوما پاروتی کے حوالوں سے نو سو سالہ تاریخ کو موضوع بحث نہ بناتے اس لیے کہ ادب میں کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ اپنے سے پہلے فنکاروں کا عظیم ادب ہمیشہ نشان راہ ثابت ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر پر ورجنیا وولف کے مشہور زمانہ ناول "اورلینڈو" ORLANDO کے اثرات مرتب ہوئے تب ہی انھوں نے "آگ کا دریا" لکھا۔ اورلینڈو میں اورلینڈو عہد الزبیتھ سے لے کر ۱۹۲۸ء تک انگلینڈ کی تہذیبی تاریخ کے دھاروں کو فکشن کی سمت عطا کرتا ہے اس کے لیے تاریخ کا کینوس محض تین سو سال تک کا عرصہ ہے۔ آخر میں وہ عورت بن جاتا ہے۔ "آگ کا دریا" میں گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال اور چمپا کی جنس نہیں بدلتی تاہم یہ لوگ ڈھائی ہزار سالہ کی سحر میں مبتلا کر دینے والی معاشرتی زندگی کے اہم ادوار میں موجود رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے "اورلینڈو" کا کینوس "آگ کا دریا" سے بہت مختصر ہے نیز یہ کہ سیاست، معیشت، تہذیب و تمدن اور عمرانی حوالوں سے "آگ کا دریا" "اورلینڈو" سے اس قدر ... کی چیز ہے کہ اگر دونوں ناولوں کے درمیان دو مختلف زبانیں حائل نہ ہوتیں تو غالباً "آگ کا دریا" کو نقادانِ فن "اورلینڈو" سے برتر قرار دیتے۔ بہرصورت یہ تو طے ہے کہ قرۃ العین حیدر پر ورجنیا کے فن کے اثرات مرتب ہوئے تھے لیکن وہ اپنی جینئس GENIUS اور انفرادیت کے باعث آگے نکل گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ بیرونی اثرات کے زیر اثر جینئس یا نابغہ منفرد تحریر ضرور سامنے لاتا ہے۔ اس حقیقت کا خود قرۃ العین حیدر نے ایک عمومی اصول کی وضاحت کے لیے اپنے ایک مضمون بعنوان "افسانہ" مطبوعہ "پکچر گیلری" صفحہ ۴۵ میں (ناشر: نوسین۔ لاہور ۱۹۸۳ء) اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مصنف تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے دوسرے مصنفوں کی قطار ہوتی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کے ذریعہ ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیتا ہے

یہ حقیقت روایت کی توسیع کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔ گو کہ ایسی روایت کا مدار برصغیر نہیں بلکہ یورپ ہے مگر چوں کہ ہندوستان ایک نو آبادی تھا اس لحاظ سے بیرونی اثرات بھی مقامی روایت کا حصّہ بنتے تھے اور ہمارے مشرقی ادب میں تبدیلی کے محرک بنتے تھے اور بن رہے ہیں۔ سو قرۃ العین حیدر کا "اورلینڈو" سے متاثر ہو کر ایک رجحان ساز ناول تحریر کرنا اور ڈاکٹر احسن فاروقی کا اس کی تقلید میں "سنگم" لکھنا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ "سنگم" برتری کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس تیکنکی میلان کا اسلامی اثرات کے حوالے سے ساتھ دیا اور قابلِ ذکر ناول یقیناً لکھا، تاہم کسی اہم کڑی کا اضافہ نہ کر سکے۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ دیگر ناول نگاروں نے طویل تاریخ کے ماجرہ میں ہر دور میں موجود ایک ہی قسم کے کرداروں کے قصے کی عکاسی کے پیٹرن کو قطعاً نظر انداز کیا اور جدّت کی دیگر مختلف شاہراہوں پر نکل کھڑے ہوئے ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ تاریخیت کا رجحان مزید مستحکم ہوتا۔

"آگ کا دریا" کے آغاز سے قبل قرۃ العین حیدر نے ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور زمانہ طویل نظم FOUR QUARTETS سے کچھ مصرعے دیے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

خاتمہ کہاں ہے ... بے آواز گھنٹوں کا

خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا۔

لوگ بدل جاتے ہیں مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے۔

تمام تر مصرعوں کو پڑھتے ہی چند باتیں قاری کے ذہن میں در آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی کی ابتدا اور انتہا کیا ہے اور ازل و ابد کے درمیان سفر کرتے ہوئے انسان کرب سے کیوں نبرد آزما رہتا ہے اور کیا کرب کبھی ختم ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کہ وقت کیا ہے؟ اس کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ وقت انسان ہے؟ تاریخ ہے؟ زمانہ ہے؟ تہذیب و تمدن ہے؟ یا بذات خود ایک ایسا لافانی کردار ہے جو ہمیں کنٹرول کر رہا ہے۔ ایک سائنس دان کے لیے وقت کی تشریح کا ایک علاحدہ معیار ہے لیکن زندگی کے سفر کے حوالے سے یہ ایک ایسی بالادست قوت کا روپ دھار لیتا ہے کہ اس کی کئی فلسفیانہ توضیحات و تعبیرات سامنے آتی ہیں۔ گو کہ ہر ناول میں وقت کا کوئی نہ کوئی تصور ہوتا ہے لیکن وہ کردار کا روپ نہیں دھارتا۔ "آگ کا دریا" اپنے قاری کو وقت کے نہاں خانے میں جھانکنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی اعتبار سے وہ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال اور چمپا ہی کی طرح اہم کردار بن جاتا ہے۔ ناول کے کردار وقت کی موجودگی کے شعور کو شروع سے آخر تک واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ گوتم کہتا ہے:

وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا۔ وقت سے تم بچ نہیں سکتے۔

(آگ کا دریا۔ مکتبہ اردو ادب لاہور۔ ص ۵۹)

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات حادثے وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔ (ص: ۱۲۷)

خود گوتم کے گرو نے گوتم کے ذہن میں شروع ہی سے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ وقت کے سامنے "کوئی رشتے نہیں" ہیں، کوئی منطق، کوئی طاقت۔ وقت پر تمہارا قابو نہیں رہ سکتا جو آنکھیں رکھتا ہے وقت کے ارتقا کو پہچان لیتا ہے۔

یہ اقتباس صفحہ ۵۰ سے ہے جب کہ گوتم مختلف فلسفوں کے ادراک کے پروسیس PROCESS میں ہے۔ وہ ہندوستان کی تہذیبی روح ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کس طرح جانیں کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ ایک تنہا انسان ہے اور باسٹھ فلسفے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گوتم کا زمانہ بدھ کے سو سال بعد کا ہے۔ گوتم سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ڈھائی ہزار سالہ وقت میں وہ طالب علم، چترکار کانیک، ڈرامہ نگار، اور اداکار ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذمہ دار منتظم، بیوروکریٹ، سفارت کار اور بہت کچھ ہے۔ ہر روپ میں اسے سچائی کی تلاش ہے اور کرب اور دکھ ہمہ وقت سائے کی مانند اس کے ہم سفر ہیں۔ گرو نے وقت کے بارے میں اس پر جس سچائی کا انکشاف کیا تھا اور اسے پہچاننے کے سلسلے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی شرط عائد کی تھی اس کے حصار سے وہ ناول کے

تے تک نہیں نکل پاتا۔ کائنات کا ازلی اور ابدی اور تنہا انسان جو کائنات کے ان گنت [illegible] جاننا چاہتا ہے جو وقت کے پردے میں پنہاں ہیں۔ ان کو روشنی میں لانا اس کی زندگی کا مقصد ہے جب کہ چاروں اور خلا ہے۔ انسان تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش، پر امید بھی مگر مایوس اور رنجیدہ جسے ساری چاندنی سارے پھول ساری ندیاں او[illegible] سے دیا گیا ہے!

اور انسان کی اسی تھکن، شکست خوردگی، بشاشت، امید او[ر] ناامیدی، مایوسی او[ر] رنجیدگی [illegible] سب کی [illegible] اٹھائے ہوئے ہیں یہ جوق در جوق ڈھائی ہزار سالہ ادوار میں چلے آ[تے] ہیں [illegible] گوتم [illegible] ہری شنکر، ابوالمنصور اور چمپا کر رہے ہیں۔ ان سب کی ذاتی اور اجتماعی کہانیاں [illegible] غیر [illegible] کا مضبوط حصہ ہیں۔

ہری شنکر بدھ فلسفے کا نمائندہ ہے۔ ہمہ وقت سوچنا اس کے کردار کا [illegible] حصہ ہے [illegible] گوتم کی [illegible] سے منسوب ہے۔ اگر وہ شانت نہیں تو زیادہ بے چین بھی نہیں یوں لگتا ہے جیسے وہ انسان اور اشیا کے بارے میں زیادہ فکر نہیں اس پر خوش دلی کا راج نظر آتا ہے۔ گوتم کو یہ ذہنی تکلیف ہے کہ عورت کو عظیم [illegible] پاتے ہیں اور ایک بچے کے ذریعہ وہ ساری کائنات کی ذمہ داری اٹھا لیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسرے انسان کے حوالے بخوشی کر دیتی ہے تو وہ یہ فیصلہ بھی صادر کرتا ہے کہ ناری کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے اور چمپا بائی کو اودھ کے ایک دور میں طوائف کے روپ میں دیکھ کر ناقابل بیان اذیت سے دوچار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ عورت جو دیبی ہے، لکشمی، گوری، اوما، جو ماں ہے اور بہن اور بیوی [illegible] ہے۔ اسے طوائف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بڑی زیادتی ہے مگر ہری شنکر کا اصرار ہے کہ بھگوان نے ناری [illegible] کے لیے تو بنائی ہے۔ اس پر گوتم نے جواب دیا تھا کہ عورت مقدس چیز ہے۔ خود تبصرے کی شکل میں قرۃ العین [illegible] ہے..... پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے محض یہ تبصرہ یوں ہی نہیں دے دیا چمپا کا شروع سے [illegible] کردار اس کی تفسیر ہے۔ عورت کے مقدرات پر قرۃ العین نے انسانوں سے لے کر ناول تک طبع آزمائی کی ہے۔ چمپا شروع سے آخر تک ایسی عورت ہے جو مردوں کی دنیا میں مردوں ہی کے بنائے ہوئے قانون کے تحت زندگی گزارتی ہے۔ چندر گپت موریہ کے عہد میں وہ گرفتار ہو کر دربار سے وابستہ مالیات کے شعبہ کے ایک پچاس سالہ موٹے اور گنجے شخص سے بیاہی جاتی ہے۔ اپنی اس حیثیت میں وہ خوش نظر آتی ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو چمپا بھگت کبیر کے گیت گایا کرتی تھی۔ اپنے طوائف کے کردار میں بھی وہ مست تھی اور افیم کھاتی بھکارن کے روپ میں بھی جب کہ فٹن میں گزرتے ہوئے گوتم نیلمبر کے افسوس اور ہمدردی کے جذبات کے تحت دیے گئے چاندی کے روپے کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہوئی تھی۔ مگر جدید زمانے میں قرۃ العین حیدر اس کے چولے کو بدل دیتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی میں انا، عدم مفاہمت اور آدرش کے نفسیاتی پہلو عطا کر کے وہ اسے اپنا ہم پلہ بنا دیتی ہیں اور تھوڑا بہت خود نوشتانہ TOUCH بھی دے دیتی ہیں اور اس دور کی چمپا سنجیدہ، باشعور اور اپنے پس منظر کے اعتبار سے ایک حقیقی کردار ضرور ہے۔ وہ خاصی بااعتماد اور حاضر جواب ہے۔ گوتم کے اس استفسار پر وہ بھیا صاحب کو کیوں پسند کرتی ہے وہ یہ دلیل لاتی ہے کہ کسی کو پسند کرنا فلرٹ نہیں ہوتا۔ یہاں گوتم لاجواب ہو جاتا ہے۔ چمپا آخر میں اس عورت کا روپ ہے جہاں شادی کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف اپنی ذات میں سمٹ جانا اور ازدواجی دنیا سے الگ رہ کر دانشوروں اور فن کاروں کی دنیا سے ناطہ نبھانا اس کا مقدر ہے۔ عورت کی آدرش پرستی کا یہ روپ اکیلی قرۃ العین حیدر ہی نہیں پیش کرتیں۔ خدیجہ مستور، نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی وغیرہ نے بھی ایسے نسوانی کردار تخلیق کیے ہیں کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ذہین

ناول نگار خواتین اس ادب سیشن OBSESSION کے تحت بھی نسوانی کردار واضح کرتی ہیں کہ عورت خدا کی انتہائی حسین ترین تخلیق ہے لہٰذا اس کی عکاسی PORTRAYAL ایک سنجیدہ، بردبار، مثالیت پسند اور اصولوں پر مفاہمت نہ کرنے والی شخصیت کی حیثیت سے کی جائے۔ اور اس رویہ یا اپروچ میں کوئی برائی نہیں۔ تعلیم عام ہو جانے والے معاشرے میں اتنی ذمہ داریوں کی حامل عورت بھی پائی جاتی ہے جو کہ ازدواج کے بکھیڑوں سے آزاد رہ کر اپنے وجود کا اثبات کراتی ہے۔ ناول کے آخر میں چمپا کمال سے کہتی ہے .... "لیکن کمال میں سمجھتی ہوں جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے میں تم سے کہیں زیادہ خوش نصیب ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔" (ص: ۷۵۵)

چمپا سمجھتی ہے کہ اس کے زخم اوروں کو نظر نہیں آسکتے۔ اس لیے کہ وہ کمزور اور فانی ہیں۔ چشم بینا نہیں رکھتے، تاہم جب وہ کہتی ہے کہ اس نے سراغ پالیا ہے تب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کرب سے مسرت کا حصول واقعی چمپا کا کمال ہے بلکہ اس مسرت اور لذّت کی عکاسی قرۃ العین حیدر کا کمال ہے اور پھر پاکستان میں اپنا مستقبل تلاش کر لینے والا کمال بھی اس نکتے کو سمجھ لیتا ہے کہ چمپا تنہا نہیں ہے وہ آگے بڑھ رہی ہے اس کے ساتھ اس کے محلّے، گلیاں، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، ٹھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں سب ہیں۔ یوں قرۃ العین حیدر کا اہم ترین نسوانی کردار کرب اور اذیت کے لمحات میں بھی اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے مگر ہندوستان میں اپنے سلطان کے ساتھ داخل ہونے والا کمال ابو المنصور؟

در حقیقت کمال بڑی شان سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے حوالے سے ہجرت اور ناسٹلجیا NOSTALGIA کے پہلو رقم ہوتے ہیں۔ اپنی سرزمین چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا مستقر بنانے والے کو نئی سرزمین پاکستان جانا پڑتا ہے۔ گویا تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انسان مستقل ہجرتی سفر میں ہے۔ وہ کہاں پیدا ہوا اور کہاں دفن ہوا۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں رہا۔ پروفیسر عتیق احمد کی اس سلسلے میں رائے بالکل صحیح ہے کہ:

> "آگ کا دریا" میں مہا بھارت سے پہلے کا دور اور بعد کا دور اشوک کا دور، مسعود غازی کا دور، سلطان محمود غزنوی کا دور، مغلوں کا دور، انگریزوں کا دور اور پھر سب سے آخر میں برصغیر کی تقسیم کے بعد پھر سے بھارت ورش اور پاکستان کا وجود میں آنا سب ایک تسلسل ہے وقت کا تسلسل، ٹوٹ پھوٹ کا تسلسل، تشکیلِ نو کا تسلسل، دکھوں اور مسرتوں کا تسلسل، پرانی تہذیبوں اور معاشرتوں کے بطون سے جدید سے جدید تر کی تشکیل کا تسلسل۔"
>
> (الفاظ۔ علی گڑھ جنوری اپریل ۱۹۸۸ء)

پھر جب وقت کی چھتری تلے تاریخ کے جبر میں یہ جبلّی تبدیلیاں جائز ہیں تو پھر نئے نئے ملکوں کے وجود میں آنے کا نوحہ کیسا؟ یہ تو انسان کی تقدیر ہے۔ اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر مظفر حنفی کہتے ہیں کہ تہذیب جب تاریخ کے جبر کا شکار ہو رہی ہے اور تاریخی تبدیلیاں اسے کسی نئی تہذیب سے ٹکرانے پر مجبور کرتی ہیں تو نئے تہذیبی افق نمودار ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک تاریخ ایک زمانی جبر کا نام ہے انقلاب آتے ہیں لیکن وقت کے دریا کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (قرۃ العین حیدر کا فن۔ قومی زبان۔ جنوری ۱۹۹۰ء ص: ۴۱) اتفاق سے نئے ملکوں کا وجود میں آنا بھی انقلاب کی ایک صورت ہوتی ہے مگر چوں کہ انسان پتھر کا نہیں بلکہ گوشت پوست کا بنا ہوا ہوتا ہے اس لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی سے پیدا شدہ تکالیف اور دکھوں پر

بلبلا اُٹھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ عام انسانوں کے مقابلے میں حساس انسانوں کا مقدر ہوتا ہے کمال بھی ایسا ہی کردار ہے۔ تمام تر مادی آسائشوں کے باوجود وہ اپنے آپ سے کہتا ہے .... میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی نوحہ گر۔ (ص: ۷۷۹)

کمال کی یہ سوچ عین فطری ہے اور اس صورت حال کی حقیقی عکاسی ہے جس کا آج دنیا کے بیشتر ممالک کے عوام کو سامنا ہے جو سیاسی اتھل پتھل اندرونی خلفشار اور تقسیم کے نتیجے میں ہجرت اور غریب الوطنی کا مقابلہ کر رہے ہیں اور جب انسان کے مقدر میں کچھ عذاب لکھے ہی ہیں تو اس کے اسباب و علل کے اظہار پر فنکار کو کیوں مطعون کیا جائے۔ فن کار کا یہ منصب ہے کہ صورت حال کی تبدیلی پر اور خوشگواریت کے ناخوشگواریت میں تبدیل ہو جانے پر ردعمل کا اظہار کرے ورنہ ناول یا افسانہ تحریر کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟ انسان کے داخلی جذبات سے ہی کردار نگاری کی نمو ہوتی ہے اس اعتبار سے ہجرت اور ناسٹلجیا کے حوالے سے کرب آمیز جذبات کی عکاسی بھی ناگزیر حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم آگ کا دریا میں ان پہلوؤں سے زیادہ اہم دوسرے نکات ہیں جن کا ناول میں تذکرہ آتا ہے اور وہی فلسفے، مابعد الطبیعات وغیرہ کے لحاظ سے ناول کو بلندی عطا کرتے ہیں۔ ان میں موت کا پہلو سرفہرست ہے۔ موت کے حوالے میرے بھی صنم خانے اور سفینۂ غم دل میں بھی تھے۔ آگ کا دریا میں وہ توسیع شدہ معنویت کے تحت موجود ہیں۔ گوتم سوچتا ہے کہ ایک دن تاریخ، ناموں کا تسلسل اور زمان و مکان سے نگل جائیں گے۔ بوڑھا کمال سوچتا ہے کہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ اس دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے! ایک دور میں وہ دونوں جب میڈیکل کالج سے گزر رہے ہوتے ہیں تو انھیں حیرت ہوتی ہے کہ اس میں ایک ہی وقت میں انسان پیدا ہو رہے ہیں اور مر بھی رہے ہیں۔ یہاں اسپتال کی علامتی حیثیت بڑی قابل ذکر ہے اس کو پھیلاؤ میں دیکھنے کے لیے ناول کے پلاٹ اسٹرکچر پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ہی کافی ہے۔ ان کی ساتھی نرملا کی موت انہیں ہلا دینے کے لیے کافی ہے اس تصور سے نرملا کے سب ہی ساتھی مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور اپنے اپنے فرسٹریشن میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں:

۔ کون کہتا ہے موت ماورائی ہے؟

۔ یعنی غور کیجیے کہ دوسروں کی موت پر پھکو پھکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

۔ اری نرملا کی بچی کہاں گیا تیرا فلسفہ اور آئیڈیالوجی مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

۔ موت سے زیادہ پھٹیچر اور سیکنڈ ریٹ بات کیا ہوگی؟

موت ہی کا دوسرا روپ جنگ ہے گوتم کو جنگ اور اس کے نتیجے میں بے گناہ انسانوں کی موت اور زندہ رہ کر تباہی اور اذیت کی زندگی بسر کرنے والے انسانوں کو دیکھ کر قلق ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیوں کہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں (ص: ۱۱۴) خود ناول کے آغاز میں ایک جنگ میں اس کے ہاتھوں کئی مخالف سپاہی مارے جاتے ہیں۔ اور اس کی انگلیاں کٹ جاتی ہیں۔ وقت کے جبر کا یہ روپ گوتم کو جس اذیت سے دوچار کرتا ہوگا اس کو قرۃ العین قاری کو متاثر کرنے کے لیے ایک دوسرے منظر میں بدل دیتی ہیں جب گوتم اسٹیج پر اپنی پرفارمنس ختم کرتا ہے تو سامعین کی اس کی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھ کر چیخیں نکل جاتی ہیں۔ جنگ ویسے بھی تباہی اور بربادی کی علامت ہے۔ تاریخ میں یقیناً کم ادوار ایسے آئے ہیں جب مفتوح دکھ کی نیند نہیں سوئے بلکہ انھوں نے سکون کا سانس لیا اور نہ جنگیں مفتوحین کو دکھ ہی دیتی آئی ہیں۔ جنگ کے

ہولناک تصوّر کے ساتھ ساتھ استحصال کا وہ تصوّر بھی "آگ کا دریا" میں تفصیل سے آیا ہے جب کہ برطانوی سامراج ہندوستان پر دوستی اور تجارت کے نام پر قبضہ جمالیتا ہے۔ سرل ایشلے جس کی تین نسلوں کو ناول میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے دراصل برطانوی سامراج کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس سے جو صفحہ ۲۲۵ سے لیا گیا ہے سامراجیت کی گھناؤنی شکل کی بہترین پیشکش ہے:

> "آٹھ جون ۱۷۹۸ء کو سرل ایشلے یک بیک چونک اٹھا اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم توڑ چکی تھی۔ اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرس دلّی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے ان پلانٹرس کے بھائی بند تھے۔"

اسی کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ چھالیہ، تمباکو، چاول، نمک اور دوسری اشیا کی تجارت پر کمپنی بہادر نے قبضہ جما کر قیمتوں کو بڑھادیا اور یوں برطانیہ امیر سے امیر تر ہو رہا تھا۔

قرۃالعین حیدر کے یہاں کوئی بھی واقعہ اسباب و علل کے کھیل کے دائرہ سے خارج نہیں ہے۔ ناول میں تاریخی واقعات کے براہ راست بیان یا علامتی انداز سے اس کی تشریح کے عقب میں اسباب کے اشارے بھی موجود ہیں۔ ایک جوگی گوتم سے کہتا ہے۔ "تمھاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ اس قوم سے اتفاق جاتا رہا ہے عالیجاہ اور جناب عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف رقعے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دلّی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتہ سے شرائط پر آمادہ ہیں۔" (۲۶۳) لیکن اس اقتباس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہ جو قرۃالعین حیدر وقت اور تاریخ کے جبر میں انسان کو جکڑا ہوا دکھاتی ہیں وہ اس قسم کی مثالوں کے بعد کیا اپنی اہمیت نہیں کھو دیتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک قوم کی جانب سے دوسری قوم کے خلاف سازشوں اور استحصال کے کھیل کے دوران مقامی سازشی لوگوں کی مفادات کے تحت کارفرمائیاں بھی انسانوں کی غلامی کے لیے ایک قسم کے اٹل جبر ہی کا کام انجام دیتی ہیں۔ ایسے واقعات تاریخ کی حقیقی جزئیات کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور اپنی فطرت میں یونیورسل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو قوموں کے نقشے تبدیل ہی کیوں ہوں؟ اور صرف نقشے ہی تبدیل نہیں ہوئے، نظریات، ایمان اور ضمیر سب کچھ تقسیم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک کردار روشن کہتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ ملک، انسان، نظریے، روحیں، ایمان، ضمیر، ہر شے تلواروں سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ (ص: ۵۳۷)

حیرت کی بات یہ ہے کہ "آگ کا دریا" کی تخلیق کے تین عشروں سے زیادہ عرصہ کے گزرنے کے بعد جب ہم آج کی نراجیت اور انتشار سے بھرپور دنیا کے سیاسی و معاشرتی حالات اور پھر جب نیم پرانے جمے جمائے ملکوں کی کوکھ سے نئے نئے ملکوں کے جنم لینے کی وارداتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ کے مقابلے میں ناول زیادہ بڑی آفاقی سچائیوں کا ترجمان ہوتا ہے۔

"آگ کا دریا" میں تنقیدی بحث و مباحثہ کے لیے بے تحاشہ نکات ہیں۔ اگر ہم سب کی کھوج کریں اور ان کی گہرائیوں میں ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کے حوالے سے اترنے کی کوشش کریں تو سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے والا مرحلہ درپیش ہوگا اس لیے کہ یہ ناول اردو ناول کی مہا بھارت ہے بذاتِ خود واقعات، فکر و فلسفے اور اس سے متعلق لاتعداد جزئیات سے بھرپور ایک ایسا دریا ہے جس کو عبور کرنے کے لیے ڈوب کے جانا شرط ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب "اردو ناول کی تاریخ و تنقید" مطبوعہ میری لائبریری لاہور ۱۹۶۶ء میں اس کو زیر بحث لاتے ہوئے بجاطور پر لکھا ہے کہ اس وسیع ناول کی تعمیر و تنظیم نہایت بلند ذہنی سطح پر ہوئی ہے ہزاروں سال پرانی ثقافت کی تصویریں فلمی مناظر کی طرح دکھائی گئی ہیں لیکن اس کا جوڑ اس چابکدستی سے ملایا گیا ہے کہ تسلسل میں کہیں ضعف نہیں آتا۔ (ص: ۳۴۰) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو ناول میں یہ باتیں پہلی بار سننے میں آئی ہیں۔ ناول کی یہ وسعت ہی مطالبہ کرتی ہے کہ اس پر مقالے کے بجائے پوری پوری کتاب ہی لکھی جائے تاکہ تمام ابعاد DIMENSIONS کا احاطہ ہو سکے۔ بہر صورت یہاں ان چند پہلوؤں ASPECTS کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے جو زیادہ اہم ہیں۔ اور جن کے بغیر ناول کے مکمل ماجرائی، موضوعاتی اور فکری ڈھانچہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ البتہ اس ناول کی اس خوبی کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے کہ شعور کی رو کے مدھم استعمال، مختلف تیکنکوں کے بیانیہ میں ادغام، واحد متکلم کے مباحث و تبصروں اور اہم کرداروں کے اندرون سے بلند ہونے والی آوازوں اور ذات سے ہمکلامی کی گونجوں کو بڑے حسن اور سلیقے سے انھوں نے ماجرہ کی جدّت آمیز اور قابلِ قبول فنی تشکیل کو گوتم نیلمبر کی سوچوں اور عمل ACTION کے حوالے سے ایک منفرد ماڈرن ناول کی ہیئت عطا کی ہے اس سے ایک جانب تو جدیدیت یعنی MODERNITY کی حرمت اور وقار میں اضافہ ہوا اور دوسری جانب بقول پروفیسر شمیم احمد اس نے ایسی تخلیقی سرگرمی کو پیدا کیا جو اردو کے بہترین جوہر پر اثرانداز ہوئی۔ جس نے ناول نگاری کو ایک نئی جہت اور نیا معیار عطا کیا۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے جو "تخلیقی ادب" کے شمارہ نمبر ۲۔ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا انھوں نے ان جانے پہچانے فنکاروں کے نام بھی دیے جنھوں نے اس ناول سے متاثر ہو کر لکھا یعنی اسے رجحان ساز ناول قرار دیا۔ بہر صورت ایک حقیقت جس پر ابھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ پورا ماجرہ یا پلاٹ گوتم نیلمبر کی سوچوں اور ایکشن تلے ڈھالا گیا ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ گوتم نیلمبر جو کہ ہندوستان کی تہذیب کی روح ہے، جو جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور جو معمولی بات کو بھی ڈرامائی اور فلسفیانہ انداز سے پیش کرتا ہے اور جو دعویٰ کرتا ہے کہ مغرب کے مفکرین کیا جانیں کہ ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں اسی کے تذکرے پر یہ تحریر بالکل اسی طرح اختتام سے ہمکنار ہو جس طرح کہ ناول میں بھی اسی پر ماجرہ تمام ہوا ہے۔ دراصل اس کے آغاز میں بھی گوتم نیلمبر چھایا ہوا تھا۔ ہری شنکر سے اس کی ملاقاتیں اور مختلف فلسفیانہ نظریات پر ازل، ابد، روح، جسم، مادہ، موت اور آزادی کے حوالوں سے اس سے بحثیں ناول کے عمومی موڈ MOOD کی تعمیر کر دیتی ہیں اور پھر تمام بحثیں سمٹ کر اسی ایک سوال میں مرتکز ہو جاتی ہیں کہ کیا دکھوں کا خاتمہ ممکن ہے یعنی کیا نروان ممکن ہے؟ یہ ہی ایک معمہ ہے جسے گوتم آخر تک حل نہیں کر پاتا... پاکستان اور ہندوستان اب دو ملک ہیں جس قدر سیاسی، سماجی، اقتصادی، نظریاتی اور جغرافیائی انفصال پتھل تھی اس کا بیان ہو چکا ہے اب یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

> "وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے

زندگی میں پہلی بار خیال آیا کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج،
نفرت، فرار کی خواہش وسعت اور اضافیت کا تصور، نروان۔ جو زندگی سے موت سے،
سونے جاگنے، محبت، رحم اور لا تعلقی سے ماورا ہے۔ اور پھر بھی حقیقی ہے۔
محرومیت صفر.... صفر...."

گوتم کو نروان کی تلاش ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بے چین و بے قرار روحوں کو جن کے دکھوں کو مغربی مفکرین نہیں سمجھ سکتے نروان مل جائے؟ یہ سوال آخر تک بلا جواب قائم و دائم رہتا ہے وقت جو چوٹ دے کر گزر جاتا ہے اور ہم تڑپ کر رہ جاتے ہیں کیا ہمیں نروان عطا کر سکتا ہے؟ ناول کے آغاز میں باسٹھ فلسفوں کی یلغار میں گوتم کو تنہا بتایا گیا تھا اب آخری سطروں میں اس کی سوچ کی یہ تصویر ابھرتی ہے۔-- اس نے دیکھا چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش، پر امید، ڈھائی ہزار سال بعد انسان باسٹھ سے کہیں زیادہ فلسفوں کی زد میں ہے اور وقت و تاریخ کی ضربوں سے انسان چور چور ہے۔ تو کیا ایسا تو نہیں ہے کہ قرۃالعین حیدر کا وژن VISION ہی یہ ہو کہ وقت کی حشر سامانیوں کے درمیان تہذیبوں کے بننے اور بگڑنے کے پروسیس PROCESS میں انسانی زندگی دکھ سکھ، راحت و تکلیف، امید اور ناامیدی کا سنگم ہی رہے گی۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وقت اور تاریخ اور ماضی و حال کے شدید حملے ONSLAUGHT کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دکھ کو سکھ میں، تکلیف کو راحت میں اور ناامیدی کو امید میں بدلنے کی کوشش کرتا رہے۔ ناول میں زندگی کی بصیرت اسے فکری اعتبار سے رجائیت عطا کرتی ہے جو اس پُرآشوب دور میں نہ صرف قدر و قیمت کا حامل ہے بلکہ قرۃ العین حیدر کی فنی و فکری بصیرت کی دلالت بھی کرتا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی اپنی کتاب "قرۃالعین حیدر کا فن" مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء میں اپنے مضمون "آگ کا دریا" میں یہ اعتراف کرنے کے بعد بھی کہ گوتم کی بالکل آخری سطروں میں یہ سوچ کہ .... زمین تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا.... ناول کے ہیرو کے حوالے سے مصیبتوں اور آزمائشوں کے درمیان زندہ رہنے، آگے بڑھنے، کچھ پانے کے احساس اور حیات کے ارتقا کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ناول نگار کا مقصد زندگی کا کوئی مخصوص فلسفہ پیش کرنا نہیں، نہ وہ ایسا کرنے کی اہل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے جب یہ اعتراف کر لیا کہ گوتم کی یہ سوچ انسان کو عزم کے سہارے زندہ رہنے کی جانب اشارہ کرتی ہے اور حیات کے ارتقا کا بھی احساس دلاتی ہے تو پھر یہ کہنے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ قرۃالعین حیدر کا مقصد زندگی کا کوئی مخصوص فلسفہ پیش کرنا نہیں۔ بہر صورت "آگ کا دریا" ہمارے ناول کی دنیا کی ایک منفرد، یادگار، بامعنی اور ناقابلِ فراموش تحریر ہے۔ اس کی یہ حیثیت غالباً ہمیشہ برقرار رہے گی۔ کچھ ناقدین کو ابھی تک یولیسیس ULYSSES کی سطح کے ناول کا انتظار ہے ان کی یہ خواہش بجا ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ "آگ کا دریا" اردو ادب میں "یولیسیس" کا پیش خیمہ ثابت ہو۔-- خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ناول کی دنیا میں کسی قسم کا جمود STALEMATE طاری نہیں ہے۔

قومی زبان (۴۶) مارچ ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر مظفر حنفی

کچھ اردو ڈرامے کے بارے میں

(مغربی بنگال کے خصوصی حوالے سے)

کسی نے ایک سائیس سے کہا بھائی، تم جس گھوڑے کو بھی اپنی نگرانی میں لیتے ہو وہی بجلی کی طرح تیز طرار ہو جاتا ہے کچھ اس کا راز ہمیں بھی بتاؤ سائیس نے سینہ پھلا کر جواب دیا میاں یہ کوئی بی۔ اے، ایم۔ اے کرنا نہیں ہے کہ جب جی چاہا پاس کر لیا، سائیسی علم دریاؤ ہے صرف سینہ بند کسنے کا ہنر برسوں میں آتا ہے اس لحاظ سے ڈرامہ کم از کم علم سمندر قرار پاتا ہے جس پر قلم ایسے شناوروں کو ہی اُٹھانا چاہیے جو برسوں سے اس سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں لیکن کیا کیجیے کہ اردو ادب، جس کا دامن دیگر معاملات میں خاصا وسیع ہے، ڈرامہ جیسے سمندری علم کے سلسلے میں بے حد کوتاہ ثابت ہوا اور کسی بھی دور میں اچھے ڈرامہ نگاروں کی تعداد گننے کے لیے ایک ہاتھ سے زیادہ انگلیوں کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ جب ڈرامے کی تخلیق میں صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس مخصوص صنفِ ادب کے نقادوں کا ہمارے ہاں قحط ہونا چاہیے اور یہی قحط تنقیدی جواز بنتا ہے، ہم جیسے طالبانِ ادب کی اس فن شریف کے بارے میں اظہار خیال پر آمادگی کا... یہاں واضح کرتا چلوں کہ نعیم احمد اور ان جیسے دو ایک نوجوان قلم کاروں کی ڈرامے سے متعلق تحریریں میری نظر سے گزرتی رہی ہیں جن میں بیشتر اداکاروں اور ڈراموں کی پیش کش پر تاثرات ظاہر کیے جاتے ہیں لیکن عرض کرنے دیجیے کہ کلکتہ یا مغربی بنگال ہی نہیں پوری اردو دنیا میں ڈرامہ بحیثیت مجموعی تاحال اپنے نقاد کا انتظار کر رہا ہے۔

اردو ادب کی دوسری اصناف کے مقابلے میں ڈرامہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل صنف ہے دیگر اصناف میں تخلیق کا مشاہدہ، شدت احساس اور قوتِ اظہار کی اگر اس مخصوص صنفِ ادب کے ساتھ تال میل بیٹھ جائے تو شاہکار وجود میں آتا ہے۔ ڈرامے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہر چند کہ اسکرپٹ ڈرامے کے لیے اساسی اہمیت رکھتا ہے (ظاہر ہے کہ یہاں ڈرامے سے میری مراد اسٹیج ڈرامہ ہے) لیکن اگر اسکرپٹ کو اچھا ہدایت کار، ماہر اداکار حسبِ حال کاسٹیوم، ترقی یافتہ اسٹیج، پر تاثیر موسیقی اور اسی نوع کے دیگر متعدد لوازمات دستیاب نہ ہوں تو ڈرامہ نگار کی ساری محنت اکارت جاتی ہے اور ناظرین سے کٹ کر یہ ڈرامہ کاغذ کے صفحات پر دھرا رہ جاتا ہے جس کی جیتی جاگتی مثالیں اردو میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انار کلی" اور پروفیسر مجیب کے "آزمائش" اور "خانہ جنگی" جیسے ادبی ڈراموں میں دیکھی جا سکتی ہیں دراصل اچھا ڈرامہ ایک پوری ٹیم کی ماہرانہ اور اجتماعی کاوشوں کا ثمرہ ہوتا ہے۔ ہم اردو والوں میں مل جل کر بڑے کام کرنے کی روایت بہت کمزور ہے زیادہ تر قابلِ ذکر ادبی خدمات انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہیں لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ڈرامے جیسے پہلو دار صنف ادب بہت سے لوگوں کا اشتراکِ عمل چاہتی ہے، اسی لیے دوسری

اصناف کے مقابلے میں یہ صنف نحیف رہ گئی۔

مقام شکر ہے کہ برصغیر ہندو پاک کے وسیع تناظر میں جب ہم مغربی بنگال بطورِ خاص کلکتہ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو اسٹیج ڈرامے کی صورت حال اتنی زیادہ مایوس کُن نظر نہیں آتی۔ اس خطّے میں کتابوں تک محدود رہ جانے والے ادبی ڈراموں کی بہ نسبت وہ عوامی ڈرامے زیادہ تخلیق کیے جا رہے ہیں جنھیں اسٹیج اور ناظرین بھی میسر آتے ہیں اور کیوں نہ ہو، اردو ڈرامے کے سب سے بڑے قلم کار آغا حشر کاشمیری کی جولاں گاہ یہی علاقہ رہا ہے حالانکہ اسٹیج ڈرامے کی جڑیں یہاں اس سے بھی گہری گئی ہیں اور ان کا سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ڈرامے کی یہ عمارت چونکہ تجارتی بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھی اس لیے ابتدا ہی سے اس میں بازاری ضروریات کا زیادہ لحاظ رکھا گیا چنانچہ ایرے غیرے کی بات میں نہیں کرتا، آغا حشر کے ڈراموں کو ہی لیجیے جنھیں اردو کا شیکسپیئر قرار دیا گیا۔ کیا واقعتاً ان کے ڈراموں میں وہ گہرائی، دروں بینی اور کیتھارسس کی کیفیت ہے جو شیکسپیئر کے ڈراموں کا خاصہ ہے البتہ حشر کے ان ڈراموں نے ناظرین کی صفوں میں حشر ضرور برپا کیا جس سے کمپنیوں نے خوب خوب منافع کمایا۔ حشر کے علاوہ نرائن پرشاد بیتاب، کاظم حسین نشتر، سلیمان آصف، وحشت دہلوی اور آرزو لکھنوی وغیرہ بھی آزادی ہند سے قبل مغربی بنگال میں ڈرامے کی تخلیق اور ارتقاء میں حصّہ دار تھے چوں کہ ان لوگوں کے ڈرامے تاجرانہ مقاصد کے پیشِ نظر بڑی تھئیٹریکل کمپنیوں کے اسٹیج پر کھیلے جاتے تھے اس لیے اچھے ہدایت کار اور اداکاروں کی معاونت بھی انھیں حاصل رہتی تھی جن کی روشنی میں اس عہد کو اردو ڈرامے کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔

افسوس کہ ڈرامے کا یہ عہدِ زریں تقسیم ہند کے نتیجے میں معدوم ہو کر رہ گیا اور کلکتہ میں اردو ڈرامے کی پیش رفت کم و بیش دو دہائیوں کے لیے تھم سی گئی اس ٹوٹی ہوئی ڈور کا سرا جوڑنے کا سہرا نیاز احمد خاں اور خلیل الرحمٰن خلیل کے سر ہے جنھوں نے خاصی بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے لیکن انھیں پیش کرنے کے لیے اب اردو والوں کے پاس کورن تھیمن، الفنسٹن تھیٹر، الفریڈ تھیٹر جیسے شاندار اسٹیج نہیں رہ گئے تھے اس موقع پر مسلم انسٹی ٹیوٹ ایران سوسائٹی، بطور خاص اوّل الذکر کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے جہاں سے وقتاً فوقتاً اردو ڈرامے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی۔ اسٹیج ہوتے رہے۔ کچھ ڈرامے تعلیمی اداروں مثلاً مولانا آزاد کالج، سینٹ زیوئرس کالج وغیرہ میں بھی منظر عام پر آئے۔ آگے چل کر کمال احمد، ظہیر انور، عزیز احمد عزیز وغیرہ نے مغربی بنگال میں نہ صرف اردو کے اسٹیج ڈرامے کا دامن وسیع کیا اور تیزی سے بدلتے ہوئے سماج کی خام کاریوں کو اپنا ہدف بنایا بلکہ کمال احمد اور ظہیر انور نے کل ہند سطح پر اپنے ڈراموں کے مجموعوں کی وساطت سے ادبی حلقوں کو متوجہ بھی کیا پھر انیس رفیع، فیروز عابد، صدیق عالم، یسٰین اجنبی، جاوید دانش، قیصر شمیم، ع۔ رشید اور ان جیسے درجنوں دوسرے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اپنے طبع زاد اور ترجمہ شدہ ڈراموں سے اردو ادب کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے، ہرچند کہ ان میں سے بیشتر کو اسٹیج کی روشنی اور ناظرین کی تالیاں تاحال نصیب نہیں ہوئیں۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کلکتہ کے پداتک تھیٹر، ایکتا کلچرل آرگنائزیشن، لافسکی آرٹس، شرجیل آرٹس، ایکو ڈرامیٹک گروپ، پارک سرکس کلچرل فورم، پرتی بمب، کلکتہ ایکشن گروپ اور موڈرن آرٹس، رانی گنج کے ادا ڈرامیٹک ایسوسی ایشن، نیو ادا ڈرامیٹک گروپ، گلشی کے تاج ڈرامہ گروپ اور تاج ڈرامہ پروڈکشن نیز آسنسول کے ٹرپل اے۔ کے پروڈکشن کی خدمات کا اعتراف کرنا بھی لازمی ہے کہ ان کی اجتماعی کاوشوں سے چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے بہت سے ڈرامے ناظرین تک پہنچے ہیں ان حالات کی روشنی میں اپنی اصابت رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم اردو کی حد تک بنگال کا اسٹیج ڈرامہ دوسرے علاقوں سے بہت آگے ہے اور یہاں اس پیچیدہ و بلیغ صنف کا مستقبل

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ روشن ہے۔

اب خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سنیے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ڈرامے کے عہد زریں میں کبھی آغا حشر اور ان کی صنف کے دوسرے لکھنے والے بازار کی ضرورت اور تاجروں کی منفعت کے پیش نظر لکھتے تھے چنانچہ ان کے ڈراموں میں سوقیت، عامیانہ پن اور سطحیت کا در آنا لازمی تھا تقسیم ہند کے بعد نیاز احمد خاں اور ان کی نسل کے دوسرے ڈرامہ نویسوں کے نزدیک تعلیم و تدریس اور طلبہ کی تربیت کا فریضہ سب سے اہم تھا نتیجتاً ان لوگوں کے ڈراموں میں مقصدیت حاوی ہوتی چلی گئی۔ اس حد تک کہ فن پارے پر پروپیگنڈے کا گمان ہونے لگا۔ میرے نقطۂ نظر سے بھی سماجی مقصدیت کے بغیر فن پارہ بے جان ہوتا ہے لیکن اگر مقصدیت پھول میں خوشبو کی طرح نادیدہ رہ کر محظوظ کرنے کے بجائے لیبل بن کر فن پارے کی پیشانی پر چسپاں ہو جائے تو اسے یقیناً خامی سمجھنا چاہیے اور یہ خامی نیاز احمد تا حال لکھنے والوں کے اکثر ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے ڈرامے کے عام پسند ہونے کا اتنا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اکثر فن پارے دروں بینی اور گہرے تاثر سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس موقع پر میں اپنے کئی دوستوں کی خفگی کا خطرہ مول لے کر عرض کروں گا کہ نیاز صاحب نے بحالتِ مجبوری ہی سہی ایک ایسی روایت کو بھی جنم دیا جو ڈرامے کے حق میں زیادہ مفید نظر نہیں آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسٹیج ڈرامے کا مثلث تین زاویوں سے ترتیب پاتا ہے اسکرپٹ، ڈائریکشن اور اداکاری، خاں صاحب موصوف نے ان تینوں زاویوں کو برابر کی اہمیت نہیں دی اور ان کے بعد آنے والی نسل کے بیشتر ڈرامہ نگاروں نے بسا اوقات اپنے ڈراموں کی ہدایت کاری کا منصب بھی خود ہی سنبھال لیا بلکہ بعض صورتوں میں تو انھوں نے ڈرامے کے کسی مرکزی یا اہم کردار کا رول بھی خود ہی ادا کیا ظاہر ہے جب ایک زاویہ مکمل مثلث بننے کی کوشش کرے گا تو فن ضرور مجروح ہوگا اچھے ڈرامہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سماج کا وسیع مشاہدہ بھی رکھتا ہو اور مسلسل مطالعہ بھی کرتا ہو پچھلی چھ سات دہائیوں میں جدید ڈرامے کی اہم ترین تحریکات، حقیقت نگاری، علامت نگاری، اظہاریت، امپریشن ازم، سرئیلزم، منظوم ڈرامہ، ڈریم پلے، پولیٹکل تھیٹر، ٹوٹل تھیٹر، ابسرڈ ڈراما، ایپک تھیٹر وغیرہ پروان چڑھیں اگر ہمارے ڈرامہ نگاروں کی نگاہ ان تحریکات پر نہیں ہے تو ان کی تخلیقات میں وسعت اور گہرائی کا فقدان رہے گا اچھا ڈرامہ لکھنے کے لیے ابسن، اسٹرینڈ برگ، شا، چیخوف، لورکا، گورکی، بریخت، انطونی، ارتو، سارتر، بیکٹ، پرانڈیلو، کافکا وغیرہ کے شاہکار اگر براہِ راست نہیں تو ترجمے کے وسیلے سے ہی ہمارے مطالعے میں رہنے چاہئیں پھر اردو کے اپنے ڈرامہ نگار ہیں۔ قدیم نسل کی تخلیقات کے علاوہ آج کے مرزا ادیب، حبیب تنویر، محمد حسن، کرتار سنگھ دگل، رفعت سروش، زاہدہ زیدی، بلونت گارگی، اُپندر ناتھ اشک، ابراہیم یوسف، اظہر افسر، انیل ٹھکر، ساگر سرحدی اور اس نوع کے بہت سے دیگر ڈرامہ نویسوں کی تخلیقات سے کسبِ فیض اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب نئی نسل کے ڈرامہ نگار اپنے آپ کو صرف لکھنے پڑھنے کے لیے وقف کر دیں اگر انھوں نے ہدایت کاری اور اداکاری کا منصب بھی خود ہی سنبھال لیا تو پڑھنے لکھنے کے لیے وقت ظاہر ہے کم رہ جائے گا اور ان کا ڈرامہ پھس پھسا ہو جائے گا کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ مستثنیات سے ہٹ کر آج کے اکثر ڈراموں میں پر زور تصادم نہیں پایا جاتا اگر ڈرامے میں دو یا اس سے زاید متخالف قوتوں میں زبردست ٹکراؤ یا متضاد نظریات میں شدید کشاکش نہیں پائی جاتی تو آپ ناظرین کو اس شش و پنج اور (SUSPENSE) سسپنس کی کیفیت میں کیسے مبتلا کر سکتے ہیں جس سے گزر کر ڈرامہ اپنے کلائمکس کو پہنچتا ہے اور دیکھنے والوں کو کیتھارسس سے دوچار کرتا ہے؟

ایسی ہی بہت سی باتیں ہدایت کاری اور ایکٹنگ کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہیں لیکن چونکہ یہ میرا میدان نہیں اس لیے دوسروں پر چھوڑتا ہوں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اداکاری [illegible]

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال

رُوح افزا

مشروبِ مشرق

سعودی عرب کی خبریں

نعیم حامد علی

سعودی عرب میں اردو شعر و ادب

زلفِ خیال نازک و اظہار بیقرار
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

(غالب)

۱۹۸۶ء کے نصف اوّل میں جب میں نے اپنے شعری مجموعے "پیکر نغمہ" کے لیے مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ خیال سرِ فہرست تھا کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۶ء تک کی اُن تمام شخصیات و شعرا کا تفصیلی ذکر کروں جو ارضِ حرمین شریفین میں اردو زبان اور شعر و ادب کی ترویج و فروغ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے پیش پیش رہے ہیں۔

اس سلسلے میں شعرا کے کوائف و کلام کے حصول کے لیے میں نے ایک سوال نامہ مرتب کر کے اُن کی خدمت میں ارسال کیا۔ شعرا حضرات نے مطلوبہ کوائف و کلام کی ترسیل میں توقع سے بڑھ کر تعاون کیا۔ شعرا کے کلام و کوائف کے حصول کے بعد جب میں نے زمانی ترتیب کے ساتھ لکھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ اگر منصوبے کے مطابق اس مضمون کو لکھا گیا تو میری کتاب "پیکر نغمہ" تذکرۂ شعرا میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لیے اختصار سے کام لینا پڑا۔

پھر جب جناب شعیب سکندر اور سعود ہاشمی نے ۱۹۹۲ء میں ایک مشاعرے کے انعقاد کے موقع پر ایک یادگاری مجلّہ نکالنے کا پروگرام بنایا تو مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس یادگاری مجلّے کے لیے سعودی عرب میں اردو زبان اور شعر و ادب کے فروغ سے متعلق پاک و ہند کے تارکانِ وطن کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ تحریر کروں۔ اس راہ میں بہت سی دشواریوں کے باوجود حامی بھر لی۔ مجلّے میں طویل بیان کی گنجائش نہیں ہوتی، لہٰذا حد درجہ اختصار ملحوظ رکھا گیا ہے۔

الریاض، سعودی عرب کا دارالسلطنت ہے۔ ریاض میں اردو کے شیدائی ۱۹۵۴ء سے قابلِ لحاظ تعداد میں مقیم رہے ہیں لیکن جب سے پاکستان و ہندوستان کے سفارت خانے ریاض میں منتقل ہوئے اور سعودی عرب میں ہمہ جہت ترقی کا دور شروع ہوا تو یہاں کے کثیر القومی تعمیراتی و تجارتی اداروں میں بالعموم اور پاکستانی و ہندوستانی کمپنیوں میں بالخصوص اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے حامل اشخاص کی کثیر تعداد بسلسلۂ ملازمت ریاض میں سکونت پذیر ہوئی۔ جب ان حضرات کو معاشی و معاشرتی استقرار حاصل

ہوا تو وہ اپنی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور نتیجتاً جن ادبی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا ان میں سرِ فہرست "بزمِ اقبال" ریاض ہے۔

بزمِ اقبال کی تاریخ تاسیس ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء ہے برم کے معتمد عمومی جناب بشیر احمد عابد ہیں۔ پہلے صدر جناب خالد محمود سید تھے۔ ۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء کو جناب ڈاکٹر حنیف شاہد بزمِ اقبال کے صدر منتخب ہوئے۔ جناب محمد حنیف شاہد ماہر اقبالیات ہیں اور علامہ اقبال پر اہم و قیع کتابیں تصنیف کی ہیں۔ "بزم اقبال" کی ادبی نشستوں میں جو مقالے وقتاً فوقتاً پڑھے گئے ان میں "اقبال کا تصورِ علم و ادب"، غالب اور اس کی شاعری"، فیض احمد فیض اور احمد فراز"، مستیِ گفتار اقبال کے کلام میں"، اقبال اور قرآن" اہم ہیں۔ بزم اقبال میں پڑھے گئے مقالوں کی تعداد کثیر ہے طوالت کے خیال سے چند نام درج کیے گئے۔

انجمن ثقافتِ پاکستان۔ ریاض ۱۹۸۲ء میں قائم کی گئی۔ انجمن کے سرفہرست صدر شہزادہ سلطان بن فیصل بن ترکی آلِ سعود ہیں۔ پاکستان سفارت خانے کے ناظم الامور محترم انیس الدین صاحب پہلے وائس چیئرمین تھے۔ مندرجہ ذیل حضرات نے بالترتیب معتمد عمومی کے فرائض انجام دیے۔

جناب اسلام الدین آغا، جناب شاہ چغتائی، جناب سردار محمد یوسف خاں، انجمن ثقافت پاکستان کے موجودہ صدر ایک اچھے مقرر اور نہایت محبوب شخصیت کے مالک انجینئر احمد بلال محبوب ہیں۔ انجمن ثقافت پاکستان ریاض ہمہ جہت و فعال تنظیم ہے اور اعلیٰ معیار کی علمی و ادبی تقاریب منعقد کرتی ہے۔

"بزم فانوس" ریاض انجمن ثقافتِ پاکستان کے نقش قدم پر چلتی رہی ہے۔ اس کے بانی جناب اسلام الدین آغا ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے کے کمیونٹی ویلفیئر اتاشی جناب خالد نصیر بزم فانوس کے سرپرست اور عباس ملک معتمد عمومی ہیں۔ بزم فانوس کے زیر اہتمام ماضی میں بہت اچھے مشاعرے منعقد ہوئے ہیں۔ آج کل فعال نہیں ہے۔

"بزم احباب دکن" ریاض۔ اس بزم کا نام تو علاقائی ہے مگر کردار آفاقی رکھتی ہے۔ بالخصوص مسلمانانِ برصغیر کو ایک دوسرے کے مزید قریب لانے میں کوشاں و کامیاب ہے۔

"شام اقبال" اور "یاد جامی" (خورشید احمد جامی ۱۹۱۵۔ ۱۹۷۰ء) جیسی ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کرتی رہتی ہے۔ "بزم احباب دکن" ریاض کی اہم و فعال شخصیات کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ جناب صفدر حسین طنز و مزاح نگار ادیب، محترمہ ڈاکٹر عطیہ انصاری، جناب میر فراست علی خسرو، جناب میر احمد علی، محترمہ نجمہ افضل حیدر آبادی

سید ابو ظفر صاحب جدہ میں ادبی محفلیں سجانے میں پیش پیش تھے۔ آج کل ریاض میں خدمت اردو میں منہمک ہیں۔ سید ابو ظفر صاحب کے مکان پر تنقیدی نشستیں مشاعرے، جشن ہائے ادبا شعرا تسلسل سے منعقد ہوتے ہیں۔

انجینئر احمد بلال محبوب، قمر حیدر قمر، منیر پرویز، محمد حفیظ قریشی، سید منیف اشعر، مشتاق شاد، پروفیسر اقبال بیگ اعجاز، شمشاد صدیقی، ڈاکٹر راشد فضلی، سید حسام احمد، حفیظ کیفی، شمس الحق نوشاد، راشد صدیق، مرزا سلطان بیگ، ریحان اظہر، شہود ہاشمی، آفتاب شیخ، مرزا بشیر، مجاہد ملک، کاوش عباسی، رشید صدیقی، شبنم مناروی، محترمہ نجمہ شاہین نجمی، محترمہ نگار خالد نگار۔

مندرجہ بالا ادیبوں شاعروں اور ادب دوست شخصیات کی اجتماعی اور انفرادی کوششوں نے ریاض کو اردو ادب کا "گلشن ہمیشہ بہار" بنا دیا ہے۔

مندرجہ ذیل محسنانِ اردو گو اب ریاض میں نہیں ہیں مگر ان کی یادیں اور کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔

اسلام الدین آغا، انیس الدین احمد، شاہد چغتائی، سردار محمد یوسف خاں، ونگ کمانڈر منظور ہاشمی، عبداللطیف، خالد نصیر، ہمایوں اختر، محمود خاور، افتخار بارک، حسین امام، سہیل فاروقی، محترمہ گلنار آفریں، فسیم اعظمی۔

اوورسیز پاکستانی رائیٹرز فورم۔ الدمام/الخبر

چند سال سے مذکورہ بالا فورم کے حوالے سے منطقہ الشرقیہ میں اردو شعر و ادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی کامیاب کوششوں کی دل خوش کن اطلاعات ہمیں اخباروں کے ادبی صفحات سے مل رہی ہیں۔ ادبی نشستوں اور مشاعروں کی رپورٹوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ علمی و ادبی صلاحیتوں کے اشخاص بہم ہو گئے ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں توجہ دی جا رہی ہے۔ طرحی مشاعروں کی روایت کو مذکورہ "فورم" نے حیاتِ نو دی ہے۔ مندرجہ ذیل مصرع ہائے طرح پر مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔

۱۔ ہم وہ کہ ہم کو ساری خدائی کی فکر ہے (کرّار نوری)

۲۔ چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا

۳۔ ورنہ یہ زندگی کا سفر رائیگاں تو ہے (منیر نیازی)

ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ الدمام/الخبر اور ریاض کے شعرا و ادبا اردو ادب دوست حلقوں میں قابلِ تقلید تعاون و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جناب سیّد ابوظفر کے دولت کدے پر ریاض میں الدمام کے پروفیسر ذکاء الرحمٰن ذکاء صدیقی کے اعزاز میں شامِ ذکا منائی گئی۔

جناب ذکا صاحب شاعر و نثر نگار ہیں۔ ریاض کے ڈاکٹر راشد فضلی اور دمام کے سیّد محمد یونس اعجاز نے ذکا صاحب کی شخصیت و فن پر مقالے پڑھے اور "ریاض" کے مشتاق شاد صاحب نے ذکاء صاحب پر ایک نظم بعنوان "کانِ نمک" پڑھی۔ خود اپنے بارے میں ذکاء صاحب کا لکھا ہوا مضمون بعنوان "من کہ باشم" سیّد قمر حیدر قمر نے پڑھ کر سنایا۔ بعد ازاں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی اور اس میں ذکاء صاحب کو خوب خوب سنا گیا۔

اوورسیز پاکستانی رائیٹرز فورم الدمام/الخبر کے عہدیداران کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سیّد محمد یونس اعجاز (مرکزی صدر، اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۲۔ سیّد جاوید علی شاہ (مرکزی جنرل سیکریٹری اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۳۔ پروفیسر اقبال نواز (سینئر نائب صدر اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۴۔ جناب زین صدیقی (سینئر نائب صدر اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۵۔ محمد عاصم صدیقی شاعر و افسانہ نگار (نائب صدر اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۶۔ اقبال احمد قمر، شاعر و افسانہ نگار (سینئر سیکریٹری جنرل اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

۷۔ محترمہ ریحانہ روحی صاحبہ (صدر شعبہ خواتین اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم الدمام)

الدمام/الخبر کے ادبا شعرا اور ادب دوست شخصیات کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ پروفیسر ذکاالرحمٰن ذکا صدیقی، محترمہ نگہت مرزا حنا، میاں مظہر قسیم مظہر، پروفیسر واصل عثمانی، سیّد اقبال طالب، سیّد عتیق انجم، نعمان منظور نعمان، اقبال فرید میسوری، نگہت فرید صاحبہ، انور کاظمی، مرزا جواد علی بیگ، افضل خاں، سہیل کمال چشتی، احمد عرفان لکھنوی، طارق محوی، جاوید اختر جاوید، سعید جلال آبادی، طارق اقبال بٹ، الطاف علیم، تسنیم شمیم، صہیب مظفر ہاشمی، ڈاکٹر شکیل۔

"بریدہ"

۸ جنوری ۱۹۹۱ء کے "جنگ" کراچی میں شائع شدہ رودادِ مشاعرہ سے یہ معلوم ہوا کہ سعودی عرب کے معروف شہر "بریدہ" میں پاکستانی و ہندوستانی اہلِ شعر و ادب کا لگایا ہوا اردو کا شجرِ طیبہ نمو پذیر ہے۔ جناب شمشاد احمد، پیرزادہ آل نبی فاروقی فاروق، رفعت لکھنوی، ترنم نولپوری، محمد فاضل امروہوی، ایوب دہلوی، نسیم نجیب آبادی، ایوب عالم شیر کوٹی، محمد جاوید نجیب آبادی، بابو امروہوی، اکرم حسن پوری، عمران لاہوری، زاہد دہلوی۔

اسمائے مرقومہ بالا کی حامل شخصیات کو لشکرِ اردو کا ہر اول دستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ کامیابی و نصرت انشااللہ ہم رکاب رہے گی۔

"طائف"

ماضیٔ قریب میں سعودی عرب کے معروف شہر "طائف" میں "ادبی فورم" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ "ادبی فورم" کے روحِ رواں اور سیکریٹری جنرل انجم اقبال ہیں۔ "ادبی فورم" نے اپنے سفر کا آغاز طائف میں پہلے اردو مشاعرے کے انعقاد سے کیا ہے۔ مذکورہ مشاعرے میں جدہ سے یاد صدیقی نسیم سحر اور سجاد بابر نے شرکت کی۔ صدارت جدہ سے مدعو کیے گئے شاعر سعید ظفر مہدی نے فرمائی۔ طائف کے شعرا کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

لطیف احمد خاں، شفاعت صدیقی انجم، سیّد محمد احمد نقوی، انجم اقبال، خوشنود حسین انجم۔

"عَرعَر"

اردو شعر و ادب کے حوالے سے تازہ ترین خوشخبری ۲۹ ستمبر ۱۹۹۲ء کے "سعودی گزٹ" جدہ سے ملی ہے کہ شمالی سعودی عرب کے شہر "عرعر" میں اسیرانِ گیسوئے اردو مشاطگیٔ عروسِ سخن میں منہمک ہیں۔ مذکورہ بالا اخبار میں شائع شدہ روداد کے مطابق ۲۴ ستمبر ۱۹۹۲ء کو "احبابِ بزمِ سخن" عَرعَر کے زیر اہتمام عَرعَر میں مقیم شاعر محترم رحمت اللہ جاری کے دوسرے شعری مجموعے "فصلِ دل" کی تقریبِ اجراء منعقد ہوئی۔ محترم جاری صاحب کے پہلے شعری مجموعے کا نام "ضربِ لطیف" ہے۔ تقریبِ رسمِ اجراء کا اہتمام جناب باقر حسین رضوی نے کیا تھا۔ محفلِ رسمِ اجراء کی صدارت جناب عارف الحسینی صاحب نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض "احبابِ بزمِ سخن" کے صدر ڈاکٹر حنیف ترین صاحب نے ادا کیے۔ جناب نعیم احمد قاسمی، جناب ڈاکٹر حنیف ترین، جناب مہدی حسن، جناب محمود سالت اور جناب نواب حیدر صاحب نے جارّی صاحب کے فن و شخصیت پر مقالے پڑھے۔ بعد ازاں تقریب کے شعری دور میں جارّی صاحب نے اپنے منتخب کلام سے حاضرین کو نوازا اور جناب غلام نبی شاکر، جناب غوث محی الدین، جناب رضا حسین رضا، جناب حفیظ محمد، جناب ایم یوسف، جناب سراج الدین صاحب اور صدرِ "احبابِ بزمِ سخن" جناب ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ خدا کرے کہ "عَرعَر" میں فیضانِ اردو و شعر و ادب ہمیشہ جاری و ساری رہے۔

"بابِ حرمین شریفین جدہ"

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

(غالب)

جدہ! عروسِ بحرِ احمر، جدہ! گہوارۂ علم و ادب، خوش رو، کشادہ دل، تبسم بلب، جدہ! شہر خوش نہاد! رشکِ قاہرہ و بغداد!

جدہ! کہ ایک شہر ہے عالم میں انتخاب
رہتے ہیں منتخب ہی یہاں روزگار کے
(شعر میر بہ ادنیٰ تصرف)

جدہ کی تاریخ اردو ادب کے مستند و اہم اشارے، میں اپنے مضمون "احوال واقعی" میں کر چکا ہوں اس وقت میں ۱۹۸۶ء کی آخری سہ ماہی سے ۳۰ ستمبر ۱۹۹۲ء تک کے اردو شعر و ادب کے حوالے سے پیش آنے والے اہم واقعات اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کروں گا۔

جدہ کی انجمن ہائے شعر و ادب

حلقۂ اربابِ ذوق۔ جدہ کی سب سے قدیم ادبی انجمن ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے بانی صدر نغز گو شاعر جناب عبداللہ یمانی ناظر تھے۔ عبداللہ ناظر کے بعد حلقہ کے صدر جناب عبدالرؤف خلش منتخب ہوئے۔ جناب بیکس نواز شارق معتمد عمومی کے عہدے پر فائز رہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق جدہ اردو شعر و ادب کے فروغ و خدمت میں پیش پیش رہا ہے۔

علمی و ادبی نشستوں کا انعقاد، نئے شعرا کو متعارف کرانا، اور پاکستان و ہندوستان سے تشریف لانے والے ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں تقاریب منعقد کرنا حلقۂ اربابِ ذوق جدہ کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے۔

حلقۂ اربابِ ذوق جدہ کے زیر اہتمام نسیم سحر کے شعری مجموعے "ہر بوند سمندر" کی رسم اجراء منعقد ہوئی۔ "ہر بوند سمندر" کا اجراء "اسلام کا نظامِ حکومت" کے مؤلف مولانا حامد الانصاری غازی کے دستِ مبارک سے ہوا۔

محفلِ رسمِ اجراء کی صدارت ڈاکٹر ابن فرید نے فرمائی۔ حلقۂ اربابِ ذوق جدہ اب فعال نہیں ہے۔

انٹر نیشنل اقبال ایوارڈ کمیٹی جدہ

مارچ ۱۹۸۶ء میں قائم کی گئی۔ اس کے صدر جناب رشید شیخ اور سیکریٹری جناب نسیم سحر منتخب ہوئے۔ کمیٹی کی طرف سے پہلا اقبال ایوارڈ محمد ابن خلیل عرب شکیب مرحوم کو، علامہ اقبال پر ان کی تحقیقی کاوشوں کے اعتراف میں دیا گیا۔ ایوارڈ شکیب مرحوم کے صاحبزادے حماد بن محمد شکیب نے وصول کیا۔ مذکورہ ایوارڈ توصیفی سند اور گیارہ ہزار پان سو پاکستانی روپے پر مشتمل ہے۔ انٹر نیشنل اقبال ایوارڈ کمیٹی جدہ اب فعال نہیں ہے۔

بزمِ اردو جدہ! اوّل

جدہ میں ابتدائے ۱۹۵۴ء سے اردو زبان و ادب کی تخم ریزی و آبیاری کرنے والی ہر شخصیت اپنی ذات میں اک انجمن تھی۔ اس لیے کسی نے خدمت اردو کے لیے انجمن سازی کی ضرورت نہیں سمجھی لیکن ہندوستان کے نامور نغز گو شاعر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز دسمبر ۱۹۷۹ء میں جب دوسری مرتبہ جدہ تشریف لائے تو اس بات پر بے حد اصرار کیا کہ جدہ میں ایک بزمِ ادب قائم کی جائے اور قیامِ بزم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ لہٰذا اوائل جنوری ۱۹۸۰ء میں والد محترم سیّد حامد علی کے دولت کدہ پر بزم کا تاسیسی اجتماع ہوا۔

بزم کانام " بزم اردو جدہ " تجویز ہوا۔ بزم اردو جدہ کے صدر محترم مصطفیٰ علی قدوائی، نائب صدر استاذی حضرت احمد جمال صادق، معتمد عمومی راقم السطور نعیم حامد علی، شریک معتمد عمومی سید ہاشم رضا اور خازن جناب عبدالعلیم صدیقی اتفاق رائے سے منتخب ہوئے۔ بزم اردو جدہ اوّل کے ارکان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

مولانا محمد یامین عثمانی، نثار رفیع ندوی، کیپٹن ابراہیم، کیپٹن قیوم سعید، سلیم حامد علی، عبدالرحیم انصاری، احمد صغیر لودھی، فضا الرحمٰن ہاشمی، عطا اللہ فاروقی، بزم اردو اوّل کا شعبۂ نقد و نظر جناب نثار رفیع ندوی کی سر براہی میں قائم کیا گیا۔ جناب احمد جمال صادق، مولانا محمد یامین عثمانی، سید ہاشم رضا، شعبۂ نقد و نظر کے ارکان قرار پائے۔

بزم کے زیر اہتمام سہ ماہی طرحی و غیر طرحی مشاعرے منعقد کرنا، پاکستان و ہندوستان سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں ادبی نشستیں منعقد کرنا اور نومشق ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی و تعارف بزم اردو جدہ اوّل کے بنیادی مقاصد قرار دیے گئے۔ چنانچہ بزم اردو اوّل کا پہلا طرحی مشاعرہ ۸ مارچ ۱۹۸۰ء کے صدر مصطفیٰ علی قدوائی کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل مصرع ہائے طرح تھے

۱۔ کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے (وحید الہ آبادی)

۲۔ اپنے گھر کے در و دیوار کہاں سے لاؤں (اقبال عظیم)

۳۔ ہم خریدار گھر، آب گہر دیکھیں گے (احمد جمال صادق)

مشاعرے کی صدارت محمد نجات اللہ صدیقی (کنگ فیصل ایوارڈ یافتہ ماہر معاشیات) نے فرمائی اور نظامت کے فرائض محمد ناظر قدوائی والدؔ نے ادا کیے۔ بزم اردو جدہ اوّل تادیر فعال نہ رہ سکی مگر اس کے ارکان بدستور انفرادی طور پر گیسوئے اردو سنوارتے رہے۔ آج میں بحیثیت معتمد عمومی بزم اردو جدہ اوّل اور بزم کے صدر و نائب صدر کی اجازت سے اس مقالے کے ذریعے سے بزم اردو اوّل کو بزم اردو ثانی کے نفاذ میں کالعدم قرار دینے کا اعلان کرتا ہوں۔

"اے اہل ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو"

بزم اردو ثانی کے بانی صدر جناب حسن چشتی تھے اور بانی معتمد عمومی جناب شریف اسلم ہیں۔ اس بزم کے مقاصد میں اردو شعر و ادب کو فروغ دینا اور علمی ادبی اور ثقافتی محافل کا انعقاد کرنا ہے۔ اس بزم کے موجودہ صدر جناب ڈاکٹر شمس بابر ہیں۔ اور معتمد عمومی حسبِ سابق جناب شریف اسلم صاحب ہیں یوں تو اس کے تمام عہدیدار و ارکان اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہیں مگر بالخصوص جناب شمس بابر، جناب شریف اسلم اور صادق اعظم کی مساعی حمیدہ کے طفیل بزم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ بزم اردو ثانی کے کارناموں میں ۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ء کو پہلے پاک و ہند مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد سرِ فہرست ہے۔

مذکورہ مشاعرے میں پاکستان سے سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، پروفیسر عنایت علی خاں اور پروفیسر انور مسعود کو مدعو کیا گیا تھا۔ جناب حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی، طالب خوندمیری، جناب خواہ مخواہ اور پاگل عادل آبادی ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔ یہ مشاعرہ مدرسہ دارالحنان کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا تھا۔ جدہ کی نمائندگی جناب نسیم سحر، سگار لکھنوی اور جناب محمد ناظر قدوائی والدؔ نے کی تھی۔

محمد ناظر قدوائی والدؔ نہ صرف یہ کہ بہت اچھے مزاح گو شاعر ہیں بلکہ مشاعروں کی نظامت کا بھی خصوصی ملکہ رکھتے ہیں۔ مذکورہ مشاعرے کی نظامت بھی محمد ناظر قدوائی والدؔ نے فرمائی تھی۔

بزم اردو جدہ (آئندہ ثانی نہیں لکھوں گا) نے ۲۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ "طنز و مزاح و موسیقی" منائی۔ جس کے مہمانِ خصوصی و صدر ہندوستان کے عظیم صاحب طرز طنز و مزاح نگار ادیب مجتبیٰ حسین تھے جن کو بطورِ خاص اس تقریب میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ بزم اردو جدہ کی ادبی سرگرمیاں بے شمار ہیں مگر اختصار کے پیشِ نظر اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

جدہ میں اردو شعر و ادب کے فروغ کی انفرادی کاوشیں

۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو راقم السطور کے شعری مجموعے "پیکر نغمہ" کی تقریبِ اجراء کا اہتمام جناب سید ظفر مہدی، جناب محمد طارق غازی، جناب محمد لقمان اور جناب طارق ہاشمی نے کیا۔

تقریبِ رسم اجراء سعودی عرب کے فلسفی شاعر عزت مآب محمد حسن فقی کی سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ محفلِ رسم اجراء کی صدارت موتمر عالم اسلامی کے سیکریٹری جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ کے عسکری مشیر جناب محمد طارق غازی اور جناب سعید اختر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اردو اور عربی تقاریر کا فوری ترجمہ سلیم حامد علی نے کیا۔

صاحب "پیکرِ نغمہ" کو جناب سید ظفر مہدی، جناب نعیم بازید پوری اور جناب قیوم طاہر نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔

عزت مآب سفیر پاکستان امیر گلستان جنجوعہ، روزنامہ "العکاظ" اور "سعودی گزٹ" کے منیجنگ ڈائریکٹر اور بے مثل عربی ادیب جناب ایاد امین مدنی "سعودی گزٹ" جدہ کے چیف ایڈیٹر جناب رضا لاری، جناب احمد جمال صادق، مولانا حامد الانصاری غازی مصطفیٰ علی قدوائی۔

مندرجہ بالا اہم شخصیات اور جدہ کے تمام اہم شاعر و ادب دوست حضرات شریک محفل تھے۔ "پیکر نغمہ" عالم عرب اور سعودی عرب سے شائع ہونے والا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ مذکورہ تقریب جدہ کے "الحارثی" ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی۔

جناب سید سلیم نعیمی صاحب اور ان کے احباب نے "جشنِ جمیل الدین عالی" کا انعقاد کیا یہ اپنی نوعیت کی اور برصغیر پاک و ہند کی سطح پر منعقد ہونے والی جدہ کی پہلی تقریب تھی۔ جس کے انعقاد کے لیے سلیم نعیمی صاحب اور ان کے دوست مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے پاکستان سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ہندوستان سے محترمہ قرۃ العین حیدر اور جناب ایم حبیب خان کو مدعو کیا گیا تھا۔ مذکورہ تقریب مارچ ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوئی۔

جناب سجاد بابر کے شعری مجموعے "راہرو" کی تقریب رونمائی جدہ دربار ریسٹورنٹ میں منعقد ہوئی۔ شاعر و نقاد جناب مصلح الدین سعودی نے سجاد بابر کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا۔ جناب نسیم سحر نے سجاد بابر کا قلمی خاکہ پیش کیا۔ شجاعت علی راہی نے کہا کہ "سجاد بابر کی غزلیں گویا طلسمی دریچے ہیں۔"

۱۹۸۹ء کی آخری شام جمعہ کو پاکستان کے معروف شاعر افتخار عارف کے اعزاز میں جناب رسول احمد کلیمی نے محفل شعر منعقد کی۔ وہ سعودی عرب عمرہ کے لیے آئے ہوئے تھے۔

اوائل ۱۹۹۰ء میں محترمہ ادا جعفری اور محترم نورالحسن جعفری صدر انجمن ترقی اردو پاکستان، بغرض عمرہ و زیارت تشریف لائے تو جدہ کے اہل ذوق کو محترمہ ادا جعفری کا کلام سنوانے کا ثواب بھی برادرم رسول احمد کلیمی نے ہی حاصل کیا۔

۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی جدہ تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک شعری

نشست منعقد کی گئی۔ ایک شعری محفل جناب سبطین شاہجہانی کے اعزاز میں بھی سجائی گئی سبطین شاہجہانی صاحب پاکستانی کونسلیٹ جدہ کے حج آفس میں تعینات ہوئے تھے۔ اس کی رپورٹ جمعہ ۲ اگست ۱۹۹۱ء کو "جنگ" کراچی میں شائع ہوئی تھی۔

جناب محسن احسان اپنے دورۂ امریکہ سے واپسی پر عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب آئے تو ان کے اعزاز میں سید ظفر مہدی نے ایک محفل شعر کا انعقاد کیا جس میں شجاعت علی راہی نے ایک خیر مقدمی مقالہ بعنوان "محسن احسان کے نام ایک کھلی چٹھی" سنایا اس کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ محسن احسان کے اعزاز میں دوسری محفل کا اہتمام جناب نسیم سحر نے کیا۔

شاعر و تمثیل نگار امجد اسلام امجد کی جدہ آمد پر جناب حسن ظہیر پاکستان کے کونسل جنرل غیور فاخر صاحب اور پاکستان کے شفیع احمد صاحب نے ان کے اعزاز میں شعری محفلوں کا انعقاد کیا۔ ان محفلوں میں زیادہ تر امجد صاحب کو سنا گیا۔ شفیع احمد صاحب کی مرتب کردہ نشست میں "معاشرے میں ادب اور شاعر کے کردار" کے حوالے سے سوالات کیے گئے اور بالآخر یہ گفتگو مذاکرے کی صورت اختیار کر گئی۔ مذکورہ ادباء و شعرا کے علاوہ پاکستان و ہند کے جن شعرا نے جدہ کی ادبی محفلوں کو وقتاً فوقتاً رونق بخشی ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

پاکستان سے احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شہزاد احمد، محسن بھوپالی، الطاف پرواز، حکیم سروسہارنپوری، احمد فراز، اختر لکھنوی، دلاور فگار، پروفیسر عنایت علی خاں، پروفیسر انور سعود اور ہندوستان سے تشریف لانے والی ادبی شخصیات میں نفیس سندیلوی، خمار بارہ بنکوی، والی آسی، حمایت اللہ، مصطفےٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، پاپولر میرٹھی، خواہ مخواہ بھمٹی، ساغر خیالی، پاگل عادل آبادی، اور متحدہ عرب امارات کے جناب ڈاکٹر فاروق زبیر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک وہ شعرا جو اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں طویل قیام کے لیے جدہ تشریف لائے اور جدہ کی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے ان کے اسمائے گرامی۔

جناب غیور احمد صدیقی فاخر کونسل جنرل پاکستان، جناب سبطین شاہجہانی، کلیم اللہ فاروقی، الیاس تبسم، شاہنواز قریشی زم زم، ریاست علی عابد، شاہد انور، سید محمد احمد نقوی، ابرار بریلوی، عادل سلطان پوری، مجیب افسر، سلیم مقصود، ظفر بدایونی، نجم الحسن عنیر، اطہر نفیس عباسی، رشید عالم صدیقی، محمد حکیم شاعر، عظمت اللہ قریشی، خلیل چشتی، ناظم الدین مقبول، حسن عسکری طارق، احسان رضا بدایونی، خواجہ محمد ابرار، عبدالباری انجم، مسرور انیس، عبدالرؤف شاہ، زاہد علی زاہد ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض شخصیات عرصہ دراز سے جدہ میں مقیم ہوں لیکن ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۲ء کے دوران میں دیکھے گئے۔

وہ محترم شخصیات جن کے دم قدم سے جدہ کی شعری محفلیں بارونق تھیں اور جو اپنی مدت کارپوری کر کے اپنے اپنے وطن واپس لوٹ گئے ہیں مگر "رفتید و لے نہ از دلِ ما" کے مصداق جن کی یادیں جدہ کے ادب دوست و شعرا کرام کے دل میں ہمیشہ رہتی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی۔

مولانا محمد یامین عثمانی، محمد شمیم اشرف، مولانا حامد انصاری غازی، سعود احمد ہوش سنبھلی، ڈاکٹر ابن فرید، قیوم طاہر، ڈاکٹر عابد اللہ غازی، سید حیات النبی رضوی، محمد رشید شیخ، مولانا فضل الرحمٰن حسن پوری ہیں۔

دو بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست اور بہت اچھے شاعر محمد بن خلیل عرب شکیب اور سعید ہاشم رضا وطن واپس لوٹنے کے بعد راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

"آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے"

سعودی عرب میں اردو دوستوں کی ادبی سرگرمیوں کا یہ ایک جائزہ ہے جس سے بہ حیثیت مجموعی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۹۲ء تک سعودی عرب میں منعقد کی جانے والی ادبی شعری محفلوں اور ان محافل میں شریک ہونے والی شخصیات سے متعارف ہونے کی صورت نکل آتی ہے۔

ازراہ کرم مضمون کی اوریجنل کاپی ارسال کریں

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
MPL

قومی زبان (۵۵) مارچ ۱۹۹۳ء

سندھی کہانی

علی بابا/ رفیق احمد نقش

چاند اور روٹی

شہر سے تبدیل ہو کر برابر والے گاؤں کے اسکول میں آئے ہوئے مجھے تین چار دن ہو چکے تھے۔ میرے علاوہ تین دوسرے ماسٹر بھی اسی اسکول میں تھے، جن میں سے دو تو اسی گاؤں کے تھے، جس گاؤں میں اسکول تھا، اور تیسرا میری طرح کسی دوسری جگہ سے آیا تھا۔ اُن تینوں میں مجھے وہ زیادہ پسند تھا، خاموش طبع، ہمدرد اور با اخلاق۔ وہ ہر وقت نہ جانے کن خیالوں میں محو رہتا تھا اور بہت کم بولتا تھا۔ میں نے اسے ہنستے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا البتہ شاید ہی مسکراتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کوئی چڑچڑا یا بد دماغ تھا، نہ ہی کوئی دوسری بات تھی۔ شاید اُسے کوئی دلی صدمہ پہنچا تھا، کوئی بات ضرور تھی جو اس پر اتنی اثر انداز ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اس قدر خاموش طبع ہوا۔

مجھے نئے اسکول میں آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ ماسٹر جس کا نام ایاز تھا، اب مجھ سے کچھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ کبھی رات کو میرے کمرے میں بھی آجاتا تھا جو اسکول کے ساتھ ہی تھا۔ ایک دن جب ایاز میرے ہاں بیٹھا ہوا تھا اور اتنے دنوں میں اب وہ کچھ زیادہ بے تکلف ہو گیا تھا، میں نے اچھا موقع دیکھ کر اس سے پوچھا، "ایاز تم ہر وقت خاموش رہتے ہو، اُداس اُداس۔ اس کا کیا سبب ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" ایک پھیکی مسکراہٹ ایاز کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"کچھ تو ضرور ہے جس نے تمھیں وقت سے پہلے اتنا سنجیدہ بنادیا ہے"

"کوئی خاص بات نہیں" وہی پھیکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟"

"کیوں" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر آخر اتنی رازداری کیوں؟"

"رازداری کس بات کی" اس نے آنکھیں اُٹھا کر نیچی کرلیں۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ کہنے لگا، "میں نے دراصل بچپن میں بڑے دکھ بھرے دن گزارے ہیں، یہی سبب ہے جس نے وقت سے بہت پہلے مجھے اتنا سنجیدہ بنادیا ہے۔" اور پھر میرے بے حد اصرار پر اس نے اپنے بچپن کی کہانی سنائی..........

"وہ دن جو میں نے اپنی پیاری ماں کے ساتھ گزارے تھے، کتنے پرسکون تھے، کتنے اطمینان بخش۔ میں ان دنوں کو اپنی زندگی کے کسی بھی حصّے میں فراموش نہیں کر سکتا، کبھی بھی نہیں"

ایاز تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے گمبھیر چہرے پر دکھ، درد اور اضطراب کی ایک تہہ اتر رہی تھی تو دوسری چڑھ رہی تھی، جیسے ایاز کا ماضی کوئی انتہائی تکلیف دہ ہو۔ ہمارے کمرے میں ایک عجیب اُداس لہر دوڑ گئی تھی۔ میں بہت بے چینی سے ایاز کی طرف دیکھ کر کروٹیں بدل رہا تھا۔ ایاز کی بھاری گمبھیر آواز دوبارہ کمرے میں گونجنے لگی۔

"اس وقت میں بالکل چھوٹا سا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے، ایک دن میری ماں بہت پریشان تھی۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ ہمارے گھر کا سارا راشن ختم ہو گیا تھا۔ صبح کو امی نے مجھے ایک باسی روٹی کا ٹکڑا بدمزہ دودھ کے ساتھ دیا تھا اور اب شام پڑ گئی تھی۔ میرے پیٹ میں بھوک سے مروڑ اٹھ رہے تھے اماں نے مجھے پڑوسن کی طرف اُدھار آٹے کے لیے بھیجا تھا مگر وہاں سے بھی جواب مل گیا تھا۔ اماں سارا دن اپنی میٹھی اور لطیف باتوں سے میرا دل بہلاتی رہی، جس سے تھوڑی دیر کے لیے میری بھوک کا احساس کچھ کم ہو گیا لیکن کہیں باتوں سے بھی پیٹ بھر سکا ہے، چاہے ان میں شہد کی مٹھاس ہو یا کتنی ہی لطیف ہوں، ان سے پیٹ نہیں بھر سکتا، پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے تو صرف روٹی درکار ہے، صرف روٹی جو میری ماں کے پاس نہیں تھی۔ میری بھوک ٹھہر ٹھہر کر اچانک شدت اختیار کر لیتی تھی جیسے اچانک کوئی ڈھول پر ڈنکا مار دیتا ہو۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہو جاتا تھا۔ آخر میں رہ نہ سکا اور ماں کے جسم سے چمٹ کر اپنے دل کا حال بتایا، "اماں! مجھے بھوک لگی ہے۔"

اماں نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بولی "کہیں مر جاوں، اب میں کیا کروں، دکان والے نے بھی ادھار دینے سے جواب دے دیا ہے۔" اماں اپنی پریشانی کو چھپا کر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی، اچانک وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی، "آؤ بیٹے! اپنے گھر کی تلاشی لیں، شاید میں کہیں پیسے رکھ کر بھول گئی ہوں۔" پھر تو بس، میں نے اور اماں نے سارا گھر کھنگال ڈالا، الماریاں، طاقچے، صندوق، ایک ایک کر کے ہم نے اُلٹا کر دیکھے مگر کہیں سے ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ اماں تھک کر آ کے مونڈھے پر بیٹھی اور میں بھی اُس کے آگے آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اچانک اماں کو کوئی بات یاد آئی اور کہنے لگی۔ "ایک جگہ تو ہم لوگ بھول ہی گئے تھے! غسل خانے کا آلا تو ہم لوگوں نے دیکھا ہی نہیں!" پھر تو میں نے لے کر اماں کے پیچھے دوڑ لگائی جیسے وہاں روپیوں کا مینہ برس رہا ہو۔ اماں نے جلدی سے آلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو، "مل گئے۔" میں نے تیزی سے اماں سے پیسے چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن اماں نے مجھے روک دیا اور بولی، "نہیں بھائی! یوں نہیں، پہلے بتاؤ، کتنے پیسے ہیں میری مٹھی میں؟" وہ پیسے اماں نے ابھی خود بھی نہیں دیکھے تھے۔ "روپیہ" میں خوشی سے چلایا۔

"غلط"

"آٹھ آنے"

"نہیں"

"اچھا دو آنے"

"نہیں"... اور جوں جوں ان پیسوں کو دیکھنے کے لیے میری بے چینی بڑھتی گئی، ویسے ویسے میری آواز میں زور کم ہوتا گیا۔

"آنہ" میں نے آخری آواز لگائی۔ اماں نے ایک دم اپنی مٹھی کھول دی۔ ہم دونوں ماں بیٹوں کے منہ سے چیخ نکل گئی،

پار آنے۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے ہماری آواز کمرے میں ایک اُداس بازگشت چھوڑ کر ڈوب گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹوں کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ وہ چونّی کھوٹی تھی، انتہائی زنگ آلود لیکن میری آنکھوں میں چمک آ گئی، میں نے کہا، "اماں! چل جائے گی، پر کی ماں اندھی ہے، شام کو دکان پر وہی بیٹھتی ہے، اسی کو دوں گا۔"

"ہشت گندے لڑکے" اماں نے ناراضگی سے کہا، "اسکول کے بچے ہوتے ہوئے یہ نیچ خیال تیرے دل میں کیسے آیا۔ کیا تجھے نہیں کہ کسی کو دھوکا دینا گناہ ہے۔" میں پھیکا پڑ گیا۔ اماں نے بازو کی پوری قوت سے وہ چونّی باہر پھینک دی۔

میں دوبارہ آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اماں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک آجا رہی تھی جیسے ہمارا ماسٹر حساب دیتے وقت کلاس میں آتا جاتا تھا۔ اماں کے چہرے پر ایک عجیب تاثر تھا جیسے وہ کوئی بڑا مسئلہ حل کر رہی ہو۔ اس کے قدم کبھی تیز ہو جاتے تھے اور کبھی آہستہ اچانک اماں کسی کی اواز پر کان لگا کر کھڑی ہو گئی اور بولی، جا بیٹے اس پھیری والے کو لے آ۔" میں نے توجہ دی۔ وہ آواز پرانے تانبے اور پیتل کے برتن لینے والے پھیری والے کی تھی۔ میں نے اُسے لا کر گھر کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ "بھائی اس کٹوری کے کتنے پیسے دو گے؟" اماں نے دروازے کی اوٹ سے کٹوری والا ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھیری والے نے ہماری کٹوری کو خوب جانچ تول کر دیکھنے کے بعد جواب دیا "آٹھ آنے" اماں ایک دم بولی، "بھائی کچھ خیال تو کرو۔ نئی نکور کٹوری ہے" پھیری والا کٹوری واپس کر کے تھیلا بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مائی آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے۔ تانبے، پیتل کو کون پوچھتا ہے۔" اماں کچھ دیر تو الجھی کھڑی رہی پھر میری طرف غور سے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھرا کر کہنے لگی، "بھاگ بیٹے اسی پھیری والے کو کٹوری دے کر، آٹھ آنے لے کر دکان سے آٹا لے آ تو تجھے روٹی پکا دوں۔"

دوسرے ہی لمحے میری ہتھیلی پر ایک اٹھنّی ستارے کی مانند چمک رہی تھی۔ میں پوری طاقت سے مٹھی بھینچے دکان کی طرف دوڑا۔ ابھی میں دکان تک بمشکل پہنچا ہی تھا کہ آچر دکان بند کر رہا تھا۔

"سیر بھر آٹا دو۔" میں نے ہاتھ والی اٹھنی بڑھا کر اس سے کہا۔

"تیرے باپ نے پیسے بھیجے ہیں کیا؟"

"ہاں" میرے منہ سے نکل گیا۔ آچر ایک دم میرے ہاتھ سے اٹھنی لے کر بولا۔ "جا پہلے گھر سے میرے پیسے لے کر آ۔ پھر آ کر آٹا لینا۔" مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میرے ہونٹوں پر جیسے مہر لگ گئی تھی۔ ناچار خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

اماں نے میرا اُترا ہوا منہ اور خالی ہاتھ دیکھ کر گھبرا کر پوچھا "کیوں بیٹے! آٹا کہاں ہے؟ پیسے گر گئے کیا؟"

"نہیں، آچر نے چھین لیے۔" میں روناسا ہو کر بولا۔

"ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اس کے تو ابھی ہماری طرف پیسے ہیں۔"

"اماں! مجھے بھوک لگی ہے۔" میں نے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بس اتنی سی بات۔ آ، اپنے بیٹے کو نکتی دوں۔"

"نکتی کہاں سے آئی؟"

اماں نے کہا، "بیٹے۔ سلیم کا بھائی پیدا ہوا ہے، انھوں نے بانٹی ہے۔"

پھر اماں نے ایک پرچ میں نکتی رکھ کر اور گلاس میں بکری کا دودھ ڈال کر میرے آگے لا کر رکھا لیکن وہ تھوڑی سی نکتی اور دودھ میری سارے دن کی بھوک مٹانے کے لیے کافی نہیں تھے۔ شام کے دھواں دھواں دھندلکے گھرے ہوتے ہوئے رات کا روپ دھارتے گئے۔ کہیں کہیں بادلوں کی کالی تہوں میں سے کوئی اکا دکا تارا ٹمٹما کر اپنا نور ٹپکا رہا تھا۔ اماں بولی، "بیٹے رات پڑ گئی ہے، اب آ تجھے نیند نگر کی کہانی سناؤں۔" پھر میں اور اماں اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئے۔ اماں اپنا بازو میرے سر کے نیچے دے کر مجھے نیند نگر کی کہانی سنانے لگی، جہاں لوگ چھ مہینے سوتے اور چھ مہینے جاگتے تھے۔ میں نے اماں کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا،

"اماں! وہ لوگ چھ مہینے کیسے سو سکتے تھے، کیا انھیں بھوک نہیں لگتی تھی؟" اماں نے میری طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولی، "ہاں! اُنھیں نہیں لگتی تھی، تُو چپ ہو کر بات سُن۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" میں نے ضد کی۔

اماں کی آنکھیں تاریک آسمان کی طرف اُٹھ گئیں جیسے اُس کی نظریں کچھ تلاش کر رہی ہوں اور اُس نے انتہائی بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "دیکھ بیٹے! آج چاند کہاں نکلا ہے؟ ہم لوگ غریب ہیں، ہماری روٹی کا حساب چاند جیسا ہے... کبھی چوتھائی، کبھی آدھا، کبھی پورا اور کبھی ہے ہی نہیں۔" میں نے تاریک آسمان کی طرف دیکھا اور ماں کے پہلو میں گہری نیند میں چلا گیا۔

صبح نیند سے آنکھ کھلی میں ابھی ہاتھ منہ ہی دھو رہا تھا کہ ایک فقیر نے آ کر ہمارے دروازے پر صدا لگائی، اماں نے کہا، "چاچا، معاف کرو، آج آٹا بالکل نہیں ہے۔ میرا بچہ رات کا بھوکا ہے اور اب بھی نہار منہ اسکول جائے گا۔" فقیر نے ایک دم اپنے کشکول میں ہاتھ ڈالا میں نے دیکھا اُس کے ہاتھ میں دو روٹیاں تھیں، گھی میں ڈوبی ہوئی۔

"لو بیٹی، یہ خود بھی کھاؤ اور اپنے بچے کو بھی کھلاؤ!"

"نہیں نہیں، ہمیں نہیں چاہئیں۔" اماں کے منہ سے ایک دم چیخ نکل گئی۔ "آج ہمارے پیسے آجائیں گے۔"

"نہیں بیٹی! رزق نہیں لوٹاتے۔ یہ تمھارے ہی دیے ہوئے ہیں۔ مجھے اگر ضرورت پڑی تو تم سے لے جاؤں گا۔" فقیر زبردستی اماں کے ہاتھ میں روٹیاں دے کر چلتا بنا۔ اماں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی انداز میں بیٹھی روٹیوں کو دیکھتی رہی، پھر اُس نے وہ دونوں روٹیاں چنگیری میں ڈال کر، دودھ کا پیالہ بھر کر میرے آگے لا کر رکھا۔ میں ایک دم روٹی پر ٹوٹ پڑا اور بڑے بڑے لقمے توڑ کر منہ میں ڈالنے لگا لیکن اچانک میرا ہاتھ رُک گیا اور میں نے اماں سے کہا، "اماں، تم بھی کھاؤ نا!"

"نہیں بیٹے! تو کھا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں تو میں بھی نہیں کھاتا۔" میں نے ضد کی۔ آج نہ جانے کیسے بھوک سے میں اندھا ہو گیا تھا اور نہ جب تک کھانے کی کسی بھی چیز میں ماں کو شامل نہیں کرتا تھا۔ اُس وقت تک میرے حلق سے نہیں اُترتی تھی۔ "بیٹے، ضد نہ کر، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اماں بھرائی ہوئی آواز میں بولی لیکن اماں میری ضد کے آگے ہار گئی میں نے لقمہ توڑ کر اُس کے منہ میں ڈالا اور دودھ کا پیالہ اُس کی طرف بڑھایا۔

لقمہ منہ میں جاتے ہی اماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دوسرا ہاتھ منہ پر دے کر گردن میز پر ٹکا دی میں نے اماں کی طرف دیکھا اور چپ چاپ کتابوں کا تھیلا اُٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

سیموئل اُلمین / عبدالعزیز خالد

شباب

شباب عمر کا ایک دور نہیں۔ یہ ذہن کی ایک کیفیت ہے۔ یہ گلابی گالوں، سرخ ہونٹوں اور لچکدار گھٹنوں کا مسئلہ نہیں۔ یہ مسئلہ ہے قوت ارادی کا، تخیل کے ایک خاصے کا، جذبوں کے وفور و سرور کا۔ یہ زندگی ہے زندگی کے گہرے چشموں کی۔

شباب کا مطلب ہے حوصلے کی ڈرپوکی پر، مہم جوئی کی اشتہا کی آرام و آسائش پر طبعی بالادستی۔ جو اکثر ساٹھ سال کے مرد میں بیس سال کے نوجوان کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

کوئی بھی مہ و سال کے شمار سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہم بوڑھے ہوتے ہیں آدرشوں کو تیاگنے سے، نصب العینوں کو کھو دینے سے۔

سال جلد پر جھریاں ڈال سکتے ہیں لیکن جوش و ولولے سے کنارہ کشی روح میں جھریں ڈال دیتی ہیں۔ پریشانی، خوف اور خود بے اعتمادی سے دل غم اور روح گرد آلود ہو جاتی ہے۔

چاہے ساٹھ ہو یا سولہ، تحیر کی حس، نامعلوم کی کشش، "اس کے بعد کیا ہے؟" کی مستقل طفلانہ ہمک، جینے کی امنگ اور ترنگ کو زندہ و تابندہ رکھتی ہے۔

تمہارے اور میرے دل کے اندر ایک نشر گاہ ہے۔ جب تک یہ ابنائے آدم اور لامحدود سے حُسن، امید، خوش دلی، حوصلے اور قوت کے پیغام وصول کرتی رہے گی۔ اس وقت تک جوانی قائم و دائم ہے۔

جب لاسلکی ہوائی تار (ایریئل) سرنگوں ہوں۔ اور تمہاری طبیعت کلبیت کی برفوں اور مایوسی کی یخ سے ڈھک جائے تو سمجھ لو بیس سال کے ہوتے ہوئے بھی تم پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے۔

مگر جب تک ایریئل سربلند ہے رجائیت کی لہروں کو گرفت میں لینے کے لیے تو امید ہے کہ تم اسّی سال میں بھی جواں سال مرو گے۔

ہندی سے ترجمہ

نوراج/ظہیر مشرقی

بچھڑے ہوئے لوگ

میرے گھر کی دہلیز کے سامنے
جس کی طرف روز میں تاکتا ہوں
اس لیے کہ وہاں آج کل میرا بچھڑا ہوا ایک بھائی اقامت گزیں ہے
جسے ایک عرصہ ہوا
میرے اس بزمِ امکاں میں آنے سے پہلے میرے گھر کے افراد نے
"گھر نکالا" دیا تھا اب تو اس بات کو ہو چکے کوئی بتیس سال اور یہ
مدت کوئی چھوٹی مدت نہیں
ایسا لگتا ہے جیسے کہ سو سال پہلے کی یہ بات ہو

اتنی مدت میں ماں باپ بھی
اپنے بچوں کے چہرے فراموش کر بیٹھتے ہیں
نفرتیں بھی سپر ڈال دیتی ہیں
اور تلخ یادوں کی کڑواہٹیں بھی
رت بدل جاتی ہے
آندھیاں رقصِ ابلیس کر کر کے تھک جاتی ہیں
ناگ پھنیاں اُگ آتی ہیں بنجر زمیں پر
الغرض ساری خلقت کے اندر تغیّر کا جاری عمل ہے
پھر بھلا کیوں نہ قلب و نظر کا بھی انداز بدلے۔
اتنی مدت گزر جانے کے باوجود آج بھی رات جب ڈال دیتی ہے
اک کالی چادر مری بستی اور سامنے والی بستی کے اوپر تو میں اس گھر کی

گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر اس طرف تاکتا ہوں
جہاں میرا بھائی اقامت گزیں ہے
اور پھر شدتِ دردِ فرقت کے باعث
مری چشمِ ناداں سے اشکوں کا سیلاب لگتا ہے بہنے
پھر مرے پردۂ گوش سے
اس کی آوازِ گریہ بھی ٹکرانے لگتی ہے
اللہ یہ کیسی بد قسمتی ہے
کہ میں اس طرف رو رہا ہوں
اور بھائی مرا اس طرف رو رہا ہے

قومی زبان (۶۱) مارچ ۱۹۹۳ء

اُزبکستانی کہانی

عبداللہ کاخر (اُزبکستان) / ستار طاہر

نیا روگ

امینتوف نے دروازے پر دستک سنی اور بڑی کاہلی سے اُٹھا....

موسم بہت سرد تھا۔ کئی دنوں سے شدید برفباری ہو رہی تھی۔ راستے برف کے نیچے چھُپ گئے تھے۔ امینتوف کے گھٹنوں میں شدید درد شروع ہو چکا تھا۔ جب بھی خزاں کے موسم میں سردی اپنے عروج پر پہنچتی تو امینتوف کے گھٹنے تقریباً ناکارہ ہو جاتے تھے۔ وہ گھٹنوں پر گرم کپڑے کی پٹیاں باندھنے سے پہلے مرہم لگاتا۔ یہ مرہم خود ساختہ تھی اور اس کا نسخہ ایک سال پہلے مر جانے والے گاؤں کے ایک سیانے بابا مردوف نے بتایا تھا۔

مرہم کی لپائی کر کے وہ گھٹنوں پر گرم کپڑے کی پٹیاں باندھتا اور پھر کوشش کرتا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے اور آگ کے سامنے بیٹھا رہے۔

دروازے تک پہنچنے میں اسے کئی منٹ لگ گئے۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر اس نے باہر دیکھا تو سب سے پہلے زمین پر جمی برف دکھائی دی اور پھر اس برف میں دھنسے لمبے بوٹوں والے پاؤں....

امینتوف نے نظریں اُوپر اٹھائیں، سیدھا کھڑا ہونے میں اسے خاصی تکلیف ہوتی تھی کیوں کہ گھٹنوں پر بوجھ بڑھ جاتا تھا۔

دستک دینے والے کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کون ہو تم"

کہہ کر امینتوف سوچنے لگا اسے اندر آنے کے لیے کہوں یا نہ کہوں.... پھر باہر کھڑے شخص کی تکلیف سے زیادہ اپنے گھٹنوں کے درد سے مجبور ہو کر اس نے کہا۔

"اندر آجاؤ"

اپنی جگہ یہ عجیب بات تھی کہ اجنبی نے امینتوف کے سوال کے جواب میں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے۔

امینتوف نے دروازہ بند کیا، کنڈی لگائی اور آتشدان کے سامنے بیٹھ گیا۔ جس میں آگ دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔

اجنبی بھی آتشدان کے قریب بیٹھ گیا۔
"تم نے بتایا نہیں کون ہو، کیسے آئے ہو؟"
اجنبی نے بھیڑ کی کھال کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے جوتے بے رنگ ہو رہے تھے لیکن لمبے ہونے کے ساتھ اچھے چمڑے کے بنے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر ایک عجیب سی کچھ لمبوتری اور کچھ پچکی ہوئی ٹوپی پہن رکھی تھی... اس کی ڈاڑھی مونچھوں کا رنگ بھورا تھا اور آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ ناک لمبی اور سردی سے سرخ ہو رہی تھی.... وہ ساٹھ سے اوپر کا تھا۔
"مسافر ہوں.... برفباری نے آلیا.... بھوکا بھی ہوں۔"
اس کی آواز میں ایک چونکا دینے والا کھردرا پن تھا۔
"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ کون ہو، کہاں سے آئے ہو کہاں جا رہے ہو؟"
"کیا یہ بتانا ضروری ہے۔"
اجنبی نے قدرے غصے سے جواب دیا اور پھر امینتوف کو گھورنے لگا۔
امینتوف گھبرانے والا نہیں تھا۔ اس نے اجنبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ایک انوکھی ڈھٹائی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔
اجنبی نے کھردرا قہقہہ لگایا.... ہاہاہا....
امینتوف مسکرانے لگا..... اسے یہ کھردرا قہقہہ اچھا لگا تھا....
"ادھر میز پر دیکھو روٹی بھی پڑی ہے اور شہد بھی،"
"شہد.... واہ...."
وہ تیزی سے اُٹھا، لپک کر میز سے روٹی اٹھائی اور ایک بوتل سے شہد ایک طشتری میں ڈال کر وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا .... پاس ہی نمک بھی تھا مگر اس نے چھوا تک نہیں۔ امینتوف اسے دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ جب وہ اپنے شہد لگے ہاتھوں کو زبان سے چاٹتا واپس آتشدان کے پاس آکر بیٹھا تو کہنے لگا۔
"کچھ پینے کو بھی ملے گا۔"
امینتوف نے اجنبی کی طرف دیکھا مسکرایا اور بولا۔
"الماری میں سے نکال لو۔"
اجنبی پھر اٹھا۔ الماری تک لپک کر گیا اسے کھولا اور پھر بوتل نکال کر منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ آستین سے منہ پونچھ کر بوتل کو الماری میں رکھ کے وہ آتشدان کے پاس آکر لیٹ گیا۔
امینتوف نے آہستہ سے کہا۔
"تم نے مجھے پہچانا....؟"
"نہیں..." اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔
"جب تم نے مجھے گھورا تھا تو میں فوراً تمھیں پہچان گیا تھا۔"
اجنبی خاموش لیٹا رہا۔

امینتوف نے پھر آہستہ سے کہا۔

"گھوڑا چور مجھے واقعی نہیں پہچانا"

اجنبی یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کئی لمحے امینتوف کو گھورتا رہا۔

"اخمد گھوڑے چور .... میں امینتوف ہوں۔"

"امینتوف ...." اس نے آہستہ سے کہا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو پھر چلایا۔

"ارے امینتوف تم ....."

"ہاں لیکن .... ہماری ملاقات کم از کم چالیس برس کے بعد ہو رہی ہے۔"

اخمد کا چہرہ لٹک گیا، آواز کا کمزوراپن بھی کم ہو گیا۔

"میں شرمندہ ہوں۔"

امینتوف اسے ایک نظر دیکھ کر بولا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا اب شرمندگی کس بات کی۔"

چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی .... آگ کی دھڑ دھڑاہٹ خاموشی کو گمبھیر بنا رہی تھی۔

"چالیس برس پہلے ہم بیس بیس برس کے تھے۔" امینتوف کہنے لگا۔

"ہاں .... بیس برس کے، کیا دن تھے وہ؟" اخمد نے کہا۔ امینتوف کا لہجہ یکدم بدلا۔

"کہو، ان چالیس برسوں میں کتنے گھوڑے چوری کیے؟"

اخمد خاموش رہا وہ کچھ سوچ رہا تھا، پھر خود بخود بولنے لگا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"میں نے ہی تمھیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ تم گھوڑے چور بننا نہیں چاہتے تھے مگر دوستی میں تم نے میری راہ اختیار کر لی۔ کاش میں ایسا نہ کرتا.... لیکن یہ تو ہونا تھا۔ اور اس رات میں تمھیں جان بوجھ کر چھوڑ گیا تھا.... اور کیا تم جانتے ہو کیوں؟"

امینتوف نے آنکھیں بند کر لیں پھر آنکھیں کھولی اور کہنے لگا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ تم چوری کے گھوڑوں میں میرا حصہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ تم سب کچھ خود ہڑپ کرنا چاہتے تھے اس لیے تم نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ تاکہ گاؤں والے مجھے پکڑ لیں اور تم گھوڑوں سمیت بھاگ جاؤ لیکن میں تمھاری چال سے واقف تھا۔ میں نے تمھیں خود چوری کے گھوڑوں سمیت بھاگنے دیا جان بوجھ کر اپنے آپ کو گاؤں کے لوگوں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ وہ تمھارا تعاقب کر کے تمھیں پکڑ نہ لیں .... میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے دھوکہ کرنے والے ہو۔"

"مگر کیسے؟ تم کیسے جانتے تھے؟" اخمد کی آواز کا سارا کمزوراپن غائب ہو چکا تھا۔

"مجھے جمیلہ نے بتا دیا تھا...." امینتوف بتانے لگا "تم سے محبت کرتی تھی ... وہ اور میں دل ہی دل میں پیار کرتا تھا۔ کبھی اسے محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ میں بھی اسے چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس بار چوری پر نکلو گے تو کامیاب ہو کر واپس آؤ گے اور اس سے شادی کر لو گے۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی تم گھوڑے چور ہو تم سے محبت کرتی تھی۔ میں تمھارا دوست ہونے کے باوجود اس لیے تم سے نفرت کرنے لگا تھا کہ تم نہ صرف گھوڑے چور تھے بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ جمیلہ نے کہا تھا کہ تم اس بار واپسی کے بعد اس سے شادی کر لو گے۔"

احمد اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ امینتوف کہہ رہا تھا۔

"اس بار جب تم مجھے ساتھ لے کر نکلے تو تمھارے تیور بدلے ہوئے تھے۔ لالچ نے تمھیں اندھا کر دیا تھا اور تم اپنے دوست سے غداری کرنے والے تھے۔ میں بھانپ گیا تھا.... اور پھر میں نے وہی کچھ کیا جو تم چاہتے تھے۔ گاؤں والوں نے مجھے بہت مارا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مجھے بہت قسمیں کھانی پڑیں۔ میں گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے، رویا اور کہا کہ میں گھوڑے چور نہیں بلکہ مسافر ہوں..."

امینتوف خاموش ہو گیا.... احمد نے آنکھیں جھکالی تھیں وہ کہہ رہا تھا۔

"میں بہت خوش تھا کہ صاف بچ نکلا... بہت قیمتی گھوڑے تھے۔ جب چوری کے گھوڑے بیچ کر میں جمیلہ سے ملا تو اس نے پہلا سوال پوچھا کہ امینتوف کہاں ہے..... میں نے اسے بتایا کہ وہ پیچھے رہ گیا ہے حالات ایسے بن گئے تھے کہ مجھے جان بچا کر بھاگنا پڑا...."

احمد اچانک خاموش ہو گیا.... آتشدان میں آگ دھڑ دھڑ جل رہی تھی، پھر اچانک بولا۔

"جمیلہ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔"

"مگر کیوں؟" امینتوف نے چونک کر پوچھا۔

"وہ گھوڑے چور سے پیار کر سکتی تھی۔ دوست کو دھوکا دینے والے سے نہیں۔"

احمد یکدم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں چلتا ہوں۔"

"مگر تم اس وقت کہاں جاؤ گے شام ہو رہی ہے۔ برف پڑ رہی ہے"

"نہیں میں اب رک نہیں سکتا۔"

"مگر کیوں؟"

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور آہستہ سے بولا۔

"اچھا ہوا میں نے روٹی کے ساتھ شہد کھایا یا اگر روٹی کے ساتھ نمک چکھ لیتا تو ساری عمر یہیں رہنا پڑتا...."

امینتوف نے اس کے ہونٹوں کو ہلتے ضرور دیکھا تھا لیکن ہونٹوں سے نکلنے والا کوئی لفظ اس کے کانوں تک نہ پہنچا تھا....

اس نے وہ سوال پوچھ ہی لیا.... جو وہ پوچھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"جمیلہ کہاں ہے؟"

"وہ..... مر چکی ہے..... بہت سال ہوئے..... سنو، اس نے کبھی مجھ سے شادی نہ کی"

اس کی آواز کا کھردرا پن عود کر آیا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا...

امینتوف بیٹھا رہا۔ جب برف سے لدی تیز ہوا نے دروازہ پر دستک دی تو دونوں پٹ کھل گئے۔

ایک بار پھر گھٹنوں پر زور دیتا ہوا امینتوف اُٹھا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا کر آتشدان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"تو کیا جمیلہ نے احمد سے اس لیے شادی نہ کی کہ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔"

اس نے اپنے گھٹنے کو آہستہ سے چھوا۔

"مجھے ایک نیا روگ لگ گیا ہے۔ ہاں ایک نیا روگ جو ساری عمر میری جان کو لگا رہے گا۔ گھٹنے کا درد مرہم لگے گا تو کم ہو جائے گا مگر یہ روگ تو ہمیشہ لگا رہے گا.... جمیلہ مرچکی ہے اور اس کا علاج تو صرف اُس کے پاس تھا.... میں کیسے جان سکوں گا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی یا نہیں...."

وہ چونکا خالی کمرے پر ایک نظر ڈالی اور خود سے کہا۔

"یہ سب خواب تھا احمد کبھی یہاں نہیں آیا۔" "نہیں.... مگر یہ میرے دل میں درد کیسا ہے؟ یہ نیا درد.... نیا روگ ہے؟"

MAT
FINEST

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ........

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

صفحات ۱۲۸ قیمت = /۷۵ روپے

آنند پلی پوسٹ پورب پوٹیاری کلکتہ ۹۳۰۰۰۷

جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے تحقیقی کارناموں سے برصغیر کا علم داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے بھٹاچاریہ جی کی اردو تصانیف و تالیفات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ وہ تحقیق کے میدان میں کسی نئے گوشے کی تلاش میں رہتے ہیں اُن کی تازہ کتاب "کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ........" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں کلکتہ کے اس اولین مشاعرہ کا ذکر ہے جو ۱۸۱۲ء میں منعقد ہوا۔ جس میں کاظم علی جوان، حیدر بخش حیدری، سیّد جعفر علی رواں (کاظم علی جوان کے شاگرد) افتخار علی خاں شہرت. مرزا ہاشم علی عیاں (مرزا کاظم علی جوان کے بیٹے) ابوالقاسم خاں قاسم، مرزا قاسم علی ممتاز (کاظم علی جوان کے بڑے بیٹے) اور مرزا لطف علی مظہر علی خاں ولا شریک ہوئے تھے۔ یہ کاظم علی جوان وہی بزرگ ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۸۰۱ء میں للولال جی کے اشتراک سے کالیداس کا ڈراما "شکنتلا" اردو میں منتقل کیا تھا۔

غالب جب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ آئے تو اُس وقت اُن کے اعزاز میں جو مشاعرے منعقد ہوئے اس کتاب میں ان کا بھی تذکرہ ہے۔ یہاں داغ کی آمد کے موقع پر جو بزم مشاعرہ منعقد کی گئی اس کا حال احوال بھی اس میں مندرج ہے پرنس دلن کے یادگار مشاعرے منعقدہ ۱۹۴۱ء کی تفصیل بھی کتاب میں موجود ہے جس سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس مشاعرے میں ثاقب قزلباش لکھنوی، آرزو لکھنوی، نوح ناروی، رضا علی وحشت، عبدالباری آسی، خواجہ عزیزالحسن مجذوب، منظر لکھنوی، جواں سندیلوی، قدیر لکھنوی، پرویز شاہدی، قمر صدیقی، نجم آفندی، بیخود کلکتوی، ذکی لکھنوی، واصف بنارسی، سالک لکھنوی، جرم محمد آبادی، گہر لکھنوی، پرتو لکھنوی، احسان دانش. ناوک لکھنوی، منیر لکھنوی، رضا مظہری، سحر لکھنوی، سیّد محمود طرزی، نواب دہلوی، جدّت الہ آبادی، ابراہیم ہوش، زخمی لکھنوی، شمس عظیم آبادی، دل لکھنوی، اسحاق لکھنوی، محضر لکھنوی اور محمود قاسم میکش شریک ہوئے تھے۔

شہر کلکتہ کی عمر تین سو سال ہو چکی ہے اور وہاں کے مشاعرے کی عمر دو سو سال. بتائی جاتی ہے تب سے اب تک شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے اندازے کے مطابق کلکتے میں دو ہزار مشاعرے ضرور منعقد ہوئے ہوں گے۔ برصغیر پاک و ہند کا کون سا ایسا اہم شاعر ہوگا جو وہاں کے مشاعروں میں شریک نہ ہوا ہوگا۔

اردو کے دوسرے مراکز کی طرح ہمیشہ سے کلکتہ بھی اردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ فروغ سے اس شہر کی لنگوافرینکا اردو رہی ہے جسے "کلکتیہ اردو" کے نام موسوم کیا جاتا ہے۔ مٹیا برج کلکتہ میں نواب واجد علی شاہ کی جلاوطنی (۱۸۵۶ء) اور اُن کے وہاں اکتیس برس کے قیام نے اردو کی ترویج اور اسکے ساتھ ہی ادب و فنون کے فروغ میں بڑی تقویت پہنچائی ہے۔ بعد ازاں مشہور ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈراموں کا منڈوا بھی یہیں سجایا تھا۔ آغا حشر کاشمیری کو شہرت یہیں حاصل ہوئی۔
مختصر یہ کہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی مذکورہ کتاب کلکتہ کی ادبی و شاعرانہ سرگرمیوں کے نئے گوشے کو منظر عام پر لاتی ہے اور اہلِ علم کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔

(ا۔س)

چار سُو

سیّد مقصود زاہدی
صفحات ۱۳۳ قیمت مجلد ایڈیشن =/۸۰ روپے غیر مجلد =/۶۰ روپے
لیوبکس۔ اسلام آباد

"چار سُو" سیّد مقصود زاہدی کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ فی زمانہ جب رباعی کہنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے ایسے میں کسی ایسی شعری تصنیف کا منظرِ عام پر آنا جو سرتاسر رباعیات پر مشتمل ہو، قاری کے لیے مژدۂ جاں فزا کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی سے متعلق کون سا ایسا موضوع یا کون سا ایسا مضمون ہے جو ان کی رباعیوں میں نہیں باندھا گیا ہے۔ جناب مقصود زاہدی اور دیگر رباعی کہنے والے اکابر شعرا مثلاً جوش، فراق اور پرویز شاہدی میں فرق یہ رہا کہ جوش بنیادی طور پر نظم کے، فراق گورکھپوری غزل کے اور پرویز شاہدی نظم و غزل کے شاعر تھے لیکن مقصود زاہدی نے رباعیات کو اپنے گلے لگایا۔ امجد حیدر آبادی کی وجہ شہرت بھی رباعی کی سبب سے تھی۔
"چار سُو" کا مختصر مگر جامع دیباچہ جناب جابر علی سیّد نے تحریر کیا۔ کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ دینے کی ایک اچھی مثال ہے۔ دیباچہ نگار نے صاحبِ کتاب کی تفہیم "اوراکِ حیات کے شاعر" کی حیثیت سے کی ہے انھوں نے اطلاع دی ہے کہ رباعی کی بحر کا اوّلین نمونہ جو ایک مصرع کی صورت میں ظاہر ہوا وہ کسی صاحبِ فن ایرانی شاعر کا موزوں کردہ نہ تھا بلکہ ایک نوعمر لڑکے کی حسی ترنگ کا ثمرہ تھا اور وہ حسی ترنگ یہ تھی:

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو

"ایں خانہ ہمہ آفتاب..... است" اگر سو فیصد کسی گھر پر صادق آتا ہے تو وہ چار سُو کے مصنف جناب مقصود زاہدی کا گھر ہے، خود ایک معروف شاعر، صاحبزادے انور زاہدی افسانہ نگار و شاعر اور صاحبزادی ماہ طلعت شاعرہ! سرورق سے لے کر اندرون صفحات تک کی ترتیب و تدوین میں مجھے انور زاہدی کا ذوقِ لطیف کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

(ا۔س)

دیوان سیّد (قندِ نبات)

سیّد علی سیّد کھیتھلی مرتبہ سیّد خورشید حسین بخاری

صفحات ۲۴۶ قیمت ۵۰/ روپے

فخر برادران، طارق روڈ، رسول پورہ، شیخوپورہ

آفرین ہیں وہ لوگ جو اپنے بزرگوں کے غیر مطبوعہ کلام کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ اُس کی حفاظت کرتے ہیں اور اُسے اشاعت
لے رحلے سے گزار کر دوسروں کو فیض یاب ہونے کے مواقع فراہم کرتے ہیں حضرت سیّد علی سید کیتھلی کی کتاب "دیوان سید"
ن سلسلے کی کڑی ہے، اس کے فاضل مرتب سیّد خورشید حسن بخاری نے کتاب کے شروع میں اپنا ایک عالمانہ مقالہ "سید کیتھلی
احوال و آثار" شامل کیا ہے۔ اس مقالے میں دیگر باتوں کے علاوہ سید علی سید کے معاصر شعرا شاہ نصیر، امام بخش و ناسخ، حیدر
ی آتش، بہادر شاہ ظفر، میر ببر علی انیس و مرزا دبیر، اسد اللہ خاں غالب، مومن خاں مومن، ذوق اور الطاف حسین حالی کی ایک
رست معہ سن پیدائش و وفات مرتب کر دی ہے۔

حضرت سیّد علی سید کے سن وفات ۱۷ جولائی ۱۸۷۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ اُن کے سامنے رونما ہوا۔ اس کا
غلب یہ ہے کہ وہ دور ابتلا سیّد صاحب کی نگاہ میں تھا جب مغل حکومت زوال کے آخری مرحلے میں تھی۔ ہر طرف طوائف
لملوکی کا دور دورہ تھا، اور مغل حکومت سمٹ کر لال قلعے تک رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے ایسے میں حضرت سیّد علی سید کس طرح آنکھیں
بند کر کے رہ سکتے تھے۔ اُن کی شاعری میں کسی نہ کسی ردِّ عمل کا اظہار ہونا لابدی تھا۔ چنانچہ اس کی واضح جھلک ان اشعار میں دیکھی
جا سکتی ہے:

اگر خلوت نہ پکڑیں اے عزیز و ہم کدھر جائیں
کہ ہے اب عرصۂ آفاق میں اک شور و شر پیدا

سیّد ہوا کم عشق بتاں روئے زمیں پر
خلقت کو بہت تنگ کیا قحط و وبا نے

عبث ہے تیزیٔ اقبال پر خوشی سیّد
فتادہ خاک میں تاج سرشہاں دیکھا

اس کتاب میں صفحہ ۴۹ سے ۲۲۳ تک اردو کلام ہے اور صفحہ ۲۲۷ سے ۲۴۵ تک فارسی کلام ہے جو منقبت اور فارسی غزلیات پر
مشتمل ہے، منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں لکھی گئی ہے۔ حضرت سیّد علی سید کے کلام کے کچھ اور رخ مندرجہ ذیل
اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں:

سرسبز نہ ہووے کبھی شاخ سر آہو
بدبخت ازل فیض کے قابل نہیں ہوتا

ملاؤں سے سیّد سخن عشق نہ پوچھو
حل علم سے مسئلہ مشکل نہیں ہوتا

بہ سوئے بلبل و پروانہ دیکھو چشم عبرت سے
کسی کو نور سے باندھا، کسی کو نار سے باندھا

دلِ عاشق جواہر خانۂ تقدیر ہے شاید
کہ صدہا موتیوں کو آنسوؤں کے تار سے باندھا

کر مصحف ہستی کی شب و روز تلاوت
گر شوق تو رکھتا ہے صحیح اور غلط کا

اب کے تو جواب آیا شتابی مرے خط کا
سبزہ کہیں شاید کہ نمودار ہے خط کا

(ا۔س)

ہزاروں خواہشیں

مسعود احمد برکاتی
صفحات ۱۴۴ قیمت ۳۰/ روپے
ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

"ہزاروں خواہشیں" عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ایک ناول کا خلاصہ ہے یہ قسط وار پہلے ہمدرد نونہال میں شائع ہوتا رہا۔ اب اسے ہمدرد نونہال ادب نے کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔

چارلس ڈکنس وکٹورین دور کا ناول نگار تھا اس کا زمانہ انیسویں صدی قرار پاتا ہے۔ چارلس ڈکنس کی شخصیات کی بہت سی جہات ہیں۔ وہ بیک وقت ناول نگار، شاعر، مزاح نگار اور اداکار تھا۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُس کی کون سی جہت نمایاں ہے، گویا وہ ہر جہت میں نمایاں نام تھا۔

"ہزاروں خواہشیں" ایک لوہار بچے پپ کی کہانی ہے جب پپ کے سفرِ زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو اُس وقت اُس کی عمر سات سال ہے۔ ابتدائے سفر میں ایک مہربان بوڑھی خاتون مس شام کے ہاں اُس کی ایک ہم عمر لڑکی اسٹیلا سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ پپ مس شام کی مہربانیوں اور اپنی نیکی کے ثمرہ کے طور پر زندگی کی دوڑ میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا جاتا ہے برسوں پر پھیلی ہوئی زندگی کی تگ و دو میں اسٹیلا سے پپ کی پہلی ملاقات نہیں بھولتی، پپ جب ہر طرح متمول ہو جاتا ہے تو زندگی کے ایک موڑ پر اُسے اسٹیلا بھی مل جاتی ہے کہانی کا اختتام یہیں ہوتا ہے۔

جناب مسعود احمد برکاتی کی یہ تلخیص نہایت سادہ، رواں اور پرکار ہے، اس کی زبان میں بچوں کی تفہیمی صلاحیت و استعداد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بچے تو تحریر کی اس خوبی سے لطف اُٹھاتے ہی ہیں۔ بڑوں کو بھی یہ تحریر مسخر کرتی ہے بلاشبہ جناب مسعود

مدبر کاتی نے بچوں کی زبان لکھنے میں اختصاص حاصل کیا ہے جو بڑوں کی بھی زبان ہے۔
اس کتاب میں ایک کمی کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر چارلس ڈکنس کے اُس ناول (GREAT EXPECTATION) کا
ر بھی کر دیا جاتا جس سے "ہزاروں خواہشیں" ملخّص ہے تو بہت اچھا ہوتا۔

(ا۔ س)

انشائے ہاشمی

مرتبہ جلیل قدوائی
صفحات ۹۲ قیمت ۔/۳۰ روپے
راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان
سی ۵/ کوزی ہومز گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

"انشائے ہاشمی" جناب سید ہاشمی فرید آبادی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتّب بزرگ ادیب جناب جلیل احمد قدوائی ہیں اور یہ خطوط جناب جلیل قدوائی، جناب مشفق خواجہ، جناب شجاع احمد زیبا اور جناب سید بدر عالم کے نام لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے فاضل مرتّب نے اس مجموعے میں اضافی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اپنا دیباچہ "ہاشمی صاحب اور میں" اور شجاع احمد زیبا صاحب کا مضمون "سید ہاشمی فرید آبادی۔ مختصر حالات" شامل کیا ہے۔

ہاشمی فرید آبادی نے مولوی عبدالحق کی آنکھیں دیکھی تھیں، انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو کی قیادت میں عرصہ دراز تک کام کیا تھا۔ خود صاحبِ علم و آگہی تھے ادب کو پرکھنے کی نگاہ رکھتے تھے، چنانچہ ادب کا کوئی کام ہو ہاشمی صاحب کی یہ ناقدانہ نگاہ ضرور بروئے کار آتی تھی اور جو بات جس طرح محسوس ہوتی تھی وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کا اظہار برملا کر دیتے تھے۔ اُن کا یہ ناقدانہ رویہ اُن کے خطوط میں بھی موجود ہے۔ مثال کے لیے یہاں دو حوالے دیتا ہوں۔ ہاشمی صاحب اپنے ۲۰ جنوری ۵۹ء کے ایک خط بنام جلیل قدوائی میں لکھتے ہیں:

> "..... ریاض کا انتخاب ایک اچھی تنقید کے ساتھ ضرور مرتب فرمائیے۔ یہ صاحبِ طرز ہی نہیں اپنی رنگین بیانی میں بھی داغ کے ہم پلہ شاعر ہیں۔ لوگوں نے امیر و جلال وغیرہ کو بہت اُچھالا، ریاض کو جیسی چاہیے منزلت حاصل نہیں ہوئی۔"

ہاشمی صاحب اپنے ۲ فروری ۵۹ء کے خط بنام جلیل قدوائی میں لکھتے ہیں:

> "..... ابوالکلام کی ابتدائی الہلالی دور کی آتش نگاری میں کچھ کلام نہیں مگر خطیبانہ زور ہر جگہ اور زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا۔ پھر دہکتے انگارے، راکھ اور آگ کی لپٹ فقط دھواں رہ جاتی ہے۔ غبار خاطر گیلی لکڑیوں کو دھونک دھونک کر سلگانے کی مثال ہے۔ اور مہر صاحب نے جو خطوط چھاپے وہ اس غبار کی بھی جھڑی ہوئی گرد معلوم ہوتی ہے۔"

جناب جلیل قدوائی نے ہاشمی صاحب کے خطوط کو یکجا چھاپ کر خطوط نویسی کے سلسلۂ کتب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے اور اُن

کی مساعی قابلِ قدر ہیں۔

(ا۔ س)

وادیٔ لیاری

حمید ناضر

صفحات ۱۹۲ قیمت = /۲۸۰ روپے

۱۷/۲۸۱، چٹائی گراؤنڈ ملیر، کراچی ۷۵۰۵۰

یہ کتاب "وادیٔ لیاری" یعنی نصف سے زائد کراچی کی تاریخ، تدریجی ترقی، آبادی، ثقافت اور عمومی صورت حال پر مبنی دس مختلف مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ مضامین عام طور پر متعلق محکموں اور شعبوں کے مختلف ماہرین نے غالباً اس کتاب کے لیے لکھے ہیں۔ ان مضامین کے تنوع کا اندازہ حسبِ ذیل عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) وادیٔ لیاری، طبیعیاتی و ارضیاتی مطالعہ (۱) وادیٔ لیاری کی ارضیاتی تاریخ (۳) وادیٔ لیاری میں آثارِ قدیمہ (۴) لیاری وجہ تسمیہ (۵) کراچی کا تاریخی پس منظر (۶) وادیٔ لیاری میں آباد قبائل (۷) داستانِ ادبِ لیاری (۸) کراچی میں اردو (۹) وزیر مینشن، قائداعظم کی جائے پیدائش (۱۰) وادیٔ لیاری، ابتدا اور ارتقا۔

اکثر مضمون نگاروں کا تعلق حکومت پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ و عجائب گھر، ادارہ ترقیات کراچی اور انسٹی ٹیوٹ آف سندھولوجی سے ہے۔ اس اعتبار سے ان مضامین کے معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

کتاب میں شامل مضامین اپنی نوعیت اور مشمولات کے اعتبار سے دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ قبائل اور گروہوں کے لحاظ سے آبادی کا تجزیہ بہت معروضی اور ہمدردانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

مشمولات کے علاوہ اپنے حسن ظاہری کے لحاظ سے بھی یہ کتاب انتہائی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اسے آسانی کے ساتھ بیرونی اداروں اور بعض سرکاری محکموں کی شائع کردہ خوبصورت اور دلکش کتابوں کے ساتھ کسی بھی کتب خانے کی الماری میں رکھا جاسکتا ہے۔ کتابت کے لیے نوری نستعلیق کا خوبصورت اور مثالی خط استعمال کیا گیا ہے۔ طباعت، کاغذ اور جلد بھی اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔ کتاب کو جگہ جگہ بہت عمدہ اور رنگین تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔

تمام کتب خانوں، کالجوں اور مختلف اداروں میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے اپنے بیرونِ ملک مقیم اعزا اور احباب کو بھی یہ خوبصورت کتاب بطور تحفہ بھیجی جاسکتی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ ہر شعبۂ حیات میں پاکستان کے روزافزوں بلند معیار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی اور ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

(ابوالفہیم)

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

نذرِ منظور...... مرتبہ اسلوب احمد انصاری

ایک مصنف کے بارے میں کسی نے لکھا تھا کہ جب اس کی ساٹھویں سالگرہ آئی تو اس کے مدّاحوں نے اس کے فکر و فن اور
، کی دلچسپی کے موضوعات پر اپنے طور پر ایک کتاب مرتب کی اور سالگرہ کے دن یہ تحفۂ خلوص مصنف کی خدمت میں پیش
نے کے لیے اس کے گاؤں گئے تو دیکھا کہ وہ کتابوں کی دنیا میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر، مطالعے میں مگن ہے اس کے
احین نے بتایا کہ "آج آپ کی سالگرہ ہے اور ہم آپ کی خدمت کا اعتراف کرنے اور آپ کو مبارکباد پیش کرنے کے لیے حاضر
ئے ہیں۔" "توں انھوں نے حیرت سے پوچھا "میری زندگی کے ساٹھ برس کیا واقعی گزر گئے ہیں اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر
"میری سوچ کی گرہیں تو اب کھلنی شروع ہوئی ہیں اب مجھے مزید تندہی سے کام کرنا چاہیے۔" مصنف مذکور نے اپنے دوستوں کا
ریہ ادا کیا ان کے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی مرتبہ کتاب "نذرِ منظور" دیکھی تو میرے ذہن میں یہ واقعہ گردش کرنے لگا یہ کتاب خواجہ
ظور حسین کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مرتب کی گئی تھی لیکن افسوس کہ وہ اس کی اشاعت سے پہلے رحلت فرما گئے۔

خواجہ منظور صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے، تشکیل پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور
رنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھانے لگے۔ اس سے پہلے بھی وہ ۱۹۲۹ء میں اسی کالج میں انگریزی کے استاد رہ چکے تھے، دوبارہ
ہس آئے تو نئی ملازمت کی ابتدا اسی کالج سے کی اور پھر کچھ عرصے کے لیے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمات بھی سرانجام
ں، خواجہ منظور حسین کے صدہا طلبہ اب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، ان سے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے والے سیکڑوں
بہ اب خود پاکستان کے کالجوں میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب صرف انگریزی کے استاد یا صرف کالج کے پرنسپل
ہیں تھے، وہ اس تہذیب کے ترجمان تھے جس میں شرافتِ کردار، ذوقِ ادب سے پہچانی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب انگریزی اور اردو
نوں پر مکمل عبور رکھتے تھے لیکن دونوں زبانوں کے طہارت کا اتنا خیال رکھتے کہ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں ملنے نہ پائے،
یشہ ٹھیٹھ اور ٹکسالی اردو بولتے، انگریزی بولتے تو اس زبان کی روایت کی پاسداری کرتے۔ تیسری زبان جس سے انھیں بے

پایاں محبت تھی فارسی تھی، اس زبان کی بصیرت و آگہی میں بھی انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

خواجہ منظور حسین نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس میں گزارا لیکن ادب سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا انھیں اپنے مطالعے کے نوادرات جمع کرنے میں بھی گہری دلچسپی تھی، ان کی اس منفرد عطا کا ذکر ان کے بیشتر طلبہ کرتے ہیں کہ وہ طلبہ کے دلوں میں ادب کی شمع روشن کر دیتے تھے، انھیں اگر ادیب گر کہا جائے تو بجا ہوگا۔ اپنی ملازمتی زندگی میں تو وہ تالیف و تصنیف کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں ہوئے۔ ان کا اثاث الادب چند تراجم سے زیادہ نہیں لیکن ۱۹۷۷ء کے بعد وہ اپنے بکھرے ہوئے کام کو سمیٹنے پر آمادہ ہوئے تو ان کی تین معرکہ آرا کتابیں منظرِ عام پر آگئیں۔ ان میں ایک "اقبال اور بعض دوسرے شاعر" تھی دوسری "تحریکِ جدو جہاد بہ طور موضوعِ سخن" اور تیسری "اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ" یہ کتابیں اقبال اور اردو غزل کے چند نئے زاویے سامنے لاتی ہیں۔ ان کی تعریف و تحسین خواص کے طبقے نے دل کھول کر کی اور اب تک کی جا رہی ہے۔ انھوں نے عہدِ جوانی میں روسی کہانیوں کے جو تراجم کیے تھے ان کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے اس کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے لکھا ہے۔ جو ۱۹۳۰ء میں ان کے شاگرد تھے۔

یہ متاعِ گراں مایہ ۱۹۸۰ء میں ہم سے چھن گئی، لیکن ان کی تہذیبی شخصیت کا نقش اور تنقیدی شائستگی کا تذکرہ تین کتابوں میں موجود ہے۔ جب بھی ان کتابوں کا مطالعہ کریں تو خواجہ صاحب کی شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے جو خواجہ منظور حسین کے شاگرد بھی ہیں اپنے طور پر ان کی زندگی میں ان کے دل پسند موضوعات پر اہلِ ادب سے مضامین لکھوانے اور انھیں کتابی صورت میں چھاپ کر کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی گئی، اُدھر خواجہ صاحب نے دنیا سے رختِ سفر باندھنے میں بہت تعجیل کی، چنانچہ یہ کتاب "نذرِ منظور" کے نام سے شائع ہوئی ہے تو خیال آتا ہے کہ خواجہ صاحب اسے اپنی زندگی میں دیکھتے تو کتنے خوش ہوتے اور پھر حیرت سے اسلوب احمد انصاری سے کہتے "بھئی آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟ میں تو عمر بھر اپنا فرض ہی ادا کرتا رہا ہوں۔" تاہم اس کتاب کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ خواجہ منظور حسین کے ایک شائستہ اور وضعدار شاگرد نے ان کی خدمات کا حق ادا کیا اور یہ کتاب مرتب کر کے ان کی نذر کر دی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شخصی ستائش سے پاک ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" کے عنوان سے جو مضمون پیش لفظ کے طور پر شامل کیا ہے یہ معلوماتی نوعیت کا ہے اور اسے شخصیت نامہ کہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ سیّد وقار حسن نے خواجہ صاحب کی تنقیدی نثر پر تجزیاتی نوعیت کا مقالہ لکھا ہے اور اس کی ایک خوبی مجھے یہ نظر آئی ہے کہ خواجہ صاحب کی تنقید سے ان کے شخصی مزاج کے مہذب اظہار کے زاویے دریافت کیے گئے ہیں، چنانچہ ان کی نثر ان کے تہذیبی مزاج کی آئینہ دار اور اس روایت کی پاسدار ہے جس میں کسی زبان کا اعلیٰ مطالعہ شخصیت کا جزوِ حیات بن جاتا ہے۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ غالب اور اقبال خواجہ منظور حسین کے پسندیدہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ان کے مطالعے میں گہری دلچسپی لی اور انھیں بطور موضوع ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ اسلوب احمد انصاری نے اس مناسبت کو کتاب میں قائم رکھا ہے۔ اور مستند اہلِ ادب سے ان دو موضوعات پر ہی مضامین حاصل کیے ہیں۔ حصۂ غالب میں پروفیسر نذیر احمد (غالب کی فارسی قصیدہ نگاری)۔ سید وحید الدین (غالب کا حسنِ فکر اور حقیقتِ آگہی)۔ آفتاب احمد خان (غالب کا آشوبِ آگہی)۔ شمس الرحمان فاروقی (اندازِ گفتگو کیا ہے)۔ اسلوب احمد انصاری (غالب کی شاعری میں استعارے کا عمل) کے علاوہ غالب کی تین غزلوں کے

جزیے کے لیے مقبول حسن خان نے شرکت کی۔ اقبال کے حصے میں "اقبال کے تصوّر عشق" پر ڈاکٹر وزیر آغا نے "اقبال اور ابن عربی" پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے، "شعر اقبال۔ تصوّف کا مسئلہ" پر سید عاصم علی نے، "اقبال کے فارسی کلام میں خدا سے خطاب" کے موضوع پر ظہور احمد عثمانی نے اور "اقبال۔۔۔خطیبانہ شاعری کے جمالیات" پر شکیل الرحمٰن نے مقالات پیش کیے ہیں، آخری مقالہ "اقبال اور بلیک" ہے جو مؤلف کتاب اسلوب احمد انصاری نے پیش کیا ہے۔

مضامین اور مصنفین کی یہ فہرست اس حقیقت کی غماز ہے کہ اسلوب احمد انصاری نے خواجہ منظور حسین جیسی علم دوست شخصیت کے حضور میں ایک ایسا ارمغانِ علمی پیش کیا ہے جو ہر لحاظ سے ان کے شایانِ شان ہے اور اس پس مرگ نذرانے پر خواجہ صاحب کی روح ضرور سرشار ہوگی یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ علی گڑھ سے مل سکتی ہے اس کے ناشر بھی اسلوب احمد انصاری ہی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری / مرتبہ حمیدہ سلطان

تلوک چند محروم کے فرزند جگن ناتھ آزاد نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف مشاعرے کی فضا کو جلوہ آرا دیکھا شاعری کا ایک شجر گھر کے آنگن میں ان کے والد کی صورت میں لہلہا رہا تھا اور گھر سے باہر تلوک چند محروم کے دوستوں کا وسیع حلقہ تھا۔ جس میں وہ تمام قادر الکلام شعرا تھے جن کے سروں پر زمانے نے تاج فضیلت سجا دیا تھا۔ اس شعر بار فضا میں آزاد نے پرورش پائی تو انھیں محسوس ہوا کہ شاعری ان کی فطرتِ ثانیہ ہے اور ان کی شخصیت کا ہر زاویہ شاعری ہی کی طرف منعطف ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ لاہور چھوڑ کر دلی چلے گئے اور پھر ہندوستان کی شہریت قبول کر کے اپنے نئے وطن کے نغمے گانے لگے لیکن جگن ناتھ آزاد کے دوستوں کا ارشاد ہے کہ وہ اب بھی پاکستان کے شہری ہیں اور ان کا جسم اگرچہ ہندوستان میں چلا گیا ہے لیکن روح پاکستان میں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دو ملکوں کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کی شخصیت میں گنگا جمنی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ایک ایسے شاعر کے روپ میں ابھرے جو امتیاز من و تو سے ماورا ہے۔ اور شخصیت اور شاعری میں فاصلہ نہیں رکھتا۔

محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ نے ان کی شاعری کا ایک نقشِ منوّر سامنے لانے کے لیے کچھ عرصہ قبل ایک کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتّب کی تھی جو ۱۹۶۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ۱۹۹۱ء میں اس کا چوتھا ایڈیشن چھپا میری محرومی دیکھیے کہ میں اس کے مطالعے کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ اب حال ہی میں جگن ناتھ آزاد نے مجھے یہ کتاب بھجوائی تو جی چاہتا ہے کہ اس کا اجمالی تعارف آپ سے کرادوں، میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی خوشبو بہت سے لوگوں تک پاکستان میں نہیں پہنچی۔ اور اس کتاب سے شناسائی اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کا شاعر جب نقل مکانی کر کے بھارت پہنچا تو اپنے بلند آہنگ ترنم سے دلی کے لوگوں کو بتا رہا تھا:

تری بزم طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

کتاب کے عنوان میں اگرچہ صرف شاعری کا ذکر کیا گیا ہے لیکن کتاب کے متن کو جگن ناتھ آزاد کی شخصیت سے محروم نہیں رکھا

گیا۔ ان کے فن اور شخصیت پر مضامین لکھنے والوں میں فراق گورکھپوری، حامد علی خان، سر عبدالقادر، عبدالحمید عدم، عبدالمجید سالک، وقار عظیم، آل احمد سرور، کلام حیدری اور متعدد دوسرے اصحاب شامل ہیں۔ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے کہ "ان کے ہر شعر کے آئینے میں ان کا کردار جھلک رہا ہے اور ان کا سچل دل و دماغ بھی۔" اشرف قادری کی نظر میں آزاد ہر دور میں انسانیت کے علمبردار رہے اور اس جھنڈے کو انھوں نے پریشانی کے دور میں بھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔" کلام حیدری کی رائے میں آزاد وقت کی رفتار پر بڑی محتاط نظریں رکھتے ہیں، ان کے قدم وقت کے ساتھ اٹھتے ہیں۔" کرشن موہن نے ان کے مزاج کے متذکرہ زاویے کو ان کی شاعری سے دریافت کیا اور کہا "آزاد نے اپنی غزلوں میں سیاست کے تاثرات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمو کر غزل کے نئے رجحانات میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے.... آزاد کی اکثر غزلیں خارجی رنگ کی حامل ہیں، ان میں اس کا اپنا غم غمِ دوراں میں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔"

کتاب کا ایک باب جگن ناتھ آزاد کی کتابوں پر نامور ادبا کے تبصروں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ہمارے سامنے جگن ناتھ آزاد کے فن اور اس کی شخصیت ایک بے حد خوبصورت اور دلربا نقش مرتب کرتی ہے اور ہمارے دل میں آزاد کے لیے جذبۂ احترام پیدا کرتی ہے۔ جن لوگوں کی آزاد سے ملاقات نہیں ہوئی انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے یہ کتاب موڈرن پبلشرز نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

رو برو / ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

بھارت کے مطلعِ ادب پر نظر دوڑائیں تو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ایک ایسے ادیب کی صورت میں نظر آتے ہیں جو کبھی بیکار نہیں بیٹھتے اور ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ان کی ایک کتاب پر تبصروں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ ان کی نئی کتاب مطلعِ ادب پر نمودار ہو جاتی ہے، اس پر مستزاد ان کی تعلیمی اور تحقیقی سرگرمیاں۔ وہ بھاگل پور یونیورسٹی میں اردو کے شعبے سے متعلق ہیں۔ اور اب ممتاز مفتی اور عبدالعزیز خالد کے فکر و فن پر پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی نگرانی میں "نقوش" کے مدیر محمد طفیل پر جو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا تھا اس پر ڈگری عطا کی جا چکی ہے۔

ڈاکٹر ہرگانوی، محقق، شاعر، افسانہ نگار اور ادبی صحافی ہیں، اور اب وہ اپنی نئی کتاب "رو برو" کے ذریعے ہمارے سامنے ایک انٹرویو نگار کے طور پر آئے ہیں۔ انٹرویو نگاری کو مغربی صحافت نے فروغ دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جو باتیں منظرِ عام پر نہیں آتیں اور سیاستدانوں کے دلوں ہی میں دفن ہو جاتی ہیں، انھیں کریدا جائے۔ صحافت سے یہ رو ادب کی طرف آئی ادبی رسائل نے تو اس طرف کم توجہ دی لیکن اخبارات کے ادبی صفحات پر انٹرویوز نے خوب گہما گہمی پیدا کی، پاکستان میں ملاقات نگاری کی صنف کو طاہر مسعود، آصف فرخی، الطاف حسین، حسن رضوی، راغب شکیب، فضل من اللہ، سلیم احمد تصور، تنویر ظہور، شمع زیدی اور ناصر بشیر وغیرہ نے بہت فروغ دیا ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ادبی انٹرویو کو بھارت کے رسائل اور اخبارات میں رائج کرنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جوگندر پال، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، سلام سندیلوی، رام لعل، ڈاکٹر قمر رئیس، مظہر امام، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور دیپک قمر جیسے متنوع اور مختلف اصناف کے

ادیبوں کے داخل سے گراں قدر معلومات برآمد کرلی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ایک ہی قسم کے سوال پر مختلف ادبا اظہار خیال کرتے ہیں تو اس موضوع کے متعدد زاویے سامنے آجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر "کیا ادبی گروہ بندیاں نقصان دہ ہیں؟" جیسے سوال پر وزیر آغا نے کہا:

"اگر ادبی گروہ کی تشکیل میں ادبی اور نظریاتی عوامل کار فرما ہوں اور اس کا مقصد ادب کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کی ترویج اور اشاعت ہو تو یہ عمل ادب کی نشوونما کے لیے مفید ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔"

اس سوال پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے رائے دی کہ "ادبی گروہ بندیاں وہ لوگ کرتے ہیں جو کام کم اور نام زیادہ کرنے کے قائل ہیں..... مفادات کی بنیاد پر بھی لوگ گروہ بنالیتے ہیں۔"

ان دو آرا میں اگرچہ بعد المشرقین ہے لیکن غور سے دیکھیے تو دونوں میں صداقت موجود ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ادیب کے داخل کو برانگیختہ کرنے کے لیے خاصے نوکیلے سوالات اٹھائے اور بڑے جاندار جوابات حاصل کیے۔ افسانہ، ناول، سفر نامہ اور انشائیہ کے بعد اب انٹرویوز میں بھی گہری دلچسپی لی جانے لگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ طاہر مسعود اور آصف فرخی کی کتابوں کی طرح "روبہ رو" بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ یہ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج، دہلی نے شائع کی ہے۔

چاندنی کے خطوط / پروین کمار اشک

پروین کمار اشک کی دانش نے ہوش کی آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چاروں طرف حبس کی کیفیت ہے، فضا پر گھٹن طاری ہے۔ لوگ سانس لے رہے ہیں لیکن اس قابل نہیں کہ زندوں میں شمار کیے جائیں، دھرتی اس کے لیے ماں کی طرح تھی لیکن ماں کی گود میں اب کانٹے بھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس عالم میں پروین کمار اشک نے دھرتی ہی سے سوال کیا۔

میں ترا بے خواب بچہ .... ماں! بتا میرے لیے
کوئی لوری کیوں نہیں، کوئی کہانی کیوں نہیں؟

ماں کی لوریوں اور کہانیوں سے محروم اس بچے کے دل پر ضرب لگی تو اس کے اندر سے شاعری کا لاوا پھوٹ پڑا۔ اہلِ ادب نے دیکھا تو حیران ہوئے۔ مظہر امام کو محسوس ہوا کہ پروین کمار اشک کے طرزِ اظہار نے صحرا کے لالۂ خودرو کی طرح کنواری مٹی کے لمس سے پرورش پائی ہے۔ "شہریار کی رائے میں "ان کے اشعار متنوع ہیں۔ عام فضا سے مختلف بھی تازہ کاری ان پر مستزاد ہے۔"

"چاندنی کے خطوط" اس تازہ فکر شاعر پروین کمار اشک کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ ان کا یہ ارشاد بے حد معنی خیز ہے کہ "بے گھر ہونے کا تجربہ تو اس سے پہلے کی نسل کو ہوا تھا مگر اس سے پھوٹنے والا کرب نئی نسل کے حصے میں آیا" گویا نئی نسل کا کرب نیا ہے اور آج کے سب نئے غزل گو شعرا کے والدین اس تجربے سے نہیں گزرے تھے ...... مگر وہ اس تجربے کی فضا سے ضرور روشناس ہوئے تھے۔ بے گھر ہونے کے احساس میں ان لوگوں نے بھی شرکت کی جو براہِ راست اس تجربے سے نہیں گزرے تھے لیکن جس انداز میں یہ کرب نئے شعرا کی تخلیق کاری کا جزو بن گیا ہے یہ اپنی مثال آپ

ہے۔ "پروین کمار اشک نے "بے گھری" کے کرب کو صراحتِ جاں کی صورت میں قبول کیا اور پھر اسے اپنی شاعری کا بنیادی استعارہ بنالیا۔

"چاندنی کے خطوط" میں ہمیں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں ماں کی گود سے بچھڑا ہوا بچہ زمین و آسمان کو اور اس جہان میں آباد انسانوں کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ اور اپنے ذہن میں متعدد سوالات ابھار رہا ہے:

جو دانہ ڈھونڈھنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے
بچپن کس دہلیز پہ مجھ کو چھوڑ گیا؟
یہ کہہ کر "ٹھہرو میں کھلونے لاتا ہوں"

"چاندنی کے خطوط" کی شاعری نئے ذائقے کی شاعری ہے اس میں ماضی کی آواز بے حد مدھم ہے لیکن زمانۂ حال کا درد بے حد نمایاں ہے۔ پروین کمار اشک نے اس درد کو بڑی معصومیت سے شعر کا روپ دیا ہے۔ اور اس کی داد محسن احسان، شمیم حنفی، بلراج کومل، بشیر بدر، عرفان صدیقی، مخمور سعیدی، محمود ہاشمی، راج نرائن راز اور شمس الرحمان فاروقی سے پائی ہے۔ یہ خوبصورت کتاب سمیکشا پرکاشن پٹھان کوٹ سے شائع ہوئی ہے۔

گردوپیش

انجمن میں بی بی سی کے جناب عبید صدیقی کی آمد

۷ فروری ۱۹۹۳ء کو بی بی سی اُردو کے جناب عبید صدیقی انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تشریف لائے۔ اُن کا یہ پاکستانی دورہ سیاسی شخصیات سے ٹیلی فونک انٹرویوز کے سلسلے میں تھا۔ عبید صاحب نے بی بی سی میں آنے سے پہلے کی مشغولیات کے بارے میں بتایا کہ وہ جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ماتحت ریسرچ کا کام کر رہے تھے اُن کا موضوع "میراجی" تھا لیکن وہ کام ادھورارہ گیا۔ بہرحال میراجی پر وہ کام آپ کے ہاں کے معروف افسانہ نگار رشید امجد نے مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اِس موقع پر ڈاکٹر صابر جلیسری نے مہمان خصوصی سے کہا کہ اب جب کہ ریسرچ کا ذکر چھڑ گیا ہے تو کچھ اِس موضوع پر اظہار خیال کریں۔ جناب عبید صدیقی نے کہا کہ ان دنوں اُردو میں زیادہ تر مردہ موضوعات پر ریسرچ کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن اِکا دُکا اچھے مقالات بھی لکھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہندستان میں پی ایچ ڈی کے لیے شمس الحق صاحب کا مقالا "راجندر سنگھ بیدی" پر اور عقیل احمد صدیقی کا مقالا "اُردو نظم" پر اوریجنل اور معیاری کام ہے۔ اِس پر ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن ترقی اُردو نے کہا...... اصل میں زندہ موضوعات پر لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں (پاکستان) حال ہی میں شاہد احمد دہلوی اور سلیم احمد پر بہت اچھا کام ہوا ہے۔ عبید صدیقی صاحب نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں ہندوستان میں زندہ ادبا وشعرا پر بھی پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالا لکھا جا رہا ہے، بہار میں اس طرح کے خاصے مقالے لکھے گئے ہیں، لیکن ان سارے مقالات کو معیاری نہیں کہا جاسکتا، دراصل پی ایچ ڈی اب ایک ضرورت بن گئی ہے انہوں نے ہندوستان میں فارسی اور انگریزی تھیسس کا حال اس سے بھی خراب بتایا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی کے سارے تھیسس اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

جب عبید صدیقی صاحب سے ان کے شعروشاعری کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ اس کی ابتدا علی گڑھ میں دوران تعلیم ہوئی لیکن میرے اس ذوق کو شہریار صاحب کی سرپرستی میں تقویت پہنچی۔ شہریار صاحب کے ہاں نئے شعرا کی ہمت افزائی اور اُن کے ذوق کو تقویت پہنچانے کی روایت جناب خلیل الرحمٰن اعظمی سے پہنچی۔ لندن میں میرے شوق کی آبیاری ساقی فاروقی، باقر رضوی، صدیقہ شبنم، عاشور کاظمی اور اکبر حیدری کی بزم آرائیوں میں ہوتی ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کہا کہ لندن میں ادبی سرگرمیوں کو اردو مرکز سے مہمیز ملی تھی۔ اس کے بند ہونے سے وہاں اردوادب کی سرگرمیوں کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔

بعد ازاں جناب عبید صدیقی سے ان کا کلام سننے کی فرمائش کی گئی عبید صدیقی صاحب سے پہلے اقبال فریدی نے اپنا کلام

سنایا جناب عبید صدیقی نے اپنی کئی غزلیں سنائیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ایسا بھی ہو تو سکتا ہے تم یہ مگر مت کرنا
اس بستی کے اک کوچے میں عمر بسر مت کرنا

کارِ دنیا کے تقاضوں کو نبھانے میں کٹی
زندگی ریت کی دیوار اُٹھانے میں کٹی

اُس سے ہوائیں خوف زدہ سی رہتی ہیں
وہ جو دل کا دیا جلائے پھرتی ہے

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی سیمینار

۸ جنوری ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی کراچی کی جانب سے کے ڈی اے سیمینار ہال میں ایک یادگاری لیکچر منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت حکیم محمد احسن صاحب نے فرمائی جو قیامِ پاکستان کے وقت کراچی شہر کے میئر تھے۔ نظامت کے فرائض جناب پیرزادہ قاسم نے انجام دیے جلسہ کا آغاز جناب ولی اللہ کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا افتتاحی کلمات میں اکیڈمی کے روحِ رواں جناب ہلال احمد زبیری نے کہا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کو بھی یہ مضمون بہت عزیز تھا جس پر ہمارے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک گرانقدر یادگاری لیکچر "پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ" تحریر کیا ہے۔

پیرزادہ قاسم نے کہا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب و ثقافت کے نہایت اہم محقق ہیں، ان کا یادگاری لیکچر صحیح معنی میں ایک تحقیقی مقالہ ہے اپنے مقالہ میں انھوں نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

صدر جلسہ جناب حکیم محمد احسن نے جمیل جالبی صاحب کے مقالے کے حوالے سے کہا کہ پاکستان کو معرض وجود میں آئے ہوئے ۴۵ برس ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک ہم اس بحث و مباحث میں لگے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان کیا ہو گی حالانکہ آزادیٔ اقوام عالم پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہو گا کہ انھوں نے آزادی سے پہلے ہی اپنے بنیادی مسائل کا تعین کر لیا تھا اور آزادی ملتے ہی ایک ایک کر کے نمٹا لیا ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایک طرف ہم قومی زبان کے نفاذ کے لیے فکر مند ہیں دوسری طرف اپنے بچے کو اسکولوں میں "بابا بلیک شیپ" پڑھوانے میں مفاخر ہیں نتیجہ یہ ہے کہ:

WE PRODUCED BATTALION OF BLACK SHEEPS

انھوں نے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں سے ہم بھٹکے ہیں اپنے سفر کا آغاز پھر وہیں سے کریں اور اکیسویں صدی میں جب ہم قدم رکھیں تو بحیثیت ایک قوم داخل ہوں۔ جس کا خواب بابائے قوم نے دیکھا تھا۔

جلسہ کا اختتام ضیافت پر ہوا۔

کتب خانوں کے معیار سے قوموں کے تمدن کا اندازہ ہوتا ہے

بلدیہ عظمیٰ کراچی وسطی کے زیر اہتمام ۲۴ اور ۲۵ جنوری ۱۹۹۳ء کو کتابوں کی دو روزہ نمائش گلستان مصطفےٰ لائبریری، فیڈرل بی ایریا میں منعقد کی گئی بلدیہ کراچی وسطی کے ایڈمنسٹریٹر سید انوار حیدر نے ۲۴ جنوری کو گیارہ بجے دن کو نمائش کا افتتاح کیا انھوں نے افتتاحی اجلاس میں کہا کہ جو قومیں کتابوں کو دوست رکھتی ہیں وہ دنیا میں عروج حاصل کرتی ہیں کتب خانوں کے معیار سے قوموں کے تمدن کا اندازہ ہوتا ہے اس موقع پر میونسپل کمشنر شاہ محمود حسین سید، افسر کتب خانہ جات جناب علی اصغر افسر تعلیمات جناب امین چوہان، کونسل افسر شوکت علی، ایڈیشنل ہیلتھ افسر ڈاکٹر طاہر ملک ناشرین کتب اور معززین شہر موجود تھے۔ لوگوں کی دلچسپی کے وجہ سے نمائش میں ایک دن کی توسیع کرنی پڑی۔

تعزیتی اجلاس

نامور نقاد اور محقق پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی اجلاس گوجرانوالہ رائٹرز کلب میں زیر صدارت پروفیسر سجاد مرزا منعقد ہوا جس میں مرحوم کی روح کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی اجلاس میں موجود شرکا نے کہا کہ ڈاکٹر ملک حسن اختر کی وفات سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

اس اجلاس میں پروفیسر محمد اکرم رضا، علامہ ساجد الباقری، سلیم اختر فارانی، محمد اقبال نجمی، قاضی اعجاز محمود، امجد حمید محسن، ڈاکٹر بشیر عابد اور عاطف کمال رانا شامل ہوئے۔

سرگودھا میں "تھل دریا" کی تقریب

پروفیسر محمد فیروز شاہ کی تیسری کتاب "تھل دریا" کی تعارفی تقریب گزشتہ دنوں سرگودھا اکادمی کے زیر اہتمام سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ تقریب رونمائی کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا نے کی مہمان خصوصی معروف شاعر جمیل یوسف تھے۔ اس موقع پر "زربان" کے ایڈیٹر پروفیسر یوسف خالد، جناب ممتاز عارف، جناب ناصر عباس نیّر، پروفیسر ہارون رشید تبسم سرگودھا اکادمی کے جنرل سیکریٹری میاں ایم ڈی شاد ایڈووکیٹ، جناب ظہیر الدین ظہیر، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور مہمان خصوصی جناب جمیل یوسف نے اظہار خیال کیا مہمان خصوصی نے کہا کہ وہ ایک سچا انسان اور کھرا ادیب ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ محمد فیروز شاہ کے ان مضامین میں "انڈر کرنٹ" کے طور پر فطرت سے ہم آہنگی اور دیہاتی فضا عام ملتی ہے اردو میں دو اسلوب بہت زیادہ رائج رہے ہیں ایک محمد حسین آزاد کا آرائشی اسلوب یعنی شعری دوسرا سر سید احمد خاں کا سادہ اور نثری اسلوب ہے۔ اچھے اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آرائشی بھی نہ ہو اور بے رس بھی نہ ہو۔ فیروز شاہ کا اسلوب امتزاجی حسن کا آئینہ دار ہے۔

صدر جلسہ کے خطاب کے ساتھ ہی یہ پروقار تقریب اختتام کو پہنچی۔

(رپورٹ ہارون الرشید تبسم)

ریڈیو موس ناروے کی اردو سروس

ناروے کے دوسرے بڑے صنعتی شہر موس میں یوم آزادی پاکستان نہایت جوش و خروش سے منایا گیا اوسلو کے اخبار

"آواز" کے نمائندہ خصوصی ممبر سٹی کونسل، موسٰی کی حیثیت سے راقم نے ریڈیو موس کی اردو سروس سے اڑھائی بجے تا شام چار بجے یوم آزادی پاکستان کا پروگرام نشر کیا۔ جو قومی ترانہ سے شروع ہوا۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر نشر کی گئی جو ان کی آواز میں تھی۔ راقم نے تقریر کا ترجمہ پڑھا بعد ازاں پاکستان کے ملّی اور قومی نغمے سنوائے گئے پروگرام کا اختتام قومی ترانے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے پر ہوا۔

(اردو نامہ جنوری ۹۳ء)

ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو میں محفل طنز و مزاح

۱۰ جنوری کی شام کو ریڈیو پاکستان کراچی کی طرف سے ایک مزاحیہ نثری نشست اور محفل مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔ اس محفل میں کراچی شہر کے چیدہ چیدہ شعرا، ادبا اور صحافیوں نے شرکت کی۔ نثری نشست کی صدارت بزرگ کالم نگار نصر اللہ خاں نے کی جب کہ اقبال فریدی نے نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مزاح نگاروں میں منظر علی خاں منظر، راشدہ نثار، ایم عظمت اللہ، ارشاد احمد خاں، ایس ایم معین قریشی اور اطہر حسن صدیقی نے اپنے شگفتہ اور طنز و مزاح سے بھرپور نثر پارے سنائے۔ اس کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ جس کی صدارت جناب راغب مراد آبادی نے کی جناب دلاور فگار بہ طور مہمان خصوصی شریک ہوئے اختر لکھنوی نے شعری نشست کی نظامت کی جن شعرا نے اپنا ظریفانہ کلام سنایا ان میں ایس ایم شجاع، بیدل جونپوری، سعید آغا، شاہد الوری، ہر فن لکھنوی، گستاخ گیاوی، امیر الاسلام ہاشمی اور ضیا الحق قاسمی قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح کی ادبی تقاریب کا ہوتے رہنا ریڈیو پاکستان کے ROUTINE پروگرام میں تازہ ہوا کے مترادف ہے۔ اس کے لیے اسٹیشن ڈائریکٹر جناب صبیح محسن کی مساعی قابلِ ستائش ہیں۔

جناب محسن شمسی انجمن میں

۱۳ فروری ۱۹۹۳ء کی شام کو انجمن ترقی اردو کے نئے دفتر واقع یونیورسٹی روڈ میں لندن کے معروف افسانہ نگار محسن شمسی تشریف لائے۔ محسن صاحب کے اعزاز میں ایک "شام افسانہ" کا اہتمام کیا گیا ۔ ۔ اس کی صدارت **مشہور افسانہ نگار** انتظار حسین نے کی۔ جناب محسن شمسی نے اپنا تازہ افسانہ "کہکشاں کی سمت" سُنایا، اس کے بعد صدرِ تقریب جناب انتظار حسین نے حاضرین کو افسانے پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ پھر انھوں نے خود ہی پہل کرتے ہوئے جناب محسن شمسی سے استفسار کیا۔ "لندن میں شعر و شاعری کی سرگرمیوں کے بارے میں تو بہت کچھ سُنتا اور پڑھتا رہتا ہوں، کیا لندن میں افسانے کی مجلسیں بھی برپا ہوتی ہیں؟" صدر کے اسی سوال کے ساتھ پروفیسر عتیق احمد نے ایک اور سوال کیا۔ "ہمارے ہاں کے افسانے اور لندن میں لکھے جانے والے افسانوں میں کیا فرق ہے؟" جواب میں محسن شمسی صاحب نے کہا۔ "لندن کے افسانہ نگاروں کی اپنی ذہنی فضا اور یہاں کے لکھنے والوں کی، اپنی ذہنی فضا ہے۔ دونوں کے ماحول و کوائف میں خاصا فرق ہے۔ دونوں جگہوں کے افسانہ نگار اپنی ہی فضا میں رہ کر لکھ سکتے ہیں، یہاں بیٹھ کر لندن کے بارے میں تو لکھا جا سکتا ہے، لیکن اُس میں ذاتی تجربات و مشاہدات کی وہ گرمیٔ خلوص کس طرح سموئی جا سکتی ہے جو ماحول کی عطا ہوتی ہے۔"

شہزاد منظر نے کہا..... "افسانہ فکر انگیز ہے۔" آصف فرخی، نے محسن، شمسی، کے افسانے میں، کرشن، چندر کے اسلوب کو

ڈھونڈھنے کی کوشش کی، اس پر زاہدہ حنا نے کہا کہ "آصف صاحب کا یہ مؤقف درست نہیں، محسن شمسی صاحب کا اپنا ایک اسلوب ہے۔" ڈاکٹر حنیف فوق نے کہا کہ "اس افسانے میں اقدار کی پرکھ، تنہائی، وہاں کے کرداروں اور آدرشوں کے ٹکراؤ کے حوالے سے کی گئی ہے۔" جناب جمیل الدین عالی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اس افسانے کا انداز بیانیہ ہے۔ کیا محسن صاحب کے دوسرے افسانوں میں بھی یہی اسٹائل برتا گیا ہے۔ یہ اسٹائل بے ساختہ ہے یا شعوری کوشش کا نتیجہ؟" اس پر محسن شمسی صاحب نے جواب دیا کہ "اس میں کوئی شعوری کوشش نہیں۔ صدرِ مجلس نے کہا کہ "اس افسانے میں افسانہ نگار کا طرزِ احساس شاعرانہ رقم ہوا ہے، اسے ایک طرح کا اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے افسانے لکھے جاتے ہیں۔"

محسن شمسی صاحب سے پوچھا گیا کہ انھوں نے لندن میں مقیم تارکینِ وطن کے مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے تو شمسی صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے افسانے میں دانستہ طور پر ایسا نہیں کیا، لیکن لندن میں مقیم کئی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے تارکینِ وطن کے مسائل پر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ فیروزہ جعفر، محسنہ جیلانی اور قیصر تمکین اُن میں سے چند ہیں۔ ڈاکٹر حنیف فوق نے کہا کہ لندن کے ڈاکٹر مصطفےٰ کریم نے بھی تارکینِ وطن کے موضوعات پر کئی اچھے افسانے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے محسن شمسی کے افسانے "کہکشاں کی سمت" کے حوالے سے ایک اور نکتہ اٹھایا وہ یہ کہ اُداسیت لندن اور برصغیر پاک و ہند کے افسانہ نگاروں میں قدر مشترک ہے۔ ہمارے ہاں اُداسی کی اساس ناآسودگی ہے ور آپ کے ہاں یہ اُداسی آسودگی اور سیری کے حوالے سے ہے۔ پروفیسر عتیق نے ایک اور رُخ سے جائزہ لیا اور کہا محسن شمسی کے افسانے میں جذبات کی جنگ ہے۔ اسی جنگ کے دباؤ کو شاعرانہ زبان ہی کے ذریعے سہارا دیا جاسکتا ہے۔ محسن شمسی صاحب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ نثری زبان کا بھی ایک ردِم اور آہنگ ہے، اگر یہ اسلوب میں بھی ظاہر ہوتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ محسن شمسی نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا دراصل ہم افسانہ نگار ذہنی انتشار اور سماجی انتشار میں رہ کر لکھ رہے ہیں۔ میری کوشش یہ ہے کہ انتشار سے معنویت تلاش کی جائے۔ اس منتشر صورتِ حال میں جو سوال سر اُبھار رہے ہیں اُس کا جواب معاشرے سے جو کچھ ملتا ہے۔ وہ روحانی مسرّتوں کے لیے کافی نہیں اور اس کے جو جواب کارل مارکس نے دیے ہیں وہ بھی ناکافی ثابت ہوا ہے۔

صدر "شامِ افسانہ" جناب انتظار حسین نے تقریب کو سمیٹتے ہوئے فرمایا۔ انجمن ترقی اردو نے ایک بڑی اچھی شام کا اہتمام کیا ہے۔ ایسی محفلیں برپا ہوتی رہنی چاہئیں۔ یہ کچھ نہ کچھ ہمیں دے جاتی ہیں۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

ادب، مسائل و مباحث

احمد شہزاد نصیب	ادب اور اخلاق	محفل لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۶
اشرف سلیم	نیا اردو افسانہ اور علامت، ایک مذاکرہ	ماہ نو، لاہور فروری ۱۹۹۲ء ص ۳
افتخار اجمل شاہین، پروفیسر	ادب کی افادیت	اظہار، کراچی جنوری، فروری ۹۲ء ص ۵۴
افضل اسر	ادب میں کومٹمنٹ	ماہ نو، لاہور ۹۲ء ص ۳۵
ایم عامی	اسلوب اور شناخت	روح ادب، کلکتہ مارچ ۹۲ء ص ۶۴
پیٹر بجسل/منیر الدین احمد	ادب کے بارے میں کہانیاں (جرمن)	ادبیات، اسلام آباد ۲۶/۹۲ء ص ۲۹۳
پیٹر بجسل/منیر الدین احمد	ابتدا کیسے کی جائے، مولو کے بارے میں (جرمن)	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۳۸۵
جمیل جالبی، ڈاکٹر	ادب کی بے معنویت	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۴۱
حفیظ الرحمن خان	ادب اور نئے عصری تقاضے	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۱
رب نواز مائل	غزل موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۵
سلیم آغا قزلباش	باتیں انشائیہ کی	نردبان، سرگودھا مئی جون ۹۲ء ص ۱۷
سلیم اختر، ڈاکٹر	کومٹ منٹ	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۴۰
شفیق احمد شفیق	الفاظ کی اہمیت اور ادیب کی ذمہ داری	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۵۷
شفیق احمد عزیز	جنگ اور ادب	محفل، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۳
عبدالرزاق صابر	براہوی ادب میں جدید رجحانات	ماہ نو لاہور مارچ ۹۲ء ص ۷۹
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	روسی اشتراک کا زوال اور ادب	صریر، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	کیلنڈری جدیدیت اور نظریاتی جدیدیت	صریر، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، ناتھالی سرات	صریر، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۸
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت چارلس بیئری بودلیئر	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۶۶
محمد علی صدیقی	ادب، سائنس اور عقل دشمنی	افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۳
مسعود منور	روسی ہئیتیت کی تاریخ اور تصورات	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۸۵

مقصود الٰہی حسنی	غزل میں ہئیت کے تجربوں کی ضرورت	صریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۲
مناظر عاشق ہرگانوی	آزاد غزل کی تفہیم	صریر، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۵
منیر احمد شیخ	ادب اور ثقافت	محفل، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۹
ناصر اسلام	کافکا کا تصورِ وجود	ادب لطیف، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۷
نجم السحر نجمی	ادب اپنے نصب العین کے حوالے سے	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹۱
نرگس جہاں آرا	دوسرے درجے کے ادب کے مابعد الطبیعیات	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۹
ولیم ہنری ہڈسن/ ثناء الحق صدیقی	ڈرامہ، ایک مطالعہ	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۳۵

لسانیات

احسان الحق، ڈاکٹر	اردو عربی قواعد، ایک تقابلی جائزہ	آگہی، کراچی سالنامہ فروری، مارچ ۹۲ء
ثمینہ شوکت، پروفیسر	ترسیل اور معنی کا باہمی تعلق	سب رس، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۴
طارق محمود	لسانی وحشیں اور تحفظات	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۷
قدرت نقوی	چھہ	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۵
قدیر الدین احمد، جسٹس	بظاہر ہم معنی اور دراصل ہم معنی الفاظ کا استعمال	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۴۵
گوپی چند نارنگ	سخنے چند در ساختیات	دریافت، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۴
وقار زیدی	لسانیات کیا ہے؟	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۴۸

تحقیق و تنقید

ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر	سلیم اللہ کی شاعرانہ عظمت	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۶۷
ادیب سہیل	گریگوری کورسو، ایک امریکی شاعر	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۵۲
اعجاز راہی، ڈاکٹر	وجودیت پسند امریکی ناول نگار، سال بیلو	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۴۱
اللہ رکھیو بٹ ترجمہ احمد نواز سولنگی	صوبہ سندھ کے کتب خانے	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۵۱
اُمید یومانی ایلو ترجمہ ڈاکٹر محمد خالد مسعود	حکیم مومن خاں مومن اور تحریک مجاہدین	فکر و نظر، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۴۲
جمیل احمد رضوی	دستاویزی طریق تحقیق	آگہی، کراچی، تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر	بابا فرید کی اردو شاعری	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۹۲ء ص ۲۲۸
حاوی اعظم	یاران نکتہ داں کے لیے	ماہ نو، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۹
حسن سوز	مجنوں صاحب کا فنِ شعر گوئی	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۵۱
خورشید احمد	مذاہبِ عالم ایک تقابلی مطالعہ (قسط ۱)	الشاعر، کلکتہ فروری، مارچ ۹۲ء ص ۱۰
دیویندر پرشاد سکسینہ	"صبح وطن" کا پہلا ایڈیشن	ہماری زبان، دہلی ۲۲ جنوری ۹۲ء ص ۸
رام لعل نابھوی	کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟	معارف، اعظم گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۲۸
رشید نثار	آنکھ اور نطق کا شاعر، یوسف ظفر	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۵۳
رشیدہ اطہر	انجم اعظمی، بحیثیت نقاد	آگہی، کراچی سالنامہ فروری، مارچ ۹۲ء
رشیدہ اطہر	شوق قدوائی کے کلام میں ضرب الامثال اور محاورات	آگہی، کراچی، مئی ۹۲ء ص ۲۵
رضوان علی ندوی، ڈاکٹر	تصحیح العرب کا ایک تنقیدی جائزہ	معارف، اعظم گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۲۹۰
ستار طاہر	مارلو میفسٹو فیلیس، ایک تعارف	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۸۰
شجاعت علی سندیلوی	جگر مرادآبادی کا تصور وطنیت	روح ادب، کلکتہ مارچ ۹۲ء ص ۳۲
شمیم حنفی، ڈاکٹر	[illegible]	[illegible]

بد ارمان، ڈاکٹر	قطعات ممنون اور عصری حیثیت	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۵۳
ارب عرفان کاشمی، ڈاکٹر	دارالشکوہ کے عارفانہ دعوے	معارف، اعظم گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۳۶۵
ش بخش صابر	نعت نبی ﷺ بلوچی اور براہوی میں	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء ص ۲۷۹
ق احمد	بابا فرین شاہ تاجی اور صوفیانہ شاعری	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۵۱
اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، لڈوگ وٹگنز ٹین	مریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۶۳
اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، ولیم فاکنر	مریر، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵۶
محمود	معرکہ مذہب و سائنس۔ ۳	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۳۳
محمود	قبل از اسلام سائنس اور ٹکنالوجی	سائنس میگزین، کراچی جون ۹۲ء ص ۹
م محمود	معرکۂ مذہب و سائنس۔ ۴	سائنس میگزین، کراچی جون ۹۲ء ص ۹۷
ن چند، ڈاکٹر	شمس الرحمن فاروقی کی اصلاحیں	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۹
راسحق	مولانا عبدالعزیز میمن کی عربی خدمات	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۶۲
ظفیر الحسن، ڈاکٹر	اشاریہ جدید اردو کلکتہ	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۹۰
ظفیر الحسن، ڈاکٹر	اشاریہ جدید اردو کلکتہ قسط ۱۱	آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹۰
ناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ہائیکو کے عروضی و صوتی نظام کی تخلیقیت شناسی	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۴۲
ناظر عاشق ہرگانوی	اختر اورینوی کی ڈرامہ نگاری	کندن، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۶
میم الدین قریشی، ڈاکٹر	عوامی کتب خانے اور ان کی اہمیت	آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۷۹
میم نقوی، ڈاکٹر	شاہ لطیف کے کلام میں عورتوں کا مرتبہ	آگہی، کراچی، فروری ۹۲ء ص ۶۳
لی حمزہ نازش	میر تقی خیال کی بوستان خیال اور ترجمہ	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۶
ہوش بلگرامی	مثنوی طوفان محبت مع مقدمہ، علامہ نیاز فتحپوری	نگار، کراچی فروری ۹۲ء ص ۷-۲۷
یونس شیخ، ڈاکٹر	نئی یورپی سوچ کا پہلا ستون اسقراط	صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء ص ۸۱

تنقید، فن تنقید

ادیب سہیل	تخلیق اور تخلیقی عمل	مریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۰
احمد سہیل	ساختیات کی کہانی	ادب لطیف، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳
مختار اجمل شاہین، پروفیسر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقید نگاری	کندن، کراچی فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۳
مختار اجمل شاہین	ڈاکٹر شاداں کی غزل گوئی	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۵۱
اکبر رحمانی، پروفیسر	لمعہ حیدر آبادی کی نظم دریائے تیشین	طلوع افکار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۴۰
الیاب ندیم	قیوم نظر اور جدید شعری ہیتیں	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۳۸
پرویز بزمی	احمد ندیم قاسمی کی نظم نگاری، محیط کے حوالے سے	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۳۳
پرویز بزمی	احمد ندیم قاسمی کی غزل	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۳۵
جمیل آذر	اک کتھا انوکھی	دریافت، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۲
جمیل آذر پروفیسر	ساختیات، اکریوین اور اکریونت	مریر کراچی جنوری ۹۲ء ص ۹
جمیل ملک	لطیف کاشمیری کا فن	ماہ نو، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۱
خالدہ حسین	سولی کی تلاش	دریافت، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۸
خیل امروہوی ڈاکٹر	اردو شاعری اور فیروز نظر کی مختلف جہتیں	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۸۶
رشید احمد گوریجہ	انشائیہ کے خد و خال	تحریریں، لاہور دسمبر ۹۱ء ص ۴۹
رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر	انشائیہ کل اور آج	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۱۵
رشید امجد، ڈاکٹر	میرا جی کی غزلیات	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۸
رشیدہ اطہر	شوکت صدیقی کے افسانے ایک مختصر جائزہ	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۲
رشید نثار	ڈاکٹر وزیر آغا چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل کے آئینے میں	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۵۰

قومی زبان (۸۸) مارچ ۱۹۹۳ء

مصنف	عنوان	ماخذ
رفیق سندیلوی	اکبر حمیدی کے انشائیے ایک مطالعہ	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۷۶
ریاض صدیقی	نسوانی تنقید	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۷۴
سلیم اختر، ڈاکٹر	منجی کتھے ڈاھواں	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۷۰
سلیم الرحمٰن	پروین شاکر انکار کے آئینے میں	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۲۶
سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر	پرتو روہیلہ کے دوہے	تحریریں، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۱
شافع قدوائی	آوارہ ایک تجزیاتی مطالعہ	اوراق، لاہور خاص نمبر جون جولائی ۹۲ء
شان الحق حقی، ڈاکٹر	ڈاکٹر رستوگی اور دل کی زبان	طلوع افکار کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۷۲
شفیق علی خان ڈاکٹر	آئینے کا لہجہ	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹۳
شمیم احمد	عزیز حامد مدنی کی شاعری میری نظر میں	ادبیات، اسلام آباد ۹۷/۱۶ء ص ۲۵۱
شہزاد احمد شہزاد	اکبر حمیدی اور جدید غزل	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۳۶۹
ضمیر علی بدیوانی	ادبی تنقید کا سفر، مظہری تنقید رد تشکیل کے آئینے میں	دریافت، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۸
طارق جاوید	مخمور جالندھری کی نظم کے فکری و فنی پہلوؤں کا جائزہ	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۴۲
طارق حبیب خواجہ	خواجہ میر درد.... تصوف سے ہٹ کر	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۳۴
عارف عبدالمتین	ایک تاریخی دستاویز، فردیات کے حوالے سے	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۱ء ص ۵۴
عبدالرحمٰن عابد قاضی	میراجی نظم رقیب، ایک تجزیہ	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۰
عبداللہ شاہ	مشتاق یوسفی کی مزاح نگاری	محفل لاہور مارچ ۹۲ء ص ۳۷
عبدالمغنی، ڈاکٹر	آل احمد سرور کی تنقید نگاری	محفل، لاہور سالنامہ جنوری ۹۲ء ص ۱۳۲
عرش صدیقی	اردو دوہے کی بحر	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۱۱
فردوس انور قاضی، ڈاکٹر	پریم چند کے افسانوی ادب کا تحقیقی مطالعہ	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۵۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ساختیات اور حمالیات ۳	صریر، کراچی فروری ۹۲ء ص ۹
قاضی عبدالرحمٰن عابد	چند ہم عصر ایک جائزہ	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۷۹
قاضی عبدالقادر ڈاکٹر	مابعد تنقید	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۴۷
قمر جمیل	پس ساختیات	دریافت، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵
لد میلاو سیلوا	الطاف حسین حالی کی روشن خیالی کی غزل	دریافت، کراچی فروری ۹۲ء ص ۱۰
محمد اسلم اعوان	ایک غیر مدرک تاریخی کردار غلام قادر روہیلہ	ماہ نو لاہور جنوری ۹۲ء ص ۱۸
محمد باقر شمس	نظم شور پر اعتراضات حقی کا جائزہ	طلوع افکار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۲۳
مسعود جاوید	طاہر نقوی کے افسانے	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ۷۶
مقصود حسنی	نذیر احمد کے کرداروں کا تاریخی شعور	صریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۴
مقصود حسنی	مغرب میں تنقید شعر کا سفر	ماہ نو، لاہور جون ۹۲ء ص ۵
مقصود حسنی	کرشن چندر کی کردار نگاری	تحریریں، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۹
ملک جاوید	قصۂ سیف الملوک میں اخلاقی شاعری	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۴۴
ممتاز احمد خاں	مشرف احمد کا فن	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۴۵
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ساختیات اہم نکات کی توضیحات	صریر، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ساختیاتی نظریہ سازی	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۹
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ساختیاتی تنقید محمد علی صدیقی سے ایک مصاحبہ	صریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹
ناصر بشیر	جعفر شیرازی کی شاعری، ایک تنقیدی جائزہ	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۸۶
ناصر بغدادی	البیر کامیو کا اجنبی	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۹۲
وزیر آغا، ڈاکٹر	ہم ضیا جالندھری اس نظم میں	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۴
وزیر آغا، ڈاکٹر	ساحر لدھیانوی کی طویل نظم پرچھائیاں	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء ص ۲۴۷
وقار راشدی، ڈاکٹر	پروفیسر کبیر احمد جائسی کی ایک اہم تصنیف، جدید تاجیکی شعرا کا تنقیدی جائزہ	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۸۰

شمیم صبائی متھراوی

گزشتہ سال جُدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ
(۱۹۹۲ء)

(۱)

"مولانا ریاست علی قادری امیر کلید جنّت"

۱۹۹۲ء

ریاست علی خُلد میں جا بسے
ہوا اُن سے راضی جو ربّ قدیر
پکارا شمیم آ کے رضوانِ خُلد
"ریاست علی قادری ہیں امیر"

۱۴۱۲ھ

(ممتاز اسکالر، مصنّف، دینی کالم نگار اور ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کے بانی صدر مولانا ریاست علی قادری نے ۳ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۲۷ جمادی الاخر ۱۴۱۲ھ بروز جمعہ اسلام آباد میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کی میّت کراچی لائی گئی اور تدفین ہفتہ کی شب سخی حسن کے قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۲)

"لمحۂ انتقال ضیاء الاسلام انصاری"

۱۹۹۲ء

وہ شخص جُدا ہو گیا ہم سے افسوس
تھا اہلِ صحافت میں بڑا جس کا نام

قومی زبان (۹۰) مارچ ۱۹۹۳ء

اُس شخص کی تاریخ فنا تو بھی شمیم
لکھ" وائے اُٹھے آج ضیاء الاسلام"

۱۴۱۲ھ

(ممتاز صحافی اور نیشنل پریس کے سابق چیئرمین جناب ضیاء الاسلام انصاری نے ۳ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۷ جمادی الآخر ۱۴۱۲ھ بروز جمعہ لاہور میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کا جسدِ خاکی ہفتہ کے دن لاہور کے گارڈن ٹاؤن قبرستان میں سپردِ لحد کیا گیا)

(۳)

"مولانا سیّد متین ہاشمی امیر بزم خُلد"

۱۹۹۲ء

متین ہاشمی اک نام دار عالم دیں
بہشت پا کے خدا کے عطا پہ قانع ہیں
شمیم یوں ملی ان کی وفات کی تاریخ
"متین ہاشمی بزم ارم کے سامع ہیں"

۱۴۱۲ھ

(معروف عالم دین اور مصنّف مولانا سیّد متین ہاشمی نے ۱۱ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۴ رجب المرّجب ۱۴۱۲ھ بروز جمعہ بعمر ۶۷ سال لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کو ہفتے کے دن سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں میانی صاحب کے قبرستان لاہور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔)

(۴)

"روح فرسا وفاتِ نذر"

۱۹۹۲ء

فلم اسٹار نذر بھی افسوس
پا گئے ہیں وفات کیا کیجیے
ان کی روح مزار پر اے شمیم
"اٹھ گئے ہائے نذر" لکھ دیجیے

۱۴۱۲ھ

(پاکستانی فلمی صنعت کے مشہور مزاحیہ اداکار جناب نذر نے ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴ رجب المرجب

ھ بروز پیر بعمر ۷۳ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو مقامی قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا۔)

(۵)

"انکشافِ رحلتِ امیر خاں"

۱۹۹۲ء

جل اُٹھے ہیں چراغِ حزن و الم
شامِ فرقت امیر خاں کی ہے
بولا ہاتف شمیم سے آکر
لکھ "یہ میّت امیر خاں کی ہے"

۱۴۱۲ھ

(ممتاز براڈکاسٹر اور ریڈیو پاکستان کے مقبول پروگرام "حامد میاں کے ہاں" کے حوالے سے شہرت رکھنے والے سینئر صدا کار جناب امیر خاں نے ۲۳ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۱۷ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۸۰ سال کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔)

(۶)

"میر خلیل الرحمان امیر عالمِ فردوس"

۱۹۹۲ء

دنیا سے اٹھا "جنگ" کا بانی کہ گرا
ایوانِ صحافت کا ستونِ ذی شان
ان کے لیے تاریخ فنا لکھ دو شمیم
"محبوبِ جناں، میر خلیل الرحمان"

۱۴۱۲ھ

(روزنامہ "جنگ" کے بانی اور ایڈیٹر انچیف جناب میر خلیل الرحمان نے ۲۵ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۱۹ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ بروز ہفتہ بعمر ۷۰ سال لندن کے ایک اسپتال میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی نعش پاکستان لائی گئی اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پیر ۲۷ جنوری کو کراچی میں پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد لحد کی گئی۔)

(۷)

"صغیر ملال صاحبِ علم فردوس"

۱۹۹۲ء

ادیب و شاعر و ناول نگار آتا ہے
اُسے بہشت میں با احترام لے آؤ
شمیم یوں در جنت پہ دفعتاً آئی
صدائے غیب" صغیر ملال آجاؤ"

۱۴۱۲ھ

(نوجوان ادیب، شاعر اور ناول نگار جناب صغیر ملال نے ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۲۰ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ بروز اتوار بعمر ۴۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔)

(۸)

"ادیب بدایونی شیفتۂ قصرِ بہشت"

۱۹۹۲ء

محفل دہر سے اک اور سخن ور اُٹھ کر
محفل خُلد کا مہمان ہوا اُس کے نصیب
اُس کی تاریخ فنا ہاتفِ غیبی نے شمیم
صاف و برجستہ کہی" قطعہ تاریخ ادیب"

۱۴۱۲ھ

(بزرگ شاعر جناب ادیب بدایونی ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء مطابق ۲۳ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ بروز بدھ کراچی میں فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔)

(۹)

"دردناک ارتحال خاور نوری"

۱۹۹۲ء

خاور نوری دہر سے اُٹھے
اُٹھنا تھی ان کی مجبوری

بن گیا ان کا سالِ رحلت
"کوسِ رخ خاور نوری"

۱۴۱۲ھ

(حیدرآباد دکن کے باکمال شاعر اور استاد سخن حضرت نجم آفندی کے شاگرد و جانشین جناب خاور نوری نے ۷ ۱۹۹۲ء مطابق ۲ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز جمعہ انتقال فرمایا۔)

(۱۰)

"بیگم الماس دولتانہ کوکبِ باغِ ارم"

۱۹۹۲ء

ممتاز دولتانہ صاحب کی اہلیہ بھی
اہلِ جہاں سے اپنا دامن چھڑا رہی ہے
یوں اے شمیم بولا تاریخ مرگ رضواں
"الماس دولتانہ جنت میں آ رہی ہے

۱۴۱۲ھ

(بزرگ سیاسی رہنما ممتاز دولتانہ کی اہلیہ اور تحریک پاکستان کی ممتاز کارکن بیگم الماس دولتانہ نے ۱۰ فروری ۱ مطابق ۵ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز پیر بعمر ۶۵ سال اپنے آبائی گاؤں وہاڑی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ان کے) قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۱۱)

"علامہ محمد اسد معنی دانِ ریاضِ بہشت"

۱۹۹۲ء

محمد اسد کر گئے انتقال
ملا ان کو تمغائے نازِ بہشت
شمیم ان کی تاریخ رحلت لکھو
"محمد اسد سرفرازِ بہشت"

۱۴۱۲ھ

("روڈ ٹونکہ" اور قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ "پیغام قرآن" کے مصنف معروف مسلم دانشور علامہ محمد اسد خاندانی نام لیو پولڈ) نے ۲۳ فروری ۱۹۹۲ء مطابق ۱۸ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز اتوار بعمر تقریباً ۹۰ سال اسپین میں

رحلت فرمائی)

(۱۲)

"حیف، ہجرِ پروفیسر خواجہ محمد شفیع دہلوی"

۱۹۹۲ء

مُرّبیِ اردو، بخُلد بریں
اُٹھا پیارا خواجہ محمد شفیع
شمیم اس کا سال فنا یوں ملا
"گیا پیارا خواجہ محمد شفیع"

۱۴۱۲ھ

(اردو مجلس (دلّی) کے بانی، اردو کے مربّی، ادیب الملک پروفیسر خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ۲۷ فروری ۱۹۹۲ء مطابق ۲۲ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۹۰ سال لاہور میں رحلت فرمائی)

(۱۳)

"داغِ رحلتِ جام صادق علی"

۱۹۹۲ء

چل بسے جام صادق علی جس گھڑی
ہو گیا سندھ میں ماتم پُر اثر
یوں کہا اے شمیم آ کے رضوان نے
"جام صادق علی خُلد کا راہبر"

۱۴۱۲ھ

(صوبہ سندھ کے وزیراعلیٰ جام صادق علی نے ۵ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۵۷ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ جمعرات کی صبح جام صاحب کی میّت سڑک کے راستے ان کے آبائی گاؤں نوابِ گوٹھ لے جائی گئی جہاں ۳ بجے سہ پہر پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین عمل میں آئی)

(۱۴)

"سانحۂ ارتحال پروفیسر سیّد نعیم تقوی"

۱۹۹۲ء

سیّد نعیم تقوی اک نام ور محقق
جب ہو گئے اچانک بزمِ جہاں سے رُخصت
پایا شمیم ہم نے ان کی فنا کا مصرع
"سید نعیم تقوی سلطانِ بزمِ جنّت"

۱۴۱۲ھ

(اردو اور سندھی کے ممتاز محقق اور اُستاد، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کے صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم نقوی نے ۵ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۵۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم جمعہ کے دن سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۱۵)

"مرگِ نکو نام عظیم الدّین محبت"

۱۹۹۲ء

تھے محبّت شاعرِ معروف جو
دے کے ہم کو رنجِ رحلت اُٹھ گئے
ان کی لوحِ قبر پر لکھ دو شمیم
"آہ گیتی سے محبّت اُٹھ گئے"

۱۴۱۲ھ

(معروف شاعر و ادیب اور فنِ تاریخ گوئی کے ماہر جناب عظیم الدّین محبت نے ۱۲ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۷ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات کراچی میں انتقال فرمایا۔)

(۱۶)

"روزِ مرگ جناب راہی معصوم رضا"

۱۹۹۲ء

اطلاع وفاتِ راہی پر

ہم نے تاریخ مرگ جب چاہی
آ کے بولا شمیم سے ہاتف
"اب ہے جنّت میں ڈاکٹر راہی"

۱۴۱۲ھ

(مشہور ادیب، شاعر اور ناول نگار ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے ۱۵ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز اتوار بعمر ۶۴ سال بمبئی (بھارت) میں انتقال فرمایا۔ ان کا ناول "آدھا گاؤں" بہت مشہور ہوا۔)

(۱۷)

"مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی عالمِ فردوس"

۱۹۹۲ء

جب ہوئے رحمت باری کی اجازت سے شمیم
قاید گلشن فردوس حبیب الرحمان
بولا رضوانِ جناں، مصرع تاریخ وفات
"شاہدِ گلشن فردوس حبیب الرحمان"

۱۴۱۲ھ

(بھارت کے ممتاز اسلامی مفکر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز پیر بعمر ۹۵ سال بھارت میں انتقال فرمایا۔)

ماہنامہ قومی زبان کراچی

اپریل ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۴

مضمون نما

اقبال، جمال الدین افغانی اور اتحادِ عالمِ اسلامی	خالد اقبال یاسر	۷
اقبال کا تصور بقائے دوام	شفیق عجمی	۱۳
ادبی سپریم کورٹ کے سامنے	سیّد ضمیر جعفری	۱۷
رباعیات	راغب مراد آبادی	۲۴
سیّد ضمیر جعفری... شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۲۵
سیّد ضمیر جعفری۔ چند باتیں	ستار طاہر	۳۳
غالب کے تصرفات	افتخار احمد عدنی	۳۹
کرشن چندر اور سماجی شعور	دردانہ قاسمی	۴۷
تخلیق میں موضوع اور ہیئت کی اہمیت	رحمن نشاط	۵۱
گلہائے رنگ رنگ		
سندھی ادب میں جدید رجحانات	مصطفٰی کھوڑو / رمیش کمار	۵۵
بڑھاپا (عربی)	یوسف الخال / انور الحسن جعفری	۵۹
کتاب فطرت O میری فاختہ میرا پیار	روسوا عبدالعزیز خالد O شکیل فاروقی / ا۔ س	۶۰
ندی کے کنارے (ملیالم)	ایس۔ کے۔ پوٹیکر / شہریار احمد	۶۱
رفتار ادب	....	۶۵
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۷۱
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۷۷
گرد و پیش	....	۸۳
گزشتہ سال جدا ہم سے ہوگئے یہ لوگ	شمیم صبائی متھراوی	۹۱

سرورق کی تصویر: سیّد ضمیر جعفری

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرون ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

برآمدات

قومی زبان (۳) اپریل ۱۹۹۳ء

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا انتقال اب سے چھپن سال پہلے اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا۔ اسی رعایت سے ہر سال اپریل کے مہینے میں علامہ کی برسی کے موقع پر، پاکستان کے علمی و ادبی ادارے سیمینار اور مذاکرے منعقد کرتے ہیں، ٹی وی اور ریڈیو سے بھی خاص پروگرام پیش کیا جاتا ہے..... علاوہ ازیں علامہ کی شخصیت، فن اور فلسفے پر کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ یہ کام انفرادی طور پر انجام پاتا ہے اور وہ ادارے بھی سرانجام دیتے ہیں جو اسی کام کے لیے مختص ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کی بہت سی جہات ہیں اُن میں سے کچھ حیطۂ تحقیق میں آ چکی ہیں اور کچھ ابھی نظر سے اوجھل ہیں، جن پر مختلف زاویے سے باتیں ہونی ابھی باقی ہیں۔ انھیں میں ایک جہت وہ ہے جو سوویت یونین کے سقوط سے منصۂ شہود پر آئی ہے، سوویت یونین کے سقوط کے بعد وسط ایشیاء میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی اُس کے نتیجے میں کئی ریاستیں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی ہیں۔ اس سے ان ریاستوں اور اُن کے پڑوسی ممالک کے درمیان، تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کی وجہ سے، اتحادِ کار کا امکان پیدا ہوا ہے۔ آگے چل کر یہ اتحاد عالم اسلامی کے اُس اتحاد میں بھی بدل سکتا ہے، جس کا خواب برسوں پہلے، جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال نے مل کر دیکھا تھا۔ علامہ اقبال نے جس کا جستہ جستہ اظہار "جاوید نامہ" اور اپنی دوسری بہت سی نظموں میں کیا ہے اور جس کا حوالہ اُن کے خطبات میں بھی جا بہ جا ملتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ کے کلام سے ایسے عناصر کو چھانٹ کر یکجا کیا جائے جن سے "اتحادِ عالم اسلامی" کے مطمحِ نظر کو تقویت پہنچتی ہے اور جس کے انعکاس کو وسط ایشیا کے بدلتے ہوئے تناظر سے پیدا شدہ رشتے میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے اہلِ علم و نقد کی بھی کمی نہیں جو اس صورتِ حال سے باخبر نہ ہوں اور اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ اس طرح کی سعی ایک طرف علامہ اقبال کے کلام میں تازہ جہت کی جستجو کا حوالہ بنے گی دوسری طرف اُن کے "اتحادِ عالم اسلامی" کے دیرینہ خواب کی تفہیم، تفسیر اور تائید کی صورت بھی پیدا ہو گی۔
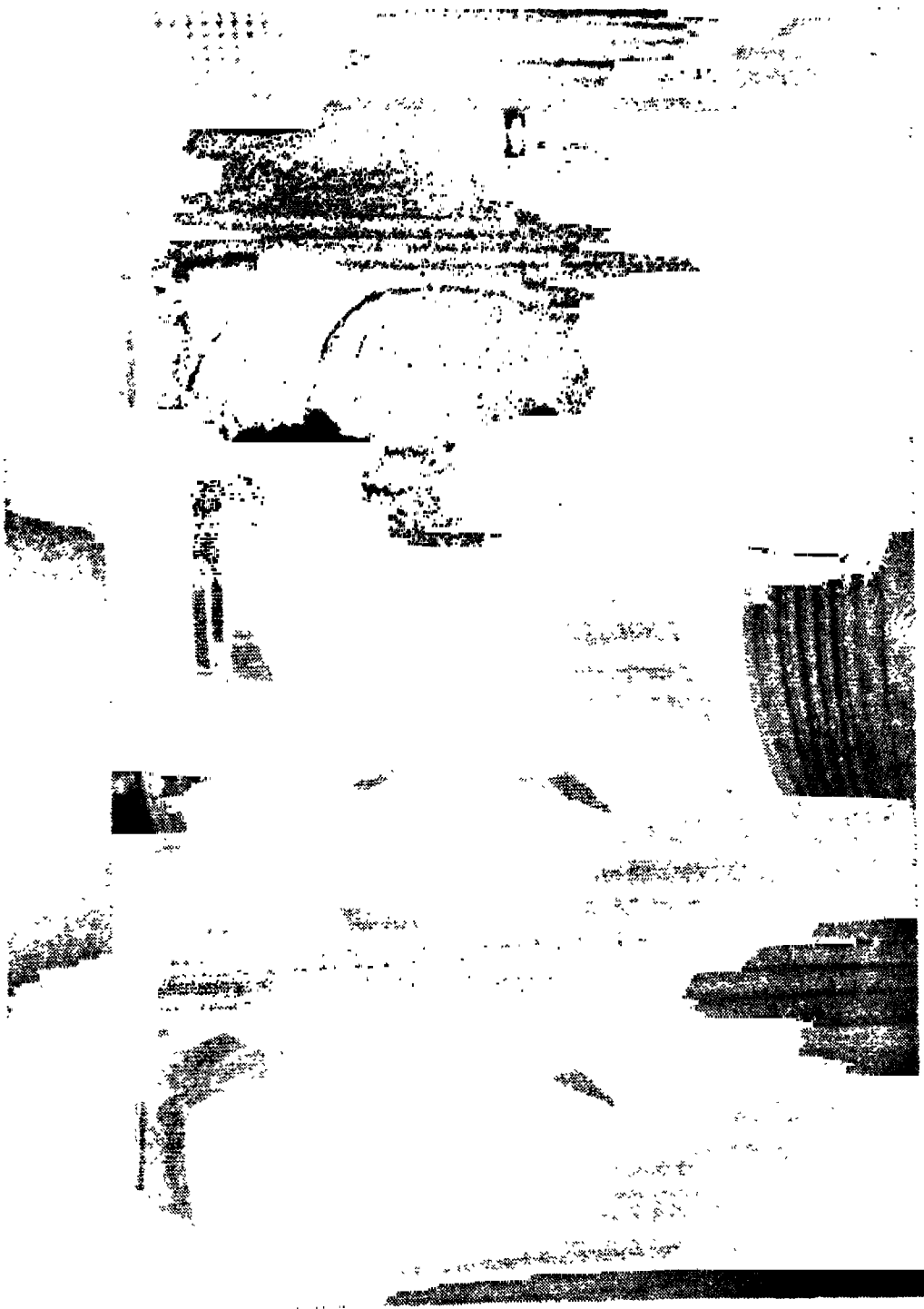
صدر انجمن ترقی اردو نواب نورالحسن جعفری سید ضمیر جعفری کو نشانِ سپاس پیش کر رہے ہیں اور صدر کے دائیں طرف معتمد اعزازی انجمن جناب جمیل الدین عالی کھڑے ہیں۔
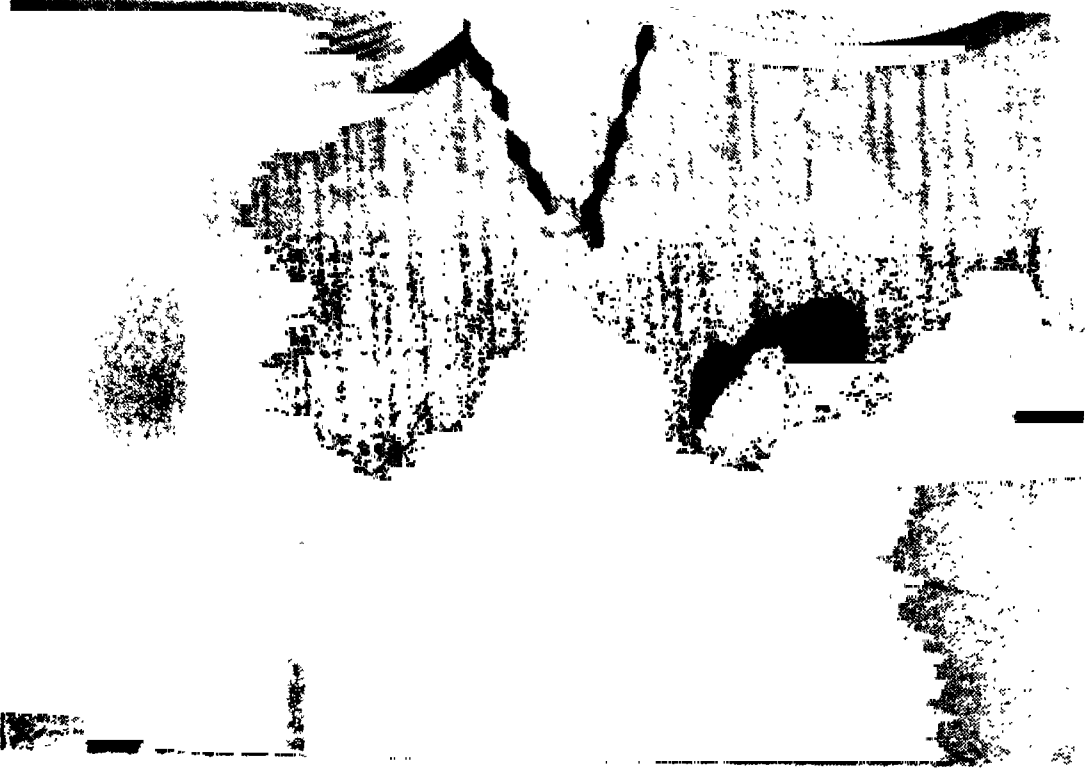
دائیں سے بائیں: جناب نورالحسن جعفری، سید منیر جعفری، ڈاکٹر اسلم فرخی۔ مائیک کے روبرو جناب جمیل الدین عالی کھڑے ہیں۔

قومی زبان (۶) اپریل ۱۹۹۳ء

روشنی کی رفتار سے رقم کی منتقلی
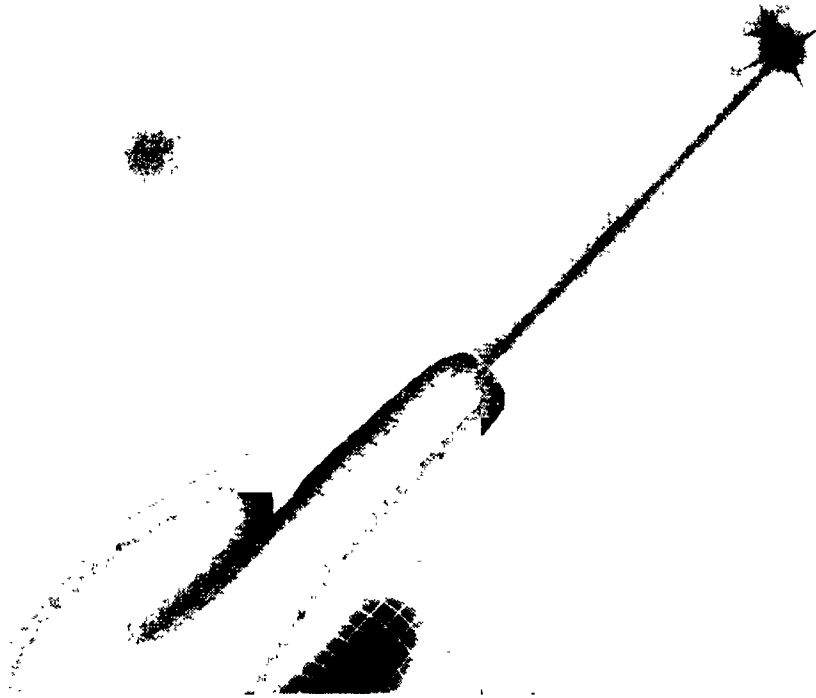
یو بی ایل کو اس کا موقع دیجئے !

بیرونِ ملک کام کرنے والے پاکستانی ملک کی ترقی میں ایک کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ فیکس یا ٹیلیکس کے ذریعہ ان کے گھر بھیجی جانے والی رقومات کا خرچ حکومت خود برداشت کرے گی۔
اتنا ہی یقینی تیز اور محفوظ جتنا کہ روشنی کا سفر! آپ سے اضافی معاوضہ لئے بغیر لمحوں میں رقومات کی منتقلی۔ یہ سہولت یو بی ایل کی تمام بیرونِ ملک شاخوں میں دستیاب ہے۔ بہترین خدمات کے لئے یو بی ایل تشریف لائیے۔

یو بی ایل یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
-ترقی ہمارا شعار

ORIENT

خالد اقبال یاسر

اقبال، جمال الدین افغانی اور اتحاد عالمِ اسلامی کی تحریک

عالم اسلام کی انیسویں صدی کی ممتاز ترین شخصیت محمد بن صفدر المعروف جمال الدین افغانی (۱۸۳۹/۱۸۳۸- مارچ ۱۸۹۷ء) عظیم مفکر، صاحبِ حکمت و دانش اور کشش انگیز رہنما تھے۔ ان کے نزدیک ملّت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا راز دو نکتوں میں پوشیدہ ہے۔ ایک نکتہ اغیار کی غلامی سے نجات ہے اور دوسرا اتحادِ عالم اسلامی۔ انھوں نے اپنی جادو اثر تقریروں، جاذب نظر شخصیت، حسنِ خلق، منطق اور زورِ بیان سے ان گنت لوگوں کو اپنا حامی بنایا۔ مشہور فرانسیسی مصنّف ارنسٹ رینان انھیں ابن سینا اور ابن رشد جیسی عظیم المرتبت مسلمان ہستیوں کے ہم پلّہ قرار دیتا ہے۔

"وہ نہ صرف مفکر و حکیم تھے بلکہ اہلِ نظر بھی تھے اور ان کی بصیرت نے اس عہد میں حالات کا مثلاً اسلامی ممالک کے زوال و انحطاط اور جمود و بے حسی، ان کی اقتصادی اور سیاسی زندگی پر یورپی ممالک کے روز افزوں تسلّط و اختیار اور مشرق میں دہریت کی نشو و نما جس کا منبع ڈارونیت تھی، صحیح اندازہ لگایا۔" (۱) اپنی کتاب "رد بر دھریہ" میں انھوں نے ڈارون کے نظریات کی تردید کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ "فقط مذہب ہی معاشرت کے استحکام و سلامتی اور قوموں کی قوت کی ضمانت دے سکتا ہے جب کہ لادینی مادیت انحطاط و زوال کا سبب ہے۔ ان کے نزدیک یہ دین اسلام اور اس کا عقیدۂ توحید ہی ہے جو اجتماعی لحاظ سے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور بہترین امّت' امّت مسلمہ ہے اور انفرادی اعتبار سے اس سے انسان میں تقویٰ، صداقت اور حسنِ اخلاق پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے بعض مملکتوں کی سیاسی سیادت و تفوق کے زوال کو مادیت (مثلاً یونان میں ابیقوریت (EPICUREANISM) اور فرانس میں والٹیئر اور روسو کے نظریات) سے منسوب کیا ہے۔" (۲) یہی نہیں بلکہ انھوں نے عہد حاضر میں اسلامی نظریات پر اٹھائے جانے والے اعتراضات سے مدلل اور مسکت جوابات بھی دیے ہیں۔ وہ اس امر کے شدت سے قائل تھے کہ اسلام اور سائنس میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دنیا کے ابتدائی نامور سائنسدان مسلمان ہی تھے۔ عقیدۂ جبر و قدر کے سلسلے میں بھی انھوں نے عقیدۂ قدر یعنی آزادیٔ عمل کا پرچار کیا۔ جمال الدین افغانی کی تحریکِ اتحادِ عالم اسلامی کو مغربی مفکرین منفی طور پر پان اسلام ازم کا نام دیتے ہیں جیسا کہ آج کل انھوں نے بنیاد پرستی کی اصطلاح اور اس کے معانی خود ہی وضع کر کے اسے قابل مذمت قرار دے رکھا ہے۔ ان کی اس تحریک کا مقصد اس وقت کی اسلامی ریاستوں کے درمیان اتحاد اور تنظیم قائم کر کے ایک لڑی میں پرونا تھا جس کے لیے انھوں نے بے شمار مصائب، آلام اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور طویل سفر کیے۔ اسی سلسلے میں وہ ایک سے زائد بار ہندوستان بھی آئے۔

جمال الدّین افغانی اپنی اس تشویش میں حق بجانب دکھائی دیتے ہیں کہ مغربی سامراجی قومیں اپنی محکوم قوموں کی تہذیب و ثقافت کی نشوو نما کو روکنے کے لیے اور ان کے جذبۂ حریّت کو دبانے کی خاطر ان قوموں پر حقیقی تعلیم کے دروازے بند رکھتی ہیں اور انھیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ان کے اندر کسی قسم کی کوئی اہلیت یا خوبی نہیں ہے۔ (رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور نظم "سفید آدمی کا بوجھ" اس کی بد ترین مثال ہے جس میں رنگ دار قوموں کو گالیاں تک دی گئی ہیں اور انسان تک تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔) اپنی زبان کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے در حقیقت وہ استبدادی اور سامراجی عزائم کی تکمیل کرنا چاہتی ہیں۔ جمال الدّین افغانی نے مشرقی اقوام کو اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی ثقافت کے حوالے سے اپنا قومی شعور پیدا کرنے کا پیغام دیا ان کے خیال میں اپنی گراں مایہ تاریخ کے بغیر دنیا میں کوئی قوم باعزت اور باوقار نہیں ہو سکتی۔

اسلامی دنیا میں انہی خیالات اور مقصد کے حصول کے لیے خلوص نیت کے سبب جمال الدّین افغانی کا نام آج بھی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ "مشرق جدید کی تاریخ میں پہلے مجاہد تھے جن کی بصیرت نے ایک اسلامی بلاک کی ضرورت محسوس کی اور اسے امن عالم کی ضروری شرط ٹھہرایا۔" (۳) علامہ اقبال کے مطابق "زمانۂ حال میں اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدّین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدّین افغان کا ذکر کرنا ہوگا۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہے، زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا۔" (۴)

اقبال کے اس نقطۂ نظر پر یہ اضافہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے ضمن میں جمال الدّین افغانی سے اگلا نام خود اقبال کا ہے اور اس کے بعد ترکی کے ضیا گوک الپ اور مصر کے سعد زاغلولو کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کے ایک سرسری مطالعہ ہی سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں رہتا کہ ان کا کلام اکثر و بیشتر جمال الدّین افغانی کے خیالات کا تخلیقی پرتو ہے اور انھوں نے جمال الدّین افغانی کی اس شکایت کو رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ ان کے خطبات بھی جمال الدّین افغانی ہی کے افکار کی توسیع ہیں تاہم انھوں نے "جاوید نامہ" میں بھی ان کا جا بجا ذکر کیا ہے اور انھیں مشرق اور دنیائے اسلام کا عظیم مفکر قرار دیا ہے۔

اقبال "پان اسلام ازم" کی اصطلاح کے پس پردہ مغربی استبداد کے پروردہ اور پرچارک مفکرین کے مذموم عزائم جانتے تھے سی لیے اقبال نے پان اسلام ازم کے بارے میں ایک بیان کے ذریعے یہ تشریح ضروری سمجھی۔ "..... پین اسلام ازم کا لفظ فرانسیسی صحافت کی ایجاد ہے اور یہ لفظ ایسی مفروضہ سازش کے لیے استعمال کیا گیا تھا جو اس کے وضع کرنے والوں کے خیال کے مطابق اسلامی ممالک غیر اسلامی اقوام خاص کر یورپ کے خلاف کر رہے تھے۔ بعد میں پروفیسر براؤن آنجہانی اور دیگر اشخاص نے پوری تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کہانی بالکل غلط تھی۔ پین اسلام ازم کا ہوا پیدا کرنے والوں کا منشا صرف یہ تھا کہ اس کی آڑ میں یورپ کی یرہ دستیاں جو اسلامی ممالک میں جاری تھیں وہ جائز قرار دی جائیں۔ ...... "پین اسلام ازم" سے اسلام کی عالمگیر سلطنت بہت متلف ہے۔ اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں مطلق العنان بادشاہوں اور رمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔" (۵)

اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے ہندوستانی سیاسی پس منظر میں ہندوؤں کی پھیلائی ہوئی گرد کو بھی صاف کرنے کے لیے پین ملام ازم کی وضاحت کی اور مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک علیحدہ معاشرتی جماعت، علیحدہ اقلیت اور علیحدہ قوم قرار دیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں سجاد حیدر یلدرم کی تحریک پر مولانا شبلی نے علامہ اقبال کا خیر مقدم کیا تو جواباً انھوں نے جو کلمات فرمائے ان سے پان اسلام ازم کے بارے میں اقبال کے مثبت خیالات کی ترجمانی ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہوتی ہے:

"میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پین اسلام ازم کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعہ قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا کرنے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ دولت و امارت کو وہ اس دارِ فانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدّین محبوب الہیؒ کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ میں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک اللہ کا کتبہ دیکھا اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے جو دولت اور حکومت کے زمانہ میں مسلمانوں میں تھی جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اس کے مستقبل سے نا امیدی نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پان اسلام ازم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا رہتا ہوں۔" (۶)

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ اقبال کے مندرجہ بالا بیانات میں بھی جمال الدّین افغانی کی روح بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اقبال کی نظموں "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام"، "حضور رسالت مآب ﷺ میں"، "شفاخانہ"، "حجاز"، "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "تعلیم اور اس کے نتائج"، "فاطمہ بنت عبداللہ"، "تہذیب حاضر"، "کفر و اسلام"، بلال"، "مسلمان اور جدید تعلیم"، "صدیق"، "مذہب"، "جنگ یرموک کا ایک واقعہ"، "دریوزہ"، "خلافت"، "خضر راہ"، "طلوع اسلام"، مشمولہ "بانگِ درا"، "مسجد قرطبہ"، "ہسپانیہ"، "طارق کی دعا"، "فرشتوں کی دعا"، "فلسفہ و مذہب"، مشمولہ "بال جبریل"، "لا الہ الا اللہ"، "مسلمان کا زوال"، "جہاد"، "قوت اور دین"، "اسلام"، "افرنگ زدہ"، "اے روح محمد"، "مکہ اور جنیوا"، "اقوام مشرق"، "مغربی تہذیب"، "آزادی فکر"، "عصر حاضر"، "سیاسیات افرنگ" وغیرہ مشمولہ "ضرب کلیم" جمال الدّین افغانی کے افکار کے ترویج و توسیع اور فروغ کا ہنگام سمجھی جا سکتی ہیں۔ در حقیقت اقبال نے اپنے کلام سے ان کی تحریک کو ایک ادبی تحریک بنا دیا ہے اقبال کا اپنا یہ کہنا ہے کہ "میرا مقصد کچھ شاعری نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ احساس ملیہ پیدا ہو جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا خاصّہ تھا۔" (۷) اور ایک اور مقام پر اقبال نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو..... میں آزاد تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔" (۸)

اسلام نے عالم انسانیت میں ایک انقلابِ عظیم بپا کر کے انسان کو رنگ و نسل و نام و نسب اور ملک و قوم کے ظاہری اور مصنوعی امتیازات کے محدود دائروں سے نکال کر ایک وسیع ترہیئت اجتماعیہ کی شکل دی۔ افغانی کی طرح اقبال کے نزدیک یہ ہیئتِ اجتماعیہ اسلامیہ قائم کرنا ہی اسلام کا نصب العین ہے۔ اسلام نے اخوت اور بھائی چارے کا یہ وسیع نظام قائم کرنے کا کارنامہ انجام دے کر دکھا دیا تھا مگر بد قسمتی سے یہ وحدت قائم نہ رہ سکی اور مسلمان مختلف فرقوں، گروہوں اور جماعتوں میں بٹتے چلے گئے۔ اقبال مسلمانوں کو پھر اسی اخوت اسلامی کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے ہیں اور ایک ملّت میں گم ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی عالمگیر ملّت کے قیام کے طلب گار ہیں جس کا خدا، رسول، کتاب، کعبہ، دین اور ایمان ایک ہو۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک (۹)

اسی جذبے کے تحت اقبال نے مسلمانوں کو اخوت کا پیغام دیا۔ اسلامی تعلیمات عالمگیریت سے مملو ہیں اور اسلام تمام نوع انسانی کو اخوت کی لڑی میں پرو کر ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کے قیام کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان کی ہوس کا علاج ہو سکے، لیکن اقبال کے نزدیک اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان ممالک ایک لڑی میں پروئے جائیں انھوں نے جمعیتِ اقوام پر اس طرح طنز کیا ہے۔

مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیت آدم؟ (۱۰)

بعد ازاں انھوں نے اپنے خطبات میں مسلمان قوم کی ایک علیٰحدہ تنظیم کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ جو انسانوں کے درمیان اخوت کا جذبہ پیدا کرے۔ رموز بیخودی میں انھوں نے اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر علیٰحدہ عنوان قائم کر کے اپنے مفکرانہ نکات بیان کیے ہیں اخوت اسود و احمر کی تمیز مٹا دیتی ہے جس سے بلال حبشیؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے ہمسر ٹھہرتے ہیں۔ یہی اخوت ملّت کے قیام کی بنیاد ہے اسی سے خیر و شر اور نیکی بدی کے معیار میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے ورنہ ہر شخص اپنے معیار خود طے کرے اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے۔ یہ مساوات اور اخوت اقبال کے اشعار کے مطابق رسالتِ محمدی کی دین ہیں۔ حریت مساوات اور اخوت کی تاسیس و تشکیل رسالت محمدی کا مقصد تھا۔ اسلام نے انسان کو انسان کی عبادت سے روکا۔ لاقیصر و لاکسریٰ کا اعلان اسلام نے کیا۔ کاہن، پادری، برہمن، سلطان، امیر سب مذہب کے، سیاست کے اور معاشرے کے اجارہ دار تھے اور عام لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ ان کی توہم پرستی اور کمزوری سے مفادات حاصل کرتے تھے لیکن رسولوں نے آکر حقداروں کو ان کا حق دلانے کا کام شروع کیا۔ حضور اکرم ﷺ کے نزول سے سیرت کی فضیلت قائم ہوئی۔ انھوں نے محنت کر کے روزی کمانے والے کو خدا کا حبیب گردانا۔ ان تعلیمات سے صرف اسلامی معاشرہ ہی نہیں پوری انسانیت فیضیاب ہوئی۔

تازہ جان اندر تن آدم دمید
بندہ را باز از خدا وندان خرید (۱)

اخوت و مساوات نے فرد کو ایک ملّت میں ضم کر کے اسے پوری ملّت کی قوت فراہم کی۔ اس نے فرد کے دل سے خوف اور یاس کو دور کیا اور ان کے اندر ایسی قوت اور اعتماد پیدا کیا کہ حوادث کے تیر ان پر بے اثر ہونے لگے۔ ملّت کا احساس دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوا۔ ایرانیوں کے خلاف جہاد کے دوران ایک معمولی سپاہی کی طرف سے انجانے میں ایرانی فوج کے سپہ سالار جابان کی جان بخشی کی اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کی طرف سے توثیق اس امر کی مظہر تھی کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ اگر امان کسی عام سپاہی نے بھی دی ہے تو وہ اسی ملّت کا ایک حصّہ ہے اور اس وعدے کی پاسداری سب بھائیوں کا فرض ہے۔ انھوں نے ملّت کی یک آہنگی کو اتنے بڑے جابر اور ظالم قاتل کے قتل کے مقابلے میں زیادہ اہم قرار دیا۔ اسی طرح سلطان مراد کی ایک معمار کے ہاتھ کاٹنے پر عدالت میں پیشی اور قصاص کی سزا کے فیصلے

پر سرِ تسلیم خم کرنا بھی اخوت اور مساوات کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اخوت، حرّیت اور مساوات ایک دوسرے سے باہم متصل اور پیوست تصوّرات ہیں۔ ایک کے بغیر دوسری اصطلاح، کیفیت، روایت یا اصول بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اقبال نے حرّیت کو اسلامی معاشرے کی اہم ترین قدر کے طور پر پیش کیا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں حریت کی ایسی روشن مثالیں قائم ہوئیں کہ ہم آج بھی ان سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس دور میں عام سے عام آدمی مسجد میں، عدالت میں اور بر سر عام امیر المومنین سے ان کے کسی فعل پر باز پرس کر سکتا تھا اور کسی دنیاوی جاہ و جلال اور سلطنت سے مرعوب نہیں ہوتا تھا بشرطیکہ وہ دل اور ذہن سے خود کو حق پر سمجھتا ہو۔ دوسری طرف خلیفۂ وقت خوشدلی سے باز پرس کا جواب دیا کرتا تھا۔ مساوات اور حرّیت کی ایسی مثالیں اور نمونے دنیا کا کوئی اور معاشرہ اور ریاست آج تک پیش نہیں کر سکی۔ سیرت کی فضیلت کے اصول اور بنیادی اسلامی قدر پر کاری ضرب اس فیصلے سے لگی جب امیر معاویہ نے اپنے فرزند یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا جس کے کردار سے ملت کے افراد اور اکابرین مطمئن نہیں تھے اور اسے عاقل، عادل اور متقی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی واقعے نے امت مسلمہ کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اس سے نظامِ حریت کی شکست و ریخت کا آغاز ہوا اور خلافت، سلطنت اور خلیفہ، بادشاہ میں بدل گیا۔ ایسے میں حضرت حسینؓ نے حریت کا علم بلند کیا اور مطلق العنان سلطانی جو آئندہ چل کر استبداد کا سرچشمہ اور پھر سے قیصریت کی طرح بننے والی تھی کے خلاف تلوار اٹھائی اور حریت عوام الناس کے حق خود ارادیت کے تحفظ اور روحانی جمہوریت کے قیام کے لیے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانوں کی قربانی دی۔ اقبال نے مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ حریت کے اس فلسفے کو اپنی مشہور علامت شاہین کی خصوصیات کے ذریعے بھی واضح کیا ہے کیوں کہ شاہین ہمیشہ آزاد فضاؤں میں محوِ پرواز ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت عزیز احمد نے اس طرح سے کی ہے۔ "اس وسعت پرواز کے باعث، حیات کی ایک اور بڑی قدر شاہین میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہ آزادی ہے۔ شاہین کی وسعتِ پرواز یا اس کی نشو و نما محض آزادی کے حالات میں ممکن ہے ورنہ غلامی میں شاہین تدروے سے بھی زیادہ بزدل بن جائے گا۔:

تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادۂ اندر قفس بادانہ می سازد

غلامی شاہین کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

چنانچہ اقبال کا شاہین کافوری میر و سلطان کا پالا ہوا باز ہرگز نہیں ہو سکتا جو اپنی رفعتِ پرواز چھوڑ کر پھر سے اپنے مالک کے پاس آب و دانہ کے لیے آ بیٹھتا ہے جو محض میر اور سلطان کے اشارے پر طیور کا شکار کرتا ہے۔" (۱۲) اور اس کے جور و استبداد میں شریک اور آلہ کار بن جاتا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی (۱۳)

دنیائے اسلام اس وقت جمال الدین افغانی اور اقبال کے نزدیک وطنیت اور قومیت کے مغربی نظریات سے متاثر ہے اس کی وجہ اور نتیجہ ان کی مغرب کے ہاتھوں صدیوں کی غلامی اور محکومی ہے۔

حواشی

۱۔ (ڈاکٹر سید محمد عبداللہ) اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد نمبر ۷، دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۳ء ص ۳۷۲
۲۔ ایضاً ص ۳۷۴۔۳۷۵
۳۔ ایضاً ص ۳۸۰
۴۔ علامہ محمد اقبال: اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ شیخ محمد اشرف، لاہور "س" ن ص ۲۳۱۔ ۲۳۲
۵۔ علامہ محمد اقبال: گفتارِ اقبال۔ مرتبہ محمد رفیق افضل ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور ۱۹۸۶ء ص ۱۷۷۔ ۱۷۸
۶۔ علامہ محمد اقبال مقالات اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۱۸۴۔ ۱۸۵
۷۔ علامہ محمد اقبال مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۳۶
۸۔ علامہ محمد اقبال: "شذراتِ فکر اقبال" مترجم (ڈاکٹر) افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۳ء ص ۸۵
۹۔ علامہ محمد اقبال: "بانگِ درا" مشمولہ "کلیات اقبال" اردو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۲۰۲
۱۰۔ علامہ محمد اقبال: "ضربِ کلیم" مشمولہ "کلیات اقبال" اردو مذکور ص ۵۸
۱۱۔ علامہ محمد اقبال: مشمولہ "کلیات اقبال" فارسی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۰۴
۱۲۔ عزیز احمد: اقبال نئی تشکیل گلوب پبلشرز، لاہور ۱۹۶۸ء ص ۳۶۲۔ ۳۶۳
۱۳۔ علامہ محمد اقبال "بال جبریل" مشمولہ "کلیات اقبال" اردو مذکور ص ۱۷

شفیق عجمی

اقبال کا تصوّر بقائے دوام
(ڈاکٹر نعیم احمد کے تحقیقی مقالہ پر ایک نظر)

ڈاکٹر نعیم احمد نے "اقبال کا تصوّر بقائے دوام" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ پنجاب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان نے اس تحقیقی مقالے کو شائع کیا ہے جو یقیناً اقبالیاتی ادب میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر نعیم احمد، شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک غیر ملکی یونیورسٹی میں بھی فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر چکے ہیں۔

اردو زبان میں فلسفہ پر لکھی گئی یا ترجمہ ہونے والی کتابوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ بعض طلبہ فلسفے کو ایک مشکل اور دقیق مضمون سمجھتے ہوئے اسے چھونے سے گریز کرتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک فلسفہ جدید زمانے میں اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے یا ازکار رفتہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اردو میں فلسفیانہ مباحث پر بہت کم مواد دستیاب ہے لہٰذا اس کو مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنا کار مشکل ہے۔ آخرالذکر ضرورت کو پورا کرنے اور فلسفے کو طالب علموں میں بہتر انداز میں متعارف کرانے کے لیے ڈاکٹر نعیم اردو میں:

۱۔ تاریخ فلسفہ یونان

۲۔ تاریخ فلسفہ جدید

۳۔ برگساں کا فلسفہ

مرتّب کر چکے ہیں۔

علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر ان کے مقالات متعدد جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا زیر بحث مقالہ بھی پہلے پہل ایک مضمون کی صورت میں شائع ہوا جسے علمی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔ (۱)

ڈاکٹر وحید عشرت مقالے کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال کے نظام فکر میں حیات بعدالممات اور تصوّر بقائے دوام کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک مابعدالطبیعاتی تصوّر ہی نہیں بلکہ فکر اقبال میں یہ ایک عمرانی اور سماجی غایت کی تشکیل بھی کرتا ہے، کیوں کہ تصور حیات بعدالممات اور تصوّر بقائے دوام ہمارے عمرانی، تہذیبی اور تمدنی روّیوں کی تشکیل میں بنیادی کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔" (۲)

ڈاکٹر نعیم نے فکر اقبال کے حوالے سے جس موضوع کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا بلاشبہ اس پر تحقیق کی ضرورت

محسوس کی جارہی تھی کیوں کہ اس موضوع پر اردو اور انگریزی میں کچھ چھوٹے بڑے مضامین شائع ہوئے تھے یا بعض مقالات میں ضمنی مباحث کے طور پر شامل تھے۔

اس سلسلے میں ایک مثال سلیم احمد مرحوم کی ہے جنھوں نے اقبال کی فکر کا مرکزی مسئلہ "موت" کو قرار دیا ہے۔ "اقبال کا مرکزی مسئلہ نہ خودی ہے، نہ عشق، نہ عمل، نہ قوت و حرکت بلکہ ان سب کے برعکس موت ہے.... یہ وہ مسئلہ ہے جو ان کے وجود کو اس زلزلے سے دوچار کرتا ہے جس سے ان کا پورا وجود متحرک ہو جاتا ہے۔ یہی ان کے شعری تجربے کی بنیاد ہے جس سے اقبال کی مخصوص کائنات شعری پیدا ہوتی ہے۔" (۳)

اقبالیات کا ایک عام سطح کا طالب علم بھی سلیم احمد کے نتائج سے اتفاق نہیں کر سکتا اس لیے کہ علامہ کی فکر اور ان کی شاعری کا سب سے اہم موضوع زندگی ہے جو اقبال کے نزدیک حرکت و عمل سے عبارت ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

ایک ایسا مفکر اور مصلح موت کے تصوّر سے کیوں کر لرزاں و ترساں ہو سکتا ہے جس کے نزدیک موت تجدید مذاق زندگی ہے۔

ڈاکٹر نعیم احمد کے تحقیقی مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مختلف اقوام اور مذاہب میں پائے جانے والے تصوّراتِ حیات بعد الموت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں جدید فلاسفۂ مغرب کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ایک پورا باب مسلم مفکرین کے خیالات کا احاطہ کرتا ہے جو انھوں نے زیر بحث موضوع پر پیش کیے ہیں خاص طور پر مولانا روم کے تصوّر ارتقا کی روشنی میں ان کا فلسفۂ حیات بیان کیا گیا ہے۔

آخری باب میں اقبال کے تصوّر بقائے دوام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اقبال نے سر اکبر حیدری کے نام اپنے خط میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اس کے عقیدہ بقائے دوام کی اساس مذہبی ہے لیکن وہ اسی پر قناعت نہیں کرتا اسے اس عقیدے کے پیدا کردہ فکری اشکالات اور منطقی تضادات سے بخوبی آگاہی ہے اسی لیے اس نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں اس مسئلہ کو خالصتاً فلسفیانہ انداز میں موضوع بحث بنایا ہے اس کا خیال ہے کہ مغربی معتقدات نے مسلمانوں کے سامنے فکر و تحقیق کی کئی راہیں کھول دی ہیں۔" (۴)

حیات بعد الممات اور تصوّر بقائے دوام ایک مابعد الطبیعیاتی مسئلہ ہے جس کا ایقان مذہب سے حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مباحث کو جذباتی یا عقائد کی فضا سے معمور ہونے نہیں دیا اور تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے اسے فلسفیانہ تفکر اور استدلال سے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک پیچیدہ مابعد الطبیعیاتی موضوع کمال خوبی سے ایک نتیجہ خیز اختتام تک پہنچایا ہے۔ جو تحقیق کی ایک خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ایک بات جو ہمیں اقبال کے تصور بقائے دوام اور اکثر مذاہب عالم میں مشترک نظر آتی ہے یہ ہے کہ بقائے دوام کو اعمال کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے قدیم مصری مذہب ہو یا ہندومت، زرتشتی مذہب ہو یا یہودیت، عیسائیت ہو یا اسلام، سب مذاہب میں روحانی نجات اور بقائے دوام کو اعمال پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔" (۵)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

حواشی

۱۔ اقبال کے تصوّر ابدیت کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو:
NAEEM AHMED IQBAL S CONCEPT OF ETERNITY IQBAL REVIEW LAHORE APRIL ۱۹۷۷ء
۲۔ اقبال کا تصوّر بقائے دوام، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۹ء
۳۔ اقبال ایک شاعر
۴۔ اقبال کا تصوّر بقائے دوام ص ۳۳۸
۵۔ ایضاً

چاولوں کی د
انتخاب !
BASMATI
ICE

قومی زبان (۱۷) اپریل ۱۹۹۳ء

سیّد ضمیر جعفری

ادبی سپریم کورٹ کے سامنے

آپ نے اس تقریب میں شرکت کو ضروری سمجھا اور اس قدر زحمت گوارا فرمائی میں اس کریمانہ پذیرائی کے لیے آپ کا بے حد ممنون ہوں اور آپ کی خدمت میں اپنا دلی ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔ میں نہ اتنے بے کراں ظرف کا دعوی کر سکتا ہوں اور نہ اس قدر بھونڈی منافقت کا متحمل ہو سکتا ہوں کہ اپنے اس اعزاز پر اپنی خوشی کو "پی" جاؤں کہ آخر میں بھی تو اسی قوم کا ایک فرد ہوں جو تنقید سے کچھ سیکھنے کے بجائے تعریف سے تباہ ہونے کو پسند کرتی ہے۔

میں اب اس عمر کو پہنچ گیا ہوں جب لوگ بوڑھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی میں قسمت کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ میں اپنی خوش قسمتی پر خدائے رحیم و کریم کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہوگا کہ مجھے اس طرح کی شاموں، صبحوں اور دوپہروں کی۔ "شاباشیاں" اور ہلاشیریاں میری توقع بلکہ میرے استحقاق سے بھی زیادہ ملتی رہی ہیں۔ لیکن مجھے اپنی پذیرائی کی تقریب پر سب سے زیادہ خوشی جس کی لہر میرے جسم کے روئیں روئیں میں ستار کے تاروں کی طرح بولنے لگی .... اور میں مسرت کی سرشاری سے گویا نڈھال ہوگیا .... صرف تین موقعوں پر محسوس ہوئی .....اول اُس دن جب میرے گاؤں کے مڈل اسکول کے طلبہ ..... جس کے پھٹے پُرانے ٹاٹوں پر بیٹھ کر میں نے .... "گاچنی مٹی" سے پوچی ہوئی تختی پر اپنی زندگی کا پہلا "الف" لکھا تھا...... میرے استقبال کے لیے ڈھول کی سنگت پر دھمال ناچتے ہوئے ..... کھیتوں میں نکل آئے اور پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کی سرپرستی میں ان بچوں نے .... مٹی کی چاٹیوں میں اڑکی "ہوئی گھر کی بھینسوں کی تازہ مکھن سے مالامال لسی کے ساتھ تازہ ہی مکھن میں گندھے گتھے شرابور اُسی طرح کے سہ منزلہ پراٹھے کھلائے جیسے تقریباً ستر برس قبل میری "ب جی" .... مجھے مدرسہ کو روانہ کرتے وقت رومال میں باندھ کر .... آدھی چھٹی میں کھانے کے لیے دیا کرتی تھی .... پھر گزشتہ برس نومبر ۱۹۹۲ء میں ... وہ موقع میری عظیم مادر علمی .... اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ جوبلی کے جشن پر جب ایک اجلاس کا اعزاز اس عاجز کو بخشا گیا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ میں قدیم و جلیل "حبیبیہ ہال" کے تاریخی اسٹیج پر سے اپنا خطبہ صدارت کیوں کر بخیر و عافیت پڑھ گیا کہ اس کے تو پہلے زینے پر قدم رکھتے ہی میرے سر میں زمین و آسمان مل کر گھومنے لگتے تھے اور

خواتین و حضرات:

اُس دن کے بعد یہ آج کی شام کہ میرے دل میں ندامت اور ممنونیت کا ہیجان کبھی اس طرح اُمنڈ کر نہیں آیا۔ ندامت اپنی بے بضاعتی پر ممنونیت آپ کی ضمیر نوازی پر۔ دل و جاں میں جذبات کے اس غیر معمولی ریلے میلے کی وجہ اس تقریب کا "انجمن

قومی زبان (۱۸) اپریل ۱۹۹۳ء

ترقی اردو" کے نام سے انتساب ہے۔ بے شک وطنِ عزیز میں بحمد اللہ بہت سے ادارے ..... اپنی اپنی توفیق و صوابدید کے مطابق ..... قومی ادب و تہذیب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ میں ان سب کا احترام کرتا ہوں۔ مگر میں پیار صرف "انجمن ترقی اردو" ہی سے کرتا ہوں کہ اس کے نام میں "بابائے اردو" مولوی عبدالحق کے نام کی خوشبو اور ہماری تاریخ آزادی کا میٹھا لمس شامل ہے ..... یہ نام پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصّہ ہے ..... سچ کہتا ہوں کہ میں نے اپنے لیے ..... اپنے دل میں کبھی عزت کا کوئی شائبہ محسوس نہیں کیا۔ مگر آج اپنا ہونا مجھے کچھ سوارت معلوم ہورہا ہے...... میں تو صرف حوصلہ افزائی کی خواہش کر سکتا تھا۔ آپ نے تو پذیرائی کی بارش کر دی!

کراچی ..... ہمارے ملک کے عوام ہی کا سمندر نہیں ..... خواصین و غواصین کا بھی سب سے بڑا مرکز اور زبان و ادب کے باون گزوں کا "عظیم آباد" ہے۔ سو، ..... چند ساعتوں کے لیے ..... ادبی حوالے سے ..... اپنے ذاتی ریکارڈ کو درست کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ..... اس وقت میں اپنے ملک کے ..... "ادبی سپریم کورٹ" کے کٹہرے میں بھی تو کھڑا ہوں۔ اگرچہ ڈر بھی رہا ہوں "ریکارڈ" درست کرتے کرتے اپنی عاقبت ہی نہ خراب کر بیٹھوں کیوں کہ شہرت دوسروں کی رائے سے بنتی ہے اور حقیقت اپنی گواہی سے آشکار ہوتی ہے۔ البتہ حاضرین گرامی سے درگزر کا خواستگار ہوں کہ میرے بیان میں ترتیب و تسلسل کی توقع نہ رکھی جائے۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے کچھ لگتا ہوں اور لکھ کچھ جاتا ہوں اور اپنی شاعری کے بارے میں اب تک ایک ہی قطعی رائے میرے ہاتھ آسکی ہے وہ یہ کہ میری شاعری بحران سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ میری شاعری سے بحران پیدا ہوا ہے شائد میرا مقصود صرف چلنا ہے، کہیں پہنچنا نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ شاعر کو سمجھنے کے لیے بُرے کے گھر تک جانا چاہیے لیکن اس کے ماحول کو چھان پھٹک کر دیکھنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں اپنی کچھ عجیب حالت ہے کہ اپنے پاس نہ دکھانے کے لیے کچھ ہے نہ چھپانے کے لیے کچھ ہے۔ خاندان پر اتنا عروج کبھی آیا ہی نہیں کہ زوال بھی آسکتا دو چار صوبیداروں کے سوا کوئی بزرگ کبھی کسی اونچے منصب تک نہ پہنچ پایا۔ صوبیدار بھی مغلوں کے ہفت ہزاری نہیں انگریزوں کے ..... کاشت کاری صوبیدار ..... بادشاہوں کے خلاف ہمارے بزرگ بغاوت تو نہ کر سکے مگر اُن کو مکروہ ضرور سمجھتے رہے چنانچہ رہائش کے لیے ہمیشہ چُن چُن کر ایسے دشوار گزار مقامات منتخب فرماتے کہ بادشاہ تو کجا پٹواری بھی وہاں تک بمشکل پہنچ سکے۔ سکندر اعظم بھی آیا تو اوپر سے "وار مار کر" نکل گیا۔ سلطان محمد شہاب الدّین غوری نے ادھر سے گزرنے کی جسارت کی تو ہمارے گاؤں کے قریب ہی قتل ہو کر رہا۔ دراصل ہمارے جغرافیے نے تاریخ کو ادھر سے گزرنے تو شاید دیا مگر بیٹھنے ہرگز نہیں دیا۔

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

علمی و ادبی تناظر میں ..... امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد ..... مجھے تو اپنی کوئی پشت دکھائی نہیں دیتی جو میری پشت پناہی کر سکتی ہمارے دادا جان اپنے زمانے میں علاقہ پٹھوہار کے واحد مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جس کا سنگ بنیاد قلعہ روہتاس میں رنجیت سنگھ نے رکھا اور انگریزوں نے اکھاڑا۔ میری معلومات کے مطابق دادا جان ہی ہمارے شجرہ نسب کے پہلے بزرگوار ہیں جن کی زندگی میں قرآن کریم کے علاوہ کوئی دوسری کتاب گھر میں داخل ہو سکی۔ ہمارے ہاں کتاب سے بے نیازی (بلکہ وحشت) کی روایت کچھ اس قدر مضبوط رہی ہے کہ ہمارے پر نانا سلطان العارفین پیر سیّد محمد شاہ اگرچہ پنجابی کے مقبول ترین صوفی شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برسوں سے اُن کے عارفانہ ابیات نسلاً بعد نسلاً لوگوں کے سینوں میں سے ہوتے ہوئے پوٹھوار اور آزاد کشمیر کے پہاڑوں

قومی زبان (۱۹) اپریل ۱۹۹۳ء

ادیوں میں گونج رہے ہیں مگر حضرت اپنے پیچھے لکھا ہوا ایک لفظ بھی چھوڑ کر نہیں گئے مبادا ان کی بوریا نشین اولاد اُسی کو
ھنے بچھانے لگ جاتی۔

وہ تو اللہ بھلا کرے پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل کا کہ جب وہ مرکزی حکومت میں تعلیمات کے معتمد اعلیٰ تھے تو اُن کے ایماد
سپی سے حضرت کے کارنامۂ ابیات کا ایک مجموعہ ..... "من کے تار" کے عنوان سے میں نے مرتب کیا اور "لوک ورثے" کے
ارے کے اہتمام سے شائع ہوا۔

ہماری اپنی ذاتی زندگی میں دین داری اور آوارگی کے ڈانڈے آپس میں اس طرح گڈمڈ رہے جس طرح جہاد افغانستان کے
مد ہماری "ڈیورنڈ لائن" افغانستان میں گڈمڈ ہو گئی ہے ایک پاؤں مجلس وعظ و ارشاد میں دوسرا کسی مجرے میلے میں..... ایک
اتھ میں عالم لوہار کا اکتارہ اور چمٹا دوسرے میں کسی مولوی صاحب کی جوتی یا لوٹا..... جانور اور پرندے پالنے کا شوق جنون کی حد
تک تھا:

بلّی بھی ہم نشیں تھی چوہا بھی ہم سفر تھا

والد صاحب قبلہ و کعبہ حد درجہ کے متدین عابد شب زندہ دار بزرگ جن کو ہم نے کبھی کھل کر ہنستے نہ دیکھا۔ میں کتوں سے جتنی
محبت تھی اُن کو اُتنی ہی کراہت؛ چنانچہ ایک مدت تک ہم اپنا راشن، کتوں کے راطب کے دوش بدوش حویلی سے باہر مویشی خانے
میں کھاتے رہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بُری عادتیں آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔ مگر:

اس سے بڑھ کر زندگی ایک اور نعمت دے مجھے
جسم فاسق اور روح پارسا رکھتا ہوں میں

رہی ہماری شاعری وغیرہ کی بات تو سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو صحیح و سالم شعرا و ادبا کی مجلس میں اپنے آپ کو ایک
"گھس بیٹھک" ہی سمجھتا ہوں۔ مگر یہ بات سمجھ اُس وقت آئی جب میں کافی مشہور ہو چکا تھا یعنی کھیت چڑیاں چگ چکی تھی۔
واقعہ یہ ہے بجز گھاس پھوس..... چیل کے گھونسلے میں ماس کی ایک بوٹی تک نہیں ہے۔ فن و فکر کی ناز برداری اپنی آرزو تو کجا
..... اپنی تاب کے مطابق بھی ہم سے نہیں ہو سکی۔ نہ شاعری راضی نہ بیوی خوش۔ قوموں کی آزادی کی طرح میں نے اپنی
تخلیقی صلاحیت کو بھی ہمیشہ ناکافی محسوس کیا ہے۔ کوئی مجھ سے اگر پوچھے کہ تمھاری بہترین نظم کون سی ہے تو میں کہوں گا وہ
ابھی تک مجھ سے لکھی نہیں گئی اور شاید کبھی نہ لکھی جا سکے۔ صاحبو! میں اپنے کسی شعر سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ شعر
تو ابھی کٹھالی میں ہوتا ہے مگر میں تھک جاتا ہوں جس طرح ہمارے ٹائیگر..... جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے ڈھاکہ میں گھبرا
کر قبل از وقت ہتھیار ڈال دیے تھے میرا ایک شعر میری اسی درماندگی کی عکاسی کرتا ہے:

جھنڈ پیڑوں اور چشموں کے کچھ آگے ہی رہے
اس سفر میں خیمہ کرنے کا مقام آتا نہیں

بہرحال کئی سرابوں اور خوابوں کی انگلی پکڑے پکڑے چلا جا رہا ہوں۔ کچھ ڈھارس اس خیال سے بندھتی ہے کہ جو آدمی غلطی نہیں
کرتا، وہ کچھ بھی نہیں کرتا اور یہ بھی کہ آخر کتنے لوگ ہیں جو اپنی پوری زندگی حرف بہ حرف..... اپنی خواہشوں اور آدرشوں کے
مطابق گزار سکتے ہیں..... ایک مرتبہ ہم فوج میں اپنے "ہانڈی وال"..... صوبیدار میجر لالہ سمندر خان کے ساتھ..... "ادبی چاند
ماری" کر رہے تھے کہ انھوں نے ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے ارشاد فرمایا..... "پارٹنر فکر مت کیا کر..... اتنے لوگ آج تک

قومی زبان (۲۰) اپریل ۱۹۹۳ء

جنگ میں نہیں مارے گئے "جتنے ٹریفک" کے حادثات میں ہلاک یا اولاد کی خواہش اور بچوں کو پالتے پالتے خود پر لوک میں اُتر گئے" اس وقت تو صوبیدار میجر صاحب کا یہ جملہ اُس زمانے کی "کلاشنکوف، تھری ناٹ تھری" کی گولی کی طرح ہمارے دل میں ترازو ہو گیا لیکن بعد میں اکثر خیال آتا ہے کہ میں دراصل اسی ہجوم میں شامل ہوں جس کی نشان دہی لالہ سمندر خان نے کی تھی۔

جہاں تک آرٹ اور نظریۂ حیات وغیرہ کا تعلق ہے تو صاحبو! ہم نے آرٹ کو تو خیر گھاس ہی نہیں ڈالی البتہ شاعری میں زندگی کے ہر منظر کو سر آنکھوں پر بٹھانے اور آشوب حیات کی ہر آواز پر لبیک کہنے کی کوشش کی ہے:

چند لفظوں میں کہوں شاعری کی لہر بہر
یہ مری باہر کی آنکھ یہ مرے اندر کا شہر

ہاں ایک بات میں کسی معذرت کے بغیر کہنا چاہوں گا کہ میری پہلی "کومٹ منٹ" (COMITMENT) اپنے وطن سے ہے۔ اپنی مٹی سے ہے۔

"آرٹ" کو ہم "گھاس" اس لیے نہ ڈال سکے کہ آرٹ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آیا وکیلوں نے اتنی توجیہیں قانون کی کیا کی ہوں گی جتنی پرتیں ادب و فن کی نقادوں نے کر رکھی ہیں۔ ایک نقاد نے آرٹ کو ایسی سرسبز ترائی سے تشبیہ دی تھی جہاں پہاڑ اور وقت ہم آغوش ہو جائیں۔ کسی نے آرٹ کو "ہکیا اور کیوں کی اکائی" قرار دیا۔ ہم نے ان اکائیوں دہائیوں سے گھبرا کر:

دیر و حرم کو چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

اور اپنے خیال ہی کو خیاباں بنا لیا۔ ذاتی طور پر میں تخلیقی عمل کو ایک قسم کی "نجی جمہوریت" سمجھتا ہوں جس میں نہ کوئی آقا ہوتا ہے نہ غلام ..... جی افلاطون کے ساتھ اُڑنے کو بھی چاہا ہے اور کراچی کی بندر روڈ، لیاری وغیرہ کی بسوں میں دھکے کھانے کو بھی ..... تجربات کی ضرورت کا میں قائل ہوں۔ صرف مردہ یا احمق شخص ہی تبدیل نہیں ہوتا۔ روایت کی حرمت کا بھی قائل ہوں بشرطیکہ وہ مرے ہوئے خوبصورت گھوڑے کی طرح نہ ہو۔ جی اس طرح بھی شعر کہنے کو چاہتا ہے جیسے کوئی گوری ندی میں نہائے اور پانی کو آواز نہ آئے۔ یا جس طرح تپتی ہوئی دوپہروں میں کوئی تنہا فاختہ ہمارے گاؤں کے گھر کے صحن میں کھڑے بوڑھے کیکر پر کوکا کرتی تھی۔ اپنے کیکر اور اپنی فاختہ پر نگاہ اس لیے جا پڑی کہ اب بھی اگرچہ میں رہتا شہر میں ہوں مگر جیتا گاؤں میں ہوں اور ویسے بھی:

گاؤں ویراں ہو گئے تو شہر بس جائیں گے کیا

تو صاحبو! میں آرٹ کو شناخت سے زیادہ دریافت کا عمل سمجھتا ہوں میرے نزدیک "آرٹ" مشین کا نہیں کھڈی کا کپڑا ہے زندگی اور انسان کے معاشی اور سماجی رشتے کے بارے میں اپنی خواہش اور کوشش یہ رہی ہے کہ جس چیز کو چھتے کے لیے مناسب نہ سمجھوں اُس کو مکھیوں کے لیے بھی روا نہ رکھوں۔ چند اشعار اپنے رجحانات و تعصبات اور اپنی نارسائی کی نشاندہی کی سبیل سے پیش خدمت ہیں:

تعمیر ..... ایک گیت ہے آواز کے بغیر
تصویر ..... ایک نظم ہے الفاظ کے بغیر

لوگ یہ کہتے ہیں لٹریچر انسانوں کی قسمت ہے

مجھ کو تو لگتا ہے یہ قسمت کے خلاف بغاوت ہے

ہم کیا اور بازار بقا میں ان بیتوں کی قیمت کیا
مٹی سے کچھ لفظ لکھے وہ بھی دریا کے پانی پر

میں بھی تو اک قاتل ہوں کہ جنگ میں انگریزوں کے لیے
میں نے بھی بندوق اٹھائی جرمن اور جاپانی پر

امتزاج لفظ و معنی اک محیط بے کراں
اس بھرے دریا میں اک کچا گھڑا رکھتا ہوں میں

خندہ اک پردہ ہے ورنہ شاعری
جُز نوائے حسرت، آموزی نہیں

شاعری چناروں سے چاندنی بناتی ہے
روز دیکھے چہروں کو اجنبی بناتی ہے

عمر جولاں گہِ فن میں گزری، مگر
نا تراشیدہ و ناشنیدہ ہوں میں

اچھا شعر احساس ہے، جیسا شاعر، شعر بھی ویسا ہو
اچھا شعر اخلاق نہیں کہ دوسرے لوگوں جیسا ہو

مجھ کو ہیں مرغوب الغرض خامیاں اشعار کی
میرے شعروں میں نہ ڈھونڈو پختگی لوہار کی

شاعری الفاظ جامد کی غلامی تو نہیں
دل پہ دستک ہو تو تاثیر دعا بھی آئے گی

قومی زبان (۲۲) اپریل ۱۹۹۳ء

ردیف و قافیہ جزوِ روایت ہی سہی لیکن
اگر معنی نہ ہو تو شاعری کی نعل بندی ہے

آپ اپنے کلچر کو جس طرف سے دیکھیں گے
کچھ قصورِ جدّی ہے، کچھ فتور ذاتی ہے

شہر ہے اک اخبار کی بولی اپنے لہو کے لہجے میں
لفظوں میں تصویریں اپنے خوابوں اور خیالوں کی

بے شک اُن کے پاس ہوں بھاری پُستک استدلالوں کے
لکھنا ہے تو رائے نہ پوچھنا دوسرے لکھنے والوں کی

محض لُغت کی بات نہیں
حرف "گراف گری" تو نہیں
شعر ہے ایک لطافت بھی
"ڈکشن" ... "ڈکشنری" تو نہیں

رونقِ بزمِ جہاں ہے شاعری
جو بھی فن ہے اُس کی ماں ہے شاعری

دیدہ و دل کو سامنے کا منظر ہی بہت الجھاتا ہے
مستقبل کی کیا سوچوں وہ تو جلدی آجاتا ہے

کوئی سمت ہو، پیار کے رستے جائیں گے
کعبہ کو بھی یار کے رستے جائیں گے

آخر دم تک دل کو زندہ رکھنا ہے
قبر میں بھی بازار کے رستے جائیں گے

مگر یہ تو میری چاہتیں، آرزوئیں اور "شتر غمزے" وغیرہ ہیں خواب ہیں.... آنکھیں بند کر کے دیکھنے کا جتن جس کو

پنجابی میں "ترکے" کہتے ہیں..... مجھے کیا معلوم میں ان میں کتنا کچھ بھیگ سکا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم ہوتا تو میں اتنا کچھ لکھ ہی کہاں پاتا۔ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک زندہ ہوں اس میں بھی یقینی بات صرف اتنی ہے کہ ابھی دفن نہیں ہوا۔ انسان اپنی زندگی کے بارے میں بے خبر ہوتا ہے مجھے اگر معلوم ہوتا کہ میں اتنی لمبی عمر پاؤں گا تو ذرا زیادہ احتیاط سے کام لیتا میرا ایک شعر بھی تو ہے:

میرا المیہٗ ذاتی
لمبی عمر اور بے احتیاطی

خواتین و حضرات!

میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے اس احساس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر مخدومی نورالحسن جعفری صاحب اور محبی جمیل الدّین عالی اور مشفقی مشفق خواجہ کا محبت بھرا "تھاپڑا" مجھے ہمت نہ دلاتا تو میں منتخب اہل قلم کی اس مجلس کے سامنے حاضر ہونے کی جسارت نہ کر سکتا۔

انجمن ترقی اردو کا عطا کردہ "نشانِ سپاس" انجمن کے نام کام اور مقام کی نسبت سے مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا اپنا "تمغہٗ قائد اعظم"۔

مجھے یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ انجمن کی چھتر چھاؤں صرف اردو تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دامن علاقائی زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے لیے بھی کشادہ ہے۔ اس حوالے سے آپ نے اُس کام کا آغاز کیا ہے جو عظیم دریائے سندھ ہماری سرزمین کی سالم تہذیبی اور تاریخی سیرابی کے لیے صدیوں سے کر رہا ہے۔

آخر میں اپنا ایک وہ شعر بھی عرض کرتا چلوں جو مجھے آج بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے:

کتنی تصویروں کے ساتھ آئی ہے شامِ زندگی
وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت

راغب مراد آبادی

رباعیات

(فی البدیہ)

یہ بات بہت فخر و سعادت کی ہے
اللہ نے خاص ان پہ عنایت کی ہے
عالی کے بقول شاہ جی نے راغب!
بہتان تراشا ہے، نہ غیبت کی ہے

دانائے رموز شاعری آئے ہیں
خورشید شہر آگہی آئے ہیں
آج انجمن ترقی اردو میں
پنڈی سے ضمیر جعفری آئے ہیں

قومی زبان (۲۵) اپریل ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

سیّد ضمیر جعفری۔ شخصیت اور شاعری

بعض شخصیات اس قدر دل آویز ہوتی ہیں کہ اُن کے بارے میں گفتگو کرنے کی خواہش بھی اپنے بارے میں گفتگو کرنے کا بہانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اکثر و بیشتر حضرات کو دوسروں کے بہانے اپنے اوپر گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ سخن فہمی اور طرفداری میں مقابلہ ہونے لگتا ہے۔ میں اس اہلِ علم کی محفل میں ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ اہلِ دانش کی محفل ہے اور اس لیے میں ضمیر جعفری صاحب کی تفہیم کے سلسلہ میں اپنی لغزشوں کے لیے پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

صاحبو! اس وقت ضمیر جعفری صاحب اپنی زندگی کے اسی سال کے سنگِ میل سے صرف کچھ ماہ ہی دور ہیں۔ ان کا اصل نام سیّد ضمیر حسین شاہ ہے۔ سلطان العارفین سیّد محمد شاہؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے پوٹوہار کے علاقہ کی ایک بڑی گدی کے پروانوں کے لیے خصوصی توجہ کے مرکز رہے ہیں۔ میں ان کا ایک عرصہ سے نیاز مند ہوں۔ گزشتہ دس سال کے اندر اندرونِ ملک ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ اور بیرونِ ملک سفر کے دوران انھیں قریب سے دیکھا ہے علاوہ ازیں میں ان کے بہت سے قریبی دوستوں کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اور سب سے زیادہ ڈاکٹر طارق محمود مرزا سے قربت کے باعث ضمیر جعفری صاحب میرے لیے کھلی کتاب ہیں۔ میں اس کتاب کو نہ بھی پڑھوں تو میں ان کی کتاب زیست کی تاریخ اور جغرافیہ سے کسی قدر واقف ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ ضمیر جعفری کی شاعری کے سخن فہم ہونے کا دعویٰ نہ کر سکوں لیکن میں اُن کی شاعری کا طرفدار ضرور ہوں میں ان کی شاعری کو اس قبیلہ کی شاعری سمجھتا ہوں جو ترقی پذیر سماجوں میں منافقت، ریاکاری، بے انصافی اور منزل سے پیہم دوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ہے۔

ضمیر جعفری کی شاعری اور شعری روایت ایک شاعرِ خود آگاہ اور دنیا آگاہ فرد کی شاعری اور شعری روایت ہے ان کی مزاحیہ شاعری، دراصل ہماری زندگی کی ناہمواریوں اور قابلِ طنز رخ کو براہِ راست بے نقاب کرتی ہے اور ان کی سنجیدہ شاعری زندگی کی بصیرت افروز اقدار سے محبت کی شاعری ہے۔ شاعری کا ایک حصّہ نشتر زنی کرتا ہے تو دوسرا حصّہ شبِ غم کے ستائے ہوؤں کو سکون بخشتا ہے۔ شاعری خواہ سنجیدہ ہو یا مزاحیہ مال کار خود کو پانے کی جستجو ہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود کو پانے کا عمل بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ انگلیاں فگار ہوتی ہیں اور پاؤں میں آبلے بھی پڑتے ہیں۔

سیّد ضمیر جعفری میرے بزرگ دوست ہیں اور مجھے ان کے ساتھ اپنی دوستی پر ناز ہے۔ گزشتہ دس سال میں شاید ہی ایسا

قومی زبان (۲۶) اپریل ۱۹۹۳ء

کبھی ہوا ہو کہ وہ کراچی آئے ہوں اور میری ان کے ساتھ بے تکلفی کی صحبتیں نہ رہی ہوں۔ ناروے اور انگلستان کے سفر کے دورا
خوش قسمتی سے سیاست، شاعری، شعری روایت، کلاسیکی شاعری، جدید شاعری، ترقی پسند شاعری، نئی شاعری اور مغربی شاعر
کے موضوعات پر گفتگو کے اتنے مواقع فراہم ہوئے کہ میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ضمیر جعفری ایک ہر دلعزیز اور باہمہ
شاعر ہیں۔ وہ غاصبوں اور آمروں کے سامنے بھی کلمۂ حق ادا کیے بغیر نہیں رہے لیکن اس قدر عمدگی کے ساتھ کہ یہ حضرات بھی
مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر وہ کون سا احتجاج ہے جو ان کی ظریفانہ شاعری میں نہیں ملتا اور وہ کون سا رخ ہے جو ان کی سنجیدہ
شاعری کو اس عہد کی عصری حسّیت کا آئینہ دار نہیں بناتا۔

میں سب سے پہلے ضمیر جعفری کی شخصیت کے اُس بنیادی رخ کی طرف آتا ہوں جو علم و ادب سے بہت گہرے لگاؤ
آئینہ دار ہی نہیں اُن کا بہت اچھا تعارف بھی ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران برٹش انڈین آرمی کے ایک افسر کی حیثیت سے انھوں
نے ملایا اور انڈونیشیا کی شاعری کی اہم صنفِ سخن پنتُون سے خط اندوزی کے لیے ملائی زبان پر دسترس حاصل کی RAFFLES
LIBRARY جو سنگاپور کے بانی کے نام پر قائم کی گئی ہے اُس میں موجود پنتون کی کتابوں کو کھنگال کر رکھ دیا اپنے اوپر...
کے لوگوں سے ملائی بولنے کی شرط عائد کی اور بقول مولانا چراغ حسن حسرت "سیّد ضمیر جعفری نے "پنتون" جمع کرنے اور انھیں
اردو کا لباس پہنانے میں جس محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے اُس سے وہی لوگ واقف ہیں جو اس کے ساتھ ملایا میں موجو
تھے..... "میں نے خود دیکھا ہے کہ کسی دکان پر کھڑے ہیں۔ دکان دار سے مول تول کر رہے ہیں۔ وہ انگریزی سمجھ سکتا ہے لیکن
انھیں اصرار ہے کہ ملائی زبان ہی میں گفتگو کریں گے اس لیے "برپا ہر گا ہر گا برپا" کیے جا رہے ہیں۔ جہاں کوئی فقرہ نہیں سوجھ
وہاں اشاروں سے مطلب ادا کر دیتے ہیں.... یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اردو زبان میں اس سرزمین کے متعلق ایک کتاب
بھی موجود نہیں ہے" اور یہ کام ضمیر جعفری ہی نے کر دکھایا کہ اردو زبان کو ملائی زبان کی شاعری کے بہترین رُخ سے متعارف
کرایا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ملائی اور انڈونیشی اور اردو زبانوں کی تخیلی جنیئس کو قریب لانے میں سیّد ضمیر جعفری نے اہم کردار ادا کیا
ہے۔ تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔

ضمیر جعفری انگریزی ادب اور بالخصوص انگریزی مزاح کے رسیا ہیں اور انھوں نے اسکاٹس DOGGERLS،
BALLADS اور نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مزاحیہ شاعری میں زبان و
بیان کے ساتھ برتاؤ میں ایک اینگلو سیکسن ANGLO SAXON خوبی یعنی کفایتِ لفظی جا بجا ملتی ہے وہ الفاظ کو بہت ذمہ
داری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر اور نظم بہت تہہ دار ہوتی ہے ایک مدت سے میں اپنی اس رائے پر قائم ہوں کہ
ضمیر جعفری جس قدر اچھے انسان ہیں اُسی قدر اچھے نثار اور شاعر ہیں حالانکہ خاصی تعداد میں بہت واجبی ذہانت کے حامل، حاسد اور
تنگ نظر افراد بھی اچھی نثر اور اچھی شاعری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں یعلوم ہوتا ہے کہ کمالِ فن ایسے لوگوں کو اچھا
انسان بنانے کے کام سے صاف مکر گیا۔

ضمیر جعفری اردو کے ممتاز مزاح نویس ہیں ان کی خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت ان کے رہنما اور پوٹوہار
میں قیام پذیر اردو کے ہم عصر مزاح نگاروں کا پورا قافلہ اُن کے ساتھ رہا انھوں نے ایک طرح سے اس ملک میں مزاح اور اچھے مزاح
کی ضرورت کا احساس دلایا جب ہمارے صاحبانِ اقتدار اپنی کج فہمیوں اور ناعاقبت اندیشانہ حرکات کی وجہ سے پوری قوم کو ہدف
استہزا بنائے ہوئے تھے مزاح نگار آمروں سے مزاح کے ہتھیاروں سے لڑتا ہے جب کہ طالع آزما، خوشامد اور چاپلوسی، کی لوری دینے

بنے ہیں۔ میرے خیال میں ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری نے وہی کام کیا جو حبیب جالب اور بعض دوسرے شعرا کی احتجاجی شاعری نے۔ ضمیر جعفری کی پراعتماد شخصیت کا مزاح (HUMOUR) بھی پراعتماد ہے ان کا مزاح مشاہدہ اور مطالعہ کے سنجوگ سے تخلیق پاتا ہے، نظریہ سازش یا سُنار کی دکان میں زیورات کے بجائے "الفاظ" اجالنے سے نہیں اِس لیے ان کے مزاح کا حملہ فی الفور ہوتا ہے اور وہ آناً فاناً میں جزوذہن بن جاتا ہے۔

میں ضمیر جعفری کی خوبصورت نثر و نظم کا دلدادہ ہوں۔ خوبصورت نثر کا بطور خاص۔ خوبصورت نثر بھی کیا چیز ہے۔ تحریر کیا گیا ہے کہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ آسکر وائلڈ کی خوبصورت نثر کی گرویدہ تھیں۔ وہ اس آئرستانی ادیب کو ڈنر پر مدعو کرنا چاہتی تھیں لیکن آسکر بھی بلا کا طناز تھا۔ ہر دعوت کا جواب جھلّاہٹ سے دیا کرتا۔ کہلا بھیجتا کہ میں انگلستان کی ملکہ کے ساتھ اُس وقت تک ڈنر نہیں کروں گا جب تک انگلستان فرانس سے نپولین کے حملے کی معافی نہیں مانگ لیتا۔ اور وہ صرف اس لیے کہ فرانسیسی خوبصورت نثر لکھتے ہیں اور انگریز اس میدان میں فرانسیسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیسے لوگ تھے اور کیسا ملک تھا۔ جہاں یہ نخرے ممکن تھے۔ ہمارے وقت کے بیشتر بقول خود "روحانی لوگ" بھی انکساری کی دولت سے محروم ہیں اور اپنے رویوں میں جاگیردارانہ FEUDAL انداز رکھتے ہیں اگر یہ لوگ پرائیویٹ جیل خانے نہیں بنا پائے تو پھر پرائیویٹ جنم ہی سہی۔ لطف یہ ہے کہ یہی حضرات ان جنتوں کے دروازوں پر سنتری بنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

ضمیر جعفری صاحب سے پہلی ملاقات کراچی کے مشہور و معروف صنعتکار و بزنس مین جناب فضل حسن مرحوم کے گھر پر ہوئی تھی وہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد، مشتاق احمد یوسفی اور ضمیر جعفری صاحب کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ مجھ ناچیز سے بھی بہت محبت کرتے تھے ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو اچھی تحریروں کے نمونے سنایا کرتے تھے۔ ضمیر جعفری نے اپنے مضمون میں میرے اور اُن کے مابین خلوص اور دوستی کے رشتہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جسے زیر بحث لانے کا یہ موقع نہیں ضمیر جعفری صاحب سے میں نے فضل حسن مرحوم کے معیار پسندیدگی کی بابت سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ اچھی نثر پنگ پانگ کی گیند کی طرح کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر نہیں ہوتی بلکہ سچی شاعری کی طرح دل پر راست اثر کرتی ہے۔ ضمیر جعفری کی نثر کا بھی یہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سادہ، سلیس، برمحل اور مؤثر نثر لکھنے پر اس طرح قادر ہیں جس طرح وہ دوسروں کی دلگیری کے کام میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں وہ مزاح لکھتے وقت بعض مزاح نویس حضرات کی طرح کسی محاذِ جنگ پر نہیں ہوتے بلکہ آپ سے سرگوشی کے لہجہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ آپ کے ہنسنے کی رفتار اُن کی آہستہ خرامی سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے ضمیر جعفری کے مزاح کے لیے کسی قسم کے فلیچرازم (FLETCHERISM) کی ضرورت نہیں آہستہ آہستہ چبانے کے عمل کی، تاکہ مزاح نگار کے جملہ کا لقمہ معدہ تک پہنچتے پہنچتے دودھ کی طرح سیال بن چکا ہو بلکہ آپ ان کا مزاح مومن کی میراث کی طرح راستہ میں پڑا ہوا پائیں گے چپکے سے اٹھائیے اور چلتے بنیے۔

ضمیر جعفری متعدد نثری کتابوں کے مصنّف ہیں بطور خاص "اڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" وغیرہ وغیرہ لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنی "نثر" کی انفرادیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ وہ بدستور اچھی نثر نہ لکھ پا رہے ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر جعفری نے انگریزوں سے عسکری تربیت کے ساتھ ساتھ نثر کے بارے میں ROYAL SOCIETY کی مخصوص ہدایات پر بھی عمل کیا ہے وہ جس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس علاقہ کے بیشتر ادبا اردو زبان کو بہت ذمہ داری اور کفایتِ لفظی کے ساتھ استعمال کرنے کے عادی ہیں شاید اس طرزِ ادا کی ایک وجہ جعفری صاحب یہ بتائیں کہ عساکر برطانوی ہند اور پاکستان میں بڑی تعداد

میں شامل ہونے کی وجہ سے حکمنامہ امروز (ORDER OF THE DAY) کی طرح رائل سوسائٹی ——————
(ROYAL SOCIETY) کی طرف سے اجرا شدہ اچھی نثر کے لیے ہدایات پر عمل درآمد ضروری خیال کیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال سے اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ اردو نثر اور نظم بھی تنظیم (DISCIPLINE) کے تابع ہو گئی۔ ہوتا آ رہا ہے کہ جو بات پہلے DISCIPLINE کے طور پر اختیار کی جاتی ہے وہ کچھ عرصہ بعد عادت اور پھر مخصوص طرزِ ادا بن جاتی ہے۔

ناروے کے سفر میں ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت کے بعض ایسے رخ سامنے آئے کہ اگر یہ سفر ہماری مشترکہ یادوں کا امانت دار نہ ہوتا تو ضمیر جعفری صاحب کی زندگی کے کتنے ہی گوشے مجھ پر منکشف نہ ہوتے۔ ناروے کے پاکستانی میرے خیال میں نوے فی صد کے لگ بھگ سید ضمیر جعفری کے خاندان کے مرید یا اُن کے حلقۂ متاثرین میں شامل ہیں مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سمندر پار پاکستانیوں کا بس چلے تو فرطِ محبت سے ضمیر جعفری کو ناروے میں زندہ ہی دفن کر دیں۔

انگلستان میں بھی یہی نظر آیا میرے خیال میں اب شاعروں کو اپنے قارئین کے ساتھ ساتھ مریدوں کا بھی حلقۂ اثر رکھنا چاہیے۔ لیکن ضمیر جعفری صاحب کو ہمیشہ اپنے ہی حال میں مست دیکھا وہ مریدوں کی عقیدت بھی کمال کفایت ہی سے وصول کرتے رہے۔ وہ ایک درد مند انسان ہیں اور اس لیے ان کی نثر و نظم دونوں میں بڑی برکت ہے انھوں نے بہت لکھا ہے لیکن اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو صرف "جزیروں کے گیت"، "مافی الضمیر"، "اُڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" ہی اُن کی عظمت منوانے کے لیے کافی قرار پاتے۔ انھوں نے میاں محمد بخش کی "سیف الملوک" کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے ایک نثری ترجمہ ہمارے دوست شفیع عقیل نے بھی کیا ہے اور اُسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے ایک ترجمہ "من کے تار" کے نام سے سلطان العارفین سید محمد شاہ کی ابیات کا ترجمہ ہے اور یہ دونوں بڑے کام ہیں لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ اُن کی شاعری کا بنیادی وصف کیا ہے تو میں صرف اس قدر کہوں گا..... جذبہ کی تہذیب، خوبصورت تمثال گری، روایت اور روایت کا حسین امتزاج، مزاحیہ شاعری سے نقدِ زندگی اور سنجیدہ شاعری سے تہذیبِ زندگی کا ایک ایسا مہتم بالشان کام جو ساٹھ سال سے جاری ہے۔ وہ بلاشک و شبہ اردو زبان کے ایک بہت ہی ہمہ جہت اور ہر فن مولا ادیب ہیں وہ اور ممتاز مفتی بہ اعتبارِ عمر سینئر ادبا میں شمار ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی صرف فکشن سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ ضمیر جعفری صحافت، ادب، شاعری، کالم نویسی ڈراما اور خاکہ نگاری وغیرہ وغیرہ کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی ماشاءاللہ مشاعروں کی صعوبتیں جھیلتے ہیں اور اپنے میزبانوں کو ان صعوبتوں کے بارے میں پتہ تک نہیں ہونے دیتے۔ ضمیر جعفری کی ذات اور اُن کی شاعری میں بھی یک گونہ مطابقت ہے۔ اس ذات میں شاعری کی کارفرمائی --- اور اُن کی شاعری میں ذات کی کرشمہ سازی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ میں نے جعفری صاحب کو بہ حیثیت قاری، سامع، دوست، علم اللسان کے طالب علم، علاقائی زبان کے ادب کے رسیا، لوک ادب کے شناور اور ملکی معاملات کے بارے میں ایک CONCERNED CITIZEN کے طور پر دیکھا ہے انھیں ان کے مکان کے کچن میں اور اپنے گھر میں ایک بزرگ خاندان کے طور پر دیکھا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حقیقی آرٹسٹ کے لیے زندگی اور آرٹ دو الگ الگ دنیائیں نہیں ہوتیں۔ میں نے انھیں ایسی صحبتوں میں بھی دیکھا ہے جن کا ذکر لطف سے خالی نہ ہونا چاہیے لیکن بہر حال اس ذکر میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں گے اور ہر چند میرے بیان کے اختتام پر ان کی معصومیت میں بھی کچھ اضافہ ہی ہوگا لیکن مبادا لوگ "معصومیت" کے متعین معنی کو بھی "اضافی" سمجھیں اس لیے ان صحبتوں کا ذکر موقوف کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ بعض نقادانِ فن لسانی حرمتوں کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور صرف اُن نقادوں کے خیالات کی ترویج میں مصروف ہیں جو آسانی کتابوں

بک کے متون کو حتمی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے ضمیر جعفری کو اب سے پہلے اُن کی شاعری کے ذریعہ جانا مجھے یوں لگا کہ وہ شاید میرے ہی لیے شاعری کر رہے ہوں۔ ایک طرف مجاز، جذبی اور فیض احمد فیض کی شاعری تھی اور دوسری طرف ضمیر جعفری صاحب کی ہلکی پھلکی شاعری کیا میں اعتراف کروں کہ مجھے مزاحیہ شاعری محض اس لیے پسند تھی کہ فیض کی رومان پرور فضا کے بعد ذہن یکسر مختلف صورت حال کا بھی طالب ہوتا ہے ضمیر جعفری صاحب میری نوجوانی کے دنوں میں اپنی شاعری کے بارے میں میری تشنگی بجھا نہ پائے اس حقیقت میں کیا کلام ہے کہ جب میں اسکول میں تھا اس وقت شاعری محض شاعری نہ تھی زندگی گزارنے کا ایک انداز بھی تھی۔

اُس زمانے میں ترقی پسند شاعروں کا ڈنکا پٹ رہا تھا مجھے اس مکتب فکر کی شاعری کی یہ ادا بہت بھائی کہ شاعری یا ادب سے سماج کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ قاری اور خارجی عوامل ہماری سائیکی پر اثر انداز ہو چکے تھے انگریزی سامراج کے بھی اثرات ملاحظہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کا یہ دعویٰ کس قدر سچا تھا۔ زندگی ہمہ دم تغیر کا نام ہے اور زندگی میں تبدیلیاں بسا اوقات تخریبی طور پر در آتی ہیں۔

جب میں نے ہم عصر شعرا کا مطالعہ شروع کیا تو میری نظر سے ضمیر جعفری کی شعری تخلیقات بھی گزریں۔ مجھے ان کی زبان اور بیان میں ایک انفرادیت نظر آئی اور وہ یہ کہ ان کی زبان باریک سے باریک مفہوم ادا کرنے پر قادر تھی ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ جو میری نظر سے گزرا وہ "جزیروں کے گیت" تھا مغربی شاعروں کے اثرات کے تحت نظم معریٰ، نظم آزاد اور سونیٹس SONNETS وغیرہ سامنے تھیں بعض تخلیقات پسند بھی آئی تھیں۔ سید ضمیر جعفری نے کمال ہی کر دیا کیا یہ کمال نہیں کہ انگریزوں کی فوج کا ایک نوجوان افسر جاپانی فاشزم سے مقابلہ کرنے ملایا پہنچے اور وہاں سے ملائی زبان کی صنفِ سخن پنتون (PONTON) سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ وہاں سے یہ صنفِ سخن لے آئے اور اسے اردو کے قالب اور پنجابی ابیات کی روح میں اس طرح ڈھال دے کہ پنتون کا تعلق پوٹھوہار سے قائم ہو جائے میرے خیال میں تو اس کمال پر انھیں جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے اس کتاب پر چراغ حسن حسرت نے مقدمہ تحریر کیا تھا اور یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ ضمیر جعفری کی پنتون کے تراجم سے کچھ اس قدر ذہنی تعلق پیدا ہوا کہ انھوں نے اکثر و بیشتر پنتونوں کی سطروں میں بے ربطی کو پوٹھوہار کے گیتوں میں موجود "گھلاوٹ" کو شامل کر کے ایک نئی زندگی دے دی۔ یوں لگتا ہے کہ پنتون کی صنفِ سخن کسی زمانے میں پوٹھوہار سے بلکہ خاص طور سے "سیف الملوک" کے خالق کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ضمیر جعفری پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پنتونوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ضمیر جعفری فوجی بینڈ کی موسیقی اور خاص طور پر SCOTTISH BALLAD کے خاصے عاشق رہے ہیں اس سے انھوں نے اردو شاعری کو بڑی عالیشان IMAGERY سے مالامال کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں!

"پنتون ملایا اور انڈونیشیا (بطور خاص جاوا) کی شاعری میں اظہار خیال کی مقبول ترین صنف کا نام ہے آپ اسے ایک قطعہ یا رباعی سمجھیں جس کا پہلا مصرعہ چوتھے کا اور دوسرا تیسرا مصرعہ آپس میں ہم قافیہ ہوتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی کڑی بندھی ٹکی پابندی نہیں بعض اوقات قافیہ سرے سے لایا ہی نہیں جاتا محض صوتی — ہم آہنگی سے کام چلایا جاتا ہے پنتونوں کا بڑا ذخیرہ دراصل لوک گیتوں پر مشتمل ہے جن کا نہ کوئی مصنف کسی کو معلوم ہے اور جو علمی حیثیت سے مرتب ہیں نہ محفوظ۔

(اب یہ بات ترمیم چاہتی ہے۔ ملایا اور انڈونیشیا نے اپنی زبانوں اور ادب کی تخلیق میں بے مثال کام کر دکھایا ہے)

ضمیر جعفری نے پنتون کو پنجاب کے ماہیا اور سرحد کے ٹپوں کے آہنگ سے ملا دیا اور کمال ہی کر دیا۔ پنتوں اور ماہیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پنتون کے چار مصرعوں میں وزن یا قافیہ کی شرط نہیں ہوتی ماہیا کا پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے جس کا دوسرے مصرعے سے بہ اعتبار معنی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سیّد ضمیر جعفری کا تخلیق کردہ ایک پنتون ملاحظہ کیجیے:

بعد مدت آج نسبتِ غم تری یاد آ گئی
جیسے بِکھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پر دفعتاً آجائے راگ
یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

ایک اور پنتون

کہتی ہیں یہ فراق کی تنہائیاں مجھے
عالم جو بن گیا ہے مٹایا نہ جائے گا
بے ہوش ہو کے ہوش میں آیا نہ جائے گا
اب راس آ چکیں مری رسوائیاں مجھے

یوں لگتا ہے جب ضمیر جعفری "جزیروں کے گیت" لکھ رہے تھے تو اُن کے کانوں میں سلطان العارفین پیر سیّد محمد شاہؒ کے ابیات بھی گونج رہے تھے جنھیں وہ اپنی والدہ سے بچپن میں سنا کرتے تھے۔ پیر سیّد محمد شاہؒ اور سیف الملوک والے میاں محمد بخش کے مابین اکثر و بیشتر مغالطہ (CONFUSION) ہو جاتا ہے اوّل الذکر سیّد تھے اور آخر الذکر سیّد تھے اور نہ "پیر" کے خالق اب آپ سیّد محمد شاہؒ کی ایک دو ابیات بھی سنیے تاکہ ضمیر جعفری کے پنتون پر بچپن میں سنے گئے ابیات کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکے:

میرا مان اور میری مایا، سائیں نظر تمھاری
میں بے کرمی اور گن ہاری میں پاگل مت ماری

گھوڑے پر گاہک آئے تو بچھ بچھ خاطر داری
دام نہیں تو در کیوں کھولیں، تُف کنجروں کی یاری

محل، منارے، چراغ، چوبارے، مسجد، کلس، شوالے
پتھر چومنے سے بھی پہلے سوچیں سوچنے والے

پُروا پونچھ سے آئے تو یہ سمجھو بادل برسے
نیلے پیلے موتی رنگوں سے پھر یہ جی کیوں ترسے

یہ مندرجہ بالا ابیات پیر سیّد محمد شاہؒ کی ابیات کے تراجم بہ عنوان "من کے تار" سے لیے گئے ہیں اور ان ابیات کا ترجمہ بھی ضمیر جعفری صاحب ہی نے کیا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ ۱۹۴۵ء میں ضمیر جعفری کے "جزیروں کے گیت" کے پنتون

PONTON ۴۰ سال بعد شائع ہونے والے سلطان العارفین کے "ابیات" سے کس طرح فیض اٹھاتے ہیں!

ضمیر جعفری پوٹوہار کے اُس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے برصغیر کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے تحریک مجاہدین میں پوٹوہار کے گکھڑ GHAKKAR سرداروں کا اہم کردار رہا ہے اور سیّد احمد شہید نے گکھڑوں کے سردار راجہ جہانداد خاں کے نام بھی خط لکھا تھا اور انھیں دعوتِ جہاد دی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ سکھوں نے پوٹوہار کے مسلم عوام پر جس نوعیت کے مظالم کیے ہیں وہ اس درجہ روح فرسا ہیں جس قدر بہاولپور، ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے عوام پر اور اس طرح کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے کہ ان تمام روایتوں کے باوجود رنجیت سنگھ کس طرح برطانوی ہند کے جغرافیائی پنجاب کا ہیرو ہو سکتا ہے — جب کہ سکھ دور کے اوائلی زمانے میں گکھڑوں کے سر کی قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی تھی۔ پوٹوہار کے لوک گیت سکھ دہشت گردی کے خلاف پُرسوز نوحے بھی ہیں۔ اس علاقہ کی ادبی روایت فارسی اثرات سے شروع ہوتی ہے اسی علاقہ میں شاہجہاں کے دور کا اردو کا پہلا شاعر شاہ مراد پیدا ہوا یہ علاقہ صوفی شعرا کے لیے بطور خاص راس رہا ہے سیّد ضمیر جعفری کے جد امجد حضرت سیّد محمد شاہ کی "ہیر" اور "ابیات" سے پیر سیّد مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی نعتیں، احمد سائیں اور ہمارے دور میں سیّد ضمیر جعفری اور باقی صدیقی نے اُسی شعری روایت کی پاسداری کی ہے جس میں محبت کی سرمستیاں اور صبر و سکون اور قناعت کی لوریاں بیک وقت نظر آسکتی ہیں۔

ضمیر جعفری متعدد شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ "کارزار"، "لہو ترنگ"، "جزیروں کے گیت"، "مافی الضمیر"، "میرے پیار کی زمین"، "ولایتی زعفران" (انگریزی نظموں کا ترجمہ) "من میلہ"، "متاعِ ضمیر"، "زیور وطن"، "مسدس بدحالی" وغیرہ وغیرہ مجھے ان کی طویل مثنوی "گنر شیر خاں" بطور خاص پسند ہے یہ BALLAD SCOTTISH کے انداز میں تحریر ہوئی ہے اور اگر کسی اردو مثنوی پر انگریزی بلکہ SCOTTISH اثرات کے دیکھنے ہوں تو "پھر گنر شیر خاں" کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ ضمیر جعفری زیادہ تر ایک مزاح نگار شاعر اور نثار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں جب کہ وہ ایک سنجیدہ غزل گو بھی ہیں۔ مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار:

پایانِ شب سراغِ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا

یہ بے حسی کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ بے دلی کہ موت کا ڈر بھی نہیں رہا

جس میں کبھی کبھی اُتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزنِ در بھی نہیں رہا

تقدیسِ آرزو کے بغیر آرزو عبث
دستار گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا

سیّد ضمیر جعفری برطانوی اور پاک افواج کے لیے سیّد ضمیر حسین شاہ کے نام سے ملازمت کے رجسٹر پر رہے۔ وہ جنگ عظیم اوّل کے زمانہ میں چار پانچ سال کے بچے تھے اور اب ۷۹ سال کے جوان ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا جوانی اور جولانی سے نکاح ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری تخلیقی نا آسودگی (CREATIVE DISSATISFACTION) کے جذبات سے مملو ہے اور یہ ہنر بھی صرف اُس شاعر ہی کو راس آسکتا ہے جس کی آنکھیں اپنے سماج کے لیے روشن مستقبل پر لگی ہوئی ہوں کہ نا آسودگی کے احساس سے تعمیر و تشکیل کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ سیّد ضمیر جعفری کی شاعری اس مخصوص احساس نا آسودگی کی شاعری ہے۔

قومی زبان (۴۴) اپریل ۱۹۹۳ء

ستار طاہر

سیّد ضمیر جعفری - چند باتیں

ایک آدمی کی زندگی میں ہم پوری آدمیت کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ایک جیسے جذبات واحساسات، عمل اور ردِّ عمل کا۔ مجھے غم اور خوشیاں، ایک جیسے ماحول، تہذیب اور ثقافت میں رچے بسے، یکساں پس منظر اور جبر وقدر میں جکڑے ہوئے ہونے کے باوجود بظاہر ایک جیسی زندگیاں بسر کرتے ہوئے بھی ہم سب ایک دوسرے سے بہت مختلف بھی ہوتے ہیں اور ہمیں اپنی اپنی زندگی خود بسر کرنی پڑتی ہے اور اپنی اپنی صلیب بھی خود اٹھا کر زندگی کے راستوں پر چلنا پڑتا ہے۔

کامیو نے کہا تھا کہ آدمی جب پچاس برس کا ہو جائے تو پھر اس کی زندگی اور فن کا محاکمہ کیا جا سکتا ہے ماشااللہ ضمیر جعفری تو نصف صدی کو عبور کر کے اپنی زندگی "تھری اسکور" سے بھی بہت آگے جا کر "سینچری" پوری کرنے والے ہیں اور ہم جو آج یہاں ان کی شعری اور ادبی جذبات کا اعتراف کرنے اور ایک بڑے شاعر اور مزاح نگار کو خراج تحسین پیش کرنے جمع ہوئے ہیں تو ہم خداوند پروردگار سے امید رکھتے اور دعا کرتے ہیں کہ سیّد ضمیر جعفری ایسے ہی ہنستے کھیلتے شعر کہتے اپنی زندگی کے سو برس پورے کریں اور ہم میں سے جو زندہ بچ جائیں پھر ایک بار یہاں جمع ہوں.... اور ایک بار پھر انھیں خراج تحسین پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں.... آمین.....

سیّد ضمیر جعفری یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو جہلم سے چودہ میل دور ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے ان کے آباؤاجداد ایران سے نکلے تو ملتان پہنچے اور ملتان سے یہاں اس زمین پر خیمے گاڑ دیے جوانہی کے مورث اعلیٰ سیّد عبدالخالق کے نام سے موسوم ہوئی اور وہاں ایک گاؤں آباد ہوا جو آج بھی موجود ہے۔

یکم جنوری ۱۹۱۶ء میں پیدا ہونے والے سیّد ضمیر جعفری کا زمین کے ساتھ گہرا رشتہ استوار ہوا ان کے آباؤاجداد کسان تھے۔

سیّد ضمیر جعفری نے خود تو ہل نہیں چلایا مگر وہ شاعری کی زمین میں کاشت کرتے رہے اور شاعری میں دھرتی کے ساتھ اپنے گہرے پرخلوص اور اٹوٹ تعلق کا اظہار کرتے رہے ان کی شاعری میں زمین ایک بنیادی حقیقت اور استعارہ کا درجہ رکھتی ہے اور زمین کے حوالے سے ہی ان کی وطن دوستی اور حب الوطنی اپنا منفرد اظہار کرتی ہے۔

زمین کے ساتھ اس گہرے تعلق کو اس علمی وراثت نے جلا بخشی جو سیّد ضمیر جعفری کے لیے انسپریشن بھی بنی اور تجربہ بھی... ان کے دادا سیّد حیدر شاہ ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ وہ پچاس ساٹھ برس تک ایک ہی اسکول میں بطور ہیڈ ماسٹر پڑھاتے رہے۔

سیّد ضمیر جعفری کی بے جی ایک رچے بسے قدیم معاشرے کی پیداوار تھیں ایک ایسی تہذیب کا نمائندہ جو اب دھندلی ہو جارہی ہے وہ رات کو پچھلے پہر اٹھتیں یہ پنجاب کے خطے میں "سرگی واویلا" ہوتا ہے۔ نوافل پڑھتیں، پھر نماز فجر سے پہلے چکی پیستیں۔ نماز فجر پڑھ کر درود پڑھتیں ہزار دانہ تسبیح پر وظیفہ چلتا۔ عربی دعاؤں کے ساتھ ساتھ وہ پنجابی کے ابیات پڑھتیں، دھیمی دھیمی لے میں جو سوز و گداز اور عقیدت سے لبریز ہوتی، پورے روحانی استغراق اور گہری کیفیت میں وہ جو ابیات پڑھتی تھیں وہ ان کی عبادت ہی کا حصّہ بنتے۔ یہ ابیات انھوں نے اپنی ماں سے ورثے میں پائے تھے۔ جب ان کی ماں ایسی ہی "سرگیوں میں انھیں گود میں لے کر چکی پیستے ایک خاص لے میں پڑھا کرتی تھیں۔ یہ ابیات، یہ سرگیاں، یہ چکی پیسنے کی آواز، سیّد ضمیر جعفری کی زندگی کا ورثہ بنیں۔ جنھوں نے ان کی زندگی اور شاعری پر گہرے اور دائمی اثرات پیدا کیے۔

یہ ابیات سلطان العارفین پیر محمد شاہ کا کلام تھا۔ جو پوٹھوار کے علاقے کے عظیم اور مقبول ترین صوفی شاعر تھے۔ سلطان العارفین پیر سیّد محمد شاہ نے پوٹھواری لہجے میں ہیر بھی لکھی تھی جو اس علاقے میں تب بھی بہت مقبول تھی اور اب بھی مقبول۔

پیر سیّد محمد شاہ سیّد ضمیر جعفری کے نانا جان تھے اور پھر وقت آیا کہ سیّد ضمیر جعفری نے ان کے ابیات کا اردو ترجمہ "من کے تار" کے نام سے کیا۔ پنجابی شاعری میں اس علاقے کے ایک اہم ترین شاعر میاں محمد بخش کی عظیم شعری تصنیف "سیف الملوک" کے اشعار بھی سیّد ضمیر جعفری کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں اپنی پوری تاثیر کے ساتھ در آئے اور پھر سیّد ضمیر جعفری نے "سیف الملوک" کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا جسے میں سیّد ضمیر جعفری اور اردو زبان کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں۔

ان کے خاندان اور بزرگوں کا طرزِ حیات روایتی اور مثالی تھا۔ ان کے والد ایکسائز انسپکٹر تھے ساری عمر اسی علاقے میں فائز رہے نہ ترقی کی نہ دولت بنائی۔ اخلاقی اقدار کا ایک قلعہ تھا۔ جس میں یہ خاندان محصور تھا۔ مگر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قلعے میں بسنے والے یہ افراد کتنے مطمئن شاکر اور محفوظ تھے اور آج کی دنیا میں یہ قلعہ مسمار ہوا ہے تو اخلاقی اقدار کا کیا حشر ہوا۔

مگر یہ قلعہ بند نہیں تھا اس لیے قلعے کے اندر زندگی اپنے سارے تنوع کے ساتھ اپنا رنگ جماتی تھی آج ہم جس شاعر اور مزاح نگار کو دیکھتے ہیں اس کا بچپن اور لڑکپن رنگا رنگ، چمکدار تجربوں، مشاہدوں اور شوق فراواں سے بھرا ہوا ملتا ہے سیّد ضمیر جعفری نے اپنے بچپن میں پرندے پالے، چھوٹا سا چڑیا گھر بنایا، اپنے گاؤں سے دور اور اپنے گاؤں میں ہیر کی محفلوں میں شرکت کی۔ جہاں سوانگ بھرنے والے آئے ان کے تماشوں میں شریک ہوئے شکار کے پیچھے مارے مارے پھرے، اس زمانے میں بیلوں کی دوڑیں ہوتی تھیں ان مقابلوں میں شرکت کی، کھڑتالوں اور چمٹوں کی تال پر سیف الملوک گانے والوں کو سنا۔ کبڈی کے بین الاضلاعی مقابلوں کے جوش و خروش میں حصّہ لیا۔

ان کے علاقے میں ایک کھیل "تلیاں" کے نام سے بہت مقبول تھا۔ یہ دراصل مکے بازی کی ایک شکل تھی دو آدمی میدان میں اترتے جسم تیل کی مالش سے لشک رہے ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کو باری باری پوری طاقت سے پانچ مکے مارتے جب مارنے والا مکا مارنے لگتا تو اُس کا مدِّمقابل اس کی کلائی پکڑنے اور روکنے کی کوشش کرتا دوسرا اسے مکا مار کر گرانے کی کوشش کرتا۔ طاقت اور پھرتی کا کھیل تھا۔ اس کھیل کو دیکھنے کے لیے آس پاس اور دور دراز سے لوگ پیدل اور گھوڑوں پر سوار آتے تھے۔ آج جس شاعر کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرنے جمع ہوئے ہیں یہ شاعر... یہ آدمی سیّد ضمیر جعفری اپنی جوانی میں مختلف انداز سے داد وصول کیا کرتا تھا۔ جب وہ تلیاں کے مقابلے کے لیے اکھاڑے میں اترتا اس کا جسم تیل سے لت پت لشکارے مار رہا ہوتا

جب بھی وہ مقابلہ کرتا، برابر چھوٹتا اور داد وصول کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیّد ضمیر جعفری کے فن پر اس کھیل کے اثرات بھی بڑے گہرے ہیں۔ اس کھیل میں بڑی دہشت تھی۔ اس کھیل کے ردِعمل میں ان کی شاعری میں گداز پیدا ہوا۔ ان کی ساری شاعری میں آپ کو جارحانہ پن (AGGRESSION) نہیں ملے گا۔ یقیناً جارحانہ پن جو فن میں اپنی جھلک مختلف انداز میں دکھاتا ہے ضمیر جعفری کے ہاں اس لیے دکھائی نہیں دیتا کہ اس کھیل نے اس کی نوک کو کند کر دیا تھا.....

داد وصول کرنا سیّد ضمیر جعفری کی روایت رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب سیّد ضمیر جعفری ایف اے کے طالب علم تھے تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے نظموں کے ایک مقابلے کا اعلان ہوا سیّد ضمیر جعفری نے بھی ایک نظم مقابلے میں بھجوائی اس نظم کا عنوان "گاؤں کی ایک شام" تھا۔ شاعر کی زندگی تجربے اور مشاہدے سے جڑی ہوئی نظم.... اس نظم کو مقابلے میں پہلا انعام ملا۔ تقریب لاہور کے وائی ایم سی اے ہال میں ہوئی۔ انھیں اردو کے عظیم محسن شیخ سر عبدالقادر نے "ہمایوں گولڈ میڈل" پیش کیا۔

میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ کیا یہ ذکر ضروری ہے کہ شاعری کے اس مقابلے میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے شاعر نے میٹرک میں ایک بار فیل ہو کر ناکامی کا ذائقہ چکھا تھا.....!

سیّد ضمیر جعفری نے ایک بھرپور زندگی بسر کی ہے وہ ہر روز گاؤں سے پندرہ میل دور جہلم میں واقع اسکول پیدل جاتے اور پیدل آتے۔ پھر تین میل کا فاصلہ سائیکل ملنے پر طے کرتے رہے اپنے استادوں کے منظورِ نظر بنے اور شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنالیا وہ برصغیر کے نامور استاد ایش کمار کے چہیتے شاگرد رہے۔ ان عظیم استادوں نے انھیں اتنا کچھ دیا کہ وہ استاد کے رتبے سے شناسا ہوئے۔

مولانا چراغ حسن حسرت کو بھی وہ اپنے استادوں میں شمار کرتے ہیں۔ ملتان میں ایک پروفیسر سیّد ضمیر جعفری پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے انھوں نے سیّد ضمیر جعفری سے رابطہ کیا تو سیّد ضمیر جعفری نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے استاد چراغ حسن حسرت پر پہلے پی ایچ ڈی کریں یہ استاد کا احترام تھا اور پی ایچ ڈی کرنے والے صاحب نے سیّد ضمیر جعفری کا یہ مشورہ قبول کر لیا....

سیّد ضمیر جعفری نے کیمبل پور سے ایف اے کیا اور بی اے کے لیے لاہور اسلامیہ کالج پہنچے۔ جہاں اس زمانے میں علامہ سیّد عبداللہ یوسف علی جیسے عظیم استاد، صاحب علم اور دانشور پرنسپل تھے۔ سیّد عبداللہ یوسف علی نے ایک بار سیّد ضمیر جعفری کو اپنے سامنے کچھ زیادہ ہی جھک کر بات کرتے دیکھا تو نصیحت کی "مسلمان جھک کر بات نہیں کرتے" سیّد ضمیر جعفری نے اسے پلّے میں باندھ لیا آپ اس کے اثرات ان کی شاعری پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا ایک اور منفرد پہلو ہے کہ وہ شاعری میں بھی جھک کر بات نہیں کرتے.....

سیّد ضمیر جعفری اسلامیہ کالج کے میگزین کریسنٹ کے مدیر بھی رہے لاہور کے ادبی حلقوں میں نام کمایا اور مقام بنایا۔ اس دور کے بزرگ نامور اور جید لکھنے والوں سے تعلقات قائم کیے۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے اپنا جریدہ "شیرازہ" جاری کیا تو سیّد ضمیر جعفری کو اس کا مدیر معاون بنایا۔

اسی تاریخ ساز دور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو سیّد ضمیر جعفری اس تاریخی جلسے میں موجود تھے۔

سیّد ضمیر جعفری کا مجموعہ کلام "قریہ جاں" مولانا صلاح الدین احمد کے نام منسوب ہے جن سے وہ بے حد متاثر ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہو کر وہ جہلم میں محکمہ مال میں گرد آور بن گئے یہ گرد آوری ان کے بس کا روگ نہ تھی۔ محکمہ مال کی جناتی زبان پڑھنا اور سمجھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے جہلم میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا،

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وہاں افسرِ مال تھے۔ جہلم کے ایس پی اعتزاز الدّین لوہارو تھے جو رشتے میں جمیل الدّین عالی کے ماموں تھے ان سب نے جہلم جیسے شہر میں شعر و ادب کی نشوونما کے لیے ضمیر جعفری کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور یہی زمانہ تھا جب ضلع جہلم میں سیّد ضمیر جعفری نے مسلم لیگ قائم کی۔

وہ علاقہ جہاں ضمیر جعفری نے جنم لیا فوجی علاقہ کہلاتا ہے جہاں گھر کا ایک فرد تو ضرور فوج میں ہوتا ہے سیّد ضمیر جعفری گر[د] آوری کے کمبل کو پھینک کر فوج میں ملازمت کے لیے راولپنڈی پہنچے مگر وہ فوج میں بھرتی نہ ہو سکے۔ جب ان کا جسمانی معائن[ہ] ہوا تو انھیں ردّ کر دیا گیا نقص یہ نکلا کہ ان کی KNEES BAD ہیں۔ یعنی گھٹنے بجتے ہیں۔ بہرحال ۱۹۴۴ میں وہ فوج کے تعلقاتِ عامہ میں چلے گئے۔ وہاں کرنل مجید ملک تھے، فیض احمد فیض تھے، چراغ حسن حسرت تھے، جو سنگاپور سے فوجیوں کے لیے اردو کا پہلا اخبار "جوان" نکالتے تھے۔ اس دور میں سیّد ضمیر جعفری فوجی وردی میں ملبوس ہوتے۔ سنگاپور اب یہ ان کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ جب ساری آسائشیں حاصل تھیں مگر فوجی وردی کے پیچھے تو شاعر کا دل دھڑکتا تھا۔ انھوں نے ملا[یا] انڈونیشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کے لوک گیت جمع کیے ان کا اردو ترجمہ کیا "جزیروں کے گیت" کے نام سے یہ کتاب ار[دو] شاعری میں ایک منفرد اضافہ ہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ فوج میں خدمات انجام دیتے رہے ستمبر کی جنگ آزادی میں حصّہ لیا آگ اور دھوئیں سے گزرے او[ر] انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ جب بلوچ رجمنٹ نے بلند ترین پہاڑی چوٹی پانڈو فتح کی تو ساری دنیا کو یہ خبر سنانے والے سیّ[د] ضمیر جعفری تھے۔

ستمبر کی جنگ آزادی اور پاکستان کے قیام نے سیّد ضمیر جعفری کی شاعری کو ایک نیا موضوع دیا انھوں نے قلم کی طاقت [کو] قومی نظموں کے لیے استعمال کیا یہ لاوا تھا جو پھٹ پڑا اور قومی شاعری ان کی شاعری کا ایک اہم اور نمایاں حصّہ بن گئی۔ وطن [سے] محبت ان کی روح میں شامل ہے جوان کی شاعری سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئی۔

سیّد ضمیر جعفری نے فوج سے خود ریلیف لی۔ فوجی وردی اُتاری ایک اخبار کے ایڈیٹر بنے جو سر فیروز خان نون نے وہ [کچھ] ساتھیوں سے مل کر نکالا جو زیادہ نہ چل سکا پھر اپنے احباب سے مل کر "بادشمال" کے نام سے روزنامہ جاری کیا۔ جو گیٹ اپ [کے] اعتبار سے منفرد اخبار تھا مگر کاروبار کا تجربہ نہ ہونے کی صورت میں بھاری نقصان اُٹھا کر اسے بند کر دیا سچ تو یہ ہے کہ اگر اس وق[ت] فوج نہ چھوڑتے تو آج یقیناً ریٹائرڈ جنرل ہوتے تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ مارشل لاء لگانے والے جنرلوں میں شامل نہ ہوتے۔

سیّد ضمیر جعفری نے بھرپور زندگی بسر کی ہے نت نئے تجربوں سے گزرے ہیں انتخابات میں بھی حصّہ لیا اور ناکام ر[ہے] شاعر کے لیے واقعی الیکشن جیتنا ممکن نہیں ہوتا۔ تاہم انھوں نے سیاسی الیکشن کو بھی اپنی شخصی اور شعری روایات سے [ن]معنویت دی۔ اپنے حامیوں کی مخالفت کے باوجود سیّد ضمیر جعفری اپنے حریف کے انتخابی کیمپ میں جاتے رہے اور طے پایا [کہ] انتخابی مہم میں "ذاتیات" کا عنصر شامل نہیں ہوگا اور چشم فلک نے یہ منظر بھی الیکشن کے دنوں میں دیکھا کہ ان کے مخالف امیدواروں کے اس پولنگ اسٹیشن پر جوان کے اپنے گاؤں میں قائم ہوا کھانا سیّد ضمیر جعفری کے ہاں سے جاتا رہا۔

"بادشمال" کی بندش اور انتخابات میں ناکامی کے بعد سیّد ضمیر جعفری پھر فوج میں نئے سرے سے آگئے انھوں نے ۱۹۶۵ کی جنگ میں فوج کے تعلقات عامہ کے افسر کی حیثیت سے جنگ کو بہت قر[یب] سے دیکھا ۱۹۶۶ء تک وہ فوجی وردی میں ر[ہے]

میجر کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔

سیّد ضمیر جعفری نے اسلام آباد کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے دیکھا۔ وہ اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے شعبہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ جو اسلام آباد میں مختلف علاقوں کے نام "رمنا" اور "آب پارہ" ہیں۔ یہ سب نام سیّد ضمیر جعفری کے رکھے ہوئے ہیں اس کے بعد وہ نیشنل سینٹر میں ڈائریکٹر رہے پھر وزارت شمالی علاقہ جات میں شعبہ تعلقات عامہ کے عہدے پر دو برس تک کام کیا یوں افغان مہاجرین سے ان کے بڑے راست تعلقات رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اکادمی ادبیات کے رسالے ادبیات کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

اردو زبان کے اس بڑے شاعر اور مزاح نگار کی زندگی کی یہ چند جھلکیاں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے سیّد ضمیر جعفری کے اعزاز میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں ہم یہ اعزاز بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم ان سے یہ گزارش کریں کہ وہ اپنی خود نوشت قلم بند کریں ایک طویل تاریخ ساز اور ہنگامہ پرور عہد میں بھرپور زندگی گزارنے والے مزاح نگار اور شاعر کی خود نوشت ایک معرکے کی چیز ہوگی جو بیتے موسموں اور عظیم اور عہد ساز شخصیتوں کی یادوں کی بازیافت کے حوالے سے ایک تاریخی دستاویز ثابت ہو سکتی ہے۔

سیّد ضمیر جعفری نے بہت کچھ کہا ہے شعر و ادب کے لیے ان کی عطا بیش بہا ہے ابھی انھیں بہت کچھ کرنا ہے ہم کیوں نہ انھیں آج کی تقریب میں مجبور کر دیں کہ وہ اپنی خود نوشت بھی قلم بند کر دیں!!

افتخار احمد عدنی

غالب کے تصرّفات

تصرّفات کے ذکر کی کیا ضرورت ہے غالب کا یہ ایک تصرّف ہی کیا کم ہے کہ ان کا خیال آتے ہی بہت سے غالب شناس دل پہ دستک دینے لگتے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو چٹکیاں لینے سے نہیں چوکتے، اور بعض سر پہ ہتوڑے برسانا شروع کر دیتے ہیں، خدانخواستہ میرا روئے سخن اپنے قہقہہ انداز دوست کی طرف نہیں ہے، ان کے قہقہے تو الاّ اللہ کی ضرب کی طرح دل کو گرماتے، دورانِ خون کو تیز کرتے ہیں اور ہر محفل کو زندگی کی گہما گہمی سے آباد کر دیتے ہیں، یہ ہیں میرے عزیز دوست آفتاب احمد خاں۔ اب چونکہ غالب شناسی کے پردے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا ان کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد بھی دل پہ دستک دیتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ وہ کبھی طبلے کی تھاپ لگتی ہے اور کبھی پکھاوج کی - - ... ۔اور ساتھ ہی وہ چٹکی لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ کبھی غالب کے چٹکی لیتے ہیں، کبھی آفتاب احمد خاں کے اور کبھی صرف اپنے اور اپنی اس شرارت سے محظوظ بھی ہوتے۔ ہتوڑے برسانے والوں کے سرگروہ جناب یاس یگانہ چنگیزی تھے ان کے نام میں ہی ہتوڑا بازی کی توجیہ موجود ہے، اگر کوئی یگانہ ہونے کے باوجود زمانے کی ناقدری سے مبتلائے یاس ہو تو اس کا چنگیزی خون اُسے ہتوڑے برسانے پر مجبور کر دے گا۔ یہ کیا کم تصرّف ہے غالب کا کہ ہر سخن فہم ان سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے، اس شعر میں غالب اپنے کج ادا محبوب سے زیادہ اپنے ترش مزاج نقاروں سے متوجہ معلوم ہوتے ہیں:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اب میں غالب کے اس شعر کی طرف آتا ہوں جس سے نیپا میں ایک چھوٹا سا ہنگامہ ہو گیا تھا پچھلے مضمون میں میں نے "آفتابین" کے استعمال پر ڈاکٹر آفتاب احمد کے اعتراض کا ذکر کیا تھا اور ان کی اصلاح پر نہایت سعادت مندی سے آفتابین کے بجائے "دو آفتاب" کی ترکیب کو ایک شعر میں نظم کیا تھا اسی سلسلے میں غالب کے تصرّف کے حوالے سے ایک اور شعر ہر دو آفتاب حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

چہ عجب اگر بہ ماہے غلبہ نیافت غالب
عجب ایں کہ غالب آمد بدو آفتاب تنہا

اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے کہ غالب ایک ماہ (یعنی محبوب ماہ رو، ماہ پیکر، ماہ طلعت) پر غالب نہ آسکا حیرت کی بات تو یہ

ہے کہ وہ دو آفتابوں (یعنی سرکش، قوی ہیکل رقیبوں) کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اپنے دونوں عزیز دوستوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اس شعر کو میری گستاخی سے زیادہ مرزا کا تصرّف سمجھیں ان سے مغلوب ہونا بھی ایک اعزاز ہے۔

اب میں غالب کے ایک چھوٹے سے تصرّف کا ذکر کرتا ہوں جس نے مجھے اُس شعر تک پہنچادیا جس سے نیپا میں ہنگامہ ہوا۔ لیکن اس کے تعارف کے لیے ایک جملۂ معترضہ۔ گفتگو یہ تھی کہ زاہد کی ضد کیا ہے، کسی نے کہا فاسق، کسی نے کہا فاجر، ایک صاحب ذرا دور کی کوڑی لائے اور انھوں نے کہا زاہد کی ضد ہے عابد۔ اس پر ہنگامہ ہو گیا۔ ویسا ہی ہنگامہ جیسا آفتابہائے غالب شناس نے بپا کیا تھا۔ سب نے کہا یہ دونوں الفاظ تو ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں، اسی لیے عام طور پر دونوں کا استعمال ایک ساتھ ہوتا ہے، جب ہنگامہ فرو ہوا تو انھوں نے کہا زاہد اور عابد میں بعد المشرقین ہے، عابد عبودیت کی تصویر ہوتا ہے وہ عجز وانکسار سے اپنے خالق کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، وہ اپنی کوتاہیوں پہ شرمسار ہوتا، اور اپنی عبادت سے عفو و درگزر طلب کرتا ہے۔ اس کے برعکس زاہد کو اپنے زہد پہ گھمنڈ ہوتا ہے، وہ ایک سپاہی کی سی مستعدی کے ساتھ تمام فرائض ادا کرتا ہے جو آسائشیں اور آسانیاں جائز ہیں انھیں بھی ترک کر دیتا ہے، اور حق سمجھ کے اپنے اجر کا طالب ہوتا ہے اس استدلال سے معترضین کا جوش تو کچھ ٹھنڈا ہو گیا لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ اسی پر مصر رہے کہ یہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ میں اس استدلال سے خاصہ متاثر ہوا۔ اگر میں نے اس زمانے میں غالب کے فارسی کلام کو دیکھا ہوتا تو میں ان کے حق میں کچھ شعر ضرور پیش کرتا۔ مثلاً:

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقویٰ مایل است امّا
زننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

میرا دل بھی تقویٰ کی طرف مایل ہے لیکن زاہد سے جو ننگِ اسلام ہے دور رہنے کی خاطر میں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے۔

یہ کس قدر سخت تنقید ہے زاہد پر جسے حشر میں غالب کی کافر ماجرائی کا جواب دینا پڑے گا۔ اس شعر کی قدر و قیمت اس وقت اور بھی میری نظروں میں بڑھ گئی جب میں نے حضرت جیسے سخن فہم کو یہ شعر اپنے مسلک کے اظہار میں پڑھتے ہوئے سنا' یا وہ مشہور شعر:

زاہدو ورزشِ سجود آہ زدعویٔ وجود
تانہ زد اہرمن رہش بدرقۂ ملک نخواست

اس کا مفہوم میں ٹالسٹائے کی ایک کہانی کے حوالے سے پہلے لکھ چکا ہوں۔

بحث کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن پھر بھی اختلاف رائے برقرار تھا میں نے اختلافات کی بدمزگی کو ختم کرنے کے لیے ایک بے ضرر سی تجویز پیش کی۔ میں نے کہا کہ اگر زاہد وہ ہے جو سارے کام سپاہی کی سی مستعدی سے نمٹا دیتا ہے تو پھر زاہد کی ضد کاہل کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ یہ قہقہہ میرے عزیز دوست آفتاب احمد خاں کا نہیں تھا کیوں کہ اس وقت تک مجھے اُن سے غالب کے فیض سے قرب کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی بہر حال اس قہقہے اور کاہل کے سست وجود فیضان اور اس لفظ کے بظاہر بالکل بے محل ہونے کی وجہ سے فضا میں ایک خوشگواری سے آگئی۔ یہ بات میں نے یونہی کہہ دی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ واقعی زاہد کی ضد کاہل ہی ہے زاہد وہ ہے جو ہر کام وقت سے کرے، مستعدی سے کرے، اصول کے مطابق کرے اور ہر کام قرینے سے کرنے کے سبب ترقی کرتا چلا جائے اور کاہل وہ ہے جو نیک نیتی کے باوجود کوئی کام وقت پر

کر سکے ارادے ہی کرتا رہ جائے۔ زاہد کو اس کے عمل کا اجر مل جاتا ہے، کاہل نیت کے اجر کی امید سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے تناظر میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے افسر زاہد ہوتے اور سول سروس کے سر کاہل۔ زاہد مالیات کے ماہر ہوتے ہیں ہر طرح کے قاعدے، قانون، ضابطے پر کامل عبور رکھتے ہیں. اور آڈٹ رپورٹوں سے سول سروس کے کاہلوں کا بھرتہ بنا دیتے ہیں. اور خود ترقی کر کے وزیر مال اور پھر گورنر جنرل ہو جاتے ہیں. اور مجلس قانون ساز کو برطرف کر کے ملک کی تاریخ کا رخ بدل دیتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وزیراعظم بن کر ملک کے آگے جمہوریت کے شان مناظر وا کر دیتے ہیں اور جمہوریت سے محروم ہو کر بڑی پامردی سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کاہل یونہی رہ جاتے ہیں۔

مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں یہ مثال ہماری انجمن کے صدر نورالحسن جعفری صاحب کو ناگوار گزرے کیوں کہ اس طرح وہ بھی زاہدوں کے زمرے میں آ جائیں گے لیکن زاہدانِ کامران و کامگار کے زمرے میں شریک ہونا کوئی بری بات تو نہیں بے دور کیوں جائیے، ہمارے اپنے دونوں آفتابوں پر بھی یہ مثال پوری اترتی ہے، ایک حلقۂ زاہداں کی نمائندگی کرتے ہیں دوسرے حلقہ کاہلاں کی۔ زاہد نے غالب پہ کتاب لکھ کر منزل پالی اور کاہل دیکھتے رہ گئے۔ بلکہ قہقہہ لگاتے رہ گئے۔ لیکن ان کے قہقہوں میں وہ اخلاص ہے کہ غالب ان کی بے توجہی سے مضطرب ہو جاتے ہیں صرف ایک اور جملہ معترضہ کے بعد میں صدق دل سے غالب کے شعر کی طرف آنے کی کوشش کروں گا۔

آفتاب احمد خاں جب بھی دلی جاتے غالب کی قبر پہ حاضری دیتے تھے اور اگر ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کا سفر کرنا پڑتا تو اس کا التزام رکھتے کہ واپسی کسی ایسی پرواز سے ہو جو کراچی کے بجائے دلی رکتی ہوئی آگے جائے اور اس طرح انھیں غالب کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کا موقع مل جائے پچیس تیس سال اُن کا یہ طریقہ رہا بس ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ دلی گئے لیکن سرکاری مصروفیات کے ایک غیر مختتم سلسلے نے انھیں غالب کے مزار پر حاضر ہونے کی مہلت نہ دی۔ پاکستان آتے ہی انھوں نے غالب کو خواب میں دیکھا اور انھوں نے بہت دردمندی سے دلی آ کر بغیر ملے واپس چلے جانے کی شکایت کی۔ آفتاب احمد خاں نے دلی کے یادگار سیمینار میں مجھے اپنا یہ خواب سنایا اور خود اس کی توجیہ یہ کی کہ چونکہ غالب میرے خیالوں میں بسے رہتے ہیں مجھے اس قسم کا خواب نظر آیا۔ میں نے کہا خدا سے ڈریے کیا غالب اتنے ناقدر شناس ہیں کہ آپ جیسے چاہنے والوں کی بے توجہی پہ شکایت نہ کریں کیا وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ خواب کے ذریعے اپنے عاشقوں سے بات کر سکیں، چلیے اس جملۂ معترضہ سے غالب کے ایک اور تصرف کا ذکر ہو گیا۔

اب میں اس تصرف کی بات کرتا ہوں جس سے ایک چھوٹا سا ہنگامہ ہوا۔ ایک دن صبح ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھلی میں گھڑی میں وقت دیکھ کے بہت پریشان ہوا فجر کی نماز وقت پہ پڑھنا بہت مشکل کام ہے، زاہدوں کے لیے آسان لیکن مجھ جیسے کاہلوں کے لیے بہت دشوار میں ایسی صورت میں اپنے آپ کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ ابھی تو بہت وقت باقی ہے، تھوڑی دیر بعد نماز پڑھی جا سکتی ہے، یا یہ کہ اتنی دیر ہو گئی ہے کہ وضو کرتے کرتے نماز کا وقت ختم ہو جائے گا میں اسی طرح کی کوشش کر رہا تھا کہ غالب کا ایک شعر یاد آگیا:

صبح است و گونا گوں اثر، غالب چہ خُسپی بے خبر
نیکاں بہ مسجد رفتہ در، رنداں بہ گلشن گشتہ جمع

صبح کی سحر طرازی کے عجب جلوے ہیں، غالب ایسے میں کیوں بے خبر سو رہا ہے، اُٹھ اور دیکھ کہ مسجد میں نیک نہاد لوگ جمع ہو گئے

ہیں اور رندوں نے گلشن کو آباد کر دیا ہے۔

میں تقریباً دو سال پہلے اس غزل کا ترجمہ کر چکا تھا غالب کے اس مقطع نے مجھے سونے نہ دیا۔ اُٹھا اور نماز ادا کی مجبوری کی شوق میں بدل گئی اور میں اشراق کی نماز پڑھ کر لیٹا۔ جب دوبارہ سو کے اُٹھا تو اس غزل کا ایک اور شعر یاد آیا "از بذلہ سنجاں کس دریک نشیمن گشتہ جمع" پہلے مصرعے میں کچھ شک ہوا تو دیوانِ غالب دیکھا کیا اچھا شعر ہے کہتے ہیں:

ہے ہے چہ خوش باشد بہ دے، آتش بہ پیش ومرغ وے
از بذلہ سنجاں چندکس دریک نشیمن گشتہ جمع

غالب بھی عالی کے محبوب کی طرح انجمن آرا آدمی تھے انھیں تنہائی میں میکشی اچھی نہیں لگتی تھی وہ چاہتے تھے کہ زندگی لطف لیں تو ہم مذاق دوستوں کی صحبت بھی ضرور ہو۔ یہاں ان کی خواہش ہے کہ سردی کا موسم ہو، آتشدان میں آگ جل رہی ہو، گزک کا وافر انتظام ہو اور شراب کا دور چلتا رہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ بذلہ سنج دوستوں کی صحبت میں ہو بذلہ سنجی متعلق ایک اور شعر یاد آگیا سن لیجیے:

حریف ماہمہ بے بذلہ مے خورد غالب
مگر زخلوت واعظ بہ محفل افتاد است

ہمارا حریف ایک بے کیفی کے عالم میں بغیر کسی خوش طبعی کا اظہار کیے مے پینے میں مصروف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی واعظ کی خلوت سے رندوں کی محفل میں آگیا ہے نماز کی ترغیب دینے والی غزل کا مطلع بھی غضب کا ہے۔ صرف پیش کیے دیتا ہوں، اگر کچھ لکھنا شروع کیا تو غالب اور اقبال کی گفتگو شروع ہو جائے گی جسے سمیٹنا مشکل ہوگا۔

شادم کہ برانکارِ من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دیں خود خاطرِ من گشتہ جمع

اس غزل کے بعد ردیف غ کی دوسری غزل پہ نظر پڑی میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا ڈیڑھ دو گھنٹے میں سات اشعار کا ترجمہ کر لیا اس غزل کی ردیف ہے دریغ خوردن۔ جس کے معنی ہیں آہیں بھرنا، دکھ اٹھانا، افسوس کرنا، مثال کے طور پہ صرف ایک شعر اور اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

از خود بروں نرفتہ و درہم فتادہ تنگ
در راہ حق بگبرو مسلماں خورم دریغ

ترجمہ اس طرح ہوا ہے:

ہوکر اسیر ذات ہیں آمادۂ فساد
ہے راہ حق میں گبرو مسلماں سے دکھ مجھے

اس غزل میں سخن گسترانہ بات مقطع میں نہیں بلکہ مطلع میں آپڑی۔ غالب کا مطلع

ہنگام بوسہ بر لب جاناں خورم دریغ
در تشنگی بہ چشمہ حیواں خورم دریغ

میں نے ایک سعادت مند مترجم کی حیثیت سے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا:

ہنگام بوسہ ہے لب جاناں سے دکھ مجھے
یا تشنگی میں چشمۂ حیواں سے دکھ مجھے

رجمہ کرنے کے بعد جب میں نے نظرثانی کی تو مطلع کا مفہوم کچھ دل کو نہیں لگا ہنگام بوسہ دکھ کیسے ہو سکتا ہے دکھ اگر ہونا ہی ہے تو بعد میں ہوگا جس لذت کی طلب تھی وہ حاصل نہ ہوئی مدت العمر کے۔۔ ارمان کا جنازہ ایک لمحے میں نکل گیا اقبال کے ایک مصرعے میں صرف ذراسی تحریف سے اس بات کو یوں کہا جاسکتا تھا:

ترا بوسہ کچھ بھی تسلی دل ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا، وہی آہ نیم شبی رہی

ہنگام بوسہ جو بھی ہونا ہے اس کی نوعیت ایک فوری عمل یا ردِّ عمل کی ہوگی افسوس کرنے اور دکھ اُٹھانے کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے لہٰذا میں نے آزادی کا استعمال کرتے ہوئے ردیف کو بدل دیا اسے آپ ضرورت شعری کہہ لیجیے یا ضرورت ترجمانی یا ضرورت معنوی میں نے "دکھ مجھے" کی ردیف کو بدل کے "احتراز" کر دیا اور اس طرح شعر کی یہ صورت ہوگی:

ہنگام بوسہ اور لب جاناں سے احتراز
ہے تشنگی میں چشمۂ حیواں سے احتراز

تبدیلی میں نے صرف مطلعے میں کی باقی غزل کو اسی طرح چھوڑ دیا۔ احتراز میں جو عالی ظرفی ہے وہ غالب کے شایانِ شان بھی ہے۔ نیپا کی تقریب سے صرف ایک دن پہلے میں نے اس غزل کا ترجمہ کیا تھا۔ جب کھانے سے فارغ ہو کے ہر دو آفتابان غالب شناس کے ساتھ میں ڈائننگ ہال سے نکلا تو میں نے ان حضرات کی خدمت میں اپنا ترجمہ پیش کیا۔

پہلا مصرعہ میں نے دو تین دفعہ پڑھا، دونوں حضرات نے غور سے سنا، غالب کے کلام کو اپنے اندر سمونے میں کچھ وقت لگتا ہے جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ بات خاطر خواہ طور پر دلنشین ہو گئی ہے تو میں نے دوسرا مصرعہ ادا کیا دونوں حضرات نے بہت پسند کیا۔ آفتاب قہقہہ نواز نے کھل کے داد دی ان دونوں حضرات کی داد سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے نہایت بے احتیاطی اور ناعاقبت اندیشی سے یہ کہہ دیا کہ میرا ترجمہ غالب کے شعر سے کچھ بہتر ہے۔ یہ کہنا تھا کہ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا آفتاب احمد خاں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے ڈاکٹر آفتاب احمد نے میرے علاوہ اردو کے تمام کم نصیب مترجموں کے لتے لے ڈالے۔ کہنے لگے کہ شان الحق حقی، رومیو اور جولیٹ یا شاید انٹنی اور کلوپٹرا کا ترجمہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ شیکسپیئر سے بہت بڑھ گئے ہیں یہ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کا ترجمہ غالب کے فارسی کلام سے بہتر ہے آفتاب احمد خاں کو جب قہقہوں سے کچھ افاقہ ہوا تو کسی کا نام لے کے کہا کہ انھوں نے میر کی زمین میں ایک غزل سنائی اور پھر یہ فرمایا کہ میں میر کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں ان دو آفتابانِ جہاں تاب کے ساتھ محمد علی صدیقی بھی تھے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار میں سب سے زیادہ شائستہ نکلے انھوں نے کہا اس قسم کے ILLUSIONS اور خوش خیالیوں میں کیا حرج ہے۔ ان میں بھی ایک دلکشی ہے جب فضا قدرے پُرسکون ہوئی تو میں نے ان حضرات کو بتایا کہ میں نے پوری غزل کا دیانتداری سے ترجمہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس مطلع کا بھی اور جب میں نے یہ کہا کہ احتراز میں ایک دلچسپ پہلو یہ نکلتا ہے کہ ممکن ہے ہنگام بوسہ غالب کو دہنِ محبوب سے ایک ایسا بھبکا لگا ہو کہ وہ برداشت نہ کر سکے ہوں۔ اور منہ موڑ کے چشمۂ حیواں سے واپس آ گئے ہوں یہ توجیہ آفتاب احمد خاں کو پسند آئی اور انھوں نے خوش ہو کے مجھے یہ اجازت دے دی کہ میں اگر چاہوں تو ان کی طرف سے ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو غالب کا یہ شعر بھیج دوں تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو

بدبودار تنفس کے خطرات سے ڈرا کے اپنی مصنوعات کی فروخت بڑھاسکیں۔ اس طرح لوگ غالب کے اشعار کی افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ دیکھا آپ نے کابل لوگ کتنے فراخدل ہوتے ہیں آفتاب زاہد سرشت ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اس تنازعے میں اتنا وقت گزر گیا کہ مہمانوں کے علاوہ میزبان بھی رخصت ہو کے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نیپا کی ڈائریکٹر معصومہ حسن سے ملنے کے لیے اور میں اس مباحثے کی بدمزگی کو دور کرنے کے لیے ان کے دفتر گئے، جاتے ہی میں نے چائے کی فرمائش کی اور ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنا کوٹ اتارا کوٹ اتارتے ہی ان کے ساتھ دو بہت چھوٹے چھوٹے حادثات پیش آئے میں نے انھیں غالب کے تصرفات سمجھا اور لکھنے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس بات پہ راضی نہ ہوئے بہرحال غالب کے تصرفات دیکھنے والے کو ہر طرف نظر آتے ہیں ایک سے اجازت دلوا دی دوسرے پہ اجازت کا دروازہ بند کر دیا۔

دو تین دن بعد جب مشفق خواجہ صاحب کو میں نے یہ روئیداد سنائی اور مطلع کے ترجمے کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنا چاہی تو انھوں نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا میں نے کہا ان دو حضرات نے تو فوراً ہی فیصلہ صادر کر دیا آپ کو وقت کیوں درکار ہے وہ بولے میں ان کا کہاں مقابلہ کر سکتا ہوں وہ ٹھہرے غالب کے دودھ شریک اور میں ہوں ادارہ یادگارِ غالب کا ایک معمولی سا کارکن میں نے حیرت سے پوچھا دودھ شریک! انھوں نے کہا جی ہاں۔ وہ غالب کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جس کی سگے بھائی کو ہمت نہیں ہوتی صرف دودھ شریک ہی کر سکتا ہے۔ میں نے کہا وہ کیسے وہ بولے ایک غالب کے اشعار میں وہ معنی دریافت کرتے ہیں جو غالب کے وہم و گمان میں نہ آئے ہوں گے، اور دوسرے غالب کی عشقیہ زندگی کا وہ تجزیہ کرتے ہیں جیسے وہ فیض کی نظم "رقیب" کے ہیرو کی طرح مرزا کے ہر معاشقے میں برابر کے شریک رہے ہوں۔ اشعارِ غالب میں نئے نئے معانی کی دریافت کے عمل سے تو میں واقف تھا لیکن غالب کی عشقیہ زندگی کے تجزیے پر خواجہ صاحب نے عجیب روشنی ڈالی، میں اس بات سے بہت متاثر ہوا میں نے کہا جتنا وقت چاہیں لیں لیکن مجھے اپنی رائے سے ضرور مطلع کریں۔ چند دن بعد خواجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالب نظیری کی غزل پر غزل لکھنے کی وجہ سے اس ردیف کے اسیر ہو گئے اور چنانچہ انھوں نے غزل کا آغاز ہی مقطع سے کیا:

غالب شنیده ام ز نظیری که گفته است
نالم ز چرغ گر نه به افغاں خورم دریغ

یہاں یہ خیال رہے کہ افغاں سے مراد صرف فغاں ہے، افغانستان کے رہنے والے نہیں ہیں کہیں آپ کے غالب شناس دوست اسے کابل میں ہونے والی بمباری کے تعلق سے افغانوں کی مصیبت کا نوحہ نہ سمجھ لیں۔ مقطع سے قریب جو اشعار ہیں ان میں تو خورم دریغ کے معنی افسوس اور حسرت کے ہی ہیں، جیسے جیسے وہ مطلع کے قریب ہوتے گئے اس معنی سے دور ہوتے چلے گئے مثلاً مقطع سے ساتواں شعر ہے "بر خوان وصل و نعمت الواں خورم دریغ" یہاں بھی اگر آپ چاہیں تو احتراز استعمال کر سکتے ہیں۔ "ہے خوان وصل و نعمت الواں سے احتراز" اس طرح شعر میں وہ خوبی پیدا ہو جائے گی "جو ڈر مجھے یاد کہ مجھے" سے نہیں آسکتی۔ مطلع کے معاملے میں مجھے آپ سے اتفاق ہے واقعی مطلع احتراز کے استعمال سے ایک نئی معنویت حاصل کر لیتا ہے ممکن ہے غالب کے ذہن میں بھی وہی مفہوم ہو جو ردیف کی مجبوری سے پوری طرح ادا نہ ہو سکا۔ البتہ احتراز کی توجیہ میں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ غالب نے اگر احتراز کیا تو اس وجہ سے نہیں کہ دہن محبوب کے بھبکے سے وہ گھبرا گئے بلکہ انھیں خود اپنے سوٴ تنفس سے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں محبوب ہمیشہ کے لیے نہ انھیں چھوڑ دے۔ لہٰذا محبوب سے دست بردار ہونے کی بجائے وہ بوسے سے دستبردار ہو گئے۔ ایسی صورت

میں دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے کا لازمی نتیجہ بن جاتا ہے۔ در تشنگی زچشمہ حیواں خورم دریغ۔ ہے تشنگی میں چشمہ حیواں سے احتراز
مشفق خواجہ صاحب کے اس تبصرے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ واقعی یہ کام ایک محقق ہی کر سکتا تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ اس غزل کا آغاز کیسے ہوا گویا یہ غزل ساری کی ساری الٹے قدموں چلی ہے، اور اسی لیے ردیف کی گرفت سے آزاد ہوتی گئی اور اس مصرعے میں انھوں نے احتراز کا استعمال کر کے میری توجیہ کو اور وسعت دے دی ہے۔ خوان وصل و نعمت الواں سے احتراز۔ اور پھر سب سے بڑا کمال انھوں نے یہ کیا کہ سوٗ تنفس کی ترکیب سے میری مشکل حل کر دی مجھے BAD BREATH کا ترجمہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی اور احتراز کی انھوں نے جو وجہ بتائی ہے اس کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ یہ غالب کا تصرف نہیں تو اور کیا ہے کہ جس خیال سے وہ مجھے نوازتے ہیں اس کی توثیق ایک محقق سے کرا دیتے ہیں۔

اب میں غالب کے ایک اور تصرف کا ذکر کر کے بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔ چند سال ہوئے فرید احمد جن کے رسالے میں غالب پر میرے کچھ مضامین شائع ہوئے تھے غالب کے ایک پرستار کو ساتھ لے کے مجھ سے ملنے آئے۔ وہ غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے میں خاموش سنتا رہا پھر انھوں نے ایسی بات کہی کہ اس پر خاموش رہنا مشکل تھا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ عرصے پہلے جب وہ دلی گئے تو انھیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ امیر خسرو کی قبر تو ہاروں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے اور فاتحہ پڑھنے والوں کا تانتا لگا ہوا ہے، لیکن غالب کی قبر پہ نہ کوئی فاتحہ خواں ہے نہ پھول۔ میں نے کہا آپ اس فرق سے دل گرفتہ نہ ہوں خسرو محبوب الٰہی کے محبوب تھے ان کے مزار پر شانِ محبوبی ہے۔ غالب تھے عاشق، اور عشق تو بے سروسامانی ہی کو پسند کرتا ہے۔

"ہلہ من عاشقِ ذاتم تنہ نا یا یاہو" لیکن اس بات سے ان کی تسلی نہ ہوئی اس پر فرید احمد نے عجیب واقعہ سنایا انھوں نے کہا کہ پیر عبدالمعبود صاحب جو بہت بڑے بزرگ تھے اور ہر سال حج کیا کرتے تھے جب سفرِ حج پہ نکلے اور راستے میں چند دن لاہور میں قیام کیا تو وہاں ان کے ایک عقیدت مند ان کی خدمت میں حاضر ہوئے گفتگو کے دوران پیر صاحب نے ان سے دریافت کیا آج کل کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا غالب پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ انھوں نے خیال کیا کہ غالب پر کتاب لکھنا وقت کا ضیاع ہے، اس چند روزہ زندگی کو بیکار شغل میں کیوں گنوایا جائے چنانچہ انھوں نے کہا کہ غالب تو ایک شاعر تھا اس پہ کتاب لکھنے سے کیا فائدہ۔ ان کے عقیدت مند بہت متاسف ہوئے کہ ان کی ایک کاوش نامقبول ہوئی۔ پیر عبدالمعبود صاحب جب حجاز مقدس پہنچے تو ایک شب انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوش لباس خوش شکل صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے اور انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میرا نام اسد اللہ خاں غالب ہے" اور معنی خیز نظروں سے انھیں دیکھ کے رخصت ہو گئے۔ پیر عبدالمعبود صاحب کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا انھوں نے اپنے لاہور کے عقیدت مند کو خط لکھا کہ غالب پر اپنا کام جاری رکھو اور ساتھ ہی اپنا یہ خواب بھی لکھ دیا۔ جب رئیس امروہوی کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے پیر عبدالمعبود صاحب کا وہ خط حاصل کر کے اس پہ ایک کالم لکھا اور شاید وہ خط بھی شائع کر دیا۔

غالب لاہور میں بھی خواب کے ذریعے اپنا پیغام سنا سکتے تھے لیکن انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی ایک زایرِ حرم کو جوارِ حرم میں پکڑا جائے تا کہ خواب کی صداقت میں کسی شک کا احتمال نہ رہے دوسرے اس میں یہ بھی مصلحت تھی کہ اگر لاہور میں وہ اپنا تعارف کراتے تو پیر عبدالمعبود صاحب اپنے عقیدت مند کے گھر جا کر ضرور نصیحت کر دیتے حجازِ مقدس میں اپنی طرف متوجہ کر کے غالب نے اُن سے ایک خط لکھوا لیا تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے اور وہ واقعی کام آیا اور ایک کالم کا موضوع بنا اور اگر غالب کی زندہ کرامت میرے عزیز دوست آفتاب احمد خاں غالب کے تصرفات پر کوئی کتاب لکھیں تو اس میں محفوظ ہو کر آنے

والی نسلوں کو غالب کے مقام سے آگاہی بخشتا رہے گا۔

مضمون ختم ہو گیا لیکن غالب کے تصرفات جاری ہیں۔ ۱۶ فروری ۹۲ء کی شام جب انجمن کے دفتر میں غالب کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب میں اپنا مضمون پڑھ کر میں خانقاہ تاجیہ جا رہا تھا تو مجھ پہ ایک عجیب کیف ساطاری ہوا اور "احتراز" کی ایک لطیف جہت سے آگاہی ہوئی اس لطافت کے ادراک کے لیے سوٴ تنفس بلکہ ہر قسم کے سوٴظن سے اجتناب ضروری ہے ایک دفعہ پھر اس شعر کو سن لیجیے:

ہنگامِ بوسہ اور لبِ جاناں سے احتراز
ہے تشنگی میں چشمۂ حیواں سے احتراز

مدت العمر کی تمنا کے بر آنے کا وقت ہے جسم سے جسم اور جاں سے جاں کے ملنے کی ساعت آ پہنچی ہے کہ دفعتاً محبوب کی شخصیت اپنی سیرت کے تمام تر جمال کے ساتھ شاعر پہ اس طرح پر تو ڈالتی ہے کہ وہ دم بخود رہ جاتا ہے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ محبوب کی پاکیزہ ہستی ایسے ارفع مقامِ صفا پہ فائز ہے کہ وہ کبھی اُس سے حصولِ قرب کی جسارت ہی نہ کر سکے گا وہ ایک مریم صفت کے لبوں کو کس طرح آلودہ کر سکتا ہے اُسے معلوم ہے کہ محبوب کے ہونٹوں کا لمس اُسے حیاتِ جاوداں دے سکتا ہے، لیکن ایک پیکرِ صفا کی عصمت کو مجروح کرنے کی قیمت پر وہ یہ دولت حاصل نہیں کر سکتا فرطِ ادب سے آنکھیں جھکائے اپنی تمنا پہ نادم وہ خاموشی سے آبِ حیات سے لوٹ آتا ہے:

ہے تشنگی میں چشمہ حیواں سے احتراز

اشفاق صاحب نے "من چلے کا سودا" لکھ کے کرامتوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے اس کے نتیجے میں عالی صاحب باوجود اپنی تصوف دشمنی کے صوفیا سے ملنے لگے ہیں۔ وہ ممتاز مفتی سے ملے گئے اور اُن سے قدرت اللہ شہاب کی زبانی اپنے مقام سے آگاہی حاصل کر کے کچھ حیران سے ہو گئے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ وحدت الوجود کی طرف مایل ہو رہے ہیں لیکن میں اس موضوع پر ان سے گفتگو سے احتراز کرتا ہوں کہ کہیں وہ بھڑک کے پھر اپنی ضد پر نہ آجائیں اب مفتی صاحب سے امید ہے کہ لاہور میں عالی کو شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے انھیں دل و دماغ کی کشمکش سے آزاد کرائیں عالی کے روحانیت سے تصادم کے بارے میں میرے پاس کچھ باتیں ہیں لیکن وہ اپنے انکار میں اتنے راسخ ہیں کہ شاہ لطیف کے تصرف کا مظہر بنتے ہوئے بھی روحانیت کو فریبِ نفس ہی سمجھتے ہیں، اگر موقع ملا تو غالب کے تصرفات کے ضمیمے کے طور پر عالی کے دوہوں میں شاہ لطیفؒ اور قدرت اللہ شہاب کے تصرفات کا ذکر کروں گا۔ اس سے بہت سوں کا بھلا ہوگا۔

دردانہ قاسمی

کرشن چندر اور سماجی شعور

کرشن چندر ان ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سے ایک تھے جنھوں نے سماجی زندگی اور تہذیب و ثقافت کو اپنی تحریروں کا بنیادی حوالہ بنائے رکھا۔ کرشن چندر ویسے تو ذاتی طور پر بھی ادب اور آرٹ کو انسانی سماج کا ترجمان تصور کرتے تھے۔ مگر ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کے اس نقطۂ نظر کو اور بھی پختگی عطا کر دی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ ادب کو زندگی اور سماجی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیے اس تحریک کے بانیوں نے ۱۹۳۶ء کی کانفرنس میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ترقی پسند ادیبوں کی ہمدردیاں سماج کے نچلے طبقے کے ساتھ ہوں گی اور ادب کو سماجی مقصد کے حصول کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی اسباب تھے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ان ادیبوں نے بھی سماجی مسائل کی بنیاد پر افسانے لکھنے کو اپنا ادبی اور اخلاقی فریضہ تصور کیا جو اس تحریک سے وابستگی سے پہلے محض رومانی یا باغیانہ خیالات کی بنیاد پر اپنے فکشن کا تانا بانا بنتے رہے تھے۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر "انگارے" کے افسانہ نگاروں کو خاص طور سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے باغیانہ اور رومانی طرز تحریر کو ترقی پسند تحریک نے ہی ایک خاص مقصد اور اخلاقی ذمہ داری کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

کرشن چندر نے متعدد ناول بھی لکھے ہیں اور بہت بڑی تعداد میں افسانے بھی۔ لیکن کرشن چندر کی مقصدیت کو نظر انداز کرنے کے لیے ان کی آرائشی زبان اور رنگین اسلوب تحریر کو عموماً نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر کی زبان یا اُن کا انداز بیان اُن کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرتا بلکہ اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے لاتا ہے کہ ادب لطیف یا رومانی انداز کے نثر لکھنے والوں نے جب اردو زبان کے رچاؤ اور رنگینی کو سماجی مقاصد سے ہم آہنگ کر کے فکشن لکھنے کی کوشش کی تو ایسے ترقی پسند فکشن لکھنے والوں کی تحریروں میں اردو زبان کی روایتی چاشنی کے ساتھ سماجی زندگی کے حقائق زیادہ اثر انداز اور قابلِ قبول اسلوب میں سامنے آنا شروع ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ ٹھیٹھ اور براہ راست اندازِ تحریر اختیار کرنے والے ادیبوں کے مقابلے میں کرشن چندر جیسے مرصع اسلوب کے ادیبوں کو زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں نے ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے میں زیادہ اہم کردار بھی ادا کیا۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی مسائل صرف سماجی مسائل نہیں رہتے بلکہ سماجی مسائل کو ادب اور فن سے ہم آہنگ کرنے کی عمدہ مثال بن کر سامنے آتے ہیں۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کے آغاز کا زمانہ جہاں ایک طرف ترقی پسند تحریک کی شیرازہ بندی کا زمانہ تھا تو دوسری طرف اس زمانے کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھانے کا مسئلہ بھی تھا۔ جاگیرداروں اور زمینداروں

کے ہاتھوں جس طرح ہر طرف غریب، کسان، مزدور اور نچلے طبقہ کی عوام کا استحصال عام تھا، اگر اس زمانے کا کوئی ادیب اس مسئلہ کو نظرانداز کرتا تو وہ دراصل سماج کے سب سے بڑے مسئلے سے چشم پوشی کرنے کے جرم کا ارتکاب کرتا۔ کرشن چندر کے افسانوں میں ابتدائی دور سے آخری دور تک اس سماجی ناسور پر نشتر لگانے کا رجحان ملتا ہے۔

انھوں نے اپنے بہت سے افسانوں کو جاگیردارانہ نظام، اس نظام میں رائج مظالم اور استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں کرشن چندر کا ایک اہم افسانہ "اجنتا سے آگے" ہے۔ اس افسانہ میں غریب کسان کے ایک گروہ پر ایک زمیندار کے گولی چلانے اور ایک راجا کے ہاتھوں مرنے والے کی بہن کو اغوا کرنے کا ایسا پُراثر ذکر کیا گیا ہے کہ افسانہ پڑھنے والا افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا معترف اور اس سے اس طرح متاثر ہوتا چلا جاتا ہے کہ یہ افسانہ کسی سماجی مسئلہ کے بیان سے کہیں زیادہ خود پڑھنے والے کے احساسات کا ترجمان معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں "اجنتا سے آگے" کے علاوہ کرشن چندر کے بعض اور افسانوں کو بھی بنیادی حوالے کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔ "پہلی اُڑان"، "شیطان کا استعفیٰ"، "ٹیڑھی میڑھی بیل"، کو اس سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان افسانوں کا موضوع یا تو دیہات ہے یا پھر دیہات کے وہ عوام جو اپنی پسماندگی، غربت، جہالت، بھوک اور معاشی بدحالی کی وجہ سے جاگیردار کے استحصال کا شکار ہونے پر مجبور ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غریب عوام اپنی غربت کی وجہ سے استحصال کا شکار ہوتے ہیں اور اس استحصال کا مسلسل شکار رہنے کی وجہ سے غربت اور افلاس کی حالت سے باہر نکلنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے افلاس کے ساتھ اُن کا استحصال بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ "پہلی اُڑان" کے ان چند جملوں سے گاؤں اور دیہاتوں کی اس عمومی صورت حال کا اندازہ بہت آسانی سے لگایا جاسکتا ہے جس صورت حال نے جبر و ظلم اور استحصال کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

> .... اکثر گاؤں میں ایک مہاجن ضرور ہوتا تھا۔ اس کا گھر باقی گھروں سے ہمیشہ کشادہ اور صاف ہوتا تھا.... گاؤں کے نمبردار سے لے کر مکین تک ہر شخص اس کا قرض دار اور احسان مند تھا۔ مہاجن گاؤں کا امدادی بینک تھا، مہاجن گاؤں کا حکیم تھا، مہاجن گاؤں کا بنیا، اور اکثر اوقات پنچ بھی، کسان لوگوں کا بال بال اس کے قابو میں تھا۔"

کرشن چندر کے افسانے "پہلی اُڑان" کے ایک کردار کے ان بیانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر نے اپنے بعض افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور طبقوں کی بنیاد پر قائم معاشرے کی بنیادی خامی کو کس طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے تاہم کرشن چندر اپنے سماجی شعور کو صرف اسی مسئلہ تک محدود نہیں رکھتے ہیں، وہ اپنی تحریروں میں طبقاتی استحصال کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی، نچلے طبقہ کے لوگوں کے معاشی مسائل اور عورتوں کی پسماندگی کو بھی جگہ جگہ اپنے افسانوں میں زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ہیرو اور ہیروئن بھی پریم چند کے اُس کلیدی خطبے کے نقش قدم پر اپنے خدوخال واضح کرتے نظر آتے ہیں جس میں پریم چند نے ترقی پسند ادیبوں کو حسن کے معیار کو بدلنے کی ترغیب دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس جملے سے پریم چند دراصل ادب سے اس ہیرو پرستی کو ختم کرانا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری روایتی داستانوں، مثنویوں اور قصے کہانیوں میں شہزادوں، شہزادیوں، وزیرزادوں اور وزیرزادیوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہا کرتی تھی۔ کرشن چندر اپنے ادبی رویہ اور انداز میں چاہے کتنے ہی رومانی کیوں نہ ہوں مگر ان کی رومانیت ہر جگہ عوامی زندگی، سماجی شعور اور انسان دوستی سے اپنا رشتہ ہر موقع پر برقرار رکھتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عشق و محبت کا ذکر کرتے ہیں، جمالیاتی ذوق کی تفصیلات بیان کرتے ہیں اور خیالی اور تصوراتی دنیا تک

تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اپنے ہر انداز میں وہ کردار محلِ وقوع اور افسانے کے بنیادی محرک کے طور پر عوامی اور سماجی زندگی سے اپنا رشتہ ضرور برقرار رکھتے ہیں۔ عوامی اور سماجی مسائل کا یہی وہ احساس ہے جو کرشن چندر کو غریبوں کی کھولیوں، مفلسوں کی جھونپڑیوں اور پسماندہ لوگوں کے گندے محلوں میں لے جاتا ہے اور اسی احساس کے مارے وہ اپنی تمام تصور پرستی کے باوجود شروع سے آخر تک ایک سماجی حقیقت نگار اور ترقی پسند افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔

کرشن چندر کو کشمیر کی سماجی زندگی سے بہت زیادہ دلچسپی ہے مگر وہ کشمیر کے ذکر میں صرف منظر نگاری اور حسن و جمال کی تصویر کشی کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس سلسلے میں بھی اپنے افسانوں کی بنیاد کشمیری عوام کی غربت کو بتاتے ہیں اور "جھیل سے پہلے جھیل کے بعد" جیسے افسانوں میں راجاؤں اور ڈوگرہ جاگیرداروں کے ہاتھوں عوام پر کیے جانے والے ظلم و ستم کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں خواہ کشمیر کی سماجی، ثقافتی زندگی ہو یا دہلی اور بمبئی کی اعلیٰ سوسائٹی اور جھگی، جھونپڑی کا ذکر، ہر جگہ ایک سماجی اور تہذیبی حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے "چھپر پتی" میں ایک اندھے بھکاری کے مسائل کو سمجھا ہے۔ وہیں "قبر" سے معنون افسانے میں لگاتار کئی مردوں کے مرجانے کے بعد زندگی کی مشکلات کا شکار ہونے والی پس ماندہ عورتوں کی بے کسی اور بے بسی کی سچی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کسی افسانے میں طوائف کی زندگی کو زیر بحث لاتے ہیں تو دوسرے افسانے میں پاکیزہ کردار رکھنے والے لوگوں کے سماجی مسائل کو کرداروں کی شکل میں جیتا جاگتا بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔

کرشن چندر کو اس اعتبار سے تو ترقی پسند مصنفین میں نرا حقیقت نگار کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنے انداز تحریر کی رومانیت کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا اور اس طرح حقیقت نگاری کو رومانیت سے ہم آہنگ کیے رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ مگر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ کرشن چندر ہی وہ اہم ترین ترقی پسند فکشن نگار ہے جو اگر ایک طرف ادب کے سماجی تقاضوں کو محرک کے طور پر قبول کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی زبان اور اپنے انداز بیان میں خالص فنی اور ادبی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کے افسانے بہت سے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ پر تاثیر اور دور رس اثرات کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے بارے میں کئی طرح کی انتہا پسندانہ رائیں پائی جاتی ہیں۔ ان کو ایک حلقہ تو پورے طور پر رومانی افسانہ نگار مانتا ہے جب کہ دوسرا حلقہ انھیں ایک نرا حقیقت نگار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے ان کو نقادوں کا ایک گروہ صرف ترقی پسند تحریک کا علم بردار تصور کرتا ہے تو دوسرا گروہ ان کی افسانہ نگاری میں تحریک سے الگ بھی ایک آزاد ادیب اور خالص فنکار کا درجہ دیتا ہے۔ ان تمام انتہا پسندانہ رویوں میں کرشن چندر کے ساتھ کہیں نہ کہیں ناانصافی برتنے کا اندازہ ہوتا ہے کرشن چندر کا قصور سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے حقیقت نگاری کو خوبصورت انداز بیان کا سلیقہ دیا اور ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں بھی سماجی مسائل کو آزادانہ طور پر سمجھنے اور ان پر اظہار خیال کرنے کی کوشش کی۔

کرشن چندر اس اعتبار سے ایک ایسے افسانہ نگار اور ناول نویس معلوم ہوتے ہیں جس نے اپنی سمجھ کی حد تک خود کو ادبی اور تخلیقی مطالبات پر بھی پورا اتارنے کی کوشش کی..... وہ اپنے بعض افسانوں میں مقصدیت کو اس کی معراج تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور "مہالکشمی" کا پل جیسے افسانہ میں انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کر کے کسی ایک طبقے سے ادب کی صاف صاف وفاداری کا تقاضہ کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کا افسانہ زندگی کے موڑ پر بھی ہے۔ جس میں سماجی اور ثقافتی مسائل بھی فن اور آرٹ کے

حسن میں ڈھل کر نمودار ہوئے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی میں سماج کے مختلف طبقات کی زندگی کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اپنے افسانوں اور ناولوں میں انسانی زندگی اور سماجی مسائل کے ان گنت پہلو نمایاں کیے انھوں نے عام حالات میں اگر عام انسانی سماج کو موضوع بنایا تو غیر معمولی حالات میں "ہم وحشی ہیں" میں شامل افسانے لکھے جو تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات اور قتل و غارت گری کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں اس مجموعے میں شامل افسانے ان کے جذباتی انداز کے باوجود اپنے موضوعات کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کی تحریروں کا دائرہ موضوعات اتنا وسیع ہے کہ ایک مضمون میں اس کا احاطہ آسان نہیں تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر نے ساری زندگی انسانی سماج اور تہذیب و ثقافت سے اپنا رشتہ قائم رکھا اور اپنے ادب کو سارے جہان کے درد و غم کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ محمد حسن عسکری نے اس بارے میں مختصر ہی سہی مگر نہایت اہم اور جامع تبصرہ کیا ہے:

> "کرشن چندر کا افسانہ زندگی کا ایک ذاتی اور بلاواسطہ تاثر ہوتا ہے۔ اسے زندگی سے محبت ہے لامحدود اور بے انداز محبت۔ اس کے دل میں درد ہے اور آنکھوں میں بصیرت اور زندگی کی وسعتیں اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے جو نغمے کی شکل میں پھوٹ پڑنے کے لیے بے قرار ہے۔ اس کا راگ ایک محدود طبقے کا رونا گانا نہیں بلکہ اس کی آواز ایک پوری دنیا کی، انسانیت کی ترجمان ہے۔"

محمد حسن عسکری ترقی پسند ادیبوں کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود وہ کرشن چندر کو ان الفاظ میں داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کرشن چندر کی سماجی اور ثقافتی وابستگی نے ہر طبقۂ فکر کے لکھنے والوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے اس سے کرشن چندر کی سماجی ذمہ داری اور ادبی فن کاری دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔

کرشن چندر کے فکشن کو اظہار اور اسلوب کے اعتبار سے کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کرشن چندر کی ابتدائی تحریروں پر ادب لطیف کے نثر نگاروں کا اثر اس حد تک نمایاں ہے کہ ان کی نثر رومانی طرز فکر اور طرز اظہار کی نمائندہ معلوم ہوتی ہے، جب کہ ان کے بعد کے افسانوں اور ناولوں میں رومانیت حقیقت نگاری کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان کے بعد کے افسانے ان کی مقصدیت سے اس قدر متاثر ہیں کہ مقصد اور موضوع پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے ایسے افسانوں کی فنی اہمیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کرشن چندر نے اپنے بہت سے افسانوں میں مقصد اور موضوع کو فکشن کے فن میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ فکر و فن کو الگ الگ کر کے دیکھنا بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ کرشن چندر فن اور فکر کے ان مختلف پہلوؤں سے اور کچھ زیادہ ہو یا نہ ہو یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریریں صحیح معنوں میں ایک ایسے ادیب اور فن کار کی تحریریں ہیں جس نے اپنے اوپر فکر یا فن کی کوئی پابندی ایسی نہیں عائد کی جس کے وہ غلام ہو کر رہ گئے ہوں۔ البتہ اس رائے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ کرشن چندر نے رومانی اور رنگین انداز بیان اور اسلوب تحریر اختیار کرنے کے باوجود سماجی زندگی اور انسانی تہذیب سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔ انھوں نے کالو بھنگی اور تائی اسیری جیسے غیر معمولی کردار اردو افسانے کو دیے اور سماج اور ثقافت کے لازوال نمونے ان کرداروں کے ذریعہ اردو فکشن میں متعارف کرائے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ کرشن چندر نے ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی زندگی کے رنگا رنگ پہلو اپنی تحریروں کے ذریعے اردو فکشن کی تاریخ میں محفوظ کر دیے ہیں۔

رحمٰن نشاط

تخلیق میں موضوع اور ہئیت کی اہمیت"

شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک گفتگو

بہت پہلے شمس الرحمٰن فاروقی ایک مختصر دورے پر آئے تو کراچی کی ایک ادبی نشست میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس محفل میں دوران گفتگوان سے یہ سوال کیا گیا کہ تخلیق میں موضوع اور اسلوب کی کیا اہمیت ہے۔ اور اس اہمیت کا دونوں کے درمیان تناسب کیا ہے۔؟

سوال اگرچہ بہت پرانا اور متعدد بار زیر بحث آچکا تھا لیکن پھر بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اُن کا کہنا تھا کہ موضوع اور اسلوب یا ہیئت تجریدی اصطلاحیں ہیں اور ہم انہیں کنکریٹ شکل میں دیکھ کر یا چھو کر اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ نہ ہی بھرپور اور واضح انداز میں اس کی صراحت کر سکتے ہیں۔ لہذا اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ موضوع اور ہیئت CONCEPTS ہیں۔ اور آج تک کوئی ایسی علٰحدہ فاصل دریافت نہیں ہو سکی ہے جو موضوع اور ہئیت کو علٰحدہ کر سکے اور نہ ہی کوئی آج تک انھیں الگ الگ کر سکا ہے۔ بلکہ بعض افراد تو یہ انتہا پسندانہ رویہ رکھتے ہیں کہ موضوع ہی کو ہئیت یا ہئیت ہی کو موضوع جانتے ہیں۔

جہاں تک تخلیق میں ان کی اہمیت کا سوال ہے تو میں یہ کہوں گا کہ موضوع قطعی غیر اہم ہے، تخلیق کو بڑا یا اعلیٰ اُسلوب یا ہئیت بناتا ہے۔ اس لیے کہ جو چیز موضوع کو، جس کو میں مضمون کہوں گا، قاری تک MEDIATE کرتی ہے وہ اسلوب ہے لہذا زیادہ اہم اسلوب ہوا نہ کہ موضوع۔

موضوع ہم کتنا ہی بڑا کیوں نہ لیں، لیکن اگر اسلوب کمزور ہے تو تخلیق بھی کمزور ہوگی اور بڑا موضوع اس تخلیق کو اہم یا بڑا بنانے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکے گا۔

بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ موضوع کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔ ہر موضوع کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں بیان ہو چکا ہوتا ہے۔ نئے موضوعات کہاں سے آئیں گے۔ یقیناً ہم کہی ہوئی باتوں ہی کو دہرائیں گے۔ لیکن اپنے اسلوب اور اپنے انداز میں

انھیں ایک انفرادیت اور تازگی دیں گے۔ اور یہی اسلوب یا انداز نہ صرف یہ کہ تخلیق کا درجہ متعین کرتا ہے بلکہ تخلیق کار کی صلاحیت اور ہنر مندی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اگر موضوع ہی تخلیق کو بڑا بناتا تو پھر سارے مسائل ہی حل ہوجاتے۔ نہ تنقید کی ضرورت پیش آتی، نہ کوئی اور مسئلہ درپیش ہوتا۔ ہم پہلے سے موضوعات کی درجہ بندی کرلیتے کہ یہ بڑے موضوعات ہیں، یہ درمیانے ہیں اور یہ چھوٹے یا اعلیٰ اور ادنیٰ موضوع اور پھر اسی اعتبار سے ہم تخلیق کی بھی درجہ بندی کر لیتے جو بڑے موضوعات پر لکھ رہا ہے وہ بڑا تخلیق کار ہے، جو درمیانے موضوعات پر قلم اُٹھا رہا ہے وہ درمیانے درجہ کا شاعر یا نثر نگار ہے اور جو چھوٹے موضوعات پر طبع آزمائی کر رہا ہے وہ چھوٹا ادیب ہے۔ چاہے لکھ وہ کیسا بھی رہا ہو۔ موضوع کا اعلیٰ یا ادنیٰ ہونا اس کا درجہ تعین کر دیتا ہے۔ پھر تو بس موضوعات کی درجہ بندی ہی کا مسئلہ رہتا ہے۔

مثال کے لیے میں یہاں تین حوالے دوں گا۔ "بلّی" کے موضوع پر میر کی ایک طویل مثنوی ہے۔ اِسی موضوع پر بادلیئر کی بھی ایک نظم ہے اور پھر ہمارے سامنے ایلیٹ کی کیٹ سیریز CAT SERIES ہے۔ ان تینوں تخلیقات میں موضوع بلی ہی ہے لیکن اسلوب ان تینوں تخلیقات کو ایک دوسرے سے ممیز و ممتاز کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان تخلیقات کا موضوع بلی نہیں بلکہ تنہائی کا کرب، محبت، انسانی و اخلاقی اقدار وغیرہ ہیں اور یہ کہ جو موضوعات انسانی اقدار اور تقدیر کی المناکیوں کا انکشاف کرتے ہیں بڑے موضوعات ہیں اور تخلیق کو بڑا بناتے ہیں۔

میں اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں کہ اپنے اختلاف کی حمایت میں نسبتی، میر، درد اور مومن کے ایک ایک ایسے شعر کی طرف اشارہ کروں گا جس کا موضوع فرد کی پریشانی، خراب و خستہ حالت اور بے چارگی ہے، لیکن موضوع کی یکسانیت اور تکرار کے باوجود ہر شعر اپنا ایک انداز رکھتا ہے۔ اور یہ فرق یقیناً موضوع کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلوب کی بناد پر ہے۔

ہمارے ہاں شعر فہمی اور شعر سے حظ اُٹھانے کے لیے شعر میں مختلف اوصاف کی موجودگی ضروری قرار دی جاتی ہے مثلاً معنی آفرینی، شور انگیزی، کیفیت، ندرتِ بیان وغیرہ۔ یہ سب اوصاف در حقیقت اسلوب ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔

دراصل آرٹ کے بارے میں افلاطون کا یہ نظریہ کہ "آرٹ اور بالخصوص شاعری وہ اچھی ہے جس کا تعلق انسانی حیات کے ولولوں سے ہو، اس قدر گمبھیر اور متاثر کن تھا کہ ہم آج تک اس کے اثر سے نہیں نکل سکے ہیں۔ ادب میں ساری الجھن (CONFUSION) افلاطون پرستی کی بنا پر ہے۔ اگرچہ ارسطو نے افلاطون کے اس جال کو توڑنے کی بہت کوشش کی لیکن بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا اور آخر تھک ہار کر SYMBOLISTS کو بھی یہ کہنا پڑا کہ

"IT IS NOT ART THAT IMMITATES NATURE BUT IT IS NATURE THAT IMMITATES ART"

لہٰذا اس تمام گفتگو کی روشنی میں مجھے یہ کہنے دیجیے کہ تخلیق میں ہم موضوع اور اسلوب کو نہ تو الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی موضوع کو اسلوب پر فوقیت دے سکتے ہیں۔ بلکہ میرے خیال میں تو یہ بحث ہی بیکار ہے کہ موضوع زیادہ اہم ہے یا اسلوب اور ہیئت۔!"

شمس الرحمٰن فاروقی کی گفتگو سے تھوڑا سا گریز کرتے ہوئے میں یہاں اپنا ایک نقطۂ نظر بھی بیان کرنا چاہوں گا۔ عرض یہ ہے کہ موضوع اور اسلوب، کسی بھی تخلیق کے دو اہم عناصر ہیں، میں یہاں ایک تیسرے عنصر کی بھی نشاندہی کروں گا اور وہ ہے کسی موضوع پر شاعر یا نثر نگار کا نقطۂ نظر، فکر یا زاویہ نگاہ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ تو موضوع نہ ہی اسلوب بلکہ تخلیق کار کے زاویہ نگاہ اور فکر ہی تخلیق کو بڑا بناتے ہیں۔ موضوع چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو بڑا یا چھوٹا۔ بلکہ میں یہاں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب

سے اتفاق کروں گا کہ موضوع کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا اور نہ ہی تخلیق کو بڑا یا چھوٹا بناتا ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو وہ موضوع کے لیے ایک پیرایۂ اظہار ہے۔ لیکن ہم تخلیق کا درجہ متعین کرتے وقت موضوع اور اسلوب کے علاوہ جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ تخلیق کار کا زاویۂ نگاہ اور فکر ہے۔

یعنی شاعر یا نثر نگار نے کس پر کہا، کیسے کہا اور کیا کہا؟ یہاں "کیا کہا" ہمارے لیے زیادہ اہم ہوتا ہے کیوں کہ یہی کسی تخلیق کار کے شعور، ذہنی رسائی اور فکر کا پتا دے کر اس کا اور اس کی تخلیق کا درجہ متعین کرتا ہے۔

مثلاً میں یہاں ایک بہت عام اور بے شمار بار کے موضوع "عشق" کا ذکر کروں گا شاید ہی کوئی شاعر یا نثر نگار ہوگا جس نے کسی نہ کسی طور اس موضوع کو نہ برتا ہو۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر شاعر یا نثر نگار کا عشق کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر اور اپنا زاویہ نگاہ ہے۔ (یہاں اشعار نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں)

شعر میں بھی معنی آفرینی، کیفیت اور ندرت بیان جیسے اوصاف کو اسلوب کا نام دیا گیا ہے اور اچھے شعر کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے تو یہ اوصاف بھی ہم پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر کے ہمیں ایک روحانی مسرت سے تو ہمکنار کر سکتے ہیں لیکن ذہنی یا فکری سطح پر کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ یہ کردار تخلیق کار کی فکر ادا کرتی ہے یعنی دیکھنے پرکھنے برتنے اور محسوس کرنے کا اس کا اپنا زاویہ نگاہ یا انداز نظر۔ یہاں میں ایک اور بہت سادہ اور واضح مثال پیش کروں گا یہ مثال "تاج محل" پر دو مشہور نظموں کی ہے۔ ایک شاعر کا خیال ہے

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

دوسرے تخلیق کار کا خیال ہے

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

دونوں تخلیقات کا موضوع "تاج محل" ہے اور دونوں کا پیرایہ اظہار یا اسلوب نظم ہے۔ اس پیرایہ اظہار میں تخلیق کاروں کی فنی مہارت یا شاعرانہ صلاحیت اپنی جگہ لیکن جو چیز ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہے وہ تخلیق کاروں کا تاج محل کے بارے میں اپنا اپنا اندازِ نظر ہے۔

لیکن تخلیق میں ان تین عناصر کے علاوہ ایک چوتھا عنصر بھی کار فرما ہے اور وہ ہے اس کا تاثر۔ یعنی پڑھنے یا سُننے والا اس سے کیا تاثر قبول کرتا ہے یا اس کی کس طرح تفہیم کرتا ہے مختلف افراد پر ایک ہی شعر یا ایک ہی افسانہ کا تاثر بالکل مختلف ہوتا ہے اور ہر پڑھنے والا اپنے اپنے انداز میں اس تخلیق کی تفہیم کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موضوع، اسلوب اور فکر کے علاوہ کوئی اور عنصر بھی ایسا ہے جو تخلیق کے پورے سفر یعنی خلق ہونے کے مختلف مراحل سے گزر کر پڑھے جانے تک اپنا ایک کردار ادا کرتا ہے، اور دیگر تین عناصر کی طرح یہ بھی چونکہ ABSTRACT CONCEPT ہے لہٰذا اس کو بھی واضح کرنا مشکل ہے۔ البتہ دیگر تین عناصر کی طرح اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں چند سطور کا مقصد اختلاف رائے کرنا نہیں بلکہ گفتگو کو آگے بڑھانا اور ادب جیسے گمبھیر موضوع کی مختلف جہتوں کو سمجھنا اور اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے، لہٰذا ان سطور کو تفہیمی تغذیہ (FOOD FOR THOUGHT) کے طور پر لیتے ہوئے مزید گفتگو کی جائے۔

یک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا
۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر
۲٫۲۵ روپے
فی یونٹ منافع کا اعلان
اپنے یونٹ یافتگان میں ۳٫۱ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔
سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔
یونٹ داروں کے لیے فوائد
سال خریداری | آغاز سال پر قیمت | منافع | گزشتہ قیمت پر اضافہ | کل یافت | فی صد
۱۹۹۱ | ۱۲٫۵۰ | ۲٫۲۵ | ۰٫۵۰ | ۲٫۷۵ | ۲۲٪
۱۹۹۰ | ۱۲٫۲۰ | ۲٫۲۵ | ۰٫۸۰ | ۳٫۰۵ | ۲۵٪
۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت
خرید کردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ

مصطفیٰ کھوڑو اور میش کمار

سندھی ادب میں جدید رجحانات

علم ادب کسے کہتے ہیں؟ کون سی کتابیں ادب میں آتی ہیں اور کون سی کتابیں اُس کے دائرے سے باہر ہیں؟ یہ کافی اہم سوالات ہیں جن پر بہت سے ادیبوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بقول "آرنولڈ مسکورس" "جن کتابوں سے معلومات حاصل ہوں انہیں ادبی کتابیں کہا جاتا ہے۔" "مہلم" نے بھی اس کی تائید کی ہے لیکن فرض کریں کہ اگر اس بات کو تسلیم بھی کیا جائے تو پھر قانون اور طب کی کتابوں کو بھی ادبی کتابیں ماننا پڑے گا جب کہ بہت سے مفکروں کی رائے میں ایسی کتابیں ادب میں شامل نہیں کی جاسکتیں اور اس لیے عام معلوماتی کتابوں کو ادب میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

"ایمرسن" کے کہنے کے مطابق "ادب" انسان کی وہ کوشش ہے جس سے وہ اپنے عیبوں اور حالتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ "جان میری" اپنی کتاب "ان دی اسٹڈی آف لٹریچر" میں کہتا ہے کہ ادب میں وہ سب کتابیں آجاتی ہیں جن میں صداقت، انسانی جذبات، کشادہ دلی اور سنجیدگی کے اچھے نمونے سموئے گئے ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی پیدائش اور ابتدا کیسے ہوئی؟

اس بارے میں سب سے پہلے یونانی فلسفی ارسطو نے اپنی مشہور کتاب "شعریات" میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اُس نے اپنی اس کتاب میں ہر قسم کے شعر کی تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"سب لطیف فن فطرت کے محرکات ہیں، انسان کو نقل کرنے میں مزا آتا ہے اور اسی لیے کوئی بھی چیز اُس پہ اثر کرتی ہے تو وہ اُس کی نقل کر کے دوسروں کو سناتا ہے اور یہی چیز ادب ہے۔"

یونانی فلسفیوں میں افلاطون وہ پہلا شخص تھا جس نے ادب کی تشریح اپنی کتاب "جمہوریت" میں کی ہے۔ اُس نے اپنا جو خیالی شہر بسایا تھا اُس میں اُس نے شاعروں اور ادیبوں کو جگہ نہیں دی۔ اُس کا خیال تھا کہ "شاعر اور ادیب اخلاق کے دشمن ہوتے ہیں۔" اُس کا شاعروں اور ادیبوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے خیال کے مطابق "ادب ایک دھوکہ ہے" اُس کے خیال میں علمِ ادب وہ ہے جس سے اخلاق اور صداقت کی نشوونما ہو۔ کسی بھی ادبی تصنیف کو دیکھا جائے تو اُس میں واقعات کو صداقت سے اس طرح جوڑا گیا ہے جو زندگی کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعری اور ڈرامہ نگاری کو افلاطون نے ادب میں شامل نہیں کیا ہے اور ان کی خامیاں اُجاگر کر کے ان پر سخت نکتہ چینی کی ہے افلاطون کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارسطو نے کہا ہے کہ ادب، زندگی کا نقش ہے، ہو بہو تصویر نہیں، اُس کے خیال کے مطابق ادبی نقالی، عکاسی نہیں بلکہ نقاشی ہے جس میں کاریگر کو زیادہ آزادی ہوتی ہے۔

"سندھی ادب میں نظم کا نیا پن"

بنیادی طور پر ہر دور کی شاعری اس دور کے لیے جدید ہوتی ہے شاعروں کے کسی بھی گروہ یا طبقے کو اس سے خارج نہیں کیا جاسکتا لیکن کوئی گروہ کسی وجہ سے اس نئے تجربے سے ٹوٹ کر الگ جا کھڑا ہوتا ہے عام اصطلاح میں سندھی کا ہر زندہ شاعر آج نیا اور جدید ہے۔ لیکن اگر کوئی گروہ کسی وجہ سے ان نئے تجربوں سے خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے تو اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ بہر حال جدید سندھی شاعری نے ترقی قیام پاکستان کے بعد کی ہے اگرچہ اس کا بیج بہت پہلے بویا جا چکا تھا۔

اب ہم ان چند صنفوں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں جو سندھی زبان کی جدید شاعری میں دیگر زبانوں سے داخل ہوئیں یا پھر نئے سرے سے زندہ ہوئیں۔ جدید سندھی شاعری کی جو پرانی صنفیں نئے رنگ میں نمودار ہوئیں وہ ہیں دوہے، بیت اور وائی جب کہ دیگر زبانوں سے سندھی میں متعارف ہونے والی نئی صنفوں میں آزاد نظم، سانیٹ، ترائیل، ہائیکو اور گیت شامل ہیں۔

آزاد نظم۔ سندھی ادب میں اس صنف کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ شروع میں تو بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس صنف کی مخالفت کی اور اسے نظم معرٰی سے مشابہت دی لیکن مخالفت کے باوجود بھی جدید سندھی شاعری میں اس صنف نے بہت نام کمایا ہے۔ اس صنف کا بانی فرانسیسی زبان کا ایک امریکی شاعر گرنفن تھا۔ سندھی زبان میں بہت اعلیٰ معیار کی آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں شیخ ایاز کی "ہرن ہٹھیلا"، "ازل جو پراسرار پریں"، گوردھن محبوبانی کی "سینوٹوریم جی پہریں، رات" امداد حسنی کی "آخری فیصلو"، "غم"، "سگن آہو جا کی" "کانگ لوے تھو"، بردو سندھی کی "ساون جی ہیکلی گگری"، شیخ ایاز ہی کی "داستان غم نہ چھیڑ"، "زماں و مکاں"، شمشیر الحیدری کی "مسرت جی منزل" اور "ہم سفر" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس صنف میں سراج، نارائن شیام، ارجن شاد، تاج بلوچ، سروپ چندر شاد، پروانہ بھٹی، موہن کلپنا، محمود زمینی، تنویر عباسی، قمر شہباز، واسدیو نرمل، سحر امداد اور پشپا ولبھ نے کافی نام پیدا کیا ہے۔

سانیٹ: یہ صنف سندھی شاعری میں یورپ سے آئی ہے شیکسپیئر اور دیگر پرانے شعرا کے مطالعے کے بعد کافی سندھی شعرا نے اس صنف میں قلم آزمائی کی ہے۔ سانیٹ میں چودہ مصرعے ہوتے ہیں ہیئت کے لحاظ سے سانیٹ کی دو قسمیں ہوتی ہیں لیکن سندھی شاعری میں ایک ہی قسم کے سانیٹ لکھے گئے ہیں اس صنف میں موضوع کی قید نہیں ہوتی۔ جدید سندھی شاعروں نے اس صنف میں ہر موضوع پر لکھا ہے۔ لیکن اس صنف کو کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی شیخ ایاز، نارائن شیام، تنویر عباسی، امداد حسینی، الطاف عباسی، انور پیرزادہ اور ایاز گل کے علاوہ کچھ اور شعرا ایک ادھ سانیٹ لکھتے رہتے ہیں۔

ترائیل: یہ فرانسیسی صنف سخن ہے۔ اس کا اصل نام (TROILET) ہے۔ اس میں کل آٹھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس صنف میں کئی شاعروں نے قلم آزمائی کی ہے جن میں نارائن شیام، امداد حسینی اور ایاز گل وغیرہ شامل ہیں لیکن مقبولیت کے لحاظ سے یہ صنف بھی سانیٹ جتنی ہی چل سکی۔

ہائیکو: یہ صنف جاپانی شاعری سے آئی ہے اس میں تین چھوٹے چھوٹے مصرعے ہوتے ہیں۔ اور اس میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تین مصرعوں میں شاعر اپنے خیال کی ادائیگی پوری وضاحت سے کرتا ہے۔ اس صنف میں جمالیاتی شاعری بہت زیادہ ہوئی ہے۔ جذباتی کیفیت کو مختصر لفظوں میں پیش کرنے کے لیے یہ صنف بہت موزوں ہے اس صنف میں شیخ ایاز، الطاف عباسی، امداد حسینی، استاد بخاری اور زیب بھٹی کے علاوہ بہت سے نئے شاعروں نے بھی لکھا ہے۔ اس صنف سے دو اور صنفیں بھی نکلی ہیں جنھیں "چونک" اور "پنجڑا" کے نام دیے گئے ہیں۔

گیت: یہ صنف ہندی شاعری سے آئی ہے۔ سندھی شاعری میں نیا پن آنے سے قبل بھی اس صنف میں لکھا گیا لیکن اس وقت اسے اتنا سراہا نہیں گیا کیوں کہ اس وقت اس میں اتنا ردِم نہیں تھا۔ گیت ہمیشہ گانے کے لیے ہوتا ہے۔ گیت میں خیالات سے زیادہ جذبات کے اظہار کی اہمیت ہوتی ہے گیت میں سادہ خیالات اور جذباتیت بہت ہوتی ہے کیوں کہ ہندی شاعری میں محبت کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے شیخ ایاز، دو سندھی، تنویر عباسی، منظور نقوی، سروپ چند شاد، تاج جویو اور دوسروں نے کافی گیت لکھے ہیں۔

ناول: ادب میں نئی طرز کے قصے کو ناول کہتے ہیں۔ ناول میں قصے کا بیان ہوتا ہے ایک ناول بلاشبہ عوام کے جذبات اور خیالات کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس قوم کی زندگی کی تفسیر اور تاریخ کے مثل ہوتا ہے سماجی اور تاریخی ناول اس بات کا واضح ثبوت ہوتے ہیں۔ ناول کی صنف میں ہمیں کئی سندھی ادیب اونچے معیار پر نظر آتے ہیں جن میں مرزا قلیچ بیگ، محمد عثمان ڈیپلائی، ڈاکٹر قاضی خلیق مورائی، ڈاکٹر گربخشانی، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، قاضی فیض محمد مورائی، آغا سلیم، علی بابا، سراج الحق، ڈاکٹر نجم عباسی، طارق عالم ابڑو، ڈاکٹر محمد خان سمیجو اور دوسرے شامل ہیں۔

ڈرامہ نگاری: ڈرامہ ایک فطری عمل ہے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور جذبات کو ابھارنے کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ارسطو کا قول ہے کہ نقالی انسانی جبلتوں میں شامل ہے اور اس کی ابتداً اوائل عمری سے ہوتی ہے اور اس عمل کا انتہائی عروج ڈرامہ ہے۔ ڈرامے سے ادبیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ڈرامہ ادب کی ابتدائی منزل ہے ڈرامہ اصل میں لاطینی زبان کا لفظ ہے جو دو قسموں میں لکھا جاتا ہے۔ کامیڈی اور ٹریجڈی۔ اس صنف کو اسٹیج، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے صحیح معنوں میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ سندھی زبان کے معروف ڈرامہ نگاروں میں مرزا قلیچ بیگ، کشن چند بے وس، منگھارام، محمد عثمان ڈیپلائی، منظور نقوی، ممتاز مرزا، آغا سلیم، عبدالقادر جونیجو، نورالہدیٰ شاہ، علی بابا، چنا شبیر ناز، قاضی خادم اور طارق عالم وغیرہ کا نام بہت اچھے انداز میں لیا جاتا ہے۔

افسانہ: اختصار افسانے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ افسانہ میں فن کی نزاکت بھی نظر آتی ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ افسانہ قاری کے جذبات پر بھی انتہائی تیزی سے اثر انداز ہوتا ہے امریکی افسانہ نگار "ایڈگرالین پو" کہتے ہیں کہ نثر کی وہ تحریر جسے قاری ایک ہی نشست میں پڑھ لے اسے افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ سندھی زبان کے مشہور ادیبوں میں امر جلیل، حمید سندھی، جمال ابڑو، غلام ربانی، شیخ حفیظ، سراج، رشید بھٹی، مانک ایاز قادری، آغا سلیم، نسیم کھرل، نجم عباسی، طارق اشرف، غلام نبی مغل، مشتاق شورو، خیرالنسا جعفری، زینت چنا، شمیرہ زریں نے سندھی ادب کو بہترین افسانے دیے ہیں۔

سفرنامہ: سندھی ادب میں اس صنف میں بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دیگر دیسوں کے رہنے والوں کے رہن سہن، ریتوں، رسموں، تاریخ و سیاست وغیرہ کی معلومات ان کتابوں میں اچھے انداز میں دی گئی ہیں۔ اس صنف میں ۵۰ء میں آغا بدر الدین کا "مسافر حجاز"، ۱۹۶۹ء میں قاضی عبدالمجید عابد کا "سفر یورپ جی ڈائری" ۷۳ء میں ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کا "ماؤ جے ملک میں"، ۸۹ء میں "ونڈسر محل جو مسافر" اور ۷۶ء میں ڈاکٹر سلیمان شیخ کا "سون ورنی دھرتی" سندھی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ ان کے علاوہ اس صنف میں لکھنے والوں میں میراں محمد شاہ، علی محمد راشدی، عنایت بلوچ، شیخ عزیز، فہمیدہ حسین، نصیر مرزا اور الطاف شیخ شامل ہیں۔ سندھی ادب میں سب سے زیادہ سفر نامے الطاف شیخ نے لکھے ہیں ان کو اگر سندھی ادب میں سفرناموں کا "سرتاج" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مزاح نگاری: سندھی ادب میں اس صنف میں بھی بہت لکھا گیا ہے سندھی ادب کے اچھے مزاح نگاروں میں محمد حسین کروڑپتی، قلب علی نکلو، نور عباسی، رشید بھٹی، علی احمد بروہی اور عبدالحلیم کے نام شامل ہیں۔

عربی نظم
(انگریزی ترجمہ)

یوسف الخال / نورالحسن جعفری

بڑھاپا

یوسف الخال ۱۹۱۶ء میں طرابلس میں پیدا ہوئے اور امریکن یونیورسٹی بیروت میں تعلیم پائی U.N سیکریٹریٹ نیویارک میں کام کیا۔

۱۹۵۹ء میں "مجلات شاعری" کے ایڈیٹر ہوئے جو عربی شاعری کا سب سے اہم جریدہ شمار ہوتا ہے۔ پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

ہم اپنے چہروں سے سرد لہروں کو پونچھ دیتے ہیں
اور اپنے آپ کو بہار کی کہانی سناتے ہیں:
کس طرح صبا مسکراتی ہے
چڑیاں چہچہاتی ہیں
درخت ناچتے ہیں

کس طرح بیج اپنی جڑیں زمین میں پھیلاتا ہے
اور پھل دیتا ہے
ہم خود کو خزاں کی کہانی سناتے ہیں
جب پرچھائیاں خمیدہ
اور شامیں طویل ہو جاتی ہیں
پھر دفعتاً ایک ستارہ نمودار ہوتا ہے
یا چاند چمکتا ہے

اور جب باڑھ گر جاتی ہے
تو کھیت حد نظر تک برہنہ نظر آتے ہیں
ہم خود کو موسم گرما کی کہانی سناتے ہیں
جو ایک گرم لے کے پروں پر سوار
یا پھدکتی ہوئی چڑیوں کی طرح
ہمارے پاس آتی ہے
جب ہم فصل جمع کر رہے ہوتے ہیں
یا دور ادھر اُدھر ٹھہرے ہوئے بادلوں کو یاد کرتے ہیں
ہم اپنے چہروں سے سرد لہروں کو پونچھ لیتے ہیں
اور خود کو موسموں کی کہانی سناتے ہیں
لیکن وہ لہریں ہماری نسوں میں اور گہری اتر کر غائب ہو جاتی ہیں۔
یہ ہمارا خیال ہے کہ وہ غائب ہو جاتی ہیں
وہ یکایک ظاہر ہوتی ہیں
ادھر بالوں کی سفیدی میں
ادھر خشک لب کی صورت میں

روسوا عبدالعزیز خالد

کتابِ فطرت

کیا تمھیں کتابوں سے معلومات اخذ کرنے کا شوق ہے؟ اس کے لیے کتنا مطالعہ درکار ہوگا؟ تم کتنی زبانیں سیکھو گے؟ کتنے کتب خانے کھنگالو گے؟ اور کتابوں کے انتخاب میں کون تمھاری مدد کرے گا؟

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدا نے دائمی عذاب کے ڈراوے پر مجھے ایک مُتَبَحرِ عالم بننے کا حکم دیا ہے۔ سو، میں اپنی کتابوں کو بند کر دیتا ہوں۔

فطرت کی کتاب ہر آنکھ کے لیے کُھلی ہے۔ اس اعلیٰ اور حیرت انگیز نسخے سے میں اس کے الوہی مصنف کی ستائش کرنا سیکھتا ہوں۔

کوئی مُتَنَفِّس بھی اس کتاب سے بے توجہی برتنے میں قابلِ معافی نہیں۔ یہ ایک عالمگیر زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ جو ساری انسانیت کے لیے قابلِ فہم ہے

شکیل فاروقی / ادیب سہیل

میری فاختہ، میرا پیار

حُسن کی ملکہ
دلکشی کی شہزادی
شیریں، دل دار، معین اور پُرجوش

میری رہنمائی قطب ستارہ کی طرح کرتی ہے
زندگی کی اتھاہ تاریکی میں

آرام دہ، تسلی بخش
حقیقت میں ایک نجات دہندہ
میری فاختہ
میرا پیار

قومی زبان (٦١) اپریل ۱۹۹۳ء

ملیالم کہانی

ایس۔ کے۔ پوٹیکر / شہریار احمد

ندی کے کنارے

ایک چھوٹی سی ندی نے ایک چٹیل ٹیلے کے قدموں کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس طرح وہ ایک وسیع بدہیت اخروٹ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ندی کے کنارے، جنگلی تناور درختوں کے درمیان چھپے تھے جس کی شاخیں کافی جھک کر زمیں بوس ہوگئی تھیں۔ بیلیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے الجھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ندی کے کنارے کو اس طرح ڈھانک لیا تھا کہ دن کے اوقات میں بھی ایک خوفناک تاریکی کا احساس ہوتا تھا۔

ندی کے درمیان دائیں جانب جہاں پانی گہرا تھا وہاں ایک بہت بڑا پتھر کسی حد تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پرانے لوگ اسے پھانسی کا پتھر کہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اگلے زمانے میں سزا یافتہ مجرموں کے سر اس پر قلم کیے جاتے تھے۔ عام طور پر کوئی بھی آدمی وہاں نہیں نہاتا تھا اس لیے کہ اس جگہ پانی کا رنگ مختلف تھا۔

پہاڑ کے نیچے ندی کے پاٹ سے ملحق ایک قسم کا دیسی کھجور کا درخت تھا جسے "اینتھل پانا" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور اس کی پھننگ پر ایک خاص قسم کا سرخ دہکتا ہوا جوز تھا۔ اس اینتھل جوز سے جو مادہ نکلتا وہ ایک حیرت انگیز اور نشہ آور خوشبو ہر چہار طرف بکھیر جاتا تھا۔ کھجور کے قریب ہی ایک تنہا کامنی کا درخت تھا جس کے ایک طرف کا حصّہ ایک مفلوج زدہ عضو کی طرح خشک اور اینٹھا ہوا تھا۔ اس کی جھولتی شاخوں میں کچھ پرانی تھیلیاں لٹکی تھیں جو ٹاٹ جیسی کسی شے میں باندھ دی گئی تھیں اور جن کا عکس پانی میں آتا تھا۔ وہ گھریلو مویشیوں سے لیے گئے نال تھے جو خاص طور پر بھیڑوں بکریوں اور گائیوں، سے بچے دیتے وقت حاصل کیے گئے تھے۔ نزدیک ہی جہاں مٹی کو نمی کھا چکی تھی۔ وہاں ایک کوڑھ جیسی جھاڑی لٹکی ہوئی تھی شاید کہ وہ ایک ناپید درخت کے جڑ کی نشانیاں تھیں۔ وہاں ایک بہت بڑا سرخ ناگ پھنی اپنے چاٹے گئے گودے کے ساتھ ایک گھوڑے کی نحیف پسلیوں کے ڈھانچے کی طرح کھڑا تھا اور اس کے ارد گرد جنگلی گل تسبیح کا جھنڈ تھا جو اس طرح دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی جگہ جھاڑیوں کے بیچ ایک کٹہل کا درخت تھا، جو اپنا قد بلند کیے آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔

ایک چھوٹی خشک نہر اسی جگہ ندی سے ملتی تھی جہاں گہرے پانی کا ذخیرہ تھا اور وہیں کشتی کا چوپڑ تھا۔

دوپہر کا وقت تھا، موسم گرما کا سورج سراپا آگ ہوگیا تھا اور ندی کے کنارے کی ریت اتنی گرم تھی کہ اس کا چھونا محال تھا۔ مادھوی اماں نے اپنے بیٹے کو نہلا کر اور اس کے جسم کو پونچھ کر سکھایا، اس کے بال کو جھاڑ کر درست کیا اور ایک بار پھر اس

کے چہرے کی مالش کی اس نے اس کو چھوٹی سی سلک کی چڈی پہنائی جسے کنا کم کہتے ہیں۔ جو لمبی اور تنگ تھی، کپڑے کا وہ ٹکڑا اس کے مخصوص عضو اور پیچھے کے حصے کو چھپائے ہوئے تھا اور اسے ایک ڈوری سے اس کی کمر کے چاروں طرف مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ چھ سالہ لڑکا جو سعادت مندی کی تصویر دکھائی دے رہا تھا ایک ساگوان کے پیڑ کے سایہ سے گزرتا ہوا چٹان تک گیا اور اپنے پیروں کو پھیلا کر وہاں بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ گزرے تھے کہ اس کے ہاتھ چلنے لگے اور وہ حرکت میں آگیا۔ بچپن پارے جیسا ہوتا ہے جس پر کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔

اس لڑکے کی کھلی آنکھیں کسی ایک جگہ نہ ٹھہر کر جگہ جگہ بھٹک رہی تھیں۔ اپنی انگلیوں کو گن کر اس نے اطمینان کر لیا کہ اس کی تمام انگلیاں سالم ہیں اس نے اپنی شہادت کی انگلی کو پھیلا کر اپنی ناک، پیشانی اور ٹھوڑی کی پیمائش کی پھر اس نے ناک کے ایک سوراخ کو بند کر کے دوسرے سوراخ سے آواز پیدا کی اور بھنبھنایا۔ اسی طرح وہ اپنی ناک کو کچھ دیر تک بجاتا رہا اور پھر رک گیا اپنی دونوں آنکھوں کے اوپری حصے کو دبایا اور درختوں اور جھاڑیوں کو دو دو دیکھ کر وہ خوش ہوا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔

اس نے اپنی اماں سے پوچھا اماں! کیا میں نہر میں باندھ بنانے کا کھیل کھیل سکتا ہوں؟

اس کی ماں نے کہا نہیں! کیچڑ سے نہ کھیلو۔ اُنّی وہاں خاموش بیٹھے رہو اور دیکھو انگوٹھی کھو نہ دینا!

اُنّی نے رونی صورت بنالی۔

اس نے اپنی گود میں پڑی انگوٹھی کو اٹھالیا۔ اس سونے کی انگوٹھی میں ایک سرخ قیمتی پتھر جڑا تھا جسے اس کی ماں نے اسے رکھنے کو دیا تھا اور خود نہانے چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی ہر ایک انگلی میں اسے پہننے کی کوشش کی آخر میں اس نے اسے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے میں پہنا جس میں وہ ٹھیک آئی یہ سوچے بغیر کہ اس کے بعد اسے کیا کرنا ہے اس نے اپنی آنکھیں اچھی طرح موند لیں اور اپنے بازوؤں کو سینے پر باندھ کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی ناک کے سرے کو زبان سے چھونے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے منہ میں ہوا بھری اور سانپ کی طرح سیں سیں کرتے ہوئے اسے باہر نکال دیا۔ اس نے کچھ یوگا مشقوں کی کوشش کی جن کے متعلق اس نے سن رکھا تھا۔

اس نے اپنی ماں سے پوچھا "اماں! یہاں سورج کی تیز روشنی آرہی ہے۔ کیا میں اس بانس کے جھرمٹ میں بیٹھوں؟

مادھوی اماں نے جو اپنے خیالوں میں گم تھی اپنے کپڑے دھوتے ہوئے ہوں کہہ دیا۔

وہ لنگڑے کی نقل کرتے ہوئے اُٹھا اور اسی عالم میں چلتا ہوا بانس کے جھنڈ تک گیا۔ اب وہ اپنی ماں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

وہ نہر اس بانس کے جھنڈ کے نیچے سے گزرتی تھی۔ اس بانس کے جھنڈ میں ایک کیچڑ کا چہ بچہ تھا جس میں پانی رکا ہوا تھا اور جس میں دوپہر کے سورج کا عکس آتا تھا۔

ایک کابلی مکھی پانی کے اوپر اٹھکھیلیاں کر رہی تھی وہ پانی کی اوپری سطح پر ڈبکیاں لگاتی اور پھر ہوا میں اُڑ جاتی۔

اُنّی کی آنکھیں کابلی مکھی اور اس کی حرکتوں کی جانب ٹھہر سی گئی تھیں اس نے اپنی گردن موڑی اور دھیرے سے اُٹھنے

ہوئے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک دل لبھانے والی کابلی مکھی تھی۔ کمسن سی مکھی کی دم پر اس کی چوٹی کے رنگ کے دھبے تھے۔ اسے مکھی کو اڑانے کی ایک ترکیب معلوم تھی اس نے چند کنکریاں اٹھالیں۔
مشکل سے وہ دو قدم آگے بڑھا تھا کہ وہ مکھی جو پانی میں دیر سے کھیل رہی تھی اُڑ کر کافی دور چلی گئی اور اس کے سامنے اُگی ہوئی جنگلی گل داؤدی کی جھاڑ پر بیٹھ گئی۔
انّی نے اپنے دائیں ہاتھ کو پھیلا کر اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو ایک چمٹے کی شکل جیسا بنایا اور خاموشی سے دبے پاؤں گل داؤدی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ جھاڑی کے قریب پہنچا کہ کابلی مکھی اڑ گئی اور کہیں آس پاس رُکے بغیر مشرق کی جانب بڑھ گئی اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹا اور وہ عزم مصمم کے ساتھ اس کے پیچھے چلتا گیا۔ چونکہ اس نے کابلی مکھی کو چھوٹے جنگلی پھولوں سے لدی ہوئی ایک جھاڑی سے اڑتے دیکھ لیا تھا وہ رینگتے ہوئے اس جھاڑی کی طرف بڑھا۔ جب تک اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے مکھی نے اس پتی کو چھوڑ دیا جہاں وہ پہنچی تھی اور کنّائی کے درخت کی شاخ پر آرام کرنے کی غرض سے جا بیٹھی پھر وہ فوراً ہی درخت سے اُڑ کر خود رو گل تسبیح کے پودے کی طرف جھپٹی جو خاموشی سے عبادت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔
انّی نے کابلی مکھی کی سرکشی پر لعنت بھیجتے ہوئے اپنے ہاتھ کو اوپر اُٹھایا اور اپنے ہونٹ کاٹے اور بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں سکیڑ لیں۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ مکھی کہیں جم کر بیٹھ جائے۔ لیکن مکھی اڑتی رہی اور پھر کنّائی کے درخت پر آرام کرنے واپس چلی گئی۔
سورج کی روشنی ایک وسیع دائرے میں کٹھل کے درخت کی شاخوں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں صاف اور برہنہ سرخ پھل انیتھل کھجور کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ ناگ پھنی کا ڈھانچہ جیسا پودا اور کنّائی کے درخت سے لٹکا ہوا گچھا بھی دکھائی دے رہا تھا۔
کٹھل کے درخت کی جڑ میں ایک سوراخ میں دفعتاً تحرک پیدا ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درخت کے نیچے کی خشک پتیاں چل رہی ہوں، کراہ رہی ہوں۔ ایک کالا ناگ جو "آٹھ فٹ لمبا ناگ" کے نام سے جانا جاتا ہے، اسی سوراخ سے آہستگی سے باہر نکلا اور اپنے کو اس درخت کے تنے کی کھردری سطح کے اوپر لپیٹ کر دوسری طرف پھسل گیا۔
وہ کابلی مکھی کٹھل کے درخت سے ملے ہوئے کنّائی کے درخت پر مستقل طور پر بیٹھی تھی۔ انّی کے نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس لمحہ اس کا جسم اور دل اس درخت کی شاخ پر مرکوز تھا اس پوری کائنات میں وہ صرف اس مکھی کی سرخ دم سے باخبر تھا۔
سورج کی روشنی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح اس کے ہاتھ پر پڑ رہی تھی جب انگوٹھی کا قیمتی سرخ پتھر چمکا تب بلوری بوتاموں جیسی دو چھوٹی آنکھیں کھجور کے اوپر پھل کے نیچے چمکتی دکھائی دینے لگی۔ سانپ پھل کی خوشبو کو اپنی سانس میں کھینچ رہا تھا انگوٹھی میں لگے پتھر کے رنگ نے اس رینگنے والے جانور کو لبھا لیا تھا اس نے اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے اور اپنے سر کو اوپر اُٹھاتے ہوئے اپنے جسم میں ہوا بھری جوں ہی اس نے بل کھا کر اپنے پھن کو پھیلایا اس کا پورا جسم پھول گیا۔
اس وقت تک مکھی نے اپنی آرام گاہ کو نہیں چھوڑا تھا انّی کا بازو نیچے جاکر ناپے تولے منصوبے کے ساتھ آگے کی طرف بڑھا۔
اچانک مکھی نے اپنے پروں کو حرکت دی اور اسے زور سے پھڑپھڑایا تب وہ آہستگی سے اُڑی اور اس جگہ کے دو تین چکر لگا

کر پھر وہیں بیٹھ گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس پسندیدہ جگہ کو جو دوپہر کے سورج سے گرم تھی چھوڑنے میں ہچکچا رہی ہے۔
ناگ انگوٹھی کے سرخ پتھر کو تکتے ہوئے ساکت رہا۔
چمٹے جیسی نازک انگلیاں ہوا میں معلق جم گئی تھیں۔
انی کی انگلیاں ایک خاص مقصد کے تحت بڑھ رہی تھیں اس وقت وہ انگلیاں آگے کی طرف نہیں بڑھیں اس نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی لائی اور اب اس کا ہاتھ ایک سست دائرہ بناتے ہوئے ناگ کے منہ کی طرف دائیں جانب خط ہلالی میں مڑا۔ انی کے بازو کی حرکت کے بعد سانپ نے چمکتے ہوئے پتھر کی طرف آہستگی سے اپنے پھن کو موڑا جونہی سرخ پتھر آہستہ سے آگے کھسکا ناگ نے اپنے پھن کو پیچھے کی جانب موڑا جیسے وہ ڈسنے کو تیار ہو۔
کابلی مکھی سورج کی فسردہ سی روشنی میں شرابور تھی۔ انگلیوں اور مکھی کے درمیان ایک بال کی دوری رہ گئی تھی۔ وہ لمحہ مکمل سکوت کا تھا اور انگلیاں آنکھ کے پپوٹے کی طرح ایک دوسرے سے مل چکی تھیں۔ کابلی مکھی کی دم جو سوکھے ہوئے کھجور کے پتے کی طرح دکھائی دے رہی تھی ایک سرسراہٹ کے ساتھ انگلیوں کے درمیان آگئی جیسے ہی انی نے شور بلند کیا کابلی مکھی نے مایوسی کے عالم میں اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا اور بجلی کی طرح غائب ہو گئی، اچانک سب کچھ ختم ہو گیا۔
بدحواس ہو کر ناگ نے خود کو اسی طرح سمیٹ لیا جیسے وہ ربر کا ایسا سانپ ہو جسے جلا دیا گیا ہو، ناکامی کے عالم میں پھن سکیڑے اور زبان کو باہر نکالے اور کھسکتے ہوئے وہ درخت سے اتر گیا۔ جھلاہٹ میں اس نے کٹائی کے درخت پر گچھوں کو سونگھا اور زمین پر پھسل گیا اور پھر ناگ پھنی سے گزرتے کوڑھ زدہ دکھائی دینے والی جڑوں پر رینگتے ہوئے جنگلی گل تسبیح کے تنوں میں غائب ہو گیا۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سیرت البم

شاہ مصباح الدین شکیل
صفحات ۱۱۶ (آرٹ پیپر)
پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

یہ حسین مرقع مشہور سیرت نگار شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے مرتب کیا ہے اور پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ کی جانب سے زر کثیر صرف کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سیرت رسول ﷺ کو تحریر، تصاویر، نقشوں اور خاکوں کے ذریعہ بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہر چیز میں حسن و رعنائی اور دلکشی و زیبائش کو ملحوظ رکھا گیا ہے جس نے سیرت کے موضوع کو اور بھی مؤثر و پُرکشش بنا دیا ہے۔ مؤلف موصوف نے یہ جواہر پارے کہاں کہاں سے اور کس کس طرح جمع کیے ہیں اس کا مختصر تذکرہ پیش لفظ میں دیا گیا ہے۔ منیجنگ ڈائریکٹر میاں محمد فرید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سیرت البم" ۱۹۷۹ء سے کی جانے والی منظم اور مسلسل کوششوں کا حاصل ہے۔ اس کے مؤلف نے اس سال ساڑھے چار مہینے حجاز مقدس میں گزارے اور سیرت طیبہ کے اہم تاریخی مقامات، مکہ، مدینہ، طائف، بدر، اُحد، حدیبیہ، الحساء، خیبر، مدائن صالح وغیرہ کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا۔ ان سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ان مقامات کو تصویروں میں محفوظ کیا۔ اس کے علاوہ نادر تصاویر جمع کیں۔ خلیج کے اس کنارے دہران بحیرۂ احمر کے دوسرے ساحل جدہ تک اور اندرون حجاز ۵ ہزار میل کا سفر کیا علماء، اساتذہ اور عوام سے ملاقاتیں کیں پھر "سیرت البم" ترتیب دیا اس میں تحریروں اور تصویروں کا ایک خوبصورت امتزاج ہے جس سے سیرت طیبہ کے اکثر گوشے خود بخود روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

ان بیش قیمت جواہر پاروں کو جس سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے اُس کی صحیح داد دینا بھی مشکل ہے۔ مختصر لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف علام نے یہ ایک ایسا نادر تحفہ قوم کو دیا ہے جس کی مثال اردو زبان و ادب میں دکھائی نہیں دیتی۔

سیرت طیبہ کو مکمل شکل میں پیش کرنے کے لیے اس کی ابتدا ہبوط آدم سے کی گئی ہے۔ کعبہ کی تعمیر اوّل ملائکہ کے ہاتھوں بتائی گئی ہے۔ اس کے بعد نو مرتبہ پھر انسانی ہاتھوں سے جو تعمیر ہوتی رہی اُس کی تفصیل دی گئی ہے۔ پھر چونکہ اسلام یا دین حنیف کی باقاعدہ شروعات حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ہوئی اور انبیائے بنی اسرائیل اور نبی کریم ﷺ کا نسلی اور نسبی تعلق اُن ہی سے ہے اس لیے اُن کے مولد و وطن، اُن کے ماحول، اُن کی پیغمبرانہ بصیرت اور انداز تبلیغ کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ، حجرۂ اسود، چاہ زمزم وغیرہ پر نہایت تفصیل سے لکھا گیا ہے اور اُن بہت سی چیزوں کی وجہ

تسمیہ بتائی گئی ہے جس کو جاننے کے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی خواہشمند رہتے ہیں۔ غرض اس کتاب میں اتنی خوبیاں جمع کی گئی ہیں کہ اُن سب کا احاطہ کرنا اور اُن کو بیان کرنا مشکل ہے۔ بقول شاعر:

داماںِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

پی۔ ایس۔ او کے ارباب کار خصوصاً محترم شاہ مصباح الدّین شکیل کے اس نیک کام کا اجر تو انھیں بارگاہ خداوندی سے ہی ملے گا ناچیز تبصرہ نگار تو اُن کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تحسین ہی پیش کر سکتا ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

معاونِ تواریخ

محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی

صفحات ۴۷۵ قیمت -/۱۵۰ روپے

۱۰/جی، بلاک نمبر ۲، پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی کراچی

فن تاریخ گوئی پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔ کتاب ہذا کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بھی کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت مفید اور معلومات افزا تھی۔ اب مؤلف موصوف نے نظر ثانی کے بعد اس میں جو ترامیم اور اضافے کیے ہیں ان سے اس میں بے حد جلا پیدا ہو گئی ہے۔

دیگر کئی علوم کی طرح فن تاریخ گوئی بھی مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ کسی زبان میں بھی اس کا کوئی نمونہ دکھائی نہیں دیا۔ یہ فن دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مفید بھی ہے لیکن جن حضرات نے اس میں مہارت حاصل کر لی ہے وہ اس دشوار گزار مرحلہ کو اس آسانی سے طے کر جاتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے اس عمل پر کرامت کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ مسلمان دو موقعوں پر اس کو خصوصیت سے کام میں لاتے ہیں۔ ایک تو بچے کی پیدائش کے وقت اُس کا تاریخی نام رکھ کر اُس کا سنہ ولادت محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ دوسرے انتقال پر مادہ تاریخ وفات سے مرنے کا سنہ محفوظ رہ جاتا ہے اور دونوں سنوں کے درمیان مختلف واقعات درج کر کے اس کی سوانح عمری مرتب کر لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے اہم واقعات، صلح وجنگ اور عمارتوں کی تعمیر کے تاریخی مادے نکال کر آئندہ نسلوں کے لیے ان کے زمانوں کا بھی ریکارڈ تیار کر دیا جاتا ہے۔ یہ تاریخوں کے جاننے کا ایک ایسا ذریعہ اور طریقہ ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اچھے اچھے مورخین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تاریخ کے مختلف واقعات کو تو پوری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اُن واقعات کے سنہ اُن کو یاد نہیں رہتے۔ ایسے موقعوں پر تاریخی مادے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ فن جتنا کارآمد ہے اُتنا ہی دشوار ہے۔ اس مرحلہ کو ہر شخص طے نہیں کر سکتا یہ کتاب ایسے ہی لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اس فن میں دلچسپی تو رکھتے ہیں لیکن اس کو آسانی سے کام میں نہیں لا سکتے۔ مؤلف علام نے ابتدا میں اس فن کے کچھ اصول بتائے ہیں۔ پھر ۲۰۰۰ اعداد کے الفاظ اور فقرے دے دیے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں میں رکھے جانے والے ناموں کے مشہور و معروف سابقوں اور لاحقوں جیسے محمد، احمد، علی، شیخ، سیّد وغیرہ کے اعداد بتا دیے ہیں تاکہ ان کو بار بار حساب لگائے بغیر استعمال کیا جا سکے۔ آخر میں ۱۴۰۴ھ اور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء کے کئی کئی تاریخی نام دے دیے ہیں۔ غرض ہر طرح کی

ہولت مہیا کر دی ہے۔ لیکن دوسروں کے لیے یہ سہولتیں فراہم کرنے میں انھیں جو کاوشیں کرنی پڑی ہوں گی دوسرے اُس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ "این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"..... اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے اردو زبان کے ذخیرۂ ادب میں ایک ایسی فنی اور قابلِ قدر کتاب کا اضافہ کیا۔

(ثناء الحق صدیقی)

ہشت بہشت

ابوالفہیم پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی

صفحات ۴۰۰ قیمت =/۱۵۰ روپے

بزم تزئین ادب (رجسٹرڈ) کراچی بیت الفیاض اے۔ ۳۰۸، بلاک این شمالی ناظم آباد کراچی

خورشید خاور صاحب اردو زبان و ادب کے ہمیشہ سے شیدائی ہیں۔ ان کے قلم کی تراوش نثر اور نظم کے میدانوں میں برابر جاری رہی ہے اور اب بھی وہ بحمد اللہ اپنے ادبی مشاغل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہشت بہشت جوان کی ادبی تخلیقات کا ایک ضخیم مجموعہ ہے ۱۹۹۲ء کے وسط میں منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس مجموعہ میں حمد و نعت، غزلیاں، منظومات، غزلیات، فردیات، قطعات اور رباعیات سب ہی اصنافِ سخن شامل ہیں اور اگرچہ ان سب میں اُن کے فکر و فن کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم تمام کلام کو یکساں معیار کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عظیم ترین شعرا کا کلام بھی رطب و یابس سے پاک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے مایہ ناز شاعر غالب کے یہاں بھی اس قسم کے سوقیانہ اشعار دکھائی دیتے ہیں:

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوا نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسی طرح خاور صاحب کے اس مجموعہ میں بھی ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ نمونے زیادہ تر ہزلیات میں ہیں۔ اس صنف میں اس کتاب کے لیے تھوڑی سی چھوٹ بھی ہے مگر ایسے اشعار پر مزاحِ لطیف کا اطلاق نہیں ہوتا۔ البتہ اس سے کسی قدر شاعر کی قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے۔ ہزلیات میں شامل اُن کے یہ دو اشعار ظریفانہ انداز کے ہونے کے باوجود دو، حاضر کی ایک تلخ حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں:

اچنبے سے میں چھوٹی "ہ" بن گیا ہوں
سنا جب سے کپڑے سے مہنگی سلائی
مجھے برمحل یہ مثل یاد آئی
کہ دمڑی کی گڑیا ٹکا سر منڈائی

دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں ایک ضرب المثل کے استعمال نے ایک گونہ لطافت پیدا کر دی ہے۔

خاور صاحب کے کلام پر تفصیلی تبصرے کی تو اس موقع پر گنجائش نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اتنے بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کا اُن کو خراجِ تحسین ادا کرنا اُن کے کلام کو جاندار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

قومی زبان (٦٨) اپریل ۱۹۹۳ء

نگار ماہ

افسر ماہ پوری
صفحات ۱۴۴ قیمت = /۶۰ روپے
ایل ۲۹/۷ سیکٹر ۵ سی ۲ شمالی کراچی، کراچی

کسی خلاق ذہن کی پیداوار مشق و مزاولت کے خلوص کی بدولت کس طرح روشن ہو کر سامنے آتی ہے اگر اس کی اعلیٰ مثال دیکھنی ہو تو افسر ماہ پوری کی تازہ کتاب "نگار ماہ" کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ کتاب میں شامل تقریباً ہر نظم وہ ظرف نظر آتی ہے جسے صاحبِ ظرف بہت لگن سے مانجھ کر چمکاتا اور اُس میں دیدہ زیبی پیدا کرتا ہے۔ افسر ماہ پوری کی نظموں کے پیکر میں ایک خاص قسم کی شائستگی کا احساس ہوتا ہے، یہی احساس انھیں دو بدو دیکھ کر بھی ہوتا ہے، وہ ہمیشہ میدانی علاقے میں بہنے والے دریا کی طرح پُرسکون نظر آتے ہیں، اُن کے اندر اور باہر کی دل میں گھر کر لینے والی سادگی اور متانت نے اُن کے تخلیقی لمحوں کو بہت سہارا دیا اور تخلیقات اُجاگر کیا ہے۔

افسر صاحب کی نظم "زرد پتے" بہ ظاہر خزاں کے عمل و ردِّ عمل کو بیان کرتی ہے لیکن در پردہ اس میں مہاجرت کی کہانی رقم ہوئی ہے۔ بڑے سیدھے سبھاؤ سے یہ نظم شروع ہوئی اور ختم ہو گئی لیکن راہ گزر میں مہاجرت سے پیدا ہونے والی بہت سی بپتائیں اپنا حال احوال لیے کھڑی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے مختصر نظموں کا تجربہ بھی کیا ہے۔ "مکڑی" اور "ارتقا" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ ارتقا میں یہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اشیاء کا ارتقا انسان سے یکسر مختلف ہے "مکڑی" میں شاعر جب اپنے کمرے میں ایک مکڑی کو جال بنتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اس جال میں جکڑتا جا رہا ہے۔ یہ تو اُس کے اندر کا حال ہے باہر بھی یہ صورتِ حال ہے کہ غیر محسوس طور پر وہ بہ یک وقت بہت سے جالوں میں پھنستا جاتا ہے، مقسوم سے بے خبر!

افسر صاحب کئی زبانوں، اردو، فارسی، ہندی، بنگلہ اور انگریزی میں دسترس رکھتے ہیں، انگریزی میں اُن کی استعداد مادری زبان جیسی ہے، وہ ریڈیو پاکستان کے لیے ایک عرصہ تک تقریباً روزانہ "انگریزی ٹاک" لکھتے رہے ہیں، دوسری زبانوں بالخصوص بنگلہ زبان کا گہرا مطالعہ بھی انھیں بڑا کام آیا ہے، اتنی بہت سی زبانوں کے تال میل نے اُن کی شاعرانہ زبان کو ایک خاص قسم کی تازگی بخشی ہے۔

افسر صاحب نے لکھنے لکھانے کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور بنگال میں اردو حلقے کے نمایاں افسانہ نگاروں میں شمار ہوئے۔ شاعری کا سلسلہ بہ قول افسر صاحب ۱۹۴۸ء میں ڈھاکے میں شروع ہوا اور پھر "چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی" کے مصداق، یہ شاعری ان کے دل و جان سے ایسی چمٹی کہ ایک میان میں دو تلوار کا رہنا مشکل ہو گیا دوسری تلوار سے میری مراد اُن کی افسانہ نگاری سے ہے۔ بالآخر افسانہ نگاری اُن سے بڑی حد تک نظر انداز ہو گئی۔ لیکن بنگال میں اردو کے حوالے سے اُن کا یہ حق اب بھی محفوظ ہے کہ وہ اردو افسانہ نگاروں کے پیش رو ہیں۔

(ا۔ س)

سحر کب ہو گی

سرور بخاری
صفحات ۱۶۰ قیمت =/۹۰ روپے
سویرا ویڈیو اینڈ پبلشرز محمد نگر لاہور

"سحر کب ہوگی" سرور بخاری کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس کے لیے مختصر تعارفی کلمات ڈاکٹر اجمل نیازی اور ڈاکٹر طارق عزیز نے لکھے ہیں۔ فلیپ بانو قدسیہ، اشفاق احمد اور امجد اسلام امجد کی آرا سے آراستہ کیے گئے ہیں۔ یہ تمام آرا سرور بخاری کے فن کی تفہیم میں قطب نما کی حیثیت رکھتی ہیں، اتنی بہت سی حسبِ حال آرا کے بعد اب "سحر کب ہوگی" پر لکھنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے لیکن بہ پاسِ خاطرِ احباب .... "لکھنا تو ہے کیوں کہ ہر لکھنے والا کسی کی تخلیقات پر لکھتے ہوئے اپنی نظر استعمال کرتا ہے اور باتیں یہیں سے مختلف ہو جاتی ہیں۔

سرور بخاری افسانے لکھتے ہیں، تصویر اُتارتے ہیں، رنگ و روغن کی مدد سے تصویریں بناتے ہیں اور موسیقی کو بھی اپنا رکھا ہے۔ گویا ان کی ذات میں فنونِ لطیفہ کا اجتماع ہو گیا ہے اور ایسا کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ فی زمانہ ایک شخص سے ایک فن کا بار اٹھایا نہیں جاتا، بعض اوقات راستے میں ہمت ہار بیٹھتا ہے اور سرور بخاری بہ یک وقت اتنے سارے فنوں کا بار ہنسی خوشی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کا اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ افسانہ لکھتے وقت، تصویر بناتے ہوئے، اور نغمہ نوازی کرتے ہوئے یہ فنون ایک دوسرے کے ممد ہوتے ہیں، سرور بخاری کے سیدھے سادے، افسانوں میں جو ایک تاثیر، ایک چمک اور رنگینی کا احساس ہوتا ہے وہ انھیں فنوں کے حوالے سے ہے۔

سرور بخاری کی افسانہ نگاری کا طرز بیانیہ ہے۔ ساری باتیں ظاہر، سارے منظر نظر کے سامنے، کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں۔ نہ افسانوں کو فلسفہ طرازی سے بوجھل کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ چیستان کا سہارا لیا گیا ہے اس کے باوجود ہر افسانہ متاثر بھی کرتا ہے اور لمحہ فکریہ بھی مہیا کرتا ہے اُن کے افسانوں میں گہرے تاثر کی وجہ ان کا اپنے معاشرے سے جڑے رہنا ہے ان کے فن میں ایک جیتا جاگتا معاشرہ سانس لے رہا ہے افسانہ نگار کی اپنے ماحول سے قرابت اور ہمدردیاں گلی در گلی اُتری ہوئی ہیں۔

سرور بخاری کا افسانہ "عبدالقدوس دلی والا" کا انجام نہایت معنی خیز ہے کہانی کار آخر میں قاری پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی تفہیم کس طرح کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہ فیصلہ دوں گا کہ مجھے عبدالقدوس دلی والے کے مقابلے میں منچلی زیادہ معزز لگی ہے۔ کتاب صوری اور معنوی اعتبار سے خوبصورت چھپی ہے

(ا۔ س)

تمھارا شہر کیسا ہے

نیلما سرور
صفحات ۱۲۸ قیمت =/۹۰ روپے
سویرا ویڈیو اینڈ پبلشرز محمد نگر لاہور

"تمھارا شہر کیسا ہے" نیلما سرور کا تازہ شعری مجموعہ ہے، کتاب کے آغاز میں غالب کا یہ شعر ہے:

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز

نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

اور اس کا انتساب "شریک زندگی، سرور بخاری کے نام" کیا گیا ہے ان دونوں کو پہلو بہ پہلو دیکھ کر معاً خیال گزرتا ہے کہ کہیں غالب کے اس شعر کا روئے سخن "سرور بخاری" تو نہیں آخر مرد اور عورت، زن و شو کے رشتے میں بندھ جانے کے بعد اسی شعر کے مصداق تو ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب پر کچھ کہنے سے پہلے اوّل اوّل یہ کہہ دیا جائے کہ نیلما سرور کا شعری مزاج FEMINIST ہے لیکن قطعاً روایتی نہیں، اشیاء کو پرکھنے، موضوعات سے متاثر ہونے اور منتخب کرنے میں ان کا رویہ جدّت سے مملو ہے۔ نیلما سرور کی ایک نظم "میری سنگھار میز پر" آرائشی سامان کے نفع و ضرر کا پُرتاثیر بیان ہے، اس کو برت کر ایک چہرہ حسب ضرورت بہت سے چہروں سے بدل جاتا ہے اور پھر ان بہت سے چہروں میں اصلی چہرہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا ہے ان کی ایک اور نظم "اُس نے رنگ برنگی تتلیاں پکڑ کر" اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ مرد سماج نے چہار دیواری کے اندر عورت پر جو قید بند لگا رکھی ہے اس کے خلاف یہ خوبصورت پُرتاثیر احتجاج ہے۔

نیلما سرور بہ حیثیت مجموعی نظم نگاری کی تکنیک کا ادراک رکھتی ہیں، مختصر سے مختصر نظموں میں ایک ڈرامائی اختتام ہوتا ہے جس کی وجہ سے کہی ہوئی بات سیدھی دل کو لگتی ہے۔ "سال میں جتنے دن ہوتے ہیں"، "مجھے دعا دو" اور تین مصرعے کی نظم "پیاس تو اندھی ہوتی ہے" نازک احساسات پر مبنی ہیں اور بڑی دلداری سے بیان ہوئی ہیں۔

نیلما سرور نے ۱۲۸ صفحات کے اس شعری مجموعے میں حمد، نعت، منقبت، گیت، غزل، آزاد نظم اور نثری نظم غرض یہ کہ بہت سی اصناف کو برتا ہے ان سب میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ کہ ان کی کوئی بھی تخلیق گرانباری کا احساس نہیں دلائی سبک روی کا مرقع ہے۔ نیلما سرور اپنی نظموں میں، خواہ وہ ذات کے حوالے سے ہوں یا کائنات کے حوالے سے کسی تاثر، کسی واقعہ، کسی واردات کو نئے شعری پیکر عطا کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ نیلما سرور کا یہ شعری مجموعہ حقیقی معنوں میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے قاری کو حسن اور تنوع کا احساس دلاتا ہے

نیلما سرور نے کتاب کے حرف آغاز کے طور پر یہ نثر پارہ رقم کیا ہے:

انسان سب سے زیادہ پیار
زندگی سے کرتا ہے
اور سب سے بڑا دھوکا بھی
اسی سے کھاتا ہے....

انسانی جبلّت و سرشت کا حرفِ اختتام بھی اسی نثر پارے میں ہے

(ا۔س)

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

غالب احوال و آثار / حنیف نقوی

مالک رام صاحب نے پروفیسر حنیف نقوی کی کتاب "غالب۔ احوال و آثار" کے "پیش لفظ" میں تحقیق کو تلاشِ حق کا دوسرا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ "تحقیق اس کوشش اور تلاش کا نام ہے جو ہم نے کسی بات کی حقیقت اور اصلیت معلوم کرنے میں صرف کی.... دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک شخص محقق یعنی متلاشیِ حق ہے۔" تاہم انھوں نے "تحقیق" کے اصطلاحی معانی کو بھی تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ "اسے انگریزی لفظ "ریسرچ" (RESARCH) کا ہم معنی اور متبادل تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب نے اس پیش لفظ میں لغوی اور اصطلاحی معانی کی توضیح شاید اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ پروفیسر حنیف نقوی کی زیر نظر کتاب .... "غالب۔ احوال و آثار" میں دونوں زاویے نمایاں نظر آتے ہیں۔ یعنی وہ تلاشِ حق کے جویا بھی ہیں، اور گمشدہ متاع کی دریافت میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی ایک اور ذاتی خوبی یہ ہے کہ علمی اور ادبی پہلو سے انھیں "نجیب الطرفین" کہا جاسکتا ہے۔ بقول مالک رام ان کے دادھیال اور ننھیال ہر دو میں پشتوں سے علم و ادب کی روایت چلی آ رہی ہے۔ ان کا مزاج تحقیقی ہے اور مطالعے میں وسعت و گہرائی ہے۔ حنیف نقوی ہمارے ہاں پاکستان میں زیادہ معروف نہیں ایک محقق ہونے کی حیثیت میں ان کے کارنامے بہت دیر سے منظرِ عام پر آئے ہیں، چنانچہ یہ کہنا شاید درست ہوگا کہ وہ شہرت کی کسی "بینڈ ویگن" کے رکن نہیں۔ تعارفاً یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ حنیف نقوی بنارس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ساتھ وابستہ ہیں، خود محنت کرتے ہیں اور اپنی نگرانی میں پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو محنت کی عادت ڈالتے ہیں۔

حنیف نقوی کی زیر نظر کتاب تحقیقِ غالب کے سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے جس سے غالب کے سفر کلکتہ، نولکشور سے ان کے روابط اور غالب کے سالِ ولادت جیسے موضوعات کو نئی روشنی ملتی ہے تلامذۂ غالب پر مالک رام صاحب کا قابلِ قدر کام منظرِ عام پر آچکا ہے خود مالک رام نے اسے حرفِ آخر قرار نہیں دیا اور جب بھی غالب کے کسی گمنام شاگرد کا نام اور اس کا کلام دریافت ہوتا ہے محقق موصوف اسے نئے ایڈیشن میں شامل کر لیتے ہیں۔ "تلامذۂ غالب" پر اس کتاب میں دو مضامین شامل ہیں جن میں مالک رام صاحب کے کام پر محاکمہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے اور مثبت مقصد یہ ہے کہ نئے مواد کی روشنی میں سابقہ اغلاط کی اصلاح ہو سکے مثال کے طور پر مالک رام صاحب نے منشی ہرگوپال تفتہ کی تاریخِ وفات ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء بمقام سکندر آباد لکھی۔ لیکن حنیف نقوی

صاحب نے معاصر شہادتوں سے وضاحت کی کہ تفتہ کا انتقال دہلی میں وبائی تپ کے عارضے سے ہوا تھا۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کا سالِ وفات ۱۸۸۱ء شمار کیا جاتا ہے۔ حنیف نقوی نے قدر بلگرامی کے مستخرجہ مادۂ تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا سالِ وفات ۱۸۷۹ء ہے۔ مالک رام اور ایم حبیب خان نے ایک نعتیہ قصیدہ چودھری عبدالغفور سرور کے نام سے منسوب کیا تھا نقوی صاحب نے واضح کیا کہ نعتیہ قصیدہ غالب کے ایک دوسرے مارہروی شاگرد چودھری عطا حسین عطا کا ہے۔ انھوں نے "شبیہ عشرت مصنفہ حاتم علی بیگ مہر سے عبدالغفور سرور کے کلام کی مزید تفصیلات بھی پیش کیں ان میں ایک "غزل سہرہ" بھی ہے جو غالب کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ مقطع حسب ذیل ہے:

ہیں تتبع میں یہ غالب کے سب اشعار سرور
"دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا"

مولوی کریم الدین نے تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" کے لیے غالب کے حالات ۱۸۴۷ء میں قلم بند کیے اور ان کی عمر ۶۰ برس کے قریب بتائی۔ اس لحاظ سے غالب کا سالِ ولادت ۱۷۸۷ء بنتا ہے جب کہ متداول سالِ ولادت ۱۷۹۷ء بتایا جاتا ہے۔ حنیف نقوی صاحب کی تحقیق کے مطابق غالب کی تاریخ ولادت ۹ فروری ۱۷۹۴ء ہے۔ نقوی صاحب نے اس کا سراغ بھی لگایا ہے کہ مرزا غالب اپنی عمر بالقصد کم کیوں بتاتے تھے۔ "مقالہ غالب کا سالِ ولادت" اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں سالِ ولادت پر کی گئی اب تک کی بیشتر بحث کا احاطہ کر لیا گیا ہے تاہم مالک رام نے ان کے اخذ کردہ نتیجے سے اختلاف کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور دلچسپ مقالہ "غالب سے منسوب ایک شعر" کے بارے میں ہے۔ شعر یہ ہے:

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

حنیف نقوی صاحب کے خیال میں یہ شعر غالب کا نہیں بلکہ عاشق حسین بزم اکبر آبادی کے اس شعر کی بدلی ہوئی صورت ہے:

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

بزم نے یہ غزل ۱۹۱۰ء سے قبل کہی تھی، غالب کے جس دیوان میں یہ شعر اُن کے نام منسوب ہے وہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا۔

متذکرہ بالا چند مثالوں سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حنیف نقوی تحقیق میں کتنی محنت کرتے اور تلاش صداقت میں کس گہرائی تک جاتے ہیں۔ وہ اپنے اخذ کردہ نتائج کی قبولیت پر اصرار نہیں کرتے تاہم قاری ان کی اس انفرادیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ انھوں نے تلاشِ صداقت میں ممکنہ ماخذات تک رسائی کی اور جلدی کاٹنے اور تیز دوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ نیز اپنے نتیجے کو بہر صورت منوانے کے لیے حقائق میں ردّ و تغیّر کی روش اختیار نہیں کی اس کتاب سے ان کا تحقیقی مزاج اور استخراجی دیانت عیاں ہوتی ہے۔ یہ کتاب عابد سہیل کے ادارہ نصرت پبلیشرز امین آباد لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

اعتبار / علیم اللہ حالی

ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ وہ بالعموم ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن پر یا تو لکھا ہی نہیں

گیا یا بہت کم لکھا گیا ہے ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ادب کے بجھتے ہوئے دیے کو روشن رکھنے کے لیے وہ نئے لکھنے والوں کا نہ صرف خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ ان کا تعارف اس کشادہ نظری سے کراتے ہیں کہ ادب میں نئے لکھنے والوں کی دلچسپی اور وابستگی پختہ ہو جاتی ہے ان کی نئی تنقیدی کتاب "اعتبار" میں یہ دونوں زاویے موجود ہیں، مثلاً اردو املا کے مشکل موضوع کو اس کے حالیہ مسائل اور مباحث کی روشنی میں پرکھا ہے۔ پریم چند کو دریافت کرنے کی سعی کی توان کے افسانوں سے ان کے سماجی نظریات تلاش کیے۔ انگریزی شاعری میں سے "ثنائے نغمہ" کا رحجان دریافت کیا، ایک دلچسپ اور بامعنی مقالہ "میر کی شاعری میں فارسی اور ریختہ کی مماثلت" ہے ایک اور مقالہ "اودھ پنچ" کے ممتاز ادیب عبدالغفور شہباز کے بارے میں ہے۔ اجتبیٰ رضوی اور بسمل سنہاروی کی شاعری پر اور شفیع مشہدی کی ڈرمانہ نگاری پر مضامین بھی اس کتاب میں ہیں جس کی ضخامت ۱۲۶ صفحات ہیں شامل ہیں۔

میرا خیال ہے کہ علیم اللہ حالی کو اولین شہرت ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت سے ملی تھی، میں نے انھیں "شب خون" میں پڑھا تو خوشی ہوئی کہ وہ عصری حقیقت کو اپنے مخصوص لہجے میں پیش کرتے تو آگہی کا ایک نیا زاویہ سامنے آجاتا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ "شب خون" کے خطوط کے کالم میں مختلف مضامین کے مباحث میں بھی سرگرم حصّہ لیا تھا اور وہ مجھے اس قبیلے کے ادب نظر آئے جو منہ پر آئی ہوئی سچی بات کو روکنا مناسب نہیں سمجھتے اور بعض اوقات گرمی گفتار کے مرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔ "اعتبار" کے مضامین پڑھ کر یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ "شب خون" کے بہرۂ مکتوبات کا علیم اللہ حالی اس کتاب کے نقاد علیم اللہ حالی سے مختلف شخص تھا۔ "شب خون" میں وہ "اعتبار" پر اصرار کرتے تھے اس کتاب میں وہ "عدم اعتبار" کا ملال نہیں کرتے۔ اپنے لکھے ہوئے کو "حرفِ آخر" نہیں سمجھتے، تنقیدی عمل میں امتیازی خطوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور بحث انگیزی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نئے خیال کا در بند نہیں کیا۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کے کام کی تحسین کشادہ نظری سے کرتے اور اپنے اختلافات کا زاویہ بے حد شائستگی سے ابھارتے ہیں۔ مثال کے طور پر "اردو املا: مسائل اور مباحث" میں انھوں نے ڈاکٹر ابو محمد سحر کے کام کا کھل کر ذکر کیا ہے اور ان کی خدمات کا احسان قبول کیا ہے لیکن علیم اللہ حالی نے ڈاکٹر سحر کی سب اصلاحات کو قبول نہیں کیا اور اصلاح کی نفسیات کو سامنے رکھنے کی سفارش کی ہے۔ ابتدائی درجوں پر بچوں کی کتابوں میں اعراب کے استعمال کو ڈاکٹر ابو محمد سحر پسند نہیں فرماتے لیکن ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا مؤقف زیادہ قرین العمل ہے کہ "ایک بار لفظوں کی تشکیل جان لینے کے بعد آگے کے درجوں میں بچّوں کو آسانی ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اعراب اور علامات کے بغیر بھی الفاظ پڑھے جاسکتے ہیں۔

کالی داس گپتا پر علیم اللہ حالی کا مقالہ بظاہر ان کے فنّی کارناموں کو روشنی عطا کرتا ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ انھوں نے فن کے حوالے سے کالی داس گپتا رضا کی شخصیت دریافت کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے ان کا یہ عمل اجتبیٰ رضوی کی شاعری والے مقالہ میں بھی نمایاں ہے قتیل داناپوری کا نام میں نے پاکستان میں پہلی دفعہ علیم اللہ حالی کی کتاب میں پڑھا لیکن ان کا مقالہ پڑھنے کے بعد قتیل داناپوری کو پڑھنے کی آرزو بیدار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اب ایسے شاعر بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو شاعری سے انسان کی فطری طبائع کی تطہیر کا کام لیں، بقول علیم اللہ حالی قتیل داناپوری کی شاعری قاری پر تطہیر کا یہ عمل غیر محسوس انداز میں سرانجام دیتی ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم مقالہ عبدالغفور شہباز پر ہے ان کا بیشتر کام "اودھ پنچ" میں محفوظ ہے لیکن اب اس پر نظر نہیں جاتی۔

علیم اللہ حالی نے عبدالغفور شہباز کے فن کے چند نئے گوشے دریافت کیے اور ان پر سابقہ کام کا (مثلاً باقیاتِ شہباز کا تذکرہ کشادہ ظرفی سے کیا ہے۔

علیم اللہ حالی تنقید و تحقیق کو شاید پورا وقت نہیں دیتے ان کی یہ کتاب دیکھ کر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ادبی موضوعات، مباحث اور مسائل پر زیادہ اظہار خیال کریں اور قاری کو اپنے مطالعہ سے مستفیض ہونے کا موقع دیں یہ کتاب اشاعتِ ادب، فخرالدّین ہاؤس، لنگر ٹولی پٹنہ سے شائع ہوئی ہے۔

سرسیّد کی تعزیتی تحریریں / مرتبہ اصغر عباس

نجی خطوط کی طرح تعزیتی تحریریں بھی لکھنے والے کے سچّے جذبات کا اظہار کرتی ہیں باہمی تعلّقات کی نوعیت اور گہرائی آشکار کرتی ہیں، ان تحریروں سے وہ غم اور کرب ظاہر ہوتا ہے جو دنیا سے رخصت ہو جانے والا پسماندگان کے دل پر وارد کر گیا ہے۔ اس لحاظ سے تعزیت نامے، لکھنے والے کے باطن اور اس کے ظرف سے بھی آگہی عطا کرتے ہیں، مجھے یاد ہے کہ میں نے "مولانا صلاح الدّین ایک مطالعہ" کے عنوان سے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو مولانا مرحوم کی شخصیت کو ان کے تعزیت ناموں سے دریافت کرنے کی سعی کی، ان کے تعزیت ناموں میں اگرچہ مولانا صلاح الدّین احمد کا روئے سخن دنیا سے رخصت ہو جانے والے دوستوں کی طرف تھا لیکن درحقیقت اندوہِ غم میں اپنی شخصیت کی بعض پرتوں کو ہی آشکار کرتے جا رہے تھے۔

کچھ عرصہ قبل مشفق خواجہ صاحب نے الطافِ کریمانہ کے تحت مجھے بھارت کی چند کتابیں "قومی زبان" کے اس سلسلے کے لیے عطا کیں تو ان میں ایک کتاب "سرسیّد کی تعزیتی تحریریں" بھی تھی جس کے مؤلف ڈاکٹر اصغر عباس ہیں۔ میں نے کتاب سب سے پہلے پڑھی اور حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد کی شخصیت کے کئی نادر گوشے سامنے آئے، یہ تعزیت نامے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے صفحات میں محفوظ تھے، سیّد اصغر عباس صاحب نے انھیں کوشش بسیار سے تلاش کیا اور پھر انھیں کتابی صورت اور مقدمے سے آراستہ کر کے شائع کر دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بہت سی تحریریں ایسی ہیں جن پر سرسیّد کا نام درج نہیں ہے۔ ان کی تعزیتی تحریریں بھی اسی ضمن میں آئی ہیں، ڈاکٹر اصغر عباس نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اندرونی شواہد، قرائن اور اسلوبِ بیان کو اساس بنایا مرحوم کے روابط اور واقعاتِ زمانہ سے استفادہ کیا اور پھر یہ فیصلہ دیا کہ یہ تحریریں سرسیّد ہی کی ہیں ان کی اس تحقیقی محنت کی انھیں ضرور داد دی جانی چاہیے۔

سرسیّد احمد خاں کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں شامل بعض شخصیات سے وہ روشناس نہیں تھے۔ لیکن ان کے قومی، سیاسی، علمی، ادبی اور سماجی کارناموں کی وجہ سے سرسیّد ان سے نہ صرف شناسا تھے بلکہ ان کے بارے میں عقیدت و محبت کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہو گئے تو سرسیّد کو محسوس ہوا کہ چراغ بجھ گئے ہیں اور دنیا کی تاریکی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان تعزیتی تحریروں سے ہمارے سامنے ایک ہمدرد خلائق انسان آتا ہے۔ ایک ایسا انسان جو دوستوں کو زندگی کا عنصر تصوّر کرتا تھا، اپنے رفیقوں کو جزوِ حیات گردانتا تھا۔

اس کتاب میں کم و بیش پانچ درجن تعزیتی تحریریں پیش کی گئی ہیں، ان میں مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی چراغ علی، دیانند سرسوتی، بابو کیشب چندر جین، مولانا عبدالحی فرنگی محلی جیسے علما اور فضلا بھی ہیں اور ہنری فرڈی نینڈ، بلوک مین، حکیم محمود احمد اور نواب ضیاء الدّین خان جیسے اہلِ علم و فن بھی، ایک حصّہ اہلِ صحافت کے لیے اور ملازمین مدرستہ العلوم کے لیے

وقف کیا گیا ہے۔ رؤسا اور اہلکاران حکومت کے لیے جو باب مرتب کیا گیا ہے اس میں ڈبلیو ایچ سمتھ، دیوان کرپارام، مہاراجہ بنارس، نواب عبدالطیف خان جیسے لوگ شامل ہیں۔

سرسیّد احمد خان نے بالعموم مرحومین کے اوصافِ حمیدہ کو ان تعزیت ناموں میں فوقیت دی ہے تاہم ان تحریروں میں سوانح سراپا اور منظر نگاری کے عناصر بھی نمایاں ہیں، چنانچہ شخصیات کے ضمن میں یہ تحریریں بنیادی ماخذات کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں سیّد مجتبیٰ اندلسی کا وہ مرثیہ بھی درج ہے جو اس نے "مصائبِ اندلس" کے عنوان سے لکھا تھا، فاضل مرتّب کی رائے میں اس مرثیے کو دیکھ کر سرسیّد نے حالی سے مسدّس کی فرمائش کی تھی، قاری کی سہولت کے لیے سرسیّد کے اعوان و انصار کے حالات حواشی میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ یہ کتاب مطالعۂ سرسیّد کا ایک اہم موضوع ہے۔ کاش! کوئی صاحب اس کتاب کی روشنی میں سرسیّد کی شخصیت کے اس پہلو کو دریافت کرنے کی سعی فرمائیں کہ دوستوں کی رخصتِ آخر پر سرسیّد پر کیا کیفیت طاری ہوئی تھی اور مختلف قسم کے لوگوں پر ان کے تاثرات کی نوعیت کیسی ہوتی تھی، سرسیّد پر یہ کتاب بنیادی نوعیت کی ہے۔ ڈاکٹر اصغر عبّاس کی محنت پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔

یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کی ہے۔

داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن / محمد انصار اللہ

ساہتیہ اکادمی دہلی نے "ہندوستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے تقریباً ایک صد صفحات کی کتابوں کا ایسا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کے تحت سادہ زبان اور دلکش اسلوب میں مشاہیرِ ادب کے بارے میں اہم ترین معلومات پیش کی جاتی ہیں، ممتاز محقق ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی کتاب "داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن" اسی سلسلے کی ایک گوہریں کڑی ہے۔

مہرشی شیو برت لال ورمن تعصب، ہٹ دھرمی اور تنگ نظری سے بے نیاز تھے، ذات پات کی تفریق سے نفرت کرتے اور محبت، صلح اور آشتی کے مبلغ و معلم تھے، ڈاکٹر انصار اللہ نے لکھا ہے: "وہ معاملات و مسائل پر خود غور کرتے تھے، خود کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے اور پھر اپنے خیالات کا اظہار بھی پوری بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ کرتے تھے وہ وحدانیت کے قائل تھے اور محبت ان کا مسلک تھا"۔ اس مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے انھوں نے پہلے "آریہ گزٹ" کی ادارت کی اور پھر لاہور سے رسالہ "سادھو" جاری کیا اس کے علاوہ انھوں نے "مارتنڈ"، "سرسوتی بھنڈار"، "پنجابی سورما"، "تتودرشی" اور "لکشمی بھنڈار" جیسے رسائل اردو، ہندی اور گورمکھی رسم الخط میں جاری کیے۔ شیو برت لال نے کہانی نویسی بھی کی اور شاعری بھی، ان کی زبان خالص ادبی زبان نہیں تھی، وہ ہندی اور اردو میں آمیزش کر کے بھگت کبیر کی زبان میں بات کرتے اور عوام کے دلوں میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے آخری زمانے کا کلام "نغمۂ یزدانی" کے عنوان سے مرتب ہو چکا ہے ان کی زندگی کا خاصا طویل حصّہ لاہور میں گزرا وہ علامہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ جس زمانے میں اقبال انار کلی میں رہتے تھے تقریباً اسی زمانے میں مہرشی شیو برت لال پیسہ اخبار اسٹریٹ میں چنگڑ محلہ میں اقامت پذیر تھے۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اس بھگوان مست اور ادیب، شاعر، انسان دوست اور دیالو شخص کا تذکرہ بڑے خوبصورت انداز میں مرتّب کیا ہے ہمارے ہاں بھی اکادمی ادبیات جیسے اداروں کو اس قسم کا کام کرنا چاہیے ساہتیہ اکادمی اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

عالم میں انتخاب
SHARBAT
ROOH AFZA
مصنوعی اَجزا سے تیار کی جانے والی
اَشیائِ خور و نوش کے منفی اثرات سے آگاہی کے
بعد نسلِ اِنسانی ایک بار پھر فطرت کے آغوش
میں پناہ تلاش کر رہی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ قدرتی اجزا کا مُرکب
رُوح افزا اپنی فطری تاثیر، منفرد ذائقے اور
اعلا معیار کی بنا پر اقوامِ عالم میں
روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔
رُوح افزا
همدرد
انٹرنیشنل

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

جمہ، فنِ ترجمہ

رندیم قاسمی	افریقی شاعری کے تراجم	ماہ نو، لاہور جون ۹۲ء ص ۳
رینہ	لوہسوں، (چینی شاعر) تعارف اور ترجمہ	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۳۵
رعابد حسین	اردو ترجمے کی روایت اور ڈاکٹر سید عابد حسین	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۸۳
م محمود	فنِ ترجمہ اور متنی تنقید	مطالعۂ پاکستان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۴۷
ن احسان	شوکت واسطی کا منظوم ترجمہ	نیرنگ خیال، راولپنڈی اپریل ۹۲ء ص ۸
دالرحمن، ڈاکٹر	قرآن مجید کا ایک منظوم اردو ترجمہ / مترجمہ ڈاکٹر نور احمد شیخ	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۵۹

پاکستانی افسانہ

فاق صدیقی	سندھی افسانہ، آزادی کے بعد	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۲۱۳
مداو نظامی	بلوچی افسانہ، آزادی کے بعد	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۳۱۹
نعام الحق جاوید	پنجابی افسانہ، آزادی کے بعد	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۱۵۱
رسا ہمدانی	پشتو افسانہ، آزادی کے بعد	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۲۷۱
سلیم اختر، ڈاکٹر	پاکستانی اردو افسانہ، شناخت کا عمل	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۷
شہزاد منظر	اردو افسانہ، آزادی کے بعد	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۱۲

بچوں کا ادب

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر	بلوچستان میں بچوں کا ادب	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۶
انعام الحق کوثر، ڈاکٹر	بلوچستان میں بچوں کا ادب	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۳۳۲

خود نوشت

لراجعفری	مگر ایک شاخ نہالِ غم	افکار، کراچی ۹۲ء ص ۲۵
افتخار احمد عدنی	یادوں کا سفر، جوش ملیح آبادی	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۱

جمیل جالبی، ڈاکٹر	ماریشس کی عالمی اردو کانفرنس	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۲۵
خدیجہ امیر علی	وہ بھی کیا دن تھے	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص
شان الحق حقی	تذکرہ تعلیم کا، کچھ ہنسنے رونے کی باتیں (پہلی قسط)	افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۵
شان الحق حقی	ہمارے اساتذہ	افکار، کراچی فروری ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی	افسانہ در افسانہ۔ چوتھی قسط	افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۱
شان الحق حقی، ڈاکٹر	عزیز احمد اور حیدرآباد دکن کا کچھ تذکرہ (پانچویں قسط)	افکار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر	کچھ بھول چوک کی باتیں (چھٹی قسط)	افکار، کراچی جون ۹۲ء ص ۲۷
شاہدہ صدیقی	وہ تاریک دن	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۱ء ص ۴۰
طفیل احمد بنگلوری	علی گڑھ کالج کا ابتدائی زمانہ	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۵
مشتاق احمد خاں، نواب	مادرِ علمی علی گڑھ کچھ بچپن کی باتیں	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۲ء ص
معیش الدین صدیقی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یادیں	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص
منظور حسین شور، پروفیسر	میری شاعری	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۸
نور الحسن جعفری	شعیب صاحب۔ ۲	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص
نور الحسن جعفری	منتشر یادیں	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۸۸
نیاز فتحپوری، علامہ	والد مرحوم میں اور نگار	نگار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۶

سفرنامہ

انوار فیروز	نیا کولمبس	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۳۹۹
انوار فیروز	نیا کولمبس	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۳۹۸
ای۔ ایم۔ فاسٹر	ابن بطوطہ کا سفر حج	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱
ترجمہ ثناء الحق صدیقی	حادثاتِ اسپین از جارج ہنری بورو	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء
ترجمہ: ثناء الحق صدیقی	باڑاجوز (بطلیوس) کا سفر	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص
ترجمہ: ثناء الحق صدیقی	باڑاجوز (بطلیوس) کا سفر، جپسی رہبر	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۴۱
چوہدری محمد اشرف	تلسی کا ایک تنہا پودا	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۳
رعنا اقبال	سفر، ہمسفر / راغب شکیب	کندن، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵۸
سلطان ظہور اختر	سفرِ امریکہ	محفل، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۷۳
عنبر چغتائی		کندن، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۴۲
محمد توفیق	سیاحتِ جاں / روس، چین نمبر ۱	نیرنگِ خیال، راولپنڈی فروری ۹۲ء ص
محمد توفیق	سیاحتِ جاں / چین نمبر ۳	نیرنگ خیال، راولپنڈی اپریل ۹۲ء ص
محمد عارف، ڈاکٹر	گیسوئے دجلہ و فرات	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۹
مستنصر حسین تارڑ	ٹاپ میدان / نانگا پربت، بلتستان داستان	ادبیات، اسلام آباد ۱۶/۹۱ء ص ۱۷۱

خطوط

سردار جعفری	بنام صہبا لکھنوی	افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۷
سلیم الرحمن	ابوالفضل صدیقی کے خط فکر تونسوی کے نام	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۹

ملاقات

آصف فرخی	رام لعل سے گفتگو	اوراق لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۲۷۵
الطاف رسول	شیخ انوار الحق چیف جسٹس سپریم کورٹ (ریٹائرڈ) سے انٹرویو	اردو نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۹

مصنف	عنوان	ماخذ
نتر، ڈاکٹر/ ڈاکٹر اجمل نیازی	ڈاکٹر محمد اجمل	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۲۶۷
شتی ہرگانوی، ڈاکٹر	ملاقات نگاری کا فن	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۶۹

بات

مصنف	عنوان	ماخذ
م قاسمی	فکر و فن کا بے مثال امتزاج، غالب	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۳
مدنی	غالب کی شاعری میں حمد و نعت کی جلوہ گری	قومی زبان، فروری ۹۲ء ص ۱۷
مدنی	غالب شناسی کے کرشمے	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۵
	دیوانِ غالب کا پہلا شارح	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۶
ستوگی، ڈاکٹر	غالب اور غالبیات پر نظرِ ثانی	کندن، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵
قی، ڈاکٹر	غالب کے فارسی مکاتیب، ایک جائزہ	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۵۱
وی (علیگ)	اردو کا پہلا فلسفی شاعر	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۰
شداوج	غالب کا ہے اندازِ بیاں اور	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۵
نوق، ڈاکٹر	نظرِ غالب اور نظارۂ عصرِ حاضر	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۹
مر	غالب کا ہے اندازِ بیاں اور	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۱ء ص ۵۷
	مطلع سرِ دیوان	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۹
ی خفی	غالب کی ایک غزل	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵
آبادی	غالب اور غالب شکن	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۷۷
ن	غالب کا ایک شعر	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۳۵
ی، ڈاکٹر	غالب کا اخلاقی نقطۂ نظر	محمل، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۱
رحمانی	دبیر الملک، غالب	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۵
ال مہر	مرزا غالب	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۸
مدین عقیل، ڈاکٹر	غالب کا ذہنی سفر	آگہی، کراچی، سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۷
سن، پروفیسر	غالب کا سیاسی شعور	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۵
ین، پروفیسر	غالب اور نشاۃِ ثانیہ	ادبیات، اسلام آباد ۱۶/۹۱ء ص ۲۱۵
ہادی، علامہ	غالب کی فارسی غزل	نگار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۸-۶۲
بش، ڈاکٹر	خوف زدہ غالب اور عصری صورت حال	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۳۲
ا، ڈاکٹر	غالب اور تصوف کی روایت	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۱۹۸

ید احمد خان اور علی گڑھ

مصنف	عنوان	ماخذ
ور، پروفیسر	سرسید اور ہم	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۸
شاصدیقی، ڈاکٹر	سرسید احمد خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۴
، پروفیسر	نواب محسن الملک اور سرسید احمد خان	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۴
شداوج	سرسید کے اصلاحی و تعلیمی کارنامے	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۴
تی	جنوبی ہند کے سرسید، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۲۱
یقی	جنوبی ہند کے سرسید، ڈاکٹر عبدالحق	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۳۲
کٹر	میرا دوست راس مسعود	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۶
رضوی	سرسید احمد خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۹
خاں	علی گڑھ اسپرٹ	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۲
ار	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ماضی حال مستقبل	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۳

رشید احمد صدیقی، پروفیسر	غالب، سرسید اور علی گڑھ	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۱۳
سرسید احمد خاں	وحشیانہ نیکی	تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۵
سیّد احمد خاں	آزادی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
سیّد احمد خاں	علی گڑھ کی کہانی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
سیّد احمد خاں	انشاء اللہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۱
سیّد احمد خاں	انسان کے خیالات	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اپریل ۹۲ء ص
سیّد احمد خاں	دین اور دنیا کا رشتہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مئی ۹۲ء ص ۵
سیّد احمد خاں	ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت پر انسان کی ترقی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جون ۹۲ء ص ۷
سیّد حامد	زاد راہ اور راہ نما	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۰
سیّد فرخ جلالی، ڈاکٹر	علی گڑھ تحریک کے ایک سرگرم کارکن، نواب مزمل اللہ خاں	تہذیب الاخلاق، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۲۷
شاہدہ بیگم	سرسیّد کی تعلیمی پالیسی، جدید تعلیم کی روشنی میں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص
شوکت الہ آبادی	سرسیّد محسنِ اردو کی حیثیت سے	کندن، کراچی فروری مارچ ۹۲ء ص ۶
شیخ عبداللہ، ڈاکٹر	عظمت، موت کے دروازے پر	تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۲۰
ظفر الاسلام اصلاحی	سرسیّد احمد خاں اور علوم شرقیہ	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۳
عشرت رحمانی	سرسیّد، قوم اور تصورِ قومیت	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۳
مجاز دہلوی	سرسیّد کا نظریہ قوم اور ان کا مشن	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۴۴
محمد علی جناح، جواہر لال نہرو اور دوسرے	سرسیّد کو اکابرینِ عالم کا خراج عقیدت	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۹
محمود علی خان چوھدری	محسنِ قوم سرسیّد	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۶
مختار مسعود	ایک سرسیّد کا انتظار ہے	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۲
مشرف علی	سرسیّد کا تعلیمی و قومی نظریہ	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۵۱
معیش الدین صدیقی	گیارہ نادر روزگار علی گڑھ کے فارغ التحصیل عباسی	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۳۴
نسیم انصاری، پروفیسر	سرسیّد کی یونیورسٹی	تہذیب الاخلاق، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۷
واحد حسین صدیقی ثاقب	کچھ عزیزانِ علی گڑھ کے بارے میں	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۵۹

اقبالیات

آفتاب احمد، ڈاکٹر	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال	افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۷
افتخار حسین شاہ	اقبال مست، آغا صادق	صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۲ء ص ۲۶
ایم اسلم	اقبال اور ملٹن	سب رس، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۸
این میری شمل/ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	مشرق و مغرب کا سنگم	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۱۶۸
بشریٰ خان	اقبال کا انسانِ کامل	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۰
جیلانی کامران	اقبال کی فکری رہنمائی	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۱۳۴
حبیب اللہ اوج	علامہ اقبال ایک لافانی شاعر، ایک عظیم مفکر	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۸
حبیب اللہ اوج	اقبال اور ریاست حیدر آباد دکن	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۹
حفیظ الرحمٰن خان	اردو شعر و ادب پر اقبال کے اثرات	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۶
خواجہ عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر	اقبال کا ایران میں اثر	اقبال، لاہور جولائی ۹۱ء ص ۹۹
رعنا اقبال	علامہ اقبال اور جمہوریت	اردو نامہ، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۵
رؤف حنیر	کیٹس اور اقبال کا تقابلی مطالعہ	انشاء، کلکتہ جنوری ۹۱ء ص ۳۹
سرور انبالوی	تعلیمی میدان میں علامہ اقبال	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۴۲

میدہ مستاب	افکار اقبال/ علامہ اقبال مترجم ڈاکٹر محمد ریاض	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۳۷۵
سید عاصم قادری	اقبال کے فکر و فن کا حقیقی سرچشمہ	محفل، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۳
نبیر حسین رضوی، پروفیسر	علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۲۱
منذر محمود، ڈاکٹر	علامہ اقبال کی انکم ٹیکس فائل	مطالعہ پاکستان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۷۷
مدالصمد پیرزادہ	متحدہ قومیت، علامہ اقبال اور مولانا مدنی	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۱۵۷
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	ترکی میں احیائے اسلام اور اقبال	دائرے، جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۴
فرالحق نوری	اقبال کی نظم مومن کا تجزیاتی مطالعہ	تحریریں، لاہور نومبر ۹۱ء ص ۱۵
جنی عبد الغفار	علامہ اقبال کا نظریۂ ملت	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۷
لد انصار اللہ	انسان میں اقبال کی تین نظمیں	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۱
لد رفیع الدین، ڈاکٹر	خودی کا انقلاب۔ ۳	حکمت قرآن، لاہور مارچ اپریل ۹۲ء ص ۴۷
لد رفیع الدین، ڈاکٹر	خودی کا انقلاب۔ ۴	حکمت قرآن، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۵
لد رفیع الدین، ڈاکٹر	خودی کا انقلاب۔ ۵	حکمت قرآن، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۹
لد ریاض، ڈاکٹر	اقبال کے خطوط ایک نظر میں	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء ص ۲۳۳
لد ریاض، ڈاکٹر	ایران کے جمہوری اسلامی دور میں علامہ اقبال پر فارسی کتب اور تراجم	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۱۳۷
لتاز حسین، پروفیسر	مسلم نشاۃ ثانیہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ فکر اقبال کے تناظر میں	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۱۲۵
منظر اعجاز	علامہ اقبال کے نظام فکر پر مولانا روم کے اثرات	روح ادب، کلکتہ مارچ ۹۲ء ص ۵۰
احید عشرت، ڈاکٹر	فردوسی اور اقبال میں چند نادر فکری مماثلتیں	اقبال، لاہور جولائی ۹۱ء ص ۱۲۷

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
انفرادیت اور بلند معیار کا ذوق رکھنے والی خواتین کی اولین پسند این فرینچ
Anne French
Anne French
MPL

گرد و پیش

سیّد ضمیر جعفری کے ساتھ ایک شام

۲۰ فروری کو ممتاز شاعر سیّد ضمیر جعفری کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اپنی روایت کے مطابق نیپا آڈیٹوریم میں ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ انجمن کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے جلسے کی صدارت کی۔ صدر کے ہمراہ انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی بھی اسٹیج پر تشریف رکھتے تھے۔

جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جلسے کی کارروائی کی ابتدا ڈاکٹر اسلم فرخی، مشیر علمی و ادبی انجمن کے تعارفی کلمات اور ان کے "خاکہ نما" سے ہوئی۔ انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی نے کہا میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ضمیر بھائی کی شخصیت کے حوالے سے معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔ ان سے میری ذاتی نیازمندی کا رشتہ پچاس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ میں ضمیر بھائی کو خاصا جانتا ہوں، عالی صاحب نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ضمیر جعفری صاحب کی ایک خصوصیت جو میرے نزدیک بہت اہم ہے وہ یہ کہ انھیں کبھی کسی کی برائی کرتے ہوئے نہیں پایا۔ میں بڑے فخر کے ساتھ انجمن کے اس جلسے میں ضمیر جعفری صاحب کا استقبال کرتا ہوں، وہ ایک بڑے شاعر اردو، خادم ادب، دوست کے دوست اور بھائیوں کے بھائی ہیں۔

عالی صاحب کے اظہار خیال کے بعد جناب احمد ہمدانی نے اپنے مضمون میں کہا کہ ضمیر جعفری صاحب کا طرز مزاح، بناوٹ کی ضد ہے، اس سے ثابت ہوا کہ مزاحیہ شاعری کسی طرح بناوٹ برداشت نہیں کر سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری پھکڑپن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ انھوں نے شائستگی کے دائرے میں ہر بات کہی ہے۔

جناب آفتاب احمد خاں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جناب ضمیر جعفری کی شخصیت میں ایسی جاذبیت ہے کہ انھیں دیکھتے ہی آدمی اُس طرف کھنچتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں اکبرالہ آبادی کے بعد مزاح میں سیّد ضمیر جعفری اور سیّد محمد جعفری دو بڑے نام ہیں۔

جلسے کے درمیان میں جناب راغب مرادآبادی کی فی البدیہہ رباعیات پڑھ کر سنائی گئیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ایک مقالہ "سیّد ضمیر جعفری شخصیت اور شاعری" پڑھا۔ انھوں نے کہا ممکن ہے کہ میں ضمیر جعفری صاحب کی شاعری کا سخن فہم ہونے کا دعویٰ نہ کر سکوں، لیکن میں اُن کی شاعری کا طرفدار ضرور ہوں، میں ان کی شاعری کو اُس قبیلہ کی شاعری سمجھتا ہوں جو ترقی پذیر سماجوں میں منافقت، ریاکاری، بے انصافی اور منزل سے پیہم دوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ہے۔

صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے مہمان خصوصی جناب ضمیر جعفری کی پہلے گلپوشی کی اور بعد ازاں انجمن کی جانب سے ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں "نشانِ سپاس" پیش کیا۔ سیّد ضمیر جعفری نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ خواتین و حضرات کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔ مزاح نگاروں کے فیلڈ مارشل شفیق الرحمن نے ایسے موقع کے لیے ایک نسخہ بتایا تھا کہ بسم اللہ کہہ کر کھڑے ہو جاؤ۔ بولے چلے جاؤ اور جہاں گرامر کے اعتبار سے جملہ صحیح ادا ہو وہیں رک جاؤ۔ میں اس وقت ادبی سپریم کورٹ میں کھڑا ہوں ایسے میں کسی بھی فرد کا جو حال ہو سکتا ہے وہی میرا ہے میرے لیے انجمن ترقی اردو کا "نشان سپاس" "تمغۂ قائداعظم" سے کم نہیں!

آخر میں صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے فرمایا کہ سیّد ضمیر جعفری سے میری ملاقات جولائی ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی اس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن سے میری پرانی یاداللہ ہے۔ میں جعفری صاحب کی شخصی خوبیوں کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اُس کا اظہار عالی صاحب نے پہلے ہی کر دیا ہے۔ بہرحال میں جناب ضمیر جعفری کا ممنون ہوں کہ وہ ہماری درخواست پر انجمن کی اس تقریب میں تشریف لائے اور ہمیں عزت بخشی۔

ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی کی انجمن میں آمد

۲۲ فروری ۱۹۹۳ء کو الٰہ آباد سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے انجمن کے دفتر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تقریب کی صدارت انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی نے فرمائی۔ مہمان ادیب و ناقد کا تعارف کراتے ہوئے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا کہ ہمارے لیے خوشی کا موقع ہے کہ ہمارے درمیان الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیرمین موجود ہیں ڈاکٹر صاحب اپنا مقالہ "غزل کی کلاسیکیت بحران میں ہے" پڑھیں گے۔

ڈاکٹر عقیل رضوی نے اپنے مقالے میں تفصیل سے اُس صورت حال پر اندیشہ ظاہر کیا ہے جس کے تحت غزل کی ہیت اور مواد میں یکسر تبدیلی رونما ہو رہی ہے اس کی کلاسیکی تعمیر و تشکیل اور سالہا سال کی مشق و مزاولت سے تیار کردہ ایک خاص معیار شکست و ریخت کی زد میں ہے جسے ہم شائستگیٔ بیان کا معیار کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عقیل رضوی کے قراتِ مقالہ کے بعد ڈاکٹر رضوی کی اجازت سے اس پر گفتگو کا آغاز جناب جمیل الدّین عالی نے یہ کہہ کر کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس وقیع مقالے میں کئی طرح کے سوالات اٹھائے ہیں اور خود ان کے جوابات بھی دیے ہیں۔ اس میں کچھ سوالات و مباحث وقتی نوعیت کے بھی آئے ہیں اس لیے یہ مقالہ وقتی بھی ہے اور عالمانہ بھی، ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کہا کہ مقالہ بہت OBJECTIVE ہے۔ غزل کی اعلیٰ روایت کی تعمیر میں برسہا برس لگے ہیں جب کسی صنف میں نیا تجربہ ہو رہا ہو تو ایک دم سے وہ کچھ بن جائے گی، کی توقع ذرا قبل از وقت ہے، کچھ باتیں بشیر بدر اور دوسرے شعرا کی مقبولیت کے حوالے سے اس مقالے میں آئی ہیں وہ OVER SAID معلوم ہوتی ہیں۔ جواب میں ڈاکٹر محمد عقیل رضوی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ اس مقالے میں GENRALIZATION ہے لیکن اس میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ میرا ذاتی مطالعہ ہے۔

محمد رضا کاظمی نے قصیدہ نگاری کی صارفیت اور آج کی شاعری کی صارفیت پر سوال کیا شہزاد منظر نے ڈاکٹر رضوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا آپ نے اپنے مضمون میں بی کلاس شاعروں کا حوالہ دیا ایسے شعرا کو ہم اردو ادب کا نمائندہ کیوں کر مانیں؟ جواب میں ڈاکٹر عقیل رضوی نے کہا کہ ایسا نہیں ہے سارے کے سارے وہ شعرا ہیں جن کی حیثیت مسلم ہے ہم نے اپنے موقف کی تائید

کے لیے آپ کے ہاں کے ساقی فاروقی، ظفر اقبال، ابن انشا، جون ایلیا، شہزاد احمد اور منیر نیازی کے کلام سے مثالیں دی ہیں۔

پروفیسر عتیق صاحب نے کہا دراصل مسئلہ جدید و قدیم کا نہیں معیار کا مسئلہ ہے۔ غزل میں اب جو تبدیلی دیکھنے میں آرہی ہے اس کا معیار کیا ہوگا؟ جواب میں عقیل رضوی نے کہا معیار اب ہم نہیں بنا سکتے معیار کا تعلق سننے والے کے معیار سے ہے۔

عالی صاحب نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے شعر کی جمالیاتی تعبیریں بدل رہی ہیں، ہمیں بھی حُسن کا معیار بدلنا ہوگا آپ ہمارے ہاں کے رسائل اوراق، فنون یا سیپ دیکھتے ہوں گے اگر اوسط تناسب کے حساب سے غزل کو دیکھیں گے تو بھی آپ کا یہ خوف قائم رہے گا کہ اس کے معیار میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے لیکن خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ذرا ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ قدما کے وقت میں بھی غیر جمالیاتی شعرا کا شاعری پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ لیکن آج ان ہزاروں میں سے بہ مشکل پچاس کو ہم جانتے اور مانتے ہیں غزل میں جو موجودہ رجحان دیکھا جا رہا ہے جس کی طرف ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں جا بجا اشارہ کیا ہے اس میں نویلا پن ضرور دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت غالب، رجحان کی اب بھی نہیں ہے۔ پروفیسر عتیق نے بڑی اچھی بات کہی ہے ہر دور میں ادب عالیہ کا ایک معیار ہوتا ہے اور اس کا تعین بھی وہی کرتے ہیں جو اُس دور میں لکھ رہے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عقیل رضوی کے اس مقالے نے ایک علمی مباحث کی فضا پیدا کر دی تھی حاضرین محفل چاہتے تھے کہ گفتگو کا سلسلہ جاری رہے لیکن وقت کی تنگی نے گفتگو کو سمیٹنے پر مجبور کیا تقریب کے اختتام پر حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی۔

دو روزہ پروفیسر احتشام حسین بین الاقوامی سیمینار

دو روزہ پروفیسر احتشام حسین بین الاقوامی سیمینار ۱۱، ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء ارتقا سیمینار کمیٹی کراچی کی جانب سے نیپا آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان، برطانیہ، امریکہ، کناڈا کے مشاہیر علم و ادب نے پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت و فن پر مقالے پڑھے۔

جمعرات ۱۱ فروری ۱۹۹۳ء کو سیمینار کا پہلا اجلاس ۴ بجے سہ پہر کو شروع ہوا اس کی صدارت جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے نصرت نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر حمایت علی شاعر نے انجام دیے۔ پروفیسر محمد نصیر نے اپنے مضمون "ارتقا کی کہانی کچھ اپنی کچھ اُن کی زبانی" کے ذریعے سہ ماہی ارتقا کا تعارف کرایا۔ طلوع افکار کے مدیر حسین انجم نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ ایسی محفل جہاں ایسے ایسے مقتدر صاحبانِ علم و ادب موجود ہوں، وہاں میرا لب کشائی کرنا پھول پر عطر ملنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر حسین محمد جعفری چیرمین ارتقا سیمینار کمیٹی نے اپنا تعارفی مقالہ "پروفیسر احتشام حسین۔ شخصیت اور جہتیں" پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے کہا احتشام حسین ایک متوازن راستے کا نام ہے اور ان کا مطالعہ ترقی پسند تحریک کے تسلسل کا مطالعہ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے شاگرد رشید ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے کلیدی خطبہ میں تفصیل سے اپنے استاد محترم کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی انھوں نے کہا آج میں جو کچھ ہوں سب احتشام صاحب کی بدولت ہے وہ صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار تھے درمیان میں صدر جلسہ جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے نصرت کو زیبا علوی صاحبہ نے ارتقا کا ایک پیکٹ بہ طور تحفہ پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ نے پہلے اجلاس کی کارروائی کو سمیٹتے ہوئے کہا میں پروفیسر احتشام حسین کا شاگرد تو نہیں تھا البتہ اُن کے ایک استاد ڈاکٹر اعجاز حسین کا شاگرد تھا ڈاکٹر اعجاز حسین کا پر تو اگر کسی کو کہا جا سکتا ہے تو وہ احتشام حسین

تھے۔

آخر میں پروفیسر حسن عابد سیکریٹری ارتقا کمیٹی نے کلمات تشکر پیش کیے

دوسرے اجلاس کی صدارت الہ آباد سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی نے فرمائی نظامت کے فرائض سندھی اور اردو کے معروف شاعر تاج بلوچ نے انجام دیے۔ تاج بلوچ نے کہا کہ پروفیسر احتشام حسین اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے غلاموں کو جگا کر آزادی کا مفہوم سمجھایا اس اجلاس میں جناب رؤف نظامانی، ڈاکٹر شاہ علی، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر محمد حسن نے پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت اور جہات پر اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالی۔ جناب رؤف نظامانی نے احتشام حسین کی تصنیف "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ کا مطالعہ" کے حوالے سے اظہار خیال کیا، سحر انصاری کے مقالے کا عنوان "احتشام حسین بحیثیت شاعر" تھا، ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے مقالے "احتشام حسین اور پلاخانوف ... چند اشارے" میں دونوں کے درمیان مطابقت تلاش کرنے کی سعی کی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مقالے میں کہا کہ پروفیسر احتشام حسین ذہن کو بند کر دینے والی اجارہ داری کے خلاف تھے خواہ وہ نظریاتی ہی کیوں نہ وہ "نگار" جیسی کھلم کھلا آزادیٔ فکر کی روایت کے ادیب تھے۔

اس موقع پر جناب شاہد نقوی نے نذرانہ عقیدت کے عنوان سے منظوم خراج عقیدت اور جناب واحد بشیر نے صدر جلسہ کو ارتقا کا پیکٹ پیش کیا صدر جلسہ ڈاکٹر عقیل رضوی نے پہلے دن کے دوسرے اجلاس کی کارروائی سمیٹتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین کی ایک بہت اچھی نظم "نہ جا" کا ذکر کیا جو اختر شیرانی کے طرز میں کہی گئی ہے۔ یہ نظم اپنا ایک پس منظر رکھتی ہے اور جس میں الہ آباد میں سیاسی دھرنا دینے والی ایک خاتون پورنیما بنرجی کی جھلک نظر آتی ہے۔

جمعہ ۱۲ فروری کو اس سیمنار کا پہلا اجلاس ۳ بجے سہ پہر شروع ہوا۔ جس کا موضوع "اردو ادب اور ترقی پسند تحریک پروفیسر سیّد احتشام حسین کے اثرات" تھا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے فرمائی نظامت کے فرائض جناب افضال احمد شیروانی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر نوازش علی رضا، پروفیسر عتیق احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی نے مقالات پڑھے۔ معروف شاعر جناب قمر ہاشمی نے پروفیسر احتشام حسین کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

پروفیسر احتشام حسین بین الاقوامی سیمنار کے آخر اجلاس کی صدارت ہمدرد فاؤنڈیشن کے چیئرمین جناب حکیم محمد سعید نے فرمائی پریزیڈیم میں ان کے ساتھ جناب جمیل الدّین عالی، جناب حسین محمد جعفری اور ڈاکٹر محمد حسن موجود تھے۔ حکیم محمد سعید صاحب کے چلے جانے کے بعد کرسی صدارت ڈاکٹر محمد حسن نے سنبھالی اجلاس کی نظامت کے فرائض محترمہ فاطمہ حسن نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں جناب عاشور کاظمی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور جناب خلیق ابراہیم نے مقالات پڑھے۔ اجلاس کے آخر میں ڈاکٹر حسین جعفری نے سیمنار کا جائزہ پیش کیا اس کے بعد صدر جلسہ نے کارروائی کو سمیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا پروفیسر حسن عابد سیکریٹری ارتقاء سیمنار کمیٹی نے اظہار تشکر کے ساتھ دو روزہ پروفیسر احتشام حسین بین الاقوامی سیمنار اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر عقیل رضوی غالب لائبریری میں

پچھلے دنوں غالب لائبریری میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چیرمین ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی صدارت غالب لائبریری کے جنرل سیکریٹری جناب مختار زمن نے فرمائی انھوں نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عقیل صاحب ان دنوں الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے چیرمین ہیں۔ کبھی اس مادرِ علمی سے ہمارا

بھی تعلق رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر عقیل رضوی نے کہا کہ مختار زمن صاحب کو ہم ۱۹۴۶ء سے جانتے ہیں۔ جب وہ "ڈائرکٹ ایکشن ڈے" کے لیڈر کی حیثیت سے سرگرم تھے۔

ڈاکٹر عقیل رضوی کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کی یہ محفل فن افسانہ نگاری پر گفتگو کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی اس لیے حاضرین محفل میں کراچی کے بیشتر افسانہ نگار موجود تھے، ان افسانہ نگاروں کی نمائندگی کے لیے مائیک پر پروفیسر علی حیدر ملک کو بلایا گیا، انھوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ افسانہ نگاری کا فن ہو یا کوئی بھی صنف سخن اس پر بات کرنے سے پہلے مبادیات طے کر لینے چاہئیں ورنہ مباحث مطلوبہ نتائج تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر سیّد عقیل رضوی نے ساٹھ کی دہائی سے اس وقت تک افسانوی دنیا میں جو انقلابات آئے تھے ان کا سرسری جائزہ لیا پھر علامت نگاری کی طرف راغب ہوئے انھوں نے بتایا کہ علامتی افسانہ کا شاخسانہ انور سجاد سے شروع ہوا ہندوستان میں اس طرح کی ابتدا بلراج منیرا نے کی۔ خالدہ حسین کا افسانوی مجموعہ "پہچان" اور رشید امجد کے کئی افسانوی مجموعے علامت نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔ آپ کے ہاں سے ہمارے ایک دوست احمد ہمیش نے بھی اس طرز کے دو ایک افسانے لکھے ہیں لیکن میرا خیال ہے انھیں پڑھ کر قاری دس بیس قدم بھی ابکائی کے بغیر آگے نہ جا سکے گا۔ اب ایسا دیکھنے میں آرہا ہے کہ سریندر پرکاش وغیرہ نے اپنا راستہ بدل لیا ہے آج کل ان کے افسانے بیانیہ اور علامت کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عقیل رضوی نے ناول پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ناولوں میں خاصا SETBACT آیا ہے۔ قرۃ العین حیدر تقسیم کے پرابلم کے دائرے سے نکل نہیں سکی ہیں۔

علی حیدر ملک نے ڈاکٹر عقیل رضوی کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں. جدلیاتی عمل بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں علامت نگاری کے حوالے سے انتظار حسین، انور سجاد، رشید امجد اور خالدہ حسین بے شک بامعنی افسانہ نگار ہیں لیکن علامت نگاری کے مطالبے اور مزاج کو سمجھے بغیر اس میدان میں مقلدوں اور نقالوں کا ایک گروہ جو آ گیا وہ علامت نگاری کے رجحان کو بدنام کرنے کا باعث ہوا علی حیدر ملک کے بعد نعیم آروی اور مشرف احمد نے بھی مباحث میں حصہ لیا اور پھر یہ سلسلہ اختتام کو پہنچا۔

غالب کی برسی کے موقع پر انجمن میں جلسہ

۱۶ فروری ۱۹۹۳ء کو انجمن کے دفتر میں غالب کی برسی کے موقع پر ایک خاص جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب مختار زمن نے فرمائی۔ صدر کے ہمراہ انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی تشریف رکھتے تھے جناب شان الحق حقی نے "غالب کی ابہام گوئی" اور جناب افتخار احمد عدنی نے "غالب کے تصرفات" کے عنوان سے مقالے پڑھے ڈاکٹر فہیم صاحب کے مقالے کا عنوان "عندلیب گلشن ناآفریدہ" تھا جناب حمید الدین شاہد نے بھی ایک مقالہ "غالب ایک ہمہ جہت شاعر" پڑھا۔ چاروں مقالات اس اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں کہ ان میں غالب پر کسی نہ کسی نئے زاویے سے روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ بہرحال چاروں وقیع مقالوں کی شمولیت کی وجہ سے اس مخصوص جلسہ میں ایک بڑے جلسہ کی شان پیدا ہو گئی تھی۔

میجر آفتاب حسن انتقال کر گئے

ممتاز سائنسی اور ادبی شخصیت اور سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کے معتمد میجر آفتاب حسن کا جمعہ کی صبح اپنی قیام گاہ پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا "اناللہ و انا علیہ راجعون" ان کی عمر ۸۴ سال تھی انھوں نے پسماندگان میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ انھیں بعد نماز عصر شاہ سلیمان روڈ قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا جنازے میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سید ارتفاق علی، پروفیسر ابوالخیر کشفی، ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر منظور احمد، پیرزادہ قاسم، جامعہ کراچی اردو کالج کے اساتذہ کرام، انجمن ترقی اردو اور مقتدرہ قومی زبان کے عہداداروں، مرحوم کے شاگردوں اور عزیز و اقارب نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ میجر آفتاب حسن کے سوئم کی قرآن خوانی کا اہتمام ۲۸ فروری کو ظہر اور مغرب کے درمیان مرحوم کی قیام گاہ بنگلہ نمبر ا امیر خسرو روڈ میں کیا گیا تھا۔ مرحوم کے صاحبزادے شمس الحسن نے بتایا کہ میجر آفتاب حسن پر دو ماہ قبل دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد وہ اسپتال سے گھر آ گئے اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق صبح کو واک کرنے گئے تھے اور واپس آکر کرسی پر ارام کر رہے تھے۔

میجر آفتاب حسن ۱۶ ستمبر ۱۹۰۹ء کو بازید پور بہار میں پیدا ہوئے، دس سال کی عمر تک گھر پر قرآن کریم اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی، میٹرک علی گڑھ سے ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۲ء میں بی ایس سی اور ۱۹۳۳ء میں ایم ایس سی کیا اور اس کے بعد ہی ۱۹۳۳ء میں شادی ہو گئی۔ جب کہ ۱۹۳۶ء میں لندن یونیورسٹی سے بی ایس سی اسپیشل کی ڈگری حاصل کی، میجر آفتاب حسن نے ۱۹۳۷ء میں انسپکٹر تعلیم سائنس حکومت حیدر آباد دکن سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ۱۹۴۸ء تک حیدر آباد دکن میں دارالتصنیف جامعہ عثمانیہ اورنگ آباد کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہے، جس کے بعد پاکستان آ گئے اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکل کے صدر شعبۂ سائنس اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں اردو کالج کراچی کے پرنسپل ہو گئے وہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۳ء تک جامعہ کراچی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک مقتدرہ قومی زبان کے معتمد جبکہ اسی دوران ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک مقتدرہ قومی زبان کے قائم مقام صدر نشین بھی رہے۔ میجر آفتاب حسن ۱۹۵۵ء سے تاحال سائنٹفک سوسائٹی کے سیکریٹری تھے میجر آفتاب حسن نے اپنی ساری زندگی قومی زبان اردو میں سائنسی علوم کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی انھوں نے جامعہ کراچی میں شعبہ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ پاکستان میں اردو زبان کے ذریعے سائنس کی تعلیم کی ابتدا کی۔ انھوں نے سابق صدر ضیاء الحق کے دور میں اردو ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کے لیے کلیدی تختی تیار کی، جس کی کابینہ نے منظوری دے دی اس طرح پہلی بار پاکستان میں اردو ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر تیار کرایا گیا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی)

قومی زبان کو فی الفور نافذ کیا جائے

ادارۂ علم و ادب کوہاٹ کے صدر، جناب محبت خان بنگش نے حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان کو فوری طور پر دفتروں میں نافذ کیا جائے اور اسے سرکاری و قومی زبان قرار دیا جائے تاکہ اردو زبان کو اس کا جائز حق اور مقام مل سکے۔

جناب محبت خان بنگش نے کہا کہ بانئ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے صاف طور پر اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا ۱۹۴۸ء میں اعلان کیا تھا۔ انھوں نے کہا بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، بانئ پاکستان کے اس اعلان کی روشنی میں اردو کو قومی زبان کا مقام دلانے کے لیے تاحیات جدوجہد کرتے رہے۔

جناب محبت خان بنگش نے کہا کہ ہر حکومت نے اس امر کا وعدہ بلکہ اعلان بھی کیا کہ قومی زبان اردو کو سرکاری طور پر
تروں میں نافذ کیا جائے گا۔ لیکن افسوس کہ اب تک کسی بھی حکومت نے عملی اقدامات نہیں کیے۔ محبت خان بنگش نے کہا کہ
دو کو فی الفور سرکاری دفاتر میں نافذ کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔ تاکہ قومی زبان اردو کو اس کا جائز حق اور مقام مل سکے۔
نھوں نے ملک بھر کے دکانداروں سے بھی اپیل کی کہ وہ اپنے اپنے سائن بورڈ انگریزی کے بجائے اردو میں لکھوا کر آویزاں
ریں۔

انھوں نے اہلِ قلم سے بھی اپیل کی کہ وہ اپنے تنظیموں کے نام انگریزی کی بجائے اردو میں رکھیں تاکہ اردو زبان کا قومی
تشخص برقرار رہ سکے اور ملک کی قومی زبان کو اس کا جائز حق اور مقام مل سکے۔

سیّد احمد کی رحلت

۷ مارچ ۹۳ء کو دل کا دورہ پڑنے سے جناب سیّد احمد کا انتقال ہوگیا، وہ بہت اچھے خوش نویس تھے اور ایک عرصہ سے انجمن
ترقی اردو پاکستان سے شائع ہونے والی کتب اور رسائل بالخصوص "قومی زبان" کی کاپی پیسٹنگ کا کام انجام دیتے تھے۔ انھوں نے
خوش نویسی کا آغاز پٹنے کے ایک اخبار سے کیا تھا، کئی سال "جسارت" کراچی سے منسلک رہے۔ ادارہ "قومی زبان" سیّد احمد صاحب
کے اچانک انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے
لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مشہور شاعر حبیب جالب کی رحلت

مشہور شاعر حبیب جالب جمعہ ۱۲ مارچ ۹۳ء کی رات شیخ زید اسپتال، لاہور میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹروں کے مطابق انھیں دل
کا شدید دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

حبیب جالب شاعر عوام کہے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس اعتبار سے کوئی دوسرا نام ان کا ہم سر نہیں، ان کے انتقال سے
ایک مخلص اور عوام دوست شاعر ہم سے جدا ہوگیا ہے۔ یہ کمی ایک عرصے تک اردو ادب میں محسوس کی جائے گی۔ ان کے انتقال پر
انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی اور ملک کی دیگر مقتدر شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

ادارہ "قومی زبان" مرحوم کے سانحہ ارتحال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں
جگہ دے اور لواحقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

(حبیب جالب کے جو شعری مجموعے اُن کی زندگی میں شائع ہوئے ان میں "برگ آوارہ"، "سرِ مقتل"، "گوشے میں قفس
کے"، "عہد ستم"، "ذکر بہتے خون کا"، "حرف حق"، "اس شہر خرابات میں"، اور کلیات، "حرفِ سردار" قابلِ ذکر
ہیں۔)

شمیم صبائی متھراوی

گزشتہ سال جُدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ
(۱۹۹۲ء)

(۱۸)
"حُزنِ ترحیلِ عشرت رحمانی"

۱۹۹۲ء

بزم ہستی سے اٹھ گئے عشرت
ہوئی رحلت. ملال آگیں لکھ
اے شمیم ان کے سالِ غم کے لیے
"مرگ عشرت ملال آگیں" لکھ

۱۴۱۲ھ

(ممتاز شاعر و مصنّف اور براڈکاسٹر جناب عشرت رحمانی نے ۲۰ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۱۵ رمضان المبارک ۱۴ھ بروز جمعہ بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی تدفین پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں ا، میں آئی۔)

(۱۹)
"اُف غمِ ہجر خالد وحید"

۱۹۹۲ء

آپ تھے اک کاروباری شخصیت
غم فزا فُرقتِ خالد وحید

بن گئی تاریخِ رحلت اے شمیم
"اطلاعِ رحلتِ خالد وحید"

۱۴۱۲ھ

(فیروز الدین مرحوم کے پوتے، شاعر مشرق علامہ اقبال کے داماد اور ممتاز کاروباری اور سماجی شخصیت جناب خالد وحید نے ۲۴ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز منگل بعمر ۵۲ سال اسلام آباد میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو منگل کی شام لاہور میں سپردِ لحد کر دیا گیا۔)

(۲۰)

"سانحۂ موتِ میاں حیات بخش"

۱۹۹۲ء

جس گھڑی جانبِ بہشت شمیم
تج کے دنیا حیات بخش چلے
بولا ہاتف برائے سالِ فنا
"والا جا ہا حیات بخش چلے"

۱۴۱۲ھ

(تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن، مسلم لیگی رہنما، راولپنڈی کی معروف سیاسی اور سماجی شخصیت اور انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کے سابق چیئرمین میاں حیات بخش نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۲ء مطابق ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز ہفتہ بعمر ۹۴ سال اسلام آباد میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی تدفین اتوار ۲۹ مارچ کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اُن کے آبائی قبرستان ڈھوک کھبہ راولپنڈی میں عمل میں آئی۔)

(۲۱)

"اسعد گیلانی بادشاہِ گلخانۂ بہشت"

۱۹۹۲ء

اسعد بچھڑے ہم سے، دعا کر
اُن کو سکونِ مرقد پہنچے
نکلا ان کا سالِ رحلت
"باغِ جناں میں اسعد پہنچے"

۱۴۱۲ھ

(معروف مذہبی اسکالر، ادیب، مصنّف، سابق رکن قومی اسمبلی اور جماعت اسلامی لاہور کے امیر ڈاکٹر سید اسعد گیلانی نے ۳ اپریل ۱۹۹۲ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز جمعہ بعمر ۷۰ سال اسلام آباد کے پولی کلینک ہسپتال میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کا جسدِ خاکی لاہور لے جایا گیا اور تدفین ہفتہ کو علامہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۲۲)

"وقتِ مرگِ افضل صدیقی صاحب"

۱۹۹۲ء

دنیا سے چلے "امن" کے ممتاز مدیر
ہے رنج فزا ہائے وفاتِ افضل
تاریخ اجل کی ہوئی جب فکر شمیم
ہاتف نے کہا "ہائے وفاتِ افضل"

۱۴۱۲ھ

(روزنامہ "امن" کے ایڈیٹر، ممتاز صحافی اور براڈ کاسٹر جناب افضل صدیقی نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۲ء مطابق ۱۲ شوال ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۶۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اُسی دن سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں عزیز آباد کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۲۳)

"یومِ فراقِ فیض بخشا پوری"

۱۹۹۲ء

غالبِ سندھ کا خطاب
جس کو ملا وہ ذاتِ فیض
چل بسی ہے تو کہہ شمیم
"آج ہوئی وفات فیض"

۱۴۱۲ھ

(اردو اور سندھی کے ممتاز شاعر اور صحافی جناب فیض بخشا پوری (نام فیض اللہ ڈومکی، خطاب غالبِ سندھ) نے ۱۴ مئی ۱۹۹۲ء مطابق ۱۰ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ بروز جمعرات بعمر ۶۸ سال جیکب آباد میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ان

کے آبائی گاؤں بخشا پور میں اسی شام سپرد خاک کر دیا گیا۔)

(۲۴)

"صدمہ فراقِ اختر بجنوری"

۱۹۹۲ء

وطن کا نامور شاعر
اُٹھا سوئے جناں اختر
شمیم اس کی خبر کردو
"گیا سوئے جناں اختر"

۱۴۱۲ھ

(ممتاز شاعر جناب اختر بجنوری (نام سیّد اختر علی شاہ) نے ۱۸ مئی ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ بروز ؛ کراچی میں رحلت فرمائی۔)

(۲۵)

"مرقدِ سراجِ ہدایت پیر آفتاب احمد قاسمی"

۱۹۹۲ء

والئ موہڑہ شریف اُٹھے
آج پھر موت کامیاب ہوئی
اُن کی تاریخ انتقال شمیم
"خبرِ وصلِ آفتاب" ہوئی

۱۴۱۲ھ

(امام العارفین پیر طریقت حضرت پیر آفتاب احمد قاسمی صبغتہ اللہ والئ موہڑہ شریف کوہ مری نے ۲۵ مئی ۱۹۹۲ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ بروز پیر بعمر ۴۶ سال اسلام آباد میں انتقال فرمایا۔)

(۲۶)

"اختر حسین رائے پوری جویائے مُلکِ عدم"

۱۹۹۲ء

ایک نامی گرامی ادیب آپ تھے
سوئے ملکِ عدم کر گئے کُوچ جو
ان کی رحلت پہ ہاتف شمیم حزیں
کہہ اُٹھا "چل بسے اخترِ نیکِ گو"

۱۴۱۲ھ

(اردو کے معروف ادیب، دانشور، نقاد، مترجم اور افسانہ نگار ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ۲ جون ۱۹۹۲ء مطابق ۲۹ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ بروز منگل بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو عصر کی نماز کے بعد پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا۔)

(۲۷)

"اختر حسین جعفری کی مرگ"

۱۹۹۲ء

بزم دنیا سے جناب اختر حسین
اپنا رشتہ منقطع کر بھی گئے
بولا ہاتف ان کی رحلت پر شمیم
"ہائے اب دنیا سے اختر بھی گئے"

۱۴۱۲ھ

(معروف شاعر جناب اختر حسین جعفری نے ۳ جون ۱۹۹۲ء مطابق یکم ذی الحج ۱۴۱۲ھ بروز بدھ بعمر ۶۰ سال لاہور میں رحلت فرمائی مرحوم کی تدفین ۴ جون کو شادمان قبرستان میں عمل میں آئی۔)

مئی ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۵

مضمون نما

عنوان	مصنف	صفحہ
غالب کی ایہام گوئی	شان الحق حقی	۵
عندلیب گلشنِ ناآفریدہ	ڈاکٹر فہیم اعظمی	۱۳
غالب میری نظر میں	پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد	۱۹
فکشن اور تنقید	ڈاکٹر سہیل احمد خاں	۲۵
پہلی موت ایک تجزیہ	امتیاز احمد	۳۳
یادوں کا سفر... بابا زمین شاہ تاجی	افتخار احمد عدنی	۳۷
گلہائے رنگ رنگ		
ماہ جبیں (ایرانی کہانی)	سیّد مہدی شجاعی / معین نظامی	۴۵
درد کا نیزہ (سندھی)	تاج بلوچ / محسن بھوپالی	۵۰
مالِ غنیمت O تیری طرف	ایریش فریڈ / منیر الدین احمد؛ شیخ ایاز / آفاق صدیقی	۵۱
قبرستان اور بچے O اکیلا آدمی	یش مالویہ / شکیل فاروقی O زاہد حسن / اجمل نقوی	۵۲
مسٹر اور مسز ایلیٹ (انگریزی)	ہیمنگوے / ماہ جبیں قیصر	۵۳
رفتارِ ادب	ا۔ س، شہاب قدوائی	۵۷
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۶۳
جدّہ کے دو مشاعروں کا احوال	نسیم سحر	۶۹
گرد و پیش	....	۷۳
گزشتہ سال جدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ	شمیم صبائی متھراوی	۷۹
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۵
حروفِ تازہ	....	۹۲

بدل اشتراک
فی پرچہ ——— ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ مُلک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

قومی زبان (۲) مئی ۱۹۹۳ء

خوشحالی کی ضمانت

زیادہ اُگائیے، پیداوار بڑھائیے اور زیادہ سے زیادہ برآمد کیجئے۔
برآمدات میں جتنا اضافہ ہوگا اتنا ہی زیادہ زرِمبادلہ حاصل ہوگا
اور دوسروں پر انحصار بھی کم ہوگا۔

حبیب بینک برآمدات بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سالہاسال
سے ملک کی برآمدات کا بڑا حصّہ ہمارے ہی ہاتھوں تکمیل پاتا ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

"نقوشِ سلیمانی" میں علامہ سیّد سلیمان ندوی کا یہ قول کہ "انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال پرائے مال پر دولت مند بننے کی آرزو ہے" بڑی معنویت کا حامل ہے۔ اس کا ایک سیدھا مفہوم تو یہ نکلتا ہے کہ "آرزو" کی یہ بیل کسی صورت منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ لیکن یہ قول اتنا ہی سادہ نہیں اس کے اور بھی مفہوم ہو سکتے ہیں ایک مفہوم یہ نکلتا ہے کہ قومی زندگی میں زبان کی اہمیت سب باتوں پر مقدم ہے اور اس قول کو اس زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کاروبارِ ملک و ملّت کا انحصار جب تک کسی ایسی زبان پر نہ ہو جو سب میں مشترک اور سب کے لیے مشترک ہو ہم بڑے اور نمایاں کام انجام دینے کے قابل نہیں ہوتے۔ بڑے کام سے مراد ملک و قوم کے مفاد میں کیے جانے والے سائنسی اور علمی نوعیت کے کام ہیں جن کا تعلق ایجادات و انکشافات سے ہوتا ہے، جن کی افادیت بہرحال فلاح و بہبود قوم و ملک پر منتج ہوتی ہے۔ ایسی زبان کا اعزاز، قیام پاکستان کے سلسلے میں اس کے تاریخی کردار کے حوالے سے، پاکستان کی لنگوافرینکا ہونے کی حیثیت سے اور آئین میں اُسے قومی زبان کا درجہ دیے جانے کے سبب سے صرف اور صرف اردو کو حاصل ہے۔

اسی نکتہ کو پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے اپنی ایک تحریر "تعلیم و تہذیب" میں ایک اور طرح سے پیش کیا ہے:

"تاریخی اور منطقی عجوبہ ہوگا کہ اہل پاکستان تحصیل علم اور روزمرہ مشاغل میں ایک ایسی زبان سے کام لیتے رہیں جو ان کی تہذیب و تمدّن سے کوئی علاقہ نہ رکھتی اور جس کا بے محابا استعمال طالب علم کے ذہن میں یہ خیال راسخ کرتا ہے کہ روشنی صرف "مغرب" سے طلوع ہو سکتی ہے اور ہماری قوم کا دماغ صرف اندھیرے کا سرچشمہ ہے۔ قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا کوئی اس سے بڑا ذریعہ شاید ہی ممکن ہو"

مذکورہ دونوں حوالوں کا لُبِ لباب یہ ہے کہ ہر نوع قومی و ملی ترقی و یگانگت کی سرگرمیوں کا حقیقی زینہ و سرچشمہ قومی زبان ہے۔ وہ یورپی اور ایشیائی ممالک بالخصوص جرمنی، جاپان، چین، کوریا، جنھوں نے شروع سے قومی زبان کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ وہ شاہراہِ ترقی پر ہمارے مقابلے میں تیز گام اور ملکی فلاح و بہبود کے کام آنے والی سائنسی و علمی ایجادات و انکشافات میں ہم سے بہت آگے نکلتے جا رہے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا کے کسی ملک کے لیے غیر زبان میں کوئی اہم کارنامہ انجام دینا آسان نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن نہیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کیوں نہ ہم پچھتاوے کے لمحوں کے تعاقب سے پہلے ہی ملکی معاملات میں قومی زبان کی سبقت و تقدّم کو تسلیم کر لیں اور اسے کاروبارِ مملکت کے ہر شعبے میں اپنا کردار ادا کرنے کے کھلے مواقع فراہم کریں۔

SHARBAT
ROOH AFZA

رُوح افزا
همدرد
انٹرنیشنل

شان الحق حقی

غالب کی ایہام گوئی

۱۶ فروری کو انجمن کے دفتر میں غالب کی برسی کے موقع پر ایک تقریب منعقد کی گئی۔ اس میں جناب شان الحق حقی، جناب افتخار احمد عدنی، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور جناب حمید الدین شاہد نے غالب کے فن و شخصیت پر مقالے پڑھے۔ جناب افتخار احمد عدنی کا مضمون غالب کے تصرفات اپریل ۹۳ء کے شمارے میں شامل ہے۔ بقیہ تین مضامین قارئین کی دلچسپی کے لیے یکجا شائع کیے جا رہے ہیں۔

صنائع لفظی و معنوی کی بہت سی قسمیں ہیں اور سبھی شاعروں نے ان سے کام لیا ہے۔ ان میں سے ایک ایہام بھی ہے۔ ایہام کا اٹھارویں صدی میں زیادہ زور رہا۔ بہت سے شاعروں نے اسے برتا۔ ہمارے اچھے اچھے اساتذہ کے ہاں اس کی مثالیں موجود ہیں:

آبرو:

نہ دیوے لے کے دل وہ جعد مشکیں
اگر باور نہ ہو تو مانگ دیکھو

سودا:

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہووے مردہ تو دیتا ہے وہ جلا

میر:

کم ہے کیا لذت ہم آغوشی
سب مزے میر در کنار رہے

درد:

ہر کُل کو جز کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے دُرجدا ہے پہ ہے غرق آب میں

مصحفی:

میں زلف منہ میں لی تو کہا مار کھائے گا
چومیں بھنویں تو بولا کہ تلوار کھائے گا

ایہام صنائع معنوی میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن علمائے بلاغت نے صنعتوں کے معاملے میں بڑی موشگافیوں سے کام لیا ہے۔ ایہام اکثر صنعت تجنیس پر مبنی ہوتا ہے جو صنائع لفظی سے تعلق رکھتی ہے۔ مشاکل وغیرہ بھی اسی نوع سے ہیں۔ مگر ان سب میں

باریک فرق ہیں۔ میں سہولت کی خاطر انھیں نظر انداز کرتا ہوں۔ ایہام کے مفہوم میں کسی قدر کشادگی سے کام لے رہا ہوں۔ جو عموماً رعایت لفظی پر مبنی ہوتی ہے خصوصاً تجنیس پر رعایات لفظی کے برتنے میں مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر یہ مقصود بالذات ہوں تو شعر کا پایہ گر جاتا ہے اور وہ لطیفہ بن کر رہ جاتا ہے۔

غالب کی ولادت اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوئی (۱۷۹۸ء) انھوں نے جس ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں اس پر پچھلی صدی کی ایہام گوئی کے اثرات باقی ہوں گے۔ ویسے تو ان کا کہنا ہے کہ:

"نہ آبلہ پائے صنائع معنیم نہ گوہر آمائے رشتۂ بدائع
کبابِ آتش بے رودِ فارسیم و خرابِ بادۂ پر زور معنی

یعنی نہ لفظی صنعتوں کی راہ کے کانٹے پیروں میں چبھوئے ہیں، نہ بدائع کی ڈوری میں موتی پروئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی کثرت سے موجود ہیں۔ غالب کے ہاں صنائع کا استعمال جو فن کے لوازم میں ہیں، بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ ان سب کا تفصیلی مطالعہ ایک الگ تالیف کا محتاج ہے۔ مگر اتنا ہے کہ انھوں نے صرف صنعت کی خاطر شعر نہیں کہے۔ صنعت اگر شعر پر حاوی نہ ہوجائے تو لطف کلام میں اضافہ کرتی ہے۔ اور یہی صورت غالب کے ہاں ہے۔

اردو میں ایہام گوئی کی گنجائش دوسری زبانوں سے زیادہ ہے۔ اس نے دوسری زبانوں کے لغات کو کثرت سے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ ہر طرح کے اسالیب موجود ہیں۔ اسی نسبت سے لفظی صناعی اور بازیگری کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔

ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے
ہر طرف شور ہوا مار چلا مار چلا

یہ ایہام جو "اس لام" اور "مار چلا" میں پیدا ہوا، اردو ہی میں ممکن تھا۔ اس وقت ہمیں صرف غالب کی ایہام گوئی سے بحث ہے۔ لیکن جیساکہ عرض کیا ان کے ہاں دوسرے صنائع لفظی و معنوی بھی افراط سے استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں صرف دو ایک صنعتوں کے نمونے دیکھیے:

صنعت طباق یا تضاد

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

اے نو آموز فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

راعات النظیر:

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
نالۂ دل نے دیے اوراق لخت دل بباد
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا
اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز
جوہر آئنہ کو طوطی بسمل باندھا
سن اے غارت گر جنس وفا سن!
شکست قیمت دل کی صدا کیا

اتفاق سے شارحین غالب نے اس تلازمے کو نظر انداز کیا جو اس شعر میں جنس سے لے کر قیمت اور صدا تک موجود تھا۔ یہاں صدا سے مراد بیچنے والے کی صدا ہے۔ ایک شرح نگار نے یہاں تک کہا کہ قیمت کی جگہ شیشۂ دل کہتے تو بہتر تھا۔

صنعت سیاق الاعداد:

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہاں ایک اور صنعت کی مثال بھی دیکھتے چلیے جسے فوقانیہ کہتے ہیں یعنی شعر میں ایسے الفاظ لانا جن کے تمام نقطے سطر کے اوپر رہیں:

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کہ دل دل ستاں روانہ ہوا

یہ سب مثالیں صرف ردیف الف کے چند اوراق سے لی گئی ہیں۔ سارے دیوان میں اور بھی بہت سی پھڑکتی ہوئی مثالیں ہیں۔
اب ایہام کی طرف آئیے دیوان غالب کی ابتدا ہی ایہام سے ہوتی ہے۔ پہلی غزل کے ہر شعر میں ایہام موجود ہے۔

نقش فریادی ہے. کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر پُر معنی ہونے کے ساتھ صنائع کا مجموعہ بھی ہے۔ اس میں مراعات بھی ہیں استعارہ بھی، تلمیح بھی اور ایہام بھی "کاغذی" کے ایک لفظ میں معنی قریب کے علاوہ دو بعید معانی موجود ہیں جو ایجاز کا کمال ہے، یعنی سراپا فریاد ہونا اور ناپائیدار ہونا۔ غور کیجیے تو "شوخیٔ تحریر" میں بھی نقش گری کے علاوہ تحریر ازل یا نوشتہ تقدیر کی طرف خیال کو راہ ملتی ہے۔ اسی طرح پیکرِ تصویر کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ وہ پیکر جو تصویر میں بنا ہوا ہے۔ لیکن پیکرِ تصویر حسین پیکر کو بھی کہتے ہیں۔ مقابلہ کیجیے آزاد کا بیان رانی پدمنی کی بابت: "وہ عالم تصویر گھونگھٹ نکالے خنجر آبدار ہاتھ میں لیے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ (قصص الہند) تصویر کے معنی نمونہ حسن مسلم ہیں:
رنگین:

سب سے گفتار برا سب سے نرالی کے نکھ سکھ
دانت تصویر ہیں مسّی کی جھاوٹ کافی

اس سے آگے کی ایک غزل میں بھی تصویر کے ساتھ "پردہ" بطور ایہام آیا ہے:

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ میں لفظ رنگ بھی ایہام کا حامل ہے۔ رنگ کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک لفظی ایک مجازی یعنی حالت. کیفیت. انداز۔ اس سے اگلا شعر ہے:

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

لفظ تنگی اور پرافشاں دونوں میں ایہام ہے۔ انقباض یا گھٹن اور گنجائش کی تنگی دونوں مفہوم ہیں۔ اسی طرح تیر کا پر ہوتا ہے اس سے پرافشانی کا استعارہ کیا اور محاورے میں گھبراہٹ، بے چینی کے معنی پیدا ہوگئے۔
اب پہلی غزل کا دوسرا شعر لیجیے۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

سخت جانی کی نسبت تنہا کی جگہ تنہائی سے کی ہے اور مراد تنہا ہے۔ یہ مجاز مرسل کی مثال ہے۔ صبح و شام کا تقابل صنعتِ طباق یا تضاد ہے۔ جوئے شیر میں تلمیح یا کنایہ بھی ہے اور استعارہ بھی۔ جوئے شیر کا لانا اپنی جگہ ایک ذومعنی فقرہ ہے جو ایہام کی تعریف میں آتا ہے۔ تیسرا شعر

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یہاں لفظ دم ایہام کی بیّن مثال ہے جسے ایہام مرشحہ کہتے ہیں۔ دم اور جگہ بھی بطور ایہام آیا ہے:

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

یہاں دم نکلنا لغت اور محاورے میں دو معنی رکھتا ہے۔ چوتھا شعر۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

عنقا اور عالم دونوں الفاظ بطور ایہام آتے ہیں۔ عنقا ہونا محاورے میں ناپید ہونا ہے۔ عالم تقریر میں عالم کے ایک معنی پر کی کیفیت دوسرے دنیا یعنی وہ عالم غیب جو عنقا کا ٹھکانا ہے۔

عنقا کی بابت عرض کردوں کہ اردو میں یہ ع کے پیش کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اصل میں عَنقا بفتحین۔ اردو میں مذکر ہے، ں میں مونث عَنَق کی تانیث لمبی گردن والی یا والا۔ عنقا شدن = ناپیدا ہوجانا فارسی محاورہ بھی ہے۔

لع

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

"آتش زیرپا" کے لفظی و مجازی دونوں معنی سے فائدہ اٹھایا ہے، یہی ایہام ہے وہ صرف لفظ ہی نہیں تراکیب اور فقروں ں ذو معنویت پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے اوپر کھلا

"دیکھا ہی نہیں" بطور ایہام بڑی برجستگی سے آیا ہے۔ اسی طرح ذیل کے شعر میں

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

آخری ٹکڑا بے ساختہ آیا ہے اور لطف کلام پیدا کرتا ہے۔ ایہام کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ نے ذو معنی لفظ استعمال کیا، گویا ایک عطیہ تھا جو آپ کی زبان نے بنا بنایا آپ کو دیا۔ دوسری صورت یہ کہ کسی کنایے یا اتیلافات پیدا ہوئے، معنی کی چھوٹ دور تک پڑی۔ غالب کے انداز کی خصوصیت ایجاز و اختصار ہے خود غزل ایجاز کا تقاضا کرتی ہے۔ یہاں اطناب کی گنجائش نہیں۔ غالب نے صنائع کو ہنرمندی سے برتا ہے اور یہ صرف مقصود بالذات معلوم نہیں ہوتے، بلکہ اکثر غیر محسوس ۔ ۔ رہتے ہیں۔ اوپر صرف متداول دیوان کے اشعار نقل ہوتے۔ قلم زد اشعار میں بھی ایہام جھلکتا ہے۔

مثلاً

خشت، پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع

پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا

قالب یا سانچا اینٹ کے لیے آغوش وداع ہے کہ تیار ہوئی اور چلی۔ قالب کا اطلاق انسانی جسم پر بھی ہوتا ہے۔ اور مفہو کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

لذتِ ایجاد ناز افسونِ عرض ذوقِ قتل
نعل آتش میں ہے تیغِ یار سے نخچیر کا

مقطع کی طرح جہاں موئے آتش دیدہ آیا تھا، یہاں نعل درآتش کا کنایہ ہے۔ پہلی غزل کی طرح ذیل کی زمین کے تما اشعار میں بھی ایہام موجود ہے۔

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہیں سکوں

اسی طور سے بعض جگہ ایہام مسلسل اشعار میں آیا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے مجھ سے
تکلف برطرف نظارگی میں بھی، سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحۂ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پُرشکن کی آزمائش ہے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے
اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ نبرد عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

یہاں لفظ گرم سے استعارہ اور اس سے ایہام پیدا کیا ہے۔

شور جولاں تھا کنار بحر پر کس کا کہ آج
گرد ساحل ہے بہ زخم موجۂ دریا نمک

لفظ سوز کی ذو معنویت سے فائدہ اٹھائیے۔

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

تمثال شیریں میں کنایہ بھی ہے تلمیح بھی استعارہ بھی اور ایہام بھی تمثال شیریں کے معنی شیریں کی تصویر بھی ہیں اور دلچسپ مثال بھی جسے کہتے ہیں جس: بات شیریں یا اقوالِ شیریں، یعنی اس نے ایک لطیف و پر معنی مثال قائم کی ہے۔

یہ غالب کے ہاں صناعی کی چند جھلکیاں تھیں۔ اہل بلاغت نے ان کی بہت سی اقسام گنائی ہیں اور ان کی مثالیں غالب کے ہاں قدم قدم پر موجود ہیں اس کا احاطہ اس مضمون میں ممکن نہ تھا اب میں اسے انھی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو خود بھی ایہام کا حامل ہے:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ڈاکٹر فہیم اعظمی

"عندلیب گلشن ناآفریدہ"

ہوں گرمئی نشاط تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

اگر ہم تصوّر اور مادی وجود کی بات کریں تو غالب کے یہاں ان دونوں صورتوں میں تضاد نظر آئے گا۔ یعنی تصوّر میں جس گلشن میں غالب نغمہ سنج ہے وہ پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ہم تصوّر اور تخیل کو ممکنات سے خارج نہیں کر سکتے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بہت سے تصوّر و تخیل نے کچھ عرصہ کے بعد مادی صورت اختیار کرلی۔ تصوّر آنے والے وجود کی منادی کرتا ہے۔ تصوّر اور تخیل میں منطقی فکر کا بھی دخل ہوتا ہے۔ جو بصیرت اور دور بینی کی بنیاد بنتا ہے، اور بدیہہ یا INTUITION کا بھی۔ کروچے کے مطابق:

"کسی چیز کے علم کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ بدیہی اور منطقی یعنی وہ علم جو تصوّر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جو منطقی فکر کے ذریعہ .... آرٹ پر صرف تصور کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اس کا سرمایہ صرف تمثال ہے۔ تصوّر کسی چیز کی صنف متعین نہیں کرتا وہ کسی چیز کو تصوّراتی اور حقیقی میں تقسیم نہیں کرتا۔"

ول ڈوران کروچے کے فلسفہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تصوّر، تخیل سے بھی پہلے ہوتا ہے اور اسی لیے دماغ میں تمثال کا عمل، منطقی عمل سے پہلے وجود میں آتا ہے، آدمی اُسی وقت آرٹسٹ بن جاتا ہے جب وہ تصور کرتا ہے، اس سے بہت پہلے کہ وہ اس کا جواز پیش کرے...... اسی لیے آرٹ کی معجز نمائی یہ نہیں ہے کہ وہ معروضیت یا خارجی حقیقت کو پیش کرے بلکہ خیالی یا نظریاتی حقیقت کو۔ اسی معنی میں غالب گلشن ناافریدہ کے عندلیب تھے۔ اُن کے بہت سے مشکل اشعار جو پہلے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اب ان کی تفہیم ممکن ہے۔ غالب کے زمانہ میں جو گلشن تھا اُس کے عندلیبان سے تنگ آکر ہی غالب نے کہا تھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یا پھر اس طرح خود کلامی کی تھی:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اُسے سخنوران کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

یہ مشکل پسندی درحقیقت غالب کی مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی بنیاد تھی۔ اگر غور کیا جائے تو سب ہی اچھے تخلیق/ عندلیبان گلشن ناآفریدہ نظر آئیں گے اور مستقبل کے پیام بر جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے غالب کا گلشن ناآفریدہ وجود میں آتا ہے اور اُن کے نغمہ کی معنویت کے نئے نئے گوشے آشکار ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے کچھ احباب آج بھی لفظوں اور متن کے متعین معنی پر زور دیتے ہیں اور وہ متعین معنی وہی ہیں جو شاعر نے شعر میں اور مصنف نے متن میں ڈالے ہیں، آج ہم اس خیال کو، کرتے ہیں۔ اگر ہم کلام کے صرف وہی معنی لیتے جو شاعر نے اُس میں ہمارے خیال کے مطابق یا خود شاعر کی شرح کے مطابق شا میں ڈالے ہیں، تو ہم استادان سخن کے کلام کو EXHAUST کر چکے ہوتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد شرحوں اور تاویلات توضیحات کے باوجود میر اور غالب اور دوسرے شعرا کے کلام میں معنی کی گنجائش نکلتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ الہامی کتابوں کی تفاسیر اور نئے نئے معنی وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اور یہی معنی کی تلاش ہماری کائنات کی تفہیم اور ارتقاء کی ضمانت ہے۔ یہ تخلیق کی، خصوصاً تخلیقی ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی معنویت کو کبھی EXHAUST نہیں کرتا۔ اُس میں ہمیشہ معنی آفرینی کی گنجائش رہتی ہے۔ جسے DECONSTRUCTION یا ساخت شکنی یا ردّ تشکیل کہتے ہیں اس کا بھی اصول کسی ساخت کا انہدام یا تخریب نہیں بلکہ اُس میں نئے نئے معنیٰ کی تلاش ہے جو کلام میں بین طور پر نہیں ہوتے بلکہ اُس کے اندر یا اس کی DEEP STRUCTURE یا ساخت کی گہری سطح میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ فکر کوئی ماورائی فکر نہیں ہے جو ایک دم آسمان سے نازل ہوئی ہو اگر ہم غور کریں تو ہم اپنی معاشرتی ساخت کے اندر الفاظ، محاورے اور جملے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی ہم وہ باتیں نہیں کہتے جو کہنا چاہتے ہیں بلکہ اصل مفہوم کو چھپا دیتے ہیں یا ساخت شکنی کی اصطلاح میں التوا میں ڈال دیتے ہیں۔ جہاں تک فنکار کا تعلق ہے تو وہ اُس لاطینی ضرب المثل پر بھی عمل کرتا ہے ARS EST CELARE ARTEM یعنی آرٹ کو چھپانا ہی سچا آرٹ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تخلیقی ادب اور آرٹسٹ کی تخلیقات کی معنویت کبھی ختم نہیں ہوتی اور نئے گلشن کے باسی اُس کے نغمے کی معنویت اجاگر کرتے رہتے ہیں بغیر اس بات پر زور دیئے ہوئے کہ شاعر یا آرٹسٹ کا خود کیا مطلب تھا۔

یوں تو تمام کلاسیکی شاعری میں مثلاً مرزا سودا، میر درد، ناسخ، مصحفی، میر، غالب اور اُن کے ہم عصروں کے کلام کی شعریات میں کوئی فرق نہ تھا، اصول و قواعد، روایت و فضا سبھی ایک جیسے تھے لیکن ہم اب بھی کچھ شعرا میں اور بجنلتی تلاش کرتے ہیں، اُن کو نئے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ نئے معنی پہناتے ہیں، اُن کی جمالیات کا احاطہ کرتے ہیں، اُن کی شاعری میں سیاسی اور سماجی عوامل کے دخل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ شعریات کے ایک ہونے کے باوجود اسلوب، اور مضمون و معنی آفرینی کی جہتوں میں فرق ہوتا ہے

میں غالب کے صرف دو اشعار میں اس مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ غالب کہتے ہیں

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ
جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل

آتشکدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

مطالعہ کے دوران میں پڑھا تھا کہ سوئٹیزر لینڈ کے رہنے والے ایک کیمیا گر نے ایک ایسے جانور کا تصور پیش کیا تھا جو آگ میں لیتا تھا اور آگ ہی میں رہتا تھا۔ اُس کیمیا گر کا اصل نام آریولس تھیوفرئیس بمباسٹ وان ہوہنہیم AUREOLUS THEOPHRATUS BOMBAST VON HOHENHI تھا۔ لیکن خود پیراسلس کا نام اختیار کیا جس سے اُس کا مطلب تھا کہ وہ پہلی صدی عیسوی کے رومن طبیب سلسس سے بڑا تھا۔ پیراسل سس طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور ابی سینا اور یونانی طبیب گالن کے مروجہ طریقہ علاج کے خلاف تھا۔ مروجہ طریقہ علاج کی مخالفت کی وجہ سے وہ بکل لوتھر بھی کہلاتا تھا۔ اُس نے تین ایسے جانوروں کا تصور پیش کیا تھا جو زمین کے نیچے، پانی میں اور آگ میں جنم لینے اور بسر کرتے ہیں، GNOME (گو نام) زمین کے نیچے، UNDINE (انڈائن) پانی میں اور سلمندر آگ کا باسی ہے۔ یہی اردو شاعری کا سمندر ہے۔ کیمیا گر پیراسلس IMAGINATION یا تصور کا بہت بڑا حامی تھا۔ اُس نے اپنی ایک تحریر کہا ہے۔

"جو بھی تصوّر میں جنم لیتا ہے یا تصور کا حامل ہے وہ فطرت کے چھپے ہوئے طاقتور عناصر کو دریافت کر لیتا ہے۔۔۔۔۔۔ ستاروں کے علاوہ جن کی جگہ متعین ہے، نئے ستارے اور نئے آسمان تصور ہی سے وجود میں آتے ہیں۔"

مجھے اس بات کی فکر تھی کہ ایک سوئٹیزر لینڈ کے رہنے والے کیمیا گر اور طبیب کا یہ تصوراتی جانور اردو شعرا کے ہاتھ کیسے لگا؟ مولانا روم کا ایک شعر ملا جس میں وہ کہتے ہیں:

گفتم بنگر درمن گفتا کہ نمی ترسی
از آتش رخسارم وانگاہ نہ سام اندر

یہ نہیں کہہ سکتا کہ سام اندر سے مراد وہی سمندر ہے جو پیراسلس کے تصوّر میں اُبھرا تھا لیکن اس سے پیراسلس کے سلمندر تصور کی اوّلیت پر ضرور شک ہوتا ہے کیوں کہ مولانا روم کا زمانہ تیرھویں صدی کا تھا اور پیراسلس کا زمانہ سولھویں صدی کا۔

پیراسلس کے متعلق مزید مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ عرصہ تک ترکی، مصر اور عرب ممالک میں گھومتا رہا اور یہ یقین کی حد ممکن ہے کہ اُس کا یہ یورپ کا تصور مشرق کی دین ہے۔ غالب سے پہلے اور غالب کے ہم عصر شعرا نے بھی سمندر کو انھی معنی استعمال کیا جن معنی میں غالب نے مگر غالب کے اسلوب اور جمالیاتی اظہار میں انوکھا لطف ہے ناسخ کہتے ہیں:

کب ہے ہمارے سینۂ سوزاں میں لخت دل
آتش کدے میں ہیں یہ سمندر بھرے ہوئے

بہت صاف ہیں سینہ آتش کدہ ہے جس میں دل کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ سمندر رہتے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کی جگہ سمندر ہے تو پھر شاعر کے جلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ وہ تو آتش کدے کا باسی ہے۔ لخت دل کو سمندر کہہ کر کے لطیف جذبات سے محروم ہو جانا شاید آج ہمیں جمالیاتی اظہار کم معلوم ہو۔

شاہ نصیر نے ایک بہت ہی سیدھی سادی بات کہی ہے:

رزق دونوں کو ہی پہنچاتا ہے وہ روزی رساں

آب میں رہتی . ماہی اور سمندر آگ میں

سمندر کے اس معنی کے باوجود جو شاہ نصیر کے ذہن میں تھے، آب اور سمندر کی رعایت سے دوسرے مصرع میں ایک حسن نظر آتا ہے۔

ذوق کہتے ہیں:

ترا مجنونِ تفتہ دشت میں آتش قدم گر ہو
جلا دے زیرپا گر خار مژگانِ سمندر ہو

شعر میں یقیناً بلند خیالی اور مضمون آفرینی کے جوہر ہیں، عاشق خود گرم و بے قرار ہے پھر وہ دشت میں رواں دواں ہے جو آگ کی طرح گرم ہے اور اُس میں سمندر رہتا ہے۔ لیکن عاشق اتنا گرم اور آتش قدم ہے کہ اگر سمندر کے مژگان پیر کے نیچے آجائیں تو جل جائیں۔ شعر میں ہر جگہ آگ کا تصور اور سمندر کے مژگان اور موئے مژگان کا مفروضہ ہے جسے خود وہ آگ نہیں جلا سکتی جس میں سمندر رہتا ہے، مگر عاشق کے قدم کی آگ ضرور جلا دیتی ہے۔ شعر میں مضامین کی فراوانی ہے، صنعت مبالغہ ہے اور اپنے دور کی شعریات کا حامل ہے۔ مگر ہمیں اس شعر میں معنوی اور جمالیاتی گہرائی یا ندرت کم نظر آتی ہے۔ آئیے اب غالب کے دونوں اشعار پر غور کریں اور دیکھیں کہ "سمندر" اُن کے یہاں کیا گل کھلاتا ہے:

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

سامنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ غالب کے جام میں لال شراب چھپی ہوئی ہے جو آگ کے شعلہ کی طرح ہے اور اس قدح کی آگ میں سمندر رہتا ہے لہٰذا دسترخوان کے دل کا کباب نکال کر رکھ دے پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے قدح میں تو شراب دکھائی دینی چاہیے اُس کے چھپے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو جواب ہوگا کہ صرف صہبا دکھائی دیتی ہے لیکن یہ لال رنگ کی شراب اصل میں آگ ہے جو ہمیں لال شراب دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اگر غالب شراب نہیں پی رہے ہیں تو کباب کی کیا ضرورت کیوں کہ کباب شراب کے ساتھ زیب دیتا ہے اور اگر غالب کے قدح میں صہبائے ظاہری ہے اور اُس کا جو دکھائی نہیں دیتا وہ آگ ہے تو پھر سمندر کیسے دکھائی دے گا جس کے دل کے کباب کی فرمائش غالب کر رہے ہیں۔ اگر آپ لفظ سُفرہ پر غور کریں تو عجیب و غریب انکشاف ہوگا۔ سُفرہ عربی کا لفظ ہے جس کے معنی دسترخوان کے ہوتے ہیں۔ ایک لغت کے مطابق یہ فارسی کا لفظ بھی ہے اور جو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ لیے جائیں تو شعر میں ذم کا پہلو نکلے گا اور ایسا معلوم ہوگا کہ حضرت غالب شعر میں جمالیاتی اور شعری زبان کے بجائے ناشائستہ زبان استعمال کر رہے ہیں، اور برائے سُفرہ کے بجائے بروئے سُفرہ لکھ کر انھوں نے ذم کے پہلو کو زیادہ اُجاگر کر دیا ہے اس طرح غالب کے شعر کے تمام ظاہری معنی رَد ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے عقب میں کسی اور مفہوم کی تلاش ضروری ہے۔ اس شعر کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ غالب نے قدح کو دل کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور دل کے اندر کا خون وہ صہبائے آتش ہے جس میں سمندر کا جنم ہوتا ہے۔ یہ سمندر دل کے ٹکڑوں کی علامت کے طور پر آتا ہے۔ غالب اپنے محبوب سے یا رقیب سے یا اپنے ستانے والے سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مرا دل غم و الم کے محسوسات و جذبات کی وجہ سے جل رہا ہے تو میرے دل کو نکال لے اور کباب بنا کر کھا جا تاکہ مجھے دل کے جلنے سے یا روز روز کی پریشانی سے نجات مل جائے۔ یہ شعر غالب کے جمالیاتی اسلوب میں ایک بھرپور شکوہ یا SENSE OF FRUSTRATION معلوم ہوتا ہے جو ان کے اس شعر میں بھی نمایاں ہے:

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس خاشاک ہو گئے

آیئے اب غالب کے دوسرے شعر کو دیکھتے ہیں جس میں انھوں نے لفظ سمندر استعمال کیا ہے:

جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

سامنے کے معنی کچھ یوں ہوں گے۔ خود اپنے جگر کے داغ سے میں کچھ حاصل کر رہا تھا کیوں کہ اس وقت سمندر نے پورے آتشکدہ کو اپنی جاگیر نہیں بنایا تھا۔ ظاہر ہے اگر پورے آتشکدے پر جس میں دل و جگر شامل ہے سمندر کی اجارہ داری ہو جاتی، تو غالب کو داغ جگر سے کچھ نہ ملتا۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ غالب داغ جگر سے حاصل کیا کر رہے تھے؟ اس شعر میں تحصیل اور جاگیر پر غور کرنے کی بھی ضرورت ہے جو اُس معاشرے کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جس میں یہ لفظ اصطلاحاً بامعنی تھے۔ تحصیل سے مراد جاگیر سے مال گزاری یا لگان یا ریونیو حاصل کرنا تھا۔

تحصیل کسی بھی ضلع کا سب ڈویژن تھا جس کے اہلکار اپنے دائرہ اختیار میں لگان وصول کرتے تھے۔ جاگیر سے ایک معنی تو یہ لیے جاتے ہیں کہ غالب کے تسلط میں آتشکدہ تھا اور اُس میں ان کا جگر جلتا تھا اور اُن کو ایک طرح کا MASOCHISTIC حظ حاصل ہوتا تھا جو کلاسیکی اور رومانی شاعری میں عام ملے گا اور جب تک آتشکدے پر سمندر کا تسلط نہیں ہوا تھا غالب کے لیے وہ جگر کے جلانے کا ذریعہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ آتشکدہ تھا کیا؟ دل؟ یا پھر سارے جذبات اور محسوسات کا نظام جس میں دل، پھیپھڑے جگر سبھی شامل کیے جا سکتے ہیں؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر تو جمالیاتی اظہار کا ایک نمونہ ہے اور اس میں منطق کی کارفرمائی تلاش کرنی بیکار ہے میں مانتا ہوں لیکن اس طرح ہم کلاسیکی دور کے بہت سے اشعار کو تجرید اور ابہام میں شامل کر کے اُس کی تشریح و تفہیم سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا قاری اور نقاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے کی تحلیل کے ذریعہ یہ معلوم کرے کہ اُس سے کتنے معنی لیے جا سکتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں تشریح و تفہیم کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہم اس شعر کے معنی کو غالب کی تخلیق کے باوجود غالب کی ملکیت نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ممکنہ اور التوا میں ڈالے ہوئے معنی کی تلاش کرتے ہیں اگر ہم یہ کہیں کہ غالب نے اپنے دور کی بین حقیقت کو نہایت ہی خوبصورت علامتی انداز میں پیش کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا اس شعر میں آتشکدہ پورا شہر تھا جس میں غالب جل رہے تھے۔ لیکن اس سے کوئی مفر نہیں تھا۔ افراتفری کا زمانہ تھا لیکن ابھی انگریزوں کی عمل داری پوری دلّی پر نہیں ہوئی تھی۔ جب عملداری ہو گئی تو غالب کا وہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا جس پر وہ گزر بسر کرتے تھے۔

آتشکدہ دلّی ہے۔ داغ جگر وہ معمولی مراعات ہیں جو دلّی میں غالب کو حاصل تھیں شاید شاہی دربار کی جانب سے سمندر انگریزی سرکار ہے جو بعد میں اپنی اجارہ داری قائم کر لیتی ہے۔ آتشکدہ اور اس کے بعد غالب کا حال یہ ہے کہ:

قمر در عقرب و غالب بہ دہلی
سمندر در شط و ماہی در آتش

غالب یقیناً عندلیب گلشن ناآفریدہ تھے لیکن وہ گلشن اب پیدا ہو رہے ہیں۔ غالب کے کلام کی کثیر المعنویت تحلیلی تنقید اور رد تشکیل کے دور میں بھی قائم و دائم ہے اور ہمارے بعد آفریدہ گلشنوں میں اس کی تجدید ہوتی رہے گی اور ہم غالب کی آواز سنتے

رہیں گے۔

بزم نظر میں بیضۂ طاؤس خلوتاں
فرش طرب بہ گلشنِ نا آفریدہ کھینچ

قومی زبان (۱۹) مئی ۱۹۹۳ء

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

غالب میری نظر میں.....

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اہلِ علم، صاحب دانش و بینش نے غالب ایک شاعر، غالب ایک نثر نگار، غالب ایک فرد کے طور پر کھا اور ہر پہلو کے حسن و خوبی کو اجاگر کیا ہے ہماری نظر میں ان سب سے مختلف ایک زاویہ اور بھی ہے۔ یہ ہے غالب اپنے دور کی آواز" دیکھنا یہ ہے کہ غالب کی ذات اور اس کے کارناموں میں زمانہ کی نبض کی دھڑکنیں ہیں یا نہیں۔ وہ جس ماحول کا آفریدہ ہے، اُس کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے یا نہیں؟ اگر اس کی ذات وقت کی نمائندہ اور اس کی آواز زمانہ کی آواز ہے تو اُس نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

غالب کا دور ہیجانی شدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ تاریخ کے اس موڑ پر دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا۔ عہد مغلیہ کے اقدار زندگی، مغرب کے تیز اور طاقتور ریلے کے آگے چکنا چور ہو گئے۔ شاہانہ سطوت، وقار اور دبدبہ باقی نہ رہا سیاست کی بساط پر ایک گوشہ پڑ رہی تھی تو دوسرا مات دینے کی چالیں چل رہا تھا۔ مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ کھوئے ہوئے ماضی کے خوابوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شکستہ کشتی سے وقت کے دریا کو پار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ ایوانوں کے گلشن کی چمک دمک ماند پڑ چکی تھی۔ ساری عمارت پر لرزہ طاری تھا۔ شہنشاہِ ہند کے ہاتھ میں وظیفہ طلبی کا کاسۂ گدائی تھا اور غالب اسی شاہ کا مصاحب بھی تھا۔ ایسے میں عام لوگوں کے ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں، شکست خوردہ موت کے دامن یا خانقاہ کے حجرے میں پناہ لیتے ہیں لیکن جس قوم کا ذہن بیدار اور جس کی فکر بالیدہ ہو وہ ہر حقیقت کو حقیقت کے روپ میں لیتی اور ہر صداقت کا جوانمردی سے مقابلہ کرتی ہوئی اپنے لیے اور دوسرے انسانوں کے لیے حوصلہ کا سبب بنتی ہے۔ غالب میں یہ حوصلہ ملتا ہے۔ وہ فخر کہتے ہیں کہ:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

تو اس میں کسی قسم کی تعلّی نہیں ہے، شاعر کی حیثیت سے اُن کی جو عزت تھی وہ اُس سے بھی واقف تھے لیکن اپنے لیے اسے اعزاز کا سبب نہیں جانتے تھے بلکہ پیشۂ آباء کو شاعری سے افضل تر سمجھتے تھے۔ غالب کے کسی شعر کے لفظوں کو لغات کے معنوں تک محدود نہ رکھا جائے، وہ لفظ کے بطن سے نئے نئے معنی پیدا کرنے کا ہنر اور سلیقہ رکھتے تھے۔ پیشۂ آباء سے مراد سپاہ گری ہرگز نہیں بلکہ سپاہ گری کا حوصلہ ہے۔ بہادری، جانفروشی، عزم اور استقامت ہے۔ افراسیابی خون اور ترسم خاں کی نسل میں سپاہی کے اوصاف موجود تھے اور سچ پوچھیے تو اسی نے غالب کی آبرو رکھ لی۔

غالب کے آلام کا درجہ متعین کرنے کے لیے یوں تو بہت سے شعر پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں ایک کا ہی حوالہ کافی ہے

کہتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

کشتۂ الم کی یہ وہ منزل ہے کہ رنگا رنگ بزم آرائیاں تو کیا اب اُن کی یاد تک باقی نہیں لیکن سپاہی منش شاعر کے پایۂ استقامت میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہ ہوئی اُس کے انفرادی غم کا ذکر تو چھوڑیے، اجتماعی نوعیت کے غم کا یہ حال تھا کہ:

"اتنے مرے کہ اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"

"او میاں سیّد زادہ، آزردہ، دلّی کے عاشقِ دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آرزو نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدّین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن کہاں، ایک آرزدہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی کس برتے پر تتا پانی، ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی"

انھیں شخصی المیوں کے ساتھ سیل حوادثِ زمانہ کے نہ تھمنے والے سلسلے کا بھی سامنا کرنا پڑا، "ستم پیشہ" کے فراق سے لے کر باسٹھ روپے آٹھ آنے کے وظیفے پر گزارا کرنا پڑا اس پر افراسیابی مزاج کا یہ حال کہ:

"جس شہر میں رہوں وہاں کوئی بھوکا پیاسا نہ رہے"

"وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں"

غموں کے ہجوم، روٹی اور شراب کے مسلسل فاقوں کے بعد تو انسان اپنی زندگی سے ہی بیزار ہو جاتا ہے۔ غالب کی یہ انسان دوستی کسی مرتبے کی ہے کہ ذات کے لیے سب کچھ لائقِ برداشت ہے لیکن عام انسان کا دکھ برداشت سے باہر۔ یہ مقام ہر گز آدمیت کا نہیں اس سے بلند تر کوئی درجہ ہے۔ وہ تو اپنی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے دعوے میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اس شعر کی روشنی میں اُن کے مرتبے کا خود بخود تعین ہو جاتا ہے۔ اسی منزل پر پہنچ کر کہا جاسکتا ہے کہ:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہے تنگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو

ہے غو ۔ دل، نفس اگر آزرفشاں نہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں!

قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کے یہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں کی کیفیات ملتی ہیں لیکن یہ پہلا دیدہ ور ہے جس کے اشعار میں غمِ روزگار کی پھیلی ہوئی پرچھائیوں میں غمِ جاناں چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے غزل کی حدود زندگی کے چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

قدو گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غمِ جاناں اور غمِ روزگار کا جس انداز سے انھوں نے تقابل کیا ہے وہ اس موضوع کے اعتبار سے حرفِ آخر ہے۔ بعد کے شاعر لاکہ موشگافیاں کرتے رہیں، حقیقت کا وہ رنگ نہیں بھر سکتے جو ان اشعار میں ہے:

ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی !!!
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

حد یہ ہے کہ:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب کی نظر میں انفرادی معاملات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے ایسی باتوں کو زیادہ اہمیت دی جن سے اُن کے علاوہ دوسروں کا بھی سابقہ پڑتا تھا۔ وہ زمانے کے چلن کو جانتے تھے اور آنے والے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے عزم وہمت کی شمعیں روشن رکھنا چاہتے تھے تاکہ بلند خیالات اور پُرعزم نظریۂ حیات سے پیغامبری کا حق ادا کیا جائے۔ اُن کی رجائیت ذات تک محدود ہے اور نہ اُن کے زمانے تک۔ وہ تو ہر زمانے کے افراد کو اپنی جیسی رجائیت کا حامل بنانا چاہتے تھے۔

اپنے وقت کے ان دھاروں میں بہتے ہوئے جو نشیب و فراز سے دوچار کر رہے تھے اپنے مزاج میں دل شکستگی تو بڑی بات ہے تلخی بھی پیدا نہیں ہونے دی جہاں ایسے مواقع آئے بھی ہیں تو انھوں نے طنز ملیح سے دل کی بھڑاس نکال لی ہے یہیں فنکار کا تخلیقی شعور ظاہر ہوتا ہے اگر وہ کہتا ہے کہ:

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

تو اس میں فخر ومباہات کا ذکر نہیں ہے، مصرعۂ ثانی اپنے آپ پر طنز ہے اور اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانا بڑے حوصلے اور ظرف کی بات ہے یا پھر اُن کا یہ کہنا کہ:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اس میں دودھاری طنز ہے ایک اپنی ذات پر اور دوسرا شہ کے مصاحبوں پر کہ کیسے کیسے شہ کے مصاب بنے اتراتے پھرتے ہیں جن کی شہر میں کوئی آبرو نہیں تھی۔ گویا شہ اور مصاحب اس درجے کو پہنچ گئے تھے کہ عزت وآبرو سے عاری تھے۔

ان حوالوں سے ایک بات یہ واضح ہو گئی کہ غالب کا بیدار شعور زمانہ کے رنگ ڈھنگ سے پوری طرح واقف تھا، دوسری طرف وہ مصائب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید اور رجائیت کی شمع جلائے رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے زمانے کو سمجھا اور اُس کے حوالے سے ایسی ابدی قدروں سے روشناس کرایا جس کے سہارے زیست کر جانا آسان ہو جائے۔ اسی لیے وہ اپنے وقت کا شاعر نہیں گردانا جاتا بلکہ آنے والے ہر دور کا شاعر ہے۔

وقت کی ہیجانی کیفیت نے غالب کی زندگی اور شاعری میں ایسی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے جسے تضاد، موقع پرستی اور منافقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب جاگیردارانہ سماج کا پروردہ تھا، اُسے اُس نظام سے اُنس تھا جس میں اس کے اجداد نے عزت و توقیر حاصل کی اور جس میں اُس کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا وہ اُس نظام میں شکست وریخت کے آثار بھی دیکھ رہا تھا، سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے نئے حاکموں پر بھی اس کی نظر تھی وہ اُن کے مظالم کا مخالف تھا۔ تو ان کے ذریعے سے پھیلنے والے نئے نئے علوم اور نظاموں کی روشنی کی برکتوں سے بھی واقف۔ ۱۸۵۷ء سے کئی برس پہلے کی بات ہے کہ سرسید نے "آئینِ اکبری" کی تصحیح و تحشی کا کارنامہ انجام دیا اور غالب نے اسے "کارِ لاحاصل" قرار دے کر رجعت پسندی کا الزام اپنے سر نہ آنے دیا اور اس سے بھی بہت پہلے ۱۸۳۸ء میں فارسی کی وہ غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

ان سے بڑی مثالیں مستقبل کے عرفان کی کیا ہو سکتی ہیں۔

غالب کا المیہ یہ تھا کہ اُن کے پیروں میں "افراسیابیت کی بیڑیاں پڑی تھیں۔ وہ قدآور اتنے تھے کہ مستقبل کی صدیاں اُن کے پیش نظر تھیں۔ اس صورتِ حال میں اقدار اور خیالات کے ٹکراؤ کی وہ صورت پیدا ہوئی جو تضاد سے تعبیر کی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اردو کے شاعروں میں غالب سے بڑا نبض شناس اور مستقبل بیں، اور حوصلہ مند شاعر شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔

قومی زبان (۲۵) مئی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر سہیل احمد خان

فکشن اور تنقید

(رضی عابدی کی کتاب تین ناول نگار (قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین) کا تعارف)

ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ناول کو "زندگی کی روشن کتاب" کہا تھا۔ اُس کے نزدیک ناول ایک ایسی تھر تھری ہے اور جیتے جاگتے سالم بشر کو ایسی لرزش عطا کرتی ہے جو شاعری، فلسفہ، سائنس یا کسی اور کتابی تھر تھری سے بڑھ کر ہے۔ لارنس کا کہنا ہے کہ سائنس دان، فلسفی اور شاعر زندہ انسان کے مختلف اجزا کے عظیم ماہر ہیں لیکن ان اجزا کی سالم صورت ناول نگار ہی دکھا سکتا ہے۔ لارنس کے بقول ناول کی اہمیت دور بین کی ایجاد سے بھی زیادہ ہے۔ لارنس بیسویں صدی کے اہم ترین ناول نگاروں میں شامل ہے مگر اس کے ساتھ ناول کے اہم ترین ناقدین میں بھی اُس کا شمار ہوتا ہے پھر بھی اگر اُس کی ازراہ تخلیقی فنکار کی ادّعا پسندی محسوس ہوں تو ایک خالص ناقد فرینک کرموڈ کا دعویٰ بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔ کرموڈ کا بیان ہے کہ تمدن کے جس مرحلے سے ہم گزر رہے ہیں اُس میں ادبی فن کی مرکزی شکل ناول ہے۔ تفریحی ناولوں کے عظیم سیلاب، کتابی کلچر کے نئے میڈیا کے حوالے سے مٹ جانے کے خدشات اور خود ناول کے ایک ادبی صنف کے طور پر خاتمے کی بحثوں کے درمیان زندگی کی سالمیت، انسانی صورت حال کی تبدیلیوں اور انسانی تعلقات کی قوس قزح کے مختلف رنگ دکھانے والا ناول زندہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ناول کے بارے میں تنقیدی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس سے پہلے تنقیدی نظریہ سازی بالعموم شاعری کے حوالے ہی سے ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں ناول نگار ہنری جیمز نے ناول کی تنقید کو ایسی گہرائی سے آشنا کیا جس کی اہمیت کو آج تک محسوس کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعد میں فکشن کے موضوع پر، پرسی لبوک، ای ایم فارسٹر اور ایڈورمیور کی مشہور تصانیف کسی نہ کسی طرح ہنری جیمز کے تصورات سے منسلک ہیں۔ لارنس کے خیالات کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ لارنس کے مطالعے اپنے اندر حیرت انگیز بصیرتیں سمیٹے ہوئے ہیں جن کا دائرہ زندگی کی لرزشوں سے مابعد الطبیعیات تک پھیلا ہوا ہے۔ لارنس کے پُرجوش مدّاح ایف آر لیوس اور اس کے رفقاء نے اپنے رسالے "اسکروٹنی" کے صفحات پر فکشن کے مطالعے کے جو نئے نقوش بکھیرے وہ بیسویں صدی میں فکشن کی تنقید کے نہایت اہم اور رجحان ساز مکتبِ فکر کے ترجمان بنے اور ان کے اثرات دور دور پہنچے۔ لیوس نے ناول نگار کے "اخلاقی احساس" کو اہمیت دی اُس کے ہاں زندگی کے "اثبات" کو محسوس کیا تاہم یہ اخلاقی احساس اخلاقیات کی تبلیغ سے علیحدہ ہے۔ لیوس کا کمال یہ بھی ہے کہ زندگی کے اثبات اور اخلاقی احساس پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اُس کا سروکار ناول کی اسلوبیات سے ہے۔ چنانچہ متن کا "قریبی تجزیہ" اس تنقیدی انداز کا اہم ترین جزو ہے۔ ناول نگار کے اہم ترین اقتباسات کے چناؤ میں لیوس کی بصیرت

بہت فعال رہتی ہے اور پھر ان اقتباسات کا تجزیہ اتنا ٹھوس ہوتا ہے جس پر تاثراتی اور انشائی رنگ میں لکھے ہوئے پلپلے مقالوں کے انبار قربان کرنا پڑتا ہے۔ لیوس اور اُس کے رفقا کے اثرات اُن کے شاگردوں کے ذریعے دور دور پہنچے اور پھر ایک سطح پر آ کر اس تنقیدی انداز کے بارے میں فطری ردِ عمل بھی ظاہر ہوا تاہم اس وقت تک اس طریقے کے اہم امکانات کو کھنگالا جا چکا تھا۔ انگریزی زبان کے باہر ہنگری کے ناقد لوکاچ کی تصانیف ناول کی تنقید کی نادر مثال ہیں لوکاچ نے مارکسی تنقید کی سطح کو بلند کیا اور تبلیغی واقعیت سے ہٹ کر "انتقادی واقعیت" کا جو تصور دیا اُس سے مارکسی تنقید کی کئی گرہیں کھلنے لگیں۔ لوکاچ نے ناول نگاروں کی طرف خاص توجہ دی اور اس کا زاویۂ نظر اب بیسویں صدی کی فکشن کی تنقید میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب فکشن کے بارے میں تنقیدی توجہ بڑھنے لگی تو اس کا سبب محض یہ نہ تھا کہ ناقدین کو سیر کے لیے تھوڑی سی فضا اور میسر آ گئی تھی بلکہ یہ احساس بھی تھا کہ فکشن کی بدلتی ہوئی ہیئتیں اور اسالیب ناقدین کے لیے چیلنج کے طور پر ابھر آئے تھے۔ بیسویں صدی کے یورپی فکشن کے اہم نمائندوں (پروست، جوئیس، ورجینیا وولف، ٹومس مان، ہرمن ہیسے) نے ناول میں ایسی سطحیں پیدا کر دی تھیں کہ ان کی تفہیم کے لیے نئے تنقیدی طریقوں کی ضرورت تھی، ایسا احساس صرف تمثیلی، علامتی اور اساطیری ناولوں ہی کے حوالے سے پیدا نہیں ہوا تھا واقعیت کے عمدہ نمونوں کی تنقید کو بھی صرف پلاٹ اور کرداروں کے تعارف تک محدود رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ارباخ نے واقعیت پسند متون کا جو عمدہ تجزیہ کیا تھا وہ اپنی جگہ اہم تھا اسی طرح ایف آر لیوس کے مکتبِ خیال کے ناقدین کا "قریبی تجزیہ" بھی کچھ نئی راہوں کی نشاندہی کر چکا تھا مگر امریکی اور برطانوی تنقید میں وین بوتھ اور ڈیوڈ لاج نے اسلوبیاتی مطالعے میں نئی اور مربوط کوششیں کیں۔ ڈیوڈ لاج نے یہ سوال اُٹھایا کہ "نئی تنقید" میں جس طرح نظم کی نامیاتی شکل، اُس میں ذکاوت اور ابہام کی صورتوں اور تمثالوں کا تجزیہ ہوتا ہے اس طرح فکشن کا کیوں نہیں ہو سکتا؟ فکشن کے اہم نمائندوں کے ہاں بھی متن اپنے اندر ایسی گہرائیاں رکھتا جن کی پہچان کے لیے زبان اور تمثالوں کا کوئی گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ واقعیت پسند فکشن کی بھی صرف ظاہری سطح تک نہیں رہا جا سکتا اعلیٰ واقعیت نگاروں کے ہاں زبان و بیان کے انداز اتنے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں کہ اُن کی تفہیم کے بغیر اُن کی نگارشات پر درست تنقید ممکن نہیں۔ فرنک کرموڈ، مالکم بریڈ بیری اور برنارڈ برگونزی تک اس مباحثے کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ریمونڈ ولیمز کے "کلچری تنقید" کے انداز کو بھی کچھ عرصہ بڑی توجہ ملی۔ ولیمز نے ناول کو کلچر کی تبدیلیوں کے ساتھ منسلک کر کے دیکھا اور اس سلسلے میں مارکسیت سے بھی بصیرت لی۔ ایک لحاظ سے اگر ڈیوڈ لاج کی زبان اور تمثالوں کے بارے میں توجہ ایف آر لیوس کے "قریبی مطالعے" سے کچھ نہ کچھ رشتہ رکھتی تھی تو ریمونڈ ولیمز کا طریقہ لیوس کی تنقید کی دوسری جہت یعنی "زندگی کے اخلاقی احساس" سے کسی حد تک منسلک تھا اگرچہ اس مماثلت سے آگے امتیازات بھی بہت سے تھے۔

۱۹۷۰ء کے بعد بالخصوص جس طرح یورپی اور امریکی تنقید میں نظریہ سازی کا زور ہوا وہ بہت بڑا تنقیدی انقلاب ہے۔ ساختیات، ڈی کنسٹرکشن، بیانیے کے بارے میں نئے نظریات، ناول کی "بوطیقا" کی تلاش، فیمنسٹ حوالے سے فکشن کا از سرِ نو مطالعہ، ان سب حوالوں سے نظریات اور عملی تنقید کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا ہے جس سے نہ تو آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں اور نہ ہی مختلف نظریات کے حوالے سے پیدا ہونے والے امکانات کو پہچانے بغیر اب تنقید ممکن ہے۔ انتہا پسندی کی صورتیں اپنی جگہ اور ناقدین کی ناکامیاں بھی تسلیم لیکن ان مختلف طریقوں سے جو اعلیٰ تنقیدی نمونے سامنے آئے ہیں وہ فکشن کی تنقید کے اہم نمائندوں کے تنقیدی طریقوں کو بھی "اگلے وقتوں کی یادگار" بناتے جا رہے ہیں۔ مگر ... مارے، بھی، پیش، نظر

رہنی چاہیے کہ اہم ناقدین کی بصیرتیں کسی بھی زمانے کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ تنقید آج کولرج، سینٹ بیو یا میتھیو آرنلڈ کے طریق کار سے کتنی بھی مختلف کیوں نہ ہو چکی ہو ان ناقدین سے واسطہ رکھے بغیر اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی۔ باخبر لوگ یہ بتا رہے ہیں کہ مختلف نظریوں کے عروج اور بحثا بحثی کے بعد اب "نئی تاریخیت" پر زور دیا جا رہا ہے اور ان لوگوں کے بقول تنقید اصطلاحات کے مباحث سے نکل کر پھر کسی حد تک "انسانی" بن رہی ہے۔ بہرحال فکشن کی تنقید کے اہم مراحل کی نشاندہی اہم کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے کچھ یوں کی جاتی ہے۔

ہنری جیمز۔ آرٹ اف فکشن ۱۸۸۴ء
پرسی لبوک۔ دی کرافٹ آف فکشن ۱۹۲۱ء
ای۔ ایم۔ فورسٹر۔ آسپیکٹس آف دی ناول ۱۹۲۷ء
ایف۔ آر۔ لیوس۔ دی گریٹ ٹریڈیشن ۱۹۴۸ء
ایرخ آرباخ۔ مائس ۱۹۵۳ء (انگریزی ترجمہ)
وین بوتھ۔ دی ریٹرک آف فکشن ۱۹۶۱ء
ڈیوڈ لاج۔ لینگوایج آف فکشن ۱۹۶۶ء
فرینک کرموڈ۔ سینس آف این اینڈنگ ۱۹۶۷ء
ریمونڈ ولیمز۔ دی انگلش ناول (فرام ڈکنز ٹو لارنس) ۱۹۷۰ء

یہ نقشہ اہم ناقدین ہی تک محدود ہے اور اس میں فرانسیسی اور جرمن زبان کے بعض نظریہ ساز ناقدین شامل نہیں۔ مثلاً لوکاچ کا کام ۱۹۳۰ء کے بعد منظر عام پر آ چکا تھا اگرچہ اس کی تصانیف کے انگریزی تراجم بعد میں سامنے آئے۔ دی مینگ آف کنٹیمپرری یورپین ریلزم ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی اور انگریزی ترجمہ ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ ادھر ورجینیا وولف اور کیتھرائن منسفیلڈ کے تبصروں سے لے کر مارک شورر، مارٹن ٹرنل، ارنلڈ کیٹل تک مختلف ناقدین نے نئی بحثیں اٹھائیں۔ پوؔلے کی نظریاتی تنقید کا بھی خوب چرچا رہا۔ نیز انفرادی طور پر ناول نگاروں پر لکھی ہوئی متعدد کتابوں کے مصنف نظر انداز ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ساختیات، ڈی کنسٹرکشن اور فیمنسٹ اندازِ نظر کے حامل ناقدین کی بھی طویل فہرست ہے اور "بیانیہ" کے نئے نظریات بھی اپنی جگہ ہیں۔ اب رولاں بارتھ سے ٹوڈوروف اور جوتھن کلر سے جیمز ہلیس ملر تک کے نام ہمارے بعض ناقدین کے مضامین میں آ رہے ہیں تاہم ابھی یہ نظریات بیان زیادہ ہوئے ہیں ان کا اپنے فکشن پر عملی اطلاق کم ہی ہوا ہے۔

اردو ناقدین کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں تفریحی اور درمیانے درجے کے ادبی ناولوں کی سطح سے اٹھتے ہوئے ناول کم ہی لکھے جا رہے ہیں ایسا ناول جو انسانی تعلقات کی قوس قزح کے مختلف رنگوں کو سمیٹنے کی کوشش کرے، جس کے کرداروں میں اندرونی یا خارجی تبدیلیوں سے کوئی گہری روحانی کشمکش پیدا ہوتی دکھائی دے جس کی اسلوبیاتی سطحیں گہری ہوں کم ہی پڑھنے میں آتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے بعض باکمال افسانہ نگاروں مثلاً منٹو، بیدی، غلام عباس کی کہانیوں میں عصمت، کرشن چندر، بلونت سنگھ بعض اعلیٰ کہانیوں میں انتظار حسین، خالدہ حسین اور سریندر پرکاش تک اعلیٰ افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعاتی اور اسلوبیاتی گہرائیاں ناقدین کے لیے مسئلہ بنتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں فکشن کی تنقید میں جو نئے زاویے پیدا ہوئے ہیں ان کا سروکار زیادہ تر افسانہ نگاروں سے رہا ہے اور یہ سلسلہ بھی کچھ عرصہ پہلے ہی شروع ہوا ہے خیر اب اتنا تو ہوا کہ نئے تنقیدی مباحث

فکشن کے حوالے سے پیدا ہو رہے اور فکشن کی زبان کو بھی شاعری کی طرح معنی اور کثیر الجہاتی سمجھا جانے لگا ہے۔ پامال واقعیت نگاروں کے بیانیے کی ظاہری سادگی کے آگے کیسی کیسی باریکیاں ہیں اب ناقدین کو دکھائی دینے لگی ہیں خلاصہ نگار مکتبی ناقدین اور ایم۔اے، پی ایچ ڈی کے رسمی مقالات سے ہٹ کر اب ہمارے ہاں فکشن کی تنقید کے لیے امکانات کھنگالے تو جا رہے ہیں۔ مکتبی تنقید بھی اس میں کچھ کردار ادا کر سکتی ہے۔ خصوصاً نظریات کے عملی اطلاق کی سطح پر یہ فکشن کے بڑے ناقدین کے تصورات کو آزما کر دکھا سکتی ہے کہ یہ تصورات فکشن کی تنقید میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور کس حد تک نہیں مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ مکتبی تنقید اور تحقیق کو رسمی سطح سے آگے لے جایا جائے۔ پھر بھی یہ امر خوش آئند ہے کہ فکشن کی تنقید میں اس وقت کچھ ذہین ناقد سرگرم عمل ہیں۔ اتنا تو وقار عظیم اور احسن فاروقی جیسے ناقدین نے بھی کیا تھا کہ جب ہمارے تنقیدی مباحث کا دائرہ شاعری کے گرد گھومتا تھا تو انھوں نے فکشن کی طرف توجہ دلائی لیکن فکشن کی گہری سمجھ بوجھ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کے ہاں ملے گی۔ عسکری صاحب نے فکشن کی طرف ہماری تنقید کے راغب ہونے سے پہلے ۱۹۵۶ء میں لکھے گئے مضمون "آدمی اور انسان؟" میں مغربی ناول کے گہرے مطالعے کی بنیاد پر یہ کہہ دیا تھا کہ "انسانی تقدیر کے مسئلے کی تفتیش میں بیسویں صدی کا ناول شاعری سے بھی آگے رہا ہے۔" اور ساتھ ہی یہ بیان بھی دیا تھا "نفسیات، فلسفہ اور دوسرے علوم پڑھ کر چاہے آپ چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا بن جائیں لیکن اگر آپ نے ناول نہیں پڑھے ہیں تو آپ بیسویں صدی کے انسان اور اس کے روحانی مسائل کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔" عسکری صاحب اس نتیجے پر اس لیے پہنچے تھے کہ ناول نگار کو زندگی کے معمولی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کو قبول کرنا پڑتا ہے چنانچہ اس ادبی صنف میں زندگی کے ٹھوس تجربات جگہ پاتے ہیں اور ٹھوس تجربات کو سمجھے بغیر تو کسی طرح کی نظریہ سازی بھی ممکن نہیں۔ ہمارے دوسرے ناقدین میں مظفر علی سید، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، محمد عمر میمن، اسلوب احمد انصاری نے فکشن کے بعض عمدہ مطالعے کیے ہیں وارث علوی کے پچھلے چند سال میں شائع ہونے والے مضامین نے نئی بحثیں بھی پیدا کی ہیں اور فکشن کی تنقید کی بہت سی نئی راہیں بھی سجھائی ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے بیدی اور انتظار حسین پر توجہ طلب کام کیا ہے۔ محمد عمر میمن نئے اردو افسانے کے تراجم کے سلسلے میں ممتاز ہیں اور ان کے بعض تنقیدی مطالعے بھی قابل قدر ہیں۔ مظفر علی سید نے فکشن سے مسلسل دلچسپی لی ہے پچھلے کچھ سالوں میں آصف فرخی نے فکشن سے مسلسل وابستگی کے ذریعے بعض اچھے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ سراج منیر کے دو تین مطالعے بھی زوردار تھے۔ شمس الرحمن فاروقی نے داستان اور افسانے کی "بوطیقا" کی طرف توجہ کر کے کئی نئے مباحث پیدا کیے ہیں۔ بعض ایسے ناقدین جن کے ہاں فکشن سے پہلے اتنی وابستگی نہیں تھی اب اس طرف کچھ زیادہ توجہ کر رہے ہیں مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا نے منٹو اور عصمت کا مطالعہ ڈی کنسٹرکشن کے اثرات کے تحت کیا ہے خیر یہ پتہ تو بعد میں چلے گا کہ افسانوی متن ڈی کنسٹرکٹ ہوا ہے یا ناقد مگر یہ دلچسپی اپنی جگہ فکشن کی تنقید کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو ضرور ظاہر کرتی ہے۔ ہاں افتخار جالب کے بعض افسانوں کے تجزیے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے انھوں نے افسانے کے داخلی انسلاکات اور لسانی تشکیلات پر اس وقت توجہ کی جب فکشن کی تنقید اسلوبیات کی طرف بہت کم توجہ دیتی تھی اسی طرح فکشن کی تنقید (جس سے عملی طور پر ہمارے ہاں زیادہ تر افسانے کی تنقید مراد ہے) میں خود بعض تخلیقی فنکاروں کے نکتہ آفریں مضامین بھی نظر انداز نہیں ہونے چاہئیں بالخصوص عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی تحریریں۔

مندرجہ بالا تمہید میں کئی خلا ہیں اور بعض ناموں کو نظر انداز کرنے کا اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ بتانا مقصود

تھا کہ فکشن کی تنقید اب سرسری اور تاریخی جائزے نہیں گہرے مطالعے مانگتی ہے جب فکشن کے سلسلے میں اتنے طریقے آزمائے جا چکے ہوں اور خود ہمارے ہاں بھی فکشن کے نئے مباحث پچھلے کچھ سالوں سے تواتر سے سامنے آ رہے ہوں تو فکشن کے نئے ناقدین کو تنقید کے لیے نیا ساز و سامان چاہیے۔ اس کا زاویۂ نظر جو بھی ہو اس سے یہ توقع ضرور رکھی جائے گی کہ وہ اپنے تنقیدی طریقے کی مدد سے فکشن میں گہرائی تک اُتر سکے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا فکشن کا ذوق کیسا ہے؟ فکشن کی اُس کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ فکشن کی روایات کا شعور کتنا ہے؟ نفسیاتی، مارکسی، اسلوبیاتی یا جو تنقیدی طریقہ اُس نے اختیار کیا ہے خود اس پر ناقد کی گرفت کتنی ہے؟ چنانچہ رضی عابدی کی نئی تصنیف "تین ناول نگار" کے تعارف کے لیے یہ طویل بیان غیر ضروری نہیں۔ کسی رسمی دیباچے کا عابدی صاحب کا مطالبہ نہیں اور اگر ہوتا بھی تو اس کی اہلیت مجھ میں نہیں۔ عابدی صاحب اس کتاب میں تینوں زیرِ تبصرہ ناول نگاروں (قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین) کے تصورات سے الجھتے ہوئے نظر آتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ ان کی اہمیت کا شعور رکھتے ہیں تبھی تو انھوں نے ان کے ناولوں کو تجزیے کے لیے چنا ہے۔ ناول نگاروں کے فنی کمالات کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں چنانچہ ان کے تصورات سے کشاکش نفرت کی بنیاد پر نہیں۔ یہی رویہ رضی عابدی صاحب کے طریقِ کار کے سلسلے میں بھی اپنانا ضروری ہے۔ کیا رضی عابدی کے تجزیے کو ہم اتنی اہمیت بھی نہ دیں کہ ان سے کشمکش کیے بغیر گزر جانے دیں۔ جی نہیں، ان تصورات سے الجھنا بھی لازم ہے۔ رضی عابدی کو داد ہم بھی دیں گے جیسے انھوں نے ناول نگاروں کو جگہ جگہ داد دی ہے وہ کسی کی زبان کی مہارت کی تعریف کرتے ہیں کسی کے ہاں فطرت کی تصویر کشی کی داد دیتے ہیں۔ رضی عابدی کے تجزیے میں بھی داد کے کئی پہلو ہیں وہ بنیادی طور پر انگریزی ادبیات کے استاد ہیں اپنے مضمون میں ان کی تدریس کے اُن کے شاگرد معترف رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے انھوں نے اردو میں اہم مضامین لکھے ہیں۔ مغربی ڈرامے پر اُن کی ایک تصنیف قارئین میں مقبول ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ مل کر انھوں نے اچھوتوں کے ادب کا ترجمہ کیا ہے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "تیسری دنیا کا ادب" شائع ہو چکا ہے۔ وہ فکشن کی تنقید کے ضمن میں چند مطالعے پہلے بھی کر چکے ہیں "تین ناول نگار" اس سلسلے میں ان کی مربوط تصنیف ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور عبداللہ حسین تھوڑے بہت سالوں کے فرق کے ساتھ ہمارے اپنے ہم عصر ہیں بلکہ اُن لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے ادبی سطح پر ہمارے عصر کے مزاج کا تعین کیا ہے۔ ہمارے ادبی مزاج کی تشکیل میں ان سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ جو وارداتیں جسمانی اور روحانی سطح پر پچھلی چند نسلوں سے ٹکرائیں اُن کو فنی ہیئت میں ڈھال کر ان تخلیقی فنکاروں نے ہمارے عصر کے انتشار کو معنی دینے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں انھیں خود جانکاہ اضطراب سے گزرنا پڑا ہے اور ان کی تحریر میں ہمیں اُس اضطراب سے آشنا کر کے اپنے عہد کے مرکزی سوالوں میں الجھا دیتی ہیں۔ کون سے صنم خانے تھے جو ٹوٹ گئے؟ غمِ دل کا سفینہ کہیں رکا یا نہیں؟ شبِ ست موج کا کوئی ساحل ہے بھی یا نہیں؟ آگ کے جس دریا سے یہ نسلیں گزریں وہ مخصوص تاریخی لمحوں کی داستان ہے یا وقت کا دھارا ہے؟ آخرِ شب ہم سفروں کی تلاش کا دھیان کیوں آیا؟ کھوئی ہوئی بستیوں کی کتھا کیوں یاد آتی ہے؟ اس نسل کی اداسی سے آگے فرد کی بے گانگی کا مرحلہ کون سے سماجی آشوب کی کہانی سناتا ہے؟ مگر ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ناول ایسے گھمبیر سوال اٹھاتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی زندگی سے مابعدالطبیعیاتی حقائق تک کئی سطحوں سے ہو سکتا ہے مگر ناولوں میں (اگر وہ سنجیدہ سطح کے ہیں) زندگی کا پورا نگار خانہ سجا ہوتا ہے روزمرہ زندگی کے معمولات کی بظاہر بے رنگی ہی سے رنگ و نور کی لہریں نکلتی ہیں۔ تمدن کے تغیرات، ثقافتی قوسِ قزح، موسموں کے بدلنے کی کیفیات، وقت کی پے در پے گردشیں انسانی گروہوں، افراد کی زندگیوں سے کس طرح پیوست ہوتی ہیں۔ یہ سب جزئیات ناول

اور نسبتاً اختصار سے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح ناول وہ جہانِ اصغر ہے جس میں جہانِ اکبر کا ہر مثیل موجود ہے۔ یہ محض عکس یا فوٹو گراف بھی نہیں اس جہانِ اصغر میں ہر شے اپنے طور پر جیتی جاگتی ہونی چاہیے پھر یہ سب جہان زبان یا لکھے ہوئے الفاظ ہی سے بنتا ہے، اسلوبیاتی وضعیں بھی اس سب ساخت کو سنبھالے رکھتی ہیں۔ تشبیہوں اور تمثالوں کے ذریعے خیال کیسے عجیب وسعتیں اختیار کرتے ہیں۔ مختلف انسانی تجربوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں، استعاروں کے ذریعے کیسے تجربے ایک دوسرے میں ڈھل جاتے ہیں کنائے اور طنز کے ذریعے زندگی کے کتنے رخ بے نقاب ہوتے ہیں۔ نثر کا آہنگ کیسے زندگی کی دھڑکنوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سب کچھ بڑی سطح کے تاریخی ناول ہی میں ہو ناول نگار تو اس جہانِ اکبر کو ایک گھر کی کہانی، ایک محبت کی ناکامی کی داستان ایک انسان کی موت کے حوالے سے دکھانے پر قادر رہے ہیں۔ دوسری طرف ناول میں تاریخ، فلسفہ حتیٰ کہ سائنس کے نظریات کا عمل دخل بھی رہا ہے مگر وہاں بھی دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ وہ ناول کے ڈیزائن میں کس حد تک پیوست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی ناول نے صنعتی تمدن اور اُس بورژوا سماج کے انفرادیت پسند فرد کے ساتھ واضح شکل اختیار کی ہے جو مقدس اساطیری اور الوہی دنیا کے احساس کے غائب ہونے کے بعد اپنا راستہ تلاش کر رہا ہے مگر اس میں روحانی پیاس بھی ہے اور وہ کسی الوہی احساس کے امکانات کو پھر سے کھنگالنا بھی چاہتا ہے مغربی ناول بورژوا تمدن سے ابھرا بھی ہے مگر اس کی حد بندیوں کو توڑتا بھی ہے۔ رضی عابدی نے اپنے تجزیے کے لیے قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور عبداللہ حسین کو چُنا ہے تو اُن کے پاس اس کا جواز یہ ہے کہ اُن کے نزدیک اِن کی ناول نگاری سنجیدہ تلاش ہے۔ وہ ناول کے ذریعے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ذات کی جڑوں کو کھوجتے ہوئے تہذیبی ماحول کی شناخت کرتے ہیں یہ تلاش اُنہیں تاریخ یا اساطیر تک بھی لے جاتی ہے اُن کے ہاں فرد کی معاشرے سے بے گانگی کی بھی کئی شکلیں ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد کی سماجی اُتھل پتھل کی مختلف لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی افسانہ نگاری شائد اُن کے ناولوں سے بھی آگے جاتی ہے اسی طرح عبداللہ حسین کے بعض ناولٹ اُن کے ذہنی مسائل کو نسبتاً کسے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں رضی عابدی صاحب نے ناولوں کے ساتھ ناولٹوں کو بھی تجزیے میں شامل کر کے کسی حد تک اس احساس کا خیال رکھا ہے قرۃ العین حیدر ہوں، انتظار حسین ہوں یا عبداللہ حسین اُن کی ناول نگاری کی سنجیدہ سطح کو تنقیدی طور پر پہچانا جاچکا ہے اور اُن اہمیت کے مختلف عناصر بھی گِنائے جاتے ہیں مثلاً قرۃ العین حیدر کے یہاں علمی گہرائی، تہذیبی درد، بہت سے کرداروں کو ایک ناول کے کینوس میں دکھانے کی مہارت، فطرت کی خوبصورت تمثالیں بدلتی ہوئی تمدنی زندگی کی کیفیتیں، چمکتی ہوئی نئی نسوانی کرداروں کے المیوں پر نگاہ، تاریخ اور تہذیب کی گہرائی تک سفر، شعور کی رو اور دوسری نئی ہئیتوں کا استعمال۔ انتظار حسین کے ہاں ہجرت کا تصور، تاریخی احساس، اساطیری جہت، ہئیتوں کے تجربات، چھوٹے قصبوں کا ماحول، فطرت، ایک خاص ثقافتی ماحول کی زبان سے لے کر داستانی نثر تک لسانی سطحیں، بے معنویت اور بے گانگی کی شکلیں عبداللہ حسین کے ہاں فرد اور تاریخ کا ٹکراؤ، زندگی کو بہت پھیلاؤ سے دکھانے کی کوشش، فطرت سے خاص قسم کا رابطہ، فرد کی ذہنی مہاجرت اور داخلی، اور بے گانگی، جرم و سزا کے تصورات غرضیکہ فکر و فن کے بہت سے پہلوؤں کی توصیف ہوتی رہی ہے مگر ساتھ ہی بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو ماضی پرستی اور ناسٹیلجیا کا اسیر بتایا گیا ہے ان کی "یاسیت" اعتراضات کی زد میں آئی ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر جاگیردارانہ معاشرت کے گلیمر سے باہر نہیں نکل سکیں۔ انتظار حسین اپنی چھوڑی ہوئی بستی سے آگے نہیں نکلتے عبداللہ حسین کے بارے میں بھی یہ کہا گیا کہ اُن کے ناول میں تاریخ ناول کا لازمی حصّہ نہیں بن سکی۔

اُن کی فلسفہ آرائی کہی ہے۔ قرۃالعین حیدر کی شاعرانہ اور انتظار حسین کی محاورتی نثر پر بھی اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اب فکشن کی تنقید کا کام یہی ہے کہ توصیف اور اعتراضات دونوں کے سادہ بیان سے اُٹھ کر ان ناول نگاروں کا مطالعہ کرے کیوں کہ ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں، دونوں جعیں معاصر اردو فکشن کی حدود کا تعین کرتی ہیں۔ رضی عابدی اپنے تنقیدی جائزوں میں کچھ توقعات پوری کرتے ہیں کچھ امکانات سامنے کر کے اَدھورے چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ امکانات کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ ویسے تو یہ ہر تنقیدی طریق کار کی مجبوری ہے مگر ذہین نقاد مجبوریوں کے پار بھی دیکھتے ضرور ہیں۔ عابدی صاحب انگریزی ادبیات کے اُستاد ہیں اور مغربی ناول کی روایت سے ضروری واقفیت رکھتے ہیں اس لیے اُن کا تنقیدی انداز سطحی یا سرسری نہیں، وہ ناول نگاروں کے مرکزی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اور اپنے جائزوں میں ایک زیریں ربط قائم کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ جہاں موقع ہو وہ جارج ایلیٹ، کونرڈ، لارنس اور دوسرے مغربی ناول نگاروں کے رویّوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور اُن معاشرتی تبدیلیوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو ناول نگاروں کے طرزِ احساس کو متعین کرتی ہیں اُنھوں نے ہر ناول نگار کی فکر کا مرکزی سرا تلاش کیا ہے اور اُس کے مختلف ناولوں کے مطالعے میں یہ بھی دیکھا ہے کہ کہاں اُس کا فن برتر سطح پر ہے اور کہاں تک اس سطح تک نہیں پہنچ پایا۔ اِس طریق کار نے اِن جائزوں کو قابلِ مطالعہ بنادیا ہے اُن کا اسلوبِ تنقید بھی سنجیدہ ہے صحافیانہ کچا پن اُس میں بالعموم نہیں۔ دراصل عابدی کا بنیادی مسئلہ ناول نگار کے مرکزی فکر یا اُس کے "ورلڈویو" اور فنی رویا (آرٹسٹ وژن) کی تلاش ہے وہ سمجھتے ہیں کے یہ طوطا قابو آجائے تو دیو بھی قابو میں ہے۔ کسی حد تک ریمونڈ ولیمز کے طریق کار کا اُن پر اثر ہے مگر ریمونڈ ولیمز کے تجزیے کی بنیاد (چاہے آپ سے اختلاف کریں) ایک بہت گہرے عمرانی تجزیے پر ہوتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد آنے والی تبدیلیوں میں کلچر کے تصورات کی حدود کیا رہیں اور ان کا ان تبدیلیوں سے کیا تعلق تھا ولیمز کا ذہنی رویہ اس سلسلے میں واضح ہے چنانچہ جب وہ ڈکنز یا لارنس کے ناولوں کے اہم اقتباسات کے حوالے سے عمرانی پس منظر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو مختلف کڑیاں جڑتی چلی جاتی ہیں۔ ولیمز کا طریق کار خالصتاً ادبی تنقید کے لیے کتنا اہم ہے یہ الگ سوال ہے مگر اُس کی آواز گہرائی سے ابھرتی ہے اور توجہ مانگتی ہے۔ رضی عابدی صاحب اپنے ذہن میں تو عمرانی تبدیلیوں کے بارے میں ضرور واضح ہوں گے مضامین میں انھوں نے "جاگیرداری عہد" "برصغیر کے مسلمانوں کے شعور" "یوپی کی ثقافت" وغیرہ کو سمجھنے کے لیے کوئی گہرا تجزیہ فراہم نہیں کیا صرف "توہمات" وغیرہ کے ردیا "طفلانہ سیاست" کہہ دینے سے تو کام نہیں چلتا برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو جس طرح قرۃالعین حیدر یا انتظار حسین نے سمجھا ہے اس سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر اس کے لیے اس سے زیادہ کم از کم اتنا گہرا تجزیہ بھی تو چاہیے پھر فنکار تو اپنے ورلڈویو کو ناول میں ڈھال کر بھی اتنا کچھ بتا گئے تنقیدی مضمون میں تو آپ کے پاس زیادہ منطقی انداز میں سب کچھ بیان کرنے کی آزادی بھی ہے مگر اس کے برعکس جب آپ فنکاروں کو مایوسی اور ماضی پرستی کے طعنے دے کر رہ جائیں تو یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مسائل کو بہت ہی سادہ سطح پر لیا جارہا ہے۔ یوں بھی اگر عابدی صاحب ان مصنفوں کے بارے میں لکھی ہوئی اردو تنقید پر بھی نظر ڈال لیتے تو کئی پہلے سے کیے گئے اعتراضات کا حوالہ شاید کچھ اور طرح آتا نیز کچھ نکتوں کی وضاحت کچھ مختلف ہوتی (ممکن ہے انھوں نے کچھ مضامین پڑھ رکھے ہوں مگر ان تجزیوں میں اس مطالعے کا ثبوت نہیں) مثلاً "آخرِ شب کے ہم سفر" کے بارے میں ان کے کئی اعتراضات وارث علوی کے اعتراضات سے ملتے جلتے ہیں مگر وارث علوی کے مضمون میں تمام اعتراضات کرداروں کی نفسیات اور ان کے مکالموں کے حوالے سے ابھرتے ہیں چنانچہ ناول کی تنقید کے سوال بنتے ہیں رضی صاحب سیدھے انداز میں فنکار کی فکر پر معترض ہوتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے ایسے تبصرے بھی ناول کی

اچھی تنقید کی ذیل میں آتے ہیں مثلاً جب وہ ناول نگار کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کے حالات و واقعات پر تبصرے ناول کی فنی وحدت کا حصّہ نہیں بن پائے۔ مصنّف بہت سی ایسی باتیں کہنا چاہتا ہے جنھیں وہ ناول میں نہیں ڈھال سکا جس کی وجہ سے یہ نیم افسانوی، نیم انشائیہ، نیم تخلیقی، نیم واعظانہ قسم کی چیزیں بن جاتا ہے تو یہ پورا بیان تنقیدی ہے۔ مگر جب وہ اس سادہ سطح پر اتر آتے ہیں کہ "انتظار حسین کی دنیا میں سمجھ دار اور مخلص لوگ ہیں ہی نہیں.... لگتا ہے اچھے لوگ اُن کے تجربے میں آئے ہی نہیں" تو تعجب ہوتا ہے پہلی بات کا کوئی تجزیہ کرنے کے بجائے جو دوسرا نتیجہ نکالا گیا اُس کی تنقیدی معنویت کیا ہے۔ مگر اس اعتراض سے یہ نہ سمجھیں کہ عابدی صاحب ہر جگہ یہی انداز اختیار کرتے ہیں جہاں وہ ناول نگار کے متن کے قریب آتے ہیں تو کئی اچھے نکات سامنے آتے ہیں جن سے فکشن سے بطور فکشن دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے مثلاً انتظار حسین کے ناولٹ "دن" کا مطالعہ یا عبداللہ حسین کے "واپسی کا سفر" پر اُن کے صفحات پر بات کچھ یوں ہے کہ جیسے عابدی صاحب ناول نگار کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کے خیالات ناول کی فنی وحدت میں نہیں ڈھل پائے اُسی طرح ان کے اپنے خیالات جہاں (اگرچہ بعض دوسرے ناقدین کے مقابلے میں کم) تقریر کے سے انداز میں آتے ہیں وہاں مضمون کا لازمی حصّہ معلوم نہیں ہوتے۔ جب وہ یہ بتانے لگتے ہیں کہ اب سب مسائل واضح ہیں کسی پر نقاب نہیں یا یہ کہ انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے تو اُن کا انداز اخباری اداریے کی یاد دلانے لگتا ہے۔

رضی عابدی کو ان فنکاروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایلیٹ بہت یاد آیا ہے، جہاں انھوں نے ایلیٹ کے طرز احساس اور ناول نگاروں میں مماثلتیں تلاش کی ہیں وہ عمدہ ادبی تنقید کی مثال ہیں۔ اس تقابل کا جواز بھی موجود ہے وقت کے مسئلے، تشکیک، روحانی اقدار کی تلاش وغیرہ ایلیٹ کے اثرات سے ہمارے جدید ادب میں کئی شکلیں اختیار کی ہیں پھر اپنے زمانے کے انتشار کو سمیٹنے کے لیے ایلیٹ نے جس اساطیری جہت کی نشاندہی کی تھی ان فنکاروں کے ہاں اس کی بھی مثالیں ہیں مگر یہ چیز عجیب ہے کہ مغربی ناول نگاروں کے حوالے بہت سرسری انداز میں آتے ہیں۔ پروست، ورجینیا وولف، لارنس سے ان ناول نگاروں کا جو رشتہ نکلتا ہے وہ مضمون نگار کے لیے مسئلہ نہیں بنتا۔ عبداللہ حسین پر طالسطائی سے ہیمنگوے کے جو اثرات ہیں ان کی معنویت کی انھیں فکر نہیں ہوتی۔ ناول کے کسی کردار کے ساتھ بھی وہ دور تک سفر نہیں کر سکتے اور زبان کے سلسلے میں "مہارت" ہی کا ذکر کر کے رہ جاتے ہیں۔ پورے ناول کی زبان جس طرح ایک بڑا ڈیزائن بناتی ہے ان کی دلچسپی کا موضوع نہیں۔ تمثالوں کے بارے میں بھی بات کچھ رسمی اشاروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ رضی عابدی کے جائزوں کی اہمیت کو مانتے ہوئے بھی یہ باتیں کہنی ضروری ہیں۔ اب اگر ہماری تنقید فکشن سے کچھ دلچسپی لے رہی ہے تو اس کا معیار قائم کرنے کے لیے ایک طرف مکتبی خلاصہ نگاروں کی بے روح تحریروں سے اسے بچانا ہوگا وہاں ناول کی تنقید اور سیاسی نعرہ بازی میں فرق بھی کرنا ہوگا۔ نقطۂ نظر سیاسی ہو یا عمرانی یا نفسیاتی اور اسلوبیاتی، جب تک ناول کی گہری سطح تک نہیں اُترے گا اس کی ادبی حیثیت مشکوک رہے گی۔ رضی عابدی کی کتاب اپنی جگہ اہم ہے اور جہاں جہاں ان کی ناقدانہ نظر متجسس اور گہری ہے اُن کی نکتہ آفرینی متاثر کرتی ہے۔

امتیاز احمد

"پہلی موت"..... ایک تجزیہ

"پہلی موت" ضمیر الدین احمد کا افسانہ ہے۔ یہ ایک چھوٹے بچے کی کہانی ہے جو ایک دوسرے شخص کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوتے دیکھ کر اس کو بچانے کے لیے بیچ میں کود پڑتا ہے اور ظلم کرنے والے کا سر پھوڑ دیتا ہے۔ شکایت گھر پہنچتی ہے۔ والدہ بطور سزا اس کا کھانا بند کر دیتی ہیں اور والد اُسے مرغا بنا دیتے ہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ اس کے خلاف آواز بھی بلند کرتا ہے اور اس پرسش اور ڈانٹ پر کہ آیا وہ پھر ایسی حرکت کرے گا؟ وہ کہتا ہے کہ ہاں، وہ پھر ایسا کرے گا لیکن بالآخر مذکورہ دونوں سزاؤں کی وجہ سے مجبور ہو کر اُسے SURRENDER کرنا پڑتا ہے اور جب اس کی نانی اس سے کہتی ہے کہ وہ جا کر والد سے معافی مانگ لے تو باوجود اس سوال کے کہ وہ کس چیز کی معافی مانگے، اس نے کوئی جرم کیا ہی نہیں ہے، وہ معافی مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"پہلی موت" انسانیت کی شکست، ضمیر کی آواز، ماحول کے جبر اور ابتدائی سطح پر ایک باغی لڑکے کی ناکام بغاوت کا افسانہ ہے۔

"وہ" ضمیر، انسانیت اور حق گوئی و بے باکی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ اشراف خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود، جس میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو اور دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑاؤ عوام سے تعلق رکھتا ہے۔ عوام کے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے (گو یہ سب غیر شعوری طور پر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے یا ممکن ہے فنکار نے اس کا التزام کیا ہو) اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک رہتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر جب وہ ایک غریب آدمی کے ساتھ صرف دس روپوں کے سبب یہ ظلم ہوتے دیکھتا ہے کہ اُسے جوتوں سے مارا جا رہا اور کنکروں پر بہ ایں طور گھسیٹا جا رہا ہے کہ اس کے کپڑے تار تار ہوئے جاتے ہیں اور بدن کے بعض حصوں سے خون رسنے لگتا ہے تو اس سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ اس بات کو فراموش کر کے کہ وہ ظلم کرنے والے سے بہت چھوٹا ہے (گو اس کی سماجی حیثیت اس کے بورژوا پس منظر کی وجہ سے بڑی ہے) وہ ایک ڈھیلا (گما) اٹھا کر عنتوا (ظلم کرنے والا) کو مار دیتا ہے اور اس طرح اس کا (عنتوا) سر پھٹ جاتا ہے۔ خون اس کے سر سے نکلنے لگتا ہے۔ فنکار اس لڑکے کو جائے واردات سے بھاگ کر گھر آتے ہوئے دکھاتا ہے اور یہ بھی کہ گھر کے اندر آنے میں بھی اُسے جھجک محسوس ہوتی ہے جو ڈر اور خوف کی زائیدہ ہے۔ اسی ڈر اور خوف اور کم عمری کی وجہ سے حالات کا سامنا کر سکنے کی صلاحیت نہ ہونے کے سبب اس کے چہرے پر وحشت برستی ہوتی ہے۔ یہ سب اس پس منظر کا نتیجہ ہے جو بورژوا اشرافیت مہیا کرتی ہے جس میں بچے کو ڈرا دھمکا کر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں سخت حالات (CRITICAL SITUATION) کا سامنا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی۔ لیکن اس لڑکے کے اندر ایک باغی، ایک بے باک انسان چھپا ہوا ہے جو بھائی کے یہ کہنے کے ساتھ ہی کہ:

چہرہ دیکھ کر شیشے میں۔ پیلا پڑا ہوا ہے جیسے دم نکلا جا رہا ہو ڈر کے مارے

اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے اور راوی کے بقول یہ کہتے کہتے کہ:

میرا کیوں دم نکلنے لگا میں نے چوری کی ہے کسی کی، میں تو کھیل رہا ہوں۔"

واقعی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ خود اعتمادی لے لیتی ہے اور اسی خود اعتمادی کے زیر اثر جواُسے اس کی باغی، بے باک اور حقیقت پسند طبیعت نے مہیا کیا ہے وہ ماں کے اس سوال پر کہ "تجھے تو نہیں مارا؟" یہ جواب دیتا ہے کہ:

نہیں۔ مگر مدن کو جو مارا۔ جوتوں سے۔ وہ بیچارا چلّا رہا تھا اور یہ اُسے اِتنے اِتنے بڑے کنکروں پر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے اور کئی جگہ خون بھی نکلا۔

گویا اس کا اور مدن کا معاملہ الگ الگ نہیں۔ ایک ہی ہے۔ یہاں دو نسلوں کے سوچنے کے الگ الگ انداز کا بھی پتہ چلتا ہے آگے چل کر باپ اور بھائی بھی اسی طرح سوچتے ہیں کہ اُسے دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن معاملہ تو یہی ہے کہ وہ اسے دوسرے کا مانتا ہی نہیں۔ یہ تو اس کا اپنا ہی معاملہ ہے پھر وہ خود ہی سوچتا ہے:

میں اُتنا بڑا ہوتا تو گتا تھوڑی مارتا۔ خود ٹھکائی کرتا اس عنتوا کے بچے کی اور مدن کو بچا لیتا۔

اُسے کسی نے بچایا بھی نہیں۔ اتنے سارے لوگ تھے۔"

یعنی اُسے اپنے چھوٹے ہونے کا افسوس اس وجہ سے ہے کہ وہ عنتوا کی ٹھکائی نہ کر سکا اور اس کی وجہ سے اس بات کا صدمہ بھی کہ جو لوگ ٹھکائی کر سکتے تھے انھوں نے عنتوا کی ٹھکائی نہ کی۔ اس میں ایک حیرت بھی ہے کہ کیوں نہیں کی اور نفرت بھی کہ صلاحیت رکھنے کے باوجود کرنے کے لائق کام نہیں کیا۔ یہ ایک فطری انسان کا رویہ ہے جسے مصلحت پسندی اور مصلحت اندیشی کی ہوا نہیں لگی ہے۔

ماں کے رویے کے سلسلہ میں اس کی یہ سوچ بھی اہمیت رکھتی ہے کہ "اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ پھر بتانے سے فائدہ؟" اس میں ایک خود اعتمادی ہے، اپنی اہمیت کا احساس ہے اور ماں کی دنیا داری اور مصلحت پسندی کے لیے تحقیر کا جذبہ بھی۔ افسانہ کا سب سے اہم حصّہ جو اس کی باغی طبیعت کو ظاہر کرتا ہے وہ ماں کے اس سوال کے جواب میں کہ "بول پھر کرے گا ایسی حرکت؟" اس کے منہ سے "ہاں" کا نکلنا ہے جس کو سن کر راوی کے بقول "اس کے کان اور اس کا ذہن بھونچکے رہ گئے" یعنی اس نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر نہیں کہا بلکہ جو کچھ ہوا وہ اس کی شخصیت کا فطری ردِ عمل تھا۔ پھر ماں کی باتوں پر اس کے اندر ہی اندر خود کلامی کے انداز میں جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے:

"میں تو اڑاؤں گا، میں تو اڑاؤں گا، میں تو اڑاؤں گا"

"میں پھوڑوں گا، میں تو پھوڑوں گا، میں تو پھوڑوں گا"

"میں تو جاؤں گا، میں تو جاؤں گا، میں تو جاؤں گا"

یہ یوں ہی بے وجہ خود کلامی نہیں ہے بلکہ اس کی طبیعت کی حقیقی اور فطری شدت پسندی، بغاوت اور خود اعتمادی اور ضمیر کی آواز کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہاں تھپڑ اور چپل پر اس کا ردِ عمل بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ماں کے دونوں زور دار تھپڑوں پر وہ روتا نہیں ہے اسے غصّہ آتا ہے جو دوسری مرتبہ میں پورے جسم میں پھیل کر اُسے اور مضبوط بنا دیتا ہے لیکن ہلکی چھچھلتی ہوئی چپل کی ایک چوٹ اُسے رلا دیتی ہے یہاں چپل کی چوٹ اُسے اس ظلم کا اعادہ معلوم ہوتی ہے جو عنتوا مدن کے ساتھ جوتوں سے مار مار کر

کر رہا تھا۔ چپل کی چوٹ اس کے اندر ظلم کو ختم کرنے کی کوشش کو ظلم سے ہی دبانے یا ختم کرنے کا احساس پیدا کرتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں کہ جس فعل پر REACT ہو کر میں نے عنتوا کو مارا تھا وہی فعل خود میرے ساتھ ہو رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس میں ماں کے ظالم ہونے کے احساس کی شدت بھی ہو سکتی ہے بعد ازاں والد کو وہ بڑی تفصیل سے عنتوا کے ظلم کی داستان سُناتا ہے لیکن نتیجہ کے طور پر اُسے بھوکے رہنے کے ساتھ ساتھ مرغا بھی بننا پڑتا ہے۔ یہاں باپ کے حکم پر اس کا ٹس سے مس نہ ہونا اور اُن کے ہاتھ اٹھالینے کے بعد مرغا بن جانے کا عمل بھی اہمیت رکھتا ہے یعنی وہ ممکن حد تک RISIST کرتا ہے۔ اس کے اندر کا باغی اور اُبھرتا ہے اور راوی کے بقول:

"سزا نے اس شے کو جو اس کے اندر کہیں چھپی ہوئی تھی اور جو کبھی کبھار پگھل پگھل کر
اس کی آنکھوں کے راستے بہا کرتی تھی سخت کر دیا تھا۔

یہی شدید قسم کی بغاوت اور مصالحت نہیں کرنے کا رویہ اُسے باورچی خانے سے کھانا نکال کر چپکے سے کھالینے سے بھی روک دیتا ہے۔ آخر میں جب اس کی قوت برداشت جواب دے رہی ہوتی ہے اور نانی اس کو ابا سے جا کر معافی مانگنے کا مشورہ دیتی ہے تو وہ ایک بار پھر اکڑ جاتا ہے۔ معافی اس کے حلق میں گولہ بن کر پھنس جاتی ہے جسے وہ نگل نہیں پاتا لیکن بھوک، تکلیف اور تلخی ایک ساتھ جمع ہو کر اُسے معافی مانگنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب وہ کئی ہزار لمحات میں تنگ آنگن کو پار کر کے اور کئی ہزار لمحات تک بلاوجہ حقے کی گڑ گڑ پر کان لگائے رہنے کے بعد اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر اپنے باپ سے معافی مانگتا ہے "ابا معاف کر دیجیے۔ اب ایسی غلطی نہیں کروں گا۔" تو اس کے اندر کھنچی ہوئی کمان چٹاخ سے ٹوٹ جاتی ہے اور وہ آنسوؤں اور سسکیوں کے ریلے بہہ جاتا ہے۔ یہ آنسو اور سسکی اس کی اپنی بے بسی، ناکامی، حالات کے آگے SURRENDER کرنے کی مجبوری یا جبر اور ظلم کو ختم کرنے کی کوشش میں خود ظلم کا شکار ہونے کے احساس کی وجہ سے ہے جو شاید ہر باغی کا مقدر ہے۔

افسانے کا عنوان "پہلی موت" بھی بڑی معنویت کا حامل ہے۔ اس میں اس چھوٹے سے بچے کو کردار بنا کر اس کا بڑا اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ بچے کے اندر جتنی حق گوئی، بے باکی، بے خوفی، مصلحت نااندیشی وغیرہ ہوتی ہے وہ ایک بڑے آدمی کے اندر نہیں پائی جا سکتی ان سب خوبیوں اور مثبت پہلوؤں کے باوجود جب اسے بھی SURRENDER کرنا پڑتا ہے تو قاری پر اس کا شدید ردِ عمل ہوتا ہے۔ SURREN DER اس باغی بچے کے اندر پیدا ہو رہی جرات، ہمت، بے باکی، حقیقت پسندی وغیرہ کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے کہ مستقبل میں شاید وہ پھر کبھی ایسی جرات رندانہ سے کام نہ لے سکے اور ممکن ہے یہ اس کی پہلی کے ساتھ ساتھ آخری جرات بھی ثابت ہو یا یہ بھی ممکن ہے وہ اس پر بعد میں اور زیادہ شدت سے REACT کرے اور اس جبر کے اندر سے کوئی نئی کونپل اُٹھتی اور سر ابھارتی ہوئی نظر آئے۔ عنوان کا لفظ "پہلی" اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ ایک زندگی میں انسان کو اندرونی طور پر اس قسم کی کئی اموات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے اندر جتنی قوت ہوتی ہے وہ اتنی مرتبہ پھر زندہ ہو جاتا ہے ورنہ شکست کھا کر اپنے آپ کو مردہ سمجھنے لگتا ہے۔

اس افسانے کی صورت حال کو اختر الایمان کی نظم "ایک لڑکا" کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک لڑکا بھی انسانی ضمیر کی آواز ہے جو اسے بار بار یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ وہ زندہ ہے ضمیر ابھی مرا نہیں ہے ہر مرتبہ جب انسان کسی کے سامنے جھکتا، کسی کے سامنے دامن پسارتا ہے یہ لڑکا اُسے یاد دلاتا ہے، ضمیر کی آواز اُسے جگاتی ہے، ٹہوکا دیتی ہے:

یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

اور بالآخر بار بار کی موت کے بعد جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا ضمیر، اس کے اندر کا انسان، حقیقی اور اصلی انسان مر چکا ہے وہ لڑکا مر چکا تھا جس نے یہ سوچا تھا کہ اک تماشا کہ عالم پھونک ڈالے گا تو اندر کی آواز پھر اُسے یاد دلاتی ہے۔

یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اور نظم اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے یعنی بار بار مرنے کے باوجود بھی ضمیر کی آواز بالکل مرتی نہیں ہے زندہ رہتی ہے اور اُسے نہو کے لگاتی رہتی ہے۔

یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ "آخر شب کے ہم سفر" کی ناصرہ، نجم السحر جب اپنے ماموں اور سابق انقلابی ریحان الدین احمد اور دیپالی سرکار کو اس لیے برا بھلا کہتی ہے کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کا شکار ہو گئے تو دیپالی سوچتی ہے کہ آج کی اس انقلابی (ناصرہ) کل کیا حشر ہوگا۔ "پہلی موت" کے اس لڑکے کے بارے میں بھی یہی سوال کیا جا سکتا ہے۔

اس افسانہ میں ماں، باپ اور بھائی اس ماحول، حالات اور جبر کی علامت ہیں جو انسان کو پہلے SURRENDER کرنے اور پھر STABLISHMENT کا شکار ہونے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ نانی اماں اس طبقہ کی نمائندہ ہیں جو حقیقت سے واقف ہوتے اور اسے سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا کہ خود حالات کے جبر کا شکار ہے یہاں انور سجاد کے افسانے "کونپل" اور خالد حسین کے افسانے "سواری" کی معنویت کا بھی سراغ ملتا ہے۔

افسانے میں اس لڑکے کا یہ بیان کہ "اتنے بہت سے لوگ تھے لیکن مدن کو کوئی نہیں بچا رہا تھا" اور راوی کا اس لڑکے کے گھر پر شکایت لے کر جانے والوں کے بارے میں یہ خیال کہ "شاید وہ سارے لونڈے لپاڑیے جن کے ساتھ وہ تھوڑی دیر پہلے کیا رہا تھا جلوس بنا کر تماشا دیکھنے ساتھ ساتھ آئے تھے۔" اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ظلم کے خلاف آواز نہ بلند کر کے ظالم کا ساتھ دینے اور پھر ظلم کو روکنے کی کوشش کو کچل ڈالنے کے عام رویے کو ظاہر کرتا اور سلیم احمد کے اس مصرع کی تفسیر بن جاتا ہے

دوست ہیں مظلوم کے اور ہمنوا قاتل کے ہیں

اور پورے معاشرے پر ایک بھرپور طنز کی صورت کو سامنے لاتا ہے۔

افتخار احمد عدنی

یادوں کا سفر۔ بابا ذہین شاہ تاجی

غالب کے تصرفات پر میرا مضمون پڑھ کر نورالحسن جعفری صاحب نے مجھے فون کیا اور بہت دیر تک نہایت ہمدردی اور شفقت سے مجھے مفید مشورے دیتے رہے۔ عمر میں وہ شاید مجھ سے چھوٹے ہوں لیکن اگر نہیں ہیں تو کم از کم لگتے ضرور ہیں۔ عمر کے س غیر واضح فرق کے باوجود وہ ایسے سرکاری اور غیر سرکاری مناصب پر فائز رہے ہیں کہ وہ مجھے اپنی نصیحتوں سے نوازتے رہیں اور یں انہیں گوش نصیحت نیوش سے سننے کے تاثر سے مطمئن کرتا رہوں۔ میں نیپا کا ڈائریکٹر تھا تو وہ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے سیکرٹری ہو گئے۔ میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو اُن کے ایما پر انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے مجھے انجمن کا متولی لے لیا لیا۔ اس دفعہ ان کا مشورہ اتنا صایب تھا کہ میں نے اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس مضمون کا عنوان ہی میرے ارادے پر شاہد ہے جعفری صاحب نے کہا کہ غالب کے اشعار کے حوالے سے کسی غالب شناس کے لطیفوں پر وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ غالب کے بے شمار قدردان اُن کی خدمت میں عقیدت کے نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور رہے شہر کے مشہور و معروف غالب شناس تو وہ اپنے قہقہوں سے اور غالب کے اشعار کے گاہ بے محل اور گاہ بر محل استعمال سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیتے ہیں۔ کون ہے جو ان سے اور ان کے محبوب شاعر سے واقف نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس لہو ولعب میں وقت گنوانے سے کیا ملے گا۔ اب آپ کہیں یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ میرے ممدوح کے قہقہوں میں اور غالب کے اشعار کے بے محل استعمال میں کس کو لہو قرار دیا جائے اور کس کو لعب۔ یہ ایسا ٹیڑھا سوال ہے کہ اس کا جواب غالب بھی آسانی سے نہیں دے سکتے۔

جعفری صاحب نے مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے ایک اہم کام کی طرف متوجہ کیا میں ان کی اس بہی خواہی کا ممنون ہوں۔ اس ذمہ داری کا ذکر میں اس وقت کروں گا جب اس سلسلے میں مجھے کچھ کام کرنے کی توفیق ہوگی۔ فی الحال میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ان کی نصیحت اتنی موثر تھی کہ میں نے فوراً یہ فیصلہ کر لیا کہ "غالب اور رمضان" اور "غالب اور غالب شناسی" کے موضوعات پر کوئی مضمون نہیں لکھوں گا حالانکہ ان میں میرے لیے خاصی کشش ہے۔ جعفری صاحب کی ناصحانہ گفتگو کی ایک خوشگوار خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پابندی کے ساتھ رخصت کا عنصر بھی موجود تھا۔ حضرت عبدالمعبود نے اپنے غالب پرست عقیدت مند پر بڑی قطعیت کے ساتھ پابندی لگائی تھی۔ یہ پابندی انھوں نے اس وقت اٹھائی جب غالب نے خواب میں آکر ان سے بغیر کچھ کہے شکایت کی۔ "شکوہ اور پائے سخن درمیاں نہیں" جعفری صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غالب کو زحمت دیے بغیر رخصت کا در مجھ پہ وا کر دیا۔ میں اُن کو مدت سے جانتا ہوں۔ میں نے اُن کو کبھی گفتگو کے دوران کوئی شعر یا مصرعہ

پڑھتے ہوئے نہیں سنا جب ٹیلیفون پر طویل گفتگو کا اختتام انھوں نے ایک مصرعہ بلکہ غالب کے فارسی مصرعے کا ترجمہ پڑھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ انھوں نے میرے ترجمے کو لفظی ترجمے سے بہتر قرار دیتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا۔ "ہے تشنگی میں چشمۂ حیواں سے احتراز" مجھے یہ مصرعہ سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ میں نے اُن کے جاننے والوں کو فون کر کے پوچھا کہ کیا کبھی جعفری صاحب گفتگو کے دوران شعر پڑھتے ہیں۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا پہلے تو نہیں ہوا۔ وہ انگریزی کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کرسکتے ہیں لیکن نہیں دیکھا گیا کہ وہ کوئی شعر یا مصرعے پڑھ کہ کسی رومانوی کمزوری کا اظہار کریں۔ یہ بات میرے لیے بہر باعث فخر ہے کہ انھوں نے نہ صرف میرے ترجمے کو پسند کیا بلکہ اُسے یاد رکھا اور پڑھ کے مجھے بالواسطہ یہ رخصت بھی دے دی کہ میں کبھی کبھی سنجیدہ مضامین میں بھی غالب کے اشعار استعمال کرلیا کروں۔

اب میں حضرت بابا ذہین شاہ صاحب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ جب جوش صاحب پر میرے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے تو میرے دوست عالی صاحب نے شکایت کی کہ ان میں جوش صاحب کم اور بابا صاحب زیادہ ہیں۔ میں نے وضاحت کی کہ میں نے تو جانا ہی جوش صاحب کو بابا صاحب کے حوالے سے ہے، وہ ان سے ملنے آتے تھے۔ بہت برہمی اور بغاوت کے عالم میں اور بہت مطمئن ہو کر لوٹتے تھے۔ عالی صاحب نے ایک اور مضمون پڑھ کر کہا کہ جوش صاحب کی زندگی کے اس پہلو سے تو لوگ واقف ہی نہیں تھے اور اب وہ یہ کہتے ہیں کہ "بھئی ہم بھی سلسلۂ تاجیہ میں شریک ہونے کو تیار ہیں بشرطیکہ۔" عالی صاحب کی زندگی کا المیہ یا شاید طربیہ یہ ہے کہ وہ کسی چیز پر غیر مشروط طریقے سے آمادہ نہیں ہوتے۔ جس زمانے (کوئی بیس پچیس برس پہلے) میں وہ بابا صاحب کے مکان کے قریب رہتے تھے تو میں عید کے موقع پر اُن کے گھر گیا۔ انھوں نے شکایت کی کہ بابا صاحب کے یہاں تو آپ ہر دوسرے تیسرے دن جاتے ہیں اور ہم سے ملنے صرف عید کے روز آتے ہیں۔ میں نے کہا اگر آپ بھی وہاں آنے لگیں تو ہر ہفتے ملاقات ہونے لگے۔ اس تجویز پر عالی صاحب بہت ناخوش ہوئے کہنے لگے "جناب میں اپنی شخصیت کا سودا کر کے کسی غیر اللہ کے آگے سر جھکا کے بیٹھنے کے قایل نہیں ہوں" میں نے پوچھا کہ ان کے ہاں جانے سے میری شخصیت میں کیا کمی آگئی ہے جو آپ وہاں جانے سے ڈرتے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز کو بالکل مسترد کردیا۔

کچھ عرصے بعد عالی صاحب نے گھر بدلا اور شہر کے ایک اور حصے میں رہنے لگے۔ انھوں نے ایک شام مجھے کھانے پر بلایا۔ میں نکلنے والا تھا کہ بابا صاحب کا فون آیا۔ ان کا بلانے کا طریقہ بڑا دلاویز ہوتا تھا۔ کہنے لگے "آپ یاد آرہے ہیں۔" میں نے کہا عالی نے مجھے کھانے پر بلایا ہے وہاں سے فارغ ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ یہ جان کر کہ مجھے مصروفیت ہے انھوں نے آنے پر اصرار نہیں کیا اور کہا کل آجائیے گا۔ عالی صاحب کے ہاں تین گھنٹے گزارنے کے بعد میں نے جانے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے کہا ایسی کیا جلدی ہے۔ میں نے کہا بابا صاحب کے یہاں جانا ہے وہ بہت بے مزا ہوئے کہنے لگے ایک شام بھی آپ ہمارے ساتھ نہیں گزار سکتے میں نے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ بابا صاحب آپ کے دوہے سن کر بہت خوش ہوں گے۔ عالی صاحب نے کہا جناب آپ کے بابا صاحب کو میرے دوہے سننے ہیں تو وہ یہاں تشریف لائیں۔ بابا صاحب نے تو مجھے دوسرے دن آنے کی اجازت دے دی تھی لہٰذا میں کچھ دیر اور ٹھہر گیا۔ لیکن جب اُٹھا تو طبیعت بے مزا سی تھی۔

دوسرے دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد انھوں نے پوچھا کہ عالی کے ہاں کیسی شام گزری۔ میں نے کہا میرا تو بہت دل چاہ رہا تھا آپ کے پاس آنے کے لیے لیکن عالی کی ناراضگی کی وجہ سے ٹھہرنا پڑا۔ بابا صاحب ایسے عالی ظرف تھے کہ مجھے اُن سے صاف بات کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں انھیں بھی آپ کے پاس لانا چاہتا تھا

لِن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ باباصاحب میرے دوہے سننا چاہتے ہیں تو یہاں تشریف لاکر عزت افزائی فرمائیں۔ بابا
احب سن کے مسکرائے جب چائے کا دور ختم ہوا تو وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے دس منٹ بعد کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلے
مجھ سے کہا "چلیے" میں پوچھا کہاں تو فرمایا "عالی صاحب کے دوہے سننے کے لیے۔" میں نے کہا باباصاحب مجھ پر یہ ستم نہ کیجیے وہ
برے اصرار کے باوجود یہاں آنے پہ راضی نہ ہوں اور آپ ان کا ایک گستاخانہ جملہ سن کے جانے کے لیے تیار ہو جائیں بڑی منت
ماجت کے بعد میں نے باباصاحب کو عالی صاحب کے ہاں جانے سے روکا یہ بھی باباصاحب کے ظرف کی وسعت۔ وہ عالی کی انا کی
سکین کی خاطر جانے پر تیار ہوگئے، اور میری آزردگی کے خیال سے ٹھہر گئے۔

"بزمِ خسرو" کے قیام کے سلسلے میں تقی صاحب کے گھر پر ایک نشست تھی۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا ادھر اُدھر
باتوں کے بعد وہ کہنے لگے "ان صوفی مشرب بزرگوں کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ میں ایک دن باباذہین شاہ صاحب سے ملا
ر میں نے تصوف صوفیا کے مسلک اور اسلام کے بنیادی طرزِ فکر سے ان کے انحراف پر سخت تنقید کی، وہ ایک تبسم کے ساتھ
اموشی سے میری باتیں سنتے رہے، دوسرے دن صبح ہی باباصاحب میرے گھر تشریف لائے۔ آتے ہی فرمایا "تقی صاحب کل آپ
باتوں میں بہت لطف آیا۔ دل چاہا کہ آپ کے ساتھ کچھ اور وقت گزارا جائے۔ اس لیے آگیا، تقی صاحب نے کہا ان کے اخلاق اور
لطفِ کلام نے مجھے لوٹ لیا ان صوفیا کے آگے ٹھہرنا مشکل ہے یہ سب کو ہضم کر لیتے ہیں۔

تقی صاحب کی تلخ تنقید سن کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ عالی صاحب کی بے لحاظی پہ ان کے گھر جانے کو تیار ہوگئے۔ مولانا ماہر
قادری جو ہر مہینے اپنے رسالے "فاران" میں باباصاحب کی تحریروں پر سخت تنقید کرتے تھے ہر اہم مشاعرے میں باباصاحب کے
ہر مدعو ہوتے تھے اور باباصاحب انھیں اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک نشست تھی۔ اس میں خواتین بھی
ریک تھیں۔ ایک بیگم صاحبہ نے جنھیں شعر سے بھی ذوق تھا اپنا کلام سنانے کی خواہش کی۔ باباصاحب صدارت فرمارہے تھے۔
برابر میں مولانا ماہر القادری بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ جب اپنی غزل سنانے کے لیے اٹھیں تو باباصاحب کی شخصیت سے اتنی
رعوب ہوئیں کہ چند جملے انھوں نے معذرت کے طور پہ کہے بولیں "مجھے یہ جسارت نہیں کرنی چاہیے تھی ایسے بڑے شعرا کی
وجودگی میں اور خاص طور پر باباصاحب" اور پھر وہ رکیں تاکہ باباصاحب کی شان کے مطابق کچھ الفاظ استعمال کریں اور بولیں
"خاص طور پر باباذہین شاہ تاجی رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ کی صدارت میں" رحمتہ اللہ علیہ سن کر مولانا ماہر القادری نے نیچے کا ہونٹ
دانتوں میں دبالیا کچھ لوگ ہنسے، کچھ لوگ مسکرائے۔ لیکن باباصاحب ایسے بیٹھے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بلکہ بڑی شفقت سے
بیگم صاحبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے تاکہ سخن سرائی کی آزمائش اُن پر آسان ہو۔

مشاعرے کے بعد کھانے کے دوران مولانا ماہر القادری نے مجھے اپنا ایک دلچسپ تجربہ سُنایا گفتگو انھوں نے انھی بیگم صاحبہ
کے ستائشی رحمتہ اللہ علیہ سے شروع کی۔ کہنے لگے کہ ایک نئے رسالے کا اجرا ہوا۔ اس کے مدیر نے انھیں خط لکھنے شروع کیے اور غیر
مطبوعہ غزلوں اور نظموں کا مطالبہ کیا۔ مولانا نے انھیں دو تین خط لکھے ہر خط میں وہ اپنے نام کے ساتھ "عفی عنہ" کے الفاظ لکھتے تھے۔
جب بالآخر مولانا نے انھیں اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام بھیجا تو انھوں نے اداریے میں بڑے احترام کے ساتھ لکھا "ہم مولانا
ماہر القادری عفی عنہ (خدا انھیں معاف کرے) کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے غیر مطبوعہ کلام سے نوازا ہے" اور
پھر مولانا کے کلام کی خوبیاں کرنے میں ان کے نام کے ساتھ "عفی عنہ" کی تکرار کی تھی۔

باباصاحب کی زندگی میں اس قسم کے دلچسپ واقعات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ باباصاحب کی ذات کے حوالے سے دو

دلچسپ تجربات مجھے بھی ہوئے۔ ان کے وصال کے دو سال بعد جب جب رسالہ "تاج" کا ذہین نمبر نکلا تو میں نے یہ روداد لکھی تھی۔ قومی زبان کے قاریوں کا حلقہ "تاج" کے قاریوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے اُس تحریر کو اس مضمون میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جعفری صاحب نے جس ذمہ داری کا احساس دلا کے مجھ پہ احسان کیا ہے اس کی طرف پوری طرح توجہ ہونے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کے بارے میں اپنی یادوں کی امانت محفوظ کر دوں۔

"بابا صاحب کی وسعت قلبی کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ جب کبھی میری کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جسے اُن کے مسلک پر اعتراض ہوتا یا اُن کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتا تو اس کی تمام گفتگو اُن کی خدمت میں بلا کم و کاست پیش کر دیا کرتا تھا۔ بعض وقت وہ کچھ اہم نکات پر روشنی ڈالتے تھے، جن کی وجہ سے صوفیاء کے مسلک کو سمجھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں، بعض وقت وہ ایسی نزاکتوں کی نشاندہی کرتے جن کے متحمل صرف اہل راز ہی ہو سکتے ہیں، اور بعض وقت یہ معلوم ہوتا کہ مخالفت کی بنیاد صرف کسی قسم کی منفعت کا حصول ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کچھ لوگ صرف بابا صاحب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے ان سے شاکی تھے۔

حسب ذیل دو واقعات جو مجھے پیش آئے تو میں نے بے کم و کاست ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ جب میں نے پہلا واقعہ سنایا تو بہت محظوظ ہوئے اور ایک بہت دلنشین تبسم کے ساتھ فرمایا "لکھ ڈالو"۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد دوسرا واقعہ سنایا تب بھی بہت محظوظ ہو کر فرمایا "لکھ ڈالو" بابا صاحب کی زندگی میں یہ واقعات لکھنے کی ہمت نہ ہوئی، اب ان کے سجادہ نشین بابا انور شاہ صاحب کے اصرار پر بابا صاحب کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اصغر نے جو سالہا سال سے میرے واقف تھے۔ بڑی لگن سے ذہنی امراض کا ایک اسپتال ناظم آباد میں تعمیر کرایا تھا۔ اس اسپتال کے لیے زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں میرے ایک دوست نے امداد کی جب عمارت مکمل ہو گئی تو ڈاکٹر اصغر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اس کا افتتاح کسی بڑے سرکاری افسر سے کرایا جائے۔ اس وقت جنرل یحییٰ خان کا دور تھا۔ ملک میں وزراء ناپید تھے۔ لہٰذا سرکاری افسر ہی افتتاحی تقریبیں ادا کر رہے تھے۔ منظور الہیٰ صاحب حکومت سندھ کے چیف سیکریٹری تھے۔ بڑے دردمند دل کے مالک ہیں۔ میں نے ایک خط لکھ کے ڈاکٹر اصغر کو اُن کے پاس بھیجا لیکن شاید ذہنی امراض کے اسپتال کا نام سن کر وہ گھبرائے اور انھوں نے اپنی مصروفیات کی بناء پر معذرت کر لی۔ ڈاکٹر اصغر بہت مایوس واپس آئے اور کہنے لگے کہ حکومت سندھ کے محکمہ صحت کے سیکریٹری سے کہیے کہ وہ اس اسپتال کا افتتاح کر دیں۔ میں نے صرف اسپتال کا ذکر کر کے ٹیلیفون پر ان سے افتتاح کی درخواست کی تو وہ راضی ہو گئے۔ لیکن جب ڈاکٹر اصغر ان کے پاس گئے اور انھیں یہ معلوم ہوا کہ اسپتال کس نوعیت کا ہے تو وہ بھی سرکاری دورے کے بہانے سے اپنا دامن بچا گئے۔ تیسرے دن ڈاکٹر اصغر بہت مایوسی اور بد دلی کے عالم میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے ہمارے ملک میں ذہنی امراض کے اسپتال کو عام طور پر لوگ پاگل خانہ کہتے ہیں اور کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ پاگل خانے کا افتتاح کرے۔ پھر وہ کہنے لگے کہ اگر آپ کا کوئی دوست اس کا افتتاح نہیں کرتا تو پھر یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ آپ تو دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ افتتاح کس طرح ہوگا۔ کسی مریض کے داخلے سے یا بجلی کے شاک (SHOCK) سے؟ انھوں نے بتایا کہ افتتاح ایک نہایت رومانوی انداز سے ہوگا۔ اسپتال کے وسط میں رات کے کھانے کے بعد ایک مشاعرہ ترتیب دیا جائے گا اور مریض اپنے کمروں کے سامنے والے برآمدوں سے داد سخن دیں گے اور مشاعرے کے اختتام پر

ویلیم (VALIUM) کی گولیوں اور کیفِ سخن سے محوِ خواب ہو جائیں گے اور دوسرے دن سے اسپتال باقاعدہ جاری ہو جائے گا۔
میں ڈاکٹر صاحب کی خوش ذوقی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے ان سے پوچھا کہ سرکاری افسروں کی طرح شعرا کو تو اس تقریب میں شرکت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تو انھوں نے بتایا کہ شعرا کی طرف سے انھیں پورا تعاون حاصل ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا کیوں کہ جنوں کا عشق سے عشق کا شعر سے قدیم رشتہ ہے۔ کراچی کے بیشتر معروف شعرا نے محفل میں شرکت کی مشاعرے سے پہلے ڈاکٹر اصغر نے اپنے گھر پر بہت پُر تکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا کھانے کے بعد دماغی امراض کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ سراج الدّین ظفر صاحب اس گفتگو میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ ڈاکٹر اصغر دیر تک ان کے سوالات کے جواب دیتے رہے جب گفتگو نفسیات کے پیچاک میں الجھنے لگی تو میں بھی اس میں شریک ہو گیا کیوں کہ اس زمانے میں میں فرائیڈ اور یونگ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سراج الدّین ظفر صاحب کے ایک سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ جس طرح زمانۂ قدیم کا انسان جس چیز سے ڈرتا تھا اس کا بُت بنا کے اُسے پوجنے لگتا تھا۔ اسی طرح ذہنی امراض کا مریض اپنے ہر خوف اور واہمے کا ایک بت تراش لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے خدشات کے بتوں میں گھر جاتا ہے اور اوہام کے یہ بت اس کے نزدیک پتھر کے تراشیدہ بتوں سے زیادہ حقیقی ہوتے ہیں۔ یہ سن کر ایک صاحب نے میری گفتگو کاٹتے ہوئے بڑے تیکھے انداز میں مجھ سے کہا "ارے صاحب کراچی کے سب سے بڑے بُت کا بھی تو کچھ کیجیے۔" میں نے پوچھا "آپ کا اشارہ کس بت کی طرف ہے؟" فرمانے لگے "بابا ذہین شاہ تاجی" اس بت کے آگے سب ہی جھکتے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، چھوٹے، بڑے، شیعہ، سنی، عالم، جاہل، آخر اس بت پرستی سے بھی تو نجات کی کوئی صورت بتائیے۔" اس سوال پر میں گھبرایا اس لیے کہ اگر میں یہ ظاہر کرتا کہ بابا صاحب سے مجھے کیا تعلق ہے تو انھیں ضرور شرمندگی ہوتی۔ اس لیے میں نے بہت احتیاط سے جواب دیا۔ میں نے کہا "بابا صاحب کی صحبت میں مجھے بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہاں میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جن پر بُت پرستی کی تہمت نہیں لگا سکتا مثلاً فضلی صاحب جو گھنٹوں بابا صاحب کی خدمت میں بیٹھ کر ان کی دلچسپ باتوں کا لطف لیتے ہیں حالانکہ انھیں تصوّف سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور وہ وحدت الوجود کے سخت خلاف ہیں، یا ہاشم رضا صاحب جو صرف مشاعروں میں شرکت کی غرض سے بابا صاحب کے ہاں جاتے ہیں یا جوش صاحب جو اس عہد کے سب سے بڑے بُت شکن سمجھے جاتے ہیں اور ان کے نزدیک اگر کوئی بُت قابلِ پرستش ہے تو صرف ان کی اپنا انا کا۔ یہ سب حضرات جو مزاج میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں کسی عقیدت کی بناء پر بابا صاحب کے پاس نہیں جاتے بس بابا صاحب کی ذات کی دلکشی ہے جو انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔" یہ جواب سن کر ان صاحب کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بابا صاحب سے میرا کوئی تعلق ضرور ہے اور پھر وہ مجھے اس محفل میں نظر نہیں آئے۔ کھانے کے بعد مشاعرہ ہوا، اور خوب جما اور شاید اس میں بھی بابا صاحب کا فیضان کارفرما تھا، بابا صاحب کا شعر ہے:

به فیضِ بت پرستی تم ذہین اللہ والے ہو
خدا یاد آئے جس کو دیکھ کر یہ آدمی تم ہو

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب از خود تکلیف کر کے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے علم ہوا ہے کہ ایک معاملے میں آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ میں آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُن کے مشورے پر عمل کیا اور ایک نقصان سے بچ گیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا دوسری ملاقات کے بعد جب وہ جانے لگے تو میں نے ان سے پوچھا آپ کا تعلق کس جگہ سے ہے؟ انھوں نے بتایا کہ اجمیر شریف کے رہنے والے ہیں اور حضرت غریب نواز کے آستانۂ عالیہ کے سجادہ نشینوں کے گھرانے سے ان کا

تعلق ہے۔
اجمیر شریف کی نسبت سے میں نے ان کی بہت تکریم کی اور ان سے استدعا کی کہ پھر تشریف لائیں۔ جب دوسری مرتبہ وہ آئے تو بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس اثنا میں میں نے کہا کہ آپ تو اپنے ہی خاندان میں بیعت ہوں گے۔ اس پر انھوں نے فرمایا نہیں میں تونسہ شریف میں بیعت ہوں۔ اس پر مجھے ذرا حیرت ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ تونسہ شریف کے ایک بزرگ جن کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا اجمیر شریف بڑی عقیدت سے ہر سال حاضری دیا کرتے تھے، میرے والد کی ان سے بہت دوستی تھی۔ ایک دفعہ جب وہ میرے بچپن میں آئے تو والد صاحب نے مجھے ان کی گود میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ آپ کا بچہ ہے۔ تو اس طرح میں تونسہ شریف سے وابستہ ہوں۔" دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس اثنا میں چائے کا بھی دور ہوا میں ڈیرہ غازی خاں کے ضلع میں جہاں تونسہ شریف واقع ہے، ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا۔ وہاں کے چند واقعات مجھے یاد آئے جس پر میں نے بے خیالی میں ایک بہت غلط بات کہہ دی میں نے کہا خواجہ سلیمان صاحب کی وجہ سے تونسہ شریف کو وقار حاصل ہوا لیکن ان کے جانشینوں میں مجھے کوئی بات نظر نہیں آئی جس زمانے میں میں ڈپٹی کمشنر تھا مجھے سجادہ نشین صاحب کی طرف سے ہتھیاروں کے لائسنسوں کی درخواستیں موصول ہوتی رہتی تھیں یا ایک بزرگ کی طرف سے ملازمتوں کے تقرر یا تبادلوں کی سفارشیں آتی رہتی تھیں، روحانیت کی جھلک کوئی نظر نہیں آئی۔
یہ سن کر ان صاحب نے جواب دیا: کیا کیا جائے زمانہ ہی ایسا آگیا ہے، روحانیت کو بھی لوگوں نے ایک تجارت بنالیا ہے۔ آپ یہیں دیکھیے کراچی میں ایک صاحب ذہین شاہ تاجی ان کی دوکانداری کا آپ کچھ نہ پوچھیں۔"
یہ سنتے ہی مجھے ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے ان کے سلسلۂ عالیہ کا احترام کرنا چاہیے تھا مجھے خود حضرت خواجہ سلیمان صاحب کی کرامت کا ایک تجربہ ہو چکا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ تمانچہ تو میرے چہرے پر اللہ کی طرف سے پڑا ہے:

روئے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ
آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

یہ سمجھ کر کہ یہ میری غلطی کی سزا ہے، میرے دل میں ایک عجیب وسعت پیدا ہو گئی اور میں نے کچھ دیر بعد بڑی خوش دلی سے ان سے پوچھا کہ بابا ذہین شاہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کہنے لگے انھوں نے اپنی دوکان چلانے کے لیے ایک پٹھان کو لال رنگ کا جوڑا پہنا کے گھنگھرو بندھوا دیے ہیں۔ اُدھر قوالی شروع ہوئی اِدھر پٹھان نے سدا سہاگن کی طرح ناچنا شروع کر دیا۔ لوگ بہت مرعوب ہوتے ہیں اور جوق در جوق ان کے مرید ہوتے ہیں۔"
میں نے کہا "لیکن سنا ہے وہ بہت خوش خلق آدمی ہیں۔" اس پر وہ کہنے لگا۔
"میاں دوکاندار اگر خوش خلق نہ ہو تو اس کی دوکان پر کون آئے گا؟ یہ سب دوکانداری کے کھیل ہیں۔"
جب میں نے یہ دیکھا کہ حضرت بابا ذہین شاہ صاحب کے بارے میں ان کے خیالات بہت شدید ہیں تو میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے ان کے شیخ حضرت بابا یوسف شاہ صاحبؒ کے بارے میں استفسار کیا کیوں کہ انھوں نے ایک مدّت مدید اجمیر شریف میں گزاری تھی۔ میں نے پوچھا "بابا یوسف شاہ صاحبؒ کو تو آپ نے دیکھا ہو گا سنا ہے وہ بہت بڑے بزرگ تھے؟"
کہنے لگے۔ "وہ تو ان سے بھی دو ہاتھ بڑھے ہوئے تھے۔" یہ سن کر مجھے بہت ہنسی آئی میں سمجھا کہ یہ ایک سلسلے کی طرف سے دوسرے سلسلے کو ترکی بہ ترکی جواب مل رہا ہے۔ میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" انھوں نے کہا "وہ حضرت اجمیر شریف اکثر آیا

کرتے تھے۔ ایک دفعہ محفل سماع ہو رہی تھی۔ وہ میر محفل بنے بیٹھے تھے عصر کی اذان ہوئی پندرہ منٹ بعد جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ کسی نے آکر ان سے آہستہ سے کہا "سماع ختم کیجیے نماز شروع ہونے والی ہے" کہنے لگے "یہاں بھی نماز ہی ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ صاحب اُٹھے اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

شام کو میں بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور جا کے میں نے پورا ماجرہ سنایا۔ بابا صاحب حسب عادت بہت محظوظ ہوئے پھر فرمایا "اجمیر شریف کی وہ محفل مجھے یاد ہے، میں بھی شریک تھا پھر چار پانچ بزرگوں کے نام گنوائے جو شریک محفل تھے جن میں سے مجھے صرف مولانا عبدالسلام صاحب دہلوی کا نام یاد رہ گیا۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ "جب اذان ہوئی تو وہ چاروں بزرگ ایک عجیب عالم استغراق میں تھے نماز جائے سماع سے دور مسجد میں ہو رہی تھی جس میں سماع کی وجہ سے خلل کا امکان نہیں تھا۔ جب ان بزرگوں کی حالت میں افاقہ ہوا تو حضرت بابا یوسف شاہ صاحبؒ نے محفل ختم کرنے کا اشارہ فرمایا۔ یہ سب کہہ کر بابا صاحب نے فرمایا" یہ بھی لکھ ڈالو۔"

کس میں اتنا ظرف ہے کہ اپنے خلاف کہی ہوئی باتوں کو لکھوائے اور وہ بھی اس قدر محظوظ ہو کر یہ فیضان ہے اس ذاتِ گرامی کا جو "وجہ تخلیق کائنات ہے" سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں۔"

یہ یہ نہیں دیکھتے کہ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ سیرت کا اگر پرتو کہیں نظر آتا ہے تو ان کی امت کے اولیاء میں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرجع خلائق بن جاتے ہیں۔ اقبال نے کس خوبی سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے مئیں
مگر یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

جدید ایرانی ادب سے

سید مہدی شجاعی/معین نظامی

"ماہ جبیں"

صحرا، کٹے پھٹے ہونٹوں کی طرح لگ رہا تھا، پیاسا اور جھلسا ہوا! ٹوٹی پھوٹی دراڑوں کی صورت میں پیاس کے نقوش قدم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ کانٹے، صحرا کے دل سے جا بجا سر نکالے اُس کے چہرے پر اپنا چہرہ رگڑ رہے تھے۔

کبھی کبھی جھونکے، صحرا کی خاموشی توڑ دیتے اور لُو کے تھپیڑے اُس کے سر اور چہرے پر ریت کے موٹے موٹے ذرّے چھڑکنے لگتے۔ اُس نے قمیض اُتار کر، اُس سے ریت جھاڑی۔ دوبارہ قمیض پہننے لگا تو اُس نے اپنے سر، گردن اور سینے پر ہاتھ پھیرا۔ گرد و غبار اور ریت ہی ریت تھی اور ہاتھ اُسی طرح نیلے کے نیلے تھے۔

صبح، جب وہ ڈرتا لرزتا گاؤں سے بھاگ رہا تھا تو ایک لڑکے نے بڑے تجسس سے اُس کے ہاتھوں اور چہرے پر نظریں پھیلا دی تھیں اور پوچھا تھا: "سر! آپ کا چہرہ اور ہاتھ نیلے کیوں ہو گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں پتہ، میں نہیں جانتا!" اُس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر لڑکے کی نگاہوں کے چنگل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن یہ نیلاہٹ تو بالکل ماہ جبیں کے چہرے کی نیلاہٹ جیسی ہے!" لڑکا چند قدم اُس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔

اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تم ماہ جبیں کو کیسے جانتے ہو؟" اُس نے مڑ کر پوچھا۔

"اُسے کون نہیں جانتا؟"

"تم نے اُسے کب دیکھا ہے؟"

"یہی آج ہے، سب نے دیکھا ہے!" یہ کہہ کر لڑکا چلا گیا۔

اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

"بدنام زمانہ! بھاگ کر کہاں جائے گا؟"

یقیناً سورج نکلتے ہی سب لوگ گلیوں، سڑکوں میں اُمڈ آتے، اُس کے گھر کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور بڑھ بڑھ کر اُس کی رُوسیاہی کو بہتر طور پر دیکھنے کی کوشش کرتے۔ چھتوں، دیواروں اور چھجوں پر شور ہوتا۔

کوئی افسوس سے سر جھٹک کر کہتا: "یہ ہیں ہمارے بچوں کے استاد صاحب!"

دوسرا بول اُٹھتا: "ہم نے اپنی بیٹیاں کیسے شخص کے سپرد کر رکھی تھیں!"

تیسرا کہتا: "اس کے بعد تو ہمیں اپنی آنکھوں پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے!"
اور چوتھا......

گاؤں سے نکل بھاگنا چاہیے! کوئی قوت اُسے بھاگ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا یا دوسروں سے؟ کہاں جانا تھا، اُسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کسی ایسی جگہ جانا ضرور تھا جہاں کوئی آنکھ بھی اُس کے چہرے کی نیلاہٹ دیکھ کر، ماہ جبیں کے چہرے کی نیلاہٹ سے اُس کا تعلق نہ جوڑ سکے۔

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ دُور کہیں گاؤں کا تاریک سایہ سا دکھائی دیا۔ پھر اُس نے سامنے رَستے پر نظریں گاڑ دیں۔ اُس کے ذہن اور سامنے نظر آنے والے صحرا میں منزل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اُس نے قمیض کی جیب سے سفید رومال نکالا۔ جھجکتے ہوئے بڑی احتیاط سے اُس کی پرتیں کھولیں اور آئینہ نکال لیا۔ ننھے مُنّے سے آئینے کو وہ آنکھوں تک اوپر اُٹھا کر اس میں جھانکنے لگا۔ نیلاہٹ تھی کہ سرخی یا کالک بن چلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہونٹ اور رخساروں کا کچھ حصہ آگ میں جھلس گیا ہو.... عین وہی جگہ تھی جو اُس نے ماہ جبیں کے چہرے پر لگائی تھی۔

"سر! میں آپ کے لیے دودھ لائی ہوں!"

یہ ماہ جبیں کا ہر روز کا معمول تھا۔ سورج نکلتے ہی دروازہ پر مسلسل تین بار ہلکی ہلکی دستک ہوتی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نرم و نازک ہاتھ اور خوبصورت ناخن اُس کے دل پر دستک دے رہے ہیں۔ دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا تھا! کچھ دیر بعد دروازے کا پرانا چوکھٹا، اُس آسمانی تصویر کو اپنے فریم میں لے لیتا۔ کندھوں پر لہراتے ہوئے بھورے بھورے بال، لانبی، گھنیری اور منظم پلکیں، جو کسی سائبان کی طرح ان بدمست بھوری آنکھوں کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں لیے رہتی تھیں۔ اُس کے چہرے کی جلد دیکھ کر ہمیشہ گلاب کی پنکھڑیاں یاد آجاتیں

پہلی بار ماہ جبیں کو دیکھ کر اُس نے سوچا تھا کہ یہ صبح سے کا کوئی سہانا خواب ہے، جسے صرف فرشتے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب بوجھل بوجھل پلکیں اوپر اٹھیں، دودھ کے پیالے والا ہاتھ آگے بڑھا اور ہونٹ..... ہونٹوں میں جنبش ہوئی: "سر! میں آپ کے لیے دودھ لائی ہوں!" تو اُسے احساس ہوا کہ فریم کی یہ تصویر، خواب نہیں ہے، تصویر نہیں ہے پھر کیا ہے؟ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی ہر روز یوں ہی کرنے لگی۔ آرام و سکون سے آتی، اُس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھماتی، پہلے والا خالی پیالہ واپس لے لیتی اور اچانک فریم، تصویر سے خالی ہو جاتا۔

اُسے شک سا تھا کہ اُس نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں نہ کہیں دیکھا ہوا ہے۔ وہ ذہن اور یادداشت پر بہت زور دیتا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ اُس کے حافظے میں لڑکی کی کوئی یاد باقی نہیں تھی۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ اُسے تو اپنے گزشتہ برسوں کے ایک ایک شاگرد کا چہرہ یاد تھا۔ پھر یہ ماہ جبیں کون تھی؟

اُس دن، عصر کے وقت وہ بال بنائے اور آئینہ دیکھے بغیر ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ گاؤں کے تمام گلی کوچوں میں گھومتا رہا کسی گلی سے ہوتا ہوا گراؤنڈ میں جا نکلا۔ کسی راستے سے چوک میں جا پہنچا۔ جن لوگوں نے اُسے گھر آنے یا کہیں مل کر چائے پینے کی دعوت دے رکھی تھی، اُن سب سے علیک سلیک اور کھڑے کھڑے اظہارِ تشکر کرتا ہوا، وہ دریا کی طرف چلا گیا تھا۔ لڑکیاں کپڑے دھو دھو کر وقت گزار رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے اپنی کشیدہ کاری والی نیلی چادر، ایک درخت کی ٹہنی پر پھیلاتے ہوئے کہا تھا: "آپ گھر سے کیسے نکلے ہیں، سر! کوئی چیز چاہیے تھی تو کہہ دیتے...."

"بس ایسے ہی ذرا تبدیلی کے لیے آنکلا ہوں!"

وہ گھومتا رہا۔ گھومتا رہا اُسے رات کے اندھیرے کا احساس اُس وقت ہوا، جب ایک لڑکا اُس کے لیے لالٹین اُٹھا لایا: سر! روشنی کے بغیر تو گر پڑیں گے نا!"

اُس میں کسی سے ماہ جبیں کے بارے میں پوچھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ کسی کو رازدار بنانے کی بجائے اسی لاحاصل تلاش کو ترجیح دیتا تھا۔

ان چند ہفتوں میں اُسے لکھنے پڑھنے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اُس کے ہوش و حواس پر ماہ جبیں چھائی ہوئی تھی، جو ہر صبح آتی اور اُسے آگ لگا کر بھاگ جاتی۔

اُس نے اتنے دن ماہ جبیں کو کیوں کچھ نہیں کہا تھا؟ اُسے بول پڑنے پر مجبور کیوں نہیں کیا تھا؟ اُس سے کھڑے کھڑے یا بیٹھ کر دو باتیں ہی کیوں نہ کیں؟ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ حسن و دلکشی کے اس مجسمے کے سامنے بات کرنا، سب سے مشکل کام تھا۔ قریب قریب ناممکن! وہ تو بس اپنے سارے حواس جمع کر کے اس کوشش میں رہتا تھا کہ حسن و جمال کا کوئی منزل اُس کی نگاہوں کی دسترس سے نکلنے نہ پائے!

اُس نے آئینہ دوبارہ رومال میں لپیٹ لیا۔ سورج کی براہِ راست برستی ہوئی حدّت کے اثرات کم کرنے کے لیے قمیض سر پر رکھی اور اسی نامعلوم منزل کی راہ لی۔

پیاس آہستہ آہستہ اُس کے جسم کو تسخیر کرتی جاتی تھی!

اس سارے عرصے میں، اُسے کبھی ماہ جبیں کو چومنے یا چھونے کا خیال نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ آج صبح ماہ جبیں کے آنے تک بھی اُس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ارادے اور عمل کے درمیان سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔

ماہ جبیں نے پیالہ پکڑانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے پیالہ پکڑ کر، ساتھ والے بینچ پر رکھ دیا۔ پہلے بایاں ہاتھ ماہ جبیں کے گالوں کی طرف بڑھایا اور پھر دایاں۔ ماہ جبیں کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ شرمیلی سی ہنسی سے کھلے اور اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ اُس نے ماہ جبیں کے گال پر ہونٹ رکھ دیے .... اور جب ہٹائے تو دیکھا کہ جہاں جہاں اُس کے ہاتھ اور ہونٹ لگے ہیں، وہاں سے ماہ جبیں کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ اچانک اس کا سارا بدن شرم اور تعجب کی لپیٹ میں آگیا۔ اُس نے بوسے والی جگہ کے نیلا ہوجانے کے بارے میں کہیں سے بھی پڑھا یا سُنا نہیں تھا۔

اُس نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ انگلیاں اور ہتھیلیاں، جو ماہ جبیں کے گالوں سے مس ہوئی تھیں، نیلی ہوگئی تھیں۔

جب وہ اپنے آپ میں آیا تو ماہ جبیں جاچکی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ والے آئینے کی طرف مڑا۔ آئینے میں اُس کے گال اور ہونٹ بھی نیلے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دروازے کے ساتھ والے ستون سے ٹیک لگا کر وہ گھسٹتا گھسٹتا، ہولے سے زمین پر آرہا۔

حیرانی، پریشانی اور شرمندگی، ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں کی طرح اُسے ہوش میں لے آئی۔ اُسے اپنی فکر نہیں تھی۔ ماہ جبیں کی عزت کا خیال تھا، جو کچھ ہی دیر میں گاؤں کی مٹی میں ملنے والی تھی۔

اُس نے سوچا کہ اگر اُس کا اور ماہ جبیں کا چہرا الگ الگ ہوں تو کسی گناہ یا غلطی کی نشاندہی نہیں ہوگی۔ کسی کو بھلا کیا پتا چلے گا کہ اُس کے چہرے کو کیسے چاند گرہن لگا ہے یا ماہ جبیں کے چہرے پر بادل کہاں سے آئے ہیں! لیکن اُن دونوں کی بیک وقت،

ایک جگہ، ایک گاؤں میں موجودگی باعثِ رسوائی ہو سکتی تھی۔

"ماہ جبیں کی عزت کا سوال ہے، مجھے کہیں چلے جانا چاہیے!" اُس نے سوچا۔

چھوٹے آئینے کے سوا، اُس نے اور کوئی چیز بھی ساتھ نہ لی۔ پانی کی کوئی بوتل بھی نہیں، جو اس صحرا میں اُس کی زندگی کو کچھ بڑھا سکتی تھی۔

اُس کی زبان کسی خشک ڈھیلے کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ ہونٹوں کی پپڑیوں سے گرم گرم خون رس رہا تھا۔ اگرچہ وہ گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن اُسے گاؤں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحرا کی آگ نے اُس کی آنکھوں سے طراوت نچوڑلی تھی۔ اُس کی بینائی بہت کم ہو گئی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ آہستہ آہستہ اُس کی رہی سہی طاقت بھی جواب دیتی جا رہی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا اور اس سے پہلے اُس کی پلکیں بند ہو گئیں۔ اُس نے اپنے آپ کو ختم ہوتے ہوئے پایا، لیکن اس میں زندگی کی حدود سے پار پاؤں رکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ، صحرا کو چھو رہا تھا اور دونوں طرف پھیلے ہوئے ہاتھ، مچھلی کے پَروں کی طرح، زمین پر تڑپ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ اُسے چہرے کی جلد کے نیچے نمی اور ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ یہ نمی اُس کے مردہ جسم میں زندگی بھر رہی تھی۔ میٹھی میٹھی سی کپکپاہٹ، پہلے اُس کے چہرے اور پھر پورے بدن پر طاری ہو گئی۔ اُس نے زمین سے چہرا اُٹھا کر کہنی پر ٹکالیا اور اپنے نیم جان ہاتھوں سے گیلی گیلی ریت اُٹھا اُٹھا کر سر، چہرے اور سینے پر ملنے لگا جوں جوں وہ مٹھیاں بھر بھر کر ریت نکالتا رہا، نیچے کی جگہ نسبتاً اتنی ہی زیادہ نم اور ٹھنڈی ہوتی گئی۔ گڑھا ابھی ہاتھ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ اُس سے شفاف پانی ابلنے لگا۔ ہاتھ اور منہ میں فاصلہ، ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس نے اپنا چہرہ گڑھے میں جھکا دیا اور ہونٹ اور چہرے اُس کی ٹھنڈک کو سونپ دیے۔

اب وہ زمین سے یوں اُٹھا، جیسے وہ نہ ہو، کوئی اور ہو! ترو تازہ اور شاداب! اُسے ہاتھوں کا خیال آیا۔ اس نے شک اور خوف سے انہیں آنکھوں کے بہت قریب لا کر دیکھا۔ گرہن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اُس نے بے تاب ہو کر آئینہ دیکھنا چاہا تو وہ غائب تھا۔ ادھر اُدھر بہت دیکھا مگر رومال اور آئینے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یونہی بے دھیانی میں اُس کی نظریں پانی میں جھلملاتے ہوئے اپنے عکس پر پڑیں۔ پانی، آئینے سے بھی زیادہ اجلا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہونٹ کا ہلکا سا نشان تک بھی باقی نہیں ہے۔

ماہ جبیں کیسی ہوگی؟ اس کرامتوں والے چشمے میں پہلے ماہ جبیں کا چہرہ...... اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاؤں اب پاس ہی دکھائی دے رہا تھا۔ "جتنا جلدی ہو سکے، ماہ جبیں کا چہرہ اس پانی سے دھونا چاہیے!" گاؤں تک کا سارا فاصلہ اُس نے دوڑتے طے کیا۔ اُسے ذرا سی بھی تھکن نہ ہوئی۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر اُسی پرانی اذیت کا شکار ہو گیا۔ ماہ جبیں کو کہاں ڈھونڈا جائے؟ پہلے بھی وہ اُسے اپنے دروازے کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ گھر کی طرف بھاگنا چاہیے وہیں کی زیادہ امید تھی۔ لیکن اس وقت تو نہیں، صبح ہی صبح!

اگلی صبح تک کیسے رہا جا سکتا تھا؟ ہاں سچ آج صبح وہ لڑکا کہہ رہا تھا کہ سارا گاؤں ماہ جبیں کو پہچانتا ہے۔ لیکن اُس نے تو از خود اس خوبصورت لڑکی کو ماہ جبیں کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کبھی لڑکی سے تو اُس کا نام نہیں پوچھ سکا تھا۔ پھر وہ لڑکا، ماہ جبیں سے کیسے واقف تھا؟ اور گاؤں والے اس نام کی لڑکی کو کیسے جانتے ہیں؟

"آپ ماہ جبیں نام کی لڑکی کو جانتے ہیں؟" اُس نے سب سے پہلے ملنے والے آدمی سے پوچھا۔

"نہیں جناب، لیکن آپ....."

لیکن وہ رکا نہیں، آگے بڑھ گیا۔ اب اسے اپنی عزت و آبرو کی قطعاً کوئی فکر نہیں تھی۔

"ماہ جبیں نام کی لڑکی...." وہ گلیوں میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی پوچھتا پھرا۔

نوجوان موچی نے اُس سے پوچھا: "آپ تو جی ہمیشہ اپنے گھر میں ہوتے ہیں. آپ نے بھلا ایسی لڑکی کہاں سے دیکھ لی؟

بوڑھے دکاندار نے کہا: "ماسٹر جی! آپ کو تو مجھ سے زیادہ ہی پتہ ہے۔ اس گاؤں میں تو اس نام کی کوئی لڑکی نہ دیکھی نہ سنی۔"

گلی کے موڑ تک کوئی بھی اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ جونہی وہ بَل کھاتی ہوئی گلی کا موڑ مڑا، اُس نے گھر کی دہلیز پر ماہ جبیں کا سایہ دیکھ لیا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھر کی طرف دوڑ پڑا کئی بار اُس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرائیں اور وہ گرتے گرتے بچا۔

"تم؟ اس وقت؟"

"میں اپنا پیالہ لینے آئی ہوں!"

وہ اُسی طرح حیران، پریشان لیکن سدھائے ہوؤں کی طرح چپ چاپ گھر میں داخل ہوا اور پیالہ اُٹھائے، آرام سے لوٹ آیا۔ ماہ جبیں کی طرف پیالہ بڑھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے نیلاہٹ کے آثار غائب ہیں۔

"وہ نیلاہٹ....؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ختم ہو گئی!" ماہ جبیں کی آنکھیں اور ہونٹ بے مثال آہستگی سے ہلے۔

"کیسے؟"

"اُسی وقت جب آپ صحرائی چشمے میں غُسل کر رہے تھے، دوپہر کے قریب!"

ماہ جبیں نے اپنی نیلی قمیض کے نیچے ایک تہہ کیا ہوا رومال نکال کر اُس کی طرف بڑھایا؛ وہ اس رومال کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔: "ہاں، یہ آئینہ آپ کا ہے۔ آپ اسے صحرا میں گم کر بیٹھے تھے!"

اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آکر اپنی حیرت کو سوال کا جامہ پہناتا، ماہ جبیں جا چکی تھی اور فریم دوبارہ خالی تھا۔ اگلے ... سے اُس کی آنکھوں کے خالی فریم میں صرف ایک موہوم انتظار تھا۔

سندھی نظم

تاج بلوچ ترجمہ احسن بھوپالی

درد کا نیزہ

میرے دروازے کے باہر کون ہے دیکھو ذرا!
وہ اگر ہے آسمانی اپسرا، اس سے کہو:
میں نے خوابوں کے جہاں سے دور
اپنا رشتہ جوڑا ہے زمیں سے
اور اس کی خاک سے
جو زندگی سے ہے قریب
جسم و جاں کو بخشتی ہے جو،
خوشی بھی... روشنی بھی... حسن بھی!

کون کڑوی اور کالی رات جیسے
خواب کے اندھے کنوئیں میں
.... آس اور امید کی کنکریاں مارے
منتظر بیٹھا رہے.... آسمانی اپسرا کے واسطے
جب چھو نہ سکتا ہوا سے
بے نام سے احساس کی گرمی کو اپنانے کی خاطر
شعر ہی لکھتا رہے۔ لکھتا رہے۔ پڑھتا رہے

میرے دروازے کے باہر دوستو!
گر آسمانی اپسرا ہے تو کہو:
وہ لوٹ جائے.... لوٹ جائے

میرے دروازے کے باہر کون ہے۔ دیکھو ذرا
کب میرے ماضی کا جنونی عشق ہے
وہ نازنیں ہو تو کہو:
میں تیری خاطر،
درد کے نیزے پہ صدیوں تک لٹکتا ہی رہا
اور تیری راہوں میں بچھائے اپنی آنکھیں
راہ کا ہر خار اپنی روح میں پیوست کر کے
تیری خاطر، ہجر کے زہراب سے بھرپور ساغر
روح میں پیہم اتارے خونِ دل روتا رہا
..... اور دشتِ ویراں میں بھٹکتا ہی رہا

.... اب درد سے میں اس قدر مانوس ہوں
کوئی خوشی، کوئی مسرت اس کی ہم رتبہ نہیں،
اس کا بدل ممکن نہیں!
اس سے کہو وہ مجھ کو میرے حال پر اب چھوڑ دے
..... میرے دروازے کے باہر کون ہے؟ دیکھو ذرا!
کوئی بھی ہو وہ..... اس سے کہہ دو لوٹ جائے۔ لوٹ جائے

اب میں بہتر ہوں.... بہت بہتر ہوں قیدِ ذات میں
جب تک کوئی سپنا حقیقت بن نہیں جاتا ہے
جب تک اس زمیں اس خاک کو رتبہ نہیں ملتا ہے
جب تک روح کو تسکین نہیں ملتی
میں بہتر ہوں.... بہت بہتر ہوں قیدِ ذات میں
اہلِ دنیا کی نگاہوں سے الگ تنہا، اُجاڑ!

آدمی نکلے نہ جب تک.... اپنی قیدِ ذات سے
میرے دروازے پر نہ دستک دے کوئی
میرے دروازے پر نہ دستک دے کوئی
میرے دروازے کے باہر کون ہے دیکھو ذرا!

ایریش فریڈ/ ترجمہ/ منیر الدین احمد

مالِ غنیمت

ہمارے سمندر پر
تیر رہی ہیں
ٹوٹے ہوئے جہازوں کی طرح
نصف سچائیاں
بے بس
اِدھر
اور اُدھر

تیر رہی ہیں
ایک دوسرے سے دُور
اور نظروں سے اوجھل
یا ٹکرا جاتی ہے ایک دھماکے کے ساتھ

یا ایک ہی سچائی کے
دونوں نصفوں میں سے
ایک
دوسرے نصف کو ٹکر مارتا ہے
اور دونوں اوندھے جاتے ہیں

اور بعض اوقات
صرف ایک پانی سے
بھر جاتا ہے
اور ڈوب جاتا ہے
اور دوسرا نصف تیرتا ہوا نکل جاتا ہے
باہر کھلے سمندر کے اور

سندھی سے
شیخ ایاز/ ترجمہ/ آفاق صدیقی

تیری طرف

جارہا ہوں آج میں خنجر بکف
چیر کر ہر ایک صف
تیری طرف، تیری طرف

میں ہوں وہ پنجہ شکن
دیکھ کر سب ہموطن
ہوتے ہیں جس پر طعنہ زن
اے مرے محبوب میں جب تک جیوں
تجھ پہ قرباں جسم و جاں کرتا رہوں
کاش اپنی موت سے پہلے بھی میں
دیکھ لوں جی بھر کے تجھ کو دیکھ لوں

ہندی نظم

یش مالویہ/شکیل فاروقی

قبرستان اور بچّے

قبرستان میں
پتنگ اُڑاتے ہیں
بچے
اور جب
کٹ جاتی ہے پتنگ
تو قبریں پھلانگتے
لُوٹتے ہیں
لال، ہرے، نیلے، پیلے
پتنگی سپنے
اور لپیٹتے ہیں
آکاش تک
سیڑھی بن جانے والی ڈور
کتنے اچھے لگتے ہیں
مُردوں کی بستی میں
جیون کے گیت گاتے
بچے!

پنجابی نظم

زاہد حسن ترجمہ/جمال نقوی

اکیلاپن

باغ میں پھولوں پر
پیپل کے پیڑوں پر
اور
تیرے رخ پر
بہار تو آئی ہے
اداس میرا دل ہے
پتھر کی سل ہے
تیرے بنا جانِ من
گھر یہ ویران ہے
ایک دیا جل رہا ہے
دوسرا میں جاگ رہا ہوں
تیسرا نام اللہ کا ہے

(انگریزی سے ترجمہ)

ہیمنگوے / امہ جبیں قیصر

"مسٹر اور مسز ایلیٹ"

مسٹر اور مسز ایلیٹ صرف اور صرف ایک بچّے کے آرزومند تھے اور اس کے حصول میں وہ لوگ حد درجہ کوشاں تھے۔ وہ لوگ کچھ اس طرح کوشش کر رہے تھے کہ جیسے مسز ایلیٹ خود ہی بچہ پیدا کرنے کی اہل ہوں۔ شادی کے بعد جب وہ لوگ بوسٹن BOSTON گھومنے کی غرض سے گئے تھے تو انھوں نے وہاں خاصی کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار جب وہ لوگ کشتی پر سفر کر رہے تھے تو بھی انھوں نے قسمت آزمائی کی تھی۔ مگر کشتی پر وہ کچھ بہت زیادہ کوشش نہیں کر پائے تھے کیونکہ مسز ایلیٹ سخت بیمار ہوگئی تھیں۔ جیسے کہ یونائٹیڈ اسٹیٹ کے جنوبی حصے کی تمام عورتیں بیمار ہوجایا کرتی تھیں۔ اسی طرح مسز ایلیٹ بھی بیمار تھیں۔ رات بھر کے سفر اور پھر صبح جلد ہی اُٹھ جانے سے تھکاوٹ اور انتشار کا شکار ہو کر اُلٹیوں کی سمندری بیماری میں مبتلا تھیں۔ کشتی پر سوار کچھ دوسرے لوگ اُسے ایلیٹ کی ماں سمجھ رہے تھے مگر کچھ ایسے بھی لوگ تھے کہ جو یہ جانتے تھے کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ اُمید سے ہے اِسی لیے اُلٹیوں کی شکایت میں مبتلا ہے...... یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اب چالیس سال کی ہوچکی تھی اور جب اچانک اس نے سفر شروع کیا تو وہ زندگی کے بیشتر سال گزار چکی تھی۔ مگر یہ بھی ایک سچ تھا کہ وہ اب بھی نہ صرف اپنی عمر سے کہیں کم دکھائی دیتی تھی بلکہ جوان دکھائی دیتی تھی۔

مسٹر ایلیٹ شادی کے بعد کئی ہفتے اس کے پیار میں ڈوبے رہے تھے.... مسٹر ایلیٹ نے اس سے تعارف کے ایک طویل عرصے کے بعد ایک شام کو چائے خانے میں پہلی بار اُس کو پیار کیا تھا۔ ہبرٹ ایلیٹ نے پوسٹ گریجویٹ کیا تھا اور شادی کے وقت وہ ہارڈورڈ یونیورسٹی میں قانون پر کام کر رہا تھا اس کی ماہانہ آمدنی تقریباً دس ہزار ڈالر تھی۔ وہ شاعر بھی تھا اور طویل نظمیں سرعت کے ساتھ لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ مگر مسز ایلیٹ سے شادی سے پہلے وہ کبھی کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں سویا تھا کیونکہ وہ خود کو بے داغ اور گناہ سے عاری رکھنا چاہتا تھا تاکہ جب وہ شادی کرے تو اپنی بیوی کو پاک جسم اور صاف ذہن و دل کے ساتھ قبول کرے اور اسی طرح کی توقع وہ اپنی بیوی سے بھی رکھتا تھا۔ وہ اکثر خود سے کہا کرتا تھا کہ انساں کو نیکی و سچائی کے ساتھ ہی زندہ رہنا چاہیے گو کہ مسز ایلیٹ کے پیار سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کے عشق میں مبتلا رہ چکا تھا اور وہ ان لڑکیوں سے اکثر و بیشتر کہا کرتا تھا کہ جلد یا بدیر اس نے اسی طرح کی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ اِسی لیے تقریباً تمام لڑکیوں نے ہی اس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اس بات سے وہ خاصا دلبرداشتہ بھی ہوا تھا۔ اور حقیقتاً لڑکیوں کے انھی طور طریقے کے ساتھ کسی سے منسوب ہوجانا دہشت زدہ کرنے کے مترادف ہوا کرتا ہے اور وہ دو لیسے کہ جوان لڑکیوں سے شادی کرنا

چاہتے ہوں انہیں چاہیے کہ وہ ان لڑکیوں کے بارے میں خوب اچھی طرح چھان پھٹک کرلیں ورنہ بہ صورت دیگر اپنے آپ کو بہتی ہوئی گندی نالی میں گرا دینا ہی ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے ایک لڑکی کو انتباہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ جس سے شادی کرنا چاہتی ہے وہ اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے اور یہ کہ وہ اس کا سخت مخالف ہے کیونکہ وہ کالج کے زمانے میں سخت عامیانہ پن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا اس کی انھی حرکتوں کی وجہ سے ایک ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آچکا ہے۔ جس کے تقریباً تمام ہی ثبوت اس کے پاس موجود تھے۔

مسز ایلیٹ کا نام کورنیلیا (CORNELIA) تھا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ایلیٹ کو کلاٹینا (CALUTINA) کے نام سے پکارے گی جو جنوب میں اس کا خاندانی تخلص تھا۔ شادی کے بعد جب وہ کورنیلیا کے گھر اپنی ماں کو اس سے ملانے لایا تھا تب وہ سخت برہم ہوئی تھی۔ مگر یہ سن کر کہ وہ غیر ممالک میں رہنے جا رہے ہیں وہ ایک دن خوش ہوگئی تھی۔

کورنیلیا نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ "تم بہت اچھے اور پیارے لڑکے ہو" تب ہی ایلیٹ نے اسے اپنے قریب کرلیا تھا اور پھر اس نے بتایا کہ کیسے اس نے خود کو اس کے لیے بچائے رکھا تھا۔ کورنیلیا بھی باکرہ تھی۔ اس نے ایلیٹ سے کہا "مجھے ایک بار پھر سے ویسے ہی پیار کرو"

ہیرٹ ایلیٹ نے اسے بتایا کہ اس نے پیار کرنے کا طریقہ اپنے ایک دوست سے سُنی ہوئی کہانی سے سیکھا تھا اور وہ اس تجربہ سے بہت ہی محظوظ ہوا تھا اور پھر ان دونوں سے جتنا بھی ممکن ہوسکا اسے اپنی عادت میں شامل کرلیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل ہی جب وہ لوگ بہت دیر تک ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے تھے تب کورنیلیا کے سوال پر اس نے ایک بار پھر اسے بتایا کہ کیسے اس نے خود کو اس کے لیے بچائے رکھا تھا۔ یہ بات سننے کے بعد کورنیلیا کے یہاں ہمیشہ کی طرح ایلیٹ ایک بار پھر ممتاز حیثیت اختیار کرگیا تھا۔ پہلے جب ہیرٹ کو کورنیلیا سے شادی کا خیال نہیں آیا تھا تب اس نے اس نظریہ سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ صرف اس کی بہترین دوست ہی ہوا کرتی تھی اور پھر ایک دن اُنھوں نے دوکان کی پچھلی طرف بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک ساتھ گراموفون کی آواز پر ڈانس کیا تھا جبکہ اس کی ایک دوست بھی دوکان پر کھڑی تھی۔ کورنیلیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ہیرٹ ایلیٹ نے اُس کو چوم لیا تھا۔ اس نے جب یہ فیصلہ کیا تو اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ لوگ شادی شدہ بھی ہیں۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ لوگ شادی شدہ تھے۔

وہ شادی کے بعد اپنے دن اور راتیں بوسٹن BOSTON ہوٹل میں گزار رہے تھے۔ اور اب وہ دونوں ہی بچے کی طرف سے نا امید ہوچکے تھے۔ اس وقت کورنیلیا سوچکی تھی۔ مگر ہیرٹ ایلیٹ نہیں سویا تھا بلکہ وہ ہوٹل کے باہر نئے کوریڈور جیگار باتھ روب (JAEGAR BATHROBE) کے اوپر سے نیچے چہل قدمی کرتا رہا اس لیے کہ اس نے شادی کے بعد اسے سیر کے لیے حاصل کیا تھا۔ جونہی اس نے چلنا شروع کیا تو معاً اس کی نگاہیں ہوٹل کے کمروں کے باہری جانب رکھے ہوئے چھوٹے بڑے جوتوں کے جوڑوں پر پڑیں اور یہ تمام ہی منظر اور چیزوں نے اس کے دل میں ایک ہل چل سی مچادی تھی۔ پھر وہ جلد ہی اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ کورنیلیا اب بھی سو رہی تھی اس نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور پھر تھوڑی دیر گزرنے کے بعد ہی وہ نارمل ہو گیا تھا چنانچہ وہ بھی آرام سے سوگیا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنی ماں سے ملنے چلے گئے اور پھر تیسرے ہی دن وہ پانی کے جہاز سے یورپ کے سفر پر روانہ ہوگئے اور یہ

ایک بچہ کے حصول کی آخری اور یقینی کوشش تھی مگر کورنیلیا اب متعدد بار کوشش کے حق میں نہیں تھی اور نہ اب وہ اتنی سعی کر سکتی تھی حالانکہ وہ لوگ دنیا میں موجود ہر ایک شے پر صرف ایک بچے کو فوقیت دیتے تھے۔ وہ لوگ سوربرگ (CHERBOURG) میں اتر کر پیرس (PARIS) آ گئے پھر انھوں نے پیرس میں بچے کے حصول کی کوشش کی تھی مگر یہ بھی سعی لاحاصل ہی رہی۔ پھر انھوں نے وہاں سے ڈیجن (DIGON) جانے کا فیصلہ کر لیا جہاں گرمیوں بھر چلنے والا ایک اسکول بھی تھا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جہاز سے اترنے کے بعد ان کے ساتھ ہی وہ سب بھی چلے گئے تھے۔ ڈیجن میں انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ بہرحال ہیبرٹ ایلیٹ نے اس عرصے میں ایک بڑی تعداد میں نظمیں لکھ ڈالی تھیں اور کورنیلیا نے ان تمام نظموں کو ٹائپ کیا تھا وہ سب کی سب ہی طویل نظمیں تھیں وہ غلطیوں کے بارے میں بہت متشدد تھا اگر ایک بھی غلطی نکل آئے تو وہ تمام کے تمام صفحات پھر سے ٹائپ کرواتا تھا اور وہ کبھی کبھی خوشی سے چلایا بھی کرتی تھی۔ ڈیجن سے روانہ ہونے سے پہلے بھی وہ لوگ بچے کے لیے کئی مرتبہ تجربات سے گزرے تھے۔

جب وہ پیرس پہنچے تو ان کے کئی دوست بھی کشتی سے واپس آ چکے تھے ان لوگوں نے ڈیجن میں بھی کوشش کی تھی اور بہر صورت اب وہ یہ کہنے کے قابل تو ہو ہی چکے تھے کہ انھوں نے وہاں رہائش کے دوران ہارورڈ (HARVARD)، کولمبیا (COLUMBIA) اور ویبیشا (WABASH) اور ڈیجن (DIGON) یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے جو کوٹ ڈی آر (CORTE DE OR) کے نشیب میں واقع تھی۔ ان میں سے کئی لوگ لینگوڈوک (LANGUEDOC) مونٹ پلر (MONTPELLIER) جانے کو ترجیح دے رہے تھے یہ تمام ہی وہاں کی یونیورسٹیاں تھیں مگر یہ سب ہی جگہیں بہت دور دور تھیں صرف ڈیجن کا پیرس سے ساڑھے چار گھنٹے کا سفر تھا اور ریل سے سفر کے دوران صرف ایک مرتبہ ہی رات کے کھانے کا وقت ہوا کرتا تھا۔

لہٰذا وہ تمام لوگ کیفے ڈی ڈوم (CAFE .DU .DOME) کے اردگرد بیٹھے تھے اور روٹونڈ (ROTONDE) کے پار سڑک پر جانے سے گریز کر رہے تھے کیوں کہ کچھ دنوں کے لیے وہ جگہ ہمیشہ ہی غیر ملکیوں سے بھر جایا کرتی تھی اور پھر ایلیٹ ٹاورین (TOVRAIN) کی حویلی جو اس نے کرایہ پر لی تھی اس میں واپس آ گیا اس حویلی کا اشتہار اس نے نیویارک ہیرلڈ (NEWYORK HERALD) میں دیکھا تھا۔ ایلیٹ کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد اس کی شاعری سے بہت متاثر تھی۔ مسز ایلیٹ نے بہت کچھ کہہ سن کر اسے اپنی ایک دوست کے پاس جانے پر رضامند کر لیا تھا جو ایک چائے خانے میں ہوتی تھی۔ مسز ایلیٹ اپنی دوست کے پاس پہنچ کر بہت خوش تھی اور ان لوگوں نے ملاقات کے بعد آپس میں ایک دوسرے سے خوب خوب گپیں ہانکی تھیں۔ ان کی دوست کورنیلیا سے بھی کئی سال بڑی تھی اور ہنی (HONEY) کے نام سے پکاری جاتی تھی اور اس کا بھی تعلق جنوب کے ایک قدیم گھرانے سے تھا۔

ان تین کے علاوہ ایلیٹ کے کچھ دوست اسے ہوبی (HUBIE) کے نام سے پکارا کرتے تھے اور وہ سب لوگ ہی ٹورین میں بنی حویلی میں چلے گئے تھے۔ ان تمام لوگوں کو ٹورین بہت زیادہ میدانی اور گرم علاقہ لگ رہا تھا جو کنساس (KANSAS) سے مشابہ تھا۔ ایلیٹ نے تقریباً کافی تعداد میں اپنی نظمیں ایک کتاب کے لیے ترتیب دے لی تھیں اور وہ اسے بوسٹن (BOSTON) سے شائع کرانے جا رہا تھا۔ اس نے مسودہ پہلے ہی نظرثانی کے لیے بھیج دیا تھا اور ایک پبلیشر سے معاہدہ بھی کر چکا تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کے دوست بلامقصد پیرس جانے لگے پھر جلد ہی اس کے بقیہ تمام دوست بھی ایک امیر، جوان اور غیر شادی شدہ شاعر کے ساتھ سمندر کی جانب ٹروویل (TROVVILLE) کے قریب تفریح کی غرض سے روانہ ہو گئے اور وہاں وہ سب کے سب بہت ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

ایلیٹ ٹورین کی حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا کیوں کہ اس نے گرمیوں بھر کے لیے اُسے کرایہ پر لے لیا تھا۔ وہ اور مسز ایلیٹ کچھ بہت زیادہ ہی بچے کے حصول کے لیے بڑے اور گرم کمرے میں سخت اور بڑے پلنگ پر کوششوں میں مصروف عمل تھے۔ مسز ایلیٹ بچ سسٹم ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنا بھی سیکھ رہی تھی۔ مگر جب انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا اور اپنی رفتار کو بڑھانے کی مشق کر رہی تھیں تب ان سے بہت زیادہ غلطیاں ہو رہی تھیں ان کی جو دوست تھی وہ اب تمام مسودہ کو مہارت سے ٹائپ کر رہی تھی۔ وہ بہت ہی لائق تھی اور تمام کام بہت صفائی سے کر رہی تھی وہ اس کے کام کو دیکھ کر بہت متاثر تھی۔

ایلیٹ وھاہٹ وائن پی رہا تھا اور اب اپنے کمرے کے ایک علیحدہ حصے میں رہائش پذیر تھا۔ ایلیٹ بہترین اور ممتاز نظموں کی ایک بڑی تعداد رات اور صبح کے درمیانی وقفہ میں لکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ صبح کو انتہائی پژمردہ دکھائی دیا کرتا تھا۔ مسز ایلیٹ اور اس کی دوست اب ایک ساتھ قرون وسطیٰ کے زمانے کے بڑے پلنگ پر سوتی تھیں۔ وہ لوگ خوشیوں سے بھرپور آواز میں چلا چلا کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک شام وہ لوگ ایک ساتھ باغ میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ شام کی ٹھنڈی ہوائیں گنگنا رہی تھیں اور ایلیٹ "وھاہٹ وائن" پی رہا تھا اور مسز ایلیٹ اور اس کی دوست آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور اب وہ سب ہی لوگ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

رفتار ادب

چراغ آرزو

سجاد مرزا
صفحات ۹۶ ہدیہ = ۴۰/ روپے
فروغ ادب اکادمی ۱۰۸ بی سٹلائٹ ٹاؤن گجرانوالہ

"چراغ آرزو" سجاد مرزا کی نعتوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے کیفِ دوام منظر عام پر آچکا ہے۔ حُب رسول ﷺ کے باب میں شاعر کی کیفیتِ قلب کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب کو منسوب بی محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے نام سے کیا ہے۔ حُبِ رسول ﷺ کی راہ سے سجاد مرزا کے قلب کی جو کیفیت ہے اس مختصر گلدستہ میں اس کا سو طرح سے اظہار ہوا ہے۔

اردو میں نعتیں مسلسل لکھی جارہی ہیں، ہر روز نعت کا کوئی نہ کوئی مجموعہ منظر عام پر آجاتا ہے ہمیں ایسی کسی کتاب پر رائے دیتے ہوئے اس کے اچھے اور ناقص ہونے کا اظہار بے محابا نہیں کرنا چاہیے کہ بہرحال اس کا تعلق حُب رسول ﷺ سے ہے اور حُب رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ جو بات کی جائے وہ احترام سے کی جائے۔

"چراغ آرزو" میں سجاد مرزا ہمہ تن آرزو ہیں۔ عشقِ رسول ﷺ جس قدر دل میں گہرا اترا ہوا ہوگا، نعت گو کے جذبات اسی قدر منصفی ہوں گے اور اظہار میں اسی قدر "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت پیدا ہوگی۔ چراغ آرزو اس کیفیت سے مملو ہے کتاب اچھی چھپی ہے

(ا۔ س)

عرفانستان

حکیم محمد سعید
صفحات ۸۲ قیمت = ۱۰۰/ روپے
ہمدرد فاؤنڈیشن پریس۔ ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

حکیم محمد سعید صاحب دینیات کے سلسلے کی کتابیں مسلسل لکھ رہے ہیں اس سے پہلے دانائے سبل اور نورستان شائع ہو کر قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں ان کی تازہ تصنیف عرفانستان اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس تصنیف و تالیف کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے وہ ترغیب دین، احیائے دین اور فروغ دین ہے اور یہ کار خیر اسی سے بہ احسن انجام پاتا ہے جو تالیف قلب

کے مدارج تک پہنچ چکا ہو۔

"عرفانستان" کو حکمت و ہدایت، عقاید و افکار، انبیائے اوّل و آخر، صحابہ کرامؓ، شہادت حسینؓ اور تفصیلاتِ رمضان کے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان ابواب کے تحت چھوٹے بڑے ۴۱ مضامین اس میں شامل ہیں۔ باب حکمت و ہدایت کے تحت مطالعۂ قرآن، فلسفۂ قرآن اور قرآن کے معاشرتی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح مختلف ابواب سے گزرتے ہوئے "روزہ، روح و جسم کا معالج" اور "عید۔ یوم تشکر" پر "عرفانستان" کا دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ہر دور اپنے ساتھ ایک زبان بھی لاتا ہے اور اسی زبان میں قرآن و احادیث کے معانی و مطالب پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو قاری اور کتاب کے درمیان فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ نکتہ حکیم صاحب کے پیش نظر ہے لہٰذا انھوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جس کا چلن عام ہے بلکہ انھوں نے اسے مزید عام فہم کر دیا ہے جس سے کتاب کی عبارت کی دلنشینی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

عرفانستان ہر گھر میں رکھنے کی چیز ہے کہ اس کے مطالعے سے دینی علوم کی بہت سی جہات سے ذہن آراستہ ہوتا ہے۔

کتاب خوبصورت شائع ہوئی ہے۔

(ا۔ س)

چھلنی کی پیاس (حصّہ دوم)

محب عارفی

صفحات ۲۴۰ قیمت =/۱۰۰ روپے

۱۰۶۲-۱۰۶۱ بلاک نمبر ۸ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

"چھلنی کی پیاس" کے عنوان سے جناب محب عارفی کا ایک شعری مجموعہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے شعری مجموعے کو حصّہ دوم کی حیثیت دی گئی ہے۔ لیکن اس میں حصّہ اوّل یعنی پہلے شعری مجموعے کی منتخب غزلیں نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح تازہ شعری مجموعہ کی صورت قندِ مکرر کی ہو گئی ہے۔

کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

یہ بے رنگیاں رنگ کے ہفت خواں ہیں
محب میرے اشعار پڑھنا سمجھ کر

محب عارفی نے گویا قاری کو متنبہ کر دیا ہے کہ بادی النظر میں جو بے رنگیاں کتاب میں نظر آتی ہیں وہ اپنے اندر رنگوں کے ہفت خواں رکھتی ہیں۔ انھیں سمجھ کر پڑھنا ہوگا۔ ہاں یہ اضافہ ضروری ہے کہ اس ہفت خواں کی سیر کے لیے کتاب کے آخر میں پس نوشت "آج کا عشق حقیقی" پڑھنا لازمی ہے۔

محب عارفی اپنے اسی مفہوم کو ایک شعر میں یوں بیان کرتے ہیں:

کیا ملے گا سرسری نظروں کو میرے شعر میں
ڈوب کر دیکھو محب کیسے بیاں ہوتا ہے کیا

گویا شعروں کی تفہیم کے باب میں قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی بار بار چیتاؤنی دی گئی ہے۔ واقعی محب عارفی صاحب کا

شعری سفر ایک جداگانہ فکری پس منظر رکھتا ہے، جس میں قدیم و جدید فلسفہ "ہستی و نیستی" یا "بود و نبود" کا اثر و رسوخ ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسی ذات کی تلاش ہے۔ جو صفات ہی صفات ہے، ہم اُسے صفات کے آئینوں میں دیکھتے ہیں، ذات تک رسائی کا تو شاید امکان نہیں البتہ جلوۂ ذات کا کوئی لمحہ دولتِ ادراک و نظر بن جاتا ہو تو بن جاتا ہو ورنہ اس مقام تک پہنچتے پہنچتے آدمی کہنے لگتا ہے "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

"چھلنی کی پیاس" کی تمام تر شاعری معلوم سے نامعلوم تک کے سفر اور معلوم کے لامعلوم کی جستجو کی پیاس ہے۔ اس لیے عارفی صاحب کے ہاں، غالب زیادہ HAUNT کرتے ہیں، غزل کے پیرائے میں عالم تحیر، "بود نبود" اور اُس کے غایت تناظر کو غالب نے جس خوبصورتی سے باندھا ہے اُس کی مثال اردو کے شعرا کے ہاں کم کم ملتی ہے۔

محب عارفی نے اس عالم بے ثبات پر سو تحیر سے نگاہ ڈالنے کی سعی کی ہے، غالب کے ایک خیال "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کو محب عارفی ایک شعر میں اس طرح باندھتے ہیں!

دُور سے قوسِ قزح سا نظر اتا ہے جو اوج
جا کے نزدیک سے دیکھا اُسے تھا کچھ بھی نہیں

غالب کے مذکورہ مصرعے اور محب عارفی کے شعر میں جو زمانی بُعد ہے وہی بُعد دونوں شعرا سے CONTENTS میں ہے غالب نے کہا "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" محب عارفی کہتے ہیں کہ "دور سے جو اوج قوسِ قزح سا نظر آتا ہے۔ نزدیک سے دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ "انداز نظر کا یہ فرق جدید انکشافات کے سبب سے ہے لیکن غالب کے ہاں تناظر لامحدود ہے اور بیان خوبصورت!

محب عارفی کی شاعری کی اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی اس یکسانیت اور کلیشے کے منظر نامے میں ایک الگ لب و لہجہ کی پگڈنڈی نکالی ہے۔ ان کی غزلوں میں خاص لہجے اور مضمون آفرینی کے ساتھ مصرعوں کی ایک مخصوص ساخت کا بھی احساس ہوتا ہے جو بظاہر سادہ و بے رنگ لیکن جہت در جہت، دروں بینی کی دعوت دیتا ہے۔

(ا۔ س)

کارواں

عزیز ملک
صفحات ۱۴۴ قیمت =/۹۰ روپے
دیا پبلی کیشنز۔ اسلام آباد

"کارواں" راولپنڈی کے ایک بزرگ ادیب جناب عزیز ملک کے شخصی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں بیس مضامین شامل ہیں۔ سب کے سب کسی نہ کسی ادبی شخصیت کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ انیس مضامین عزیز ملک نے تحریر کیے ہیں صرف ایک مضمون جو عزیز ملک پر ہے وہ مولوی سعید احمد نے لکھا ہے۔ عزیز ملک نے تمام مضامین کے لیے خوبصورت عنوانات چنے ہیں۔ "شاعر یکتائے من" کے تحت مولانا گرامی کا ذکر خیر ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن سے علامہ اقبال ابتدا میں مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ "پنجابی کے غالب" سائیں احمد علی کو روشناس کراتا ہے۔ "ادب کا بانسری بجیا" ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شخصیت و فن کو روشنی میں لاتا ہے۔ "فنافی الضمیر" سید ضمیر جعفری کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ "لبیک کا شگو" مشہور ناول و افسانہ نگار

ممتاز مفتی کی شخصیت کے پس پردہ گوشے کو اُبھاگر کرتا ہے اور "شاعر پوٹوہار" باقی صدیقی کے بارے میں ہے اور "یوسف ظفر" کی بات "یوسف ظفر" کا خاکہ نما ہے۔ اس خاکہ نما میں وہ حصہ کمال کا ہے جس میں ہفت روزہ "آزاد کشمیر" کی خالی آسامی کے لیے سعادت حسن منٹو بلائے جاتے ہیں۔ منٹو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پرچہ کی ادارت یوسف ظفر ایک عرصہ سے سنبھالے ہوئے ہیں قصداً آتے ہیں۔ آنے کا مقصد محض یہ جتانا ہے کہ جب ایک لائق شخص سلیقے سے پرچہ ترتیب دے رہا ہے تو اس کے لیے خالی آسامی کے پُر کرنے کا اشتہار چہ معنیٰ دارد! چنانچہ منٹو انٹرویو کے درمیان سوال و جواب میں اس احمقانہ اقدام کا مذاق اُڑاتے ہیں اور آخر میں یہ کہتے ہیں:

"صرف یہ حقیقت آپ کے گوش گزار کرنے کے لیے آیا ہوں کہ اس پرچے کی ادارت کے لیے اس جوہر شناس ملک میں صرف ایک ہی موزوں شخصیت ہے۔ اس کا نام یوسف ظفر ہے۔" .... انٹرویو لینے والے حضرات سے منٹو کے جو مکالے ہوئے ہیں وہ منٹو کے جذبۂ انسانیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس "کارواں" میں بہت سے مشہور و معروف شاعر و ادیب کے ساتھ کم معروف اور غیر معروف ادیب و شاعر کا بھی ذکر ہے لیکن عزیز ملک نے اپنی شگفتہ تحریر سے کم معروف یا غیر معروف کو بھی معروف ادیب و شاعر کے برابر بلکہ بعضوں کو اس سے بھی زیادہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی عزیز ملک کی تحریر کا کمال ہے۔ عزیز ملک کی تحریریں پختہ، پُر مغز اور شگفتگی و تازگی کے گھہائے رنگا رنگ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین میں نظر میں کھُب جانے والے فقرے کی بہتات ہے یہ زبان و بیان پر قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ کتاب صحیح معنوں میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

(ا۔ س)

یادرفتگاں (تیسرا ایڈیشن)

محبت خان بنگش

صفحات ۶۰۸ قیمت =/۱۲۰ روپے

ادارۂ علم و ادب بہزادی چکر کوٹ کوہاٹ ڈویژن صوبہ سرحد

"یادرفتگاں" محبت خان بنگش کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا اور اب تیسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا ہے اس میں ۱۸۳۲ء سے ۱۹۹۲ء تک کے اُن ادیب و شعرا کا تعارف و تذکرہ ہے جو ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی افادیت تو آج کے دور میں ہے ہی لیکن آنے والے ادوار میں اس کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہوگا جب آئندہ نسلیں سرحد کے ادیب و شعرا پر کام کرنا چاہیں گے اور انھیں اس ضمن میں حوالے کی کتاب کی جستجو ہوگی۔

محبت خان بنگش ادبی مراکز سے دور کوہاٹ میں بیٹھے ہوئے تحقیقی، تخلیقی اور شخصی نوعیت کی کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح اُن کی تخلیقی پیاس بجھتی رہتی ہے وہ اب تک نظم و نثر کی تقریباً دس کتابیں ادارۂ علم و ادب کوہاٹ کے تحت شائع کر چکے ہیں۔ محبت خان بنگش ان تھک ہیں۔ توقع ہے کہ آنے والے برسوں میں وہ مزید اسی نوعیت و افادیت کی کتابیں پیش

کریں گے۔ محبت خان بنگش کی یہ عملی اردو دوستی مثالی ہے جو ہزاروں صفحات کی صورت میں قارئین تک پہنچ چکی ہے۔
یہ کتاب میگزین سائز پر چھپی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

(ا۔ س)

مسلمان سیاہ اور جغرافیہ داں

مرتب: عبدالرشید خاں
صفحات ۱۶۲ قیمت: درج نہیں
گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر ا ناظم آباد کراچی

جس طرح کسی معاشرے کو صحیح طور پر جاننے اور سمجھنے کے لیے اس کی تاریخ کو جاننا لازمی ہوتا ہے اسی طرح کسی ملک یا خطہ کی جانکاری کے لیے جغرافیہ کا جاننا ضروری ہے۔

جغرافیہ یونانی لفظ جیوگرافی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی زمین کا علم ہے۔ جغرافیہ کے اولین نقوش ہم کو یونان میں دکھائی دیتے ہیں اس سلسلے میں غالباً پہلا نام ہیروڈوٹس کا آتا ہے جس کے یہاں جغرافیائی شُد بُد کا گمان ہوتا ہے۔ دیگر یونانی جغرافیہ دانوں میں اسٹرابو اور کاڈس ٹالمی (بطلیموس) کا نام لیا جاتا ہے۔

بعد کے عہد میں ایک عیسائی راہب کوسمس نے جغرافیائی معلومات کے سلسلے میں کچھ اضافہ کیا۔ مسلمانوں خصوصاً عربوں نے پہلی بار جغرافیہ اور علم جغرافیہ کی طرف مکمل توجہ کی۔ مسلمان خصوصی طور پر جغرافیہ اور تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسلم دور کے قابلِ ذکر جغرافیہ دانوں میں ابوزید الکابی، ہشام الکلبی اور ابوسعید الاصمعی ہیں جنھوں نے ستاروں کے تعین کے لیے طول البلد اور عرض البلد کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی جس کی وجہ سے ریاضیاتی جغرافیہ اور نقشہ کشی کا کام مسلمانوں میں خصوصی دلچسپی سے پھیلا۔ اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی ساتھ جغرافیائی معلومات میں بھی وسعت آتی چلی گئی۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے قدیم دنیا کے بہت سے اُن علاقوں کا سراغ لگایا جن سے دنیا یا تو آگاہ ہی نہ تھی یا بہت ہی کم حد تک آگاہ بھی مثلاً دریائے والگا کا علاقہ بحرہ کیسپین، سائبیریا، افریقہ کے بعض ساحلی اور اندرونی علاقے۔ مسلمانوں نے اُن علاقوں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ علم جغرافیہ کے سلسلے میں باقاعدہ تصنیفی کام عباسی خلیفہ مامون عبدالرشید کے دور میں شروع ہوگیا تھا بعد میں ابوالحسن مسعودی، ناصر خسرو، ابن بیطار، احمد اللہ مستوفی، ابن بطوطہ، ابوریحان البیرونی اور ادریسی نے سیاحت اور دور دراز کے سفر اختیار کر کے علم جغرافیہ کے متعلق بیش بہا معلومات لوگوں تک اپنی تصانیف اور سفر ناموں کے ذریعہ پہنچائیں۔

اس کتاب میں فاضل مرتب نے دوسری صدی ہجری سے لے کر موجودہ دور تک کے نمایاں جغرافیہ دانوں کے سلسلے میں بڑی حد تک معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے جس کے لیے انھیں کتنی محنت اور کیا کیا جتن کرنے پڑے یہ وہ ہی جانتے ہوں گے۔ اس کتاب کے سلسلے میں محترم ثناء الحق صدیقی صاحب نے بڑا ہی مبسوط اور پُرمغز مقدمہ تحریر کیا ہے جو اس کتاب کا خاصہ ہے۔ جغرافیہ کے تاریخی ارتقا کے سلسلے میں یہ کتاب اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔

کتاب کی اشاعت اور طباعت میں معیار کو برقرار نہیں رکھا گیا ہے جو ایسی کتاب کے لیے بے حد ضروری ہے مگر اس ہوش ربا مہنگائی کے دور میں کتاب چھاپ کر فاضل مرتب نے پھر بھی ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔

(شہاب قدوائی)

United PID-1-7/92

قومی زبان (۶۳) مئی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

مشرقی شعریات اور اردو شاعری کی روایت/ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

میں اردو ادب کے لیے اس اقدام کو بے حد مفید تصور کرتا ہوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد اب اردو ادیبوں میں مغرب سے آنے والے تنقیدی نظریات اور ادب کے نئے پیمانوں پر سنجیدہ بحث شروع ہوگئی ہے۔ اس بحث سے محض مثبت اور منفی آرا ہی سامنے نہیں آرہی ہیں بلکہ بعض روشن زاویے بھی ابھرنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر "سٹرکچرل کرنسزم" کے بعد "ڈی کنسٹرکشن" کے مباحث پیدا ہوئے اور انھیں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ریاض صدیقی، قیصر الاسلام نے تفصیل سے واضح کرنا شروع کیا تو ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر احمد سجاد، احمد ہمدانی اور کسی حد تک شمس الرحمان فاروقی نے اختلافی نقاط پیدا کیے اور دریافت کیا کہ کیا مشرقی تنقید کو مغرب سے یہ نئے پیمانے درآمد کرنے کی ضرورت ہے؟ یہ بحث ابھی چل رہی ہے اور کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچی لیکن اس سے قبل ڈاکٹر وزیر آغا نے "تنقید اور جدید اردو تنقید" اور اب ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے "مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت" لکھ کر اس تنقیدی تسلسل روبہ منظر لانے کی کاوش کی ہے جو تذکروں کے دور سے شروع ہوا اور اب تک مائل بہ ارتقا ہے۔ فی الوقت ذکر چونکہ ہندوستانی کتابوں کا ہو رہا ہے اس لیے وزیر آغا کی کتاب "تنقید اور جدید اردو تنقید" اس جائزے کے مدار میں نہیں آتی اور زیر نظر کتاب ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کی "مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت" ہے جو ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کا بنیادی مقصد مشرقی شعریات کا ایک ایسا ناکہ تیار کرنا ہے جس کے پس منظر میں اردو شعریات کی بنیادوں کی نشان دہی کی جا سکے۔ چنانچہ اس کتاب کا فکری سفر ماضی سے شروع ہوتا ہے اور اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے جہاں اردو شعریات پر مغربی شعریات کا اثر و رسوخ زیادہ ہو جاتا ہے اور مشرقی شعری روایت آہستہ آہستہ پس منظر میں چلی جاتی ہے تاہم اردو اندھیرے کے جگنو کی طرح کبھی کبھی اپنی روشنی دکھاتی رہتی ہے۔ اس عمل میں ڈاکٹر صاحب نے قدیم ماضی کی تین روایات کی اہمیت تسلیم کی ہے۔

اول۔ یونانی روایت جس کی بنیاد افلاطون کے بعض غیر ادبی تصورات اور ارسطو کی کتاب "بوطیقا" پر قائم ہے۔

دوم۔ سنسکرت کی روایت، جس کی اساس رس یا جذبہ کے تصورات پر مبنی ہے۔

سوم۔ عربی روایت جس کا غالب رجحان ادب کے خارجی محاسن اور فنی مباحث کی طرف ہے۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے مؤخر الذکر روایت کو کتاب کا بنیادی موضوع بنایا ہے، کیوں کہ اس روایت نے ہی

فارسی زبان کی تنقیدی روایت پر اپنا اثر ڈالا اور بعد میں تذکروں کی وساطت سے یہ روایت اردو میں بھی رواج و فروغ پاتی رہی۔ چنانچہ اس کتاب میں ابواب کی تقسیم بھی اسی ترتیب سے کی گئی ہے۔

عربی شعریات کی روایت کے باب میں انہوں نے آمدِ اسلام سے پہلے کے زمانے سے اس تاثراتی تنقید کا سراغ لگایا ہے جس کی بنیاد پر عکاظ کے میلے میں ہر سال بہترین قصیدے کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اس تنقید میں محاورۂ عرب کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور قبائیلی مسلمات کا مبالغہ آمیز بیان تحسین حاصل کرتا تھا۔ انہوں نے ماقبلِ اسلام، صدر اسلام اور اموی عہد کو عربی تنقید کا تشکیلی دور قرار دیا ہے اسے واضح صورت عباسی عہد میں دی گئی اور شاعروں کے طبقات اور انتخابات مرتب کیے گئے۔ ابن اسلام، ابن معتز، ابن قتیبہ، خدامہ بن جعفر، جاحظ، ابن رشیق اور ابن خلدون نے عربی تنقید کی اس روایت کو منضبط کیا جس میں یونانی تنقید کے بعض اثرات بھی موجود تھے۔ اس روایت کے زیر اثر فارسی کی ابتدائی تنقیدی کتابیں مثلاً قابوس نامہ، چہار مقالہ، لباب الالباب اور المعجم وغیرہ لکھی گئیں۔ اس استفادہ کے باوجود امیر کیکاؤس، نظامی عروضی سمرقندی، محمد عوفی، رشید الدین وطواط، دولت شاہ سمرقندی، فخری ابن امیری اور شمس قیس رازی نے فارسی تنقید کو نئی کروٹ دی اور اس کی ایک اپنی خود مختار روایت قائم کی اور اسی روایت کو بعد میں اردو شعرا نے اپنے تذکروں میں استعمال کیا اور بیک وقت دو خدمات سر انجام دیں۔

اول۔ شعرا کی تاریخ نگاری جو اردو تذکروں کی اساسی ضرورت تھی۔

دوم۔ تنقید نگاری، جس کے نقوش زیادہ واضح نہیں اور تذکرہ نگار کے ذوق و شوق و وجدان کے پابند ہیں۔ تاہم شعرا کے کلام پر تذکرہ نگار کی رائے سے اس کا تنقیدی شعور ہی قاری کے سامنے آتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے تین ابواب اس اجمال پر ختم ہو جاتے ہیں، چوتھا باب جو اس کتاب کو اردو تنقید کی اساس فراہم کرتا ہے وہ "مشرقی شعریات اور اردو شعرا کا تنقیدی شعور" کے بارے میں ہے۔ اس باب میں فائز دہلوی سے لے کر حسرت موہانی تک کے اصولی اور نظریاتی مباحث کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ آخری باب "مشرقی شعریات اور روایتی اردو تنقید" مولانا حالی کے دور سے شروع ہوتا اور بیسویں صدی میں مسعود حسن رضوی ادیب تک کے شعری رویوں اور ان کے فکر و نظر پر مشرقی روایت کی فوقیت کی روشنی میں لاتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اختتامیہ میں چند اہم فیصلے دیے ہیں جن کا اثبات اس کتاب میں اٹھائے گئے مباحث اور مثالوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر قاسمی کی رائے میں حسرت موہانی نے جو مشرقی معیار نقد پیش کیا اسے حالی اور شبلی کے زمانے میں ادبی تنقید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریا آبادی نے اردو تنقید کے ارتقا میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ حامد حسن قادری کا مشرقی رویہ قدامت پسندانہ ہے۔ اردو تنقید میں محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، امداد امام اثر، مولوی عبدالرحمان، وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق، عبدالسلام ندوی، نیاز فتح پوری، مسعود حسن رضوی ادیب چند ایسے نقاد ہیں جو مشرقی شعریات کے ساتھ ہم آہنگ اور اس سے کسبِ فیض کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کی یہ کتاب اس بات کی شاہد بھی ہے کہ خود ان کے باطن میں بھی مشرقی شعری روایت نمایاں طور پر پنپتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے خنک مزاجی سے اپنے موضوع کا تجزیہ کیا اور بحث کو دل کشا انجام تک پہنچایا ہے اس سے نہ صرف ان کی مشرقی استقامت عیاں ہے بلکہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ زیر بحث موضوع اور اشخاص کو خندہ جبینی سے دیکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص نوع کی جمالیاتی لطافت ہے جو اگرچہ علی گڑھ کی رومانی نثر کی عطا نظر آتی ہے لیکن اسے بھی مشرق کی روایت ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اب اردو تنقید پر مغرب کے اثرات کا

جائزہ بھی سامنے آنا چاہیے لیکن طمانیت کی بات یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) بابائے اردو یادگاری لیکچر میں یہ کام ڈاکٹر وزیر آغا سے کرواچکی ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے گویا اس سے فی الحال دائرہ تنقید مکمل ہو جاتا ہے۔

سرہانے کا چراغ / عزیز تمنائی

عزیز تمنائی سے میری پہلی ملاقات مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ "ادبی دنیا" میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اردو سانیٹ ان کی ادبی پہچان تھے اور یہ ایسی سخت صنفِ سخن تھی جسے بڑے بڑے قادرالکلام شعرا بھی ڈرتے ڈرتے آزماتے تھے۔ عزیز تمنائی کے سانیٹ نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان کی تقلید میں متعدد نوجوان شعرا نے بھی سانیٹ لکھنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عزیز تمنائی مختصر نظم بھی بہت عمدہ کہتے تھے اور ان کی غزل میں بھی ان کا اپنا رنگ تھا حالانکہ جس دور میں انھوں نے شاعری کی اس دور میں غزل کی آبرو بڑھانے میں جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی جیسے شعرا بہت معروف تھے اور نظم کو ترقی پسند شعرا کا سیلاب اپنے ساتھ بہا کر کسی اور سمت میں لے جا رہا تھا۔ عزیز تمنائی نے اس دور میں اپنے اندر کے انسان کی آواز سنی اور اپنے منفرد انداز میں شاعری کی ان کے سانیٹوں کا مجموعہ "برگِ نوخیز" کے عنوان سے شائع ہوا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ وہ اچانک شاعری کے افق سے غائب ہو گئے کم و بیش ۳۰ برس کے بعد ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ "سرہانے کا چراغ" سامنے آیا ہے تو عزیز تمنائی صاحب سے جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں مجھے تجدید ملاقات کر کے بہت خوشی ہوئی ہے۔

عزیز تمنائی کی شاعری میں زندگی کو رجائی نظر سے دیکھنے، لمحے سے نشاطیہ سرور حاصل کرنے اور حقیقت کے پسِ پردہ حقیقت کو جاننے کا رجحان نمایاں ہے۔ وہ زندگی کی الجھنوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کی نظر گشتِ مسلسل میں مصروف ہے وہ سفر کو مدام صورت میں جاری رکھتے ہیں، اور دنیا کی ہر راہ گزر پر اپنی آہٹ سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے یہ مثبت رویے ان کی نظموں "طلسمی دریچہ"، "جانی پہچانی گلی"، "قصۂ درد" اور "ہیولیٰ" میں نمایاں ہیں۔ کتاب میں چند سانیٹ اور غزلیں بھی شامل ہیں مختصر ترین نظم کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے:

سوچ کے دروازے پر دستک / دیتے رہنا / کوئی نہ کوئی اندر ہوگا / اک دن باہر آجائے گا

اس کتاب کا دیباچہ "سوغات" کے مدیر محمود ایاز نے لکھا ہے۔ ان کے خیال میں "اس مجموعہ کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو پڑھنے والے کو ایک گہری آسودگی اور مسرت سے آشنا کرائیں گی اور بیسیوں اشعار ایسے بھی ہیں جو سینۂ پرنور میں خلوت کی تلاش کریں گے۔" علامہ جمیل مظہری نے تو ۱۹۶۳ء میں ہی عزیز تمنائی کو ایک عظیم فنکار تسلیم کر لیا تھا اور لکھا تھا کہ "رنگ سازی اور معنی آفرینی کا ایسا حسین امتزاج دورِ جدید کے فن پاروں میں نظر سے کہیں نہیں گزرا۔" جنیت پرمار کے سادہ اور پرکار سرورق کے ساتھ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

منتخب افسانے ۱۹۹۱ء / نند کشور وکرم

نند کشور وکرم ہر سال دہلی سے بہترین ادب کا ایک انتخاب چھاپتے ہیں، اس کتاب کا ایک حصہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہوتا ہے جسے وکرم صاحب الگ کتابی صورت میں بھی پیش کرتے ہیں، زیر نظر کتاب ۱۹۹۱ء کے منتخب افسانے ہے جو ۱۹۹۲ء کے اواخر میں منظر عام پر آئی تھی نند کشور وکرم نے انتخاب کو نمائندہ بنانے کے لیے ایک یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ مؤقر نقادوں

سے ایک سوال نامے کے ذریعے بہترین افسانوں کی نشاندہی کی فرمائش کرتے ہیں لیکن انھیں ملال اس بات کا ہے کہ ان میں سے بیشتر لوگ انھیں سوالنامے کا جواب ہی نہیں دیتے انھیں یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ سب رسائل جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک سے شائع ہوتے ہیں انتخاب کے لیے دستیاب نہیں ہوتے، اس سب کے باوجود انھیں داد دینی پڑتی ہے کہ وہ یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں ان کے انتخاب میں متعدد ایسے افسانے مل جاتے ہیں جنھیں اس برس کے نمائندہ افسانے شمار کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر زیر نظر کتاب میں جیلانی بانو کا افسانہ "مجرم"۔ ضمیر الدّین احمد کا "سوکھے ساون"۔ اختر جمال کا "اصیل مرغ"۔ تسنیم سلیم چھتاری کا "بازگشت"۔ رام لعل کا "صبح ہوگئی" ہر لحاظ سے مصنفین کی اعلیٰ پائیگی کی شہادت دیتے ہیں یہ کتاب عصمت چغتائی کے نام معنون ہے جن کا انتخاب ۱۹۹۱ء میں ہوا تھا۔

تنقید نامہ / پروفیسر عنوان چشتی

عنوان چشتی صاحب کا شمار ان نامور ناقدین میں ہوتا ہے جو تخلیق اور تحقیق کی طرح تنقید کو بھی ایک آزاد، مکمل اور خود مکتفی فن شمار کرتے ہیں اور اس کے لیے خود اپنے اصول اور طریقے تراشتے ہیں، وہ اپنے معاصرین پر اپنے نقطۂ نظر سے بحث کرنا اپنا ادبی حق سمجھتے ہیں لیکن خوبی کی بات یہ کہ نقطۂ اختلاف بھی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں ان کی تنقید کی ایک خصوصی جہت یہ ہے کہ وہ لفظ کی سطح کے ساتھ چپکے ہوئے معنی کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس کے پس پشت معنوی اسباب اور محرکات بھی دریافت کرتے ہیں، تلاش و جستجو کا یہ عمل زیر نظر کتاب "تنقید نامہ" میں بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مومن کی شاعری سے پیکر تراشی، مسعود حسین خان کی نثر سے ان کی مرقع نگاری اور ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے ان کے صوفیانہ رجحانات دریافت کیے ہیں، ان کے دو جائزے "ہم عصر اردو غزل۔ دہلی میں" اور "جدید اردو غزل۔ مغربی بنگال میں" ہمارے سامنے اس صنفِ سخن میں پروان چڑھنے والے مخصوص علاقائی رجحانات واضح کرتے ہیں، سراج اورنگ آبادی، احسن مارہروی، مرزا مظہر جان جاناں پر مضامین تعارفی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں بھی عنوان چشتی کی مخصوص قلمکاری کا انداز موجود ہے۔ زاہدہ زیدی کے مجموعہ "سنگِ جاں" پر تبصرہ میں تجزیاتی زاویہ اس شاعرہ کی دریافتِ نو پر منتج ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱٦۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی سے دستیاب ہے۔

لمحہ لمحہ پیاس / کیلاش ماہر

کیلاش ماہر کا شعری سفر گزشتہ پانچ دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے، کائستھ خاندان کے اس فرد کی پیدائش تو مراد آباد میں ہوئی جس کی شعری روایت میں جگر صاحب کا بہت حصہ ہے۔ لیکن انھوں نے ذہنی اور فکری تربیت الہ آباد کی فضا میں حاصل کی جو اس زمانے میں فراق گورکھپوری کی ادبی روایت سے معمور تھی۔ فراق صاحب سے ہی کیلاش ماہر نے یہ بات سیکھی کہ شاعر کو اصناف کا پابند ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی پہلے غزلیات کا مجموعہ "لمسِ ہوا" کے نام سے ۱۹۸۲ء میں پیش کیا اب "لمحہ لمحہ پیاس" کے عنوان سے ان کی نظموں کی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔

کیلاش ماہر نے شاعری کی ابتدا، ترقی پسند تحریک کے تقاضوں سے کی تھی لیکن سماجی علوم کی آگہی نے انھیں زندگی کے ان زاویوں کو دیکھنے پر بھی آمادہ کیا جن کے خطوط خارجی کائنات سے ان کے دل کے مرغزار تک پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ ان کی

نظموں میں ترقی پسند نقوش جدید تصورات کے ساتھ ہم آغوش نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری کائنات ہی کا نہیں شاعر کی ذات کا آئینہ بھی بن جاتی ہے۔ "نئی نسل کا آخری نوحہ"۔ "لمحہ لمحہ پیاس"۔ "مردہ روحوں کا مسیحا"۔ "عزم"۔ "خوشبو کا سفر" اور دیگر متعدد نظموں میں ہمیں وہ شاعر نظر آجاتا ہے جو شعورِ نو سے سرشار ہے لیکن کوہِ ندا کی طرف جانے سے بھی خوف نہیں کھاتا اور جب مرگِ صدا کو عبور کر جاتا ہے تو زندگی اس پر ایک نیا چہرہ ایک نیا رنگ منکشف کر دیتی ہے، یہ نیا چہرہ کیلاش ماہر کا اپنا ہے اور نیا رنگ کائنات کا رنگ ہے اور یہ دونوں مل کر رجائیت کا ایک انوکھا زاویہ روشن کر دیتے ہیں، ڈاکٹر عنوان چشتی نے انھیں اردو نظم کی روایت میں ایک اہم اضافہ قرار دیا ہے میں ان کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ یہ کتاب نرمن وہار دکاس مارگ دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

چاولوں کی دُ
پا تانی
ب تی چاول
کی شیدائی ہے!

منفرد چاول ہے. کوئی اور چاول اس جیسا نہیں.
کا بہترین انتخاب!

ائس ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ

باب جدہ

نسیم سحر

جدّہ کے دو مشاعروں کا احوال

جدّہ میں غمِ روزگار کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ گلشن کا کاروبار یعنی شعر و شاعری کی محفلیں بھی حسبِ توفیق جاری ہیں اور احباب پاکستان یا ہندوستان سے کسی شاعر یا ادیب کے آنے کی خبر سن لیں تو پھر کہیں نہ کہیں مشاعرہ یا شعری نشست برپا ہو کر رہتی ہے۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر کلیم عاجز جیسی مصروف ہستی امریکہ کے ایک طویل ادبی دورے سے واپس انڈیا جاتے ہوئے چند دن کے لیے جدّہ میں قیام پذیر ہوئی تو یہاں بھی کئی محفلیں سجنے کا جواز پیدا ہو گیا۔ ان میں سے چند تو خالص نجی محفلیں اور چند میں صلائے عام تھی۔ "صلائے عام" والی ایک محفل جدّہ میں مقیم ہندوستانی شاعر اور "عکسِ جاں" کے مصنّف سیّد ظفر مہدی نے اپنے دولت کدہ پر سجائی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر ریاض سے آئے ہوئے معروف شاعر اور نقاد شبنم مناروی کو مسند نشین ہونے کی دعوت دی گئی جو اُسی روز ریاض سے بذریعہ کار سفر کر کے آئے تھے اور خاصے تھکے ہوئے لگ رہے تھے بلکہ کسی حد تک وہ اس مشاعرے میں شرکت سے ہی گریزاں تھے مگر یاروں کی محبت اور اپنی ذاتی مروّت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے جب کہ ایک اور متوقع مہمانِ خصوصی تو آہی نہیں سکے یعنی برمنگھم (انگلستان) سے ڈاکٹر صفی حسن کی آمد ایک روز پہلے سے متوقع تھی اس لیے "غیر سرکاری طور پر" یہی طے تھا کہ دوسرے مہمانِ خصوصی وہ ہوں گے مگر وہ تشریف نہیں لا سکے اور تاحال اُن کی آمد کی کوئی خبر نہیں اگرچہ یہ طے ہے کہ ان کے آنے پر ان کے اعزاز میں مشاعرہ ہوگا۔ بہرحال ذکر اس مشاعرے کا تھا جس میں صاحبِ خانہ اور میزبان شاعر سیّد ظفر مہدی نے نظامت ہمارے حوالے کرنے کا اعلان فرمایا۔

جناب احمد سعود نے تلاوتِ کلام پاک فرمائی جس کے بعد راقم کی تجویز پر حال ہی میں فوت ہو جانے والے اپنے ایک دوست شاہ الیاس احمد تبسم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کے ایک قریبی دوست کلیم اللہ فاروقی نے بھی ان کی یاد میں چند کلمات کہے۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں کلام سنانے والوں میں کلیم اللہ فاروقی، عبدالقیوم عادل، ناظم الدّین مقبول، مہتاب قدر، نسیم سحر، سیّد ظفر مہدی، عبدالباری انجم، یاد صدیقی، سیّد محمد احمد نقوی، سجاد بابر، شبنم مناروی اور ڈاکٹر کلیم عاجز شامل تھے۔

ایک اور ایسی ہی خوبصورت محفل پاکستان سے آئے ہوئے شاعر اور دوہوں کے حوالے سے شہرت پانے والے ہمارے ایک دوست پرتو روہیلہ کے اعزاز میں ہمارے ہاں ہی سجی۔ چونکہ اس محفل کا انعقاد ہی پرتو روہیلہ صاحب کے لیے ہوا تھا اس لیے انہی کو اس کی صدارت کے لیے زحمت دی گئی اور نظامت راقم نے کی۔ یہاں ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ اُن کے تعارف میں ہم نے کہا کہ آج کی محفل دو شخصیتوں کے اعزاز میں ہے ایک مختار علی خاں اور دوسرے پرتو روہیلہ مگر ہمارا زیادہ واسطہ پرتو روہیلہ سے ہے تو محفل میں سے ایک صاحب نے دریافت کیا "کیا مختار علی خاں نہیں آسکے؟" اس پر جاننے والوں کا ایک پُرزور قہقہہ بلند ہوا۔ قارئین

کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مختار علی خاں اور پر تو روہیلہ ایک ہی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ مختار علی خاں حکومت پاکستان کے ایک سینیئر عہدیدار ہیں اور ان دنوں وزارت انصاف میں ممبر انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل کے طور پر متمکن ہیں۔ پر تو روہیلہ ان کا ادبی نام ہے اور اس نام سے اب تک جو تصنیفات ان کے قلم کی مرہون منت ہو چکی ہیں ان میں "نوائے شب"، "پر توِ شب"، "رین اجیارا"، "شکستِ رنگ"، "پشتو ٹپے" شامل ہیں جب کہ دام خیال کے عنوان سے ان کی کلیات بھی یہ سطریں شائع ہونے تک چھپ چکی ہوگی۔ بہر حال ذکر مشاعرے کا ہو رہا تھا جس کا آغاز محمد سبطین شاہ جہانی نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور اس کے بعد ناظم مشاعرہ اور میزبان کی حیثیت سے راقم نے سب سے پہلے اپنی غزل پیش کی۔ پھر جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں نور المبین، رشید الدین رشید، مہتاب قدر، مرزا یوسف رہبر، سہیل حیدر جدی، محمد سبطین شاہ جہانی، شجاعت علی راہی، رؤف خلش، یاد صدیقی، اعتماد صدیقی، سجاد بابر، سید ظفر مہدی اور جناب پر تو روہیلہ شامل تھے۔

ان دونوں شعری محفلوں کا منتخب کلام پیش کیا جا رہا ہے:

ڈاکٹر کلیم عاجز:

وہ جس پہ سارے جہاں کا عتاب ہے پیارے
وہی یہ عاجزِ خانہ خراب ہے پیارے

پر تو روہیلہ:

شب گزرتی کیوں نہیں سورج نکلتا کیوں نہیں
درد پتھر بن گیا آخر پگھلتا کیوں نہیں

شبنم مناروی:

ہوا کے ساتھ چلنے کا یہی انجام ہوتا ہے
ہمارے جسم و جاں پر دوسروں کا نام ہوتا ہے

شبنم سحر:

رکھ کر یہ بات پیشِ نظر میں چلا گیا
کوئی نہ جا رہا تھا اُدھر، میں چلا گیا

ظفر مہدی:

احباب کی آسان روی نے کیا بیزار
دانستہ ہی وابستہ رہے درد سری سے

شجاعت علی راہی:

بھلے ہی دکھ کی آنچ سے جاگے بھلے ہی بھوکا سوئے
تیری چھاؤں ملے تو ماں یہ بالک کبھی نہ روئے

اعتماد صدیقی:

ڈوبتے ڈوبتے بھی اک کشتی

جانے کیا کہہ گئی سمندر سے

مہتاب قدر:

سزائے موت سزاؤں کی آخری حد ہے
تمھارا ظلم جو دیکھا تو سر کا ڈر بھی گیا

کلیم اللہ فاروقی:

ایسے بھی دوستوں پہ ہمارا رہا ہے ساتھ
گننی پڑی ہیں انگلیاں جن سے ملا کے ہاتھ

سجاد بابر:

پرچھائیں گھٹتی بڑھتی رہی روشنی کے ساتھ
میں جس جگہ کھڑا تھا وہیں دیر تک رہا

نورالمبین:

مجھ کو حسرت نہیں بلندی کی
مجھ کو تھوڑی سی آبرو دے دے

رشید الدین رشید:

دے سمندر کو نام صحرا کا
اور سرابوں کو آبجو لکھ دے

مرزا یوسف رہبر:

تم پاس نہیں تو موسم کی حالت نہ رہی پہلے کی طرح
کب صبح ہوئی پہلے کی طرح، کب شام ہوئی پہلے کی طرح

سہیل حیدر جدی:

پرواز کا امکاں تھا تو جب حوصلہ کب تھا
کیوں آج ہمیں شکوۂ بے بال و پری ہے

محمد سبطین شاہجہانی:

شب کی تنہائی میں اُس چشمِ غزالاں کا خیال
غارتِ صبر و سکوں تھا مگر ایسا تو نہ تھا

یاد صدیقی:

ہوائے درد نہ یوں شہر بھر کے سر آتی
کہیں ٹھکانہ نہیں تھا تو میرے گھر آتی

ناظم الدین مقبول:

وہ اک خوشی جو کبھی دل نواز نغمہ تھی
چلی گئی ہے مکانوں سے، خیر ہو دل کی

عبدالباری انجم:

پھر بزمِ تصوّر کو سجانے کے لیے آ
آنکھوں سے مری نیند اُڑانے کے لیے آ

عبدالقیوم عادل:

بظاہر دوریاں حائل ہیں لیکن
بہت نزدیک آتے جا رہے ہیں

سیّد محمد احمد نقوی:

وہ ایک چہرہ جو روشنی کی کتاب بن کر کھلا ہوا ہے
اُس ایک چہرے کو موسموں کے مسل چکے انقلاب کتنے

ازراہ کرم مضامین میں اختصار کا خیال رکھیں

گردوپیش

بکریٹری دارالمصنفین اعظم گڑھ کی انجمن میں آمد

گزشتہ دنوں پٹنہ (بہار) سے آئے ہوئے مہمان جناب شہاب الدّین دیسنوی سیکریٹری دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اعزاز میں
بمن ترقی اردو کے دفتر میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس کی صدارت صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی۔ ڈاکٹر اسلم
ری مشیر علمی و ادبی نے حسب روایت مہمان کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ گفتگو کا آغاز برصغیر پاک و ہند کے موجودہ حالات سے
ا۔ لیکن جلد اس کا رخ اردو زبان وادب کی جانب مڑ گیا۔ جناب شہاب الدّین نے ہندوستان میں اردو کی عمومی صورت حال کے
رے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ یوپی میں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں ہے، وہاں اردو کی ابتدائی تعلیم کا
ام "دینی تعلیمی کونسل" کے تحت قائم کردہ دینی مکاتب کے ذریعے ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں ندوہ اور دیوبند اپنے اپنے دائرہ کار میں
رگرم ہیں۔ شہاب الدّین صاحب نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا لیکن اس کے برعکس مہاراشٹر میں ڈھائی سو کے قریب اردو
یڈیم اسکول ہیں، جہاں سائنس وغیرہ کے امتحانات کے پرچے بھی اردو میں آتے ہیں۔

جناب شہاب الدّین نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں ہمارے ہاں ذہنوں میں کئی
لرح کے سوالات ابھرتے ہیں اول یہ کہ اُردو جس حال میں ہے اُسی طرح لکھنے پڑھنے میں برتی جائے، دوم اِس کو مزید سادہ و عام فہم
کیا جائے تاکہ غیر اردو حلقہ بھی اسے آسانی سے سمجھ لے سوم یہ کہ اس کی مروجہ شکل میں ہی دوسری زبانوں کے وہ الفاظ قبول کر
لیں جو اردو کے مزاج کے عین مطابق ہوں۔ اس کے ساتھ ہی شہاب صاحب نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا "آپ کے ہاں اردو زبان
کی ترویج کی راہ کے مسائل کیا ہیں مجھے نہیں معلوم" اس پر جواباً صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے کہا کہ یہاں کوئی ایسی شعوری
کوشش نہیں کہ اسے فارسی و عربی کے غیر ضروری دخیل الفاظ سے پاک کیا جائے اور ان کی جگہ مقامی زبانوں کے الفاظ قبول کرنے
کا چلن اپنایا جائے۔ دراصل اس میں ارادی کوشش ہو بھی نہیں سکتی۔ زبان کے پھیلاؤ کے اپنے راستے ہیں ویسے آپ حضرات اردو
زبان کے تعلق سے مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔"

گفتگو میں جن شرکائے تقریب نے حصہ لیا ان میں شاہ محی الحق فاروقی، ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، جناب افتخار احمد عدنی، جناب
مصطفٰے علی بریلوی، پروفیسر علی محسن صدیقی، پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر ظفیر الحسن اور جناب فخر الحسن اور جناب
نہیم محسن کے نام نامی شامل ہیں۔

شامِ افسانہ

آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو شامِ افسانہ منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت اردو کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ ہاجرہ مسرور نے فرمائی۔ پروگرام کے مطابق "۱۹۹۲ء کا افسانوی ادب" پر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے مقالہ پڑھا۔ اس میں ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والے افسانوں اور ناولوں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا اور اس بات کا اشارہ دیا گیا ہے کہ اردو افسانہ نگاری اس صدی کے آخر تک ایک نئی سمت میں جست لگانے کے لیے پر پرزے ابھی سے نکال رہی ہے۔

شامِ افسانہ کی اس محفل میں محترمہ زاہدہ حنا، محترمہ شکیلہ رفیق، محترمہ نفیس حسن، جناب امراؤ طارق اور ڈاکٹر مشرف احمد نے اپنے تازہ افسانے سنائے۔ یہ تقریبِ "شام افسانہ" اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھی اس کا اختتام صدر جلسہ محترمہ ہاجرہ مسرور کے خطاب پر ہوا۔

اکادمی ادبیات کے زیر اہتمام پانچ مشاعرے

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام پانچ مشاعروں کا سلسلہ وار انعقاد کیا جا رہا ہے۔ چاروں صوبائی صدر مراکز لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ نیز وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ہونے والے ان مشاعروں میں اردو، پنجابی، سندھی پشتو، بلوچی اور دیگر پاکستانی زبانوں کے ممتاز اور منفرد شعرائے کرام شرکت کریں گے اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ ۱۴ اپریل کو نشتر حال پشاور میں ہوگا جس میں پشتو اور ہندکو کے ممتاز شعرا اپنا کلام پیش کریں گے۔ اس محفل شعر کی صدارت پشتو زبان کے عہد ساز شاعر اور ادیب عبدالغنی خاں کر رہے ہیں جب کہ صاحب طرز شاعر اجمل خٹک بطور مہمان خصوصی شرکت کریں گے۔ ہاشم بابر اس شام شعر کی میزبانی کے فرائض انجام دیں گے۔

جلیسانِ ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام تقریبِ تقسیم اسناد

جلیسانِ ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام کاسموپولیٹن ہائی اسکول، لطیف آباد حیدرآباد میں ایک جلسہ تقسیم اسناد کا انعقاد ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی کی صدارت میں منعقد اس تقریب میں شعبہ اردو جامعہ سندھ سے گزشتہ پانچ سالوں میں ایم اے اردو بدرجہ اوّل پاس کرنے والے طلبہ و طالبات کو اسناد امتیاز دی گئیں۔ تقریب کے مہمان خصوصی جناب پروفیسر ارشد رضا تھے جب کہ معلّن کے فرائض معتمد جلیسانِ ادب سیّد جاوید اقبال نے انجام دیے۔ سندھ کی معروف قاریہ محترمہ منیزہ شمشاد نے تلاوتِ قرآن کی سعادت حاصل کی اور حیدرآباد کے معروف شاعر جناب مضطر ہاشمی نے اپنی ایک خوبصورت نعت نذرِ حاضرین کی۔ جلیسان ادب کے نائب صدر جناب محمد انیس خان نے مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہا۔ بعد ازاں شعبہ اردو جامعہ سندھ کے چند طلبہ نے اپنے ایم اے کے مقالات کی تلخیص پیش کی۔ نوید الاسلام (نوید سروش) کا عنوان تھا "رحمان کیانی: شخصیت اور فن" فریدالدّین (فرید طاہر) کا موضوع تھا "اردو ناولوں کا موضوعاتی جائزہ" انعام الحق عباسی نے "ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری" کے حوالے سے مضمون پڑھا اور سیما اشفاق نے "ماہر القادری کی لسانی تصریحات" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ صفدر علی خاں کا عنوان تھا "رسالہ فاران کی ادبی خدمات و اشاریہ فاران"

اس دوران شعبے کے دو خوش گلو طلبہ جناب سعید مرزا اور جناب افسر خان نے معروف شعرا کی غزلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔
اس کے بعد سلسلۂ تقسیم اسناد کا آغاز ہوا۔ امتیازی اسناد حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کے نام درج ذیل ہیں:
حنا عنبرین، نوید سروش، سیما اشفاق، انعام الحق عباسی، فرید الدین، عفت یاسمین، محمد سلیم، صلاح الدین، پرویز اختر، سید سجاد حیدر، شاہ انجم، صفدر علی خان، سلطانہ عثمان، گل محمد، محمد سعید مرزا، مسیح الدین عثمانی، ذکیہ حسن، مرغوب احمد، سلیم اقبال، ذوالفقار احمد، فریدہ بانو، حافظ قاری رضوان احمد، رفعت شیخ، محمد صادق، محمد رفیق، محمد افسر خان بنگش، فرزانہ، صدف، رضیہ، بشیر عنوان، محمد انیس خان، شازیہ فاخر، عدنان محمد صدیقی، کرار احمد خانزادہ، نسرین افروز، مبارک علی، ذکیہ سلطانہ، شفیق احمد، وکٹر نوئیل ڈینئیل، پروین شگفتہ، شائستہ، بشیر احمد خان، علی محمد نقوی، شمیم قمر الزماں۔
طلبہ و طالبات میں اسناد کی تقسیم کے بعد حیدر آباد کے معروف اشاعتی ادارے کو ان کی خدمات کے اعتراف میں امتیازی اسناد دی گئیں۔ مکتبۂ ذوقی کی سند جناب مصنظر ہاشمی نے وصول کی۔ ادارۂ اردو کی سند محترمہ پروفیسر رابعہ اقبال کے حوالے کی گئی۔ جناب حبیب ارشد نے قصر الادب کی نمائندگی کی اور جناب شاہ انجم ادارۂ انشاء کا سرٹیفکیٹ وصول کرنے کے لیے تشریف لائے۔
تقسیم اسناد کے بعد صدر شعبۂ اردو جامعہ سندھ ڈاکٹر نجم الاسلام کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی انھوں نے تقریب کے انتظامات کی تعریف کی اور ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کی تشریف آوری پر خوشی کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی جناب پروفیسر ارشد رضا صاحب نے حیدر آباد شہر کے علمی و ادبی پس منظر کا تذکرہ نہایت دل نشین انداز میں فرمایا۔ صاحبِ صدر ڈاکٹر پروفیسر یونس حسنی نے شگفتہ و دل پذیر پیرائے میں کراچی اور حیدر آباد کی ادبی فضا کا موازنہ فرمایا اور جلیسانِ ادب کو اس تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دی۔
اس موقع پر حیدر آباد شہر سے شائع ہونے والی علمی و ادبی کتب مختلف اداروں کے اسٹالز سے رعایتی قیمتوں پر فروخت کی گئیں۔
اس پروگرام میں شہر کے معروف ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکاء میں ڈاکٹر الیاس عشقی، پروفیسر عنایت علی خاں، پروفیسر مسز رابعہ اقبال، پروفیسر فہمیدہ شیخ، پروفیسر آصفہ ریاض، جناب ولی قریشی، جناب ارتضا عزمی، جناب محمود صدیقی، جناب حمید الدین شیخ، ڈاکٹر احمر رفاعی، پروفیسر حضور احمد سلیم، پروفیسر ظہور احمد قائم خانی، جناب دانش مند خان، جناب مرزا سلیم بیگ، جناب رفیق احمد نقش، پروفیسر حبیب ارشد، جناب سلیم ستو، جناب امین جالندھری، جناب صابر بن ذوقی، جناب صادق حسین صادق، ڈاکٹر ایوب عباسی، ڈاکٹر قمر الزماں اور جناب صالح شاہ اثر شامل ہیں۔

۹۲-۱۹۹۱ء کی شعری تخلیقات پر تین عالمی ایوارڈ

ایم اے جناح ہاؤس لندن کی انتظامیہ نے ۹۲-۱۹۹۱ء میں یورپ، امریکہ، پاکستان اور ہندوستان میں چھپنے والے شعری مجموعوں پر تین "عالمی ایوارڈ" برائے ۹۲-۱۹۹۱ء دینے کا اعلان کیا ہے یہ ایوارڈ ۱۴ اگست کو جشن آزادی پاکستان کے موقع پر ایم اے جناح ہاؤس لندن میں دیے جائیں گے۔ شرکت کے خواہشمند شعرا حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کی دو کاپیاں ۲۰ جون ۱۹۹۳ء تک خالد حسن ایم اے جناح ہاؤس ۳۵ رسل روڈ لندن ڈبلیو ۱۴ ۸ ایچ یو کے پتہ پر روانہ فرمائیں ۲۰ جون کے بعد موصول

ہونے والی تخلیقات شریکِ مقابلہ نہیں کی جائیں گی۔

نقاش کاظمی کے لیے ہیومن رائیٹس ایوارڈ

وائس فار ہیومن رائیٹس کے اعلان کے مطابق ۱۹۹۲ء کا ہومن رائٹس ایوارڈ اردو کے پاکستانی شاعر نقاش کاظمی کو ان تصنیفات اور کارکردگی کی بنا پر دیا جائے گا مذکورہ ایوارڈ نقاش کاظمی کے تازہ مجموعہ "رخِ سیلاب" کے حوالے سے عطا کیا جارہا جب کہ ان کی ایک اور نثری کتاب "الفرو ایشیائی ادیبوں کے مسائل اور اُن کا پس منظر" کے مندرجات کو بھی مد نظر رکھا گیا اعلان کے مطابق مذکورہ ایوارڈ عالمی سطح پر حقوق انسانی، شخصی آزادی حب الوطنی، محبت اور امن کے فروغ کے سلسلے میں ۲، کی طبع شدہ تخلیقات و خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جارہا ہے۔

"کندن" کے مدیر لیاقت قریشی کا انتقال

نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ گوہر پبلیشرز کراچی کے مالک اور ادبی ماہنامہ "کندن" کراچی مدیر اعلیٰ لیاقت قریشی ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کی صبح ۴ بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ادبی حلقوں میں لیاقت قریشی مرحوم کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ان کے لائق فرزندوں کا یہ عہد کہ لیاقت قریشی مرحوم کی جلائی ہوئی شمع فروزاں رکھیں گے۔ قابل ستائش ہے۔

ادارہ "قومی زبان" جناب لیاقت قریشی کے اس "سانحہ ارتحال" پر ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہے اور دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

پاکستان بیت المال کی کارروائی اردو میں لکھی جایا کرے گی

پاکستان بورڈ آف منیجمنٹ نے لاہور میں ۲۵ فروری ۱۹۹۳ء کے اجلاس میں آئندہ اپنی کارروائی قومی زبان اردو میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں بورڈ کے رکن مدیر "تکبیر" محمد صلاح الدین نے ایک قرارداد پیش کی تھی جسے متفقہ طور منظور کر لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ جہاں انگریزی کا استعمال بہت ناگزیر ہوگا اسے صرف وہیں تک استعمال کیا جائے گا اس سلسلے میں انگریزی کی بجائے اردو ٹائپ رائٹر مہیا کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

(بشکریہ "اخبار" اردو اسلام آباد

ایشین اردو سوسائٹی سویڈن کے سالانہ انتخابات

ایشین اردو سوسائٹی سویڈن کے سالانہ انتخابات کے نتیجے میں ۱۹۹۳ء کے لیے جاوید اقبال قریشی، ڈاکٹر جاوید شفقت، محمد جمیل احسن، سیّد اقبال احمد، جاوید نسیم غوری، سیّد عمران احمد، زبیدہ شریف اور سیّد محمد احمد کو مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تقریب حلف برداری کا بھی اہتمام کیا گیا۔ سالانہ اجلاس منعقدہ اسٹاک ہوم سویڈن میں سوسائٹی کی کارکردگی اور حساب کتاب کی صورت حال پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور مجلس مشاورت کے لیے ڈاکٹر شائستہ زید، محترمہ شہناز قریشی

جی الجداوی، محترمہ شاہانہ سید، محمد علی آرٹسٹ، محترمہ سعیدہ بانو بیگ روشن، ہارون خان، محترمہ سلطانہ سید اور افتخار زبیری کا انتخاب کیا گیا۔

(بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد)

علامہ اقبال کے بچوں کی آیا انتقال کر گئیں

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے بچوں کی آیا مسز ڈورس احمد گزشتہ دنوں لاہور میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اُن کو یہاں عیسائیوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جاوید اقبال، صاحبزادی منیرہ اقبال کی پرورش کی تھی۔

صحافی ستار طاہر انتقال کر گئے

ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور کے ایڈیٹر ستار طاہر حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ وہ نماز عید کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور وہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی خالق حقیقی سے جا ملے انھیں اسلام پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ستار طاہر کے سوگواران میں دو تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء)

ازراہ کرم مضمون کی پشت پر نام اور مکمل پتا تحریر کریں

شمیم صبائی متھراوی

گزشتہ سال جُدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ

(۱۹۹۲ء)

(۲۸)

"عالی گہر نور احمد قادری کی تربت"

۱۹۹۲ء

نور احمد قادری بھی دہر سے رخصت ہوئے
جاتے جاتے دے گئے وہ اپنی رحلت کا الم
مصرع تاریخ رحلت ان کا یوں نکلا شمیم
"انتقالِ نور احمد قادری اہلِ قلم"

۱۴۱۲ھ

(ممتاز اہلِ قلم اور علمی شخصیت جناب نور احمد قادری نے ۹ جون ۱۹۹۲ء مطابق ۷ ذی الحج ۱۴۱۲ھ بروز منگل انتقال فرمایا۔)

(۲۹)

"ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی کا ارتحال"

۱۹۹۲ء

روئے گا انھیں برسوں یہ جہانِ سائنس
لیجیے ہوئے رخصت آئی ایچ عثمانی
یوں ملا شمیم ان کا مصرع فنا ہم کو
"کوکبِ رہِ جنت آئی ایچ عثمانی"

۱۴۱۲ھ

(ملک کے ممتاز ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے ۱۷ جون ۱۹۹۲ء مطابق ۱۰ ذی الحج ۱۴۱۲ھ بروز بدھ اسلام میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کا جسدِ خاکی کراچی لایا گیا اور جمعرات کی شام گزری کے قبرستان میں سپردِ لحد کر د

قومی زبان (۸۰) مئی ۱۹۹۳ء

(۳۰)

"تاریخِ وفات جناب عبدالسلام"

۱۹۹۲ء

خبریں پڑھتے تھے جو ٹی وی پر وہ آج
ہو گئے عرش آشیاں عبدالسلام
ان کی تاریخِ فنا لکھ دے شمیم
"حاکمِ ارضِ جناں عبدالسلام"

۱۴۱۲ھ

(ریڈیو اور ٹیلی وژن کے معروف نیوز کاسٹر جناب عبدالسلام ۲ جولائی ۱۹۹۲ء مطابق ۳۰ ذی الحج ۱۴۱۲ھ بر جمعرات بعمر ۵۰ سال اسلام آباد میں ٹریفک کے ایک حادثے کے سبب انتقال فرما گئے۔ مرحوم کو جمعرات کی شـ اُن کے سیکڑوں مداحوں کی موجودگی میں اسلام آباد کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔)

(۳۱)

"دردِ فرقت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر"

۱۹۹۲ء

انتقال سحر کے بارے میں
رنج آگیں اگر خبر ہے، لکھ
بولا ہاتف شمیم سے آکر
"غم فزا رحلتِ سحر ہے" لکھ

۲۰۴۹ بکرمی

(برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر، ادیب اور دانش ور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء مطابق ۲ ساون ۲۰۴۹ بکرمی بروز جمعہ بعمر ۸۴ سال دہلی میں انتقال فرمایا۔)

(۳۲)

"بساطِ ملالِ اجلِ رشید اختر ندوی"

۱۹۹۲ء

چھٹے اُف اختر ندوی بھی ہم سے
گھٹا رنج و محن کی چھا گئی ہے

شمیم اُن کے لیے تاریخِ رحلت
لحد میں اختر ندوی ماں ہے

۱۴۱۳ھ

(ممتاز ادیب، مصنف اور دانشور جناب رشید اختر ندوی نے ۲۱ جولائی ۱۹۹۲ء مطابق ۱۹ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ بروز بعمر ۷۸ سال مَری میں انتقال فرمایا۔ تدفین اسی دن اسلام آباد کے قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۳۳)

"سجاد باقر رضوی جنت نصیب"

۱۹۹۲ء

تربتِ سجاد باقر اے شمیم
جس گھڑی پھولوں کی چادر سے سجی
بولا ہاتف بہر تاریخِ وفات
"تربت سجاد باقر ہے یہی"

۱۴۱۳ھ

(ممتاز شاعر، نقاد، انگریزی اور اردو ادب کے اُستاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے ۱۳ اگست ۱۹۹۲ء مطابق ۱۳ صفر لظفر ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ٦۴ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی تدفین اسی شام لاہور کے قبرستان میں ل میں آئی۔)

(۳۴)

"یادگار انتقالِ پروفیسر ممتاز حسین"

۱۹۹۲ء

اُٹھ گیا ایک ادیب نامی
جب ہوئی رحلتِ ممتاز حسین
ملی تاریخ وفات ان کی شمیم
"ابدی فرقتِ ممتاز حسین

۱۴۱۳ھ

(ممتاز ادیب اور نقاد، پروفیسر سیّد ممتاز حسین نے ۱۵ اگست ۱۹۹۲ء مطابق ۱۵ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۷ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کا جسد خاکی اسی شام سخی حسن قبرستان میں سپرد قبر کر دیا گیا۔)

(۳۵)

"حیف غمِ جدائی بشیر ساربان"

۱۹۹۲ء

چل بسے وہ بشیر بھی جن کو دیارِ پاک سے
لے گئے صدر جانسن اپنا بنا کے میہماں
مصرع سالِ مرگ یوں اُن کا ملا شمیم کو
"تج گئے بزمِ زندگی آج بشیر ساربان"

۱۴۱۳ھ

(سابق امریکی صدر جان سن کے دوست کی حیثیت سے امریکہ کا دورہ کر کے عالمی شہرت حاصل کرنے وا
محمد بشیر ساربان نے ۱۵ اگست ۱۹۹۲ء مطابق ۱۵ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال فرما

(۳۶)

"رحلتِ نیک دل ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی"

۱۹۹۲ء

ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی کیا اُٹھے
اُٹھ گیا بزم جہاں سے اک پرستارِ ادب
از پئے تاریخ رحلت بولا ہاتف یوں شمیم
"ہو کلیم اللہ حسینی داخلِ فردوس اب"

۱۴۱۳ھ

(تاریخ بیہقی کے مصنّف اور جامعہ عثمانیہ کے سابق صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی نے
اگست ۱۹۹۲ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ بروز منگل حیدرآباد دکن میں رحلت فرمائی۔)

(۳۷)

دمِ وفاتِ محترمہ بیگم شریف صاحبہ"

۱۹۹۲ء

قصر گلزارِ جہاں ڈھنے کے بعد
دامنِ راحت میں ہیں بیگم شریف
سال رحلت یوں لکھو اُن کا شمیم
"مجلس جنت میں ہیں بیگم شریف"

(انجمن ترقی اردو پاکستان (خواتین) کی صدر محترمہ بیگم شریف نے ۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ء مطابق ۱۶ ربیع الاول بروز منگل کراچی میں انتقال فرمایا۔)

(۳۸)

سنہِ رحلت مفتی محمد وقار الدین قادری

۱۹۹۲ء

دہر سے آپ جب چلے آئی سروش کی صدا
قصر بہشت پائیے مفتی وقار قادری
آپ کا مصرع فنا مل گیا یوں شمیم کو
کوئے جناں میں آئیے مفتی وقار الدین

۱۴۱۳ھ

(دارالعلوم امجدیہ کے شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد وقار الدین قادری نے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۲ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۸۰ سال کراچی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو دارالعلوم امجدیہ میں علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری کے پہلو میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد لحد کیا گیا۔)

(۳۹)

"یومِ رحلتِ مولانا قاضی احسان الحق"

۱۹۹۲ء

پوچھا جب رضوان جنت سے شمیم
کچھ خبر بھی ہے کہاں احسان ہے
بولا وہ سُنتا ہے حوروں کا کلام
"سامع باغِ جناں احسان ہے"

۱۴۱۳ھ

(شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان کے جانشین، دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار کے مہتمم اور اشاعت توحید و سنّت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاضی احسان الحق نے ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء مطابق ۲۱ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ بروز اتوار بعمر ۵۰ سال راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو پیر کے دن جامع اشاعتِ اسلام اٹک میں اُن کے والد حضرت مولانا غلام اللہ خاں کے پہلو میں سپرد مزار کیا گیا۔)

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

مولانا محمد علی جوہر

جہانگیر عالم، پروفیسر	تصور پاکستان اور مولانا محمد علی جوہر	تہذیب الاخلاق، لاہور، مارچ ۹۲ء، ص ۲۱
حبیب اللہ اوج	مولانا محمد علی جوہر	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۲۳
سعید احمد صدیقی علیگ	مولانا محمد علی جوہر	سالہ کراچی ۹۲ء، ص ۵۱
سید اظہر علی، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر آل انڈیا مسلم لیگ	تہذیب الاخلاق، لاہور، مارچ ۹۲ء، ص ۲۴
عبدالماجد دریاآبادی	اسیر صحافت و سالار سیاست	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۲۸
سید ہاشم رضا	مولانا محمد علی جوہر	[illegible] کراچی، جنوری، فروری ۹۲ء، ص ۵
عشرت رحمانی	رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۷
عیاز انصاری	رئیس الاحرار	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۲۶
محمد احمد شیون	مولانا آزاد اور سرسید	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۳۲
مشرف علی ڈاکٹر	بی اماں کالال - محمد علی جوہر	تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۹۲ء، ص ۹

مولانا حسرت موہانی

ام لؤطارق / راشد عزیز	مولانا حسرت موہانی ایک نظر میں	نگار کراچی، مئی ۹۲ء، ص ۶۰
حبیب اللہ اوج	اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی	تہذیب الاخلاق، لاہور، ۹۲ء، ص ۳۷
رابعہ بیگم	حسرت کی خانگی زندگی	نگار کراچی، مئی ۹۲ء، ص ۱۷
سرور اکبرآبادی ڈاکٹر	مولانا حسرت موہانی	اظہار کراچی، مئی ۹۲ء، ص ۱۳
عزیز قیسی	حسرت موہانی بحیثیت شاعر	اوراق، لاہور، جون، جولائی ۹۲ء، ص ۸ تا
فرحان فتحپوری ڈاکٹر	مولانا حسرت موہانی اور علامہ نیاز فتحپوری	نگار کراچی، مئی ۹۲ء، ص ۲
نورالحسن نقوی پروفیسر	مولانا حسرت موہانی	تہذیب الاخلاق، لاہور، مئی ۹۲ء، ص ۳

مولانا عبیداللہ سندھی

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر	مولانا عبیداللہ سندھی کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج	الولی حیدرآباد، فروری ۹۲ء، ص ۱۸
ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر	ریشمی خطوط سازش کیس کے آئینے میں	الولی حیدرآباد، فروری ۹۲ء، ص ۴۳

ادریس ایل	مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے شاگرد	الولی حیدر آباد فروری ۹۲ء ص ۱۰
اسعد مدنی، مولانا	مولانا عبید اللہ سندھی کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج	الولی حیدر آباد فروری ۹۲ء ص ۴۸

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر	بابائے اردو مولوی عبدالحق..........	تہذیب الاخلاق لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۰
بابائے اردو	سرسید کا مقام	تہذیب الاخلاق لاہور مارچ ۹۲ء ص ۲۰
بابائے اردو مولوی عبدالحق	کچھ اپنے عہد کے بارے میں	قومی زبان کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳
خلیق انجم، ڈاکٹر	مولوی عبدالحق ادبی و لسانی خدمات..........	ہماری زبان دہلی ۱۵ جنوری ۹۲ء ص ۲
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	مقدمات عبدالحق دوسری قسط	ہماری زبان دہلی ۱۵ جنوری ۹۲ء ص ۳
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	مقدمات عبدالحق	ہماری زبان دہلی ۲۲ جنوری ۹۲ء ص ۲

آغا حشر کاشمیری

ابو سعادت جلیلی	حشر کی زندگی کا سفر	سب رس کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۷
معین قریشی	آغا حشر کاشمیری	سب رس کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۲

اختر حسین رائے پوری

شہزاد منظر	سوویت ادب اور اختر حسین رائے پوری	طلوع افکار کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۴
صہبا لکھنوی	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری زندگی شخصیت اور فن.....	طلوع افکار کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۹
محمد رضا کاظمی	اختر حسین رائے پوری	طلوع افکار کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۹
منظر جمیل	ایک عالی دماغ تھا نہ رہا اختر حسین رائے پوری	طلوع افکار مئی جون ۹۲ء ص ۵

صادقین

ابرار کرت پوری	صادقین، عالمی شہرت یافتہ خطاط اور مصور	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۵۴
احمد ندیم قاسمی	صادقین کی انفرادیت	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۱۳
احمد علی ریاض صدیقی	صادقین کا ابتدائی دور	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۵۱
ایم اے حسین	مصور ہندوستان، نام مصور پاکستان	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۴۱
توصیف احمد خاں	دانا گر تے	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۶۸
جاوید صدیقی	صادقین سے بات چیت	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۸۲
حسن جاوید	صادقین کا بہروپ	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۹۲
حسین امجد	صادقین در پردہ راز	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۷۸
حسین انجم	صادقین ایک نظر میں	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۹
خاطر غزنوی	صادقین کی شاعری	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۷۹
زاہدہ حنا	صادقین کا تصویری سماج	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۵۷
سبط حسن	صادقین نقاش کی رباعیاں	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۵۹
ستارہ جعفری	صادقین ور سردار جعفری ایک یاد	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۷۶
سلطان احمد نقوی	پچاس سال	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۷۱
سلمان عباسی، ڈاکٹر	صادقین۔ "جو بند تھا بوتل میں وہ جن بول رہا ہے"	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۲۰
سید ہاشم رضا	ایک عہد ساز شخصیت	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۱۱۸
شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر	صادقین کی رباعیات	طلوع افکار، کراچی صادقین نمبر فروری ۹۲ء ص ۹۸

شیخ عزیز	صادقین آرٹ کا [illegible]	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۶۶
صادقین	رباعیات صادقین [illegible] صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۳
صادقین صدق	ہندوستانی مصوری	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۵
صادقین	مقدمہ رباعیات صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۱۵
صادقین	خود نوشت	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۹
صادقین	سفرنامۂ صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۵
صادقین	مکاتیب صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۱۰
عظیم امروہوی	صادقین بحیثیت رباعی نگار	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۷
علی سردار جعفری	سفیر محبت	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۲
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	صادقین، اردو رباعی کا خیام	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۱۱
فیض احمد فیض	صادقین ایک خطاط، ایک مفکر	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۹
مالک رام	صادقین خطاطی اور غالب	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۳
مجاہد لکھنوی	صادقین اپنے گھر میں	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۶
مجتبیٰ حسین	صادقین میری نظر میں	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۸
محمد علی صدیقی	صادقین یگانۂ روزگار مصور	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۷
محمود الرحمن، ڈاکٹر	صادقین ان کہی کہانی	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۹
مختار زمن	زندۂ جاوید صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۵
مظہر جمیل	صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص [illegible]
منو بھائی	صادقین کی مصوری	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۷
منیر احمد شیخ	صادقین، ایک عجوبۂ روزگار	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۵
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	صادقین شاعر، خطاط، مصور	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۳
نصر اللہ خاں	صادقین	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۷
نور الحسن جعفری	صادقین کچھ یادیں	طلوع افکار، کراچی، صادقین نمبر، فروری ۹۲ء، ص ۱

عصمت چغتائی

افضل توصیف	عصمت چغتائی	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
پطرس بخاری	کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
سرفراز سید	ایک بات اور [illegible] عورت	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
سعادت حسن منٹو	عصمت چغتائی	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
عصمت چغتائی	میری دوست میری دشمن	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
عصمت چغتائی	آپ بیتی	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
عصمت چغتائی	میں کیوں لکھتی ہوں	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
فیروز مکرجی، ڈاکٹر	راہ ساز عصمت	ادب لطیف، لاہور، فروری ۹۲ء، ص ۲۳
فیض احمد فیض	عصمت چغتائی	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
قرۃ العین حیدر / الطاف فاطمہ	ہستی کی متلاشی	ادب لطیف، لاہور، عصمت چغتائی نمبر، دسمبر ۹۱ء
ذکاء الدین شایاں	عصمت چغتائی	فنون، لاہور، ستمبر ۹۰ء، ص ۱۵
راشد انور راشد	عصمت چغتائی کا فن	انشاء، کلکتہ، جنوری ۹۲ء، ص ۹
سالک لکھنوی	عصمت چغتائی	[illegible]، کلکتہ، جون ۹۲ء، ص ۵
عاصم شہنواز شبلی	افسانہ اور عصمت چغتائی کا شعور	[illegible]، کلکتہ، جون ۹۲ء، ص ۲۰
عبدالقوی دریا آبادی	عصمت چغتائی	[illegible]، حیدر آباد، مارچ ۹۲ء، ص ۳۵

مصنف	عنوان	ماخذ
[illegible]	عصمت چغتائی سے انٹرویو	روح ادب، کلکتہ مارچ ۹۲ء ص ۱۳
ہاجرہ مسرور	عصمت چغتائی ایک تاثر	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۲۲

فیض احمد فیض

مصنف	عنوان	ماخذ
ریاض قدیر، پروفیسر	فیض کی پنجابی شاعری	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۰
[illegible] احمد	دامن یوسف، فیض احمد فیض کے خطوط کا مجموعہ......	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۹۳
لدمیلا وسی لیوا، ڈاکٹر	فیض کی ایک نظم کا قصہ	ہماری زبان، دہلی ۲۲ جنوری ۹۲ء ص ۱

احمد ندیم قاسمی

مصنف	عنوان	ماخذ
فتح محمد ملک	ندیم کا تصورِ انسان	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۴۴۳
[illegible] احمد بٹ، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی تعارف	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۴۲۱
[illegible] احمد بٹ، ڈاکٹر	مصاحبہ/احمد ندیم قاسمی	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۴۲۸

پرویز شاہدی

مصنف	عنوان	ماخذ
اختر اورینوی، ڈاکٹر	پرویز شاہدی کی فنکاری	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۱۱
ادیب سہیل	پرویز صاحب ایک جائزہ	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۴۷
ظفر فیروز، پروفیسر	پرویز شاہدی کی شخصیت اور فن	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۵۸
فضیلت پرویز	پرویز شاہدی اپنے گھر میں	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۹۳
محمد ظہیر احسن ڈاکٹر	رباعیات پرویز شاہدی	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۴۲
مسلم شمیم	پرویز شاہدی کا فن اور آدرش	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۶۵
مظہر امام	پرویز صاحب	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۲۷
یونس [illegible]	یادوں کی خوشبو حضرت پرویز شاہدی کی یاد میں	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۲۱

ڈاکٹر وزیر آغا

مصنف	عنوان	ماخذ
انور سدید، ڈاکٹر	چھلک اُٹھی لفظوں کی چھاگل	نردبان، سرگودھا، مئی جون ۹۲ء ص ۳۲
ریاض صدیقی	ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب تنقید اور جدید اردو تنقید سے مکالمے	نردبان، سرگودھا، مئی جون ۹۲ء ص ۴۴
غلام سرور، کرنل	انشائیہ وزیر آغا کی نظروں میں	نردبان، سرگودھا، مئی جون ۹۲ء ص ۵۹
ناصر عباس نیر	وزیر آغا کی نظموں میں ہوا کی علامت	نردبان، مئی جون ۹۲ء ص ۹۱

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

مصنف	عنوان	ماخذ
احسن فاروقی، ڈاکٹر	علی عباس حسینی اور اردو افسانہ نگاری	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۳
احسن فاروقی، ڈاکٹر	جانی صاحب جانسی	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۷
احسن فاروقی، ڈاکٹر	بلس الو اور چمگادڑ	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۱
احسن فاروقی، ڈاکٹر	غیر حاضریاں لگ رہی ہیں	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۶
حسین انجم	ڈاکٹر احسن فاروقی حیات اور تصانیف	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۱
حسین انجم	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، چند واقعات کے حوالے	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۵
شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر	ڈاکٹر احسن فاروقی اور تاریخ ادب انگریزی	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۴۰

مولانا محمد باقر شمس

حسین انجم	سید محمد باقر ایک نظر میں	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵
حسین انجم	خاندان اجتہاد کی ادبی یادگار، مولانا محمد باقر شمس	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۳
ساحر لکھنوی	محقق یگانہ	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۷
سردار نقوی	عظمت زبان و بیان کا علمبردار	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۵
سید محمد تقی	مولانا شمس اور تاریخ لکھنؤ	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۹
محمد باقر شمس، مولانا	تحقیق زبان کا مسئلہ	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۱
محمد باقر شمس مولانا	جوش کا شاعرانہ مرتبہ	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۳۶
نعیم تقوی، ڈاکٹر	مولانا باقر شمس	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۳
وحشی محمود آبادی	علم و ادب کا سنگم باقر شمس	طلوع افکار، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۱

ڈاکٹر جمیل جالبی

اسلم فرخی، ڈاکٹر	ڈاکٹر جمیل جالبی	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ۵۳
انور سدید، ڈاکٹر	ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید	دائرے، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۴۳
نسیم فاطمہ	ڈاکٹر جمیل کی کتابیں	دائرے، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۴
مشفق خواجہ	اردو ادب کی پہلی تاریخ	دائرے، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۰
ممتاز مفتی	ڈاکٹر جمیل جالبی	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۴۵
نصر اللہ خاں	جمیل جالبی	دائرے، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵۹

عزیز حامد مدنی

آصف فرخی	مضامین مدنی	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۱
ظفر سعید سیفی، پروفیسر	مدنی چچا	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۰ء ص ۴۵
عزیز حامد مدنی	آج کی بات	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۰ء ص ۳۱
عزیز حامد مدنی	تو نے کی حسرت عیاں تہذیب رسم عاشقی	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۰ء ص ۳۵

صبا اکبر آبادی

احسن فاروقی، ڈاکٹر	صبا اکبر آبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵۹
احمد ندیم قاسمی	صبا اکبر آبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۷
اسلم فرخی، ڈاکٹر	باتیں صبا صاحب کی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۹
تابش دہلوی	حضرت صبا اکبر آبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۵
جمیل الدین عالی	صبا بھائی کے لیے حرفے چند	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳
جوش ملیح آبادی	صبا اکبر آبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۱۴
احمد رفاعی، ڈاکٹر	صبا لطف بگو	محفل، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۱۹
اسلم فرخی، ڈاکٹر	صبا اکبر آبادی اوراق گل کی روشنی میں	محفل، لاہور سالنامہ جنوری ۹۲ء ص ۳۱
حفیظ جالندھری، ابوالاثر	یہ ہمیں ہیں، صبا اکبر آبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۹
سلیم احمد	شہادت	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵۱
سید عبداللہ، ڈاکٹر	رباعیات خیام (اردو)	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۱
طالب جوہری، علامہ	صبا اکبر آبادی کی مرثیہ نگاری	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵۳

عابد علی خاں۔ ڈاکٹر	غالب اور صبا، ہمکلام	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص
عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر	چراغِ بہار	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص
مجنوں گورکھپوری۔ پروفیسر	صبا اکبر آبادی کا ترجمۂ غالب	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص
محمد علی صدیقی	چراغِ بہار	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص
ممتاز حسین، پروفیسر	صبا اکبر آبادی۔ ایک تاثر	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص

تابش دہلوی

اسلم فرخی۔ ڈاکٹر	نذرِ تابش	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۵
تابش دہلوی	اظہارِ تابش	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۹
سحر انصاری	تابش دہلوی	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۳
نظیر صدیقی۔ پروفیسر	دید باز دید	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۱

جیلانی بانو

جیلانی بانو	مجرم	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۱
حسین انجم	جیلانی بانو، ایک نظر میں	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹
رعنا اقبال	رپورتاژ/جیلانی بانو	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۱
عتیق احمد	جیلانی بانو کے افسانوں کا سرسری مطالعہ	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۲۳
مظہر جمیل	جیلانی بانو سے گفتگو	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۵
مظہر جمیل	جیلانی بانو زندہ پیڑ کی کہانی کار	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۲۳
ممتاز احمد خاں	ایوانِ غزل ایک مطالعہ، جیلانی بانو کا ناول مطبوعہ ۱۹۷۶ء	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۲۷

مجید امجد

محمد امین	مجید امجد کی چند یادیں	ماہ نو لاہور جون ۹۲ء ص ۱۵
ناصر عباس نیر	نظم بھکارن کا تجزیاتی مطالعہ	نردبان، سرگودھا مئی جون ۹۲ء ص.
انور سدید، ڈاکٹر	مجید امجد کی داستانِ محبت	نردبان، سرگودھا مئی جون ۹۲ء ص ۱

فرخندہ لودھی

اصغر ندیم سید	ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم....	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۵۶
انور سدید، ڈاکٹر	فرخندہ لودھی کے چند خوابیدہ خطوط انور سدید کے نام	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۶۳
تسلیم احمد تصور	باتیں فرخندہ لودھی کی	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۶۱
تسلیم احمد تصور	فرخندہ لودھی	تحریریں، لاہور دسمبر ۹۱ء ص ۳۵
رحمان مذنب	فرخندہ لودھی، تعارف	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۴۱
صابر لودھی	میں ہوں اپنی شکست کی آواز	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۵۱
غلام الثقلین نقوی	ایک جان دو قالب	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۴۳
فرخندہ لودھی	آخری موم بتی	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۶۹

رحمان مذنب

انور سدید، ڈاکٹر	پتلی جان اور رحمان مذنب	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۷
انور سدید، ڈاکٹر	رحمان مذنب کے چند خوابیدہ خطوط	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۵

ار سدیدہ، ڈاکٹر	رحمان مذنب سے ایک طویل ملاقات	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۸۰
مان مذنب	کوہاں کی جنت	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۸۹
ر لودھی	رحمان مذنب، قتیل شیوہ آزری	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۶۶
م الثقلین نقوی	پتلی جان، رحمان مذنب کے افسانوں اور مضامین کا مجموعہ	زردبان، سرگودھا مئی جون ۹۲ء ص ۱۴
م الثقلین نقوی	اللہ کا گنہگار بندہ	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۵۵

لیپ سنگھ

ر حنفی، ڈاکٹر	کچھ دلیپ سنگھ کے بارے میں	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۲۰
م عظیم آبادی	گوشے میں قفس کے، دلیپ سنگھ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۱۷
ر نیازی	دلیپ سنگھ کی تبصرہ نگاری	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۲۲

اہ عبداللطیف بھٹائی

ر احمد شاد، ڈاکٹر	شاہ لطیف کے سُر کلیان ایمن کے روحانی رموز	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۲۵
م تقوی، ڈاکٹر	لطیف کے کلام میں تشبیہات و استعارات	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۳۲
م تقوی، ڈاکٹر	شاہ لطیف کے معاصرین	آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۱

حروف تازہ

دھنک کے باقی ماندہ رنگ
(خاکے ۱۹۹۳ء)

ابراؤطارق

صفحات ۱۸۴ قیمت -/۱۰۰ روپے
سیپ پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ کراچی

وادیٔ لیاری
(تاریخ ۱۹۹۲ء)

مدیر و مؤلف حمید ناضر

صفحات ۱۹۲ قیمت -/۲۸۰ روپے
۲۸۱/۱۷ اچنائی گراؤنڈ ملیر کراچی ۷۵۰۵۰

نگار ماہ
(شاعری ۱۹۹۲ء)

افسر ماہ پوری

صفحات ۱۴۴ قیمت -/۶۰ روپے
حامد مطبوعات ایل ۷۲۹، سیکٹر ۵ سی ۲ شمالی کراچی، کراچی ۷۵۸۵۰

فضل احمد کریم فضلی
(شخصیت اور فن ۱۹۹۲ء)

سیّد جاوید اقبال

صفحات ۱۶۴ قیمت -/۶۰ روپے
فلیٹ نمبر ۱۷/۴ جامع کلاتھ مارکیٹ لطیف آباد ۸ حیدر آباد (سندھ)

مقدمۃ الکلام عروض و قافیہ
(عروض ۱۹۹۱ء)

ابوالفہیم پروفیسر خورشید خاور امروہوی

صفحات ۶۵۶ قیمت -/۲۵۰ روپے
بیت الفیاض اے-۸، ۳ بلاک این شمالی ناظم آباد کراچی

ہشت بہشت
(شاعری ۱۹۹۱ء)
ابوالفہیم پروفیسر خورشید خاور امروہوی
صفحات ۳۹۹ قیمت ۱۵۰/۰ روپے
بیت الفیاض اے۔ ۸، ۳ بلاک این شمالی ناظم آباد کراچی

معاونِ تاریخ
(تواریخ ۱۹۹۳ء)
محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی
صفحات ۴۷۵ قیمت ۱۵۰/۰ روپے
۱۰/جی، بلاک نمبر ۲ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی

جوش ملیح آبادی
(تنقیدی جائزہ)
مرتب: خلیق انجم
صفحات ۳۱۱ قیمت ۱۰۰/۰ روپے
انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی (بھارت)

مولانا امتیاز علی عرشی
(ادبی و تحقیقی کارنامے)
پروفیسر نذیر احمد
صفحات ۲۸۰ قیمت ۶۰/۰ روپے
انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی

کڑوی باتیں
۱۹۹۲ء
تنویر کاظمی
صفحات ۱۵۸ قیمت ۱۲۰/۰
روحیل پبلیشرز۔ ۳۶۔ سی عباس ٹاؤن بلاک ۴، اے گلشن اقبال کراچی

تماشا
(۱۹۹۲ء)
صبیح محسن
صفحات ۲۵۲ قیمت ۱۵۰/۰
مکتبہ جمال ایف ۶۷/۳ بلاک ۷ کہکشاں کلفٹن کراچی

غالب
سید آفتاب عالم
صفحات ۶۳ قیمت ۲۰/۰
۳۰۱ شرف آباد کراچی

افسانہ اور علامتی افسانہ
(۱۹۹۳ء)

علی حیدر ملک

صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۰۰/-
شعبہ تصنیف و تالیف وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

اردو واسوخت
(۱۹۹۳ء)

شمیم صہبائی متھراوی

صفحات ۲۰۷ قیمت ۸۰/-
ناشر سیماب اکادمی، پوسٹ بکس نمبر ۲۳۵۷ کراچی

آب و سراب
(۱۹۹۳ء)

جمیل عظیم آبادی

صفحات ۱۶۰ قیمت ۷۵/-
بی ۳۵۲، سیکٹر ۱۱-اے شمالی کراچی، کراچی

یادِ رفتگاں
تیسرا ایڈیشن (۱۹۹۲ء)

مرتب محبت خاں بنگش

صفحات ۶۰۸ قیمت ۱۳۰/-
ادارہ علم و ادب گلا خیل، بہزادی چکر کوٹ کوہاٹ سرحد

کاوشیں
(۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر یونس حسنی

صفحات ۱۴۴ قیمت ۴۵/-
رباب، بہار کیمشنر دہلی کالونی نمبر ۲ کراچی

نئی صورتیں
(۱۹۹۲ء)

وارث اقبال

صفحات ۹۶ قیمت ۴۵/-
سی ۸۲ بلاک ۶ پی ای سی ایچ ایس کراچی

تعل دریا
(۱۹۹۲ء)

محمد فیروز شاہ

صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۰۰/-
عذرا اصغر تجدید اشاعت گھر اسلام آباد

عرفانستان
(۱۹۹۲ء)

حکیم محمد سعید

صفحات ۱۸۲ قیمت ۱۰۰/-
ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد

اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ
(۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات ۳۳۶ قیمت ۱۸۰/-
وکٹری بک بنک لاہور

چراغ آرزو
(۱۹۹۲ء)

سجاد مرزا

صفحات ۹۶ قیمت ۴۰/-
فروغ ادب اکادمی ۱۰۸ سٹیلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

جریدے

"اقبال"

مدیر اعزازی: ڈاکٹر وحید قریشی
صفحات ۲۰۶ قیمت ۶۰/- روپے
بزم اقبال، ۲ کلب روڈ لاہور

ماہنامہ "صریر"

ڈاکٹر فہیم اعظمی
صفحات ۸۸ قیمت ۱۰/- روپے فی شمارہ
سی ۱۴/۲۰ فیڈرل بی ایریا کراچی

"اقدار" شمارہ ۱۱، ۱۲

مدیر شبنم رومانی
صفحات ۲۴۸ قیمت ۳۰/- روپے
مطبوعات اقدار، ۲۰ گمزیلی بلڈنگ صدر کراچی

ارتقا

مرتبہ، حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید
صفحات ۳۵۲ قیمت ۳۰/- روپے
ارتقا مطبوعات ۱۰/اے، ولایت آباد نمبر ۲ منگھوپیر روڈ کراچی ۱۶

فنون
شمارہ ۳۶ (اختر حسین جعفری نمبر)

احمد ندیم قاسمی

صفحات ۱۴۴ قیمت ۴۰/- روپے
۳۹/۶ ملک چیمبرز لوئر مال لاہور

فنون
شمارہ ۳۷

احمد ندیم قاسمی

صفحات ۴۶۴ قیمت ۹۰/- روپے
۳۹/۶ ملک چیمبرز لوئر مال لاہور

جون ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۶

مضمون نما

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام مشاہیر کے خطوط	.....	۵
عکسی تحریریں	....	۱۹
ہندوستانی کا ذکر خیر	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	۳۳
بیاد اختر	حمیدہ اختر حسین	۳۷
رائے پوری کے تبصرے	محمد رضا کاظمی	۴۳
ہم دلی یا ہم زبانی	ڈاکٹر محمد باقر	۵۵
یادوں کا سفر۔ بابا زہین شاہ تاجی	افتخار احمد عدنی	۵۷
ایک قہقہہ انداز کی دریافت	افتخار احمد عدنی	۶۵
۱۹۹۲ء کا افسانوی ادب	ڈاکٹر ممتاز احمد خان	۶۷
گلہائے رنگ رنگ		
زمین کا بوجھ اٹھانے والا بیل	کلونت سنگھ ورک / فرحت سلطانہ	۷۵
نظمیں	ایریش فریڈ / منیر الدین احمد اور رفیق احمد نقش	۸۰
رفتار ادب	ثناء الحق صدیقی	۸۳
گرد و پیش	....	۸۹
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۹۴

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ـــــ ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرون ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال،

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

پاکستان
میں سرمایہ کاری کے وسیع مواقع
اور سرمایہ کاری کے لئے
حبیب بینک
کا خصوصی دستِ تعاون

قومی زبان (۳) جون ۱۹۹۴ء

کسی کا قول ہے کہ "زبان کبھی اتفاق کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی نفاق کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔
فاق کا ذریعہ بننے کا جیتا جاگتا ثبوت تو حصول پاکستان کی تحریک کے دوران کے مہ و سال ہیں جب سارے
صغیر کے مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کی تحریکی سرگرمیاں اردو زبان کے ہار میں پروئی ہوئی تھیں، یہ الفاظ
یگر یہی وہ واحد زبان تھی جو برصغیر میں اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور ملتِ اسلامیانِ ہند کے
طالبات کی توضیح و تشریح کے کام آتی تھی۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، بعد ازاں اس اتحاد و یگانگت کا
زمی نتیجہ ایک نئی مملکت پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ رہی یہ بات کہ زبان نفاق کے لیے بھی استعمال ہو
سکتی ہے تو اس کے اس رُخ کے پنپنے کا اب یہاں اس لیے سوال پیدا نہیں ہوتا کہ پوری پاکستانی قوم نے
۱۹۷۱ء کے آئین میں "اردو" کو قومی زبان تسلیم کر کے نہ صرف اسے آئینی تحفظ فراہم کیا ہے بلکہ وہ دروازہ
بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے جس کی بنیاد پر زبان نفاق کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بلاشبہ پاکستانی
قوم اور اس کے اربابِ حل و عقد کا یہ فیصلہ مدبّرانہ ہے۔

اس فیصلے کے بعد جو اقدام عمل میں آنا ہے وہ یہ کہ ہر سطح پر "قومی زبان" کے نفاذ کو حتمی بنانے کے
لیے اسے حکومت کی ترجیحات میں سرِفہرست رکھا جائے۔ یہاں اس بات کا ذکر موضوعِ بحث سے غیر متعلق
نہیں کہ سویت یونین سے ٹوٹنے کے بعد سنٹرل ایشیا کے نوآزاد مسلم ممالک ازبکستان، تاجکستان وغیرہ میں اب
اس امر کی تیاری ہو رہی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ریاست کی سرکاری زبان روسی کو ازبکی اور تاجکی سے
بدل دیا جائے اور سارے ملک کے انتظامی و انصرامی امور انھیں زبانوں میں نمٹائے جائیں۔

اس کی روشنی میں یہ کتنی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی شے کو تسلیم کر لیا جائے اور اس پر
عمل درآمد نہ ہو، معاملہ لیت و لعل میں پڑا رہے۔ قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں کچھ ایسا ہی رویہ ایک
عرصے سے اپنے ہاں دیکھا جا رہا ہے۔ اردو نہ صرف یہ کہ قومی زبان ہے بلکہ سارے پاکستان میں ایک رابطے کی
زبان بھی ہے اور ہر صوبہ کے دور دراز علاقوں تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہم جتنی جلد اس کو اس کا حقیقی
منصب و مقام عطا کریں گے اُتنی ہی جلد ملکی اتحاد و یگانگت کے قریب تر آئیں گے۔ اب یہ ایک ایسی رسی
ہے جسے مضبوطی سے پکڑے رہنے ہی میں قوم کی ترقی و بقا کا راز مضمر ہے۔

گزشتہ دنوں پاکستان و بھارت کے دو نامور بزرگ ادیب ڈاکٹر محمد باقر لاہور میں اور جناب مالک رام دہلی میں انتقال کر گئے دونوں بزرگوں کی ادب سے وابستگی اور ادبی خدمات کثیر ہیں۔ ادارہ "قومی زبان" ان کے انتقال کو ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے اور اس سانحۂ رحلت پر سوگوار ہے۔

قومی زبان (۴) جون ۱۹۹۳ء

United

PID-1-7/9.2

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام

مشاہیر کے خطوط

۱۷ اپریل ۱۹۳۶ء

بھائی صاحب قبلہ۔ آداب و نیاز
میں آج لاہور سے واپس آیا ہوں۔ غالباً آپ بھی پہنچ گئے ہوں گے۔
لاہور میں بھارتی ساہتیہ پریشد (ALL INDIA LITARARY UNION) کے متعلق آپ سے کچھ گفتگو کا موقع نہ ملا۔ ۲۴، ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہندوستان کی سبھی زبانوں کے ادیبوں کی ایک کانفرنس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہونے جارہی ہے۔ اس کی غرض و غایت منسلکہ مینفسٹو سے واضح ہوگی۔ میں آپ سے التماس کروں گا کہ اس میں آپ ضرور شرکت فرمائیں۔ حالانکہ آپ اس طولانی سفر کے بعد تھکے ہوں گے اور جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس نئے سفر کی زحمت دوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی صلاح اور بیدار مغزی سے پریشد کو اپنا آئیڈیل بنانے میں کامیابی ہوگی۔ مجھے مسٹر کھنیالال منشی نے تاکید کی ہے کہ کسی طرح آپ کو راضی کروں۔ میں نے اور دوستوں کو بھی خطوط لکھے ہیں۔ لیکن آرائش محفل دوسری چیز ہے اور لائحہ عمل کی زینت دوسری۔ آپ کو بھی کسی نظام عمل کے نہ ہونے کی شکایت ہے۔ اور بجا ہے۔ یہ موقع اس قسم کے کوآرڈینیشن کا ہے۔ آپ اگر ۲۴ تک تشریف لائیں تو سارا کام بن جائے۔ میں اردو کی نیابت کروں گا۔ لیکن آپ کی رہنمائی میں۔ اگر کچھ اور اصحاب بھی آنے پر راضی ہو سکیں تو کیا پوچھنا۔

حقیر
(پریم چند)

ضیا منزل
علی گڑھ
۱۷ جولائی ۳۵ء

اختر ہمیشہ متبسم رہو
تمھارا محبت نامہ ملا۔ کتنی مسرت ہوئی اس کا اندازہ تم کیا کر سکتے ہو۔ اچھا ہوا کہ تم نے بہت جلد خط لکھ دیا ورنہ ایک شکستہ خاطر سے انتقام لینا گوارا نہ کیا۔ تمھاری موجودہ مسرتوں اور ایک خوش آئند مستقبل کا حال سن کر جس قدر بھی خوشی ہو سکتی ہے ہوئی۔
یقین کرو اگر تم اس وقت سامنے ہوتے تم سے بغل گیر ہو کر بلکہ یہ کہوں بے اختیار لپٹ کر تمہارے ہونٹوں سے

وہ بیش بہا چیز چرا لیتا جو اُس یادگار رات کو چرالی تھی۔ یاد ہے وہ وادیٔ حسن و موسیقی۔ دیکھو اس ملاقات کی تجدید کب ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

اپنی روداد کیا سنائیں۔ "پرانے بادہ پرستوں کی یادگاروں" کا مرقع ہو کے رہ گیا ہوں۔ یہاں کی تاریک فضا ایک آزاد انسان کے لیے کہاں تک سوہانِ روح اس کا اندازہ بھی خوب ہو چکا ہے۔

میں نے اردو میں ایم اے لے لیا ہے کیا کروں۔ بقول خود کے:

جانتا ہوں فریب ہے سب کچھ
اور پھر بھی فریب کھاتا ہوں

اختر! تمھاری شادی ہو رہی ہے! اور آن کے ساتھ ہو رہی ہے۔ سچ مچ؟ مذاق تو نہیں کر رہے ہو اگر یہ واقعہ ہے تو قبل از وقت میری مبارکباد قبول کرو۔ شادی کرو ضرور کرو اور جتنی جلد ہو سکے کرو۔ "ہجر کا فلسفہ" اپنی تمام لطافتوں کے باوجود یقین کرو ناکام انسانوں کا فریب ہے ایسا فریب جو انسان خود کو دیتا ہے۔ تم نے مجھے سہرے کے لیے لکھا ہے۔ میاں سہرے کیا کیا حیثیت ہے کہو تو تمھارا اور ساتھ ہی ساتھ قبلہ ظفر عمر صاحب مدظلہ کا خاندان کا "شاہنامہ" تصنیف کر کے رکھ دوں۔

بھئی اب تو تم جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو۔ موٹر پر سیر کا کیا لطف جب تک کوئی دشمنِ امان و آگہی دوش بدوش نہ ہو۔ اور بھئی ہم سے ملاؤ گے نا؟ کیوں ہمارا بھی تو کچھ حق ہوگا۔

تم نے مجھے حیدرآباد بلایا ہے۔ اگر کوئی اور بلاتا تو میں جواب میں اپنا یہ شعر کہہ دیتا:

دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی
اس طرح ساز عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

حیدرآباد آنا میرے لیے حج سے کم نہیں ہے۔ تم لوگ تو خیر ہجرت بھی کر گئے ہو خوش رہو اور تمھاری خوشیوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہاں ابھی تو مدتوں بھٹکیں گے منزل دیکھنے والے۔ تم نے اپنی منزل تلاش کر لی۔ تمھارا آتشِ زیر پا والا دور ختم ہو گیا۔ ہمارا ہنوز باقی ہے اور دیکھو کب تک رہتا ہے۔ اور بھئی شاید میری زندگی ہی رہے گی۔

خیر! اپنی بے کسی کا اظہار کر کے تمھاری موجودہ مسرتوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔ سبطِ سے خوب چھنتی ہوگی۔ اب تو اطہر بھی آگئے ہوں گے۔

اپنی انجمن میں کبھی اس آشفتہ سر کو بھی یاد کر لیا کرو۔ شیرینی کا لطف جب ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تلخی بھی برداشت کی جائے۔ ردولی سے میں نے دو خط لکھے۔ ایک طویل خط اطہر کو لکھا تھا دوسرا سبطِ کو تحریر کیا تھا کسی کا جواب نہ ملا ان حضرات کی خدمت میں میرا یہ شعر پڑھ دینا۔ اچھا ہے:

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

نیلی چھتری کے مکیں سے ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ پھر جاؤں گا تو دریافت کر کے تمھاری دریافت طلب بات کا جواب دوں گا۔ خواجہ منظور صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا تھا۔ تمھارا اسلام سب سے کہہ دیا ہے۔ اور سب تم کو پوچھتے تھے۔ اب کے والد بہت ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عنایتوں کا طومار باندھ رکھا ہے حلیم صاحب کی اکڑفوں زوروں پر ہے ان کا بندر اپنے ساتھ ایک اور بھی لایا ہے۔ میں نے اس طرف کچھ نہیں لکھا۔ اگر کوئی معقول چیز لکھی تو روانہ کروں گا۔ رشید صاحب نیل کے لیے اصرار کر رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی کچھ نہ کہہ سکا تمھاری چیزیں دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ تمھارا

(۱۹۰۱ ۰۰ ۰۰)

ضیا منزل علی گڑھ
۶ ستمبر

اختر پیارے

ہمیشہ مسکراتے رہو۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا تمہارا محبت نامہ مع مولوی صاحب کے سرٹیفکٹ کے ملا۔ جس زمانے میں میں علی گڑھ آیا تو ایک ضروری کام سے شملہ چلا گیا تھا واپسی پر تمہارا خط ملا۔ جواب فوراً نہ دینے کی کئی وجوہ ہیں مگر اب ان کا اعادہ بے سود ہے۔ تم نے بھی میرے خط کا جواب کچھ بعد ہی دیا تھا۔ منجملہ اور وجوہات کے ایک یہ بھی تھی کہ سبط کے خط سے معلوم ہوا تھا اور خود تمہارے خط میں ذکر تھا کہ تم آئندہ ہفتے میں اس طرف آ رہے ہو شوکت عمر نے بلایا ہے۔ کل بشیر صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس تمہارا مکتوب آیا ہے اور تم دسمبر میں آ رہے ہو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

معلوم نہیں مجید کے متعلق تم نے اب کیا طے کیا اب جب کہ تم خود ہی آ رہے ہو۔

مولوی صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور شکریہ ادا کر دینا۔

میں ان دنوں بہت مصروف رہا یہاں "اردو ہفتہ" منایا جا رہا تھا مشاعرے بھی ہوئے جگر اور ساغر بھی آئے تھے۔ ساغر کے بعد حاضرین کے پیہم اصرار پر سید بن صاحب صدر مجلس نے مجھے پڑھنے کو کہا۔ پھر اس وقت تک پڑھنا پڑا کہ شل ہو گیا بڑی مشکل سے جان بچی۔ تم بہت یاد آئے۔ تم لوگ ہوتے تو سہارا ہوتا۔ کوفت ہی کوفت رہی۔ اور کہو ان کے خط بھی آتے ہیں؟ اور بھئی اب تو جلدی اس قصہ کو طے کرو۔ میں کل دہلی ہوتا ہوا پھر شملہ جا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کچھ دن اچھے گزر جائیں ورنہ یہاں معاذاللہ۔ ابھی ایک صاحب کا نماز سے انکار کرنے پر "داخل خارج" ہو گیا! ہندوستان ٹائمز میں خوب لے دے مچی اب یہی حال ہے۔ جی چاہتا ہے کسی طرف میں بھی چلا جاؤں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شملہ میں فرید جعفری کے ساتھ قیام رہا۔ ان کو تمہارا پتہ لکھا دیا ہے وہ کسی تجویز پر غور کر رہے تھے شاید تم کو لکھا ہو۔ ساغر سے بہت دیر تک تمہارے متعلق اور اطہر کے متعلق باتیں ہوئیں تم دونوں کا پتہ لکھ لیا ہے۔ ایشیا کا پہلا نمبر میرے پاس ریویو کے لیے بھیجا ہے اپنا افسانہ ہے مجھ سے بھی نظم مانگی ہے۔ تمہیں بھی لکھ رہے ہوں گے۔ مگر تمہارا مضمون پہلے میگزین کے لیے آ جانا چاہیے۔ کب تک بھیج رہے ہو۔ سبط نے لکھنے کا وعدہ کر لیا ہے اور شاید لکھنا شروع کر دیا ہو۔

کل روانہ ہو رہا ہوں۔

تمہارا آشفتہ حال

(مجاز)

ابھی ساغر کا خط آیا ہے لکھتے ہیں کہ ایشیا روانہ کر دیا ہے۔ بہر حال ان کی مدد کرنا چاہیے۔ میرا شملہ کا پتہ یہ ہوگا

C/O

ABDUL HAFEEZ

LYNDHURST W

SIMLA E

INFORMATION
BUREAU
HYDRABAD DECCAN
۲۳-۳-۴۷

محبی۔ السلام علیکم
فروری میں ایک خط آیا تھا، میں بہت بیمار رہا اور ایک بیماری سے نجات پائی تو دوسری بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ میں حیدر آباد کی سرکاری ملازمت میں شریک ہو گیا.... ہو گیا کیا کر لیا گیا۔ اب میں یہاں (DIRECTOR OF INFORMATION) ہوں اور یقین نہیں آتا کہ میری زندگی میں یہ انقلاب بھی ممکن تھا! بہر حال اس انقلاب کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ آخر مارچ میں ایشیائی کانفرنس کے لیے دہلی آنے والا تھا مگر عین وقت تک سارا پروگرام زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔ یہاں (LEGISLATIVE ASSEMBLY) کا اجلاس شروع ہونے والا ہے اور اُس کے لیے میری موجودگی ناگزیر تھی۔ بہر حال آپ نے تو ایشیائی کانفرنس کا عجیب و غریب اجتماع دیکھا ہو گا۔
شمیم صاحب میرے پاس آئے تھے ان کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مستقل ملازمت تو پسند نہیں کرتے اور یہاں ملکی اور غیر ملکی کے جھگڑے کی وجہ سے وہ آسان بھی نہیں۔ لیکن میرے محکمہ میں ترجمہ وغیرہ کا کام باہر کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ میں نے اوروں سے کہا ہے کہ ان کے لیے یہ کام بھیجا جائے گا۔ وہ وعدہ کر گئے ہیں کہ روانگی سے پہلے مجھ سے ملیں گے۔
انشاء اللہ اپریل یا مئی میں آپ سے ملاقات ہو گی۔ حمیدہ کو دعا۔ بہت جھوٹی لڑکی ہے۔ مجھ سے حیدر آباد آنے کے وعدے کیے اور پھر بھول گئی۔
میری بیوی بخیریت ہیں اور آپ کو سلام کہتی ہیں۔

والسلام
(محمد عبد الغفار)

HYDERABAD
DECCAN
۲۴ اکتوبر

محبی۔ تسلیم
بھائی مجھے بھی بہت افسوس رہا کہ دہلی میں تم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن دو دن سے زیادہ ٹھہر نہ سکا اور کچھ ایسے چکر میں پھنسا رہا کہ تمھاری تلاش میں نہ نکل سکا۔
علی گڑھ میں حمیدہ بھی تھیں، اُس نے دسمبر میں آنے اور تمھیں ساتھ لانے کا وعدہ کیا ہے۔ میں پریم چند سوسائٹی سے لیکچر کی تاریخ کا تعین کرا کے تمھیں جلد اطلاع دوں گا۔ راج گوپال صاحب دہلی جا کر کسی خانگی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لیے غالباً نہ مل سکے ہوں گے۔ بہر حال اب عنقریب اس معاملہ کا فیصلہ کرا کے اطلاع دیتا ہوں۔

آج ہی حمیدہ کو بھی خط لکھا ہے۔ تم دونوں کے آنے اور چند روز میرے پاس ٹھہرنے کا بہت شوق سے انتظار ہے۔

احقر
(محمد عبدالغفار)

جامعہ عثمانیہ
یکم/دسمبر ۴۵ء

بھائی اختر۔ تسلیم

دو نظمیں بھیج رہا ہوں۔ انتخاب آپ فرمالیں۔ ایک ہفتہ کے لیے میں ہوسٹل سے باہر رہوں گا۔ واپس آنے کے بعد میں آپ سے ملوں گا۔

آپ کا مخلص
(مخدوم محی الدین)

لمحہ رخصت

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل بانہوں کی بے تاب تمنا پا ہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کا حیا سے جھک جانا
اک شوقِ ہم آغوشی پنہاں اُن نیچی بھیگی پلکوں میں
شانوں پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زلیخائی
انداز تغافل تیور سے رسوائی کا ساماں آنکھوں میں
فرقت کی بھیانک راتوں کا رنگین تصور میں آنا
افشائے حقیقت کے ڈر سے ہنس دینے کی کوشش ہونٹوں میں
آنسو کا ڈھلک کر رہ جانا خوں گشتہ دلوں کا نذرانہ
تکمیل وفا کا افسانہ کہہ جانا آنکھوں آنکھوں میں

سجدہ

شب تاریک ہے خموشی ہے
کل جہاں محوِ عیش کوشی ہے
لطف سجدوں میں آ رہا ہے مجھے

چھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے

چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز اُس کی باتوں کی

اڑ رہا ہے غبار نورِ بدن
پھیلتی جا رہی ہے بوئے چمن

موج تسنیم و کیف خلد بریں
جگمگاتا بدن چمکتی جبیں

اپنی آنچل میں منہ چھپائے ہوئے
آ رہا ہے قدم بڑھائے ہوئے

نغمے پازیب کے سناتے ہوئے
بخت خفتہ مرے جگاتے ہوئے

عشوہ و ناز کا فسوں لے کر
ساتھ اک لشکر جنوں لے کر

دور سے مسکراتا آتا ہے
بجلیاں سی گراتا آتا ہے

وہ کہ رنگیں کرن تبسم کی
اک مسلسل لڑی ترنم کی

پردۂ تن میں راگ پوشیدہ
راگ وہ جس میں آگ پوشیدہ

بانسری بھی بجائے جاتا ہے
آگ تن میں لگائے جاتا ہے

ایک دنیائے رنگ و بو بن کر
خون شدہ دل کی آرزو بن کر

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر
اُس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

(مخدوم محی الدّین) بی۔اے (عثمانیہ) حیدرآباد

کراچی: ۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء

جگر نواز

غالباً آپ کے علم میں ہے کہ مجھے آپ سے صحیح معنوں میں تعلق خاطر ہے اور اسی بنا پر ایک خاص اعتماد بھی۔ اس لیے زیادہ لکھنا نہ صرف یہ کہ بیکار سمجھتا ہوں بلکہ محبت واعتماد کی ہلکی سی توہین بھی۔

محبی مرزا جالب صاحب کو آپ سے ملا چکا ہوں، میں نے اُن کے حالات بیان کرنے میں کوتاہی کی ہو تو کی ہو، مبالغہ مطلق نہیں کیا اور نہ بیان سے مجھے کوئی مناسبت ہے۔ بہرحال یہ اب آپ کے سپرد ہیں، میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ وہ گاہے گاہے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہا کریں لیکن اس طرح کہ مجرم تقاضا نہ بن سکیں۔

آپ سے بہت ہی بے تکلفانہ طور پر ملنے کے اکثر اوقات جی چاہتا ہے، اور یہ بات بہت کم انسانوں کے لیے ہی مہیا ہوتی ہے۔ میں پابہ رکاب کوشش کروں گا کہ روانگی سے قبل ایک بار اور ملاقات ہو جائے اس وقت "دل دماغ" نہ صرف یہ کہ غیر حاضر ہے بلکہ سخت مکدر بھی، اس لیے یہیں سے رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ۔

(جگر مراد آبادی)

الہ آباد ۶ مارچ

ڈیئر اختر۔ سلام نیاز

خط ملا، اتفاق یہ کہ میں ۳، ۴ دن سے بخار میں مبتلا ہوں یعنی یہ کہ مشرح طور پر جواب دینے سے معذور ہوں۔ تم نے بعض ضروری باتیں لکھی ہی جن میں ایک غیر ترقی پسند لوگوں کا انجمن میں شریک کرنا ہے۔ مولانا بھی اپنے خط میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ بھائی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مہمل لوگوں کو علیٰحدہ کرنے کا صرف ایک علاج یہ ہے کہ باضابطہ کام شروع کیا جائے۔ علمی تحریکوں میں اس کی اور بھی ضرورت ہے اس لیے کہ جب تک زبانی جمع خرچ اور محض دعوے کا سوال ہے ہر اہلِ علم شریک ہو جانا چاہتا ہے مثلاً یہاں پہلے جلسہ کی رونق کے لیے وہ دقیانوسی جمع ہوئے کہ کیا پوچھتے ہو۔ دوسرے جلسہ میں ان کی تعداد جتنی کم ہوئی تقریباً اتنے ہی واقعی ترقی پسند نوجوان رہ گئے۔ یہ کوئی سیاسی انجمن تو ہے نہیں کہ پہلے ہی دن تفریق کی جا سکے۔ اس کی صورت تو یہی ہے کہ ہم لوگ جو بزعم خود ترقی پسند ہیں اس میں آگے بڑھ کر حصہ لیں اور بڑھتے ہوئے ترقی پسند رجحانات کو متشکل کر سکیں۔ تو خود دیکھیں........

رہا علی گڑھ کا قصہ وہاں جناب کو علم ہے کہ ہمارے آپ کے کارناموں کی بدولت اب ڈاکٹر ضیاالدین کی راج دھانی ہے یعنی اگر کسی نوجوان یا کسی ترقی پسند کو قریب لانا ہے تو عمداً چند مہمل لوگوں کو ساتھ لینا پڑے گا۔ جس طرح ہم بااصولوں نے علی گڑھ میں رہ کر کام کیا۔ شاید ہی وہ طریقہ آئندہ ممکن اور مفید ہو۔ پنجاب کا مجھے علم نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ تاثیر اور محمود اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہاں غلط قسم کے لوگ ہم سے بے جا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

بھائی یہ سنجیدہ گفتار تھی۔ یہ تجویز ہے اور مشورے سر آنکھوں پر لیکن خود اس میں حصہ لے کر زیادہ بہتر نمونہ کیوں نہیں پیش کرتے بالخصوص ایسی صورت میں کہ تم یہ خیال بہت پہلے اپنے مضمون میں پیش کر چکے ہو۔ بسا اوقات غیر معمولی ذہنی تشدد کام نہ کرنے کا بھی بہانہ ہو جاتا ہے اس لیے دونوں باتیں ساتھ ساتھ چلنی چاہئیں۔ ہمیں ضرورت اس کی ہے کہ انجمن کے اصلی کام کرنے والے اپنے نظری خیالات کے اعتبار سے بڑے کامل اور صحیح ہوں لیکن اس کے ساتھ ہر تغیر پسند رجحان کو ساتھ لے کر چل سکیں۔ حقیقتاً یہ تحریکیں کامیاب صرف اس وقت ہوں گی جب کوئی عوام میں سیاسی تحریک شروع ہوگی۔ کام کرنے والے ہی ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو سیاسیات سے قریب ہوں۔ یہ میرا ذاتی عقیدہ ہے دوسروں کی ترجمانی نہیں کر رہا ہوں۔

میں خود کوئی علمی آدمی نہیں ہوں۔ نہ فنون لطیفہ سے مجھے کوئی رغبت ہے البتہ اپنے نام نہاد تعلیم کا خمیازہ ایسی تحریکوں میں حصہ لے کر نکالنا چاہتا ہوں۔ تم نے جو میرے مضمون کے متعلق تنقید کی وہ زیادہ مشرح ہوتی تو اچھا تھا۔ میرا ایمان دو باتوں پہ ہے جو میں پیش کرنا چاہتا تھا اول یہ کہ کلچر اور ادب خالصتاً جماعتی مفہوم ہے، دوسرے یہ کہ ادب عملی ضرورت سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہ خیال کہاں تک واضح ہوا بہرحال میں اس کا زیادہ اہل نہیں ہوں کہ ادبی تحریکوں پر تنقید کروں۔ اس سے زیادہ حماقت یہ تھی کہ "سہیل" میں شائع کیا۔

ہم اپریل میں ایک کانفرنس کانگریس کے ساتھ ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں بہت سے لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں مقصد یہ ہے کہ ترقی پسندی کے مفہوم کو واضح کریں۔ مصنفین کے فرائض کے متعلق گفت و شنید رہے اور مختلف زبانوں کے لکھنے والے ایک دوسرے سے قریب آئیں۔ اگر ایک مضمون ہندی یا بنگالی یا خود اردو کے لکھنے والوں کے متعلق لکھو اور اس میں مختلف غیر ترقی پسند رجحانات اور صحیح ترقی پسندی میں امتیاز کر کے دکھا دو اس کے علاوہ کچھ نظری بحث بھی ہو تو یہ بڑا کام ہو۔ مضمون انگریزی میں اگر ہو تو اچھا ہے تاکہ سب لوگ سمجھ سکیں اور باہر بھی شائع کرایا جا سکے۔

بہرحال کوئی صورت متعین کر کے باہمی اشتراک کی کوئی صورت ہونی چاہیے چند آدمیوں کے بھروسہ پر یہ کام شروع کیا گیا ہے اور اگر یہ لوگ بھی مدد نہ کریں تو ظاہر ہے کہ اس انجمن کا چلانا مشکل ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم مولانا کے ساتھ الہ آباد آ رہے ہو اور اس موقع پر گفتگو ہوگی۔ اب کیا صورت ہو اس لیے کہ خط کتابت سے کبھی کوئی بات طے نہیں ہوا کرتی۔ میں اپریل میں اورنگ آباد آنا چاہتا ہوں اور جولائی میں واپس۔ سبطے سے کہہ دینا کہ نامہ نگار خصوصی لکھنؤ کانگریس کی کارروائیوں پر باضابطہ "پیام" کے لیے مضمون لکھے گا۔ یہی شکریہ کی صورت ہو سکتی ہے۔ ۱۵ مارچ تک سند نامہ لکھنؤ پہنچ جانا چاہیے۔ حمیدہ (۱) کو پیار

بہی شکریہ

(اشرف)(۲)

---

(۱) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی بیگم
(۲) ڈاکٹر کنور محمد اشرف: مارکسٹ مؤرخ

قومی زبان (۱۳) جون ۱۹۹۳ء

نادر علی بلڈنگس شاہراہ اعظم۔ میرٹھ
۵ جولائی ۱۹۴۲ء

پیارے اختر!

میں آج ہی جوابی تار دینے والا تھا کہ آخر آپ کے استعفیٰ کا کیا ہوا!؟ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے آپ کے خلاف ہوا ہے۔ بخاری اور ان کے گینگ سے مجھے خدشہ تھا کہ وہ آپ کی روحِ خودداری اور ذہین انسانوں کی سی باغیانہ ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر، ریڈیو ڈیپارٹمنٹ سے علیٰحدہ ہو جانے کا امکان پیدا کر دیں گے۔ سو وہی ہوا۔ خیر آپ کی طرح جو خوددار ہوتا ہے وہ مضبوط بھی ہوتا ہے۔ اور مضبوط آدمی دنیا سے لڑ سکتا ہے خواہ اس کے شانے شل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ میری سچی دوستی آپ کے لیے ہے۔ گو یہ کسی کام کی نہیں، مگر کسی حالت میں آپ سے منافق نہیں ہوگی۔ اور ہم مل جل کر دنیا کا مقابلہ کریں گے۔

میری مختصر کہانی یہ ہے کہ بنیادی غلطی مجھ سے "اسلام ہاؤس" میں ٹھہر کر ہوئی۔ میرے میزبان ہر لحاظ سے ۵ برس پہلے کے انسان نہیں۔ میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہے ہیں۔ مگر میرے کاز میں کوئی دلچسی نہیں لیتے۔ حالانکہ وہ ایشیا کی انفرادی خریداری اور وظیفہ وغیرہ کی سعی میں امداد کر سکتے ہیں۔ میں نے زبان میں تالا ڈال لیا ہے، مگر وہ شاید بھانپ گئے ہیں کہ میں کس ڈھب کا آدمی ہوں اور میرے مقاصد کیا ہیں!؟ نواب چھتاری اور دوسرے لوگوں سے ان کے روابط نہیں، مگر وہ کچھ نہیں کرتے۔ لیکن ان کے کچھ نہ کرنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں۔ سیّد عبدالعزیز ابھی تک گرم اور شاداب ہیں۔ اور انھوں نے بنیادی اقدامات شروع کر دیے ہیں۔ وزارتِ عظمیٰ ابھی وقت نواب علی یاور جنگ بہادر کے ہاتھ میں ہے۔ اور کونسل عبدالعزیز صاحب کے ہاتھ میں یہاں تک کہ نظام دکن بھی۔ نواب چھتاری اور عزیز صاحب میں پوشیدہ کشمکش ہے۔ مگر نواب صاحب ان کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ نہ ان کی نہ نواب علی یاور جنگ بہادر کی۔ عزیز صاحب نے علی سے میری نسبت بلا کر کہا، انھوں نے مجھے بلایا، میں نے ایک نوٹ مرکز کے متعلق لکھ کر دیا، اور تمام کتابیں وغیرہ بھی پیش کر دیں۔ انھوں نے دفتری طور پر مجھے رائے دی کہ میں صدر اعظم بہادر کو درخواست دوں۔ چنانچہ میں نے درخواست بھی دے دی اور اس کا تمام پس منظر ان کے سیکریٹری کو سمجھا دیا۔ وہ درخواست انھوں نے علی یاور جنگ بہادر کو منتقل کر دی۔ اس کے متعلق مجھے جواب بھی مل گیا۔

نواب چھتاری، علی یاور جنگ، غلام محمد یہ سب لوگ ۱۵ جولائی تک کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ۱۵ کے بعد تصفیہ ہوگا۔ متعلقہ اصحاب نے مجھے روک لیا ہے کہ یہاں پیروی کیے بغیر کام نہیں نکلتا۔ اس ماہ اور رہیے۔ غلام محمد صاحب سے مل کر سادگی سے میں نے تمام مقاصد کہہ دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زاہد صاحب نے دہلی سے ان کو خط لکھ دیا ہے (ان کے علم میں میرا مقصد تھا) انھوں نے بھی وعدہ تو کیا ہے۔ کونسل میں ۷ ممبر ہیں۔ ان سب کی رائے لی جائے گی۔ درخواست گشت کرے گی۔ اور اس کے پیچھے میں۔ نواب چھتاری، غلام محمد اور عبدالعزیز صاحب استوار ہیں۔ باقی ۴ ممبروں سے کہنے اور ملانے کے متعلق مسز نائیڈو نے وعدہ کیا ہے۔

قومی زبان (۱۴) جون ۱۹۹۳ء

مسز سروجنی نائیڈو کا سلوک میرے ساتھ بالکل ایسا ہے جیسے بیٹوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے معززین کو کئی بار اپنے مکان پر دعوت دے چکی ہیں۔ اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایسی والہانہ باتیں کرتی ہیں، کہ مجھے ندامت ہوتی ہے۔ ایشیا کی انفرادی خریداری میں بھی انھوں نے حصّہ لیا ہے۔ اور نظام کو براہ راست درخواست دینے کے لیے نواب کاظم یار جنگ بہادر سے انھوں نے بڑی کوشش کی ہے۔ کل ان سے ملاقات ہوگی۔ اور براہ راست "اعلیٰ حضرت" کو بھی درخواست دی جائے گی۔

یہ تمام کوششیں جاری ہیں مگر جب تک کچھ نہ ہو جائے، کوئی نوید آپ کو نہیں سنا سکتا۔ نواب کاظم یار جنگ نظام کے چیف سیکریٹری ہیں۔ اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

پیٹرول راشننگ کی وجہ سے میزبان کی موٹر استعمال نہیں کر سکتا، تانگہ پر اس وسیع و عریض دیس میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ سر پر تفکر کا بوجھ، دل میں لطیف احساسات کا ہجوم، روح میں ایک اباڑ آوسر، قدم قدم پر شعر خوانی، کیسے معلوم کہ کن طوفانوں میں زندگی کی ناؤ ڈانوں ڈول ہے۔ مگر وقت کا مطالبہ ہے کہ تازہ و شاداب متبسم بلکہ کھنک دار آواز، حاضر دماغ اور کھلے دل سے۔ گوشت پوست کے ڈھیروں کے سامنے اپنی شخصیت کی نمائش کرو، اور واپس آکر تنہا کمرے میں منہ پھاڑتی ہوئی روشنی اور تپکتی ہوئی تاریکی میں دفن ہو جاؤ.... لیکن بہرحال۔ یہی واقعات ہیں، اور فی الحال ان سے مفر نہیں، مصیبت کا مقابلہ جیسا اس مرتبہ کرنا پڑا ہے کبھی نہ کرنا پڑا تھا۔ تمام ڈنر، تمام ٹی پارٹیز اور تمام مشاعرے، ان نفسیات کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ کبھی احساسات دب بھی جاتے ہیں۔ اس وقت دنیا اور انسان پر خوب ہنستا ہوں۔...... اپنی سی ہر کوشش کر رہا ہوں، آپ کے خط کے بعد ایک لمحہ بھی غفلت نہیں کروں گا، متعلقہ اصحاب کہتے ہیں کہ آپ کے معاملے کے متعلق کارروائی بالکل صحیح ہو رہی ہے۔ عزیز صاحب نے اپنی زبان سے ابھی مجبوری و مایوسی کا اظہار نہیں کیا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بیچارے آج کل بیمار ہیں۔

راولپنڈی کے صاحب کو میں نے آپ کے نام خط لکھ دیا ہے وہ اس خط کو لے کر آپ سے ملیں گے۔ دہلی آنے والے ہیں۔ ان امور کے متعلق آپ مجھے لکھتے رہیے۔

ہلکی سی مایوسی آپ کے خط سے جھلک رہی ہے۔ یہ زہر ہے۔ اسے پاس نہ آنے دیجیے۔ میں محض اس لیے بدر آباد میں ذلتیں برداشت کر رہا ہوں کہ ان لٹیروں کو دم کر کے آئے بغیر طاقت کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی، اور بغیر طاقت کے ہم انسانوں کے لیے کچھ نہ کر سکیں گے۔

میری نوعیت بالکل مزدور کی سی ہے۔ مگر میں مایوس نہیں ہوتا۔ آپ کیوں مایوس ہوں آپ تو ان مسائل کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ برے دن نہیں آئیں گے۔ ہم اپنی طاقت سے برے دنوں کو اچھے دنوں میں تبدیل کر دیں گے۔ ذمہ داریوں اور فرائض کو بھی ادا کریں گے۔ اور مزید ذمہ داریوں کو بڑھائیں گے۔ میں ہرنی صاحب سے ایک بار ملا۔ آج مجھے اس خط کے بعد ریڈیو پر براڈکاسٹ کرنے جانا ہے اس لیے نہیں جا سکوں گا۔ مگر کل ضرور جاؤں گا، اور پرسوں آپ کو خط لکھوں گا۔ قاضی عبدالغفار صاحب سے بھی مشورہ کر لوں گا۔ میں اس کام کو کل ضرور کروں گا۔

حمیدہ بیگم کو میرا سلام۔ اور کامران میرٹھ سے آجائیں تو میرا پیار کہیے۔ اور بالکل نہ گھبرائیے۔ آپ اک شخصیت ہیں اور اُس شخصیت کی ہر جگہ قیمت ہے۔ اور ہر وقت قیمت ہے۔

بابا سے ملا تھا۔ خط لکھا ہوگا آپ کو۔ مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

آپ کا
(ساغر نظامی)

کینڈی
۲۷ اکتوبر ۶۴ء

ہمزاد۔ سلام و محبت

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوق کو شاعر سمجھنے کی سنجیدہ حماقت تو کبھی بھی نہیں کی مگر آج تمہیں لکھتے وقت ان کا ایک شعر جانے کیوں یاد آگیا:

گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ دخانی میں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اب وقت کی سوئیاں بہت تیز چل رہی ہیں یا بقول اقبال:

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

اور ہمزادِ بے بسی کا عالم یہ ہے کہ آئینہ کی طرح صرف دیکھنے کی اجازت ہے پتہ نہیں یہ انسانی زندگی سراسر فریب ہے۔ مایا ہے۔ ہے۔ یا درحقیقت کچھ بھی نہیں ہے بلکہ ہمارے اضافی اعتبارات نے یہ بے معنی خطوط کھینچ ڈالے ہیں، بھول بھلیاں بنا ڈالی ہیں۔ اب زندگی کی اس منزل پر دیکھتا ہوں کہ وقت بھاگا جا رہا ہے یا یوں کہہ لو کہ لوگ خود بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں۔ خیر یونہی سہی۔

"نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے"

(غالب)

پچھلے پہر جب روانہ ہوا تو مخمور شبانہ کا عالم تھا، نیچے کراچی جھلملاتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا اور اوپر تارے بکھرے ہوئے تھے، میں آرام دہ نشست پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اب کی بار کراچی نے دل کیوں موہ لیا؟ بزم آرائیاں تو تمہارے دم سے پہلے بھی کیا کرتے تھے، عشرتناک راتیں طلوع سحر سے جا ملتی تھیں مگر ان رنگ رلیوں کے باوجود کلفت کے دھوئیں میں خود کو لپٹا ہوا سا پایا تھا پھر نفسیاتی تجزیہ نے تمہارے جملوں کو تازہ کر دیا یعنی یہ کہ اب درباریوں سے نکل کر آزادانہ زندگی جیسی بھی ہے بسر کر رہا ہوں۔ پاکستان کا دفتری نظام شاید کچھ ہی بہتر ہو مگر ایک بات خوش آئند یہ نظر آئی کہ باوجود سیاسی قلابازیوں کے ملک میں ایک صحت بخش سلطنت کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ صنعت و حرفت کی حیرت انگیز ترقیوں کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ کراچی،

کے علاوہ لاہور میں بھی اردو کا زور دیکھا یہ چیز اس اعتبار سے زیادہ اہم یوں ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو نہیں بلکہ انگریزی ہے۔

ایک رات تمھارے ہاں سے جھومتا ہوا ابن انشا کے ساتھ چلا اور جب تمھاری کاران کی منزل تک پہنچی تو پڑوس میں قوالی کی مجلس گرم تھی روحانی فیض کی ارزانی تھی کیوں کہ پیر مجلس عالم کیف میں سرمست تھے، انشا کے باضابطہ تعارف نے مجھے مقدس پیر سے ہم بغل کر دیا اور جب قوال نے جامی کی ایک غزل شروع کی تو میں سر دھننے لگا اب اسے تمہاری مجلس کا فیض کہوں یا پیر کی کرامات سے منسوب کروں، مگر یار وہ بھی ایک رات تھی شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی۔

آج اطلاع ملی ہے کہ انشا کی عطا کردہ کتابوں کا پارسل کولمبو پہنچ گیا ہے چند دنوں بعد اردو کی کتابیں ہماری میز پر ہوں گی۔ سنگھالی ماحول میں اردو تعداد نہیں بلکہ سونے پر سہاگہ ہے یہ!

اطہر کو بوحدتِ مضمون سلام

ہانی حمیدہ بیگم کو سلام عرض کرتی ہیں۔

تمہارا

(ہمزاد (۱))

(۱) (اصل نام -: ایس اے امام، یونیورسٹی آف سیلون سے تعلق)

کراچی

۲۱/۶/۷۰

مشفی سلام مسنون

بہت شرمندہ ہوں کہ شمیم (۱) صاحب کے انتقال پر آپ کو تعزیت کا خط بروقت نہ لکھ پایا۔ مرحوم سے مجھے ارادتِ قدیمی تھی اور وہ بھی میرے حال پر شفقت رکھتے تھے پھر آپ سے میرا دلی واسطہ لہٰذا اس سانحے پر بہت صدمہ ہوا۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ پرانی تہذیب اور وضعداری کی نشانی اور پرانی یادوں کے سرمایہ دار تھے۔ ایک خاص انداز میں زندگی گزار دی۔

خط لکھنے میں وجہ تاخیر جو پریشانیاں تھیں ان میں ایک یہ کہ وزارت تعلیم میں پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ صوبے بنے اور منظور الٰہی صاحب کو جو آگے بیٹھے بھی نہ تھے۔ سندھ کا چیف سیکریٹری بنا دیا گیا۔ ان کی گدّی کسے ملے گی ... کسی کو ابھی تک معلوم نہیں۔ قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ اب وہ بھی نہیں ہوتیں۔ عجب نہیں کہ اپنے بنگالی بھائی برہان الدّین احمد صاحب ہی جو جوائنٹ سیکریٹری سے ایڈیشنل سیکریٹری ہو گئے ہیں اس گنبد پر نوبت بجاتے رہیں۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔ ایک تعلیمی پالیسی نور خاں کی تھی جس میں کم از کم یہ تھا کہ مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا واضح اعلان تھا۔ اب نئے آنے والوں نے عمارتِ نو ساخت کی

قومی زبان (۱۷) جون ۱۹۹۳ء

ہے۔ اب کمیشن بیٹھے گا جو پھر سے مقامی زبانوں کی صلاحیتوں پر حکم لگائے گا اور انگریزی کے جانے نہ جانے کا اِذن دے گا..... یہ باتیں تو خیر اونچی ہیں۔ بک سینٹر کی طرف توجہ کرنے کا وقت منظور الٰہی صاحب کو بھی ملا یہی سوچتے رہے کہ کیا جلدی ہے؟ پہلے بورڈ کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ نئے کی نامزدگی کی فائل مدت سے منسٹری میں پڑی ہے۔ حسینی چھ مہینے بیمار اور اسپتال میں داخل رہے۔ ان کے نعم البدل کو نہ کچھ معلوم تھا نہ انھوں نے فائل آگے کھسکائی نہ نئے۔ AEA اور DEA آرہے ہیں۔ پرانے سلیکشن آفیسر بد دل ہو رہے ہیں اور آخر میں ایک کلہاڑا جو ہم پر گرا اور خاص وجہ پریشانی کی اور میرے خط لکھنے کی۔ ہوا یوں کہ فنانشل ایڈوائزر نے ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر کے نوٹ پر (جو اس لیے مخالفانہ تھا کہ ان کے ایک عزیز کو آدم جی انعام دلانے میں ہم مدد نہیں کر سکتے تھے) لکھ دیا کہ اس محکمے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اسے ۳۰ جون ۱۹۷۰ء سے ختم کر دیا جائے۔

داد فریاد کس سے ہو؟ منظور الٰہی چارج چھوڑ بیٹھے تھے، برہان الدین صاحب سے نہ معرفت تھی اور نہ ابھی تک کوئی تعلق۔ انھوں نے FA کی بات پر صاد بھی کر دیا تھا۔ مجھے اسلام آباد جا کر کیا کھکھیڑیں اٹھانی پڑیں اور کیسے FA کا فیصلہ انھی کے قلم سے بدلوایا۔ یہ الگ داستان ہے۔ تین دفتروں کا عملہ فعلہ، مکان، ٹیلی فون، اسٹیشنری، کلرک ولرک...... ہمارا کام اب دو لاکھ میں نہ ہوتا تھا۔ ہم نے گرانٹ میں اضافے کی اپیل کی تھی چوبے گئے تھے چھبے بننے... اُلٹے دوبے رہ گئے... بلکہ دوبے بھی نہ رہتے اگر سعی نہ کرتے۔

وطن عزیز کا عجب حال ہے اور اب تو اخباروں کی بھی ہڑتال ہے۔ یوں بھی سنا تھا اس بیچ میں "جنگ" کا تہران جانا بند ہو گیا تھا۔ دیکھیے یہ ہڑتال کب تک چلے۔ کہیں فوبیا نہ جانے کیوں کہ یمین و یسار کی کشمکش زوروں پر ہے۔ اے کاش آپ کا سا STRATEGIST یہاں ہوتا۔ سیّد امتیاز علی تاج کے قتل ہونے کی خبر آپ نے سُن لی ہوگی۔ مارنے والے دو نقاب پوش جورات کی تاریکی میں آئے تھے کون تھے؟ یہ تو تفتیش پر ہی پتہ چلے گا۔ بچاری حجاب بھی زخمی ہوئیں۔ اسپتال میں ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں جائداد کا تنازعہ تھا۔ بے شک وہ بھی تھا۔ تاج صاحب اپنی جائیداد کا تنہا وارث اپنی اکلوتی بیٹی کو بنانا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے اخباروں میں اعلان کر دیا تھا کہ شیعہ ہو گیا ہوں۔ بہر حال بہت ہی بھلے آدمی تھے۔ سازشوں سے دور اور مجلس ترقی ادب میں بیٹھ کر اتنے کام کر گئے کہ کسی اور ادارے نے نہیں کیا۔ تازہ کارنامہ ان کا اردو کے پرانے ڈراموں کے متون کی تدوین و اشاعت تھی۔ اس کے بارہ مجلّدات ہونے تھے۔ آدھے ان میں چھپ بھی چکے اگرچہ منظرِ عام پر نہیں آئے۔ حق مغفرت کرے۔ موت برحق ہے لیکن ایسی موت؟

اور کیا عرض کروں۔ وہی پرانی بات لکھتا ہوں کہ اب آپ کو روزانہ چار چھ گھنٹے کا کام شروع کرنا چاہیے۔ ڈائری، یادداشتیں، تنقیدیں۔ بر آر آنچہ درونِ سینہ داری۔ کتابیں یہاں چھپتی رہتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی والوں نے غالب کی کتابیں چھاپی ہیں اور دیوان کا ایک ایڈیشن بھی مرتبہ حامد علی خاں خوب صاف چھپا ہے اور ہمارے ہاں کا انعام اسے ملا ہے۔ آئینہ ادب پبلیشرز نے سریامین کی ضخیم ڈائری کہ چودھری خلیق الزماں کی کتاب کا جواب ہے شائع کی۔ عاشق حسین بٹالوی کی یادیں اور تاثرات۔ اکبر کے دین الٰہی پر ایک کتاب وغیرہ۔

میرے ادھر آپ کی طرف آنے کی کوئی سبیل نہیں بنتی ورنہ اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ لے آتا۔ سنٹوں والوں کا

نام نہاد پروگرام بھی شاید ٹھپ ہوگیا جس سے اور کچھ نہیں تو ہم اپنے انفاس کو ایران کی ہوا سے تازہ کرلیتے تھے۔
اب اجازت... غم دوراں کے بہت اسباب باقی ہیں۔

(انشا)

(۱) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بڑے بھائی

۲۸ فروری ۱۹۴۳ء

پیارے اختر

تسلیم

میں نے پچھلے خط میں اک مفصل خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے کل فضا پر اک نگاہ ڈالی جہاں تک شالیمار کا تعلق ہے ہم دونوں کے علاوہ مسٹر احمد نے کرشن چندر کو بھی بلایا ہے، وہ ایک دن کو آئے تھے اور شاید جلد ہی یہاں آجائیں گے۔ اگر انھیں ریڈیو سے آزادی مل گئی تو شاید جلد ہی یہاں آجائیں گے۔ میرے اور جوش کے علاوہ ایک صاحب بھارت ویاس ہندی کوی بھی یہاں پہلے ہی سے براج رہے ہیں۔ اس بھیڑ میں مسٹر احمد سے کسی اسٹوری کے لیے کہنا میرے نزدیک غیر نفسیاتی چیز ہے، اب رہے "نویگ" پربھات اور بمبئی ٹاکیز وغیرہ ان سب جگہ کسی نفسیاتی پس منظر کے بغیر کوئی سعی کرنا تم جیسے عزیز و محترم اور بلند مرتبہ دوست کے لیے مناسب نہیں تمھاری عزت واحترام ہماری عزت اور ہمارا اپنا احترام ہے۔

میں نے طے کرلیا تھا کہ آج اتوار کو بمبئی جاؤں۔ یکایک معلوم ہوا کہ خواجہ احمد عباس پونا ہی آئے ہوئے ہیں چنانچہ میں اُن کی تلاش میں نکلا اور انھیں اپنے گھر لایا اور اس باب میں دیر تک اُن سے نہایت غور کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ خواجہ [illegible]مد عباس کی رائے ہے کہ آپ اس کام کے لیے کم از کم ایک ماہ کا وقت دیں۔ وہ پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ پربھات اور بمبئی ٹاکیز میں نتیجہ آفریں کوشش کریں گے۔ [illegible]یں خواجہ احمد عباس سے برابر ملتا رہوں گا۔ اور فضا پر نظر رکھ کر ان ہی میدانوں کی طرف اشارہ بھی کرتا رہوں گا۔ باوجودیکہ شالیمار میں امکان نہیں مگر کرشن چندر کچھ کم ہمت معلوم ہوتے ہیں چھ سات دن ہی میں اُن کے آنے یا نہ آنے کے متعلق معلوم ہوجائے گا اگر نفی میں نتیجہ نکلا تو میں موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا آپ ابھی اطمینان رکھیں خواجہ احمد عباس بہت مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ نتیجہ موافقت ہی میں نکلے گا۔

ہم لوگ ہرگز یہ گوارا نہیں کریں گے کہ آپ جیسا جوہرِ قابل سرکاری دفاتر میں ضائع ہو جائے۔ ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ آپ کو جہنم کی طرف جاتے دیکھیں۔

حمیدہ بہن کو سلام کامران کو پیار اور چھوٹے منے کو بھی میری شادی کی تاریخ ۲۸ مارچ مقرر ہوئی ہے برات میں شرکت کے لیے تیار رہیے۔ انتقام نہ لیجیے گا۔ میں ۲۰ یا ۲۲ کو یہاں سے دہلی اور میرٹھ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ اُس وقت تک یقیناً کوششوں کے نتائج نکل چکے ہوں گے۔

آپ کا

(ساغر نظامی)

عکسی تحریریں

Mr. akhtar Husain B.A. (Alig) is, perhaps, the first eminent Mohammden Scholar of Sanskrit. The All India Sanskrit Vidvat Sammelan has recognized his Scholarship in that language by conferring on him the title of Sahityalankar. I am told that he knows Bangla, Marathi and Gujrati and is a well-known writer in Hindi and Urdu. These qualifications give weight to his intention to proceed to Europe for higher studies in Sanskrit. I strongly recommend him to the Trustees of Fazalji Dawood Bhai Trust to whom he is applying for a foreign Scholarship. They would do well to give him every encouragement, for, I believe, he would put this help to the best account. I hope, he would prove useful to our country and commuenity and revive the traditions of Muslim Sanskrit Scholars of Mughal,period.

(Sd)
Mahammad Iqbal Kt
M.A; Ph. D.
Bar-at- Law,
Lahore.

Lahore,
26th, April, 1934.

سحر

شب تاریک پر خموشی ہے — کل جہاں محو عیش کوشی ہے

اوس سبزوں میں آ کے بیٹھی ہے — چھیڑ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے

چوڑیاں بج رہی ہیں تاروں کی — آئی آواز اپسرا باتوں کی

اڑ رہا ہے غبار پُر نور بدن — پھیلتی جا رہی ہے بوئے چمن

موج تسنیم و کیف خلد بریں — جگمگاتا بدن جھلکتی جبیں

اپنی آنچل میں منہ چھپائے ہوئے — اڑ رہی قدم بڑھائے ہوئے

نغمے پازیب سنائے ہوئے — بخت خفتہ مرے جگائے ہوئے

عشوہ و ناز کا فسوں لے کر — ساتھ اک لشکر جنوں لے کر

دور سے مسکراتا آتا ہے — بجلیاں سی گراتا آتا ہے

وہ کہ رنگین کرنہ(?) تبسم کی — اک مسلسل لڑی ترنم کی

پردۂ تن میں رنگ پوشیدہ — رنگ وہ جس میں آگ پوشیدہ

بانسری سی بجائے جاتا ہے — آگ تن میں لگائے جاتا ہے

رکھ دنیائے رنگ و بو بن کر — خون شدہ دل کا آرزو بن کر

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر — دھڑکتے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی

میری ہستی پہ چھا گیا کوئی —

فخرالدین محی الدین — ایم اے (عثمانیہ)(?)

د... آباد

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

"ہندوستانی" کا ذکر خیر

(غیر مطبوعہ تحریر)

برطانوی عہدِ حکومت کی لسانی اصطلاح میں "ہندوستانی" سے مراد شمالی ہند کا وہ روز مرّہ تھا۔ جو برصغیر میں عام طور پر بولا اور سمجھا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں کے کاروبار اور سیاست میں دخل درانداز ی شروع کی تو اس کے انگریز اہل کاروں نے دیکھا کہ مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی ہے لیکن عوام کی اپنی زبان کچھ اور ہے۔ جسے انھوں نے "ہندوستانی" کا نام دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک جب کمپنی نے از کلکتہ تادلی سیاسی تسلّط حاصل کرلیا تو ضرورت پیش آئی کہ اس کے کارندے ملکی زبانوں سے باقاعدہ واقفیت حاصل کریں چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں بالخصوص اردو کی تصنیف و تالیف اور درس وتدریس کا مناسب انتظام کیا گیا۔ اس طرح صحیح معنوں میں اردو نثر کی تشکیل شروع ہوئی۔ اس وقت تک "ہندوستانی" کا نام فقط یورپین لیتے تھے ان کے نزدیک اس کی حیثیت اُردو کی عام فہم شکل سے جُدا نہ تھی۔ ہندی نثر کا ذکر تو کجا اس کے نام کا وجود بھی نہ تھا اور اس کی پرانی شاعری برج بھاشا، اودھی اور ماگدھی سے موسوم تھی البتہ اردو ہی کو کبھی کبھی ہندوی کہا جاتا تھا۔ عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کا چلن چھ سو سال سے زیادہ قدیم تھا حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی حیثیت عدالتوں اور دفتروں میں ۱۸۳۵ء تک برقرار رکھی اس وقت برطانیہ نے بارہ دفتروں میں فارسی کی جگہ انگریزی اور عدالتوں میں اردو کو دی اس فیصلے کا اثر دور رس ثابت ہوا ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی کتاب "اُردو ہندی تنازعہ" میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۱۸۵۷ء تک اردو کے ساتھ ہندوستانی کا نام اس طرح آتا رہا گویا ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں لیکن اس کے فوراً بعد جیسے ہی ہندو قومیت بیدار ہوئی اور اس نے ہندی کے فروغ کو اپنی شناخت کا محور بنایا تو وہ لسانی تنازعہ شروع ہوا جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ طرفین کے اعتراضوں اور دلیلوں کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر ہندی دانوں کا اصل اعتراض اُردو رسم الخط پر تھا اور نہ آسان زبان کے وہ بھی منکر نہ تھے، خواہ اسے کھڑی بولی کہا جائے یا "ہندوستانی" تاہم اپنے تاریخی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے یہ معاملہ وقت کے ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندو مسلم اکابر نے شدت سے محسوس کیا کہ آزادی کی کامیابی کی ضمانت متحدہ محاذ ہے چنانچہ دونوں قوموں کے جن اختلافات کو مٹانے کی بھرپور کوشش ہوئی اُن میں ہندی اردو کا قصہ سرِ فہرست تھا۔ اب انگریزوں کا پرانا نسخہ کام آیا

اور کانگریس کے پلیٹ فارم پر متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہندوستان کی قومی زبان "ہندوستانی" کہلائے گی خواہ وہ ہن
رسم الخط میں لکھی جائے خواہ اُردو رسم الخط میں۔

ترک موالات اور خلافت کی ان تحریکوں کا جوش دو چار سالوں میں ہی ٹھنڈا پڑ گیا البتہ لسانی شورہ پُشتی پر مفاہمت کا جو
رکھا گیا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ سال سود مند رہا ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے خواہ مخواہ اِن بھڑوں کے اس چھتے کو اس طرح چھیڑا کہ سا
فضا مسموم ہوگئی اس تکلیف دہ قصّہ کو دہرانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اپنے پُرانے کاغذات کا جائزہ لیتے لیتے چند غیر مطب
خطوط دریافت ہوئے جن کا تعلق گاندھی جی کی اُس مذکورہ بالا کانفرنس (ساہیتہ پریشد) سے ہے جو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں ناگ
میں منعقد کی تھی ملک بھر سے ایک سو دانشوروں اور ادیبوں کو اس جلسہ میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی میں.
بھی گاندھی جی کے اس اذن پر لبیک کہا اس تاریخی جلسے کے شرکاء میں اب میرے سوا دو چار ہی باقی رہ گئے ہیں ساہتیہ پریشدَ
لسانی معرکہ آرائی کا ذکر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ میری سرگزشت "گردراہ" میں بھ
درج ہے اپنی صدارتی تقریر میں گاندھی جی نے یک بیک اعلان کیا کہ ملک کی قومی زبان کو آئندہ "ہندی" یعنی "ہندوستانی"
جائے گا ہندوستانی کا نام تو انھوں نے تکلفاً لیا تھا ورنہ منشاء یہ تھا کہ قومی زبان "ہندی" کہلائے گی پھر جو ہنگامہ برپا ہوا اسَ
نوعیت لسانی کم اور سیاسی زیادہ تھی۔

گاندھی جی نے لسانی تنازعہ کا جو جن بوتل سے باہر نکالا پھر وہ ان کے قابو میں نہ آیا ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مولو
عبدالحق، پریم چند، پنڈت سندر لال وغیرہ کو جمع کر کے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی اگلے سال جب ڈاکٹر راجن
پرشاد کانگریس کے صدر بنے تو معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے مولوی عبدالحق کے ساتھ ایک اقرار نامہ شائع کیا جسَ
رو سے کانگریس کی پرانی تجویز کی ازسر نو تصدیق کی گئی اور قومی زبان بلاشریک غیر "ہندوستانی" قرار پایا بایں ہمہ ہندی اور اردا
یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ادب کو فروغ دینے کی مجاز ہے۔ اس عارضی مفاہمت کے باوجود جو نقصان ہونا تھا وہ ہوچکا اور ا
معاملے میں گاندھی جی کی ساکھ بگڑ گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندی اور اردو کی تسلیم شدہ جداگانہ حیثیت کے باوجود ان میں جو قدر مشترک تھی اسی کا نام "ہندوستاز
تھا البتہ اس کی ادبی شکل کا واضح تعین ممکن نہ تھا۔ پریم چند ایسی آسان زبان استعمال کرتے تھے جو رسم الخط کے فرق کے سا
ہندی اور اردو میں شائع ہوتی تھی۔ بڑی حد تک یہ بات سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے متعلق کہی جاسکتی ہے مید
نے خود میکسم گورکی کی آپ بیتی اور "پرل بیک" کے ناول "گوڈارتھ" کا ترجمہ "پیاری زمین" کرتے وقت اِسی زبان کو ملحوظ خا
رکھا۔ سنسکرت سے کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کا ترجمہ بھی ایسی ہی زبان میں کیا ہے قومی اتحاد اس وقت میرا بھی جزو ایما
تھا۔ اور "ہندوستانی" کے فروغ کو اس کا وسیلہ ہی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک جب میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہا
اور خدمات کے علاوہ ہندوستانی لغت کمیٹی کی صدارت میرے سپرد ہوئی جس کے اردو مشیر چراغ حسن حسرت اور ہندی مشیر ایس
ای َواتسائن تھے۔ اس وقت تک ریڈیو میں ہندی اور اردو کے بجائے ایک مشترک زبان "ہندوستانی" میں خبریں نشر ہوتی تھیں
اور ہماری کمیٹی کا کام مشکل اصطلاحوں کے عام فہم مترادف تلاش کرنا تھا یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا گیا میرے بعد بھی یہ سلسلہ
جاری رہا۔ تکنیکی اصطلاحوں کے اس ہندوستانی لغت کو زمانہ کی نظر کھا گئی البتہ ان میں درجنوں اصطلاحیں زبان زد خاص و عا
ہیں۔ ہم سب سے بڑھ کر پنڈت سندر لال ہندوستانی کے علم بردار تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس مسئلے کا تعلق براہ راست ہندو مسا

ہد سے تھا جوان کی زندگی کا مشن تھا۔ وہ پنڈت نہرو کے ہم وطن اور ہم جماعت تھے ترک موالات کے وقت کالج سے تاریخ کی
روفیسری تج کر اس مہم پر وہ یوں چل کھڑے ہوئے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا انگریزی، ہندی، سنسکرت کے علاوہ اردو، فارسی، عربی
انھیں کامل دسترس حاصل تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوستانی کی جداگانہ ادبی حیثیت ہے وہ "نیا ہند" کے نام سے
رتوں الہ آباد سے ایک ماہنامہ شائع کرتے رہے جس میں ایک ہی عبارت دو جدا رسم الخطوں میں آمنے سامنے چھپا کرتی تھی۔

آخری خط کے مضمون کی وضاحت ضروری ہے جو پنڈت سندر لال نے اپریل ۱۹۴۰ء میں الہ آباد سے مجھے بھیجا تھا۔ ایک
ال قبل گاندھی جی کے ساتھ سندر لال بھی قید فرنگ سے آزاد ہوئے تھے اور انھوں نے از سر نو سوچنا شروع کیا کہ لسانی گتھی کو
س طرح سلجھایا جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کی رقابت کی وجہ سے از حد پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اب گاندھی جی کو بھی اپنی غلطی
احساس ہو گیا تھا۔ اور اس کی تلافی کے لیے ہندوستانی، کو توسیع اور ترقی کے علاوہ کوئی راستہ نہ سجھائی دیا اسی سلسلے میں انھیں
یرے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا ذکر سندر لال نے اپنے خط میں کیا ہے عین اسی وقت برطانوی حکومت ہند کے فیڈرل
لک سروس کمیشن نے میرا انتخاب معاون مشیر تعلیم کے عہدہ پر کر لیا تھا اور میں امرتسر سے شملہ منتقل ہونے کی تیاری کر رہا
ھا۔ "گرد راہ" میں ان واقعات کی تفصیل ملے گی۔ ہندو مسلم نفاق کی شدت نے لسانی مسئلہ کو لاینحل بنا دیا تھا اس ماحول میں
ہندوستانی" کا نعرہ صدا بصحرا ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا میں سندر لال کی پیشکش کو منظور نہ کر سکا اس وقت تو انھیں میرے انکار سے
لال ہوا لیکن دو سال کے اندر تقسیم کی وہ تلخ حقیقت سب کے سامنے آگئی جس کی آہٹ میں پہلے سے سن رہا تھا۔ مذہب اور زبان
نے کبھی انسانوں میں اتفاق پیدا کیا ہے اور کبھی نفاق انسانی تعلقات میں اتفاق اور نفاق کے کئی پہلو ہوتے ہیں سوال یہ ہے کہ
ن میں سے کن کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔

بول چال کی وہ زبان جو آج بھی باقی ہے جو صدیوں سے برصغیر کے عوام کو باہمی ربط کا موقع فراہم کرتی ہے لیکن اب اسے
ئی "ہندوستانی" نہیں کہتا کیوں کہ خیر سگالی کی جس روایت نے اسے جنم دیا تھا وہ انقلاب زمانہ کی نذر ہو گئی۔

حمیدہ اختر حسین

بیادِ اختر

سحر انصاری صاحب یہ آپ نے کیسا غضب کر دیا کہ "گرد راہ" کا تیسرا ایڈیشن اس شرط پر چھپوانے کی ذمہ داری آپ جب لیں گے کہ میں اپنے قلم سے اختر پر کچھ لکھ کر دوں۔ انصاف تو کریں کہ کہاں "گرد راہ" اور کہاں میرا قلم اور میرا ہاتھ! میں تو اس کی گرد کو بھی چھونے کی جسارت نہیں رکھتی۔ ہاں اس کا تیسرا ایڈیشن نکل آنے کے شوق نے مجھے قلم پکڑنے کی ہمت ضرور عطا کر دی۔

اختر نے ادب اور اپنے معاشرے کو کیا دیا، اس کا اعتراف آپ سب نے جس فراخدلی اور احترام کے ساتھ کیا ہے وہ بہت کم خوش بختوں کو حاصل ہوا ہوگا۔ میں تو صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ ان کی شخصیت کے بے شمار پہلو جو نظروں سے پوشیدہ یوں رہے کہ اپنے متعلق نہ قلم سے لکھا نہ منہ پر لائے۔ اپنی نجی زندگی کے متعلق ذکر کرنا، خواہ وہ کیسا ہی عزیز دوست ہو، ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہاں تک کہ مجھ سے اتنی قربت کے باوجود اس معاملہ میں میرا شمار بھی اسی قطار میں رہا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے گاہے گاہے نجی محفلوں میں اختر پر اعتراض کیا کہ خدا نخواستہ وہ مذہب کے خلاف ہیں، کمیونسٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ گھوم پھر کر بات ان تک پہنچتی تو صرف ہنس دیا کرتے تھے کہ کہنے سننے کا ہر شخص کو پیدائشی حق ہوتا ہے۔ ان پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اختر تو سچے مومن انسان تھے۔ ان کی اسلام دوستی اور انسان دوستی میں قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ سوشلزم پر صحیح عمل کو انسانوں کے دکھ کا مداوا سمجھتے تھے۔ وہ بالکل قنوطیت پسند نہ تھے بلکہ اس کے برعکس دنیا اور انسان کی ترقی میں ایمان رکھتے تھے۔ ان کی انسان دوستی اور انسانیت بدرجۂ اتم ان کی اپنی زندگی کے ہر پہلو سے واضح ہوتی ہے۔ فکر و عمل دونوں ہی طریقوں سے وہ ترقی پسند (CONSTRUCTIVE) رستہ پر گامزن رہے۔ اپنے سے بڑوں کی تقدیم و تکریم اور چھوٹوں سے شفقت بے حد حتی کہ برابری کا درجہ دیتے۔ زندگی کے مختلف حادثات کے باوجود جوان کے، میرے اور لڑکوں کے ساتھ پیش آئے وہ ایک شجر سایہ دار کی طرح ہم سب کو اپنے دامن میں سمیٹ کر خوشبوؤں سے ہمکنار کرتے رہے۔ اپنے لڑکے اور ان کے ان گنت دوستوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے جیسے کہ ان کے برابر کے ہوں اور ان کو کبھی کم مائیگی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ بحث اور مباحثہ میں میانہ روی، دلائل میں ان کی فکری گہرائی اور آفاقی وسعت نظری نے ہمیشہ دوسروں کا دل موہ لیا اور یہی ہوتا کہ سامع بغیر اس خیال کے کہ وہ اپنا کوئی اثر ڈال رہے ہوں۔ وہ بہت متاثر نہیں بلکہ اپنی جھولی بھر کر اٹھتا اور کوئی نہ کوئی سوچنے کا نکتہ ساتھ لے کر جاتا۔ وہ اشعار کا استعمال اور انتخاب برمحل اور موزوں کرتے۔ تاریخ، فلسفہ، مختلف زبانوں کے ادب، معاشیات،

عمرانیات اور دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ اور بھی بہت سارے علوم پر گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ مذاہب عالم بالخصوص اسلام پر بڑا گہرا مطالعہ تھا اور ہمیشہ اپنی نپی تلی اور مدلل گفتگو سے قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے۔

کسی منصب سے کبھی مرعوب نہ ہوتے۔ ان کی نگاہ میں بڑا آدمی وہ ہے جو اچھا انسان ہو۔ اس میں مذہب، عمر اور تعلیم کی قید نہ تھی۔ کسی کے رتبہ یا حیثیت کا ان پر کوئی اثر پڑتے نہیں دیکھا ہاں اپنے چھوٹے افسران، چپراسیوں اور ملازمین سے بے حد جھکاؤ اور برابری سے ملتے ضرور دیکھا۔

اکثر رمضان میں روزے رکھتے، بینائی کے ختم ہو جانے کے بعد روزے کم رکھتے۔ مگر سات کو اپنے بھائی کی وفات اور ۲۷ رمضان کو اپنے والد کی وفات کے دن کا روزہ کبھی قضا نہیں کیا۔ عید اور بقر عید کو نماز کے لیے سب سے پہلے تیار ہو جاتے۔ کالی شیروانی اور کالی ٹوپی ان پر بہت جچتی۔ ملازمین اور لڑکے ساتھ جاتے۔ اب کی عید پر جب یہ اپنے چاروں بیٹوں اور پوتے شاکر کو نماز کے لیے لے جا رہے تھے تو پہلی بار میرے دل میں وہم سا آیا میری والدہ اپنے پانچ بیٹوں اور ابا کو ایک ہی دروازے سے جانے نہ دیا کرتیں۔ میرا دل چاہا کہ کہوں کہ سب ایک ساتھ نہ جائیں لیکن اختر کے مذاق اڑانے کے ڈر سے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھ سے فرمائش کر کے قرآن پاک کا ترجمہ سنا کرتے تھے۔

اختر کی شخصیت پر مولوی عبدالحق بابائے اردو کی چھاپ ان کی روزمرہ زندگی میں ہر روز ہی نظر آتی رہی۔ زندگی کا ہر قدم سوچ کر اٹھانا، باقاعدہ صبح کی ہوا خوری، اس کے بعد ورزش کر کے ایک پیالی چائے پی کر تیار ہونا۔ ان کو اب جب کہ کہیں آنا جانا نہ تھا مگر آٹھ بجے ٹھیک یوں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر جاتے جیسے دفتر جانے والے ہیں سہ پہر کو کپڑے بدل کر ریڈیو سنتے، ساڑھے چار بجے نہا کر تیار ہوتے، پانچ بجے کمرے سے نکل آتے، چائے پی کر لمبی سیر کر کے آجاتے۔

پہلے ہی سے ان کے ملاقاتی یا لڑکوں کے دوست ان کے انتظار میں بیٹھے ملتے اور یہ میر محفل بن کر بیٹھ جاتے کیسی کیسی دلچسپ گفتگو ہوتی کبھی لڑکے اور ان کے دوست گرما گرم بحث کرتے مگر یہ ہیں کہ ایک کے بعد ایک کا جواب دیتے۔ بہت پیچھے کی طرف جا کر سر کو پکڑ کر آگے آتے جاتے۔ وجہ تسمیہ اور اس کے اثرات آئندہ کیا پڑیں گے، بتاتے۔ ان کی دوربین نظریں کس قدر آگے کا دیکھ لیا کرتیں اور دیر سویر وہ سچ ہی نکل کر سامنے آتا رہا۔

ادھر کئی ماہ سے USSR کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا ان پر بڑا اثر پڑا۔ وہ اس پر بہت کچھ لکھنے کے لیے بڑے بے چین تھے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی اصل وجوہ اور اسباب پر ہی ایک عرصہ اظہار خیال کرتے رہے۔ جب آخری بار سردار جعفری انڈیا سے آئے تو دونوں کی باتیں میں خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ اختر نے پوچھا "اب بتائیں جعفری صاحب اگر میں جہاں اور جس بات پر بہت پہلے سے غلط ترعمل پر اعتراض کرتا تھا۔ سب کو ناگوار گزرتا تھا۔ اب دیکھیے یہ سب کیا ہوا؟" جعفری صاحب نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا "یہ آپ ہی بتائیں یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟" اختر کا کہنا تھا کہ یہ سب سوشلزم کے خلاف بہت بڑی سازش عرصۂ دراز سے کی جا رہی تھی۔ اس کی کڑی کو بہت پیچھے جا کر گرفت میں لایا جا سکتا ہے، کاش میں لکھ سکتا یا کوئی مجھے ایسا مل جاتا جس سے لکھوا سکتا۔ ضروری ہے کہ اس عظیم حادثہ اور المناک واقعات کا کوئی درست سمت میں نشاندہی اس وقت کر دے۔ وقت گزر جانے کے بعد جب ہسٹری کے ایسے واقعات کو قلمبند کیا جاتا ہے، تو وہ کبھی اصل روپ میں نہیں رہ جاتی ہے سردار جعفری صاحب نے اپنی ایک نظم جو USSR کے بکھر جانے پر کہی تھی وہ اختر کو سنائی تو اس پر جھوم اٹھے۔ کسی سے یہ کبھی نہ کہا کہ ان کو قطعاً نظر نہیں آتا ہمیشہ یوں کہتے کہ کچھ بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ باہر کسی کے ہاں آنے جانے اور کسی میٹنگ کی صدارت کرنے سے بہت ہی

کتراتے۔ جب بھی میں نے اصرار کیا کہ ہرج کیا ہے، چلے جائیں تو مجھے یہ جواب ملتا "آپ بات کو سمجھتی کیوں نہیں ہیں مجھے لوگ لاچار اور مجبور دیکھ کر رحم کی نظر سے دیکھیں گے، یہ مجھے پسند نہیں" لیکن کچھ ایسے مواقع ہوتے کہ چلے جاتے ۔ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر۔ زندگی بھر کوئی خطبۂ صدارت یا لیکچر اور تقریر لکھ کر نہیں پڑھی اور ہمیشہ اگرچہ بڑے اختصار سے کام لیتے مگر اس میں وزن اتنا ہوتا کہ سننے والوں کو کوئی نہ کوئی بات بالکل نئی اور سوچنے کے لیے مواد مل جاتا۔

قدرت نے دماغ ایسا عطا کیا تھا کہ جو بھی ایک بار نظر سے گزرا تھا، وہ ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتا آپ ان سے گھنٹوں ہسٹری خواہ ایشیا کی ہو یا یورپ کی، امریکہ ہو یا چین و جاپان کی باتیں کرتے رہیں، وہ تاریخوں کے حوالہ کے ساتھ صدیوں پیچھے لے جا کر دورِ حاضر میں لے آئیں گے۔

ادب اور شاعری، ایشیا، یورپ، ایران اور دیگر ممالک کے۔ ان سب پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ موسیقی اپنی ہو یا یورپین، دونوں ہی پر یکساں گفتگو پہروں کر سکتے تھے۔ سیاحی کا ذکر آ جائے تو وہ کھل اٹھتے ۔ حیران کن باتیں بتاتے، کھانوں پر بات چل پڑے تو مختلف ممالک کے کھانوں پر بولتے اور بتاتے رہتے۔ سیر و سیاحت سے والہانہ دلچسپی رہی۔ اس بحر میں، ان کے پاس جیسے خزانہ تھا۔ مذاہب عالم میں ان کی علمیت اور معلومات بدرجۂ اتم تھیں، روحانیت اور فقہ اور تصوف پر جو وہ بتاتے تو بڑے بڑے عالمِ دین خاموشی سے سنا کرتے۔ میں نے بارہا ان کو کسی کانفرنس کے بعد جس میں مختلف ممالک کے مبصرین ایک ہی کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں اور اتفاق سے مہمان کچھ یوں بیٹھا دیے گئے کہ ایک ہندوستانی بینچ میں پاکستانی اور پھر بنگالی سامنے کوئی ایرانی اور فرانسیسی ہے تو یہ بوقت چار زبانوں میں بات چیت اس روانی سے کرتے کہ میں حق دق رہ جاتی۔ کچھ شرارت کے موڈ میں آکر ہندوستانی صاحب سے اس قدر ثقیل ہندی، جس میں بے طرح سنسکرت کے الفاظ داخل کر دیتے کہ وہ بے چارے بغلیں جھانکنے لگتے اور کہتے ڈاکٹر صاحب آپ کی ہندی تو ہماری سمجھ سے باہر ہے روزمرہ کی زبان استعمال کیجیے نا۔ تو ہنس کر کہتے کہ یہ جو آپ کے ملک میں ہندی زبان میں بے تحاشا سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جا رہے ہیں تو بے چارے عوام پر بڑی بری بیت رہی ہے۔ ان کو تو ریڈیو پروگرام نہ ہی ٹی وی کی خبریں اور نہ ہی درسی کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

جانوروں سے بے حد پیار کرتے، ان کے پالنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ طرح طرح کی چڑیاں، توتے، کبوتر، کتا، خرگوش رکھا کیے۔ ایک زمانے میں ایک کچھوا بھی رکھ لیا تھا صبح ۵ بجے سے ٦ بجے تک عبادت کے بعد باہر نکل کر چڑیوں کا پانی بدل کر دانہ دینا، مچھلیوں کے حوض میں ان کے لیے چٹکی چٹکی کھانا ڈال کر ان کا تماشا دیکھتے۔ کتے کو دودھ دیتے، صبح کی ایک پیالی چائے مولوی صاحب کی طرح خود بناتے، نمک گرم پانی میں ڈال کر صبح اور سوتے وقت غرارہ کرنا، یہ عادت بھی مولوی صاحب کی عطا کردہ تھی۔ اس کے بعد ورزش، اس سے پہلے ہوا خوری ہمیشہ پڑھتے ہوئے سونے کی عادت اس طرح قائم تھی کہ اب بھی ایک کوئی نہ کوئی کتاب تکیہ کے پاس رکھ کر، اس پر ہاتھ رکھ کر ریڈیو سنتے سنتے سو جاتے۔ یہ بارہا کہا کہ انسان کو کسوٹی پر پرکھنا ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس کا سلوک بچوں اور جانوروں کے ساتھ کیسا ہے اور پڑوسیوں سے کیسے تعلقات ہیں۔

ضبط اور صبر اور برداشت کی کس قدر طاقت ان کو مولا نے دے رکھی تھی، میں تو حیران ہو جایا کرتی۔ صومالیہ میں کسی دعوت کے بعد ہندوستانی سفیر ہم دونوں کو ہمارے گھر چھوڑنے آ رہے تھے۔ سامنے اختر بیٹھے اور انھوں نے دروازہ بند کیا اور برابر میں بیٹھ کر موٹر چلانا شروع کی۔ اختر کا ہاتھ دروازے پر تھا۔ انگوٹھا درمیان میں آگیا تھا مگر اُف تک نہ کی۔ جب ہم گھر کے گیٹ پر اُتر گئے اور موٹر روانہ ہو گئی تو سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انگوٹھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی گوشت قیمہ کی طرح ہو گیا۔ فوراً

فون کر کے UN کا ڈاکٹر بلایا وہ اسپتال لے گئے دوسرے دن جب میں نے پوچھا کہ اختر آپ نے منہ سے کیوں نہ کہا، تو ہنس کر جواب دیا کہ ہندوستانی یہ نہ سوچیں کہ ہم پاکستانیوں میں قوت برداشت نہیں۔ اپنی رہائش اور لباس میں بڑی سادگی ساری عمر برتی۔ ان کے مزاج کے مطابق یہی شعار میں نے اختیار رکھا۔ آپ سب نے خود بھی یہ دیکھا ہوا ہے کہ ہمارے گھر میں ہر چیز انتہائی اوسط درجے کی رہی۔

دوستوں کی دعوتیں کرنے کا شوق ساری عمر رہا۔ جب جب ان کے احباب کھانے پر آئے۔ میں نے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا۔ پہلے موسیقی کی محفلیں گھر یا سمندر میں کھڑے کسی جہاز پر کرتے جس ملک میں ان کی پوسٹنگ رہی یا زمانہ تعلیم میں جو بھی موسیقی، بیلے یا ڈرامے ہوتے ان میں شرکت کرنا، ہر میوزیم کو بڑی گہری نظر سے دیکھا کرتے۔ پہاڑوں، سمندر، گھنے جنگلات اور جھرنے ان پر اپنا اثر ایسے ڈالتے کہ کئی کئی روز خوش ہو کر ذکر کرتے اور ساتھ یہ بھی کہا کرتے کاش وہ افریقہ کے کسی جنگل میں کیوریٹر ہوتے اور یوں فطرت کے قریب تر ہو کر زندگی گزار دیتے۔

جائیداد وغیرہ کے نام سے بڑی نفرت کرتے۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسکول کے لیے برنیٹو روڈ پر ایک بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی الاٹ کرا کر چیف کمشنر سے الاٹمنٹ آڈر اور چابی دکھا کر میں نے کہا "لیجیے اب میں اپنا ننھا سا اسکول جو گھر میں کھول لیا ہے، اس کو بہت بڑا کر لوں گی، یہ دیکھیے الاٹمنٹ آرڈر۔ کچھ سامان بھی وہاں پہنچا دیا ہے۔" غصہ سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر چار ٹکڑے کر دیے اور چابی کو دور پھینک کر بولے "کل صبح پہلا کام آپ یہ کریں کہ الاٹمنٹ کے ٹکڑے اور چابی واپس کر کے آئیں۔ کیا ہم لوگ یہاں اس لیے آئے ہیں کہ لوٹ کھسوٹ کریں؟" میں ان کے غصے سے ڈر گئی اور دوسرے دن واپس کر آئی۔ جب جی ایم سیّد کی گرفتاری کے آرڈر نکلے تو رات کی تاریکی میں ایک چادر اوڑھے ہمارے ہاں آئے اپنا نام بتا کر کہا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا اور نہ جانے کتنے عرصے کے لیے ایک خواہش آپ کے پاس لے کر اس لیے آیا ہوں کہ میرا بندر روڈ پر ایک بہت بڑا پریس ہے، اس کو آپ لے لیں۔ آپ کی ذات کے متعلق جو پڑھا اور سنا ہے اس سے یقین ہے کہ آپ اس کو صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ میری تمنا تھی کہ ایک اخبار نکالوں، وہ آپ مجھ سے بہتر نکالیں گے۔ اخبار کے لیے کاغذ ایک سال تک کے لیے منگا لیا تھا۔" اختر نے پریس لینے سے صاف انکار کر دیا انھوں نے کہا کہ میں کل رات پھر آؤں گا تب تک آپ کو سوچنے کا وقت مل جائے گا۔ میں نے رائے دی کہ مان لیں، آپ کا ساری عمر کا خواب پورا ہو جائے گا کہ اخبار نکال سکیں۔ بگڑ اٹھے کہ کوئی مصیبت میں مبتلا ہو رہا ہو، اور میں اس کی چیز کو لے لوں۔ دوسری رات وہ پھر آئے اختر نے اپنی معذوری ظاہر کر کے کہا "آپ کو اس کے لیے ان سے بہت بہتر لوگ مل سکتے ہیں۔" وہ بے چارے بڑے مایوس ہو کر چلے گئے۔

جب پیر الٰہی بخش کالونی کی اسکیم سلیمان صاحب چیف انجینئر کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔ سلیمان صاحب والد کے عزیز دوست تھے۔ والد سے ملنے آئے اور مجھ سے کہا "بیٹی کیوں نہیں تم دو ملے ہوئے مکان بک کروالیتی ہو۔ بیچ کی دیوار گروا دو گی تو بڑا مکان ہو جائے گا، اور میں نے ایسا ہی کر کے جب اختر کو بتایا تو وہ بگڑ اٹھے کہ افسوس ہم جیسے لوگ ان لوگوں کا حق مار نے کھڑے ہو جائیں جن کو گورنمنٹ رہائش کے لیے مکانات نہیں دے سکی تو اللہ اس ملک کی خیر کرے کل جائیں اور آپ نے ممبر شپ کے جو فارم بھرے ہیں ان کو پھاڑ کر آئیں۔ میں واقعی دل میں بہت شرمسار ہوئی۔ یہ بھی ان کے حکم کے بموجب کر آئی۔

ایوب خاں کے زمانے میں جب کلیم داخل کرنے کی آخری تاریخ کا اعلان ہوا تو میں نے ان کے والد کو پٹنہ کے مکان، باغات اور زمین جس کے کاغذات میں نے پٹنہ سے ایک صاحب کے ذریعہ منگا لیے تھے (وہ اپنے کاغذات کے لیے پٹنہ گئے) اس بنا پر فارم پر

ر کے دستخط کے لیے دیے تو اختر اور شمیم بھائی دونوں بگڑ اُٹھے کہ ہم اپنی خوشی سے پاکستان آئے تھے۔ آخر پاکستان گورنمنٹ کس
ظا میں اس کا بدل دے میری ایک نہ سنی اس قدر خفگی کو دیکھ کر میں نے خود کاغذ پھاڑ کر پھینک دیے اختر ایک بار جب دورے
پر گئے ہوئے تھے تو میں نے ایک ہزار گز کی زمین گلشن اقبال میں اردو کالج کے پاس خرید لی جب آئے اور بتایا تو پارہ اس قدر اوپر
لیا کہ فوراً ہی ایجنٹ کو زمین کا نمبر دے دیا اور وہ چند ہفتوں ہی میں فروخت ہو گئی۔ بار بار سر ہلا کر کہتے افسوس کی بات ہے ایک
مکان رہنے کے لیے موجود ہوتے ہوئے بھی اس نے ایسی حرکت کیوں کر لی۔ ہاں میں پھر ان کے سامنے شرمسار ہو گئی۔ کمرشل
پلاٹ ہر ممبر کو دیا گیا تو صرف خود ہی انکار نہ کیا بلکہ ایجوکیشن منسٹری کے ہر افسر کو ایسا بھیانک نقشہ کھینچ کر بتایا کہ لوگ کہتے
پھریں گے کہ فلاں فلاں کی دکان سے گوشت خرید کر لا۔ تے ہیں۔ فلاں فلاں کی دکان سے بال کٹواتے ہیں وغیرہ وغیرہ بعد میں یہ
سب ہی لوگ ملاقات پر بھی یہ بات ضرور کہا کرتے "اختر صاحب آپ نے ہم سب کو کیسا بہکایا کہ ہم سب نے کمرشل پلاٹ نہ لیا۔
آج تو وہ ہوتا تو اچھی گزر جاتی۔ اس پنشن سے کیا بنتا ہے؟ مگر مجھ سے ایک غلطی پھر سرزد ہو گئی کہ جب بلاک نمبر ۶ میں کمرشل
پلاٹ مل رہے تھے تو ایک لے لیا۔ الاٹمنٹ تو اختر نے واپس کروا دیا مگر وہ روپے جو داخل دفتر کر دیے تھے ان کو جا کر واپس نہ لیا۔

ایسا بے نیاز اور سیر چشم انسان شاید ہی دیکھنے میں آئے گا۔

اپنی زبان اور خیالات پر پورا پورا قابو تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی عادت پر بھی۔ ساٹھ سال کی سگریٹ کی عادت کو آج سے ۵
سال پہلے ایک دن ڈاکٹر کے کہنے پر پینا چھوڑ دیا اور پھر سگریٹ کا کبھی ذکر بھی منہ پر نہ آیا۔ کھانا بہت اچھا ہو، اُنیس بیس کا فرق
بھی ہوا تو انھوں نے گرفت کر لیا اور باورچی کو بلا کر ہدایت دیتے مگر خود بہت تھوڑی مقدار میں کھاتے۔

اپنی دس روز کی علالت میں جب وہ اسپتال میں تھے، گو کہ بالٹیوں خون منہ سے نکل چکا تھا۔ آٹھ گھنٹے کا آپریشن کر کے
پیٹ کی تین آنتیں کاٹ کر پھینک دی گئی تھیں، پر جب ہوش میں آئے تو یوں جیسے سوتے سے اٹھے ہیں۔ جسم کے ہر حصے
میں نلکیاں لگی ہوئی خون چڑھ رہا ہے، آکسیجن لگی ہے، لیکن جیسے ہی کوئی ملاقاتی، کوئی دوست عیادت کو آیا، تو جس کا جس قسم کا
مضمون ہوتا اس سے اسی بحر میں بات کرنے لگتے۔ بے شمار شعروں سے شاعروں کو اپنا حال سنا دیا۔ انتقال والی رات کو ایک گھنٹہ
پہلے تک بیٹے کو فارسی میں تصوّف کے اشعار سنائے اور ان کا ترجمہ کر کے بتاتے رہے۔ اسپتال میں منہ میں ایک قطرہ پانی نہ دیا گیا
تو ایک مرتبہ بھی پانی نہ مانگا، یوں ۲ جون ۱۹۹۲ء کو صبح ۵ بجے ایک عظیم انسان اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

مجھے اس وقت اختر کے "گردِ راہ" ختم کرتے کرتے یہ جملے یاد آ رہے۔ "اب خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں رہا۔
گلبانگِ فجر کے وقت جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو ستارۂ صبح مسکرا کر کہتا ہے یونانی اساطیر کا یہ گمان صحیح ہے کہ جسمِ خاکی
سے جدا ہو کر روحیں افلاک میں تاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اختر سوختہ تو میرے قریب آ، تیرے لیے ایک خاص مقام کا
تعین ہو چکا ہے۔"

۱۲، نومبر ۱۹۹۲ء

(بہ اجازت مصنفہ)

عالمَ میں اِنتخاب

SHARBAT
ROOH AFZA

رُوح افزا
ہمدرد
انٹرنیشنل

قومی زبان (۴۱۴) جون ۱۹۹۳ء

محمد رضا کاظمی

رائے پوری کے تبصرے

(ان تبصروں کا مقابلہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی محفوظ فہرست "تبصرہ" سے کر لیا گیا ہے جس کے لیے میں محترمہ بیگم اختر حسین رائے پوری کا از حد ممنون ہوں۔ (م-ر-ک)

تبصرے ادبی تنقید کا پہلا زینہ ہوتے ہیں۔ ابتداً ایسا نہیں تھا۔ لارڈ میکالے کے مضامین جو ادبی اور تاریخی تنقید کے نشان راہ تھے وہ اپنے پیرائے میں کتابوں پر تبصرے، تھے مگر یہ تبصرے زیر نظر موضوع پر لارڈ میکالے کی فکر و مطالعہ سے اتنے گراں بار ہوتے کہ زیر تبصرہ کتاب صرف ایک بہانہ بن جاتی۔ یہ غیر متناسب پیرایہ تنقید کا بہت دنوں جاری رہنا ممکن نہ تھا چنانچہ جب ادبی تنقید کی رفتار میں سرعت آئی تو کتابیں، مقالے، مضامین اور تبصرے اپنی اپنی سطح پا گئے۔ اس تقسیم کے نتیجے میں تبصرے عملی تنقید تک محدود ایک مختصر ادبی روداد کی شکل اختیار کر گئے۔ گویا موضوع کے رخ سے دیکھیں یا ناقد کے رُخ سے، تبصرہ ایک ضمنی ادبی صنف تنقیدی صنف نظر آنے لگی۔ صرف چند موقعوں پر تبصروں کی حیثیت ضمنی نہیں، کلیدی ہو گئی ہے اور ان میں سب سے نمایاں مثال اختر حسین رائے پوری کے تبصروں کی ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی نظری تنقید سے واقفیت رکھنے والا ہر فرد اس کا اقرار کرے گا کہ گو ان کی ہفت زبانی نے اردو تنقید کو ایک آفاقی نظر عطا کی تاہم جہاں تک اردو ادب کے فنی جائزے کا تعلق ہے ان کی نظر صدر پر نہیں حاشیے پر رہی ہے۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری پر اپنے پہلے مضمون میں، میں نے درج ذیل شکایت کی تھی کہ

> "اردو کے ادیبوں کا مستقبل اردو سے وابستہ ہے اور اردو ادب پر اختر حسین رائے پوری کی تحریروں کا تناسب کم ہے اس لحاظ سے، کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے عملی تنقید میں اپنے امکانات پورے نہیں کیے۔" (۱)

اس رائے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی کہ اختر حسین رائے پوری کے تبصروں کو شامل مطالعہ کرنے کے بعد بھی ان کی نظری تنقید کا پلہ گراں رہتا ہے۔ تاہم ہماری شکایت کا بھی کافی حد تک ازالہ ہوتا ہے کیوں کہ تبصرہ نگاری تنقید کی ایک جبری صنف بھی ہے جس کے نتیجے میں ناقد تازہ اور مقبول مطبوعات سے سروکار رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ جبر سب سے زیادہ اختر حسین رائے پوری کے حق میں مفید ثابت ہوا کہ یہ تبصرے ان کی تنقید نگاری کی ایک نئی جہت پیش کرتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کے تبصرے ان کی تنقید نگاری کے اولین دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء جب وہ سہ ماہی

"اردو" سے وابستہ تھے۔ "ادب اور زندگی" جیسے عہد ساز مضامین بھی اسی دور اور اسی رسالے میں شائع ہو رہے تھے اور یہ تبصرے بھی لیکن تبصرے نظروں سے اوجھل رہے کیوں کہ (۱) سوائے "میدان عمل" کے کسی کتاب کا تبصرہ ان کے تنقیدی مجموعوں میں نہیں آیا (۲) یہ ناخدا کے فرضی نام سے لکھے جاتے تھے اور ان کا انتساب واضح نہیں تھا۔

دریافت کی حیثیت سے شعری مجموعوں کے تبصرے سب سے اہم ہیں۔ اپنے مضامین مشمولہ "ادب اور انقلاب (جدید) میں انھوں نے صرف تین جدید اردو شاعروں پر براہ راست اظہار خیال کیا ہے اور وہ بھی بہت کفایت سے۔ یہ ہیں جوش ملیح آبادی، مجاز اور ن۔ م۔ راشد۔ تبصروں میں تین شاعروں کا جائزہ کلیدی ہے۔ آل احمد سرور، اثر صہبائی اور جوش ملیح آبادی۔ جوش ملیح آبادی کا نام دونوں فہرستوں میں مشترک ہے اور یہ فال نیک ہے کہ تبصروں میں جوش پر ان کی رائے مذکورہ مضمون سے کہیں زیادہ واضح، گہری اور تفصیلی ہے۔ "اردو" میں جوش کے حوالے سے تین مطبوعات پر تبصرے ہیں۔ جوش کے سو شعر ماہنامہ کلیم اور نقش و نگار:

ان تبصروں کی ایک خصوصیت ان کی دوطرفہ تازگی ہے۔ یہ اردو شاعری پر اختر حسین رائے پوری کی ابتدائی تحریروں میں ہے اور جوش کے ابتدائی جائزوں میں بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۵ء تک جوش کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ ان کا شعری تشخص بھی واضح ہو چلا تھا مگر ابھی راسخ نہیں ہوا تھا۔ ابتدائی ڈیڑھ مجموعوں "روح ادب" اور "شاعر کی راتیں" تک وہ رئیس ملیح آباد کے لاحقہ سے آزاد نہیں ہو پائے تھے۔ ترتیب اشاعت کے اعتبار سے دیکھتے چلیں، پہلے نمبر پر دیکھیے جوش کے سو شعر۔

> "ترتیب میں حسن کلام کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسی نظمیں ملیں جن میں سو سے کم یا زیادہ شعر نہ ہوں۔ اس پابندی کی وجہ سے ان میں صرف ایک نظم شامل کی جاسکی جو واقعی جوش کی اچھی نظموں میں سے ہے۔ ہماری مراد "کسان" سے ہے۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر کوئی انجان جوش کے کمالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔" (۲)

ایک مختصر انتخاب پر بھی رائے سرسری نہیں، برمحل اور جچی تلی ہے۔ اس کے بعد کا تبصرہ جوش کے زیر ادارت شائع ہونے والے "ماہنامہ کلیم" کا ہے۔ اس بار بحث نظری اور گہری ہو گئی ہے:

> "اس میں جوش صاحب نے اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جسے اس رسالے کا افتتاحیہ سمجھنا چاہیے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ انقلاب کے منشا ہی سے ناواقف ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں قدرت کے جبر کے آگے انسان کی بے چارگی کا ذکر کرتے ہوئے صوفیانہ انداز میں اس کی تگ و دو پر تمسخر کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اسے نظام عالم کی اصلاح کی نصیحت کی گئی ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے پورا مقالہ بے ربط ہو گیا ہے اور اس کی حیثیت نثر نگاری کے عمدہ نمونے سے زیادہ نہ رہی۔ (۳)

یعنی وہی شکایت جو ان کی شاعری کی ہم رکاب رہی ہے۔ نفس مضمون بے اعتبار طرز اظہار جادو نگار۔ اس زمانے تک ادبی دنیا جوش کی اس خصلت کی عادی نہیں ہوئی تھی ورنہ اختر حسین رائے پوری جوش کے یہاں تضاد کی نشاندہی اتنی سنجیدگی کے ساتھ نہیں کرتے۔ اب اسی تبصرے کا ایک آدھا جملہ ملاحظہ ہو۔

> "غزل گوئی پر جوش صاحب کا مضمون بھی اچھا ہے۔" (۴)

گویا اتنے بڑے مسئلہ پر اختر حسین رائے پوری کا موقف نصف صدی سے ان صفحات میں پوشیدہ تھا۔ افسوس کہ غزل کے

نیم وحشی ہونے کے متعلق انھوں نے کوئی واشگاف بحث نہیں کی ورنہ غزل کی تائید ان کی نظری تنقید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس مقام پر وہ جوش کے دوش بدوش نظر آتے ہیں گرچہ غزل کی خامی کو اجاگر کرنا ان کا کوئی فوری مسئلہ نہیں تھا۔ اس نکتے کی وضاحت کا انھیں موقع بھی نہیں ملا کہ اس سلسلے کا آخری تبصرہ جوش کے نقش و نگار پر تھا جو ان کی نظموں پر مشتمل دوسرا مجموعہ تھا۔ اس تبصرہ کے شروع میں انھوں نے جوش کی لذّت اصولی کو اپنا ہدف بنایا ہے ان کے مطابق۔

"پورے مجموعے میں ایسی کوئی نظم نہ ملے گی جسے پڑھ کر ہم جوش صاحب کو شاعر انقلاب کہہ سکیں.... نقش و نگار کا شاعر اب تک اپنے ہیجانات کی تہذیب نہیں کر سکا ہے وہ کسی اصول یا خیال کا مدعی نہیں ہے...."

.... یار پری چہرہ کی رنگینی کو یہ آخری شعر یوں مجروح کر رہا ہے کہ گویا حوض کوثر میں بڑا مینڈک کود پڑا ہو:

اللہ کرے وہ صنم دشمن ایماں
مچلے کسی شب جوش کے پہلو میں دوبارہ

تھوڑا ضبط نفس ایسی بدعنوانیوں کا اعادہ نہ ہونے دیتا۔ جوش اردو شاعری کا بائرن ہے.... وہ (بائرن) اس آدمی کا ترجمان تھا جو حیوانیت کے دور سے گزرنا چاہتا ہے۔ لیکن انسانیت کے مطالبات اتنے سخت ہیں کہ مکر، ظلم اور جبر کے الزام لگا کر انھیں ٹھکرا دیتا ہے اور اس بے قدری کے بدلے ایک بہتر اخلاق کا مدعی بن بیٹھتا ہے..... فنی حیثیت سے جوش کا مرتبہ شاید بلند ہے..... فارم کے اعتبار سے وہ اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔" (۵)

پہلے ایک کتابیاتی وضاحت جوش کی انقلابی شاعری کا نقش و نگار میں نہ پایا جانا اس وجہ سے تھا کہ ان کی انقلابی نظمیں ان کے تیسرے مجموعے "شعلہ و شبنم" کے لیے مخصوص تھیں جس کی اشاعت اسی سال ہوئی۔ آخری سطریں دیکھیے کہ فن کی عمدگی کے اقرار پر فکر کی ربودگی کا بار کتنا گراں ہے۔ جوش پر نظری تنقید کا آغاز انھوں نے کلیم کے حوالے سے کر دیا تھا لیکن وہاں سیاسی پہلو حاوی تھا یہاں اخلاقی پہلو حاوی ہے۔ نفسیاتی توجیہہ کے اعتبار سے بائرن کی مثال جوش کی اپنی کسی تشبیہہ سے کم نہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جوش کی صرف ابتدائی نہیں اساسی تنقید ہے۔ اپنے دور آخر تک اختر حسین رائے پوری اپنے اس تجزیہ پر قائم رہے:

"دو چیزوں کی کمی ان کے یہاں محسوس ہوتی ہے ایک انٹلکچوئل فاؤنڈیشن ان کے یہاں نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ مورال فائبر نہیں تھا۔" (۵) اختر حسین رائے پوری کی انفرادی تنقید پر منحصر نہیں۔ جوش کی تنقید کے تمام اہم گوشوں پر ان کی سالاری عیاں ہے۔ جوش کے تصور انقلاب اور ان کی لذتیت کے بارے میں جو باتیں اختر حسین رائے پوری نے ۱۹۳۶ء میں یعنی ترقی پسند تحریک کے سال اجرا میں کہی تھیں انھیں خفیف سے تغیر کے ساتھ کلیم الدین احمد، فیض احمد فیض، خلیل الرحمان اعظمی اور کلام حیدری وغیرہم کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے جوش کے یہاں ناہمواری کی جو بات کی ہے اسے فی الحال جانے دیجیے کہ اسے محسوس کرنے والے بھی اس کا مناسب اظہار نہیں کر پاتے۔ جوش کی فنی برتری

اور فکری خامی پر بیک وقت اصرار بھی یہیں اردو تنقید کی سرشت میں داخل ہوئی ہے کہ اس تبصرے کی سب سے بڑی خامی میں بھی ان کے مقلد ایک قطار میں ہیں۔ خامی یہ ہے کہ اختر حسین رائے پوری نے جوش کے محاسن اور جوش کے معائب دونوں کی صحیح اور دیانت دارانہ نشاندہی کی ہے مگر انھوں نے اسے ایک دوشاخہ رہنے دیا۔ مجموعی رائے حل ہو کر نہیں آئی۔ بائرن کے حوالے سے وہ محاسن و معائب کی مشترکہ توجیہہ کے قریب آکر بھی وہاں سے گریز کر گئے اور یوں وہ نشاندہی اور رہنمائی کے نازک فرق کو عبور نہ کر سکے۔ بہرحال جوش کے باب میں اختر حسین رائے پوری کی رائے نقش کا لہجہ ہے اور اس کا اثر و نفاذ اس وجہ سے ہے کہ اختر حسین رائے پوری نے ایک اخلاقی معیار کا اطلاق اخلاقی دیانت کے ساتھ کیا ہے۔

غرض کہ جب جوش کی فنی برتری کو تسلیم کرنے میں اتنے تحفظات حائل تھے تو ان سے یہ امید کہ وہ آل احمد سرور کی شاعری کی پذیرائی کریں گے بہت موہوم ہو جاتی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب آل احمد سرور کا زیر تبصرہ مجموعہ "سلسبیل" شائع ہوا تو اس وقت تک ان کی شہرت ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی۔ اختر حسین رائے پوری نے جہاں شعر میں ان کا داخلہ روکنا چاہا اور تبصرے کے ابتدائی جملوں میں انھیں متشاعر کہنے سے گریز نہیں کیا:

> "کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یعنی ہر شعر خواں شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"(۶)

ضروری کوائف اور کچھ ضمنی مباحث سے ہوتا ہوا یہ تبصرہ وسط میں آکر کشادہ ہو جاتا ہے اور بحث کا پس منظر عمومی ہو جاتا ہے۔

> "مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں۔ یا تو شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بندی کر دے، پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے اور دریاؤں میں ایسے بھنور ڈال دے کہ ناظر سکتے میں آجائے اور سمجھ نہ سکے کہ یہ نظارہ خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔ یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر پذیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بیان کرے کہ سننے والے پر وہی کیفیت طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے کلام میں خارجی منظر کشی کے عمدہ نمونے ملیں گے۔ لیکن پیش نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو اجاگر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی، صرف مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کیفیت ہے جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔"(۷)

سمجھیں گے آپ کیا عملی ہے یہ شاعری! اگلے مرحلے میں تبصرہ نیاز فتحپوری کے زیر سایہ آجاتا ہے "سرمایہ" اور "مالہٗ و مالیہ" کا یہ سنگم اردو تنقید اور اختر حسین رائے پوری کی تنقید دونوں میں کمیاب ہے اس لیے اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

"اجنبی ترکیبیں اور ناموزوں بندشیں جا بجا نظر آتی ہیں: "مرے دل میں بھی لہریں سی کئی بے ساختہ اٹھیں (صفحہ ۲۷)

لہروں کی بے ساختگی یعنی چہ؟

جناب احمریں کی شوخیاں فرش زمرّد پر

مرا وہ راز جو یوں برملا افشا نظر آیا

(صفحہ ۲۰)

دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

عروس شعر نے پردہ اٹھایا روئے روشن سے
بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشیمن سے

(صفحہ ۴۱)

گویا شاخ نشیمن پر پنچھیوں کی طرح اہل نظر اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف پر پھیلائیں۔"

"یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے" (صفحہ ۴۰) نظر کی پرواز بھی ذوق نظر کی پرواز اور وہ بھی آخری پرواز سمند ناز پر یہ تازیانہ!

مگر لبوں پہ یہی ایک دعا نظر آئے (صفحہ ۵۹) دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا۔" (۸)

فی الحال اعتراضات کی صحت زیر بحث نہیں بلکہ ان اعتراضات کا بنیادی بننا جب اس مشق کے بعد رائے میں جماؤ آتا بھی ہے تو بس اس قدر:

"غزلوں پر اصغر گونڈوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں جگر مرادآبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے۔" (۹)

"غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غنیمت ہیں کہ ان گھڑ اور بے جوڑ ترکیبوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے" (۱۰)

غرض کہ یہ تبصرہ روایتی شاعری اور روایتی تنقید سے اختر حسین رائے پوری کی گہری شناسائی کی جھلک ہمیں دکھا دیتا ہے۔ شاید ان کی تنقید وحنہ ت کا یہی رنگ پکڑ لیتی اگر فوراً ہی ان کا گزر ایک زیادہ شگفتہ گوشے سے نہ ہو گیا ہوتا اثر صہبائی کے خمستان پر تبصرہ سابقہ تبصرہ سے پیوس ، ہے مگر تحمل میں نمایاں اضافہ محسوس کیا جا سکتا۔ اصل کتاب پر تبصرہ سے پہلے سیّد سلیمان ندوی کے مقدمہ کے متعلق یہ جملہ معترضہ سنئے ، چلیے:

"سیّد صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں۔" (۱۱)

اس میں شک نہیں کہ اختر حسین رائے پوری نے یہ تبصرہ بہت دل جمعی کے ساتھ کیا ہے۔ اثر صہبائی کے فطری رجحان کو وہ بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

"خود فراموشی کا وہ جذبہ کم کو میسر ہوتا ہے . حو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس کے بغیر
غزل بلکل روکھی پھیکی رہ جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اثر صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر
کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا ضبط ہے ..... غزل جس قسم کی
صناعی اور خود فراموشی کی طالب ہے، وہ اثر صاحب کو ودیعت نہیں ہوئی۔" (۱۲)

......اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایسے شعر بھی نکل جاتے ہیں کہ سخن شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا ہے.....

کچھ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاہیے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

مگر ایسے اشعار خال خال ہیں۔" (۱۳)

اثر صہبائی کی نظموں کو ان کی غزلوں سے بہتر قرار دینے کے بعد اختر حسین رائے پوری رباعی کو ان کا خاص میدان قرار دیتے ہیں:

"شاید یہ مبالغہ نہیں کہ جگت موہن لال رواں آں جہانی کے بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آلہا اودل ہیں۔" (۱۴)

اب دو مختلف مقامات کے جملے یکجا ملاحظہ ہوں:

"اثر صاحب جس اندوہ و ملال کی تلچھٹ پی رہے ہیں وہ فطری نہیں بلکہ ماحولی ہے۔ امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو اپنے دامن سے جھٹک دیں گے اور اس (کذا) کا آئندہ مجموعہ نوحہ غم نہیں پیام عمل ہوگا۔"

"راحت کدے میں شاعر نے اپنی رفیقہ حیات کی یاد میں جو قطعات کہے ہیں ان میں سے کئی پُردرد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوصِ جذبات صحیح صناعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔" (۱۵)

آخر میں اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں:

"اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے ہیں اور ان کا مستقبل روشن ہے۔" (۱۶)

خمستان پر تبصرہ اختر حسین رائے پوری کے معیار اور طریقہ کار کو سب سے شفاف صورت میں پیش کرتا ہے۔ جوش کی شاعری میں تخلیقی وفور بہت ہے اور تنقید کا رخ اس کی تہذیب اور سمت کی جانب ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری بعد میں موقر تنقیدی توجہ کا مرکز بنی مگر بہرحال تخلیقی وفور کے لیے مشہور نہیں۔ اثر صہبائی کی شاعری بین بین گویا معمول کی شاعری ہے۔ یہاں عیب کو عیب اور ہنر کو ہنر کہا گیا ہے۔ مگر تبصرہ ہمدردی سے کیا گیا ہے۔ پامال قفنیوں سے گزارنے کے باوجود شاعر کا نقش بھرپور طریقے سے ابھار دیا گیا ہے۔ اثر صہبائی ایک خوش گو شاعر تھے جن کی صلاحیتیں اوسط سے کچھ اوپر تھیں اور ان کے محاسن و معائب انفرادی سے زیادہ عصری تھے چنانچہ اس تبصرہ کا اطلاق محدود نہیں ہے۔ ضمناً یہاں اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ اختر حسین رائے پوری صرف تفصیلی تبصروں میں نہیں نہایت ہی مختصر تبصروں میں شاعر کی خصوصیات کا احاطہ کرنے پر قادر تھے مثلاً "آہ کے سو شعر" کے حوالے سے صفدر آہ کی شاعری کے متعلق یہ جملے ملاحظہ ہوں جو مکمل تبصرہ ہے:

"اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ سیتاپوری خوش فکر شاعر ہیں۔ حسن تغزل کے ساتھ ان کے کلام میں غور و فکر کی کمی نہیں۔ شعروں کا انتخاب خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔"

(۱۷)

اتنی منصفانہ رائے کا اتنی سہولت کے ساتھ ادا ہو جانا ایک دشوار مرحلہ تھا۔

شاعری سے زیادہ اختر حسین رائے پوری کا تعلق افسانوی ادب سے تھا کہ اردو اور ہندی کے افسانوی ادب میں ان کی عطا کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے لیکن افسانوی ادب کے تبصروں میں وہ ہمیں قدرے مایوس کرتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو حادثاتی ہے کہ اردو افسانوں کے اہم مجموعے بہت ہی کم تبصرے کے لیے آئے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ان کا یک طرفہ جائزہ لیا ہے۔ زیر تبصرہ کتابوں میں سے کم از کم نصف بچوں کا ادب ہیں۔ سب سے پہلے قاضی عبدالصمد کی دو کتابیں آتی ہیں ۱۔ "سودیشی اردو" اور ۲۔ "ضروری کہانیاں" اختر حسین رائے پوری نے ان کی کتابوں کی افادیت کو سراہا۔ پہلی کتاب، ان کے بقول "مولویانہ اردو اور پنڈتانہ ہندی کی جگہ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانا چاہتی ہے۔ (۱۸)

دوسری کتاب کی یہ خوبی ہے کہ یہ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے ان قصوں کے عوض جس سے نفرت بڑھتی ہو، ان حکایات کو پیش کرتی ہیں جن سے مذہبی رواداری اور یکجہتی کو فروغ ہو۔ یہی حال بچوں کی ان چار کتابوں کا ہے جن پر ایک ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ۱۔ میرزا مظفر حسین بیگ سیفی دہلوی کی "نیت کا پھل"، ۲۔ رقیہ ریحانہ کی "مرغی اجمیر چلی"، ۳۔ عطاء اللہ کی "شہزادی گلنار" اور ۴۔ محمد مجیب کی "شیدلا"۔ اس مشترکہ تبصرے میں وہ ثبوت دیتے ہیں کہ بچوں کے ادب کو وہ بہت چوکس ہو کر اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر بغائر کیا کرتے تھے۔

> "یہ چاروں کتابیں بہت آسان زبان میں لکھی گئی ہیں اور سوا شہزادی گلنار کے باقی تینوں سبق آموز بھی ہیں چھوٹے بچوں کی تربیت قوموں کے مستقبل کی ضامن ہوتی ہے۔ انھیں راجا رانیوں کی کہانی سنانے سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ بچوں کی لوریوں اور کہانیوں کی ترتیب میں ایسے مقاصد پیش نظر رکھے جائیں جن سے سماج اور انسانیت کو فروغ ہو۔" (۱۹)

خود بچوں کو ایسی رائے میں شاید تامل ہو تاہم یہ پیش نظر رہے یہ تبصرے بچوں کے لیے نہیں تھے۔ اس تبصرے کے بعد یہ کہنے کی حاجت نہیں رہتی کہ اپنے مضامین کے مقابلے میں جہاں وہ تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر توازن کے ساتھ پیش کرتے تھے ان تبصروں میں نظریہ سے ان کا شغف یک طرفہ ہے اور افادیت کا ایک محدود تصور ابھرتا ہے۔ اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انھیں جو اعتبار حاصل تھا، ان کا جو فنی تجربہ تھا اس کے شائبہ میں بھی یہاں ناظرین کو شریک نہیں کرتے۔ یہ نیت کی سلامتی کے باوجود شعوری اقدام تھا اور اس سلسلے میں اہم ترین تصنیف "شعلے" کے تبصرے میں اختر حسین رائے پوری نے زور و شور سے اس کی تصدیق کی ہے تبصرہ کے ابتدائی سطروں ہی میں اختر حسین رائے پوری اس کی صراحت کر دیتے ہیں کہ احمد علی کے افسانوں کو اور اس کے صواب و خطا کو فنی معیار پر نہیں جانچا ہے۔ نہ ان میں اسلوب بیان کی ندرت تلاش کرتا ہے اور نہ کردار نگاری کے کمال کا اندازہ لگاتا ہے...." (۲۰)

مصنف کا مدعا یہ ہے کہ متوسط طبقے کی زندگی کے اوچھے پن کو ظاہر کرے اور اس کا مقابلہ عوام کی زندگی سے کرے۔ جن پر سماج کے نظام کا دار و مدار ہے تصویر کے دو رخ "مزدور" اور "غلامی" میں اس تضاد کی طرف چند اشارات کیے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ "انگارے" کی اشاعت کے بعد احمد علی صاحب کے زاویۂ نگاہ میں ایک بیّن فرق پیدا ہو گیا ہے۔

"انگارے" کا آرٹ جنسی تشدد کا شکار تھا۔ اس کی تصویر بڑے شوخ رنگوں میں بنائی گئی تھی۔ لیکن "شعلے" کا ہر صفحہ اس تنگ و تاریک زندگی پر خندہ زن ہے......"

"شعلے میں کوئی پیغام نہیں ہے یہ گویا نشان راہ ہے جہاں رک کر راہ گیر اگلی پچھلی منزلوں کا جائزہ لینے لگتا ہے۔" (۲۱)

پیغام نہ ہونے کے باوجود اتنی توصیف کو خراج سمجھنا چاہیے کہ اختر حسین رائے پوری کے سکۂ نقد کی قیمت سکۂ رائج الوقت سے زیادہ رہی ہے۔ انھوں نے یہاں جس ہمدردانہ تفہیم کا مظاہرہ کیا ہے ان کے تبصروں میں کم ہے۔

فن افسانہ نگاری پر تو براہ راست ان تبصروں میں اور زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ البتہ مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی کتاب "افسانہ" کے حوالے سے گفتگو دلچسپ ہے۔ اس کتاب میں دو مقالے ۱۔ "افسانہ اور اس کی غایت" اور ۲۔ "اردو افسانہ"۔

پہلا مقالہ کل ہند ادبی کانفرنس منعقدہ ۶ جنوری ۱۹۳۶ء کلکتہ میں پڑھا گیا تھا اور اس کا تذکرہ ان دونوں ناقدین کے سباق میں برمحل ہے کہ کلکتہ کی یہ کانفرنس ترقی پسندی کو رجحان سے تحریک میں بدلنے والی پہلی کانفرنس تھی لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء کی کانفرنس کی اس حیثیت سے پیشرو ہر چند اس کا ذکر اردو ادب کی نظریاتی تاریخ سے مٹا دیا گیا ہے لیکن اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری دونوں کی تفہیم کے لیے اس کا حوالہ ضروری ہے۔ "ادب اور زندگی" جیسا عہد آفریں مضمون اس شعور کا پروردہ ہے جو اختر حسین رائے پوری کو قیام کلکتہ سے ملا اور مجنوں گورکھپوری کا یہ مقالہ بھی ان کے قیام کلکتہ کا مرہون منت ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے مقالے کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ شکایت بھی کی ہے کہ اس میں افسانہ کی تازہ ترین صورت کا تذکرہ نہیں ہے۔ اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری فن تنقید میں ہم مکتب تھے فن افسانہ نگاری میں ہم مکتب نہیں تھے۔ مجنوں گورکھپوری اصلاً ادب لطیف کے دبستان کے افسانہ نگار تھے اور اختر حسین رائے پوری نظریاتی تنقید میں ان پر سبقت رکھنے کے ساتھ افسانہ میں مجنوں سے زیادہ جدید رنگ کے مالک تھے اور وہ لازماً اسے اہمیت دیتے تھے۔

مضمون بجائے خود لائق تحسین ہے اور اس کا مطالعہ مبتدیوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ زمانۂ حال میں تحلیل نفسی اور اشتراکیت کے ادبی اسکولوں نے فن افسانہ نگاری میں جو انقلاب برپا کر دیا۔ مؤلف نے اس کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ بیان کچھ پرانا اور ادھورا رہ گیا۔ طامس ہارڈی کی توصیف میں غلو سے کام لیا ہے اور اس کے ایک ناول TESS کو طالسطائی کے شاہکار "اینا کرینینا" پر فوقیت دے ڈالی ہے۔ (۲۲) بعینہ یہی شکایت انھیں دوسرے مقالے "اردو افسانہ" کے متعلق بھی ہے:

"دوسرا مضمون اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ اس میں اردو کے حالیہ افسانہ نگاروں کے ذکر سے پہلو تہی کی (گئی) ہے...... سب نئے لکھنے والوں کو حقارت سے "ٹڈی دل" کہہ کر چھوڑ دینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بہرحال اس موضوع پر اردو میں جو تھوڑی سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ بھی غنیمت ہے۔" (۲۳)

افسانوی ادب کے ذیل میں کچھ اور بھی تبصرے ہیں مگر طبع زاد افسانوں کے نہیں تراجم کے چنانچہ تبصرہ ترجمے کی کیفیت اور ترجمے کے مسائل پر زیادہ زور دیتا ہوا تمام ہو جاتا ہے۔ اس لیے فی الحال ہم ان تبصروں سے صرف نظر کر سکتے ہیں۔ افسانہ سے ملتی جلتی صنف نثری ڈرامہ ہے اور اس دور کے تین ڈرامے اختر حسین رائے پوری کے زیر تبصرہ آئے دو ڈرامے اشتیاق حسین قریشی کے، بعنوان "نسیم شب"، "نفرت کا بیج" اور تیسرا محمد مجیب کا "انجام" یہ دونوں ڈرامہ نگار آگے چل کر شہرت و اقبال کے مالک

ہوئے مگر ڈرامہ نگار کی حیثیت سے نہیں مورّخ و معلّم کی حیثیت سے۔ اختر حسین رائے پوری کی طرح یہ بھی اپنا اپنا نظریاتی تشخص رکھتے تھے۔ فن ان کی بھی فکر کا تابع تھا اور ان صفحوں پر ڈرامے کے کرداروں کی طرح یہ نظریے بھی اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

پہلا تبصرہ محمد مجیب کے ڈرامے "انجام" پر ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع ہے "مذہبی اداروں کا استحصال" اور اس موضوع سے مبصر کی ہمدردی اس زمانے میں بہت واضح تھی مگر اس بنا پر ان سے کوئی رعایت حاصل نہ کر سکی۔ قصہ مختصراً یہ ہے کہ ایک حاکم عدالت شیخ نجم الدین پنشن پانے کے بعد اپنے گناہوں کے بوجھ کو محسوس کرتا ہے اپنی بیمار روح کے علاج کے لیے شیخ صاحب دو صاحبان خانقاہ کے پاس جاتے ہیں جو علاج کے عوض ان کی نفسیاتی کیفیت کو اتنا شدید کر دیتے ہیں کہ شیخ صاحب خود کشی کر لیتے ہیں۔ اس آموختہ کے بعد کا پہلا ہی جملہ ہتھوڑا ہے۔

"فنی اعتبار سے ہمیں اس ڈرامے میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔ شیخ صاحب کے ذہنی ہیجان کے گرد کوئی پر اسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں اتنی زیادتی کی گئی ہے کہ ڈرامہ بے نمک ہو گیا ہے۔" (۲۴)

جملۂ معترضہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے نمک کا لفظ برمحل نہیں معلوم ہوتا بلکہ بیان کردہ کیفیت کا مفہوم بہتر طور پر ادا ہوتا اگر یہ کہا جاتا کہ خوان تکلم کا نمک تیز ہے۔ یہ لفظی گرفت نہیں اگلے جملہ میں ان کا منشا ہماری فہم کی تائید کرتا ہے۔

"پلاٹ کے دو پہلو تھے جن سے ایک نہ ایک کی وضاحت ضروری تھی۔ یا تو سجادہ نشینوں اور خرقہ پوشوں کے مکروہ چہرے بے نقاب کیے جاتے اور یا پنشن خوار عبادت گزاروں کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کیا جاتا۔ ڈرامے کے نصف حصّے تک موضوع میں ابھار موجود تھا جو بعد میں بالکل دب گیا۔" (۲۵)

فنی نکات کی تہہ میں وہ جتنا یہاں اترے ہیں افسانوں کے تبصروں میں نہیں اترے تھے اس تبصرہ کی یہی اہمیت بہت تھی مستزاد اہمیت یہ ہے کہ اس سے اختر حسین رائے پوری کی رواداری اور محاذ آرائی کی پیمائش آسان ہو جاتی ہے موضوع مرغوب تھا مگر فنی نقطۂ نظر سے وہ اس سے آگے نہیں جا پاتے کہ

"زبان کی سادگی اور صفائی ڈرامے کی خشکی کی تھوڑی سی تلافی کر دیتی ہے۔" (۲۶)

اس تبصرے کے آخری جملے کے بعد اگلے تبصرہ کا آخری جملہ پڑھیں:

"ڈرامے کا فنی معیار بھی پست ہے۔" (۲۷)

اس سے پہلے کی تمام سطریں اشتیاق حسین قریشی سے ان کا کھلا ہوا مناظرہ پیش کرتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ ڈرامہ سے زیادہ ڈرامہ نگار کے مطابق اس ڈرامے کا موضوع "نسیم شب" یعنی اشتیاق حسین قریشی کا اشتراکیت پر براہ راست حملہ:

"ہندوستان میں اس صدی کے اندر اشتراکیت بہت مقبول ہوگی۔ اس کے سیاسی مذہبی اور معاشرتی نتائج کیا ہوں گے؟ ..... تمثیل نگار صرف یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اس قسم کی تحریک اگر معرض وجود میں آئی تو افراد پر اس کا اثر کیا ہوگا۔؟ (۲۸)

اس کا براہ راست جواب اختر حسین رائے پوری ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

"تمثیل نگار کی صاف بیانی کے بعد اس بحث کا کوئی محل نہیں۔ کہ اس ڈرامے میں ان کی شخصیت نے بنیے اور پنڈت کو ہی اپنے جذبات کا آئینہ دار کیوں بنایا۔ البتہ ہمیں ساہوکار کی زبان سے ان کا یہ استدلال سمجھ میں نہ آیا کہ "میں روپیہ قرض دیتا تھا جس سے کسانوں کے بہتیرے کام نکلتے تھے۔ میں روپیہ نہ دیتا تو وہ کھیتی باڑی نہ کر سکتے .... مہاجنی اتنا برا کام نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔"

اس کا بالواسطہ جواب انھوں نے اس فقرے میں دیا ہے:

"ڈراما نگار نے ان صفحات میں جن لوگوں کو مردود قرار دینے کی کوشش کی تھی بین السطور میں وہی مخلص نظر آتے ہیں اور وہ پنڈت، زمیندار اور ساہوکار جو وطن کے ملجا و ماویٰ بتلائے گئے ہیں نہایت ہی شقی القلب اور سیاہ باطن معلوم ہوتے ہیں۔" (۲۹)

لہجے میں اتنی سختی کیوں آئی اس کا جواب بھی اختر حسین رائے پوری کی تحریر مہیا کر رہی ہے:

"قریشی صاحب ان لوگوں سے بہت خفا ہیں جو سماج میں ایسا تغیر کرنا چاہتے ہیں جس سے امیر و غریب کا فرق مٹ جائے اور ہر انسان کو زندہ رہنے کا موقع ملے۔ اس خفگی کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوا ہے۔ ان لوگوں کو جی بھر کر گالیاں دی گئی ہیں اور ان کے ذکر سے پہلے "کتوں" کا اسم صفت ہر جگہ نظر آئے گا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ وطن کو بین القومی جمہور کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سیٹھوں اور ساہوکاروں کی دست برد سے غریبوں کو نجات دلا رہے ہیں اور بنی نوع کو قومی و وطنی تعصبات سے آزاد کرا رہے ہیں۔" (۳۰)

اس مکالمے کی دو طرفہ سادگی ہمیں محظوظ کرتی اگر طاقت کا نظریاتی توازن آج اتنا بگڑ نہ گیا ہوتا۔ بیان میں گرمی سہی لیکن اختر حسین رائے پوری کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ جب تک للکارے نہ جائیں تبصرہ کو رزم گاہ نہیں بناتے۔ خود اشتیاق قریشی کے دوسرے ڈرامے پر ان کا تبصرہ اس دعوی کی دلیل ہے ڈرامے کا عنوان ہے "نفرت کا بیج" اور موضوع ہے "دوستی" اپنے مختصر تبصرے میں اختر حسین رائے پوری موضوع کا تعارف اور سماجی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ تنقید ہے تو اس قدر کہ:

"ڈرامے میں خود غرض دوستوں کی اصلی سیرت بے نقاب کی گئی ہے۔ زبان صاف اور مکالمہ فطری ہے مگر پلاٹ یا تحریر میں کوئی دل کشی نہیں۔" (۳۱)

ڈراموں کے سلسلے میں اور بھی تبصرے ہیں مگر طبع زاد ڈراموں کے نہیں۔ چنانچہ ان میں بھی افسانوں کی طرح ترجمے کی خوبی یا خامی کو ملحوظ رکھا گیا ہے تنقید کے ذیل میں بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی کتاب "افسانہ" کے علاوہ مخدوم محی الدین کی کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" پر تبصرہ شامل ہے مگر چونکہ مصنّف کی مبصر کے برعکس بنگلہ زبان سے براہ راست واقفیت نہ تھی۔ اس لیے حوصلہ افزائی کے باوجود وہ اس کتاب کی محدودات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ادبی تنقید سے قریب تر کتاب میر حسین الدین احمد کی کتاب "فلسفۂ برگساں" ہے۔ موضوع اور تصنیف کے مجمل تعارف کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اگر برگساں کی تعلیم کو تھوڑا کھرچا جائے تو وہ نٹشے کا ہم دوش نظر آتا ہے اور "قوت حیات" کے نام پر زور آور کی حکومت اور کمزور کی فنا کا مدعی بن

جاتا ہے۔

بہرحال برگساں کی تعلیم اپنے اثرات کے لحاظ سے اہم ہے اور زیر نظر رسالہ بہت صفائی کے ساتھ اس کی تشریح کرتا ہے۔" (۳۲)

ان صفحات میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ سیاسی، معاشی اور تاریخی کتابوں پر ان کے تبصروں کا جائزہ لیا جائے۔ تاہم یہاں اس قدر اعتراف ضروری ہے کہ جس اسناد کے ساتھ وہ ان موضوعات پر رائے دیتے ہیں وہ اردو کے تنقید نگاروں میں تقریباً نایاب ہے۔ مگر ہمیں خط فاصل بھی کہیں نہ کہیں کھینچنا ہے ورنہ ان موضوعات سے ان کی ادبی تنقید کو بالکل علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اختر حسین رائے پوری ان گنے چنے ناقدین میں تھے جو محض نظریاتی وابستگی نہیں دانشوری کے پورے عرض کے ساتھ ادب کی طرف آئے تھے۔

حاشیے

(تقریباً تمام حوالے سہ ماہی "اردو" (م) مولوی عبدالحق۔ اورنگ آباد ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۵ء کے ہیں اس لیے ماہ اشاعت اور صفحہ نمبر کا ہی حوالہ دیا جاتا ہے)

(۱)۔ ناخدا "جوش کے سو شعر" اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۷۲۴ (۲)۔ "کلیم" جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۵۹ (۳)۔ ایضاً ص ۱۶۰ (۴)۔ "نقش و نگار" اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص ۷۱۳ تا ۷۱۷ (۵)۔ رعنا اقبال، "ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے گفتگو" طلوع افکار (م) حسین انجم (کراچی جولائی ۱۹۹۱ء) ص ۳۴۸ (۶)۔ ناخدا "سلسبیل" جولائی ۱۹۳۵ء ص ۶۰۲ (۷)۔ ایضاً ص ۶۰۳ (۸)۔ ایضاً ص ۶۰۴ (۹)۔ ایضاً (۱۰)۔ ایضاً (۱۱)۔ خمستان ایضاً ص ۶۰۷ (۱۲)۔ ایضاً ص ۶۰۷ (۱۳)۔ ایضاً (۱۴)۔ ایضاً ص ۶۰۸ (۱۵)۔ ایضاً ص ۶۰۹ (۱۶)۔ ایضاً (۱۷)۔ "آہ کے سو شعر" اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۳۴ (۱۸)۔ سودیشی اردو جولائی ۱۹۳۵ء ص ۶۱۱ (۱۹)۔ بچوں کی چار کتابیں جولائی ۱۹۳۶ء ص ۴۸۱ (۲۰)۔ شعلے اپریل ۱۹۳۶ء ص ۲۹۵ (۲۱)۔ ایضاً ص ۲۹۷ (۲۲)۔ افسانہ جنوری ۱۹۳۷ء ص ۲۲۷ تا ۲۲۸ (۲۳)۔ ایضاً (۲۴)۔ انجام اکتوبر ۱۹۳۵ء (۲۵)۔ ایضاً (۲۶)۔ ایضاً (۲۷)۔ ایضاً ص ۷۴۳ (۲۸)۔ نیم شب ایضاً ص ۷۴۲ (۲۹)۔ ایضاً (۳۰)۔ ایضاً ص ۷۴۳ (۳۱)۔ نفرت کا بیج جولائی ۱۹۳۶ء ص ۴۸۱ (۳۲)۔ فلسفۂ برگساں اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۷۲۲ تا ۷۲۳

ڈاکٹر محمد باقر

ہم دلی یا ہم زبانی؟

(چیف جسٹس ریٹائرڈ قدیر الدین احمد سے معذرت کے ساتھ)

فضل الٰہی (لائبریرین) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور میں لندن کے ایک مقام پر بس سے اُتر گئے۔ قریب ہی ایک سپاہی کھڑا تھا میں نے ٦۔ کارک اسٹریٹ کا پتہ پوچھا جہاں ہم ڈاکٹر محمد بخش (کیپٹن بعد میں کرنل الٰہی بخش کے والد اور قائداعظم جناح کے معالج) سے ملنے جا رہے تھے۔ سپاہی نے حیرت کے انداز میں ہم دونوں کو گھورا اور خاموش کھڑا رہا۔ فضل الٰہی نے حسب معمول مجھے کھینچ کر ایک طرف کر دیا اور لندنی سپاہی سے مخاطب ہو کر بولا:

"ہو وچ وائے از ٦۔ کوک اسٹریٹ؟" (WHICH WAY IS ٦ CORK STREET) سپاہی انگریزی سن کر روایتی انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا: "فولومی سر" (FOLLOW ME SIR) اور پھر روایتی آداب کے مطابق ایک مکان پر پہنچ کر اُس نے گھنٹی بجائی اور ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ملا کر سلام کر کے چلا گیا۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔

اہلیہ اور میں نیویارک سے واشنگٹن اپنی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ راستے میں کچھ دیر ایک گاؤں پڑتا ہے جہاں کے لوگ ابھی تک کسی میکانکی وسیلے سے سفر نہیں کرتے۔ اہلیہ نے ایک دکان سے ایک شیشی خریدی میں ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ اشارہ کیا۔ قریب پہنچا تو اہلیہ نے کہا کہ یہ دوکاندار کوئی زبان بول رہی ہے جس کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ فرانسیسی تھی۔ قیمت دے کر دکان سے باہر نکل آئے۔

امریکہ بفیلو میں قریب کی گلی میں ایک نوجوان مرغی فروش تھا اُس سے مرغی تلوا کر میں ذبح کر کے اُسے دے دیتا تو وہ پر صاف کرنے والی مشین میں ڈال کر ہمیں صاف کر کے لوٹا دیتا ایک دن اُس کی اطالوی ماں کاؤنٹر پر تھی۔ ہم نے انگریزی بولی تو وہ ہاتھ کا اشارہ کر کے دکان میں غائب ہو گئی۔ نوجوان آیا اور اُس نے معذرت کی۔ اماں انگریزی نہیں سمجھتی حالانکہ دس سال سے یہاں ہے۔ ہم اطالوی ہیں۔ (حالانکہ امریکہ میں آباد کاری کی پہلی قانونی شرط ہے کہ آپ انگریزی بول، سمجھ اور لکھ سکتے ہیں)۔

میں نے کہا "کڑیے چھیتی چھیتی وہیلی ہوجا" میری بیٹی انجلا نے گھور کر مجھے دیکھا اور ایک اضطراری انداز میں چیخ کر کہا "اماں!" اہلیہ پاس ہی تھیں فرمایا اردو میں کہیے۔ بیٹی چودہ سال کی ہے۔ پنجابی نہیں سمجھتی۔ اہلیہ خود افغان ہے۔

فقیر نے گھر کی چھوٹی سے اکائی سے لے کر ایک ملک کی وسیع زمین کا ذکر کیا ہے جہاں اُن کی زبان کے انداز بیان اور لہجوں میں فرق ہونے کے باوجود یگانگت اور اُنس کا احساس اُجاگر ہوا۔ انسانیت اور اخوت ہر جگہ کار فرما تھی۔ بعض ایسے ملک بھی دیکھے جہاں بیک وقت سرکاری طور پر ایک سے زاید زبانیں رائج تھیں مثلاً کینیڈا اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ۔ لیکن کیا مجال جو وہاں کے رہنے والے کسی ہم شہری سے دُجانگی کریں یا اُسے اپنے جیسا محب وطن نہ سمجھیں۔ زبانیں رکاوٹ نہیں ڈال رہی تھیں ہر ایک شہری

کو اسلامی مساوات اور حقوق انسانیت کے مطابق مراعات حاصل ہیں اور وہ ان سے متمتع ہو رہا ہے۔

اپنے وطن عزیز میں یہ طرز حیات مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ یہاں فرد کے حقوق منوانے کے لیے گزشتہ ۴۱ سال میں ہم نے اپنی ثقافت (جو قرآن مجید اور اسلام کے سوا کچھ بھی نہیں) کو کاملاً پس پشت ڈال دیا ہے منشیات فروخت کرنے والے کی ثقافت اور ہے، جمہوریت کے راستے سیاسی زینوں پر چڑھ جانے والوں کی ثقافت اور ہے۔ افسروں کی ثقافت الگ ہے۔ علماء کہلانے والے گروہوں اور جماعتوں کی ثقافت اور ہے۔ سیاسی میدانوں میں دوڑتے ہوئے انسانوں کے ہجوموں کا وزن اور طرح کیا جاتا ہے۔ قاتلوں، چوروں اور ڈاکوؤں نے معیار ثقافت علیٰحدہ بنا رکھا ہے۔ جاگیر دار، کارخانے دار، تاجر اور سرمایہ کار اپنی اپنی ثقافت کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ ان کے لیے کوئی زبان تقدس کا درجہ رکھتی ہے نہ اجتماعیت کی پرورش کرنے والی۔ مسلمان کے پاس متحد رہنے کے لیے صرف ایک ہی حربہ تھا اسلامی اخوت و مساوات۔ اُسے ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ فقیر کو یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیا میں (روس کے زہریلے اثرات کے زخم خوردہ) مسلمانوں کے گروہ سے جنھوں نے پُرتپاک انداز میں السلام علیکم کہہ کر مجھ سے معانقہ کیا۔ یہ بات پاکستان میں نہیں رہی۔ کیماڑی سے خیبر تک لوگ گروہوں، جماعتوں، فرقوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اس طول و عرض میں ہر گروہ کے افراد سندھی، پنجابی، بلوچ اور پٹھان ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ فقیر کے اپنے چھوٹے سے گھر میں سندھی، افغان، پنجابی اور بلوچ آباد ہیں۔ جن میں زبان کی وجہ سے کوئی کبھی تنازعہ نہیں ہوا۔ اس غریب خانے پر جی۔ ایم۔ سید، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ شاہ اور راشدی برادرز تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اسے مشرف کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قائداعظم نے فقیر کو گھنٹوں انٹرویو دیا ہے (تفصیل شائع ہو چکی ہے) مولانا سید سلیمان ندوی سے گورنر ہاؤس لاہور تک ملاقات رہی ہے۔ وہ وقت ہوا ہو چکے ہیں۔ وہ ثقافت یعنی خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی فضا سے معدوم ہو چکی ہے اور نتیجتاً وطن عزیز میں انتشار، بے چینی اور بے مروتی کا دور دورہ ہے۔ زبان یا زبانوں کی وجہ سے کہیں کوئی فساد نہیں۔

فقیر نے امریکہ میں انگریزی، ولندیزی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی، روسی، چینی، جاپانی، ہسپانوی، ہندی، اردو، عربی، فارسی اور کئی دیگر زبانوں کو مستعمل دیکھا ہے اور گروہوں کو آپس میں میز طور پر اپنی اپنی خوراک، لباس، اور وسائل تفریح کو سر عام استعمال کرتے مشاہدہ کیا ہے۔ واشنگٹن کے چائنا ٹاؤن میں کھانا کھایا ہے۔ میری لینڈ کے ولندیزی گاؤں میں رات بسر کی ہے۔ کہیں نفاق، بدمزگی، نفرت یا اکانت کو کارفرما نہیں دیکھا یہاں اپنے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے دن رات تگ و دو جاری ہے اور نفرتوں کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے۔

آئیے اس آگ پر اسلامی ثقافت کا پانی پھینک کر اسے بجھائیں۔ پاکستان صرف اسی لیے بنایا گیا تھا۔ جب یہ آگ بجھ جائے گی تو اس سے اتحاد، یگانگت اور اخوت کی فضا زبانوں کے اختلاف کے باوجود پیدا ہوگی۔ اور ہم ایک دوسرے کو برداشت کر سکیں گے زبانوں کا مسئلہ کوئی نہیں ہے اسے صرف قرآن مجید اور اسلام حل کر سکتا ہے۔ ورنہ سات کروڑ پنجابیوں کو پاکستان کی ۱۲ فیصد آبادی اردو سکھاتے سکھاتے کم از کم ایک ہزار سال صرف کر دے گی۔ فقیر کی بات نہیں مانتے تو زندگی کو تجارب کی آماجگاہ بنانے والے اور سطح زمین کو روس سے ناپتے ہوئے قونیہ تک پہنچ جانے والے درویش کی بات سن لیجیے جس نے کہا تھا

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است (مولوی)

یہ ملک اور اس کے رہنے والے صرف "ہم دلی" سے بچ سکتے ہیں صرف ہم زبانی سے نہیں۔

افتخار احمد عدنی

یادوں کا سفر۔ بابا ذہین شاہ تاجی

احباب میرٹھ کی ایک تقریب میں چند روز ہوئے مظفر ضیا صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے شاید اس پابندی سے متاثر ہو کر جو مجھ پر صدر انجمن نے غالب شناسوں کے لطیفوں سے احتراز کے سلسلے میں لگائی ہے یہ دل خوش کن بات کہی کہ ہمیں تو غالب کی ذات آپ کے غالب شناس دوستوں کے حوالے سے ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کی بیگم بھی تشریف لے آئیں۔ انھوں نے بھی غالب کے حوالے سے میری تحریروں میں دلچسپی کا اظہار کیا میں نے اُن سے پوچھا آپ نے میرا کون سا مضمون دیکھا ہے تو ان کے جواب پہ مجھے کچھ حیرت ہوئی انھوں نے کہا "غالب اور تصوف" اس مضمون میں غالب کے مسلک پر حسن عسکری کی سخت تنقید پر بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے غالب کے دو اشعار پر بے اماں ردِ عمل کا ذکر ہے۔ یہ خاصہ ثقیل مضمون ہے۔ لوگ خوامخواہ یہ سمجھتے ہیں کہ خواتین ہلکی پھلکی باتوں سے خوش ہوتی ہیں۔ یہاں صورت حال اس عام نظریے سے بالکل مختلف تھی کہ مرد کی دلچسپی حقیقت کی گہرائی اور عورت کی دلچسپی مجاز کی رعنائی میں ہوتی ہے۔ مظفر ضیا صاحب کو غالب کی طرحدار شخصیت اور میرے غالب شناس دوستوں کے قہقہوں اور چٹکلوں سے دلچسپی تھی اور ان کی بیگم کو غالب کے قلب پر وارد ہونے والی کیفیات سے یہ غالب کا تصرف نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے عام تصور کو بدلنے پہ بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر گفتگو کا رخ جگر صاحب کی طرف نہ مڑ گیا ہوتا، اور جگر صاحب کے رمی کے شوق اور رمی میں فضلی صاحب کی بہن سے بُری طرح ہار کے بے خواب راتیں گزارنے اور پھر فضلی صاحب کے ایما پر جگر صاحب کی دلجوئی کی خاطر ان سے ہار جانے کی باتیں نہ شروع ہو گئی ہوتیں تو میں بیگم مظفر ضیا سے ضرور "غالب اور تصوف" کے موضوع سے ان کی دلچسپی کا سبب پوچھتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر مظفر ضیا صاحب ہر صاحبِ ذوق کی طرح غالب کے بڑے مدّاح ہیں تو ان کی بیگم نے اس مدّاحی کے توڑ میں حسن عسکری اور مولانا فضل حق خیرآبادی کو اپنا حلیف سمجھا ہو اور میرے مضمون سے مظفر ضیا صاحب کو چڑانے کا کچھ مواد حاصل کر لیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ ازدواجی نزاع کی نہایت شائستہ صورت ہے، نہایت شائستہ، عالمانہ اور قابلِ تقلید۔ خدا کرے اور خواتین کو بھی ان کا اتباع کرنے کی توفیق ہو اور اگر وہ غالب کے کلام میں تصوف کے مضامین کی قدر داں ہیں۔ تو وہ میرے

لیے بہت لائق احترام ہیں۔

میں نے چاہا کہ اپنے غالب شناس دوست کو مظفر ضیا صاحب کی بات سنا کے انھیں غالب شناسوں کی اہمیت کے اعتراف کی خوش خبری دے دوں۔ لیکن ان کی بیگم اور ان کے دفتر والے دونوں ہی میری کوشش میں حائل رہے ان کی بیگم نے تو اس لیے ان سے میری بات نہیں ہونے دی کہ غالب کا ذکر آتے ہی قہقہوں کی گونج سے گھر کا سکون برباد ہو جائے گا۔ اور ان کے دفتر والوں نے ان کے چاروں طرف اتنے ٹیلیفون نمبروں کا جال بچھایا ہوا ہے کہ کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔ وہ کاروباری لوگ ہیں، انھیں غالب اور غالب شناسی سے کیا دلچسپی وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ادارے کی ایک قابلِ فخر شخصیت قہقہوں کے سیلاب میں ضائع ہو جائے۔ آج بہ مشکل ان سے رابطہ ہوا تو انھوں نے کھنک دار قہقہوں سے نوازتے ہوئے کہا کہ مظفر ضیا صاحب کے تاثرات کو قلمبند کر دو تا کہ لوگ بے محل اور بر محل کی بحث میں الجھے بغیر ہر موقع پر ان کی طرف سے شعرِ غالب کا ہدیہ قبول کر لیا کریں۔ میں نے کہا بے محل میں جو مزا ہے وہ بر محل میں کہاں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے چار شعر عطا کیے، حسب معمول قہقہوں کے درمیان۔ جن میں دو بر محل تھے اور دو بے محل۔ پانچویں کا وزن درست نہیں تھا، لہٰذا انھوں نے اسے محفوظ کر لیا۔ دیوان غالب دیکھ کر احتیاط سے عطا کریں گے لیکن چونکہ ان تمام اشعار کا تعلق سیاست سے تھا اس لیے انھیں لکھنا ضروری نہیں ہے۔

حضرت بابا ذہین شاہ تاجی پہ میرا مضمون پڑھنے کے بعد عبیداللہ قدسی صاحب نے کل مجھے فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جن باتوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر کے وہ شاہد ہیں، اس قسم کی وہ اور بہت سی باتیں دیکھ چکے ہیں، بابا ذہین شاہ صاحب کی زندگی میں بھی اور ان کے شیخ بابا یوسف شاہ صاحب کی زندگی میں بھی۔ میرا دل چاہا کہ ان سے مل کر ان کے مشاہدات سے استفادہ کروں۔ وہ بڑے مصروف آدمی ہیں۔ بیس کتابیں لکھ چکے ہیں اب اکیسویں کی تکمیل میں منہمک ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ملاقات کو اپنی کتاب کی تکمیل تک موخر کر دیا بہر حال ان کے فون سے مجھے اُن کی ہی ایک اہم بات یاد آ گئی اور اس لیے میں بابا صاحب کے ذکر کی ابتدا اُن ہی کے حوالے سے کرتا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں انتخابات کی گہما گہمی کے درمیان جب پی پی پی اور نو ستاروں کے متحدہ محاذ کے درمیان سخت آویزش تھی قدسی صاحب نے بابا صاحب سے پوچھا کہ وہ کسے ووٹ دیں بابا صاحب نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا "جسے چاہے ووٹ دے دیجیے" اس جواب پر قدسی صاحب کو حیرت ہوئی چند روز بعد وہ اپنی بیگم کے ساتھ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی بیگم جمیلہ خاتون کالج میں فلسفہ پڑھاتی تھیں۔ انھوں نے گفتگو شروع کی اور انتخابات کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ہدایت طلب کی کہ اس صورتِ حال میں وہ کسے ووٹ دیں۔ بابا صاحب نے وہی جواب دہرایا لیکن ایک اہم وضاحت کے ساتھ بابا صاحب نے کہا "جسے چاہے ووٹ دے دیجیے۔ میری کتاب میں دونوں میں سے کسی کا نام نہیں ہے۔" اور پھر یہی ہوا کہ انتخابات بے معنی ہو گئے کسی کو بھی اقتدار نہ حاصل ہوا۔

۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو رات ڈیڑھ بجے کے قریب بابا صاحب نے مُدّن قوال کو جو ہمیشہ اُن کے گھر پہ رہتا تھا اور ایک خاتون کو جو ان کی خدمت پہ مامور تھیں طلب کیا اور اپنا پستول نکال کے اس میں گولیاں بھریں اور پھر پستول کا رخ ان دونوں کی طرف کر کے کہا "مار دوں دونوں کو" قوال بیچارے کی تو جان نکل گئی۔ خدمت گزار خاتون نے نسبتاً زیادہ ہمت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا۔ آدھے گھنٹے تک دونوں کو اس آزمائش میں مبتلا رکھنے کے بعد بابا صاحب نے پستول نیچے رکھا اور دونوں کو جانے کی اجازت دی۔ دوسرے دن بابا انور شاہ صاحب جو اب سجادہ نشین ہیں بابا صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ رات کیا ہوا تھا۔ انھوں نے سنتے ہی کہا اس کے معنی ہیں کہ ملک میں مارشل لا لگنے والا ہے اور دوسرے ہی دن مارشل لا لگ گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا تھا کہ وہ نوّے دن میں انتخابات کرا کے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کریں گے۔ جب نوّے دن کی مدت پوری ہونے کو آئی تو میں نے باباصاحب سے سوال کیا کہ یہ صورتِ حال کب تک رہے گی تو بابا صاحب نے مسکرا کے کہا "ابھی چلنے دو۔" مزید تین مہینے گزرنے کے بعد میں نے وہی سوال دہرایا تو باباصاحب نے پھر کہا "ابھی چلنے دو" اگست ۱۹۷۸ء میں باباصاحب کے وصال سے پہلے ایک بار اور میں نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا بھی وہی جواب ملا تھا۔ اس وقت کسے یہ گمان ہوسکتا تھا کہ یہ چھوٹا سا جواب "ابھی چلنے دو" پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لا کی طرف اشارہ ہے۔

میں نے پچھلے مضمون میں اہل علم کے ساتھ باباصاحب کے حلم و تحمل کا ذکر کیا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے کے چند ہی روز بعد اعجاز محمد صاحب میرے پاس آئے وہ باباصاحب کی خدمت میں تقریباً پچیس سال گزار چکے ہیں اور اب تک سلسلہ تاجیہ سے بہت قریبی وابستگی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پہلی دفعہ مجھے کچھ ایسے واقعات سنائے جو بڑی معنویت کے حامل ہونے کے علاوہ بابا صاحب کے مزاج میں ایک ہلکی سی جلالی آمیزش کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مدتوں سے میری ملاقات ان سے ہر ہفتے ہوتی رہتی ہے لیکن اس سلسلے میں مضامین کے شروع ہونے سے پہلے انھوں نے اس قسم کا کوئی واقعہ مجھے نہیں بتایا جو واقعات انھوں نے مجھے سنائے ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

ایک دفعہ ایک جوان العمر شخص جو بہت مضطرب اور پریشان تھا باباصاحب کی خدمت میں آیا اور آتے ہی بہت بد تمیزی سے اُن سے مخاطب ہوا۔ باباصاحب تحمل سے اس کی باتیں سنتے رہے لیکن اس کے لہجے میں درشتگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ انھیں اشتعال دلانا چاہتا ہے۔ جب اس کی بد تمیزی حد سے بڑھ گئی تو باباصاحب کو جلال آگیا انھوں نے بلند آواز میں کہا کہ اس کا رویہ اس کے حق میں نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ وہ شاید یہی سننا چاہتا تھا۔ وہ فوراً بولا "تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو، یہی کروگے نا کہ میرا سب کچھ چھین لوگے۔ میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں، نہ گھر، نہ سامان، نہ دوست، نہ رشتہ دار اور کیا کروگے۔ مجھے دیوانہ بنادو گے مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں گا زیادہ سے زیادہ میری جان لے لوگے۔ میں پہلے ہی زندگی سے بیزار ہوں جو چاہے کرلو، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی باباصاحب کا غصہ ایک دم فرو ہوگیا انھوں نے بہت محبت سے اس سے کہا "تجھے کیا غم ہے۔" جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تیرا ہے۔ میں بھی تیرا ہوں۔" یہ سُن کے اس جوان کا دل بھر گیا بابا صاحب نے اُسے سینے سے لگالیا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کے بہت اطمینان سے رخصت ہوا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نہایت پروقار شخصیت والے عالم باباصاحب سے ملنے کے لیے آئے پہلے انھیں کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔ وہ آکے بیٹھے اور انھوں نے دھیمے لہجے میں گفتگو شروع کی۔ بتدریج ان کی آواز بڑھنا شروع ہوئی۔ ان کے انداز میں شدّت آگئی اور بالاخر ان کی آواز بہت بلند ہوگئی۔ باباصاحب بالکل خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ کے خاموش ہوگئے تو باباصاحب نے گفتگو شروع کی۔ باباصاحب کا لہجہ بھی ابتدا میں دھیما تھا۔ پھر اس میں تیزی آتی چلی گئی، یہاں تک کہ ان کی آواز بہت بلند ہوگئی۔ جب تک باباصاحب اس انداز میں گفتگو کرتے رہے وہ عالم سر جھکائے بیٹھے رہے جب باباصاحب خاموش ہوگئے تو پھر انھوں نے بولنا شروع کیا اور اسی طرح ان کی آواز بڑھ کے بہت بلند ہوگئی۔ باباصاحب خاموشی سے سنتے رہے۔ جب خاموش ہوئے تو باباصاحب نے بولنا شروع کیا اور وہ خاموش ہوگئے۔ اس طرح چار دفعہ ہوا۔ جب چوتھی مرتبہ باباصاحب تقریر کر کے خاموش ہوئے تو ان عالم نے مباحثے کو ختم کرتے ہوئے کہا "آپ کا میں بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔" باباصاحب نے بڑی محبت سے کہا "آپ مجھے بہت عزیز ہیں آپ میری جان ہیں۔" پھر دونوں اٹھ کے ایک دوسرے سے

بغل گیر ہوئے اور وہ عالم رخصت ہو گئے۔

اعجاز بھائی نے یہ واقعہ سنایا تو مجھے اس پہ بہت حیرت ہوئی میں نے ان سے پوچھا کہ اس عجیب گفتگو کا موضوع کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ اوّل تو ایسی صورت میں باباصاحب کے پاس بیٹھنا خلاف ادب ہوتا لہٰذا وہ برابر کے کمرے سے یہ گفتگو سنتے رہے دوسرے باتیں کچھ ایسے رمز و کنائے کے انداز میں کی جارہی تھیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ موضوعِ بحث کیا تھا میں نے ایک صوفی اور ایک عالم کی اس غیر معمولی ملاقات کے بارے میں غور کیا تو کچھ اس طرح کی بات سمجھ میں آئی کہ شریعت کو طریقت کی آزادہ روی اور ظواہر سے بیگانگی پر جو شکایات ہیں انھیں پوری شدّومد سے بیان کرنے کے لیے قدرت نے اُن عالم کا انتخاب کیا تھا اور طریقت کو جو شریعت کی کم مائیگی اور عبادات کی روح سے عاری ہونے کا گلہ ہے اس کے اظہار کے لیے بابا ذہین شاہ صاحب کو چُنا تھا چنانچہ دونوں نے ان ذمہ داریوں کا پوری طرح حق ادا کیا جو انھیں تفویض کی گئی تھیں اور اس بحث و تمحیص کے نتیجے میں شریعت اور طریقت کی مغایرت دور ہو گئی۔ واللہ اعلم

ایک اور واقعہ جو اعجاز بھائی نے سنایا وہ باباصاحب کے ایک نوجوان مرید کا تھا جو کسٹمز کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ نہایت لا ابالی اور غیر ذمہ دار تھا بات کرنے میں بھی بہت بیباک تھا۔ پولیس نے ایک بار جوا کھیلنے اور شراب پینے کے الزام میں گرفتار کیا۔ جب اسے تھانے لے جایا گیا تو وہاں اُس نے پولیس کے تشدد سے بچنے کے لیے کہا کہ وہ بابا ذہین شاہ صاحب کا مرید ہے۔ تھانیدار باباصاحب سے واقف تھا۔ اس نے فون کر کے باباصاحب سے پوچھا کہ کیا وہ واقعی ان کا مرید ہے باباصاحب نے کہا کہ ہاں وہ میرا مرید ہے، اُسے رہا کر کے میرے پاس بھیج دو جب وہ آیا تو اُسے دیکھتے ہی باباصاحب کو سخت غصہ آگیا۔ انھوں نے اُسے بہت ڈانٹا اور کہا اوّل تو ایسی بیہودہ حرکتیں کرتا ہے، اور پھر پکڑا جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کو میرا نام لے کے سلسلے کو بدنام کرتا ہے یہ سن کر وہ نوجوان بولا "سنبھال نہیں سکتے تو مرید کیوں کرتے ہو۔" اس غیر متوقع جواب پر باباصاحب کو ہنسی آگئی۔ انھوں نے سمجھا بجھا کے اسے رخصت کیا میں نے اعجاز بھائی سے پوچھا کہ کیا اس واقعے کے بعد اس نوجوان کی اصلاح ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اسی طرح اپنی روش پر قائم ہے۔ بس فرق اتنا ہوا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے احتیاط سے کرتا ہے تاکہ پکڑا نہ جائے اور سلسلے کی بدنامی کا باعث نہ ہو۔

اب میں طوالت کے خوف سے اس مضمون کو ختم کر رہا ہوں اور حسبِ سابق رسالہ تاج میں شائع شدہ ایک تحریر نقل کر رہا ہوں جس میں باباصاحب کی خدمت میں میری پہلی حاضری کا ذکر ہے، اس کے ساتھ ہی تاج کی تحریروں کا سلسلہ ختم سمجھیے۔

۱۹۶۷ء میں کراچی میرا تبادلہ ہوا، باباصاحب کے ایک خاص مُرید صوفی صاحب میرے ساتھ کام کرتے تھے اُنھوں نے یہ دیکھ کر کہ مجھے تصوّف سے ذوق ہے باباصاحب کی خدمت میں چلنے کا اصرار کیا مجھے ایک اور بزرگ سے بڑی عقیدت تھی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ باباصاحب کی خدمت میں حاضری اُن سے بے وفائی کے مترادف ہوگی اس لیے اُن کے اصرار کے باوجود مسلسل ٹالتا رہا۔ بالآخر ایک مجبوری کے تحت ان کے پاس جانا پڑا۔ ہوا یوں کہ میرے خالو خلیل الزّماں صدیقی جو اُس زمانہ میں میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا کوئی صورت بابا ذہین شاہ تاجی کے ہاں جانے کی ہو سکتی ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کیوں ان کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریڈیو پر اُنھوں نے باباصاحب کی ایک تقریر سنی ہے۔ اس تقریر کو سن کر اُنھیں یہ احساس ہوا کہ یہ صاحبِ مقام آدمی ہیں اور تصوّف کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ خلیل الزّماں صاحب کی بات سے مجبور ہو گیا۔ بات یہ

ں کہ وہ اس وقت ایک عجیب مرحلہ میں تھے۔ وہ ایک عرب بزرگ سے جو حیدر آباد دکن میں آکر بس گئے تھے بیعت تھے اُن کا م حبیب العدروس تھا۔ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ جب تک خلیل الزماں صاحب حیدر آباد میں رہے اور اُن کی وابستگی پنے شیخ کے روضہ سے رہی وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہے لیکن جب حیدر آباد چھوٹا تو ہر طرح کی پریشانیوں نے اُنھیں گھیر ۔ اور ان سب میں بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ اولیاالله کی نسبت ہی بددل ہونے لگے تھے پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ توحید کے خیال یں انھیں رسالت ماٰب صلی الله علیہ وسلم کی بارگاہ سے دوری ہونے لگی اور اگر اس بارگاہ سے دوری ہو جائے تو پھر دل کو چین ہیں نصیب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے صوفی صاحب سے کہا کہ میں اپنے خالو کے ساتھ بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ں۔

دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد صوفی صاحب ہمیں بابا صاحب کے ہاں تاج منزل لے گئے۔ بابا صاحب قالین پر بیٹھے ئے کچھ لوگوں سے مصروف گفتگو تھے جب ہم پہنچے تو وہ حضرات اجازت لے کر رخصت ہو گئے بابا صاحب اُٹھے اور خلیل الزماں ماحب سے بہت مسکراتے ہوئے بغل گیر ہوئے اور پوچھنے لگے کیسے زحمت فرمائی۔ خلیل الزماں صاحب نے کہا ایک مقام پر پھنس یا ہوں یہ سن کر بابا صاحب نے انھیں بٹھاتے ہوئے کہا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کسی مقام پر پھنسنے کا احساس ہی اُن لوگوں و ہوتا ہے جو وہاں سے نکلنے کے اہل ہوتے ہیں اور ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں ورنہ سب ہی کہیں نہ کہیں پھنسے ہوئے ہیں لیکن ن کو اس کا احساس نہیں۔ آپ کا یہ احساس تو بہت مستحق ہے۔ یہ سن کر خلیل الزماں صاحب کو بڑا اطمینان ہوا لیکن قبل اس کے لہ وہ اپنی مشکل بیان کرتے یا توحید و رسالت کا مسئلہ پیش کرتے بابا صاحب نے ایک عجیب پُر تاثیر تقریر شروع کردی اور وہ بھی پنے خاص موضوع یعنی مقام محمدی پر۔ اس گفتگو میں اُنھوں نے توحید اور محمدیت کو ایک دوسرے میں اس طرح سمویا کہ خلیل الزماں صاحب کے دل سے تشکیک کے سب کانٹے نکل گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں تو غیریت کا سوال ہی نہیں عینیت ہے، خدائے حضور ﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا، اُن کے عمل کو اپنی طرف منسوب کیا، کنکریاں تم نے نہیں ہم نے پھنکیں۔ جب یہ ہو تو حضور ﷺ سے قُرب الله سے بعد کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تقریر تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی، بابا صاحب نے خود فرمایا ہے: "میری داستان محمد ﷺ میری گفتگو محمد ﷺ....." جب بابا صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو خلیل الزماں صاحب کے چہرے پر عجیب اطمینان تھا اور انھوں نے یہ کہا کہ آپ نے میرے تمام مسئلے حل کر دیے۔ اس گفتگو کے بعد نہایت پُر تکلف چائے سے میزبانی ہوئی چائے کے بعد میں نے سوچا کہ میں بھی ایک مسئلہ بابا صاحب کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے کہا کہ وہ کون سی صورت حال ہے جس میں کوئی عمل جو شریعت کے خلاف ہو طریقت کے فتوے سے جائز ہو جاتا ہے اور حافظ کے اس شعر کی حقیقت کیا ہے:

به مے سجّاده رنگین کن گرت پیر مُغاں گوید
که سالک بے خبر نبود ز راه و رسم منزل ہا

بابا صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ جو سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں یہی سوال حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ سے بھی کیا گیا تھا۔ انھوں نے جواب دینے میں کچھ تامل کیا تھا لیکن جب اصرار بڑھا تو انھوں نے کہا کہ اس سوال کا جواب دینے میں مجھے شریعت کا عبا اُتار کر درویشی کی چادر اپنے کندھوں پر ڈالنا ہو گی۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور سوال کرنے والے سے وعدہ لیا کہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا چاہے وہ اسے خلاف شریعت ہی کیوں نہ معلوم ہو، جب اس نے وعدہ کر لیا تو شاہ

صاحب نے اُس رات اسے دلّی کے چاوڑی بازار میں کسی طوائف کے کوٹھے پر جانے کا حکم دیا۔ وہ شخص یہ سن کر سنّاٹے میں آ
جب اُس نے مفلوک الحال ہونے کا عذر کیا تو شاہ صاحب نے اسے پانچ روپے دیے اور وعدہ پورا کرنے کی تاکید کی اُسے اتفاق
ایک ایسی عورت ملی جو ساری رات جا نماز پر بیٹھی عبادت کرتی رہی۔ دوسرے دن اُس شخص نے شاہ صاحب کی خدمت میں حا
ہو کر سب ماجرا سنایا تو انھوں نے بدمزہ ہو کر فرمایا "میاں تم نے ہمارے پانچ روپے بھی ضائع کیے۔" پھر انھیں پانچ روپے دیے ا
تاکید کی کہ اس طوائف سے اس طرح ملنا جیسے شوہر اپنی بیوی سے ملتا ہے۔ چنانچہ یہ حضرت جبراً قہراً پھر اُسی طوائف کے کوٹھے
گئے دوسری رات اس نے پھر نماز پڑھنا چاہی اس پر یہ بولے کہ اب یہ سب نہیں چلے گا اور بڑھ کے انھوں نے اُس کا ہاتھ پکڑ
اپنی طرف کھینچا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی انھوں نے دیکھا کہ طوائف کے کوٹھے پر نماز پڑھنے والی عورت خود ان کی
اپنی بیوی تھی۔

حج سے واپسی پر بمبئی کے ساحل کے قریب جہاز کے طوفان سے پاش پاش ہونے پر قافلہ والوں نے انھیں مُردہ سمجھ کر چھ
دیا تھا لیکن انھیں ہوش آگیا تھا اور وہ دلی واپس آگئے تھے۔ قافلہ میں چوں کہ عورتیں اور ضعیف مرد شامل تھے لہٰذا ان لوگوں
سواریوں کا انتظام کرنے اور دلی تک پہنچنے میں ایک طویل مدت لگ گئی تھی۔ دلی کے گرد و نواح میں چند ہی روز پہلے ڈاکوؤ
نے قافلہ پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا تھا اور کچھ قبول صورت عورتوں کو چاوڑی بازار میں فروخت کر دیا تھا۔ ان ہی عورتوں میں
ان حضرت کی بیوی بھی شامل تھی۔ انھوں نے سارا واقعہ شاہ صاحب کو سنایا تو انھوں نے کوتوال شہر کے ذریعے جوان کا مرید تھ
ان کی بیوی کو نائکہ کی قید سے آزاد کرا کے ان حضرت کو دلوایا۔

یہ ایک واقعہ سنا کر بابا صاحب نے سارے مسئلہ کو حل کر دیا اور پھر فرمایا کہ بعض امور تکوینی ہوتے ہیں یعنی اُن کا تعلق اللہ
تعالیٰ کے حکم کُن سے ہوتا ہے اُن پر عمل کرنے پر سالک مجبور ہے۔ کیوں کہ حکمِ الٰہی کے سامنے احکام شریعت کی حیثیت ثانوی ہو
جاتی ہے یہی مفہوم ہے حافظ کے اس شعر کا۔

اس کے بعد بابا صاحب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ قرآن تو ایک
اولوالعزم صاحبِ شریعت پیغمبر کو بھی اس معاملہ میں بے بس کر دیتا ہے حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو بے گناہ قتل کر کے ایک
گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا لیکن قرآن ان کے عمل کو رضائے الٰہی کے عین مطابق قرار دیتا ہے بابا صاحب نے ایسی جامع اور خوبصور
تقریر فرمائی کہ اس مسئلہ کا ہر گوشہ روشن ہو گیا۔ بابا صاحب کے پاس تقریباً تین گھنٹے گزارنے کے بعد جب ہم واپس ہوئے تو میں
نے اس بات پر افسوس کیا کہ میں نے اپنے ایک خواب کو بابا صاحب کے سامنے تعبیر کے لیے پیش نہیں کیا اس پر خلیل الزماں
صاحب نے مجھ سے کہا کہ ذرا غور کرو گے تو تمھیں احساس ہو گا کہ تمھاری بات کا جواب تمھیں مل چکا ہے۔ جب میں نے غور کیا
معلوم ہوا کہ واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں میرے خواب کی تعبیر مجھے عطا ہو گئی تھی۔

یہ تھی بابا صاحب کی خدمت میں میری پہلی حاضری جس نے خلیل الزماں صاحب کو ان کی عمر کے آخری حصہ میں ایک
سخت مرحلہ سے نکال کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے لبریز کر دیا تھا اور جس نے بغیر سوال کے میرے ایک اہم خواب کی تع
دے کر مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ یہی حاضری میری بیعت اور ایک نہ مٹنے والی ارادت پر منتج ہوئی۔ میں گیا تھا خلیل
الزماں صاحب کی خاطر اور خود اُن سے وابستہ ہو گیا میں نے طرح طرح کے لوگوں کو بابا صاحب کی خدمت میں مختلف اغراض
حاضر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی کو صرف شعر و سخن کی نسبت سے، کسی کو لطیف سماع کی خاطر، کسی کو بابا صاحب سے بے

کرنے کے شوق میں بعض تو ایسے بھی آئے جو بڑی شدت سے تصوّف کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ شریعت کے علاوہ خدا تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے بعض صرف اس لیے آتے تھے کہ چونکہ باباصاحب کے پاس بڑے بڑے لوگ عقیدت سے حاضر ہوتے تھے ان کی سفارش سے اُن کے کام نکل جائیں گے لیکن ہوتا یہ تھا کہ جس کو باباصاحب نے شفقت کی نظر سے دیکھ لیا وہ اپنے سب اغراض ومقاصد کو بھول کر صرف ان کا ہی ہو جاتا تھا وہاں جانے والوں کی منزل بالآخر ایک ہی ہو جاتی تھی:

ایک ہی منزل پہ جا کر مل گئے دونوں ذہین
وہ چلے سوئے حرم ہم کوئے جاناں کی طرف

افتخار احمد عدنی

ایک قہقہہ انداز کی تاریخی دریافت

آج بروز جمعرات بتاریخ ۶ مئی ۱۹۹۳ء میرے غالب شناس دوست کی تمام محرومیاں دور ہو گئیں۔ انھیں مدت العمر کی تلاش کا ثمرہ مل گیا آج وہ کلام غالب میں قہقہے سے متعلق ایک شعر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور شعر بھی ایسا کہ لگتا ہے اس کا پہلا مصرع اُن ہی پر کہا گیا ہے وہ اپنے قدردانوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خوش خبری کا حقدار مجھے سمجھ کے سب سے پہلے مجھے فون کیا۔ سہ پہر کا وقت تھا میں سو رہا تھا۔ انھوں نے نادر شاہی حکم دیا کہ مجھے فوراً جگایا جائے جب میں نے رسیور ہاتھ میں لیا تو پہلے انھوں نے مجھے قہقہوں سے جھنجھوڑ کے نیند کا خمار دور کیا اور پھر اپنی دریافت کی حیرت انگیز خبر سنائی۔ جب میں شعر کے لیے تیار ہو گیا تو یہ مصرع سنایا:

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقتِ قہقہہ

اور پھر اس طرح قہقہے لگائے جیسے وہ واقعی ہاتھ پر ہاتھ مار کے داد طلب کر رہے ہوں۔ جب وہ کچھ دیر کے لیے رُکے تو میں نے اس مصرعے کو دو تین بار دہرا کے کہا کہ یہ مصرعہ غالب کا ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا کیوں۔ میں نے کہا ہاتھ پر ہاتھ مارنا اور قہقہے لگانا آپ کا شیوہ ہے۔ غالب کا محبوب ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا اور اگر وہ غالب سے اس طرح پیش آتا تو وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے۔ انھوں نے نہایت فاتحانہ انداز میں غالب کا یہ شعر پڑھا اور مجھے خاموش کر دیا:

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

"غالب تو خود اپنے محبوب کو اس قسم کی حرکتوں پر اکساتے تھے۔ وہ دانش وروں کی بے جان محبت کے قائل نہ تھے۔"

میں نے کہا "چلیے مانا کہ دھول دھپے کے شوق میں غالب نے کسی قہقہہ انداز کو دل دے دیا ہو۔ اب دوسرا مصرعہ سنائیے"

کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے

دوسرا مصرع سُن کے میری سمجھ میں آ گیا کہ انھوں نے قہقہے سے کیوں گریز کیا۔ میں نے اس کے معنی پوچھے تو وہ خود کچھ کرمکِ شب تاب، چاند کی پر افشانی اور یار کے قہقہوں میں کوئی خاطر خواہ ربط تلاش نہیں کر سکے۔ جب یہ گفتگو الجھتی چلی گئی تو انھوں نے تنگ آ کے کہا "شعر میں نے دریافت کر لیا ہے، معنی تم دریافت کرو۔"

میں شان الحق حقی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس شعر کے مطلب یا اگر ایک سے زیادہ مطلب نکلتے ہوں تو مطالب پہ روشنی ڈالیں ان کے علاوہ اس معاملے میں اور کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔

شعر خاصہ بے ڈھب ہے۔ پہلا مصرعہ تو ایسا کہ لگتا ہے جیسے داغ نے اپنے خاص حلقے میں بیٹھ کے کہا ہو۔ دوسرا مصرعہ بیدل کا ترجمہ لگتا ہے۔ کچھ اَن مِل بے جوڑ سا شعر ہے پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شعر غالب کا نہیں ہے متداول دیوان دیکھا نہیں ملا نسخہ عرشی دیکھا اس میں بھی نہیں ملا خدا بھلا کرے انجمن کا کہ اُس نے کالی داس رضا گپتا کا دیوان کامل شائع کر دیا ہے۔ اس میں یہ شعر موجود ہے۔

میرے غالب شناس دوست نے اس شعر کی دریافت سے اپنے طرز قہقہہ زنی کے لیے ایک معتبر سند حاصل کر لی ہے اور ساتھ ہی یاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام کا اہتمام بھی کر دیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

١٩٩٢ء کا افسانوی ادب

١٩٩٢ء کے مجموعی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ یہ سال معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے زرخیز رہا ہے۔ اس سال پرانے اور نئے دونوں قسم کے لکھنے والوں نے زبردست تخلیقی سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ لوگ جو "افسانے پر جمود طاری ہے" کی پھبتی کستے رہے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ بالخصوص نسبتاً کم سینئر اور نئے افسانہ نگار موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطحوں پر مختلف جہات کو آشکار کرتے ہوئے افسانے کی افزودگی کے مرحلے سے کامیابی سے گزرے ہیں جس کی بناء پر افسانے کا مستقبل روشن ہوتا نظر آرہا ہے۔

١٩٦٠ء کے اطراف سے افسانہ ہیئت، اسلوب، تیکنک، مواد اور موضوع کے جن تجربات اور جن فنی تبدیلیوں سے گزرتا رہا ہے اب ان میں ٹھہراؤ سا آگیا ہے اور تخلیق کاروں کو جن منزلوں کی تلاش تھی وہ اب اپنا پتہ دینے لگی ہیں۔ اب افسانہ اپنی ہیئت میں وہ تبدیلی لاچکا ہے جو نہ صرف اسلوب کو نکھار دیتی ہے بلکہ قاری کو اپنے مواد میں پنہاں دلچسپی کے مختلف عناصر کے زور پر اپنی گرفت میں ایک بار پھر سے لینے پر مجبور کر چکی ہے۔ یہ پورا عمل اس کہانی پن کی حرمت کو ثابت کرنے لگا ہے جس کی خواہش ہر سطح کا قاری جبلی طور پر کیا کرتا ہے اب بھی علامتیں ان علامتوں میں ڈھلنے لگی ہیں جن سے ماضی میں آسانی سے تفہیم نہ ہونے کے باعث پڑھنے والے، بیزاری کا اظہار کرنے لگے تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایسے فن کار جو بیانیہ کے استعاراتی پیٹرن میں کردار کے بجائے بیانات STATEMENTS اور تبصروں COMMENTS کے عوامل سے کام لینے لگے تھے ان کے یہاں وہ کردار نمودار ہونے لگے ہیں جنھیں ہم اپنے اطراف میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اور جن کے ناموں کے لیے الف، بے، تے جیسے حروف تہجی کی اب ضرورت نہیں پڑتی۔ اب فکر یا بصیرت واقعہ سے پھوٹ رہی ہے نہ کہ بیانات، ذاتی تبصروں، حکایات، اساطیر، بے مصرف فنتاسی یا کتابوں میں درج فلسفیانہ تحریروں سے۔ افسانوی فن میں یہ تبدیلی انتہائی خوش آئند ہے۔ آج حقیقت کے پیچھے چھپی ہوئی دوسری حقیقتوں کے اظہار سے جس طرح پڑھنے والے کے ذہن میں مسرت کے قمقمے روشن ہونے لگے ہیں وہ اس امکان کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ بہت جلد ہمارا افسانہ ماضی والے کارنامے انجام دینے لگے اور ہر سطح کا قاری اس کے خارجی و باطنی تجربات میں خوش دلی سے شریک ہونے لگے۔ شاید یہ تمہید طویل ہوگئی ہو لیکن ایک ایسے دور میں جب کہ جدید افسانے کے تعلق سے قنوطیت اور یاسیت کا اظہار ہونے لگا ہو اس امر کی تعریف از حد ضروری ہے کہ میڈیا کے دھماکہ خیز انداز سے

ہمارے معاشرے پر پنجے گاڑنے کے باوجود آج ہمارا افسانہ نگار خاصی فنّی اور فکری جست لگانے لگا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہ صرف جدید افسانہ کے زرّیں دور میں زندہ ہیں بلکہ ماضی کے مقابلے میں یہ اب ہمارا مقدر بننے والا ہے۔

لیکن یہ کوئی چلتا ہوا عمومی تبصرہ نہیں ہے۔ اس کے عقب میں ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والا ٹھوس افسانوی ادب ہے بلکہ وہ قابلِ ذکر افسانوی رجحانات ہیں جو محسوس اور نامحسوس طریقوں پر اپنے وجود کا احساس دلانے لگے ہیں۔

آج کے افسانے کا ایک خاص رجحان حقیقت کے بطون میں پنہاں دوسری ایسی حقیقتوں اور سچائیوں کا اظہار ہے جو پڑھنے والے کو انکشاف کی لذّت سے ہمکنار کر رہا ہے۔ منشا یاد کا افسانہ "درخت آدمی" جو اُن کے تازہ خاص خاص افسانوی مجموعے "درخت آدمی" میں بھی موجود ہے انسان کی مکمل ذات کی دریافت کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ کائنات کا محور ہی انسان ہے۔ ایسے دور میں جب کہ یہ کہا جارہا ہے کہ کائنات کی حشر سامانیوں میں انسان بے وقعت اور لایعنی وجود ہے "درخت آدمی" کا عام سا کردار اپنی درخت جیسی جہات کے ساتھ سچائیوں کے نئے زاویوں کو پیش کرتا ہے۔ منشا یاد ایسا فنکار ہے جس نے "بند مٹھی میں جگنو" کے ساتھ جس سفر کا آغاز کیا تھا اور اپنے تجربات میں نئی علامات اور استعاروں سے شہر اور دیہات دونوں زندگیوں کا کامیاب احاطہ کیا تھا اب فکری جہات کو واقعہ در واقعہ اپنے فن میں سمو رہا ہے اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُراثر افسانے لکھ رہا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اس کا افسانہ "دھند کے پیچھے" آج کے انسان میں پنہاں منفی سوچ کی گندگی کے مہلک اثرات کی نقاب کشائی کر کے منافقت اور ریا کاری کے نئے رخ دکھا رہا ہے۔ اس کے یہاں ماحول کی وہ جزئیات اپنی توانائی کے ساتھ سامنے آ رہی ہیں جو بور نہیں کرتیں بلکہ اپنی گرفت میں لے کر سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

> "شہر کی بہت سی گلیوں کی طرح یہ ایک تنگ اور تاریک گلی تھی دونوں جانب بوسیدہ مکانوں کی قطاریں جن کی دیواروں سے بارشی اور گندے پانی کے پائپ دیو قامت جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ جوڑوں سے رسنے والی غلاظت نے دیواروں کو داغ داغ کر رکھا تھا۔"

اس پس منظر میں ان کا شہری ویلن چودھری رشتے سے انکار کر دیتا ہے لیکن بعد میں جب پتہ چلتا ہے کہ اس کے علاقے کو گندہ علاقہ کہنے والا چودھری خود گندی سندی جگہوں پر جانے سے لگنے والی بیماری کا شکار ہے تو افسانے کا پورا پس منظر قاری کو نہ صرف چونکاتا ہے بلکہ اطراف کو گہری نظر سے دیکھنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ ایک اور رجحان ذہنی انتشار میں اپنے انجام سے بے خبری ہے۔ "وائے حسرتا" میں ڈاکٹر رشید امجد دنیا کے جنگل میں بپا ہونے والے ایسے تماشے کا بیان کرتا ہے جہاں منافقت کے راج میں درویش، سلطان اور دانشور سب شریک ہو کر ایک داخلی کربناک وجودی صورت حال کو جنم دے چکے ہیں اور ذہنی انتشار کے ساتھ ساتھ جو پُرشور ہنگامہ برپا ہے اس نے انسانیت کے خاتمے کی گھنٹیاں بجادی ہیں۔

> "شور ہنگامے اور مستی اور سرور میں یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ باہر سے بھی کوئی اندر گھس آئے ہیں اور مارنے والے اپنے نہیں باہر کے لوگ ہیں۔ میلے میں قتل و غارت کا ایک بازار گرم ہے۔ سر کٹ کر نیچے گر رہے ہیں لیکن مستی و سرور میں کسی کو اندازہ نہیں کہ مارنے والے کون ہیں اور کب اندر آئے ہیں۔"
>
> یہ رات کا آخری پہر ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ افسانہ نوشتہ دیوار کا کردار انجام دیتا ہے اور انتباہی افسانے عام طور پر قاری کے فہم و شعور کو مثبت طور پر متحرک کرتے ہیں۔

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور تماش گاہ ہے پاکستان سے ذرا دور ایک عرب ملک میں بالکل قریب جہاں اونٹوں اور اونٹنیوں کی دوڑ سے حقیقی پُر تشدّد لطف حاصل کرنے کے لیے کنگال اور نادار والدین سے ان کے بچے حاصل کیے جاتے ہیں اور انھیں ان اونٹوں اور اونٹنیوں پر باندھا جاتا ہے تاکہ ان کی بھیانک چیخوں سے اس دوڑ کو اور ان کے لطف کو مہمیز لگے خواہ وہ مر ہی یا معذور ہو جائیں۔ مادیت پرستی اور شقاوت قلبی کے مظاہر جو قحط کے موقعوں پر دیکھنے میں آتے تھے اب جدید تاریخ ان کو نئی کروٹ دے رہی ہے جہاں ماں باپ بچوں کو فروخت نہ کرنے کے باوجود اپنے وجود کو سہارا دے سکتے ہیں مگر مادی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہیں سرکار دو عالم آنحضرت ﷺ سے منسوب ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ "ہر پیغمبر کے دور کا ایک آزار ہوتا ہے اور میری اُمت کا آزار مادّیت پرستی ہوگا۔" آج کی دنیا میں جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ہمارے معاشرتی، تہذیبی، سماجی اور اقتصادی آزار مادّیت پرستی کی عطا ہیں اور ہمارا افسانہ مادّیت پرستی کے مہلک مظاہر کی خوب عکاسی کر رہا ہے۔ "تماش گاہ" نامی اس افسانے میں جسے معروف افسانہ نگار نجم الحسن رضوی نے تحریر کیا مکالماتی فضا بہت زبردست ہے۔ اس میں استاد احمد بچے سے کہتا ہے کہ اونٹ سے مت ڈرو۔ یہ تو ہمارے اندر ہیں ہر آدمی کے اندر.... آدمی کے اندر سب کچھ ہوتا ہے اس کے اندر شیر بھی ہوتا ہے اور شکرا بھی، اور لڑکے کو محسوس ہوا گویا اس نے دوڑ شروع ہونے سے قبل اونٹ کو رومال میں باندھ کر اپنے کھانے کے ڈبے میں بند کر لیا ہے.... پھر یہ ہی بچہ گر کر معذور ہو جاتا ہے طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس کا باپ سرکار سے کہتا ہے "میرا بچہ خوش نصیب تھا جو آپ کے پاس رہا۔ خیر اب اگر وہ کام کے قابل نہ رہا تو کیا ہوا ایک لڑکا اور ہے میرا...."

اس تماش گاہ کی فتنہ پردازی پر مزید روشنی ڈالنا بیکار ہے سب اس میں چھپے الیے کو سمجھ گئے ہوں گے۔ نجم الحسن رضوی اپنے دوسرے افسانوں مثلاً "بے خواب بستی" اور "مرجینا ہاؤس میڈ" میں بھی پڑھنے والوں کو معاشرے کی حقیقت پسندانہ عکاسی سے متاثر کرتے ہیں۔

اقبال متین بھی بھرپور توانائی کے ساتھ لکھ رہے ہیں ان کے افسانے "بے دلی پتہ پوچھے ہے" میں مادّیت پرستی کی اسی کیفیت کو گرفت میں لیا گیا ہے۔ جدید دور میں اب رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ بوڑھے باپ دوسرے شہروں میں سدھارے بیٹوں کے منتظر ہی رہتے ہیں اور پھر مایوسی کی حالت میں جان سے گزر جاتے ہیں اقبال متین کئی ادبی پرچوں میں نظر آتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح توانائی سے لکھ رہے ہیں۔ شمشاد احمد خاموشی سے افسانے لکھتے آ رہے ہیں اور پھر اچانک اپنے مجموعے "گرم ریت" کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے والوں کے ہجوم میں نمودار ہوئے اور اپنے فن سے پڑھنے والوں کو چونکایا۔ ۱۹۹۲ء میں ان کے کئی افسانے کئی ادبی پرچوں میں نظر آئے۔ ان کے یہاں موضوعات کی نیرنگی ہے۔ بڑے بچے اور عورتیں سب اپنی اپنی نفسیات کے ساتھ ان کے افسانوں میں در آتے ہیں۔ ان کا خاص موضوع انسان کے اندر چھپی ہوئی درندگی ہے جو اپنی خاص وضع میں کبھی کبھار درندوں کی صفات کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ مادّیت کے غلبے سے بھی وہ جاں بلب ہیں.... ریت ان کے افسانوں میں بنیادی علامت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جو انسان کے ہاتھوں سے سکون کے پھسل جانے، نیز اس کی ذہنی کجی، زندگی کی بدہیئتی اور اُس کے مسخ ہو جانے کی معنویت واضح کرتی ہے۔ ان کے افسانے "ریت پر بارش"، "گرم ریت کے مسافر" اور چند اور بھی قابل ذکر ہیں۔ انھیں اپنی رفتار دھیمی کرنا چاہیے تاکہ معیار برقرار رہے۔

کچھ افسانہ نگار فیملی مین FAMILY MAN یا گھر دار آدمی کے معاشرتی، سماجی اور جنسی مسائل کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان میں سلطان جمیل نسیم، طاہر نقوی وغیرہ شامل ہیں سلطان جمیل نسیم کا افسانہ "دھند" اور طاہر نقوی کا "سچ" اس کی کامیاب مثالیں ہیں۔

عورت کے ساتھ بہت سے معاشرتی مسائل جُڑے ہوئے ہیں جو اکثر جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ اتفاق سے عورت کے مقدرات کے بارے میں قرۃالعین حیدر سے لے کر زاہدہ حنا اور زاہدہ حنا سے فردوس حیدر تک بہت متاثر کن افسانوی مواد ملتا ہے۔ فردوس حیدر مسلسل اسی موضوع کو الگ الگ افسانوی فریم ورک میں سجا کر پیش کر رہی ہیں۔ ان کے یہاں جنس کا ایک دبا دبا سا احساس ملتا ہے جو فحاشی کے ذیل میں کبھی نہیں آتا۔ "نیلے آنسو" بڑا چونکا دینے والا افسانہ ہے چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسانی وارداتوں کا انوکھا بیان اور تجسس کے عنصر کے ساتھ کہانی کو ایک عجب ڈگر پر لا کر ختم کرنا ان کا مخصوص فن ہے۔ حسّاس عورت کی منزل کے بارے میں ان کا قلم مرد کی مکروہ جذباتی کیفیات کے دلچسپ حوالوں سے دلچسپ ان کہی کو پیش کر دیتا ہے جس سے پڑھنے والا یقیناً متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح نیلم احمد بشر "اپنی اپنی مجبوری" فرزانہ رضوی "بے نوا ہجوم" میں اس موضوع کو خوب نبھاتی ہیں لیکن شہناز پروین کا افسانہ "جنت گم گشتہ" اپنی فکری بالیدگی کی بنا پر بہتر افسانہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ مسرت لغاری کا افسانہ "کینسر" اُمِ عمّارہ کا افسانہ "ایک شمع تھی دلیل سحر" حمیدہ معین رضوی کا افسانہ "ریت کے ذرّوں میں بکھری ہوئی ذات" عذرا اصغر کا افسانہ "زندگی کی ڈھلتی شام" اور محسنہ جیلانی کا افسانہ "بھٹکی ہوئی روح" سب نئے ذائقے فراہم کرتے ہیں۔ اردو افسانہ متنوع تیکنیکوں اور منفرد موضوعات سے مالامال ہے۔ یہاں فنتاسی اور انوکھے واقعات سے ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جس کی تفہیم میں زیادہ آسانی نہیں ہوتی۔ احمد ہمیش کا سیریز کا افسانہ "پش اینڈ پُل" اقبال فریدی کے افسانے "بانجھ بڑھیا انٹرنیشنل اور مٹی کا ٹوٹی والا لوٹا" اور نگہت رضوی کا افسانہ "پہچان" اس کی مثالیں ہیں۔ احمد ہمیش کا سیریز کا افسانہ "پش اینڈ پُل" ۵ داستانی اسلوب کی ایک مثال ہے جس میں گہری عصری حقیقتیں اور تاریخ کے دیے دکھ جلوہ گر ہیں۔

ان مثالوں سے ہٹ کر ڈاکٹر مشرف احمد کا افسانہ "جہاز" بھی توجہ چاہتا ہے منشا یاد کے افسانے "درخت آدمی" کی مانند اس میں مشرف احمد نے انسان کو اس شکستہ پانی کے جہاز سے تشبیہہ دی ہے جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی جینے کا سلیقہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس افسانے میں ان گنت مسائل کے دوران انسانی مدافعت کا پہلو قابلِ ذکر ہے شپ بریکنگ کی صنعت اور کلفٹن پر کھڑے ناکارہ جہاز کے حوالے سے کچھ یوں بتایا گیا ہے:

> وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا تھا کہ جہازوں کو توڑنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے ہفتوں مہینوں درجنوں افراد دن رات ہتھوڑوں کی ضربات سے انھیں توڑنے میں مصروف رہتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جہاز آخری دم تک مدافعت کرے گا۔"

پرانے لوگوں میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "ایک یک لباس آدمی" خاصی توجہ چاہتا ہے اس میں ایک نام سا کریم بخش نامی کردار اہم ہے جو محبت اور خلوص کی آج کے دور میں نایابی کا احساس دلاتا ہے اس کے یہ الفاظ خوب ہیں.... "یہاں آدمی تو دن میں سینکڑوں ملتے ہیں صاحب جی پر پیار سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے اس کھڑکی میں سے ہی دکھائی دیتی تھیں اور آج کل کون کسی سے پیار کرتا ہے صاحب جی؟"

اسی طرح انتظار حسین کا افسانہ "بخت مارے" نوجوان پڑھے لکھے ڈاکوؤں کے شوق ڈکیتی پر اچھا افسانہ ہے جس میں انتظار حسین نے اپنے جاری ساری اسلوب میں معاشرہ پر خوب طنز کیا ہے۔ ممتاز مفتی ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہیں چھوٹے چھوٹے بلیغ فقروں میں کہانی کی تعمیر میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ "آن آف" تخلیقی قوت کی اعلیٰ مثال ہے۔ انھوں نے گزشتہ دس بارہ برسوں میں جو جدید قسم کے افسانے لکھے ہیں وہ ان کی ذہنی وفکری بلکہ فنی صلاحیتوں کی دلالت کرتے ہیں۔ تخلیقی ادب میں "ہانٹڈ ہاؤس" جیسا افسانہ چھپوانے والا یہ بوڑھا ادیب حیرت انگیز طور پر انسان کے اندرون بالخصوص جنس کی کارفرمائیوں کو علامتوں کی نزاکت اور لطافت کے ساتھ بیان کرنے میں آج بھی پرانے والے تخلیقی جوش کا مالک ہے! مرزا ادیب کا افسانہ "مسئلہ حل ہو گیا ہے" ان کے خاص روایتی فن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ البتہ احمد یوسف کا بہترین ناولٹ "پستی کے مکیں" طوائفوں کے قدیم ادارے کے موضوع کی تجدید کرتا ہے۔ "آنندی" کے موضوع کو جدید پیرائے میں احمد یوسف نے اس گندگی کی پوٹ کے شریف محلوں میں آباد ہو جانے سے برآمد ہونے والے سماجی فساد اور اُتھل پتھل کو خوب برتا ہے اس میں تمام کردار آج کے ہیں اور اپنی پوری ریاکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں اس میں طنز مردجاتی ہی پر کیا گیا ہے اور اشاراتی طور پر اس سوال کو اٹھایا گیا ہے کہ کیا مرد کبھی اپنے اندر کے گند کو صاف کرنے کی زحمت گوارا کرے گا یا مزے لوٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کو مصنوعی طور پر پاکیزہ رکھنے کا ڈرامہ بھی رچاتا رہے گا۔ آخر میں محلے سے مجبوراً اٹھ جانے والی طوائف خوب سوال کرتی ہے؟

"میں زلیخا بائی، ٹھیٹھری بازار کی ایک ادنیٰ طوائف تمھارے درمیان سے چلی جاؤں گی۔
میں چلی جاؤں گی۔ لیکن تم ٹھیٹھری بازار سے کب تک دامن بچاؤ گے۔ ٹھیٹھری بازار تو
تمھارے اردگرد آباد ہے۔ تمھارے دلوں میں آباد ہے۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔؟"

جوگندر پال بھی احمد یوسف اور انتظار حسین کی عمر کے گروپ میں شامل ہیں ایک طویل عرصے کی ریاضت کے بعد ان کے گزشتہ کئی برسوں کے افسانوں میں جنریشن گیپ "GENERATION GAP" ٹوٹتے رشتوں، مذہبی ریاکاریوں، مرد عورت کے درمیان نازک رشتوں میں دراڑوں کے پڑنے اور بوڑھے لوگوں کی مخصوص سوچ جیسے موضوعات پر ان کے یہاں بہت اچھے افسانے ملتے ہیں۔ اندھوں کی زندگی پر معاشرتی وسیاسی تمثیل پر مبنی ناول "نادید" بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ ان کا افسانہ "بے وصال" تو قابل ذکر ہے ہی لیکن ناسٹلجیا اور ہجرت کے احساس پر مبنی افسانہ "فاختائیں" غالباً ۱۹۹۲ء کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ "فاختائیں" میں ہجرت کے عذاب کو موضوع بنایا گیا ہے جو زندگی کی آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہجرت کا موضوع ایک آفاقی عالمی موضوع ہے اس زمانے میں جب کہ نئے نئے ملک وجود میں آرہے ہیں اہل دل سمجھ سکتے ہیں کہ اس موضوع کو یقیناً دوام حاصل ہوگا اور ہجرت سے پیدا شدہ مسائل کے نئے نئے رخ سامنے آتے رہیں گے۔ "فاختائیں" میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر کی آزادی کے وقت چونڈے سے لوبھ سنگھ دہلی آگیا لیکن چونڈے کے فضل دین کو نہ بھول سکا جو اس کا ساتھی مدرس تھا۔ لوبھ سنگھ دہلی میں ٹیکسی چلانے لگتا ہے لیکن چونڈا اس کے خوابوں میں آتا رہتا ہے۔ فضل دین کے بھیجے ہوئے خطوط اس کے خوابوں کو مہمیز لگاتے رہتے ہیں۔ وقت اسی طرح گزرتا رہتا ہے اور لوبھ سنگھ کا لڑکا جسونت سنگھ اس کی حالت دیکھ کر حیرت کرتا رہتا ہے ایک وقت آتا ہے جب تصور ہی تصور میں وہ بغیر پاسپورٹ ویزے کے دہلی سے اپنی ٹیکسی لے کر فوراً چونڈا آجاتا ہے اور فضل دین کے پوتے پوتیوں وغیرہ کو ٹیکسی میں بٹھالیتا ہے منظر کچھ یوں ہے:

کھڑا کیا ہے اور ہارن کی پوں پوں سے اس کے سارے پوتے پوتیوں اور دوہتے اور دوہتیوں کو اکٹھا کر کے گاڑی میں لاد کر دلی اڑا لایا ہے یہ دیکھو قطب صاحب کی لاٹ! یہ لاٹ صاحب کا دفتر یہ لال قلعہ، ہاں بھائی سبھوں کو ایک ایک قلفی دے دو۔ کھاؤ پترو"

ایک جگہ لوبھ سنگھ سوچتا ہے:

"صورت احوال یہ ہے کہ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ دن رات چپ چاپ پڑا رہتا ہوں اور صرف وہ ہی گھڑیاں کام کی لگتی ہیں جب ذرا آنکھ لگ جاتی ہے اور میں اپنے چونڈے جا پہنچتا ہوں۔"

افسانے کے آخر میں لوبھ سنگھ خط لکھ رہا ہے۔ اس کا بیٹا جسونت سنگھ، چڑ کر کہتا ہے۔ "تسی تے پاگل ہوگئے ہو۔ بھاپے۔ چونڈے کا چاچا فضل دین تو مر مُک چکا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ "ارتقا" کے اگست ۱۹۹۲ء کے شمارے سے لیے گئے اس خوبصورت افسانے کو ہمارے پڑھنے والے لوگ مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے اسی طرح احمد داؤد کے افسانے "جڑیں" کو پڑھ کر بھی ہجرت کے نفسیاتی مسائل سے زبردست آگاہی ہوتی ہے احمد داؤد نے اسے سارک ممالک کے ایک وفد کے کردار کے حوالے سے ہماری سوچ کو متحرک کیا ہے۔ اس لحاظ سے افسانے میں ہجرت کے رجحان نے پڑھنے والوں کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ غیر ممالک میں اس خطے سے جا کر آباد ہو جانے والے لوگوں کے دکھوں کا بھی اردو افسانے میں مہجر ادب کے تحت اظہار ہو رہا ہے اور وہ بھی ان ادیبوں کے ذریعے جو کہ خود ہی وہاں رہ رہے ہیں ایسے لوگوں میں ڈاکٹر خالد سہیل، نصر ملک، منیر الدین احمد، سعید انجم وغیرہ نمایاں ہیں۔

اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں رسائل چھپ رہے ہیں اور براہ راست حاصل کیے جانے والے افسانوں کے انتخاب بھی شائع کیے جا رہے ہیں اس لیے سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے بہر صورت کچھ اور نام یاد آ رہے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے نقش جمائے ہیں اور مختلف معاشرتی سماجی اور تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے ان میں سے کئی فنکاروں کے افسانوں میں ماجرے کا شیرازہ خاصا گاڑھا ہے اور کچھ لوگوں نے نجی علامتوں اور مشکل فینتسیاتی صورت ہائے احوال میں پناہ لی ہے اور زندگی کی لایعنیت اور انسان کی عدم پہچان اور بیگانگی ایسے مسائل اٹھائے ہیں اور انسان کی ہذیانی کیفیات کی اچھی عکاسی کی ہے اسی طرح شہر کے جان لیوا مسائل بھی ابھارے گئے ہیں۔ افتخار نسیم کے "ناگزیر" اور "خواب کچھ اس طرح کا ہے" ذکیہ ارشد حمید کا افسانہ "کٹی پتنگ" الطاف فاطمہ کا "گئے دنوں کا سراغ" عذرا اصغر کا "زندگی کی ڈھلتی شام" ملکہ افروز کا "ہیلو" ادا کار طلعت حسین کا "صندوق" نسرین قریشی کا "ہاں" بشریٰ اعجاز کا "حل" نفیسہ حق کا "پہلا دن" شائستہ فاخرہ کا "کلر بلائنڈ" خالدہ شفیع کا "انٹلیکچوال" دیوندر اسر کا "آر کی ٹیکٹ" شرون کمار ورما کا "کسی کام تو آئے" احمد صغیر کا "مسیحا" مشتاق مومن کا "شطرنج پرندے اور انقلاب" مشرف عالم ذوقی کا "بچھونا" علی اختر کا "تالیاں" جتندر بلّو کا "ہم قدم" انور خاں کا "کہانیوں کا شکاری" رام لعل کا "ہم نہیں" نورالہدیٰ سیّد کا "ان کہی" آثم مرزا کا "وقت کتنا سخی ہے" گلزار جاوید کا "موی" بنگلہ دیش سے زین العابدین کا "کاغذ کا ٹکڑا" اور ایوب جوہر کا "نوکری" سلیم آغا قزلباش کا "چڑیل" میجر ابدال بیلہ کا "معانقہ" ارشد رضوی کا "سورج اور وہ" محمود شکیل کا "تماشا" انور خواجہ کا "پیکار" شمس نعمان کا "جنگل میں گمشدہ شہر" قمر احسن کا "اسپ کشت مات نمبر ۱ اور نمبر ۲" عذرا نقوی کا "قصوروار" حفیظ احسن کا "نمود صبح" محمد بیگ بلوچ کا "انعام" رفیق علی خاں کا "قرض" رفعت نواز کا منظر پس منظر، کہکشاں کنول کا "اچھا جی" عابدہ رفعت کا "دو گز

زمین" رضیہ حسین کا "ذائقہ" مسعود اشعر کا "میں بہت خوش قسمت ہوں" غنی طارق کا "آواز" غنی پرواز کا "نسخہ" ناصر بغدادی کا "دل ڈوبنے کا منظر" "چشم دید گواہ" الفضل مراد کا "دوسرا سچ" سیما پیروز کا "اپنا اپنا غم" منشا یاد کا "ایک اور اچھا افسانہ" "زائد المیعاد نیکی" خورشید احمد شمی کا "فرشتہ، محمد سعید شیخ کے افسانے "خلش" اور "بحران" مرزا ادیب کا افسانہ "مسئلہ حل ہوگیا ہے" وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ معروف افسانہ نگار جیلانی بانو کے دونوں افسانے "گوشت کے بیوپاری" اور "جوائے" ۱۹۹۲ء کے دیگر قابل ذکر افسانوں کی طرح یاد رکھے جائیں گے گزشتہ تین چار سالوں سے ان کے یہاں نہ صرف فکر کی گہرائی ملنے لگی ہے بلکہ ابعاد کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ پروفیسر علی حیدر ملک نے "دیوار کا لکھا" میں بڑی چابکدستی سے سیاسی و مذہبی جماعتوں اور دیگر اداروں کی جانب سے دیوار پر لکھائے گئے نعروں کے ذریعہ ان کی مخصوص ذہنیت اور عوام کی بے حسی کی تصویر کشی کی ہے۔ خالدہ حسین کے یہاں "بلیک ہول" اور "گواہی" میں ان کا مخصوص ماجرائی فن جلوہ گر ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے "گڑ کی بھیلی" اور "نقطے سے نقطے" نشاط فاطمہ نے "رزم گاہ" مرزا حامد بیگ نے "رات" سلیم آغا نے "زرد بالائی" احمد جاوید نے "بھیڑیے" علی تنہا نے "گائے" ممتاز احمد [illegible] نے "حکمت عملی، ا، نمبر ۲" اور "فرد جرم" میں "شمس نعمانی نے "ٹیلیفون اور خدا" میں کچھ نئے مضحکہ خیز پہلوؤں اور مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کے ہاتھوں انسان کی بے چارگی میں اضافہ ہوا ہے اور اس کی زندگی عذاب کا شکار بن کر رہ گئی ہے اور روشنی کہیں نظر نہیں آتی ان کے علاوہ بھی بہتیرے فنکار ایسے ہیں جنھوں نے مذکورہ موضوعات کو برتا ہے جن میں منیر الدین احمد، نیر مسعود، آصف فرخی، اطہر نیاز، امجد طفیل، شہنم شکیل، پروفیسر ایش کمار، مقصود الہیٰ شیخ، محمد خالد اختر، اسد محمد خاں، دلیپ سنگھ، غلام محمد، گلنار آفرین، شکیلہ رفیق، رحمٰن نشاط، نسیم سترکھی، معین دانش، شام بارک پوری، یوسف چوہدری، نعیم آروی، صفیہ صدیقی، شمع خالد، سلطان سبحانی، رضا الجبار، اکرام بریلوی، رضوان صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ اکادمی ادبیات نے افسانوں کا مرزا حامد بیگ کا مرتب کردہ انتخاب بھی شائع کیا جس پر ملی جلی آرا سامنے آئیں۔ یہ کام جاری رہنا چاہیے۔

اس سال علاقائی اور بین الاقوامی افسانوں کے تراجم بھی تسلسل کے ساتھ سامنے آئے۔ مترجمین میں منیر الدین احمد، نصر ملک، جمال نقوی، آمنہ پناہ، چندر کانتا، ریحانہ احمد، سعید انجم، رفیق نقش، معین نظامی، محمد زبیرانی، ڈاکٹر محمد ریاض، پروفیسر عبدالسلام، شعیب احمد، رعنا اقبال، عائشہ رندھاوا، محمود احمد قاضی، آفاق صدیقی، فرخندہ لودھی، مسعود اختر شیخ، حیدر جعفری سید، ڈاکٹر منظور ممتاز، احمد سعدی، صہیب فخری، عطا صدیقی، محمد عمر میمن، احمد صغیر صدیقی، عبدالکافی ادیب، انور سن رائے، منظر سلیم، اسلم رانا، ممتاز احمد خان، انور زاہدی وغیرہ شامل ہیں۔

بچوں کے لیے ادبی ناولوں کے ترجمے کے لیے مسعود برکاتی کا نام نمایاں ہے۔ کچھ ڈائجسٹ بالخصوص اردو ڈائجسٹ افسانوں اور ناولوں کے اچھے ترجمے چھاپ رہے ہیں۔ اس ڈائجسٹ نے رواں اور سلیس ترجمہ کرنے والوں کی اچھی ٹیم تیار کی ہے۔ "اخبار جہاں" اور "اخبارِ خواتین" میں طبعزاد ناول بھی چھاپے جا رہے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف فکشن کا زور و شور ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ وقت بہت ظالم شے ہے۔ اچھی تحریروں کو وہ چھان پھٹک کر محفوظ کرتا رہتا ہے۔ ۱۹۹۲ء ہی میں اکادمی ادبیات نے ایک قابلِ تعریف کارنامہ یہ انجام دیا کہ پاکستان سمیت اسلامی ممالک کے بہترین افسانوں کے ایک مخصوص شمارے میں تراجم چھاپے یہ شمارہ کتاب کی حیثیت سے محفوظ کرنے کے قابل ہے۔ ادھر معروف شاعر و ادیب قمر جمیل نے اپنے رسالے "دریافت" میں ۱۹۹۲ء کی نوبل انعام یافتہ جنوبی افریقی افسانہ نگار و ناول نویس ادیبہ نڈائن گورڈیمر کی چیدہ چیدہ کہانیوں کے لیے ایک پورا شمارہ وقف کیا اور ان کے فن کے جائزے بھی نمایاں انداز سے چھاپے۔

۱۹۹۲ء میں کئی افسانوی مجموعے سامنے آئے۔ ایک دو ایسے مجموعے بھی تھے جو ۱۹۹۱ء کے اواخر میں آئے مگر ان کے امپیکٹ IMPACT کو ۱۹۹۲ء ہی میں محسوس کیا گیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کا مجموعہ "مٹھی بھر سانپ"، ڈاکٹر رشید امجد کا "دشتِ نظر سے آگے"، نعیم آروی "بستی کا آخری آدمی"، فردوس حیدر کا "پتھر میری تلاش میں"، ممتاز مفتی کا "ان کہی"، رحمن مذنب کا "بالاخانہ"، آصف فرخی کا "چیزیں اور لوگ"، طارق محمود کا "بند دروازہ"، سعید پرویز کا "نہ وہ سورج نکلتا ہے"، ہاجرہ مسرور کا "سب افسانے میرے"، حسن منظر کا "انسان کا دیش"، اختر جمال کا "خلائی دور کی محبت"، فرخندہ لودھی کا "خوابوں کے کھیت"، حمید اختر کا "لامکاں"، سلطان جمیل نسیم کا "ایک شام کا قصہ"، غلام الثقلین نقوی کا "سرگوشی"، وقار بن الٰہی کا "کس سے کہے وہ"، انور زاہدی کا "عذاب شہر پناہ"، منیر الدین احمد کا "شجر ممنوعہ" اور چند اور مجموعے منظر عام پر آئے۔ ناولوں میں ممتاز مفتی نے اپنے پہلے ناول "علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصہ "ایلی اور الکھ نگری" کے عنوان سے پیش کیا جس میں ان کا سب سے بڑا مشاہدہ عورت کے بجائے ایک مرد قدرت اللہ شہاب مرحوم ہیں جن کے لیے انھوں نے آغاز میں لکھا ہے کہ وہ بڑا انسان تھا اور اس کا مسلک محمد ﷺ MUHAMMAD HOOD تھا۔ احمد داؤد کا ۱۹۸۱ء میں "جواز" میں "بستی" کے عنوان سے چھپنے والا ناول نظر ثانی کے بعد "رہائی" کے نام سے سامنے آیا۔ اس ناول پر بحثیں کچھ دنوں بعد آئیں گی۔ مستنصر حسین تارڑ سفر ناموں کے لیے زیادہ معروف ہیں ان کا جدید انداز سے لکھا گیا ناول "بہاؤ" سامنے آیا جس پر ایک مضمون میں ڈاکٹر رشید امجد نے جواب لکھا ہے کہ مستنصر کا مسئلہ صرف اپنی جڑوں کی تلاش نہیں بلکہ اس سارے عمل کی بازیافت ہے وہ ایک اہم پیغام دے رہا ہے کہ ہم نے جو اپنے گرد حصار کھینچ لیا ہے اور تازہ ہوا اور نئے امکانات کے راستوں کو جس طرح روکا ہے وہ بہت خطرناک ہے یعنی یہ ناول نوشتہ دیوار کا کردار انجام دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس ناول پر بانو قدسیہ کے متنازعہ ناول "راجہ گدھ" کی طرح تادیر گفتگو چلے۔

صاحبو اس قسم کے جائزے عام طور پر تھوڑے بہت نامکمل ہی ہوتے ہیں مگر اپنی بساط بھر کوشش کی گئی ہے کہ معروضی بحث کی جائے اور غالب رجحانات کا احاطہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ اہم ادبی جرائد کے مطالعہ کے ذریعے افسانے اور ناول کے میدان میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ نام نادانستہ طور پر رہ گئے ہوں۔ ویسے یہ امر قابلِ تعریف ہے کہ اس صدی کی اس آخری دہائی میں ہمارے کئی سینئر اور جونیئر فنکار اپنی اپنی فہم و فراست اور دقیقہ شناسی کے زور پر مختلف فنی و فکری جہات کے ساتھ افسانے اور ناول تخلیق کر رہے ہیں اس کو اور اردو زبان کے پھیلتے ہوئے عالمی افق کو دیکھتے ہوئے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میدانوں میں ہمارا مستقبل تابناک ہے۔

پنجابی کہانی

کلونت سنگھ ورک / فرحت سلطانہ

زمین کا بوجھ اٹھانے والا بیل

ٹھٹھی کھارا امرتسر سے زیادہ دور نہ تھا۔ پکی سڑک پر ہونے کے باعث سہولتوں کے اعتبار سے بہتر دیہاتوں میں سے تھا۔ مگر جس خوشگوار امر نے مان سنگھ کو سفر پر آمادہ کیا تھا وہ راستے کی طوالت کا کم ہونا نہ تھا۔ اگرچہ شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے اور تانگے میں جتے گھوڑے کے قدم سست پڑتے جا رہے تھے مگر مان سنگھ قطعاً پریشان نہ تھا۔

مان سنگھ ایک نوجوان سپاہی تھا اور آج کل اپنی رجمنٹ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ آج وہ اپنے دوست کرم سنگھ کے گاؤں جا رہا تھا۔ فوج میں آج تک اتنی گہری اور مضبوط دوستی نہیں دیکھی گئی تھی۔ مان سنگھ اور کرم سنگھ دونوں ایک ہی رجمنٹ میں تھے اور برما کے محاذ پر ایک ہی بٹالین میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ مان سنگھ ابھی نائک کے عہدے تک ہی پہنچا تھا۔

کرم سنگھ کے گاؤں میں بیشتر لوگ اس کے باپ سے اس کی اگلی چھٹیوں کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے۔ وہ ایک زندہ دل اور یار باش آدمی تھا اس کی گفتگو اتنی پُرلطف ہوتی تھی کہ لوگ اس کے پاس بیٹھ کر اس کی جنگی مہمات کی کہانیاں سننا بے حد پسند کرتے تھے۔ اگرچہ وہ اس گاؤں کا واحد فوجی نہ تھا دوسرے بھی کئی فوج میں تھے مگر جب وہ گھر آتے تو ان کے پاس گاؤں کے لوگوں سے گپ شپ کے لیے کبھی اتنے موضوعات نہ ہوتے تھے۔ اکثر لوگوں سے وہ رسمی علیک سلیک سے آگے نہ بڑھتے مگر کرم سنگھ کے ساتھ معاملہ مختلف تھا جب وہ گھر پر ہوتا تو صبح نہانے کے لیے کنوئیں پر جمع ہونے والے نہ صرف زیادہ لوگ ہوتے بلکہ وہاں ان کا قیام بھی زیادہ طویل ہوتا۔ موسم سرما میں لوگ دانے بھوننے والے کے تنور کی بجھتی ہوئی آگ کے ارد گرد نصف شب تک بیٹھے رہتے اور کرم سنگھ کی بھرپور گفتگو بغیر کسی انقطاع کے جاری رہتی۔

اپنی رجمنٹ میں کرم سنگھ بہترین نشانہ باز کے طور پر مشہور تھا۔ نشانہ بازی میں اس کی گولیاں ہمیشہ ہدف کے وسط میں انتہائی مہارت کے ساتھ پیوست ہو جاتیں جیسے ہاتھ سے ٹانکی گئی ہوں۔ جنگ کے دوران درختوں کی شاخوں میں چھپے بہت سے جاپانی سپاہی اس کے نشانے کا شکار ہو چکے تھے اور وہ اپنے ان ساتھیوں کا جو جاپانی گولیوں کا شکار ہوئے تھے بھرپور بدلہ لے چکا تھا جہاں ایک پوری مشین گن اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتی وہاں کرم سنگھ کی صرف ایک گولی کافی ہوتی تھی اگرچہ اب اس کے بازوؤں میں نوجوانوں والی لچک باقی نہ رہی تھی تاہم اب بھی جمنازیم میں اس کے کرتب لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔

جنگ کے دنوں میں جمنازیم اور اس طرح کی دیگر سرگرمیاں اگرچہ ملتوی ہو گئی تھیں مگر اب بینڈ کے ساتھ اکڑی ہوئی یونیفارم میں پریڈیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

اب قرب و جوار میں کوئی بازار نہیں لگتا تھا اور لوگ ایک دوسرے کے گاؤں جانا بھی ترک کر چکے تھے۔ لہٰذا جب مان سنگھ کی چھٹی پر جانے کی باری آئی تو کرم سنگھ نے خاصا حسد محسوس کیا۔ اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ بھی چھٹی پر جاسکتا تاکہ وہ دونوں ایک ساتھ جاتے اور چھٹیاں بھی مل کر گزارتے۔ چھوہر کانہ بہرحال امرتسر سے زیادہ دور نہ تھا دونوں کے درمیان کوئی پچاس میل کا فاصلہ ہوگا ایک جس علاقہ میں واقع تھا وہ مجھا کہلاتا تھا اور دوسرا بار کے علاقے میں تھا، ایک کی جڑیں ماضی میں تھیں جب کہ دوسرا ابھی نوجوان تھا اور حال ہی میں ترقی یافتہ۔

مگر ان دنوں چھٹیوں کا حصول خاصا مشکل تھا شاذ و نادر ہی چند خوش قسمت چھٹیاں حاصل کر پاتے تھے اپنے ہی جیسے صرف چند ہی خوش نصیب سپاہیوں کو اپنی بہادری اور حاصل کردہ تمغوں کی نمائش کا موقع ملتا ہے۔

جب مان سنگھ ملٹری ٹرک میں چڑھ کر رخصت ہونے لگا تو کرم سنگھ نے اسے رخصتی پیغام دیتے ہوئے کہا تھا "تم میرے گاؤں ضرور جانا اور واپسی سے پہلے میرے لوگوں سے ضرور ملنا وہ تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ تم انھیں میری خبریں دے سکتے ہو۔ وہ ایسا ہی محسوس کریں گے جیسے میں ان سے ملا ہوں پھر جب ہم ملیں گے تو تم سے اپنے لوگوں کی خبریں سن کر مجھے یہی محسوس ہوگا جیسے میں خود ان سے ذاتی طور پر مل کر آیا ہوں۔"

پھر اپنے گاؤں کے جغرافیہ میں مان سنگھ کی دلچسپی بڑھانے کے لیے وہ بولا تھا "تم کبھی اس راستے سے گزرے ہو؟"

"نہیں" مان سنگھ بولا "میں امرتسر تک تو گیا ہوں لیکن اس سے آگے کبھی نہیں گیا۔"

"اوہ! وہاں بے شمار گردوارے پھیلے ہوئے ہیں تاران ترن، کھدور صاحب اور گوندوال۔ تم ان سب کی زیارت بھی کر لینا اور میرے لوگوں سے بھی مل لینا میں انھیں لکھ دوں گا۔" کرم سنگھ بڑے جوش سے بولا تھا۔

اسی لیے مان سنگھ اب اپنی چھٹیوں کے اختتام کے قریب تانگے میں کرم سنگھ کے گاؤں جارہا تھا۔

"میں مان سنگھ ہوں باپوجی..... میرا تعلق چوہر کانہ سے ہے" مان سنگھ ہاتھ جوڑ کر اس بوڑھے آدمی کو پرنام کرتے ہوئے بولا جو کرم سنگھ کے مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا۔

"آؤ، بیٹھو، خوش آمدید" بوڑھا شخص بولا۔

مان سنگھ اندر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں اجنبی کے چہرے سے ہٹائیں اور زمین پر ایک جگہ مرکوز کر دیں۔

مان سنگھ اگرچہ بے صبری طبیعت کا مالک نہ تھا مگر اس نے اس خوش آمدید کو قدرے تعجب سے لیا۔ ایک ثانیے کو اسے لگا جیسے یہ بوڑھا کرم سنگھ کا باپ نہیں۔

"کیا تم کرم سنگھ کے باپ ہو؟" مان سنگھ نے پوچھا "کیا اس نے میرے بارے میں تمھیں لکھا تھا؟"

"ہاں اس نے لکھا تھا کہ تم ہم سے ملنے کے لیے آؤ گے۔"

ان الفاظ کو ادا کر کے بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا اور صحن کی جانب چل دیا اس نے ایک بچھڑے کو ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے کھونٹے پر باندھا۔ جانور کو سہلایا اور اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا جسے وہ چاٹنے لگا پھر وہ مکان کے اندر مان سنگھ کی آمد کی خبر کرنے چل دیا اندر جا کر اس نے چائے بھیجنے کو کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ڈیوڑھی میں آنے سے خوفزدہ ہو، وہ صحن ہی میں ایک گھوڑی کے نزدیک رُک گیا۔ اس نے برتن گھوڑی کے آگے کیا اور اس میں کچھ اور دانہ ڈالا۔ بالآخر وہ اپنے مہمان کی طرف مُڑا مگر اب بھی وہ پہلے

کی طرح اپنے آپ میں گم لگتا تھا۔ "جسونت سنگھ کہاں ہے؟"

اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑنے کے لیے مان سنگھ نے یونہی پوچھا وہ جانتا تھا کہ کرم سنگھ کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے۔

"وہ ابھی چارہ لے کر آتا ہی ہوگا۔" اسی دوران کرم سنگھ کی ماں چائے لے کر آ گئی۔

"ست سری اکال ماں جی"

بوڑھی عورت کے ہونٹ تھر تھرائے اور یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر وہ کچھ بولی نہیں مان سنگھ نے اس کے ہاتھ سے کیتلی اور پیالہ لے لیا تو وہ واپس اندر چلی گئی۔

"یہ ماجھیل عجیب لوگ ہیں۔" مان سنگھ نے خود سے کہا وہ اندر سے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال اب وہ اپنا قدم واپس نہیں لے جاسکتا تھا اسے ایک رات تو اُس گھر میں قیام کرنا ہی تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ وہ صبح سویرے ہی روانہ ہو جائے گا۔

رات میں جسونت سنگھ آیا تو گفتگو قدرے غیر رسمی ہو گئی "برما کی جنگ میں کرم سنگھ کی گولی بڑی مشہور ہے جیسے ہی وہ ٹرائیگر کھینچتا ہے ایک جاپانی نیچے گرتا ہے اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تمھیں کبھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کیسے چھپے ہوئے جاپانیوں کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔

مان سنگھ نے اس امید میں توقف کیا کہ شاید اس سے کرم سنگھ کے بارے میں اور سوالات پوچھے جائیں گے۔ جاپانیوں اور جنگ کے بارے میں اس کے پاس بے شمار خبریں تھیں وہ اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ کوئی اس کی بات سننے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔

"جسونت ہمیں نہری پانی کب ملے گا؟"

باپ نے ایک طویل اور بے کیف خاموشی کے بعد پوچھا۔

"پرسوں صبح تین بجے" وقت کے اس حوالے نے مان سنگھ کو ایک بار پھر اپنی باتوں کا تار جوڑنے کا موقع فراہم کر دیا۔

"ہاں فوج میں کرم سنگھ کے لیے صبح سویرے اٹھنا ہمیشہ پریشانی کا باعث رہا اسے صبح کی نیند بہت بھاتی ہے وہ ہمیشہ آخر میں اٹھنے والا بندہ ہوتا ہے۔"

مان سنگھ اپنے دوست کے بارے میں بے تکان اور مسلسل گفتگو کر سکتا تھا لیکن اس کا یہ آخری تبصرہ بھی سامعین میں کوئی نمایاں دلچسپی کے آثار پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

پھر کھانا آیا جس میں مہمان کے لیے خصوصی کھانے تھے اس کے کھانے کے دوران جسونت سنگھ پنکھا جھلتا رہا جس سے مان سنگھ کا یہ احساس قدرے کم ہوا کہ اسے زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ اس کا کھانا قریب الختم تھا کہ کرم سنگھ کا چھوٹا سا بیٹا گھٹنوں کے بل چلتا ہوا آیا۔

اگر وہ خاندان میں کسی اور سے نہیں تو کم از کم اس بچے سے تو کرم سنگھ کی باتیں کر سکتا تھا۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے بولا "کیا تم اپنے بابا کے پاس جاؤ گے۔ میرے ساتھ چلو وہاں بڑی بارشیں ہوتی ہیں تمھارے کھیلنے کے لیے وہاں بہت سا پانی ہوگا۔"

یوں لگا جیسے مان سنگھ کے الفاظ نے بوڑھے کا قلب چیر دیا ہو "بچے کو لے جاؤ" وہ چلایا "یہ ہمیں چین سے کھانے بھی نہیں دے گا۔" اس کی ماں آکر بچے کو لے گئی۔ نوالہ مان سنگھ کے حلق میں پھنس گیا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اس گھر کی فضا میں مزید سانس

نہیں لے سکتا، اس کا دم گھٹ جائے گا اس نے اپنے صبح کے سفر کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔

"تاران تُرن یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

"تقریباً چار میل"

"کیا مجھے سویرے سویرے تانگہ مل جائے گا؟"

"تم پریشان نہ ہو ہم جسونت کو تمھارے ساتھ بھیجیں گے، دونوں بھائی مل کر ساری جگہیں دیکھ لینا۔" مان سنگھ نے یہ سن کر قدرے خوشگوار محسوس کیا۔ کم از کم جسونت اتنا زیادہ اکھڑ نہیں تھا۔

مگر مان سنگھ کے ساتھ باہر نکل کر اس کے ہونٹوں پر بھی مہر ہی لگی رہی اگر کوئی دوست یا جاننے والا ملتا بھی تو وہ فاصلے ہی سے خیریت پوچھ کر آگے چل دیتا۔ مان سنگھ رک کر لوگوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان جگہوں پر بار بار تو نہیں آنا تھا۔

"کرم سنگھ نے آرمی میں بڑا نام کمایا ہے تم بھی کیوں نہیں آرمی جوائن کر لیتے؟" مان سنگھ پھر اسی موضوع پر آتا ہوا بولا۔

جسونت سنگھ گڑبڑا گیا، اس نے خود کو مجتمع کیا اور بولا:

"کیا فوج میں ایک ہی کافی نہیں" پھر تیزی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے اس نے پوچھا "تمھارے ضلع میں اس دفعہ کماد کی فصل کتنی اونچی ہوئی ہے؟" وہ اب ایک کھیت سے گزر رہے تھے۔

"بندے کے قد سے تو اونچی ہی ہے۔"

مگر مان سنگھ کا دھیان کہیں اور تھا وہ سوائے اپنے دوست کے اور کسی موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مکان واپس پہنچ کر اس نے گھر واپسی کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا، اس نے سوچا کہ وہ امرتسر سے رات کی ٹرین پکڑے گا۔

اگرچہ انھوں نے اسے آرام پہنچانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی مگر اسے توقع سے کچھ کم ہی لطف آیا تھا۔ اب جب کہ اس کے لیے جانے تیار ہو رہی تھی وہ ڈیوڑھی میں خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا سڑک پر نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ اس کی نظر ڈاکیے پر پڑی جو اپنے کاندھے پر تھیلا لٹکائے وہ اسی طرف چلا آ رہا تھا ایک لحظہ میں یوں لگا جیسے وہ گزر جائے گا مگر وہ اندر آ کر چارپائی پر مان سنگھ کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیا لائے ہو؟"

"اور کیا ہو سکتا ہے، بیچارے کرم سنگھ کی پنشن کے کاغذات ہیں۔"

"کرم سنگھ کی پنشن! کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"تم نہیں جانتے؟ اس گاؤں کے درخت اور پرندے تک اس کے لیے روتے ہیں پندرہ دن پہلے تو خط آیا تھا۔"

مان سنگھ کو یوں لگا جیسے اس کا حلق بند ہو گیا ہے اس کا سانس سینے میں گھٹ جائے گا اس کا جسم اچانک شل ہو گیا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کرم سنگھ کے باپ نے ڈاکیے کو دیکھ لیا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کرم سنگھ سے اس خبر کو پوشیدہ رکھنے میں ناکام ہو گیا ہے اب اس کا بوجھ اتر گیا تھا جو دو بالا پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس پر تھا اب وہ ختم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہے۔ ان کے آنسو مل کر گویا ایک تالاب بنا رہے تھے۔ "تم لوگوں نے مجھے بتایا

کیوں نہیں تھا؟" مان سنگھ نے لوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"ہم نے سوچا تم چھٹیوں پر آئے ہو تمھاری چھٹیاں کیوں خراب کی جائیں جب تم رجمنٹ لوٹتے تو خود پتا چل جاتا۔ تمھیں بھی اپنی چھٹیوں کا لطف اتنا ہی عزیز ہے جتنا کرم سنگھ کو تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ مگر ہم اس بات کو تم سے چھپانے میں ناکام رہے مجھے بڑا افسوس ہے۔"
واپس لوٹتے ہوئے مان سنگھ کی آنکھیں تجسّس کے ساتھ گاؤں کا جائزہ لیتی رہیں یہ وہ ماحول تھا جس میں کرم سنگھ کا باپ پل کر بوڑھا ہو گیا تھا یہاں مقبرے اور یادگاریں تھیں جن میں یہاں حملہ آوروں سے لڑنے والے ہیروؤں کی لافانی کہانیاں پوشیدہ تھیں۔
یہ اس بوڑھے آدمی کی طاقت کا راز تھا، اس کی صدمہ برداشت کرنے کی طاقت کا راز۔ وہ رضاکارانہ طور پر دوسروں کے غموں کو کم کرنے کے لیے ان کا بھی بوجھ اٹھا سکتا تھا۔
مان سنگھ نے سنا تھا کہ ایک بیل ہے جس نے اپنے سر پر پوری زمین کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، کرم سنگھ کا باپ بھی وہی فیض رساں SPIRIT تھا جو اگرچہ بھاری بوجھ تلے خمیدہ ہو چکا تھا مگر اب بھی دوسروں کے لیے بوجھ اٹھانے کو تیار تھا۔

ایریش فریڈ (۱۹۲۱ء - ۱۹۸۸ء) جرمن
سے ترجمہ / منیر الدین احمد

انسانوں کے بارے میں سوالات

کیا محبت سکھائی گئی؟
ہاں، مگر اناڑی پن سے اور چوری چھپے
اور کیا موت سکھائی گئی؟
ہاں، مگر صرف ایک پہلو سے

کیا مطلب ہے، ایک پہلو سے؟
صرف مارنا سکھایا گیا
سکھایا گیا اور اس کی مشق کروائی گئی
اور مرنے کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا
گیا

اور کیا حسد سکھایا گیا؟
ہاں، سکھایا گیا اور سونچا گیا، مگر
صرف ان پر، جنھیں دشمن کہا گیا
نہ کہ خود اپنی بدبختی پر

اور آپ نے اپنی زندگی کے ساتھ کیا کیا
قریب قریب سب کچھ
جس کی توقع رکھی گئی تھی
ایک ایسے کورس کے بعد

پس تحریر

جو کچھ میں نے زندگی کے خلاف
لکھا تھا
دراصل زندگی کے حق میں تھا

جو کچھ میں نے موت کے حق میں
لکھا تھا
دراصل موت کے خلاف تھا

جرمن نظمیں

ایریش فریڈ کی نظمیں

انگریزی سے ترجمہ: رفیق احمد نقش

لاجواب

"کیوں تم
اب تک
لکھتے ہو نظمیں؟
حالانکہ
اس طریقے سے
تم پہنچ پاتے ہو
صرف تھوڑے سے لوگوں تک

دوست پوچھتے ہیں
بے صبری سے
کیوں کہ اپنے طریقوں سے
وہ بھی پہنچ پاتے ہیں
صرف تھوڑے سے لوگوں تک

اور میں نہیں جانتا
کیا جواب دوں
انھیں

مطابقت

کل میں نے ابتدا کی تھی
بولنا سیکھنے کی
آج میں خاموشی سیکھ رہا ہوں
کل
میں سیکھنا بند کر دوں گا

خوف اور شک

کوئی شک نہ کرو
اُس پر
جو تمھیں بتاتا ہے،
وہ خوف زدہ ہے

لیکن ڈرو
اُس سے
جو تمھیں بتاتا ہے
اُسے کوئی شک نہیں

(انگریزی سے)

Remember
burshane
- the pioneers of bottled gas in Pakistan

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سیّد صاحب

پروفیسر سیّد فخرالحسن

صفحات ۲۴۰ قیمت درج نہیں

سیکریٹری نشرواشاعت، مجلس علوم اسلامیہ، کراچی

سیّد صاحب سے مراد سیّد سلیمان ندوی ہیں جو ہمارے اُن مشاہیر میں سے ایک ہیں جن کو بجا طور پر علامہ اور نابغۂ روزگار کہا جاتا ہے۔ وہ علامہ شبلی کے جانشین اور دبستانِ شبلی کے گوہر شب چراغ تھے۔ انھوں نے دور غلامی میں علوم اسلامیہ کی اشاعت نہایت شد و مد سے کی جب ساحرانِ افرنگ کی پوری کوشش تھی کہ مسلمانوں کو اُن کے اسلاف، اُن کے ماضی اور اُن کے اپنے علوم سے اس درجہ بیگانہ کر دیا جائے کہ وہ اگر عیسائی نہ بن سکیں تو مسلمان بھی نہ رہیں۔ سیّد صاحب کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر کتابیں، مضامین اور مقالے لکھے اور ایسا علمی کام انجام دیا جو بڑے سے بڑے ادارہ کے لیے بھی قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ اُن کے مضامین اور مقالے اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ اُن کا احصار و شمار ممکن نہیں۔ ساتھ ہی اُن کی مستقل تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے۔ پھر اُن میں سے کئی اس پایہ کی ہیں کہ اگر اُن میں سے کوئی ایک کتاب لکھ کر سیّد صاحب اپنے قلم کو ہمیشہ کے لیے روک لیتے تو اُن کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ سیرت النبی ﷺ جس کی ابتدا علامہ شبلی نے کی تھی سیّد صاحب کے ہاتھوں نہ صرف اُس کی تکمیل ہوئی بلکہ شبلی کے تیار کردہ خاکہ میں رنگ انھوں نے ہی بھرا۔ یہ ایک ایسی جامع اور بلند پایہ تصنیف ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکی۔ "تاریخ ارض القرآن" میں سیّد صاحب نے جس تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے اُس کی بنا پر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں انھوں نے مستشرقین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان دو کے علاوہ اُن کی تصانیف "خیام"، "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کا فن جہاز رانی" ایسی کتابیں ہیں جو دوسروں کی پوری پوری تصانیف پر بھاری ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب سیّد سلیمان ندوی کی حیات کا ایک رنگین خاکہ اور اُن کی ہمہ جہتی کاوشوں کا ایک دلکش مرقع ہے۔ پروفیسر سیّد فخرالحسن صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت اُن پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ وہ آٹھ مقالات ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے اور اب اُن کو ترتیب دے کر ایک مربوط و جامع تصنیف کی شکل دے دی گئی ہے۔

مقالات کی ترتیب یہ ہے:

سیّد صاحب، سیرت نگاری، تاریخ نویسی، مقالات قرآنی، مستشرقین، اسلام کا نظام حکومت و سیاست، عرفانی پہلو اور

معیت سلیمانی، تعارف نگار ڈاکٹر نثار احمد صاحب نے ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے صحیح کہا ہے کہ

"ان مقالات کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سید صاحب کے افکار کا خلاصہ، ان کی تمام قابلِ ذکر تصانیف کا تعارف، ان کے علمی، تعلیمی کارناموں کا اجمال، وسعت معلومات، تحقیق و تدقیق، انہماک، اشتغال کی تفصیل، موضوعات پر فکری گرفت اور اظہار بیان کا کمال اور بطور خاص علوم و آداب اسلامی کے حوالے سے سید صاحب کی خدمات کا حال بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے۔"

ان بے شمار خوبیوں کے ساتھ بعض ایسے تسامحات بھی دکھائی دیتے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ مثلاً صفحہ نمبر ۶۴ پر مولانا احمد علی محدث کو بجائے سہار نپوری کے شاہجہانپوری اور صفحہ ۱۷ پر ڈی۔ ٹی ایچ کی جگہ ایل ایل۔ ڈی لکھا گیا ہے۔ دراصل مولانا احمد علی محدث سہار نپوری، شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے اور صحیح بخاری کے حاشیہ نگار تھے۔ اُن سے شبلی نے سہار نپور میں کچھ عرصہ قیام کر کے فیض حاصل کیا تھا۔ اور ڈی۔ ٹی ایچ مخفف ہے ڈاکٹر آف تھیولوجی کا یہ ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سید صاحب کو اُن کی علوم دینی کی خدمت کے اعتراف میں اعزازی طور پر دی تھی۔

بہرحال یہ تسامحات نہایت بے ضرر ہیں اور اُن سے کتاب کی جامعیت و افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجموعی طور پر کتاب زیر تبصرہ بے حد معلومات افزا اور قابلِ مطالعہ ہے اور لائق مصنف ایک ایسی اعلیٰ پایہ کی تصنیف منظر عام پر لانے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

فنِ تاریخ گوئی

کسریٰ منہاس
صفحات ۱۹۰ قیمت -/۱۵۰ روپے
نقوش، اردو بازار لاہور

فنِ تاریخ گوئی کا رواج غالباً عربی، فارسی اور اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات اس کو ذہنی عیاشی تصور کرتے ہوں۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس نوع کا خیال قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ حقیقتاً یہ ایک انتہائی مفید فن ہے جس کو شاعری کی ایک صنف سمجھا جاتا ہے دیگر اصناف سخن فرحت و انبساط اور مسرت و شادمانی حاصل کرنے کے لیے ہیں لیکن تاریخ گوئی اپنا ایک افادی پہلو بھی رکھتی ہے۔ مختلف حروف کے مقررہ اعداد کو جوڑ کر اشخاص، اور واقعات سے متعلق سنین کو محفوظ کر لینا کتنا مفید ہوتا ہے اس بات کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ یہ فن بظاہر خاصا دشوار گزار ہے لیکن جن لوگوں کو مہارت ہوتی ہے وہ نہ صرف بڑی آسانی سی تاریخی مادے نکال لیتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں ایسے ایسے کمالات دکھاتے ہیں کہ بعض اوقات اُن پر کرامات کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

فنِ تاریخ گوئی پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب اس فن میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ جو بحث اس کتاب میں کی گئی ہے اُس میں خاص طور پر دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک اس فن کی تاریخ ہے اور دوسری

فن تاریخ گوئی کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس سلسلے میں بعض جزوی مسائل بھی آ گئے ہیں۔ جیسے لغات تاریخ گوئی، ہمزہ کے عدد، تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل وغیرہ ایک علیحدہ عنوان غالب کی تاریخ گوئی کا قائم کیا گیا ہے۔ تاریخ گوئی میں فن تعمیہ پر جداگانہ بحث کی گئی ہے اور ان سب باتوں کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کی بنا پر ایک طرف مصنف کا مافی الضمیر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور دوسری طرف قارئین کو اس فن کے سمجھنے میں کافی سہولت ہوتی ہے۔

غرض اس موضوع پر یہ ایک اچھی پیشکش ہے۔ یقین ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

(ثناء الحق صدیقی)

اقبال نامے

مرتبہ: ڈاکٹر اخلاق احمد اثر

صفحات ۱۸۴ قیمت = /۸۰ روپے

مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی (بھارت)

"اقبال شناسی" کے باب میں ڈاکٹر اخلاق احمد اثر ایک معروف نام ہے۔ اقبالیات پر مختلف عنوان سے ان کی اب تک چار کتابیں "اقبال اور شیش محل"، "اقبال اور ممنون"، "اقبال اور راس مسعود" اور "اقبال نامے" منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں، آخر الذکر کتاب "اقبال نامے" کا دوسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے دوسرے ایڈیشن کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بھوپال اور اندور سے متعلق اقبال کے مطبوعہ مکاتیب کے ساتھ کچھ غیر مطبوعہ مکاتیب اور دیگر تازہ مواد بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ تازہ مواد آٹھ مکتوبات اور ایک اقبال کی ایسی تحریر کا عکس ہے جو مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر" پر درج ہے۔ اس سلسلے کا پہلا خط (انگریزی میں) بنام شعیب قریشی ہے، جو ۱۱ جون ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا۔ علامہ اقبال نے اس میں ایک ایسے عرب نوجوان کا ذکر کیا ہے جس نے نواب سلطان جہاں آف بھوپال کی وفات پر ایک مرثیہ تحریر کیا ہے اور اُسے "ہزہائی نس" کو سنانا چاہتا ہے اور گزارش کی ہے کہ اگر اس عرب کی "ہزہائی نس" تک رسائی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے تو کر دی جائے۔

اسی خط میں محمد شعیب قریشی کی شادی کی مبارک باد بھی دی گئی ہے۔ آٹھوں تازہ مکتوبات میں سے ایک محمد شعیب قریشی اور سات راس مسعود کے نام ہیں۔

اقبال کے علاوہ ڈاکٹر اخلاق احمد اثر کی تحقیق کا ایک اور میدان ڈراما ہے۔ اس موضوع پر بھی ان کی اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(ا۔ س)

اقبال فریدی کے افسانے

اقبال فریدی

صفحات ۱۴۴ قیمت = /۵۷ روپے

بی۔ ۵۔ قمر پلازہ گلشن اقبال بلاک ۳۔ کراچی

اقبال فریدی کی طبیعت کی افتاد یہ ہے کہ وہ بھیڑ میں چل نہیں سکتے چنانچہ انھوں نے اپنے لیے الگ ایک ڈگر کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "اقبال فریدی کے افسانے" اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے بیانیہ کہہ لیں، جی چاہے تو اس میں علامت کا سُراغ لگالیں لیکن اس اسلوب کو کوئی ایک نام دینا مشکل ہے۔

اس مجموعہ کا افسانہ "غرارہ ایک متروک پہناوا" ہو یا "وطن سے مناجات کا دیباچہ" یا "مٹی کا ٹونٹی والا لوٹا" یا کوئی اور سب تھگلی تھگلی جوڑ کر چادر تیار کرنے کے عمل سے مشابہہ اور چند ملتے جلتے اور کبھی انمل بے جوڑ ٹکروں کو یکجا کر کے دیکھنے اور اس میں معنویت تلاش کرنے کی سعی ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ GAPS بناتے چلے جاتے ہیں اور جب قاری کی GAPS کی پنہاں معنویت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو ایک نئی دریافت کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ ویسے "غرارہ ایک متروک پہناوا" وقت کی بے ثباتی اور اس کی سرعت کے اسٹرکچر پر تیار ہوا ہے۔ یہ اس کی تفہیم کا دوسرا رخ ہے۔

"اقبال فریدی کے افسانے" میں مصوری کا لطف بھی ملا ہے وہ اس طرح کہ ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار عالمی شہرت کا مصور پکاسو اور اس سے مختص فن کولاژ یاد آیا ہے کولاژ چند اَن مِل بے جوڑ اشیا کی ترتیب کے ذریعے کسی معنوی پیکر کی جستجو ہے۔

"وطن سے مناجات کا دیباچہ" میں مذکورہ خصوصیات کے علاوہ بائبلی طرز اظہار کی جھلک بھی ملتی ہے۔ خصوصاً جب افسانہ کا راوی کراچی سے مخاطب ہوتا ہے اور یہ تخاطب تکرار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، مختصر یہ کہ ان کے افسانے میں ٹکاؤ، اور بیان میں تسلسل کے بجائے ہر لحہ منظر کے بدلتے رہنے کا لطف آتا ہے۔ یہی اقبال فریدی کی افسانہ نگاری کی انفرادیت ہے۔

(ا۔ س)

آب و سراب

جمیل عظیم آبادی
صفحات ۱۶۰ قیمت = ۷۵/ روپے
راشد پبلی کیشنز بی ۴۵۲۔ سیکٹر ۱۱۔ اے شمالی کراچی، کراچی ۳۶

انگریزی کا ایک مقولہ ہے "سلو اینڈ اسٹیڈی وینس دی ریس" "SLOW AND STEDY WINS THE RACE" یہ مقولہ سو فیصد جمیل عظیم آبادی پر منطبق ہوتا ہے وہ دبے پاؤں شعر و ادب میں داخل ہوئے اور دیکھتے دیکھتے اپنی ایک پہچان بنا بیٹھے۔

جمیل عظیم آبادی کے اب تک چار شعری مجموعے بہ شمول "آب و سراب" منظر عام پر آکر قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ "دل کی کتاب" غزلوں کا مجموعہ "گیان درپن" دوہے اور گیتوں کا مجموعہ "وحدت و مدحت" حمد و نعت کا مجموعہ اور "آب و سراب" مقفع، معرا اور آزاد نظموں کا مجموعہ ہے۔

"آب و سراب" کے تعارفی کلمات ڈاکٹر حنیف فوق نے تحریر کیے ہیں انھوں نے نظم "آدمی" میں نظیر اکبر آبادی سے اور "زندگی" میں علامہ اقبال سے مطابقت تلاش کرنے کی سعی کی ہے اور جس انداز سے ان کے فن پاروں کا تجزیہ کیا ہے اُس سے جمیل صاحب کی شعری شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

جمیل عظیم آبادی کی شاعری پیرایہ بیان کے اعتبار سے قدیم و جدید کا سنگم ہے لیکن حسیت کے اعتبار سے عصری مسائل سے جڑی ہوئی ہے۔ اُن کی نظمیں "جاسوس سیارہ" اور "نیو ورلڈ آرڈر" موضوع کے لحاظ سے جدید تر ہیں۔ البتہ ان کا طرز بیان سیدھا سادا ہے سو وہی اسلوب ان نظموں میں بھی قائم ہے۔ لیکن ان کی سادگی سپاٹ نہیں معنویت کے کنائے بھی رکھتی ہے ان کی شاعرانہ سرشت احساس سے گندھی ہوئی ہے جو بنیادی بات ہے وہ یہ کہ دوران مطالعہ ان کی نظمیں دل کو چھوتی ہیں۔ ایک شاعر کو اپنی نظموں سے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔

(ا۔ س)

تھل دریا

محمد فیروز شاہ

صفحات ۱۲۰ قیمت =/۳۰ روپے

عذرا اصغر تجدید اشاعت گھر اسلام آباد، لاہور

"تھل دریا" محمد فیروز شاہ کی تازہ کتاب ہے، اس سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے "دریچہ" اور "طلوع" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ "تھل دریا" ان کی ملی جلی نثری تحریروں کا مجموعہ ہے جس کو "فکر و نظر"، "کتب نما"، "حرف و صوت کے موسم"، "کھوئے ہوؤں کی خوشبو" اور "برلب آباسین" کے عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

"منظر و پس منظر"، "سچائیوں کی کھوج میں لکھے ہوئے لفظ"، "ساعتِ نظر کی صدا" اور "ایک سوال" یہ چاروں تحریریں اعلیٰ فکری اور تخلیقی سطح کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہلے میں صوفی اور ادب میں قدر مشترک تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور حوالے سے باتوں کی تکمیل کی گئی ہے۔

"سچائیوں کی کھوج میں لکھے ہوئے لفظ" کی ابتدا اِس جملے سے ہوتی ہے۔

(۱) "شاعری دل کے دریچے کھولنے لگے تو ساحری بن جاتی ہے" درمیان میں ایسے جملے بھی ملتے ہیں۔ "شاعری بھی انھیں لوگوں کو مالا مال کرتی ہے جو ایک منفرد انداز درویشی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔"

یہ پورا مضمون اسی اُٹھان سے اپنا آغاز کرتا ہے اور انجام تک اس کا یہی انداز باقی رہتا ہے۔ اس کا سجیلہ پیرایۂ بیان شاعرانہ لبادہ اوڑھے ہوئے ہے اِس میں فکر آرائی کے ساتھ قدرے تیکھا پن بھی ہے جو زمانہ چشیدگی کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے۔ "فکر و نظر" کے تحت ان چاروں مضامین میں اختصار قدر مشترک ہے۔

اس کتاب کا آخری اور طویل مضمون "دبستان میانوالی" ہے اس مضمون کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس کے ذریعے ہم ایک دور افتادہ علاقے کے ادیبوں اور شاعروں اور ان کے ادبی کاموں اور سرگرمیوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ یہ اطلاع بہتوں کی معلومات میں اضافہ کرے گی کہ منشی تلوک چند محرومؔ ان کے بیٹے جگن ناتھ آزادؔ رام لعل اور ڈاکٹر اجمل نیازی کے علاوہ بے شمار دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

علاوہ ازیں کچھ مضامین کتابوں کے حوالے سے اور کچھ شخصیات کے حوالے سے ہیں سبھی محمد شاہ فیروز کے رواں شاعرانہ اظہار کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ فرداً فرداً لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں [illegible]

گردوپیش

مولانا حسرت موہانی کی بیالیسویں برسی منائی گئی

حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کی جانب سے ۱۳ مئی کو کراچی میں زیرِ صدارت سینیٹر سیّد اشتیاق حسین اظہر مولانا حسرت موہانی کی بیالیسویں برسی منائی گئی اس موقع پر جن ممتاز شخصیات نے پیغامات بھیجے ان کے اسمائے گرامی میں سینیٹ کے چیئرمین جناب وسیم سجّاد، وفاقی وزیر خارجہ سیّد شریف الدّین پیرزادہ، جناب حکیم محمد سعید اور ڈاکٹر منظور الدّین احمد قابلِ ذکر ہیں۔

حسرت موہانی میموریل ہال بلاک اے شمالی ناظم آباد میں منعقد اجلاس کے شرکاء میں سینیٹر سیّد اشتیاق اظہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر حسنین کاظمی اور جناب فاروق احمد نے اپنے خطابات میں مولانا حسرت کی ہمہ جہت شخصیت کے حوالے سے انھیں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے برصغیر کے رہنے والوں کی آزادی کے لیے جہاں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں وہاں انھوں نے اردو ادب کی بھی گراں مایہ خدمت انجام دی مولانا ایک سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک سچے پکے مسلمان ہونے کے ناتے قول و فعل میں بھی ایک مثالی یکسانیت رکھتے تھے مولانا نے شاعری کی تو اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوا لیا مولانا کے کلام میں عشق کی ترجمانی اور حسن کی آئینہ بندی جس سلیقے سے نظر آتی ہے وہ یقیناً حقیقت پر مبنی قرار دی جاتی رہے گی۔

اکابرِ سلف کی یادیں منانا زندہ قوموں کی علامت ہوا کرتی ہے یہ ماضی کا قرض ہے جو حال میں ادا کیا جاتا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔ مولانا حسرت علی گڑھ کی تحریک کے ایک مجاہد تھے وہ سرسیّد کے مشن کو اپنا نصب العین قرار دے کر برصغیر کی آزادی کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دے گئے وہ تاقیامت یاد رکھے جائیں گے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ڈاکٹر کلیم سہسرامی کی انجمن میں آمد

پچھلے دنوں بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مہمان شاعر و نقاد ڈاکٹر کلیم سہسرامی کو انجمن ترقی اردو کے دفتر میں مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر کلیم ان دنوں راجشاہی یونیورسٹی کے "فارن لینگویجز ڈیپارٹمنٹ" کے سربراہ ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن نے ڈاکٹر کلیم سہسرامی کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے اُن سے کہا "بنگلہ دیش میں اردو کے حوالے سے کچھ بتائیں" جواب میں کلیم صاحب نے کہا کہ اردو بڑی سخت جان ہے اُسے قتل کر دیا جائے پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ بنگلہ دیش میں اردو کی مخالفت تو نہیں ہے لیکن تعلیمی ڈھانچا کچھ ایسا بنتا جا رہا ہے کہ اردو کی گنجائش مشکل ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود راجشاہی یونیورسٹی میں نئی بات یہ ہوئی ہے کہ وہاں اردو پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کا انتظام ہو گیا ہے، پچھلے دنوں طلبہ سے "بنگلہ دیش میں اردو ناول نگاری" اور "مولانا وحشت کی شاعری" کے موضوع پر کام کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر کلیم

سہسرامی نے مزید کہا کہ راجشاہی لائبریری میں کتب کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ جس کی مدد سے بلامبالغہ بارہ تھیسس بنگال پر لکھے جا سکتے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے حال احوال کا ذکر آیا تو ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے بتایا کہ وہاں اردو فارسی ڈیپارٹمنٹ سے اس وقت چار خواتین منسلک ہیں ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، محترمہ ام سلمیٰ وغیرہ۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ڈاکٹر کلثوم نے ہمارے استاد محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے فکشن پر پی ایچ ڈی کی ہے۔

دوران گفتگو اُن تمام قابلِ ذکر ادیبوں اور شاعروں کا نام آیا جو سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بھی وہاں اردو حلقے میں فعّال ہیں۔ مسلسل لکھ رہے ہیں اور ان میں سے اکثر کے شعری یا افسانوی مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں ایسے اشخاص میں احسن احمد اشک، عطاء الرحمٰن جمیل اور احمد الیاس شاعری کے حوالے سے احمد سعدی، غلام محمد، زین العابدین، شام بار کپوری اور س۔ م۔ ساجد افسانہ نگاری، اور ڈاکٹر کلیم سہسرامی اور یوسف حسن تنقید و تحقیق کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ پھر گفتگو یکا یک بنگالی نژاد شعراء میں ظہور المبارک اور شرف الحسینی کی طرف مڑ گئی۔ اس پر افسر ماہ پوری نے بزرگ شاعر شرف الحسینی کا ایک یادگار شعر سنایا:

ایک فتنہ مجھے بیدار نظر آتا ہے
سونے والا بڑا ہشیار نظر آتا ہے

وقفے وقفے سے تقریباً تمام شرکائے تقریب نے گفتگو میں حصہ لیا ان میں جناب افسر ماہ پوری، ڈاکٹر ظفیر الحسن، جناب شاہ محی الحق فاروقی، جناب عبدالجلیل بسمل، ڈاکٹر فہیم اعظمی، جناب محسن صدیقی، جناب افتخار اجمل شاہین اور جناب امیر الاسلام ہاشمی قابلِ ذکر ہیں۔ تقریب کا اختتام مہمان اور حاضرین کی تواضع پر ہوا۔

پریس کلب میں حبیب جالب کی یاد میں تعزیتی جلسہ

گزشتہ دنوں کراچی پریس کلب میں معروف شاعر حبیب جالب کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں انھیں شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا اور اُن کی خدمات کے احترام میں سیکڑوں حاضرین جلسہ ایک منٹ کھڑے رہے۔

بلوچستان یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر کرار حسین نے کہا کہ حبیب جالب کمٹمنٹ کے شاعر تھے۔ اُن کی شاعری ایک انقلابی رویہ رکھتی تھی اور عمر بھر سرکشیدہ رہے۔ اُن کی شاعری سادہ کاری کا نمونہ اور عوام کے دکھوں کے خلاف مسلسل احتجاج تھی اور سچ پوچھیے تو ان کی شاعری کی عوام میں مقبولیت اسی سبب سے ہے۔

عوامی محاذ کے رہنما معراج محمد خاں نے کہا کہ حبیب جالب اپنی شاعری کے ساتھ "کمیٹڈ" رہے اور ذاتی منفعت پر اپنی شاعری کو قربان نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ وہ سچ کے اظہار میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے۔

معروف شاعرہ محترمہ زہرہ نگاہ نے کہا کہ حبیب جالب کی شاعری "حرفِ حق" کا درجہ رکھتی ہے اُس معاشرہ کے لیے جہاں عوام الناس کا استحصال ہوتا ہو۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ہمیشہ اُن پر کچھ لکھنا مشکل لگا جواب ہم میں نہیں ہیں۔ یہی دیکھیے کہ خواہش کے باوجود اب تک فیض احمد فیض پر کوئی قرینے کا مضمون نہیں لکھ سکی۔

اس موقع پر بابا نجمی، فہمیدہ ریاض، محسن بھوپالی اور نجم الحسن عطا نے اپنے محبوب شاعر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

حبیب جالب کے برادر خورد جناب سعید پرویز نے اپنے بڑے بھائی کی زندگی کے ابتدائی دنوں پر روشنی ڈالی۔

معروف نقاد جناب احمد ہمدانی اور جناب حسن عابدی نے اپنے مضمون میں عوام پر حبیب جالب کی شاعری کے دور رس اثرات کا جائزہ لیا۔

"پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ" کے سیکریٹری جنرل جناب عبدالحمید چھاپرہ، جناب رارق بگٹی اور جناب محمود شام ے حبیب جالب مرحوم کی زندگی اُن کی عوام دوستی اور ادبی خدمات کو اپنی اپنی تقریر میں اُجاگر کیا۔

ٹیلی وژن ڈراما.... "تماشا" کی تقریبِ اجرا

گزشتہ مہینے جناب صبیح محسن کی کتاب "تماشا" کی نیپا آڈیٹوریم میں تقریب اجرا منعقد ہوئی جس کی صدارت ممتاز افسانہ نگار محترمہ ہاجرہ مسرور نے فرمائی اور مہمان خصوصی جناب نورالحسن جعفری صدر انجمن ترقی اردو پاکستان تھے۔ شہ نشین پر صدر اور مہمان خصوصی کے ساتھ جناب سیّد فخر عالم صدر دیسنہ ایسوسی ایشن اور خود صاحبِ کتاب جناب صبیح محسن موجود تھے۔

تلاوت قرآن کے بعد جناب سیّد فخر عالم نے اظہار خیال کیا اور کہا کہ اتنے مقتدر حضرات کے روبرو "تماشا" کے بارے میں میرے لیے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ انھوں نے دیسنہ کو مردم خیز خطہ قرار دیا اور چند اکابر عظام جن میں علامہ سیّد سلیمان ندوی، اُن کے ہم مکتب حافظ تجمل حسین، مولانا سیّد ابوظفر ندوی، نجیب اشرف ندوی اور سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام لیے۔

جناب طاہر مسعود نے کہا کہ صبیح محسن نے ٹی وی کے ذریعے DOCU۔DRAMA کو متعارف کرایا ہے۔ ۰۰۷ اور تکون DOCU۔DRAMA کی نہایت عمدہ مثال ہے یہ ڈراما دیکھنے والوں کو تفریح بھی فراہم کرتا ہے اور جدید معلومات بھی!

جناب امراؤ طارق کے مضمون کا عنوان ہے "سوچا فنکار ادھورا آدمی" ہے۔ مضمون بڑے اچھے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صبیح محسن صاحب کے فن میں خود اعتمادی، حقیقت پسندی اور منطقی طرز استدلال ان کی سائنسی تعلیم اور عمیق مشاہدے کے باعث پیدا ہوا ہے۔

ٹی وی کے سینئر پروڈیوسر جناب قاسم جلالی نے کہا کہ " میرا جب صبیح محسن صاحب سے ڈرامے کے سلسلے میں رابطہ ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ ٹی وی اسکرین پر فرسودہ مضامین کے ڈرامے تو آتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں نہ ان موضوعات پر ڈرامے لکھے جائیں جو انٹر نیشنل قدر و قیمت کے حامل ہوں چنانچہ آپ نے دیکھا صبیح صاحب کے لکھے ہوئے کئی ایسے موضوعات پر ڈرامے پیش کیے گئے جو تازہ ہوا کے جھونکے کے مترادف ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا کہ" صبیح محسن چھوٹے چھوٹے ڈرامے سے بڑے بڑے ڈرامے کی طرف آئے۔ وہ یہاں تک پہنچنے کے لیے بڑی ریاضت سے گزرے۔ صبیح محسن نے اردو ڈرامے کو بین الاقوامی سطح فراہم کی ہے۔ یہی ان کے ڈراموں کا اختصاص ہے۔ ایک بات اور وہ یہ کہ ان کے ڈرامے سوال اندر سوال ہیں۔"

صبیح محسن صاحب نے کہا کہ جس طرح غزل کے سننے والے افراد کی سطح کچھ اور، اور اس کے پڑھنے والوں کی سطح تفہیم کچھ اور ہوتی ہے یہی صورت حال ڈرامے کے ساتھ بھی ہے دیکھنے والے افراد کا حلقہ الگ ہوتا ہے اور پڑھنے والے کا حلقہ الگ۔

مہمان خصوصی جناب نورالحسن جعفری نے کہا میں صبیح محسن صاحب کا بہت مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ عزت بخشی۔ "تماشا" میں "لو کوشیڈ" "فاصلہ" اور کئی دوسرے ڈراموں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کا مشاہدہ گہرا اور انسانی نفسیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ ڈرامے کے باب میں یہ کتاب ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

صدر جلسہ محترمہ ہاجرہ مسرور نے کہا "میں نے صبیح محسن صاحب کو "بین السطور" اور "گر قبول افتد" کے ذریعے سنجیدہ طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے جانا اب وہ "تماشا" میں ڈراما نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں بے شک "تماشا" دیکھنے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ کوئی فن پارہ یادرہ جائے تو یقیناً اُس فن پارے میں دیر تک زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

تقریب کے درمیان ایک ٹیبلو پیش کیا گیا جو ڈرامہ "لوکوشیڈ" کے ایک سین پر مشتمل تھا۔ جس میں قاضی واجد، شکیل احمد، زینت یاسمین، ثانیہ سعید، شہود رضوی اور منصور معطر نے حصّہ لیا۔

تقریب کی نظامت انور مقصود نے کی نظامت کے درمیان وقفے وقفے سے ان کے پُر معنی اور پہلو دار فقرے قارئین کو لطف دیتے رہے۔ گویا وہ کہیں اور ہم سنتے جائیں۔

"رخِ سیلاب" کی تقریب پذیرائی

آرٹس کونسل کراچی، گل چہرہ اکیڈمی، یونی کیریئرز انٹرنیشنل اور حلقۂ احباب معیار کے اشتراک سے معروف شاعر نقاش کاظمی کے دوسرے مجموعۂ کلام "رخِ سیلاب" کی تقریب رونمائی و پذیرائی کا اہتمام آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی جناب ایس ایچ ہاشمی تھے۔

تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسلم فرخی، جناب حمایت علی شاعر، جناب سحر انصاری، ڈاکٹر عالیہ امام، محترمہ زاہدہ حنا اور محترمہ شاہدہ حسن نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں جناب نقاش کاظمی کی شخصیت اور فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ اس طرح "رخِ سیلاب" کے شاعر کے فن کو پرکھنے کے کئی انداز نظر سامنے آئے۔

طنز و مزاح کے معروف شاعر جناب دلاور فگار نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر وفا راشدی لاہور میں

گزشتہ دنوں انجمن کے سابق رفیق کار ڈاکٹر وفا راشدی کراچی سے لاہور تشریف لے گئے تو اُن کے اعزاز میں لاہور کے مختلف علمی و ادبی و تعلیمی اداروں نے متعدد تقریبات منعقد کیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے "بزم اقبال" کے دفتر میں ڈاکٹر وفا راشدی کے اعزاز میں ایک تقریب ملاقات کا اہتمام کیا جس میں جناب احمد ندیم قاسمی، جناب رشید احمد جالندھری، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر تحسین فراقی، خورشید احمد یوسفی، حفیظ الرحمٰن احسن اور محمد اسحاق بھٹی نے شرکت کی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے بحیثیت میزبان اپنے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر وفا ایک فعال شخصیت ہیں، اب تک ان کی چودہ کتابیں چھپ چکی ہیں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصّہ" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی چھاپ رہی ہے اس موقع پر جناب احمد ندیم قاسمی، جناب حفیظ الرحمٰن اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی اظہار خیال کیا۔

آخر میں میزبان تقریب نے ڈاکٹر وفا راشدی کو بزم اقبال کی مطبوعات پیش کیں۔

جدّے میں ایک مشاعرہ

گزشتہ دنوں جدّہ میں جو "مترنم مشاعرہ" منعقد ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کے چوٹی کے شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ اُس کی وڈیو کیسٹ کی تقریب اجراء کی رسم جناب عارف قریشی کے ہاں ڈاکٹر کلیم عاجز کی صدارت میں مولانا فرید الوحیدی نے ادا کی اور "مترنم مشاعرہ" کی عمدگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جدّہ میں مقیم اردو شعرا ہر لحاظ سے مہمان شعرا کے ہم پلہ تھے مگر انھیں بوجوہ اُس مشاعرے میں نمائندگی نہیں دی جاسکی تو اب کفارہ کے طور پر منتظمین کو ایک شاندار مشاعرہ ان کے اعزاز میں منعقد کرنا چاہیے۔

تقریب رونمائی کے موقع پر ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام بھی تھا جس کی نظامت کے فرائض نسیم سحر نے سرانجام دیے۔ کلام کا ایک کڑا انتخاب پیش خدمت ہے:

بہت قریب ہے کوئی مرے تصوّر میں
نہیں ہے شامِ جُدائی بھی شام تنہائی

(نسیم سحر)

زمانہ یہ ہے کوئی سانپ سے نہیں ڈرتا
کہ آدمی ہی یہاں آدمی کو ڈستا ہے

(ناظم الدّین مقبول)

کبھی یہ تھا کہ نہ تھمتا تھا غم کا سیلِ رواں
ہے اب یہ حال مری چشم آج تر بھی نہیں

(عبدالباری انجم)

عجیب طور طریقے سکھا گیا ہے مجھے
کوئی بھی درد پرایا نظر نہیں آتا

(یاد صدیقی)

بیاں جو مرے سارے جذبات کر دے
میں ایسی زباں بولنا چاہتا ہوں

(ظفر مہدی)

مجھ کو جو رنج ہے جو الم ہے
سب ترا لطف تیرا کرم ہے

(فرید الوحیدی)

نقش ہے ہر در و دیوار پہ انجام غرور
تم بھی مغرور نہ ہو ہم کو یہی کہنا ہے

(ڈاکٹر کلیم عاجز)

(رپورٹ نسیم سحر) ***

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

دیگر علمی، ادبی، تعلیمی شخصیات

آصف نورانی	علی سردار جعفری سے انٹرویو	مطالعہ پاکستان، کراچی ۳/۹۲ء ص ۵۲
آغا ناصر	خواجہ معین الدین	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۲۶۱
ابن فرید، ڈاکٹر	پروفیسر کبیر احمد جائسی	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۶۱
ابوسعادت اصلاحی	جمال الدین افغانی اور العروۃ الوثقیٰ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۲۰
ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر	پیر علی محمد راشدی، حالات و خدمات	الولی، مارچ ۹۲ء ص ۱۰
احمر رفاعی، ڈاکٹر	جذبوں کی تب و تاب کا شاعر، خورشید ایلچپوری	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۷۸
اختر سعید خاں	مظفر حنفی، سخن کے آئینے میں	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۶۴
اختر شاہجہانپوری	ڈاکٹر انجنا سندھیر، جذبوں کی شاعری	ابلاغ، پشاور جنوری ۹۲ء ص ۱۹
اسحاق قصیوری	پروفیسر ایس ایم جمیل واسطی ایک مثالی معلم	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۵۰
اسلم فرخی، ڈاکٹر	بیاد انور عنایت اللہ	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۵۱
افتخار اجمل شاہین، پروفیسر	جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۵۳
اقبال متین	شاذ تمکنت، موت سے پہلے دو ملاقاتیں	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۵۰
انتظار حسین	سجاد حیدر یلدرم	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۴۱
امان اللہ خاں شیروانی	مولوی عبید الرحمن خاں شیروانی ایک مرد باصفات	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جون ۹۲ء ص ۲۶
انور زاہدی	سلویا پلاتھ، موت کی پیامبر امریکی شاعرہ	قومی زبان، کراچی مئی ۹۲ء ص ۴۱
انور سدید، ڈاکٹر	تسلیم احمد تصور	تحریریں، لاہور نومبر ۹۱ء ص ۲۵
انور سدید، ڈاکٹر	قتیل شفائی	نیرنگ خیال، راولپنڈی فروری ۹۲ء ص ۸
انور سدید، ڈاکٹر	جنت سے نکلا ہوا شاعر، جان کاشمیری	محفل، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۵
انیس خورشید	مولانا فضل اللہ فاروقی ندوی	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۶۳
ایل کمار، پروفیسر	یونان کے فلسفی، سقراط	انشاء کلکتہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۵
سلیم سیفی، ڈاکٹر	شاہد احمد دہلوی	محفل، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۳۳
بیخود دہلوی	فصیح الملک داغ	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۴۰

مصنف	عنوان	ماخذ
پیروز بخت قاضی	روشنی کا طالب، شکیب جلالی	نیرنگ خیال، راولپنڈی اپریل ۹۲ء ص ۳۹
تابش دہلوی	خواجہ محمد شفیع	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵۹
ثناء الحق صدیقی	زاہدہ خاتون بیگم زبیر زبیری	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ۲۷
جلیل قدوائی	قاضی جلال الدین	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۷
جوگندر پال	نئی ترقی پسندی کی ایک اہم آواز، قمر رئیس	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ۲۳۰
جیون خاں	ڈاکٹر حمید اللہ پراگندہ سے کچھ تاثرات	اودھ نامہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۳
حبیب اللہ اوج	عشرت رحمانی	تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳
حبیب اللہ اوج	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۳
حبیب اللہ مرزا	مرزا قلیج بیگ	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۶۵
محمد وسیم خاں		
حسنین کاظمی،	میکش اکبرآبادی، ایک نظر میں	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۰۸
حفیظ صدیقی، پروفیسر	طاہر شادانی	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۱ء ص ۱۱
حفیظ صدیقی	فاخر ہریانوی، چند یادیں چند تاثرات	محفل، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۱
حیدر قریشی	عہد ساز شخصیت، ڈاکٹر وزیر آغا	ابلاغ، پشاور جنوری ۹۲ء ص ۴۰
خان زادہ سمیع الوری	مظہر خیری اور جام نو	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۷۷
خاور قریشی	انجم شادانی، شخصیت اور فن	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۴۲
داور خاں داؤد	رحمان بابا کی شخصیت اور ادبی حیثیت کا پس منظر	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۲۹۰
رشید نثار	رئیس امروہوی، نئی مابعد الطبیعیات کا شاعر	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۴۰
رضوان علی رضوی، ڈاکٹر	امام احمد رضا خاں بریلوی	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۱۸
رضیہ حامد، ڈاکٹر	قلم کے صفیر، رفعت سروش	طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۷۷
ریاض الرحمن خاں شیروانی	کرنل بشیر حسین زیدی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جون ۹۲ء ص ۱۴
ریاض الدین عطش، خواجہ	کلیم عاجز	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۹
سلطان رشک	شوکت ہاشمی کی شاعری	نیرنگ خیال، راولپنڈی فروری ۹۲ء ص ۲۰
سلطان ظہور اختر	محسن ملت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	محفل، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۵
سلویسلر اسلین ترجمہ و تہذیب: سہیل احمد صدیقی	نادین گورڈیمر، جنوبی افریقہ کی ممتاز ناول نگار.....	قومی زبان کراچی مئی ۹۲ء ص ۳۹
سلیم الرحمن	چیخوف	محفل، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۹۹
سید قاسم محمود	سعادت حسن منٹو	مطالعہ پاکستان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹۳
سید مظفر حسین رزمی	ظہور الحسن رمز، اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے	تحریریں، لاہور دسمبر ۹۱ء ص ۱۴
شان الحق حقی، ڈاکٹر	حفیظ ہوشیارپوری	سب رس، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۸
شاہد علیم	نواب زادہ راحت سعید خاں چھتاری	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۷
شفیع عارف دہلوی	خواجہ محمد شفیع دہلوی	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۴۲
شکیل فاروقی	ملک محمد جائسی	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۸
شوکت الہ آبادی	سید معراج جامی	تحریریں، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۳
صبا اکبرآبادی	آگرہ کی ایک منفرد شخصیت، مسیت خاں گارڈ مرحوم	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۸۵
ضیاء الدین اصلاحی	محدث العصر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	معارف، اعظم گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۳۰۷
ضیاء الدین اصلاحی	کرنل بشیر حسین زیدی	معارف، اعظم گڑھ اپریل ۹۲ء ص ۳۴۷
عارف عبد المتین	سیف اللہ خالد	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۱ء ص ۳۳
عارف لکھنوی	علامہ سید سلیمان ندوی	کندن، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۱۰
عارف لکھنوی	علامہ سلیمان ندوی	محفل، لاہور مئی ۹۲ء ص ۸۷

عبدالعالی ادیب	اجمل خٹک	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۹۹۱ء ص ۱۱۵
عرش صدیقی	طاہر تونسوی، محقق اور نقاد	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۴۷
علیم احمد	نوبل انعام یافتہ شخصیات برائے ۱۹۹۱ء	سائنس میگزین، کراچی فروری ۹۲ء ص ۳۳
فارغ بخاری، یوسف رضا چشتی، تاج سعید	جلیل حشمی کی یاد میں	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۲۳
فرحت حسین، ڈاکٹر	داغ دہلوی	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۲۱
قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا	ڈاکٹر عبدالمنعم النمر[1]	معارف، اعظم گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۱۷
قرۃ العین طاہرہ	مجید امجد	ابلاغ، پشاور جنوری ۹۲ء ص ۱۵
آکتاویو پاز/ قمر جمیل	آکتاویو پاز سے ایک ملاقات	دریافت، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۷
کنیز اسحاق	ڈاکٹر شہناز مزمل اور عکسِ دیوار پہ تصویر	محفل، لاہور سالنامہ جنوری ۹۲ء ص ۴۷
گیان چند، ڈاکٹر	دکنیات کا معتبر ترین محقق، حسینی شاہد	سب رس، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۵
لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر	مقصود حسین فیروز نظامی	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۷۵
مجتبیٰ رضوی	علی گڑھ کا نامور فرزند، مولانا ظفر علی خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۳۷
محب الحسن، پروفیسر	مہاراجہ محمد علی خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۴
محمد ادریس، حافظ	مفکرِ اسلام سیّد مودودیؒ	ترجمان القرآن، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۱۴
محمد تقی عثمانی	حضرت فقیر محمد، جامع الصفات عالمِ دین	البلاغ، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۵۷
محمد تقی عثمانی	مولانا ظفر احمد انصاری	البلاغ، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۳
محمد خاں کلیم	ارشد میر، انشائیہ، طنز و مزاح نگار	محفل، لاہور سالنامہ جنوری ۹۲ء ص ۴۹
محمد عبدالرؤف، ڈاکٹر/ عبدالوحید رانا	شاہ عبداللطیف، پاکستانی ثقافت کا استعارہ	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء ص ۲۸۶
محمود اختر	وادیٔ مہران کا ایک جواں مرگ شاعر	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۸۲
محمود الرحمن، ڈاکٹر	مقبول عامر، چند یادیں چند باتیں	طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۹
مرزا احسان بیگ مغل	مولانا محمد صادق	الولی، حیدر آباد مارچ ۹۲ء ص ۲۲
مشتاق قمر	جارج برنارڈ شا	محفل، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۴۳
مشرف احمد، ڈاکٹر	ابوالفضل صدیقی مرحوم سے ان کی زندگی میں کیا گیا انٹرویو	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۶۴
مصطفیٰ علی بریلوی	عبدالرحیم صابر بلوچ، ایک خاموش خادمِ علم و ادب	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۳۱
مصطفیٰ علی بریلوی	سر آغا خاں	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۸۲
مصطفیٰ علی بریلوی	پروفیسر مسعود حسین ادیب لکھنوی	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹۱
مظہر یوسف	رئیس غلام محمد خاں بھرگری	الولی، حیدر آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۱
ملا واحدی	مصورِ غم راشد الخیری	دائرے، مارچ اپریل ۹۲ء ص ۴۵
ممتاز مفتی	بانو رشید امجد	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۳۵
منصور آفاق	خالد احمد اور تنہائی	ماہِ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۳۲
منظر علی خاں	پروفیسر سیّد محمد ماجد ہاشمی کی شخصیت اور ان کی تحریر کا پرتو	نیرنگِ خیال، راولپنڈی فروری ۹۲ء ص ۱۳
نجیب جمال، ڈاکٹر	اسلم انصاری، خوابِ آگہی کا شاعر	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۸۸
نسیم نوشو نوز	بارورخ اسپنوزا، ایک مختصر تعارف	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۳۲
نواب جوش یار جنگ	نواب سر سیّد حامد علی خاں والیٔ ریاست رامپور	تہذیب الاخلاق، مارچ ۹۲ء ص ۲۳
وقار راشدی، ڈاکٹر	ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی شخص اور شاعر	محفل، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۱
ہری چند اختر	ڈاکٹر تاثیر	محفل، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۳۱
یاور علیگ	کیفی اعظمی، ایک تجزیہ	ابلاغ، پشاور جنوری ۹۲ء ص ۶
یوسف علی خاں	حکیم فتح محمد سیوانی	الولی، حیدر آباد مارچ ۹۲ء ص ۲۲
....	مولانا ظفر احمد انصاریؒ	البلاغ، کراچی فروری ۹۲ء ص ۷

(۱) ماہر علوم عربی و تواریخ اسلامی

جولائی ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۷

مضمون نما

غالب کا ایک شعر	شان الحق حقی	۷
ادب کے لوصاح عتیق	نور تسروپ فرائی / قاضی افضال حسین	۱۱
طوفانِ نوح	محمد سلیم الرحمٰن	۲۳
ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر اُمِّ سلمیٰ	۳۱
انجم اعظمی۔ ساون آیا ہے۔ توسیع یا تکذیب	ن۔ م۔ دانش	۳۵
یادوں کا سفر۔ بابا ذہین شاہ تاجی	افتخار احمد عدنی	۴۳
چین میں بچوں کا ادب	مختار زمن	۵۱
شبلی کا ایک فلسفیانہ نظام	سارہ فاروقی	۵۳
ستار طاہر کی وفات پر (نظم)	ڈاکٹر انور سدید	۶۳

گلہائے رنگ رنگ

جارج پنجم کی ناک (ہندی)	کملیشور / اشہاب قدوائی	۶۵
سادھو (مراٹھی)	جی۔ اے۔ کلکرنی / اسلام بن رزاق	۶۹
نظمیں	شیخ ایاز۔ پی بی شیلے / آفاق صدیقی۔ سہاد مرزا	۷۳
رفتارِ ادب	ثناء الحق صدیقی۔ ا۔ س	۷۵
کچھ وقت بنگلہ دیشی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۸۱
گرد و پیش	....	۸۵
نئے خزانے	ڈاکٹر وقار راشدی	۹۱

بدل اشتراک

فی پرچہ —— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

PID (Islamabad)

"اردو ادب کے بڑے محقق" کا لقب جن کے نام کے ساتھ سجتا تھا اور جن کے لیے اسے لکھ کر دل کو طمانیت ہوتی تھی وہ جناب مالک رام تھے۔ جو ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت کر کے دنیائے اردو کو سوگوار کر گئے۔ اس طرح ہم ایک اچھے انسان اور اردو کے ایک بڑے محقق سے محروم ہو گئے۔

جناب مالک رام کے موضوعات میں غالب کو اختصاص حاصل تھا۔ تمام عمر غالب کی جستجو میں لگے رہے۔ اور اپنی تحریروں میں غالب کے فن و شخصیت کو یہ ہر رنگ رقم کرنے کی سعی کی۔ ان کی تصانیف "ذکرِ غالب" اور "تلامذہ غالب" غالبیات کے سلسلے میں تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ اس حقیقت کے کم ہی لوگ منکر ہوں گے کہ غالب کی بازیافت میں جناب مالک رام نے اکیلے جتنا کچھ کیا اتنا بہت سے مل کر بھی نہیں کر پائے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف "تذکرہ معاصرین" جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے اُس کے بارے میں اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ کے باب میں ایک نیا معیار قائم کرتی ہے اور سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

مالک رام کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ انھیں قرآن سے اُنسیت تھی اور فقہ اسلامی پر ایک خاص درک رکھتے تھے۔ "عورت اور اسلامی تعلیم" ان کی بڑی وقیع کتاب ہے۔ انھوں نے "ترجمان القرآن" اور "تذکرہ خطباتِ دین" کی تدوین کا کام بھی انجام دیا۔

جناب مالک رام کی تحریر کی لَے دھیمی ہے اور ایک ایسے دریا کی مثال ہے جو ہموار علاقے سے گزرتا ہے۔ رفتار کا یہی دھیما پن اُن کی تحریر و تقریر کو پُر تاثیر اور دل کو چھونے والا بنا دیتا ہے۔

انجمن ترقی اردو کے لیے جناب مالک رام کی خدمات بہت وسیع ہیں۔ انھیں انجمن کے مربیوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہ رشتہ بھی ہمارے ذہنوں میں جناب مالک رام کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے کچھ کم نہیں۔

جناب مالک رام کے انتقال سے ایک ایسا خلا رونما ہوا ہے جس کی تلافی مشکل سے ہو سکے گی۔ علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں اُن کے بے شمار کارنامے تادیر یاد رکھے جائیں گے۔

۵ جون ۱۹۹۳ء کو جناب مالک رام کے سلسلے میں منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے کے مقررین۔ دائیں سے بائیں: جناب آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اور جناب جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان۔

جناب مالک رام کے تعزیتی جلسے کے دوسرے مقررین۔ دائیں سے بائیں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جناب ایم ایچ عسکری اور ڈاکٹر اسلم فرخی
مشیر علمی و ادبی

شان الحق حقی

غالب کا ایک شعر (۱)

(جسے ایک غالب شناس کی دریافت نے موضوعِ گفتگو بنا دیا ہے)

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقت قہقہہ
کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے

"قومی زبان" جون ۹۳ء کے شمارے میں جناب افتخار احمد عدنی نے مجھ سے بطور خاص فرمائش کی ہے کہ غالب کے اس شعر کا مفہوم واضح کروں۔ میں ان کا مضمون پڑھتے پڑھتے اس فرمائش پر تو بعد میں پہنچا جو ورق پلٹنے کے بعد آخر میں نظر آئی، اس سے پہلے ہی جب شعر سامنے آیا تو اس کا کچھ مفہوم ذہن میں آچکا تھا اور اس سے زیادہ کی جستجو کے لیے توقف کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔

اس شعر پر مجھے مولانا محمد حسین آزاد یاد آئے۔ ان کی "آبِ حیات" اپنی گوناگوں غلط بیانیوں کے باعث اب اتنی مطبوعِ خاطر نہیں رہی جتنی کہ پہلے تھی۔ جدید ذہن حسنِ بیان سے زیادہ حقائق اور صحتِ بیان کا جویا ہوتا ہے۔ چنانچہ "آبِ حیات" جیسا نثر کا شاہکار پس پشت چلا گیا۔ اس کے خاص خاص لطائف جو پہلے ذہن میں مستحضر رہتے تھے، اب فراموش ہو گئے۔ شاید عدنی صاحب بھی "آبِ حیات" کو پڑھ کر بھول بھال گئے، آئیے "آبِ حیات" کی ایک روایت کو تازہ کر لیں۔ اشرف علی فغاں کے احوال میں لکھتے ہیں:

> "ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لالیاں اور جالیاں۔ سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ انھوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو۔ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا مہاراج اس قافیے کو متبذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا ہاں کچھ کہنا تو چاہیے۔ انھوں نے اسی

وقت پڑھا:

"جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں"

جگنو کو دیکھ کر تالیاں بجانا عورتوں یا لڑکوں کا ایک اضطراری فعل تھا۔ اور شاید اب بھی ہو یعنی اس کی متوازن RHYTHMIC حرکت پر تال دینا۔ گویا وہ خود تالیاں بجاتا ہوا جارہا ہے۔ جگنو کو پٹ بیجنا بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت: پٹ دیجنا۔ (پٹ کے ایک معنی حرکت کرنا اور بیجنا کے پنکھا جھلنا۔ وہی متوازن حرکت کا مفہوم (کچھ اور قیاسات بھی ہوسکتے ہیں۔ مثلاً پٹ حکائی لفظ بھی ہے۔) یہ واضح ہے کہ غالب کے ہاں محبوب کے اپنے ہی ہاتھ پر ہاتھ مارنے یعنی تالی بجانے کا ذکر ہے۔ کسی اور کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا آداب محبت یا آداب مصاحبت کے خلاف تھا۔

مطلب یہ کہ وہ اگر تالی بجائے تو چاند اس کی خاطر جگنو بن جائے۔ غالب کے ہاں محبوب کے اعجاز کا ذکر اور جگہ بھی ہے مثلاً:

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبد پیکر دیوار میں آوے

یعنی تو لب کھولے تو تیری مسیحائی کو ثابت کرنے کے لیے دیوار پر بنی ہوئی تصویریں زندہ ہوجائیں۔ یہ محبوب کا دعویٰ نہیں، شاعر کا حسن گمان ہے۔ جلیل مانک پوری کے اس شعر میں بھی کچھ اس قبیل کا مضمون ہے کہ جیسے مظاہر کائنات کی لو محبوب کے ساتھ لگی رہتی ہے:

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

غالب کی اس غزل کا یہ شعر بھی شاہد ہے کہ ان کے تخیل میں ان کے محبوب کی کیا شان اور کیا مقام ہے:

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

یہ بھی ۱۸۱۶ء کی غزل ہے جب کہ موصوف انڈر ٹین تھے اور کیا کچھ کہہ گزرے تھے۔ یہ سات شعر کی غزل تھی جن میں سے غالب نے دو کو قلمزد کر دیا تھا، ایک شعر اور ایک مقطع، ان کا کہنا ہے انھیں نہ سمجھا جائے چنانچہ ان پر ابہام اعمال وغیرہ کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی ہاں کچھ جواہر مل جائیں تو انھیں ضرور سراہا جائے گا۔

---

(۱) (میں جناب شان الحق حقی کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر مندرجہ بالا شعر کا مفہوم سمجھایا اور وہ بھی جگنو میاں اور اس شعر کے حوالے سے جسے ہم دونوں کے ممدوح "حضرت" بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے غالب شناس دوست اسے تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس پر ضرور احتجاج کریں گے۔ اگر اپنے ہی قہقہے پر یار ہاتھ پر ہاتھ مارے تو ہمارے دوست، ان کا قہقہہ اور اُن کا شیوہ دست زنی سب ہی اس شعر کے مفہوم سے خارج ہوجائیں گے۔ اگر غالب زندہ ہوتے تو وہ ضرور اس

شعر کا کوئی ایسا مفہوم بتاتے جس سے نہ ان کے قدردان کا دل ٹوٹتا نہ انہیں اپنے شعر سے کچھ زیادہ گریز کرنا پڑتا۔

اب میں حقی صاحب سے ایک اور درخواست کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ برائے مہربانی تفتہ کے حسبِ ذیل شعر کا مسئلہ بھی حل کریں۔ یہ شعر ہمارے غالب شناس محترم نے اس محفلِ نعت میں پڑھا تھا جس میں حقی صاحب نے بھی شرکت کی تھی۔ انہوں نے اس طرح شعر پڑھا تھا:

چوں بہ محشر عرصۂ محشر تپید
تفتہ گریاں آمد و دامانِ پیغمبر گرفت (کشید)

اگر تفتہ کا شعر حل جائے تو مسئلہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔ ورنہ کم از کم حقی صاحب اتنا احسان ضرور فرمائیں کہ دونوں مصرعوں کو ہم وزن کریں۔ شکریہ)

(افتخار احمد عدنی)

RICE
PID (ISL)

نورتھروپ فرائی / قاضی افضال حسین

ادب کی اوضاعِ عتیق

ہر باضابطہ علم بتدریج حاصل کیا جاسکتا ہے، اور تجربہ یہ ہے کہ ادب کی تفہیم میں بھی تدریج کو کسی قدر دخل ہے۔ ہمارے پہلے ہی جملے نے ہمیں ایک معنیاتی دقت میں ڈال دیا ہے طبعیات، فطرت کے متعلق علم کا ایک منظم شعبہ ہے اور اس کا طالب یہ نہیں کہتا کہ وہ فطرت کا مطالعہ کررہا ہے۔ بلکہ وہ طبعیات (PHYSICS) پڑھ رہا ہوتا ہے۔ فن، فطرت کی طرح، باضابطہ مطالعے کا موضوع ہے اور اسے خود اس کے منظم مطالعے..... تنقید..... سے ممتاز کرنا چاہیے۔ اس لیے "ادب کا مطالعہ" ناممکن ہے۔ ہم اس کے متعلق ایک خاص طرح پڑھتے ہیں، لیکن اس مطالعے کا موضوع ادب کی تنقید ہے۔ اسی طرح "ادب کی تدریس" میں دشواری بھی اسی لیے محسوس ہوتی ہے کہ تدریس ممکن نہیں۔ صرف نقد ادب ہی براہ راست پڑھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے جہاں ادب سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ سائنس کا تفاعل اختیار کرے، وہیں اس کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ ایک منظم اور باضابطہ مطالعے کی حیثیت سے تنقید جزوی طور پر ہی سہی۔ سائنس نہ ہو ممکن ہے یہ "خالص" یا "قطعی" سائنس نہ ہو لیکن یہ انیسویں صدی کی علمی اصطلاحیں۔ جواب متروک ہوچکی ہیں۔ تنقید، فنون لطیفہ سے بحث کرتی ہے۔ اور ممکن ہے خود بھی ایک فن لطیفہ ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تنقید لازماً بےضابطہ یا غیر منظم ہوگی اگر اسے سائنس سے بھی منسوب کرنا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے اپنی تہذیبی لطافت سے محروم کردیا جائے۔ علمی تصانیف اور رسائل میں تنقید یقیناً سائنس کی تمام خصوصیات سے متصف ہوتی ہے۔ ان میں شواہد کا مطالعہ سائنسی طریقے پر کیا جاتا ہے۔ ماہر متقدمین کا استعمال علمی انداز میں کیا جاتا ہے۔ متعلقہ مباحث کی سائنس کے انداز میں تفتیش کی جاتی ہے۔ متون کی تدوین میں سائنسی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ بحور اپنی وضع کے اعتبار سے سائنسی ہیں۔ اسی طرح صوتیات اور لسانیات بھی (اپنے مزاج کے اعتبار سے) سائنسی ہیں۔ پھر بھی اس نوع کے تنقیدی مطالعے کے دوران ایک مرکز گریز حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ جو قاری کو ادب سے دور لے جارہی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ادب، معاشرتی علوم کا مرکزی شعبہ ہے، جس کے ایک جانب تاریخ اور دوسری جانب فلسفہ ہے۔ تنقید چونکہ اب تک، ادب کا ایک ذیلی شعبہ ہے۔ اسی سبب موضوع کی باضابطہ ذہنی تنظیم میں طالب علم کو تصورات کے لیے فلاسفہ کی طرف اور واقعات کے لیے مورخ کے تصوراتی دروبست کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ نسبتاً مرکزی حیثیت والے تنقیدی علوم مثلاً تدوین متون ایک ایسے "پس منظر" کا جزو معلوم ہورہے ہیں جو تاریخ یا کسی دوسرے غیر ادبی صیغۂ علم کی طرف راجع ہو۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ تنقید کے ذیلی صیغے، ایک منضبط مرکزی ادراک کے وسیع ہوتے ہوئے نمونے (PATTERN) سے منسلک ہوسکتے ہیں۔ اس کی اگرچہ اب تک کوئی شہادت نہیں، لیکن اگر اس کی تصدیق ہوسکے تو یہ (ان ذیلی صیغوں کو) مرکز گریز ہونے سے روک سکیں گے۔ اگر ایسی کسی

ترتیب یا منصوبے کا وجود ہو تو تنقید، فنون لطیفہ کے لیے وہی ہوگی جو حکمت فلسفے کے لیے یا علم تاریخ کے لیے ہے۔

فی زمانہ تنقید کا بیشتر مرکزی عرصہ شرح و تفسیر پر مشتمل ہے۔ اور بلاشبہ ہمیشہ رہے گا لیکن محققین کے مقابلے میں شارحین کو اس کا احساس بہت کم ہوتا ہے کہ وہ کسی نوع کے سائنسی دستور کے پابند ہیں۔ وہ تو (الہامی مناجات کے الفاظ میں) اس گوشے کو منور کرنے میں منہمک ہیں، جہاں وہ خود ہیں۔ اگر ہم (موجودہ تنقیدی سرگرمی کے حوالے سے) تنقید کی ماہیت کے متعلق کوئی جامع تصور قایم کرنا چاہیں تو ہم خود کو تعمیم کی لرزاں دلدل، مدبرانہ اقداری، فیصلوں، ذومعنی تبصروں، اور وسیع تناظر کے تحقیقی نتائج کے خلاصوں کا جائزہ لیتا پائیں گے۔ تنقید کا یہ حصہ، صداقت اور دروغ گوئی دونوں سے عاری، قضیہ نما (PSEUDO PROPOSITIONS) اور خوش آہنگ اہمال سے پر ہے۔ بظاہر یہ صرف اس لیے موجود ہے کہ تنقید، فطرت کی طرح بے مصرف اشیاء سے ہر جگہ کو خالی و ویران مقام پر ترجیح دیتی ہے۔

قضیہ نما (PSEUDO PROPOSITIONS) کی اصطلاح سے میرے منطقی اثباتی رویے کا خیال ہوسکتا ہے لیکن میں معنی خیز قضیہ اور حقیقی واقعے میں خلط مبحث نہیں کروں گا اور نہ ہی ادب کے مطالعے کے معنی کے "داخلی۔ جذباتی" اور "معروضی۔ بیانیہ" جہات کی خیالی ثنویت کو یہ سمجھ کر کہ ادبی مفہوم کی تفہیم کے لیے اس ثنویت کو نظر انداز کرنا ضروری ہے۔ خلط ملط کرنے کا مشورہ دونگا۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ تنقید میں ایک معنی خیز بیان کے مہمل بیان سے تفریق کے اصول بہت واضح نہیں ہیں اس لیے ہمارا پہلا کام ، بے معنی تنقید کی شناخت اور اس سے نجات حاصل کرنا ہے۔ (بے معنی تنقید سے میرا مطلب) ادب کے متعلق اس طرح کی گفتگو ہے جو علم کی منظم وضع کی تعمیر میں معاون نہ ہو۔ ایک بے ضابطہ اقداری فیصلہ کا تعلق تنقید سے نہیں بلکہ ذوق کی تاریخ سے ہے اور ان سے زیادہ ان سماجی اور نفسیاتی ضرورتوں کی نشاندہی ہوتی ہے جو ان بیانات کا سبب بنے .... وہ تمام اقداری فیصلے جو ادبی تجربے کے زائد نہ ہو کر، جذباتی ہوں یا مذہبی یا سیاسی تعصبات سے مستخرج ہوں، غیر اختیاری یا بے ضابطہ (CASUAL) کہے جاسکتے ہیں۔ جذباتی فیصلے زیادہ تر یا تو معدوم درجہ بندی یا تضاد بیانی (شیکسپیئر نے زندگی کا مطالعہ کیا تھا اور ملٹن نے کتاب کا) یا پھر مصنف کی شخصیت کے تئیں شخصی ردعمل پر مبنی ہوتے ہیں۔ ادبی لپ شپ جو ایک تخیلاتی صرافہ میں شاعر کے مرتبہ کا بازار گرم کرتی یا اسے گراتی ہے، تنقید کا ذب ہے۔ دولت مند صاحب (INVESTOR) ٹی، ایس، ایلیٹ، اس بازار میں ملٹن کو ارزاں کرکے اب اسے دوبارہ خرید رہا ہے۔ ڈن اپنی قیمت کی غالباً انتہا تک پہنچ گیا ہے اور اب وہ گھٹنا شروع ہوگیا۔ ٹینی سن، ممکن ہے خفیف سی ہماہمی پیدا کرے لیکن شیلے کا مال لب تک سٹے پر لگا ہوا ہے۔ اس نوع کی تنقید کسی باضابطہ مطالعے کا جزو نہیں ہوسکتی کہ منظم مطالعہ صرف تدریجی ہوگا۔ جہاں بھی لرزش، تذبذب یا ردعمل ہوگا وہ صرف فرصت کے اوقات کی گفتگو ہوگی۔

اس کے بعد نقادوں کا ایک قدرے سنجیدہ حلقہ ہے۔ جس کے نزدیک قاری پر ادب کا اثر تنقید کا پیش نامہ ہے۔ اس لیے ہمیں ادب کے مطالعے کو مرکز تو رکھنا چاہیے، اور مطالعے کی بنیاد خود فن پارے کے ساختیاتی تجزیے پر رکھنی چاہیے۔ فنون لطیفہ کے کسی بھی عظیم شہ پارے کی یافت، پیچیدہ اور مبہم ہوتی ہے۔ اس پیچیدگی کو نمایاں کرنے میں خود مطالعے کے موضوع کو مرکز میں رکھتے ہوئے، ہم تاریخ یا فلسفہ سے حسب منشاو ضرورت مدد لے سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا (یعنی فن پارے کو مطالعے میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوتی) تو ہم دیکھیں گے کہ ادب کے متعلق لکھنے کے شوق میں ہم بھول گئے کہ ادب پڑھنا کیسے چاہیے۔

اس طریقہ کار کی تنہا کمزوری یہ ہے کہ یہ اصلاً مرکز گریز یا "پس منظر" تنقید کی ضد کے طور پر سوچا گیا ہے۔ اس لیے فلسفے کے داخلی اور خارجی روابط کے درمیان کشمکش کی طرح یہ ہمیں ایک غیر حقیقی کشمکش میں مبتلا کرتا ہے۔ تضادات، عام طور پر ایک قول کو تسلیم اور دوسرے کی تردید یا ان میں کسی ایک کو منتخب کرنے (سے حل نہیں ہوتے) اس کے بجائے مسئلے کو قول محال کی شکل میں بیان کرنے سے گریز کے ذریعے حل کیے جاتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ فن پارے کی تنقیدی تفہیم کی پہلی کوشش نقد بیان یا ساختیاتی تجزیے کی شکل میں ہو، لیکن تنقید میں ایک خالص ساختیاتی طریقہ کار کی وہی حدود ہیں جو اس طریقہ کار کی علم الحیوانات (BIOLOGY) میں ہیں۔ اپنی اصل میں یہ تجزیے کا محتاط سلسلہ ہے جو ادبی ساخت کے مخصوص وجود پر منحصر ہے۔ اس میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی ہے۔ کہ یہ وضع یا ساخت کیسے وجود میں آئی۔ ماقبل میں یہ کیا اور کیسی تھی اور یہ کہ اس ساخت کا قریبی ربط اور کن ساختیوں سے ہے۔ ساختیاتی تنقید بیان کے اصولوں (RHETORIC) کو تنقید میں واپس لے آتی ہے۔ لیکن ہمیں تو فن شعریات کی ضرورت ہے۔ اور صرف تزئین کے ان اصولوں سے نظریات کی تشکیل، اصطلاحات صائع کی بے لفاظی مری A الجھ جانے سے بمشکل بچ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ادبی تنقید میں اصول ربط (ORDINATIONG CO) کی کمی ہے۔ یعنی ایک ایسا مرکزی فرضیہ، جو علم الحیوانات کے طریقہ تفسیر کی طرح جس جزو پر تبصرہ کر رہا ہو، اسے ایک وسیع کل کا حصہ سمجھے۔ ایسا کوئی اصول، ساختیاتی تجزیے کے مرکز جو تناظر کو باقی رکھنے کے ساتھ ہی دوسری انواع نقد کو بھی یہی تناظر فراہم کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس فرضیہ کا پہلا اصول وہی ہے، جو دوسرے علوم کا ہے، یعنی مکمل (TOTALCOHERENCE) کا مفروضہ۔ یہ مفروضہ سائنس کے موضوعات کی بجائے خود سائنس کے متعلق ہے (اسی طرح) خود فطرت میں بھی ہمیں، جو ایک نظم و ضبط کا یقین ہے۔ وہ بھی طبعی علوم (NATURAL SCIENCE) کی معقولیت کا نتیجہ ہے اور اگر کسی منزل پر طبعی علوم فطرت کا نظم و انضباط پوری طرح ثابت کر دیں تو غالباً وہ اپنے موضوع کی تحقیق کے تمام امکانات ختم کر لیں گے۔ سائنس کی حیثیت سے تنقید بہ تمام و کمال تعقلی ہے۔ ادب ایک منضبط علم کے موضوع کی حیثیت سے جہاں تک ہمیں معلوم ہے، نئی تنقیدی دریافتوں کا نا مختتم ماخذ ہے اور رہے گا، خواہ نئے ادبی فن پاروں کی تخلیق بند ہی کیوں نہ ہو جائے اگر ایسا ہے تو ان تحدیدی اصولوں کی جستجو فضول ہے جو تنقید کے ارتقاء کی حوصلہ افزائی نہ کرتے ہوں۔ یہ دعویٰ کہ نقاد کو نظم میں معنی کی ان سے زیادہ جستجو نہیں کرنی چاہیے۔ جتنی کہ ہم قیاس کرتے ہیں، کہ شاعر نے شعوری طور پر اس نظم میں رکھے ہیں۔ خام یا عاجلانہ غائیت (TELEOLOGY) کے مغالطے کی عام شکل کہی جا سکتی ہے۔ یہ دعویٰ اس خیال کے عین مماثل ہے کہ طبعی مظاہر جیسے ہیں، بس ویسے ہی ہیں کیوں کہ پروردگار کی فہم و ادراک سے ماوریٰ حکمت نے انھیں ایسا ہی بنایا ہے۔

یہ مفروضہ بظاہر بہت سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن کسی مخصوص شعبۂ علم کو یہ دریافت کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے کہ وہ پوری طرح منضبط تعقلی علم ہے۔ تاوقتیکہ یہ تحقیق نہیں ہو جاتی وہ علم کا باقاعدہ شعبہ نہیں بنتا بلکہ کسی دوسرے علم میں جنین (EMBRYO) کی طرح شامل ہوتا ہے۔ طبعی فلسفے سے علم الطبیعات (PHYSICS) اور اخلاقی فلسفہ سے عمرانیات کا استخراج و ارتقاء اس عمل کی مثالیں ہیں۔ یہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ جدید علوم کا ارتقاء ریاضی سے ان کی قربت کی مناسبت سے ہوا چنانچہ طبیعات اور نجوم نے اپنی جدید شکلیں، نشاۃ الثانیہ میں حاصل کیں۔ کیمیا نے اٹھارہویں صدی میں علم الحیوانات (BIOLOGY) نے انیسویں صدی میں اور عمرانی علوم نے بیسویں صدی میں اپنی موجودہ شکلیں پائیں اس لیے اگر منضبط

تنقید کا ارتقاء اب ہمارے زمانے میں ہو رہا ہے۔ تو کم از کم زمانی اعتبار سے یہ ترتیب غلط نہیں ہے۔

اب ہم درجہ بندی کے ان اصولوں کی تلاش میں ہیں جو ہمارے متعین کردہ دو نکات کی حدود ہیں ان نکات میں پہلا، تنقید کی ابتدائی کوشش یعنی فن پارے کی ساختیاتی تنقید ہے اور دوسرا فرضیہ یہ ہے کہ تنقید ایک باقاعدہ شعبہ علم ہے اور پوری طرح با معنی ہے۔ ساختیاتی تجزیے سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہم استقرائی طریقہ پر مزید آگے بڑھ کر ان معلومات میں وسیع تر تنظیم کی تلاش کر سکتے ہیں یا ٹھیک اس کے علی الرغم تنقید کی وحدت کے مفروضے سے برآمد نتائج کی روشنی میں استنباطی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں یہ یقیناً واضح ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک طریقہ بغیر دوسرے طریقے کی اعانت یا اصلاح کے لامحدود طور پر کارگر نہیں ہوگا۔ خالص استقراء میں ہم بے ترتیب قیاس آرائیاں کرتے رہیں گے، خالص استنباط بے لچک اور بے اندازہ خانہ بندی کی طرف لے جائے گا۔ تو آئیے ان دونوں جہتوں میں چند تجرباتی پیش رفت کرتے ہیں ابتدا استقرائی طریقے سے کریں۔

II

فن پارے کی وحدت جو ساختیاتی تجزیے کی بنیاد ہے، فن کار کی غیر مشروط خواہش کی زائدہ نہیں کہ فنکار تو صرف اس کا ایک صاحب ہنر سبب ہے۔ فن پارے کی ایک جہت اور نتیجتاً اس کا ایک مقررہ باقاعدہ سبب ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس پر نظر ثانی ممکن ہے اور یہ کہ شاعر (فن پارے میں) ترمیم اس لیے نہیں کرتا کہ وہ (اس ترمیم کو) پسند کرتا ہے۔ بلکہ ترمیم (فن پارے کی) پہلی صورت سے بہتر ہوتی ہے۔ اس صداقت کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری کی طرح نظمیں بھی بنائی نہیں جاتیں بلکہ پیدا ہوتی ہیں۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ نظم کو ممکن حد تک غیر مجروح حالت میں پیدا کرے اور اگر نظم زندہ ہے تو وہ بھی شاعر سے چھٹکارا پانے کے لیے اتنی ہی مضطرب ہوتی ہے اور اس کی (شاعر کی) اظہار ذات کی خواہش ذاتی یادداشتوں انسلاکات اور اس کی انا کے دیگر تمام نال (NAVALSTINGS) اور خوراک (FEEDING TUBE) سے آزاد ہونے کی التجا کرتی ہے۔ نقاد وہیں سے شروع کرتا ہے جہاں سے شاعر جدا ہوتا ہے اور تنقید شاعر کو نظم سے جوڑنے والی ایک نوع کی ادبی نفسیات کے بغیر بمشکل ہی چل سکتی ہے۔ اس کا ایک جزو شاعر کا نفسیاتی مطالعہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس نفسیاتی مطالعے کی ضرورت بطور خاص اظہار کی ناکامی کے تجزیے میں کارآمد ہے۔ یعنی (شاعر کی) ذات سے متعلق وہ چیزیں جو اب تک اس کی تخلیق سے منسلک رہ گئی ہیں۔ اس سے زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کا اپنی ذاتی ضنمیات (MYTHOLOGY) اپنی قوسِ قزح یا علامات کا مخصوص طریقۂ تخلیق ہوتا ہے، جن سے وہ بیشتر ناواقف ہوتا ہے، ڈرامہ اور ناول جیسی تخلیقات میں، جہاں کردار ہوتے ہیں، یہی نفسیاتی تجزیہ کرداروں کے باہمی روابط تک پھیلایا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ ادبی نفسیات ان کرداروں کے افعال کا مطالعہ صرف اس مخصوص ادبی روایت کے حوالے سے ہی کر سکتی ہے۔

ہمارے سامنے اب بھی نظم کے مقررہ رسمی اسباب کا مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ صنف سخن کے سوال سے بہت زیادہ وابستہ ہے۔ ہم اصناف کے متعلق بہت زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے کیوں کہ تنقید ان کے متعلق بہت زیادہ جانتی نہیں۔ ناول اور رزمیہ کے متعلق بہت ساری تحریریں خصوصاً افواہ کی نفسیات کی مثال کی حیثیت سے بہت دلچسپ ہیں۔ اصناف کے دو خاص تصورات، واضح طور پر مغالطہ آمیز ہیں، اور چونکہ یہ دو متضاد انتہاؤں پر ہیں، اس لیے سچائی کو ان کے درمیان کہیں ہونا چاہیے۔ ایک مصنوعی افلاطونی تصور ہے (جس کے مطابق) صنف تخلیق سے قبل اور اس سے آزاد وجود رکھتی ہے۔ (یہ تصور صنف کی ہیئت کی روایت،

مثلاً سانیٹ سے گڈمڈ کرتا ہے۔ دوسرا نمو پذیر انواع کا مصنوعی حیاتیاتی تصوّر ہے۔ جو مختلف اصناف کے "ارتقاء" کے جائزوں میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ہم صنف کی ابتدا کی تحقیق کرتے ہیں، اور اس کے لیے سب سے پہلے اس عمرانی صورت حال اور تہذیبی تقاضوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جنھوں نے اس کو پیدا کیا۔ دوسرے الفاظ میں ہم فن پارے کے مادی اسباب کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ تفتیش ہمیں ادبی تاریخ کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ادبی تاریخ عام تاریخ سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کے تحریری زمرے (GOTHIC ROMANTIC BAROQUE) اور ایسے ہی دوسرے تہذیبی درجات، عام مورخ کے لیے بہت کم کارآمد ہیں۔ زیادہ تر ادبی تاریخیں ان اقسام کا بیان نہیں کرتیں لیکن پھر بھی تنقیدی علوم کی بہت ساری اقسام کے مقابلے میں ہم ان کے متعلق بہت زیادہ جانتے ہیں۔ مورخ، ادب اور فلسفے کو تاریخی نقطۂ نظر سے پڑھتا ہے۔ فلسفی، ادب اور تاریخ کو فلسفیانہ نظر سے دیکھتا ہے اور خود مختار تنقید کے نقطۂ نظر سے تاریخ اور فلسفہ کو برتنے کی ابتدا نام نہاد "فکری تاریخ" کے طریقہ کار سے ہوتی ہے۔

پھر بھی ہمیں لگتا ہے کہ کہیں کچھ کمی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے ایک مخصوص تخلیقی طریقہ کار کے ذریعہ پیکر تراشتا ہے لیکن جب بہت سارے شاعر کثیر تعداد میں ایک ہی جیسے پیکر تراشتے ہیں تو اس عمل کی تفہیم کے لیے سوانح سے زیادہ بڑے تنقیدی مسائل پر غور و خوض کی ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ آڈن (AUDEN) نے انتہائی بصیرت افروز مضمون (FLOOD THE ENCHAFED) میں بحث کی ہے۔ سمندر جیسی اہم علامت صرف شیلے یا کیٹس یا کالرج کی شاعری تک محدود نہیں رہ سکتی ادب کی اساطیری علامت کی حیثیت سے متعدد شعرا کے یہاں اس کا ظہور یقینی ہے اور اگر ہر صنف کا ایک تاریخی ماخذ یا آغاز ہے تو صنف ڈرامہ دور متوسط کے مذہب سے اس طریقے سے کیوں ابھرتا ہے جو صدیوں قبل یونانی مذہب سے اس کی پیدائش سے حیرت انگیز طور پر مماثل ہے۔ یہ آغاز سے زیادہ ساخت کا مسئلہ ہے اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پیکروں اور ان کی طرح اصناف کا بھی وضع عتیق (ARCHETYPE) ممکن ہے۔

یہ واضح ہے کہ تنقید اس وقت تک منظم نہیں ہو سکتی جب تک خود ادب میں وہ صفت نہ ہو جو تنقید میں تنظیم کی صلاحیت پیدا کرے۔ الفاظ کی ایک ترتیب جو طبعی علوم میں فطرت کی ترتیب سے مطابقت رکھتی ہے۔ ایک وضع عتیق، تنقید کی متعدد و مرتب کرنے والی صرف ایک قسم نہیں ہونا چاہیے کہ اسے خود مکمل ہیئت کا ایک جزو ہونا چاہیے اور اس سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تنقید، ادب میں کس نوع کی مکمل ہیئت دریافت کر سکتی ہے تنقیدی طریقہ کار کا ہمارا جائزہ زیادہ سے زیادہ ادبی تاریخ تک لے جاسکتا ہے۔ مکمل ادبی تاریخ ابتدائی سادگی سے لطیف تر کی طرف سفر کرتی ہے اور اس میں ہم اس امکان کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں کہ ادب، ابتدائی تہذیبوں میں نمایاں ایک نسبتاً محدود اور سادہ ضابطوں کی زیادہ پیچیدہ شکل ہے اگر ایسا ہے تب اوضاع عتیق (ARCHETYPES) کی جستجو ایک نوع کا ادبی بشریات ہے۔ جس کا سروکار ان طریقوں سے ہے جس سے ادب ما قبل ادبی اقسام مثلاً (RITUAL) (مذہبی رسوم) (MYTH) (ضمیات) اور (FOLKLORE) (عوامی روایت) سے مستفیض ہوتا ہے۔ مزید ہم پر منکشف ہوگا کہ ان انواع اور ادب کے درمیان تعلق صرف توارث سے یا زمانہ سابق سے یا بعد کی طرف سفر کا نہیں اور یہ ہم عظیم کلاسیکی فن پاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں حقیقتاً ان کی طرف مراجعت کا رجحان عام ہے۔ یہ مشاہدہ اس عام احساس سے پوری مطابقت رکھتا ہے کہ ایک اوسط درجے کا فن پارہ خواہ کتنا ہی زور دار کیوں نہ معلوم ہو، تنقیدی تجزیے کی بہ وقت

سطح پر واقع اور قدرے بے ترتیب شکل رکھتا ہے۔ جب کہ ایک وقیع شاہکار ہمیں ایک ایسے نقطے کی طرف کھینچتا محسوس ہوتا ہے جہاں ہم معنی خیزی کے بے انداز ساختوں کو مدغم ہوتے دیکھتے ہیں۔ یہاں اس امکان پر غور کرنے کا موقع ہے کہ صرف زماں میں الجھنے کی بجائے کیا ادب کو کسی نامعلوم مرکز سے تصوراتی عرصے میں وسیع ہوتا ہوا نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

وضع عتیق کی طرف یہ استقرائی سفر ساختیاتی تجزیے سے انحراف کے مثل ہے۔ جسے ہم برش کے کام کی بجائے تصویر کی ڈیزائن دیکھنے کے لیے تصویر سے فاصلے پر جاتے ہیں۔ مثلاً ہیملٹ کے گورکن والے سین کے پیش منظر میں جوکر کے ذو معنی جملوں سے لے کر YORICK کی خود کلامی کے رقص الموت تک ایک پیچیدہ لسانی بافت ہے زمانی اعتبار سے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہی WILSONKINGHT اور SPURGEON حلقہ کے تنقید نگاروں میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں بدچلنی اور زوال کے پیکروں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیسے جیسے پورے ڈرامے میں اس سین کی جگہ کا مفہوم ہم پر واضح ہوتا جاتا ہے۔ ہم نفسیاتی روابط کے ایک جال کے درمیان ہوتے ہیں جو BRADLEY کی خاص دلچسپی کے تھے۔ لیکن ان مطالعوں میں بہر حال ہمیں صنف کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کا خیال آتا ہے۔ ہیملٹ ایک ڈرامہ ہے اور ایک ELIZABETHAN ڈرامہ ہے۔ اس لیے اب ہم ایک قدم اور پیچھے STOLL اور SHAW کے گروپ میں پہنچتے ہیں اور اس سین کو صنفی روایت کے مطابق ڈرامائی تناظر میں دیکھتے ہیں اور صرف ایک قدم اور پیچھے جاکر اس سین کے وضع عتیق کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے ہیرو کی محبت میں خود کشی اور اس کی محبت کا پہلا غیر مبہم اعلان LAERTES سے اس کی کشمکش اور خود اپنی قسمت کا فیصلہ اور ان کے مزاج کا اچانک اعتدال جن سے آخری سین کی ابتدا ہوتی ہے یہ سب اس قبر میں جست لگانے اور اس سے واپسی کے گرد صورت پذیر ہوتا ہے جو اسٹیج پر ہیبت ناک حد تک کھلی ہوئی ہے۔

اس سین کی تفہیم کے ہر مرحلے پر ہمیں ایک مخصوص قسم کی علمی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی صفائی اور وضاحت کے لیے ہمیں پہلے ایک مدوّن کی ضرورت ہے پھر علم بیان کے ایک ماہر کی، اس کے بعد ماہر لسانیات اور پھر ادبی ماہر نفسیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ (اس کے علاوہ) ایک ادبی عمرانی مورخ، ادبی فلسفی اور افکار کی تاریخ، کے ایک عالم کی مدد کے بغیر ہم اصناف کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ نیز اساطیر (اوضاع عتیق) کے لیے ایک ادبی ماہر بشریات کی ضرورت ہے۔ لیکن اب چونکہ تنقید کا مرکزی طریقہ کار متعین ہوگیا ہے، یہ تمام علمی سرگرمیاں رفتہ رفتہ نفسیات تاریخ وغیرہ میں سمٹنے کی بجائے ادبی تنقید کے مرکزی حوالے کی طرف راجع دکھائی دیتی ہیں بالخصوص ادبی ماہر بشریات جو ہیملٹ کے قصے کے ماخذ، قبل شیکسپیر ڈراموں سے SAXO تک اور SAXO سے فطرت کی ضمیات (NATURE MYTH) تک تلاش کرتا ہے۔ وہ شیکسپیر سے دور نہیں ہوتا جارہا ہے بلکہ وہ اس وضع عتیق کے قریب تر آتا جارہا ہے جسے شیکسپیئر نے دوبارہ خلق کیا ہمارے اس نئے تناظر کا ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی ہے کہ تنقید نگاروں کے درمیان تضادات اور مختلف دبستانوں کے درمیان برتری کے وعدوں کی کشمکش بے حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے آئیے اب دیکھیں کہ استنباطی طریقہ کار سے ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں۔

III

بعض فنون مثلاً موسیقی، زمانی ہوتے ہیں۔ بعض مثلاً مصوری کا کردار مکانی ہے۔ وہ صرف کسی ایک رقبہ (SPACE) میں پیش کیے جاسکتے ہیں ان دونوں صورتوں میں تنظیم کا بنیادی اصول تکرار (RECURRENCE) ہے، جب یہ تکرار زمانی ہوتی

ہے تو اسے آہنگ کہتے ہیں اور جب یہ مکانی یا ایک رقبے میں ہوتی ہے تو اسے ترتیب یا نقشہ کہتے ہیں اس لیے ہم شاعری کے آہنگ اور تصویر کے نقشے (ڈیزائن) کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن تحسین کی قدرے بلند سطح پر اپنے ذوق کے تناسب کی نمائش کے لیے ہم تصویر کے آہنگ اور موسیقی کے PA TTERN کا بھی ذکر کر سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر تمام فنون کا ادراک زمانی اور مکانی دونوں حوالوں سے کیا جاسکتا ہے موسیقی کے اندراج نغمہ (SCORE) کو ایک ساتھ دیکھا جاسکتا ہے ایک تصویر نظروں کے پیچیدہ رقص کی روشنی کہی جاسکتی ہے۔ ادب، موسیقی اور مصوری کے درمیان کی چیز محسوس ہوتی ہے۔ ایک انتہا پر تو اس کے الفاظ وہ آہنگ خلق کرتے ہیں جو آوازوں کی مترنم ترتیب تک پہنچ جاتا ہے اور دوسری انتہا پر وہ نقش مرتب کرتے ہیں جو مصور تحریر (HIIROGIYPHIC) یا تصویری پیکر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جسے ہم تجرباتی تحریر کہتے ہیں۔ اس کا بیشتر حصہ ان انتہاؤں کے ممکن حد تک قریب تر پہنچنے کی کوشش ہے۔ ہم ادب کے اس آہنگ کو بیانیہ کہہ سکتے ہیں اور اس ملفوظی ترتیب کے ذہنی ادراک کو مفہوم یا معنی خیزی کہہ سکتے ہیں۔ ہم بیانیہ کو سنتے ہیں لیکن جب ہم فن پارے کی مکمل ترتیب کا ادراک کرتے ہیں تب ہم اس کا مفہوم دیکھتے ہیں۔

فن پارے کے حوالہ جاتی کردار کا مغالطہ مصوری سے زیادہ ادب کی تنقید میں مانع ہوتا ہے۔ اس مغالطے کے سبب ہم بیان کو خارجی "زندگی" کے واقعات کی نمائندگی اور معنی کو کسی خارجی، تصور کا عکس سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر تنقیدی محاورے کو اس کے صحیح مفہوم میں استعمال کریں تو ایک مصنف کا بیانیہ فن پارے کی مستقیم زمانی حرکت ہے اور اس کا مفہوم اس کی ہیئت کی مکمل وحدت ہے۔ اسی طرح ایک پیکر کسی خارجی معروض شے کا نقش محض نہیں بلکہ ملفوظی ساخت کی ایک اکائی ہے جو اس کی مجموعی ترتیب (PATTERN) یا آہنگ کا ایک جزو ہے۔ یہاں تک کہ مصنف الفاظ میں جو حروف استعمال کرتا ہے وہ بھی اس PATTERN کا جزو ہیں۔ اگرچہ صرف بعض خاص حالتوں میں (مثلاً سہ حرفی) تنقیدی توجہ کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ اس طرح بیانیہ اور معنی، موسیقی کی اصطلاح میں، پیکر کا خوش آہنگ اور خوش ترتیب تناظر بن جاتے ہیں۔

آہنگ یا متوازن تحرک، فطرت کی گردش سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے اور فطرت میں ہر وہ چیز، مثلاً پھول یا پرندوں کا نغمہ، جسے ہم سمجھتے ہیں کہ فن پارے سے کچھ مماثلت رکھتی ہے۔ ایک حیاتیاتی وحدت اور اس کے ماحول کے آہنگ خصوصاً شمسی سال کے تواتر میں گہری موزونیت و مطابقت سے نمو پاتی ہے۔ جانوروں میں اس مطابقت کے بعض مظاہر مثلاً پرندوں کا رقص وصال تو قریب قریب مذہبی رسم کہے جاسکتے ہیں۔ اس کے علی الرغم، انسانوں میں مذہبی رسوم ایک اختیاری کوشش معلوم ہوتی ہیں۔ (اسی لیے ان میں سریت ہوتی ہے) جس کا مقصد ادوار فطرت سے منقطع ربط دوبارہ قائم کرنا ہے۔ ایک کسان کو، سال کے ایک خاص زمانے میں، اپنی فصل ضرور کاٹ لینی ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ عمل غیر اختیاری ہے، اس لیے فصل کا کاٹنا حقیقی مذہبی رسم نہیں ہے دراصل فصل کاٹنے کا ایسے زمانے میں بشری اور فطری قوتوں کے درمیان تطابق کی وہ خواہش مذہبی رسم (RITUAL) ہوگی جو شعوری طور پر فصلی گانے، فصلی قربانیاں اور عام لوگوں کے ایک خاص فصل کے زمانے میں رواج خلق کرتی ہے۔ رسم، اعمال کی ایک سلسلہ وار زمانی ترتیب ہوتی ہے۔ جس میں شعوری معنی یا دلالت مخفی (خوابیدہ) ہوتی ہے۔ جیسے کوئی غیر متعلق ناظر تو دیکھ سکتا ہے، لیکن جو ان رسوم میں حصہ لینے والوں سے بڑی حد تک پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس طرح ہم مذہبی رسوم میں بیانیہ کا ماخذ دریافت کر سکتے ہیں۔ رسوم کی کشش خالص بیان کی طرف ہوتی ہے اور اگر خالص بیان کوئی چیز ہے تو وہ خودکار اور غیر شعوری ہوگی۔ مذہبی رسوم میں ہم، قاموسی ہونے کا مسلسل رجحان بھی پائیں گے۔ فطرت کی تمام اہم تکرار، دن،

چاند، کی مختلف منزلیں، موسم، سال کے مخصوص دن، (راس السرطان، راس الجدی)، ولادت سے موت تک وجود کی کشمکش ان سب سے رسوم (RITUALS) منسلک ہو جاتی ہیں۔ بڑے مذاہب میں تو بیشتر، رسوم کا ایک واضح مستقل نظام ہوتا ہے، جو انسانی زندگی کے تمام اہم اعمال کی طرف معنی خیز اشارہ کرتی ہیں۔

دوسری طرف پیکر کی ترتیب یا معنی خیزی کے اجزاء اپنی ابتدا یا ماخذ کے اعتبار سے پر اسرار ہوتے ہیں اور کسی مافوق البشر لمحے میں معاً ادراک کی چمک حاصل کرتے ہیں، جس کی اہمیت کی طرف CASSIRER نے MYTH AND LANGUAGE میں اشارہ کیا ہے۔ جب تک ہم انھیں ضرب الامثال (PROVERBS) معمہ (RIDDLE) احکام (COMMANDMENTS) اور تشخیصی لوک کہانیوں (TALES - ETLIOLOGICAL FOLK) کی شکل میں قبول کریں۔ ان میں بیانیہ کا قابل لحاظ عنصر شامل ہو چکا ہوتا ہے۔ ان پیکروں کا رجحان بھی قاموسی ہوتا ہے۔ جو اصول و معنی کا ایک پورا نظام تجربی اور غیر مسلسل اجزا سے مرتب کرتے ہیں۔ ضمیات روح پھونکنے والی وہ مرکزی قوت ہے جو رسوم کو اساطیری معنی خیزی اور سروشِ غیبی کو اساطیری بیانیہ عطا کرتی ہے۔ اس لیے ضمیات وضع عتیق ہے۔ یہ زیادہ آسان ہوگا کہ بیانیہ کے لیے صرف ضمیات اور معنی خیزی کا ذکر کرتے ہوئے اساطیری کہا جاوے۔ دن کے دور شمسی، سال کی موسمی گردش اور انسانی زندگی کی نامیاتی تکرار میں معنی خیزی کا یکساں (PATTERN) ہے جس سے MYTH ایک ایسی شخصیت کے گرد مرکزی بیانیہ تعمیر کرتا ہے جو جزوی طور پر سورج کچھ زرخیزیا روئیدگی اور قدرے دیوتا یا اساطیری انسان ہوتا ہے۔ تنقید نگاروں کو اس MYTH کی غیر معمولی اہمیت کا احساس بطور خاص یونگ اور فریزر نے دلایا، لیکن اس موضوع پر بازار میں ملنے والی متعدد کتابیں اپنے طریقہ کار اور زاویۂ نظر کے اعتبار سے ہمیشہ منظم نہیں ہوتیں، اس لیے میں اس کے مختلف مراحل کا گوشوارہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ طلوع، بہار اور پیدائش، اس کی ایک منزل ہے۔ یہ شاہ کردار (ہیرو) کی پیدائش، احیاء نجات اور تخلیق، (چونکہ چار منازل کا ایک دورانیہ (CYCLE) ہے اور ظلمت، سرما اور قوت کی قوتوں کی شکست کا MYTH ہے، معاون کردار ماں اور باپ ہیں یہ MYTH رومانس، بیشتر مستی آمیز اور رزمیہ نظموں کی وضع عتیق ہے۔

۲۔ عروج، موسم گرما اور شادی یا فتح کی منزل یا APOTHEOSIS مقدس نکاح اور خبت میں داخلے کا MYTH ہے۔ اس کے معاون کردار رفیق اور دلہن ہیں۔ یہ MYTH یا دیہاتی زندگی کے متعلق نظموں نیز منظریہ نظموں کی وضع عتیق ہے۔

۳۔ غروب، خزاں اور موت کی منزل۔ یہ زوال، مرتے ہوئے دیوتا، قربانی، پر تشدد، موت اور شاہ کردار کی علیٰحدگی کا MYTH ہے۔ اس کا معاون کردار، غدار یا نمک حرام رفیق اور عیار مگر خوش آواز مغنیہ ہیں۔ یہ MYTH المیہ اور نوحہ کی وضع عتیق ہے۔

۴۔ اندھیرا، سرما اور فنا کی منزل ان قوتوں کی فتح کا MYTH ہے سیلاب اور انتشار کی واپسی کا MYTH ہیرو کی شکست اور GOTTERDAMMERUNG کا MYTH اس منزل سے مخصوص ہیں اس کے معاون کردار دیو اور ساحرہ ہیں۔ یہ MYTH طنز کی وضع عتیق ہے (مثال کے لیے دیکھیے THE DUNCIAD کا اختتامیہ)

شاہ کردار کی جستجو بھی مبہم اور بے ترتیب ملفوظی ساخت کو جذب کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ ہم یہ مقامی داستانوں کے انتشار میں دیکھ سکتے ہیں ان داستانوں کا یہ انتشار بعض ان فوق البشر ہینتوں کے پیغمبرانہ ظہور کا زائدہ ہے۔ جو شعبہ جاتی دیوتاؤں کے صنمیات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، بیشتر ترقی یافتہ مذاہب میں یہ جستجو کی وہی مرکزی MYTH بن جاتی ہے جو مذہبی

رسوم سے نمو حاصل کرتی ہے۔ جیسے کہ مسیح کی MYTH یہودیت میں درالرحم (ORACLE) کی بیانیہ وضع اختیار کر گئی ہے۔ ایک مقامی سیلاب سے اتفاقیہ کوئی لوک کہانی پیدا ہو سکتی ہے لیکن سیلاب کی کہانیوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ایسی کہانیاں کتنی سرعت سے فنا کی MYTH کی مثال بن جاتی ہیں۔ آخری بات یہ کہ مذہبی رسوم اور ظہور فوق البشر (EPIPHANY) دونوں کے قاموسی ہونے کا رجحان MYTH کی ان متعین شکلوں میں مجسم ہوتا ہے جو مذاہب کے مقدس صحائف کی تشکیل کرتی ہیں۔ نتیجتاً یہ صحائف وہ پہلی دستاویزات ہیں جنھیں اپنے موضوع کے وسیع اور گہرے مطالعے کے لیے تنقید نگار کو پڑھنا چاہیے۔ ان کی وضع سمجھ لینے کے بعد وہ اساطیر سے اصناف کے مطالعے پر اتر سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے کہ کیسے ڈرامہ MYTH کی رسمی جہت سے اور غنائی نظم اس کی الہامی، مبہم یا جزوی اور متفرق جہت سے نمو کرتی ہے۔ جب کہ رزمیہ میں مرکزی قاموسی ساخت باقی رہتی ہے۔

علم کے اس شعبہ میں اپنی حدود اربعہ متعین کرنے سے قبل ادبی تنقید کے لیے انتباہ اور حوصلہ افزائی کے چند کلمات ضروری ہیں۔ یہ دیکھنا نقاد کے فرائض میں شامل ہے کہ تمام اصناف کیسے جستجو کی MYTH سے مستخرج ہیں، لیکن تنقیدی طریقہ کار کی حد تک یہ استخراج منطقی ہوتا ہے۔ مستقبل میں تنقید کے تعارف یا خاکہ کی کتاب اگر اس فن کے وسیع مطالعے کی بنیاد پر لکھی جائے گی اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف بھی کرے گی تو اس میں پہلا باب جستجو کی MYTH (QUEST MYTH) پر ہوگا۔ یہ تو جب ہم اس MYTH سے اصناف کے اشتقاق کی تاریخی تشریح کرتے ہیں تب ہم یہ حقیقی ما قبل تاریخ افسانے یا ضمیاتی رابطے کے نظریات پر لکھنے لگتے ہیں۔ مزید یہ کہ نفسیات اور بشریات بہت ترقی یافتہ علوم ہیں۔ وہ تنقید نگار جوان علوم سے بحث کرتا ہے تھوڑے دنوں تک ان علوم کی معمولی شد بد والا بھی معلوم ہوتا ہے۔ تنقید کے ارتقائی سفر کی یہ دو منازل (نفسیاتی اور بشریاتی تنقید) ادبی تاریخ اور علم بیان کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جن علوم سے ان کا تعلق ہے خود ان علوم کا ارتقاء دیر میں ہوا۔ لیکن THE GOLDEN BOUGH اور یونگ کی LIBIDO کی علامتوں پر کتاب ادبی نقاد کے لیے جو کشش رکھتی ہے وہ ان علوم کی معمولی شُد بُد کے سبب نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر ادبی تنقید کے بہت اہم مطالعے ہیں۔

پھر بھی، ذہنی صورت حال سے ماہر نفسیات کو جو دلچسپی ہوتی ہے، یا معاشرتی اداروں سے ماہر بشریات کو جو دلچسپی ہوتی ہے ادبی ہیئت کا مطالعہ کرنے والے نقاد کی دلچسپیاں اس سے مختلف ہیں۔ مثلاً بیانیہ کے تئیں ذہن کا رد عمل اصلاً انفعالی اور معنی کا فعال ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی بنیاد پر RUTHBENEDICT نے اپنی تصنیف PATTERNS OF CULTURE میں دو تہذیبوں APOLLONIAN اور DIONYSIAC میں اس بنیاد پر فرق کیا ہے کہ اوّل الذکر رسوم کی اطاعت اور پابندی پر اصرار کرتی ہے جب کہ موخر الذکر پیغمبرانہ ذہن پر الہام کے اثرات کی زائدہ ہے۔ اس کے علی الرغم تنقید نگار تو اس پر غور کرے گا کہ عوامی ادب جو غیر تربیت یافتہ جامد ذہن کے سکون کو متاثر کرتا ہے کیوں بیانیہ اقدار پر بہت زور دیتا ہے۔ جب کہ شاعر اور اس کے ماحول کے درمیان ربط کو منتشر کرنے کی لطیف اور فنکارانہ کوشش رمبو کے ILLUMINATION جوائس کی تنہائی میں الہامی ظہور (SOLITARY EPIPHANY) اور اسرار کے ماخذ کی حیثیت سے بادلیر کا تصور فطرت تخلیق ادب کی ابتدائی کوششوں سے خود آگہی تک ارتقاء کے دوران بیانیہ سے معنی کی اقداری اہمیت کی طرف فن کار کی توجہ میں کیسے تدریجی تبدیلی ہوتی ہے۔ تاکید کی یہ تبدیلی شلر کے بے تصنع اور جذباتی شاعری کے درمیان امتیاز کی بنیاد ہے۔

تنقید کا مذہب سے تعلق اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جب وہ ایک ہی دستاویز سے بحث کر رہے ہوں۔ تاریخ کی طرح تنقید میں بھی الوہی صفات کو، انسان کی تخلیقی صناعی کا نتیجہ تصور کیا جاتا ہے۔ نقاد کے لیے خدا، خواہ وہ فردوس گمشدہ میں ہو یا انجیل میں، انسانی قصے کا ایک کردار ہے۔ نقاد کسی بھی الہامی واقعے یا بیان کو خدا یا شیطان کا قائم کردہ معمہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کی تشریح ایک ایسے ذہنی وقوعہ کی حیثیت سے کرتا ہے جو اپنی ابتدا میں خواب سے منسلک ہے، خواب سے اس ذہنی وقوعے کی ابتدا ثابت ہو جانے کے بعد یہ کہنا ضروری ہے کہ فن یا تنقید میں کوئی چیز نقاد کو خواب یا خدا کی طرف عمومی بیدار شعور کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتی فن کا تعلق حقیقی کے بجائے قابل ادراک سے ہے اور تنقید اگرچہ بالآخر اسی قابل ادراک کے حوالے سے ہی کوئی نہ کوئی نظریہ قائم کرتی ہے لیکن واقعیت کا زائدہ کوئی نظریہ قبول کرنا تو دور اسے مرتب کرنے میں بھی حق بجانب نہیں کہی جا سکتی یہ بات اس بحث کا آخری نقطہ بیان کرنے سے قبل سمجھ لینی ضروری ہے۔

ہم نے ادب کی مرکزی MYTH کو خصوصاً اس کی بیانیہ جہت کے حوالے سے جستجو کی MYTH (QUEST MYTH) کی حیثیت (قایم) کیا ہے۔ ایسا اگر ہم اس مرکزی MYTH کو معنی کی کسی ایک ترتیب یا ڈیزائن کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہیں۔ تو ہمیں تحت الشعور کے تعامل سے شروع کرنا ہوگا، جو الہام یا دوسرے الفاظ میں خواب کا ماخذ ہے۔ بیداری اور خواب کا بشری دور، روشنی اور اندھیرے کے فطری دور سے بے حد قریبی مطابقت رکھتا ہے۔ غالباً یہی تطابق ہماری تمام تخیلی سرگرمیوں کا ماخذ ہے، نیز یہ تطابق بڑی حد تک ایک تضاد پر مبنی ہے۔ یہ دن کی روشنی ہی ہے جس میں انسان اندھیرے کی طاقت کے زیر اثر کمزوری اور انتشار کا صیّد ہوتا ہے اور تاریکی اور اندھیرے میں "LIBIDO" یا فرد کی فاتح شجاع ذات بیدار ہوتی ہے۔ اس لیے فنون لطیفہ کا جنھیں افلاطون بیدار اذہان کا خواب کہتا ہے۔ آخری مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تضاد کو حل کر کے سورج اور شاہ کردار کو آمیز کیا جائے اور ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں دونوں کی خواہش اور خارجی حالات کے درمیان مطابقت پیدا ہو جائے۔ یہ مقصد ان رسوم سے بہت مشابہہ ہے جن میں بشری اور فطری قوتوں کے اتصال کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی فنون لطیفہ کا سماجی تفاعل، انسانی زندگی میں عمل کے مقاصد تشکیل دینے سے بڑی حد تک جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے معنی خیزی کے اعتبار سے فنون لطیفہ کا مرکزی MYTH سماجی کشمکش کا اختتام، تکمیل آرزو کی معصوم دنیا اور آزاد انسانی معاشرے کی بصیرت ہونا چاہیے۔ ایک مرتبہ یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد، دوسرے عمرانی علوم میں فن کار کی بصیرت کی تعمیر و ترتیب کے حوالے سے تنقید کے ناگزیر مقام کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اس مقام پر ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ انسانی اعمال کے جواز کا مذہبی تصّور، کسی بھی دوسرے فن کی طرح تنقید کے لیے بھی کتنا موزوں ہے۔

MYTH میں خدا یا شاہ کردار کی اہمیت اس میں ہے کہ ایسے کردار جنھیں ہم انسانوں جیسا مگر فطرت پر انسانوں سے کہیں زیادہ متصرف تصور کرتے ہیں رفتہ رفتہ ذاتی ملکیت مشترکہ کا رویاء تعمیر کرتے ہیں جو غیر جانب دار فطرت سے پرے بے اندازہ قدرت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ وہ اشتراک ہے جس میں ہیرو جسد خاکی سے پرواز کی صورت میں مسلسل شامل ہوتا رہتا ہے کہ اس طرح یہ مقدس ماورائی کائنات جستجو کی اس محوری گردش سے اپنے آپ کو الگ کرنے لگتی ہے جس میں ہر کامیابی وقتی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ہم QUEST MYTH پر پیکروں کے نظام کی حیثیت سے غور کریں تو ہم ہیرو کے مقاصد کی تکمیل ہوتے دیکھیں گے، یہ حواس کے علی الرغم عقل کے حوالے سے کائنات کا معصوم ادراک ہے۔ جو ان اساطیری پیکروں کا مرکزی پیٹرن خلق کرتا ہے۔ دنیا کا یہ معصوم ادراک مذہب میں جنت کے تصّور سے مطابقت رکھتا اور بیشتر اسی شکل میں بیان بھی ہوتا ہے۔

ہم اسے المیہ کے مقابلے میں (جو جستجو کو صرف اس کی مقررہ گردش کی ہیئت میں دیکھتی ہے) زندگی کا طربیہ تصور بھی کہہ سکتے ہیں۔

اختتام، ہم مافیہ کی دوسری فہرست پر کر رہے ہیں جس میں طربیہ اور المیہ کے مرکزی پیٹرن کی تشریح کی جائے گی۔ اساطیری تنقید کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ پیکر کی انفرادی اور عالمگیر جہت یکساں ہوتی ہے۔ جس کا سبب فی الحال ہمارے لیے بے حد سنجیدہ ہے ابتدا ہم بیس سوالات کے منصوبے سے یا اگر ہم چاہیں تو تکوینِ کائنات کی عظیم زنجیر OF BEING GREAT CHAIN) کے عمومی خاکے سے کر سکتے ہیں۔

۱۔ طربیہ تصوّر میں پوری دنیا ایک جماعت ہے یا ایک شاہ کردار جو قاری کی تکمیل آرزو کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی مذاکرہ، رفاقت، نظم و ترتیب، دوستی اور محبت کے پیکروں کی وضع قدیم ہے۔ المیہ تصور میں یہ دنیا ظلم و انتشار سے پُر یا پھر ایک فرد اور تنہا آدمی ہے۔ اپنے پیرؤوں سے منہ موڑے ہوئے رومانس کا دیو پیکر، فریب خوردہ درد گرداں ہیرو شادی یا کسی اور متوازی خلوت صمیمہ (تکمیل خواہش، وصال) کا تعلق طربیہ بصیرت سے ہے۔ فاحشہ، چڑیل اور یونگ کی "بھیانک ماں" کی دوسری اقسام المیہ جہت سے تعلق رکھتی ہیں۔ تمام الوہی بہادر فرشتہ صفت یا دوسرے فوق البشر گروہ، انسانی طریقہ کار کا تتبع کرتے ہیں۔

۲۔ طربیہ میں حیوانی کائنات: پالتو جانوروں، عام طور پر بھیڑوں یا بکریوں کے ریوڑ یا معصوم پرندوں میں کوئی ایک عام طور پر فاختہ سے عبارت ہوتی ہے، یہ دیہاتی پیکروں کی وضع عتیق ہے۔ المیہ تصور میں حیوانوں کی دنیا درندوں اور شکاری پرندوں مثلاً بھیڑیے، گدھ، DRAGON اور اس جیسے دوسرے درندوں سے پُر ہوتی ہے۔

۳۔ طربیہ میں نباتاتی کائنات چمن، باغ یا شجر حیات، گلاب، یا کنول وغیرہ سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ آرکاری یا سادہ دیہاتی زندگی کی وضع عتیق ہے۔ جیسی کہ MARVELL کی سبز کائنات یا شکسپیر کے بادیاتی طربیے ہیں۔ المیہ میں نباتاتی کائنات ایک پر خطر جنگل ہے۔ جیسا کہ COMUS یا INFERNO کے ابتدائیے میں ہے یا پھر خاردار جھاڑیاں۔ بیاباں یا شجرِ موت اس المیہ کائنات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

۴۔ طربیہ میں عالمِ معدنیات ایک شہر یا ایک عمارت یا مندر یا پھر ایک چمکدار قیمتی پتھر کی شکل میں ہو گا بلکہ حقیقتاً پوری طربیہ سیریز، خصوصاً درخت روشن یا شعلہ فشاں تصور کی جاسکتی ہے۔ جیومیٹریکل پیکروں کی وضع عتیق۔ پُر نور گنبد کا تعلق اسی سے ہے۔ المیہ تصور میں معدنیات، صحرا، پتھر، کھنڈر یا، خطرناک جیومیٹریکل پیکروں مثلاً صلیب کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۵۔ طربیہ میں غیر متشکل کائنات ایک دریا ہے۔ جو روایتاً چوطرفہ ہے۔ اس نے نشاۃ ثانیہ کے (اخلاط اربعہ سے مزین) معتدل جسم کے پیکروں کو متاثر کیا۔ المیہ تصور میں یہ عالم، عام طور پر سمندر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کہ فنا یا زوال کے MYTH اکثر سیلاب کے MYTH ہیں۔ سمندر اور درندوں کے اتصال سے (انجیل کے کے دریائی عفریت اور دوسرے دریائی عجیب الخلقت دیو پیکر جانور برآمد کیے گئے ہیں جیسا کہ اس جدول سے واضح ہے کہ شعری پیکروں کی بیشتر اقسام اس گوشوارہ میں آجائیں گی: مثلاً (بغیر کسی منصوبہ یا جستجو کے) طربیہ بصیرت کی مشہور مثال YEATS کی SAILING TO BYZANTIUM لیجیے۔ اس میں شہر ہے شجر، پرندہ، فقراء کے گروہ جیومٹریکل گردش اور اس دوران دنیا سے بے نیازی ہے۔ یقیناً صرف عام طربیہ یا المیہ سیاق و سباق ہی میں کسی علامت کی تعبیر متعین ہو سکتی ہے اس سیاق و سباق کی اہمیت نسبتاً غیر قطعی اساطیر مثلاً جزیرہ میں زیادہ واضح ہوتی ہے۔

جو جزیرۂ خوش بختی و کامیابی بھی ہوسکتا ہے اور جزیرۂ سحر و فریب بھی۔

ہماری جدولیں نہ صرف یہ کہ ابتدائی ہیں بلکہ بلاشبہ ضرورت سے زیادہ سادہ ہیں اسی طرح اساطیر میں ہمارا استقرائی طریقہ کار بہت سرسری تھا، لیکن اہم بات ان دونوں طریقہ کار کی کمیاں نہیں بلکہ یہ حقیقت اہم ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ دونوں طریقہ کار کہیں نہ کہیں درمیان میں مل جانے والے ہیں اور اگر وہ ملتے ہیں تو تنقید کے جامع اور باقاعدہ ارتقاء کا بنیادی خاکہ مرتب ہوجاتا ہے۔

(نقد و نظر علی گڑھ۔ جلد ۱۳ شمارہ (۲))

محمد سلیم الرحمٰن

طوفانِ نوح

ایک زمانہ تھا جب صحائف کو جھٹلانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کوئی پرلے درجے کا سر پھرا ہی جان جوکھوں میں ڈال کر ایسی حرکت کی سوچ سکتا تھا۔ پھر مغرب میں روشن خیالی اور سائنسی تحقیق کا زور ہوا اور رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی کہ ہزاروں سال پرانی روایات اور عقائد کو سائنسی پیمانوں سے پرکھا اور مسترد کیا جانے لگا۔ تحقیق کے اس روز افزوں سیلاب سے طوفانِ نوح کہاں بچ سکتا تھا۔ پہلے کہا گیا کہ یہ تو محض افسانہ ہے۔ پھر اس نظریے کا چلن ہوا کہ قدیم زمانے میں کبھی دجلہ و فرات میں بلا کی طغیانی آئی ہوگی۔ عراق کے میدانی علاقے اور شہر سب ڈوب گئے ہوں گے۔ اس آشوب عظیم سے بچنے والوں نے فرض کر لیا کہ سیلاب نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوگا۔ پَر کا کوّا بنا دیا۔ پرانے وقتوں کے لوگ ٹھہرے ضعیف الاعتقاد۔ تمام محیر العقول باتوں پر جھٹ پٹ یقین کر لیتے تھے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلی بار بعض عالموں، مؤرخوں، آثاریات دانوں اور محققوں کو احساس ہوا کہ پرانی روایتیں محض افسانہ یا مبالغہ نہیں بلکہ ان کی تہہ میں ٹھوس حقائق کارفرما ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ بیان ہوتے ہوتے اصل واقعات پر افسانوی رنگ کی کہیں دبیز اور کہیں مہین تہہ چڑھ گئی ہو۔ لیکن اس تہہ کو کھرچ کر دیکھا جائے تو اصلیت کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ تازہ بہ تازہ سائنسی تحقیق سے بھی اس نئی سوچ کو تقویت پہنچی۔

اسی قبیل کا ایک مضمون "آسٹریا ٹوڈے" میں طوفانِ نوح پر نظر آیا جو ایڈتھ ٹولمن اور الیگزانڈر ٹولمن کی تحریر ہے۔ مضمون دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لیے اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش ہے۔

۹۵۴۵ سال پہلے کی بات ہے۔ ۷۵۵۳ ق م سمجھ لیجیے۔ چاند رات اور ستمبر کی ۲۳ تاریخ رات کے تین بجے یورپ اچانک قیامت صغریٰ سے دوچار ہوگیا (برصغیر میں اس وقت صبح کے سات بجے ہوں گے) چند روز سے کئی کلومیٹر لمبا چوڑا ایک دمدار ستارہ ہوشربا رفتار سے دنیا کی طرف چلا آرہا تھا۔ البتہ یہ صحیح سالم نہ تھا۔ دنیا تک آتے آتے اس کے سات بڑے بڑے اور متعدد چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ دمدار ستارے زیادہ تر آبی برف کے بنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے مدار کے اس حصے میں پہنچتے ہیں جو سورج سے قریب ترین ہو تو برف پگھلنے سے ان کا بند بند جدا ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ اس دمدار ستارے کے ساتھ پیش آیا۔

روئے زمین کا تین چوتھائی حصہ سمندر پر مشتمل ہے۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ دمدار ستارے کے ساتوں ٹکڑے، جو جنوب مشرق سے دنیا پر نازل ہوئے تھے، سمندر میں جا گرے۔ پہلے نے آسٹریلیا کے جنوب میں جزیرۂ تسمانیا سے ذرا پرے غوطہ کھایا، دوسرا چین اور ویت نام کے سواحل سے آگے جنوبی بحرِ چین میں، تیسرا لنکا کے جنوب مغرب میں بحرِ ہند میں، چوتھا شمالی

اوقیانوس میں ناروے اور گرین لینڈ کے مابین، پانچواں وسطی اوقیانوس میں جزائر ایزورز کے پاس، چھٹا مرکزی امریکہ کے ساحل سے ذرا ہٹ کر بحرالکاہل میں اور ساتواں جنوبی امریکہ کے جنوبی سرے کے مغرب میں بحرالکاہل ہی میں گرا۔ متعدد چھوٹے موٹے ٹکڑے آکر خشکی سے ٹکرائے۔

ایک تو ان ٹکڑوں کا لاکھوں ٹن وزن، دوسرے ان کی ہوشربا رفتار، اس لیے ان کے بیک وقت دنیا سے ٹکرانے کے لرزہ خیز نتائج کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ کرۂ ارض ایک بار تو تہہ و بالا ہو گیا۔ تصادم سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بالترتیب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ پہلے تو دنیا اتنے زبردست زلزلے سے دوچار ہوئی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

۲۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑے، خاص طور پر شمالی اور جنوبی امریکہ کے مغربی سواحل پر واقع ایسے پہاڑوں نے تباہی مچادی۔

۳۔ تصادم کے دھماکوں سے عالم گیر آندھی چلی جس کے زور سے چٹانیں، درخت، انسان اور حیوان اڑ کر کہیں کے کہیں جا پڑے۔

۴۔ بعض علاقوں میں درجۂ حرارت اٹھارہ سو سینٹی گریڈ تک پہنچا۔ دریا سوکھ گئے۔ چٹانیں پاش پاش ہو گئیں۔

۵۔ سمندروں سے یکے بعد دیگرے کھولتے پانی کی کوہ پیکر موجیں اٹھیں اور پہاڑی سلسلوں کے اوپر سے گزر کر براعظموں کو دور دور تک روندتی چلی گئیں۔

۶۔ فضا میں گرد کا دبیز پردہ تن گیا۔ ہفتے بھر گھپ اندھیرا چھایا رہا۔ اس کے بعد مدتوں جھٹپٹے کا عالم رہا۔

۷۔ شدید سردی کی لہر آئی جو بعض علاقوں مثلاً سکنڈی نیویا میں تین سال تک بغیر کسی وقفے کے جاری رہی۔ بعض دوسرے خطوں میں مثلاً ایران میں سال میں دس مہینے سردی رہنے لگی۔ گرمی کا موسم چند روز کے لیے جھلک دکھاتا۔

۸۔ بے انتہا پانی کرۂ ہوا میں جا پہنچا۔ اس کی بڑی وجہ تو سمندروں کا اچھال تھا جو تصادموں سے پیدا ہوا لیکن وہ پانی بھی کچھ کم نہ تھا جو دمدار ستارے کے ٹکڑے برف یا ادھ پگھلی برف کی صورت میں ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ بعد ازاں یا تو جھلسا دینے والی موسلادھار بارشیں ہوئیں یا اولے پڑے جن میں کیچڑ، کلونس اور درختی گوندر لے ملے تھے۔

۹۔ ماحول نائٹرک ایسڈ اور دوسرے کیمیاوی مرکبات سے بے طرح آلودہ ہو گیا اور جب یہ کیمیاوی سرخی مائل کتھئی رنگ کی خونی بارش بن کر برسے تو انھوں نے تصادم گاہوں کے قرب و جوار میں انسانوں اور حیوانوں کی کھال کو جھلس دیا۔

۱۰۔ دنیا میں جا بجا آگ لگنے سے پائروٹوکسز پیدا ہوئے۔ مزید براں، سیارے کی اوزون تہہ کو ضرر پہنچنے سے تاب کاری اور بالائے بنفشی شعاعوں کی آمد بڑھ گئی۔ ان تمام عوامل کے ملاپ سے سخت ارثیاتی فتور پیدا ہوا اور عجیب الوضع بچے جنم لینے لگے۔ کسی کے صرف ایک آنکھ ہوتی، کسی کے صرف ایک کان یا ٹانگ یا ہاتھ۔

۱۱۔ کرۂ ہوا کے اجزائے ترکیبی میں تغیرات سے برپا ہونے والا "سبز خانہ اثر" تقریباً چار ہزار سال باقی رہا۔

۱۲۔ حیوانی زندگی کی بہت سی اقسام نابود ہو گئیں۔ مثلاً مہافیل (میمتھ) کا نام و نشان مٹ گیا۔ انسانی نسل کی بقا صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ اس کے معدودے چند نمائندے، جنھوں نے گہرے غاروں میں پناہ لے رکھی تھی، زندہ بچ گئے۔

اس عالم گیر سیلاب نے انسانی نسل کے حافظے پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔ معاملہ یہ ہے کہ اس آشوب عظیم کے کوئی دستاویزی ثبوت تو دستیاب نہیں جنھیں چشم دید گواہوں نے قلم بند کیا ہو۔ اول تو آج سے دس ہزار سال پہلے فن تحریر کا وجود ہی

نہیں تھا اور بالفرض ہوتا بھی تو اس وقت کے لکھے کا پانی، آگ، آندھی، بارش کی خوفناک تباہ کاریوں کے بعد باقی رہنا محال تھا۔ تاہم دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کی اسطوریات اور زبانی روایات میں اس طوفان کے متعلق بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ اس مواد کا تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ایک عجیب انکشاف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ علاقے جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور اور الگ تھلگ ہیں لیکن طوفان کے بارے میں جو روایات وہاں محفوظ ہیں ان میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔

بعض ثبوت تو ان روایتوں سے ملے۔ دوسرے پچھلے دس برس میں ارضیاتی اور فلکیاتی علم میں جو کمال کی پیش رفت ہوئی ہے اس کی مدد سے اس تصادم کی تعجب خیز حد تک مفصل اور ہم رنگ تصویر ہمارے سامنے آگئی ہے۔

اس تجزیے کی سائنسی بنیاد ایک ایسے تصادم کے شواہد پر رکھی گئی ہے جس سے دنیا اس وقت دوچار ہوئی تھی جب انسانی نسل کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ حادثہ، جس کے نتائج پر بڑی دیدہ ریزی سے تحقیق کی گئی ہے، آج سے چھ کروڑ چونسٹھ لاکھ سال پہلے پیش آیا تھا جب تقریباً دس کلومیٹر قطر کا پتھر اور لوہے کا بنا ہوا ایک بجر سیارچہ دنیا سے ٹکرایا تھا۔

کروڑوں برس پہلے نازل ہونے والا سیارچہ اس دمدار ستارے سے بہت مختلف تھا جس نے دس ہزار سال پہلے دنیا کو ہلا ڈالا تھا۔ دمدار ستارے کے بارے میں ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وہ زیادہ تر آبی برف کا بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود دونوں تصادموں کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے اور جس ترتیب سے پیش آئے ان میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے۔

چھ کروڑ چونسٹھ لاکھ سال پہلے کے آشوب کا زمانہ ٹھیک وہی ہے جب عظیم ڈینوساروں کی نسل صفحۂ دنیا سے مٹ گئی۔ صرف ڈینوسار ہی نہیں بلکہ حیوانوں کی تقریباً پچاس فی صدی انواع آناً فاناً معدوم ہو گئیں۔ دس ہزار سال پہلے کے آشوب نے مہافیلوں کا کام تمام کر دیا بلکہ کہنا چاہیے کہ خود انسان بھی نیست و نابود ہونے سے بال بال بچا۔ ہم دیکھیں گے کہ بچ جانے والوں نے اس واقعے کو، جسے ہم اب سیلابِ عظیم یا طوفانِ نوح کے نام سے یاد کرتے ہیں، حیرت ناک طور پر بچے تلے انداز میں بیان کیا ہے۔

اس مواد کو جانچنے کے لیے ہم نے جہاں تک ممکن ہوا اصل روایتوں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ جن روایتوں کو شاعرانہ انداز میں نئی شکل دی گئی ہے وہ ہمارے دائرۂ تحقیق سے خارج ہیں۔ کسی سیارچے یا دمدار ستارے کو دنیا سے ٹکرانے کے کیا نتائج ہوں گے؟ اس بارے میں ارضیات دانوں کے پاس اب سائنسی طور پر مصدقہ معلومات کا ایک عظیم انبار موجود ہے۔ چنانچہ ہم آسانی سے ان روایات میں موجود ٹھوس حقائق کو افسانوی عناصر سے الگ کر سکتے ہیں۔ چند مثالوں سے ثابت ہو جائے گا کہ جن واقعات کا ذکر آ چکا ہے انھیں عینی شاہدوں نے کس انداز سے یاد رکھا۔

مثلاً پہلے یہ ذکر ہو جائے کہ جب دمدار ستارہ سر پر آپہنچا تو دنیا کے مختلف علاقوں کے باشندوں کو آسمان پر کیا نظر آیا تھا۔ پہلی لوک روایت پیرو (جنوبی امریکہ) سے لی گئی ہے۔ جب وہاں کے مقامی لوگوں سے پوچھا جائے کہ یہ قیامت خیز دمدار ستارہ دیکھنے میں کیسا تھا تو وہ آسمان پر اس جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں چھ ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے۔ گویا پہلے پہل وہ انھیں چھ ستاروں کی طرح نظر آیا یہ روایت ہزاروں سال سے نسل در نسل منتقل ہوتی آئی۔ جب دمدار ستارہ بالکل قریب آگیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے سات ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اخنوخ کے حوالے سے ایک پرانے یہودی قصے میں آیا ہے "اخنوخ دیکھتا ہے آسمان کے سرے پر سات ستارے، جیسے بڑے بڑے جلتے ہوئے پہاڑ" جنوبی امریکہ کے جنوبی سرے پر واقع تیئرا ڈیل فوے گو کے یامانا نامی لوگوں کو پرانا ضبیث سورج یاد ہے جو آسمان سے گر پڑا تھا۔ اس کے گرنے سے سمندر ابلنے لگا تھا، خشکی پر تمام چیزیں

جل بھن گئی تھیں اور لوگ مر کھپ گئے تھے۔

قدیم یونانی اسطوریات میں سورج دیوتا، ہیلیوس کے بیٹے فائیتون کا ذکر ہے اور بالترتیب بیان ہوا ہے کہ کس طرح کاذب سورج زمین پر آگرا، دنیا بھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آیا اور جھٹپٹا چھا گیا۔ بائبل میں سیلاب کی تفصیل بڑی محنت سے یکجا کر دی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جب بائبل کو قلم بند کیا جارہا تھا تو لوگ اس طوفانِ عظیم کا ذکر عام طور پر کرتے رہتے ہوں گے چنانچہ لکھا ہے کہ "اور وہ ایک بہت بڑے جلتے پہاڑ کے مانند سمندر میں گرا۔"

عینی شاہدوں کے بیانات کی بعض تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ دمدار ستارے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہو گئے تھے۔ ان تفصیلات میں خواہ ان کا تعلق شمالی اوقیانوس یا جنوبی چین سے ہو خواہ ہندوستان یا مصر سے، دمدار ستاروں کے ان لا تعداد ٹکڑوں کو "ستاروں کی بارش" کے نام سے یاد کیا گیا ہے یقیناً مراد وہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو خشکی پر گرتے رہے ہوں گے۔

بحرِ ہند میں ہونے والے تصادم کا بظاہر بڑے غور سے مشاہدہ کیا گیا۔ اس خطے میں ایسی بہت سی مقامی روایتیں موجود ہیں جن میں "مُردوں کے خون جیسی" موسلا دھار سرخی مائل کتھئی بارش کا ذکر ہے۔ اس امر کی تصدیق دوسرے علاقوں میں رائج کہانیوں سے بھی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نائٹرک آکسائڈ سے معمور نائٹرک ایسڈ کی اتنے بڑے پیمانے پر بارش لوک حافظے کا حصہ بن گئی تھی۔

نائٹرک ایسڈ دو طرح وجود میں آیا۔ ایک تصادم سے پیدا ہونے والی توانائی کے ذریعے، دوسرے چٹانوں کے ان ہزاروں ٹکڑوں سے جو تصادم کی وجہ سے فضا میں دور تک اچھل گئے اور پھر دہکتے گولے بن کر زمین پر آگرے۔ کروڑوں برس پہلے کے جس تصادم کا اوپر ذکر آچکا اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تصادم کے قرب و جوار میں تقریباً خالص نائٹرک ایسڈ برستا رہا تھا۔ تصادم سے نائٹرک ایسڈ کے نو تہہ در تہہ ذخیرے وجود میں آئے ان کا اندازہ ایک ارب ٹن لگایا گیا ہے۔

بہر کیف، دس ہزار سال پہلے بحرِ ہند میں جو ایسڈ برسا ہو گا اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر نہیں ہو سکتے کہ شمالی اوقیانوس کے پانیوں تک کا رنگ تبدیل ہو گیا ہو۔ لیکن سکینڈی نیویا کی قدیم روایات کے مخزن "ایڈا" (EDDA) میں لکھا ہے کہ جب پراتم دیوتاؤں کی جنگ میں اِمیر (YMIR) نامی عفریت ہلاک ہوا تو اس کے خون سے سمندر رنگین ہو گیا۔ یہ شمالی جرمانی اقوام کا اپنا مشاہدہ ہے اور ثابت کرتا ہے کہ تصادم کے نتیجے میں سکینڈی نیویا کے آس پاس موسلا دھار تیزابی بارش برسی ہو گی۔

دمدار ستارے کا ایک ٹکڑا مرکزی اوقیانوس میں جزائر ایزورز کے جنوب میں گرا تھا۔ اس امر کے تعین سے ایک اور پرانی روایت کی تصدیق ہوتی ہے جس پر صدیوں سے بحث جاری ہے۔ قدیم یونان سے یہ روایت چلی تھی کہ اوقیانوس میں اٹلانٹس نامی جزیرہ بہت بڑی تہذیب کا مرکز تھا اور اچانک سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ قدیم یونانی سیاست دان سولون مصر کے کاہنوں سے ملا تھا جن کو طوفانِ نوح کے بارے میں بڑی معلومات تھی۔ وہ سولون کو باور کرانے میں کامیاب رہے کہ جبل الطارق کے مغرب میں اٹلانٹس نامی ایک جزیرہ عظیم الشان تمدن کا گہوارہ تھا۔ لیکن آج سے گیارہ ہزار چھ سو سال پہلے ایک عظیم قدرتی آفت کے دوران صرف آٹھ پہر کے اندر اندر ناپید ہو گیا تھا۔ تازہ شواہد کی روشنی میں اٹلانٹس کے وجود کو جھٹلانا آسان نہیں رہا۔ اغلب یہی ہے کہ اٹلانٹس دمدار ستارے کا شکار ہوا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دمدار ستارے کا ٹکڑا سیدھا جزیرے پر گرا یا اس کے اردگرد کے سمندر میں اثرات یکساں مرتب ہوئے ہوں گے اور اس جگہ سمندر کی تہہ کا قشر چوں کہ نسبتاً مہین ہے اس لیے

جزیرے کا ذرا سی دیر میں تہ و بالا ہو جانا یقینی ہے۔

اگلے تصادم کے بارے میں فرض کرنا پڑے گا کہ وہ وسطی امریکہ میں گواتے مالا کے ساحل سے پرے مشرقی بحرالکاہل میں پیش آیا ہوگا۔ اس تصادم کے جو بھیانک اثرات مرتب ہوئے ان کی تفصیل جنوبی اور شمالی امریکہ کی مقامی انڈین روایات میں موجود ہے۔ ان روایات میں شدید گرمی سے لگنے والی عظیم آگوں، دریاؤں کے سوکھنے، موسلادھار بارش کے برسنے کا ذکر ہے۔ بارش بھی ایسی جس کی ہر بوند خیموں جتنی بڑی تھی۔ شمالی امریکہ کے مغربی ساحل سے اٹھنے والی طوفانی موجوں نے براعظم کو دور دور تک پامال کر دیا۔ اس لیے تعجب ہی کیا کہ گواتے مالا کی ایک مقامی زبانی روایت میں ذکر ہے کہ ان دنوں زمین کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔

ساتویں تصادم کے محل وقوع کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تیئرا دیل نووے گو کے یامانا لوگوں کی روایات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ دمدار ستارے کا ٹکڑا جنوبی امریکہ سے پرے بحرالکاہل میں گرا ہوگا۔ ان روایات میں کھولتے ہوئے سمندری سیلاب اور گرم بارش کا ذکر ہے لیکن اس طرح کے مظاہر جائے تصادم سے بہت دور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چنانچہ اس نکتے پر مزید بحث اور تحقیق کی گنجائش ہے۔

روئے زمین کا بہتر فیصد حصّہ سمندر ہے۔ اس لیے یہ قطعی طور پر ممکن ہے کہ دمدار ستارے کے ساتوں ٹکڑے ان مقامات پر گرے ہوں جن کی نشان دہی کی جا چکی۔ جو زبانی روایات ہم تک پہنچی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ سات بڑے ٹکڑوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی زمین پر گرے تھے۔ ان میں سے چند یقیناً خشکی سے ٹکرائے ہوں گے۔ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ ایسے متعدد گڑھے موجود ہیں جن کی تاریخ کا حساب لگایا گیا تو پتا چلا کہ وہ دس ہزار سال پرانے ہیں۔ مثلاً پولینڈ میں ایک جگہ سو میٹر کا ایسا گڑھا ہے۔ ایک اور گڑھا ٹیکساس میں ہے جس کا قطر ۱۶۸ میٹر ہے۔ یہ بلاشبہ اسی دمدار ستارے کے پرخچوں سے بنے ہوں گے۔

حضرت نوح کو آدم ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گویا سیلاب کی وجہ سے نسل انسانی تقریباً نیست و نابود ہو گئی تھی اور حضرت نوح کی بدولت اس کا احیاء ممکن ہوا۔ بائبل میں ہے کہ خدا نے سیلاب کے در کھول دیے تھے اور چالیس دن اور چالیس رات متواتر بارش ہوتی رہی تھی اور حضرت نوح اور ان کے خاندان کے سوا بنی آدم کے تمام افراد ڈوب گئے تھے۔

ہماری رائے میں بائبل کے آغاز میں دمدار ستارے کے لائے ہوئے طوفان اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا احوال موجود ہے۔ کتاب تکوین میں ہے کہ دنیا کو سات دن میں تخلیق کیا گیا۔ جدید سائنسی علوم کی روشنی میں تکوین کی اس روداد کو پڑھا جائے تو اس میں کئی قباحتیں نظر آتی ہیں۔ پہلا دن نور کی تخلیق کے لیے وقف ہے۔ سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔ مشکل یہ ہے کہ ان دونوں واقعات میں تین مرحلوں کا فرق نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ زمین پہلے بنی ہو اور سورج بہت بعد میں۔ کہا گیا ہے کہ خشکی اور تری کو تیسرے دن الگ کیا گیا۔ تو یہ واقعہ سورج کی تخلیق سے پہلے کیسے رونما ہوا؟ یہ بھی صحیح نہیں کہ پرندے زمینی جانوروں سے پہلے وجود میں آئے۔ جل تھلیے اور خزندے تو پرندوں سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے۔

لیکن اگر ہم بائبل کے اس باب تکوین کا عنوان بدل دیں تو تمام الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ آفرینش کی روداد نہیں بلکہ دمدار ستارے سے تصادم کے بعد زمین اور اس پر پائے جانے والے جانداروں کے احیاء کی کہانی ہے زمین کی تخلیق ثانی کا بیان ہے۔

جب تکوین کے باب کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں رہتا۔ تصادم کے بعد کی ابتری اور لمبی گھور اندھیری رات ختم ہونے پر جب پہلی بار کرۂ ہوا کی آلودگی کی ظلمت کو چیر کر افق پر روشنی کی مدھم سی جھلک نظر آئی ہوگی تو بچے کھچے انسانوں نے اسے امید کی اولین کرن سمجھا ہوگا۔ کوہ پیکر موجوں اور موسلادھار بارش کی صورت میں نازل ہونے والے طوفان کا زور ٹوٹا تو سمندر اترا اور خشکی اور تری میں تمیز کرنا ممکن ہوگیا۔ نائٹریٹ کی کھاد سے مالامال چِھلے میں دبی پودوں کی باقی ماندہ جڑوں سے بڑی تیزی سے اکھوے پھوٹے۔ قدرتی امر ہے کہ رفتہ رفتہ کم ہوتی گرد اور کلونس سے جو فضا پر مسلط تھی، سب سے پہلے سورج کی تیز روشنی چھن کر آئی ہوگی چاند کی کمزور روشنی بہت بعد میں دکھائی دی ہوگی اور ستارے جن کی روشنی اور بھی کم ہوتی ہے سب سے بعد میں نمودار ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سمندر کی گہری تہوں میں بچ جانے والی مچھلیاں اور دور افتادہ فلک بوس پہاڑوں پر پناہ لینے والے پرندے سب سے پہلے دکھائی دیے ہوں گے۔ خشکی کے جانور بھی آخر اپنے مامنوں سے نکلے ہوں گے۔ سب سے آخر میں معدودے چند سہمے سہمے انسانوں نے اپنی پناہ گاہوں سے باہر قدم رکھا ہوگا کہ دیکھیں تو سہی ان کی دنیا پر کیا گزری ہے۔

حیرت ہے کہ بائبل کے باب تکوین کو جس نے یا جن لوگوں نے قلم بند کیا انھیں یہ معلومات کیسے ملی اور معلومات بھی ایسی جس پر جدید ارضیاتی تحقیق نے صاد کیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس عظیم آشوب کے تمام واقعات کو بڑی احتیاط سے یاد رکھا گیا اور اس سے متعلق تمام روایات نسل در نسل زبانی منتقل ہوتی رہیں۔ گڑبڑ صرف اس وقت پیدا ہوئی جب طوفانِ نوح کے فوراً بعد کے منظر نامے کو آسمان و زمین کی اصل تکوین سمجھ لیا گیا۔

لیکن جو اہم ترین سوال ہے وہ تو رہ جاتا ہے۔ آخر یہ کیسے پتا چلا کہ طوفان نوح ٹھیک ۹۵۴۵ سال پہلے ۲۳ ستمبر کو آیا تھا؟ اور پھر وقت کا ایسا تعین کہ جب طوفان آیا تو یورپ میں رات کے تین بجے تھے اور اسی حساب سے پاکستان اور ہندوستان میں صبح کے سات۔ اس قدر یقین سے بات کرنے کا کیا جواز ہے؟

دمدار ستارے سے تصادم کا سب سے اہم ارضیاتی ثبوت شیشہ نما TEKTITES (گداخینوں) کی شکل میں دستیاب ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے گول، چیچک روسنگ پارے جائے تصادم سے پرے اس راستے کے ساتھ ساتھ بکھرے ملتے ہیں جو دمدار ستارے کے ٹکڑے نے گرنے سے پہلے اختیار کیا تھا۔ ان گداخینوں یا ان سے بالکل قریبی ماحول کی تاریخ کے تعین سے تصادم کے زمانے کا حساب لگایا جاسکتا ہے۔ جنوبی آسٹریلیا میں بکھرے ہوئے گداخینوں سے جو لکیر بنتی ہے اس کا رخ شمال مغرب کی طرف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصادم کی جائے وقوع آسٹریلیا کے جنوب مشرق میں سمندر میں تھی۔ ان گداخینوں کے ساتھ درختوں کی جو باقیات ملی ہیں ان کی ریڈیو کاربن تاریخ نکالنے سے پتا چلا کہ وہ تقریباً دس ہزار سال پرانی ہیں۔ یہی تاریخ ان گداخینوں کی ہے جن کا تعلق بحر ہند میں واقع ہونے والے تصادم سے ہے۔

گرین لینڈ کے برف ٹوپ میں بورنگ کے ذریعے برف کی تہوں کے جو نمونے حاصل کیے گئے ہیں ان سے مزید شواہد ہاتھ آئے ہیں۔ ان سال بہ سال جمنے والی تہوں کے معائنے سے پچھلے دس ہزار برس میں پیش آنے والے موسمی واقعات کی بہت جچی تلی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس قدرتی پیمانے نے کرۂ ہوا میں برپا ہونے والے تمام بڑے بڑے واقعات کو ریکارڈ کیا ہے۔ مثلاً جہاں راکھ اور تیزابی آلودگی کا تہہ بہ تہہ جماؤ ملے گا تو یہ آتش فشانی سرگرمی کا ثبوت ہوگا۔ گرین لینڈ میں جب ۱۳۹۰ میٹر گہرے برف کے ایک دَل کا جائزہ لیا گیا جس میں گزشتہ ۹۸۹۰ سال کا ریکارڈ محفوظ تھا تو انکشاف ہوا کہ ایک خاصے غیر معمولی سال کے دوران

دنیا بھر میں کم از کم چھبیس کروڑ ٹن ایسڈ تہہ بہ تہہ جما تھا۔ یہ آج سے ۹۶۲۰ سال پہلے کی بات ہے۔ اس سن میں ایک سو ستر سال بڑھائے گھٹائے جا سکتے ہیں۔ ایسڈ کی اس قدر بڑے پیمانے پر جماوٹ بلاشبہ طوفانِ نوح کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ سائبیریا کی برف میں ایک ماہفیل پٹھے کی لاش جمی ہوئی ملی ہے۔ ریڈیو میٹرک ذریعے سے تاریخ نکالی گئی تو علم ہوا کہ لاش ۹۶۰۰ سال پہلے کی ہے۔ اس سن میں تین سو سال بڑھالیں یا کم کر دیں۔ تصادم کی وجہ سے جو غضب کی سردی پڑنے لگی تھی ماہفیل اس کے شدائد کی تاب نہ لا سکے تھے۔

لیکن اس آشوب کی بالکل صحیح صحیح تاریخ کا سراغ لگانا شجر توقیت کے ذریعے ممکن ہے۔ شجر توقیت سے مراد ہے درختوں کے تنوں میں بننے والے سالانہ حلقوں کی سائنسی جانچ پڑتال۔ زندہ درختوں اور پرانے وقتوں کی لکڑیوں میں موجود افزائش کے سالانہ حلقوں کی ساخت اور حالات کا جائزہ لے کر تاریخی اور قبل از تاریخ واقعات کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کی جا سکتی ہیں پچھلے دو برس میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کی مدد سے بعض دوسرے امور کے علاوہ ان حلقوں میں کاربن چودہ کے اجزاء کا تعین کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ یوں شجر توقیت کا دائرہ اب پچھلے گیارہ ہزار سال پر محیط ہے۔ کاربن چودہ کے اتار چڑھاؤ کی لکیر میں ہمیں ایک مقام پر ریڈیو کاربن میں انتہائی درجے کا جو اضافہ نظر آتا ہے وہ اجرام سماوی کے ساتھ تصادم سے مخصوص ہے اس کی تاریخ بھی ۹۵۴۵ سال پرانی قرار پائی ہے۔

ان تحقیقات سے جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں ان سے سن کا بالکل دو ٹوک تعین ممکن نہیں۔ لیکن اس ضمن میں اب تک جتنی بھی سائنسی تحقیق ہوئی ہے اسے یکجا کرنے اور خاص طور پر شجر توقیت کے نتائج سامنے رکھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ طوفانِ نوح ۹۵۴۵ سال پہلے آیا تھا۔ اب چاہیں تو اس تاریخ میں چند سال گھٹا یا بڑھالیں۔

شمال مغربی کینیڈا کے چیپے وا انڈین قبیلے کے ہاں ایک بہت پرانی لوک روایت ہے جس کی رو سے عظیم برف باری ستمبر کے مہینے میں شروع ہوئی تھی۔ دنیا کے جنوبی نصف کرّے میں موسموں کے اوقات شمالی نصف کرّے کے الٹ ہوتے ہیں وہاں جو روایت ملی ہے اس سے چیپے وا قبیلے کی قدیم یادداشت کی تصدیق ہوئی ہے۔ جنوبی امریکہ کے سرے پر رہنے والے یاناما لوگوں کا کہنا ہے کہ اس آفت کا آغاز موسم بہار کے اوائل یعنی ستمبر میں ہوا تھا۔ مشرق وسطیٰ کی روایتوں کے مطابق طوفان ٹھیک اعتدال خریفی کے دن آیا تھا یعنی وہ دن جب رات اور دن کی لمبائی یکساں ہوتی ہے اور اعتدال خریفی ۲۳ ستمبر کو پڑتا ہے۔ بائبل کے عہد نامۂ عتیق میں کہا گیا ہے کہ سیلاب چاندرات کو آیا تھا۔ گل گامیش کی کہانی ہے کہ "خشکی کو آگ اس وقت لگی جب سپیدۂ سحر بمشکل نمودار ہوا تھا۔" یعنی عراق میں صبح کے چھ بجے تھے ان شواہد کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوفانِ نوح نو ہزار پانچ سو پینتالیس سال پہلے ۲۳ ستمبر کو آیا تھا۔ واللہ اعلم

قومی زبان (۳۰) جولائی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر اُمِ سلمیٰ

ڈاکٹر عندلیب شادانی .... ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا اصل نام وجاہت حسین اور تخلص عندلیب تھا۔ اس عہد کے مشہور فارسی عالم، اولاد حسین شادان بلگرامی سے دلی عقیدت رکھنے کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ شادانی یوں چسپاں کر لیا جو بعد میں ان کے نام ہی کا ایک جزو بن گیا۔ (۱) بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں جنون تھا۔ ادب سے خصوصیت کے ساتھ لگاؤ تھا۔ اس زمانے کے مروجہ سینکڑوں شعر زبانی یاد تھے ہر اس چیز کی طرف دل کھینچتا تھا جو حسن و جمال کا مظہر ہوتی۔ (۲)

عندلیب شادانی نے ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگلہ دیش) میں ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک بطور اردو و فارسی معلم کے ۴۱ سال خدمات انجام دیں۔ وہ بیک وقت کئی ادبی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، محقق بھی تھے اور افسانہ نگار و ڈرامہ نویس بھی۔ بحیثیت اردو شاعر انھوں نے ۲۲ غزلیں اور ۱۶ نظمیں لکھیں اُس مجموعے کا نام "نشاط رفتہ" ہے یہ مجموعہ 1951ء میں لاہور سے چھپا۔ ان کا کلام ایک زمانے تک "پریم پجاری" کے نام سے چھپتا رہا۔ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں کہتے ہیں:

> "میری عمر کوئی دس گیارہ برس کی تھی کہ ہمارے شہر میں ایک بڑا بھاری مشاعرہ ہوا۔ بعض ہم عمر اور ہم سبق لڑکوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی چند شعر کہے اور اس دن مجھے معلوم ہوا کہ مبدءِ فیاض نے مجھے طبعِ موزوں عطا فرمائی ہے اور اس کے بعد تو قریب قریب ہر روز دورانِ گفتگو میں درجنوں مصرعے بے ساختہ موزوں ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن باقاعدہ شعر کہنے اور کسی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کرنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔" (۳)

لیکن ۱۹۲۳ء میں انھیں حصولِ تعلیم کے لیے لاہور جانا پڑا تو انھیں وہ ماحول میسّر ہوا جو ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں مددگار ثابت ہوا۔ ایک طرف مولانا تاجور جیسے شاعر کا پڑوس اور ان کے اصرار سے لاہور کی ادبی صحبتوں میں شرکت اور دوسری طرف یکایک دل کی گہرائیوں میں اس لطیفۂ ازلی کا ظہور جس کے طفیل زندگی زندگی بنتی ہے بقول اُن کے حیات کا نقطۂ آغاز تو وہی ہے:

> عشق سے ہوتا ہے آغازِ حیات
> اس سے پہلے زندگی الزام ہے (۴)

عندلیب شادانی نے باقاعدہ شاعری نظم گوئی سے شروع کی۔ "تصویرِ بہار" ان کی پہلی نظم ہے جو انھوں نے دیال سنگھ

کالج لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں ۲۹ جنوری ۱۹۶۴ء کو پڑھی سامعین کی تحسین نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر دوسری نظم "شالامار" کی تخلیق ہوئی۔ اس نظم نے لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو مزید روشناس کرایا۔ (۵)

عندلیب شادانی نے اپنی شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور جنوری ۱۹۲۴ء سے لے کر اگست ۱۹۲۹ء تک اور دوسرا دور جولائی ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک۔ دونوں دوروں کے درمیان تقریباً پانچ برس کا زمانہ خاموشی سے گزرا۔ البتہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک خاص واقعے سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک نظم "سی نوری تا" لندن میں کہی تھی۔ اس کے بعد پھر مکمل خاموشی۔ ۱۹۳۴ء میں یکایک احساس نے انگڑائی لی اور یہ غزل وجود میں آئی:

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
اُنھیں کی یاد میری زندگی ہے (۶)

شاعری کے بارے میں اُن کے خیالات اُن کی تنقیدی کتاب "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" میں ملتے ہیں۔ یہ کتاب نثر میں ہے جس میں انھوں نے حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ چونکہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" اسی لیے کسی نے انھیں مذکورہ بالا شعرا کا مخالف جانا۔ کسی نے انھیں فراق کا حریف گردانا۔ کسی نے صنفِ غزل کا دشمن سمجھا، لیکن ایسے خیالات کی تردید کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"نفسِ غزل کا مخالف میں ہرگز نہیں۔ غزل بلاشبہ ایک جمیل صنفِ سخن ہے۔ لیکن رسمی غزل کو جس میں بے کیف نقالی کے سوا اور کچھ نہ ہو میں یقیناً سوختنی سمجھتا ہوں میں خود بھی شعر کہتا ہوں اور جب کچھ کہتا ہوں تو غزل ہی کہتا ہوں۔" (۷)

اُن کے خیال میں یوں تو ایک شاعر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے اشعار میں زندگی کے تمام مسائل سے بحث کرے لیکن غزل صحیح معنی میں اسی وقت غزل کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے جب کہ اس کا موضوع محبت اور صرف محبت ہو۔ غزل میں عشقیہ مضامین کے علاوہ جب دوسرے عناصر داخل ہو جاتے ہیں تو غزل کی فضا میں وہ معنوی ہم آہنگی باقی نہیں رہتی کہ ایک تربیت یافتہ دماغ اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ یوں تو فلسفہ، سیاست، اخلاق اور زندگی کے دوسرے مسائل سبھی قابلِ توجہ ہیں لیکن مینائے غزل، صہبائے محبت ہی کے لیے موزوں ہے۔ غزل ایک نگار خانہ ہے میوزیم نہیں کہ اس میں ہر چیز کے لیے گنجائش نکالی جائے پھر غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی تو ہیں۔ جس کا جی چاہے ان میدانوں میں جولانیِ طبع دکھائے۔ اس بات کو انھوں نے مندرجہ ذیل مثالوں سے یوں واضح کیا ہے:

"کھاد کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو لیکن چمن کی روشوں پر اس کے ڈھیر لگا دینا یقیناً بدتمیزی ہے۔ ہل اور پھاوڑے کی حیثیت مسلم لیکن انھیں ڈرائنگ روم میں رکھنا بلاشبہ ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ بیل بے حد کارآمد جانور ہے لیکن اُسے چینی اور شیشے کے برتنوں کی دوکان میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ٹنکچر آیوڈین کے مفید ہونے میں کیا شک ہے لیکن اس کے رکھنے کی جگہ عطر دان نہیں جس طرح زندگی اور موت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح آبادیوں کے لیے گورستان بھی ناگزیر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر پبلک تفریح گاہ میں چند قبریں بھی ضرور بنا دی جائیں۔ آفتاب سرچشمہ حیات ہے لیکن سائے میں پروان

چڑھنے والے نازک فن اس کی حرارت اور تپش کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انھیں دھوپ سے بچانا ہی ہوگا۔" (۸)

اس کے علاوہ شادانی کے خیال میں غزل میں تشبیہ، استعارہ اور مبالغہ سے بیان میں حسن، تاثیر اور زور پیدا ہو جاتا ہے لیکن ہماری بعض تشبیہیں اور استعارے اس درجہ پامال اور فرسودہ ہو چکے ہیں کہ ان سے بیان میں کسی قسم کا حسن پیدا ہونا تو درکنار کلام اور بے کیف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مبالغہ کے استعمال میں نہایت احتیاط اور اعتدال کی ضرورت ہے ورنہ دور از کار مبالغوں سے بیان کا سارا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔ (۹)

شادانی صاحب کے خیال میں غزل کہنے یا رودادِ محبت بیان کرنے کا اہل صحیح معنی میں اُسی شخص کو سمجھنا چاہیے جو شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ خود اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہو۔ آپ بیتی کہتا ہو اور محسوس کر کے کہتا ہو یہ نہیں کہ اس کے اشعار دماغ سے پیدا ہوں اور دل سے نہیں۔ اسی نظریے کے تحت ان کا کہنا ہے کہ میں نے زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق نہ ہو سکے۔" (۱۰)

"دور حاضر اور غزل گوئی" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔

"تحقیقات" جواُن کی دیگر ایک تحقیقی کتاب ہے اس میں بھی انھوں نے شعر و ادب کی مختلف اصناف سخن اور چند ایک تاریخی واقعات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جدید، لاہور سے طبع ہوئی۔

"تحقیق کی روشنی میں" شادانی صاحب کی ایک اور تحقیقی و تنقیدی کتاب کا نام ہے۔ جو ۱۹۶۳ء میں لاہور سے منظر عام پر آئی۔ تحقیق کے بارے میں ان کا نظریہ یہ رہا ہے کہ یا تو کوئی نئی بات دریافت کی جائے یا کسی پرانی بات کے نئے گوشے وانمود کیے جائیں۔ ان کے حقیقی مضامین تحقیق کے ان دونوں فرائض کو بوجوہ احسن پورا کرتے ہیں۔ ان کی تحقیقی سرگرمیوں کا تعلق صرف ماضی کے ادبی سرمائے سے نہیں بلکہ معاصرانہ مباحث سے بھی ہے انھوں نے جن مسائل پر دادِ تحقیق دی ہے وہ نہ صرف اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہیں بلکہ ان کے نتائج کے اعتبار سے بھی، جن تک وہ بڑی چھان بین کے بعد پہنچتے ہیں۔ (۱۱)

شادانی صاحب افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ایک اچھے مقام کے حامل ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سچی کہانیاں" شائع ہوا ان کی سچی کہانیاں "پریم پجاری" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس کتاب کی مقبولیت نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور پھر دوسرا مجموعہ "نوش و نیش" اور تیسرا مجموعہ بنام "چھوٹا خدا" منظرِ عام پر آئے ان افسانوں کو لکھتے وقت ارادی طور پر افسانہ نگاری کے فن کا کوئی خاص اصول ان کے سامنے نہ تھا۔ افسانے صرف اُن واقعات پر مبنی ہیں جن واقعات کو سن کر وہ متاثر ہوئے اور جن واقعات کو پڑھ کر دوسرے بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ سچی کہانی اگر واقعی سچی کہانی ہو تو وہ کسی فنکار کے دماغ کی پیداوار نہیں ہوتی۔ حالات کا تقاضا واقعات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتا ہے اسی کا نام سچی کہانی ہے اب لکھنے والے کا کام ہے کہ وہ ان واقعات کو ایک دل نواز اور پر تاثیر پیرائے میں بیان کر دے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا لکھنے والے کے سلیقے اور صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس صنف میں شادانی صاحب خوب کامیاب ہیں۔ (۱۲) اور کسی نقاد نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے افسانے کی اس صنف یعنی سچی کہانی کو ایک مستقل حیثیت دینے والا پریم پجاری کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔" حقیقت یہی ہے کیوں کہ ان کے بعد اس نوع کے افسانوں پر کسی اور نے ہاتھ نہیں ڈالا۔

"چھوٹا خدا" میں ایک ڈرامہ بعنوان "بے روزگار" بھی شامل ہے۔ "بے روزگار اس وقت کے تقاضوں کے تحت لکھی گئی

تھی۔ لیکن اس کا اطلاق آج کے زمانے میں بھی ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگاری کا شکار بنتے ہیں اور سیاسی سازشوں کے ایجنٹ بن کر ملک کے امن وامان کو درہم برہم کرتے ہیں اور انجام کار اپنی زندگیاں برباد کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ان کی دیگر مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ "نقشِ بدیع" (جدید فارسی الفاظ کی لغت)، ۲۔ ترجمہ و شرح رباعیات باباطاہر عریاں، ۳۔ ترتیب و حواشی چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی، ۴۔ ترجمہ ابوالفضل (جلد اوّل)، ۵۔ تدوین و حواشی قصائد قاآنی، ٦۔ تلخیص شعرالعجم شبلی نعمانی (جلد سوم و جلد پنجم)، ۷۔ پیام اقبال (خطبہ صدارت یوم اقبال ۱۹۵۰ء، کلکتہ)۔

شادانی صاحب نے ایک ماہانہ "خاور" کے نام سے ڈھاکہ سے نکالنا شروع کیا تھا مگر مالی مشکلات کی بنا پر اسے بند کر دیا ان کے علاوہ اُن کا انگریزی مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی "ہندوستان کے مسلم مورخ" اسکول آف اورینٹل اینڈ امریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

شادانی صاحب کو فارسی زبان سے بے حد شغف تھا۔ اس وقت برصغیر میں کم لوگوں کو قدیم و جدید فارسی پر اتنی قدرت تھی جتنی انھیں تھی۔ خصوصاً ایرانی لب و لہجے کے ساتھ بات کرنے میں انھیں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ جب ایران گئے تو خود ایرانیوں کو حیرت رہی کہ ایک غیر ایرانی اتنی اچھی فارسی کیوں کر بول سکتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے فارسی میں باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن انھوں نے فارسی میں فی البدیہہ شعر خاصی تعداد میں کہے ہیں اور اسی سہولت و سلاست کے ساتھ جو ان کے اردو فی البدیہہ اشعار کی خصوصیت ہے۔ (۱۳)

الغرض یہ کہ عندلیب شادانی نے اپنے ادبی کارناموں سے بنگلہ دیش کے "اردو دبستان" کا نام روشن کیا اور برصغیر کے اردو حلقے میں اچھا مقام حاصل کیا۔

اشارے

(۱) نظیر صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ (کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱) (۲) "نقوش" آپ بیتی نمبر (جون ۱۹٦۴ء) ص ۱۲٦٦۔ (۳) ڈاکٹر عندلیب شادانی، مقدمۂ نشاط رفتہ (لاہور ۱۹۵۰ء) ص ہ (۴) ایضاً ص و۔ (۵) ایضاً ص و۔ (٦) ایضاً ص ز۔ (۷) ڈاکٹر عندلیب شادانی، دور حاضر اور اردو غزل گوئی، (لاہور ۱۹٦۲ء) ص ۱۱۔ (۸) ایضاً ص ۱۳۔ (۹) ایضاً ص ۱۴۔ (۱۰) مقدمۂ نشاطِ رفتہ ص، ح۔ (۱۱) ڈاکٹر عندلیب شادانی، تحقیق کی روشنی میں (لاہور ۱۹٦۳ء) ص ۱۲۔ (۱۲) ڈاکٹر عندلیب شادانی، نوش و نیش (لاہور ۱۹۵۱ء) ص ۷۔ (۱۳) ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ ص ۴۰

ازراہ کرم مضامین میں اختصار کا خیال رکھیں

ن۔ م دانش

انجم اعظمی .... ساون آیا ہے، توسیع یا تکذیب

انجم اعظمی کی شاعری ہو یا تنقید، ان کی تحریر میں اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ انسانی زندگی کو سب سے بڑی قدر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اور قدروں کے سلسلے یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ محبت، معاشرہ، حسن فرد اور آزادی فکر کو ان کے یہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھیں اقدار کے حوالے سے وہ جدید شاعری کے بعض رویوں کی مذمت کرتے ہیں۔ انھیں زندگی، انسان اور معاشرہ کے لیے سم قاتل تصور کرتے ہیں اور جنھیں وہ منفی رویوں کا نام دیتے ہیں جیسے زندگی کی بے معنویت کا پرچار، جدید کے نام پر روایت سے مکمل انکار و انحراف، انسان کی بہتر زندگی اور مستقبل کی مایوسی و ناامیدی کا اظہار تبدیلی و ارتقا کے مقابلے میں جمود اور ٹھہراؤ کی حمایت وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں ایک خاص بات جو بار بار سامنے آتی ہے وہ وقت کے تسلسل کا احساس ہے۔ ماضی، حال، مستقبل ان کے یہاں ایک اکائی کی صورت میں ڈھلتے ہیں۔

"حال کا لمحہ زندگی گزارنے کا لمحہ ہے۔ ماضی اور حال جہاں پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں وہیں سے مستقبل کا دروازہ کھلتا ہے اور وہی تخلیق کی اولین محرک ہے۔"

تخلیقی ادب زمان و مکان کی اضافیت میں زندگی کی ساری قدروں کو ایک اکائی کی صورت میں دریافت کرتا ہے (۱) (ص ۶۴) اس اکائی کو چاہے معاشرہ کے نام سے یاد رکھا جائے یا آدمی کی ذات سمجھ لیا جائے کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا، معاشرہ سے مراد آدمی کی زندگی ہے اور آدمی کہہ کر معاشرہ ہی پر گفتگو کی جاتی ہے۔ بیسویں صدی کا آدمی جس کی ذہنی، فکری اور جذباتی کائنات میں فرائڈ، مارکس اور آئن اسٹائن (جنس، معاش اور اضافیت) مدغم ہو گئے ہیں، بے شمار مسائل میں گھرا ہوا ہے ان کے بقول یہ سارے مسائل اس عہد کے انسان کے بنیادی مسائل ہیں اور ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اس آدمی کو سمجھنا ہے۔ (۲) جو آج زندگی گزار کر خوش نہیں ہے۔ لیکن زندگی گزارنے کی بے پایاں خواہش رکھتا ہے۔ (ص۔ ۶۷) اور (۳) اس آدمی نے وقت کے پھیلاؤ میں زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اپنے وجود کے معنی تلاش کیے ہیں۔ (ص ۱۴) ادب (۴)، آدمی اور آدمیت کی طرفدار ہے شعر کی سمجھ اور آدمیت سے شناسائی درویشی کے مسلک کی جانب راغب کرتی ہے اور ہمارے زر پرست معاشرہ میں باقاعدہ اپنی گدائی کا اعلان کرنے کے مترادف ہے۔"

یہ ہیں وہ تصورات جن کے گرد انجم اعظمی کی "ساون آیا ہے" سے پہلے بالخصوص "چہرے" اور "زیر آسمان" کی شاعری گھومتی ہے ("زیر آسمان" کی کچھ نظمیں "ساون آیا ہے" میں شامل ہیں) جس کا بنیادی موضوع سرمایہ دارانہ صنعتی شہری زندگی،

اس کے تضادات اور اس کے معمولات میں آدمی کا روحانی کرب ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تنقید میں جدید عہد کی خصوصیات مثلاً تیز رفتاری، انکار اور ہمارے معاشرے میں تصوف سے بڑھتی ہوئی وابستگی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے منفی رخ سے پردہ ہٹایا ہے اور یہی رویے کسی نہ کسی شکل میں ان کی شاعری میں بھی کارفرما ہیں۔

بیشتر نقادوں کی تنقید ان کی اپنی شاعری کے لیے جواز اور بنیاد فراہم کرتا ہے لیکن یہ ہمیشہ بہت واضح اور مساواتی نوعیت نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر شاعری، نقاد کے مقرر کردہ حدود و قیود کو توڑتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے یا تنقید کا دائرہ اتنا وسیع ہو ہے کہ اس دائرے میں شاعری بہت چھوٹی پڑ جاتی ہے اردو اور دوسری زبانوں میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کلیم الدین احمد، انجم اعظمی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ۔ خواہ کوئی، فنکار اچھا ہو یا نقاد اس کے فن اور تنقید میں ایک داخلی تعلق اور رشتہ ضرور ہوگا۔ بظاہر وہ کتنے ہی ایک دوسرے کی نفی کیوں نہ کرتے ہوں۔

انجم اعظمی بھی اسی دوہری حیثیت کے مالک تھے، ان کی تنقیدی کتاب "ادب اور حقیقت" اور شاعری میں ایک براہ راست تعلق موجود ہے۔ "ادب اور حقیقت" ان کی "ساون آیا ہے" سے پہلے کی شاعری کی بوطیقا ہے۔ جب کہ "ساون آیا ہے" میں ایک دوسرا شاعر نظر آتا ہے۔ جو بظاہر اپنے بعض سابقہ تنقیدی اور شعری تصورات کی نفی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میرا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ میں "ساون آیا ہے" کو انجم اعظمی کے ابتدائی تصورات کی توسیع اور منطقی نتیجہ سمجھتا ہوں۔

"ساون آیا ہے" اور انجم اعظمی کے دوسرے شعری مجموعوں میں فرق پہلی نظر میں دکھائی دے گا۔ یہاں ایک واضح تبدیلی کا احساس نمایاں ہے۔ یہ تبدیلی روایتی موضوعات اور پابند نظموں سے لے کر آزاد نظموں اور ان کے مختلف آہنگ تک، اظہار خیال و بیان سے لے کر اسلوب و لفظیات تک، خیال و تجربے کی سادگی اور اکہرے پن سے لے کر اس کی پیچیدگی اور تہہ داری تک نظر آتی ہے۔ لیکن یہ پیچیدگی ان علامت پسند شعرا کی پیچیدگی نہیں ہے جن کے ساتھ ادب کا سنجیدہ قاری بھی ابلاغ کی سطح پر شیئر SHARE نہیں کر سکتا ہے اور جہاں تک علامت نگاری کا تعلق ہے تو یہ موجودہ نظم کا غالب اسلوب یا رجحان ہے یا کم سے کم وہ استعارے کا سہارا لیتی ہے۔ آج کا قاری بیانیہ نظم کا قاری نہیں ہے اور نہ ہی آج کا شاعر بیانیہ اسلوب کی بنیاد پر قابل توجہ ہو سکتا ہے۔

انجم اعظمی نے اپنے بیشتر ہم عصر ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں نظم کے موضوع، موضوع کے ساتھ ٹریٹمنٹ اور بیان و اسلوب کے سلسلے میں زیادہ لبرل رویے کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے جدید شاعری اور جدید تصورات کی محض لفظ جدید کی بنیاد پر نفی نہیں کی، بلکہ وقت کے تسلسل کا گہرا ادراک رکھنے کے سبب انھوں نے جدید کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ان کے صالح عناصر کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس لیے ان کا رویہ، ان کی نظمیں، لفظیات و اسلوب ترقی پسندوں سے زیادہ جدید نظم نگاروں کے قریب ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ نئے بلکہ نوجوان لکھنے والوں سے ایک قریبی تعلق رہا۔ وہ اپنی عمر کے دیگر شاعروں کے برعکس نوجوانوں کی نشستوں میں جاتے، نظمیں سنتے، نظمیں پڑھتے اور گفتگو کرتے تھے۔ وقت کو ایک سیل رواں کی شکل میں دیکھتے اور نوجوانوں سے اس تعلق نے ان کی شاعری کو بھی تروتازہ رکھا۔ اس لیے "ساون آیا ہے" صرف زمانی اعتبار سے ہی ان کا آخری مجموعہ نہیں بلکہ اپنی فکر اور اظہار و اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کا آخری مجموعہ ہے۔ یہ ان کے مسلسل و مستقل فکری ارتقا یا تبدیلی کا مظہر ہے۔

اسی کا نام لے کر زندگی کی آزمائش سے گزرتا جا

ہوس کے پیچ و خم میں پاؤں کیا کیا ڈگمگائیں گے
خود اپنے نفس کی یلغار بھی ہوگی
فریب آرزو (اے دل) نشاط انگیز بھی ہوگا
تم اپنے ساتھ توبہ کی سپر رکھنا
جب اپنوں کے بہت غم جمع ہو جائیں
وفا کی لوح بن کر
کاسۂ عمر گریزاں میں
حیات جاوداں کا نور بھر لینا
سحر تک رات کی پرچھائیوں کو منتشر رکھنا
نہ ہے مہتاب کی رونق
نہ روئے گل ترے آگے
جگا کر احسن تقویم کا افسوں
نقاب رخ الٹ دینا
تری اللہ ہو کوئل کی کو کو ایک جیسی ہو
پپیہا جب پکارے پی کہاں
تیری صدا مکے مدینے تک پہنچ جائے

(توبہ کی سپر)

نہاں خانۂ دل میں امید کی ایک ننھی کرن ہے
جو باقی ہے کچھ اور باقی نہیں ہے
اپنے دامن میں ہجرت کی سوغات لے کر مدینے چلوں
اپنے آقا سے پوچھوں کہ اے والیٔ دو جہاں کیا کروں
ایسے طوفان میں کیا کروں

انجم اعظمی "ساون آیا ہے" میں زندگی کو جس طرح CONCLUDE کر رہے ہیں یہ رویہ ان ابتدائی (پہلے کے) مجموعوں میں آپ کو نہیں ملے گا۔

میں نے ابتداً اس تبدیلی کو ان کی فکر کی توسیع اور منطقی نتیجہ کہا ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم ان کے بعض تنقیدی تصورات، ادب، زندگی اور معاشرہ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر، "چہرہ" اور "زیر آسمان" کی بعض نظموں میں انتظار اور امید کی کیفیت کو مد نظر رکھیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں اور صاف ہو جائے گی۔ انجم اعظمی اس صنعتی معاشرہ میں جہاں انسان بازار کی چیز بن چکا ہے مشینوں کے دھوئیں نے انسان کی پرچھائیں تک کو نگل لیا ہے۔ ہجوم میں انسان تنہا ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی بدترین شکلیں، طاقتور اقوام نے کمزور اقوام کو اپنا مطیع و غلام بنایا ہوا ہے۔ تو وہاں یہ سوال اٹھتا ہے

کہ انسانی مساوات پر مبنی معاشرہ کیسے قائم ہو۔ فرد جو انجم اعظمی کے یہاں ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی اہمیت اور اس کے وجود کی معنویت کس طرح بحال ہو؟ ان سوالوں کا جواب ابتدا میں ان کے پاس اعلیٰ انسانی اقدار پر غیر متزلزل یقین، مساوات پر مبنی ایک معاشرہ کے قیام کے خواب اور ایک پُرامید مستقبل کی شکل میں تھا۔ لیکن ان کا یہ یقین، خواب اور پُرامید مستقبل مذہب کا سہارا نہیں لیتا ہے۔ بلکہ انسانی ذہن و فکر اور سائنسی ترقی انسان دوست رخ ان کی اس امید اور یقین کی بنیاد ہے۔ وہ پُرامید تھے انسان معاشرے کے مصائب اور مسائل پر قابو پالے گا۔ وہ انتظار کش تھے کہ وہ صبح کبھی تو طلوع ہوگی جس کی روشنی ہر گھر میں پھیلے گی اور ہر فرد اس اجالے کا حقدار ہوگا۔ لیکن زندگی کی سفاک سچائیاں اور حقیقتیں انسان کے خوابوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ جب انسانی عظمت کے مقابلے میں کوئی منہ چڑا کر یہ کہتا ہے:

بیٹ کر جاتی ہے چڑیا فرق پر
عظمتِ انساں کا آئینہ ہوں میں

تو عظمت انساں کا خواب دھڑام سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جب زندگی اور سماج کی بے رحم حقیقتیں برہنہ صورت میں سامنے آتی ہیں تو پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جاتی ہے اور سر سے آسمان ہٹ جاتا ہے اور فرد خود کو پوری کائنات میں اکیلا، راکھ کے ڈھیر پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ خود کو دھوکہ دینے کے لیے اس کے پاس ایسی کوئی شے باقی نہیں رہتی ہے جس کی بنیاد پر وہ معاشرے کے تضادات پر قابو پانے کا خود کو دھوکہ دے سکے۔ نتیجتاً ان تضادات کا حل وہ مراجعت میں ڈھونڈتا ہے۔ مذہب (اور روایت) کی طرف مراجعت دراصل زندگی کے تضادات پر قابو پانے کا سادہ ذہنی عمل ہے۔ جسے فرار، گریز، مراجعت کا نام دیا گیا ہے۔ زندگی اور معاشرہ کے اقدار پر پختہ یقین کی وجہ سے اپنے آئیڈیل (بہتر معاشرہ، بامعنی زندگی) کی تلاش میں رہنے والوں کے یہاں امید اور انتظار بنیادی رویے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جب سماج کے تضادات سے تصادم کے نتیجے میں ان کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اس شکست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے ہیں۔ سمندر میں ڈوبتے آدمی کی طرح ان کے ہاتھ آخری سانس تک اوپر اٹھے رہتے ہیں کہ شاید کوئی ان کا ہاتھ تھام لے۔ زندگی کی امید آخری سانس تک رہتی ہے۔ اقدار، یقین اور خوابوں کی یہ شکست و ریخت فرد کو جس جذباتی اور روحانی ردِعمل سے دوچار کرتی ہے وہ کیفیت "ساون آیا ہے" کی مختلف نظموں اور لائنوں میں بار بار ابھرتی ہے۔ وہ پہلے چیخا کرتے تھے، احتجاج کرتے تھے۔ اب فریاد کرتے ہیں کبھی مدینہ، کبھی مدینہ والے اور کبھی دہانِ زخم سے خدا کو پکارتے ہیں۔

"آخری امید"، "انتظار"، "بازگشت"، "شہر جدید"، "ناامیدی کفر ہے"۔ اسی احساس اور کیفیت کا مظہر ہیں۔

وحشت بے اماں میں یوں گزرے تمام روز و شب
لوگوں کو خوف کھا گیا
راہ فرار بھی نہ تھی
شوق سے اجتناب تھا کتنی تھی دل کی بے بسی
شوق ہے آخری امید
میرا خدا تھا مجھ سے دور اور میں اس بھنور میں تھا
دل نے دہانِ زخم سے اس کو پکار ہی لیا

(شہرِ جدید)

ایک خلقت ہے جو ڈوبتی جا رہی ہے
یہی موت ہے، موت سے آج کوئی ہراساں نہیں ہے
مرگِ انبوہ کا جشن ہے لوگ بے خوف ہیں
زندگی درمیاں ان کے سہمی ہوئی ہے

میں ہوں یا کوئی دیوانہ ہے
دن ن سچائیوں و سنوائے بغیر
گمانوں کی پھیلی ہوئی دھند میں
زندگی کی طرف دیکھنا چاہتا ہوں

(مرگِ انبوہ)

شکست یا شکست کا خوف مراجعت کو جنم دیتا ہے آدمی ماضی کی طرف بھاگتا ہے اس کی یادیں جاگ اٹھتی ہیں اور کمرہ پی
ہاں کی صدا سے بھر جاتا ہے اور پھر یہ پی کہاں کی صدا دوست، ساتھی، ماں، باپ سے ہوتی ہوئی مدینے والے تک اور بچپن کی
یادوں سے بھرے گاؤں فتح پور تال رتوئے سے ہوتی ہوئی مکے، مدینے تک پہنچتی ہے۔

صدائے پی کہاں سے باغ سارا گونج اٹھتا ہے
نکل آیا ہوں کتنی دور کتنا فاصلہ ہوگا
مری بستی سے میرے شہر کا
جس میں گزاری عمر ساری شور کے اندر

(بازگشت)

تری اللہ ہو کوئل کی کوکو ایک جیسی ہو
پپیہا جب پکارے پی کہاں
تیری صدا مکے مدینے تک پہنچ جائے

(توبہ کی سپر)

۔ ذہنی مراجعت صرف یادوں کے حوالے سے ہی نہیں ہوتی ہے فکری بھی ہوتی ہے۔ اب وہ انسان کی ذہنی و فکری ارتقا کو روسو
کی طرح نادانی سے چالاکی تک کا سفر قرار دیتے ہیں۔ روسو کے مطابق انسانی تہذیب و تمدن نے فطری زمانے کے معصوم انسان کو
عقل کے نام پر صرف چالاکی سکھایا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"میں یہ اعلان کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تفکر و تدبر کی عادت خلاف فطرت ہے سوچ و
بچار کرنے والا آدمی مسخ شدہ حیوان ہے عقل کو جلا دینے کی ضرورت سے زیادہ جلد بازانہ
کوشش، ترک کر دینی چاہیے البتہ دل اور تاثرات کی تربیت کرنی چاہیے تعلیم سے انسان

نیک نہیں بن جاتا صرف چالاک ہو جاتا ہے۔"
زندگی کرنے کا یہ طریقہ بھی عجیب ہے
محبت میرے خمیر میں ہے
اور نفرت
میں نے برآمد کر لی ہے
میرا خدا حکمت والا ہے
اور میں نادانی سے چالاکی تک سفر میں ہوں
اس کے پیمبروں سے جھگڑتا رہا
اور ساون برسنے سے پہلے تک
اپنی ویرانی پر روتا رہا

(اپنی ویرانی پہ روتا رہا)

مراجعت، بالخصوص مذہب کی طرف مراجعت کی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے اور اس عمل میں یہ عموماً بنیادی وجہ ہوتی ہے وہ ہے بڑھاپا، اس لیے کل کا انقلابی، آج کا مذہبی اور آج کا انقلابی، کل کا مذہبی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اردو ادب میں ایسے کئی نام دکھائی دیں گے پروفیسر احمد علی اور حسن عسکری سے زیادہ جدید علوم و فنون، فلسفہ کا دلدادہ ان کے زمانے میں اور کون تھا۔ لیکن بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں تو انسان مذہب کی طرف رجوع ہوتا ہے علم و ادب کی دنیا میں یہ ایک عام سی بات ہے گو یہ عام سی بات ہر ایک کے ساتھ رونما نہیں ہوتا ہے۔

اسی لیے "ساون آیا ہے" میں انجم اعظمی کا رویہ، مجھے ان کی جوانی یا ترقی پسند اور جدید ہونے کے "رویے" کے برعکس لگنے کے باوجود غیر متوقع، انوکھا یا عجیب سا نہیں لگتا ہے بلکہ میں اسے انجم اعظمی کے سابقہ تصورات کا توسیعی و منطقی نتیجہ سمجھتا ہوں۔ یہ تصورات ان کی شاعری میں محض فیشن کے طور پر نہیں آئے ہیں بلکہ یہ ان کی روح کی پکار ہے وہ جس دل سوزی سے خدا اور مدینے والے کا ذکر کرتے ہیں اس سے ان کی نظموں میں ایک مناجات کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کا تبدیل شدہ شعری تصور زیادہ شدت سے ابھرا ہے۔ مشرق کا مزاج مذہبی ہے۔ خواہ اس کا سبب پیداواری آلات اور قوتوں کی پسماندگی ہو یا سائنس اور ٹکنالوجی سے دوری، یا کوئی اور سبب لیکن مشرق بیسویں صدی میں بھی مذہب کی آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہے۔

"ساون آیا ہے" کی غزلوں میں ایک تخلیقی تازگی ہے اور یہ کسی بھی اعتبار سے انجم اعظمی کی پہلے کی غزلوں سے لگا نہیں کھاتیں ان کی لفظیات، ان میں متحرک احساس، ان میں موجود خیال اور تجربہ بالکل الگ اور انوکھا ہے۔ جدید غزل کے مختلف شیڈز ہیں۔ اس کو کسی ایک رنگ میں قید یا متعین کرنا آسان نہیں ہے۔ شکیب جلالی، جون ایلیا، ظفر اقبال، رئیس فروغ، انور شعور اور اقبال ساجد جدید غزل کے بعض مشترک اور بعض مخالف اور مختلف رویوں اور خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے علاوہ جدید غزل کا ایک اور رنگ بھی ہے۔ وہ ہے اس کا صوفیانہ یا مذہبی رنگ، اس رنگ کو نظریاتی بنیاد حسن عسکری اور اس کے پیرو کاروں نے فراہم کیا اور جیلانی کامران نے "نئی نظم کے تقاضے" میں اس کی بوطیقا وضع کی۔ جس میں انھوں نے ایک نئی شاعری کی ضرورت محسوس کی اور اس کا جواز فراہم کیا ان کے مطابق:

"نئی شاعری مذہبی شعور کے بغیر پیدا نہیں ہوسکی۔ ایسی شاعری جو انسان اور انسان کی رشتہ بندی، سے پیدا ہوتی ہے جس میں فریقین اقدار کو اضافی جانتے ہیں اور مسخ شدہ عکس کی رونمائی میں حصہ لیتے ہیں۔ اس شاعری سے کم تر ہے جس میں انسان، کائنات اور زندگی بخشنے والا رب شامل ہے۔ اس شاعری میں شاعر کسی ادارے کی طرف سے آئی ہوئی بشارت کا ذکر نہیں کرتا بلکہ زندگی بخشنے والے رب تک اپنی فریاد کو پہنچاتا ہے۔ جو اکیلے پن اور تنہائی سے پیدا ہوتی ہے۔ نئی شاعری کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ وہ تنہائی جو ہمارے دلوں میں ہے وہ تنہائی جو ہماری سوچ میں ہے، وہ اس احساس سے حوصلہ پکڑ سکے جو احساس ہمیشگی سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ نیکی، خوشی اور خوبصورتی لازوال ہیں اور انسان ان کا متلاشی ہے۔(۵۱)

یہ ہے اس غزل کی نظریاتی اساس جس پر اظہار الحق، غلام حسین ساجد، ثروت حسین اور دوسرے نئے غزل گو شاعروں کی غزلیں کھڑی ہیں۔ جدید غزل کا یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ "ساون آیا ہے" کی غزلوں میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کا خمیر مذہبی روحانی تجربے سے اٹھا ہے۔ یہ ایک ذہنی مراجعت کا عمل ہے، اپنے اصل کی طرف اور اصل کے سوال اور نوعیت پر اختلاف ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ بیسویں صدی کا جدید صوفیانہ مسلک ہے۔ اس کے نظریہ سازوں اور شاعروں کا یہی خیال ہے کہ وہ مذہبی تجربات کو اپنا شعری محرک بناتے ہیں۔ ان کی لفظیات مذہبی اور صوفیانہ لغت پر مشتمل ہے۔ وہ تحیر اور معنی خیزی کے عمل کو مذہبی تجربات و تصورات کے شعری اظہار سے جوڑتے ہیں۔ انجم اعظمی کی بیشتر غزلیں جدید یا جدیدیت کے اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

سایہ ابر سے تقدیر جگا لی میں نے
اک صراحی پس پردہ تھی اٹھا لی میں نے
بے حجابی سے حجابات کیے ہیں پیدا
دل کے رازوں کی امانت تھی سنبھالی میں نے
اتری قرآن سے کل عصر کے آئینے میں
روح اقرار تھی سینے میں بسا لی میں

ایک قدم کے بیچ میں کون و مکاں سمٹ گئے
آگے کوئی بتائے بھی پاؤں کہاں دھروں گا میں

وہ روشنی ہوں کہ اپنے سائے میں چھپ کے کب سے
خود اپنے سارے حجاب کے رنگ دیکھتا ہوں

وصل کی خواہش حجاب اندر حجاب
دھیان کس کا تھا کہ دیکھا ہر طرف
اک جزیرہ خواب کا ہے اور میں
میرے رستے میں ہے دریا ہر طرف

گداز دل کا یہ کیسا عجیب لمحہ ہے
کہ عمر بھر کی ریاضت بھی اس سے کم تر ہے

وہ اور کیا ہمیں دیتا ہے دیکھنا ہوگا
ملا ہے بارِ امانت اتار کر دیکھیں

پڑاؤ ڈال کے بیٹھے تھے کائنات میں ہم
یہ آنکھ بند ہوئی کارواں گزرنے لگے

انجم اعظمی کا یہ آخری مجموعہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ یہ ان کے ابتدائی تصورات و خیالات کی توسیع بھی ہے اور تکذیب بھی۔

افتخار احمد عدنی

یادوں کا سفر..... بابا ذہین شاہ تاجی

چند ہفتے پہلے اعجاز صاحب میرے پاس آئے تو انھوں نے باباصاحب کے متعلق مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو خاص اہمیت کی حامل تھیں۔ ان میں سے تین کو میں نے گذشتہ مہینے کے مضمون میں شامل کر لیا تھا۔ دو کو میں نے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ ان کی نوعیت ذرا مختلف قسم کی ہے۔ سوچتا ہوں کہ انھیں اس مضمون میں شامل کر لوں تاکہ اعجاز صاحب کا قرض ادا ہو جائے۔

اعجاز صاحب نے بتایا کہ باباصاحب کا ایک مرید جس کا نام نور محمد تھا اولاد کی تمنا میں باباصاحب کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا۔ ایک روز باباصاحب نے اس کے لیے دعا کی اور اولاد کی خوش خبری دی۔ اس کے گھر بیٹا ہوا تو وہ بہت عقیدت سے باباصاحب کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔ باباتاج الدّین کی زندگی پر باباصاحب کی کتاب "تاج اولیا" مستقل پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس کے بچے کی عمر ڈیڑھ سال کی ہوئی تو اُسے ایسی بیماری ہوگئی کہ اس کا منہ بند ہوگیا۔ نہ پانی اس کے منہ میں جاسکتا تھا نہ دودھ دو دن یہ کیفیت رہی تو وہ سمجھا کہ بچہ اب نہیں بچے گا۔ مایوسی میں وہ سیدھا بابا ذہین شاہ صاحب کے پاس آیا آتے ہی اس نے پوچھا کہ آپ باباتاج الدّین کے خلیفہ ہیں۔ باباصاحب نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا پھر میرے بچے کو کیوں نہیں بچاتے۔ باباصاحب نے پوچھا کیا بات ہے تو اس نے اپنے بچے کی بیماری کا حال سنایا۔ باباصاحب نے کہا کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ وہ علاج کردے گا۔ اس نے کہا اگر ڈاکٹر سے کوئی اُمید ہوتی تو میں یہاں کیوں آتا۔ باباصاحب نے اُسے سمجھایا کہ بچے بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں، شہر حکیموں اور ڈاکٹروں سے بھرا ہوا ہے۔ کسی کے پاس لے جاؤ وہ علاج کردے گا یہ سن کر وہ ایک اضطراب کے عالم میں چیخنے چلانے لگا۔ اس نے کہا میرا بچہ مر رہا ہے اور آپ کہتے ہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ اگر میرا بچہ مرگیا تو میں اُسے دفن نہیں کروں گا۔ باباصاحب نے پوچھا، دفن نہیں کرے گا تو کیا کرے گا۔ یہاں لے آؤں گا آپ کے دروازے پہ ڈال دوں گا۔ اور چیخ چیخ کے ہر ایک سے کہوں گا، یہ باباتاج الدّین کے خلیفہ ہیں، یہ ایک بیمار بچے کو موت کے منہ سے نہ بچا سکے۔ بس یہی فریاد کرتا رہوں گا، باباصاحب نے جب یہ دیکھا کہ غم کی شدّت سے اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے تو اشارے سے اُسے خاموش ہونے کو کہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو باباصاحب آنکھیں بند کر کے ایک گہرے استغراق میں ڈوب گئے۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہے۔ معلوم نہیں اس استغراق میں اُن پہ کیا گزری کہ پسینے میں شرابور ہوگئے۔ پھر آنکھیں کھولیں اور نور محمد سے کہا جا تیرا بچہ ٹھیک ہوگیا، وہ گھر گیا تو دیکھا کہ اس کا بچہ ماں کے سینے سے لگا دودھ پی رہا تھا۔ وہ بچہ اب خود صاحب اولاد ہے اور اپنے بچوں کے ساتھ بڑی عقیدت سے باباصاحب کے عرس کے موقعے پر خانقاہ تاجیہ میں حاضری دیتا ہے۔

دوسرا واقعہ اعجاز کے بھائی نے سنایا اس میں کرامت سے زیادہ بابا صاحب کی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ بابا صاحب کے مریدوں کے ایک متمول خاندان میں ایک چھ سات سال کا بچہ بیمار ہوا۔ اس کی بیماری پر ماں باپ نے بہت روپیہ خرچ کیا۔ طرح طرح سے اس کے ناز اٹھائے۔ اُس کی سب فرمائشیں پوری کیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد ماں باپ کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہوئی کہ ان کا بچہ چلنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ اپنے پاؤں کے استعمال سے معذور ہوگیا۔ پلنگ پہ لیٹا رہتا تھا۔ کسی علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس کے ماں باپ بابا صاحب کے پاس دعا کے لیے آئے بابا صاحب نے اطمینان دلایا کہ بچہ بالکل ٹھیک ہے کوئی پریشانی کی بات نہیں انھوں نے اصرار کیا کہ کم از کم آپ ایک دفعہ اُسے چل کر دیکھ لیں۔ بابا صاحب نے کہا اچھا اُسے بتادو کہ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر آؤں گا۔ اور اگر میرے آنے پہ وہ ٹھیک نہیں ہوا تو پھر میں اس کا علاج کروں گا۔ دوسرے دن بابا صاحب ایک موٹا سا ڈنڈا لے کے ان کے گھر گئے۔ دروازے پہ پہنچتے ہی انھوں نے گرجدار آواز میں پوچھا کیسا ہے وہ! اور پھر دو چار دفعہ زور سے ڈنڈے کو زمین پہ پٹخا۔ بچے نے جیسے ہی یہ سوال اور ساتھ ہی ڈنڈے کی آواز سنی وہ بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے اٹھا اور باورچی خانے کے دروازے سے نکل کے ایسا بھاگا کہ کوئی نوکر اس کا پیچھا نہ کرسکا۔ چار پانچ فرلانگ پہ اپنے عزیز کے گھر جا کے رُکا۔ ڈنڈے کی دھمکی نے وہ کام کردیا جو کسی علاج سے نہ ہوسکا۔ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مومن کی بصیرت سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

یہاں مجھے بیدل کی زندگی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ کس طرح انھوں نے ایک شخص کو گھونسہ مار کے زندہ کردیا تھا۔ مومن کی بصیرت کا وہ ایک بین ثبوت ہے۔ لیکن بیدل سے پہلے فضلی صاحب کا ذکر صراحت کے طور پر سن لیجیے۔ فضلی صاحب عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر حامد شفقت کا علاج تھا۔ ایک دن ان کی طبیعت بگڑی۔ ڈاکٹر صاحب دیکھنے کے لیے آئے اور دوائیں تجویز کر کے جانے والے تھے کہ فضلی صاحب کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ اگر ہسپتال میں یہ سانحہ رونما ہوتا تو فوراً بجلی کے جھٹکوں سے دل کی حرکت بحال کرنے کی کوشش کی جاتی۔ گھر میں تو کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ڈاکٹر شفقت نے فوراً اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈال کے دونوں ہاتھوں سے اس زور سے اُن کے سینے کی مالش شروع کردی کہ دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ لیکن دل کی حرکت بحال ہوگئی۔ اور اس طرح فضلی صاحب کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ اس کے بعد فضلی صاحب کے جسم میں ایک بیٹری بھی پیوست کردی گئی تاکہ بوقت ضرورت دل اس کی مدد سے اپنا کام کرتا رہے۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ جدید علوم نے انسان کو یہ صلاحیت دے دی ہے کہ دل کی حرکت کے بند ہونے کے بعد اُسے دوبارہ فعال کرلے۔ لیکن آج سے ڈھائی سو سال پہلے کون جانتا تھا کہ دل کی حرکت کو کس طرح بحال کیا جاسکتا ہے ایک شخص حضرت عبدالقادر بیدل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر میں اس کا ساتھی بے جان ہو کے گرا اس کی موت سے سب سراسیمہ ہوگئے۔ بیدل اس کے پاس گئے اور اس کے سینے پر بہت زور سے ایک مکّہ مارا دل کی حرکت بحال ہوگئی اور وہ زندہ ہوگیا۔ یہ مومن کی فراست نہیں تو اور کیا ہے۔

اس برصغیر میں مشکل یہ ہے کہ لوگ بیدل کو صرف غالب کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اور وہ حوالہ بھی ایسا ہے جسے کچھ زیادہ قابل قدر نہیں قرار دیا جاسکتا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ غالب کے ہاں سب دور از کار استعارے، مغلق اصطلاحیں اور ناقابل فہم مضامین بیدل کے اثر سے آئے ہیں۔ اس کے برعکس کابل، سمرقند، بخارا اور تاشقند میں بیدل کے کلام کو وہ پذیرائی حاصل ہے جو یہاں غالب کے دیوان کے حصے میں آئی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دو نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے کس نے کس کو کتنا

چلے

ن پہنچایا ہے۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ حشر کے دن ہی ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار فرمایا ہے کہ جن چیزوں
تم اختلاف کرتے ہو اُن کا فیصلہ ہم کریں گے۔

میرا بالکل یہ ارادہ نہیں تھا کہ اس مضمون میں باباصاحب کی کسی کرامت کا کوئی ذکر کروں، لیکن مشکل یہ ہے کہ نظام
ت و ولایت اور کرامت لازم اور ملزوم ہوگئے ہیں۔ میرے نزدیک تو باباصاحب کی سب سے بڑی کرامت اُن کی شخصیت تھی
ی وجاہت میں جلال اور جمال کا عجب امتزاج تھا، ان کی نگاہوں میں انتہائی شفقت کے ساتھ غضب کی گہرائی تھی اور کبھی
ی شوخی کے کوندے کی لپک بھی نظر آتی تھی۔ ان کی مسکراہٹ میں نفسِ مطمئنہ اور ہر کس و ناکس کے لیے مرحمت کے ساتھ
ں نہایت لطیف مزاح کی جھلک تھی۔ یہ خوبیاں جس ذات میں جمع ہو جائیں وہ بجائے خود ایک کرامت ہوتی ہے۔ جوش صاحب
نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس چیز نے انھیں اپنی طرف کھینچا وہ باباصاحب کا چہرہ تھا۔ ان کے الفاظ ہیں "معنوی اور صوری
عتبار سے ایسے منور و مرتب چہرے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔" کراچی کے ایک تاجر جنھیں بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بغیر
سی مطلب کے باباصاحب کی محفلوں میں جایا کرتے تھے۔ جب رشید علی خاں صاحب نے جن کا تعارف میں بعد میں کراؤں گا اُن
سے پوچھا کہ جب تم باباصاحب کو بزرگ نہیں مانتے تو اتنے اشتیاق سے اُن کی محفل میں کیوں آتے ہو تو انھوں نے جواب دیا
صرف انھیں دیکھنے کے لیے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" میں اس مضمون میں ان لوگوں کا ذکر کروں گا جنھیں باباصاحب اچھے
لگتے تھے۔ یا جن پر اُن کی شخصیت نے کوئی خاص تاثر چھوڑا۔

یہ شاید ۱۹۷۲ء کی بات ہے میں ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو میری بیوی نے بتایا کہ ابن انشا چار دن
سے مسلسل آپ کے لیے فون کر رہے ہیں۔ دوسرے دن میں نے اُن سے پوچھا کیا بات ہے تو انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر محمد اجمل،
وفاقی وزارت تعلیم کے سیکریٹری باباذہین شاہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت تک اجمل صاحب سے واقف نہیں تھا۔
میں نے کہا باباصاحب کا دروازہ تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ جب چاہیں ان سے مل لیں۔ پتہ میں بتائے دیتا ہوں ابن انشا نے کہا
نہیں وہ پہلے آپ سے ملنا چاہتے ہیں بعد میں وہ آپ کے ساتھ باباصاحب کے پاس جائیں گے۔ چنانچہ ایک چائینیز ریسٹورنٹ میں
ہم جمع ہوئے ڈاکٹر اجمل سے مل کر ایسا لگا جیسے کوئی ہم مشرب و ہم راز مل گیا ہو۔ ان کے لہجے میں عجب مٹھاس ہے بہت دیر تک
ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن دس بجے ہم باباصاحب کے گھر جائیں۔ ڈاکٹر اجمل نیشنل میوزیم کے ریسٹ
ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے میں وہاں پہنچا تو وہ بہت سے ملنے والوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اہلِ
غرض وزارت تعلیم جیسے بے ضرر اور بے فیض ادارے کے سیکریٹری کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ بڑی مشکل سے آدھے گھنٹے
میں ڈاکٹر اجمل نے اپنے ملنے والوں کو نمٹایا جب ہم ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہونے لگے تو ابن انشا نے جو ڈاکٹر اجمل کی مصروفیات کے
انتظامات کے ذمہ دار تھے مجھ سے باباصاحب کے گھر کا ٹیلیفون نمبر مانگا تاکہ تاخیر کی صورت میں وہ یاددہانی کرا سکیں۔ موٹر میں
بیٹھتے ہوئے اجمل صاحب نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہروں گا۔ انھوں نے ابن
انشا کو یقین دلایا کہ وہ بارہ بجے تک ضرور واپس آجائیں گے۔ موٹر روانہ ہونے کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یہ تو آپ نے
اچھا کیا کہ ابن انشا کو باباصاحب کے گھر کا نمبر نہیں دیا لیکن یہ تو پوچھ لینا تھا کہ تاخیر کی صورت میں انھیں کہاں اطلاع دی
جائے۔ اجمل صاحب نے اطمینان سے جواب دیا اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

باباصاحب کے پاس ہم پہنچے تو وہ اس شفقت سے پیش آئے جیسے وہ ہمارے منتظر ہی تھے۔ انھوں نے اپنے دلنشین انداز

میں اجمل صاحب سے باتیں شروع کیں۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد میں نے ان پر ایک عجب انشراح کی کیفیت دیکھی۔ با صاحب کی گفتگو اتنی دلاویز اور نکتہ کُشا تھی کہ ڈاکٹر اجمل کو محویت میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا اس گفتگو کے دوران دو دفعہ چائے کا دور ہوا، چائے کے بعد بابا صاحب ہم دونوں کی طرف اپنی پان کی ڈبیا بڑھا دیتے تھے یہ تواضع ان کی خصوصی توجہ کی علامت تھی۔ ڈھائی بجے کے قریب دوپہر کا کھانا آ گیا کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد متواتر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جب چار بج گئے تو مجھے خیال آیا کہ اس طویل نشست سے بابا صاحب تھک گئے ہوں گے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا اب ہمیں اجازت لینی چاہیے۔ وہ بادلِ نخواستہ اُٹھے رخصت کرنے سے پہلے بابا صاحب نے حضرت بابا تاج الدّین کی زندگی پر اپنی کتاب "تاج الاولیا" ڈاکٹر اجمل کو دی اور ان کے تصرفات جاریہ کی طرف کچھ اشارہ بھی کیا۔

پانچ بجے کے قریب جب ہم واپس پہنچے تو بیچارے ابن انشا سراپا شکایت بنے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں نے آپ کے اعزاز میں ادیبوں اور صحافیوں کو مدعو کیا تھا۔ آپ کے انتظار میں لطیفوں اور چٹکلوں سے وقت گزارتا رہا جب تین بجے تک آپ نہیں آئے تو میں نے اُن سے معذرت کی کہ وہ اس وقت ایک روحانی دنیا میں ہیں وہاں سے انھیں واپس لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے ایک میٹھے سے تبسم اور کچھ شیریں کلمات سے ابن انشا سے معذرت کی۔ اس کے بعد کئی سال تک وہ کراچی آتے رہے، لیکن میں نے ابن انشا کو ان کے آس پاس کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک تجربہ ہی اُن کے لیے بہت کافی تھا۔ شاید وہ ایک دفعہ اپنے ساتھ ابن انشا کو بابا صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ بابا صاحب کی گفتگو پر ابن انشا کا تاثر جو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا وہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ہم جیسے ساحل کی موجوں سے کھیلنے والے بابا صاحب کی باتوں کی گہرائی کے کہاں متحمل ہو سکتے ہیں۔

ابن انشا کے جانے کے بعد ڈاکٹر اجمل کو یاد آیا کہ وہ اسلام آباد جانے کے لیے سیٹ بک کرانا بھول گئے تھے میں نے کہا اسلام آباد جانے کی کیا جلدی کل پھر بابا صاحب کے پاس چلیں گے۔ انھوں نے کہا کل مجھے ایک اہم میٹنگ کی صدارت کرنی ہے۔ اس میں شرکت ابن انشا کی دعوت پر شمولیت سے زیادہ ضروری ہے، لہٰذا ہم دونوں چائے پی کے پی آئی اے کے دفتر گئے اور بڑی مشکل سے ڈاکٹر اجمل کو رات کی پرواز میں ایک نشست ملی۔ اس طرح تقریباً ایک دن میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزار کے گھر واپس ہوا۔

تیسرے دن گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر اجمل کا فون آیا انھوں نے پوچھا کیا کر رہے ہیں میں نے کہا آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا میں کراچی واپس آ گیا ہوں اگر آپ مصروف نہ ہوں تو بابا صاحب کے ہاں چلیں اس قدر جلد اُن کی واپسی پر مجھے حیرت ہوئی۔ تھوڑی دیر میں کچھ ضروری کام نمٹا کے میں ریسٹ ہاؤس میں اُن کے پاس پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ رات وہ "تاج الاولیا" پڑھ رہے تھے تو بیداری اور غنودگی کے درمیان انھوں نے بابا تاج الدّین کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا انھوں نے ڈاکٹر اجمل سے کہا "چلو کراچی چلو" اور یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ صبح وہ دفتر پہنچے تو وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ نے انھیں بتایا کہ کراچی ایک اہم میٹنگ کے لیے جانا ہے ان کا ٹکٹ منگا لیا گیا ہے وہ فوراً کچھ ضروری سامان لے کے ایئر پورٹ پہنچیں اس زمانے میں دفتر سات بجے کھل جاتے تھے۔ ڈھائی گھنٹے میں وہ کراچی پہنچ گئے میٹنگ آدھے گھنٹے میں ختم ہو گئی اور وہ تمام دفتری مصروفیات سے فارغ ہو کر بابا صاحب کے یہاں جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ تفصیل بابا صاحب کو بتائی گئی تو وہ سن کے ایسے مسکرائے جیسے وہ جانتے ہوں کہ کیسے بابا تاج الدّین اپنے لوگوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے اپنے تصرف کا مظاہرہ کرتے

ہتے ہیں۔

اس کے بعد باباصاحب کی زندگی میں جب بھی اجمل صاحب کراچی آتے تو سب سے زیادہ اہم پروگرام ان کی خدمت میں حاضری دینے کا ہوتا تھا۔ تاج الاولیا پڑھنے کے بعد جب انھوں نے کتاب شہاب صاحب کو دی تو ان کا تاثر یہ تھا کہ اس میں ایسے حیرت انگیز واقعات ہیں کہ ان پہ یقین کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھیں سلسلۂ یوسفیہ تاجیہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ شریعت کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر لوگوں کو حق کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا تصوف کی تاریخ اور دائرہ طریقت میں کوئی جواز نہیں ہے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو انھوں نے مجھے فون کیا کہ مغرب کے بعد قصرِ ناز آجائیے گا۔ باباصاحب کے یہاں چلیں گے اور ساتھ قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد بھی ہوں گے۔ ہم باباصاحب کے یہاں پہنچے تو تھوڑی دیر میں منشی رضی الدّین قوال بھی آ گئے۔

وہاں جو باتیں ہوئیں اُن کو سمجھنے کے لیے پس منظر کے طور پر ایک اور محفل کا ذکر ناگزیر ہے۔ میری بہن رفیعہ کے بیٹے راشد ملک نے جو امریکہ میں بس گئے ہیں ایک ایرانی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ طے ہوا کہ نکاح طہران میں ہو۔ اور ولیمہ کراچی میں۔ نکاح کے بعد دولہا دلہن آئے تو ساتھ دلہن کے بھائی اور کچھ ایرانی خواتین بھی تھیں۔ ولیمے کے بعد خاندان میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میری بہن نے فرمائش کی کہ تم دعوت میں اپنے ہاں قوالی کا ضرور اہتمام کرنا۔ قوالی کا رنگ تو بابا صاحب کی موجودگی ہی سے جمتا تھا۔ چنانچہ میں نے باباصاحب کو مدعو کیا۔ پورا خاندان جمع ہو گیا لیکن باباصاحب کے آنے میں بہت دیر ہوئی۔ منشی رضی الدّین قوال اپنی پارٹی کے ساتھ بہت پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کو مہمانوں سے الگ ایک لان میں بٹھا دیا گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ ان قوالوں کو جن کے بغیر محفلِ سماع منعقد ہی نہیں ہو سکتی اس طرح نظرانداز کیا جائے۔ چنانچہ میزبانی کی ذمہ داری اوروں کے سپرد کر کے میں قوالوں کے پاس جا بیٹھا۔ رضی الدّین قوال سے میں نے کہا بزرگوں کو عارفانہ کلام سناتے ہوئے آپ کی عمر گزر گئی ہے۔ آپ نے بزرگوں کے تصرفات ضرور دیکھے ہوں گے، انھوں نے انکسار سے کہا ہم کہاں اس قابل کہ ان کے تصرفات دیکھیں۔ ہم تو صرف اپنے پیشے سے وابستگی کی وجہ سے ان کی محفل میں حاضری دیتے ہیں۔ میں نے اس عجز کو انکسار پہ محمول کرتے ہوئے جب اصرار کیا تو انھوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔

منشی رضی الدّین نے کہا کہ چند سال پہلے وہ اپنی پوری پارٹی کے ساتھ پنجاب کا دورہ کر رہے تھے۔ لاہور میں ان کا چھوٹا بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور یہ کہا کہ اگر رات گزر گئی تو شاید بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ منشی رضی الدّین رو رو کر رات بھر غوث الاعظم کے واسطے سے دعائیں کرتے رہے۔ جب ذرا دل ٹھہرا اور آنکھ اُٹھائی تو دیکھا کہ بابا ذہین شاہ آئے ہیں اور تخت پہ کھڑے ہیں۔ انھوں نے منشی رضی الدّین کو تخت پہ کھڑے ہونے کا اشارا کیا وہ حسبِ حکم اپنے بیمار بچے کو چھوڑ کے تخت پہ جا کھڑے ہوئے وہ تخت فضا میں پرواز کرتا ہوا غوث الاعظم کے دربار میں جا پہنچا، جہاں بڑی شان کے اولیا موجود تھے غوث الاعظم نے اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو بائیں جانب سے دائیں جانب اپنے چہرے کے سامنے کھینچا ایسا کرنا تھا کہ ان کا چہرہ باباتاج الدّین کے چہرے میں تبدیل ہو گیا۔ اور پھر دوبارہ ایسا کیا تو باباتاج الدّین کا چہرہ بابایوسف شاہ صاحب کے چہرے میں بدل گیا اور پھر ایک بار اور ایسا کیا تو بابا ذہین شاہ تاجی کا چہرہ سامنے تھا۔ یہ جلوہ دکھا کر غوث الاعظم نے دائیں جانب سے بائیں جانب کی طرف اپنا ہاتھ کھینچا تو بابا ذہین شاہ صاحب کا چہرہ بابایوسف شاہ کے چہرے میں ان کا چہرہ باباتاج الدّین کے چہرے میں تبدیل ہو گیا اور آخری دفعہ ہاتھ کھینچنے پر غوث الاعظم کا چہرہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اس کے بعد غوث الاعظم نے

اشارے سے واپس جانے کی اجازت دی تخت پرواز کرتا ہوا لاہور واپس آگیا۔ رضی الدین نیچے اتر گئے اسی وقت سے بچے کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہوگئی اور دو تین دن میں وہ بالکل ٹھیک ہوگیا۔

یہ عجیب و غریب واقعہ سن کر میں واپس اپنے مہمانوں میں آگیا میں دلہن کے ایرانی بھائی کے پاس بیٹھا۔ اس وقت اُن کی عمر شاید پینتالیس سال کی ہوگی بہت خوبرو آدمی ہیں۔ طہران میں ان کا بہت اچھا کاروبار ہے۔ قیمتی مغربی لباس میں وہ سفارت نمائندہ لگ رہے تھے ہم باتیں کر رہے تھے کہ باباصاحب آگئے ہم سب لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باباصاحب کے لیے نشست انتظام برآمدے میں کیا گیا تھا جو لان سے دو فٹ اونچا تھا۔ یہ انتظام باباصاحب کو شبنم اور کراچی کی تیز ہوا سے بچانے کے لیے تھا۔ باباصاحب کو دیکھتے ہی ان کی وجاہت سے متاثر ہو کر ہمارے ایرانی مہمان نے حافظ کا یہ مصرعہ پڑھا:

ستارہٗ بدرخشید و ماہِ مجلس شد

اک ستارہ چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مجلس پر چاند کی طرح دمکنے لگا

میں یہ مصرعہ سن کر حیران رہ گیا ہمارے ملک میں تو کسی کامیاب کاروباری آدمی سے ایسے ارفع شعری ذوق کی توقع نہیں کی جا سکتی یہ وہی غزل ہے جس کے ابتدائی اشعار حافظ نے نعت میں کہے ہیں اور جس کے ایک شعر سے متاثر ہو کے جگر صاحب اپنی ناراضگی بھول گئے تھے اور سول سروس اکیڈمی کی تقریب میں شرکت پہ آمادہ ہوگئے تھے۔ وہ شعر غضب کا ہے سن لیجیے:

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت

بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

ہمارے محبوب کا کرشمہ تو دیکھو کہ نہ وہ کبھی مدرسے گیا، نہ کسی سے اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ بس اپنی ایک ادائے خاص ارباب علم و دانش کا معلم بن گیا۔

نورالحسن جعفری صاحب کی تحریک پر جب میں نے نیپا میں ایک منفرد محفلِ نعت کا اہتمام کیا تھا جس میں اہلِ ذ حضرات کو اپنے پسندیدہ نعتیہ اشعار پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی تو پروفیسر کرار حسین صاحب نے اسی غزل کے اشعا انتخاب کیا تھا اور ان کی تقریر اس محفل کا حاصل تھی۔ ہمارے غالب شناس دوست نے اس محفل میں غالب سے اپنی محبت کا اَ عجیب ثبوت دیا۔ اب وہ غالب سے گزر کر غالب کو چاہنے والوں کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ انھوں نے یہ شعر منتخب کیا وہ ہرگوپال تفتہ کا تھا جو انھوں نے اس طرح سنایا:

چوں بہ محشر عرصۂ محشر تپید

تفتہ گریاں آمد و دامانِ پیغمبر کشید

اب جو میں نے یہ شعر لکھا تو کھلا کہ دونوں مصرعوں کی بحر مختلف ہے، یا تو پہلے مصرعے میں فاعلاتن کا ٹکڑا گر گیا ہے، یا دوسر مصرعے میں اس کا اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن جب حضرت غالب شناس نے یہ شعر پڑھا تو کسی کو گمان تک نہ گزرا کہ دونوں مصرعے متوازن ہیں۔ وہ جس اعتماد اور گھن گرج سے شعر سناتے ہیں اس کے پیش نظر کون شک کر سکتا ہے کہ شعر میں کوئی سقم ہوگا۔

اب میں پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ اپنے ایرانی مہمان سے حافظ کا مصرعہ سن کر میں باباصاحب کے پاس گیا دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ کھانے کے بعد محفلِ سماع کا آغاز ہوا۔ میں نے دیوانِ حافظ سے "ستارہٗ بدرخشید" والی غزل کے پانچ منشی رضی الدین کو دے دیے۔ انھوں نے بڑی خوبی سے اس غزل کو سنایا وہ ایرانی لہجے سے بھی واقف ہیں۔ وہ شعر کو پہلے تح

اللفظ پڑھتے اور پھر قوالی کے انداز میں سناتے۔ ہمارے ایرانی مہمان اس غزل سے بہت لطف اندوز ہوئے ہمارے خاندان میں مردوں سے زیادہ خواتین کو سماع کا ذوق ہے چنانچہ باباصاحب نے خواتین کی فرمائش کے مطابق حضرت امیر خسرو کا ہندی کلام سنوایا جب رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب سب کی فرمائشیں ختم ہوگئیں تو میں نے رضی الدّین سے کہا اب آپ اپنی پسند کی کوئی چیز سنائیے۔ انھوں نے جو چیز سنائی وہ باباصاحب نے بھی پہلے نہیں سنی تھی۔ منشی رضی الدّین نے اس خوبصورتی سے ہر بول کو ادا کیا کہ یہ آخری چیز اس نشست کا حاصل ہوگئی:

موسے بول نہ بول۔ میری سُن یا نہ سُن
میں تو تو ہے نہ چھوڑوں گی اے سانورے

منشی رضی الدّین آدھے گھنٹے تک یہ چیز سناتے رہے، اور اسی پر محفل کا اختتام ہوا۔

اس محفل کے چند دن بعد کی بات ہے کہ ڈاکٹر اجمل، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد باباصاحب کے پاس گئے تھے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ہماری موجودگی میں منشی رضی الدّین آگئے۔ ورنہ میں نے کبھی کسی قوال کو محفل سماع کے علاوہ باباصاحب کے پاس آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ منشی رضی الدّین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ غوث الاعظم کے دربار میں ان کی حاضری کے واقعے کی تصدیق کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ باباصاحب سے میں نے کہا کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی صحت یابی کے سلسلے میں ایک عجیب وغریب واقعہ سنایا ہے، آپ کا چونکہ اس سے خاص تعلق ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے اُسے دہرایا جائے۔ باباصاحب نے سکوت فرمایا شاید یہ طے کرنے کے لیے کہ اجازت دیں یا ممانعت کریں۔ اس سکوت کو منشی رضی الدّین نے اجازت سمجھ کے وہ واقعہ شروع کردیا اور من وعن اسی طرح دہرایا۔ خاص طور پر ان کا اپنے چہرے کے سامنے ہاتھ کو کھینچ کر یہ کہنا کہ جب غوث الاعظم نے یوں کیا تو اُن کا چہرہ باباتاج الدّین کے چہرے میں تبدیل ہوگیا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ واقعہ سن کر باباصاحب نے کچھ نہیں کہا صرف تبسم فرمایا اور اس طرح منشی رضی الدّین کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ اس کے بعد کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب منشی رضی الدّین نے جانے کی اجازت طلب کی تو میں نے کہا "باباصاحب ان سے وہ چیز تو سنوا دیجیے مو سے بول نہ بول۔ میری سن یا نہ سن" باباصاحب کے اشارے پر منشی رضی الدّین نے بغیر کسی ساز اور سنگت کے وہ چیز سنائی۔ جب یہ بول ادا کیے "نگر کے لوگ لگائی ہے ہم کو۔ دھرت نام تو دھرو نام رے" تو قدرت اللہ شہاب نے زمانے کی ملامت سے بے نیازی کے انداز میں اپنے ہاتھ دو تین بار ہلا کر خاموش داد دی اور ان بولوں پر بھی اُن کی داد کا وہی انداز تھا۔

رہی لاج شرم کی بات کہاں
جب پریم کے پھاندے دیو پاؤں رے

یہ چیز مکمل کر کے رضی الدّین رخصت ہوگئے۔ لیکن اُن کے اس تاثر نے شاید شہاب صاحب کی طبیعت پر احتساب کی گرفت کو نرم کردیا تھا اور وہ اہلِ ملامت کے طریقے کو اپنانے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ اشفاق احمد صاحب کو کہیں جانا تھا، وہ جلدی رخصت ہوگئے۔ ہم لوگ دیر تک باباصاحب کے پاس ٹھہرے اور کھانا کھا کے وہاں سے اٹھے۔ اس کے بعد میں نے قدرت اللہ شہاب کو باباصاحب کے پاس کبھی نہیں دیکھا۔

چھ مہینے پہلے جب میں اشفاق احمد سے لاہور میں ملا تو اُن سے یہ معلوم کر کے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ شہاب صاحب جب کراچی جاتے تو ضرور باباصاحب سے ملتے تھے، اور اشفاق صاحب کی اس شکایت کے باوجود کہ اگر وہاں جانا تھا تو مجھے کیوں نہ لے گئے

وہ انھیں اپنے ساتھ کبھی نہیں لے گئے۔ ہمیشہ تنہائی ہی میں ملاقات کی نہ جانے کیا راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں۔ ممکن ہے منشی رضی الدین کو شہاب صاحب کی موجودگی میں باباصاحب کے یہاں اسی لیے بھیجا گیا ہو کہ ان کی زبانی غوث الاعظم کے دربار میں تاجیہ سلسلے کے بزرگوں کے تقرب کا حال سن کر اہل ملامت سے اُن کی مغائیرت دور ہو جائے۔ باباصاحب نے ان کی شرعی وضعداری کا کیسا بھرم رکھا کہ مجھے بھی نہیں بتایا کہ تنہائی میں وہ ملامت کے لیے آتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل کے ذکر میں میرا یہ مضمون پورا ہو گیا۔ اگلی قسط میں کرار حسین صاحب، سلیم احمد اور کچھ اور حضرات کا ذکر ہوگا، شاید میرے کرم فرما حضرت کا بھی مختصر سا ذکر خیر ہو۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا"

قومی زبان (۵۱) جولائی ۱۹۹۳ء

مختار زمن

چین میں بچوں کا ادب

چین میں بچوں کے ادب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ چینی عوام اور سیاسی لیڈر بچوں کو قوم کی بہت بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ محض نام کے لیے اور تقریروں کا موضوع بنانے کے لیے نہیں بلکہ واقعتاً دل سے۔ اسی لیے بچوں کی کتابوں اور رسالوں پر زور دیتے ہیں۔ میں اپنی صحافیانہ زندگی میں کئی بار چین گیا ہوں لیکن ادیب کی حیثیت سے صرف ایک ہی بار حال میں یہ فرض انجام دیا اور وہ بڑا اہم ثابت ہوا۔ بیجنگ، کینٹن، نان کینگ، وغیرہ شہروں میں دوسرے لکھنے والوں کے علاوہ بچوں کے ادیبوں سے خاص طور پر طویل اور کارآمد ملاقاتیں ہوئیں۔ "بچوں کے ادیب" میں نے جان بوجھ کر کہا ہے اس لیے کہ بچوں کے لیے لکھنا جزوقتی کام نہیں ہے کہ بڑوں کے لیے نامور ادیب لکھ ہی رہے ہیں۔ وقت ملا تو بچوں کے لیے بھی دو چار نظمیں لکھ دیں۔ یہ بھی ہوتا ہوگا۔ لیکن ادیبوں کا ایک بہت بڑا طبقہ صرف بچوں کے لیے لکھتا ہے۔ خود اس کے پاس وقت نہیں ہے کہ یہ بڑوں کی طرف توجہ کرے۔

بچوں کے ادیب لی چھوچھن صاحب نے ہمیں بتایا کہ بچوں کے لیے ادب تصنیف کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کام انجام دینے کے لیے ہر عمر کے بچوں کی ان کی استعداد کے مطابق درجہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ڈھائی سال یا تین سال کے بچے تو صرف تصویروں سے خوش ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ کچی عمر سے ہی کتابوں کی ورق گردانی میں دل چسپی لینے لگیں۔ اس کے بعد ہماری زبان میں یہ سمجھیے کہ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول آتے ہیں۔ ان اسکولوں میں اوسط کے لحاظ سے مختلف بچے پڑھتے ہیں جو لوگ بچوں کے لیے لکھتے ہیں وہ بچوں کے پاس ان اسکولوں میں جاکر بیٹھتے ہیں۔ پڑھائی کے وقفے میں وہ بچوں سے ملتے ہیں ان سے باتیں کرتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ خود بچوں کو باتیں کرنے پر اکساتے اور دل بڑھاتے ہیں۔ اس طرح لکھنے کے لیے ان کے پاس ایک قسم کا چربہ یا فریم ورک تیار ہو جاتا ہے، چھوٹی عمر کے بچے صرف چند درجن الفاظ جانتے ہیں۔ اس سے بڑی عمر کے بچوں کا ذخیرہ الفاظ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ اور آگے بڑھے تو مزید الفاظ اس فریم میں فٹ ہو گئے مثلاً پانچ یا سات سال کی عمر یا آٹھ اور بارہ برس سے اوپر کی عمر ان کی درجہ وار حد بندیاں ہیں الفاظ کے علاوہ یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ عموماً بچے کس طرح سوچتے ہیں؟ کن باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں؟ ان کا مختلف سانحوں اور حادثوں پر کیا ردعمل ہوتا ہے، اور وہ اپنے ردعمل کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں؟ کون سے الفاظ استعمال کرتے ہیں؟ گویا لکھنے والا ایک طرح سے بچوں کی نفسیات کا ماہر بھی ہوتا ہے۔ ہمیں مختلف درجوں کی کتابیں اور رسالے دکھلائے گئے۔ پانچویں اور چھٹی جماعت کے لیے متعدد کہانیاں اور مضامین لکھے

گئے ان کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے: "بچپن کی یاد"، "میٹھا انگور"، "ہرن کا قصہ" وغیرہ بچوں کے ادیب وہ الفاظ نوٹ کرتے جاتے ہیں جو ایک خاص عمر کے بچے بولتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مختلف درجوں کے بچوں کے پاس ذخیرہ الفاظ کتنا ہے۔ بس اگر اُس مخصوص درجے کے لیے کتاب یا مضمون لکھنا ہے تو وہی الفاظ استعمال کرنے چاہیں جو اس عمر کے بچے کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں۔ ہاں دو چار لفظ نئے ڈال دیے جائیں تو ذخیرہ الفاظ میں خفیف سا اضافہ بھی ہوجائے گا مگر اس سے بچہ گھبرائے گا نہیں بلکہ بڑی دل چسپی سے مضمون پڑھے گا...... ہمیں بھی بتایا گیا کہ بچوں کے ادب میں تصویریں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اس کی خصوصی تربیت استادوں اور استانیوں کو دی جاتی ہے...... ہر صوبے میں بچوں کے پبلشنگ ہاؤس موجود ہیں لی چھوچھن صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ بچے ہماری بنیاد بھی ہیں اور ہمارا مستقبل بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بچوں کا اچھا ادب نو عمر دماغ پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ لی چھوچھن صاحب پہلے فوج میں ملازم تھے پھر فوج سے ریٹائر ہوگئے اور بچوں کے رسالہ "چھوٹا مالک" (یعنی بچہ) نکالتے ہیں انھوں نے خوش ہو کر بتایا کہ مجھے بہت سے لوگ محض اس لیے جانتے ہیں کہ جب وہ چھوٹے تھے تو میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتے تھے.......... چین جا کر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضروری نہیں صرف بڑے ہی آدمیوں پر مضامین لکھے جائیں۔ معمولی آدمی اور عورتیں بھی اگر کام کریں تو ان پر مضمون لکھنا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً مجھے ایک مضمون دکھلایا گیا جو ایک ملنسار لائق فایق اور محنتی جاپانی خاتون پر تھا...... مجھے اس وقت مولوی عبدالحق مرحوم یاد آتے انھوں نے "نام دیو مالی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ نام دیو کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ ایک معمولی سا مالی تھا لیکن اپنے شوق سے، خوش اسلوبی اور ایمانداری سے کام انجام دیتا تھا اس لیے مولوی صاحب نے اسے زندہ جاوید کردیا.......... یہی چین کا طریق کار ہے انقلاب چین کے بعد سے ادب اور ادیب جس جس دور سے گزرے ہیں وہ ایک الگ مسئلہ ہے اور میں نے اس موضوع پر لکھا بھی ہے لیکن یہ بڑی بڑی باتیں ہیں اس وقت ضرورت تو بچوں کی طرف توجہ کرنے کی ہے اور چین اس سلسلے میں ہمیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ شاعری ہمارے کلچر کا حصہ سہی، لیکن کیا کوئی ادیب اور شاعر، معدودے چند حضرات کو چھوڑ کر، بچوں کی طرف توجہ دے رہا ہے؟ یہ ہمارے بچے ہیں اور میں چینیوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ وہی ہماری بنیاد اور ہمارا مستقبل ہیں "ہمدرد فاؤنڈیشن" قابل ستائش ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں چھاپ کر اور رسالہ جاری کر کے اس نے ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا لیکن نہ صرف اس کام کی توسیع کی ضرورت ہے بلکہ اسے سائنسی لائن پر چلانا ہے...... میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں ادیبوں کے ایسوسی ایشن کے صدر مونگ سان تھائی صاحب نے بتایا کہ بچوں کا ایک رسالہ "قہقہہ" نکلتا ہے اس کے پڑھنے والے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اس رسالے پر کافی محنت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہماری رائے میں بچوں کو ہنستے رہنا چاہیے" یہ نکتہ اہم ہے بچوں کو خوش و خرم رکھنا اور ان کے دل و دماغ کے لیے فرحت و انبساط پیدا کرنے والا ادب پیدا کرنا بھی ہمارا ہی فرض ہے وہ بچے جو ہر وقت منہ لٹکائے اور رونی صورت بنائے بیٹھے رہتے ہیں اور اپنی صحت اور خوشی کو فروع ہی سے قربان کردیتے ہیں اچھے شہری نہیں بن سکتے یا بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے میں بھی چین سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے ہمارے بڑے مثلاً شیخ سعدی، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، صوفی تبسم وغیرہ اس نکتے کو سمجھتے تھے اور انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ بڑے اور بچے سب خوش رہیں، ہنستے گھر بستے ہیں۔ دنیا میں دکھ درد، رنج و غم، لڑائی جھگڑا بہت ہے بچے جتنی دیر اس سے دور رہیں ان کے لیے اچھا ہی ہوگا آئندہ زندگی میں تو انھیں ان مسائل کا سامنا کرنا ہی ہے تو کیوں نہ ہنسی خوشی وہ اپنا بچپن گزاریں تاکہ زندگی کے مسائل کو وہ حوصلے اور تنومندی سے جھیل سکیں۔

سارہ فاروقی

شبلی کا فلسفیانہ کام

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے تیرھویں صدی خاص اہمیت رکھتی ہے اس صدی میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز ہوا اور اسی زوال کے سبب مسلمانوں میں بیداری کا دور شروع ہوا۔ چنانچہ اس دور میں مذہبی احیا اور معاشرتی اصلاح کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ مسلمان علماء نے جب اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو لازماً ان کے ہاں فلسفیانہ خیالات کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور وہ اپنے خیالات عوام تک پہنچانے اور عوام کے ذہنوں میں بسے ہوئے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے فلسفیانہ طرز استدلال استعمال کرنے لگے۔

اس سلسلے میں مجدد الف ثانی کی اصلاحی کوششوں اور کارناموں سے جن کا تعلق علم و عمل اور اخلاص سے ہے۔ نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ تمام اسلامی ممالک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مجدد الف ثانی کے حقیقی تجدیدی کارناموں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی فنی نکتہ طرازیوں اور شریعت و طریقت اور حقیقت کی صوفیانہ نکتہ آرائیوں نے انھیں مجدد الف ثانی کے لقب سے نوازا۔

مجدد الف ثانی ایک ایسے دور میں اسلام کے حامی بن کر کھڑے ہوئے جب بادشاہِ وقت اکبر بذات خود اسلام کی جڑوں کو کاٹنے میں پیش پیش تھا۔ انھوں نے اسلام کو محفوظ رکھنے کے لیے تحریر و تقریر دونوں طریقوں سے کام کیا۔ ان کی تصانیف میں اثبات النبوۃ" عربی رسالہ ہے۔ یہ ان کی نہایت جامع اور تحقیقی مباحث پر مبنی تصنیف ہے۔ کیونکہ اس وقت اکبری فتنہ مسئلہ نبوت اور رسالت میں شک و شبہات پیدا کر رہا تھا اس طرح رسالہ تہلیلیہ جو عربی زبان میں ہے کلمہ طیبہ سے متعلق تحقیق پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ بھی اس دور میں تصنیف کیا گیا جب کلمہ طیبہ سے جزو رسالت حذف کر کے اکبر خلیفہ اللہ درج کیا جا رہا تھا۔ پھر رسالہ "معارف الدینیہ" ہے یہ فارسی زبان میں ہے اور مجدد الف ثانی کے معارف خاص اور سلوک و طریقت کے اہم مباحث پر مشتمل ہے اس طرح ان کی اور تصانیف ہیں جو اسلام کو بچانے کے لیے لکھی گئیں۔

مجدد الف ثانی کی طرح شاہ ولی اللہ بھی عام مسلمانوں تک اسلامی تعلیمات پہنچانے میں کوشاں رہے۔ شبلی "الکلام" میں لکھتے ہیں "ابن رشد اور ابن تیمیہ کے بعد بلکہ خود انھی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا اس کے بعد سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ ہر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا مقصود تھا کہ آخیر زمانے جب کہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے

ماند پڑ گئے (۱)

شاہ ولی اللہ اسلام کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کرنے اور معقول و منقول میں تطبیق کرنے میں ایک جداگانہ مقام کے حامل رہے ہیں انھوں نے اپنے عہد میں مدون ہونے والے علوم و فنون کا احیاء کیا انھوں نے انھی مسائل کو حل نہیں کیا جن میں مسلمان الجھ کر رہ گئے تھے بلکہ ایک علم کا دوسرے علم سے، اہل علم کے ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے تضاد و تنازع کو بھی سلجھایا وہ ایک حکیم و فلسفی تھے (۲) اور عمرانیات و نفسیات پر بحث کرتے ہوئے وہ خالص وجودی حکیم اور فلسفہ تجربیت کے علمبردار بن جاتے ہیں (۳)

سر سید کا شمار بھی برصغیر کے چند نمایاں مسلم مفکرین و مجاہدین آزادی میں ہونا چاہیے جنھوں نے نہ صرف منزل کی نشاندہی کی بلکہ انگریزوں کی تہذیب کا مطالعہ کر کے ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو وقت و حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی (۴) اور مسلمانوں کو ترقی کے لیے دوسرے علوم کے ساتھ فلسفہ کی اہمیت کو بھی واضح کیا پھر وقت کی ضرورت کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کی اور اس طرح جدید علم الکلام کے بانی کہلائے۔

برصغیر کے مسلمانوں کو درپیش خطرات جو کہ مشنریوں، یورپ و ہندوستان میں پھیلنے والے خیالات (جو اسلام کو عقل کا دشمن اور انسانی ترقی میں مانع قرار دیتے تھے) اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں پرورش پانے والے شکوک و شبہات پر مشتمل تھے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے سر سید کی مذہبی تصانیف نے نمایاں کردار ادا کیا سر سید نے اسلام کی ایسی تفسیر کی کہ جدید فلسفے کی رو سے اس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ سر سید نے "تبئین الکلام" کی تفسیر اس طرح کی کہ عیسائیت کے صرف وہی عقائد اند ہوں جنھیں اسلام صحیح سمجھتا ہے اسی طرح رسالہ "ابطال" میں ثابت کیا کہ اسلام غلاموں سے نیک سلوک کی تلقین کرتا ہے اور "خطبات احمدیہ" میں ولیم میور کے اعتراضات کے جواب دیے اور ان سب سے بڑھ کر سر سید نے "تفسیر القرآن" میں قرآن کے مندرجات کو عقل و سائنس کے مطابق درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور قرآن کے درمیان اختلاف معلوم ہوا، وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل و تشریح کرنے کی کوشش کی (۵)

ان مذہبی بحثوں میں سر سید کے ساتھ مولوی چراغ علی بھی شریک تھے جنھوں نے اپنے افکار کو عالمانہ پختگی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ سر سید کی طرح اسلامی قانون کے چار بڑے منابع وحی، حدیث، اجماع اور اجتہاد کے حقوق و طریقوں کی جانب متوجہ ہوئے ان کے متعلق سر سید نے کہا تھا:

.... مذہبِ اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے "(۶) ان کے مضامین "رسائل چراغ علی" میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دو انگریزی کتب تصنیف کیں جو اردو میں "تحقیق جہاد" اور "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے نام سے ترجمہ ہوئیں۔ (۷)

جدید و قدیم فلسفہ پر شبلی کی نظر ان کے معاصرین میں سب سے زیادہ وسیع تھی۔ اسلام پر یورپ کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جس تلاش و تحقیق، وسیع النظری اور طرز استدلال کی ضرورت تھی، اس کی مثال شبلی کے علاوہ دوسری نہیں ملتی (۸) انھوں نے مغربی علوم و فنون، ایجادات و انکشافات، تحقیقات اور فلسفے اپنی تحریروں سے ایسی دیوار کھڑی کی جسے کوئی نہ ہلا سکا۔ (۹)

شبلی نے اسلامی تاریخ پر خصوصی توجہ دی اور چند کلیدی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا۔ شبلی جدید مسلم ہند کے پہلے مؤرخ

ہیں جنھوں نے مغربی علم و فضل کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور اسلام کی ثقافتی و مذہبی سرچشموں کے متعلق تحقیق و تجسس اور تلاش و جمع اور انھیں مرتب کیا۔ انھوں نے مخطوطات کی تدوین کی اور مطالعہ اسلام کے لیے تاریخی و سائنٹیفک تناظر قائم کرنے کی کوشش کی اسی طرح وہ "علم کلام" کو صحیح مواد کا سرچشمہ اور ترقی پذیر قدامت پسند عقلیت کے لیے طاقتور ذریعہ سمجھتے تھے۔ (۱۰) شبلی کے اساتذہ کرام میں فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی جیسے جیّد عالم تھے شبلی میں فلسفہ، منطق اور علم ہندسہ کا شوق انھی اساتذہ کے طفیل پیدا ہوا۔ شبلی میں مناظرانہ رنگ، طرزِ استدلال عملی دلائل جیسے جوہر بھی انھی اساتذہ کی دین ہیں۔ (۱۱)

شبلی کو وہی خطرات درپیش تھے جن سے سرسیّد نبرد آزما تھے۔ اس وقت عیسائی مبلغین اسلام اور شارع اسلام کو فلسفہ و منطق کے ذریعہ مفلوج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمان تلوار سے زیر نہیں آسکتے اسی لیے انھوں نے فلسفہ کی آڑلی اور فلسفہ ہی کو پناہ گاہ بنا کر علم و فکر کے ذریعہ اسلام پر حملے کرنے لگے۔ مسلمانوں کے نزدیک بہترین دفاعی حربہ یہی تھا کہ وہ فلسفہ کو فلسفہ کی ڈھال بنا کر فلسفہ ہی کے ذریعہ فلسفہ کو رد کریں۔ (۱۲) زمانے کی بدلتی روش نئے علم کلام پر زور دے رہی تھی شبلی نے سرسیّد کی طرح اس وقت کارفرما قدیم و جدید نظریات کے درمیان راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور اسلاف کی تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے اصولِ علم کلام مرتب کیے اور علم کلام کے عقائد و مسائل پر اصول و قوانین مرتب کر کے اسلام کے مہتم بالشان مسائل کو سلجھانے کی حتی المقدور جدوجہد کی اور فلسفہ و منطق اور معقولات کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تصانیف پیش کیں۔ (۱۳) انھوں نے ندوۃ کے ایک اجلاس میں علما کو خبردار کیا تھا کہ وہ اس کفر و الحاد کو روکیں جو فلسفہ کی کمین گاہوں سے نکل کر ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ (۱۴)

بلاشبہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ "الکلام" ہی ہے۔ شبلی کا خیال تھا کہ وہ اس کام کو کافی پھیلا کر ضخامت کے ساتھ پیش کریں گے لیکن دو جلدوں ہی سے ان کا مقصد پورا ہو گیا تو انھوں نے اس کی تکمیل کی ضرورت نہیں سمجھی۔ (۱۵) انھوں نے غزالی و رازی کے افکار سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن انھوں نے اس تصنیف سے جس "علم الکلام" کی بنیاد رکھی اس سے ان تمام مباحث کی نشاندہی ہوتی ہے جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے تھے۔ چنانچہ شبلی نے عقلی دلیلوں سے اثباتی جواز پیدا کر کے تمام مسلمانوں کو گمراہ ہونے سے بچالیا۔ فلسفہ و منطق سے متعلق ہندوستان میں شبلی کی ٹکر کا کوئی دوسرا متکلم پیدا نہیں ہوا۔ (۱۶) "علم الکلام" اور "الکلام" کی بدولت اسلام کے بنیادی عقائد کو علم و فکر اور عقلیت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

شبلی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "علم الکلام" کا وہ حصہ جو دسویں صدی ہجری تک مؤثر رہا ہے اسے آج بھی ویسے ہی اثر انداز ہونا چاہیے۔ اس وقت سے انھوں نے "علم الکلام" کے کلاسیکی تصورات کو اُس دور اور وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید و قابلِ فہم اصطلاحات میں از سرِ نو بیان کرنے کی کوشش کی یہ حقیقت ہے کہ اس وقت "علم الکلام" کی ضرورت صرف یونانی فلسفہ کی روک تھام اور چیلنج قبول کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ مختلف مکاتبِ اسلامی کے باہمی اختلافات اور تنازعات کو حل کرنے کی بھی ایک کوشش تھی۔ (۱۷) یہ اور بات ہے کہ شبلی کی اصل دلچسپی پہلی وجہ سے تھی کیوں کہ اس میں مطالعہ کا وسیع میدان موجود تھا اور اس میں دورِ جدید کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت تھی۔ (۱۸)

شبلی نے "علم الکلام" کی تاریخ اور عہد بہ عہد ترقی کی مکمل داستان کے بعد "الکلام" لکھنا شروع کی اس کتاب میں نئے نظریات پر بڑے شگفتہ انداز میں فلسفیانہ دلائل سے بحث کی گئی ہے شبلی نے توحید، وحی، نبوت، قیامت، عالم، عقائد، صفات

باری تعالیٰ، ملائکہ، روح اور اسی طرح کے دوسرے موضوعات و مسائل پر نہایت مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

شبلی نے "علم الکلام" پر کام کرنا شروع کیا تو اچھا خاصا مواد امام غزالی سے متعلق جمع ہو گیا انھوں نے اس مواد کو "الغزالی" کے نام سے پیش کر دیا۔ اس میں غزالی کے حالات و واقعات کے ساتھ ایک بڑا حصّہ فلسفہ کی بحث پر مشتمل ہے لہٰذا یہ کتاب ایک طرح سے "علم الکلام" ہی میں شمار کی جاسکتی ہے۔

غزالی کے زمانے میں فضل و کمال کے اظہار کا جو طریقہ تھا، علمی مناظرات کو اس میں اولیت حاصل تھی۔ درباروں میں علماء و فضلاء کا اجتماع ہوتا تھا اور علمی مسائل پر مناظرانہ گفتگوئیں ہوتی تھیں جو شخص زور تقریر سے حریف پر حاوی آجاتا تھا وہی ممتاز سمجھا جاتا تھا مناظروں کو اتنی وسعت حاصل ہوئی کہ بڑے بڑے شہروں میں مناظروں کی مجلسیں قائم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ مناظرہ خود ایک فن بن گیا اور یہیں سے مسلمانوں میں فلسفیانہ مباحث کا رواج ہوا۔ (۱۹)

اس وقت چار فرقے موجود تھے متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ اور صوفیہ شبلی نے تمام فرقوں پر تفصیلی روشنی ڈالی (۲۰) اور فلاسفہ کے متعلق لکھا "فلسفہ کا جس قدر حصّہ یقینی ہے یعنی ریاضیات وغیرہ اس کو مذہب سے تعلق نہیں اور جو حصّہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے یعنی الٰہیات وغیرہ وہ یقینی نہیں۔" (۲۱)

"الغزالی" میں غزالی کی تصانیف پر مفصل بحث ہے اور غزالی کے فلسفیانہ نکات پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے اس سلسلے میں فلسفۂ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ (۲۲)

اسلام میں اخلاق کا تصور ابتدا ہی سے تھا لیکن فلسفیانہ طرز پر اس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب یونانی علوم و فنون کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ ارسطو نے علم اخلاق پر بارہ مقالوں پر مشتمل دو کتابیں تحریر کیں۔ فرریوس نے ان کی تفسیریں کیں۔ حنین بن اسحٰق نے عربی میں ان کا ترجمہ کیا۔ ارسطو کی ایک اور کتاب "فضائلِ نفس" کا ترجمہ ابو عثمان دمشقی نے عربی زبان میں کیا۔ (۲۳) فلسفہ اخلاق پر مذہبی طرز کی ایک اور کتاب "قوت القلوب" کا ذکر بھی آتا ہے شبلی کا خیال ہے کہ اس میں فلسفہ کی جھلک باوجود اخلاق کے تمام مباحث کے بہت کم ہے۔ (۲۴)

اس زمانے میں فنِ اخلاق کی تصانیف کے مقبول نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ فلسفیانہ انداز کی حامل کتب مشکل پسند ہوتی تھیں اور مذہبی پیرایہ نہیں رکھتی تھیں پھر ان میں مسائل اسلام سرے سے مفقود تھے۔ (۲۵)

غزالی نے تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے "احیاء العلوم" لکھی جس کے متعلق ہنری لوئیس نے لکھا کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانے میں "احیاء العلوم" کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہو چکا ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ ڈیکارٹ نے "احیاء العلوم" کو چُرالیا ہے۔ (۲٦) شبلی نے "احیاء العلوم" پر تفصیلی بحث کی ہے۔ غزالی نے فلسفہ اخلاق کے ابتدائی اصول یونان سے لیے ہیں شبلی کی تحقیقات کے مطابق ابنِ مسکویہ کی کتاب "تہذیبِ الاخلاق" حکمائے یونان کے فلسفہ اخلاق کا خلاصہ ہے غزالی نے اس کو پیشِ نظر رکھا لیکن آمیزش کے باوجود غزالی نے اپنے طرزِ ادا کے ساتھ نفسِ فن کو اس قدر وسعت دی کہ یونانیوں کا فلسفہ اخلاق اس کے مقابلے میں قطرہ و گوہر کی نسبت رکھتا ہے۔ (۲۷) شبلی نے فلسفہ اخلاق پر روشنی ڈالنے کے بعد اس کی غرض و غایت واضح کی ہے۔

شبلی ثابت کرتے ہیں کہ شہرت کے لحاظ سے "علم الکلام" کو غزالی سے وہی نسبت ہے جو ارسطو کو منطق سے۔ ابنِ خلدون کا خیال ہے کہ غزالی ہی نے سب سے پہلے اس فن کو فلسفیانہ طرز پر مرتب کیا۔ (۲۸) ابتدا میں "علم الکلام" کے دو طریقے رائج تھے۔ عقلی اور نقلی۔ نقلی "علم الکلام" خود اسلامی فرقوں جبریہ، قدریہ، معتزلہ وغیرہ کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا۔ مقدمہ تاریخ میں ابن

خلدون نے جس "علم الکلام" کا ذکر کیا ہے وہ یہی "علم الکلام" ہے عقلی "علم الکلام" فلاسفہ اور دوسرے مذاہب سے مقابلے کے لیے ایجاد ہوا تھا، جس کا بانی ابوالہذیل علاف تھا۔ (۲۹) غزالی سے قبل فلسفے پر لکھی گئی کتب کی یہ خصوصیت تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ ارسطو نے فلسفہ کی تدوین کی تو افلاطون کا خیال تھا کہ اس طرح اسرار و رموز کے طلسم کو توڑ دیا گیا ہے لیکن ارسطو کا جواب تھا کہ اسرار و رموز اس طرح بیان کیے ہیں کہ عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ (۳۰) مسلمانوں میں فلسفۂ ارسطو کا سب سے بڑا مفسر ابن سینا ہے لیکن وہ بھی بات کو نہایت مہیب، پر رعب عبارت میں ادا کرتا ہے غزالی نے اس طلسم کو توڑا اور پھر اس طرز کو امام فخرالدین رازی نے اور زیادہ ترقی دی اور فلسفہ کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ (۳۱)

مسلمانوں نے جب یونانی فلسفہ کا ترجمہ کیا تو اس کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ ان کا ہر مسئلہ گویا الہام الہیٰ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک افلاطون و ارسطو کا دماغ مسلمانوں میں مافوق الفطرت خیال کیا جاتا رہا ترجمے کے بعد جب مسلمانوں نے تصانیف پیش کیں تب بھی یہی رویہ رہا۔ یعقوب کندی، فارابی، شیخ بوعلی سینا جو خود ارسطو و افلاطون کے ہم پایہ تھے، ان میں سے کسی نے بھی ان مسائل پر چون و چرا نہیں کی صرف متکلمین کے گروہ نے مذہب کی وجہ سے مخالفت کی لیکن ان کی توجہ صرف ان مسائل کی طرف تھی جو اسلام کے خلاف تھے۔ (۳۲) غزالی نے فلسفہ یونان کے مسائل بیان کرنے کے ساتھ ان پر تنقید کی اور فلسفۂ یونان کی عظمت دلوں سے کم کی اس طرح علماء اس کے عیب و ہنر کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ شیخ اشراق کی "حکمت الاشراق"، ابو البرکات کی "المعتبر" اس سلسلے کی نمایاں تصانیف ہیں۔ امام رازی نے صرف تنقید ہی نہیں کی بلکہ صحیح مسائل کو بھی تہہ تیغ کر دیا۔ (۳۳) مسلمانوں میں فلسفہ کی ترویج چند فرقوں تک محدود تھی۔ محدثین و فقہا نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی البتہ متکلمین اس سے رد اور ابطال کی حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ وہ استدلال و اثبات مطالب میں منطق و فلسفہ کی اصطلاحوں سے پرہیز کرتے تھے۔ (۳۴) اس بندش کو بھی غزالی نے توڑا اس کے نتیجہ سے فلسفہ کم از کم خواص میں مقبول ہوا اور ڈیڑھ صدی تک ابن طفیل، ابن رشد اور ابن ماجد جیسے نامور پیدا ہوئے۔ (۳۵)

شبلی اردو کے پہلے مورخ ہیں جنھوں نے علماء و مشاہیر اسلام پر فلسفیانہ استدلال اور منطقی مباحث کے زور سے اس دور کی پوری علمی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول کا احاطہ کیا یہ شبلی کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ (۳۶)

شبلی "المامون" میں تحریر کرتے ہیں:

> "میں اعلانیہ اعتراف کرتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ تک پہنچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کیے ہیں اس کے اعتبار سے ہمارے قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔"
> (۳۷)

شبلی کی تصانیف کا قابل قدر حصہ "مقالاتِ شبلی" ہیں ان میں ایک حصہ فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہے اس میں بارہ مقالے شامل ہیں ان مقالات میں سے تین کا موضوع فلسفہ یونان اور اسلام ہے یہ مضامین اس اعتراض کا جواب ہیں کہ مسلمانوں نے ارسطو کی تقلید کی شبلی لکھتے ہیں:

> "چونکہ عام طور پر مشہور ہے اور مسلمانوں کی موجودہ تصانیف بھی اس کی شہادت دیتی ہیں کہ مسلمانوں میں مقلدین ارسطو کے سوا اور کوئی فرقہ موجود نہ تھا اس لیے اس میں ہم صرف

خارجی طور پر اس واقعہ کی غلطی ثابت کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے دوسرے نمبروں میں ہم
تفصیل سے بتائیں گے کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان پر کیا اضافہ کیا یا کیا اصلاح و ترمیم کی۔"
(۳۸)

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان فلسفۂ یونان میں نہ صرف حذف و اضافہ کرتے رہے بلکہ بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ عہد عباسیہ میں مسلمانوں نے فلسفہ پر کام کیا یہ مرحلہ تراجم کے بعد آیا۔ تصنیف و تالیف کرنے والا یہ گروہ محدود تھا اور زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے غزالی نے فلسفہ کی باقاعدہ و باضابطہ تعلیم و تدریس کا آغاز کیا۔ غزالی، بوعلی سینا اور فارابی سے مستفیض تھے۔ مسلمانوں میں ابتدا ہی سے دو گروہ بن گئے تھے ایک ارسطو کا مقلد تھا اور دوسرا، دوسرے حکماء کا مقلد تھا۔ بوعلی سینا و فارابی کا تعلق پہلے گروہ سے تھا۔ (۳۹) شروع میں فلسفے پر کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں تھیں بلکہ چند خاص کتب خانوں تک محدود تھیں انہی میں سے ایک عباسیہ حکمرانوں کا کتب خانہ تھا۔ بوعلی سینا اسی کتب خانے سے مستفیض ہوا۔ بوعلی سینا نے خود متعدد کتابیں لکھیں جو کہ خوب مقبول ہوئیں۔ امام رازی و طوسیٰ نے بوعلی سینا کے فلسفے پر سخت تنقید کی لیکن ارسطو کے اثرات زائل نہ ہو سکے۔ (۴۰) اور ان کے ہاں بھی ارسطو کی چھاپ محسوس کی گئی۔ شبلی نہایت تفصیل سے بتاتے ہیں کہ مسلمان ارسطو کے فلسفے سے متاثر ضرور ہوئے لیکن تقلید نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانوں نے اس میں اضافے و ترامیم کیں۔

اس کے بعد شبلی ارسطو کے مخالف گروہ پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے یحییٰ نحوی کا ذکر کرتے ہیں جس نے ارسطو کا رد لکھا۔ اسی طرح ابوعلی صہبائی نے اپنی کتاب "الاراوالدیانات" میں ارسطو کی منطق کا رد لکھا پھر علامہ شہرستانی نے بھی برقلس اور ارسطو کا رد لکھا چھٹی صدی عیسوی میں مخالفت کا یہ رجحان عام ہو گیا اور ابو برکات بغدادی، شیخ الاشراق اور امام رازی نے فلسفہ یونان پر بکثرت حملے کیے امام رازی ہی کی طرح ابن تیمیہ نے فلسفہ کے رد میں متعدد ضخیم کتابیں تحریر کیں۔ اس طرح شبلی نے مستند ثبوت پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ مسلمان ارسطو کے مقلد نہیں۔ (۴۱)

فلسفہ یونان اور اسلام ہی کے عنوان سے ایک دوسرے مضمون میں شبلی نے یونانی منطق کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور بعد میں حکمائے اسلام کی اصلاحات بیان کیں ہیں۔ (۴۲)

"......اس موقع پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس شاخ کو چھوڑ کر یورپ کو یہ بھی تسلیم ہے
کہ ارسطو کی منطق پر آج تک نہ اضافہ ہو سکا اور نہ اصلاح و ترمیم لیکن حقیقت یہ ہے کہ
حکمائے اسلام نے اس فن میں اصلاح و ترمیم کی بلکہ بہت سے مسائل کی غلطیاں ثابت
کیں۔" (۴۳)

شبلی نے ارسطو کی منطق کی آٹھ اقسام پر حکمائے اسلام کے تغیرات اصلاحات اور اضافے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ (۴۴)

اسی عنوان کے تحت لکھے گئے شبلی کے تیسرے مضمون میں حکمائے اسلام کی ان اصلاحات کا ذکر ہے جو انھوں نے یونانی منطق پر کیں یونانی منطق داں علم کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں ایک تصور اور دوسری تصدیق اور ان کے ادراک کے طریقوں کو معروف اور حجہ کہتے ہیں۔ (۴۵) شبلی نے لکھا ہے:

"معروف کے ادراک میں اگرچہ حیثیت ملحوظ نہ ہو کہ فلاں شے کی حقیقت اور حد ہے تو وہ
معروف نہیں بلکہ معرف ہے اس بنا پر معرف کا ادراک جو ہم کو ہوتا ہے وہ تصدیق اور

قضیہ کی صورت میں ہوتا ہے اور یوں اس کو تصور کی صورت میں لانا چاہیں تو ہر قضیہ بھی تصور کی صورت میں لایا جاسکتا ہے۔..... " (۴۶)

اہل منطق معرف اور حد کی بحث میں جو نئے نکتے بیان کرتے ہیں، حکمائے اسلام نے انھی نکات کے ساتھ بہت سی ترمیمات کیں ہیں شبلی انھیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ شبلی ذاتی اور عرضی کی بحث پر اظہار خیال کرتے ہیں:

"تصور کے اکثر مسائل ذاتی اور عرضی پر مشتمل ہوتے ہیں ذاتی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ شے کی نفس حقیقت میں داخل ہو اور شے کا تصور تام بغیر اس کے تصور کے نہ ہو سکتا ہو مثال سے یوں سمجھو کہ انسان میں مختلف اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ چلتا ہے، پھرتا ہے، روتا ہے، ہنستا ہے، ان میں بعض اوصاف ایسے ہیں جو اور جانوروں میں نہیں پائے جاتے لیکن اگر ان سے قطع نظر کرلیں تب بھی انسان کا وجود برقرار رہتا ہے بخلاف اس کے اگر حیوانیات اور گویائی سے قطع نظر کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے یعنی اگر یہ نہ ہو تو انسان بھی نہ ہوگا اس لیے چلنا پھرنا انسان کی غرضیات میں شامل ہے اور حیوانیات و گویائی ذاتیات میں۔ اسی بنا پر ذاتی کی تعریف یہ ٹھہری کہ ماہیت کا وجود بغیر اس کے نہ پایا جاسکے۔" (۴۷)

شبلی اس بحث کو ماہیت اور ذاتیات تک لے جاتے ہیں:

"...... ماہیت کے علم کے لیے ذاتی کا علم ہونا ضروری ہے اور ذاتی کے علم کے لیے ماہیت کا علم ضروری ہے کیوں کہ جب تک یہ متعین نہ ہو چکے یہ کیوں کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز اس کی ماہیت میں داخل ہے اور فلاں چیز خارج۔" (۴۸)

حکمائے اسلام نے منطق پر جو اعتراضات کیے تھے شبلی نے ان میں ایک موضوع "قیاس" پر علیحدہ سے تفصیل سے بحث کی ہے۔ (۴۹)

اہل منطق کے نزدیک قیاس دو یا دو سے زیادہ قضایا سے مرکب ہوتا ہے ایک سے استدلال ممکن نہیں اس پر اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ اکثر دلائل میں ایک قضیہ مذکور ہوتا ہے اہل منطق کا خیال یہ ہے کہ کبریٰ مسلسل الحصول اور بدیہی ہوتے کے سبب محذوف ہوجاتا ہے اور صغریٰ ہی پیش نظر ہوتا ہے شبلی کا کہنا یہ ہے کہ اگر اس نکتے پر غور وفکر کیا جائے تو اہل منطق کی یہ توجیہ بھی بے حقیقت ہے کیوں کہ اہل منطق خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم ان مقدمات کو تسلیم کرتے ہیں جو موجود ہیں نہ کہ ان مقدمات کو جو موجود نہیں حالانکہ وہ ہمارے ذہنوں میں ہوتے ہیں اور انھی کی مدد سے استدلال کیا جاتا ہے جب لازم کے تصور سے ملزوم کا تصور ہوسکتا ہے تو دیگر مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ بہت سی باتوں میں صرف ایک قضیہ استدلال کے لیے کافی ہوتا ہے اس کے بعد شبلی مقدمات کبریٰ اور صغریٰ پر ایک اور حیثیت سے یعنی شکل اوّل کی حیثیت سے بحث کرتے ہیں۔ شکل اوّل کا ماحصل یہ بیان کیا ہے کہ پہلے عام کے لیے کلیہ ایک حکم ثابت کرتے ہیں پھر وہی حکم خاص پر منتقل کر دیتے ہیں اس بنا پر شکل اوّل میں کبریٰ کا کلیہ ہونا ضروری ہے۔ (۵۰)

اسی موضوع یعنی فلسفہ یونان اور اسلام، کے تحت تیسرا مقالہ اجرام فلکی پر بحث کرتا ہے شبلی کا خیال ہے کہ اجرام فلکی پر

یونانی نظریات باطل ہیں لیکن یہ نظریات آج بھی قائم ہیں یونانی حکماء نے اپنے نظریات کی تائید میں بہت سے دلائل و مثالیں دیں ابن رشد نے بھی ان نظریات کی تائید کی ہے لیکن شبلی کا طرز استدلال مختلف ہے وہ ان نظریات کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے متکلمین اسلام کے نظریات پیش کرتے ہیں۔ (۵۱)

شبلی کا ایک مقالہ "فلسفہ اسلام اور فلسفہ قدیم و جدید" ہے یہاں شبلی ثابت کرتے ہیں کہ فلسفہ یونان اور جدید فلسفہ کے درمیان کڑی وہ فلسفہ ہے جو حکمائے اسلام نے پیش کیا اس کے ساتھ ہی شبلی یہ واضح کرتے ہیں کہ جدید فلسفہ قدیم فلسفہ کی نسبت فلسفہ اسلام سے زیادہ قریب ہے یہ مضمون شبلی کی تحقیق و جستجو کا مرقع ہے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جاوے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا کل فلسفہ اس خیال کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فلسفۂ اسلام، جدید و قدیم فلسفہ کے درمیان کی کڑی ہے۔ (۵۲) یہاں شبلی نہایت فخر سے (اپنے معاصرین کے برخلاف) متکلمین اسلام کے نظریات بطور ثبوت پیش کرتے ہیں لیکن تفصیل میں جانے کے بجائے صرف اختلافی مسائل ہی کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ اور ان اختلافی مسائل میں جسم اور ہیولیٰ کو اہمیت دیتے ہیں ارسطو کے فلسفہ کے برخلاف متکلمین اسلام ہیولیٰ کے قائل نہیں ان کے خیال میں جسم ناقابلِ تقسیم چھوٹے چھوٹے ذرّات یا اجزا پر مشتمل ہے ان کا کہنا تھا کہ اگر ارسطو کے نظریہ اتصال کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہیولیٰ ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ یہ اتصال، اتصال مطلق ہوگا نہ کہ اتصالِ خاص۔ اسی طرح جوہر فرد کے وجود کا نظریہ ہے متکلمین اسلام نے یہاں بھی ارسطو سے اختلاف کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ جسم جس باریک و مہین ذرات سے مرکب ہے وہ تجزیہ نہیں کہا جا سکتا (۵۳) شبلی بھی جوہرِ فرد سے انکار کو ناممکن قرار دیتے ہیں جسم انہی جوہر سے مرکب ہے یہ جوہر آپس میں نہایت پیوستہ ہیں۔ (۵۴) پھر شبلی لکھتے ہیں کہ حکمائے یونان کا پیش کردہ چار عناصر کا نظریہ بھی حکمائے اسلام نے ادا کر دیا اس طرح دوسرے مسائل میں حکمائے اسلام کے قدمائے یونان سے اختلافات کو پیش کر کے شبلی جدید فلسفہ اور فلسفہ اسلام میں زیادہ ہم آہنگی ثابت کرتے ہیں۔ (۵۵)

شبلی اپنے ایک مقالے "علوم جدیدہ" میں علم کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں قدیم فلسفے کے مقابلے میں جدید فلسفے میں بہت سے مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی ہے انہیں مسائل میں ایک علم بھی ہے۔ جدید فلسفہ، قدیم فلسفہ سے قطعی مختلف علم کی تعریف متعین کرتا ہے جدید فلسفے کی رو سے انسان مختلف حواس رکھتا ہے اور ہر حوس چند مخصوص خاصیتیں رکھتا ہے جو مختلف حواسات کی بدولت ادراک میں آتے ہیں۔ کسی خاص چیز کے حواس میں آنے سے جو مختلف کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں وہ ہمارے حافظے میں محفوظ رہتی ہیں جب کوئی احساس پیدا ہوتا ہے تو باقی کیفیتیں یاد آجاتی ہیں۔ (۵۶) احساس و ادراک کے مختلف مدارج کا تذکرہ کرتے ہیں:

> "پہلی غلطی یہ ہے کہ ذہن یا عقل کوئی مادی شے نہیں جس میں صورت کا انعکاس یا انطباع ہو۔ دوسری یہ کہ تصور کے وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک حاصل شدہ صورت کا تذکرہ ہوتا ہے ہمارے ذہن میں بہت سی معلومات ہیں جب ہم ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے ان کا تصور کیا اب اگر تصور کی حقیقت وہ ہو جو یونانی بیان کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت کوئی نئی صورت حاصل ہوئی حالانکہ اس وقت کوئی نئی صورت حال حاصل نہیں ہوئی بلکہ جو پہلے سے حاصل تھی اس کی طرف ہمارا ذہن متوجہ ہوا ہے کیوں کہ اس شے کی صورت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ

شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو۔" (۵۷)

پھر شبلی وضاحت کرتے ہیں کہ احساس بالفعل اور احساس مرکب دراصل ادراک کے ابتدائی درجے ہیں ان سے جزئیات کا علم ممکن ہے کلیات کا نہیں کلیات کا علم ایک مخصوص وجدان تعقل یا شعور سے حاصل ہوتا ہے۔ منطق میں تصور کو تعقل ہی کہا جاتا ہے کیوں کہ تصور کے لیے صورت کی شرط ہے جب کہ کلیات میں کوئی خاص صورت حاصل نہیں ہوتی بلکہ جزئیات سے خصوصیات منہا کر کے ایک عام مفہوم پیدا کرنا ہوتا ہے یہی علم کا اعلیٰ درجہ ہے۔ (۵۸)

شبلی اپنے ایک مقالے "جذب یا کشش" میں کہتے ہیں کہ کشش ثقل کا نظریہ جدید نہیں بلکہ انتہائی قدیم ہے اور حکمائے اسلام نے اس سلسلے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ یونانیوں کے ہاں بھی اس موضوع پر نظریات پیش کیے گئے ہیں مسلم حکما کو اس میں اولیت حاصل رہی۔ ثابت بن قرۃ اس بات کا قائل تھا کہ ہر جسم میں باہم کشش ہے فارسی شعرا کے ہاں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن اس مسئلہ کو اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب آئزک نیوٹن نے اسے ایک باضابطہ اصول کی شکل دی۔ (۵۹)

اسی طرح شبلی نے نظریہ ارتقا پر ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھا اور نہ صرف یہ ثابت کیا کہ ارتقا کا نظریہ مذہب کے کسی اصول کے خلاف نہیں بلکہ اخوان الصفاء اور ابن مسکویہ کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ مسلم حکماء جامد کائنات کے قائل نہیں تھے کیوں کہ چوتھی صدی ہجری یا گیارہویں صدی ہجری میں ابن مسکویہ نے نہ صرف حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا بلکہ نباتات سے انسان تک ترتیب موجودات کا ایک سلسلہ بتا دیا ابن مسکویہ کا نظریہ روحانی یا غیر زمانی نہیں ہے بلکہ یہ ارتقا زمین و زمانہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے اس طرح شبلی اس مضمون میں تحقیقات سے اصل حقائق پیش کرتے ہیں۔ (۶۰) اس سلسلے میں حکمائے اسلام کے نظریات بھی بیان کیے ہیں خاص طور پر ابن مسکویہ کی تفصیلی بحث جو اس نے الفوزالاصغر میں کی ہے اس میں سے اقتباسات لیے ہیں۔ (۶۱)

بون یونیورسٹی میں اسلامی فلسفہ اور مشرقی زبانوں کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر برٹن کی تصانیف کا جائزہ لینے کے لیے شبلی نے ایک مضمون "ڈاکٹر برٹن اور تاریخ فلسفہ اسلام" تحریر کیا (۶۲) اس مضمون میں بون یونیورسٹی کے ایک طالب علم سے مدد لی گئی ہے جس میں اس نے پروفیسر برٹن کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے (۶۳) پروفیسر برٹن نے اسلامی فلسفہ پر دو کتابیں لکھیں ایک "مابعدالطبعیہ" اور دوسری "درجات الفلسفہ فی الاسلام" کے نام سے ترجمہ کی گئی پہلی کتاب میں مصنف نے موضوع کے لحاظ سے کافی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے جبکہ دوسری کتاب میں فلسفہ کے چار دور تشکیل دیے ہیں اور ہر ایک پر مفصل بحث کی ہے (۶۴) شبلی کا ایک مضمون "فلسفہ اور فارسی شاعری" ہے فارسی شاعری فلسفیانہ خیالات کی عکاسی کرتی ہے اس مضمون میں ان خیالات کی نشاندہی کے ساتھ نامور شعرا کا تذکرہ ہے اور اہمیت سحابی نجفی کو دی گئی۔ جس کی شاعری خصوصاً رباعیوں میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ملتے ہیں۔ (۶۵)

ایک اور مضمون "حقائق اشیاء اور معشوق حقیقی" ہے جس میں صوفیانہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور خاص موضوع "صوفیانہ شاعری میں معشوق حقیقی کا تصور" ہے (۶۶) اس مضمون کو ضمناً فلسفیانہ مضمون کہا جاسکتا ہے اسی طرح "ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس اور علمی نمائش گاہ" میں ندوۃ کے اجلاس کا حال اور ایک نمائش کا ذکر ہے (۶۷) اسے بھی ضمناً فلسفیانہ مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔

مقالات شبلی میں ایک مضمون "قضا و قدر اور قرآن مجید" ہے اس میں قضا و قدر کو مذہب و فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے

سب سے پہلے فلسفیانہ نقطہ نظر سے جبر اور قدر کو جانچا گیا ہے اور پھر مذہبی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے

"قدیم متکلم" کے زیرِ عنوان شبلی نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں علماء کرام سے چند سوالات کیے ہیں چھ سوالات میں سے پانچویں اور چھٹے سوال میں شبلی پھر فلسفے پر آجاتے ہیں اور پوچھتے ہیں:

> س ۵: کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے؟
>
> س ٦: اگر اس وقت اس زمانے میں فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں نہیں؟

تاریخی مقالات میں مضمون "ابن رشد" میں ابن رشد کے تعارف کے ساتھ اس کے فلسفہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے (٦٨) اسی حصے میں تاریخی حوالے کے ساتھ مختلف اشخاص کا ذکر کیا ہے اور ان کے فلسفہ اور اس دور کے فلسفہ پر بحث کی ہے اور اس اور اسی کے ساتھ فلسفہ یونان پر مفصّل مضمون ہے۔ (٦٩)

مجلس علم الکلام میں عہد عباسیہ میں فلسفہ سے رغبت پیدا ہونے کا ذکر ہے جبکہ اس دور میں فلسفہ پڑھنا حرام سمجھا جاتا ہے فقہا نے فلسفہ کو ناجائز قرار دیدیا تھا لیکن پھر بھی علم کلام پر توجہ دی گئی (۷۰) اور اس زمانے میں بزرگوں نے جدید و قدیم فلسفہ پر رد لکھا (۷۱) اس کے ساتھ جدید علم الکلام کے ناقص رہ جانے پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور علم الکلام پر تحقیقی کام کے لیے مجلس علم الکلام کے قیام کا مشورہ دیا ہے (۷۲) علمی گروہ میں فلسفہ پر مسلمانوں نے جو کام کیا ہے اس پر یورپ میں ہونے والی تحقیق کے سلسلے میں سوال اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کو اس کا کتنا علم ہے (۷۳) ایک اور مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں مسلمانوں کی فلسفہ میں ترقی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ (۷۴)

شبلی نے ہر صنف پر قلم اٹھایا۔ چنانچہ تنقید کے میدان میں بھی شبلی نے اپنی اہمیت واضح کردی محمد اسحاق شمس اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

> "شبلی نے اگرچہ تاریخی تنقید کے فلسفہ پر براہ راست قلم نہیں اٹھایا تاہم ان کی تاریخی تنقید میں اس کا عکس بالکل نمایاں ہے جس سے کوئی صاحبِ بصیرت انکار نہیں کرسکتا۔"

حواشی

(۱) شبلی الکلام۔ مسعود پبلشنگ ہاؤس۔ ۱۹٦۴ء ص ۸۷ (۲) محمد سرور۔ ارمغان شاہ ولی اللہ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۱ء ص ۳ (۳) ایضاً ص ۵ (۴) سید اصغر علی شاہ جعفری۔ تحریکِ پاکستان۔ نیو بک پیلس لاہور ص ۳۳۹ (۵) شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۵ء ص ۱۵۷ (٦) ایضاً ۱۹٦۲ء ص ۱۵۸ (۷) ایضاً ص ۱٦٦ (۸) ایضاً ص ۱٦٦ (۹) ایضاً ص ۱٦٦ (۱۰) ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، شبلی ایک دبستان۔ مکتبہ عارفین ڈھاکہ ص ۴ (۱۱) ایضاً ص ۴ (۱۲) عزیز احمد۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔ مترجم جمیل جالبی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۲۲ (۱۳) محمد واصل عثمانی۔ شبلی ادیبوں کی نظر میں۔ صفیہ اکیڈمی کراچی ۱۹٦۸ء ص ٦٦ (۱۴) شبلی۔ تمہید۔ الکلام ص ۱۲ (۱۵) محمد واصل عثمانی۔ شبلی ادیبوں کی نظر میں ص ٦۷۔ ٦۸ (۱٦) شبلی۔ الکلام۔ ص ۱۲ (۱۷) ایضاً ص ۱۳ (۱۸) ایضاً ص ۱۳ (۱۹) عزیز احمد۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔ مترجم جمیل جالبی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۱۹۸۹ء ص ۱۲۹ (۲۰) ایضاً ص ۱۲۹ (۲۱) شبلی۔ الغزالی مکتبہ دین و دنیا لاہور ص ۲۷ (۲۲) ایضاً ص ۲۷ (۲۳) ایضاً ص ۸۵ (۲۴) ایضاً ص ۸۶ (۲۵) ایضاً ص ۸۶۔ ۸۷ (۲۶) ایضاً ص ۸۸ (۲۷) ایضاً ص ۸۸ (۲۸) ایضاً ص ۸۹ (۲۹) ایضاً ص ۸۹ (۳۰) ایضاً ص ۱۰۸ (۳۱) ایضاً ص ۱۳۴ (۳۲) ایضاً ص ۱۳۴۔ ۱۳۵ (۳۳) ایضاً ص ۱۵۱ (۳۳) ایضاً ص ص ۱۵۲ (۳۴) ایضاً ص ۱۵۴ (۳۵) ایضاً ص ۱۵۵ (۳۶) ایضاً ص ۳۱۵ (۳۷) ایضاً ص ۳۱۸ (۳۸) محمد واصل عثمانی۔ شبلی ادیبوں کی نظر میں ص ۲۵ (۳۹) شبلی۔ المامون۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۶ء ص ۱۰ (۴۰) شبلی۔ مقالاتِ شبلی (جلد ہفتم) مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۲ (۴۱) ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری۔ شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ ۱۹۹۰ء ص ۱۸۱ (۴۲) ایضاً ص ۱۸۲ (۴۳) ایضاً ص ۱۸۴ (۴۴) شبلی۔ مقالاتِ شبلی (جلد ہفتم) ص ۱۳ (۴۵) ایضاً ص ۱۳ (جلد ہفتم) (۴۶) ایضاً ص ۱۶ (۴۷) ایضاً ص ۱۹ (۴۸) ایضاً ص ۱۸ (۴۹) ایضاً ص ۲۰ (۵۰) ایضاً ص ۲۲ (۵۱) ایضاً ص ۲۲ (۵۲) ایضاً ص (۵۳) ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری۔ شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ ص ۱۸۸۔ ۱۸۹ (۵۴) ایضاً ص ۱۹۱ (۵۵) محمد واصل عثمانی۔ مقالہ اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں شبلی کا حصہ "شبلی ادیبوں کی نظر میں ص ۲۵۶ (۵۶) ایضاً ص ۱۹۴ (۵۷) ایضاً ص ۱۹۵ (۵۸) ایضاً ص ۱۹۶ (۵۹) ایضاً ص ۱۹۷ (۶۰) شبلی، مقالاتِ شبلی ص ۴۵ (۶۱) ایضاً ص ۴۵ (۶۲) ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری۔ شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ ص ۱۹۸ (۶۳) ایضاً ص ۱۹۸ (۶۴) محمد واصل عثمانی۔ شبلی ادیبوں کی نظر میں مقالہ "اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ" ص ۲۵۷۔ ۲۵۸ (۶۵) شبلی۔ مقالاتِ شبلی۔ جلد ہفتم ص ۶۲ (۶۶) ایضاً ص ۷۳ (۶۷) ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری۔ شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ ص ۲۰۱ (۶۸) شبلی۔ مقالات شبلی جلد ہفتم ص ۷۷ (۶۹) ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری۔ شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ ص ۲۰۳ (۷۰) شبلی۔ مقالاتِ شبلی ص ۸۵ (۷۱) ایضاً ص ۹۱ (۷۲) ایضاً جلد اول ص ۱۴۲ (۷۳) ایضاً جلد سوم ص ۱۴۲ (۷۴) ایضاً جلد پنجم ص (۷۵) ایضاً جلد پنجم ص (۷۶) ایضاً جلد ششم ص ۳۷ (۷۷) ایضاً جلد ہشتم ص ۵۳ (۷۸) ایضاً جلد ہشتم ص ۵۴ (۷۹) ایضاً جلد ہشتم ص ۵۵ (۸۰) ایضاً جلد ہشتم ص ۱۴۳۔ ۱۴۴ (۸۱) ایضاً جلد سوم ص ۱ (۸۲) محمد اسحاق شمس۔ شبلی کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر انور سدید

ستار طاہر کی وفات پر

موت سے معانقہ:

عجیب دیکھا یہ منظر حیات کا میں نے
نہ جام ہے، نہ صراحی، نہ مے نہ ساقی ہے
اجل سے عید ملن کی ستار طاہر نے
"ورق تمام ہوا اور قصّہ باقی ہے"

OOOOO

اس کی یاد میں

وہ جی رہا تھا قلم کی کمائی پر انور
وہ صبح و شام مشقت بہت اٹھاتا تھا
اسے اجل نے پکارا ہے عین عید کے دن
کہانیاں جو ہمیں نت نئی سناتا تھا

OOOOO

زیست کا مسئلہ

زیست تھی اک مسئلہ ستار طاہر کے لیے
ڈور کو سلجھا رہا تھا اور سرا ملتا نہ تھا
موت کی دہلیز پر پہنچا تو جیسے کِھل اٹھا
غنچۂ امید اس کا جو کبھی کِھلتا نہ تھا

OOOOO

آخری دیدار

کبھی کبھی وہ یہ کہتا تھا سرگرانی میں
"یہ کائنات فقط الجھنوں کی بستی ہے"
وہ پُرسکوں تھا لحد میں تو یوں ہوا محسوس
"فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے"

OOOOO

کملیشور / شہاب قدوائی

جارج پنجم کی ناک

یہ اس وقت کی بات ہے جب انگلینڈ کی رانی ایلزابیتھ دوئم اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کرنے والی تھیں۔ اخبارات میں ان کے اس دورے کے خوب خوب چرچے ہو رہے تھے۔ لندن کے اخبارات میں تیاریوں کی دلچسپ خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ رانی صاحبہ کا درزی پریشان تھا کہ ہندوستان، پاکستان اور نیپال کے دورے پر وہ کب کیا پہنیں گی۔

انگلینڈ کے اخبارات میں شائع ہونے والی اس قسم کی خبریں دوسرے دن ہندوستانی اخبارات کی زینت بنی نظر آتی تھیں .... کہ رانی صاحبہ نے ایک ایسا ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ بنوایا ہے جس کا ریشمی کپڑا ہندوستان سے منگوایا گیا ہے .... اس سوٹ پر تقریباً ۴۰۰ سو پونڈ کا خرچہ آیا ہے۔

رانی صاحبہ کے زائچہ کی مکمل تفصیل اور پرنس فلپس کے کارنامے اخبارات میں تواتر سے شائع ہوئے یہاں تک کہ ان کے نوکروں، باورچیوں اور نگہبانوں کے مکمل کوائف تک اخبارات کی سرخیاں بنے۔ شاہی محل میں پلنے اور رہنے والے کتوں کی تصاویر اخبارات میں چھاپی گئیں۔

اس دھوم دھام اور شور شرابہ کا ڈنکہ تو انگلینڈ میں بج رہا تھا مگر گونج ہندوستان میں سنائی پڑ رہی تھی۔ اخباری خبروں کی بدولت سارے ہندوستان میں ایک سنسنی پھیل رہی تھی اور راجدھانی میں تہلکا مچا ہوا تھا۔ پانچ ہزار روپے کا ریشمی سوٹ پہن کر پالم ہوائی اڈے پر اترے گی اس رانی کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔

نئی دہلی نے ایک نظر جو خود پر ڈالی تو بے ساختہ منہ سے نکلا "وہ آئیں گھر میں خدا کی .... کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نئی دہلی کی کایا پلٹنے لگی۔ حیرت تو اس پر ہوئی کہ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا اور نہ کسی نے کسی کو دیکھا، مگر سڑکیں جوان ہو گئیں، ان پر جمی بڑھاپے کی دھول ایک دم غائب ہو گئی، عمارتیں نازنینوں کی طرح سج سنور گئیں۔

مگر ایک بڑی مشکل پھر بھی درپیش تھی .... وہ تھی جارج پنجم کی ناک۔

دہلی شہر میں سب کچھ تھا اور بہت کچھ ہونے کی توقع تھی مگر جارج پنجم کی ناک کی بڑی مصیبت تھی شہر میں سب کچھ تھا مگر ناک نہ تھی۔

اس ناک کی بھی ایک لمبی داستان ہے۔ اس ناک کے پیچھے بڑے ہنگامے ہوئے ہیں۔ تحریکیں چلتی رہیں، سیاسی

جماعتوں نے ریزولیوشن پاس کیے، چندہ جمع کیا گیا، تقریریں اور گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ اخبارات کے صفحات رنگ دیے گئے۔
بحث اس بات پر تھی کہ جارج پنجم کی ناک رہنے دی جائے یا ہٹادی جائے!
ہر سیاسی تحریک کی طرح کچھ لوگ حمایت اور کچھ لوگ مخالفت میں تھے اور اکثریت خاموش تھی۔ خاموش رہنے والوں کی طاقت دونوں طرف تھی۔
یہ تحریک ابھی چل ہی رہی تھی کہ جارج پنجم کی ناک کی حفاظت کے لیے پہرہ لگا دیا گیا... اب کس کی مجال جو ناک تک پہنچے۔ ملک میں جگہ جگہ ایسی ناکیں موجود تھیں جن تک لوگوں کے ہاتھ پہنچ گئے انھیں شان و شوکت کے ساتھ اتار کر عجائب گھروں میں پہنچادیا گیا۔
اسی زمانے میں جارج پنجم کی لاٹ سے اس کی ناک غائب ہو گئی۔ گشت ہوتا رہا۔ پہرے دار پہرہ دیتے رہے مگر ناک پھر بھی غائب ہو گئی۔
مہارانی کی آمد ہو اور ناک نہ نظر آئے۔ یہ پریشانی کی بات ہے۔ بڑی سرگرمی سے ملک میں ناک کی تلاش کا سلسلہ چل نکلا۔
ملک کے خیر خواہوں کا اجلاس طلب کر کے ان کے سامنے ناک کا مسئلہ پیش کیا گیا اجلاس کے سب شرکا اس بات پر متفق نظر آئے کہ جب تک جارج پنجم کی ناک بحال نہیں ہوتی ہے اس وقت تک ہماری ناک بھی نہ رہے گی۔
اعلیٰ سطح پر مشورے ہوئے، بڑے سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اس ناک کا لگنا بہت ہی ضروری ہے۔ یہ طے ہوتے ہی ایک بت ساز کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً حاضرِ خدمت ہو بت سازیوں تو فنکار تھا مگر اس کے مالی حالات اتنے اچھے نہ تھے آتے ہی اس نے حکام کے چہرے دیکھے .... عجیب پریشانی تھی ان چہروں پر کچھ لٹکے ہوئے کچھ اُداس اور کچھ بد حواس تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر لاچار فنکار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے.... تبھی ایک آواز سنائی دی "بت ساز! جارج پنجم کی ناک لگنی ہے!"
بت ساز نے سنا اور جواب دیا۔ "ناک لگ جائے گی! مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لاٹ کب اور کہاں بنی تھی؟ اس لاٹ کے لیے پتھر کہاں سے لایا گیا تھا؟"
سب حکام نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا... آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہا گیا کہ اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے۔ خیر مسئلہ حل ہوا ایک کلرک کو فون کیا گیا اور اس بات کی پوری چھان بین کرنے کا کام اس کے سپرد کر دیا گیا.... محکمہ آثارِ قدیمہ کی فائلوں کے پیٹ چیرے گئے مگر کچھ بھی پتہ نہیں چلا کلرک نے لوٹ کر کمیٹی کو خوف زدہ انداز میں بتایا "سر! میری خطا معاف ہو۔ فائلیں سب کچھ ہضم کر چکی ہیں!"
حاکموں کے چہروں پر اداسی کے بادل چھا گئے ایک خاص کمیٹی بنائی گئی اور اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ جیسے بھی ہو یہ کام ہونا ہے اور اس ناک کا دارومدار اب آپ پر ہے۔ آخر بت ساز کو پھر بلایا گیا.... اس نے مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بولا کہ اگر پتھر کی صحیح قسم کے بارے میں ٹھیک پتہ نہیں چلتا تو پریشان نہ ہوئیے .... میں ہندوستان کے ہر پہاڑ پر جاؤں گا اور ایسا پتھر کھوج کر لے آؤں گا۔
کمیٹی کے اراکین کی جان میں جان آئی صاحب صدر نے چلتے چلتے فخر سے کہا: ایسی کیا چیز ہے جو اپنے ہندوستان میں نہیں ملتی ہر چیز اس ملک کی زمین میں چھپی ہوئی ہے .... ضرورت صرف اس کے سراغ لگانے کی ہے۔ کھوج کے لیے محنت کرنی

ی اس محنت کا پھل ہمیں ملے گا.... اپنا زمانہ خوشحال ہو گا۔
یہ چھوٹی سی تقریر فوراً اخبار میں چھپ گئی۔

مجسمہ ساز ہندوستان کے پہاڑی علاقوں اور پتھروں کی کانوں کے دورے پر نکل کھڑا ہوا..... کچھ دن بعد وہ مایوس لوٹ آیا ں کے چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ اس نے سر لٹکا کر بتایا کہ ہندوستان کا چپہ چپہ کھوج ڈالا مگر اس قسم کا پتھر کہیں نہیں ملا یہ تھر غیر ملکی ہے۔

صاحبِ صدر نے طیش میں آکر کہا: لعنت ہے آپ کی عقل پر! ساری غیر ملکی چیزیں ہم اپنا چکے ہیں.... دل دماغ، طور طریقے اور رہن سہن... جب ہندوستان میں بال ڈانس تک مل جاتا ہے تو پتھر کیوں نہیں مل سکتا!"

مجسمہ ساز چپ کھڑا تھا یک بیک اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اس نے کہا "ایک بات میں کہنا چاہوں گا مگر اس شرط پر کہ وہ بات اخبار والوں تک نہ پہنچے...."

صدر کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی۔ چپراسی کو حکم ہوا اور کمرے کے سب دروازے بند کر دیے گئے۔ تب مجسمہ ساز نے کہا اپنے دیس میں بھی رہنماؤں کے مجسمے ہیں، اگر اجازت ہو... اور آپ لوگ بہتر سمجھیں تو میرا مطلب ہے تو.... جس کی ناک اس لاٹ پر ٹھیک بیٹھے اس کو اُتار لایا جائے۔

سب نے اس کی طرف دیکھا.... سب کی آنکھوں میں ایک لمحہ کی بدحواسی کے بعد خوشی تیرنے لگی۔ صاحب صدر نے آہستہ سے کہا! "لیکن بڑی ہوشیاری سے!"

اور مجسمہ ساز پھر ملکی دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ جارج پنجم کی کھوئی ہوئی ناک کی ناپ اس کے پاس تھی۔ دلی سے وہ بمبئی پہنچا۔ دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، تلک شیواجی، کاؤس جی، جہانگیر..... سب کی ناکیں ٹٹول ڈالیں ناپیں اور پھر گجرات کی طرف بھاگا۔ گاندھی جی، سردار پٹیل، وٹھل بھائی پٹیل، مہادیو دیسائی۔ کے مجسموں کو پرکھا اور بنگال کی طرف چل دیا، گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کو بھی دیکھا اور ناپا جوکھا اور بہار کی طرف روانہ ہو گیا بہار ہوتا ہوا وہ اتر پردیش کی طرف آیا... چندر شیکھر آزاد، بسمل، موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ کی لاٹوں کے پاس گیا... گھبراہٹ میں مدراس بھی پہنچ گیا ستیہ مورتی کو بھی دیکھا اور میسور، کیرالہ وغیرہ صوبوں کا دورہ کرتا ہوا پنجاب پہنچا۔ لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ کی لاٹوں سے بھی سامنا ہوا آخر کار دلی پہنچا اور اپنی مشکل بیان کی پورے ہندوستان کے مجسموں کا معائنہ کر آیا سب کی ناکوں کو ناپ لیا مگر جارج پنجم کی اس ناک سے سب بڑی نکلیں۔

یہ سن کر سب مایوسی سے جھنجھلانے لگے مجسمہ ساز نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا سنا تھا کہ بہار سکریٹریٹ کے سامنے سن بیالیس میں شہید ہونے والے تین بچوں کے مجسمے موجود ہیں شاید بچوں کی ناک ہی فٹ بیٹھ جائے یہ سوچ کر وہاں بھی گیا مگر.... ان تینوں کی ناکیں بھی اس سے کہیں بڑی بیٹھتی ہیں۔ اب بتایئے میں کیا کروں؟

دارالخلافہ میں سب تیاریاں تھیں جارج پنجم کی لاٹ کو مَل مَل کر نہلایا گیا تھا روغن لگایا گیا تھا۔ سب کچھ تھا صرف ناک نہیں تھی!

بات پھر اعلیٰ حکام تک پہنچی بڑی کھلبلی مچی۔ اگر جارج پنجم کے ناک نہ لگ پائی تو پھر رانی کو خوش آمدید کہنے کا مطلب؟ یہ تو اپنی ناک کٹانے والی بات ہوئی۔

مگر مجسمہ ساز پیسے سے لاچار تھا.... یعنی ہار ماننے والا فنکار نہیں تھا اس کے ذہن میں ایک حیرت انگیز خیال کوندا اور اس نے پہلی شرط دہرائی جس کمرے میں کمیٹی بیٹھی تھی اس کے دروازے پھر بند ہوئے اور مجسمہ ساز نے اپنا نیا منصوبہ پیش کیا۔

"چونکہ ناک لگنا اشد ضروری ہے اس لیے میری رائے ہے کہ چالیس کروڑ میں سے کوئی ایک زندہ ناک کاٹ کر لگادی جائے۔

بات کے ساتھ ہی سناٹا چھا گیا۔ چند منٹ خاموشی کے بعد صدر نے سب کی طرف دیکھا سب کو پریشان دیکھ کر مجسمہ ساز کُچھ اور پھر آہستہ سے بولا۔ "آپ لوگ گھبراتے کیوں ہیں؟ یہ کام میرے اوپر چھوڑ دیجیے .... چننا میرا کام ہے .... آپ کی تو صرف اجازت چاہیے۔"

کچھ کانا پھونسی ہوئی اور آخر کار مجسمہ ساز کو اجازت مل گئی۔

اخباروں میں صرف اتنا چھپا کہ ناک کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اور راج پتھ پر انڈیا گیٹ کے پاس والی جارج پنجم کی لاٹ کے ناک لگ رہی ہے۔

ناک لگنے سے پہلے پھر ہتھیار بند پہرہ داروں کی تعیناتی ہوئی، مجسمہ کے آس پاس کا تالاب سکھا کر صاف کیا گیا اور تازہ پانی ڈالا گیا تاکہ جو زندہ ناک لگائی جانے والی تھی وہ سوکھنے نہ پائے اس بات کی خبر اوروں کو نہ تھی۔ یہ سب تیاریاں اندر ہی اندر چل رہی تھیں رانی کے آنے کا دن نزدیک آتا جارہا تھا۔ مجسمہ ساز خود اپنے بتائے حل سے پریشان تھا زندہ ناک لانے کے لیے اس نے کمیٹی سے کچھ اور مدد مانگی جو اس کو دے دی گئی لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ ایک خاص دن ہر حالت میں ناک لگ جائے گی۔

اور وہ دن آیا۔ جارج پنجم کی ناک لگ گئی۔

سب اخباروں نے خبریں چھاپیں کہ جارج پنجم کے زندہ ناک لگائی گئی ہے .... یعنی ایسی ناک جو قطعی پتھر کی نہیں لگتی۔

لیکن اس دن کے اخباروں میں ایک بات غور کرنے کی تھی۔ اس دن پورے ملک میں کسی افتتاح کی خبر نہیں چھپی، کسی نے کوئی فیتہ نہیں کاٹا۔ کوئی جلسۂ عام نہیں ہوا۔ کہیں بھی کسی کو خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ کسی ہوائی اڈے یا اسٹیشن پر کوئی تقریب نہیں ہوئی۔ کسی کی کوئی تازہ تصویر نہیں چھپی۔

سب اخبار خالی تھے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟

ناک تو صرف ایک چاہیے تھی اور وہ بھی بُت کے لیے۔

مراٹھی کہانی

جی۔ اے۔ کلکرنی / اسلام بن رزاق

سادھو

وہ تھکا ماندہ سادھو اُس گاؤں میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ مگر اُس نے گاؤں کی حدود میں اس اعتماد سے قدم رکھا جیسے گاؤں کے سارے گلی کوچے اُس کے دیکھے بھالے ہوں۔

گاؤں کے کنارے ایک کنویں پر بہت ساری عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ جن میں بوڑھی، جوان سب ہی شامل تھیں۔ اُن مختلف العمر عورتوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کے بوڑھے چہرے کی جھرّیاں مزید گہری ہوگئیں۔ اور ماتھے پر اندرونی کرب کی ایک لکیر سی اُبھر آئی۔ زمانۂ حال کی لمحہ لمحہ بدلتی بساط پر جینے والے ان بے بضاعت لوگوں پر اسے بڑا ترس آیا۔ اُن میں سے ایک کے مستقبل کے احوال وہ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً اُس کی نگاہیں اُس دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں جو کنویں کی منڈیر پر جھکی ڈول سے پانی کھینچ رہی تھی۔ اُس کے جھل مل کرتے لباس سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک نوبیاہتا دُلہن ہے۔ اُس کا جسم ہلدی کی گانٹھ جیسا چمکدار اور پُرکشش تھا۔ وہ اتنی نو عمر تھی کہ شباب کی آمد آمد کے باوجود اُس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت باقی تھی۔

سادھو کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ اور ہلدی کی گانٹھ جیسا پُرکشش بدن مُردہ ڈھور کی مانند پھولنے لگا۔ سادھو نے گھبرا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں ایک راہگیر سے بولا۔

"اُس لڑکی کو دیکھتے ہو، وہ ابھی کنویں میں ڈوب کر مر جائے گی۔"

پھر بغیر رُکے تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ سڑک کے موڑ پر پہنچا تھا کہ عقب سے عورتوں کے بے تحاشا چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر اُس نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہاں جو کچھ ہونا تھا اُس نے اپنی نگاہِ پیش بیں سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اُسے ایک خستہ حال جھونپڑی دکھائی دی۔ جس میں ایک سیاہ فام لوہار اپنے وزنی ہتھوڑے سے لوہا کوٹ رہا تھا۔ سامنے بڑا سا الاؤ دہک رہا تھا جس میں آگ کی چنگاریوں کا فوارہ سا اُٹھ رہا تھا۔ الاؤ کی سرخ روشنی میں وہ لوہار یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی سمندر منتھن کے بعد اُسی آگ سے کسی سیاہ فام مورتی کی طرح برآمد ہوا ہو۔

پاس ہی ایک چھوٹا بچہ بڑے انہماک سے شعلوں کی لپ لپاتی زبانوں سے اُڑنے والی چنگاریوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سادھو

نے یہ سب دیکھا مگر اُسے بڑا تاسف ہوا کہ اُس نے اُس طرف کیوں نگاہ کی۔ پیش آنے والے حادثے نے اُسے ایک بار پھر مضطرب کر دیا اور اُس نے پاس کھڑے ہوئے شخص سے کہا۔

"آہ! اب یہ بچّہ جھلس کر مر جائے گا۔" اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص سادھو کی اس بات پر پہلے تو چونکا پھر دور جاتے سادھو کو کوئی سِڑی سمجھ کر اُس پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی اور استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ وہ بچّہ اُسی شخص کا تھا اور پچھلے کئی روز سے اسی طرح روزانہ وہاں آ کر بیٹھتا تھا اور لپ لپاتے شعلوں کا تماشا دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ اتنے میں لوہار اُٹھا اُس نے اُنگلی سے پیشانی اور گردن کا پسینہ صاف کیا اور اکڑی ہوئی شریانوں کو ڈھیلا چھوڑتا ہوا پانی پینے کے لیے اندر چلا گیا۔

سادھو تیز تیز قدم اُٹھاتا کسی اَن دیکھی انجان زنجیر سے بندھا چلا جا رہا تھا۔ سامنے نکڑ پر املی کا پیڑ تھا وہ جانتا تھا کہ اُس درخت کے سرسبز سائے تک پہنچتے پہنچتے بچے کی چیخ سنائی دے گی اور ویسا ہی ہوا۔ جوں ہی اُس نے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں قدم رکھا پشت سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ سادھو کے قدم رُکے نہیں وہ چلتا رہا۔ اب وہ گاؤں کے باہر آ چکا تھا اور اُس کا اعصابی تناؤ بھی کم ہو گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کے سامنے والی ٹیکری کے دامن میں وہ مندر ضرور ہو گا۔ چند قدم طے کرتے ہی اُس کی نظر مندر پر پڑی۔ وہ ایک پرانا بوسیدہ مندر تھا۔ جس کے ستون ڈھے چکے تھے۔ مورتی ٹوٹی پڑی تھی اور چاروں طرف تاراجی کا راج تھا۔

اس نے سوچا اب اس مندر کے ایک گوشے میں مرگ چھالا بچھائے وہ سکون اور اطمینان سے اُس کی راہ دیکھتا رہے گا۔ وہ اُس مسافر کی سی طمانیت محسوس کر رہا تھا جو ایک طویل مسافت کے بعد کسی گھنے درخت کے سائے میں پہنچ گیا ہو۔

اُس نے مرگ چھالا فرش پر بچھایا اور اُس پر اطمینان سے آسن جما کر بیٹھ گیا۔ اب باہر درخت کے پتوں کی سرسراہٹ کے سوا وہاں کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

غالباً اُس ویران مندر میں ایک عرصے سے کسی متنفس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ فرش پر دھول کی دبیز چادر بچھی تھی جس پر دروازے سے مرگ چھالا تک صرف اُس کے قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ سادھو دروازے پر نظر جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بہت پہلے آگاہ ہو چکا تھا کہ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ خواہ مخواہ کی بے صبری سے ہونے والا وقوعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا۔ اور نہ ہی کسی کے ڈرنے گھبرانے سے وہ پل بھر کے لیے ٹل سکتا ہے۔

بڑی دیر کے بعد باہر خشک پتّوں پر کسی کے قدموں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ دوسرے لمحے ایک خونخوار قسم کا نوجوان ہاتھ میں چمکدار خنجر لیے دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ نوجوان دروازے میں کھڑا اندر مندر کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"بھرت! اندر آجا۔ میں یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔" مندر کے سنّاٹے میں سادھو کی آواز گونجی۔

نوجوان اپنا نام سُن کر پہلے تو چکرایا۔ پھر سادھو کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے آثار تھے۔ سادھو کو اس کا نام کیونکر معلوم ہوا؟ آخر اُس نے کرخت آواز میں پوچھ ہی لیا۔

"تو کیسے جانتا ہے کہ میرا نام بھرت ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ بھرت اُس سے یہ سوال ضرور پوچھے گا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جواب میں اُسے بالکل

خاموش رہنا ہے۔ مگر اِس سوال نے اُس کی یادوں کے پُرسکون تالاب میں ایک ہلچل سی مچادی۔ جس طرح وہ حال کے بطن میں چھپی مستقبل کی تصویر دیکھ لیتا ہے اُسی طرح اب ماضی بھی ساکار ہو کر اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

جب گھر میں بچہ ہوا تھا تو اُسی نے اس کا نام بھرت رکھا تھا۔ مگر بچے کی پیدائش کے چند روز بعد ہی اُس کی بیوی گھر اور خاندان کی پروا کیے بغیر بچے کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ لڑکا بھی آٹھویں میں قدم رکھتے نہ رکھتے گھر سے فرار ہو گیا۔ یوں گھر کا پورا شیرازہ بکھر گیا۔ تب سے وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہا تھا۔ اُس نے مستقبل کی آنکھ سے بارہا اپنے بیٹے کی جگہ اسی خونخوار نوجوان کو اِسی بوسیدہ مندر میں اسی حالت میں خنجر بکف دیکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے اس کی رگوں میں برف جم چکی تھی۔

وہ انجانے میں اُسی گاؤں کے پاس سے کتنی ہی بار گزرا ہوگا مگر کبھی اسے وہ مندر دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کبھی اس گاؤں میں داخل ہونے کی اُس کے دل میں کوئی خواہش جاگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واقعات اپنے وقت پر ہی رونما ہوتے ہیں۔ نہ ایک پل اِدھر نہ ایک پل اُدھر جیسے ہر نقش پتھر پر کندہ کر دیا گیا ہو۔ اُس نے تصور میں اُس نوجوان کے ہاتھ میں چمکتا خنجر بھی دیکھا تھا مگر ایک عجیب ناگزیر طاقت اُسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ وار کرنے والا اور وار سہنے والا دونوں وقت کے اس بیکراں جال میں کس قدر بے بس ہیں؟ اس لیے دونوں ہی بے قصور ہیں۔ سادھو کو خاموش دیکھ کر بھرت بولا۔

"تو جانتا ہے اس بستی پر میری حکمرانی ہے۔ میرے عتاب سے لوگ کانپتے ہیں اور میری ذرا سی چاہت انھیں نہال کر دیتی ہے۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

سادھو اک اک بات جانتا تھا۔ پچھلے کتنے ہی برسوں سے مستقبل کا ایک ایک راز اُس پر افشا ہو چکا تھا۔ جب وہ اپنے اننت سفر پر گھر سے نکل رہا تھا تبھی، یا اُس سے پہلے اُس وقت جب وہ اپنے بیٹے بھرت کا نام تجویز کر رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے جب وہ خود پیدا ہوا تھا۔ یا اُس سے بھی پہلے جب اُس کے باپ کا جنم ہوا تھا یا اُس سے بھی پہلے جب پہلا انسان وجود میں آیا تھا وہ ہر منظر کو عجیب بے تعلقی سے دیکھتا آیا تھا جیسے کوئی ناٹک دیکھ رہا ہو۔ اُس کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح بے شمار انسانوں کی پیدائش اور اُن کی قسمتوں کی ناگزیریت کے ساتھ کھینچی ہوئی ایک ایک لکیر.... زندگی کا ہر بھید اُس پر کھل چکا تھا اور اب جو کچھ ہونے والا تھا اُس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ متواتر مستقبل کا تعاقب کرنے والا لمحۂ موجود ایک جست میں مستقبل کی حدود پار کر جانے والا تھا وقت کے بہاؤ میں لمحہ بھر کو ایک گرہ پڑنے والی تھی اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح پُرسکون ہو جانے والا تھا۔

"تجھ جیسے شخص کا زندہ رہنا بے حد خطرناک ہوگا۔" بھرت نے کہا۔

"میں تجھے قتل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ تیری زبان سے موت بولتی ہے۔ تیرے الفاظ تباہی اور نحوست کا علامیہ ہیں۔"

سادھو نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے مگر سچ صرف یہی نہیں ہے۔ لفظ کو واقعہ بنا دینے کا اختیار کسی کو نہیں۔ میرے الفاظ کسی وقوعے کا علامیہ بن ہی نہیں سکتے۔ تیرا یہ سوچنا غلط ہے کہ میں جو بولتا ہوں اُسی کے مطابق ہوتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے دراصل جو ہونے والا ہوتا ہے وہ مجھے قبل از وقت دکھائی دے جاتا ہے اور میں اُسے لفظوں میں محض بیان کر دیتا ہوں۔ میرا بولنا ناگزیر ہے۔ یہی میرا اشراپ ہے۔"

مندر کی شکستہ دیوار سے دھوپ کی ایک کرن اندر رینگ آئی اور فرش پر دھول کا بالشت بھر ٹکڑا کندن ہو گیا۔ تاریکی کچھ کم

ہوئی۔ سادھو کہہ رہا تھا۔

"اور سن! اپنے اس سراپ کے کارن میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بدنصیب ہوں۔ کیوں کہ اس کے سبب میں امید اور خواب کی فریب خوردہ مسرّتوں سے حظ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر میں دوسروں کے مقابلے میں بے حد مطمئن ہوں۔ کیوں کہ میں نے خواہشات کی نفی کر دی ہے۔ اس لیے دکھوں کی بھی نفی ہو چکی ہے۔ جب لاگ ہی نہیں تو لگاؤ بھی نہیں۔ اور جب لگاؤ نہیں تو دکھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تو مجھے قتل کرنے آیا ہے مگر میں موت سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ میرے دل میں تیرے تعلق سے بھی کوئی میل نہیں۔ اُس دھوپ کے ٹکڑے کو غور سے دیکھ! کیسا سنہرا رنگ ہے اس کا تھوڑی دیر میں یہ میری زندگی کے آخری لمحے کی طرح لہو رنگ ہو جائے گا۔ اُس کے سرخ ہوتے ہی سمجھ لے میرا وقت بھی آن پہنچا۔ البتہ نہ میں تجھ سے یہ کہوں گا کہ تو جلدی سے اپنا کام ختم کر اور نہ ہی زندگی کے چند لمحے تجھ سے مستعار مانگنے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ نہ تیرے چاہنے سے یہ قتل مقررہ وقت سے قبل عمل میں آسکتا ہے۔ نہ میرے چاہنے سے ایک پل کے لیے ٹل سکتا ہے۔"

سادھو بولتے بولتے رک گیا۔ اُس کی نگاہیں بھرت پر گڑی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھرت کا چہرہ سیاہ، بے جان اور بے رونق ہو گیا۔ اُس کی گردن کے گرد کالے ناگ کی کنڈلی جیسی پھانسی کی رسی کے نیل پڑنے لگے۔ سادھو نے بہت پہلے جب بھرت ابھی بچہ تھا اپنے ہاتھوں سے اُس کے گلے میں سیاہ موتی باندھا تھا کہ اُسے نظر نہ لگے اور اب اُسی گردن میں پھانسی کا پھندا دکھائی دے رہا تھا۔ اور المیہ یہ کہ اس پھانسی کا سبب وہ خود بننے والا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو مضطرب ہو گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب کچھ ناگزیر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے ہی سے مقدّر ہے اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تبھی اُس نے کمال ضبط سے آنسوؤں پر قابو پالیا اور انھیں پلکوں کے اندر ہی قید کر لیا۔

سادھو کی بات بھرت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس کا غصہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اُس کا چہرہ لال ہو گیا آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا دوسرے ہی لمحہ اُس کا خنجر والا ہاتھ سر سے بلند ہوا۔ بجلی سی کوندی اور پورا خنجر آنکھیں موندے، شانت بیٹھے اُس سادھو کے سینے میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ سادھو کے سینے سے خون کا چشمہ اُبل پڑا اور فرش پر بہتی خون کی لکیر اُس سرخ ہوتے دھوپ کے ٹکڑے کو مزید سرخ بنانے لگی۔

سندھی نظم

شیخ ایاز ترجمہ/آفاق صدیقی

گیت

بیت گئی برسات
پیا بن بیت گئی برسات
بادل گرجے، بجلی کڑکی
ساون رُت کے جھالے برسے
دل دھڑکا اور آنکھ بھی پھڑکی
ہائے یہ برہن کب تک ترسے
تڑپ تڑپ کر کس جس نے کاٹی
کالی کالی رات۔ بیت گئی برسات
نیل گگن کے سُندر تارے
گھور اندھیرے سے گھبراوے
بجھ گئے وہ جلتے انگارے
برکھا نے اولے برسائے
منہ تک آئی اور شرمائی
گھائل من کی بات۔ بیت گئی برسات
مست گھٹائیں جھوم کے آئیں
میگھ دوت نے مُدھ چھلکائی
جل تھل کی آنکھیں للچائیں
ہریالی پر مستی چھائی
آئی نہ میرے کام کوئی بھی
ساون کی سوغات۔ بیت گئی برسات
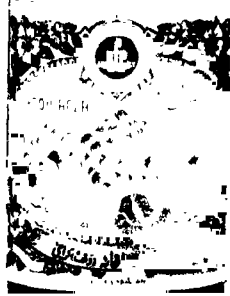
پی بی شیلے (PB SHELLEY) ترجمہ/سجاد مرزا

ایک مرثیہ

اے زمانے، زندگی، اے وقت:
تو بتلا مجھے
یہ نقوشِ پاہیں کس کے؟... جن کے پیچھے آج تک
ہوں رواں۔ لرزاں۔
پریدہ رنگ
سوچوں کا جہاں
کب پلٹ کر آئیں گے؟ شان وشکوہ وتازگی،
نہیں۔ شاید نہیں۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں!
رات دن کی گردشیں جانے بجھا دیتی ہیں کیوں؟
اک مسرت کا دیا۔ اک روشنی تسکین کی
راحتِ فصلِ بہاراں۔ سردی و گرمی کے رنگ
میرے قلبِ زار کو خوشیوں کی جانب موڑ دے
اب نہیں۔ شاید نہیں۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں!

عالم میں اِنتخاب
معنوعی اَجزا سے تیار کی جانے والی
اَشیاءِ خور و نوش کے منفی اثرات سے آگاہی کے
بعد نسلِ اِنسانی ایک بار پھر فطرت کے آغوش
میں پناہ تلاش کر رہی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ قدرتی اجزا کا مُرکّب
رُوح افزا اپنی فطری تاثیر، منفرد ذائقے اور
اعلا معیار کی بنا پر اقوامِ عالم میں
روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔
رُوح افزا
ہمدرد
انٹرنیشنل

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

فہرست مخطوطات اردو
قومی عجائب گھر پاکستان۔ کراچی
ڈاکٹر ظفر اقبال
صفحات ۴۵۸ قیمت ۵۰۰/۰ روپے
ادارہ کتابیات پاکستان، جامعہ کراچی

مخطوطات مہذب قوموں کے علمی سرمایہ کا نہایت اہم حصّہ ہوتے ہیں۔ اُن سے آئندہ علمی تحقیقات میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لہٰذا اُن کو محفوظ کرنا ایک بڑا قومی فریضہ ہے۔ دراصل ماضی کا بہت بڑا علمی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ جب تک پریس کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اُس وقت تک تمام کتابیں قلمی یا مخطوطوں ہی کی شکل میں ہوتی تھیں۔ انھیں کی نقلیں مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل جاتی تھیں۔ پریس کی ایجاد کے بعد بھی کچھ کتابیں تو زیور طبع سے آراستہ ہو جاتی ہیں لیکن بیشتر اب بھی مسوّدوں یا مخطوطوں ہی کی شکل میں رہ جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے عالم اور ادیب محنت شاقہ کے بعد کتابیں لکھتے ہیں لیکن اُن کو کوئی چھاپنے والا نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے بعد اگر کوئی قدر دان اُن کتابوں کے مسوّدوں کو محفوظ کر لیتا ہے تو وہ ضائع ہونے سے بچ جاتی ہیں ورنہ ردّی والوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے بعض ایسے ادارے قائم ہیں جو بہت سے مخطوط کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اُن ہی میں ایک "قومی عجائب گھر پاکستان۔ کراچی" بھی ہے جس سے بہت سے محققین استفادہ کر رہے ہیں۔

ان مخطوطات کو مفید تر بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اُن کی فہرستیں مرتب کی جائیں تاکہ ضرورت مندوں کو پتہ چلے کہ کون سا مخطوطہ کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ ایسی فہرستیں مرتب کرنا بڑے پتے ماری کا کام ہے لیکن بحمد اللہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس قسم کے صبر آزما کام خوش دلی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال گزرے انجمن ترقی اردو کے فاضل رکن اور محترم بزرگ افسر صدیقی مرحوم نے انجمن کے اُردو مخطوطات کی توضیحی فہرست چھ جلدوں میں مرتب کی تھی جو انجمن کی اہم ترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی موضوع سے متعلق ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ یہ قومی عجائب گھر پاکستان۔ کراچی میں محفوظ ۵۹۶ اردو مخطوطات کی فہرست ہے جن کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اور اُن سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تاکہ اُن سے استفادہ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت ہو۔ مقدمہ مختصر ضرور ہے لیکن چند سطروں ہی میں لائق مؤلف

و مرتب نے سبر ڈال کر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جن کو ہر مخطوطہ کا اندراج کرتے وقت انھوں نے ملحوظ رکھا ہے۔ کتاب کی پوری خوبیاں تو اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہیں لیکن ایک سرسری جائزے کے بعد بھی نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب محنت سے لکھی اور بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اور محققین کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

جیسی غذا ویسی صحت

سیّد محمود خاور

صفحات ۴۸ قیمت = /۱۰ روپے

این ۳/۷-۳ ایکسٹینشن ماڈل کالونی، کراچی

یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن بڑوں کے لیے بھی کچھ کم مفید نہیں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صحت مند رہنے کے لیے غذا کے معاملے میں کن کن باتوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ شروع میں غذائی گروپ دے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہر گروپ سے ہماری صحت کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتی ہے لہٰذا غذاؤں کے استعمال میں توازن قائم رکھا جائے تاکہ جسم کا مجموعی طور پر نشوونما ہو اور تندرستی بحال رہے۔

مؤلف کتاب کے مشورے اپنی جگہ پر صائب ہیں لیکن انھیں خود اعتراف ہے کہ

"آج کے دور میں اچھی غذا نہیں ملتی، ہر چیز میں ملاوٹ، صاف ستھری ہوا نہیں ملتی۔ ہر طرف گندگی اور اس پر طرہ آج کی تیز رفتار مشینی زندگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کا سکون چھن گیا جسموں میں جان نہ رہی، چہرے زرد اور بے رونق، بیچارہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔"

غذاؤں میں ملاوٹ ہی نہیں ہے بلکہ سرے سے غذائیں ہی نہیں ہیں۔ سرمایہ دار اپنی دولت میں اضافہ کی دھن میں غذاؤں کے نام پر نامعلوم کیا کیا چیزیں غریب انسانوں کے پیٹوں میں اُتار رہے ہیں جن سے نئے نئے امراض پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر بڑھتی ہوئی گرانی کے سبب یہ ناقص غذائیں بھی میسّر نہیں۔ ضرورت ہے کہ ان باتوں کا حل تلاش کیا جائے۔ غریب عوام نہ صرف زبان حال سے بلکہ زبان قال سے بھی کہہ رہے ہیں:

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

(ثناء الحق صدیقی)

پیٹرول کی کہانی

سیّد محمود خاور

صفحات ۲۵۰ قیمت = /۱۰ روپے

این ۳/۷-۳ ایکسٹینشن ماڈل کالونی، کراچی

یہ دیکھ کر کہ موجودہ دور میں پیٹرول کی کتنی افادیت و اہمیت ہے سیّد محمود خاور صاحب نے کتاب زیر تبصرہ لکھی ہے او

اس میں پیٹرول کی دریافت اور اُس کو نکالنے اور صاف کرنے کی مشینوں کے طریقہ کار وغیرہ پر کس قدر روشنی ڈالی ہے نیز پاکستان میں تیل اور پیٹرول کے ذخائر اور اُن کو نکالنے اور صاف کرنے کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے بچوں کی فہم کے مطابق اُس کا جائزہ لیا ہے۔ دنیا کا ایک نقشہ دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ پیٹرول کہاں کہاں پایا جاتا ہے اور کتنی کتنی مقدار میں نکالا جاتا ہے۔

کتاب بے حد مفید، دلچسپ اور عام فہم ہے اور نہایت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ٹی وی پر ضرورت سے زیادہ غیر سنجیدہ پروگرام دیکھ کر بچوں کا مذاق اتنا بگڑ گیا ہے کہ وہ ایسی سنجیدہ اور مفید باتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پاتے۔

(ثناء الحق صدیقی)

ہوائی جہاز کی کہانی

سید محمود خاور

صفحات ۸۰ قیمت ۱۵/۰ روپے

این ۳/۲۷۔۳۔ ایکسٹینشن ماڈل کالونی، کراچی

آج کل جب کہ ہوائی جہاز نہ صرف دور کے ملکوں کے سفر کے لیے اہم ترین سواری کا کام دے رہے ہیں بلکہ اور بھی متعدد کاموں میں استعمال کیے جا رہے ہیں، بچوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس مرحلہ تک پہنچنے کے لیے انسان کو کتنی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ کتاب زیر تبصرہ اسی مقصد سے لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہت سے بچوں کے دلوں میں ایسے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کتاب کا موضوع "ہوائی جہاز" ہے لیکن چونکہ اس کی ایجاد ایک دم نہیں ہو گئی بلکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے پہلے لوگوں کے دلوں میں ہوا میں پرواز کرنے کی تمنا پیدا ہوئی، پھر اُڑن کھٹولوں اور پر لگا کر اُڑنے کی کہانیاں وضع کی گئیں۔ پھر ان تخیلات کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی گئیں جس کے نتیجہ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں غبارے اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوائی جہاز کی ایجاد عمل میں آئی۔ کتاب زیر تبصرہ میں یہ سب باتیں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ طرزِ تحریر عام فہم اور دلنشین ہے۔ یقین ہے کہ بچے اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے۔

(ثناء الحق صدیقی)

اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات ۳۳۶ قیمت ۱۸۰/۰ روپے

وکٹری بک بنک۔ لاہور

اب تک ادبی سیمینار، کتب کی تقاریب رونمائی اور رسائل میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بہتیری تقریریں سُننے اور تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اسی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ہر تقریر میں خواہ مختصر ہو یا طویل، متعلقہ موضوع پر کہنے کے لیے کوئی نہ کوئی نیا گوشہ ضرور نکال لاتے ہیں جسے سن کر قاری کے اندر تازہ دمی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قاری کے ذہن میں لمحہ

فکر یہ سر اٹھاتا ہے یہی حال اُن کے مضامین کا ہے ہر مضمون میں عام باتوں کے علاوہ کوئی نہ کوئی نکتہ، کوئی نہ کوئی اشارہ گرہ میں باندھ رکھنے کا ضرور بیان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر و تقریر کا وصفِ خاص اسی میں مضمر ہے اس کی ایک جھلک کتاب کے صفحہ ۲۶۰ پر دیکھیے:

"بعض شعرا نظریاتی جبریت کے تحت اپنی ہر نظم میں خواہ مخواہ ایک طرح کا آدرش دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوّل تو آدرش قسم کی کوئی چیز شاعری کے لیے ضروری نہیں۔ اور ہو بھی تو اُس کی جگہ نظم کی اوپری سطح پر نہیں فن کی پُر پیچ گھاٹی میں ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مذکورہ تنقیدی کتاب کے بیشتر مضامین شخصی نوعیت کے ہیں۔ جن شخصیات پر مضامین کی عمارات تعمیر کی گئی ہیں اُن میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ادا جعفری، صبا اکبر آبادی، ماہر القادری، سلیم احمد، جمیل الدّین عالی، شاعر لکھنوی، منیر نیازی، قابل اجمیری، سرشار صدیقی، عبدالعزیز خالد، انجم اعظمی، صادقین، افتخار عارف، عطا شاد، محسن بھوپالی، اشفاق حسین، سیّد محمد جعفری، مرزا محمود سرحدی اور اقبال حسین شوقی ہیں۔ لیکن ہر شخص کے بھی اپنے رنگا رنگ عکس ہوتے ہیں، اس طرح اس کتاب میں ہمیں بہت سے رنگوں سے متعارف ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین مل کر پاکستانی شاعری اور شعرا کی ایک مجموعی تاریخ بن جاتے اور تاثر کی ایک اکائی پیش کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم صحیح معنوں میں ذات سے کائنات تک کا لطف اس کے مطالعے سے اُٹھاتے ہیں کیوں کہ ہر ذات اپنی جگہ ایک کائنات بھی تو ہوتی ہے۔ خدا کرے ڈاکٹر فرمان صاحب جیسا کہ انھوں نے کہا ہے جلد ہی اس کا دوسرا حصّہ بھی شائع کر دیں تا کہ یہ دائرہ مکمل ہو جائے۔

(ا۔ س)

تماشا

صبیح محسن

صفحات ۲۵۲ قیمت =/۱۵۰ روپے

مکتبہ جمال ایف۔ ۶۱/۳ بلاک ۷، کہکشاں کلفٹن، کراچی

ادب میں صبیح محسن صاحب اپنے افکار و احساسات کا اظہار دو وسیلوں سے کرتے ہیں ایک ظرافت، دوسرا تمثیل۔ ظرافت یا طنز و مزاح کے دو مجموعے "گر قبول اُفتد" اور "بین السطور" اپنی جداگانہ شناخت قائم کر چکی ہیں اور قارئین یہ برملا کہتے ہوئے ملتے ہیں کہ "صبیح محسن کے ہاں مزاح میں متانت ہے۔"

متانت اور مزاح بادی النظر میں ایک دوسرے کے مخالف سمت کھڑے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، دونوں صفت اور موصوف کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جب ناقدین صبیح محسن کی متانتِ مزاح کی بات کرتے ہیں تو اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن کے مزاح کا کبھی پھکڑپن سے ڈانڈا نہیں ملتا بلکہ اسے اس کے سائے سے بھی اجتناب ہے۔

صبیح محسن کے ٹی وی ڈراموں کے مجموعے "تماشا" کو اُن کے قارئین و ناقدین نے اُن ڈراموں سے یکسر مختلف گردانا جو عام طور سے ٹی وی کے لیے لکھے جاتے اور اسکرین پر پیش ہوتے ہیں۔ اس بارے میں ادب کے قاری اور ٹی وی ڈرامے کے پروڈیوسر قاسم جلالی کی آرا پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"صبیح محسن صاحب کے ڈراموں میں بڑی انفرادیت اور تازگی پائی جاتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس دور کے بعض اہم ترین مسائل کو موضوع بنایا ہے، اس بھری پری دنیا میں انسان کی تنہائی، خیر و شر کی کشمکش، سائنس اور ٹیکنالوجی کی انتہائی تیز رفتار ترقی سے پیدا ہونے والے امکانات اور اندیشے اور ایسی ہی حقیقتوں کے گرد وہ اپنی کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔"

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صبیح محسن صاحب ادب کے کسی صنف پر طبع آزما ہوں تو دوسروں سے دامن بچا کر چلنے کا طور اپناتے ہیں۔ یہی وہ روش ہے جو تخلیق کار اور اس کی تخلیقات کو دوسرے سے ممیز کراتی ہے۔ ان کا ڈراما "تکون" ہو "فلائٹ زیرو تھری" یا "لوکوشیڈ" ہو یا کوئی اور ڈراما سب کی جانب ڈراما نگار کا اپروچ اسی طور ہوا ہے۔ انھوں نے ٹی وی ڈراموں کی بھیڑ چال میں ایک نئی اور مشکل روایت کی داغ بیل ڈالی ہے اور یہ ڈراما نگار کے سائنس اور آرٹ پر یکساں درک کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔

کتاب بہت قرینے، سلیقے سے چھپی ہے۔ ڈرامے کے باب میں ایک اضافہ ہے۔

(ا۔س)

نئی صورتیں

وارث اقبال

صفحات ۹۶ قیمت =/۷۵ روپے

سی ۸۲۔ بلاک ۶، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی

"نئی صورتیں" جناب وارث اقبال کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ وارث اقبال صاحب ان دنوں صدر شعبہ انگریزی جامعہ بلوچستان کوئٹہ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری خواہ غزل ہو یا نظم، اپنے منظر نامے کے لحاظ سے عام ڈگر سے جدا نظر آتی ہے اور اس جداگانہ تناظر کے حاصل ہونے میں صاحبِ کتاب کے کوئٹہ میں قیام کا بڑا دخل ہے۔ ایک نئے تناظر میں شاعری کے پروان چڑھنے کی وجہ سے ان کی غزلیں اور نظمیں قدرے نئے پن سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ اس نئے پن کے ظاہر ہونے میں اُن کے انگریزی زبان و ادب سے درس و تدریس کے ناتے، مسلسل تعلق کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ یوں بھی کہسار کی قربت، صحرا کے سفر اور سمندر کی ہمسائیگی شاعر کی فکری اُڑان میں بہت معاون ہوتی اور اس کے شعری تناظر کو وسیع تر کرتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مناظر و مظاہر فطرت سے کون کتنا فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہر فنکار کی اپنی ذہنی اُفتاد پر موقوف ہے پروفیسر وارث اقبال کے شعری مجموعے کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے منظر نامے سے وافر فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی نظمیں "بوسیدہ پُرانا گھر"، "وادی اُورَک" اور "زمستاں کی تھکی راتیں" اس دعوے کی شہادت ہیں۔

جناب وارث اقبال کی غزلوں میں بھی یہ فضا بدرجہ اتم موجود ہے۔ نمونتاً ایک شعر درج ہے۔ اس شعر کی پوری غزل ایسے ہی

تناظر رکھتی ہے:

اڑ گئے صحن چمن سے طائران خوش نوا
ہوئے گل اب کس پرندے سے کوئی باتیں کرے

(ا-س)

دوسخنہ

آصف رضا، رضی مجتبیٰ
صفحات ۲۱۶ قیمت = /۶۰ روپے
فرید پبلشرز۔ نیو اردو بازار کراچی ۱

"دوسخنہ" جناب آصف رضا اور جناب رضی مجتبیٰ کی شاعری کا مشترک شعری مجموعہ ہے۔ اس میں آصف رضا کی نظمیں اور رضی مجتبیٰ کی غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب "فن و ادب کی آفاقیت کے نام" ہے۔ یہ انتساب بذاتِ خود دونوں شعرا کی ذہنی و فکری سطوح کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیش لفظ کے اختتام پر آصف رضا اور رضی مجتبیٰ کا نام ہے، ایسا ممکن العمل نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک بھائی نے پیش لفظ لکھا ہو اور دوسرے بھائی کا نام احتراماً شامل کر لیا گیا ہو۔

پیش لفظ کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

"اس مجموعہ کی شاعری، جو دو بھائیوں کی شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے اپنی سرشت کے اعتبار سے علامتی ہے۔"

یہاں مجھے COMTEN PORARY AMERICAN POETRY کے مرتّب ہاورڈ نمیروف کا یہ قول یاد آیا جاتا ہے کہ "میں نے شعوری طور پر اس کی جستجو نہیں کی جسے لوگ اپنی آواز، اوریجنلٹی یا ایک خاص پہچان رکھنے والے اسلوب کا نام دیتے ہیں اگر ایسا ہوسکتا ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو اپنے آپ ہوتا ہے، اس میں کسی شعوری کاوش کا دخل ممکن نہیں۔"

اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ آصف رضا کی نظمیں علامتی فضا رکھتی ہیں۔ "سات بہنیں" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ غزل میں بات اشارے کنائے میں کہنے کی روایت تو پہلے سے موجود ہے ہی رضی مجتبیٰ نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ پیش لفظ اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتا ہے اور یہ پیش لفظ ایسے موضوع پر آئے دن شائع ہونے والے مضامین سے کہیں زیادہ وقیع اور قابل مطالعہ ہے۔

کتاب اچھی چھپی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

(ا-س)

انور سدید

کچھ وقت بنگلہ دیشی کتابوں کے ساتھ

روایت و درایت / پروفیسر کلیم سہسرامی

دسمبر ۱۹۹۱ء میں مجھے غالب سیمنار، دہلی میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا تو پہلے ہی دن کلیم سہسرامی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اس محفل میں مجھے خلیق احمد نظامی صاحب سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ مالک رام صاحب کے دولت خانے تک جانے اور ان کا شریک سفر ہونے کی سعادت بھی ملی۔ تاہم کلیم سہسرامی سے ملاقات کی مسرت جداگانہ نوعیت کی تھی وہ اُس دیس سے آئے تھے جو کبھی میرا وطن تھا اور جہاں جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن اب وہ میرے خوابوں کی سرزمین تھی۔ اور اس سرزمین پر جو لوگ اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف تھے میرے نزدیک ان کا دیکھنا بھی عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ اشفاق عادل صاحب نے لکھا ہے کہ کلیم صاحب کا ذہنی افق وسیع ہے۔ ان کے مزاج میں اعتدال ہے اور ان کے معیار میں رفعت ہے۔ غالب سیمینار میں ان کا مقالہ سنا، دوسروں کے مقالات پر انھیں سوالات اٹھاتے اور اعتراضات کرتے دیکھا پھر جوابات سننے کا انداز بھی مشاہدہ کیا تو مجھے ان کی خنک مزاجی نے بہت متاثر کیا۔ وہ تیز تیز گفتگو کرتے تو گمان ہوتا کہ وہ بہت سی باتیں جلد کہنے کی فکر میں ہیں لیکن جب فریق مخالف جواب دیتا تو کلیم صاحب پورے سکون سے باتیں سنتے۔ آخری دن ملے تو وہ میرے لیے علی گڑھ سے مختار الدّین احمد صاحب کی کتابوں کے تحائف لے کر آئے تھے۔ "نقد و نظر" کے سابق شمارے دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ان رسائل کے ساتھ اپنی کتاب "روایت اور درایت" بھی رکھ دی ہے جو انھیں دنوں پٹنہ سے چھپی تھی۔

میں نے یہ کتاب لاہور پہنچ کر پڑھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی ورق گردانی دہلی میں ہی کر چکا تھا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اسے بنگلہ دیش کے ایک مصنّف نے لکھا ہے، دوسری خوبی یہ کہ اس میں چند ایسے مصنفین کو بے حد محبت اور بہت خلوص سے متعارف کرایا گیا ہے جن سے شمالی ہند اور بالخصوص پنجاب کا اردو طبقہ زیادہ شناسا نہیں، چنانچہ رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، احسن مارہروی، عبدالسلام ندوی، عبدالقادر سروری اور متعدد دوسرے نامور ادبا نے نظم و نثر کی تاریخ نگاری کا فریضہ سرانجام دیا تو اس خطّے کے بعض نامور شعرا کو نظر انداز کر دیا۔ متعدد ناقدین نے یہ نقطہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ "اردو ادب کی کوئی تاریخ راسخ عظیم آبادی، شورش، جوشش، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، نصیر حسین خیال اور خدا بخش لائبریری کے

تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔" کلیم سہسرامی نے یہ کتاب لکھ کر اس نظراندازگی کا ازالہ کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ مصنّف نے اپنے کڑے احتساب سے روگردانی نہیں کی اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور فوقیت ظاہر کرنے کے باوجود شائستگی اور تنقیدی وضعداری کو اثبات مہیا کیا اور ہر کڑے مقام سے آسانی اور کامرانی سے گزر گئے۔

"روایت و درایت" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنفین اور کتابوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ ان کا ربط روایت کے ساتھ قائم کیا جاسکے، دوسرے حصّے کے مضامین "روایت و درایت" کی ذیل میں آتے ہیں اور یہاں ادب اور ادیب شناسی کی کاوش نمایاں نظر آتی ہے۔ پہلے حصّے پر تنقیدی رجحان غالب نظر آتا ہے، دوسرے حصّے میں تحقیقی عناصر منظر عام پر لائے گئے ہیں۔

کلیم سہسرامی کے نقد و تبصرہ میں ایک نمایاں بات یہ نظر آتی ہے کہ وہ مصنّف کو اپنے آئینے سے پوری طرح منعکس کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے نظریات کی جھلک بھی دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال جناب غلام سرور کی کتاب "پرکھ" پر ان کا تبصرہ ہے جو اس کتاب کا پہلا جامع مقالہ ہے۔ "پرکھ" کے مضامین ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک کے دور میں ادبی رسائل میں چھپے تھے اور یہ وہ دور تھا جب دلی اور لکھنؤ کی مرکزیت دوسری جنگ عظیم کے اثرات کا سامنا کررہی تھی۔ آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی لیکن اوائل میں یہ واضح نہیں تھا کہ سیاست کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ کلیم سہسرامی نے جناب غلام سرور کے موضوعات اور ان کے تنقیدی عمل سے ثابت کیا کہ وہ کسی قسم کی اجارہ داری کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ غیر علاقائی نقطۂ نظر کے حامل اور ادب کی ہمہ گیر وسعت کو تسلیم کرنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کی محرومیوں کا ذکر کرنے کے باوجود انھوں نے اختر اورینوی کے ڈرامہ "شہنشاہ حبشہ" پر تنقیدی مقالہ لکھا تو اسے توصیفی نہیں بننے دیا۔ اسی طرح "ترقی پسند تحریک"۔ "اقبال کی غزلیں" اور "مواد اور ہیئت" کے موضوع پر قلم اٹھایا تو انھیں اپنے خیالات کی روشنی میں پرکھا اور اپنے نتائج کا بلاکم و کاست اظہار کردیا۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے سرور صاحب سے جابجا اختلاف کیا ہے اور اپنا قولِ فیصل سناتے چلے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ نظیر اکبرآبادی کو "جوگی" کے بجائے "باغی" قرار دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ضمن میں انھوں نے غلام سرور صاحب کے بارے میں رائے دی ہے کہ وہ لہجے کا توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور اس مضمون میں احتشام حسین، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین کے بارے میں جذباتی اور طنزیہ انداز اختیار کیا گیا ہے جو ناقدانہ سنجیدگی اور ادبی متانت کے منافی ہے۔

اس کتاب میں کلیم سہسرامی نے عشرت لکھنوی، شفق عمادپوری، صفی لکھنوی اور جلیل مانکپوری کے شاگرد الطاف حسین مانوس سے تعارف بڑی عمدگی سے کرایا ہے جو سہسرام کے ایک وہبی شاعر تھے لیکن المیہ شاعری میں اپنی مثال آپ تھے۔ بہار کے حوالے سے انھوں نے جگر مرادآبادی کے "ساقی نامہ" کو نئی روشنی دی ہے اور ڈاکٹر سعید الدین کے ساتھ مکالمے سے اس کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ یہ "ساقی نامہ" ترمیم اور اضافے کے ساتھ جگر صاحب کے مجموعہ کلام "آتشِ گل" میں شامل ہے۔ لیکن اس کتاب میں اس کا عکس شامل ہے۔ جو ۳۱ مارچ ۱۹۵۲ء کے اور جنل ورقِ پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے حصّے میں نواب نصیر حسین خیال اور صفیر بلگرامی پر دو مضامین "رسالۂ جہادیہ" اور "سہسرام کا اردو اسٹیج" چنے۔ ایسے نوادرات ہیں جنھیں بڑی قدر سے دیکھا جائے گا۔ ان مضامین سے کلیم سہسرامی صاحب کی تلاش و جستجو کا سلیقہ اور ان کی علمی لگن بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب کلیم سہسرامی کی تہذیبی شخصیت کو آشکار کرتی ہے اور ہمارے سامنے خطۂ بہار اور بنگلہ دیش میں اردو دوستی کے نقوش کو تابندہ صورت میں پیش کردیتی ہے۔

سادہ کاغذ / ایوب جوہر

بعض لوگوں کے نزدیک زندگی ایک سادہ کاغذ کی طرح ہے جس پر انسان نقوشِ حیات خود اُبھارتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی تو لکھی ہوئی کتاب ہے اور انسان اس کے لکھے ہوئے اوراق پڑھتا ہے۔ بنگلہ دیش کے افسانہ نگار ایوب جوہر نے تجزیہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ۔

"میں ساری زندگی سادہ کاغذ کی طرح سادہ رہا۔ کوئی پھول، کوئی نغمہ، کوئی زخم، کوئی آنسو....

نقطوں کی اس طویل قطار سے بظاہر یہ باور کرایا گیا ہے کہ مصنف ان سب چیزوں سے محروم ہے لیکن درحقیقت پھول، نغمہ، آنسو اور زخم تو ایوب جوہر کے گرد و پیش میں بکھرے پڑے ہیں اور وہ جس طرف بھی آنکھ اٹھاتا ہے ان میں سے کوئی ایک چیز کبھی کانوں میں رس گھولتی ہے، کبھی آنکھ میں کھٹکنے لگتی ہے اور بعد میں افسانہ بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت ایوب جوہر کے افسانوں کی کتاب "سادہ کاغذ" سے بھی عیاں ہے۔ آپ اسے زندگی کی کتاب سمجھیے، جس پر ایوب جوہر نے "بے لباس حروف"، "سفر"، "بے شکل دروازے"، "ہجرت"، "ننگا آدمی" اور متعدد دوسرے افسانے لکھے ہیں۔ دوسری طرف آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانے تو زندگی کی کتاب میں مرقوم ہو چکے تھے۔ ایوب جوہر نے انھیں چھپوا کر اور آپ کے مطالعے کی منزل سے گزار کر آپ کے احساس پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ "سادہ کاغذ" کے افسانوں میں زندگی اپنی شکل بدل بدل کر اور نئے نئے نقاب اوڑھ کر سامنے آتی ہے۔ ایوب جوہر چونکہ زندگی کا ناظر ہے اس لیے وہ ان نقابوں کے پس پردہ حقیقی شکل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس کے افسانوں کا ذائقہ بیان کرنے کی کوشش کروں تو بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ وہ کڑوے ذائقے کا افسانہ نگار ہے لیکن اس کے باطن میں ایک شیریں مزاج انسان بھی موجود ہے جو زندگی کی جراحتوں کو ایک غیر جانبدار انسان کی نظر سے دیکھتا ہے اور قاری کو اپنے مشاہدات میں شریک کر لیتا ہے۔ "سادہ کاغذ" کے افسانے ہمیں بنگلہ دیش کے سماجی منظر سے متعارف ہونے کا موقع دیتے ہیں، مغربی پاکستان کے لوگوں کے لیے یہ آنسوؤں کا تحفہ ہے۔ غم اور ملال کے الفاظ میں گندھا ہوا تحفہ۔

رنگ و بو کی سرزمین / شام بارکپوری

شام بارکپوری نے اپنے سفرنامے "رنگ و بو کی سرزمین" کا مسودہ مجھے دیا تو یوں محسوس ہوا کہ اسے اگر ابن بطوطہ اور یوسف خان کمبل پوش کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تو وہ ابن انشا سے ضرور مل چکے ہوں گے اور بنگلہ دیش کے لوگ ان سے ضرور پوچھتے ہوں گے کہ "ڈھاکہ یا کھلنا کب واپس آئے ہو اور گزشتہ پندرہ بیس برس کس ملک میں بسر کیے ہیں۔" اس قسم کے لوگوں کو اطمینان خیز جواب دینے کے لیے شام بارکپوری نے اس دفعہ سفرنامہ "رنگ و بو کی سرزمین" لکھ دیا ہے۔ اور مقصد یہ بتایا ہے کہ انھوں نے تھائی لینڈ، ملائیشیا، سنگاپور میں جو وقت گزارا اس کے لمحے لمحے کا احوال رقم کیا ہے؟

سفرنامہ "رنگ و بو کی سرزمین" نہ تاریخ کے اوراق پلٹتا ہے اور نہ جغرافیے کی سیاحت کراتا ہے، یہ زمانۂ حال کے رواں لمحوں کو گرفت میں لینے کی حسین کاوش ہے۔ اس سفر میں شام بارکپوری کا ہمزاد "فیروز" ان کے ساتھ بیشتر مقامات پر موجود ہے اور داخل کی اس آتشِ فروزاں میں مبتلا ہے جو اکثر اوقات موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے پر بھی آمادہ کر دیتی ہے۔ شام بارکپوری صاحب اس ہمزاد کے پاسبانِ عقل ہیں وہ منہ زور جذبوں کو لگام دیتے ہیں وہ ان بے لگام جذبوں کے کانٹے دار پر کاٹتے

ہیں۔ لطیف اور کثیف جذبوں کی کشمکش نے اس سفر نامے کو افسانے اور ناول کی طرح لذیذ بنا دیا ہے۔ میرے خیال میں بنگلہ دیش سے چھپنے والا یہ پہلا سفر نامہ ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے اسے آمادۂ سفر ہو جانے کی دعوت دیتا ہے۔ سفرنامہ پکچر پیلس کھلنا سے دستیاب ہے۔

مٹی کی خوشبو/احمد سعدی

احمد سعدی میرا معاصر افسانہ نگار ہے۔ کیفیت اس اجمال کی یہ ہے کہ آزادی سے قبل قدوس صہبائی بمبئی سے ایک خوبصورت اور درخشاں لیکن ارزاں ہفت روزہ "نظام" شائع کیا کرتے تھے۔ میں اس پرچے کا افسانہ نگار تھا، قدوس صہبائی اس ابتدائی ادبی تعارف میں میرے معاون تھے اور نئے لکھنے والوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ احمد سعدی کو بھی میں نے سب سے پہلے "نظام" ہی میں دیکھا تھا۔ ان کے افسانے کا عنوان "ایک رات" تھا اس کے بعد ان سے ایک طویل ملاقات بھی بمل مترا کے ناول "کوڑیوں کے مول" کے ترجمے سے ہوئی جو "نقوش" میں قسط وار چھپا تھا۔ علاؤالدین آزاد کے ناول "کرنافلی" کا خوبصورت ترجمہ بھی ان کا ایک کریڈٹ ہے۔ "مٹی کی خوشبو" احمد سعدی کے طبعزاد افسانوں کی کتاب ہے جس میں ان کے نو افسانے "تیسرا دن"، "بے گھر"، "چہرہ"، "بے زبان"، "پہلا آدمی"، "مٹی کی خوشبو"، "شب گزیدہ"، "پاگل ہاتھی" اور "دور کا رشتہ" شامل ہیں۔

احمد سعدی بنیادی طور پر انسانی دکھ کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ زندگی کے واقعات رنج و غم جمع کرتے ہیں اور اپنے بے لاگ، سچے اور قدرے کھردرے انداز میں افسانے کا روپ دے دیتے ہیں۔ انھیں اپنے دل پر گزرنے والی واردات کی شاید پروا نہیں لیکن وہ ماحول کے بھیانک چہرے میں خوش رنگ تبدیلی لانے کے آرزومند ضرور ہیں، اگرچہ ان کے افسانے اداسی کی تہہ میں لپٹے ہوئے ہیں لیکن ان سے مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا اور وہ اپنی مٹی کو زندہ دیکھنے کی آرزو میں پھول، کھلاتے اور کانٹے جمع کرتے چلے جا رہے ہیں۔ احمد سعدی ان افسانوں سے بنگلہ دیش کی سماجی زندگی کی عکاسی کر رہے ہیں اردو ان کے اظہار کا بہترین وسیلہ نظر آتا ہے۔

نجم و شرر/حلقہ فکر و دانش ڈھاکہ

جب مشرقی پاکستان کے ادبی افق پر مغربی پاکستان کے بیوروکریسی کے متعدد ستارے جگمگا رہے تھے تو اس دور میں ایک شدید نوعیت کا ردِعمل جنم لے رہا تھا۔ اس ردِعمل کے دوران ہی مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کر لیا، بیس ہزار اہلِ قلم کم ہوتے ہوتے صرف دو سو رہ گئے نوشاد نوری کے مطابق "ان کا نہ کوئی تہذیبی ماضی تھا، نہ ثقافتی حال اور نہ سماجی مستقبل" لیکن ہونٹوں پر جمی ہوئی برف کو پگھلانے کے لیے حلقہ فکر و دانش کی نشاۃ ثانیہ برپا کی گئی اور عہد کیا گیا کہ بنگلہ دیش کو اردو تہذیب کا موہن جوڈارو نہیں بننے دیا جائے گا۔ اس کا ایک ثبوت زیر نظر کتاب "نجم و شرر" ہے جس میں بنگلہ دیش میں پروان چڑھنے والی غزلیہ شاعری پیش کی گئی ہے۔ ۱۹۷۲ء کے بعد قائم رہ جانے والے آدھے پاکستان کو طارق بنارسی، فرقان ادریسی، صابر عظیم آبادی، شرر آروی، حصیر نوری، کلیم رحمانی اور متعدد دوسرے شعرا سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کتاب میں نوشاد نوری اور ڈاکٹر یوسف حسن کے دیباچے شامل ہیں اور ان میں بنگلہ دیش میں اردو کو زندہ رکھنے کی آرزو نمایاں ہے۔ کاش ایسی مزید کتابیں شائع ہوں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں اردو پل کی صورت اپنا وجود قائم رکھے۔

گرد و پیش

جناب مالک رام کی وفات پر انجمن ترقی اردو پاکستان اور ادارہ یادگارِ غالب کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ

۵ جون ۱۹۹۳ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان اور ادارۂ یادگارِ غالب کی جانب سے ممتاز غالب شناس، محقق، عالم اور ادیب جناب مالک رام آنجہانی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کا نیپا آڈیٹوریم میں انعقاد ہوا۔ جلسے کی صدارت جناب آفتاب احمد خاں نے فرمائی۔ اسٹیج پر صدر کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی اور محترمہ رعنا فاروقی سیکریٹری ادارہ یادگارِ غالب بھی موجود تھیں۔ نظامت و تعارف کے فرائض ڈاکٹر اسلم فرخی، مشیر علمی و ادبی انجمن نے انجام دیے۔

جلسے کا آغاز ڈاکٹر اسلم فرخی نے خود اپنے مضمون سے کیا۔ انھوں نے جناب مالک رام کی کتاب "ذکرِ غالب" اور "تلامذہ غالب" کا ذکر کیا۔ "ذکرِ غالب" کو اس کے مؤلف کی دید و دریافت کا ایک اچھا نمونہ قرار دیا۔ "تلامذہ غالب" کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب غالب شناسوں میں جناب مالک رام کی قدر و منزلت بڑھاتی ہے "تلامذہ غالب" ان کا ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے ان کی غیر معمولی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ جناب مالک رام کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کے حوالے سے کہا کہ اُن کی وسعتِ معلومات، تبحرِ علمی اور اسلام سے آگاہی بے مثال ہے۔ جس کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔

جناب مسعود احمد برکاتی نے اپنے مضمون میں جناب مالک رام کی چار جلدوں پر مشتمل تصنیف "تذکرہ معاصرین" کا ذکر کیا اور اس حوالے سے کہا کہ یہ مالک رام صاحب کا یادگار کام ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھوں نے مالک رام صاحب کے علمی رویے کے بارے میں کہا کہ وہ اپنی تحریروں میں اور تحقیقی نتائج میں اُچک یا اونچی اُوڑان کے قائل نہیں تھے اُن کی تحریریں ایک نرم رو دریا کی طرح بہتی ہیں۔ اُن کو شور دریا کے مقابلے میں سمندر کا سکوت زیادہ پسند تھا۔ ان کا ایک اختصاص غالب پر بے شمار کام ہے۔ تلامذۂ غالب کی ایک سو بیاسی شخصیات کا کھوج لگانا اور ایک ایک دانہ سمیٹ کر لڑی میں پرونا غیر معمولی استقلال چاہتا تھا۔ جو انھوں نے بحسن و خوبی کر دکھایا۔

جناب ایم ایچ عسکری نے اپنی تقریر میں دلی میں جناب مالک رام سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب ایک روز پاکستانی سفارت خانے میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے آ نکلے۔ سلام کلام کے بعد بڑی سادگی سے سوال کر دیا "مرزا صاحب کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ میں سمجھا وہ مرزا غالب کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں، میں ایسے سوال کے لیے تیار نہ تھا سوچ میں پڑ گیا خود کو مجتمع کرنے لگا۔ اب انھوں نے جس انداز سے مخاطب کیا اُس سے معلوم ہوا کہ وہ مرزا غالب کو نہیں سعید مرزا صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، میں انھیں کیا بتاتا مجھے تو یہ جان کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کئی پشت سے میرے خاندان کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ جناب عسکری نے کہا جب میں جنوری ۱۹۹۱ء میں دہلی گیا تو اُن سے ملنے گیا۔ ادبی حلقے کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی تو جناب مالک رام نے بتایا کہ ایسا لگتا ہے کہ دلی کے ادیب ادب کے معاملے میں تو پُرخلوص ہیں، لیکن ادیبوں کے

معاملے میں مخلص نہیں۔ گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ انھیں کا ذکر کرتے ہیں، جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اپنے قیام کے دوران یہ دیکھا کہ دلّی کی کوئی ادبی محفل ایسی نہیں جس میں جناب مالک رام نہ شریک ہوئے ہوں۔ دراصل مالک رام صاحب ANTI PR TYPE کے آدمی تھے۔

میرے لیے اُن کے انتقال کی خبر سے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی مجھ میں سے گزر گیا ہے:

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے جناب مالک رام کی شخصیت و فن پر ایک جامع مقالہ پڑھا، انھوں نے کہا کہ مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالب" کے متعلق ڈاکٹر عابد حسین کی رائے ہے کہ ان کی یہ کتاب اُن تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب پر کی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے مزید کہا کہ محقّق ہونے کے باوجود مالک رام صاحب کی تحریر تازہ کاری اور شگفتگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے کہنے کا مقصد شاید یہ ہے کہ مالک رام کی تحریر عام محققین کی طرح ٹھس نہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی تقریر میں جناب مالک رام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جناب مالک رام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے دور کے چند بڑے محققوں مولوی عبدالحق، عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مختارالدّین آرزو کی صف میں شمار ہوتے تھے۔ جناب مالک رام اچھا ادب، بڑا ادب اور چھوٹا ادب کے جھمیلے میں نہیں پڑتے تھے۔ اُن کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بڑے موضوع کا انتخاب کرتے تھے۔ ان کا ایک موضوع "غالب شناسی" تھا اور پھر دوسرے موضوع کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا انتخاب کیا دونوں اپنے اپنے زمانے کے یگانہ روزگار تھے اور صرف موضوع کا انتخاب بھی کوئی ایسی اہم بات نہیں، جو بات مالک رام کو ممیز کرتی ہے وہ موضوع کا حق ادا کرنا ہے۔ "عورت اور اسلام" اُن کی ڈیڑھ دو سو صفحات کی کتاب ہے، لیکن اس سلسلے میں اپنے تبحر علمی کا جو ثبوت فراہم کیا ہے اس کے بعد اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابوں اور فتووں کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ میرا کام تو اس وقت شکریہ ادا کرنا تھا لیکن میں چند باتوں سے PROVOCATE ہو گیا ہوں لہٰذا اس سلسلے میں اپنی معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔ اوّل یہ کہ آنجہانی مالک رام انجمن ترقی اردو (ہند) کے کئی مرتبہ صدر رہ چکے ہیں جسے مولوی عبدالحق کی انجمن ترقی اردو کے کُل کا ایک حصہ سمجھیے۔ اس ناتے ہمارا فرض بنتا ہے یا تھا کہ ان کی خدمات کے اعتراف میں ہم اس طرح کا ایک تعزیتی جلسہ ترتیب دیں۔ ہمارے مقالہ نگار اور مقررین نے جو کچھ اظہار خیال کیا اُس سے تین باتیں جناب مالک رام کے سلسلے میں سامنے آئیں وہ یہ کہ وہ عربی پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ خلیق و مخلص اور غالب شناسی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایم ایچ عسکری کی رائے درست ہے کہ مالک رام صاحب PR کے آدمی نہیں تھے، اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ عالی صاحب نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا میری بھی مالک رام صاحب سے کئی بار کی یاد اللہ تھی۔ ہر ملاقات میں اپنی معلومات کے لیے اُن سے کوئی نہ کوئی سوال کر بیٹھتا تھا۔ وہ نہایت متانت سے جواب دے کر قائل کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے مالک رام صاحب سے پوچھا "غالب پر آپ نے اتنا کام کیا، اُن کی شخصیت و فن کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جو آپ کے ذکر میں نہ آیا ہو، سوائے شرح کلام غالب کے آخر آپ نے غالب کے کلام کی شرح پر کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی؟ جواب میں انھوں نے کہا "تم تو شماریات کے آدمی ہو، طبیعیات پر لکھتے رہتے ہو۔ تمھیں کہکشاں کے شمار کا اندازہ ہے؟ میں نے کہا یہ کہکشاں ۸،۷ لاکھ کھرب میل لمبی اور ۱۸ لاکھ کھرب میل چوڑی ہے، اس پر جناب مالک رام نے

دریافت کیا یہ حساب کتاب تو ایک کہکشاں کا ہے اب ذرا بتاؤ باقی کہکشاؤں کی تعداد کیا ہے؟ عالی صاحب نے جواباً کہا ایک عرب کے قریب کہی جاتی ہیں۔

یہ سن کر جناب مالک رام نے کہا اب ذرا غالب کا یہ شعر دھیان میں لاؤ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور سوچو جو شخص اس سے آگے نکل کر دشتِ امکاں کو نظر میں رکھ رہا ہو اُس کے فکر کا کوئی کیا شرح کرے گا۔ کم سے کم اس کے کلام کی تہہ داری اور درون بینی تک رسائی کا خود کو اہل نہیں پاتا۔ اس لیے میں نے اس دشت کی سیاحی کے لیے قدم نہیں بڑھایا۔ کلام غالب کی شرح کے باب میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ غالب کے فارسی کلام کے بغیر غالب کا مطالعہ مکمل نہیں۔

اب اس جواب کے آگے جناب مالک رام سے کوئی کیا سوال کر سکتا تھا پھر بھی عالی صاحب نے پوچھ ہی لیا تو پھر شرح کلام غالب کا مسئلہ کس طرح حل ہو؟"

عالی صاحب نے اپنی گفتگو کا اختتام اس پر کیا کہ حقیقت میں مالک رام کے اُٹھ جانے سے اردو ادب کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آخر میں جلسے کے صدر جناب آفتاب احمد خاں نے حاضرین کو یہ کہتے ہوئے مخاطب کیا میں تو اس منزل میں ہوں "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"

صدر نے اپنی تقریر کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا اردو ادب کی اس عظیم شخصیت مرزا غالب پر کوئی بھی شخص کام کر سکتا ہے۔ یہ کام رُکا نہیں۔ مسلسل کیا جا رہا ہے لیکن اس میدان میں کام کرنا اور لوہا منوانا صرف مالک رام صاحب کے حصے میں آیا غالب کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اُن کو مالک رام میسر آئے۔ مالک رام اُن معدودے چند محققین میں سے ایک تھے جنھوں نے غالب شناسی میں اکیلے اتنا کچھ کر دیا ہے جو بہت سے مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

اقبال فریدی کے افسانے کی رونمائی

گزشتہ دنوں ایک علمی و ادبی ادارے "ڈائیلاگ" کی جانب سے پاکستان امریکن کلچر سینٹر (PACC) میں معروف افسانہ نگار جناب اقبال فریدی کی کتاب "اقبال فریدی کے افسانے" کی تقریب اجرا ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر فہیم اعظمی مدیر ماہنامہ "صریر" نے فرمائی۔ میزبانی کے فرائض جناب آفتاب مضطر نے انجام دیے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد تقریب کا آغاز PACC سے متعلق خاتون مسز اسماء احمد کے مختصر کلمات سے ہوا۔

محمد سبکتگین صاحب نے "ڈائیلاگ" کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہر ادبی ادارہ "ٹائپ" قسم کا بن جاتا ہے، اور کسی نہ کسی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے لیکن "ڈائیلاگ" اب تک گروہی مصلحتوں سے پاک ہے۔ میں مسز اسماء احمد کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے "ڈائیلاگ" کی اس تقریب کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔

جناب منصور مانی نے اپنے مضمون کی توضیح کے لیے بیچ بیچ میں مین گانے والوں کی آوازیں سنوائیں ایک کا نام یاد رہ گیا،

وہ نصرت فتح علی ہیں تینوں گانے ایک قبیل کے تھے، ان کی لَے بہت تیز اور آڑی ترچھی تھی ایک گانے والے کا انداز کچھ ایسا بیانیہ تھا کہ اس پر نثری نظم کا گمان ہوتا تھا۔

موسیقی کے ان نمونوں کو سن کر "بے سمت بھاگ دوڑ" اور کان پڑی آواز نہ سنائی دینے والے بے ہنگم شور سے واسطہ پڑا۔ منصور مانی کا مضمون بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بجائی گئی موسیقی اور منصور مانی کے مضمون میں کون کس کا پس منظر تھا۔ البتہ منصور مانی کی یہ بات چونکاتی ہے کہ اب کے ادب کو ایک نیا لہجہ موسیقی سے ملے گا، اُس موسیقی سے جو آواز کی گرد اُڑاتا ہے۔

ڈاکٹر مشرف احمد نے اپنے مضمون میں اپنے خاص اسلوبِ تحریر کو برقرار رکھا اور اقبال فریدی کے کئی افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا اس کے لیے افسانوں کے بطون تک رسائی حاصل کی صرف گھوڑا دوڑاتے اور راہگیروں کو خاک پھانکنے کا سبق سکھاتے ہوئے نہیں گزرے۔ انھوں نے آخری بات یہ کہی کہ اقبال فریدی نے اپنے مجموعے میں اکہری کہانیاں نہیں لکھیں۔

عشرت حمید صاحب نے پروفیسر عتیق احمد کا مضمون پڑھ کر سنایا جو بہ وجوہ تقریب میں نہیں آسکے تھے۔

پروفیسر عتیق کو یہ محسوس ہوا کہ اقبال فریدی اپنی کتاب کے پہلے ہی افسانے میں "جدیدیت" سے ہٹے نظر آتے ہیں۔ اقبال فریدی انھیں اپنی جدیدیت کے باوجود اپنے جیسے لگے عام جدیدیوں کی طرح نہیں۔ جو اپنی ذات ہی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔

ڈاکٹر آئی یو خان نے کہا اختصار آج کی پہلی ضرورت ہے۔ اس کا کھلا ثبوت اقبال فریدی کے افسانوی مجموعے میں شامل پندرہ افسانے ہیں۔ کوئی تمہید نہیں، کوئی فضا بندی نہیں، ایک بات کہنی ہے سو کہیں سے شروع کی اور کہیں پہ ختم کر دی۔ اقبال فریدی روٹین کے آدمی نہیں ہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اختصار سے لکھنے والا معنی آفرینی کا دلدادہ تو ہوگا ہی....

انور شعور نے کہا کرشن چندر، بیدی اور رام لعل کا عہد ختم ہونے کے بعد رشید امجد اور خالدہ حسین کا دور آیا اقبال فریدی ان کے بعد کی نسل کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے تاثراتی ہیں اور انھیں اسی طور پر پڑھنا چاہیے:

آخر میں تقریب کے صدر ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کہا اقبال فریدی کے افسانے کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی تمام شاخیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہی ہیں ہر دور اپنے حساب سے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی اسلوب وضع کرتا ہے لیکن کوئی وضع شدہ اسلوب ساقط نہیں ہو جاتا البتہ اس کارواں میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال فریدی نے افسانے کا مواد اپنی زندگی سے لیا ہے۔ کوئی شئے ماورائی یا سپر نیچرل نہیں ہے۔ اقبال فریدی کی اپنے فن پر گرفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے اگرچہ اقبال فریدی کی یہ پہلی کتاب ہے لیکن پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی کتاب نہیں ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا جشن متحدہ عرب امارات میں

یونی کیرینز انٹرنیشنل (UNIKARIANS INTERNATIONAL) دبئی کے زیر اہتمام مئی کے آخر میں عالمی سطح پر برصغیر ہندو پاک کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کا جشن دبئی، ابوظہبی اور العین (متحدہ عرب امارات) میں منایا گیا۔ جس میں پاکستان اور ہندوستان کے شعرا شریک ہوئے۔ برصغیر کے نامور شاعر حضرت محشر بدایونی (کراچی) نے تینوں شہروں میں اس جشن کی صدارت فرمائی۔

گزشتہ برس جب یونی کیریئرز انٹرنیشنل دبئی کے زیر اہتمام قتیل شفائی کا جشن منایا گیا تھا تو جگن ناتھ آزاد نے دبئی، ابوظہبی اور العین میں اس جشن کی صدارت کی تھی۔ یونی کیریئرز انٹرنیشنل کا طریق کار یہ ہے کہ اس کی جانب سے ہر سال باری باری پاکستان اور ہندوستان کے ایک نامور شاعر کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس جشن کے منانے میں ایک خوبصورت روایت جس پر پابندی سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے یہ ہے کہ جب پاکستان کے شاعر کا جشن ہوتا ہے تو ہندوستان کے شاعر کو صدارت کی دعوت دی جاتی ہے اور جب ہندوستان کے شاعر کا جشن منعقد ہوتا ہے تو پاکستان کے شاعر کو صدارت کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔

(نامہ نگار)

فلاڈلفیا میں اسلام کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کی نمائش

اسلام کے بارے میں لکھی گئی کتابوں اور عربی زبان کی دیگر کتابوں کی پہلی نمائش فلاڈلفیا، پینسلوانیا میں ۱۰ سے ۱۶ ستمبر تک منعقد ہوگی۔ نمائش کے منتظمین کو امید ہے کہ یہ نمائش نہ صرف مشرق وسطیٰ سے امریکہ پہنچنے والی کتابوں کی مانگ اور اس سے وابستہ کاروبار میں اضافہ کا سبب بنے گی بلکہ اس کے نتیجے میں ثقافتی آگہی میں بھی اضافہ ہوگا۔

فلاڈلفیا عرب امریکن ایسوسی ایشن کے سیکریٹری اور نمائش کے مارکیٹنگ ڈائریکٹر اسام ٹی ماصری کا کہنا ہے کہ اکثر امتیازات نفرت کی وجہ سے جنم نہیں لیتے بلکہ اس کی وجہ لاعلمی ہوتی ہے۔ جب آپ کسی کے بارے میں پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اس طرح خیالات کا تبادلہ شروع ہوتا ہے انھوں نے کہا اس نمائش کا مقصد تہذیبوں کے درمیان زیادہ ادراک کو فروغ دینا اور امتیازات کو کم کرنا ہے۔ اسی لیے ہم بیرونی ممالک میں اس بزنس کو فروغ دینے میں امریکیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور غیر ملکی پبلشرز کو ایسے مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ امریکہ کی مطبوعات اور ٹیکنالوجی کو دیکھیں اور انھیں خریدیں۔

ماصری کے مطابق امریکہ میں ۷۰ لاکھ سے زائد مسلمان رہائش پذیر ہیں اور تقریباً ۳۰ لاکھ امریکی شہری عرب نژاد ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پینسلوانیا کی ریاست میں عرب باشندوں کی کافی آبادی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پینسلوانیا کے قصبوں، ایسٹن، بیتھلیہم اور ایلنٹن کے سرکاری اسکولوں میں عربی ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے مگر پبلک لائبریریوں میں عربی زبان میں ایک بھی کتاب موجود نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کا ازالہ کرنے کے لیے ہم نے فلاڈلفیا کی فری لائبریری سے رابطہ کیا ہے اور وہ وہاں کے تمام عوامی کتب خانوں میں عربی زبان کی کتابیں، موسیقی اور وڈیو فلمیں مہیا کرنے پر رضامند ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر سال ایسے ہی بک فیر کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ کمیٹی کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ خریدنے اور فروخت کرنے والوں کے درمیان سالانہ رابطے کی تنظیم کی حیثیت سے کام کرے۔

کمیٹی نے اس سلسلے میں ۱،۴۰۰ غیر ملکی پبلشرز، ۵۳۷ امریکی پبلشرز اور ۱،۵۰۰ تقسیم کنندگان اور فروخت کنندگان کو دعوت نامے بھیجے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۰،۰۰۰ دعوت نامے کالجوں، یونیورسٹیوں، لائبریریوں اور پیشہ ور تنظیموں اور اسکالروں کو بھیجے جائیں گے۔ ماصری نے کہا کہ فروری کے وسط تک ہمیں ۷۶ ایسے جوابی خطوط موصول ہوچکے تھے جن میں مثبت جواب دیا گیا ہے جب کہ ۲۰ خطوط میں محتاط انداز میں خدشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس نمائش میں جن ممالک کے نمائندوں کی شرکت متوقع ہے۔ ان میں تیونس، شام، مصر، اردن، قطر، کویت، پاکستان، بھارت، قبرص اور ملائیشیا شامل ہیں۔

ماصری نے بتایا کہ اس نمائش میں مالی اور مغربی افریقہ کے کئی ممالک کی شرکت بھی متوقع ہے۔ اس کے علاوہ ۶۰ دعوت

نامے انڈونیشیا بھی بھیج چکے ہیں اور ہم نے کئی غیر مسلم ممالک کو بھی مدعو کیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم آنے والوں کا خیر مقدم کریں گے اور اس نمائش میں کتابوں کی عام فروخت کی اجازت ہوگی۔ امید کی جاتی ہے کہ اس نمائش سے مذہب اسلام اور عربی ثقافت کے بارے میں امریکیوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ ایک کہاوت ہے کہ "قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے" اس لیے کتابوں کی فروخت ہتھیاروں کو فروغ دینے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

(خبر و نظر، امریکی شعبہ اطلاعات۔ اسلام آباد)

۳۲۹ زبانوں کی سرزمین........ امریکہ

امریکہ کے مردم شماری بیورو کا کہنا ہے کہ اس وقت پورے ملک میں ۳۲۰ زبانیں اور بولیاں کسی نہ کسی انداز سے سنی اور بولی جارہی ہیں۔ یہ اس مسلسل ہجرت کا نتیجہ ہے جو امریکہ میں ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے جاری ہے۔ یورپ، افریقہ، ایشیا، جاپان ہر علاقے کے لوگ اس ملک میں آکر مستقلاً بس تو ضرور گئے مگر اپنی مقامی زبان کے ساتھ ان کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ گھر سے باہر انگریزی بولتے ہیں اور گھروں میں اپنی مادری زبان۔

امریکہ کے مشہور اخبار THE USA TODAY نے اس صورت کا تجزیہ یوں کیا ہے کہ گھروں میں اپنی اپنی زبانیں بولنے والوں میں سے ۵۶ فیصد لوگ بڑی اچھی انگریزی لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ جب کہ ۲۳ فیصد لوگ بس گزارے کی انگریزی بول پاتے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ گھروں میں اپنی مقامی زبان استعمال کرنے والے ۹۰ فیصد لوگ جو زبانیں استعمال کر رہے ہیں ان کی تعداد ۲۰ ہے جس میں ہسپانوی زبان اوّل نمبر پر ہے۔ تقریباً ایک کروڑ تہتّر لاکھ لوگ ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔

محبّت خان بنگش کو ادبی ایوارڈ دیا گیا

پاکستان سوشل ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) بہاولپور کے مرکزی صدر مجاہد کشمیری غازی لفٹننٹ محمد ایاز خان (فخرِ ملت) کی زیر نگرانی ضلع کونسل ہال جھنگ میں منعقدہ عالمی سوشل ورکرز کانفرنس ۱۹۹۳ء کے موقع پر کوہاٹ کے شاعر ادیب اور سینئر صحافی محبت خان بنگش کی دینی، سماجی اور بالخصوص ادبی خدمات پر سوشل ایوارڈ دیا گیا۔

قبل ازیں سال ۱۹۹۲ء میں کل پاکستان سوشل ورکرز کانفرنس منعقدہ فیض الاسلام کمپلیکس راولپنڈی میں بھی انھیں میڈل (ستارہ سماج) سے نوازا گیا تھا۔

سیّد قمر ہاشمی کا انتقال

"خبر نامہ ہمدرد" کے نائب مدیر، ممتاز شاعر و ادیب سیّد قمر ہاشمی اللہ کو پیارے ہوئے۔ انتقال کے وقت وہ ستّر سال کے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں ایک فرزند سجاد ہاشمی کو سوگوار چھوڑا ہے۔

سیّد قمر ہاشمی سیّد احمد شہیدؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تین کتابیں جو طویل نظموں کی صورت میں ہیں۔ ("احمد مرسل ﷺ"، "زوان ساگر"، "دانائی کا آفتاب لینن") کے موضوع پر ہیں۔ ایک کارنامے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ادب میں تادیر یاد رکھی جائیں گی۔

ادارہ "قومی زبان" سیّد قمر ہاشمی کی رحلت پر سوگوار ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین و احباب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

علمی، ادبی، سوانح و تذکرے

ابو سعادت جلیلی	حشر کی زندگی کا سفر شخصیت اور خدمات پر ایک طائرانہ نظر	صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء ص ۲۵
اطہر سلیمی	سیالکوٹ کے قدیم فارسی شعرا	ماہ نو، لاہور مئی ۹۲ء ص ۲۳
اکبر حیدری کاشمیری	لالہ سری رام اور خمخانۂ جاوید	قومی زبان، کراچی جون ۹۲ء ص ۲۹
اکبر رحمانی، پروفیسر	نوح ناروی اور خاندیس	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۹
اوپندر ناتھ اشک	کج کلاہ کا بانکا شاعر، وامق جونپوری	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۷۵
ناور رضوی نگرامی	ڈاکٹر عندلیب شادانی، حیات و کلام	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۸۸
داؤد رہبر، ڈاکٹر	میر کی سیرت۔ا	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۳۹
ذکی دہلوی	ڈاکٹر وفا راشدی، ایک تعارف	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۶۳
سید جاوید اقبال	شعرا اردو کی تذکرہ نگاری! پاکستانی دور	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۵
سید مسعود حسن	مولوی محمد شفیع، ایک قاموسی شخصیت۔ قسط اول	صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء ص ۱
سید مسعود حسن	مولوی محمد شفیع، ایک قاموسی شخصیت۔ قسط دوم	صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۲ء ص ۱
علی جمال نقوی	باغی شاعر، قاضی نذر الاسلام	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۶۸
علی محمد خاں، ڈاکٹر	لاہور میں فارسی شاعری کی قدیم روایات	صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۲ء ص ۴۸
فردوس انور قاضی، ڈاکٹر	مجتبیٰ حسین، ایک مطالعہ	آگہی، کراچی سالانہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۲۸
کریم بخش خالد	سندھی ادب کے اکابرین	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۲۷
معین دانش	ابتدائی اردو عہد کا شاعر، سید فضل علی افضل	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۵۳
نجیب جمال، ڈاکٹر	یگانہ کا قیام لاہور	صحیفہ، لاہور جنوری مارچ ۹۲ء ص ۱۰۰
وفا راشدی، ڈاکٹر	صحرا میں چاند، شاعروں کا تذکرہ مصنف: سرور انبالوی	الولی، حیدر آباد مارچ ۹۲ء ص ۳۸

تعلیم و تدریس، مسائل و مباحث

ابرار احمد بگوی	تعلیمی اصلاح ایک ناگزیر ضرورت	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۲ء ص ۲۸
الطاف رسول	نظام تعلیم اور اخلاقی انحطاط	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۳۱
الطاف رسول	ملک میں تعلیم اور کتب خانوں کی اہمیت	اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۲۵
اویس سبحانی	سائنس کی درسی کتابیں	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۹۵
صفدر حسین بھٹی، پروفیسر	برصغیر میں تعلیمی ارتقاء	اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۳۱
عبدالرؤف نوشہروی، پروفیسر	قرون وسطیٰ میں تعلیم نسواں	آگہی، کراچی سالنامہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۱۳۰
قیصر مشتاق، پروفیسر	پاکستان میں ریاضی کی اہمیت	سائنس میگزین، کراچی مئی ۹۲ء ص ۷۶
قیصر مشتاق، ڈاکٹر	پاکستان کی یونیورسٹیاں	مطالعہ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۶
مظفر حسین غزالی	عورتوں کی تعلیم، ماضی اور حال	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ فروری ۹۲ء ص ۴۴
نثار احمد ہوتھ	سرسید کی بلوچستانی بیٹی، زبیدہ جلال اور مسئلہ تعلیم	مطالعہ پاکستان، کراچی جون ۹۲ء ص ۲۲

علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی، فلاحی ادارے اور تحریک

آباد شاہپوری	تاریخ جماعت اسلامی	ترجمان القرآن، فروری ۹۲ء ص ۲۰
ابووارث جمیل	ریڈ کراس اور اس کا آغاز	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۲ء ص ۴۲
بادفروش	علامہ نیاز فتحپوری، یادگاری لیکچر ۱۹۹۱ء جشن نیاز و نگار	صریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۸۲
رشید اشرف سیفی، مولانا	دارالعلوم کراچی	البلاغ، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۴۹
رشید نثار	پچیس برس، اوراق کی معیت میں	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۶۸

ریاض الدین عطش، خواجہ	المنائی ایسوسی ایشن آف شکاگو کا چھٹا عالمی مشاعرہ ۱۹۹۱ء	آگہی، کراچی مئی ۹۲ء ص ۳۴
زینت جہاں	سندھ مدرستہ الاسلام	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۶۱
مجاہد لکھنوی	ماہنامہ حریم لکھنؤ، اجراء واشاعت	طلوع افکار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۷۷
محمود احمد غازی، ڈاکٹر	مدرسہ رحیمیہ، برصغیر کی ایک انقلابی درس گاہ	البلاغ، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۱۰۵
محمد منصور مدنی، مولانا	امریکہ میں ایک دینی مدرسے کی داغ بیل	البلاغ، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۴۱
....	انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام "مولوی عبدالحق ادبی لسانی خدمات" چار روزہ بین الاقوامی....	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۷

سیاست، صحافت، امور مملکت

ابوسفیان اصلاحی	الرسالہ، ایک مشہور عربی مجلہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارش ۹۲ء ص ۴۲
اظہر علی، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر اور آل انڈیا مسلم لیگ	العلم، کراچی دسمبر ۹۱ء ص ۸۴
خورشید احمد، پروفیسر	نفاذ شریعت ایکٹ پر اعتراضات کا ایک علمی محاکمہ (۲)	ترجمان القرآن، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۳۸
سہیلہ عزیز	سید عبدالحفیظ، مسلم صحافت کی ایک تاریخ ساز شخصیت	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۳
سید مودودی	اسلامی انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ اور اس کے تقاضے	ترجمان القرآن، فروری ۹۲ء ص ۱۲
صفیہ صدیقی	کمیونٹی میں اردو اخبارات کا کردار	اخبار اردو، اسلام آباد اپریل ۹۲ء ص ۱۲
عبیداللہ فہد	ابن خلدون کے تجربی سیاسی افکار، ایک تنقیدی مطالعہ	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۷
فوزیہ چودھری	اردو کی مزاحیہ صحافت	ماہ نو، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۵۸
مبارک علی، ڈاکٹر	جمہوریت	سائنس میگزین، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۲۵
نیاز احمد	یوم مئی ایک تاریخ ساز دن	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۵

موسیقی، مصوری، خطاطی اور دیگر فنون

ادیب سہیل	ٹھمری کا دوسرا اہم اسکول۔ کلکتہ	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۲۱۵
افضل پرویز	موسیقی میں پنجاب کا حصہ	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۲۰۳
انور زاہدی	مصور جمال شاہ کا فن	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۲۲۲
انور سدید، ڈاکٹر	بشیر موجد کی اسلامی خطاطی	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۸۹
جولیٹ ہائی ایٹ	فن کا سلطان، راجہ چنگیز سلطان (مصور)	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۷ء ص ۳۷۶
رشید ملک	موسیقی کی تاثیر کا مسئلہ.....۲	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۶ء ص ۱۰۷
رشید ملک	موسیقی کی تاثیر کا مسئلہ.....۳	ادبیات، اسلام آباد ۹۱/۱۷ء ص ۳۶۷
رشید ملک	موسیقی کی تاثیر کا مسئلہ.....۴	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۱۹۱
ف س اعجاز	آرٹ اور پروفیشنلزم	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۲
نسیم نیشوفوز	پال سیزاں، ایک فنی مطالعہ	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۲۷۷
نسیم نیشوفوز	تاثریت پسندی، فنون لطیفہ کی اہم تحریک	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۳

مطالعہ کتب

آفاق صدیقی	بھٹکتی نسلیں / خورشید قائم خانی	کندن، کراچی فروری مارچ ۹۲ء ص ۵۹
ابوسعد	اطبا اور ان کی مسیحائی تصنیف: حکیم مختار احمد	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۲ء ص ۳۶
احمد زین الدین	صحرا سے گلستاں تک، ایک نظر میں (مجموعہ کلام مبارک مونگیری)	حریم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۶۱
احسن جمال، ڈاکٹر	دانائے سبل، سیرت نبوی ﷺ مصنف: حکیم محمد سعید	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۰۱
احمد حسن قریشی، ڈاکٹر	پنجابی کتابیات مؤلف ڈاکٹر شہباز ملک.....	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۱۸ء ص ۳۰۶

دریں الدین	بے انت سفر، شاہد کامرانی کے افسانوں کا مجموعہ	اظہار، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۶۱
قمر جہاں	اور آگ، تنقیدی مقالات شفیق احمد شفیق	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۷۷
قمر راہی	ثلاثہ غسالہ/تالیف، حکیم حبیب الرحمن، ترجمہ و تعلیقات عارف نوشاہی..	فکر و نظر، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۷۷
یب سہیل	جنم کنڈلی، ڈاکٹر فہیم اعظمی کا ناول	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۲۸
رار احمد سہاوری، پروفیسر	سورج مالا طفیل ہوشیار پوری کی تازہ شعری تصنیف	تخلیق، لاہور مئی ۹۲ء ص ۱۹
سرار احمد قریشی	اردو ادب کی مختصر تاریخ/ڈاکٹر انور سدید	تحریریں، لاہور دسمبر ۹۱ء ص ۱۷
شرف سلیم	پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء انتخاب شعری ادب مرتب شہزاد احمد......	ماہ نو، لاہور مارچ ۹۲ء ص ۹۱
فتخار عارف	ملاقاتیں ادھوری ہیں. شعری مجموعہ عطا	ماہ نو، لاہور فروری ۹۲ء ص ۸۷
فتخار اسل شاہین	سچائیاں، حسرت کاظمی کا دوسرا شعری مجموعہ	صریر، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۶۸
فسر ساجد	رچنا/علی اکبر عباس	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۵۰۷
کبر حمیدی	چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات).....	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۸۷
لیاس عشقی، ڈاکٹر	سندھ کی جدید اردو شاعری، ایک سنگ میل....	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۷
امام اعظم، ڈاکٹر	آنکھوں دیکھی......	صریر، کراچی ۹۲ء ص ۴۷
امجد اسلام امجد	پنجابی ادب وا رتقاء......	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۲۹۶
انور سدید، ڈاکٹر	سمندر آنکھیں......	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۴۱۱
انور سدید، ڈاکٹر	چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل.....	تحریریں، لاہور نومبر ۹۱ء ص ۴۱
انور سدید، ڈاکٹر	حیات وحشت، ڈاکٹر وفا راشدی	ادب لطیف، لاہور فروری ۹۲ء ص ۴۷
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ.....	قومی زبان، کراچی فروری ۹۲ء ص ۸۷
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ.....	قومی زبان، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۸۴
انور سدید، ڈاکٹر	نذر مختار.....	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۳۱
باقی احمد پوری	ریشم جیسے خواب.....	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۱۰۳
پرویز پروازی	زرد ستارہ/انجم منور....	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۲۲
توصیف تبسم، ڈاکٹر	دیئے کی آنکھ.....	ادبیات، اسلام آباد ۱۶/۹۱ء ص ۲۹۸
توصیف تبسم، ڈاکٹر	زرِ سخن....	تحریریں، لاہور نومبر ۹۱ء ص ۴۴
ثناء الحق صدیقی	مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی دفتر دوم (اردو ترجمہ)....	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۹۸
جلیل عالی	دشتِ نظر سے آگے....	ادبیات، اسلام آباد ۱۷/۹۱ء ص ۴۹۸
جمیل آذر	دشت نظر سے آگے.....	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۱۸
جمیل نظر	کمند حرف.....	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۴۷
حنیف فوق، ڈاکٹر	حرفِ دل میں، شعری مجموعہ....	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۴۷
خواجہ حمید یزدانی، ڈاکٹر	سیاست نامہ کشمیر و پنجاب (اردو ترجمہ)	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ۲۸۵
خورشید خاور امروہوی	مکاں شیشے کا....	تحریریں، لاہور جون ۹۲ء ص ۳۳
دکی دہلوی	گلہائے خنداں	العلم، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵۷
ابد فخر محمد ماجد	شاہراہِ آزادی....	فکر و نظر، اسلام آباد مارچ ۹۲ء ص ۸۹
رحمان مذنب	اردو ادب کی مختصر تاریخ....	نیرنگ خیال، راولپنڈی اپریل ۹۲ء ص ۱۷
رفیق سندیلوی	منتخب ہائیکو (دو کتابیں)...	صریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۶۸
سرور انبالوی	مہران نقش/مقالات.....	اظہار، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۷۵
رفیق سندیلوی	سرابوں کا صدف....	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۴۳۵
زاہد حسن	آسمان.....	تحریریں، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۶
زاہد حسن	نئے پرانے، کلاسیکی شعرا کے دواوین سے انتخاب....	ماہ نو، لاہور جون ۹۲ء ص ۸۸
زاہد حسین	شہر میں شام....	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۹۴

مصنف	عنوان	ماخذ
ساحل احمد	کشش....	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۳۲۶
سعادت سعید، ڈاکٹر	فرد نژاد/شعری مجموعہ....	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۸۱
سعید انجم	بے گھر آنکھیں، شعری مجموعہ حضرت شاہ	انشاء، کلکتہ اپریل مئی ۹۲ء ص ۸۱
سہیل احمد خاں، ڈاکٹر	شہر میں شام/جاوید انور	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۸۶
سید عاشور کاظمی	مٹھی بھر تارے/باقر نقوی کا دوسرا شعری مجموعہ	انشاء، کلکتہ فروری مارچ ۹۲ء ص ۴۱
سید قوی احمد، پروفیسر	حیات وحشت اور ڈاکٹر وفا راشدی	آگہی، کراچی جون ۹۲ء ص ۴۷
سید محمد تقی	سچائیاں/حسرت کاظمی کا شعری مجموعہ	کندن، کراچی فروری مارچ ۹۲ء ص ۵۳
سید معراج جامی	منتخب ہائیکو/مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۱۰۶
سید معراج جامی	صحیفۂ حمد/مجموعہ حمد و نعت لطیف اثر	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۱۰۸
سید معراج جامی	حیات وحشت ایک مطالعہ/ڈاکٹر وفا راشدی	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۱۰۴
سیدہ عنبرین نوشاد	خواب اور آئینہ/ڈاکٹر سعدیہ نسیم کا مجموعہ کلام	اظہار، کراچی مئی ۹۲ء ص ۹۹
شریف کنجاہی	چار دن کی چاندنی/شعری مجموعہ اکبر عباس	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۸۲
شفیق سرشار	مظفر حنفی، حیات، شخصیت اور کارنامے/محبوب راہی	دائرے، کراچی مئی جون ۹۲ء ص ۱۰۴
عتیق احمد	رحمتی گندھا/افسانے	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۱۱
عتیق احمد	کھٹی میٹھی باتیں/حیدر بیابانی کی گیتوں اور غزلوں کا مجموعہ	دائرے، کراچی مارچ اپریل ۹۲ء ص ۱۰۰
عشرت رومانی	خواب میرے اگر بکھر جائیں/ساحر شیوی	کندن، کراچی فروری مارچ ۹۲ء ص ۵۶
عشرت رومانی	زندگی پھر بھی اچھی لگی/وقار مانوی کا شعری مجموعہ	صریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۸۰
غالب عرفان	جامی کا "جام انا" رحمن جامی کا پہلا مجموعہ کلام	دائرے، کراچی جنوری فروری ۹۲ء ص ۱۱۴
فرخندہ لودھی	سمندر آنکھیں/نسیم احمد تصور کا مجموعہ کلام	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۳۱۴
فصیح رضوی	سفر آخر سفر ہے/طاہر اسلم گورا کے افسانوں کا مجموعہ	تحریریں، لاہور دسمبر ۹۱ء ص ۲۳
فہیم جوزی	تیسری دنیا کا افسانہ/مرزا حامد بیگ (دو مضامین کا مجموعہ	ادبیات، اسلام آباد ۱۶/۹۱ء ص ۲۹۱
کلیم رحمانی	حصار/ڈاکٹر فہیم اعظمی کے افسانوں کا مجموعہ	صریر، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۷
کلیم رحمانی	احسن لڑکی ایک تجزیہ/توصیف چغتائی کی کہانیوں کا مجموعہ	صریر، کراچی مئی ۹۲ء ص ۲۷
محمد خاں کلیم	دانائے سبل/حکیم محمد سعید	محفل، لاہور اپریل ۹۲ء ص ۱۲۳
محمود اسیر	خالد اقبال یاسر کی شاعری "در و بست" کے آئینے میں	فنون، لاہور ستمبر ۹۱ء ص ۱۰۱
مخدوم منور	اندر سمندر، ایک جدید شعری پیکر (آذر حفیظ کا شعری مجموعہ)	وجدان، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۲۱
ممتاز احمد خاں	ناول دریا کے سنگ، ایک تجزیہ	دریافت، کراچی جنوری ۹۲ء ص ۳۹
میرزا ادیب	رفیع پیر کے ڈرامے	صحیفہ، لاہور جولائی دسمبر ۹۱ء ص ۷۷
میرزا ادیب	مہران نقش، ایک جائزہ....	صریر، کراچی اپریل ۹۲ء ص ۷۰
میرزا ادیب	گلابوں والی گلی[1]	اوراق، لاہور سالنامہ دسمبر ۹۱ء ص ۳۱۶
میرزا ادیب	سرگوشی/غلام الثقلین نقوی	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۳۱۱
ناصر الدین البانی	مستقبل اسلام کیا ہے؟[2]	حکمت قرآن، لاہور جنوری ۹۲ء ص ۳
نجیب جمال، ڈاکٹر	تدریس اردو/ڈاکٹر فرمان فتحپوری	آگہی، کراچی تحقیق نمبر اپریل ۹۲ء ص ۳۸
نصر عباس نقوی	گناہ کی مزدوری/مرزا حامد بیگ کا چوتھا افسانوی مجموعہ	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۱۵
نظیر صدیقی	بیسویں صدی کا اردو ادب/ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	ادبیات، اسلام آباد ۱۸/۹۲ء ص ۳۰۹
وزیر آغا، ڈاکٹر	رچنا/علی اکبر عباس کی شعری کتاب	اوراق، لاہور جون جولائی ۹۲ء ص ۳۳۳

(۱) نیلم احمد بشیر کا اولین افسانوی مجموعہ ۱۹۹۰ء

(۲) محدث العصر ناصر الدین البانی کی تالیف سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ کا پہلا باب۔ ترجمہ عطاء الرحمن ثاقب حافظ محمد خضر

ایک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا

۱۹۹۱-۹۲ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر

۲٫۲۵ روپے

فی یونٹ منافع کا اعلان

اپنے یونٹ یافتگان میں ۳ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔

سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔

یونٹ داروں کے لیے فوائد

سال خریداری	آغاز سال پر قیمت	منافع	گزشتہ قیمت پر اضافہ	کل یافت	فی صد
۱۹۹۱	۱۲٫۵۰	۲٫۲۵	۰٫۵۰	۲٫۷۵	۲۲٪
۱۹۹۰	۱۲٫۲۰	۲٫۲۵	۰٫۸۰	۳٫۰۵	۲۵٪

۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت خریدکردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ

صدر دفتر

نیشنل بینک آف پاکستان بلڈنگ ... پوسٹ بکس ... کراچی

شاخیں:

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

اگست ۱۹۹۳ء　　جلد ۶۵　　شمارہ ۸

بدل اشتراک
فی پرچہ ـــــ ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

مضمون نما

بابائے اردو کے خطوط ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام	----------	۴
بابائے اردو کے خطوط محترمہ حمیدہ اختر کے نام	----------	۳۷
بابائے اردو کے خطوط ظفر عمر کے نام	----------	۴۸
جناب ظفر عمر کا خط بابائے اردو کے نام	----------	۵۲
ہمارے مولوی صاحب	حمیدہ اختر	۵۳
سفر بے شرط	ڈاکٹر ظفیر الحسن	۸۹
رفتار ادب	ا۔ س۔ شہاب قدوائی	۹۹
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۱۰۵
گرد و پیش	----------	۱۱۱
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۱۱۷

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

بابائے اردو مولوی عبدالحق اسی مہینے ۳۲ برس پہلے ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو ہم سے جدا ہوئے تھے۔ تب سے ہر سال ان کی برسی کے موقع پر ماہنامہ "قومی زبان" اپنا اگست کا شمارہ بابائے اردو نمبر کے بطور شائع کرتا ہے۔ اس کے لیے مشاہیر اہل قلم سے مضامین لکھوائے جاتے ہیں. اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس شمارے میں خصوصی اہمیت کی چیزیں شامل کی جائیں اور یہ خصوصی اشاعت بابائے اردو کے ہر طرح شایان شان ہو۔

چنانچہ حسب روایت اس شمارے کا اختصاص یہ ہے کہ اس مرتبہ بابائے اردو کے تقریباً تین درجن غیر مطبوعہ خطوط کے عکس شائع کیے جارہے ہیں۔ اردو کے مکاتیبی ادب میں ان خطوط کی حیثیت نوادر کی ہے۔ یہ خطوط ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، بیگم حمیدہ اختر اور ان کے والد "نیلی چھتری" کے مصنف جناب ظفر عمر بی۔اے کے نام لکھے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر رائے پوری کی بیگم محترمہ حمیدہ اختر نے "ہمارے مولوی صاحب" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون خاص طور پر "قومی زبان" کے لیے لکھا ہے اس سے مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے تازہ گوشے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً باہر لیے دیے رہنے والے مولوی صاحب درونِ خانہ کیسے باغ و بہار اور محبت و شفقت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اس مضمون میں پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق کی زندگی کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جو اب تک عام نگاہوں کے سامنے نہیں تھا۔ بیگم اختر حسین رائے پوری اُن معدودے چند شخصیات میں سے ہیں جنھیں مولوی صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جس اپنایت کا اظہار مضمون کے عنوان "ہمارے مولوی صاحب" سے ہوتا ہے یہی اپنا یت شروع سے آخر تک جاری و ساری رہتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ "قومی زبان" کے قارئین بابائے اردو کے خطوط اور محترمہ حمیدہ اختر کے مضمون کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

پچھلے دنوں کراچی کی اہم ادبی شخصیات مشہور نقّاد جناب شمیم احمد اور بزرگ شاعر جناب قمر ہاشمی کا انتقال ہو گیا۔ ادارہ اُن کے انتقال پر سوگوار اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ مرحوم شمیم احمد انجمن ترقی اردو سے ایک عرصے تک وابستہ رہے ہیں۔ اس لیے ان کی وفات اہل انجمن کے لیے ذاتی سانحے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو کے بزرگ اور ممتاز محقّق مالک رام صاحب کی یاد میں عنقریب "قومی زبان" کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جارہا ہے جس کے لیے ہمارے بعض اہل قلم مضامین لکھ رہے ہیں۔

کہہ دینا کہ اگر وقت لگا تو گاڑی کے منہ آ جا کے آئے۔

امید ہے کہ اب تمھاری صحت بالکل اچھی ہوگی۔ خصوصاً

جب کہ تمھیں کوئی دُکھ دینے والا نہیں ہے۔

تمھارا ملیر!!

بابا

"بابائے اردو نے جتنی مدّت تک جس پامردی، خلوص اور قابلیت سے اردو کی نوع بنوع خدمات انجام دی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی تمام زبانوں کے جتنے خدمت کرنے والے گزرے ہیں ان میں شاید ہی کوئی دوسرا مولوی صاحب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ انیس نے اپنے بارے میں جو کہا ہے:

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

وہ یقیناً صحیح ہے لیکن یہ مقولہ مولوی صاحب پر جتنا صادق آتا ہے کم از کم اس صدی کے آخر تک شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ مولوی صاحب نے اردو کے تحفظ و ترقی کے لیے سب سے پُر خطر اور مشکل دَور پایا لیکن ان کی ہمت میں فرق نہیں آیا۔ ان کی کوشش اور قربانی سے اردو، ہندوستان اور پاکستان کی تمام زبانوں کی صف اوّل میں کھڑی نظر آتی ہے اور اس طرح کھڑی ہوئی ہے کہ بے شمار مخالفتوں کے باوجود اپنی جگہ سے ہٹی نہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کو یہ حیثیت دلانے میں مولوی صاحب سب سے آگے ہیں اور کسے معلوم ان کے جلائے ہوئے دیے سے کیسے کیسے اور کتنے اور دیے جلیں گے اور کتنی اور کیسی روشنیاں دور و نزدیک پھیلیں گی۔ بلاشبہ مولوی صاحب اردو کے محسنِ اعظم ہیں۔

خدا کی بارگاہ سے ایک دوسرے بابائے اردو کا متمنی، منتظر اور ملتجی!"

رشید احمد صدیقی

[illegible]

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی ذات میں خود انجمن اردو ہیں۔ ان کی ساری عمر اردو کی خدمت میں گزری سچ تو یہ ہے کہ بابائے اردو کا خطاب مولوی عبدالحق کے قامت پر راست آتا ہے۔"

جسٹس ایس اے رحمٰن

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad. (Dn.)

بمبئی - ہوٹل میجسٹک

۲۱ مارچ ۳

عزیز سلمہ - مجھے لکھنؤ [illegible] علی گڑھ [illegible] - میں یہاں سے

۲۳ کی شب کو [illegible] ایکسپریس سے روانہ ہوں گا اور

۲۵ مارچ کو علی الصبح دہلی پہنچوں گا [illegible] ۱/۲ ۷ بجے

پہلی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہو جاؤں گا -

عبدالحق

"جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لیے، مسٹر جناح نے پاکستان کے لیے کیا۔ وہ کام اردو کے لیے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا۔ بلاشبہ عبدالحق صاحب نے اپنے خون سے اس زبان کو سینچا ہے۔"

کرشن چندر

[illegible]

"مولوی عبدالحق نے سادہ نگاری کو ترقی دی۔ نقد و تبصرہ کی نئی راہ نکالی۔ اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی۔ اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا ایک زندہ ادارہ ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

انتظار اور کروں گا۔ اگر انجمن نے لغت کا مسودہ نہ بھیجا تو مجبوراً کسی دوسرے مکتبے
سے یہ کتاب چھپوانی پڑے گی۔ چونکہ اس کے متعلق میرا کام بھی کر دیا ہے
اور یہ میرا ذاتی نقصان ہوگا کہ جو روپیہ میں نے انجمن کے اخراجات کر دیا ہے
وہ مجھے اپنی ذات سے ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے بعد انجمن کا الجھن سے یا مجبور
ہو جاؤں گا۔ مجھے اب کسی اور نقصان کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہاں
قابل اطمینان طور پر بغیر کسی معاوضہ کے ہو سکتا ہے۔ اگر ہے تو تم انجمن سے کہو کہ فوراً
مسودہ واپس کر دیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے اطمینان دلاتا ہوں کہ انجمن مسلسل
کام دیتی رہے گی۔ لیکن کسی کو فائدہ ہونے پر میں کوئی روپیہ نہیں دیتا۔
لہذا اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ہر مہینے اپنا کام بھیج دیں اور
جتنا کام آئے گا اسی حساب سے فوراً رقم اس کی معرفت میں بھیج دیا کروں گا
میں نے ۱ اکتوبر سے یونیورسٹی سے اپنا تعلق قطع کر لیا ہے۔ تمام سامان
باندھ رہا ہوں۔ میں یہاں ۱۵ یا زیادہ سے زیادہ ۲۰ اکتوبر
تک ہوں گا۔ اس کے بعد دہلی چلا جاؤں گا۔ اگر تم جلد لکھو تو یہاں کے پتے پر
ورنہ لطیفی پریس، دلی دروازہ، دہلی کی معرفت لکھنا۔

میں تمہارے خط کا منتظر رہوں گا۔

تمہارا خیر طلب

مالک

انجمن ترقی اردو (ہند)
Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India).

دھولیا
۲۰ مارچ ۳۶ء

عزیزمن ۔ میں آج کل سفر میں ہوں ۔ فروری کے آخری ہفتے سے دہلی سے چلا ۔ بمبئی
گجرات، کرناٹک کا دورہ کرکے یہاں پہنچا ہوں ۔ اب مہاراشٹر کا دورہ کر رہا ہوں
شہروں کے علاوہ قصبات اور دیہات میں بھی گیا ۔ لوگ عام طور پر اردو کے
دلدادہ معلوم ہوتے ہیں ۔ تمھارا خط میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہا ۔ کئی روز ہوئے
ایک گاؤں بھوسٹ نامی میں ملا ۔ روز جواب لکھنے کا ارادہ کرتا تھا
مگر موقع نہ ملا ۔ آج دھولیا میں تھوڑا سا وقت مل گیا تو یہ خط لکھ رہا ہوں
میں ادھر کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں ۔ کامران کی بیماری کا حال سن کر بہت
افسوس ہوا ۔ بیچاری حمیدہ اس وقت بہت پریشان ہوگی، لیکن میں ملک کے
اس قدر دور ہوں کہ کچھ نہیں کرسکتا، جس کا مجھے اور افسوس ہے ۔ اگر دلی میں
ہوتا تو فوراً جاتا اور جو کچھ ممکن ہوتا کرتا ۔ میرا دورہ ۱۵ اپریل سے
پہلے ختم نہیں ہوگا ۔ دور دراز سفر کرنا پڑتا ہے اور کہیں ایک روز یا بعض
بڑے مقامات دو روز سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ملتا ۔ تھک کر بالکل
ادھ موا ہوگیا ہوں ۔ تم گھبراؤ نہیں، انشاءاللہ میں وہاں پہنچ کر سب حالات دیکھوں گا۔

"گورکی کا بچپن" کا ترجمہ میں نے دیکھا ، اچھا ترجمہ ہو گیا ہے ، مجھے پسند ہے۔
لیکن بعض مقامات کہیں کہیں ایسے آ گئے ہیں کہ میں اصل سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا
شائع یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کی طرف سے نہیں ہو گی ۔ وہاں سے طلب کر کے
مقابلہ کروں گا ۔ اور اس کو بہ فوراً چھپنے کو دے دوں گا ۔ ترجمے کا
قصہ برابر پہنچتی رہنی چاہیے تاکہ کتابت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے ۔
امید ہے کہ تمہارا کام جلد ختم ہو جائے گا ۔ اور ڈاکٹر صاحب کی ڈگری
مل گئی ہو گی ۔ اور تمہاری دیرینہ تمنا پوری ہو گئی ہو گی ۔

خیر طلب
عبدالحق

"اردو زبان نے جو ہندوستان کے بہت بڑے حصے کی زبان ہے اور سارے ملک کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں جتنی ترقی کی ہے اس میں مولانا عبدالحق صاحب کی کوششوں کو بہت دخل ہے مولوی صاحب نے نہ صرف اردو کے حال کو استوار بنایا بلکہ اس کے مستقبل کو پائیدار بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی یعنی اردو کی محبت جو ان کے دل میں تھی۔ اس کی لگن دلوں میں لگا دی اور اس کا پیام سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیا۔ آج اردو نہ صرف مشرقی علوم بلکہ مغربی علوم و فنون سے بھی مالا مال ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہے اور ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ اُن تحریکوں کا نتیجہ ہے جن کی روحِ رواں مولوی عبدالحق صاحب کی ذات تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند

گورکی کا ترجمہ بھی جلد ختم کرنے کا ارادہ ہے
کیونکہ وہ اس سال کا پروگرام ہے۔ امید ہے
کہ تم سب خیریت سے ہوگے۔ مخلص
عبدالحق

"مولوی عبدالحق عہد آفریں شخصیتوں میں سے تھے اور ہمیں فخر ہے کہ ہم نے ان کی آنکھیں دیکھیں ہیں۔ وہ ہم سب کے اُستاد تھے۔ ہم نے ان سے زبان سیکھی اور کام کرنے کی لگن بھی انھوں نے جو چراغ جلائے ان کی ضیا پاشی میں کبھی فرق نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ حجرہ نشین درویش نہ تھے۔ میدان کے مجاہد بھی تھے۔ اپنا چراغ بجھانے سے پہلے وہ بہت سے چراغ جلا گئے۔ بزم امروز انھیں چراغوں میں سے ہے۔ اس جماعت کے متعلق میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب اسے ہمیشہ عزیز رکھتے تھے۔ یہ ان طالب علموں اور نوجوان لکھنے والوں کی جماعت ہے جنھوں نے بابائے اردو کے مشن کو اپنایا ہے۔ میری تمنا فقط یہ ہے کہ کہیں مولوی صاحب کے نام لیوا اور حلقہ بگوش ان کے نام کو بھی اسی طرح تعویذ کے طور پر استعمال نہ کرنے لگیں جس طرح اقبال کے بہت سے مداح اقبال کے نام کو استعمال کرنے لگے ہیں اور جس کی وجہ سے بعض معترضین کو کہنے کا موقع ملتا ہے کہ وہ ایک مرد تن آسان تھا۔ تن آسانوں کے کام آیا۔

قدرت اللہ شہاب

"مولوی عبدالحق سے زیادہ مخلص خادم، اردو کا مجھے دوسرا نہیں ملا اور نہ اب تک کسی نے اردو کی اتنی زیادہ عملی خدمت کی ہے۔ اُن سے زیادہ سچا محبِ وطن اور ایک "مشترکہ ہندوستانی قومیت" کا حامی، میں نے نہیں دیکھا۔ میں انھیں اپنے عزیز ترین دوستوں اور بزرگوں میں شمار کرتا ہوں۔"

پنڈت سُندر لال

قومی زبان (۲۵) اگست ۱۹۹۳ء

ٹیلیفون ۶۲۹۰
Phone 6290

حبشی گوڑہ حیدرآباد دکن
انجمن ترقی اردو (ہند)
Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
1, Daryaganj, Delhi. (struck out)
۱- دریا گنج دہلی

مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء

عزیزی سلمہٗ -

تمہارا خط پہنچا - میں دو ایک روز کے لیے حیدرآباد
سے باہر چلا گیا تھا - اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی -
اب ہندوستانی ڈکشنری کے کام کی ضرورت نہیں ہے - جو حصہ باقی
رہ گیا ہے میں خود دیکھ لوں گا - بات یہ ہے کہ بہار گورنمنٹ نے
دو سال سے اپنی امداد بند کر دی ہے - یہ کام میں نے اپنے ذمے
لیا تھا اس لیے اس کا خرچ میں اپنے پاس سے کر رہا تھا - میں
اپنا تمام سرمایہ انجمن کو دے چکا ہوں اور میری پنشن میں
اتنی گنجائش نہیں کہ اپنے پاس سے خرچ کروں - البتہ انجمن
کا مسلسل تم کو ملتا رہے گا - گارساں دتاسی کا ترجمہ
مکمل کر دو - اپریل لائبریری سے اطلاع حاصل ہوئی کہ وہاں
گور کی کی شیریں صبح نہیں ہے - یہ کہاں سے حاصل کی جائے؟
دو سو کا چیک حمید کے نام آج ملکہ کے پتے سے بھیج
رہا ہوں -

چھپے ہیں۔ [illegible] ہے۔ لیکن [illegible] تیار ہو گئی ہے۔
بہرحال اگر آپ کا ارادہ یہ تیار نہیں ہو۔ تو [illegible] تیار کر لو۔

میری آنکھوں پر اب بار پڑنے لگا ہے اور [illegible]
سے دکھ آ جاتی ہے۔ اس لئے مجھے بہت افسوس ہے۔ [illegible]
بھی ڈاکٹر [illegible] لکھا ہے۔

[illegible] دعا اور [illegible]

خیر طلب
[illegible]

عبدالحق

"دنیا میں کبھی کبھی ایسے انسان بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو صرف پیدا ہونا جانتے ہیں مرنا نہیں جانتے۔ ان کی زندگی کی پیمائش سال و ماہ سے نہیں بلکہ ان کے کردار و عمل سے کی جاتی ہے، اور انہی انسانوں میں سے ایک ڈاکٹر عبدالحق ہیں، تاریخ کے نقش غیر فانی، داستان ادب کے سب سے بڑے ہیرو اور جریدۂ عالم پر ایک مہر دوام! ان کے متعلق یہ سوال کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ خدمت زبان کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ بلکہ ہمیشہ یہ پوچھا جائے گا کہ کیا نہیں کیا؟" "اس اجمال کی تفصیل کبھی ختم ہونے والی نہیں"

علامہ نیاز فتحپوری

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, (India.)
Branch AURANGABAD, (Deccan).

انجمن ترقی اردو (ہند)
شاخ اورنگ آباد (دکن)

۲۶ / اکتوبر ۱۹۴۲ء

مکرمی و معظمی سلمہ — تسلیم

تمہارا رجسٹرڈ پارسل حیدرآباد سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا
عید اور دسہرے کی تعطیلات میں یہاں آ گیا کیونکہ ان دنوں میں
وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ہفتے میں دہلی چلا جاؤں گا۔
ترجمے کا ابتدائی ۴۸ صفحات کا ترجمہ اردو میں شائع ہوگا
غالباً آپ کا معاوضہ ادا کر دیا گیا تھا۔ مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں۔ میں
مصلح الدین صاحب کو لکھتا ہوں کہ اگر آپ کا معاوضہ ادا کر دیا گیا ہو تو
وہ رقم وضع کر کے باقی رقم آپ کو ادا کر دیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ
کہ آئندہ حساب صاف رہے اور آپ کو رقم ادا کرنے میں کوئی تاخیر
اور ترجمہ وصول ہوتے ہی معاوضہ ادا کر دیا جایا کرے۔

میں نے انجمن [illegible] کے متعلق شیخ [illegible] کو لکھا تھا۔ جس پر

اور آپ سے بہت دنوں سے بات ہو رہی ہے اور یہ سن کر نہایت افسوس ہوا کہ انجمن [illegible]

گرفتار ہو گئے ہیں۔ ایک وقت سے ان کا کارکن کا خیال نہ تھا۔ لیکن افسوس کہ

میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ پر اس کا کوئی اثر نہیں [illegible]۔ میں گورنمنٹ

کی پالیسی بخوبی جانتا ہوں میری بات کون سنے گا اور میں گورنمنٹ سے اس

سے یہ درخواست کرتا ہوں — غرض یہ معاملہ یوں ہی رہ گیا۔

مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ انجمن کی [illegible] نہیں اور [illegible]

[illegible] میں دقتیں آ رہی ہیں۔ میں دہلی آ کر اس بارے میں

تم سے مشورہ کروں گا۔

حمیدہ اور [illegible] کو دعا

"سن رسیدہ علماء میں جو ادبی تحقیقات اور زبان اُردو پر جدید معروض اصول کے مطابق ناقدانہ تصنیفات کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں مولانا عبدالحق ہیں نہ صرف عالم بلکہ اس یادگار کام (یعنی جامعہ عثمانیہ) کو جن دماغوں نے بنایا ہے، اُن میں شامل ہونے کے باعث بھی اُن کا پیہم ذکر آتا ہے۔ مولانا عبدالحق کا علمی تبحر جامعہ میں تصنیفی مادہ پیدا کر رہا ہے۔"

خالدہ ادیب خانم

[illegible] ترجمہ ختم ہو جائے [illegible] تعجب لگتا چاہیے۔ [illegible]
بہت ہی کرنے والوں کی خدمت ہے۔ بھرے اطمینان رکھو۔ کام برابر اور مسلسل ہو رہا ہے۔
انجمن کی امداد کا معاملہ [illegible] کونسل سے بخیر و خوبی نکل گیا۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا
[illegible]
[illegible]
حمیدہ کو بہت بہت سلام اور دعا۔

طالب
عبدالحق

"ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی ساری عمر اردو ادب کی خدمت میں گزری ہے۔ انھوں نے جو اعلیٰ کام کیا ہے وہ کسی اردو داں سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے جس دلیری سے جس سچے جذبہ ایثار کے ساتھ زبان اردو کی حمایت میں اپنے آپ کو سینہ سپر کیا ہے اس کے لیے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ نہیں مل سکتے۔"

سر شیخ عبدالقادر مرحوم

"مولوی عبدالحق کے اوصاف اور ان کے کارناموں کے لیے صرف دو لفظ کافی ہیں وفاداری اور استواری جس خدمت کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا عمر بھر اس کے سوا کسی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ بس یہی وہ وصف ہے جس نے عبدالحق کو "عبدالحق" بنایا اسی نے قوت بخشی، اسی نے عمر طویل عطا کی۔"

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

Phone 6290 — ٹیلیفون ۶۲۹۰

انجمن ترقی اردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India.)

1, Daryaganj, Delhi,

۱- دریاگنج، دہلی

مورخہ ۔ ۳ر [illegible]

عزیزم سلمہ — تمھارا خط پہنچا۔ مسئلۂ زبان کی یعنی

ہندی والوں نے خوب زہر اگلا۔ ان جھگڑوں کا

[illegible] — فیصلہ ایسی کمیٹیوں سے نہیں ہو سکتا۔

تم نے جو تجویز لکھی ہے اس کے لیے ضرور کوشش

کروں گا۔ خدا کرے مسلمانوں کی سمجھ میں آ جائے۔

ترجمہ دیکھ کر اسی ہفتے بھیج دوں گا۔

بمبئی میں اردو کانفرنس ۲۳، ۲۴، ۲۵ر فروری کو۔

بمبئی والوں کا ایک سال سے تقاضا تھا۔ وہاں جانا ضروری ہے۔

۳ر مارچ کو حیدرآباد میں یوم حالی ہے اور ۷ر مارچ کو

اردو کانفرنس لشکر میں۔ ان سب کو ایک ہی دورے میں

بھگتا دوں گا۔ لیکن اس زمانے میں ایک ~~[illegible]~~ اور آفت

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, (India.)

AURANGABAD, (DECCAN.)

انجمن ترقی اردو (ہند)

اورنگ آباد (دکن)

[illegible]

[illegible]

"مولوی عبدالحق صاحب میرے قدیم اور عزیز دوست ہیں۔ وہ ایک مدّت سے اردو اور اس کے خوشنما ادب کی عالمانہ خدمت کر رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ جس زبان میں غالب، ذوق اور سودا نے اپنے لافانی شعر لکھے۔ اس کے چاہنے والے سب کے سب ان کی خدمت میں ہدیۂ منت و تحسین پیش کریں۔"

مسز سروجنی نائیڈو

قومی زبان (۳۷) اگست ۱۹۹۲ء

بابائے اردو کے خطوط محترمہ حمیدہ اختر کے نام

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn.)

بہادر منزل - سیف آباد
حیدر آباد دکن - ۲۴ر جولائی ۱۹۳۷ء

عزیزی سلمہا!

میں نے پرسوں اردو کے دو رسالے بھیجے تھے، پہنچے ہوں گے۔ ان میں دو ایک مضمون تمہارے پڑھنے کے قابل ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ تم تعلیمی ترقی اور اپنے معلومات کے بڑھانے میں بڑی کوشش کرتی ہو۔ یہ بہت خوب ہے لیکن اپنی صحت کا بھی خیال رکھا جائے۔ صحت بہت بڑی نعمت ہے۔

یوں تو تم میں ماشاءاللہ بہت سی خوبیاں ہیں لیکن سب سے بڑی خوبی جو مجھے پسند آئی وہ یہ ہے کہ تم کھانا بہت اچھا پکاتی ہو۔ مجھے کھانے کا بہت شوق ہے اور شاید یہ آخر عمر میں سب ہی کو ہو جاتا ہے اس لیے میں

اس دن کا منتظر ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاؤ۔ اس وقت
میں سمجھوں گا کہ جو میں نے سنا تھا وہ ٹھیک تھا۔ آج کل لڑکیاں کتابیں
تو فرفر پڑھ لیتی ہیں اور امتحانوں میں بھی کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن
بہت سے ایسے ہنر جن پر انسان کی صحت اور مسرت کا دار و مدار ہے ان
سے محروم رہ جاتی ہیں۔ جب میں نے یہ سنا کہ تم ایسی نہیں ہو تو مجھے بڑی
خوشی ہوئی۔

اختر کو دو ایک روز سے بخار آ گیا تھا۔ الحمد، جب بخار آتا ہے
تو بہت واویلا مچاتے ہیں طرح طرح فیل کرتے ہیں۔ اب بالکل اچھے ہیں۔
اچھے ہی نہیں بلکہ خوب تنومند ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ تمہاری طبیعت
قرین صحت ہوگی۔

تمہارا خیر طلب

عبدالحق

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے جو اس وقت تک اردو زبان کی خدمت کی ہے اس کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ان کے ایسے اعتدال پسند اور منصف مزاج ادیب فی زمانہ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔"

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn.)

نادر منزل، سیفی آباد
حیدرآباد دکن
۱۱ر اگست ۱۹۳۰ء

عزیزی سلمک ۔ تمھارا خط پہنچا۔ جسے پڑھ کر اور تمھارے خیالات معلوم کرکے بیحد خوشی ہوئی۔ خدا تمھیں اچھا رکھے اور اس سے زیادہ روشن دماغی عطا کرے۔ تعلیم نسواں کی حالت ہمارے ملک میں بہت قابلِ اصلاح ہے اور تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔

یہاں سے چند کتابیں تمھارے مطالعہ کے لیے بھیجی گئی تھیں امید ہے کہ پہنچی ہونگی۔

تمھارے والد وہاں ہوں تو میرا بہت بہت سلام پہنچا دینا۔

تمھارا خیر طلب

عبدالحق

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, (India.)
AURANGABAD, (DECCAN.)

نئی دہلی
یکم مارچ ۱۹۳۹ء

انجمن ترقی اردو (ہند)
~~اورنگ آباد (دکن)~~

عزیزی سیما - میں ابھی لاہور سے واپس آیا ہوں۔ تمہارا خط ملا۔
میں نے نذر الاسلام کی کتاب سرسری طور سے دیکھی - اس سے معلوم ہوا کہ
اس میں کی اکثر نظمیں اس سے قبل بار بار طبع ہو چکی ہیں - نئی
نظمیں صرف چند ہیں۔ اگر میں اس صورت اپنی کمیٹی کے سامنے
پیش کروں تو وہ فی صفحہ ½ روپیہ پر بھی مشکل سے راضی ہوں گے۔
اس لیے دو روپیہ بہت کافی معاوضہ ہے۔ میں نے افسر کو
بھی لکھا ہے۔ اگر وہ اس پر رضامند ہوں تو رقم فوراً
ادا کر دوں گا۔
یہ حامد اللہ افسر کہاں سے آ گئے۔ مجھے تو اس کی مطلق
اطلاع نہ تھی۔ نہ تم نے ذکر کیا اور نہ افسر نے کبھی لکھا۔ میں

[illegible]

"اپنی اولاد کو شاید کسی نے اس دل سوزی سے نہ چاہا ہو جتنا بابائے اردو نے اردو کو چاہا۔ ان کی پوری زندگی کی کہانی اردو کے لیے محبت شفقت اور جان نثاری کی کہانی ہے۔ وہ اُردو کے لیے جئے، اور اردو کے لیے مرے۔"

پروفیسر وقار عظیم

"بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اعلیٰ خدمات کی یاد ہندو پاکستان میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ خود میں نے ان تحریروں سے ادبیات عالیہ کا درس لیا ہے۔ ان کی نثر میرے لیے اور مجھ جیسے کئی اوروں کے لیے چراغ راہ رہی ہے۔"

فراق گورکھپوری

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, (India.)
AURANGABAD, (DECCAN.)

انجمن ترقی اردو (ہند)
~~اورنگ آباد دکن~~

۲۴ ہارڈنگ ایوینیو
نئی دہلی
۱۰ر فروری ۱۹۳۹ء

عزیزمن سلمہا ۔

اس وقت دو سو روپیہ کا چیک بھیجتا ہوں تا کہ تمھیں تکلیف نہ ہو۔
صفحات کے حساب سے جو کمی بیشی ہوگی دیکھا جائے گا۔
میں آج لکھنؤ جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم سب خیریت سے ہو گے۔
کامران لطیف کو پیار اور دعا۔

عبدالحق

اس رقم کی رسید ٹکٹ چسپاں کرکے ضرور بھیج دینا۔

انجمن ترقی اُردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India).

سری نگر کشمیر

عزیزی سلیما -

تمہارا خط دہلی سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا - آخر کا ایک خط
۲۳ اگست کا لکھا ہوا پہنچا تھا - اس میں لکھا تھا کہ سوئٹزرلینڈ
سے واپس آ گئی ہو اور ترجمے کی قسط اپنے بھیجے لکھوں؟ -
اس کے بعد ایک تار آیا جس سے معلوم ہوا کہ جو روپیہ میں نے
سوئٹزرلینڈ کے پتے سے بھیجا تھا وہ وہیں رہ گیا ان کو
نہیں ملا - معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا اعلان ہو گیا تھا اور
وہ رقم وہیں روک لی گئی اور پریس لنسا بھیجی گئی - اس کے
بعد سے کوئی خط نہیں آیا جس سے تشویش ہے - روز انتظار کرتا ہوں -
لوگ جنگ میں گرفتار ہیں شاید اس لیے خط و کتابت میں دقت ہے لیکن
جس جہاز میں خط تھا وہ ڈبو دیا گیا ہو کچھ نہیں کہا جا سکتا - کچھ دن اور
صبر کرنا چاہیے شاید کوئی خط آ جائے -
میں آخر اکتوبر تک دہلی پہنچ جاؤں گا

دعاگو
عبدالحق

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn.)

۵ / مئی ۱۹۳۶ع

عزیزی سلیمہ — تمہارا خط پہنچا، اس سے خوشی ہوئی کہ تمہاری
صحت اب اچھی ہے۔ میں متواتر سفر میں رہا۔ ۱۰ مئی کو
ہم اورنگ آباد آگئے۔ محبوب اور نورالہی بھی ہمارے ساتھ
آئے۔ نورالہی کا دشمن بہت ہوگیا ہے۔ آخر اس
روز جب تمہارا خط آیا اسے وطن واپس کردیا گیا۔ میاں اختر
کس طرح اس کے رکھنے پر راضی نہیں ہوتے تھے اور زبردستی
اسے بھیج دیا۔ محبوب کو ہر وقت تکلیف ہوتی ہے۔
تم چکلتہ ضرور جاؤ۔ وہ بہت اچھا مقام ہے۔ وہاں
رہ کر تمہاری صحت اور اچھی ہوجائے گی اور تم ہٹی کٹی ہوکر
آؤ گی۔ تمہارے والد کو ایسی کیا مصروفیت ہے۔ رخصت لے کر

آئے ہیں کچھ دنوں آرام کر رہا ہے۔ ایسی شدت کی گرمی میں انھیں کیا سوجھی ہے آخر یہ نیا کام ایسے کون آ گیا ہے۔

بیماریاں اور بلاوے یہاں بہت ستاتے ہیں۔

کل یہاں ایک چھینٹا پڑ گیا اس لیے امن ہو گیا ورنہ گرمی یہاں بھی اچھی خاصی تھی۔

عبدالحق

"مولوی عبدالحق صاحب کی ساری عمر اردو کی خدمت میں گزری ہے اس صدی میں کئی ایسے موقع آئے کہ اگر مولوی صاحب سینہ سپر نہ ہو جاتے تو اردو کہیں کی نہ رہتی۔ کوئی ۲۵ سال اُدھر کی بات ہے کہ گاندھی جیسے بااثر شخص نے اردو پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اس وقت مولوی صاحب اگر خم ٹھونک کر سامنے نہ آجاتے تو گاندھی نے میدان مار لیا ہوتا۔

شاہد احمد دہلوی

"انجمن ترقی اردو بابائے اردو مرحوم کی یادگار ہے۔ انھوں نے جس ایثار اور خلوص سے کام لے کر اس ادارہ کو زندہ رکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مولوی صاحب جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ایسی شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ادو کے کاموں کو جاری رکھا جائے۔"

جناب اختر حسین صاحب۔ صدر انجمن ترقی اردو و نیشنل پریس ٹرسٹ پاکستان

بابائے اردو کے خطوط ظفر عمر کے نام

Private & Confidential

My dear Z. O.

I received your letter of the 10th June only yesterday. It was redirected to Aurangabad.

Yes, Syed A. H. has been working with me here. During this period I had ample opportunity to study him & I am glad to say that I have formed a very high opinion of his character & abilities. He is a young man of scholarly bent of mind & one of the ablest students I have ever come across. He is not only a good scholar of English but possesses good knowledge of Urdu, Persian. He is a highly cultured & modern young man imbued with modern ideas. He is outspoken, frank & a most independent chap. He has some principles & sticks to them. He has a natural aptitude for literary work & is in my opinion eminently fitted for it. He is not inclined to enter into Govt. service & to force him to join in any competitive exam for service will be his utter ruin. At present he is engaged in the

Dear Z. O.

I do not know how to express my heartfelt thanks for your exceedingly gracious & kind letter of the 27th June. I am really happy that you have decided once for all ~~about the~~ to the marriage of Hameeda to Akhtar.

Akhtar was deeply moved by the very affectionate & kindly tone of your letter. ~~& tears flowed from his~~ eyes. For some time he was in such a state of joy that I was rather alarmed. This very fact shows his nature. He has a very noble character & I may rest assured that he will prove a worthy son-in-law of yours. I send you my heartiest congratulations on your prompt decision.

After discussing the matter with him & ~~I discussed the~~ we are of opinion that the marriage sho[uld] take place during the Christmas week immediately after

the 3rd, say on the 29th Dec. In that case I shall be able to come with him & join the happy [illegible].

I quite agree with you that the marriage ceremony should be as simple affair as possible & [illegible] as he is naturally against all sorts of ostentations & waste.

With kindest regards,

Yours very sincerely

دلوں پر قبضہ، خیالات پر حکومت ہے
اب اس سے بڑھ کے تمھیں اختیار کیا ہوگا

بابائے اردو

"مولوی عبدالحق درحقیقت ایک پورا عہد اور ایک پورا .... ادارہ ہیں اور اُن کا فیض ابھی جاری ہے اور منزلِ ذوق و شوق کے راہ رووں کو عزم و ہمّت اور صبر و استقلال کے ساتھ کام کرنے کا سبق دے رہا ہے۔ بابائے اردو نے تحقیق کا ایک بلند معیار قائم کیا اور بے لاگ اور دلنشین تنقید کے ذریعے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور اُن کی تربیت بھی کی۔ اردو زبان و ادب پر انھوں نے جو احسانات کیے ان کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

جناب ظفر عمر کا خط بابائے اردو کے نام

Orai, U.P.

June 27.35.

My dear Maulana Abdul Haq,

I am most grateful for your kind and affectionate letter of June 21. I am greatly touched by your entering into my feelings and advising me to make up my mind as if Hameeda was your own daughter. As you know I have very great respect for your judgement and under the circumstances I can have no hesitation in accepting your advice and deciding to marry Hameeda to Akhtar.

I do hope your reading of Akhtar's character and ideals will turn out correct and he will have a brilliant career in the service of his country as a Journalist and a man of letters- Insha Allah.

I leave it to you to suggest, after consulting Akhtar, the time for the marriage which ought to be as simple an affair as possible as I do not believe in ostentation and xxx waste.

With kind regards,

Yours sincerely,

Zafar Omar

حمیدہ اختر

ہمارے مولوی صاحب

کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ۲ جون ۱۹۳۵ء کو اختر حسین رائے پوری نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھامنے کی خواہش کا اظہار میرے والد ظفر عمر مرحوم سے کیا اور ۲ جون ۹۲ء ہی کو انھی ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔
نصف صدی پہلے بلکہ آج بھی کوئی لڑکا اپنا پیغام خود تو نہیں دیا کرتا یہ کام بزرگوں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ نفسِ مضمون کچھ نرالے انداز سے یوں تھا۔

محترمی تسلیم

پڑ ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

میں ایک وہ بندۂ ناچیز ہوں جس کا دنیا میں کوئی نہیں پر علم اس کا اوڑھنا بچھونا ضرور ہے۔
آپ کی صاحبزادی حمیدہ عمر کے لیے درخواست گذار ہے۔ اگر قبول کر لیں تو زہے نصیب اور رد کر دیں تو شکوہ آپ سے نہیں، بلکہ اپنے رحیم و کریم خدا سے ہوگا۔

فقط

اختر حسین (۱)

والد صاحب ان حضرت کی اس بے باکی اور انداز پر حیران ہوئے اور ضرور تلملائے ہوں گے۔ اپنے بڑے بیٹے شوکت عمر کو خط دکھاتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہاں وہ اس لڑکے کو خوب اچھی طرح جانتے ضرور ہیں مگر اپنی کوئی رائے نہیں دیں گے۔ مولانا عبدالحق کے ساتھ ایک سال سے کام کر رہے ہیں ان کو ایک خط لکھ کر معلوم کر لیں، پھر جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔
والد صاحب ان کو خط لکھ کر دریافت کرتے ہیں، مولوی صاحب کا یہ جواب آتا ہے:

ڈیئر ظ۔ ع (ظفر عمر)

مجھے کل ہی آپ کا مورخہ ۱۰ جون کا خط موصول ہوا۔ یہ دوبارہ اورنگ آباد روانہ کیا گیا تھا۔ ہاں سید ا۔ ح (اختر حسین) میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اس دوران مجھے ان کو سمجھنے کا کافی موقع ملا۔ میں یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے ان کے کردار اور ان کی

صلاحیتوں کے بارے میں بہت اعلیٰ رائے قائم کی ہے۔ یہ ایک عالمانہ ذہنی رجحان کے نوجوان ہیں اور ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا ہے، ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت، ہندی، بنگلہ، اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں اور اردو ہندی کے بہت اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ یہ انتہائی مہذب و شائستہ ہیں، نہایت روشن خیال نوجوان ہیں۔

یہ ادبی کاموں کے لیے فطری میلان رکھتے ہیں، میرے خیال میں اس کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا کوئی رجحان نہیں ہے اور ان کو مجبور کرنا کہ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں ان کی مکمل تباہی کا سامان ہو گا۔

فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔ جو میری نگرانی میں ترتیب پارہی ہے۔ اس کے بعد یہ بطور پیشہ صحافت کو اختیار کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر انھیں کافی مدد ملی جو میں انھیں دینے پر تیار ہوں، یہ بہت کامیاب ہوں گے اور ہندوستانی صحافت میں نام پیدا کریں گے۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں، مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔ آپ چاہیں تو بہت آسانی سے اختر کے رشتہ کے ماموں وحید الحق صدیقی جو علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرار ہیں یا دوسرے ماموں س۔ و۔ا۔ رضوی سی، آئی۔ اے، جو سی، پی گورنمنٹ مجلس قانون ساز کے صدر ہیں ان کے ذریعے ہر طرح کی معلومات اور تحقیقات کر سکتے ہیں۔

میں نے ان کے کردار اور صلاحیتوں کے بارے میں سچی اور صحیح رائے آپ کو بتا دی ہے۔ اختر اپنے ملک کی خدمت کی شدید لگن رکھتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اہمیت ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

میں تو ان کے اس اعلیٰ مقصد میں ہر طرح کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ ہرگز اختر کو ان کی طبیعت اور ارادوں کے خلاف کوئی اور پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کروں گا۔ اپنی تمام آزاد روی اور روشن خیالی کے وہ دل آویز ادب اور آداب کے مالک ہیں، بزرگوں کے لیے عزّت اور احترام کرنے کا بڑا ڈھب بھی ہے۔ میں اختر کو دماغی اور دلی صفات کی وجہ سے بے حد پسند کرتا ہوں اور دل سے ان کی قدر کرتا ہوں۔

میں یہ سب آپ کو بڑی رازداری سے لکھ رہا ہوں جیسے حمیدہ میری اپنی ہی بیٹی ہو۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے اور فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اختر کو دامادی کا شرف بخشیں۔ اگر آپ ان کو باریابی کی اجازت دیں تو بلاشبہ ان سے مل کر آپ میرے اندازوں کی تصدیق کریں گے۔

عبدالحق (۲)

والد صاحب اس خط کو وصول کرنے کے بعد بغیر کسی معتبر معلومات کے میرا رشتہ اختر کے ساتھ کرنے کی منظور کا خط روانہ کر دیتے ہیں۔

اس طور مولوی صاحب کی عظیم اور شفیق شخصیت مجھ پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ دوسرا خط مولوی صاحب یوں لکھتے ہیں:

ڈیر ظ۔ ع (ظفر عمر)

آپ کا خط مورخہ ۲۷ جون وصول ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی رضامندی پر کن الفاظ میں اپنی خوشی اور تشکّر کا اظہار کروں میں آپ کے فیصلہ پر بہت خوش ہوں۔ اختر آپ کے اس قدر مشفقانہ خط سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ دیر تو وہ کچھ ایسی خوشی و مسرت کے عالم میں رہے کہ میں ذرا گبھرا سا گیا۔ یہ حقیقت ان کے کردار کی عکاسی کرتی ہے درحقیقت اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ آپ یقین رکھیں اور مطمئن رہیں وہ آپ کے لیے لایق داماد ثابت ہوں گے۔ میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ ہم دونوں آپس کی گفت و شنید کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ شادی کرسمس کے ہفتہ یعنی عید کے فوراً بعد یعنی ۲۹ دسمبر ۳۵ء کو اس صورت میں میں ان کے ہمراہ آکر اس پر مسرت شادی میں شرکت کر سکوں گا۔

میں اور اختر آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ شادی کی رسومات تا حد امکاں کم سے کم ہونی چاہئیں ہر طرح کی نمود و نمائش کے اختر بہت خلاف ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

عبدالحق

مجھے جو انھوں نے پہلا خط لکھا اس میں یہ لکھ کر

"میں نے جب یہ سنا کہ تم کھانا اچھا پکاتی ہو تو بے حد خوش ہوا۔ اس دن کا منتظر ہوں جب تمہارے ہاتھ کا پکایا کھانا کھا سکوں گا۔ بڑی عمر پر آکر اچھے کھانوں کا شوق سب کو ہو ہی جاتا ہے۔"

ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے والدہ نے بڑی توجہ سے مجھے آٹھ دس نفیس اور لذیذ چیزیں پکانا سکھادیں۔ ورنہ میں تو مطلق کوری تھی۔ گاہے گاہے مولوی صاحب مجھے کتابوں کا پارسل بھی روانہ کرواتے رہے اور خط لکھتے رہے۔

۲۹ دسمبر ۳۵ء کو دس بجے دن کی گاڑی سے برات لے کر مولوی صاحب پہنچ رہے ہیں۔ ان کے شایان شان انتظامات کیے گئے تھے۔ ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے جہاں پر رکیں گے اس کے سامنے سرخ قالین بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف پولیس کے بینڈ والے کھڑے ہیں دوسری طرف خاندان کے بزرگ اور شہر کی معزز شخصیات، ریل آکر رکتی ہے دروازہ کھلتا ہے، سب سے آگے مولوی صاحب کچھ کودنے والے انداز سے اترتے ہیں، پیچھے سے اختر اور ان کے دس عدد دوست۔ ڈاکٹر کے ایم اشرف، سبط حسن، مجاز، ساغر نظامی، ذکاء اللہ خاں، بشیر الدین، علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین اور ہندو دوست مہندر، رام لال تیسرا نام بھول گئی

سب یکے بعد دیگرے کود کود کر اتر جاتے ہیں اور مولوی صاحب اور اختر جو گا رہے ہیں اس میں ہم نوا ہو گئے۔

للا رو پیہ لایو ہے
للا کی شادی کر دیں گے
بھئی کر دیں گے۔ کر دیں گے
(درمیان کا بول بھول گئی)

لایق دولہا لایوں ہیں
جاہل لڑکی لے لیں گے بھئی لے لیں گے (ساتھ میں زوردار تالیاں)

بینڈ والے بامذاق تھے اسی دھن کو بجانے لگے۔ سب حق حیران یہ ماجرا دیکھ کر اپنی اپنی نظریں نیچی کیے کھڑے ہیں۔ والد کی شرمساری کا کچھ اندازہ کر کے مولوی صاحب کہتے ہیں۔ "ظفر عمر دیکھو بھئی یہ بڑی خوشی کا موقع ہے یہ کوئی عام سی شادی تو نہیں اور ہاں اختر سے تو ملو!"

براتی موٹروں میں بٹھائے جاتے ہیں بھائی شوکت عمر اپنے ساتھ اختر، ڈاکٹر اشرف اور سبطِ حسن کو بٹھاتے ہیں۔ راستے میں پوچھا کہ مولانا صاحب کو آخر یہ کیا ہو گیا تھا تم سب کے ساتھ گا رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ سبط کا یہ کہنا تھا۔ "خوشی کا موقع تھا کوئی مجلس تو تھی نہیں اور مولانا کی رائے گاڑی سے اُترنے سے پہلے بنی کہ جلدی سے کچھ تک بندی کر لیں اور گاتے ہوئے گاڑی سے اتریں پھر ذرا ظفر عمر کی بوکھلاہٹ دیکھنے میں آئے گی!! اختر کی شادی ہے کچھ ایسی تو ہو کہ لوگ ساری عمر یاد رکھیں۔" (۳)

بھائی شوکت عمر کا سارا انتظام تھا۔ براتیوں کے لیے بڑے رنگا رنگ خیمے لگوائے ہوئے تھے، پہلے مولوی صاحب کو ان کے خیمے میں لے گئے پھر اختر کو اور باقی سب کو کہ نہا دھو کر تیار ہوں تو وہ گھر میں سب کو لے کر جائیں اور خود کوٹھی کے برآمدے میں منتظر کھڑے تھے کہ دیکھا مولوی صاحب ہر خیمے کے پردے کو لمحہ بھر کے لیے ہٹا کر جھانکنے کے بعد واپس اپنے خیمے میں چلے گئے۔

خاصی دیر ہو گئی تو بھائی شوکت عمر ان سب کو بلانے گئے۔ ہر خیمہ خالی۔ سفر کے کپڑے سب کے پلنگوں پر اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے ہیں یعنی سب نہا دھو چکے ہیں۔ پر ہیں کہاں؟ دور امرودوں کے باغ میں کچھ گانے کی سی آواز سن کر لپکتے ہوئے ادھر گئے۔ وہاں بھی سب کے سب نہیں ہیں اور مولوی صاحب تو ہنسی سے دوہرے ہوئے جاتے ہیں ذکن، اختر، مجاز کوئی دھن نکال رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے۔ جب انھوں نے دریافت کیا کہ گھر میں نہ آکر باغ میں کیوں آ گئے؟ تو مولوی صاحب کا جواب کہ "امرود ان کا سب سے مرغوب پھل ہے، تازہ تازہ توڑ کر کھانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ ان کو کچھ گانے کی آواز سی آ رہی تھی تو فوراً سب بول اُٹھے کہ "گانا اور کھانا ہم سب کو بہت بھاتا ہے۔" کیا کہہ سکتے تھے بیچارے شوکت عمر۔ "اچھا اب چلیں اندر سب لوگ منتظر ہیں آپ سب کے۔"

مولوی صاحب اندر آئے تو بالکل سیریس موڈ میں سب سے ملے اور اختر کو ملایا۔ چائے پیتے رہے ادھر اُدھر کی بات چیت کرتے رہے۔

ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ پروقار انداز سے وہ پہلے کھڑے ہوئے اور ان کے پیچھے باقی

سب۔ کھانے کا کمرہ بہت بڑا تھا۔ ۲۴ لوگوں کی میز لگی ہوئی تھی چاروں طرف سرخ وردی میں بینڈ کے بیگ پائپر اپنی نفیری لیے اسٹیچو کی طرح منتظر کھڑے ہیں کہ براتی بیٹھ جائیں تو یہ اپنی ہلکی سی دھن میں شہنائی کا راگ بجانا شروع کریں سب بیٹھ گئے بیرے سفید وردی اور اونچی کلاہ میں کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ کھانا پلیٹوں میں لے لیا۔ نفیری بجنے لگی۔ مولوی صاحب ایک دومنٹ خاموش ہاتھ میں چھری کانٹا پکڑے رہے پھر بولے "بھئی اس توں. توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں تو چلو پی ہی لیں۔" یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے اور ساتھ ساتھ سب براتی!! والد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے بینڈ والوں کو باہر چلا جانے کو کہا تب ٹماٹر ساس کی بوتلیں واپس میز پر رکھ دی گئیں اور بالکل سیریس موڈ میں بات چیت کرنے لگے۔ کھانا ختم ہوا کافی کا دور چلا ایک دم کھڑے ہو کر اختر کا ہاتھ پکڑا اور سب سے مخاطب ہو کر فرمایا "چلو چلو اپنے اپنے تمبو میں، ہم تو بنجارے لوگ ٹھہرے دو گھڑی پیٹ سیدھی کر لیں۔" میرے ماموں سیّد حامد حسین (جنرل شاہد حامد کے والد) سے مڑ کر کہتے ہیں کہ ان کے خیمے میں جو نیلے رنگ کے دو کیبن ٹرنک رکھے ہوئے ہیں وہ حمیدہ کے لیے ہیں ان کو وہاں سے اندر پہنچوا دیں اور شام کی چائے چار بجے ان کے ٹینٹ میں بھجوا دی جائے۔

مہمان آنا شروع ہو گئے بعد مغرب نکاح پڑھایا جائے گا۔ مولوی صاحب کے ساتھ معہ دولھا کے سب براتی تشریف لاتے ہیں۔ سامنے ایک تخت پر گاؤ مسند لگی ہوئی ہے جس پر دولھا کو بٹھایا گیا۔ سامنے والے صوفے پر مولوی صاحب اور دیگر حضرات۔ مولوی صاحب مجاز سے مخاطب ہو کر دبی آواز میں کہتے ہیں "میاں چونچ آپ تو میرے پاس آ جائیں" سننے والوں نے شکر ہے یہ سمجھا کہ جوش بلائے جا رہے ہیں۔ کچھ نے تو ادھر اُدھر دیکھ کر آپس میں یہ بھی کہا کہ "مگر جوش صاحب ہیں کدھر؟" مجاز ان کے پاس آئے تو ذکن کو اختر کے پاس بھیج کر مجاز سے کچھ آہستہ آہستہ کہا اور پاس ہی بٹھا لیا۔

ہمارے زمانہ میں تب یہ نہ ہوتا تھا کہ مہر پہلے سے طے کر لیا جائے نہ ہی چھپے ہوئے نکاح کے فارم ہوتے تھے۔ محفل ہی میں سر جوڑ کر مہر طے پاتا اور نکاح نامہ قلم سے لکھ لیا جاتا تھا۔

میرے ماموں سیّد حامد حسین مولوی صاحب کے نزدیک آ کر مؤدب ہو کر ان سے دریافت کرتے ہیں۔ مولانا آپ مہر کا طے کر دیں۔ تو مولوی صاحب ذرا گھبراہٹ ظاہر کرتے ہوئے دریافت کرتے ہیں "حامد حسین تم یہ کس مہر کا نام لے رہے ہو۔ ہم تو اختر کی شادی حمیدہ کے ساتھ کروانے آئے ہیں۔" وہ دو قدم پیچھے ہو کر آگے بڑھتے ہیں یہ کہتے ہوئے "مولانا شادی تو حمیدہ ہی سے ہو رہی ہے مہر کوئی لڑکی نہیں بلکہ مہر تو وہ رقم ہے جو نکاح کے وقت مقرر کی جاتی ہے۔" اب مولوی صاحب سیدھے تن کر بیٹھتے اور باآواز بلند فرماتے ہیں۔ "تو یوں کہو نا کہ تم لوگ لڑکی بیچ رہے ہو۔ بولو بولو کیا بولی لگائی ہے تم نے اس بیچاری لڑکی کی؟" میرے ماموں کچھ پیچھے کو ہو جاتے ہیں۔ جن مہمانوں نے یہ سنا وہ حق حیران کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ پھر ہمت باندھ کر قریب آ کر کہتے ہیں کہ جو بڑی بہن اور بہو کا ہے یعنی یہ .... مولوی صاحب نے جیب سے چیک بک نکال کر چیک فوراً لکھ کر میرے ماموں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھوں نے قاضی صاحب کے پاس آ کر ان کو بتا دیا قاضی صاحب خطبۂ نکاح پڑھنے کے بعد جب پوچھتے ہیں حمیدہ بنت ظفر عمر..... وغیرہ وغیرہ آپ کو قبول؟ تو مولوی صاحب جھٹ سے کہتے ہیں "قبول نہ ہوتی تو یہاں تک آتے کیوں ہوتے۔" قاضی صاحب مولوی صاحب کی شخصیت اور دبدبہ سے ناواقف تھے۔ بگڑ کر کہتے ہیں۔ "دیکھیے بڑے صاحب آپ خاموش رہیں اس کا جواب خود دولھا میاں دیں گے۔" تو مولوی صاحب جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئے۔ میرے ماموں نے اندر آ کر مسکراتے ہوئے وہ چیک اماں کو لا کر دیا۔ ریل سے باراتیوں کے اترنے کا انداز اور گانا وہ اپنی [illegible] کو سنا چکے تھے۔ اماں [illegible] سے لسٹ کر رو پڑیں [illegible]

بھائی جان یہ کس قسم کے لوگ ہیں مجھے تو اس لڑکی کی خیر معلوم نہیں دیتی۔ اور ان بزرگوار نے سمجھا کیا ہے۔ کوئی مہر لینے کے لیے تو لکھوایا نہیں جاتا۔ چیک ہاتھ میں پکڑ کر چار ٹکڑے کر دیے۔ سامنے رکھی ہوئی پان کی چاندی کی تھالی کو اُٹھا اُس میں رکھ کر بولیں آپ جا کر مولانا کو یہ واپس کر آئیں۔ انھوں نے انکار کیا کہ نا بابا میں تو یہ لے جا کر دینے سے رہا۔ بھری محفل میں جانے اب مجھے کیا کہہ بیٹھیں۔ اماں نے بھائی کو قسم دی کہ آپ مولانا صاحب کو دے کر آئیں وہ آئے پرے کھڑے ہو کر تھالی چیک کے ساتھ ان کے ہاتھ میں تھما جلدی سے سرک گئے۔ مولوی صاحب مسکرائے اور ایک ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر منہ سے "پھو پھو" کر کے اِدھر اُدھر اڑا دیے۔ کسی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔ بندہ ایک سہرا لکھ کر لایا ہے پیش خدمت ہے۔ اب مولوی صاحب کراری آواز میں فرماتے ہیں۔ سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے؟ خوش ہونے کے ہم حقدار ہیں کہ دلہن لے جا رہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں۔ ہاتھ کے اشارہ سے اختر، ذکر اور سبطے کو بھی اپنے پاس بلالیا باقی تو پہلے ہی سے ان کے ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اب براتی آخر کیا کرنے والے ہیں کہ سہرا گایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب تال دے رہے ہیں۔

ایک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا!!
جیسے ہو اک مرغ بیچارا
ڈھونڈے سہارا ڈربے کا

یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی (۴)

(تالیوں کی گونج میں)

بہن کھلونا، بھائی تماشہ
آگے تانگہ پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

(تالیوں کی گونج)

یہ پڑھ کر آپ لوگ ہنس رہے ہیں نا! بھئی یہ تو بابائے اردو کی تک بندی تھی!!

میں تو آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ اگر آج کل کے موڈرن زمانے میں بھی کوئی ایسی برات اور ایسے براتی آجائیں تو لڑکی والے یقیناً ڈنڈے لے کر ان پر پل ہی تو پڑیں!! مگر یہاں واسطہ تو مولوی عبدالحق صاحب کا تھا جن کا ڈنکا اس وقت سارے ہندوستان میں بجتا تھا اور اُن کی عزت اور شہرت ہر طرف یوں پھیلی ہوئی تھی کہ ہر کسی پر رعب اور دبدبہ ان کا نام سن کر طاری ہو جاتا تھا یہ زمانہ ان کے پورے عروج کا تھا۔ ہر مہمان دم بخود تھا میرے والد صاحب، چچا، ماموں، بھائی شوکت عمر خفت سے

گردنیں جھکائے ہوئے۔

"کھانا میزوں پر ہے تشریف لے چلیں۔" براتی بڑے بھولے انداز سے اُدھر ایسے چل پڑے جیسے کوئی خاص بات ہی نہ کی ہو۔ اب وہ اپنی پُروقار شخصیت کے ساتھ لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہوگئے۔

کھانے کے بعد میرے بھائی شوکت عمر کو جانے کیا سوجھی کہ مولوی صاحب سے کہا اندر چل کر وہ جہیز کا سامان دیکھ لیں تاکہ جہیزرات ہی کو بند کر دیا جائے۔

مولوی صاحب اور شوکت عمر کمرے میں داخل ہوئے سامنے ہی تانبے کی پتیلیوں کا ایک کونے میں ننھا منا سا مینار دیکھ کر پوچھتے ہیں "یہ کس لیے ہیں؟ کھانا پکانے کے واسطے تو کیا ان کے گھر میں نہیں۔ یہ کہہ کر اپنی چھڑی سے ایک کو جو ٹھوکا دیا تو یکے بعد دیگرے وہ سب دھم دھم کر کے نیچے گر گئیں۔ میز پر پاندان، خاصدان پر نظر پڑتے ہی برہم سے ہوئے ہٹاؤ ہٹاؤ ان واہیات چیزوں کو ساتھ ہی ایک طرف لحاف، توشک، رضائیاں نظر آگئیں پوچھتے ہیں "یہ الم غلم کیا ہے؟"

"جی بستر ہوں گے۔ یہ سب کچھ تو ہر لڑکی کو دیا جاتا ہے۔"

"جو دسیوں لڑکیاں تمھارے گھر میں ہیں ان کو دے دینا ہمارے ساتھ صرف حمیدہ کے کپڑے اور ذاتی استعمال کا کچھ سامان جائے گا۔" مولوی صاحب بیزار سے ہو کر باہر نکل آئے۔

ناشتہ کے بعد ہم سب اور وہ سب کالپی روانہ ہوئے۔ دریائے کالپی اورئی سے ۱۲ میل دور حسین علاقہ میں سے نیچی نیچی پہاڑیوں سے گزرتا ہے دریا کے ایک طرف پہاڑی پر ایک ریسٹ ہاؤس تھا ڈھلان پر پھلوں کے باغات پھر کھیتوں کا سلسلہ دریا تک پھیلا ہوا۔ جاڑے میں ہمالیہ کے برفانی مقامات سے پچاسوں طرح کے لاکھوں پرندے دریا میں اپنا بسیرا دو ماہ تک اختیار کر لیا کرتے ہیں۔

مولوی صاحب کی پہلے سے فرمائش ہو گئی تھی کہ لنچ وہاں کھانا چاہتے ہیں اور اس علاقہ کی سیر کریں گے۔

اختر سے بھائی جان نے راستے میں کہا "خدارا تم لوگ اب کوئی عجوبہ حرکت مزید نہ کرنا والد صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ آج تو انسانیت کے دامن کو پکڑے رہنا۔" جواب میں اختر نے کہا "شوکت ذرا تم ہمیں انسانیت لادو تو ہم دامن ہی نہیں بلکہ گریبان بھی پکڑ لیں گے۔"

کالپی پہنچ گئے جب بھائی جان نے مجھے مولوی صاحب سے ملایا کہ "یہ حمیدہ ہیں۔" میں نے جھک کر آداب کیا۔ دوپٹہ خوب اچھی طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ جھک کر میرا منہ دیکھتے ہی فرماتے ہیں "یہ تو ذرا سی لڑکی ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں شاردہ ایکٹ میں ہم لوگ دھر نہ لیے جائیں (اس وقت میں بے انتہا دبلی تھی) مولوی صاحب والدہ سے ملے تو والدہ نے حال احوال دریافت کر کے بڑے پُروقار انداز سے اتنا کہا "برائے مہربانی آپ اور اختر صاحب اس سیدھی سادی لڑکی سے صرف اتنا مذاق روا رکھیے گا جس حد تک اس کا کچّا دماغ سمجھ پائے۔"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا فی الحال ہم حمیدہ کو لے کر ندی کے کنارے تک ہو آئیں کھانے کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔"

پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے تو مالیوں نے خبردار کیا کہ آج کل کئی جوڑے چیتے کے ادھر اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں لہٰذا آگے نہ جایا جائے مولوی صاحب میرا اور اختر کا ہاتھ پکڑے ہوئے یہ کہتے ہوئے چلے کہ یوں تو چیتوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

دریا کے دوسرے کنارے پر ہرنوں کے غول اور بارہ سنگوں کی ڈار چوکڑیاں لگاتے دیکھ کر کچھ دیر کھڑے بہت خوش ہوئے ایک کھیت میں ایک بوڑھا برگد کا پیڑ کھڑا تھا اس کے چاروں طرف ایک پکا چبوترا بھی تھا جس پر ایک مورتی رکھی ہوئی تھی مولوی صاحب لپک کر آگے کو بڑھے اور جھک جھک کر اس کو سلام کرنے لگے۔ جب اختر نے کہا دیوی کو سلام نہیں نمسکار کرتے ہیں تو ہنس کر بولے "میں تو "زبان بے زبانی" (۵) کے برگد صاحب کو شکریہ کا سلام کر رہا ہوں ان ہی حضرت کے طفیل تو ہم کو ایک لڑکی ملی ہے" اب میں نے پہلی بار نظر اٹھا کر سر اونچا کر کے مولوی صاحب کو دیکھا سفید جھک ڈاڑھی اور سر کے بال۔ روشن آنکھیں جن میں شفقت جھلک رہی تھی پوچھتے ہیں "دیکھ لیا اچھی طرح ہوا تو نہیں لگا؟"

میرا جواب یہ تھا "یہ لگا کہ آپ سے شفقت، محبت اور دوستی ملے گی۔" ہنس پڑے کہنے لگے "اختر یہ بات اچھی ہے کہ اس لڑکی کے منہ میں زبان بھی ہے۔" پھر اسی چبوترے پر کچھ دیر لیٹ کر سامنے کا نظارہ کر کے خوش ہو کر بولے کہ کیا رائے ہے یہاں زمین خرید کر ایک چھوٹا سا کاٹیج نہ بنا لیا جائے تاکہ ہر سال دنیا والوں سے چھپ کر یہاں آئیں اور قدرت سے قریب ہو کر سکون سے کچھ وقت گزار سکیں۔

ہم جیسے ہی دریائے کالپی کی سیر سے واپس آئے کھانا لگا دیا گیا۔ کھاتے وقت والد صاحب سے مخاطب رہ کر مولوی صاحب ان صاحبان کی خیر و عافیت معلوم کرتے رہے جو مشترکہ جان پہچان کے لوگ تھے، کہ یک دم ان کو یوسف زماں (خلیق الزماں صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی) کی اُن دو لڑکیوں کا خیال آگیا جن کو یوسف زماں صاحب (۶) اللہ کو پیارے ہوتے وقت والد کی سرپرستی میں سونپ گئے تھے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ان لڑکیوں کو بی اے کروانے کے بعد لندن بھجوا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے بھی راہ ہموار کی گئی۔ اب وہاں قیام پذیر ہیں۔ تو خوب ہنس کر بولے "شاباش ہے ظفر عمر کہ درجن بھر اپنے ستّر کو پالتے ہوئے۔ دسیوں کنبے کے لڑکے لڑکیاں اور دوستوں کی اولاد کو "نیلی چھتری" کے چھپر کے نیچے رکھ کر دنیا کے لائق بنایا اور خود بھی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہو یہ تمھارا دم خم ہے اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کب کا پاگل خانے پہنچ چکا ہوتا۔"

شام کی چائے پی کر واپس "اورئی" آ گئے رات کو ۹ بجے حیدر آباد کے لیے روانگی تھی۔ کھانا جلد ہی کھا لیا گیا۔ اسٹیشن پہنچے ریل آ کر رکی جو چار سیٹر ڈبہ بک کروایا تھا وہ تو چھ سیٹر نکلا اس میں ایک بنگالی جوڑا معہ اپنے دو عدد بچوں کے پہلے سے براجمان تھا۔ مولوی صاحب اور اختر دونوں کا موڈ خراب سا ہو گیا، اس وقت کچھ کیا نہ جا سکتا تھا۔ سامان رکھ دیا گیا ہماری تین سیٹیں نیچے کی تھیں چوتھی پر وہ دو بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر وہ دونوں میاں بیوی مولوی صاحب کافی دیر ہاشمی فرید آبادی پر گرم ہوتے رہے کہ بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے بکنگ ان کے ذمے کی تھی وغیرہ وغیرہ ریل چھک چھک کرتی جب چل دی تو میں باہر کھڑکی سے سر نکال کر بے اختیار رونے لگی اب یہ احساس اجاگر ہوا کہ لو میں تو بابل سے ہزار میل دور جا رہی ہوں۔ مولوی صاحب میرے پاس آ کر اپنا دستِ شفقت میری پیٹھ پر رکھ کر کہتے ہیں "سنو ہم کو سمندر، دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں چلو سر تو اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو اب ہم کو ان سے نبٹنا ہے۔ میں حیران کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اختر دوسری سیٹ پر چُپ چپ سے بیٹھے تھے کچھ ان کے کان میں جا کر کہا وہ ہنس پڑے "خوب خوب" میں ابھی بھی اپنے خیالوں میں گم صم بیٹھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریل پوری اسپیڈ پکڑ چکی تھی میں اپنے پر قابو پانے کے لیے سر جھکا کے نیچے ہی دیکھ رہی تھی کہ ان دو بنگالی بچوں کی زوردار چیخیں نکلیں، باپ اوپر سے گردن جھکا کر بنگالی میں کچھ پوچھتے ہیں اور بچے کچھ بتا کر مولوی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں اور مولوی صاحب تو بنگلہ سمجھ نہ سکے اختر بُری طرح

ہنس رہے ہیں۔ مولوی صاحب اپنی سیٹ پر دراز اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ اب اوپر سے دونوں ماں باپ مولوی صاحب پر نگاہیں جمائے ہوئے مجھے نظر آئے۔ ایکاایک پھر بچے زور سے چیخ مارتے ہیں۔ اب کی وہ گھگی کے عالم میں اختر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جلدی سے میں نے سر گھما کر دیکھا تو مولوی صاحب دونوں ہاتھوں سے چونچ بنائے منہ ٹیڑھا کیے بچوں کو ڈرا رہے ہیں میں خود اب اختر اور مولوی صاحب سے ڈرنے لگی دور ہو بیٹھی کہ الہیٰ خیر ان دونوں کے مزاج تو تلے اوپر نہیں ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بچے مولوی صاحب کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہے ہیں اب کی میں نے ان کو دیکھ ہی لیا کہ دونوں ہاتھوں کی چونچ بنائے ان کو گھما کر منہ ہولناک طریقہ سے آڑا ترچھا کر رہے ہیں۔

اوپر بنگالی بابو پوچھتے ہیں کہ "بڑا شاحب آپ یہ کیا کرتا ہے اور بچّوں کو کیسے ڈراتا ہے؟" کیا آپ پاگل آدمی ہے؟"

تو اور کیا باہر ڈبہ پر لکھا دیکھا نہیں کہ اس ڈبہ میں دو پاگل بھی سفر کرے گا" اب دونوں ہی ہاتھوں کی چونچ بنائے منہ آڑا ترچھا ان کی طرف دیکھ کر کر رہے ہیں بچے بلبلا رہے اور ماں باپ جھٹ بستر لپیٹ کر نیچے آکر بچوں کا بستر گول کر نیچے سیٹ سے ٹین کا ٹرنک کھینچ کر دروازے کے پاس بیٹھ گئے پیٹ کو ہماری طرف کر کے سینے پر بچوں کو دبکائے بیٹھ گئے تو مولوی صاحب اور اختر منہ سے ہولناک آوازیں بلند کیے جاتے ہیں۔ اب تو میں خود بھی ڈر کے مارے کانپ اٹھی کہ آخر کیسے لوگ ہیں یہ؟ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا مجھ پر اپنا رعب اور ڈر طاری کرنا چاہتے ہیں۔

"بی حمیدہ دیکھ لو ہم کو کچھ ناگوار لگے تو یہی حشر تمھارا بھی کریں گے۔"

"گربہ کشتن روزِ اوّل باید" والی بات کی جا رہی ہے۔ نہیں نہیں میں تو ایسے ڈروں گی نہیں ورنہ زندگی اجیرن نہ ہو جائے گی؟ ٹھیک ہے نہلے پر دہلے کا استعمال کر کے دکھادوں گی۔

ریل رکی دروازہ کھول، دونوں بچوں کو لے کر کھٹاک سے اتر گئے۔ قلی نے سامان اتار لیا۔ نہ جانے غریب کس ڈبے میں جا بیٹھے ہوں گے۔ اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔ بولے "اگر ایسا نہ کرتے تو پرسوں صبح تک ہم تو سچ مچ پاگل ہو جاتے!! جب اطمینان کا سانس بھر کر مولوی صاحب اپنی سیٹ پہ بیٹھے تو ان کو اپنا حقہ یاد آیا اور شاید اس کے تمباکو کی خوشبو کا تصور کیا ہو تو ناک میں درحقیقت کوئی اور ہی سی خوشبو آئی۔ ناک چڑھا کر، لمبی سانس کھینچ کر، میری طرف دیکھ کر دریافت کرتے ہیں یہ کھانے کی کہاں سے بو آرہی ہے؟ "والدہ نے کل کے لیے کھانا ہمارے ساتھ کیا ہے پتیلیاں سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی ہیں" میں نے جواب دیا۔

اچھل کر اٹھ بیٹھے کہ اب اس سے بھی ہم کو نبٹنا ہو گا۔ ریل ہلکی ہوئی جھٹا جھٹ پتیلیاں دروازے کے پاس کھینچ کر رکھ لیں دروازہ کھول کر آواز دے رہے ہیں "کسی کو کھانا چاہیے؟" کوئی نہ آیا تو قلی کو آواز دی کہ جلدی یہ سامان اتارو جب وہ تینوں پتیلیاں اُتار چکا تو دروازہ کی جلدی سے چٹخنی لگائی اور کھڑکی سے پکار کر کہا "جاؤ یہ سب لے جاؤ موج کرو۔" بتی بجھا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ صبح میری آنکھ خود سے کبھی کھلتی تھی جب تک مجھے ہاتھ سے ہلا کر کوئی اٹھا نہ دے۔ دن کے نو بج گئے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا آنکھ میری یوں کھلی کہ مولوی صاحب اپنی چھڑی سے میرے پاؤں کو ہلکے ہلکے کونچ رہے ہیں ہڑبڑا کر اٹھی کچھ وقت یہ سمجھنے میں لگا کہ میں کہاں ہوں۔ بولے "یوں کام نہیں چلے گا سارا مزا کر کرا کر دیا۔

بھوپال کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج خاص خاص انداز سے نکل رہے تھے۔ سوچا اب دن کی روشنی میں دو انجانے انسانوں کے دوبدو بیٹھ کر گزارنا ہے۔ خطوں اور افسانوں والے اختر کو تو خوب جان گئی تھی پر یہ والے اختر تو نہ جاننے کے برابر تھے۔ خیر

جیسے تیسے دن گزرا، رات گزری، گاڑی رکی مولوی صاحب اور اختر کے بہت سے دوست اسٹیشن پر موجود تھے مگر اب بھی کوئی خاتون نظر نہ آئیں لمبے موٹے موٹے پیلے چنبیلی کے گجرے ہم دونوں کے گلے میں سب ہی نے پہنائے سب لوگ مولوی صاحب کو ہاتھ میں گجرے تھماتے رہے پھر دونوں نے اپنے اپنے حصے کے گجرے میرے گلے میں ڈال دیے کس قدر بوجھ لد گیا۔ اسٹیشن سے موٹر میں روانہ ہوئے کچھ دیر بعد اختر نے اشارہ کیا وہ سامنے جو پہاڑی نما ٹیکری پر کوٹھی ہے وہ "نادر منزل" ہے گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ. سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آئی لان کے ساتھ پھولوں کی کیاریاں کھلے ہوئے پھولوں سے بھری۔ لان کے او. ایک طرف بہت بڑا گھنا برگد کا درخت جس کے چاروں طرف جالی سے بے تحاشہ بڑا چڑیوں کا پنجرہ۔ اس کے چار حصوں میں ہر قسم کی خوبصورت چڑیاں۔

آج جمعہ تھا نئے سال کا پہلا دن نیا گھر، نئے لوگ اور ان کا ہر انداز ہی نیا!! یہ سوچتی ہوئی موٹر سے اتری سامنے ہی چار ملازمین کھڑے ہیں شیرو، بشیر، محبوب، نورالہی سب نے جھک کر سلام کیا ایک ایک ہار پہنایا۔ سامان دوسری موٹر پر آرہا ہے مولوی صاحب نے بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا کہ اندر چلو اپنے گھر میں، پہلے بڑا ڈرائنگ روم، پھر ایک بڑا سا ہال کمرہ جس میں دیوار کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت سی کرسیاں۔ اس پر بے شمار طرح طرح کے رسالے اور اخبارات وغیرہ تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ کبھی یہ اس کوٹھی کا کھانے کا کمرہ ہوتا ہوگا اور اب لائبریری ہے۔ اس کے ساتھ جو کمرہ تھا اس کو تھوڑا سا جھانکا یا کہ یہ ان کا اپنا دفتر ہے ہر طرف کتابوں کی اونچی الماریاں ایک طرف ان کا لکھنے کا ڈیسک۔ کچھ فاصلے سے ایک آرام دہ کرسی جس کے قریب تھال میں پیچوان رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر ایک ساوار، چائے کی پتی کے ڈبے اور چند پیالیاں اور ایک چائے دان پڑا تھا۔ یہاں جو کتابوں کی الماریاں تھیں ان کی کتابیں بہت بوسیدہ سی لگیں۔ ان میں تالے لگے تھے مولوی صاحب خود ہی بول پڑے یہ سوچ رہی ہو کہ کس قدر پھٹی پرانی کتابیں ہیں۔ یہ سب صدیوں پرانے، انمول کتابوں کے نسخے اور مسودے ہیں۔" پھر ایک اور کمرہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں عابد حسین اور دوسرے والے میں جانے کیا نام لیا چلتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رکے دروازہ اس کا کھلا تھا کہا یہ احتشام الحق صاحب کا ہے میرے کان اس نام کو سن کر کھڑے ہوئے کہ والد صاحب نے آنے سے پہلے مجھے بتایا کہ اپنے عزیز دوستوں احتشام الحق، قاضی عبدالغفار اور سروجنی نائیڈو کو آج ہی خط لکھ کر ڈال چکے ہیں اور یہ تینوں تمھارا بہت خیال رکھیں گے۔

یہ کمرہ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ دوسرے کمرے سے مختلف ہے۔ فرش پر ایک جازم بچھی تھی سامنے نیچا سا ڈیسک نما شے، لمبے لمبے کاغذ، پیلی رنگت کے ہر طرف کچھ تہہ شدہ اور کچھ کھلے ہوئے تھے۔ ایسے تین کمروں کی طرف مولوی صاحب نے اشارہ کیا کہ یہ کاتبوں وغیرہ کے ہیں۔ پھر بڑے ہال کمرے سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر کہا یہ اختر کا آفس ہے۔ یہاں صرف دو نیچی الماریاں اور ڈیسک اور کرسی تھی۔ الماریوں میں موٹی موٹی طرح طرح کی زبانوں کی ڈکشنریاں تھیں۔ میز پر وہی لمبے اور پیلے والے ٹائپ شدہ کاغذ طریقے سے تہہ کیے رکھے ہوئے تھے۔ چق کو ہٹا کر برآمدے میں داخل ہوتے وقت مولوی صاحب نے کہا "آج تو تم کو آفس دکھا دیا اب یہ تمھارے لیے علاقہ ممنوعہ رہے گا، نہ تم کبھی اُدھر جاؤ گی اور نہ اُدھر سے کوئی ادھر آئے گا۔ یک بارگی زبان سے نکل گیا "تو کیا آپ اور اختر بھی ادھر نہ آئیں گے؟" یہ سن کر اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ارے اختر تو ہمارے ساتھ ہیں نہیں وہ کدھر کو چل دیے! سوچ کر چپ رہی برآمدے میں ایک چھوٹی سی کھانے کی میز اور چار کرسیاں تھیں ادھر اُدھر چند مونڈھے۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی صاحب نے کہا کہ وہ ان کا اپنا سونے کا کمرہ ہے اور سیدھے ہاتھ کی طرف

تم دونوں کا۔ "جاؤ اپنے کمرے میں اب چلی جاؤ۔" میں نے خواہش ظاہر کی کہ جب آپ نے سب دکھا دیا تو اپنا کمرہ بھی دکھا دیں۔ مولوی صاحب کے کمرے میں ایک مسہری، درمیان میں دیوار کے ساتھ لگی لوہے کی کیبنٹ، دوسری طرف ایک چھوٹا ڈیسک اور دو نیچی نیچی کتابوں کی الماریاں ان پر کچھ بوتلوں میں خشک میوہ، باہر کے بسکٹوں کے چند ٹن، دواؤں کی چند بوتلیں، ساتھ میں ڈریسنگ روم اور غسلخانہ، کمرے سے باہر آتے وقت دروازے کے قریب والی برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک پتلی لمبی سی میز ہے۔ اس پر کچھ پیالیاں، چائے دانی اور کئی طرح کے چائے ڈبے ایک ویسا ہی ساوار جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی یعنی کہ پانی چائے کے لیے گرم ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب برآمدے کے دوسرے سرے پر لپک آئے اس کمرے کے دو دروازے برآمدے میں کھلتے تھے جن پر چقیں پڑی ہوئی تھیں چق ہٹا کر آواز لگائی "رائے پوری صاحب تم سے ملنے کوئی صاحبہ آئی ہیں! اور مڑ کر چل دیے تر نہار ہے تھے میں نے پورے کمرے پر نظر ڈالی تو لگا اس کا سب فرنیچر بالکل نیا عمدہ قسم کی ٹیک کا ہے۔ دو مسہریاں، ایک چھوٹا سا ڈیسک، کرسی، دو نیچی سی کتابوں کی الماریاں، ایک کونے میں دو آرام دہ کرسیاں، سامنے وکس پالش سے جھل جھل چمکتی میز اس پر ایک ۵۵۵ سگریٹ کا ٹن اور ایش ٹرے۔ کمرہ بڑا کشادہ، قالین بہت عمدہ نیلے رنگ کا ایک پھول دان میرے ڈسک پر اور ایک الماری پر تازے گلاب کے پھول رکھے ہوئے، آگے بڑھے تو بڑا سا ڈریسنگ روم، دو کپڑوں کی الماریاں، ایک ڈریسنگ ٹیبل ساتھ میں اسٹول بیچ میں میرے دو ٹرنک اور ہم دونوں کے تین سوٹ کیس رکھے تھے۔ اختر نہا کر نکل آئے مجھ سے کہتے ہوئے کہ آپ نہا دھو کر برآمدے میں آجائیں تو گرم گرم چائے مولوی صاحب پلائیں گے۔

میں جب برآمدے میں آئی تو نہ وہاں مولوی صاحب اور نہ اختر برآمدے کی تین سیڑھیاں اتر کر دس فٹ چوڑی زمین پر لال بجری بچھی ہوئی، پھر ساتھ ہی ڈھال شروع ہو جاتی ہے جس پر پہلے پھولوں کی کیاریاں، پھر ہری گھاس ٹھہر ... کوئی ۲۵ فٹ لیول کی ہوئی۔ آگے جا کر زمین ڈھلوان تھی جس پر گنجان جھاڑیاں اکا دکا اونچے اونچے پیڑ۔ مولوی صاحب ... بیٹھے ... والے انسان پیچھے سے دو انسان یک بہ یک "ہو" کی آواز نکالتے ہوئے وارد ہونے میں اُچھل ہی تو پڑی۔ خود مولوی صاحب نے اپنے ہاتھ سے مختلف ڈبوں میں سے تھوڑی تھوڑی پتی نکال کر چائے دانی میں ڈالی میں بغور دیکھتی رہی تا کہ شام کو میں چائے دم کروں۔ چائے دانی پر ایک چھوٹا تولیہ ڈھانک دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ سے پوچھا "ہلکی چائے چاہیے یا تیز؟" میرے منہ سے جانے کیوں یہ نکل گیا "چائے اور چاہ جیسی بھی مل جائے" مسکرائے پھر پوچھا "اور دودھ کتنا۔"

'بقدر اشک بلبل' ہنس کر بولے "تم کو فارسی کچھ آتی ہے؟" ہاں تھوڑی سی۔ اختر یہ لڑکی خاصی چٹ پٹی ہے ذرا بچ کر رہنا ہوگا" اندر کمرے میں گئے ایک گڈی نوٹوں کی میرے ہاتھ میں دے کر ساتھ ہی ڈیسک کے خانوں کی چابیاں تھما کر فرمایا "سب نوکروں کو تنخواہیں دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتا دیا کرنا۔"

خود تو اندر چلے گئے اختر اخبار پڑھتے رہے میں نے اتنے ڈھیر سے نوٹ کبھی اپنے ہاتھ میں لیے نہ تھے۔ نہ مجھے یہ معلوم کہ ملازموں کی تنخواہیں کیا ہیں؟ اور کھانے میں ان دونوں کی پسند کیا ہے۔ خیر اختر سے پوچھ لوں گی۔ اندر جا کر دراز کھولی پیڈ، سادے لفافے، ٹکٹ دار لفافے، قلم سب ہی کچھ رکھا ملا۔ والدہ کی ایک تاکید یاد آئی کہ جب تم کو گھر چلانے کے لیے روپیہ دیا جائے تو ایک پر "لفافہ برائے قرض" دوسرے پر "اشد ضرورت کے لیے" لکھ کر تھوڑے تھوڑے روپے اس میں رکھ دینا آخر ماہ میں اگر ضرورت ہو تو لفافے سے قرض لے کر پہلی کے بعد لفافے کا قرض واپس کرنا۔ اشد ضروری کو صرف اشد ضرورت پر ہاتھ لگانا میں نے بے گنے

کچھ ایسا ہی کیا۔ رات کا کھانا بعد مغرب کھایا گیا۔
دوسرے دن صبح بشیر میرے پاس آکر کھانا پکانے کا پوچھتا ہے "آج رات کیا پکایا جائے" "بھئی پہلے تو دن کے کھانے کی بات کرو" میں نے کہا۔ تو وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ بولا مطلب یہ ہے کہ اختر میاں یا مولوی صاحب نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ ہمارے گھر دن کا کھانا کھایا نہیں جاتا بس رات کا بتادیں۔ "بشیر جو تم نے پرسوں پکایا وہی آج پکالو۔" "مگر آپ لوگ یہاں پرسوں کب تھے؟" "ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے تم اپنی مرضی سے پکالیا کرو مجھے کیا معلوم یہ دونوں کون سی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ اپنی تنخواہ لے لو اور بتا دو کہ کس کو کیا دوں؟" وہ میرا منہ دیکھ کر مسکرا پڑا کہ ان صاحبہ کو کچھ بھی خبر نہیں اس نے مجھے سب کچھ بتایا۔ جب میں نے کہا کہ بس ایک حساب کے لیے کاپی مجھے لا دینا اور چند شریفے۔ گھبرا کر کہا "یہ اس گھر میں کبھی نہیں آسکتے۔" "وہ کیوں؟" "آپ مولوی صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔ آج تو آپ کی فرمائش بھلے پوری کر دوں گا کمرہ بند کر کے کھائیے گا۔ بیج اور چھلکے کاغذ میں لپیٹ کر ٹوکری میں رکھ دیجیے گا۔"
کل ہی اختر سے مولوی صاحب کہہ چکے تھے کہ وقت بہت ضائع ہو چکا ہے کام کی پوری پابندی ہونا چاہیے اور جو بھی جس بات کے اوقات ہیں اس میں فرق نہ آئے۔ صبح پانچ بجے یا تو خود سے اختر اٹھے ہوں گے یا مولوی صاحب نے آواز دے کر اٹھالیا ہوگا۔ دونوں سیر کر کے آگئے اختر نہانے غسلخانے میں چلے گئے مولوی صاحب نے چق اٹھا کر جھانکا میں اوندھی پڑی سو رہی تھی۔ دیر تک سونا ناگوار گزرا یا چھیڑنے کے موڈ میں ہوں۔ میز پر سے کتابوں کا ڈھیر اٹھا کر میرے اوپر لاد دیا۔ میں نہ اٹھی نیچے رکھا ہوا صندوقچہ کمر پر رکھ دیا اور ساتھ ہی کرسی دو پائے ادھر دو ادھر میرے اوپر رکھ دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بڑے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ الٹی تو لیٹی تھی دکھائی دیتا تو کیسے۔ زور لگا کر اٹھی تو آڑم دھڑم کرسی گری صندوقچہ گرا اور سب کتابیں۔ اختر غسلخانے سے پکار پکار کر کہے جائیں حمیدہ بیگم خیر تو ہے یہ چیزیں کیوں اُچھال رہی ہیں؟ جواب دیا جو آپ مجھ پر لاد گئے تھے ان ہی سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ کیا کہہ رہی ہیں؟ اختر تیار ہو کر کمرے میں آئے غور سے گری ہوئی کرسی، صندوقچہ اور کتابیں دیکھتے رہے۔ اچھا میں سمجھا۔ یہ کہہ کر برآمدے میں تیز قدم سے نکل کر مولوی صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ لمحہ بھر میں بات کی نزاکت کو سمجھ کر میں دوپٹہ اوڑھتی ہوئی ان کے پیچھے لپکی وہ مولوی صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر تنے کھڑے ہیں کہ غسلخانے سے نکلیں۔ تو میں بھی اندر داخل ہو کر ذرا زور سے بولی آپ حد کرتے ہیں۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ مولوی صاحب نے کیا ہے میں تو آپ سے مذاق کے طور پر ایسا خود ہی کر رہی تھی۔ خود تو آپ لوگوں نے مذاق اور تفریح، بھری محفل میں روا رکھی وہ ٹھیک تھا۔ ایک ذرا سا میں نے صندوقچہ اور کرسی گرا دی تو مولوی صاحب سے اس کی پوچھ گچھ کرنے چلے آئے مولوی صاحب نے سب کچھ اندر سے سن ہی لیا تھا۔ سو کھا سا منہ بناتے باہر آئے اور کہا دیکھو تم دونوں آپس میں لڑو بھڑو تو شکایت میرے پاس لے کر نہ آنا۔ اختر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ جاتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تو آنکھوں سے جیسے شفقت کے لپکے سے ظاہر ہو کر کہہ رہے ہیں ہم تم دوست دوست۔
مولوی صاحب ناشتہ اور چائے پی کر چند کش پیچوان سے کھینچے اور مسکراتے رہے پہلے اختر چق اٹھا کر اپنے دفتر میں چلے گئے پھر خود اُٹھے یہ کہتے ہوئے "تم نے کس مزے سے مجھے بڑے بلے سے بچالیا۔" "کیا کہا آپ نے؟" اختر کا ایک یہ نام ہے اور بھی بہت سے ہیں۔ دفتر چلے گئے۔ ایک بجے جب بشیر ٹرے میں شربت اور ایک سیب رکھ کر لائے تو ساتھ ہی کاغذ میں لپٹے دو بڑے بڑے شریفے بھی تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اب پھر کبھی شریفہ نہیں لائے گا ورنہ اس کی تو چھٹی ہی کر دی جائے گی۔

کیا ہی یہ شریفے تھے پاؤ پاؤ بھر کے۔ خوش ہو کر شریفے کھانے لگی دروازے میں چٹخنی لگانا بھول گئی۔ مولوی صاحب یا تو کچھ اپنے کمرے سے لینے آئے یا کسی خیال کے تحت میری خبر لینے۔ چق اُٹھائی تو میں بیٹھی شریفے کھا رہی تھی۔ اس قدر گھبرا کر بولے "ہائیں یہ کیا کر رہی ہو؟ کون لایا؟" شریفہ میرے ہاتھ سے ٹرے میں گر تو گیا پر ہمت کر کے پوچھا "اس میں آخر کیا برائی ہے؟" "میں بتاتا ہوں اپنا منہ ایک طرف کو خوب ٹیڑھا کر کے مولوی صاحب نے کہا" یہ ہو جاتا ہے۔" (یعنی لقوہ گر جاتا ہے) منہ سے نکل گیا "تو پھر میرا ہی منہ ایسا ہو جائے گا اور کسی کا تو نہیں۔" "تم کیا سمجھ رہی ہو کہ ایک لقوہ زدہ لڑکی کو ہم اپنے گھر رکھے رہیں گے؟ فوراً ٹکٹ کٹوا کر ظفر عمر کے پاس روانہ کر دیں گے۔" میں سوچتی رہ گئی کہ اب تو کبھی یہ کھانے میں نہ آئیں گے۔
دوسرے دن کوئی دس بجے باہر باغ کی کیاری کے پاس کھڑی کچھ پھول توڑ رہی تھی کہ دیکھا کوئی صاحب بالکل دوہری کمر، صاف براق رنگ، سفید جھک کرتا پاجامہ ہاتھ میں اسی قدر باریک سی چھڑی جس قدر خود باریک اور نازک سے تھے۔ کوٹھی کی دیوار کے پاس آتے آتے رک کر دور ہی سے کہتے ہیں۔ "میں احتشام الحق (شان الحق حقی کے والد) ہوں۔ ظفر عمر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ اُن کی بیٹی کا خیال رکھوں میں تمہارا چچا ہوں کوئی تکلیف ہو کچھ چاہیے ہو تو بے تکلّف مجھے بتا دینا۔ ٹھیک ہو نا بیٹی؟" "آداب جی بالکل مزے میں ہوں، ہاں ایک تکلیف ہے کہ یہاں شریفے نہیں آسکتے آپ مجھے لا دیا کریں، مگر دیں گے کیسے؟" اس پر بڑے میاں نے کہا "اسی کیاری میں کاغذ کی تھیلی روز رکھ دیا کروں گا۔" وہ واپس چلے گئے ان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی اگر زور کی ہوا چلی تو یہ اُڑ جائیں گے۔

رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا "حمیدہ یہ بتاؤ تم اپنے گھر میں شاموں کو کیا کرتی تھیں۔" میری شاید شامتِ اعمال ہی تو تھی کہ بتا دیا کہ شام کو بیڈ منٹن کھیل لیتے تھے اور بعد مغرب کبھی تاش کھیلا کرتے تھے کبھی پچیسی۔" "تو پھر تم یہاں بھی یہی کرنا" "پر وہ کیسے؟" "بتاؤں گا۔"

تیسرے دن شام کی چائے کے بعد مولوی صاحب تین بڑے چھوٹے بنڈل اپنے کمرے سے اٹھا کر، لا کر سامنے رکھ دیے کھول کر دیکھا ایک میں تین عدد بیڈ منٹن کے بلّے ایک ڈبّہ میں شٹل کاک، ایک پیکٹ میں دو گڈی تاش اور ایک میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں!!

خوش ہی تو ہو گئی پوچھا "یہ بیڈ منٹن تین آدمی کیسے کھیل سکتے ہیں۔ دو کھیل سکتے ہیں۔ ہاں تاش اور پچیسی تین لوگ ضرور کھیل سکتے ہیں۔" "اچھا ہم نے تو تاش کھیلے نہیں چلو ہم دونوں کو سکھاؤ۔" "کیا آپ دونوں تاش کھیلنا نہیں جانتے؟" "جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے وہی یہ سب چیزیں کھیلا کرتے ہیں"۔ مولوی صاحب بولے۔ میں نے پتّے بانٹنے سمجھانا شروع کیا یہ عاقل لوگ جب کچھ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں تو جھٹ سمجھ لیتے ہیں۔ چند ہاتھ کھیلے مگر لڑتے جائیں کہ آپ بے ایمانی کر رہے ہیں۔ وہ کہیں تم بے ایمانی کر رہے ہو۔ پھر یہ اعلان کر کے کھڑے ہو گئے کہ کل چھکّا مل کے ساتھ نہیں کھیلیں گے میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا چھکّا مل کدھر ہیں؟ یہ جو تمہارے شوہر نام دار ہیں۔ ان کے بہت سے نام ہیں۔ دوسرے دن میں نے بیڈ منٹن کو کھیل کر سمجھایا اس کو اختر کبھی کھیل چکے تھے مگر ایسا بن کر مونڈھے پر چڑھے بیٹھے دیکھتے رہے کہ آج ہی دیکھ رہے ہوں۔ آج صرف سبق سیکھا گیا۔ مگر یہ تاکید کہ کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ سارے شہر میں مشہور ہو جائے گا کہ عبدالحق تاش پتہ، پچیسی اور بیڈ منٹن کھیلنے لگے!!
جس بھی شام کو بیڈ منٹن اختر اور وہ کھیلتے تو لڑائی ایسی ہوتی کہ مولوی صاحب بلّا لے کر ان کے پیچھے بھاگتے ظاہر ہے اختر تیز بھاگتے تو دور سے گھما کر ریکٹ اُچھال اُچھال کر مارتے کہ وہ ٹوٹ جاتا۔ تاش کھیلتے میں ایسی لڑائی ہوتی کہ اس کی گڈی پھاڑ دی

جاتی۔ پچیسی کی بساط کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا۔ دوسرے روز اور تو آہی جائیں گے۔ میری جان غضب میں ان کی سی کہوں تو وہ بگڑے جاتے ہیں اُن کی بات کو درست کہوں تو وہ بگڑ رہے ہیں۔ شام آتی تو میری جان نکلنے لگتی مگر ان دو عظیم ہستیوں کو بچکانہ موڈ میں دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتی۔ اختر جز بز ہوتے کہ میں نے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ رات کے پڑھنے کا لطف ملیامیٹ ہوگیا ہے۔ مولوی صاحب کا جواب ہوتا "شکر ہے کہ کچھ دیر آنکھوں کو آرام مل جاتا ہے اور دماغ جو پڑھ پڑھ کر پچپچا ہوگیا ہے وہ روبصحت ہو رہا ہے!"

پہلی بار جب سروجنی نائیڈو کے لڑکے بابا اور مسز نائیڈو سے ملنے کو جانے لگے تو مولوی صاحب اختر کو بار بار کہے جاتے دیکھو لڑکی کو ان کے کتّے سے کٹوا کر نہ لے آنا پھر یہ باؤلی ہو کر گھر میں گھومتی پھرے گی ہم دونوں کو تو ضرور کاٹ کھائے گی۔" اختر مجھ سے کہتے "ان کی باتوں میں نہ آئیے ان کو کسی کو ڈرانے میں مزا آتا ہے۔"

پہلی بار جب قاضی عبدالغفار کے ہاں گئے تو ان کی اعلیٰ نسل کی کتیا کے بچے کو دیکھ کر ایک بچّہ مانگ لیا بچّے چھوٹے بہت تھے دو ہفتے بعد ماں سے الگ ہو سکیں گے۔ "اختر تمہارا کیا خیال ہے۔ قاضی صاحب کی بیگم صاحبہ دینے پر رضامند ہیں۔ لے لوں؟" اختر نے کہا کہ "مولوی صاحب ہرگز ہرگز کتا نہ رکھیں گے۔ انھوں نے ایک کتّا پالا تھا اس سے بہت مانوس تھے ایک شیر کا بچّہ بڑے سے پنجرے میں پال لیا، اس نے ایک بار کتّے کو پنجے میں ایسا دبوچا کہ وہ مر گیا۔" "ان سے اجازت میں لے لوں گی۔" میں نے جواباً کہا۔

سروجنی نائیڈو کی سیاہی بلّی کا ایک بچّہ ہم پہلے ہی لاچکے تھے۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کرتے۔ میز سے برابر نیچے کچھ نہ کچھ ڈالتے رہتے اور کہے جاتے یہ تو دن بدن اور بھی بھتنا بنتا جاتا ہے۔

چند دنوں بعد جب مولوی صاحب نے پوچھا کہ کچھ تم کو چاہیے ہے؟ میں نے دو چھوٹے تخت کی فرمائش کر دی۔ ایک برآمدے کے لیے ایک اپنے کمرے کے لیے۔ ہنس کر کہتے ہیں "تو بڑی بی بن کر بیٹھنے کا ابھی سے شوق ہے" دوسرے ہی دن تخت آگئے ایک برآمدے میں لگوایا توشک بچھوا کر صاف چادر لگائی کچھ لحافوں کو لپیٹ کر اس کے گاؤ تکیے بنائے مولوی صاحب شام کو چائے پی کر دھپ سے تخت پر لیٹ جاتے پیچوان قریب کروا کر زور زور سے کش لگاتے ہوئے اخبار پڑھتے جاتے ذرا ذرا دیر بعد کہتے جاتے بھئی یہ تو بڑا آرام دہ ہے۔ آدھے گھنٹے بعد اختر ان کو اُٹھ جانے کو کہتے کہ اب ان کی باری ہے۔ چھوٹا موٹا جھگڑا اسی بات پر ہو جاتا روز ہی مدراس کی کانفرنس کے لیے جانے کا ذکر آجاتا۔ باتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ دو ہفتے کے لیے جائیں گے۔ پھر میرا کیا بنے گا؟ ساتھ لے جائیں گے؟ اکیلے گھر میں چھوڑ کر نکل جائیں گے؟

اختر سارے دن اندر کا رخ نہ کرتے مگر مولوی صاحب کئی بار چق ہٹا کر حال احوال ضرور پوچھ جاتے۔ ایک دن ان کو بتایا کہ قاضی صاحب کی بیوی اپنے کتّے کا بچّہ شاید مجھے دے دیں۔ مگر اختر کو کتّوں سے شاید نفرت سی ہے کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ بولے پھر تو تم اس کو ضرور لے آؤ، ہر بات میاں پنجو مل کی کیوں چلے؟ لیجیے کس آسانی سے یہ معاملہ حل ہوگیا۔

ایک دن میں نے جب خود ان کو مچھلی کا سالن پکا کر کھلایا۔ بڑے خوش ہو کر کہا اس کا انعام وہ مدراس سے آکر دیں گے۔ میں اداس ہو گئی کہ میرا کیا بنے گا؟ ایک دن اعلان کر دیا کہ اختر اور وہ کل دوپہر کی گاڑی سے مدراس جا رہے ہیں تم اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ لو۔ صبح سے پہلے تم کو منظور یار جنگ کے ہاں پہنچا دیں گے۔

دوسرے دن اختر نے اپنے کپڑے وغیرہ سوٹ کیس میں رکھے۔ میں نے اپنے کپڑے پہلے ہی رکھ لیے تھے۔ سوٹ کیس

موٹر میں رکھ دیا گیا تھا، ناشتہ کرتے ہی کہا جلدی چلو اختر اپنے دفتر کے کمرے میں کرسی پر بیٹھے شاید کچھ ضروری چیز لکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر کھڑے ہوئے اچھا خدا حافظ مولوی صاحب نے موٹر میں بیٹھ کر پوچھا کہ "آج تک تم نے یہ ہم سے کیوں نہ پوچھا کہ کہاں پہنچادی جاؤ گی اور وہ لوگ کیسے اور کون ہیں؟ مجھے رونا سا آرہا تھا جب یہ کہا کہ میں کیوں پوچھتی؟ میں ٹھہری ایک سوٹ کیس جس کو یہاں وہاں دھر دیا جائے گا۔ اس کو پوچھنے کا حق ہی کیا ہے؟ بے چین سے ہو کر کہنے لگے مردوں کو کام سے ادھر ادھر کبھی جانا ہی ہوتا ہے (۷) بہت اچھے لوگوں میں اتنے دن تم رہ کر خوش ضرور ہوگی۔ تم نے یہ بھی دیکھا کہ وہ "اکڑفوں شاہ" کرسی پر ڈٹے بیٹھے رہے!!" "آپ کا ہی حکم ہوا ہوگا۔"

موٹر نواب منظور یار جنگ کی کوٹھی کی پورچ میں رکی۔ برآمدے سے ایک بھاری بھرکم خاتون موٹر کے پاس آکر مولوی صاحب کو جھک کر سلام کرتی ہیں۔ مولوی صاحب جلدی کے مارے اُترے بھی نہیں۔ اترو اترو یہ ہیں میزبانوں کی والدہ تمہارا بہت خیال رکھیں گی۔ "میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی نہیں میں اتر آئی موٹر روانہ ہوگئی میں کھڑی ادھر کو دیکھتی رہی ہاتھ کے اشارہ سے کہہ رہے تھے اندر جاؤ میں سارے دن گم صم سی سوچا کی کہ یہ دونوں بالکل ہی مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ یہاں وقت اچھا گزرا مگر اپنا گھر اور اس کے نرالے سے مکیں یاد بہت آتے رہے۔ تیسرے دن دونوں نے ایک ایک تار بھیجا شکر کیا کہ یہ لوگ مجھے بھول نہیں گئے واپسی پر اسٹیشن سے سیدھے مجھے لینے دونوں آئے مگر موٹر سے نہ اُترے کہا جلدی سے بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گئی۔ راستے میں مولوی صاحب نے پوچھا "تمہارا دل تو درجنوں عورتوں میں رہ کر بہت ہی خوش ہوتا رہا ہوگا۔" "اپنا مردانہ گھر بہت یاد آتا رہا۔" میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگے "سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارا دل بھی اپنے گھر جلد واپس آنے کو چاہا کرتا تھا۔ اور یہ بھی خیال آتا کہ قاضی صاحب کے ہاں سے کتے کا بچّہ بھی لانا ہے۔ اب بڑا ہو گیا ہوگا۔"

اختر نے اوپری طور سے پھر مخالفت کی کہ مولوی صاحب نہ لانے دیں گے۔ ان کو کتے بالکل ناپسند ہیں اس پر مولوی صاحب نے بالکل ضدی بچوں کی طرح کہا "ہم لائیں گے ضرور لائیں گے اور آج ہی شام لائیں گے۔" دن میں کسی سے دو برتن، ایک چین، برش ایک چھوٹی سی کھٹلیا اور گدہ منگوالی گئی۔ شام ہوتے ہی مجھے موٹر میں لے کر قاضی عبدالغفار صاحب کے یہاں گئے برآمدے میں کھڑے کھڑے چند باتیں کر کے بچے کو لے کر آگئے۔ اب اس کے نام پر دونوں میں خاصی بحث و تکرار ہوئی آخر "نازی" نام طے پاگیا۔ نازی کے مقابلہ میں بیچارہ "لاما" اور بھی گیا گزرا لگنے لگا۔ مگر اختر جان کر "لاما" کی تعریفیں کرتے اور نازی کو پاس نہ آنے دیتے تاکہ مولوی صاحب کی توجہ نازی کی طرف زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے۔ ایک بار نازی برآمدے سے نیچے سیمنٹ کے گملے پر گرا پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی ڈاکٹر نے پٹی باندھ کر ہدایت کی کہ دو دن تک اس کو ہرگز کھڑا نہ ہونے دیا جائے۔ جمعرات کی شام تھی۔ مولوی صاحب کرسی کھسکا کر نازی کی کھٹولی کے پاس اپنا اڈا جما کر بیٹھ گئے، ایک ہاتھ اس کی پیٹ پر رکھا ہوا کہ یہ کھڑے ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کبھی پانی کا برتن منہ کے سامنے کریں کبھی دودھ کا، کھانا آیا تو کہا "پہلے تم کھالو اُس کے اوپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ سکو پھر میں کھاؤں گا۔ اختر سے تو کہوں گا نہیں وہ جانے اس کے چٹکی ہی کاٹ لیں اور یہ گھبرا کر کھڑا ہو جائے!!" اختر دور سے کھڑے مسکراتے رہے۔ ان کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں کاش لاما کا بھی پیر ٹوٹ جائے۔ ادھر سے جواب کہ وہ تو اب آپ چھڑی مار کر ضرور اس بیچارے کو لنگڑا کر دیں گے میں نے سوچا کہ آخر ساری رات یہ ایسے بیٹھ کر کیوں کر گزاریں گے؟ میں نے مولوی صاحب کو رائے یہ دی کہ آپ کچھ دیر بعد کمرے میں لیٹ کر سو جائیں میں نازی کے پاس بیٹھتی ہوں۔ ایک بجے رات کو آپ کو جگا دوں گی۔ تو کہا تم جاگ تو لو گی تب تک؟ [illegible]

"کاش یہ بول سکتا اور اتنا بتا دیتا کہ کس نے اس کو دھکا دے کر گرایا اختر نے یا "لاما" نے "ایک بجے رات کو آواز دی کھٹ سے اُٹھ بیٹھے برآمدے میں آکر اس کے اوپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے خوش ہو کر بولے "اس کا انعام تم کو کل دوں گا۔" ناشتے کے بعد اپنے کمرے کی کیبنٹ سے ایک ڈبیہ نکال کر لائے میرے ہاتھ میں پکڑا دی ڈبیہ بہت پرانی معلوم ہوئی چاندی کی کٹاؤ دار گو کالی ہو گئی تھی پھر بھی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ کھولا تو اس میں بارہ عدد مٹر کے دانوں کے برابر سچے آب دار موتی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سچے اور جھوٹے موتی کی پہچان ہی نہ تھی۔ میں نے تو ڈبیہ قیمتی سمجھی۔ شکریہ کے بعد ان کو چھیڑنے کو کہا۔ "سچ سچ بتائیے کہ آپ نے کس کے لیے یہ ڈبیہ اور موتی لیے تھے؟" ماتھے پر بل پڑے آنکھوں میں اُداسی نظر آ رہی تھی۔ "تم نے یہ کیوں پوچھا؟" "ڈبیہ بہت پرانی جو ہے۔" "یہ سچ ہے کہ کسی کو دینے کے لیے بہت عرصہ پہلے لیے تھے۔ پر دیے نہیں۔ کیوں کہ اس کو اس قابل نہ سمجھا۔ پھر پینتیس سال سے یہ ڈبیہ یونہی پڑی رہی۔ اختر سے نہ کہنا وہ میرا مذاق اڑائے گا۔" "میں کیوں ان کو بتانے لگی دوستوں کی باتیں بتائی تو نہیں جاتیں۔" میں نے کہا۔ ہنس پڑے میں آکر سو گئی جمعہ کو سارا دن نازی کے پاس بیٹھے رہے۔ سیر کو نہ جانا ایک بہت عجیب بات تھی۔

مولوی صاحب کو سیّد ہاشمی فرید آبادی کی والدہ سے بہت عقیدت تھی۔ مہینے میں کسی جمعہ کی شام کو ضرور جاتے مجھے بھی ایک بار ساتھ لے کر گئے۔ کیا حسین بڑھیا تھیں۔ بولیں تو جیسے موتی بکھر رہے ہوں کیا ہی بامحاورہ زبان اور تکلم کا انداز تھا۔ مولوی صاحب ہر بار کوئی نیا لفظ اپنی گرفت میں ضرور کر لاتے اور اختر سے کہا جاتا کہ وہ دیکھیں یہ ڈکشنری میں رہ تو نہیں گیا۔ اور جب کبھی مولوی صاحب میرے کہے ہوئے اوٹ پٹانگ لفظ سن کر خوش ہو کر کہتے شاید یہ لفظ ڈکشنری میں آیا نہیں تو اختر بگڑ اٹھتے کہ مولوی صاحب آپ کو کیا ہو گیا ہے انھوں نے تو "گھپولا" بولا اور آپ سچ مچ ڈکشنری کا گھپولا کروانا چاہتے ہیں۔ سیریس ہو کر کہتے اس میں برا ماننے کی بات نہیں۔ حمیدہ بول چال کی زبان کی ماہر ضرور ہے۔ اختر کبھی ماننے پر تیار نہ ہوتے اس بار جو مولوی صاحب ہاشمی صاحب کی والدہ سے ملنے گئے تو انھوں نے کہا میاں عبدالحق آپ نے حد کر دی بھو بیاہ کر لائے دو مہینے ہو گئے ولیمہ آج کرتے ہیں نہ کل۔ لوگ منتظر بیٹھے ہیں باتیں ملا رہے ہیں۔

آخر یہ ولیمہ کیا ہوتا ہے؟ جب ان کو بتایا تو کہا آپ کو پہلے ہی بتا دینا تھا کون سی بڑی بات ہے۔ مگر یہ صرف زنانہ ولیمہ ہوگا۔

رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب بہت ہنس کر بولے "مابدولت آج ایک اعلان کرنا چاہتے ہیں۔" پوچھا وہ کیا؟ "ایک دعوت ولیمہ کہلاتی ہے وہ اس جمعرات کو کریں گے۔ لیکن صرف خواتین مدعو کی جائیں گی وہ بھی چائے پر۔" دعوت نامے چھپوائے گئے روانہ کیے گئے یہ سب ہاشمی صاحب کے ذمے تھا اور چائے کا انتظام بھی۔ دو سو مہمانوں کے لیے ہمارے برآمدے کے سامنے اور ڈھال سے اُتر کر جہاں بیڈمنٹن کورٹ بنایا گیا تھا وہاں میزیں برتن وغیرہ ۲ بجے سے ہوٹل کے بیرے لگانے لگے۔ بلاوا پانچ بجے کا تھا۔

قاضی عبدالغفار صاحب مجھی کے پیچھے پڑ گئے کہ "بیگم تم تو چار بجے تک پہلے سے چلی جاؤ ذرا دیکھ لینا کہ حمیدہ ٹھیک سے تیار ہو اور کچھ زیور بھی پہن لے۔" وہ بیچاری آگئیں۔ سامنے تو دفتر تھا پیچھے کی سمت سے آئیں۔ تو ظاہر ہے ان کو پہلے میزیں اور چائے کے لگے برتن نظر آئے میں برآمدے میں کھڑی بیروں کو کچھ ہدایت کر رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر خوش ہو گئی پر وہ تو بڑی گھبرائی سی آواز میں بولیں۔ یہ چائے کے برتن کیوں لگے ہیں بلایا تو کھانے پر سات بجے ہے۔ میں ہنس پڑی کہا آپ کیا کہہ رہی ہیں

چائے پر بلایا ہے کہ دعوتی کھانے کی خوشبو گھر میں کئی دن بھری نہ رہ جائے۔" انھوں نے بٹوہ کھولا اور دعوت نامہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ بار بار پڑھوں چھپا ہوا تو وہی تھا جو چچی کہہ رہی تھیں۔ گھبرا کر پوچھا کہ اب ہوگا کیا؟ اور یہ ہوا تو کیسے؟ بھئی جو بھی اور جیسے بھی ہوا اب تو بات مولوی صاحب کی عزت کی ہے تم اختر میاں کو فوراً بلا کر دعوت نامہ دکھاؤ کہ وہ کھانے کا انتظام کروائیں۔ اور وہ خود مولوی صاحب کو بتائیں۔ بھئی میں تو جاتی ہوں سات بجے آجاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں پلٹ گئیں۔ کچھ دیر کھڑی سوچا کی میں خود تو باہر آفس میں جا کر مولوی صاحب سے کہہ نہیں سکتی اب اختر کے دفتر کی چق کو ہٹا کر پکارا "سنیے، اندر آئیے۔" وہ میری آواز سن کر ذرا اچھل سے گئے "خیر تو ہے۔" "بس خیر ہی تو نہیں ورنہ بھلا آفس سے میں آپ کو کیوں بلاتی۔" وہ اندر آئے کارڈ ان کے ہاتھ میں دیا بغور پڑھا ماتھے پر چند بل سے اُبھرے اطمینان سے برآمدے سے نیچے اتر کر ہیڈ بیرے کو بلا کر کہا کارڈ چھپنے میں کوئی غلطی ہوگئی کھانے کا چھپ گیا آپ چائے کا سامان اور برتن فوراً اٹھوا کر واپس ہوٹل لے جائیں اور دو سو لوگوں کا کھانے کا بندوبست کریں آپ کے ہوٹل سے اتنا انتظام اتنی جلدی میں نہیں ہوسکتا ہو تو اور دو ایک ہوٹل سے بھی لے لیں۔ مینو یہ ہونا چاہیے۔ کھانا ٹھیک آٹھ بجے میزوں پر آجانا چاہیے۔" پھر برآمدے میں آئے مجھے صرف اتنا کہا کہ "شکر کیجیے کہ چچی پہلے سے آگئیں اور یہ عقدہ کھل گیا اور نہ مولوی صاحب کو کیسی شرمساری اٹھانی پڑتی۔ چق اٹھا، اپنے دفتر میں جا کر کام کرنا شروع کر دیا یہ بھی تو نہ کیا کہ مولوی صاحب کو جا کر صورت حال بتا آتے۔

مولوی صاحبؒ نے دفتر ہی میں چائے آج پی لی اور ٹھیک پانچ بجے پورچ سے ہوتے ہوئے لان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک جاتی سڑک پر ٹہلنے لگے میں برآمدے سے نیچے اُتر کر اُن کے کمرے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی ان کو گیٹ تک جاتے اور پھر واپس پورچ کی طرف آتے دیکھ کر پریشان ہوتی رہی وہ اپنی گھڑی کو دیکھ رہے ہیں یعنی سوا پانچ بج گئے ساڑھے پانچ بج گئے کوئی مہمان نہیں آیا۔ یہ بے قاعدگی کی مجال! گھبرا کر اندر برآمدہ میں آئے چق اٹھا کر دیکھا اختر اب یہاں کیوں ہوتے کمرے میں لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ پوچھا کہ آپ نے مولوی صاحب کو بتایا نہیں وہ تو بڑی تیزی سے پھاٹک تک جاتے اور آتے ہیں گھڑی دیکھ رہے ہیں۔ "آپ خود چلی جائیں میں کیوں ان سے کچھ کہوں میں نے تو دعوت کرنے کو نہیں کہا تھا۔ کارڈ کا مضمون خود اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا۔ اب وہ غصّہ میں پورے سات بجے تک یونہی شیر ببر کی طرح ٹہلتے رہیں گے۔ اور پھر جانے کیا حرکت کریں۔ اختر کی آواز میں غصّہ تھا نہ ہی چہرے پر، بلکہ مسکرا رہے تھے۔ ایک بار ہمت کر کے باہر نکلی مولوی صاحب کی پیٹھ میری طرف کو منہ پھاٹک کے رخ پر تھا۔ قدم تیز تر ہو چکے تھے۔ دور لان کے آخری سرے کی جھاڑیوں کے درمیان سیّد ہاشمی صاحب کا سر بس نکلا نظر آیا دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اشارہ کر رہے ہیں کہ اندر جاؤ واپس چلی جاؤ میں سچ مچ ڈر گئی کہ جب ایک اتنا لحیم شحیم انسان ڈر کر یوں چھپا ہوا ہے یا شاید کوئی چھڑی پڑ چکی ہے۔ فوراً واپس آگئی کھانے کے دیگ آ چکے تھے۔ بیرے برتن لگا ہی چکے تھے اب پونے سات ہوگئے ہیں میں ان کے کمرے کے کونے کی دیوار سے یوں لگی کھڑی ہوں کہ مولوی صاحب کو پھاٹک کے گیٹ پر جاتے بخوبی دیکھ سکتی ہوں، ایک موٹر گیٹ میں داخل ہونے لگی مولوی صاحب نے اپنی جُریب گاڑی کی بونٹ پر دو بار ماری اور جو بھی کہا ہو وہ پیچھے کی طرف ہوئی اور فراٹے بھرتی روانہ ہوگئی اب پھاٹک کے درمیان کھڑے ہیں موٹریں دنادن آتیں اور واپس جاتی نظر آتی رہیں۔ میں اپنے کمرے میں آگئی اختر بے نیازی سے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ یک بارگی اٹھ کر برآمدے میں کھڑے ہو کر ہیڈ بیرے کو بلا کر کہتے ہیں۔ آپ اپنا یہ سب سامان اٹھا کر واپس لے جائیں کل صبح چائے اور کھانے کا بل مولوی صاحب کو دے کر اپنی رقم لے جائیے گا۔ مولوی صاحب اندر آگئے۔ کمرے میں شیروانی اتار کر، برآمدے کی کرسی پر بیٹھ کر محبوب

کو آواز دے کر کہتے ہیں۔ محبوب نے بتایا کہ گھر میں کھانا تو پکا نہیں دیگ کا لے آتا ہوں۔ اختر یہ سنتے ہی کمرے کی چق اٹھا کر کہتے ہیں آج کوئی کھانا نہیں کھائے گا۔ مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے "ایک رات نہ کھایا تو کیا میں مر جاؤں گا۔" اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کوٹھی کے پیچھے کوٹھیلوں پر دیگیں رکھی ہوئی تھیں جا کر کہہ آئے کہ ان سب کو اوندھا کر کے کھانا گرا دو کتے، بلیوں کی ہی دعوت ہو جائے۔ میں دل میں اپنے کو ذمہ دار ٹھہرا کر چور چور سی اب اختر سے بھی ڈر رہی ہوں میں مولوی صاحب کے کمرے کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اب مجھے کرنا کیا چاہیے کہ والدہ کا یہ جملہ یاد آیا کہ "بھوکا سیّد اور بھوکا شیر برابر کے ہو جاتے ہیں۔" خود سیدانی تھیں ان کا تجربہ اپنے بھائیوں اور والد کا شاید یہ ہی رہا ہو۔ اٹھی میز پر پیالیاں بسکٹ کا ڈبہ رکھا اور پکار کر کہا آج تو میں چائے دم کروں گی۔ گو آپ مجھے کہہ چکے ہیں کہ بدنیت انسان کی دم کردہ چائے آپ نہیں پیا کرتے آئیے اندر کمرے سے اور وہ پنیر کا ڈبہ اور پستے بھی لے آئیں۔ اپن دونوں مل کر چائے پئیں گے۔ بسکٹ پنیر اڑائیں گے اور آپ کا "باگڑ بلا" آج بھوکا سوئے۔ میری ان باتوں پر مولوی صاحب کا پارہ یک دم نیچے گر گیا بچوں والی معصومیت سے چہرے پر آنکھیں دمکاتے ہوئے اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ میں نے چائے دم کر کے "ٹی کوزی" سے چائے دان ڈھانک دیا تھا، بھوک میں چائے اچھی لگی۔ تیسری پیالی میں بھی چائے بنا کر، دو بسکٹ درمیان میں ان کے پنیر رکھ کر اپنے کمرے میں گئی اور میز پر رکھ، یہ کہتی ہوئی باہر آ گئی "چائے ٹھنڈی نہ کر دیں" ذرا ہی دیر بعد اختر پیالی لیے آ گئے اور بولے "کیا ایک پیالی چائے اور مل سکتی ہے؟"۔ "یہاں بیٹھیں تو چائے ضرور مل جائے گی۔" بیٹھ گئے کلکتہ میں کسی کانفرنس کا ذکر ہونے لگا اختر نے مولوی صاحب سے پوچھا "خطبۂ صدارت ختم کر لیا ہو تو کل صاف کر لیا جائے۔" میں اُچھل پڑی کہ کانفرنس کا مجھ سے کوئی ذکر تک نہ کیا گیا او اب جانے کدھر کو دھر دی جاؤں گی۔ دونوں مختلف امور پر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ ان کو کوئی غصہ ہے نہ اُن کو۔ یہ دو عظیم انسان اب اپنے اپنے عالمانہ میدان میں گھریلو اور عام انسانوں کے رسم رسومات کے قصوں سے نکل چکے ہیں۔ ایک دم مجھے خیال آیا۔ "بھئی واہ کیا برات لے کر اُترنے کا انداز تھا کیا ہی نکاح کی محفل تھی اور یہ ولیمہ بھی خوب ہی رہا۔" ہنسی آ گئی پوچھتے ہیں ہنس کیوں رہی ہو۔ "بس ایسے ہی تو جاؤ سو جاؤ ہم کو ابھی بہت سے موضوع پر باتیں کرنا ہیں۔" میں کپڑے بدل کر یہ سوچتی ہوئی سو گئی۔ کون بھول سکتا ہے، اختر حسین کا نکاح اور ولیمہ ان میں شرکت کرنے والے سب ہی تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بس ایک بشیر الدین صاحب اور قاضی صاحب کی بیگم صاحبہ علی گڑھ میں۔ مہندر اور رام لال صاحب کلکتہ میں۔

چچا احتشام الحق میرا خاموشی سے، خفیہ انداز سے کتنا خیال رکھا کرتے۔ شریفے ان کے ساتھ مختلف چیزیں جیسے گھٹیاں کبھی کبھی کھجوری یا ایسی ہی اور شے حسبِ وعدہ کیاری میں رکھ جاتے ایک بار ان سے کہا چچا میری چوڑیاں اب سب ٹوٹ گئیں دوسرے دن تین ناپ کی چھوٹی، منجھولی اور بڑی چوڑیاں بھی لے آئے کہ جانے ہاتھ میں کون سی آئیں گی!!

ادھر کلکتہ روانہ ہونے سے ایک دن پہلے مجھے بتایا گیا کہ کل شام کو سوٹ کیس میں کپڑے رکھ کر بالکل تیار رہنا منظور یار جنگ کے گھر بس آٹھ دن رہنا ہو گا۔!!! اب کی میں نے بہت کہا کہ قاضی صاحب یا سروجنی نائیڈو کے ہاں رہ جاؤں مگر نہ مانے۔ اب کی دونوں مل کر موٹر میں جا کر وہاں چھوڑ آئے۔ وہاں کے رہنے کی مزیدار تفصیل "ہم سفر" میں پڑھیے گا۔ یہ پوری کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے جانے کیسے مجھ سے تین ماہ میں ایک درجن قلم اور چند رجسٹر بھیج کر لکھوائی۔ خواہش کر دی تھی کہ رجسٹر جوں ہی ختم ہو ان کو روانہ کر دوں۔ سو میں یہی کرتی رہی۔ اب پورے نو ماہ میں پہلا رجسٹر مجھے واپس بھیج دیا ہے۔ ہنوز تین عدد ان کی تحویل میں ہیں۔ اگر جلدی پڑھ کر املے وغیرہ کی غلطیاں درست کر کے بھیج دیں تو میری زندگی میں آ جائیں گے۔ ان کے حکم

کے بموجب پہلا رجسٹر صہبا لکھنوی صاحب کو دے دیا ہے کہ وہ قسط وار "افکار" میں چھپواتے رہیں اگر میں نہ رہی تو آپ سب جانیں۔ اسے کتابی شکل میں چھپوا دیں اس میں آپ کو بہت سا تاریخی مواد جو نظروں سے پوشیدہ رہا ہے پڑھنے کو ملے گا۔

کلکتہ سے واپسی پر دونوں ہی میرے لیے ویسی ہی عمدہ ساڑھیاں لائے جیسی مدراس سے مدراسی ساڑھیاں لائے تھے۔

چند دن بعد اختر کو ملیریا بخار آ گیا خوب ہی جاڑا لگتا ہے اس میں۔ مولوی صاحب اور میں رضائیاں اڑھاتے گئے۔ ڈاکٹر آئے ملیریا کی دوائیں دے گئے۔ دس بجے رات کو تھرمامیٹر لگایا تو بخار ایک سو چار ڈگری تھا میں جلدی سے ایک پیالے میں برف اور پانی لائی تھوڑا سا کولون ڈالا رومال اس میں گیلا کر کے نچوڑ کر اختر کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ مولوی صاحب نے اچھل کر رومال میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ "یہ کیا کرتی ہو؟ کیا بیچارے کو مار ڈالنا چاہتی ہو۔ اتنی سردی لگ رہی ہے اور تم برف کا کپڑا سر پر رکھ رہی ہو۔" سمجھایا کہ "یوں بخار کم ہو جائے گا اماں ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں اور ہم کو یہی انھیں نے بتایا ہے۔"

مولوی صاحب پریشان ہو ہو کر اختر کو دیکھ رہے ہیں کبھی گھور کر مجھے دیکھتے جیسے کہنے والے ہوں کہ اس کو کچھ ہو گیا تو تم کو مار ہی ڈالوں گا۔

بیس منٹ بعد تھرمامیٹر نے ایک سو دو بخار بتایا تو دیکھ کر حیران ہو گئے "بھئی واہ یہ تو جادو ہو گیا۔ ہم کو پہلے کیوں نہ بتایا تھا؟" "پہلے میں یہاں تھی کب" "تم کو پہلے ہی یہاں آجانا چاہیے تھا۔" مولوی صاحب سے میں نے جھٹ کہا "اب آپ جا کر لیٹ جائیں۔" مگر نہ مانے کہ "یہ بخار پھر تیز ہوگا۔ کبھی ایسی الٹ پلٹ بولتا ہے کہ تم ڈر جاؤ گی۔" سچ ہی تو کہہ رہے تھے کپڑا برف کا رکھنا بند کر دیا ایک گھنٹے بعد بخار پھر تیز ہوا اور یہ کہے جائیں:

"اندر پاگل باہر پاگل
سب گھر دیوانہ
فقط اختر حسین دانا"

مولوی صاحب کہنے لگے سنا اشارہ نیلی چھتری (۸) والوں کی طرف ہے۔"

بمبئی میں کوئی میٹنگ ہے مولوی صاحب کو خطبہ صدارت پڑھنا ہے لکھ کر مجھے دیا کہ ذرا پڑھ لینا کوئی زبان کی غلطی تو نہیں؟ اختر جل بھن کر کہتے ہیں۔ کیوں ان کا دماغ خراب کرتے ہیں۔ یہ اور آپ کے لکھے میں غلطی پکڑیں؟ "بھئی میں تو یہ کہوں کہ تم بھی اپنا مسوّدہ دکھا لیا کرو فائدہ میں رہو گے کہ یہ جو بولتی ہیں اصل زبان یہی ہے۔" میں نے بھی سوچ لیا کہ اختر کی غلطی پکڑ کر ہی رہوں گی۔ اختر کا مسوّدہ چوری سے پڑھا۔ بھاگی ہوئی مولوی صاحب کے پاس گئی کہ "ذرا سنیں تو سہی وہ جو بڑے زباں داں بنتے ہیں اور مجھ پر ہمیشہ ہنستے ہیں اور مذاق اُڑاتے ہیں۔ دیکھیے ذرا یہاں پر جھومر ناک میں پہنا دیا ہے!!" بڑے خوش ہوئے کہا "کیا رائے ہے؟" "ہم ان کی توجہ اُدھر نہ دلائیں اور یہ یونہی چھپ جائے تاکہ تا مرگ جھومر اس حسینہ کی ناک میں جھومتا رہے۔" "لیکن تم بھی کچھ نہیں کہنا۔" وہ جھومر آج بھی ناک میں جھوم رہا ہے۔ میری اور مولوی صاحب کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی جیسے گُتّیاں، گُتّیاں ہوں۔ اختر کا وہ اتنا لحاظ کرتے نظر آتے کہ میرے دل و دماغ پر ان کا رعب بن سوچے بڑھتا رہا۔ کبھی کبھی میں مولوی صاحب سے کہہ بیٹھتی آخر آپ اختر کی ہر بات کیوں مان جاتے ہیں ہم دونوں کی کچی کر کے وہ ہمیشہ اپنا پلڑا اونچا کر لیتے ہیں۔ ہنس پڑتے اور کہتے "یہ جو اینٹھو خاں ہیں ان کا کوئی بھروسہ نہیں جانے کب اور کدھر کو نکل پڑے نہ جانے کس بات پر روٹھ جائے۔ تم بھی اس بات کا خیال رکھا کرو۔"

کھانے کے بعد تاش پچیسی کا کھیل یوں نہ ہوتا کہ اختر باہر شطرنج کھیلتے یا سبطِ حسن، عزیز احمد اور محی الدّین صاحب یعنی ہم خیال دوستوں کی صحبت میں چلے جاتے مولوی صاحب بڑی خوشی سے اجازت دے دیتے پہلی بار جب جانے لگے مجھے بُرا سا لگا تو ذرا ڈپٹ کر بولے یہ کیا جاہل لڑکیوں کی طرح منہ پھلا لیا شطرنج تو بڑا دماغی کھیل ہے اور ہم خیال لوگوں سے مباحثے دماغی غذا ہے۔" "میری جہالت کا اعلان تو اسٹیشن ہی پر آپ نے بہانگ دہل کر دیا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ ہنس پڑے "لڑکی تم اب تک بھولی نہیں۔" اور جب اختر چلے جاتے تو خود تو برآمدے کے تخت پر لمبے لمبے دراز ہو کر پیچوان کی مہ نال ہونٹوں میں داب کر کش لگاتے اور چھیڑ کر کوئی بات ایسی کہتے کہ میرا تفصیلی بیان جوان کو کوئی کہانی لگتا غور سے سنا کرتے بڑا خوش ہوتے کہ مجھے وقت کا گزرنا معلوم بھی نہ ہوتا۔ اختر واپس آجاتے ایسی ہی کسی شام کو میں نے مولوی صاحب سے کہا "ایک بات پوچھوں سچ سچ جواب دیجیے گا۔" بولے "ضرور پوچھو" "یہ بتائیں کہ کیا آپ نے سچ مچ کبھی شادی نہیں کی اور کیوں نہ کی؟" ذرا دیر توقف کیا سامنے کی طرف دیکھتے رہے، بولے "شادی تو ایک بار ۱۷ سال کی عمر میں ہوئی مگر میں نے نہ کی، کرائی گئی۔ والد صاحب کا حکم ہوا اس کو پورا ضرور کیا رات کو سامنے کے دروازے سے داخل ہوا غسلخانے کے دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا۔ یہاں حیدر آباد آگیا۔ برسوں بعد گھر والوں کو تا پتہ معلوم ہوا۔ یہاں آکر انجمن ترقی اردو ایک ڈبّہ میں بند تھی اس کو گود لے لیا اسی کو پالتا پوستا رہا۔ کبھی اور کسی طرف دھیان ہی نہ گیا۔" منہ سے میرے بے ساختہ نکل گیا کہ "میری بڑی خیر ہوئی کہ ریل چل رہی تھی اختر اتر نہ پائے اگر اُترتا تو ٹانگیں نہ جھاڑ کر رکھ دیتا۔" "تو وہ موتی کی ڈبیہ جو آپ نے مجھے دی، وہ کسی کے لیے تھی نا؟" بس چپ ہو کر جلدی جلدی کچھ کش لے کر دھواں اڑاتے رہے۔ میں دل میں سوچتی رہی وہ کوئی بد نصیب ہو گی جس نے ایسے عظیم انسان کو ہاتھ سے جانے دیا۔ ان کی آنکھوں کی گہرائی اور اداسی برداشت نہیں ہو رہی تھی تو توجہ ہٹانے کو کہا "آپ دونوں تو سیر سپاٹوں کو نکل جاتے ہیں ایسے موقع پر مجھے آئندہ قاضی صاحب کے ہاں چھوڑ جائیں یا سروجنی نائیڈو کے پاس کیسے مزے کی باتیں کرتی ہیں۔" "نا بابا قاضی صاحب کا کتا تم کو کاٹ کھائے گا اور سروجنی تمہارے دماغ میں الابلا بھر دیں گی۔ یہ شاعر لوگ بڑی ایران توران کا ملاتے ہیں۔"

اختر واپس آکر کپڑے بدل کر لیٹے ہی تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے سے ہائے وائے کی زور دار آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ہم دونوں دوڑے ان کے کمرے میں گئے تو غسلخانے کے پاس فرش پر بیٹھے ہوئے "ہڈی ٹوٹ گئی ٹوٹ گئی" کہہ رہے ہیں گر پڑے تھے۔ محبوب کو بلا کر لائے بڑی مشکل سے پلنگ پر لٹایا۔ شیرو کو موٹر پر روانہ کیا، وہ ڈاکٹر لے کر آیا۔ اس نے پاؤں کی انگلیاں ہلا جلا کر، ٹخنہ گھمایا ایک چیخ ان کی نکلی ڈاکٹر نے کہا "[illegible] ٹوٹی ہے۔ ٹخنہ بُری طرح مڑا ہے کوئی پٹھہ مرور کھا گیا ہے۔ تین دن اس پر زور قطعی نہ پڑے الاسٹک بینڈج باندھی۔ درد کی گولیاں دیں کل آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

مولوی صاحب کو گرم گرم چائے پلائی گولی ذرا ٹھہر کر کھائیں گے۔ سر کو ادھر سے اُدھر تکلیف میں کر رہے ہیں۔ ہم دونوں ادھر اُدھر بیٹھے ہیں۔ بولے "پٹی سے بہت کچھ درد میں کمی لگ رہی ہے۔ اب میں تو پرسوں بمبئی جا نہیں سکتا اختر کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ میرا خطبہ صدارت پڑھ دینا۔" "میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا میں ہی فالتو رہ گیا ہوں؟" "یہ بھی تمہاری ٹریننگ کا حصّہ ہو گا تم کو انجمن چلانی جو ہے۔"

اختر بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔ "آخر آپ یہ خیالات اپنے دماغ میں کیوں جمائے رکھتے ہیں بار بار کہہ چکا کہ میں ایک آزاد بندہ ہوں وقت آنے پر یہاں سے چل پڑوں گا۔ میں ابھی تار بمبئی دے کر اس اجلاس کو ملتوی کرواتا ہوں ہاں کل اورنگ آباد جا کر [illegible] کو دیکھ آؤں گا، شمیم صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" مولوی صاحب نے بڑی اداسی اور گہری

نظروں سے اختر کو دیکھ کر سر میری طرف موڑلیا، آنکھوں سے ایسا لگا جیسے کہہ رہے ہوں۔ دیکھا اور سنا تم نے۔ "شیرو پھر بلانے گئے تار لکھ کر دیا کہ ڈاکخانے جا کر دے آئے۔ محبوب سے کہا گیا دروازے کے پاس لیٹ جانے کوئی ضرورت ہوئی تو آواز دے دیں گے۔ محبوب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر درد زیادہ ہو تو آ کر ان کو اٹھا دے تا کہ دوا کی دوسری گولی دیں۔

اختر دوسرے دن اورنگ آباد روانہ ہونے سے پہلے ڈھیر ساری ہدایات دے گئے کہ مولوی صاحب کتنا ہی دفتر تک جانے کی ضد کریں ہرگز نہ جانے دوں۔ محبوب کو ہر دم کمرے کے باہر بیٹھنے کو کہا۔ مولوی صاحب نے اس پر بھی دن میں پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کام کیا دوپہر کو آرام کر کے شام سے اخبار لیٹ کر پڑھتے رہے۔ مجھ سے چائے بنوا کر پی۔ رات کا کھانا سات بجے کھانے اور مہمان آجانے کے بعد محبوب کو کسی بات پر بڑا جھاڑا۔ "دور ہو یہاں سے جاؤ اپنے کواٹر میں۔ مجھے اب خاص تکلیف نہیں۔ کوئی ضرورت دروازے کے پاس سونے کی نہیں۔" جب وہ نہ ٹلا تو ہاتھ میں چھڑی اٹھا کر دھمکایا کہ "مجھے کوئی قیدی سمجھتا ہے؟ وہ ڈر کر تیز قدموں سے برآمدے کے نیچے اترا میں نے لپک کر کہا "اختر صاحب کے دفتر والے کمرے میں لیٹ جاؤ جب سو جائیں تو برآمدے میں بستر گھسیٹ لینا۔ ہرگز کوارٹر میں نہ جانا ورنہ اختر صاحب تمھاری شامت بلا دیں گے۔

کمرے میں جا کر درد کی گولی دی کہ کھالیں۔ "کیوں کھاؤں" یہ کہہ کر تسلے میں پھینک دی۔ "میرے چوٹ کب آئی تھی۔ یک ذرا سی ایکٹنگ کی زندگی میں پہلی بار۔ اور جس لیے کی وہ کام بھی نہ بنا اختر بمبئی نہ گئے۔ بچوں کی ٹریننگ کرنا آسان تو نہیں۔" جلدی جلدی پٹی کھول ڈالی نیچے اُتر کر دونوں پاؤں پر کھڑے ہوگئے۔ پھر کبھی ایک پر کبھی دوسرے پر زور دے کر خوب ہنس رہے ہیں۔ میں حق حیران ہو کر ان کو دیکھ رہی ہوں تو کہنے لگے "کیا سوچ رہی ہو کہ میں پاگل تو نہیں ہو گیا؟"

"مولوی صاحب آپ نے حد کر دی جب کل سب کو پتہ چلے گا تو آپ کی کیا رہ جائے گی۔ اختر پرسوں واپس آئیں گے تو ان سے کیا کہیں گے؟"

"کسی کو معلوم کیسے ہوگا؟ لو میں پھر پٹی باندھے لیتا ہوں۔" بیٹھ کر جلدی جلدی اوندھی بوندھی پٹی لپیٹ لی اس پٹی کو صبح ڈاکٹر صاحب دیکھ کر پوچھیں گے کہ کیوں کھولی؟ آپ کا بھانڈا تو تب ہی پھوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ گھبرا اٹھے۔ "ہاں یہ تو ہے۔ پھر کیا کروں؟"

"کھولیں پٹی مجھے دیں۔" میں نے پوری پٹی پہلے کس کر لپیٹی پھر ان کے پاؤں پر FIGURE OF EIGHT (۸) کے طریقے سے باندھنا شروع کی وہ جھک جھک کر دیکھا کیے۔ "ارے یہ تو تم نے ڈاکٹروں والی پٹی باندھ دی۔ تم کو یہ کیسے اس طرح باندھنا آئی؟"

"اماں نے سکھائی"۔

"ایک تو یہ تمھاری اماں بقراط سقراط سے کم نہیں دوسرے تم خود ان سے دو ہاتھ آگے ہوتی جاتی ہو۔ بھئی دیکھو میں اب سیدھا سیدھا لیٹ جاتا ہوں۔ کل دن بھر بھی مجبوراً لیٹ کر کام نبٹالوں گا مگر تم اختر سے کہنا نہیں۔ عورت پیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہے۔"

"اچھا اب چلیں اپنے کمرے میں یا کہیں تو پڑھ کر سنا دوں۔"

"بس وہی پڑھنا لکھنا۔ تھک جاتا ہوں اس سے۔ تم سیدھی طرح برآمدے سے مونڈھا لا کر، اس پر بیٹھ کر اتنا تو بتاتی جاؤ کہ آخر تمھارے ابا اپنی ایک ٹانگ کدھر پھینک آئے تھے؟"

"توبہ کریں کوئی اپنا ہاتھ پاؤں پھینک کر آیا کرتا ہے؟"
"تو پھر ہوا کیا تھا؟"
"ایسا ہوا کہ جب میں تین دن کی تھی تو ابا شیر کے شکار کے لیے ترائی کے جنگلات میں ہاتھی پر گئے۔ ایسے علاقوں میں جب پوسٹنگ ہوتی تو ہاتھی بھی رکھا کرتے تھے۔ یوں تو شیر کے شکار پر جاتے تو دو چار لوگ اور بھی ہوتے اب کی صرف ان کا فیل وان ہی تھا (بڑی تفصیل سے "ہم سفر" میں اس سچے حیرت انگیز قصے کا ذکر آپ کو ملے گا یہاں اختصار سے کام لینا پڑ رہا ہے) شیر دکھائی دیتا ہے دونوں گولی بندوق میں بھرتے ہیں۔ شیر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے نالہ کے اس طرف ہاتھی سے اتر کر نالہ پھاندتے ہیں کہ کسی پیڑ پر چڑھ کر شیر پر نظر رکھیں۔ ہاتھی وان نے بندوق سے کارتوس نکالا نہ تھا۔ جب وہ نالہ پھلانگتا ہے تو گولی چل جاتی ہے اور ابا کے ٹخنے پر لگ جاتی ہے۔ زمین پر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارا سا چل پڑتا ہے۔ ہاتھی وان گھبرا کر جنگل میں بھاگ جاتا ہے۔ ابا بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جب ہوش آتا ہے تو دیکھتے ہیں ہاتھی اپنی سونڈ میں نامو (فیل وان) کو لپیٹے لا رہا ہے۔ مالک کے پاس لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ ابا نے کہا یہ جانور ہو کر مالک کا وفادار اور تو انسان ہو کر انسان کا مدد نہ کر کے بھاگ جاتا ہے۔ اب یہ ہاتھی تجھے زندہ نہ چھوڑے گا اگر جو میں کہتا ہوں وہ نہ کیا۔ صافہ اپنا پھاڑ اور تین جگہ پر کس کر گرہ لگا۔ پیر کو چوتھے ٹکڑے میں لپیٹ کر مجھے ہاتھی پر ڈال اور اسٹیشن لے جا اور ریلوے پولیس سے کہنا کہ مجھے لکھنؤ لے جائیں۔ اس نے ایسا ہی کیا ریلوے اسٹیشن وہاں سے چالیس میل دور تھا۔ ہاتھی اسٹیشن پر اکیلا رہ گیا اور ہمارے گھر کا رخ کیا۔ رات کو صرف ہاتھی واپس آجاتا ہے۔ ابا کے گھوڑے نے ہنہنانا اور شکاری کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔"
مولوی صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے آنکھیں ڈبڈبا سی رہی تھیں کہنے لگے۔
"یہ جانور تو انسانوں سے ہزار گنا بہتر ہوتے ہیں۔ اپنی کلی بے زبانی کے ساتھ کس طور سے اپنے مالک کے لیے پریشانی کا اظہار کرنے لگے پھر کیا ہوا؟"
باقی کل پر اٹھا رکھتی ہوں اب تو دس بجنے والے ہیں اچھا خدا حافظ۔
"تو باقی نہیں سناؤ گی میں اختر سے کہوں گا جب پشاور جائیں تو بازار قصہ خوانی میں تم کو بیٹھا کر آواز لگائیں کہ آج ایک خاتون قصہ خواں آئی ہیں آؤ لوگو قصہ سنو۔"
میں واقعی ڈر گئی کہ ان دونوں سے کوئی بعید بھی نہیں کہ ایسا ہی کر ڈالیں پھر بیٹھ کر باقی قصہ سنا دیا کہ کیا حالت ہوئی ابا کی ایک وقت اسپتال کے ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ وہ ختم ہو گئے۔ سفید چادر اڑھا دی گئی۔ کوئی قبر کی زمین کے لیے چلا گیا۔ کوئی کفن کے لیے کوئی میری خالہ کے گھر کہ آ کر لاش کو لے جائیں اتنے میں ابا کے سرجن دوست حمید دیکھنے آتے ہیں لاش سے لپٹ کر سینہ پر سر رکھ کر رونے لگتے ہیں ان کو ہلکی سی دل چلنے کی آواز آتی ہے۔ اماں کو کمرے سے باہر کر کے غسلخانے سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو کر ہتھوڑا سا اور آری جیسی شے لیے بھاگ کر آئے کھانا کھانے کی میز کا پٹرا ان کے نیچے رکھ، بالکل جیسے پیڑ کاٹا جاتا ہے کاٹ دیتے ہیں نبض پکڑ کر سینہ پر کان لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کچھ دیر میں دل اور پلس چلتی ہوئی پاتے ہیں۔ دس منٹ بعد پورا یقین ہو جاتا ہے کہ ابا زندہ ہو چکے ہیں۔ اسپتال کے ڈاکٹروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ باقی کام وہ کر لیں۔ ابا ٹھیک ہونے لگتے ہیں۔ دوست سے اصرار ہے کہ وہ فیس نہ لیں گے تو کچھ فرمائش ہی کریں۔ سرجن حمید ابا سے ان کا عربی گھوڑا شاید یہ سوچ کر مانگ لیتے ہیں کہ اب ظفر عمر تو کبھی گھوڑے پر بیٹھ نہ سکیں گے چنانچہ گھوڑا لکھنؤ کے اسپتال سائیس اور رو کے آدمی کے ساتھ لایا گیا۔ ابا کا

پلنگ کمرے سے پانچ سیڑھیاں اُتار کر کمپونڈ میں رکھ دیا گیا دور سرجن حمید اور دوسرے لوگ کھڑے ہیں۔ گھوڑا پلنگ کے پاس آگیا تو اشارہ سے سائیس اور زو کے آدمی کو بتا دیا۔ گھوڑے کی حالت یہ ہے کہ آنکھوں کے نیچے کا گوشت آنسو سے گل گیا ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہے پلنگ کے چاروں طرف پھرتا ہے پھر اپنی گردن نیچے کر کے سر ابا کے سینہ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ اس کے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرتے جاتے اور آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ چار قدم چل کر اب ان کے پاؤں کی طرف آکر پاؤں پر سر رکھتا ہے۔ پھر اکر سر ہٹا کر دیکھتا ہے گو چادر پاؤں پڑی ہوئی تھی۔ پھر سرہانے آتا ہے ابا نے چادر اپنے پاؤں پر کھینچ کر اس سے کچھ جیسے کہا ہو۔ ادھر دیکھ کر ان کے سینہ پر اپنا سر رگڑ رہا ہے وہ پیار سے گردن پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ سرجن حمید کو آواز دے کر بلاتے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ کر ہاتھ پھیرتے رہے۔ گھوڑا بغور کبھی ان کو کبھی ابا کو دیکھ رہا ہے۔ انھوں نے پاؤں کی طرف اشارہ پھر کیا یعنی اب میں تم پر بیٹھ نہ سکوں گا۔ ڈاکٹر حمید سے کہا اب آپ اس کی گردن پر ہاتھ پھیر سکتے ہیں۔ وہ سر جھکا لیتا ہے۔ سائیس سے کہتے ہیں زین کس دو۔ وہ کسوا لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب آپ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر اسے لے جائیں۔ بے چوں وچرا وہ ان کو بیٹھنے دیتا ہے۔ مڑ مڑ کر جاتے ہوئے ابا کی طرف دیکھتا ہے۔ میں تو خیر یہ سب سنا کر رو پڑی تھی مولوی صاحب کے آنسو بھی آنکھوں میں تیر رہے تھے ہمارے مولوی صاحب صرف انسان دوست نہ تھے بلکہ جانوروں کے بھی دوست تھے۔ اتنا یہ سب سن کر بولے۔

"کاش اس دنیا میں انسان کم ہو جائیں یہ جانور بڑھ جائیں۔ جاؤ بیٹی اب سو جاؤ۔" اور وہ خود پلنگ پر بیٹھے کسی اور ہی دنیا میں جیسے پہنچ گئے۔ جاتے وقت محبوب سے کہا اپنا بستر ذرا برآمدے کی طرف کر لو میں نے گولی درد کی دے دی ہے۔

تیسرے دن اختر آگئے اور مولوی صاحب بستر سے کھڑے ہو گئے تھوڑا لنگڑا کر چلنے لگے جب میری اور ان کی نظریں چار ہوتیں تو ان کی اس بچکانہ حرکت پر ہنسی سی آنے لگتی۔ ایک بار بناوٹی گرج دار آواز میں بولے۔ "لڑکی مجھ پر ہنس رہی ہو تھوڑا سا لنگ کھاتا جو چل رہا ہوں اور تمھارے ابا؟"

اختر بول پڑے "آپ کیسی بات کہہ گئے۔ کسی کی دل شکنی کر کے مزا کیوں لیتے ہیں؟"

کیسے مزوں سے یہ سارا وقت گزرا۔ ان نئے قسم کے لوگوں میں اور اُن کی حرکات میں۔ ایسا مگن رہتی کہ گھر خط لکھنے کا ہوش ہی نہ آتا۔ اپریل میں ابا کا خط آتا ہے مولوی صاحب کے پاس کہ میری سب سے بڑی بہن منور بیگم جو ہماری آپا تھیں صرف ۲۷ سال کی عمر، دو سال ٹی بی میں مبتلا رہ کر فوت ہو گئیں۔ اُن کی والدہ ہفتہ بھر میں واپس علی گڑھ جا رہی ہیں۔ حمیدہ کو وہاں بھیج دیجیے۔ مجھے صرف اتنا بتایا کہ تمھاری آپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ سب علی گڑھ جا رہے ہیں۔ اگلے ہفتہ مجھے دہلی جانا ہے۔ تم اگر چلنا چاہو تو پہلے تم کو سیدھا علی گڑھ پہنچا کر دہلی لوٹ آؤں گا۔" بے حد خوش ہوئی کہنے لگے "تم شاید اب تک بازار نہیں گئیں نہ کچھ خریدا۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں یہاں ملتی ہیں۔" کیسے بازار جاتی روپیے ہمیشہ کم پڑ جاتے تھے۔ مجھے تو ہر بار لفافے سے قرض لینا پڑتا تھا۔ پہلی پر لفافے کا قرضہ واپس کرنا ہوتا تھا۔ "کیوں اختر تم کو کچھ روپے نہیں دیتے؟" "دیتے ہیں۔ وہ بھی گھر میں جب خرچ کر دیتی ہوں تو لفافے سے قرض لیتی ہوں۔" مولوی صاحب کی آنکھیں حیرت سے اور بڑی ہو گئیں۔ بھویں سکڑ گئیں بولے "تو یہ قرض ہے اور لینے اور دینے کا طریقہ آج ہی سنا ایسا کیوں کیا؟" "اماں نے جو کہا تھا۔ گھر چلانے کو جب رقم دی جائے تو ایسا کرنا بس اس چکر میں پھنسی رہی۔" "پھر تم نے جب ہی مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں خود لفافوں میں پہلے ہی رکھ دیتا۔ اچھا اب ضرور بازار ہو آؤ گھر والوں کے لیے یہاں کے تحفے بھی خرید لینا۔"

کبھی باتوں باتوں میں مولوی صاحب مجھ سے پوچھ چکے تھے کہ تمھارے ہاں عید اور "بکر عید" کیسے منائی جاتی ہے؟ میں نے بتا دیا تھا۔ بولے "پرسوں "بکرا عید" ہے ہم بھی منائیں گے۔ تو کیا سچ قربانی کروائیں گے۔" کسی بے گناہ کی ہم جان تو لینے سے رہے بھئی یہ رسم میری سمجھ میں کبھی نہ آئی، یہ تو حج کے ارکان میں ہے۔ حج پر جو نہ جائے تو صرف بکرا کاٹنا کیوں؟ پہلے سب اور ارکان تو ادا کرے۔ میں سوچنے لگی کہ یہ دونوں کس طور بکرا عید منائیں گے؟ چھ بجے اُٹھ جانا ہے چائے پی کر اختر اور وہ نماز پڑھنے جائیں گے!! سنا تھا کہ یہاں عیدین کے موقع پر تخت پر رات ہی کو کنارے کنارے سب کے کپڑے رکھے جاتے ہیں فرش پر جوڑے کے سامنے سب کے جوتے چپلیں۔ صبح آئی تو دیکھا۔ برآمدے میں بس بالکل ویسے ہی میری ساری بلاؤز، اختر اور مولوی صاحب کا کرتا پاجامہ نیچے دونوں کے جوتے اور میری چپلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب نے مسز نائیڈو کو فون کر کے کہہ دیا تھا۔ ان کے درزی نے میرے بلاؤز پہلے بھی سیے تھے۔ مولوی صاحب کے پیار کے ساتھ میری چھوٹی چھوٹی ضرورت کا اس طرح خیال رکھنے پر خوشی کے آنسو آنکھوں میں آ گئے۔ کہا ہم دونوں پیدل جا رہے ہیں قریب ہی تو وہ جگہ ہے۔

اس کے تیسرے دن مولوی صاحب مجھے لے کر روانہ ہوئے علی گڑھ کے لیے۔ راستے بھر طرح طرح کی کہانیوں کی طرح کے میرے بہن بھائیوں کے قصے سنا کیے۔ پھر بولے "بھئی یہ جو تمھارے زاہد بھائی سب سے دلچسپ ہیں انھیں سے ہماری ملاقات نہ ہوئی۔ کب لندن سے واپس آئیں گے؟" کبھی اختر کے متعلق باتیں کرنے لگتے۔ تعریفوں کے پل باندھتے "بھئی زندگی بھر میں نے مختلف قسم کے کاموں کو ایسی سرعت سے کسی کو کرتے نہیں دیکھا کبھی مجھے شبہ سا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی جنات تو چھپا ہوا نہیں۔ کس سرعت سے اس کا دماغ مشکل سے مشکل نکتے کا صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ پھر ٹس سے مس ہرگز نہیں ہوتا۔ دوسروں کو اپنی صحیح اور کھری بات ماننے پر جھکا لے گا اور خود کبھی نہیں جھکتا۔ تم کبھی اس سے حجت نہ کرنا پھر تو اکڑ اور تن کر لوہا لاٹ ہو جاتے ہیں۔ سچی اور کھری بات فوراً مان لیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ" میں نے آتے آتے ایک ٹوکرا شریفوں کا ان سے خفیہ ریل کے ڈبے میں رکھوا لیا تھا۔ بھوپال کا اسٹیشن آیا۔ لوگ ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب سے کہا آپ کے گھر کے لیے ایک ٹوکرا شریفے لایا ہوں۔ ان کو قلی بلا کر اتروا لیں میں حق دق ان کا منہ دیکھتی رہ گئی کیسے ان صاحب سے کہتی کہ یہ تو میرے ہیں۔ ریل جب چل پڑی تو ان سے کہا "آپ کو کیا حق تھا کہ دوسرے کی چیز کسی کو تھما دیں؟ اور آپ کو معلوم کیسے ہوا؟" "اس کی بو سے۔ اسی لیے ٹوکرا دے دیا کہ علی گڑھ جا کر تم سب سے زیادہ کھاتیں اور پھر یوں ہو جاتیں (اپنا منہ خوب ٹیڑھا کر لیا۔)

مولوی صاحب چند گھنٹے "نیلی چھتری" میں رک کے میری والدہ سے بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ "مجھے امید ہے حمیدہ نے آپ کو کوئی شکایت کا موقع نہ دیا ہوگا۔؟" ہنس کر بولے "شکایت کے موقع تو ہم دونوں نے اس کو بہت دیے، مگر کبھی اس نے نہ برا مانا اور نہ دل پر لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات سے ہمارے گھر میں تازہ ہوا کے جھونکے سے آ گئے ہیں۔ آپ نے بہت اعلیٰ تربیت بیٹی کو دی!!"

ان کے جانے کے بعد جب والدہ نے خوش ہو کر بتایا تو میں خوشی سے بانسوں چڑھ گئی۔

دس ہی دن بعد مولوی صاحب نے اختر سے کہا، "بھئی گھر تو بھائیں بھائیں کرنے لگا بہت ہو لیا۔ تم چند دن علی گڑھ رک کر حمیدہ کو لے کر آ جاؤ جب واپس پہنچی تو فرما دیا کہ اب ایک سال سے پہلے نہیں جاؤ گی۔

اختر بڑی اسپیڈ سے اپنے ذمے لیے کام کو کرتے رہے۔ دفتر کے اوقات میں سوائے دو بار کے کبھی اندر نہ آئے مولوی

صاحب بے شک ہر روز چند بار اندر آکر ضرور پوچھ جاتے۔ میرا ہر دن خوشیوں سے بھرا گزر رہا تھا۔ اختر کی ایک چڑ بنا رکھی تھی!

یہ جو پنچو ہے کھڑا!!!

اس کو مار دوں تڑا!!!

تو رہ جائے پڑا!!!

اس کے توڑ پر اختر نے کچھ ایسی ہی بے معنی سی چڑ ان کے لیے بنائی تھی۔ اس وقت یاد نہیں آرہی شاید آگے جا کر یاد آجائے۔ جس دن بھی خود کچھ پکا دیا بے حد خوش ہو کر کھایا اور دوسرے دن چپکے سے بڑے پیار سے ننھا منا تحفہ ضرور دیا۔ ان تحفوں کی نوعیت ایک پیڈ، کچھ لفافے، چند پنسلیں!! کبھی فاؤنٹن پن، کبھی کوئی کتاب۔

وقت گزرتا گیا دسمبر کا مہینہ آگیا مولوی صاحب نے کہا کہ تم دونوں کی شادی کی سالگرہ زوردار مناؤں گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اب یہ غضب نہ کریں۔ کہیں ولیمہ والا حال نہ ہو جائے اس کا۔ کچھ کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں "بات کو بھول جانا چاہیے ورنہ جینا حرام ہو جاتا ہے۔ ادھر تو میرے اختر راتوں کو بھی اکثر دفتر جا بیٹھتے۔ مولوی صاحب مجھ سے کہتے "یہ کام کی جان کو آگیا ہے۔ کیا کچھ پریشانی لاحق ہے اختر کو؟" "یکسوئی میں انسان کام زیادہ کر سکتا ہے پریشانی میں دماغ پراگندہ ہوتا ہے۔ کام نہیں کیا جاتا۔" "میں کہتی۔ سر ہلا کر کہتے ہیں "کوئی بات ضرور ہے۔"

جنوری ۷۳ء کا شروع ہفتہ ہے اختر کئی دن سے چُپ چُپ سے رہتے۔ رات کو تاش یا پچیسی کھیلنے سے صاف انکار۔ میں اور مولوی صاحب کھیلتے ضرور مگر بے دلی سے کہ جب لڑائی بھڑائی نہ ہو رہی ہو تو مزا خاک آتا۔ ایک دن بولے "تم کیسی بیوی ہو کہ میاں کے چہرے مہرے کو دیکھ کر سمجھ نہیں رہیں کہ اس میں یہ ایک عجیب سی خاموشی اور اداسی جو آئی ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہو گی پھر ان سے منہ کھول کر پوچھو نا۔" "بہت بہتر۔"

میں موقع کی تلاش میں رہی ایک دن جب اختر اپنے کاغذات دیکھ کر کچھ پھاڑتے رہے کچھ جیسے ایک طرف رکھ رہے تھے۔ تو ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ یہ سب کیا کر رہے ہیں اور کیوں؟ مولوی صاحب آپ کی طرف سے بڑے پریشان ہیں ان کو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ فکر مند ہیں۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی پریشانی مجھ کو بتائیں؟" اچھل سے پڑے کہ مولوی صاحب کو یہ احساس ہو رہا ہے ہاں حمیدہ میں فکر مند ضرور ہوں کہ اب میرا وہ سارا کام جو مجھے یہاں موجود رہ کر کرنا تھا ختم ہو گیا اب میں دہلی جا کر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں مولوی صاحب کے ساتھ میں اسی وعدہ سے آیا تھا کہ پھر وہ اخبار کا ایک سال کا خرچ اٹھانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ لیکن ان کی شفقت اور محبت تمھارے آجانے کے بعد سے اور بھی بڑھ گئی۔ بے حد مگن رہنے لگے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کیسے کہوں کہ ہم دونوں کو جانے کی اجازت دیں جب کہ اب میں مزید یہاں رک بھی نہیں سکتا۔" میں نے کہا "اگر یہ بات ہے کہ آپ سے کہا نہیں جا رہا تو مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ پہلے میں بات کروں گی ان کو جو ایک دھکا سا لگے گا اور غصہ بھی آئے گا اس کو آپ نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر دو ایک روز بعد آپ بات کر لیجیے گا۔ اطمینان کی سانس لی اور کہا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

چند دن بعد جب اختر اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے گئے۔ مولوی صاحب کھانے کے تخت پر لیٹ کر حقہ پیتے میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ایک دم اخبار رکھ کر بولے۔ "پچیسی لے آؤ نا۔" جی نہیں آج تو نہ کھیلوں گی۔ آپ سے کچھ باتیں ہوں گی۔" "پھر چلو وہی کرو۔"

میں نے جب دھڑکتے ہوئے دل کو کڑا کر کے کہا "مولوی صاحب مجھے ذرا ایک بات بتائیں کہ اگر کوئی کسی سے وعدہ کرے تو

کیااس کو پوراہی کرناچاہیے؟" وہ بولے "میرے خیال میں ہر شریف انسان اپنے وعدہ کی پاسداری ضرور کرتا ہے۔" یہی تو میں اختر سے کہے جارہی ہوں؟ اٹھ کر بیٹھ گئے گھبرا کر پوچھتے ہیں "کیساوعدہ اور اس کی پاسداری؟" "آپ نے جو اختر کو علی گڑھ سے لاتے وقت کیا تھا؟ آپ نے جو اپنے ہاتھ سے لکھے خط ابا کو اور مجھے بھیجے تھے اس میں بھی لکھا ہوا ہے کہ اختر کی آپ صحافت کے سلسلے میں پوری مدد کریں گے۔" الجھ کر بولے "آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"پہلے تو خود آپ نے کہا کہ اختر کھویا سا پریشان سا کیوں ہے ان سے پوچھو۔ وہ میں نے پوچھ لیا۔ ان کی پریشانی یہ ہے کہ آپ سے کیسے اور کیوں کر کہیں کہ اب وہ دہلی جا کر اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو یہ خیال بے حد بے چین رکھ رہا ہے کہ آپ کو رنج ہوگا ہم دونوں کے جانے سے۔ دہلی جانے کی خوشی سے اجازت نہ دیں گے شاید اپنے وعدہ سے غصہ کے مارے منکر ہی ہو جائیں۔"

ماتھے پر بل ڈالے بھویں سکیڑے کچھ دیر خاموش رہ کر اور سر کو ادھر سے اُدھر ہلا کر بولے "اس کا تو ابھی سوال ہی نہیں آسکتا۔ میں تو خود انجمن کو دہلی منتقل کرنے کے مراحل میں ہوں۔ ساری کارروائیاں ہو جائیں پھر دہلی تینوں ساتھ ساتھ چلیں گے، تب وہ اپنا اخبار شوق سے نکالیں میری ہر مدد ہر طرح سے حاضر اور موجود رہے گی۔"

میرا ان سے یہ کہنا تھا "نہیں مولوی صاحب آپ ان کو اب جانے کی خوشی خوشی اجازت دے دیجیے۔ سال سوا سال میں آپ انجمن کو لے کر دہلی آجائیں گے تب تک اخبار جم جائے گا اور ہم پھر آپ کے پاس ہوں گے۔" مولوی صاحب جھلا کو بولے "اور اتنے عرصہ میں یہاں اکیلا جھک مارتا رہوں؟ اختر اگر ناسمجھی کی سوچ رہے ہیں تم تو اپنے ہوش سے کام لو۔ خیر میں تو کسی گنتی ہی میں نہیں مگر یہ راجہ رانی، لاما، نازی اور چڑیوں نے کیا قصور کیا ہے؟" یعنی اتنے صدمے کی کیفیت میں بھی مولوی صاحب کو ان بے زبان جانوروں کے احساسات مدِ نظر تھے۔ "آپ کے ہوتے ہوئے وہ ہماری کمی محسوس نہیں کریں گے۔" سر کے درد کا بہانہ کر کے اٹھنے لگے میں نے کہا میں تیل لا کر لگاتی ہوں۔ بڑا برا سامنہ بنا کر کڑواہٹ سے کہا "جی مجھے تیل نہیں لگوانا۔" حالانکہ جب کبھی سر میں درد محسوس کرتے اور میں ان کے سر میں تیل لگاتی تو ان کو بہت اچھا لگتا۔ کبھی کہتے کہ تم تو تیل مالش بھی کر کے کما کھا سکتی ہو مگر افسوس کہ لڑکیاں تیل مالش کے پیشہ میں نہیں۔" اختر بھی جھٹ سے نیچے بیٹھ کر ان کی یاری کے حقدار بن جاتے۔ "یوں درد کو دور کر دینا آپ کو کیسے آیا؟ کہہ دیں گی کہ اماں نے سکھایا!!"

مولوی صاحب اٹھ کر کمرے میں چلے گئے اختر آئے ان کو اپنی بات چیت جو مولوی صاحب سے کی تھی بتادی۔ کہتے ہیں یہ بہت اچھا کیا آپ نے اب میں کل ان سے بات کرلوں گا۔ دوسرے دن رات کے کھانے کے بعد بات چھیڑی۔ خاموش چپ چاپ سنتے رہے پھر یہ کہہ کر اپنے کمرے میں اٹھ کر چلے گئے "مناسب تو یہ تھا کہ ساتھ ہی دہلی چلتے ہزاروں بکھیڑوں سے میں تنہا کیسے نمٹوں گا؟" اور اختر یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا "تو یہ کیوں نہیں صاف صاف کہتے کہ آپ اپنے وعدہ سے پھر گئے۔ مگر میں پھر بھی دہلی جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح اخبار ضرور نکالوں گا۔" میں برآمدے میں بہت دیر بیٹھی سوچا کی کہ اس مسئلہ کو کس طور نبٹوں؟

تیسرے دن اختر نے اعلان کر دیا کہ وہ دو روز کو اورنگ آباد شمیم صاحب سے ملنے جارہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اتنا کہا کہ "شمیم کو اتنا سمجھاتے آنا کہ وہ عملے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی گرفت نہ کیا کریں۔ تھوڑا بہت چیزوں اور پیسہ کے نقصان پر اتنی سختی اور گرفت کرنا چھوڑ دیں وہ سب لوگ برسہا برس سے جس روش پر چلنے کے عادی ہیں وہ اب کیوں کر بدل دیں گے؟ ان کی اپنی ایمانداری کام میں خلل پیدا کرتی ہے سب لوگ ان سے نشاکی ہو کر جان بوجھ کر رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔" اختر کا جواب یہ تھا کہ

میں نے پہلے ہی آپ کو ان کے مزاج سے آگاہ کر دیا تھا تو آپ کا کہنا تھا کہ پریس کے حالات اور اخراجات بہت زیادہ ہوئے جاتے ہیں مجھے اب ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ اتنی ضد کر کے آپ نے ان کو بلوایا اب آپ جانیں اور وہ جانیں۔ میرے کہے سے شمیم صاحب بدل نہیں سکتے۔"

اختر چلے گئے مولوی صاحب کی اداسی سے میرا دل کٹا جاتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بلا کر، پاس بٹھا کر مجھ سے یوں باتیں کیں۔

"حمیدہ اس ضدی، ہٹی اور سر پھرے کو بس ایک ہی ترکیب سے یہاں رکنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ تم دہلی جانے سے انکار کر دو۔" میرا ظاہر ہے جواب یہی ہو سکتا تھا کہ "میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں جہاں بھی وہ جائیں گے اور جو بھی وہ کریں مجھے تو ان کا ساتھ دینا ہی ہے۔"

"میں تم کو جانے کی اجازت یوں نہیں دے سکتا کہ ظفر عمر سے تمھارا ہاتھ مانگا تو اختر کی شادی انھوں نے تم سے کر دی۔ میرے اوپر تمھاری ہر طرح کی ذمہ داری ہے۔ تم کو کیا خبر کہ اختر نے اخبار اگر نکالا تو اس کا اور خود ان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ اپنے اخبار میں انگریزوں کے خلاف اتنا کچھ لکھے گا کہ جیل پہنچ جائے گا۔ اخبار بند ہو جائے گا اور تم کو پریشانیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔"

مولوی صاحب کی باتوں کا میں نے یہ جواب دیا "میں ہر حال میں ان کا ساتھ دوں گی اگر جیل چلے گئے تو فخر سے سر اونچا ہوگا۔ اخبار کو میں خود چلاؤں گی۔" "تو تم کو اپنے متعلق اتنی غلط فہمی ہے کہ اخبار چلاتی رہیں گی۔ تم نے زندگی میں کوئی تکلیف اٹھائی نہیں۔ پیسوں کا نہ ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔ اختر کا آگے پیچھے کوئی ہے جس پر سہارا لے سکو؟"

"خدا آپ کے دم کو سلامت رکھے کہ ان کے سر پر ایک مشفق باپ کا سایہ ہے۔ آپ کو اپنے لائق اور قابل بیٹے کی راہ کا ہر روڑا پتھر ہٹانا ہی زیب دے سکتا ہے۔" مولوی صاحب بولے "اچھا یہ بات ہے۔ ہاں غلطی میری تھی جو سمجھ بیٹھا تھا کہ تم دونوں زندگی بھر میرے پاس رہو گے۔ جاؤ اپنے کمرے میں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میں بڑی اداس اپنے کمرے میں آگئی۔ اختر واپس آئے تو مولوی صاحب نے دریا گنج کے کسی پریس کے نام ایک خط ان کے ہاتھ میں پکڑا کر کہا "اب خوش۔"

اختر خط پڑھ کر مسکرانے لگے بس یہ کہا "شکریہ اب میں دہلی کے لیے آج سیٹیں بک کرائے لیتا ہوں ذرا ہم گھر جمالیں تو آپ جلد ہی ہمارے پاس آئیں۔" مولوی صاحب نے جل بھن کر کہا "جیسا حکم سرکار کا۔"

ہمارا مختصر سا سامان بندھ گیا شاموں کو اختر اپنے دوستوں کو خدا حافظ کرنے نکل جاتے دن میں مجھے موٹر پر مولوی صاحب نے قاضی عبدالغفار، بابا سروجنی نائیڈو اور منظور یار جنگ کے ہاں بھیج دیا شام کو گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ صبح مولوی صاحب نے شاید خود اکیلے چائے پی لی ہو۔ سارے دن کمرے میں رہے اندر سے دروازہ کھولیں ہاں ناں کچھ نہیں کہتے پھر ایک گرجدار آواز میں بولے "جاؤ۔ جاؤ نا مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو، دیکھو نازی کو اگر ساتھ نہ لے کر گئیں تو اچھا نہ ہوگا۔" میں ڈر گئی کہ جیسا وہ تین چار دن سے بار بار کہے جاتے تھے کہ نازی کو ہمیں دہلی لے جانا ہی ہے۔ میں جی اچھا کہہ تو دیتی مگر ایک بار یہ خیال نہ آیا کہ ہم اس کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ مگر اس وقت جس انداز سے انھوں نے فرمایا جس نے مجھے بے بس کر دیا کہ یہ گویا ان کا حکم ہے، جس کی سرتابی کی گنجائش نہیں۔ اختر مجھ سے بار بار آ کر کہیں کہ "آپ نہ کہیں ان سے دروازہ کھولنے کو۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں کہ وہ غصہ میں ہیں ساتھ ہی غمگین، ہر گز وہ باہر نہ آئیں گے نہ آنے دیں گے۔" اختر کے چہرے پر کچھ کم اداسی نہ تھی۔ "اس بدبخت نازی کو ہمارے سر منڈ کر کبھی کبھی خوب خوش ہوا کریں گے کہ یہ ہم کو خوب تنگ کر رہا ہوگا۔ اور اپنے لیے اس کی موجودگی یوں نہ

برداشت کر سکیں گے کہ بہت سی یادیں ان کو ہر روز ہی آجایا کریں گی۔ لاما تو اب بلیوں کا عاشق زار ہو ہی چکا ہے بیشتر ان کے فراق میں باہر رہتا ہے اور دیکھ لینا راجہ، رانی کو نہیں بھیج دیں گے۔" یہ ظلم تو وہ ہرگز نہ کریں گے۔" اچھا شرط لگالیں، اور ہاں وہ چڑیاں، پنجرے کو کھول کر یہ سب اُڑا دیں گے۔"

شام آگئی سامان پہلے موٹر میں دو بار اسٹیشن چلا گیا تھا۔ اب ہم کو بھی روانہ ہونا ہے۔ ہم دونوں دروازے کے پاس گئے مجھ سے تو کچھ کہا بھی نہ گیا کہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اختر نے ذرا کانپتی سی آواز سے کہا "مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا۔" جلدی سے دہلی کا رخ پکڑیے گا اور اپنے بچوں کے پاس ٹھہریے گا۔ خدا حافظ۔"

اس گھر میں کیسی خوشی خوشی میں داخل ہوئی تھی اور آج کتنے بھاری دل سے روتی ہوئی یوں جا رہی ہوں جیسے بیٹی بیاہ ہو کر سسرال سدھارتی ہے!

دو سیٹر کوپے میں نازی نے وہ اچھل کود مچائی کہ توبہ بلوا دی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھ چار کرنے کی ہمت نہ کر پاتے۔ سارا راستہ جیسے تیسے کاٹا کبھی اختر کہہ اٹھتے کہ "اب مولوی صاحب یہ کر رہے ہوں گے وہ کر رہے ہوں گے۔" رات کو میں نے کہا کہ "اداس سے لیٹے پڑھ رہے ہوں گے کہ ان کے کھیل کود کے دن گئے۔"

دہلی آگئے شاہد احمد صاحب ("ساقی" والے) نے دریا گنج میں ایک فلیٹ لے کر کچھ موٹا جھوٹا ضرورت بھر کا کرایہ کا فرنیچر رکھوا دیا تھا۔ چند دن میں ہم جم گئے۔ آتے ہی تار اماں کو دے دیا کہ ایک باورچی اور گھر کا سامان روانہ کر دیں۔ تیسرے دن ایک ٹھگنے سی ڈاڑھی والے باورچی (ابراہیم کے ابا) بستر ے برتن وغیرہ کے ساتھ آگئے۔ اختر نے اخبار کے ڈکلریشن کے لیے درخواست حکومت ہند کو بھیج کر پہلے مولوی صاحب کو خط لکھا "ایک ماہ کے اندر اندر وہ آئیں۔ گھر چھوٹا سا مگر دل بڑا سا ہے۔ نازی کو ساتھ کر کے آپ نے ہم سے پورا پورا بدلہ لے لیا۔ کہاں آپ کی کوٹھی اور کمپاؤنڈ اور کہاں یہ بند فلیٹ اور پھر آپ کی غیر موجودگی سر اٹھا اٹھا کر غم زدہ نگاہوں سے مجھ سے جانے کیا کیا پوچھتا ہے، آپ کے آنے تک رسالہ کا ڈمی چربہ تیار کر لوں گا تا کہ آپ دیکھ کر اپنی رائے دے سکیں۔"

جب مولوی صاحب کا خط آیا تو اس میں کوئی گلا یا شکوہ نہ تھا۔ یہ ضرور لکھا کہ لاما "میاؤں۔ میں آؤں؟" راتوں کو کرتا رہتا ہے! دو تین دن میں دھڑا دھڑ اختر نے مضامین کی فرمائش کے لیے خط لکھ ڈالے اور قلم اور رجسٹر لکھنے بیٹھ گئے۔

ایک ماہ بعد جب مولوی صاحب دہلی تشریف لائے تو ہمارے پاس ٹھہرے تیس پرچوں کی پوری شکل نکل آئی تھی۔ نازی تو ان کو دیکھ کر بس دیوانہ سا ہو گیا۔ ان کی ٹانگوں میں لپٹ رہا ہے کبھی گود میں چڑھا جاتا ہے۔ کبھی منہ چاٹے لیتا ہے کہ وہ جز بز ہو کر ہٹاتے جاتے ہیں "جہاں نما" کے مضامین جو اختر نے خود لکھے یا تراجم کیے اور کتنے ہی بڑے لوگوں: پنڈت سندر لال کا مضمون پریم چند کا تازہ افسانہ، ٹیگور اور اقبال، مجاز وغیرہ کی نظمیں مگر ہائے "نازی" وائے "نازی" ایک بارگی مولوی صاحب نے جھنجھلا کر پکارا "کڑک مرغی۔ کڑک مرغی" ادھر آؤ" بڈھن خانسامہ دوڑا ہوا سامنے آکر کھڑا کہہ رہا ہے۔ "جی سرکار" ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے کہ پہلی بار ان کے حلیہ کو جیسے دیکھا ہو۔ چھوٹا سا قد، چگی ڈاڑھی، پھولا اور ڈھیلا جسم۔ درحقیقت کڑک مرغی کا خطاب ان پر پورا اتر رہا تھا ذرا ڈپٹ کر فرمایا "فوراً "نازی" کو یہاں سے لے جاؤ کہیں جا کر چھوڑ آؤ۔" وہ کالر پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جب شام کی چائے کے وقت نازی کو بسکٹ دینے کو آواز لگائی تو وہ نہ آیا پھر آواز دے کر "کڑک مرغی" بلوائے گئے کہ بھئی اب اس غریب کو کھول دو تو وہ کہتے ہیں "سرکار آپ نے حکم دیا تھا کہ کہیں چھوڑ آؤ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اس

کو چھوڑ آیا" جانے ابھی آدھی ہی پی تھی گھبرا کر کھڑے ہوئے، چلو اختر جلدی چلو "نازی" کو ڈھونڈ کر لائیں۔ شیروانی پہن جلدی جلدی دونوں نیچے اتر گئے رات کو آٹھ بجے خالی ہاتھ بڑے اداس واپس آئے۔ اختر کا بیان تھا کہ "مجھے تو کون شکل سے پہچانتا مگر ان کے جانے اور پہچانے بیسیوں لوگ رستے بھر ملا کیے، بڑے ادب سے مولانا کہتے ہوئے آگے بڑھتے اور یہ "نازی" "نازی" پکارتے بن جواب دیے تیز تیز کبھی ادھر کبھی ادھر کو مڑ جاتے شاید کل اخباروں میں یہ خبر چھپ جائے گی۔!!"

دوسرے دن پریس پر گئے جو سب سے اچھا کاغذ ہو سکتا تھا اس کو پسند کر کے ہدایت کی کہ رسالہ میں یہ استعمال ہوگا۔ واپسی پر اختر سے فرمائش کی کہ فلاں دکان سے حقہ کا تمبا کو لا دو بس وہ ادھر کو گئے خود فلیٹ میں آ گئے مجھے پاس بلا کر بٹھا کر بڑی شفقت سے کہا "دیکھو جب کبھی کوئی ضرورت ہو تو مجھے لکھ دیا کرنا تم کو خبر ہے کہ پنجروں کے دروازے کھلے رہ گئے اور سب چڑیاں اڑ گئیں راجہ اور رانی کی نگاہوں میں بڑی اداسی نظر آتی تم تو روزان کو اپنے ہاتھ سے تازی تازی گھاس لے جا کر دیا کرتی تھیں نا تو وہ تم کو بہت یاد کرتے تھے۔ میں نے زو کو دے دیے میں روز سیر کے لیے باغ عامہ جب جاتا ہوں تو ان سے ضرور ملتا ہوں۔ دونوں مزوں میں ہیں اور وہ تمھاری سروجنی نے ٹھیک ہی تم کو بتایا تھا کہ پودوں میں جان ہوتی ہے وہ پیار کے ہاتھوں کو محسوس کرتے ہیں۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا تو میں نے کہا تھا نا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مگر وہ بات سچ ہی تھی۔ تمھاری کیاریوں کے پودے سب ہی سوکھ سا کھ گئے ان کو تم یاد آتی ہو گی۔ جیب میں سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر مجھے دیا یہ تم رکھ لو۔" "اس میں ہے کیا؟" "کچھ روپے ہیں تمھاری شادی سے پہلے جو تمھارے کمرے اور ڈریسنگ روم کے لیے فرنیچر خریدا تھا اور وہ بڑا قالین۔ اسی دکاندار کو بلا کر اس کو واپس دے دیا۔ جو بھی اس نے روپیے دیے وہ اس لفافے میں ہیں۔" میں ذرا گھبرا کر پیچھے کو سرک کر ہو بیٹھی اور کہا "میں ہرگز ان کو نہ لوں گی۔ اختر کس قدر ناراض ہوں گے مجھ پر" "وہ کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے وہ تو میرا تحفہ تھا تمھارے لیے۔ اس کے واپس کر دینے پر یہ روپے بھی تمھارے ہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہا "آپ ضد نہ کریں میں یہ لے نہیں سکتی۔" ہنس کر بولے "تو تم نہ لو "لفافہ برائے قرض" "لفافہ برائے اشد ضرورت کے لیے ان کو دے دو اس طرح تم نے تو نہ لیے لفافوں نے لیے!!" ان کے اس پیار سے حکم دینے کو ٹال نہ سکی پھر کہا "حمیدہ مجھے بڑا ڈر سا لگ رہا ہے کہ اگر اخبار کے لیے سرکار نے اجازت نہ دی تو اختر پر کیا گزرے گی اور خدا بہتر جانے وہ منہ اٹھا کر کدھر کا رخ کرے۔ اگر کلکتہ چلے گئے تو مسلمان اور اردو زبان ایک بہت بڑے عالم کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھی گی۔" میرا یہ جواب تھا کہ "ہمیشہ روشن پہلو کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ تاریکی سے دامن بچا کر گزر جانا چاہیے۔" خوش ہو کر بولے "شاباش بیٹی یہ ہوئی ہمت والوں کی سی بات!!"

اختر آ گئے تو پوچھتے ہیں "کیا رازداری کی باتیں دونوں کر رہے تھے؟"

"ہم میاں پنچو مل کو کیوں بتائیں۔" ہم دونوں خوش ہو گئے کہ اب ان کے دل پر ہمارے آنے کا ملال نہیں رہا اور ہمارے اپنے دلوں پر سے جیسے کوئی پتھر ہٹا دیا گیا ہو.... رات کی گاڑی سے وہ واپس حیدرآباد چلے گئے۔

ایک خط میں پریشانی کا اظہار ہے کہ اب تک "ڈکلریشن کیوں نہیں ملا آخر وہ حیدرآباد سے کس قسم کی معلومات کرنا چاہتے ہیں؟"

اختر اس بیچ میں برابر انجمن کا کام بھی کر کے بھیجتے رہے جب تین ماہ بعد پتہ چلتا ہے کہ اجازت نہیں ملی، تو مولوی صاحب بہت فکر مند ہو کر لکھتے ہیں جلد دہلی آنے کی کوشش کریں گے پھر ——— مستقبل کے متعلق بات کریں گے۔ اختر بڑے ہی چپ اور اداس رہتے مجھ سے کہا جن جن کے مضامین وغیرہ آئے تھے آپ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔"

جون ۱۹۳۷ء میں فلیٹ چھوڑ کر سامان "نیلی چھتری" میں رکھ ہم دونوں کوٹ گڑھ (یہ جگہ شملہ سے ۸۰ میل پر ہے اس وقت کوئی سڑک نہ تھی پگڈنڈی پر پیدل یا ٹٹو پر ہی جاسکتے تھے۔ موٹر یا بس کا کیا سوال تھا) روانہ ہوئے۔ اختر کے ایک بہت عزیز دوست ان دنوں اپنی بہن بہنوئی (جو فارسٹ آفیسر تھے) کے پاس آئے ہوئے تھے۔ ان کے بلاوے پر وہاں چلے گئے۔ اس کا تگرام میں نے اس خیال سے لگایا کہ اختر کے دل کی اداسی جنگلات، پہاڑوں، جھرنوں اور جہلم دریا کی پُر شور روانی کی خوش کن آواز سے کچھ دور ہو ہی جائے گی۔ بعد میں آگے کا کوئی پروگرام بنا سکیں گے۔

اس حسین علاقہ میں قدرت سے قریب تر ہو جانے کا اثر اختر پر ایسا ہوا کہ وہ اخبار کا غم بھول گئے۔ مگر میں برابر فکر مند کہ ان کو کیا مشورہ دوں! ایک رات دو بجے یہ دماغ میں خیال آیا کہ اگر ولایت جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے آئیں تو بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ اُسی وقت اٹھا کر جب اختر سے کہا تو انھوں نے ہنس کر کہا۔ "کیسے خواب دیکھ رہی ہیں جانے کے لیے بہت وسائل چاہیے ہوتے ہیں اور پھر سرکار مجھے پاسپورٹ ہی کیوں دے گی۔ سو جائیے۔"

میں نے دوسرے دن والد صاحب کو ہردوئی تار دیا کہ فوراً پاسپورٹ کے دو فارم بھیج دیں۔ چند روز بعد فارم آگئے اختر کو بڑی مشکل سے ان کو بھرنے پر راضی کیا کہ میرے ابا ضرور پاسپورٹ دلوا سکیں گے۔ ایک ماہ بعد جب ہم ہردوئی واپس آئے تو اختر کی بات سچی نکلی لکھنؤ سے جواب آچکا تھا کہ دہلی سے وائیسرائے کی سیکریٹریٹ سے اجازت اس لیے نہیں ملی کہ اختر کا ریکارڈ ان کی نظر میں ٹھیک نہیں!! اختر نے مجھ سے صرف اتنا کہا "مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ پاسپورٹ نہیں ملے گا۔ اب کل میں ایک دن کو وردھا رکتا ہوا حیدر آباد جاتا ہوں۔ مولوی صاحب سے کام کے متعلق بات کر کے بمبئی چلا جاؤں گا وہاں پاؤں نہ جما سکا تو کلکتہ جا کر "مول چند اگروال" کے اخبار میں پھر کام شروع کر دوں گا تب آپ وہاں آجائیں۔"

اختر دو دن ہمارے گھر رک کر "وردھا" (گاندھی جی کا جہاں آشرم تھا۔ سروجنی نائیڈو آج کل یہاں گاندھی جی کے پاس تھیں) سے ہوتے ہوئے حیدر آباد مولوی صاحب کے پاس چند روز کے لیے اور نگ باد شمیم بھائی سے ملنے چلے گئے۔ اختر کے روانہ ہونے کے دوسرے دن ہی میں نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ آپ کچھ نہ کر سکے، اب میں خود لکھنؤ جاؤں گی (اس وقت عارضی کانگریس کی حکومت بن چکی تھی اور والد صاحب کے دوست پنڈت پنتھ یو پی گورنمنٹ کے وزیر اعلیٰ تھے) آپ بس پنتھ جی کو تار دے کر میرے آنے کی اطلاع دے دیجیے" والد صاحب میری اس ہمت اور عزم کو دیکھ کر خوش ہوئے کہا کہ "ٹھیک ہے تم رات کی گاڑی سے چلی جاؤ۔ بس سیدھی ان کے گھر جا کر اپنی سی کوشش کر دیکھو۔" (اس کی تفصیل "ہم سفر" میں آپ کو بڑی دلچسپ لگے گی) فی الحال قصہ مختصر یہ کہ پنڈت پنتھ جی کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ ان سے سب سے پہلے یہ فرمائش کرنا پڑی کہ مجھے فوراً ایک چپل بازار سے منگوا دیں کہ اسٹیشن سے تانگے میں آتے ہوئے پاؤں سے گر گئی۔ نہ رہے پانچ روپے اور وہ اُدھر ناپ کی چپل ہے!! فرش پر پالتی مارے، بڑی بڑی گول گول آنکھوں والے گول مٹول پنتھ جی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے تو میری نظر ان کے ماتھے کے تلک اور گلے کے جنؤ پر پڑی۔ تلک سے سروجنی نائیڈو کی بندیا یاد آگئی پنڈت جی نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ پاسپورٹ کا دینا یا نہ دینا صوبے کی گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہوتا جب تک وائسرائے کے دفتر سے اجازت نہ مل جائے۔ میں نے ان سے پوچھا "کیا سروجنی جی اور پنڈت جواہر لال بھی ابھی "وردھا" میں گاندھی جی کے پاس ہیں؟" بتایا "ہاں وہیں ہیں۔" "پھر مجھے سروجنی جی سے بات کروا دیجیے۔" بیچارے پریشان سے ہو کر سیکریٹری سے کہتے ہیں فون ملا کر بی بی کو بات کروا دو۔" وہ فون ملا کر مجھے دے دیتے ہیں۔ "آپ کو اختر نے بتایا ہوگا کہ پہلے گورنمنٹ نے اخبار نکالنے کی اجازت نہ دی اور اب پاسپورٹ دینے

سے انکار کر دیا۔" سروجنی جی نے جواب دیا۔ "اختر نے تو کوئی ایسا ذکر نہیں کیا۔ ایک دن رک کر حیدر آباد مولانا کے پاس چلے گئے۔" "میں اس وقت پنڈت پنتھ جی کے پاس بیٹھی ہوں پاسپورٹ لینے آئی مگر آپ کے وزیر اعلیٰ بے بس ہیں آپ یہ کریں کہ ایک تار وائسرائے کو اپنی طرف سے اور ایک گاندھی جی کی طرف سے اور ایک جواہر لال جی سے بھی بھجوائیے پھر آپ تینوں کی بات رد نہ کی جائے گی۔" سروجنی جی نے شفقت، محبت سے کہا "ایک شرط ہے کہ پاسپورٹ مل جائیں تو دو روز کو "وردھا" آشرم میں رکتی ہوئی حیدر آباد جانا۔" دو روز میں پنڈت جی کی کوٹھی میں دھرنا دیے بیٹھی رہی صبح کو تار سے اجازت مل گئی شام کو پاسپورٹ میرے ہاتھ میں آ گئے۔ رات کی گاڑی سے واپس "ہردوئی" کے لیے چل پڑی دوسرے دن وردھا کے لیے روانہ ہو گئی۔ یہاں آشرم کا جو حال دیکھا اور گاندھی جی سے جو بات چیت ہوئی وہ خوب ہی تھی ("ہم سفر" میں پڑھیے گا) دوسری رات حیدر آباد کے لیے چل پڑی۔ صبح ۱۰ بجے جب "نادر منزل" پہنچی تو مولوی صاحب کی خوشی کی حد نہ تھی وہ سمجھ رہے تھے کہ گھوم پھر کر ہم اب پھر واپس ان کے پاس آ گئے۔

"پہلے چائے کا ایک دور ہو جائے تو سب حال بتانا۔" "اختر کہاں ہیں؟" "وہ باگڑ بلا جس کے پاؤں میں بلی بندھی ہوئی ہے۔ تو اورنگ آباد بھاگ چھوٹا!!"

"آپ کو بتایا ہوگا کہ پاسپورٹ نہیں ملے" بولے "کیسے پاسپورٹ ایسا کوئی ذکر نہیں کیا اختر نے۔" اب میں نے بڑی تفصیل سے مولوی صاحب کو الف سے ی تک حال سنایا ان کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوا جارہا تھا۔ جب بتایا کہ گاندھی جی کہہ رہے تھے کہ مولانا صاحب ہم سے بہت خفا ہے وہ تو بس اردو کے چکّر میں ناگپور میں ہم سے بہت حجت کرا اور آپ کا شوہر تو بہت ہی تیز آدمی ہے اصل میں سنسکرت پڑھ کر دماغ میں بڑی تیزی آجاتا ہے وغیرہ وغیرہ" اور جب چپل والی بات بتائی تو مولوی صاحب کے قہقہے نکل گئے اور جب گاندھی جی نے یہ بتایا کہ ہندو مسلمان سب ایک ہے۔ جھگڑا کیوں کرنا تو میں نے پوچھ لیا پھر لکشمی پنڈت نے جب سیّد حسین سے شادی کر لی تو انھوں نے لکشمی جی کو اس وقت تک بند کروا کر رکھا جب تک ان کے پھیرے نہ ڈلوا لیے تو کہا "ہندو اور مسلمان بہن بھائی ہیں شادی کیسا ہو سکتا تھا۔" اس پر مولوی صاحب بے ساختہ ہنس کر بولے "بڈھا کتنا چالاک ہے جیسے لومڑی ہو۔ مگر ایک بات تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو ایسی باتیں گاندھی جی سے یا پنڈت پنتھ سے کرتے کوئی لحاظ نہیں آیا؟" یوں کہ میری نظر میں صرف تین انسان ایسے ہیں جن کا مجھ پر بڑا رعب پڑا ہوا ہے۔ "وہ کون؟" "ایک آپ ایک ابّا اور تیسرے اختر" جھٹ سے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ رکھ تھوڑا جھک کر کہتے ہیں "بندہ کورنش بجالاتا ہے۔"

"اچھا یہ سب چھوڑیں اب ذرا یہ پاسپورٹ تو دیکھیں بس اب ہم دونوں چلے ولایت کو اختر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیں گے اور یہ آپ کی جاہل لڑکی بھی کچھ نہ کچھ ضرور پڑھے گی۔ اور ہاں یہ بتائیے کہ اختر آکر جب پاسپورٹ دیکھیں گے تو کس قدر خوش ہوں گے؟"

"اب تک تم نے اپنے میاں کو ذرا بھی نہ جانا وہ کچھ بھی خوشی کا اظہار نہ کریں گے کہ تم کہیں اپنے کو کچھ سمجھنے نہ لگو۔" "ہاں آپ یہ بتائیں کہ یہ سارا باغ ایسا اتنی جلدی اُجاڑ کیوں کر ہو گیا؟ چڑیاں کدھر گئیں؟" "اڑ گئیں"۔ "آپ نے خود پنجرے کھول کر اڑا دیں نا؟ اور آپ اپنے کمرے میں شفٹ کیوں نہ ہوئے؟"

"اب ایسی باتیں کر کے منہ کا مزہ خراب نہ کرو۔" چہرے اور آنکھوں میں اداسی دیکھ کر چپ ہو گئی۔ مولوی صاحب کہنے لگے "وہ دونوں لفافے تو تمھارے پاس ہیں نا؟ لاؤ مجھے دو اُن کے میں بینک بھیج کر پونڈ کروا دوں۔ ورنہ روپے وہاں بیکار ہوں گے۔"

اب وہ سیریس ہو کر بولے "پہلے یہ بتاؤ کہ سوچا کیا ہے؟ سفر کرتے وقت ٹکٹ لینا پڑتا ہے اس کے لیے روپے درکار ہوتے ہیں۔ پھر ولایت میں رہنے کے لیے بہت سے روپے ہونا چاہیے۔ اس سب کا کیا بندوبست کیا؟" "اس کی تو کوئی فکر کی بات نہیں کہ اختر انجمن کا کام کر کے بھیجتے رہیں گے" اور "وشوامتر" اخبار کے لیے لکھیں گے اور میرا تو بندوبست یوں ہے کہ جیسے ہر لڑکی کے والدین کرتے ہیں اگر لڑکی باہر جائے تو ٹکٹ لے کر دیتے ہیں اور پھر سے جیب خرچ ملنے لگتا ہے۔" "یہ کس نے بتایا؟" "ابّا نے" اس پر مولوی صاحب ہنس کر کہتے ہیں "ظفر عمر پولیس والے بھی ہیں اور جاسوسی ناول نویسی بھی۔" "اس کا یہاں کیا تعلق ہے؟" "کچھ یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ اختر جس قدر بھی انجمن کا کام کر کے بھیجا کریں گے فوراً اس کی اجرت بھیج دی جایا کرے گی۔ لیکن اب سچ سچ بتاؤ کہ تمھارا خرچ کیسے چلے گا؟" "یہ دیکھیے جو ابّا نے چھ ماہ کا جیب خرچ اور ٹکٹ کے روپے دیے ہیں۔" ان کو دیکھ کر مولوی صاحب کے چہرے پر اطمینان سا نظر آیا اختر شام کو واپس آ گئے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے پوچھا "آپ یہاں کیوں آ گئیں؟ یہ پاسپورٹ لے کر" وہی بات سچ نکلی کہ کوئی خوشی کا اظہار نہ کیا بس اتنا کہا "یہ بہت اچھا ہوا اب کل ہم کو بمبئی روانہ ہو جانا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا "چند دن تو دونوں رک جاؤ۔"

تین دن بعد پھر ہم دونوں شفیق مولوی صاحب کو اداس چھوڑ کر چل پڑے جب کیا ہی اچھا زمانہ تھا کوئی روپے پیسے کی، ویزے ہیلتھ سرٹیفکٹ کی پابندی نہ تھی۔ بس جیسے ریل یا بس کا ٹکٹ خریدا جاتا ہے ویسے پانی کے جہاز کا ٹکٹ خریدے اور چل دیے۔ اختر نے بمبئی میں ایک فرنچ ڈکشنری اور دو شروع کی کتابیں جب خرید لیں تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم لندن نہیں بلکہ پیرس جا رہے ہیں۔ پندرہ دن کے سفر کے دوران اپنے کو اختر نے اتنی فرنچ خود پڑھا لی کہ پیرس پہنچ کر اپنی بات سمجھا سکتے تھے اور دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ میری تو حیرت کی حد نہ رہی۔ یونیورسٹی کھلنے میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔

خالدہ ادیب خانم جو ترکی کی مشہور و معروف ہستی تھیں۔ ہندوستان چند ماہ کے لیے آئی تھیں۔ والد صاحب اور مولوی صاحب دونوں ہی سے ان کی اچھی ملاقات ہو چکی تھی۔ ترکی زبان کی بہت اچھی ادیبہ اور اتاترک کمال پاشا کے ساتھ ترکی کی جنگ آزادی میں دوسرے جنگ عظیم کے دور میں شانہ بشانہ رہی تھیں۔ سیاست میں بڑا عمل دخل بھی تھا۔ عرصہ بارہ تیرہ سال سے پیرس میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہی تھیں ان کو والد صاحب اور مولوی صاحب نے ہمارے لیے خط لکھ دیے تھے۔ اس عظیم خاتون نے ہمارے ساتھ اور ہمارے بچے کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو صرف کوئی حقیقی ماں ہی کر سکتی ہے۔

پیرس پہنچ کر اختر انجمن کا بہت سا کام بھی کرتے اور ساتھ یونیورسٹی کی تعلیم بھی۔ کوئی آٹھ ماہ بعد ایک دن بڑی موٹی اور بڑی سی کتاب کا پارسل اختر کے نام آیا میں سمجھ گئی کہ یہ ڈکشنری کی جلد ہے مگر خود نہ کھولی۔ اختر خود کھولیں اور میں ان کی خوشی آنکھوں سے دیکھ سکوں گی۔ وہ شام کو آئے جلدی سے کھول کر مولوی صاحب کا پیش لفظ پڑھنے لگے میں بھی پیچھے کھڑی جھکی اس کو پڑھ رہی تھی اس میں ہر کام کرنے والے کا بڑی تحسین کے ساتھ ذکر تھا سوائے اختر کے۔ ان کے ہاتھ جیسے کچھ کانپے اور ڈکشنری نیچے پاؤں کے پاس گر گئی۔ سامنے سے جوان پر نظر پڑی تو لگا جیسے گرتے ہوئے مجسمہ کا سفید چہرہ ہو۔ میرے اوپر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ پیڈ اور قلم ان کے سامنے رکھ کر کہا کہ "بس آج سے آپ انجمن کام نہیں کریں گے۔ رازق خدا اور آپ کا علم ہے۔" جس کیفیت میں وہ اس وقت تھے اتنا لکھ دیا کہ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے اب مزید کام نہ کریں گے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

میں نے خالدہ ادیب خانم کو جب یہ سنایا تو مجھ سے کہا کہ وہ اختر سے اس بارے میں بات کریں گی جب اختر آئے ان کے

فلیٹ پر مجھے لے جانے کے لیے تو ان کی گفتگو اختر کے ساتھ ہوئی۔ "مجھے حمیدہ سے معلوم ہوا کہ جس ڈکشنری پر تم نے ڈھائی سال بڑی لگن اور محنت کے ساتھ کام کیا اس کے پیش لفظ میں مولانا نے ہر ایک کا ذکر کیا سوائے تمھارے۔ حمیدہ نے ہمیشہ بنا بنایا حلوہ کھایا ہے وہ تو اس دنیا اور دنیا والوں سے بے پروا ہے مگر تم نے تو دنیا میں تھپیڑے کھائے اور ننھی سی عمر سے گرم سرد دیکھا مگر قدم بڑھائے آگے آتے رہے۔ علم کے شیدائی اور قوم و ملک کا دل میں درد بھرتے رہے۔ پھر جس انسان نے تم کو باپ ولی محبت دی۔ استاد کی جگہ بھی لی۔ اس کا دیا ایک کڑوا نوالہ کھاتے وقت ایسے ہو گئے کہ اس سیدھی سادی لڑکی کے کہنے پر خط میں مزید انجمن کا کام نہ کرو گے لکھ ڈالا۔ مجھے تعجب ہے کہ تم جیسا انسان ایسی کمزوری دکھائے، بے سوچے سمجھے خط لکھ دیا، عدنان ہے اور مجھ پر نظر کرو کہ آج بارہ برس سے زیادہ ہو گئے اپنے بچوں سے جدا، ملک سے دور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم کو مصطفیٰ کمال سے کوئی گلہ اس لیے نہیں کہ وہ ہمارے ملک اور قوم میں تازہ تازہ خون کو ہر کسی کی رگوں میں دوڑا رہے ہیں۔ مولانا عبدالحق بھی کچھ ایسا ہی کر رہے ہیں، کسی بھی قوم کی صحت مند زندگی پر زبان سب سے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ ایسے عظیم لوگ کچھ ذاتی انا یا انسانی کمزوری میں فرد واحد کو نقصان پہنچا بیٹھیں تو اس کو اپنے ملک اور قوم کے آگے ذرا بھی اہمیت نہیں دینا چاہیے اور رہا کہ تم انجمن کا مزید اور کام نہ کرو گے تو میں دیکھوں کہ تم کیسے نہیں کرتے۔ کیا انجمن مولانا کی اپنی ذاتی ملکیت ہے یا پوری قوم کی تم جو بھی انجمن کا کام کرو گے اسکا فائدہ اردو زبان کو پہنچے گا اور قوم کو دوسرے جو بھی اور جتنا بھی انجمن کا کام کرنے کی تم نے ذمہ داری لی اس کو ذمہ داری کے ساتھ تم کرو گے اور بلکہ کچھ اور بھی زیادہ کر کے دکھانا، تب کوئی بات ہوئی وقتی طور پر جانے کس جذبہ کے تحت مولانا اپنے مقام سے دس قدم نیچے کو چلے آئے تو اس کا جواب تمھاری طرف سے یہ ہونا چاہیے کہ تم بیس قدم آگے بڑھاؤ تاکہ وہ تم کو اور بھی زیادہ نظر اٹھا کر دیکھیں آج رات سے انجمن کا کام کرنے بیٹھ جاؤ۔" اختر نے اتنا کہا کاش خانم آپ سمجھ سکتیں کہ مجھ پر کیا گزری۔ "میرا تو قبلہ گاہ ہی ٹوٹ گیا۔" (یہی جملہ اختر نے "گرد راہ" میں کہیں پر لکھا ہے)

لگ بھگ ہر روز تین بجے دوپہر کو خالدہ ادیب خانم ہمارے فلیٹ کے نیچے آتیں میں اوپر سے اتر آتی پھر مجھے لے کر پیرس کے کسی باغ میں جاتیں کیا کیا اور کیسی کیسی باتیں کیا کرتیں ان کی شخصیت، ان کی شفقت و محبت میرے لیے مولوی صاحب کی طرح تھی، ایک دن کہنے لگیں "حمیدہ میں نے ڈکشنری کے پیش لفظ کے متعلق اور مولانا کے بارے میں بہت سوچا میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انھوں نے ایسا جو کیا تو اپنی اُس دلی چوٹ کا اختر سے بدلہ لے لیا جو ان کو اس وقت پہنچا ہوگا جب تم دونوں ان کو چھوڑ کر دہلی آجاتے ہو۔ انھوں نے ضرور سوچ لیا ہوگا کہ وقت آنے پر اختر کے دل پر خود وہ بھی کوئی کاری ضرب لگائیں گے!! تم جب بھی مولوی صاحب سے ملنا تو ضرور پوچھنا، دیکھ لینا ان کا یہی جواب ہوگا۔ اور پھر اسی دن مجھے خط لکھ کر بتا بھی دینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اختر، مولانا سے کبھی اس بات کے متعلق کوئی اشارہ تک نہ کریں گے۔ جس کا ان کو ملال رہے گا کہ جواب میں وہ یہ نہ کہہ پائیں گے پنچو جیسی کرنی ویسی بھرنی مجھے چھوڑ کے جاتے وقت احساس ہوا تھا کہ میرا دل کیسا دُکھے گا۔

خالدہ خانم کا کہنا واقعی سچ نکلا۔ ہمارے بیس دن کے بیٹے کو اپنے زیر سایہ رکھ کر مجھ کو بھی اختر کے ساتھ لندن بھیج دیا کہ چھ ماہ والا "مونٹسیری" کا کورس کر لوں۔ بچہ بہت علیل ہو گیا۔ پیرس سے اس کو لندن لائی تین ماہ وہ وہاں کے اسپتال میں رہا اور اس کو لے کر علی گڑھ آ گئی جتنا وہ انجمن کے لیے کام کر چکے تھے دو ہفتہ سفر کے درمیان میں صاف کر آتے ہی مولوی صاحب کو روانہ کر دیا۔ ان کو لکھا کہ اپریل کی فلاں تاریخ میں آئیں تاکہ کامران کے عقیقہ میں شرکت کر سکیں اور بچہ کی علالت کا حال لکھا جس پر مولوی صاحب نے حیران ہو کر لکھا کہ "کامران حسین کدھر سے آ گئے نہ تم نے کبھی لکھا نہ اختر نے۔"

مولوی صاحب چند گھنٹوں کے لیے تشریف لائے اور کہا "بہتر ہو کہ میرے پاس آجاؤ" میں نے کہا کہ "مولوی صاحب یہ بتائیں کہ آپ کس منہ سے یہ فرمار ہے ہیں، اختر کی وجہ سے نا؟" کہنے لگے "اور کیا" میرا یہ جواب تھا کہ "آپ نے اختر کے ساتھ اس قدر زیادتی کی آپ کا ضمیر جانے کس کس طور پر آپ کو برا بھلا کہتا ہو گا کہ اتنی شفقت، محبت اور قدردانی کے بعد اس کی اتنی محنت کا صلہ آپ جیسے عظیم انسان اس طرح دے جس کو ہر گز ایسا کرنا زیب نہیں دیتا۔" مولوی صاحب کی آنکھیں دھندلاسی گئیں اور چہرہ تمتما گیا۔ مجھے گھور کر کچھ دیر دیکھتے رہے پھر بولے "اس وقت جب تم دونوں مجھے چھوڑ کر چل پڑے تب یہ سوچا تھا کہ مجھے کیا دکھ اور تکلیف ہوئی ہو گی؟ میں منع کرتا رہا مگر ایک نہ سنی میں نے اس وقت سوچ لیا کہ اختر کے دل کو اسی قدر ٹھیس ضرور پہنچاؤں گا۔" "توبہ مولوی صاحب آپ نے تو بچوں والی بات کی ہمارا آپ کے پاس سے جانا کسی مقصد کے لیے کچھ برا نہ تھا۔ لیکن آپ جیسے عظیم ادب پرور، مفکر اور عالم ہستی کے لیے یوں حق تلفی کرنا اپنے آپ کو داغ دار کر لینے کے برابر ہوا۔ گو اختر ہر گز آپ سے خود نہ گلا کریں گے نہ شکوہ آپ نے ان سے ایک باپ کو چھین لیا ان کو تو زندگی میں پہلی بار باپ جیسی شفقت اور گھر ملا تھا جس کو کیا ہی بچکانہ انداز میں آپ نے ڈھا کر رکھ دیا!" مولوی صاحب کا سر کچھ دیر کے لیے جھک سا گیا آنکھوں کی نمی کو چھپانا شاید مقصود تھا، بولے "تم تو ہمیشہ میرے ساتھ جھگڑے کرتی رہی ہو۔ اصل میں مجھے کہا ہی نہ تھا کہ میرے ساتھ چلو۔" میں ان کے گلے سے لگ گئی اور رو پڑی تو وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ بھلا وہ آنسو کب برداشت کر سکتے تھے مجھے ہنسانے کے لیے وہی اپنے ٹیپ کے بند پڑھے

جو کوئی ہم سے سیدھم سادھا
ہم بھی اس سے سیدھم سادھا
جو کوئی ہم سے ٹیڑم ٹاڑھا
ہم بھی اس سے ٹیڑم ٹاڑھا

اب ہم دونوں ہی ہنس پڑے اور ان کو بتایا کہ آج ہی خالدہ خانم کو خط لکھ کر آپ کی باتیں بتانا ہیں۔ انھوں نے مجھے تاکید کر دی تھی کیوں کہ انھوں نے بالکل یہی کہا تھا کہ جب پوچھو گی تو مولانا یہ کہیں گے کہ اس سے مراد اختر کے دل کو ٹھیس لگانا تھی۔ مسکرا کر بولے "خانم بڑی دور بین اور انسان شناس ہیں۔"

جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ انجمن کے کام کا روپیہ جو وہ بھیجتے تھے وہ غدر بود ہونے لگا۔ خط آنے بھی بند ہو گئے۔ جس سے وہ قدرے پریشان ہوتے۔ میری پریشانی کا بھی خیال۔ تسلی بخش خط لکھتے....

اختر ۱۹۴۱ء مارچ میں واپس آگئے۔ ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مولوی صاحب دہلی میں اور یہاں کبھی کبھی ہمارے گھر آتے رہے۔ لڑکوں کی ضدوں کو جب اختر کو فوراً پورا کرتے دیکھتے تو خوب ہنس کر کہتے "یہ بڑے ہو کر اس کو ٹھیک کریں گے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔" میں ہر بار کہتی "خدا کے لیے مولوی صاحب یوں تو نہ کہا کریں۔"

ایک بار نواب لیاقت علی خاں کی دعوت پر مجھے کھڑا دیکھ کر ہاتھ میں پلیٹ لیے پاس آکر کہنے لگے "یہ دیکھو بھیک کا ٹھیکرا لیے ہوئے ہوں۔ (کھڑا کھانا تھا۔ سب ہی ہاتھوں میں پلیٹ لے کر کھانا لے رہے تھے) اور یہ تو دیکھو کہ دہلی میں اور یہاں جب بھی کسی انجمن کے کام کے لیے میں نے اختر سے ایک فون کر کے بلا کر کہا ہمیشہ اولین اہمیت دے کر اس کو کروا دیا مگر اب تک ایک بار یہ نہ پوچھا کہ ڈکشنری کے معاملہ میں میں نے ان کے ساتھ زیادتی کیوں کی؟" "میں نے تو برسہا برس پہلے آپ سے کہہ

دیا تھا کہ اختر آپ سے کبھی کچھ خود نہ کہیں گے۔" کڑوی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "لینشموخان جو ٹھہرے!"
کراچی میں جب یہ سنا کہ مولوی صاحب بہت علیل ہیں اور بہت کمزور ہوگئے ہیں اور بالکل ہی کمرے میں لیٹے رہتے ہیں تو فوراً ہی ان کو دیکھنے کے لیے اُن کی قیام گاہ کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی۔ میں نے اس شیر جیسے انسان کو کتنا ہراساں اور بے بس پایا کہ مجھے رونا آنے لگا۔ وہ آب دیدہ ہوگئے۔ میرے اس کہنے پر کہ آپ میرے ساتھ چلیں کمرے میں ملازم تھا اس سے کہا "جاؤ چائے بنا کر لے آؤ" پھر جواب دیا" بھلا میں کہاں جا سکتا ہوں، میں تو ایک قیدی ہوں، پھر اگر انجمن کو چھوڑ کر جاؤں تو جو میری نادر کتابیں ہیں اور قلمی نسخے باقی رہ گئے وہ بھی شاید نہ رہیں۔" میں سوچ میں پڑ گئی کہ مطلب کیا ہے؟ یہ عظیم انسان، محسن قوم و زبانِ اردو کسی کے قیدی ہو سکتے ہیں؟ ان کے چہرے پر تو میں نے ہمیشہ ہنسی دیکھی تھی میں یہ والا چہرہ اور یہ دھندلی اور پپوٹے پھولی آنکھیں برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ان کو ہنسانے کے لیے میں نے حیدرآباد کی کچھ باتیں پوچھ ڈالیں جن کو وہ ہمیشہ ٹال جاتے تھے کہ وہ کیا باتیں تھیں؟

"اچھا اب اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ اپن دونوں" وہ اب بتا دیں تا کہ آخر وہ "چندن گوہ" ہمارے کمرے میں آپ نے کہاں سے اور کیوں کر داخل کیے تھے؟" مسکرانے لگے آنکھوں میں کچھ چمک سی پیدا ہوگئی۔ "اچھا وہ۔ ہوا یوں تھا کہ آفس میں بیٹھا تھا۔ ایک صاحب ملنے آئے وہ یہ سوچ کر کہ ان دنوں جانور اور پرندوں کا مجھے شوق ہوگیا ہے بتایا کہ کل ان کو ایک عجیب سا جانور پہاڑیوں میں ملا جس کو وہ کسی طور سے جکڑ جکڑا کر ایک بڑے سے بکس میں بند کر لائے ہیں۔ اس کا جسم تو دو فٹ ہے جیسے گرگٹ ہو اور دم مچھلی جیسی تین فٹ کی ہوگی۔ بس نایاب ہے۔ اس کی خصلت ہے کہ دن بھر چپ چاپ پڑا رہے گا مگر رات کو شکار کرنے نکل جاتا ہے اور دم ایسے اِدھر اُدھر گھما کر مارتا ہے کہ یوں آواز آتی ہے جیسے کوئی زور سے ہنٹر کا چٹاخا کر رہا ہو۔ جب ان سے پوچھا یہ کیا کھاتا ہے؟ تو بتایا مینڈک گرگٹ اور چھپکلی وغیرہ زود اے اس کو خریدنے کے لیے تڑپ اٹھے مگر میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے پوچھ لوں اگر آپ رکھنا چاہیں تو حاضر کر دوں۔ ان کو اپنا کوئی کام مجھ سے کروانا تھا۔ میں نے اس خیال سے ہاں کر دی کہ اس کو برآمدے میں چڑھنے کے لیے کچھ گوشت کے ٹکڑے رات کو ڈال دوں گا اور جب وہ سٹاسٹ اپنی دم سے آوازیں نکالے گا اور تم دونوں ڈرو گے تو اچھا تماشہ رہے گا۔ ان سے کہا کہ بعد مغرب میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس وہ بکس رکھ جائیں محبوب سے کہا کہ "لاما" رات کو بہت بھوکا ہوتا ہے کمرے کے پاس آکر "میاؤں میاں" سے سونے نہیں دیتا ایک پیالے میں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں رکھ دے جب یقین ہوگیا کہ تم دونوں سو گئے ہو تو پاس جا کر بکس کا ڈھکن کھول کر نیچے بوٹیاں ڈالیں سیڑھیوں پر اور برآمدے میں رکھیں۔ وہ سیدھا نکل کر گوشت کھاتا ہوا جب برآمدے میں آگیا تو میں نے اپنا دروازہ بند کر لیا وہ دم کو شپاشپ، تڑاخ تڑاخ کرتا پھرا، پھر تمھارے کمرے کے اندر۔ دروازہ ذرا سا کھول کر چاندنی رات میں میں نے دیکھا کہ وہ اندر چلا گیا تم چیخ چیخ کر "مولوی عبدالحق" کہہ رہی ہو اور میں برآمدے سے پکار پکار کر کہتا جاتا کہ نیچے قدم نہ اُتارنا میں نوکروں کو بلا کر لاتا ہوں" پھر کس مشکل سے اس کو واپس بکس میں بند کیا گیا اگر تب میں بتا دیتا تو وہ باگڑ بلا مجھے کھا نہ جاتا" ہم دونوں ہنسنے لگے چائے آئی جب پی چکی تو کہا اب جاؤ۔ یوں میں ان کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر واپس آگئی میرا دل ان کے الفاظ سے کیسا دکھی ہوا سوچوں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے ایسے عظیم اور قوم کے محسن کو قیدی ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے؟ رات کے جہاز سے صومالیہ چلی گئی۔

۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو ریڈیو پر خبر سنی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوگیا۔ ہم دونوں پر جیسے بجلی گر پڑی ہو۔
کسی بھی قوم اور ملک کی شناخت اس کی زبان ہی سے ہوتی ہے۔ بابائے اردو کے احسانات جو پاکستانی قوم اور ملک پر ہیں وہ

انشاء اللہ رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ اردو زبان آج جو دنیا کے ہر ملک میں اپنا پاؤں جما رہی ہے۔ تو یہ وہ ہی پودا ہے جس کی آب پاشی مولوی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے کی۔ ہزاروں کو فیض یاب کرتے رہے اور اپنی اردو زبان کے شیدائی سپاہی انھوں نے ہی ـــ تو بنائے۔ ہزاروں کو زندگی کے گزارنے اور کچھ اردو زبان کے لیے کرنے کا ڈھب سکھا کر نسل در نسل اس سلسلہ کو جاری اور ساری رکھنے کے لیے تیار کیا۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا خیال بھی آیا کہ اب وہ شاید جنّت میں بیٹھ کر بھی اپنی انجمن ترقی اردو کے لیے کام میں مصروف رہتے ہوں گے۔

اس علم دوست، اردو زبان کے عاشق اور انسان دوست کو میرا باادب سلام فرشتے پہنچادیں۔ اے کاش پھر کبھی اب ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے محسن اور عظیم علم دوست کو آخری وقت دُکھی دل سے دنیا سے رخصت کریں۔

حواشی

(۱) والد ظفر عمر مرحوم کی عادت تھی کہ اپنے ہر بچے کے خطوں کی فائل بنا کر رکھتے تھے اس خط کو کبھی میں نے ان کی فائل میں دیکھا۔

(۲) یہ خط بابائے اردو نے اپنے قلم سے انگریزی میں لکھ کر ٹائپ کروا کر بھیجا تھا۔

(۳) میرے والد صاحب نے ایک ماہ قبل ہزار روپے کا ایک چیک مولوی صاحب کو یہ لکھ کر بھیج دیا تھا کہ اختر کا سوٹ اور شیروانی وغیرہ بنوادیں، اس چیک کے چار ٹکڑے کر کے واپس بھیجا کہ تم نے مجھے اختر سے شرمندہ کیا۔ کیا وہ خود نہیں بنا سکتے۔ سوچ لیا ہوگا کہ وہ بھی ظفر عمر کو شرمندہ کریں گے۔

(۴) اختر کا ایک افسانہ "میرے خوابوں کا مندر"

(۵) اختر کا یہ افسانہ "زبانِ بے زبانی" جس کو پڑھ کر بہت اثر ہوا اور یہ ہی ہماری ملاقات کا سبب بنا۔

(۶) اس کی تفصیل "ہم سفر" میں جو مجھ سے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے جانے کیوں کر اور کیوں قلم بند کروالی ملی گی۔ یہ ہنوز ان کی تحویل میں ہے۔

(۷) بڑی تفصیل سے اس کا ذکر "ہم سفر" میں کیا گیا ہے۔

(۸) والد صاحب نے اپنے پہلے جاسوسی ناول "نیلی چھتری" ہی کے نام پر کوٹھی کا نام رکھا تھا۔

قومی زبان (۸۹) اگست ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر محمد ظفیر الحسن

سفر ہے شرط

(۱۹۴۲ء - ۱۹۴۳ء)

پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد دوسری جنگ عالمگیر (۴۵-۱۹۳۹ء) تک پوری تباہی و بربادی کے ساتھ جاری رہی۔ اور اس کے سیاہ بادل برعظیم کے در و دیوار پر چھا رہے تھے۔ آزادی کی جدوجہد فیصلہ کن مرحلے طے کر رہی تھی۔ محکوم ملک کے باشندے امید و بہیم کی حالت میں عالمی بساط حرب و ضرب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ برطانوی تسلّط سے آزادی کا جذبہ بچے بچے میں موجود تھا۔ (۱)

جہاں دیکھیے شور و ہنگامہ، جدھر نظر اُٹھائیے فتنہ و شر، ایسا معلوم ہوتا کہ نیکی کا خدا شیطنت کی رسّی دراز کر کے انسانیت کی تباہی کا عبرت انگیز منظر دکھانا چاہتا ہے.... حیوانیت اور بربریت کی تیز آندھیوں میں انسانی زندگیاں خس و خاشاک کی طرح اڑ رہی ہیں۔ (۲)

کانگریس موقع سے فائدے اٹھا کر "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے لگا رہی تھی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۴۲ء کو مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) پھر مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے ۲۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو ایک ہزار مسلمان طلبہ نے لاہور میں مسلم لیگ کے حق میں مظاہرہ کیا۔ ۳/۱ اپریل ۱۹۴۲ء کو الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۹ واں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ۲۰/۱۶ اگست کو لیگ ورکنگ کمیٹی کی قرارداد اور استصواب رائے سے پاکستان کا مسئلہ طے کرنے کی تجویز ہوئی۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۲ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے تقریر کی کہ مسلمان "خود مختاری" چاہتے ہیں نہ کہ "خود اظہاری"

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء عید کے دن مسلمانوں کو قائداعظم کا پیغام اور اسی دن روزنامہ "ڈان" کا اجرا۔ ۲۳ اکتوبر کو سر غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے نئے وزیراعلیٰ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۴/۱۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو قائداعظم محمد علی جناح کا دورۂ پنجاب اور پاکستان کے حق میں شاندار مظاہرے۔ ۲۵ دسمبر ۴۲ء کو ہندوستان کے مسلمان قائداعظم کی ۶۶ ویں سالگرہ مناتے ہیں اور پاکستان کا حلف اٹھاتے ہیں۔ (۳)

ملک کے سیاسی حالات کا ایک یہ رُخ تھا۔ یعنی ملک میں سیاسی کشمکش پورے عروج پر تھی۔ دوسری طرف بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اردو زبان کو ہندو پاک کے دور دراز حصّوں میں مقبول بنانے اور اردو کی صلاحیت کو بروئے کار لانے میں پورے انہماک اور مستعدی سے کوشاں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی بھی قوم کی بقا اور تحفّظ کے لیے اس قوم کی زبان کی بقا کو بنیادی اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ زبان کی آزادی کے بغیر ذہنی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔

حامد اللہ افسر میرٹھی نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ:

"مولوی صاحب نے آزادی کی جدوجہد کے ابتدائی مرحلوں میں ہی اس امر کا اندازہ کر لیا تھا کہ ذہنی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی اور ذہنی آزادی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ غیر ملکی زبان کے تسلط سے ہمارا پیچھا نہیں چھوٹ جائے اور ہم اپنی مادری زبان میں سوچنے اور اظہار خیال کرنے پر قادر نہ ہوجائیں۔ (۴)

اردو کا مستقبل صحیح معنی میں روشن اسی صورت میں ہوگا کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی کوششوں کو نہ صرف جاری رکھیں بلکہ بڑھائیں۔ اس بارے میں انجمن ترقی اردو یقیناً مفید کام کر رہی ہے۔ پھر بھی اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے حلقے میں عملی طور پر اردو کا حامی بن جائے۔ (۵)

بابائے اردو اُن چند ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے علم و ادب کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ سرسیّد کے زمانے سے لے کر آخر وقت تک وہ بڑے انہماک کے ساتھ برابر اردو کی ترویج و ترقی کا کام کرتے رہے.... ترقی اردو کی تحریک بابائے اردو کی مساعی جمیلہ کی بدولت ایسے زمانے میں کامیاب ہوئی جب کہ اغیار نے اردو کو مٹانے کی پوری طرح تیاری کر لی تھی ..... انھوں نے انتہائی مشکل اور پیچیدہ حالات میں اردو کے لیے جہاد کیا۔ اور اپنی جانفشانی سے ہندوستان میں اردو کے پرچم کو بلند رکھا۔ (۶)

مولوی صاحب نے جن مقامات کا دورہ کیا، سرکاری کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی۔ اس کی روئیداد اُن کی زبانی سنیے:

"۵ جنوری ۱۹۴۳ء کو پٹنہ پہنچا۔ ہندوستان کمیٹی بہار گورنمنٹ کے اجلاس میں شرکت کی اور "ہندوستانی ڈکشنری" کا نمونہ جو میری نگرانی میں تیار ہوا ہے پیش کیا۔ دوران قیام متعدد مقامی حضرات سے اردو کے متعلق گفتگو ہوئی۔ (۷)

۸ جنوری ۱۹۴۳ء الہ آباد پہنچا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور سر تیج بہادر سپرو سے انجمن کے بعض معاملات میں گفتگو کی۔ (۸)

دہلی میں ۳۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو اندر پرست کالج (نسواں) کی طالبات نے بزم ادب قائم کی جس کی صدارت کی۔ (۹)

۱۳ فروری کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کانووکیشن کے جلسے میں شریک ہو کر یونیورسٹی کے سائنس کے پروفیسروں سے استدعا کی کہ وہ اردو میں سائنس پر کتابیں لکھنے میں مدد دیں۔ (۱۰)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو کا سالانہ اجلاس عام ۱۴ فروری ۱۹۴۳ء کو بوقت ۳ بجے سہ پہر اسٹریچی ہال مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) کی تحریک اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تائید پر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے کرسی صدارت کو رونق بخشی۔ (۱۱) خطبۂ صدارت میں انھوں نے فرمایا:

"ذہنی قابلیت کے لیے تعلیم، باقاعدہ مطالعہ، مدارس کے معلم، یونیورسٹی کے پروفیسر، کتب خانے، تجربہ خانے، کتابیں، رسالے، اخبار اپنے زمانے کے مروجہ خیالات مکتفی ہوتے ہیں.... اس وقت یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے........ تعلیم و تحقیق کا بہترین سامان مہیا کیا جائے، کتب خانہ بہت معقول ہو لیکن ان سب سے بڑھ کر پروفیسر اور لیکچرار ایسے ہوں جنھیں ادب سے سچا لگاؤ ہو۔" (۱۲)

دہلی میں ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو انٹر پراونشیل بورڈ فار اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن کی کمیٹی میں شرکت کی اور اینگلو انڈین اور یورپین مدارس میں اردو زبان میں تعلیم کے متعلق تجاویز پیش کیں۔ اور ان پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا۔

اس ضمن میں بابائے اردو نے ۲ مارچ ۱۹۴۳ء مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو تحریر فرمایا: خط کا اقتباس یہ ہے:

"عنایت نامہ پہنچا۔ کل اینگلو انڈینز اور یوروپینز انٹر پراونشل ایجوکیشن بورڈ کی میٹنگ ہے۔ اس میں دیسی زبانوں کی تعلیم کے متعلق بحث ہوگی، یو۔ پی کے اینگلو انڈینز نے تو پچھلے سال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے مدارس میں سوائے اردو کے اور کوئی دیسی زبان نہ پڑھائیں گے۔ اب اس بورڈ کی (جو بین الصوبائی ہے) ایک کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوگا۔ انھوں نے مجھے اس کا ممبر بنالیا ہے۔ اس میں بھی میں اردو کی حمایت کروں گا۔

۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو بنگال جا رہا ہوں۔ دیناج پور اردو کانفرنس ہے۔ وہ لوگ بڑی مستعدی سے کام کر رہے ہیں۔ وہاں سے رانچی کلکتہ ہوتا ہوا گیا، پٹنہ وغیرہ مقامات کا دورہ کروں گا اور ۲۰ تک واپس آجاؤں گا۔ ۲۱ مارچ کو آپ علی گڑھ تو آئیں گے ہی ۲۲ کو دہلی آجائیے۔ اصلاح رسم خط کے متعلق اس انجمن میں ایک کمیٹی ہوگی۔ اس میں ضرور شرکت فرمائیں۔ سید ہاشمی نے ایک تجویز پیش کی ہے اس کی ایک نقل آپ کے ملاحظہ اور غور کے لیے بھیجتا ہوں۔ ضرور تشریف لائیے گا۔ ورنہ علی گڑھ پہنچ کر آپ کو پکڑ لاؤں گا۔ اس وقت باقی امور کا بھی بالمشافہ فیصلہ ہو جائے گا۔" (۱۳)

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو دیناج پور (بنگال) کی اردو کانفرنس کی صدارت کی اور اسی روز شب کو شبینہ اردو، دیناج پور کے جلسہ تقسیم انعام میں شرکت کی۔ یہاں کی انجمن اور مدرسہ حبیب الرحمٰن صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں جناب مولوی عبدالحق نے بنگال میں اردو کے رواج اور پھر قریب زمانے میں اسباب زوال کو بڑی تحقیق اور بصیرت آموز تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ خطبہ "خطبات عبدالحق" کے مجموعے، جلد دوم میں چھاپ دیا گیا ہے۔ (۱۴)

انجمن ترقی اردو ٹھاکر گانو نے پچھلے سال سے ایک شبینہ مدرسہ اردو کے لیے قائم کیا ہے۔ جس میں ایک تنخواہ دار استاد

پڑھاتا ہے۔ پچاس سے زیادہ بچے اور بالغ لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں شامل ہیں۔ الگ مکان میں یہ مدرسہ اور کتب خانہ ہے اس شبینہ مدرسے میں ہندو طلبہ بھی زیادہ تعداد میں اردو پڑھتے ہیں۔ (۱۵)

چنانچہ مولوی صاحب ۸ مارچ ۴۳ء کو ٹھاکر گانو (بنگال) پہنچے۔ ۱۰ مارچ کو ٹھاکر گانو کی "اردو منزل" کا افتتاح کیا اور مدرسہ شبینہ اردو کے طلبہ اور طالبات کی تعلیم کا معائنہ کیا۔ نیز وہاں کے ہائی ٹریننگ اسکول اور پبلک لائبریری کا بھی معائنہ کیا۔ (۱۶)

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۰ مارچ کو بیگون باڑی (بنگال) کے مدرسہ کا معائنہ کیا اور سالانہ جلسے کی صدارت کی۔

۱۱ مارچ کو شتاب گنج (بنگال) میں ہندی مدرسے کا معائنہ کیا اور سالانہ جلسے کی صدارت کی۔ بنگال کے ان تمام مذکورہ علاقوں کے دورے میں جناب میزان الرحمٰن صاحب۔ ایس ڈی او ٹھاکر گانو بابائے اردو کے ہمراہ رہے اور بڑی اعانت کی۔

بابائے اردو ۱۲ مارچ کو کلکتے پہنچے اور متعدد اصحاب سے بنگال میں اردو کی ترویج پر مشورہ اور تبادلہ خیالات کیا۔ (۱۷)

۱۳ مارچ کو جمشید پور پہنچے کرسینٹ کلب کا معائنہ کیا۔ سہ پہر کو وہاں کی لٹریری سوسائٹی میں ہندوستان کی ملکی زبان LINGUA FRANCA OF INDIA پر لیکچر دیا۔ بعد مغرب جلسۂ عام میں جو ایک میدان میں منعقد ہوا تھا، اردو زبان کی اہمیت اور اشاعت پر تقریر کی۔

۱۵ مارچ کو رانچی پہنچ کر مولوی صاحب نے چھوٹا ناگ پور، اردو مرکز رانچی کا معائنہ کیا۔ فادر کی مولڈر سے ملاقات کی۔ شب کو مدرسۂ شبینہ اردو (انجمن ترقی اردو) فتح اللہ روڈ کا معائنہ کیا۔ اس میں مشن کے عیسائی لڑکے اردو پڑھتے ہیں۔ (۱۸)

۱۶ مارچ کو بابائے اردو مقام اریا کے اپر پرائمری مدرسے (انجمن ترقی اردو) کا معائنہ کیا اس مدرسے میں ہندو مسلمان سب پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کانکے کے مدرسے اردو (زیر نگرانی چھوٹا ناگ پور، اردو مرکز) کا معائنہ کیا۔ یہاں دو مدرسے ہیں۔ ایک لڑکوں کا دوسرا لڑکیوں کا۔ رانچی واپس آکر سینٹ الائی سی ایس (رومن کیتھولک) کے مدرسے کا معائنہ کیا۔ اس میں تین سو لڑکے پڑھتے ہیں۔ انجمن کی کوشش سے اردو ان سب کے لیے لازمی کر دی گئی ہے۔ لواڈی اسکول (رومن کیتھولک) کا معائنہ کیا۔ یہاں بھی اردو داخل نصاب ہو گئی ہے۔ لیس اسکول (رومن کیتھولک) کا معائنہ کیا۔ اس تمام دورے میں اردو کے مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی صاحب بابائے اردو کے ہمراہ رہے۔ اُن سے بڑی مدد ملی۔ (۱۹)

رانچی سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ مارچ ۴۳ء میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو اپنے دورے کا مفصل حال لکھا ہے۔

> "میں ۴ مارچ کو گھر سے نکلا اور اس وقت سے اب تک آوارہ گردی میں مبتلا ہوں۔ دیناج پور میں اردو کانفرنس تھی اور توقع سے زیادہ شاندار اور کامیاب یعنی علی گڑھ سے کہیں بہتر دیناج پور سے ٹھاکر گانو، شتاب گنج وغیرہ ہوتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ کلکتہ سے جمشید پور اور جمشید پور سے پرسوں یہاں آیا۔ آج گیا جا رہا ہوں ایک (دن) وہاں قیام کر کے پٹنہ اور پٹنہ سے سیدھا دلی یعنی ۲۱ کی شب کو دلی پہنچ جاؤں گا۔ غالباً علی گڑھ سے آپ کا ساتھ ہو۔ میں کورٹ کی میٹنگ میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ آپ علی گڑھ سے ضرور دہلی تشریف لائیے۔
> ممکن ہو تو علی گڑھ اسی گاڑی میں سوار ہو جیے جس سے جاؤں گا۔
> ۲۸ کو ہندوستانی اکیڈمی کا جلسہ ہے۔ میں ۲۷ کی شب کو دلی سے چلوں گا اس لیے اس کے

متعلق جو امور ہوں وہ مجھے دلّی ہی میں سمجھا دیجیے گا۔" (۲۰)

مولوی صاحب ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو گیا پہنچے وہاں کے بعض معززین کو مدعو کر کے گفتگو کی اور عمارت فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے کے متعلق استدعا کی۔ بعض صاحبوں نے اور خاص کر جناب مصطفیٰ احمد صاحب نے اعانت کا وعدہ کیا۔

انھوں نے دہلی میں ۲۲ مارچ کو انجمن کے مکان میں اصلاح رسم خط کمیٹی کا انعقاد کیا۔ جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، سید وہاج الدّین احمد صاحب، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی صاحب، سید ہاشمی صاحب وغیرہ شریک تھے۔ اور کئی گھنٹے کی گفتگو اور بحث کے بعد مناسب تجویزیں قرار پائیں۔ (۲۱)

مولوی صاحب ۲۸ مارچ کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو انجمن ترقی اردو، میرٹھ کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔ (۲۲)

یکم مئی بروز شنبہ مراد آباد میں زیر اہتمام مسٹر ضیاء الاسلام صاحب پی سی ایس ایک آل انڈیا مشاعرہ ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ رائے بہادر رام بابو سکسینہ پی سی ایس نے فرائض صدارت انجام دیے .... اس کے بعد دوسرا اجلاس زیر صدارت سر سید رضا علی سبزہ زار پر ٹاؤن ہال کے باہر منعقد ہوا۔ اس میں ہزاروں سامعین تھے براڈکاسٹ کا مقامی انتظام بھی تھا۔

یہ مشاعرہ اس نوعیت سے عدیم النظیر تھا کہ اس میں ملک کے قدیم جدید شعرا شریک تھے۔

دوسرے روز ٹاؤن ہال میں مولوی عبدالحق صاحب کی صدارت میں ایک ادبی جلسہ ہوا جس میں علامہ کیفی دہلوی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سید وقار عظیم، پروفیسر عبدالباسط، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور مولانا زکریا فیاضی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے بلند پایہ مقالات پڑھ کر سنائے۔

مولانا عبدالحق صاحب نے مقالات کی بہت تعریف کی اور یہ اُمید ظاہر کی کہ ان کو شائع کرادیا جائے گا۔ (۲۳)

شملہ میں ترقی اردو کے لیے مختلف انجمنیں مثلاً "بزم اردو"، "بزم کہسار"، وغیرہ پہلے سے ادب کی خدمت کرتی رہی ہیں۔ اور انھیں دنوں بہ نام "ایوان اردو" ارباب ذوق کی ایک مجلس بھی اپنی ادبی محفلوں کے ذریعہ سے ادبی خدمات نجام دے رہی ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب شملہ تشریف لائے۔ چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو شام ساڑھے پانچ بجے وائی ایم سی ہال میں ایک پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ظہیر الدّین اسسٹنٹ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل نے فرمائی۔ جناب غلام جیلانی عاصی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت میں منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ پھر جناب ممدوح نے اردو زبان کی اہمیت اور اس کے قبول عام کو تاریخ کی روشنی میں، بیان کیا۔ آخر میں منجملہ اور قرارداد کے یہ بھی قرارداد منظور ہوئی کہ شملہ میں انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ جس کا الحاق مرکزی انجمن سے ہو جو مرکزی انجمن کی ہدایت پر کاربند ہو۔ (۲۴)

بابائے اردو عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۳۷ء میں پہلی بار اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کے ساتھ ملیبار کا دورہ کر چکے تھے اور بالغوں کی تعلیم کے لیے مختلف مقامات پر شبینہ مدارس قائم کیے۔ موپلا قوم کے سربرآوردہ اصحاب سے مل کر انھیں اردو کی اہمیت سے روشناس کیا۔

ملیبار کے چند ہمدردان اردو کالی کٹ میں اردو کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں کوشاں تھے۔ چنانچہ ۶، ۷ نومبر ۱۹۴۳ء کو کانفرنس کی تاریخ مقرر ہوئی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب ممدوح مع حکیم اسرار احمد کریوی یکم نومبر ۱۹۴۳ء کی شام کو دلّی سے روانہ ہوئے۔ ۲ نومبر

۱۹۴۳ء کی شام کو اراکین انجمن اشاعت اردو اور اردو لٹریری سوسائٹی ناگ پور یونیورسٹی کے عہدیداروں نے ناگ پور اسٹیشن پر آپ سے ملاقات کر کے ناگ پور مجوزہ کل ہند اردو کانفرنس کے متعلق بات چیت کی۔ قاضی پیٹھ میں مولوی علی شبر صاحب حاتمی بھی شریک سفر ہو گئے۔

۳ نومبر ۱۹۴۳ء کی شام کو مولوی صاحب ممدوح اور ان کے دونوں شریک سفر مدراس پہنچے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کے ہاں قیام ہوا۔

۴، ۵ نومبر کو مولوی عبدالحق صاحب ممدوح نے عبدالحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس و دیگر ہمدردان اردو سے مدراس اور خصوصاً ملیبار میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں مشورہ کیا نیز مدراس و ملیبار میں اردو کی تبلیغ و ترویج کے لیے ایک مفصل پروگرام مرتب فرمایا۔

۵ نومبر کی شام کو جناب مولوی صاحب ممدوح۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسل گورنمنٹ کالج مدراس، مولوی محمد حسن صاحب محوی، حکیم اسرار احمد کریوی اور علی شبر صاحب حاتمی کے ساتھ کالی کٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ مدراس اسٹیشن پر موپلا طلبۂ ملیبار مقیم مدراس نے جناب مولوی عبدالحق صاحب ممدوح کو ہار پہنائے اور یقین دلایا کہ وہ ملیبار میں اردو کی اشاعت کے سلسلے میں مولوی صاحب ممدوح کے ہر ارشاد کی سرگرمی سے تعمیل کریں گے۔

۶ نومبر ۱۹۴۳ء کی صبح کو یہ معزز مہمان کالی کٹ پہنچے۔ وہاں اسٹیشن پر خیر مقدم کے لیے کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے اراکین اور عام باشندگان شہر بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ فضا میں فلک شگاف نعرہ "اردو زندہ باد"، "عبدالحق، زندہ باد" کا نعرہ گونج رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنوبی ہند میں ملیبار اردو کا ایک مضبوط مرکز بن کر رہے گا۔ مہمانوں کے قیام کا انتظام خان بہادر اتا کو پاتنگل صاحب ایم ایل اے کے ہاں کیا گیا تھا۔ بنگلور سے حکیم امامی صاحب ایک روز پہلے ہی سے کالی کٹ آ گئے تھے۔ حکیم امامی صاحب بنگلوری نے صدر منتخب کے خیر مقدم میں ایک برمحل اور زوردار نظم پڑھی مولوی مقبول احمد صاحب، صدر مجلس استقبالیہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ملیبار کی تاریخ، عربوں کی آمد، موپلا قوم کی عظمت اور اردو کی اہمیت اور افادیت پر بڑے موثر انداز سے روشنی ڈالی۔

۷ نومبر ۹ بجے صبح کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ موپلا شاعر جناب سرور صاحب نے اردو میں ایک پُرلطف نظم پڑھی۔ اسی دن ۳ بجے صدر محترم اور ان کے رفقا نے جے۔ ڈی۔ ٹی۔ آئی اسکول اور یتیم خانے کا معائنہ کیا۔

۸ نومبر کی صبح جناب مولوی صاحب ممدوح اور ان کے رفقا افضل العلما، سی۔ سی عبدالرحمٰن صاحب کی معیت میں دارالعلوم والے کاٹ کے مدرسے کے معائنہ کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۲ء سے قائم ہے۔ دو سال ہوئے کہ مدرسے میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہے۔

۹ نومبر کی صبح مولوی عبدالحق صاحب ممدوح پرنسپل عبدالحق صاحب حکیم اسرار احمد کریوی، جناب ابوبکر صاحب، ایڈیٹر موپلا ریویو، کالی کٹ اور جناب احمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر کی معیت میں ماپلاپرم تشریف لائے مدرسے کا معائنہ ختم ہونے کے بعد اسکول کے ہال میں سارے طلبہ جمع ہوئے اور جناب پرنسپل عبدالحق صاحب کی صدارت میں جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔

جناب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اساتذہ اور طلبہ سے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ مدرسہ موپلا قوم کا تہذیبی۔ تعلیمی اور تمدنی مرکز ہے۔ پہلے موپلا طلبہ اختیاری مضامین میں عربی اور ملیالم کو ترجیح دیتے تھے لیکن مولوی عبدالحق صاحب کے طفیل

اب ہوا کا رخ بدل گیا ہے اور امسال موپلا طالب علم اردو پڑھنے کی طرف غیر معمولی دلچسپی اور رغبت کا اظہار کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ موپلا قوم کی آئندہ فلاح اور ترقی کا انحصار بڑی حد تک اردو پر ہے۔ صدر صاحب کی تقریر کے بعد ایک بچے نے خوش الحانی سے مہمانوں کا خیر مقدم نظم سے کیا۔ جس کے پہلے تین شعر یہ تھے۔(۲۵)

ہے شہد سے بھی میٹھی اردو زباں ہماری
سچ پوچھیے تو یہ ہے تسکین جان ہماری

دل کا سرور ہے یہ آنکھوں کا نور ہے یہ
اردو زباں کے ہم ہیں، اردو زباں ہماری

ہندوستاں سے چل کر یورپ پہنچ گئی ہے
دنیا پہ چھا رہی ہے اردو زباں ہماری

ماپلا پرم سے سب حضرات ترنیور تشریف لے گئے اور موپلا طالبات کے ہائی اسکول کا معائنہ کیا۔ یہ ملیبار میں موپلا طالبات کا پہلا ہائی اسکول ہے جو ۱۹۴۰ء میں قائم کیا گیا۔ اسکول اور دار الاقامہ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج مدراس کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ صدر صاحب نے مختصر لفظوں میں اسکول کے نظم و نسق کی تعریف کرتے ہوئے اردو کی تعلیم پر خاص طور پر زور دیا۔

۱۰ نومبر کی صبح سارے اصحاب مدراس پہنچے اور وہاں دو دن قیام فرمانے کے بعد عازم حیدر آباد ہوئے۔

حواشی:

(۱)۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۔ مصنفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ لاہور ۱۹۶۶ء ص ۴۸۹
(۲)۔ ماہنامہ "جدید اردو" کلکتہ جنوری ۱۹۴۳ء ص ۵
(۳)۔ ماہنامہ "ہمایوں" لاہور جنوری ۱۹۴۳ء ص ۴-۶
(۴)۔ سہ ماہی "فکر و نظر" علی گڑھ ج: ۱۹۸۶۲۳ء (نامورانِ علی گڑھ) ص ۱۷۸ رسالہ اردو بابائے اردو نمبر ص ۱۵
(۵)۔ ہمایوں۔ جنوری ۱۹۴۳ء ص ۳
(۶)۔ قومی زبان۔ بابائے اردو نمبر اگست ۱۹۶۳ء ص ۱۰۴-۱۰۵
(۷)۔ تا (۱۰)۔ سالانہ رپورٹ ۱۹۴۳ء ص ۳۵
(۱۱)۔ ہماری زبان مارچ ۱۶، ۱۹۴۳ء ص ۹
(۱۲)۔ اردو، سہ ماہی اپریل ۱۹۴۳ء ص ۲۳۶
(۱۳) مکاتیب عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی صاحب اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص ۱۲

(۱۴)۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو۔ مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی۔ کراچی ص ۱۲۱۔ ۱۲۲
(۱۵) ہماری زبان۔ فروری ۱۶، ۱۹۴۳ء ص ۱۰
(۱۶) تا (۱۹)۔ سالانہ رپورٹ ۴۳ء ص ۳۶۔ ۳۷
(۲۰) تا (۲۱)۔ مکتوب بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء ص ۱۳۵۔ مکاتیب عبدالحق نیز سالانہ رپورٹ ۱۹۴۳ء ص ۳۷۔ ۳۸
(۲۲)۔ سالانہ رپورٹ ص ۳۸
(۲۳)۔ ہماری زبان یکم جون ۱۹۴۳ء ص ۷
(۲۴) ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۴۳ء ص ۹ و یکم دسمبر ۱۹۴۳ء ص ۶، ۷، ۸
(۲۵) تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو ص ۱۲۵

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

جملہ معترضہ

ابن الحسن

صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۰۰/ روپے

فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی

جناب ابن الحسن کا شمار اردو کے ممتاز، متین اور صاحبِ طرز کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھیں اردو اور انگریزی دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ قومی معاملات و مسائل میں ان کے تجزیے بے لاگ، فکر انگیز اور حقیقت پسندانہ انداز کے حامل ہوتے ہیں۔ ابن الحسن صاحب چونکہ صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بڑی شگفتہ اور دلاویز نثر لکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے کالموں سے صرف قوم کے سیاسی اور معاشرتی نشیب و فراز کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ بیان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ بات اگر سلیقے سے کہی جائے تو اس کا اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہی کیفیت ابن الحسن صاحب کے کالموں کی بھی ہے ایک تو قومی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ، دردمندی، خلوص اور راست بازی دوسرے ان کی نثر کا دل موہ لینے والا انداز۔ ان کے کالم قارئین میں بہت مقبول ہیں اور ان کی آرا و خیالات کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

"جملہ معترضہ" ابن الحسن صاحب کے ۴۳ کالموں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور آٹھ برس کے عرصے پر محیط ہیں۔ آٹھ برس کے عرصے میں جو کالم لکھے گئے اور شائع ہوئے ان میں سے ۴۳ کو رفیع الزماں زبیری نے منتخب کر کے "جملہ معترضہ" کے نام سے شائع کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۴۰۰ کالموں میں جو سب اپنی جگہ بہترین ہیں تھوڑے سے کالموں کا انتخاب ایک مشکل کام تھا مگر اس مشکل کام کو انھوں نے بڑے سلیقے اور خوبصورتی سے انجام دیا ہے۔

"جملہ معترضہ" کے مطالعے سے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۱ء تک کے سیاسی اور معاشرتی ماحول کی بوالعجبیوں کا ایک بڑا سچا خاکہ نظروں کے سامنے آتا ہے۔ یہی خاکہ آگے چل کر لکھی اور بن لکھی تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔ ابن الحسن صاحب کے ان کالموں میں راست مورخ کی دیانت، مخلص وطن دوست کا خلوص اور دردمندی اور ادیب کا بانکپن یکجا نظر آتا ہے۔ ان میں پاکستان کے ہوش مند عوام کے دلوں کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ پاکستان کا کوئی سیاسی اور معاشرتی جائزہ ان کالموں کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

پاکستان زندہ باد

سیّد انصار ناصری
صفحات ۲۰۸ قیمت = /۱۵۰ روپے
دیا پبلی کیشنز اسلام آباد

۳ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو سے قائداعظم محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریریں نشر ہوئی تھیں۔ قائداعظم کی تقریر قیام پاکستان کا اعلان تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب آل انڈیا ریڈیو نے مسلمانوں کے اس عظیم رہنما کو تقریر کی دعوت دی تھی۔ قائداعظم کی تقریر کا اعلان ہوتے ہی برصغیر کے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی تھی اور سارا ملک ان کے ارشادات عالیہ کی سماعت کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔

عام لوگوں کا جو حال ہوا ہو سو ہوا ہو خود آل انڈیا ریڈیو کے مسلمان عملے میں بھی مسرت، استعجاب اور احساس ذمہ داری کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر غیر معمولی اہتمام ہوا۔ مسلمان عملے نے کیسے ذوق و شوق سے قائداعظم کی پذیرائی اور ان کے نشریے کے لیے اہتمام کیا۔ تقریر کے اردو ترجمے کے لیے اہتمام کیا۔ تقریر کے اردو ترجمے کے لیے کیا کاوش کی گئی۔ یہ ساری روداد انصار ناصری نے جو اُس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ تھے بڑے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں قلم بند کی ہے۔ ناصری صاحب کو قائداعظم کی تقریر کا ترجمہ کرنے اور ترجمہ نشر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی چنانچہ انھوں نے ایک محرم راز کی حیثیت سے اپنے تاثرات آل انڈیا ریڈیو کی فضا اور عوامی جذبات و تاثرات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

انصار ناصری کہنہ مشق ادیب ہیں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہ روداد ان کی اپنی ذاتی روداد ہے عقیدت، محبت اور خلوص پر مبنی ہماری قومی تاریخ کا لازوال سرمایہ بڑا اچھا ہوا کہ قومی تاریخ کے اس پہلو کو ایک ایسے ادیب اور مورخ نے محفوظ کر دیا ہے جو بذات خود اس کا ایک حصّہ تھا۔ ناصری صاحب نے ۳ جون کی اہم تقریروں کے ترجمے اور ان کی روداد کے ساتھ اہم جلسوں کے چشم دید حالات بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان جلسوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے تاریخی اجلاس منعقدہ ۹ جون ۴۷ء کی روداد اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۴، ۱۵ جون کی روداد کا مطالعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ ناصری صاحب نے یہ رودادیں پوری دیانت داری اور سنجیدگی سے قلم بند کی ہیں۔

ناصری صاحب نے تقسیم ہند کے مراحل کو بھی مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ یہ موضوع بڑا اہم اور تاریخ کی بڑی کتابوں کا حصّہ رہا ہے۔ ناصری صاحب نے جو کچھ دیکھا ہے۔ اُسے بڑے دلچسپ انداز سے مرتب کر دیا ہے۔ چونکہ وہ ان سارے مراحل میں شریک تھے اس وجہ سے ان کا بیان بڑا معتبر اور مستند ہے۔

ضمیمے کے طور پر بعض تقریروں کے انگریزی متن بھی کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں جس سے افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

"پاکستان زندہ باد" ایک معلومات افزا، دلکش اور تاریخی حوالے کی مستند کتاب ہے۔ انصار ناصری صاحب نے اسے مرتب کر کے ایک قومی فریضہ انجام دیا ہے۔

لالۂ اردو۔ مولانا اخگر سرحدی

ہارون الرشید تبسم

صفحات ۹۶ قیمت -/۳۰ روپے

دیدہ ور اکیڈمی (کوٹ فرید) سرگودھا

مولانا اخگر سرحدی کا انتقال اب سے دو برس پہلے ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء کو سرگودھا میں ہوا۔ اُن کے رفیق خاص جناب ہارون الرشید تبسم نے ان کے فن و شخصیت پر یہ کتاب چھاپی ہے۔ بزرگوں کو یاد رکھنے کا ایک بہتر طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے کارہائے گراں مایہ کو یکجا کر دیا جائے۔

مولانا اخگر سرحدی کی سب سے اہم پہچان استواری کے ساتھ اردو سے وفاداری ہے اور یہ سبق انھوں نے جنوری ۱۹۴۰ء میں حاصل کیا۔ جب پہلی کل ہند اردو کانفرنس دہلی میں سرحد کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کے لیے گئے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی معیت میں ملک بھر کا دورہ کیا مولانا اخگر سرحدی میں اردو سے محبت کی آگ مولوی عبدالحق صاحب کی معیت میں مرحمت ہوئی اور آخری عمر تک اُن کے سینے میں اُسی آب و تاب سے روشن رہی۔

مولانا اخگر سرحدی کی خدمات فروغ اردو کے سلسلے میں وسیع ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو سرگودھا کے صدر، تحریک نفاذ اردو کے مجاہد اور انگلیوں پر گنے جانے والے اردو کے وفاداروں اور بے لوث خدمت گزاروں میں سے تھے۔ پاکستان میں اردو کے فروغ و نفاذ کے سلسلے میں جب بھی جہاں کہیں ذکر ہوگا، مولانا اخگر سرحدی کا نام ضرور احترام سے لیا جائے گا۔

مولانا اخگر اردو کے خاموش کارکن کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ پروفیسر ہارون الرشید نے اُن کی اس صلاحیت کی صرف ایک جھلک دکھائی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کے کلام کا ایک جامع مجموعہ بھی کتابی صورت میں شائع ہو اور یہ کام بہ حسن و خوبی ہارون الرشید صاحب ہی کر سکتے ہیں کہ وہ برسوں مولانا اخگر کے شریک کار رہے۔ انھوں نے اُن کی کارکردگی اور اردو کے کاز سے بے لوث محبت کو دیکھا ہے۔ مولانا کے اس جذبے سے یہ سبق ہارون الرشید صاحب نے بھی لیا ہوگا جو بے جزا و سزا آدمی کو کام کرتے رہنے پر کاربند کرتا ہے۔

(ا۔ س)

جوش ملیح آبادی کی نادر غیر مطبوعہ تحریریں

ڈاکٹر ہلال نقوی

صفحات ۱۶۰ قیمت -/۱۵۰ روپے

حیات اکیڈمی۔ سی ۲۳، بلاک ۶ فیڈرل بی ایریا کراچی

مشاہیر کے ادبی کاموں کو دست بردِ زمانہ سے بچالینا اور پھر اُسے یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دینا بذاتِ خود ایک اہم اور قابلِ ستائش کام ہے۔ اور یہ کام جناب ہلال نقوی ایک عرصے سے دلجمعی سے انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ علامہ جمیل مظہری کے بکھرے ہوئے شعری کارناموں کو "جمیل مظہری کے مرثیے" (۱۹۸۸ء) "مثنوی آب و سراب" (۱۹۸۹ء) اور "مسدس فریاد و جواب فریاد" (۱۹۸۹ء) کی شکل میں شائع کر چکے ہیں۔ آخر الذکر کتاب "شکوہ جواب شکوہ" کی طرز پر لکھی گئی ہے جس میں

انسان کا شکوہ فریاد کی لے میں اللہ سے کیا گیا ہے۔

اب جناب ہلال نقوی جوش ملیح آبادی کی طرف آئے ہیں۔ ان پر کئی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا ارادہ رکھتے ہیں جن میں سے چند ایک طباعت کے مراحل میں ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، جس کام کی ابتدا اتنی وقیع ہے۔ توقع رکھنا چاہیے کہ اس کا اختتام بھی شایان شان ہو گا۔ اس طرح کا ادبی کام صبر آزما ہوتا ہے، اس کے لیے جستجو اور مسلسل جستجو درکار ہوتی ہے۔ اس میدان میں وہی اُتر سکتا ہے جو آڑے آنے والی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو، قدرت کی طرف سے ہلال نقوی صاحب کو یہ صلاحیت وافر ودیعت ہوئی ہے۔

اس کتاب کو مضامین کے اعتبار سے تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصّے میں ملی جلی تحریریں ہیں، دوسرے حصّے میں غیر مطبوعہ مکتوبات ہیں اور تیسرے حصّے میں جوش صاحب کا غیر مطبوعہ کلام ہے۔ سب کے سب مطالعے کے لحاظ سے قارئین کے لیے مغتنمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہی پڑھنے کی بے کلی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اُس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں حضرت جوش بہ ہر عنوان دیکھنے کو ملتے ہیں۔

علّامہ اقبال کے بعد اس عصر کو سب سے زیادہ جوش نے متاثر کیا ہے۔ ناقدین اب جوش کے کلام کی بازیافت اور ان کے فن کی قدر و قیمت متعین کرنے کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ جوش کی نصف صدی سے زائد مدّت تک کی ادبی خدمات کا اعتراف اسی طرح کیا جا سکتا ہے ہلال نقوی کی اس تصنیف کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

کتاب قرینے سے چھپی ہے۔

(ا۔س)

گرفت

یٰسین افضال

صفحات ۱۱۲ قیمت = /۶۵ روپے

مکتبہ فکر نو ۲۔ سی۔ اشفاق پلازہ فاطمہ جناح کالونی ایم اے جناح روڈ کراچی

"گرفت" جناب یٰسین افضال کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پانی پتھر" شائع ہو کر قارئین سے تحسین حاصل کر چکا ہے۔

یٰسین افضال جدید حسّیت کے شاعر ہیں، اشیاء کو دیکھنے، پرکھنے کا اپنا پیمانہ ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ عقلیاتی، روحانی، مکانکی اور سائنسی نظاموں میں جو آویزشیں اور تصادمات جاری ہیں اور ان کی وجہ سے جو انسان کے باہر اور اندر کا، ایک ٹوٹ پھوٹ، بدہیئتی اور مسخ صورت حال سے واسطہ ہے، اُن کو حیطۂ اظہار میں لایا جائے۔ ایسا کرنے میں یٰسین افضال صاحب اپنی نظموں میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس راہ میں امکانات کے دروازے ہر چہار طرف کھلے ہوئے ہیں۔

اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا ہے۔ وہ وقت کو MULTI DIMENSION (مختلف الابعاد) کہتے ہوئے تخلیق کار سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ وقت کے تمام ابعاد پر نگاہ رکھے اور ان کا طواف کرتا رہے ورنہ اس کا فن یک رُخا اور جامد ہو

جائے گا۔ اُن کا خیال ہے کہ تخلیق کار کے حق میں کسی ایک جگہ کھڑا ہو جانا سمِ قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اُنھیں "گرفت" کے شاعر یسٰین افضال ایک جگہ ٹھہرے ہوئے نظر نہیں آتے۔

"پانی پتھر" اور "گرفت" کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیں تو صاف معلوم ہوگا کہ یسٰین افضال کے ہاں ارتقا کا عمل جاری ہے۔ فکری سطح پر بھی اور اسلوبی سطح پر بھی۔

کتاب دیدہ زیب شائع ہوئی ہے۔ یہ اس کی ایک اضافی صفت ہے۔

(ا۔س)

فضل احمد کریم فضلی.... شخصیت اور فن

سیّد جاوید اقبال

صفحات ۱۹۴ قیمت = /۶۰ روپے

قصر الادب۔ حیدر آباد

"فضل احمد کریم فضلی... شخصیت اور فن" سیّد جاوید اقبال کا ایم اے اردو کا مقالہ ہے جو اپریل ۱۹۸۷ء میں لکھا گیا اور اب کتابی صورت میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں ایک تحقیقی کتاب کی شان پائی جاتی ہے۔

سیّد جاوید اقبال نے فضلی صاحب کی شخصیت و فن کے حوالے سے خاطر خواہ معلومات یکجا کر دی ہیں۔ فضلی صاحب کی وجہِ شہرت اُن کی ناول نگاری اور شاعری ہے۔ کتاب میں ان کے مشہور ناول "خون جگر ہونے تک" پر تفصیل سے باتیں کی گئی ہیں۔ یہ ناول ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال اور اُس دوران میں رونما ہونے والے المناک واقعات سے تعلق رکھتا ہے، اس ناول میں سچائی کا عنصر بیش از بیش اس لیے ہے کہ فضلی صاحب ناول کے منظر و پس منظر کے عینی شاہد ہیں وہ سول سروس کے آدمی تھے اور اس ناتے انھوں نے بیس برس تک بنگال کے مختلف اضلاع میں ضلع کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد فضلی صاحب کی تقرری ڈھاکے میں ہوئی انھوں نے ۱۹۵۰ء کے آس پاس ڈھاکہ میں کل پاک و ہند مشاعرے کروائے، اُن کی موجودگی میں ڈھاکے کی ادبی محفلوں میں خاص رونق آگئی تھی۔ شاعری میں فضلی صاحب کا شمار ایک اچھے غزل گو میں ہوتا ہے۔ انھیں جگر مراد آبادی سے عقیدت و ارادت تھی۔

فضلی صاحب کے تین شعری مجموعے "نغمۂ زندگی"، چشمِ غزال" اور "جمالِ غزل" اور دو ناول "خونِ جگر ہونے تک" اور "سحر ہونے تک" اُن سے یادگار ہیں۔ فضلی صاحب کے باب میں سیّد جاوید اقبال کی مذکورہ کتاب کو اوّلیت حاصل ہے۔ یہاں اُن کی تحقیقی صلاحیت کے ساتھ ناقدانہ نظر بھی سامنے آئی ہے۔ توقع رکھنی چاہیے کہ یہ روایت دوسروں سے بھی آگے بڑھے گی۔

(ا۔س)

نونہال (خاص نمبر)

صفحات ۲۸۸ قیمت = /۱۵ روپے

ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاکخانہ ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

گزشتہ دس برسوں سے "ہمدرد نونہال" (خاص نمبر) ہر برس برابر آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ حسب روایت یہ

خاص نمبر اُسی شان و شوکت سے اس برس بھی منظر پر آیا ہے۔ جو عید الاضحیٰ پر تمام بچوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ اس خصوصی نمبر میں بزرگ اور محترم شخصیات و شعرا اور ادیبوں کے ساتھ لکھنے والوں کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔

بچوں کے اس رسالے میں ایک طرف صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی نظم "آنکڑا بانکڑا"، مرزا ادیب کی تخلیق "باپ اور بیٹا" اور احمد ندیم قاسمی کی تخلیق "جلیبیاں" شامل ہیں تو دوسری طرف شکیل فاروقی کی "گروی آنکھ" کتابوں سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے بچوں کے لیے ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا ہلکا پھلکا مضمون "میں لائبریرین ہوں" بڑا ہی دلچسپ اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہب، سائنس، سیر و سیاحت، ملکی و غیر ملکی معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی اس میں موجود ہے جس سے بچوں کے علاوہ بڑے بھی مستفید ہوں گے۔ جناب حکیم محمد سعید، جناب مسعود احمد برکاتی، جناب شان الحق حقی جیسے لوگوں کی بچوں کے لیے تخلیقات خاصے کی چیزیں ہیں۔ جو تمام بچوں کی ذہنی نشوونما میں معاون ہوں گی اور زندگی کی صحیح سمت کے تعین میں خصوصی طور پر رہنمائی کریں گی۔

رسالے کا ٹائٹل حج کے مبارک اور متبرک موقع کی مناسبت سے اس کی اہمیت کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔ رسالے کی طباعت اچھی ہے جو آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ اسکول کی تعطیلات کی وجہ سے یہ خاص نمبر طلبہ کے خالی اوقات میں ان کا ایک اچھا ساتھی ثابت ہوگا۔

(شہاب قدوائی)

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

جوش ملیح آبادی۔ تنقیدی جائزہ/ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

جوش ملیح آبادی ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن کی محنت ان کی زندگی میں رنگ لائی اور ان کے سر پر شہرت کا آفتاب ابھرا تو ان کی وفات کے لمحے تک چمکتا رہا۔ پاکستان اور بھارت میں ان کے عقیدت مندوں کی اتنی بڑی تعداد پیدا ہو گئی کہ ان کی وفات کے بعد ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ دوسرے چوتھے برس ان پر کوئی نہ کوئی نئی کتاب چھپ جاتی ہے۔ لیکن ایک فرق واضح ہے کہ اب جوش صاحب پر محض تعریف و تحسین ہی نچھاور نہیں کی جاتی بلکہ انھیں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا بھی جاتا ہے اور نقادان پر کڑوی کسیلی نظر ڈالنے کی جرأت بھی کر لیتا ہے۔ چنانچہ جوش کے حسن و قبح کے زاویے ہی آشکار نہیں ہو رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حقیقی جوش کی دریافت و بازیافت صحیح معنوں میں ان کی وفات کے بعد شروع ہوئی ہے۔

اس کی ایک مثال زیر نظر کتاب "جوش ملیح آبادی۔ تنقیدی جائزہ" ہے جس کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم تحقیق میں اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو تلاش صداقت کے لیے بہت دور تک جانے اور گہرائی میں غوطہ لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ تحقیق ان کی تنقید کے علاوہ تالیفی کاموں میں بھی سما گیا ہے اور اس کے کچھ آثار زیر نظر کتاب میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں مسعود حسن خان، وارث علوی، سید حامد، کاظم علی خان، گوپی چند نارنگ، صبا اکبر آبادی، رشید حسن خان، تارا چرن رستوگی اور متعدد دوسرے ادبا کے تنقیدی مضامین شامل ہیں اور ان میں سے بیشتر اس زاویۂ خیال سے لکھے گئے ہیں کہ جوش کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور ان سے جوش کا وہ امیج سامنے آجائے جو ان کی شاعری سے مرتب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں ڈاکٹر خلیق انجم ہی کی مثال دوں گا۔ انھوں نے "حرفِ آغاز" میں موازنۂ جوش و اقبال کیا ہے تو تمہیداً یہ بھی لکھا ہے کہ:

> "اردو کے عظیم شاعروں کی فہرست میں صرف چار نام آتے ہیں۔ میر۔ غالب، انیس اور اقبال اس کے بعد دوسری فہرست بڑے شاعروں کی ہے۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام جوش ملیح آبادی کا ہے۔ اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ہیں۔"

اب "موازنۂ جوش و اقبال" میں ڈاکٹر خلیق انجم کی حقیقت نگاری اور اظہارِ رائے کی پختگی ملاحظہ کیجیے:

"علامہ اقبال کے یہاں تفکر، نظامِ حیات کے بارے میں باقاعدہ فلسفہ اور سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔ جوش کے یہاں بھی تفکر ہے لیکن علامہ اقبال کے مقابلے میں کم درجے کا ہے۔ جوش انسان دوست ہیں، غریبوں کے ہمدرد ہیں، سامراج دشمن ہیں لیکن ان کے لہجے میں سنجیدگی کے بجائے وہ تلخی اور ترشی ہے جو ان کی بات کو دل نشین نہیں ہونے دیتی۔"

جوش کی نجی زندگی کا زاویہ سامنے آیا تو ڈاکٹر خلیق انجم نے جوش .. صاحب کے حیدر آباد کے قیام پر بھی اپنی رائے بے لاگ انداز میں دی اور لکھا:

"جوش نے "یادوں کی برات" میں کچھ بھی لکھا ہو اور کتنی ہی مجبوریاں بیان کی ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جوش صرف تلاشِ جاہ و منصب و دولت میں حیدر آباد گئے تھے۔ ان کے آئیڈیل اپنے والد نہیں بلکہ پر دادا فقیر محمد خان گویا تھے۔ جوش تلوار اٹھانے کے قابل تو نہیں تھے لیکن وہ خود کو اس قابل ضرور سمجھتے تھے کہ حیدر آباد کے نواب میر عثمان علی خان کے دربار سے توسّل حاصل کر سکیں۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کے نزدیک جوش کی دوسری غلطی ہجرتِ پاکستان تھی۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"ممکن ہے کہ پاکستان جا کر انھیں مالی اعتبار سے فائدہ ہوا ہو لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت بُری طرح متاثر ہوئی۔ جوش مالی اعتبار سے بالکل آسودہ تھے لیکن مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس نے انھیں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ کراچی کے چیف کمشنر سیّد ابو طالب نقوی نے انھیں سینما ہال، مکان اور پلاٹ وغیرہ کا لالچ دے کر پاکستان بلوالیا۔"

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ خلیق انجم صاحب نے اس کتاب میں جوش کو بطور انسان اور بطور شاعر پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو ان کی بشری خامیوں سے اغماض نہیں برتا اور شاعری میں تحسین و ستائش کے ساتھ تنقید و تبصرہ دونوں کو اہمیت دی ہے۔ مقالہ "شاعرِ حریت و فطرت۔ جوش ملیح آبادی" میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اعتراف کیا ہے کہ:

"بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبال کے بعد جتنی عزت، شہرت اور مقبولیت جوش کو نصیب ہوئی، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی .... باغیانہ اور منظریہ شاعری دونوں میں انھوں نے ایسے شاہکار چھوڑے ہیں جن کے کلاسیکی رچاؤ، حسن کاری اور تابناکی کے نقش کو زمانہ آسانی سے دھندلا نہ سکے گا۔"

ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے مقالے میں "جوش کی شاعری اور اہمیت" آشکار کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ "جوش کی شاعری کا سماجی پہلو بہت اہم ہے۔ وہ طبعاً انسان دوست ہیں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا شدید احساس رکھتے ہیں، حریت، مساوات اور اخوت کے اصول ان کو زیادہ عزیز ہیں۔"

بشیر الدین احمد نے جوش کی شخصیت کو ان کے اشعار کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ صبا اکبر آبادی نے جوش کو اپنی یادوں اور ملاقاتوں سے دریافت کیا اور ان کی شخصیت اور شاعری کا ایک دلکش نقش ابھار دیا۔ کاظم علی خان نے جوش کے مراثی

سے جدید اردو مرثیے کے خدوخال متعین کیے ہیں. ایک دلچسپ مضمون جو ذاتی حوالوں سے لکھا گیا ہے وہ رفعت سروش کا ہے، اس کا عنوان ہے "جوش کا اثر میری شخصیت اور شاعری پر"

نامی انصاری اور سید حامد کے علاوہ تارا چرن رستوگی کا مضمون "یادوں کی برات" کے حوالے سے ہے. اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ "یادوں کی برات" جوش کی اپنی شخصیت کا ہو بہو عکس ہے جس میں پیچ و خم اور جلال و جمال کی آمیزش ہے جوش کی شخصیت کی جو تعمیر ہوئی تھی وہی لفظوں میں ڈھل کر "یادوں کی برات" بن گئی ہے۔" اس کتاب کا ایک قیمتی مضمون رشید حسن خان کا ہے "جوش کی شاعری میں لفظ اور معنی کا تناسب" ہے۔ انھوں نے شاعری میں جوش کی مرصع کاری اور لفظ آرائی کو بہت سی خرابیوں کا باعث قرار دیا ہے، لیکن ان کا ایقان ہے کہ یہ مرصع کاری اور لفظ آرائی ان کی نثری کتاب "یادوں کی برات" کو بے مثال دلکشی بخشتی ہے۔

کاظم علی خان کی کتاب "جوش شناسی" جو لکھنؤ سیمینار کے مقالات پر مشتمل ہے کے بعد زیر نظر کتاب جوش کے فن اور شخصیت کو توازن و اعتدال سے متعارف کرانے کی عمدہ کاوش ہے۔ اس کتاب میں جوش ہمارے سامنے اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت آتے ہیں لیکن ان کا مجموعی تاثر مثبت مرتب ہوتا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

حافظ محمود شیرانی....... تحقیقی مطالعے / مرتبہ پروفیسر نذیر احمد

حافظ محمود شیرانی اردو اور فارسی زبان و ادب کے ایک ایسے محقق تھے جن سے تحقیق کے ایک مخصوص دبستان کی بنیاد پڑی۔ اس دبستان کے محققوں نے داخلی شہادت کو اہمیت دی اور مفروضات سے قطع نظر کرتے ہوئے اصل حقیقت تلاش کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ محمود شیرانی کو اس دبستانِ تحقیق میں استادِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا معرکہ آرا کارنامہ "پنجاب میں اردو"، "خالق باری" کے متن کی تحقیق اور اس کے مصنف کے بارے میں انکشافات بھی اعلیٰ مقام ہیں، اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں ان کا نظریہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نظریے کو سب محققین نے قبول نہیں کیا اور اختلاف کے کئی زاویے موجود ہیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نظریے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی۔ اور شیرانی کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل حافظ محمود شیرانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں دور و نزدیک سے بہت سے محقق، نقاد اور ادبا شامل ہوئے، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر خلیق انجم، محمد انصار اللہ، سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر بھگوت سروپ، صاحبزادہ شوکت علی خان اور متعدد دوسرے ادبا نے مقالے پڑھے۔ ان مقالات کا مجموعہ "حافظ محمود شیرانی.... تحقیقی مقالات" کے عنوان سے چھپ گیا ہے اور اس وقت زیر نظر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب اگرچہ حافظ محمود شیرانی کے بارے میں ہے لیکن وہ خود اس میں شریک ہیں۔ ان کا ایک نایاب مضمون "آلات آتش بازی" جو انھوں نے زمانۂ ملازمت میں لکھا اور بوجوہ نامکمل رہا پہلی دفعہ اس کتاب میں منظرِ عام پر آیا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور قیمتی مضمون پروفیسر بھگوت سروپ نے لکھا ہے۔ وہ تقریباً ساٹھ برس قبل شیرانی صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اس دور کی یادیں تازہ کی ہیں جب شیرانی صاحب اورینٹل کالج لاہور میں علم و فضل کے جواہر بے دریغ تقسیم کرتے تھے۔ مثلاً ان کا طریق تدریس یہ تھا کہ پہلے پورے اہتمام سے متن کی تصحیح اور قدما کے کلام کا مقابلہ قدیم مخطوطات سے کرتے پھر کتابت اور طباعت کی اغلاط کی طرف متوجہ کراتے۔ شاعری اس طرح پڑھاتے کہ طلبہ کا علم الفاظ کے معنی اور شعر کے

مفہوم تک محدود نہ رہے بلکہ شاعر کا پورا مافی الضمیر قاری کو منتقل ہو جائے۔ فارسی ادب کی تدریس کے لیے شیرانی صاحب کے نزدیک کسی استاد کا ایران کی مفصل تاریخ سے واقف ہونا لازمی تھا، تاکہ اسے ان سلاطین اور امرا کے حالات سے آگاہی ہو جائے جن سے شعراوابستہ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک "تحقیق بلاتدقیق" بے معنی تھی۔

یہ کتاب کل تیرہ مقالات پر مشتمل ہے۔ سیّد امیر حسن عابدی نے "تنقیدِ شعر العجم" کا جائزہ لیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے حافظ صاحب کے قیامِ لندن کی معلومات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر ضیا الدّین ڈیسائی نے "دبستان شیرانی" کے عناصر تحقیق دریافت کیے ہیں۔ مظہر محمود شیرانی نے ان کے اسلوب پر اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ان کی تاریخی حسّیت پر مقالے پیش کیے ہیں۔ اردو زبان اور نظریۂ شیرانی کے سلسلے میں عبد الغفار شکیل اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے مضامین شریکِ اشاعت ہیں۔ بقول پروفیسر نذیر احمد ان مقالات میں کافی تنوّع ہے اور ان سے مجموعی طور پر شیرانی کے علم و فضل، ان کی غیر معمولی محققانہ صلاحیت، اندازِ تحقیق اور فارسی زبان و ادب پر قدرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ نے دہلی سے شائع کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی پر یہ پہلی جامع تالیف ہے۔

پہچان اور پرکھ/آل احمد سرور

آل احمد سرور صاحب کا ارشاد ہے کہ "ادب کی تنقید، ادب سے ہمدردی اور محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہ محبت ایک عرفان عطا کرتی ہے۔ صرف جذباتی نہیں ہوتی۔ یہ محبوب کے روئے روشن کو ہی نہیں دیکھتی چاند کے دھبے بھی دیکھتی ہے۔ تخلیق کے تجربے میں قاری کو شریک کرتی ہے۔ فنکار کے روحانی سفر میں اس کی ساتھی ہے۔"

ادب سے محبت کا یہ عمل آل احمد سرور کی تنقید کا ایک بے حد روشن پہلو ہے اور اس کے بیشتر نقوش ان کی زیر نظر کتاب "پہچان اور پرکھ" میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ ادب میں نظریے کو خلاقانہ انداز میں شعر میں سمونے کے قائل ہیں۔ انھوں نے تنقید میں اپنے طریق کی وضاحت اقبال کے اس مصرعے سے کی ہے:

"آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں"

لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے نظریے سے زیادہ نظر سے سروکار رکھا ہے اور لفظ کی اس جادوگری کو نمایاں کیا ہے جو مواد اور ہیئت کے مخصوص نامیاتی فارم میں موجود ہوتی ہے۔ "پرکھ اور پہچان" میں فراق، جوش، فانی، حسرت، انیس، غالب اور میر جیسے شعرا پر تنقید کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری کی دریافت میں بیشتر شخصیت کو اساس بنایا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آل احمد سرور نے نتیجے کا انعکاس اپنی شخصیت کے آئینے سے کیا ہے اور تاثر کی اس تابانی کو ابھارا ہے جس کی کرنیں خود ان کے اپنے دل سے پھوٹتی ہیں، اس تاثر کو دو آتشہ بنانے کے لیے انھوں نے لطیفے سے کام لینے کی سعی بھی کی ہے۔ ہر چند تنقید لطائف و ظرائف کی متحمل نہیں ہوتی لیکن سرور صاحب جب شاعر کی دریافت کے لیے اس کی شخصیت کو اساس بناتے ہیں تو واقعے اور لطیفے کے استعمال کا محل بھی پیدا کر لیتے ہیں اور یوں مسکراہٹ کا جگنو چمکا کر وہ مشکل تنقید کا اگلا آسان قدم اٹھا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مقالہ "جوش کی شخصیت اور شاعری" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> جوش نے عقلیت پر بڑا زور دیا ہے۔ عقلیت پر زور کے سلسلے میں مجھے ایک پٹھان کا لطیفہ یاد آیا۔ خان عبد الغفار خان کے اثر سے سرحد کے پٹھانوں میں عدم تشدد کا چرچا

شروع ہوا۔ خدائی خدمتگاروں کا ایک جلسہ تھا جس میں گاندھی جی کے اہنسا کے نظریے پر تقریریں ہو رہی تھیں۔ ایک پٹھان بار بار مقرروں کو ٹوکتا تھا۔ والینٹر پٹھان نے پہلے تو اسے منع کیا لیکن جب وہ نہیں مانا تو اسے گولی مار دی۔ جوش کی عقلیت کی تلقین بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ "مانو ورنہ جہنم میں جاؤ" مشتاق احمد یوسفی نے ایک جگہ اختر شیرانی اور جوش کے عشق پر نہایت پرلطف انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ "اختر شیرانی محبوب سے اس طرح التجا کرتے ہیں جیسے بچہ مٹھائی مانگتا ہے۔ اور جوش معشوق سے اس طرح وصل کا تقاضا کرتے ہیں جیسے پٹھان اپنا قرض وصول کرتا ہے۔"

"پرکھ اور پہچان" میں آل احمد سرور نے چند نظریاتی موضوعات پر بھی مقالے لکھے ہیں۔ ان میں "ادب میں قدروں کا مسئلہ"، "شاعری اور نثر کا فرق"، "تنقید میں انتخابی نظریے کی ضرورت"، "اردو شاعری میں انسان کا تصور"، چند اہم موضوعات ہیں۔ سرور صاحب نے اپنے مخصوص جمالیاتی اسلوب میں ان مضامین پر اس طرح قلم اٹھایا ہے کہ بہت سے مشکل مقامات خارِ مغیلاں بننے کے بجائے دستۂ گل بن گئے ہیں۔ قاری انھیں پڑھنے میں نظافت محسوس کرتا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کی ہے۔

RICE

گردوپیش

اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے صدر مملکت آرڈی نینس جاری کریں، صدر تحریک نفاذ اردو

صدر تحریک نفاذ اردو پاکستان چوہدری احمد خان علیگ جو کہ آج کل نفاذ اردو مہم کے سلسلے میں ملک گیر دورے پر ہیں نے بہاولنگر میں اپنی آمد کے موقع پر اخبار نویسوں کو بتایا کہ اردو آرڈیننس کے اجراء کے لیے صدر مملکت اور وزیراعظم کے نام مختلف طبقات کے نمائندہ افراد کی جانب سے برقی اور پوسٹل تاریں بھجوائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک ہزاروں تاریں بھجوائی جا چکی ہیں۔ چوہدری احمد خان علیگ نے کہا کہ وہ جہاں جاتے ہیں اپنی تنظیم کی شاخ بھی قائم کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے قیام کے دوران اراکین اسمبلی، بلدیاتی کونسلروں، وکلاء، اساتذہ، سیاسی و سماجی رہنماؤں اور صحافیوں سے بھی رابطہ رکھتے ہیں تاکہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ۱۹۹۱ء میں اردو بل قومی اسمبلی کو بھجوایا گیا تھا جب کہ پنجاب اسمبلی اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے انگریزی کی جگہ اردو بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کی پرزور سفارش کر چکی ہے۔

(بشکریہ "اخبار اردو" جون ۹۳ء اسلام آباد)

تقریب میں اردو میں خطاب

گزشتہ روز لاہور میں گورنر بلوچستان گل محمد خان جوگیزئی نے روٹری کلب کے جلسے میں تقریب کی کارروائی انگریزی میں شروع ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم تلاوت قرآن پاک انگریزی میں نہیں ہوئی بلکہ عربی میں کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ اس تقریب میں اردو میں خطاب کر رہے ہیں ورنہ بلوچستان میں بھی ایسی تقاریب انگریزی میں ہوتی ہیں حالانکہ وہاں انگریزی سمجھنے والے بہت کم ہیں۔

(بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد جون ۹۳ء)

"نوائے وقت" کا مطالعہ کرتا ہوں"، فرانسیسی سفیر

پاکستان میں متعین فرانس کے سفیر جین پیٹر ماسٹ نے کہا ہے کہ وہ پاکستان کے اردو روزنامہ "نوائے وقت" کا روزانہ

مطالعہ کرتے ہیں۔ جنرل ریٹائرڈ حبیب اللہ خان کے صاحبزادے رضا قلی خان کو فرانس کا ایوارڈ فرنچ نیشنل میرٹ ایوارڈ دینے کی تقریب میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ اردو روزنامہ "نوائے وقت" کا روزانہ مطالعہ کرتے ہیں اگرچہ وہ زیادہ نہیں پڑھ سکتے لیکن اس کے باوجود "نوائے وقت" کا تھوڑا بہت مطالعہ کرتے ہیں۔

(بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد جون ۹۳ء)

مولانا شیرانی نے وزارت کی طرف سے خط و کتابت اردو زبان میں کرنے کے احکامات جاری کر دیے

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا محمد خان شیرانی نے وزارت مذہبی امور کی طرف سے دیگر اداروں کے ساتھ خط و کتابت کے لیے اردو زبان استعمال کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں اور ان پر فوری طور پر عملدرآمد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

(بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد جون ۹۳ء)

ڈاکٹر شوکت بولو کی اردو خدمات

ڈاکٹر شوکت بولو "اردو و مطالعہ پاکستان" انقرہ یونیورسٹی کے نگراں ہیں، وہ دوسرے ترک ہیں جنھیں تمغۂ پاکستان کا اعزاز حاصل ہوا ہے موصوف گزشتہ تین سال سے اردو زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت پاکستان کی تدریس اس شعبے میں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اسلامیات اور عربی کا ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ اردو ادبیات میں پی ایچ ڈی، انقرہ یونیورسٹی سے کی، ڈاکٹر شوکت بولو کا علمی و ادبی کام بے شمار ہے۔ وہ علامہ اقبال کی "بالِ جبریل"، شبلی نعمانی کی "علم الکتاب" مولانا عبدالسلام ندوی کی "اقبالِ کامل" رام بابو سکسینہ کی "تاریخ اردو ادب"، حامد حسن قادری کی "داستان نثر اردو"، شیخ اکرام کی تینوں معروف کتابوں "آب کوثر"، "موجِ کوثر"، "رودِ کوثر"، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی کتاب "ہندوستان کے حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب "اسٹرگل فار پاکستان" وغیرہ کے علاوہ دوسری اہم کتابوں کو ترکی زبان میں منتقل کر چکے ہیں۔ ان دنوں وہ اردو ترکی لغت کی تیاری میں مشغول ہیں۔

بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد جون ۹۳ء)

سوئٹزرلینڈ میں اردو

برن یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ کے شعبۂ اردو کی ایک طالبہ ربیرامان کی اطلاع کے مطابق وہاں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں ایم اے کی سطح پر اردو تدریس کا بندوبست موجود ہے، اس شعبے میں چار زبانیں عربی، فارسی، ترکی اور اردو پڑھائی جاتی ہیں۔ اردو کا شعبہ چھوٹا ہے، اردو طلبہ و طالبات کی تعداد بہ مشکل سال میں دو کے برابر بنتی ہے۔ ۱۹۹۲ء میں پہلی مرتبہ ایک طالب علم نے اردو میں ایم اے کی سطح کا مقالہ لکھا جس کا موضوع تھا "سرسید احمد خاں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریہ جہاد کا تقابلی مطالعہ" ربیرامان اس یونیورسٹی کی واحد طالبہ ہیں جو اردو میں تحقیق کر رہی ہیں۔ اس شعبے میں ارسلہ روتھن ڈبس ایک طویل عرصے تک اردو پڑھانے کے بعد اب ریٹائر ہو چکی ہیں۔ ارسلہ روتھن نے ۶۰۵ صفحات پر مشتمل ایک کتاب "ALLAH S INDIAN GARDEN" ۱۹۸۹ء میں شائع کی ہے۔ اس میں ولی دکنی سے لے کر جوش، فیض اور احمد ندیم قاسمی تک کئی اہم شعرا کے کلام کا جرمنی زبان میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انیسویں اور بیسویں صدی کی نثر کے

تراجم کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اس طرح اسے جرمن زبان میں اردو ادب کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر این میری شمل نے اس کتاب کو انتہائی عمدہ تراجم میں شمار کیا ہے۔

سوئٹزر لینڈ میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کے ڈاکٹر جون کرسٹوفر برکل بھی اردو سے مَس رکھتے ہیں انھوں نے علامہ اقبال کی چند نظموں کا اردو ترجمہ کیا ہے ان کی دلی خواہش ہے کہ اس شعبے میں اردو کی تدریس کے کام کو جاری رکھا جائے۔

(بشکریہ "اخبار اردو" اسلام آباد جون ۱۹۹۳ء)

"ایچنگ" پرنٹ میکنگ کا فن

تصویر کشی کا یہ طریقہ جن میں برش کی بجائے سوئی اور کینوس کی بجائے زنک یا کاپر کی پلیٹ استعمال کرتے ہیں۔ مصوری کا یہ میڈیم عرف عام میں "ایچنگ" کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں تقریباً ۱۰ سال سے مصوری کا یہ میڈیم برتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں نیشنل کالج آرٹس لاہور کے ہال میں طالب علم آرٹسٹوں نے سوئی سے خوبصورت مناظر، پورٹریٹس اور دوسرے شہ پارے تخلیق کر کے مصوری کے ایک نئے گوشے کو روشناس کرایا۔ اس کالج میں فل برائٹ اسکالر امریکی مصور والٹر کرمپ دو سال سے فل برائٹ پروگرام کے تحت طلبہ کو ایچنگ پرنٹنگ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کے اس کام میں دوسرے اساتذہ جناب انور سعید اور جناب افشار ملک بھی شامل ہیں۔

نیشنل آرٹس کالج ہال میں "ایچنگ" کی چار ہزار ڈالر کی مالیت کی جدید ترین مشین "رائٹ کمبی نیشن پریس" نصب کی گئی ہے جو کالج کو یو ایس آئی ایس کی جانب سے تحفے کے طور پر ملی ہے۔

ویسے پرنٹ میکنگ میں استعمال ہونے والا "ایچنگ پریس" پاکستان میں بھی پچیس تیس ہزار روپے میں تیار ہو جاتا ہے۔

(بشکریہ "خبر و نظر" امریکی شعبہ اطلاعات، اسلام آباد)

فیض میلہ

لاہور میں اس سال بھی فیض احمد فیض کی سالگرہ پر فیض فاؤنڈیشن کی جانب سے فیض میلہ کا انعقاد ہوا۔ موسیقی اس میلے کی اہم پیشکش ہوتی ہے۔ اس میں اضافہ پاکستان کی مشہور کتھک ناہید صدیقی نے رقص سے کیا انھوں نے فیض کی مشہور نظم "تنہائی" کو رقص کے ذریعے سے پیش کیا۔

(بشکریہ "فرنٹیئر پوسٹ" لاہور)

نوشاد کی موسیقی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری

برصغیر کے نامور موسیقار نوشاد کی موسیقی اور زندگی پر ملا نسینیا نامی ایک خاتون نے چار سال تک ریسرچ کر کے اپنا مقالہ آگرہ یونیورسٹی میں داخل کیا تھا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے واضح رہے کہ نوشاد برصغیر کے پہلے موسیقار ہیں جن کی موسیقی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ "جنگ" ۶ جولائی ۱۹۹۳ء)

صوفی بیرنگ شاہ کے سالانہ عرس کے موقع پر ادبی تقریب

گزشتہ دنوں سندھی ادبی سنگت مدیجی (شاخ) کے زیراہتمام، سندھ کے صوفی بزرگ حضرت سید محمد اسماعیل شاہ "بیرنگ" کی نویں برسی کے موقع پر درگاہ آرائیں (ضلع شکار پور) سندھ میں ایک ادبی سیمینار منعقد کیا گیا صدارت، سندھی زبان کے نامور شاعر، افسانہ نگار اور کالم نویس جناب محمد علی پٹھان نے کی خاص مہمان نوجوان شاعر اور سندھی ادبی سنگت سندھ کے مرکزی جوائنٹ سیکریٹری منٹھار سولنگی اور اعزازی مہمان نوجوان افسانہ نگار جناب وہاب سہتو تھے۔ نظامت کے فرائض جاوید شیخ نے انجام دیے مہمانوں کا شکریہ سیکریٹری مہدی شاہ نے ادا کیا۔ اس موقع صوفی بیرنگ شاہ کے کلام، فن، فکر اور شخصیت پر جن اہلِ قلم حضرات نے منظوم اور مقالات کی صورت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ان میں جناب مشتاق شاہ بخاری، مجاہد چانڈیو، ضیاء الدین شاہ، شاہین سندھی، امام راشدی، اشرف زمان پیر چنڈامی، سید حزب اللہ شاہ، ڈاڈو ڈتل، غلام محمد غازی، عاشق شیخ، محبت شاہ، قمرالدین سہتو، امتیاز سومرو، سلطان احمد شاہ اور دیگر قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں محفلِ سماع ہوا جس میں بے شمار فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

(رپورٹ امام راشدی نوڈیرو، سندھ)

ممتاز نقاد پروفیسر شمیم احمد انتقال کر گئے

۲۰ جون ۱۹۹۳ء کو اردو کے ممتاز نقاد اور جامعہ کراچی کے شعبہ اردو کے سابق پروفیسر شمیم احمد دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ان کی عمر ساٹھ سال تھی مرحوم ۱۹۳۳ء میں بھارت کے ضلع بارہ بنکی کے قصبہ گھیولی میں پیدا ہوئے تھے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی وہ اپنے بھائی سلیم احمد مرحوم کے ساتھ کراچی آ گئے تھے مرحوم اپنی جرأت اظہار کے حوالے سے برصغیر کے تمام ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے ان کی تنقید کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں تحریک پاکستان پر بھی مرحوم کی ایک کتاب حال ہی میں شائع ہوئی مرحوم درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ تھے انھوں نے بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں کئی سال تک خدمات انجام دیں بعد میں وہ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے اور ابھی حال ہی میں معاون پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی ہے مرحوم کو ان کی وصیت کے مطابق ان کے بڑے بھائی سلیم احمد مرحوم کے برابر میں پاپوش نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی)

مظفر حسین رزمی کی رحلت

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں اردو کے معروف شاعر سید مظفر حسین رزمی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک عرصے سے صاحبِ فراش تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ سقوط ڈھاکا کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور انتقال سے پہلے تک سیکریٹریٹ کے تعلیمی شعبے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

سید مظفر حسین رزمی غزل کے اچھے شاعر تھے ۱۹۸۳ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ "خواب کی رت" اسلام آباد سے شائع ہوا۔

شاعری انھیں اپنے والد جناب رمز کسری سے ورثے میں ملی تھی۔

ادارہ دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

راگ انبالوی کا انتقال

۲۴ جون ۱۹۹۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے جناب محمد رفیق راگ انبالوی کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ انچاس سال کے تھے۔ وہ ایک عرصے سے رسالہ ماہنامہ "آسمان" کراچی سے شائع کر رہے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے ان کی خاموش ادبی خدمات ادبی حلقے میں تادیر یاد رکھی جائیں گی۔

خدائے بزرگ و برتر مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور احباب و لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق فرمائے۔ آمین

مولانا محمد شاہد تھانوی کا انتقال

معروف عالم دین، خطیب اور ادیب مولانا محمد شاہد تھانوی ۷ اور ۸ ذی الحجہ کی درمیانی شب انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا شاہد تھانوی دسمبر ۱۹۵۰ء میں سکھر میں پیدا ہوئے صرف نوسال بارہ دن کی عمر میں حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کر لی۔ دینی تعلیم جامعہ اشرفیہ سکھر میں مکمل کی۔ سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا دس سال جامعہ اشرفیہ سکھر میں فقہ، حدیث و تفسیر وغیرہ پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں سکھر سے کراچی منتقل ہو گئے کراچی سے ماہنامہ "الاشرف" کے مدیر اور جامع مسجد گول مارکیٹ ناظم آباد کے خطیب تھے۔ خطابت کے ساتھ تحریر کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مضامین ملک کے اکثر رسائل واخبار میں شائع ہوا کرتے تھے۔

مولانا شاہد تھانوی نے ابھی زندگی کی پینتالیس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ بلاوا آگیا اور پسماندگان کو روتا چھوڑ کر یکایک دارالبقا کی طرف روانہ ہو گئے اللہ انھیں غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین

سیف الدّین سیف انتقال کر گئے

۱۲ جولائی کو مشہور شاعر سیف الدّین سیف کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۲ سال تھی، وہ غزل کے بہت اچھے شاعر تھے۔ غزل گوئی میں اُن کی ایک خاص پہچان تھی۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول [illegible] ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف فلموں کے لیے مقبول نغمے لکھے بلکہ فلم سازی و ہدایت کاری کے میدان میں بھی اپنی شہرت قائم کی۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت جون تا دسمبر ۹۲ء کے رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ۔

عنوانات

معارف قرآن
علوم اسلامیہ
مطالعۂ پاکستان
مطالعۂ سائنس
فکر، فلسفہ، حکمت
تاریخ، تہذیب، ثقافت
تاریخ، فن و ادب
فارسی زبان و ادب
اردو زبان و ادب
ادب، مسائل و مباحث
لسانیات
تحقیق و تنقید
تنقید، فن تنقید
ترجمہ، فن ترجمہ
بچوں کا ادب
خود نوشت
سفرنامہ
خطوط
ملاقات

شخصیات

غالبیات
سر سید احمد خاں
اقبالیات
بابائے اردو مولوی عبدالحق
مولانا ابوالکلام آزاد
حسرت موہانی
اختر حسین رائے پوری
حافظ محمود شیرانی
علامہ جمیل مظہری
فیض احمد فیض
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
عصمت چغتائی
جلیل قدوائی
ڈاکٹر سجاد باقر رضوی
پروفیسر ممتاز حسین
چوہدری برکت علی
تابش دہلوی
عبدالغنی خاں
افضل منہاس
اختر حسین رائے پوری
حیدر گردیزی
علامہ تاج محمود امروٹی
دیگر علمی ادبی تعلیمی شخصیات
علمی، ادبی سوانح و تذکرے
تعلیم، تدریس، مسائل و مباحث
علمی ادبی تعلیمی ثقافتی فلاحی

ادارے اور تحریکیں

سیاست، صحافت، امور مملکت
مصوری، موسیقی، خطاطی، دیگر فنون
مخطوطات و نوادرات
مطالعہ کتب

جون تا دسمبر ۱۹۹۲ء کے رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ ترتیب حسب ذیل ہے۔

مجلہ ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء

اہل قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء

شش ماہی غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء

سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد۔ ۹۲/۲۰۔ ۹۲/۲۱

اردو، کراچی اکتوبر، دسمبر ۹۱ء

العلم، کراچی اپریل، جون ۹۲ء

دانش، اسلام آباد ۲۷، ۹۲/۲۸ء، ۲۹، ۹۲/۳۰ء ۹۲/۳۱

روح ادب کلکتہ، اپریل، جون ۹۲ء

صحیفہ، لاہور اپریل، جون ۹۲ء

فنون، لاہور جنوری، اپریل ۹۲ء

مضنیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء

ماہنامہ، آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء، اکتوبر، نومبر ۹۲ء، جمیل مظہری نمبر دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، اخبار اردو، اسلام آباد ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء،

ماہنامہ، افکار، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، جریدہ الاشرف، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء

ماہنامہ، المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء، اگست ستمبر ۹۲ء

ماہنامہ، الولی، حیدرآباد سندھ، جون ۹۲ء، جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء،

ماہنامہ، انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء، اگست ستمبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء،

ماہنامہ، انشعاب، ملتان ستمبر، اکتوبر ۹۲ء

ماہنامہ، اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، تحریریں، جون، جولائی ۹۲ء، اگست، ستمبر ۹۲ء

ماہنامہ، ترجمان القرآن، لاہور، اگست ۹۲ء

ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ اگست ۹۲ء، سرسید نمبر ستمبر اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، حکمت قرآن، لاہور جولائی اگست ۹۲ء

ماہنامہ، دائرے، کراچی جولائی اگست ستمبر ۹۲ء، اکتوبر نومبر دسمبر ۹۲ء

ماہنامہ، سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء،

ماہنامہ، سب رس، کراچی اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء
ماہنامہ، شاعر، بمبئی ۹۲/۱ء - ۹۲/۲ء
ماہنامہ، صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء
ماہنامہ، طلوع افکار، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء،
ماہنامہ، فیض الاسلام، راولپنڈی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء
ماہنامہ، قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء
ماہنامہ، کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء
ماہنامہ، ماہِ نو، لاہور جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء، دسمبر ۹۲ء
ماہنامہ، محفل، لاہور جولائی ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء
ماہنامہ، مطالعۂ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء، اگست ۹۲ء، ستمبر ۹۲ء، اکتوبر ۹۲ء، نومبر ۹۲ء
ماہنامہ، نگارِ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء، مولوی عبدالحق نمبر اگست ۹۲ء
ماہنامہ، نیرنگ خیال، راولپنڈی اگست ۹۲ء، نومبر ۹۲ء

معارفِ قرآن

اختر سعید صدیقی، ڈاکٹر	قرآن میں انسان کے ادراکی قویٰ کا مقام	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۳
ارشد کیانی، پروفیسر	فرعون کا کردار، قرآن کی روشنی میں	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۲
اسرار احمد، ڈاکٹر	قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر	حکمتِ قرآن، جولائی اگست ۹۲ء ص ۴
حافظ احمد یار، پروفیسر	سورۃ البقرہ ۲۴ آیت ۳۴	حکمتِ قرآن، لاہور جولائی اگست ۹۲ء ص ۸۳
زکریا پارک	صداقتِ قرآن پر دو اور ثبوت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۱۹
سیّد حسین ایم جعفری، ڈاکٹر ترجمہ: اشفاق انور	تقویٰ قرآن مجید کی روشنی میں	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۳۳
عبدالمغنی، ڈاکٹر	قرآن کیوں پڑھیں؟	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۳
عذرا معین	سورۂ عصر کی تفسیر	الانسان کراچی، ستمبر ۹۲ء ص ۲۹
غلام مصطفےٰ قاسمی، علامہ	قرآن پاک کے سندھی تراجم	الولی، حیدرآباد سندھ دسمبر ۹۲ء ص ۵
غلام نبی عارف، پروفیسر	چین میں قرآن حکیم کی تعلیم	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۱
کبیر احمد جائسی، پروفیسر	تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۲۵
محمد مظفر مرزا، پروفیسر	قرآنِ حکیم، مسلمانوں کا انسائیکلوپیڈیا	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۳
وفا راشدی، ڈاکٹر	برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۰۱

علوم اسلامیہ

ابن الحسن	"اشھو تاکہ تعظیم محبوب ﷺ رب ہو" ایک علمی وفکری تجزیہ	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۸
ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر	خطبۂ حجۃ الوداع	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۱۲

ابوالعلا مودودی، مولانا	ہدایت و ضلالت کا راز	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۱
اسلم شیخوپوری، مولانا	انقلاب مصطفوی ﷺ قسط ۱	جریدالاشرف، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۴۰
اسلم شیخوپوری، مولانا	انقلاب مصطفوی ﷺ قسط ۲	جریدالاشرف، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۴۸
اسلم صدیقی	کثرت مال و زر کی ہوس، قرآن اور حدیث کی روشنی میں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۴۴
امان علی نقوی شجر	غزوات، تاریخ اسلام کی روشنی میں	الولی، حیدرآباد سندھ ستمبر ۹۲ء ص ۵
امان علی نقوی شجر	غزوات، تاریخ اسلام کی روشنی میں۔ آخری قسط	الولی، حیدرآباد سندھ اکتوبر ۹۲ء ص ۵
امان علی نقوی شجر	غزوات اور سراپا پر ایک نظر تاریخ اسلام کی روشنی میں	الولی، حیدرآباد سندھ، نومبر ۹۲ء ص ۵
جاراللہ زمخشری	اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ (تصنیف مختصر الموافقۃ .....)	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۶۱
حبیب اللہ اوج	حضرت اویس قرنی، مقام تابعی اور اشتیاق صحابہ	تہذیب الاخلاق، لاہور، جولائی ۹۲ء ص ۹
حسین عارف نقوی	امیر کبیر میر علی ہمدانی اور المودۃ القربیٰ	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۲۱۳
خالد مسعود، ڈاکٹر	اسلام اور عصری مسائل	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۳۹
طاہرہ حبیب، مسز	اقلیتیں، زمانہ رسالت ﷺ اور عہد خلافت راشدہ میں	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۸۹
عابدہ علی خواجہ، ڈاکٹر	اسلام کے عہد اوّل میں مسلمان خواتین کی علمی خدمات	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۰۹
عبدالرحمٰن گیلانی، مولانا	انسانی حقوق اور تعلیمات نبوی ﷺ	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۵
عبدالرشید عراقی	شیخ عبدالحق محدث دہلوی (بسلسلہ کاروان حدیث)	حکمت قرآن، لاہور جولائی اگست ۹۲ء ص ۵۹
غلام مصطفیٰ قاسمی، علامہ	نبی ﷺ کی سیرت نمبر ۱	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۲ء ص ۲
غلام مصطفیٰ قاسمی، علامہ	نبی ﷺ کی سیرت نمبر ۲	الولی، حیدرآباد سندھ جولائی ۹۲ء ص ۲
غلام مصطفیٰ قاسمی، علامہ	نبی ﷺ کی سیرت نمبر ۳	الولی، حیدرآباد سندھ اگست ۹۲ء ص ۲
فیاض عالم ولی اللہ شاہ	کیا سنت نبوی واجب العمل اور اس سے انحراف کفر ہے؟	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۲ء ص ۵
قمر احمد عثمانی، مولانا	فرمان رسول ﷺ	فیض الاسلام، راولپنڈی جولائی ۹۲ء ص ۱۱
کلیم اللہ ساریو، ڈاکٹر	حضرت شاہ ولی اللہ کی مختصر سوانح نگاری......	الولی، حیدرآباد سندھ جولائی ۹۲ء ص ۵
کلیم اللہ ساریو، ڈاکٹر	شاہ ولی اللہ کی نظر میں اسلام کے سماجی......	الولی، حیدرآباد سندھ ستمبر ۹۲ء ص ۲۲
کلیم اللہ ساریو، ڈاکٹر	عقائد اور اجتماعیت کا تعلق مولانا عبید اللہ.....	الولی، حیدرآباد سندھ اکتوبر ۹۲ء ص ۲۴
گوہر رحمٰن، مولانا	طبقۂ معترفین اور سلام کا نظام عدل (۲)	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۲
مجتبیٰ حسین، پروفیسر	شہادت عظمیٰ	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۵
محمد اسحاق بھٹی	ایک حدیث	المعارف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۳۹
محمد حمید اللہ، ڈاکٹر	سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۱
محمد حمید اللہ، ڈاکٹر	سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۳
محمد طاہر ملک، ڈاکٹر	وصیتہ عبدالکریم بن محمد لاہوری	الولی، حیدرآباد سندھ اگست ۹۲ء ص ۵
محمد یسین بٹ، پروفیسر حافظ	مولانا اشرف علی تھانوی	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۱۹
مغیث الدین شیخ	حج اور ابلاغ حج مسلم اُمہ کے اتحاد کا ذریعہ	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۹۹
نثار احمد، ڈاکٹر	نبوت و رسالت کا بیان از روئے بائبل حدیث و قرآن	آگہی، کراچی اکتوبر نومبر ۹۲ء ص ۳۹
نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر	رحمت عالم ﷺ کا اسوۂ حسنہ	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۰

مطالعۂ پاکستان

ابوالمجیب	محمد علی جناح سے قائد اعظم تک	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۷
احمد ہمدانی، پروفیسر	قائد اعظم کا سفرِ آخرت	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۹
الطاف رسول	قومی یک جہتی اور پاکستان	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۵
الطاف رسول	قائد اعظم کا سیاسی فلسفہ	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۴۱
الف واؤ جیم	قائد اعظم اور علامہ اقبال	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۵
بلال	ہمارا تاریخی و ثقافتی ورثہ، پاکستان کے محکمہ آثارِ قدیمہ	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۹۲
حبیب اللہ اوج	بہادر یار جنگ	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۴
حبیب اللہ اوج	قائد اعظم بانیِ پاکستان۔ ترے گا سدا......	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳-۱۰
خانم شائستہ حبیب	تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۴۲
خورشید احمد گیلانی	قائد اعظم اور ہم	تہذیب، الاخلاق لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۷
دکھی علیگ	قائد اعظم سے ایک ملاقات	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۴
رضا ہمدانی	تحریک پاکستان اور پاکستانی ادب	ماہِ نو، لاہور اگست ۹۲ء ص ۹
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	قائد اعظم ایک مدبّر رہنما	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۳
سلیم اختر، ڈاکٹر	پاکستان کا تخلیقی منظر نامہ	ماہِ نو، اگست ۹۲ء ص ۱۵
شاہد علی	نظریہ پاکستان اور طلبہ کا کردار	الانسان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۴
شائستہ اکرام اللہ، بیگم	محمد علی جناح	تہذیب الاخلاق اگست ۹۲ء ص ۱۰
شریف المجاہد، پروفیسر	تحریک پاکستان تاریخ کے تناظر میں	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۴
شفقت قریشی	قیام پاکستان کا تاریخی پس منظر	فیض الاسلام، راولپنڈی اگست ۹۲ء ص ۲۴
شمیم حسین قادری، جسٹس	یوم آزادی	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۷
ظفر الاسلام، ڈاکٹر	نواب محمد اسماعیل	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۳۸
ظفر اللہ خان	تحریک پاکستان اور نوجوان نسل	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۸
ظفر خاں بلوچ	۶ ستمبر ایک تاریخ ساز دن	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۶
عبدالعزیز	تاریخ تحریک پاکستان کا ایک ورق، مصنف کی ذاتی سرگزشت	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۳۵
عنایت اللہ نسیم چوہدری، پروفیسر	مادرِ ملت فاطمہ جناح	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۷
عنایت اللہ نسیم چوہدری، پروفیسر	قائد اعظم کے آخری ایام	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۳
عنایت اللہ نسیم سوہدروی	شہید ملت لیاقت علی خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۱۹
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	تحریک آزادی برصغیر کے نامور مجاہد.....	الولی، حیدر آباد سندھ نومبر ۹۲ء ص ۳۴
فاروق قریشی	جلیانوالہ باغ تاریخ، آزادی وطن کا ایک قومی سنگِ میل	الولی، حیدر آباد سندھ دسمبر ۹۲ء ص ۲۵
قدیر الدین احمد، جسٹس	تحریک پاکستان کا ایک ایمان افروز واقعہ	سب رس، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴
کرامت علی	ہندی اور ہندو کی برطانوی سرپرستی	اردو نامہ، لاہور نومبر ص ۲۷
مظفر مرزا، پروفیسر	حضرت قائد اعظم اور مہاتما گاندھی، ایک مطالعاتی تجزیہ	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۷
معیش الدین صدیقی	تحریک پاکستان کے سرگرم علیگ کارکن پروفیسر عمر علی صدیقی	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۸

مقصود زاہدی	قائداعظم محمد علی جناح کا یوم پیدائش	ماہ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۶
علی خاں فروانی، پروفیسر مکرم	قائداعظم اور مسلم لیگ	سب رس، کراچی اگست ۹۲ء ص ۹
منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر	مسلم لیگ کی تحریک، اجلاس ڈھاکہ سے قیام پاکستان تک	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۱
نثار احمد، ڈاکٹر	میر کارواں کا ذہنی سفر	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۵۶
نواب مشتاق احمد خاں	قائداعظم محمد علی جناح	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۵
نورین چوہدری	قائداعظم اور آزادیٔ نسواں	الانسان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۹

مطالعۂ سائنس

احسان آفریدی	برٹرینڈ رسل کے سائنسی نظریات	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۸
اسرار احمد	سائنس اور ہم	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۳۰
اسلم پرویز	برقی انقلاب	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۱۴
اشفاق ایاز	بحر احمر کی طلسماتی دنیا	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۷۹
افتخار احمد	کمپیوٹر، بیسویں صدی کی ضرورت ایک تعارفی جائزہ (حصہ دوم)	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۵
افتخار احمد	کمپیوٹر، بیسویں صدی کی ضرورت ایک تعارفی جائزہ (آخری قسط)	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۴
انیل اگروال	تحفظ ماحول اور معاشی ترقی	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۵۳
ایس قریشی	پاکستان میں الیکٹرونکس کا مسئلہ	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۹
ایلیا پریگوگین (اٹلی کے نوبل انعام یافتہ سائنس داں)	سائنس اور ثقافت کا سنگم	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۲۹
برٹرینڈ رسل، ترجمہ، سید قاسم محمود	انسانی زندگی پر سائنس کے اثرات	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۱
جاوید جبار	وسط ایشیا کی ماحولیات	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۷
جے ڈی لاجو	فطری ماحول اور ثقافت	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۲۹
حسن شاہد رضوی	کہانی الیکٹرونکس کی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۵۲
خالد محمود	قدرت کے کرشمے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۴۳
خالد محمود	اردو طباعت کمپیوٹر کے جھروکوں سے	ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۸
ژاک بروس	انسان اور درخت	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۹۵
زاہدہ حنا	ماحولیاتی جرائم کا تاوان	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۱
سرفراز علی	پاکستان میں توانائی کے وسائل اور تقاضے	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۹
سلیم انور عباسی	انسانی ماحول اور بری و بحری مسائل	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۷۵
سید حامد	سائنس کی عوامی تحریک	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۹
سید قاسم محمود	ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی، پاکستان کے نامور ایٹمی سائنس داں	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۹
سید قاسم محمود	معرکۂ مذہب و سائنس قسط ۵	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۶۹
سید قاسم محمود	چارلس ڈارون، نظریۂ ارتقا کی تلاش میں	سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۱۱

عباس امروہوی — باصوتی موجیں، طبیعیات — سائنس میگزین، کراچی، جولائی ۹۲ء ص ۹۱

بد السلام، ڈاکٹر — خاموش نسل کشی، کرۂ ارض اور انسان کے حوالے سے — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۳۵

بد السلام
ترجمہ تسلیم انصاری — عرب اور عالم اسلام میں سائنس کا احیاء — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۱۹

عبدالسلام سلامی — کمپیوٹر، سائنس اور انجینئرنگ — سائنس میگزین، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۴۱

عبدالماجد صدیقی — ادویات اور جدید تحقیق — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۴۰

عرفان احمد — سائنس کی اہم ایجادات اور ایشیائی ممالک — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۳۶

عرفان احمد — کرۂ ارض کا ماضی، حال، مستقبل — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۸۹

علی رضوان — ڈائنوسار، ایک دیو قامت جانور — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۳

علی مزروئی — بنجر زمین اور ٹیکنالوجی — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۴۱

عمران شہزاد — حیوانات کی اہمیت — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۸۵

فراست علی — قوتِ مدبرۂ برف — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۳۳

فرانز واگرے لیک — پہاڑ اور جزیرے — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۰۱

مارک اولیور گوستہ — انسان اور حیوانات — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۸۱

محسن فارانی — نئی نئی سائنسی معلومات — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۰

اسلم پرویز — لیزر، جادوئی شعاعیں — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۲۱

شہاب الدین — ایٹم اور قرآن — سائنس میگزین، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۷۳

صدیق — تابکار بادل — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۶۵

ضیاالحق، جنرل — اسلامی سائنس کا احیاء — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۵

علی — تیسری دنیا اور بایو کیمیکل ٹکنالوجی — سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۴

تان عمری — مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۶۶

از صدیقی — آسمان کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں — سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۹

جبیں صدیقی — جینیاتی انجینئرنگ، مستقبل کی ٹکنالوجی — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۴۲

ر معین — موسموں کی بے اعتباری — سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۳

ہت ابراہیم — ارضیات کی اہمیت — سائنس میگزین، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۴۷

یس احمد ندوی — مدارس اور سائنس — تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۶۹

رث میر — مسلمان، سائنسی خدا سے عاری؟ — سائنس میگزین، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۱۷

مین الدین، پروفیسر — پاکستان میں سائنسی تعلیم — سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۶۶

ری چوکوف، ڈاکٹر — ذرے میں کائنات — سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۱

سف جبریل — صحائف آسمانی اور ایٹمی طاقت — سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵۷

لم، فلسفہ، حکمت

ضال احمد — سوویت یونین کی شکست و ریخت — ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۸۱

ضل عامر، پروفیسر — ادب اور اخلاق — ماہ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۷

اقبال احمد، پروفیسر	اشتراکیت کا بحران اور سوویت یونین	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۳۴
نور احسن صدیقی	کیا سوشلزم ناکام ہو گیا ہے؟	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۷
جمال علوی	حسن زبان، حسن بیان	شاعر، بمبئی ۹۲/۱ء ص ۲۴
جیون خاں	زندہ دفینوں کی تلاش	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۷
جیون خاں	انمول انسانوں کی تلاش	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۱۳
جیون خاں	کچھ تو بدلنا ہوگا	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۶
حسن عابدی	وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر ہے	افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۲
ریاض صدیقی، پروفیسر	سوشلسٹ، بحران، عالمی معاشرہ اور ہمارے دانشور	طلوع افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۷
سید حامد	ہمارے مسائل	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص
سید حامد	اصلاح گھر سے ہوتی ہے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۹
سید رشید احمد	بائیں بازو کا بحران، نظریہ و عمل	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۲
شان الحق حقی، ڈاکٹر	تین تصویریں	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۳
علی احمد	اشتراکی نظام کا بحران	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۶
علی عباس جلال پوری، علامہ	عام فکری مطالعہ	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۲
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	انکار کا فلسفہ مضمرات و اثرات	صریر، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵
قیصر تمکین	ادیب و فنکار، بتکدہ، تصورات اور تاریخ کی گواہی	افکار، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۱۲
مبارک علی، ڈاکٹر	بنیاد پرستی	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۰۶
محمد اسحاق بھٹی	فکر و نظر کی آزادی اور علم و عمل کی سیاحت	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۷
محمد اللہ خاں	خداداد صلاحیتیں اور ان کا استعمال	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۵۰
ممتاز حسین، پروفیسر	افق عالم، نئی صدی اور جمہوریت کا سفر	افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۱۲
نسیم نیشو فوز (ترجمہ و تلخیص)	سارتر کی وجودیت، ایک مختصر ترین مطالعہ	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶۱
نصرت علی	دفتری ماحول اور ذہنی تناؤ	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۳
یونس اگاسکر، ڈاکٹر	اردو کہاوتوں میں ہندوستانی عورت	اہل قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۵

تاریخ، تہذیب، ثقافت

آفتاب شیخ	یورپی نوزائیدہ مسلم ریاست بوسنیا اور عالم اسلام	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۸۵
احمد حسن دانی، پروفیسر	وسط ایشیا، جدید ریاستوں کا ظہور	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۹
احمد حسن دانی، پروفیسر	وسط ایشیا، جدید ریاستوں کا ظہور (قسط دوم)	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۱
احمد حسن دانی، پروفیسر	وسط ایشیا، جدید ریاستوں کا ظہور (آخری قسط)	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۳۱
اکبر زیدی	آج کا نیا سرحد	مطالعہ پاکستان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۳۷
ایم ایم حسن	سقوط ڈھاکہ	دائرے، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۲۹
اے بی اشرف، ڈاکٹر	ترکی جدید کا معمار، کمال اتاترک تاریخ کی روشنی میں	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۱۱
خواجہ الطاف حسین حالی	حسب اور نسب	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۵
رشید احمد جالندھری	قاہرہ میں مسلم اسکالرز کا ایک بین الاقوامی اجتماع	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۷

ریاض الرحمٰن خاں شروانی	ایک جاگیردار خاندان کی باشعور اور روشن خیال لڑکیاں (قسط ۲)	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۲۶
زاہد علی شاد	قدیم مصر اور خلائی مخلوق (قسط ۵)	سائنس میگزین، کراچی اگست ۹۲ء ص ۶۱
زوار حسین	تہذیب بطور عمل	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۰۰
سہیل مظفر چوہان	تاریخ کی کہانی، تہذیب کی زبانی	سائنس میگزین، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۵۸
شاہین مفتی	ماں، جگت ماں	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۴۱
ظل الرحمٰن خاں	سوویت یونین اور مشرقی یورپ......	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیدنمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۸۹
ظہیر ناشاد در بھنگوی	مزدوروں کا شہر، کلکتہ	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۳۵
عبدالرؤف	کلکتہ، قدامت، وجہ تسمیہ، تاریخی حیثیت،........	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۵
محمد اسحاق بھٹی	کُرد اور کروشیان تاریخ کے آئینے میں	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۹
محمد زبیر	بہاولپور اور عباسی حکمران	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵۵
محمد نذیر ہزاروی	لسانیت اور قومیت، احادیث اور تواریخ کی روشنی میں	جریدہ الاشرف، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۳
نظام صدیقی	دیوارِ چین، تاریخی پس منظر	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵۳
وحید الدین خاں	طارق بن زیاد	انشاء، کلکتہ نومبر ۹۲ء ص ۴

تاریخ فن و ادب

احمد سہیل	امریکہ کی جدید نیگرو شاعری، تاریخ و تجزیہ	شاعر، بمبئی ۲/۹۲ء ص ۲۶
ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر	جدید ترکہانی، جدید افسانوں کی تاریخ اور ارتقاء	طلوع افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۲۵
جمیل جالبی، ڈاکٹر	اردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقاء	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۳۲
رفیق سندیلوی	انگریزی زبان میں ہائیکو کا تجربہ	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۷۵
قمر جمیل	افریقی ادب	دائرے، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۱
عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	۱۹۷۰ء کے بعد افسانوی صورتحال	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۲۱

مناظر

نصر ملک	ہندوستانی ادب ڈینش زبان میں قسط نمبر ۲	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۳۲
نصر ملک	ہندوستانی ادب ڈینش زبان میں تیسری قسط	انشاء، کلکتہ نومبر ۹۲ء ص ۱۳
نصر ملک	ہندوستانی ادب ڈینش زبان میں چوتھی اور آخری قسط	انشاء، کلکتہ نومبر ۹۲ء ص ۱۲
یوسف حسن	قدیم گوجری دوہے (پندرھویں صدی عیسوی تک)	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۷۷

ماہنامہ قومی زبان کراچی

ستمبر ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۹

مضمون نما

مضمون	مصنف	صفحہ
حضرت جگر مراد آبادی... کچھ یادیں	تابش دہلوی	۷
جگر غیر غزلیہ کلام کی روشنی میں...	رعنا اقبال	۱۱
کیا زندہ آدمی تھا...	سرشار صدیقی	۱۵
شمیم صاحب	ڈاکٹر مشرف احمد	۱۹
کھنڈوہ میں اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مظفر حنفی	۲۳
یادوں کا سفر... بابا ذہین شاہ تاجی	افتخار احمد عدنی	۲۹
اسلوبیات۔ ایک وضاحت	قاضی قیصر الاسلام	۳۷
"مدھ بھائی... ایک مطالعہ	امتیاز احمد	۴۳
تلفظ کے چند رجحانات	منظور علی	۴۷
ظفر علی خاں کی نعت گوئی	کلثوم طارق برنی	۵۳
گلہائے رنگ رنگ		
کرشن چوڑا (بنگلہ دیشی کہانی)	بشیر الہلال / احمد سعدی	۵۹
جاپانی ہائیکو	عبدالعزیز خالد	۶۴
امریکہ سالگرہ مبارک!	کلاڈ میکے / ادیب سہیل	۶۶
عشق کی دردناک کہانی (ایرانی کہانی)	منیر روانی پور / شاہدہ عالم	۶۷
رفتار ادب	.....	۷۱
گرد و پیش	.....	۷۹
نئے خزانے	ڈاکٹر وقار راشدی	۸۹

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق، ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

سرمایہ کاروں کے لئے سنہری موقع !
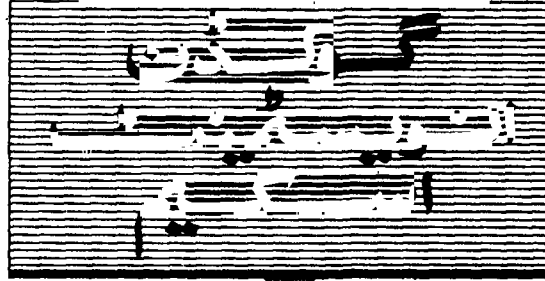
یہ اسکیم آپ کے گھریلو بجٹ کو متاثر کیئے بغیر اضافی آمدنی کا ایک منفرد موقع فراہم کرتی ہے۔ پنشنروں، بیواؤں، کم اجرت پانے والے کارکنوں، تنخواہ دار اور ریٹائرڈ افراد کے لئے انتہائی مناسب ہے۔

نمایاں خصوصیات

- تمام مقیم و غیر مقیم پاکستانی، غیر ملکی افراد، کمپنیاں، ایسوسی ایشنز، کاروباری اور تاجر حضرات اس اسکیم میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔
- کم از کم ۵۰،۰۰۰ ہزار روپے یا دس ہزار پر تقسیم ہونے والی رقم کی سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ مدت تکمیل تین سال ہے۔
- ۳ سالہ سرمایہ کاری پر ۱۲٫۵ فیصد سالانہ منافع کی ادائیگی ماہ بہ ماہ۔

آمدنی کا گوشوارہ

سرمایہ کاری	ماہانہ منافع
۵۰،۰۰۰/- روپے	۵۲۱/- روپے
۱۰۰،۰۰۰/- روپے	۱۰۴۱/- روپے
(ہر اضافی ۱۰،۰۰۰/- روپے پر ۱۰۴/- روپے ماہانہ منافع)	

- ادائیگی کا طریقہ کار: ماہانہ منافع کی رقم کھاتے داروں کی خواہش کے مطابق۔
  (ا) ان کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کردی جائے گی
  (ب) یا اگر وہ چاہیں تو براہ راست خود حاصل کر سکتے ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے ہماری نزدیکی شاخ سے رجوع کیجئے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

قومی زبان کی حیثیت سے نفاذِ اُردو کی بات جہاں چلتی ہے وہاں فوراً اس پر ایک گھسا پٹا اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سائنس کا دور ہے اور سائنسی تحقیق میں آئے دن ہونے والی تبدیلیوں کی زبان انگریزی ہے۔ اس لیے اردو کو اپنانا سائنسی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جانے کے مترادف ہوگا۔

سائنسی تحقیقات اور اس کے نتیجے میں ایجادات و انکشافات کا بنیادی تعلق ذہن و فکر سے ہے۔ ان تحقیقات کا عملی اظہار زبان ہے۔ پھر یہیں سے ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کسی ملک کے افراد کی سوچ بہتر انداز میں کس زبان میں اظہار پا سکتی ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کے لیے موزوں ترین زبان اُس کی قومی زبان ہوگی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جاپان، چین، روس، جرمنی، فرانس کی سائنسی تحقیق کا تمام کام اُن کی اپنی زبانوں میں ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی ملک سائنسی تحقیق و ایجاد کی دوڑ میں اُن ترقی یافتہ ممالک (برطانیہ، امریکہ) سے پیچھے نہیں جن کی زبان انگریزی ہے بلکہ بعض معاملات میں یہ ہراول کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر ہم پاکستانی تحقیقات کے سائنسی ہدف کو پانے کے لیے اپنی زبان کیوں استعمال نہیں کر سکتے؟ رہی سائنسی اصطلاحات کی بات تو وہ جوں کی توں ہماری قومی زبان اردو میں رواج دی جا سکتی ہیں۔ بہ صورت دیگر ان کے نعم البدل بھی وضع کیے جا سکتے ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر تحقیقی و تخلیقی سوچ اپنی قومی زبان میں بہتر طریقے سے اظہار پا سکتی ہے۔ مگر وہ علوم جو کسی اور زبان میں پہلے سے موجود ہیں اُن کا ہم تک پہنچنا اکتساب اور مطالعہ کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ دنیا کے علوم پہلے لاطینی اور یونانی زبان میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن یورپ میں یہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی وغیرہ میں اکتساب کے ذریعے سے ہی پھیلے اور پھر اپنی قومی زبانوں میں لوگوں نے اُن تحقیقات میں اضافہ کیا جو لاطینی اور یونانی میں ہوا کرتی تھیں۔ ہمیں موجودہ علوم کو دوسری زبانوں سے اپنی قومی زبان میں منتقل کر کے آئندہ تحقیقات کے دروازے اپنی قوم کے لیے کھول دینے چاہئیں تا کہ وہ ہمیشہ کسی بیرونی یا خارجی طریقۂ اظہار کے دست نگر نہ رہیں۔
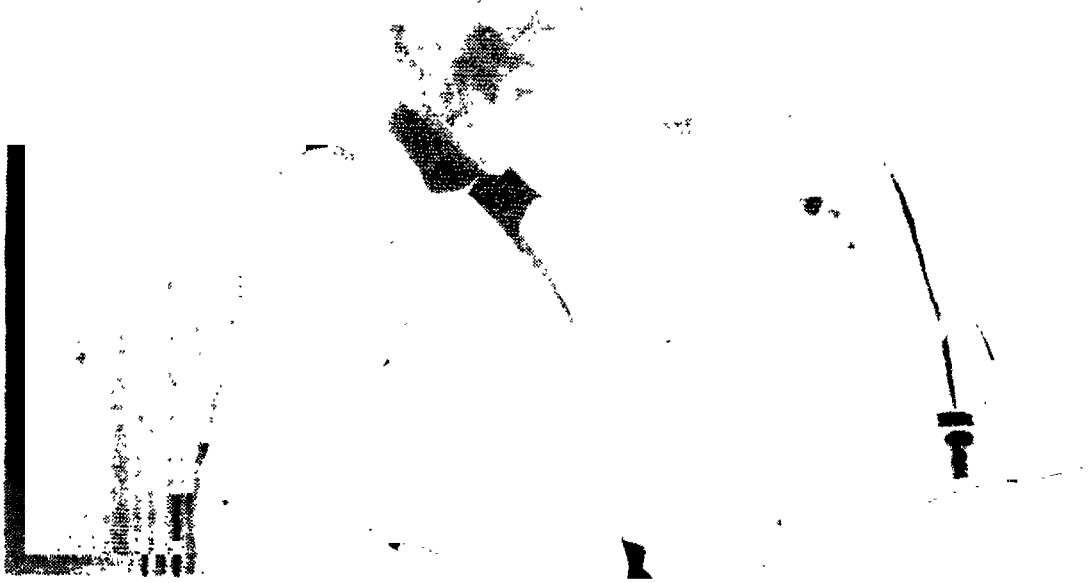
بابائے اردو کی ۳۲ ویں برسی کے موقع پر منعقدہ سیمینار میں جناب جمیل الدین عالی (اوپر) ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو اور صدر جلسہ جناب مختار زمن (نیچے دائیں سے با
... جلسہ ... سنبھال ...

سیمینار میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر شجاع احمد زیبا، ڈاکٹر نجم الاسلام، جناب خاطر غزنوی اور ڈاکٹر حنیف فوق اپنے مقالات پڑھ رہے ہیں۔

(ڈائس پر دائیں سے بائیں) جناب جمیل الدّین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر مختار الدّین آرزو، مہمان خصوصی جناب مختار زمن اور ڈاکٹر اسلم فرخی۔

حاضرین جلسہ

حضرت جگر مُراد آبادی .... کچھ یادیں

تابش دہلوی

اس دور کے غزل کے عناصر اربع میں حضرت جگر مراد آبادی کا نام نامی ایک اہم عُنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

جگر صاحب نے شاعری اور شخصیت دونوں اعتبار سے ہماری شاعری اور تہذیب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، شاعری میں ہمیشہ پاکیزہ خیالات کا اجرا، اور محبت کے صالح جذبات کی اشاعت ان کا موقف رہا انھوں نے حسن و محبت کے محاکات میں ہمیشہ تمجید کا خیال رکھا اور اس طرح وہ اپنی پاکیزہ سرشار شاعری کی نغمگی سے دلوں کو گرماتے رہے۔ اس مضمون میں ان کی شاعری موضوع گفتگو نہیں ہے بلکہ بعض یادوں کو تازہ کرنا مقصود ہے۔

جگر صاحب نہایت اعلیٰ کردار کے مالک تھے، وہ پرانی تہذیبی قدروں کی پاسداری اور حفاظت اپنی میراث کی طرح کرتے اور اسلاف کی ثقافتی نشانیوں کو حرزِ جاں رکھتے۔ بزرگوں کا ادب، دوستوں کی خاطر مدارات، اہل علم و دانش کی خدمت، ناداروں کی دستگیری، ہم عصروں کا احترام، چھوٹوں سے محبت، عیب بینی اور غیبت سے اعراض، غرض انسانی اقدارِ اعلیٰ کا فروغ ان کا وتیرہ تھا اور انہی خوبیوں نے جگر صاحب کی شخصیت کو نہایت دل پذیر بنا دیا تھا، اُن سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کی خواہش ہوتی۔ وہ لوگوں سے، لوگوں کا ذہن اور اپنا ذہن ایک سطح پر لا کر ملتے اور اس طرح احساسِ برتری یا احساسِ کمتری سے خود کو بھی محفوظ رکھتے اور دوسروں کو بھی۔ جگر صاحب ہر مذاق کے لوگوں میں اپنے لیے جگہ بنالیتے۔

مجھے جگر صاحب سے نیازمندی کا شرف ۱۹۳۸ء سے حاصل رہا لیکن ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۸ء میں جگر صاحب کا کراچی میں طویل قیام اس شرف میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔ ان کی شفقت اور محبت میرے لیے:

کرد گستاخ مارا تُو کرمہائے

کا مصداق تھی۔ میرے علاوہ ماہر القادری، اقبال صفی پوری، ادیب سہارنپوری، شعیب حزیں روز کیا بلکہ ہر وقت کے حاضر باش تھے اور گستاخانہ حد تک اُن سے بے تکلف تھے، اور جگر صاحب کا بھی یہ عالم تھا کہ ہم میں سے اگر کوئی بھی کسی روز غیر حاضر ہو جاتا تو بے چین رہتے۔ جگر صاحب کا فرصت کا بہترین مشغلہ رمی (تاش کا کھیل) تھا وہ اس قدر انہماک سے رمی کھیلتے کہ دوسری باتوں کا انھیں بالکل ہوش نہ رہتا اور اس سلسلہ میں لطائف بھی ظہور میں آتے مثلاً ایک شاعر نے جگر صاحب کی فرمائش پر رمی کے دوران میں اپنا کلام سنایا اور داد کی بجائے جگر صاحب کے منہ سے نکلا "یہ ہے پان کا چوا" اور شاعر ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ جگر صاحب ملنے

والوں کی یلغار سے تنگ آکر نہایت خاموشی سے اصطفیٰ منزل سے نکل کر میرے غریب خانہ آجاتے اور دو تین دن میرے یہاں رہتے، میری چھوٹی بیٹی رشیفہ سے جو دو تین سال کی تھی بہت پیار کرتے تھے، میرا قیام جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں تھا انہی کوارٹروں میں سلیم احمد اور جام نوائی بدایونی بھی رہتے تھے، میرے یہاں بھی رمی کی پھڑ جمتی اور یہ دونوں بھی جگر صاحب کے ساتھ رمی کھیلتے اور یوں کئی کئی راتیں اور دن گزر جاتے۔

ایک عقیدت مند نے عمدہ قسم کی دو قراقلی ٹوپیاں جگر صاحب کو پیش کیں، ایک صاحب نے ان میں سے ایک ٹوپی چُرالی اور وہ اُسے روز پہن کر جگر صاحب کے پاس آتے رہے لیکن جگر صاحب سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ اُن سے کہتے "چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد"

ایک روز ایک صاحب نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی جگر صاحب کی شیروانی سے ان کا بٹوہ نکال لیا اور یہ حرکت جگر صاحب نے دیکھ لی لیکن جگر صاحب نظریں چُرا گئے اور ان کو شرمندگی سے بچالیا۔

جگر صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے اور یہ بات سب کو معلوم تھی، جگر صاحب کی خوشنودی کے لیے ایک صاحب نے جگر صاحب سے جوش کے عیب بیان کرنے شروع کر دیے، جگر صاحب نہایت خفا ہوئے اور کہا کہ جوش کو میں بُرا کہہ سکتا ہوں آپ ان کے مرتبہ کے آدمی نہیں ہیں اور یہ حق آپ کو ہرگز نہیں ہے کہ آپ ایک بڑے شاعر کی برائی مجھے خوش کرنے کے لیے کریں۔

ہم عصر شعراء میں جگر صاحب حضرت اصغر گونڈوی کے بعد سب سے زیادہ حضرت فانی بدایونی کو بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان پسند کرتے تھے، اور ان کے قصے اکثر بیان کیا کرتے تھے، کہنے لگے ایک دفعہ کسی نے ایک مصرع دیا "تیرے وحشی کے گریبان سئے جاتے ہیں" اور فی الفور دوسرا مصرع کہنے کی فرمائش کی حضرت فانی کا مصرع سب سے اچھا تھا:

تیرے وحشی کے گریبان سئے جاتے ہیں
"دل پہ پڑتے ہیں وہ ٹانکے جو دئے جاتے ہیں"

جناب فضلی صاحب نے ملیر میں ایک پکنک کا اہتمام کیا یہ پکنک دو تین روز کی تھی اس میں جگر صاحب کے علاوہ میں، ماہر القادری، ادیب سہارنپوری، اقبال صفی پوری، اسمٰعیل احمد مینائی، خود فضلی صاحب اور دوسرے لوگ شریک تھے، وہاں بھی رمی کی محفلیں جمیں، کرکٹ کھیلی گئی، ایک روز طے پایا کہ "حاضر مشاعرہ" کیا جائے اور مصرع طرح کا جگر صاحب دیں گے۔ چنانچہ جگر صاحب نے مصرع دیا:

شمع میں جلتا نظر آیا ہے پروانہ مجھے

شعر کہنے کے لیے دو گھنٹے مقرر ہوئے، سب نے دو دو تین تین شعر کہہ لیے لیکن خود جگر صاحب سے ایک شعر بھی نہ ہو سکا۔

ریڈیو پاکستان حیدر آباد نے کُل پاکستان طرحی مشاعرہ کا اہتمام کیا طرحی مصرع تھا:

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

کراچی سے جگر صاحب، میں، ماہر القادری، ارم لکھنوی، اقبال صفی پوری، ادیب سہارنپوری، سراج الدّین ظفر، اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے شعراء بھی مدعو تھے، ان میں حفیظ جالندھری بھی تھے جگر صاحب راستے بھر طرح میں شعر کہتے رہے، کوئی شعر ہو جاتا مجھے سناتے، ایک شعر بہت خوش ہو کر سنایا:

غنیمت ہے چشم تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

میں نے کہا جگر صاحب یہ شعر جہاں استاد حضرت داغ دہلوی کا ہے، فوراً کاٹ دیا اور کہا لاحول ولاقوۃ الاّ باللہ۔

جگر صاحب کی اگر کسی نے دعوت کی ہے تو دعوت میں جاتے وقت جتنے حضرات موجود ہوں گے ان کو جگر صاحب بہ اصرار دعوت میں لے جائیں گے، دعوت کرنے والے بھی جگر صاحب کی اس عادت سے واقف ہوتے اور وہ اسی حساب سے دسترخوان کا اہتمام رکھتے، اور اس طرح ناخواندہ مہمان اور میزبان شرمندگی سے بچ جاتے۔

ایک دفعہ اردو کالج کراچی کے پرنسپل میجر آفتاب حسن نے اردو کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک وفد لے کر کوئٹہ جانے کا پروگرام بنایا کیوں کہ کوئٹہ بلوچستان کے اکثر سردار علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور انھیں یقین تھا کہ وہ اردو کالج کی مالی امداد کریں گے۔ اس وفد میں جگر صاحب، ماہر القادری، ادیب سہارنپوری، سیّد محمد جعفری، اقبال صفی پوری اور اسمٰعیل مینائی شامل تھے، کوئٹہ پہنچ کر بعض لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کچھ رقم بھی مل گئی میرا تعلق چونکہ ریڈیو سے تھا اس لیے میں کوئٹہ ریڈیو پاکستان گیا اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے جی علی سے جو آل انڈیا ریڈیو دلی میں میرے شریک کار تھے ملا انھوں نے بتایا کہ کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کا باقاعدہ افتتاح کرنے زیڈ اے بخاری کنٹرولر ریڈیو پاکستان آرہے ہیں اور اس سلسلے میں خاص پروگرام ترتیب دیا گیا ہے جس میں ایک مشاعرہ بھی رکھا گیا ہے میں نے مشورہ دیا کہ اتفاق سے کوئٹہ میں جگر صاحب وغیرہ موجود ہیں کیوں نہ ان کو بھی مدعو کرلیا جائے۔ کے جی علی نے کہا کہ ہم مدعو کرلیں لیکن مقامی فیس سے زیادہ ہم نہیں دے سکیں گے کیوں کہ ہم نے انھیں کوئٹہ میں مدعو نہیں کیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ میں شعرا کی رضامندی لے لوں گا، چنانچہ میں نے جگر صاحب وغیرہ سے رضامندی لے کر ان کو آگاہ کردیا اور اس طرح ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ دوسرے روز جگر صاحب کہنے لگے کہ بعض اوقات دوستی میں مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، یہ اشارہ مشاعرہ کی مقامی فیس کی طرف تھا، اس گفتگو کے بعد میں کبیدہ خاطر رہا اور کراچی آنے کے بعد جگر صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ کئی دن گزر گئے جگر صاحب نے احباب سے میری غیر حاضری کا ذکر کیا، احباب نے مجھے بتایا، میں نے کہا جگر صاحب سے کہیے میں خفا ہوں۔ آپ یقین کریں گے جگر صاحب مجھے منانے آئے، سوء اتفاق کہ ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کے بعد بھی میں حاضر خدمت نہ ہوسکا، جگر صاحب دوبارہ آئے اور اس مرتبہ خالی ہاتھ نہیں آئے، مٹھائی کا ڈبہ، میری بیوی کے لیے عطر کی شیشی احمد حسین دلدار حسین کا پان کا زردہ (تمباکو) لے کر آئے، ہائے کیا لوگ تھے، کیسی محبتوں سے اُن کا خمیر اٹھا تھا!!!

مجھے معلوم تھا کہ بخاری صاحب اور جگر صاحب ایک دوسرے سے کبیدہ ہیں اور ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے ہیں اور میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ ان دونوں کا میل ہوجانا چاہیے، چنانچہ میں نے بخاری صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا، بخاری صاحب آمادہ ہوگئے۔ میں نے کہا شرط یہ ہے کہ پہل آپ کریں گے اُدھر میں نے جگر صاحب کو بھی آمادہ کرلیا۔ غرض ایک دن میں اور بخاری صاحب جگر صاحب کی قیام گاہ پہنچے، سوء اتفاق سے جگر صاحب موجود نہیں تھے، بخاری صاحب اپنی آمد کے متعلق ایک پرچہ چھوڑ آئے تھوڑی دیر بعد جگر صاحب آگئے، انھیں بخاری صاحب کے آنے کا علم ہوا، فوراً بخاری صاحب کے دفتر پہنچے دونوں دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے اور دونوں آب دیدہ تھے، یہ منظر دیکھنے کا تھا، پھر بخاری صاحب نے خود جگر صاحب کی کئی غزلیں ریڈیو پاکستان کے لیے ریکارڈ کیں اور جگر صاحب نے اصطفیٰ منزل میں دو مشاعرے بخاری صاحب کی

صدارت میں کیے۔

جگر صاحب ہونہار نوجوان شعراء کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے، راز مراد آبادی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، دور ہاشمی، نمار بارہ بنکوی، نظر امروہوی وغیرہ کو دراصل انھوں نے ہی متعارف کرایا، برصغیر کے ہر اچھے مشاعرے میں ان کو مدعو کراتے اور اس طرح ان شعراء کی شہرت میں جگر صاحب کا بڑا دخل رہا۔

کراچی میں ایک مشاعرہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے، سابق کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو، اقوام متحدہ کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل جناب پطرس بخاری کی صدارت میں کرایا اس میں پاکستان کے دوسرے علاقوں کے شاعر بھی شریک تھے انہی شاعروں میں ساحر صدیقی بھی تھے انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا، ساحر صدیقی میرے یہاں مقیم تھے، دوسرے روز علی الصبح جگر صاحب ساحر صدیقی سے ملنے آئے اور ان کی بہت حوصلہ افزائی اور تعریف کی، میں نے کہا جگر صاحب آپ نے کیوں زحمت کی، ساحر صدیقی خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے جگر صاحب ہونہار شاعروں کی حوصلہ افزائی میں اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔

کراچی میں ہندوستان کی ایک مقبوضہ مسلم ریاست کی شہزادی کو شاعروں اور شاعری سے بڑا شغف تھا وہ خود بھی بہت عمدہ ترنم سے شعر پڑھتی تھیں، اُن کے یہاں روز دعوتیں اور مشاعرے ہوتے، میرے سوا کراچی کے تمام شعراء ان محفلوں میں شریک ہوتے رہتے، ایک دن جگر صاحب نے مجھ سے ان کے یہاں چلنے کے لیے کہا میں نے عرض کیا کہ میں بغیر دعوت کے نہیں جاؤں گا، چنانچہ ایک دن وہ شہزادی صاحبہ خود مجھے مدعو کرنے آئیں، مقررہ تاریخ پر میں جگر صاحب کے ہمراہ ان کے یہاں شریکِ محفل ہوا۔ تمام انتظام نہایت شاہانہ تھا، کھانے کے وقفہ میں میں نے دیکھا کہ جگر صاحب موجود نہیں ہیں، اور جگر صاحب کی عدم موجودگی سے میں نے اپنے آپ کو اس محفل میں بیگانہ بیگانہ محسوس کیا اور جگر صاحب کا یہ انداز مجھے بڑا عجیب لگا گویا اس طرح جگر صاحب مجھے وہاں چھوڑ کر خود غائب ہو گئے میں صبح تک اس محفل میں شعر سنتا اور سناتا رہا۔

یہ ہیں ایک انسان کی شخصیت کی مختلف جھلکیاں، ان جھلکیوں میں کردار کی عظمت کی کتنی جہتیں ہیں اور یہی مختلف جہتیں انسان کو فرشتوں پر فضیلت دیتی ہیں، جگر صاحب بھی فرشتہ نہیں انسان تھے اور یہی شرف ان کی عظمت کی دلیل ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی کے مکان کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے

نیا پتہ یہ ہے

A۶۰۲ - بون وسٹا اپارٹمنٹ

L-F-۱۴ - بلاک ۲ - کلفٹن - کراچی

جگر غیر غزلیہ کلام کی روشنی میں....

رعنا اقبال

مالک رام اردو کے ایک بلند پایہ محقق اور ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون "جگر مراد آبادی" میں کامل یقین اور پوری قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ "جگر کی ایک خصوصیت قابل تعریف ہے انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کچھ اور کہتے تو اس میں اس حد تک کامیاب بھی نہیں ہوتے چونکہ ان کی افتاد طبع تھی بھی غزل کے مناسب حال اس لیے ان کا کسی اور صنف سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال سے مترادف ہوتا۔ مگر جگر کے مجموعہ ہائے کلام مالک رام کے اس دعوے کی نفی کرتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے سوا کچھ نہیں کہا اور صرف مجموعہ ہائے کلام ہی نہیں بلکہ خود جگر نے اپنے نثری مضمون "میرا کلام میری نظر میں" مشمولہ "شعلہ طور" اشاعت اول ۱۹۳۶ء میں ان الفاظ میں یہ اعلان و اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں.... جگر لکھتے ہیں.... "واقعہ کانپور کے متعلق جو نظم ہے وہ بے شک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے.... اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں..." کلیات جگر پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی "آتش گل" کے حصے میں "قحط بنگال"، "گاندھی جی کی یاد میں"، "اعلان جمہوریت" اور "ساقی سے خطاب" جیسی نظمیں آتی ہیں جب کہ "شعلہ طور" کے حصے میں "عید"، "مہاتما گاندھی"، "یوم آزادی"، "ساقی سے خطاب"، "نغمہ اسلام" اور "خطاب بہ مسلم" اور اس کے علاوہ آخری حصے میں بھی کچھ غیر غزلیہ کلام دکھائی دیتا ہے۔

یہ دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی ذہن اگر ایک طرف ریزہ خیالی پر مجبور ہے تو دوسری طرف اس کے لیے تسلسل اور ربط کے ساتھ کلام کرنا بھی ضروری ہوتا ہے جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اسی لیے کہ خود بہ قول ان کے.... "میرا مزاج قدرتاً عاشقانہ و رندانہ واقع ہوا ہے۔ حسن پرستی بھی میرے فطرت کا جزو لازم ہے بنا بریں میرا مزاج سرتاسر محبت ہی محبت ہے۔"....

ان کی غزل گوئی کی بنیاد اسی حسن پرستی اور محبت پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک حساس اور باشعور انسان بھی تھے۔ اپنے عہد اور اپنے معاشرہ کے اہم واقعات سے وہ آنکھیں نہیں چرا سکتے تھے اور نہ خاموش رہ سکتے تھے۔ ڈاکٹر احمر رفاعی نے اپنی کتاب "جگر مراد آبادی۔ آثار و افکار" (حصہ دوم) کے عرض حال میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "یہاں اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ جگر صرف شاعر تھے۔ ایک خالص غزل گو شاعر.... وہ سیاسی انسان نہیں تھے۔ البتہ سیاسیات کے بارے میں اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ ضرور رکھتے تھے جو خالصتاً انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار سے عبارت تھا۔ ان کے کلام میں جہاں جہاں ملک کے سیاسی نشیب و فراز

کے ضمن میں اظہار خیال ہوا ہے اس کی تہہ میں ان کے اسی دلپذیر احساس کی تب و تاب موجود ہے۔ اگر انھوں نے کسی بھی سیاسی جماعت یا اس کے قائدین کے کسی اقدام کو سراہا ہے تو صرف اس بناء پر کہ وہ اقدام قومی، ملی یا ملکی زندگی کے کسی خاص مرحلے پر ان کے ہمہ گیر جذبۂ انسانیت دوستی سے کسی نہ کسی اعتبار سے مطابقت ضرور رکھتا تھا۔"

اس سلسلے میں پہلی نظم "قحط بنگال" ہے۔ "قحط بنگال" ایک ایسا واقعہ ہے جس نے پورے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس ایک واقعہ نے سیاست کو بھی متاثر کیا اور ادب کو بھی اس کے حوالے سے بہت سی نظمیں اور افسانے تخلیق کیے گئے۔ جگر نے اپنی نظم میں جہاں اس واقعہ پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے وہاں سیاسی بصیرت کا بھی ثبوت دیا ہے وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ...

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بلکہ ان مناظر کے اندر جھانک کر یہ بھی کہتے ہیں کہ....

ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن
اک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں
بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ ارباب نظر دیکھ رہا ہوں
ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں

جگر صاحب کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ اغیار بالآخر سفر پر مجبور ہو گئے اور برصغیر آزاد ہو گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد ہند کا آئین نافذ ہوا اور اسی رعایت سے اس تاریخ یعنی ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ قرار دیا گیا۔ جگر نے اس موقع پر ایک نظم کہی جس کا عنوان ہے "اعلان جمہوریت" اس نظم میں اظہار مسرت کے بعد وہ جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ حقیقی جمہوریت کا نفاذ اور عوام کی خوشحالی و مساوات ہے:

یہ میکدے کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
نمائشی ہی نہ ہو یہ نظام جمہوری
حقیقتاً بھی زمانے کو سازگار آئے
نہ ہو جو عام مسرت، محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

مگر شاعر کی نیک تمنائیں کسی کام نہ آئیں۔ ظلم اور ناانصافی کا وہی پرانا نظام جاری رہا امیدیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ جگر نے اس صورت حال کے پیش نظر "یوم آزادی" کے زیر عنوان نظم تخلیق کی جس میں انھوں نے اپنے دکھ کا یوں اظہار کیا...

وہی سلاسل وزنداں وہی ہے طوق و رسن

اسی کو کہتے ہیں کیا احترام آزادی
وہی سیاست باطل وہی نظام کہن
بس اور کیا ہے یہ نقش دوام آزادی

"ساقی سے خطاب" کے عنوان سے جگر کی دو نظمیں ہیں ان دونوں نظموں میں ملکی و قومی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک نظم میں وہ کہتے ہیں:

وہ پاکستان ہے ساقی یہ ہندوستان ہے ساقی
مگر انسانیت کا ہر جگہ فقدان ہے ساقی
یہاں سرمایہ داری چور بازاری کے میلے ہیں
یہاں اپنی حکومت ہے یہ ہندوستان ہے ساقی

دوسری نظم میں ناگفتہ بہ حالات کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے حالات کو بدلنے کے لیے عمل کی تلقین کی جاتی ہے:

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاک وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
سلامت تو ترا میخانہ تری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی

اس نظم سے پہلے ایک نوٹ دیا گیا ہے جس سے شاعر کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے وہ نوٹ یہ ہے:

"ساقی اور رند دونوں میخانۂ روحانیت سے وابستہ ہیں دونوں میں شدید محبت ہے جہاں ساقی عظیم المرتبت ہے وہاں رند بھی معمولی رند نہیں بلکہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ عصر جدید کے حالات سے متاثر ہو کر رند میخانہ کی زندگی ترک کرنا اور جدوجہد دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے اور ساقی سے اجازت کا طالب ہوتا ہے ساقی کو خیال ہوتا ہے کہ عملی دنیا میں خدا جانے رند سے کیا کیا لغزشیں ہوں لیکن رند پر ساقی کا احساس منکشف ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہہ کر ساقی کو مطمئن کرنا چاہتا ہے:

نہ لا وسواس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سر مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

اسی کے ساتھ نظم میں معیار جنوں، تنظیم میخانہ انسان اور انسانیت، وطن اور وطنیت وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی رند یعنی شاعر کے نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔"

گاندھی جی پر بھی جگر نے دو نظمیں کہیں ہیں۔ "گاندھی جی کی یاد میں" اور "مہاتما گاندھی"۔ گاندھی جی کے علاوہ جگر نے لوک مانیہ تلک پر بھی ایک نظم لکھی تھی مگر وہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اس ضمن میں جگر کہتے ہیں....

"دو نظمیں جن میں سے ایک نظم "تلک کی موت" پر ہے اور دوسری اسکول اسٹرائیک کے موقع پر "بچوں سے خطاب" ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخ ادبی" میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے اس لیے یہ ظاہر کیے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی جب کہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی۔ اسی لیے اس میں بیجا غلو اور بعض شدید قسم

کی لغزشیں ہوگئی ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے لیکن نہ ہو سکی۔ اس لیے احتیاطاً اس قدر لکھ دیا۔"

یہ نظم جیسا کہ عرض کیا گیا کہیں دستیاب نہیں ہے اور نہ کسی مجموعے میں شامل ہے مگر کلیات جگر (مکتبہ اردو ادب، لاہور) میں صفحہ ۴۳۶ پر جو تین اشعار تین سوالیہ نشانات (؟؟؟) کے نیچے درج ہیں وہ اس نظم کے معلوم ہوتے ہیں وہ اشعار یہ ہیں:

تلک اگر پاؤ ہو نام تم کو
جتانا انہی کا ہے اکرام تم کو
سنانا انہی کا ہے پیغام تم کو
دکھانا ہے اس صبح کی شام تم کو
تلک وہ کہ ہر موئے تن اس کا گاندھی
تلک وہ کہ سارا چمن جس کا گاندھی

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ کلیات جگر میں نعتیں، تہنیتی و تعزیتی نظمیں اور سہرے وغیرہ بھی موجود ہیں۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور ان کا شاعرانہ مقام و مرتبہ ان کی غزلیات ہی کی بنیاد پر قائم ہے لیکن ان کی شخصیت اور افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کے غیر غزلیہ کلام کا مطالعہ بھی ضروری ہے ان کے بغیر جگر شناسی ممکن اور معتبر نہیں ہو سکتی۔

کیا زندہ آدمی تھا.....

قمر ہاشمی کی یاد میں

سرشار صدیقی

۱۶ جون ۱۹۹۳ء بدھ کے دن بعد نماز ظہر چند دوست، چند عزیز و اقارب، چند ہمسائے قمر ہاشمی کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا آئے۔ ان سے میری برادرانہ رفاقت کا ایک طویل دورانیہ ختم ہوا اور کم و بیش نصف صدی کی دوستی ان کے ساتھ دفن ہو گئی۔

قمر ہاشمی راجستان کی ریاست ٹونک کے صاحبِ فضیلت اور صاحبِ حیثیت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور سید احمد شہید بریلوی نہ صرف ان کے مورث تھے بلکہ ان کے فکر و عمل کے لیے مثالیہ بھی تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری برسوں میں قمر ہاشمی ملازمت کے سلسلے میں کان پور آ گئے تھے جہاں وہ حکومتِ برطانیہ کے دفاعی سازوسامان تیار کرنے والی ایک بہت بڑی فیکٹری میں کام کرنے لگے۔ کان پور پہلے ہی شمالی ہند کا انتہائی ممتاز تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ اونی، سوتی اور ریشمی کپڑے تیار کرنے والے بے شمار بڑے بڑے ملز، خام چمڑے کے گودام، ٹینریاں (TANNERIES) اناج کی سب سے بڑی منڈی اور پھر حکومت کی ہارنس اینڈ سیڈلری فیکٹری اور سینٹرل آرڈیننس ڈپو وغیرہ نے اس شہر کی اہمیت کو کلکتہ اور بمبئی کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ صنعت و تجارت کے علاوہ یہ شہر عظیم درس گاہوں کے حوالے سے بھی پہچانا جاتا تھا، مدرسہ جامع العلوم، مدرسہ فیضِ عام، حلیم مسلم کالج، مولانا محمد علی میموریل اسکول وغیرہ نے تعلیمی میدان میں ہندو اکثریت کی اجارہ داری کے خلاف مضبوط محاذ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ادب میں مولانا حسرت موہانی، مولانا عبداللہ علم (علمی جنتری والے) حکیم ناطق لکھنوی، مولانا ثاقب کان پوری، مولانا نشور واحدی، پنڈت گنگادھر ناتھ فرحت، پنڈت دیا نرائن نگم (ماہنامہ "زمانہ" کان پور کے مدیر)، پرنسپل عبدالشکور، دَور ہاشمی اور پنڈت وحشی ہتکاری جیسے نامور ادیب و شاعر گیسوئے اردو سنوارنے میں مصروف تھے جن کے فیضِ صحبت نے لکھنے والوں کی ایک نئی پود تیار کر دی تھی جن میں اشتیاق اظہر (جو آج کل ایوانِ بالا کے رکن ہیں)، سید شرافت علی ہاشمی (جو جامعہ کراچی کے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کے سربراہ تھے)، کوثر جالبی، پیام فتح پوری، دانش ممتاز، فنا کان پوری، ابوالخیر کشفی، حسنین کاظمی اور حنیف فوق وغیرہ شامل تھے۔ ان کے حاشیہ نشینوں میں راقم الحروف کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ قمر ہاشمی اور ان کے بڑے بھائی سالک الہاشمی کان پور آئے تو عمر اور نظریات کے فطری تقاضوں کے مطابق اسی نئی نسل میں شامل ہو گئے۔

کان پور بنیادی طور پر مزدوروں کا شہر تھا، اسی لیے وہاں ٹریڈ یونین کی تحریک، ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں اور عوامی

تھیٹر کی مصروفیات بھی نمایاں اور تیز تھیں۔ نظریاتی صف بندی ادب میں بھی ہوئی اور ہمارے بعض ساتھی جن میں قمرہاشمی بھی تھے، بائیں بازو کے ترجمان کہلائے اور ادب عالیہ کے غزل زار میں ہم نے سیاسی اور انقلابی نظموں کو فروغ دینے کی شعوری کوششیں شروع کیں عوام اور حقیقت پسند خواص نئی آوازوں اور نئے موضوعات سے متاثر ہوئے اور ہم نے مبتدی ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ بنالی۔

اسی زمانے میں مسعود اختر جمال کی پوسٹنگ کان پور میں ہوگئی۔ ش مظفر پوری پہلے ہی سے وہاں موجود تھے، مزدور تحریک کے سلسلے میں کیفی اعظمی کا زیادہ وقت کان پور ہی میں گزرتا تھا، اسرار الحق مجاز عموماً لکھنؤ سے آجاتے تھے، مسعود اختر جمال کی وجہ سے فراق صاحب بھی یونیورسٹی کی تعطیلات میں پھیرے لگالیا کرتے تھے اور تقسیم ہند کے بعد ساحر ہوشیار پوری، نریش کمار شاد، دیو ندر اِسر راجونت سنگھ رانا اور دوسرے بہت سے لکھنے والے کان پور آکر یہیں بس گئے اور اس طرح مقامی ادب میں ترقی پسندوں کی اکثریت بھی ہوئی اور غلبہ بھی.......

غالباً ۱۹۴۹ء میں قمر ہاشمی نے کان پور سے ہجرت کی اور ٹنڈو آدم سندھ میں آباد ہوئے پھر تو وقفہ وقفہ سے ہماری کان پور کی ادبی رفاقتیں منتشر ہونے لگیں۔ پہلے اشتیاق اظہر، پھر حسنین کاظمی اور پھر ابوالخیر کشفی بھی مجھے بیاض بردار شاعروں کے نرغے میں چھوڑ کر کراچی آگئے۔ تاہم ان سب سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا حتٰی کہ مئی ۱۹۵۰ء میں میں بھی ان سے آن ملا۔

کراچی آنے کے کچھ دنوں بعد مجھے شدید خارش ہوگئی۔ طبی مشورہ تھا کہ آب وہوا تبدیل کروں اور میری مجبوری یہ تھی کہ کراچی چھوڑوں تو جاؤں کہاں؟ اسی ہفتہ فرشتہ رحمت بن کر قمرہاشمی دو چار دن کے لیے کراچی آئے اور حاکمانہ انداز سے مجھے اپنے ہمراہ ٹنڈو آدم لے گئے۔ چند دنوں میں ٹھیک ہوگیا لیکن قمرہاشمی کا اصرار تھا کہ ابھی چند ہفتے قیام کروں۔ میں ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا لیکن وہاں جوہر سعیدی، درد سعیدی اور مظفر حسین شاہ کی صحبت بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا چنانچہ یہ حل نکالا کہ عارضی طور پر جز وقتی مدرس کی حیثیت سے اسی اسکول میں نوکری کرلی جس میں قمرہاشمی پڑھایا کرتے تھے۔ تقریباً دو ماہ میں ان کے محل نما مکان میں رہا اور طیبہ بھابھی (بیگم قمرہاشمی) کے پکائے ہوئے کھانے کھاکر مکمل صحت یاب ہوا اور طالع آزمائی کے لیے پھر کراچی آگیا۔

اچانک ایک دن شاعر لکھنوی نے مژدہ سنایا کہ قمرہاشمی مستقل کراچی آکر "ہمدرد" سے وابستہ ہو رہے ہیں۔ وہ کراچی ضرور آئے لیکن ہماری ملاقاتوں کے سلسلے بہت محدود رہے۔

میں لیاقت آباد میں تھا تو وہ لانڈھی میں رہتے تھے، میں ڈرگ کالونی میں گیا تو وہ پاپوش نگر کے دور افتادہ بلکہ اس دور کے نیم ویران علاقے میں آگئے۔ دن بھر کی تھکادینے والی نوکری کے بعد نہ وقت بچتا تھا نہ جیب میں بسوں کے لیے پیسے ہوتے تھے۔ بس گاہ گاہ چھٹیوں کے دن صدر کے چائے خانوں یا کافی ہاؤس میں ملاقات ہوتی یا پھر کسی نہ کسی جمعہ کی شام محمدی بلڈنگ بندر روڈ کی تیسری منزل پر ملتے تھے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتے وار نشستیں ہوا کرتی تھیں۔

مشاعروں سے وہ طبعاً کنارہ کش تھے۔ شاذ و نادر ہی کسی مشاعرے میں دیکھے جاتے۔ البتہ احباب کے گھروں کی مخصوص محفلوں میں ضرور شریک ہوتے۔ ان کا کام شاعری کی خاموش عبادت تھا۔

قمرہاشمی اور انجم اعظمی کے مراسم بہت گہرے تھے۔ انجم میرے بھی اچھے دوست تھے لیکن ہماری ملاقاتیں اس وقت تک جلسوں، نشستوں اور مشاعروں کے علاوہ ریڈیو پاکستان کراچی کے پرڈیوسر اور اردو کے ممتاز شاعر و نقاد احمد ہمدانی کے کمرے تک محدود

تھیں جہاں سلیم احمد، قمر جمیل اور پروفیسر ممتاز حسین عموماً مل بیٹھتے اور ادب کے مسائل و موضوعات پر نرم گرم اور طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ انجم اعظمی اس محفل کے رکن رکین تھے۔ جب پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس منتظمہ میں انجم اعظمی ہمارے ساتھ منتخب ہوئے تو غیر محسوس طور پر ایک تثلیث بن گئی۔ انجم، قمر اور سرشار، بعد میں انجم اعظمی میرے ساتھ ایک دوسری مضبوط تثلیث کا حصّہ بھی بنے جو حلقۂ نیاز و نگار اور ماہ نامہ "نگارِ پاکستان" کے حوالے سے وجود میں آئی تھی۔ اس کے تیسرے رکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہیں۔ قمر ہاشمی اور انجم اعظمی دونوں نے اپنی اپنی تثلیث اپنے آخری دم تک قائم رکھی۔ یوں بھی قمر ہاشمی اور فرمان فتح پوری کے تعلقات ۱۹۴۵ء سے قائم تھے اور پاکستان آنے کے بعد دوستانہ مراسم نے برادرانہ صورت اختیار کرلی تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ انجم اعظمی اور قمر ہاشمی دونوں کے آخری ایّام میں فرمان اور میں ان کی عیادتوں، اور تیمارداریوں سے لے کر تجہیز و تکفین تک مسلسل شریک رہے۔ اسے حق دوستی کی ادائیگی تو نہیں کہہ سکتے تاہم کوشش کی کہ انھیں تنہائی کے عذاب سے محفوظ رکھیں۔

قمر ہاشمی کے مزاج میں بڑا تحمل تھا لیکن اپنے قریبی دوستوں کے لیے وہ تنک مزاج بھی ہوجاتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ہماری عمر کے جن لوگوں نے ایک خاص معاشرتی فضا میں آنکھ کھولی تھی اس میں بے جھجک اختلافِ رائے کا حق اور ایک دوسرے کی ناز برادری بھی تقاضائے دوستی میں شامل تھی۔

اپنی افتادِ طبع کے مطابق وہ کم آمیز ضرور تھے لیکن حلقۂ یاراں میں ان کی کم سخنی رخصت ہوجاتی، خوب بولتے، واقعات اور لطیفے سنا سنا کر بے حال کردیتے۔ بچھڑے ہوئے مشترک دوستوں کا تذکرہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی کتاب "تماشا طلب آزاد" اسی گہرے احساس کا تخلیقی روپ ہے۔

میں نے انہیں ادب کا خاموش کارکن محض برسبیل تذکرہ نہیں کہا، وہ نہ مشاعروں میں شرکت کرتے نہ اشاعت کی طرف توجہ دیتے لیکن جب بھی ملتے کسی نئی نظم یا نئی غزل کے ساتھ ملتے۔ اس کے علاوہ وہ کسی بڑے موضوع پر سوچتے رہتے، مواد و معلومات جمع کرتے رہتے اور پھر چپکے چپکے اپنی سوچ اور مواد کو کسی طویل نظم کے پیکر میں ڈھال دیتے۔ طویل نظمیں ان کا اختصاص اور ان کی پہچان بن گئی ہیں۔

عصری ادب میں ان کا یہ انفرادی کارنامہ نہایت نمایاں اور امتیاز بن کر انہیں زندہ رکھے گا۔ "ہمہ رنگ و نغمہ انساں" "زوال" اور "دانائی کا آفتاب" ان کے نظری اور فکری شاہ کار ہیں لیکن "مرسلِ آخر ﷺ" ان کے عقیدے کی گونج اور ان کے تجدیدِ ایمان کی شہادت ہے۔ اس طویل نظم میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور ان کے عقیدے کی کیفیتیں نقطۂ عروج پر ہیں۔ بہت ممکن ہے یہی ان کے لیے ذریعہ شہرت اور وسیلۂ نجات بھی ثابت ہو۔

"تحریک عمرہ" کے تحت ۱۹۹۱ء میں وہ بھی ادیبوں کے اجتماعی سفرِ سعادت میں شریک تھے۔ بیت اللہ اور حرم نبوی ﷺ میں ان کا عالم دیدنی تھا۔ تیز بخار اور شدید تنفس کی شکایت میں بھی ان کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ ہر نماز جماعت سے ادا کرتے۔ ان کی یہ ادا ان کی قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ ان کے عام زندگی میں دوسرے فیصلہ کن ارادوں کی توثیق تھی۔

پچھلے چند برسوں میں اپنے پیاروں اور عزیز ترین رشتوں کے جنازے اٹھا اٹھا کر وہ نڈھال ہوگئے تھے۔ چھوٹے اور بڑے بھائی کی میت، رفیق حیات کی میت، اکلوتی بیٹی کی میت، رفیقوں اور زندگی کے ساتھیوں کی میت،.......... ان کے شانے

شل اور اعصاب مضمحل ہوگئے تھے لیکن وہ سارے زخم سمیٹے اپنے پورے قد کے ساتھ سر کشیدہ نظر آتے تھے اور اپنی افسردگی سے کسی انجمن کو افسردہ نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کی انسانی بڑائی تھی۔

اس زندہ آدمی کو قبر میں اتارنے کے بعد آخری دیدار کا لمحہ بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ قریبی عزیزوں کے بعد ہم بھی آگے بڑھے تاکہ وہ خط و خال اپنے حافظوں میں محفوظ کرلیں جو پھر کبھی نظر نہ آسکیں گے۔ فرمان فتح پوری، علی حسن، مسعود احمد برکاتی، مختار حیات سب اس ابدی سکوت پر لب بستہ تھے لیکن سب کی پلکیں نم اور ہونٹ لرزاں تھے۔ اور میں ...... وہاں بھی چپ رہا اور اس وقت بھی خاموش رہنا چاہتا ہوں۔

شمیم صاحب

ڈاکٹر مشرف احمد

۲۰ جون ۱۹۹۳ء کی شام کو ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع ملی کہ شمیم صاحب وجود سے عدم میں بدل گئے ہیں۔
اب سے کوئی بائیس تئیس برس قبل میں اپنے ایک دوست کے کہنے سے انھیں "نیا دور" میں اشاعت کے لیے اپنا ایک افسانہ "رشتہ" دینے کے لیے گیا تھا۔ سہ ماہی "نیا دور" کے مدیر تو ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ہیں۔ لیکن اس پرچے کی ترتیب و اشاعت میں شمیم احمد صاحب ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور بہت سے لکھنے والے انھی کے ذریعے اپنے مسودات "نیا دور" میں اشاعت کے لیے دیا کرتے تھے۔ گو اس پرچے میں کسی لکھنے والے کی تحریر کی اشاعت یا عدم اشاعت کا آخری فیصلہ جالبی صاحب ہی کرتے تھے۔

ان دنوں شمیم احمد صاحب انجمن ترقی اردو کے "قاموس الکتب" کے مدیر تھے۔ انجمن کی پرانی عمارت کی بالائی منزل پر واقع کتب خانہ خاص کے ہال میں ایک وسیع و عریض کمرے کے ایک کونے میں ان کی نشست تھی۔ اس غیر معمولی وسیع و عریض کمرے کو انجمن میں تحقیق کی غرض سے آنے والے ریسرچ اسکالرز بھی استعمال کرتے تھے۔ بہر حال پہلے ہی دن شمیم صاحب سے خاصی دیر تک گفتگو رہی اور ان مراسم کا آغاز ہوا جو تادم زیست برقرار رہے۔

میرا متذکرہ بالا افسانہ اشاعت کے لیے منظور کر لیا گیا انھی دنوں موسم گرما کی تعطیلات ہو جانے کے باعث میں بہاول پور جانے والا تھا۔ شمیم صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کوئی طویل کہانی یا ناولٹ لکھنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے ایک طویل کہانی بہ عنوان "جب خون جگر برفاب بنا" لکھ کر انھیں بھجوائی۔ شمیم صاحب نے اسے پڑھنے کے بعد کچھ ترامیم و اضافے کا مشورہ دیا۔ تاہم ترامیم و اضافوں کے باوجود بھی یہ کہانی ان کے نزدیک "نیا دور" کے لیے ناقابل اشاعت قرار پائی۔ یہ طویل کہانی بعد ازاں "دلدل" کے عنوان سے "سیپ" کراچی کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوئی۔

شمیم احمد صاحب اپنی بے لاگ اور انتہا پسندانہ تنقید کی بنا پر ادبی حلقوں میں ناپسندیدہ سمجھے جاتے رہے۔ دونوں بھائی (مرحوم سلیم احمد و شمیم احمد) اپنے مضامین میں اپنے جارحانہ فقروں کی بنا پر بھی خاصے مشہور تھے۔

۶۹-۱۹۶۸ء میں نبی باغ ضیاالدین میموریل کالج (رتن تلاؤ) میں علمی ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان ادبی نشستوں اور بڑے بڑے جلسوں کے روح رواں پروفیسر خواجہ آشکار حسین مرحوم تھے۔ ایسی کئی نشستوں اور جلسوں میں شمیم صاحب نے اپنے کئی تندو تیز مضامین پڑھے۔

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی جدوجہد کے عروج کے دنوں میں ملک دو نظریاتی کیمپوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ شمیم

احمد صاحب ایک ادیب کے طور پر عام اصطلاح کے مطابق "رجعت پسند" گروپ میں شامل تھے۔ اس زمانے میں ایک ادیب اور اہل قلم کے ساتھ ساتھ شمیم صاحب نے ایک نظریاتی صحافی کا رول بھی ادا کیا۔ ان کی نظریاتی تحریروں کا ہدف ترقی پسند شاعر و ادیب بھی تھے۔ لیکن وہ عام سیاسی اور مذہبی رجعت پسندوں کی طرح سارے ترقی پسند ادیب یا شاعروں کے خلاف نہ تھے مثلاً میں نے ان کو ہمیشہ فیض کی شاعری کا مداح پایا اور وہ ہمیشہ فیض صاحب کا نام احترام سے لیا کرتے تھے۔

پھر انجمن ترقی اردو سے ان کا تعلق ختم ہوگیا اور وہ بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر مقرر ہو کر چلے گئے۔ وہ کوئٹہ میں طویل عرصے تک مقیم رہے مگر ان کا دل برابر کراچی آنے کو چاہتا رہا۔ وہ اس بات کے آرزومند رہے کہ کراچی کے کسی سرکاری کالج میں ہی انھیں ملازمت مل جائے تو وہ واپس آجائیں اس کا بنیادی سبب دراصل یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی سلیم احمد کے جن سے وہ بڑی گہری محبت کرتے تھے قریب رہنا چاہتے تھے۔

بلوچستان میں وہاں کے عام باشندوں، طالب علموں اور رفقائے کار نے انھیں اپنے دام محبت کا اسیر بنا لیا تھا۔ جس کا تذکرہ وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔ بلوچستان ہی کے دوران قیام ان کے گہرے اور مخلصانہ مراسم قلات پبلشرز کے مالک سنیٹر زمرد حسن سے ہوئے جن کا اصل وطن پنجاب تھا اور جو ترقی پسندانہ خیالات کے حامی تھے لیکن ان کی شخصیت نے شمیم صاحب کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے ایک خاکہ لکھا جو ماہنامہ "دائرہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس خاکے کا اختتام درج ذیل شعر پر ہوتا ہے:

یہ میکدہ یہ سیاہ خانۂ جہاں یہ رات
کہاں چراغ جلاتے ہیں لوگ اے ساقی

شمیم صاحب محبت اور نفرت میں انتہاؤں پر تھے اور اپنی محبت اور اظہارِ ناپسندیدگی میں کسی رو رعایت کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مصلحت اندیشی سے کلیتاً انحراف کرتے تھے کیوں کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں ایسا کرنا ناممکن ہے لیکن سماجی رشتوں اور معاشرتی جبر کے باوجود جس حد تک مصلحت سے گریز کیا جاسکتا ہے، وہ گریز کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک عجب واقعہ اس وقت مجھے یاد آ رہا ہے۔

یہ واقعہ مجھے ایک صاحب نے سنایا تھا جس زمانے میں مرحوم سلیم احمد پر پہلی مرتبہ دماغی بیماری کا حملہ ہوا تو شمیم احمد اُن صاحب سے معافی مانگنے گئے اور کہا کہ میں نے ایک صاحب سے آپ کے خلاف کافی باتیں کی تھیں جس کا نتیجہ بھائی صاحب کی بیماری کی شکل میں مجھے دیکھنا پڑا اُن صاحب سے یہ واقعہ سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جس شخص کو مکافات عمل کا اس درجہ احساس اور یقین ہو اس سے تو ہمیشہ بے خوف اور بے کھٹکے ہو کر ملنا چاہیے چنانچہ میں ان سے ہمیشہ بے خوف اور بے ہراس ہو کر ہی ملتا رہا۔

کسی بھی شخصیت کے وہ چاہے کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں لیکن اس کا اظہار وہ ہمیشہ کھل کر کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے وہ بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جالبی صاحب کی شخصیت کے بارے میں ان کے مضمون کو خاصا سخت اور ضرر رساں سمجھا گیا اتفاق سے انھی دنوں جب یہ مضمون کتابی سلسلے کے ایک جریدے میں شائع ہوا تو شمیم صاحب کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ملازم ہو چکے تھے اور اس کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ہو چکے تھے ایسی صورت میں روش عام کی بناء پر مصلحت کا تقاضہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہر جے خرچے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے شمیم صاحب کو وہ پرچہ دریا برد کرا دینا چاہیے تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان دونوں کے ایک مشترکہ دوست نے البتہ اس مضمون کو برداشت

کر لینے پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے ظرف کی داد دی تھی۔
شمیم صاحب آدمی سے محبت کس طرح کرتے تھے۔ اس کے لیے پروفیسر حسن عسکری سے ان کی گہری محبت کی مثال کافی ہے۔

عسکری صاحب کے لیے ہونے والے تعزیتی جلسے میں مضمون پڑھتے ہوئے ان کا گلا بار بار رندھ جاتا تھا سلیم احمد کے ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن پر عسکری صاحب کے بارے میں نشر ہونے والے پروگرام کے دوران دونوں بھائیوں کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں تھی لیکن اس محبت اور عقیدت کے سلسلے میں ایک اور واقعہ بیان کرتا ہوں۔

کوئٹہ سے واپس کراچی آجانے کے بعد انھوں نے بار بار ایک صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا مجھ سے کہا کہ اگر ان صاحب سے ملاقات ہو تو انھیں میرے گھر لے کر آؤ۔ میں نے معذرت کر لی مگر اس شوق ملاقات کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ وہ صاحب ملک کی ایک جامعہ سے عسکری صاحب پر پی ایچ ڈی کی ریسرچ کا عنوان منظور کرا چکے ہیں۔ میں ان سے ملاقات کر کے صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا وہ اس موضوع کا حق ادا بھی کر سکیں گے یا نہیں؟

میں نے عرض کیا کہ شاعروں کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا کہ ان کا شعر مدرسے میں جا کر خراب ہوا۔ یہ انداز اب مزید آگے بڑھا ہے اگر جامعات میں نوآموز ریسرچ اسکالرز کے ہاتھوں، جس میں، میں بھی شامل ہوں اہل قلم کی مٹی خراب ہوتی ہے تو ہونے دیجیے اس میں کم از کم ریسرچ اسکالر کا تو بھلا ہو ہی جاتا ہے۔

شمیم صاحب مسکرائے اور ان صاحب سے ملاقات پر اصرار کرتے رہے۔ میں نے سوال کیا کہ عسکری صاحب پر ریسرچ کرنے کا اہل آپ کے خیال میں کیسا شخص ہونا چاہیے انھوں نے کہا ایسا شخص جس نے کم از کم دس بیس برس تک انھیں خطوط پر مطالعہ کیا ہو جن پر عسکری صاحب کرتے رہے ہیں۔ بہ صورت دیگر زیادہ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص صرف ان کی افسانہ نگاری کا کسی حد تک جائزہ لے سکتا ہے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ ایسے اشخاص کے نام تو بتائیے کہنے لگے سینئر افراد میں مظفر علی سیّد اور جونیئرز میں سے سراج منیر (جواں مرگ سراج منیر اس وقت زندہ تھے)

شمیم صاحب کے ساتھ ایک نشست اور یاد آرہی ہے جب وہ عسکری صاحب پر ریسرچ کرنے والے صاحب کو اپنے ہاں بلانے میں کامیاب ہوگئے تھے اتفاق سے میں بھی اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ شمیم صاحب نے بڑی رسانیت اور محبت سے ان صاحب کو عسکری صاحب پر ریسرچ کے خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور آخر میں یہ کہا کہ اگر اس موضوع پر کام کرنے کا شوق ہے تو صرف ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے موضوع میں تبدیلی کر لو معلوم نہیں اب ان صاحب کا کیا ارادہ ہے؟ شمیم صاحب تو دنیا سے رخصت ہوگئے۔

شمیم صاحب میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کی عزت نفس کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اور اگر کسی دوسرے کی عزت نفس کو مجروح کیا جا رہا ہو تو یا اس کا واجب احترام نہ کیا جا رہا ہو تو اس سے انھیں شدید رنج پہنچتا تھا۔

جب ملازمت سے ان کی سبکدوشی کا زمانہ قریب آیا تو میں نے پوچھا کہ شاید اب وہ شعبے میں جزوقتی (کوآپریٹو ٹیچر) استاد کی حیثیت سے کام کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا بظاہر یہ ناممکن ہے۔ ایک سینئر ریٹائرڈ جزوقتی استاد سے صدر شعبہ کے مکالمے کا حوالہ دے کر کہنے لگے کہ مجھے ان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا تھا۔ چنانچہ [illegible] سلوک کے پیش نظر وہ ایسی کسی پیش کش (اگر پیش کش ہوتی) کو قبول کر [illegible] نظر آتے تھے۔

کھنڈوہ میں اردو زبان و ادب

ڈاکٹر مظفر حنفی

مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب کی مستحکم روایات نیز علمی و شعری سرگرمیوں کے اعتبار سے بھوپال کے بعد جن شہروں کے نام ذہن میں آتے ہیں ان میں سرفہرست کھنڈوہ، اندور، جاورہ، رتلام، جبل پور، اجین وغیرہ ہیں جہاں مسلسل شعر و ادب کے تذکرے رہتے ہیں۔ یہاں برہان پور کا نام یوں نہیں لیا گیا کہ وہ کھنڈوہ ہی کی تحصیل ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کھنڈوا میں اردو زبان و ادب کے دھارے برہان پور کے سرچشمے ہی سے آئے ہیں جسے عہدِ اورنگ زیب تک بابِ دکن کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے شمالی ہند اور دکن کے درمیان یہ شہر ایک رابطے کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے یہاں بھی عہدِ قدیم سے ہی دکن کی مانند اردو کے ارتقائی سفر کے نقوش نظر آتے ہیں، مثلاً اردو مرثیوں کا پہلا دیوان ہاشم برہان پوری سے منسوب ہے۔ دارالسرور برہان پور شعر و ادب کی اتنی طویل اور وقیع روایت کا حامل ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے اس لیے میں اس جائزے کا آغاز ماضی قریب ہی سے کرنا چاہوں گا۔

اواخر انیسویں صدی کے فنکار منشی نور محمد نواب کو اپنے عہد کے مشہور استادِ فن اور ممتاز غزل گو داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ نواب کھنڈوی کے دو دیوان "چمنستانِ سخن" اور "ساغرِ جمیل" شائع ہوئے جن میں سے اوّل الذکر مطبع نولکشور، لکھنؤ سے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔ بطورِ تبرک ان کا ایک شعر حاضر ہے:

اچھی رہے گی دشت نوردی میں چھیڑ چھاڑ
الفت ہے میری آبلہ پائی کو خار سے

انیسویں صدی کے اختتام تک اس علاقے کے شعرا میں شاغل برہان پوری، کیفی کاکوروی، عبدالرحمٰن صدیقی، رفعت برہان پوری، فتح محمد شمس، شوکت برہان پوری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بیسویں صدی میں آزادیِ ہند سے پیشتر نور نظامی، ظفر کھنڈوی، امیر الدین اثر، راغب برہان پوری، تجمل حسین جوہر، حاذق برہان پوری، شیخ حمید کامل، یعقوب خاں بصر، عبدالرحمٰن نسیم، حکمت اللہ اختر، حیات خاں مضطر، شجاعت خاں راحت، استاد اسد وغیرہ کو کھنڈوہ کے ممتاز شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا خصوصاً فتح محمد ظفر اپنی قادرالکلامی اور کہنہ مشقی کے لیے مشہور تھے اور گرد و نواح میں منعقدہ کل ہند مشاعروں میں اکثر مدعو کیے جاتے تھے۔ موصوف نے درجنوں شاعروں کی رہنمائی کی اور کھنڈوہ میں شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا ان کے کلام کا رنگ داغ اسکول سے مطابقت رکھتا تھا اور شعروں کی برجستگی، روانی اور سلاست دامنِ دل کو کھینچتی تھی۔ سہل ممتنع اور سادگی ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات تھیں۔ بطورِ نمونہ دو شعر دیکھیے:

تمہارا اس قدر بے داد کرنا
سکھا دے گا مجھے فریاد کرنا

آج اپنی بلندی پہ اسے ناز ہے بے جا
وہ خاک جو کل تک مری ٹھوکر سے اڑی ہے

ظفر کے ہم عصر، جن سے ان کی معاصرانہ چشمک بھی رہتی تھی، نور نظامی بھی استادانہ مرتبے پر فائز تھے۔ زین خاں نور کے تلامذہ کا حلقہ خاصا وسیع تھا ان کا کلام شستہ و شائستہ، پہلودار اور لطیف و بلیغ ہوتا تھا دبستان امیر مینائی سے متاثر تھے۔ نرم وسبک الفاظ میں معاملات حسن و عشق اور وارداتِ قلب کی ترجمانی عمدگی کے ساتھ کرتے تھے کیا خوب شعر کہا ہے:

دسترس میرے جنوں کی نہ وہاں ہو جائے
دامنِ دل کو مرے پردۂ محمل نہ بنا

اُن کا یہ پہلودار شعر بھی لائق سماعت ہے:

علم و حکمت کا راستہ اکثر
دشت دیوانگی سے ملتا ہے

کھنڈوہ کے شاعروں کی اگلی نسل پر شیخ محمد ظفر کے ساتھ استاد نور کے اثرات بھی مرتسم ہوئے ہیں دیگر شاعروں میں شیخ حمید کاکل کا مطلع ہے:

ساحل پہ سر پٹکتا ہے دریا ترے لیے
آجا کہ خاک اُڑاتا ہے صحرا ترے لیے

اور حکمت اللہ اختر فرماتے ہیں:

چل بسا ہے کیا کوئی دیوانۂ نازک مزاج
ہر کڑی کرتی ہے ماتم خانۂ زنجیر میں

اس وقت تک نارمل اسکول کھنڈوا کا ادبی جریدہ "بہارستان" بے قاعدگی سے سہی، لیکن شائع ہوتا تھا جس کے مدیر شارق نیازی ہوا کرتے تھے۔ سیٹھ مظہر الدین، حاجی صلاح الدین اور دیگر ادب دوست رؤسا اکثر بڑے پیمانے پر کل ہند مشاعروں کا بندوبست کرتے تھے۔ قوالیوں اور رام دنگلوں کے نام پر بھی شہر میں شعر و ادب کے چرچے ہوتے تھے۔ جن میں استاد شاعر فی البدیہ شعر کہتے تھے۔

بعد ازاں اُس نسل نے کاروانِ ادب کو آگے بڑھایا جو غیر منقسم ہندوستان کی زائیدہ تھی لیکن جس نے اپنی پہچان دنیائے ادب میں ۱۹۴۷ء کے بعد مستحکم کی۔ اس میں سر فہرست ممتاز خوشتر، شوق ماہری، فائق برہان پوری، اختر رام پوری، معین الدین فاروقی، عزیز قصری، راشد برہان پوری، حفاظت کھنڈوی، گرامی چشتی، عیش ماہری، فرید شیخ، آزاد امیدی، مقبول نیازی، جاوید انصاری، محمود درانی، عبدالحمید ماہری، علیق برہان پوری، ظہیر الدین مدنی، قاضی حسن رضا، فاضل برہان پوری، شادان احسانی، مخدوم جابر، نشتر کھنڈوی، حسن بشیر، طالب قریشی، خورشید ساز، قاضی انصار، وقار حسین، ساحر ادیبی، خلیل کھنڈوی، قمر اقبال، آدم

ملی عامر، ریاض احمد خاں وغیرہ کے نام نمایاں ہیں ان لوگوں میں سے ظہیر الدین مدنی، فرید شیخ، معین فاروقی، جاوید انصاری، نثار حسین وغیرہ کی تنقیدی و تحقیقی کتابیں مقبول نیازی کے خاکے اور خود نوشت سوانح، گرامی چشتی کے ڈرامے، قاضی انصار اور ریاض احمد خاں کے ادب اطفال سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں علاوہ ازیں ممتاز خوشتر، حمید ماہری، خلیل کھنڈوی، اختر رام پوری، فائق برہان پوری، شوق ماہری، فاضل برہان پوری، قمر اقبال، قاضی حسن رضا، آزاد امیدی، راشد برہان پوری وغیرہ کے شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔

شوق ماہری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ماہر القادری کے شاگرد اور مقامی غزل گویوں میں ممتاز ترین حیثیت کے مالک ہیں ہر چند کہ نظمیں بھی کہتے ہیں مگر غزل ان کا خاص میدان ہے طرز ادا کی لطافت، کلاسیکی رچاؤ اور کلام کی شگفتگی ان کے امتیازات ہوتے ہیں:

پہلے جب تک نہ تیرا نام لیا
ہم نے شیشہ چھوا نہ جام لیا

ماہر القادری کے دوسرے شاگرد عیش کھنڈوی اپنے استاد کے رنگ میں ہی غزل کہتے تھے۔ ان کی عمر اگر اور وفا کرتی تو اساتذہ میں شمار کیے جاتے شعر کچھ اس انداز کے ہوتے تھے:

حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے
کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں

فرید شیخ تنقید و تحقیق کے علاوہ شاعری میں بھی دخل رکھتے ہیں زبان پر مضبوط گرفت کے ساتھ ان کے اشعار میں گھلاوٹ اور رچاؤ ایک نئے ذائقے سے روشناس کرتے ہیں موصوف کا ایک شعر:

مصیبتوں میں خدا یاد آہی جاتا ہے
اسے شکستِ خیالِ صنم نہیں کہتے

ممتاز خوشتر، ناطق گلاؤٹھی کے معروف شاگرد اور خود کئی شاگردوں کے استاد تھے قادر الکلامی اور روایت کی پاسداری ان کے کلام کا جوہر ہے کہتے ہیں:

جب سے خفا ہوئے ہیں وہ کیفِ شباب مٹ گیا
روٹھ گئی ہے فصلِ گل، مجھ سے بھری بہار میں

جاوید انصاری کو سنگلاخ زمینوں میں رواں دواں شعر کہنے پر قدرت حاصل تھی:

جھک کر نگاہِ ناز نے پیہم چلائے تیر
دیکھا نہ ہم نے ایسا کہیں ہوشیار مست

گرامی چشتی، طبّاع اور ذہین قلم کار تھے انھوں نے بمبئی سے یکے بعد دیگرے کئی ہفت روزہ پرچے نکالے نیز جنگ آزادی کے موضوع پر کچھ ڈرامے بھی قلمبند کیے ان کی ہر غزل میں بانکپن اور جوشِ طبع کی جھلک ملتی ہے کہتے ہیں:

حیات و موت کی اُس کشمکش میں مبتلا ہوں میں
کہ جیسے کوئی کشتی میں ہو اور کشتی ہو طوفاں میں

ایوب شاداں احسانی کی غزل رنگِ قدیم میں اپنی برجستگی اور لطافت کی بناء پر جاذبِ توجہ ہے موصوف احسان دانش کے شاگرد تھے نمونتاً ایک شعر ملاحظہ ہو:

جدھر دیکھو نظر آتی ہیں تصویریں نشیمن کی
قفس میں کس سے سن لی ہے رہائی کی خبر میں نے

حسن بشیر نے اپنے پیچھے کچھ تحریریں نثر میں بھی چھوڑی ہیں لیکن ان کے جوہر غزل میں ہی کھلتے تھے۔ ان کے کلام میں عصری حسیت اور جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ہندوستان گیر شہرت حاصل کرتے:

سیکڑوں رنگ میں، لفظ کے روپ میں، خون کی شکل میں، راہ چلتے ہوئے
سر سے ایڑی تلک اتنے سوراخ تھے مجھ میں جو کچھ بھی تھا سب بکھرتا گیا

قاضی حسن رضا کا مجموعہ کلام "میثاق" شخصیت کے کرب، اشعار کی تاثیر نازک کیفیات کے اظہار اور صلابت کے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر دیکھیے:

اگر آندھیوں سے ملاقات ہو
ہمارے لیے بھی ہوا مانگنا

قاضی انصار ادبِ اطفال کے علاوہ غزلیں بھی تخلیق کرتے ہیں اور اکثر رواں دواں شعر نکالتے ہیں کیا خوب کہا ہے:

ہم سفر جس جگہ بس ٹھہر جائے گی
تیری یادوں کو لے کر اُتر جاؤں گا

اسی دور کے ایک اور شاعر حفاظت کھنڈوی متعدد شاگردوں کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور اکثر مشاعرے منعقد کرتے ہیں ڈوب کر کہتے ہیں ان کے شعر میں تغزل، سلاست اور زبان کی لطافتیں پائی جاتی ہیں ایک شعر:

خود جلا ڈالا نشیمن میں نے اتنا سوچ کر
زندگی بھر بجلیوں سے کون شرمندہ رہے

ادیب سہارنپوری کے شاگرد ساحر ادیبی طنز و مزاح نگار تھے اکثر نظموں میں ظرافت کی پھلجھڑیاں روشن کرتے تھے اور ہزل بھی خوب کہتے تھے بھوپال مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنا تو ساحر نے فرمایا:

اب سارے مگر آ گئے بھوپال میں ساحر
بھوپال ہے ہو تال یا بھوپال ندارد

میں سمجھتا ہوں لکھنے والوں کی اس صف کا تذکرہ "نئے چراغ" کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ماہنامہ "نئے چراغ" ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء راقم الحروف کی ادارت میں نکلتا رہا ہندو پاک کے درجنوں ممتاز اور اہم شاعر، افسانہ نگار اور نقاد اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے اس کی مجلس ادارت میں حسن بشیر، قاضی انصار اور حسن رضا بھی شریک تھے اسی ادارے کے زیر نگرانی انجمن ترقی اردو شاخ کھنڈوہ اور نیشنل لائبریری بھی عرصے تک اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں کوشاں رہی۔ مدیران "نئے چراغ" سیٹھ عبدالطیف، پرنسپل اقبال احمد، علی احمد قریشی، حاجی صلاح الدین، مخدوم جابر، ڈاکٹر خورشید صدیقی، خان بہادر، حفاظت علی، محبوب تاج، ولی اللہ انصاری، منشی جلیس، ڈاکٹر مسرت حسین اور ناصر حسین وغیرہ کی مجاہدانہ خدمات کے نتیجے میں مذکورہ بالا چند سالوں میں

کھنڈوہ اور اس کے گرد و نواح میں متعدد اردو میڈیم پرائمری اسکول، مڈل اسکول اور دو اردو میڈیم ہائر سیکنڈری اسکول قائم ہوئے مقامی گرلز کالج میں اردو مضمون کی تدریس کا سلسلہ بھی انجمن ترقی اردو کی پیہم کاوش اور مطالبے کا نتیجہ ہے۔ شہر میں اردو داں آبادی خاصی ہے۔ لیکن افلاس کا دور دورہ ہے بایں ہمہ سال میں دو تین کل ہند مشاعرے ضرور منعقد ہوتے ہیں اور اب تو خیر سے ادبی سیمینار اور اردو کے خدمت گزاروں کے جشن بھی ہونے لگے ہیں۔ مقصود علی ضامن کے قلمی رسالے "محشرِ خیال" اندر سین اثر کے ماہنامے "شجر" اور صفدر رضا کے سہ ماہی پرچے "طلسمِ حرف" نے بھی کھنڈوہ میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں حصّہ لیا۔

اس علاقے میں پچھلے پندرہ بیس برسوں میں لکھنے والوں کی ایک تازہ دم صف نمودار ہوئی ہے جس میں چار شعری مجموعوں کے شاعر عاصی فائقی، "طلسمِ حرف" کے مدیر اور ایک مجموعہ کلام کے مصنف صفدر رضا، نظم نگار سکندر عرفان امتیازی حیثیت رکھتے ہیں نسبتاً جدید تر نسل میں عبداللہ شیخ، اقبال نصیب، اختر قریشی، قدرت اللہ راہی، رفیق شاہد، حبیب حباب، اقبال گرامی، اختر آصف، اسد اللہ اسد، صغیر منظر، اظہر الدین، ہارون فراق، اختر محمود، بشیر زیدی، عبدالغفار شاطر، دلکش کھنڈوی وغیرہ لائق ذکر ہیں بطور نمونہ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نہ سایہ ہے نہ ٹہنی پر ثمر ہے
یہ موجودہ زمانے کا شجر ہے

(عاصی فائقی)

آزادیِ وطن کی جہاں بات آ گئی
سر اپنے، تھالیوں میں سجا لائے یار لوگ

(صفدر رضا)

حمید سعید دلکش مزاح نگار ہیں:

ابھی سے اور منّت مان لی ہے ایک لڑکے کی
ابھی دو دن ہوئے ہیں ایک کی منّت اتاری ہے

دوسرے مزاح نگار عبدالغفار شاطر کا شعر ہے:

گھر میں بیوی سے ہوئی جنگ تو بدھوارے چلے
قافیہ ہونے لگا تنگ تو بدھوارے چلے

اور یہ ہیں کچھ دوسرے شعرا کے اشعار:

جتنی جینے کی خواہش ہماری بڑھی
اتنا دشوار دنیا نے جینا کیا

(اسد اللہ اسد)

مجھ کو دیکھو کبھی احساس کے آئینے میں
میں تمھارا ہی تمھارا ہوں تمھیں کیا معلوم

(بشیر زیدی)

چھپاتے نہیں بہاروں میں
کچھ پرندے عجیب ہوتے ہیں

(اقبال گرامی)

کل اندھیرے مرے مخالف تھے
ان دنوں روشنی ستاتی ہے

(اشفاق مضطر)

دیوار و در پر پھیل گئی چاندنی فراق
لگتا ہے کوئی آج مرے گھر بھی آئے گا

(ہارون فراق)

میں بھی اِک مشتِ خاک رکھتا ہوں
تیری مٹھی میں آسمان سہی

(صغیر منظر)

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ کھنڈوہ کی صحت مند ادبی روایت کا خون ان میں بھی موجزن ہے توقع ہے ان لکھنے والوں میں سے کچھ آنے والے دور کے نمائندہ فنکار ہوں گے۔

یادوں کا سفر۔ بابا ذہین شاہ تاجی

افتخار احمد عدنی

اہلِ دل کا کلام لوگوں کو کس طرح متاثر کرتا ہے اس کا کچھ اندازہ مجھے بابا ذہین شاہ صاحب پر اپنے پچھلے مضمون کی اشاعت کے بعد ہوا۔ ایک صاحب نے فون کر کے مجھ سے کہا یہ کیا غضب کے بول لکھ دیے آپ نے۔

موسے بول نہ بول، میری سن یا نہ سن
میں توہے نہ چھوڑوں گی اے سانورے

انھوں نے کہا میں کیا بتاؤں میرے دل پہ کیا گزری انھیں پڑھ کر۔ نہایت شائستہ لہجے اور کمزور سی آواز میں وہ بات کر رہے تھے ان کی شائستگی اور مذاق سے متاثر ہو کر میں نے انھیں خانقاہ تاجیہ لے جا کر یہ چیز سنوانے کی پیشکش کی۔ انھوں نے کہا کہ میری صحت کہیں جانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے لیے یہ بول ہی کافی ہیں۔ میں نے کہا ایسی صورت میں آپ کے لیے میں ایک کیسٹ بنوا لوں گا۔

منشی رضی الدین قوال سے پہلی دفعہ یہ چیز سن کر بابا صاحب نے کہا تھا۔ یہ کسی صاحبِ حال کا کلام ہے۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ جب حضرت فخرالدین جنھیں شمالی ہند اور خاص طور پر پنجاب میں سلسلۂ نظامیہ کا مجدد کہا جاتا ہے محبوب الٰہیؒ کی محبت میں گلبرگہ چھوڑ کر دلی آئے تو ان کے ایک چاہنے والے سے ان کی جدائی برداشت نہ ہو سکی وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئے یہ ان ہی کا کلام ہے۔

نجام کو لال فخر دین پیارے
تمری کہا کے میں کت جاؤں رے

اسی پُرتاثیر کلام کا اثر تھا کہ اہلِ ملامت سے قدرت اللہ شہاب کی مغایرت دور ہوئی اور وہ بغیر کسی کو خبر کیے بابا صاحب سے ملنے لگے۔

مجھے جن صاحب نے فون کیا تھا ان کا نام ہے ضمیر نیازی وہ ایک صحافی ہیں۔ دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ "صحافت زنجیروں میں" اور "صحافت کا محاصرہ" اور آج کل اپنی تیسری کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے اہلِ درد بھی صحافت سے وابستہ ہیں شاید اسی دردمندی نے ان کی صحت کا یہ حال کر دیا ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز سننے کے لیے بھی گھر سے نہیں نکل

سکتے۔ ان کی ناتواں آواز سے بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ خدا ان کے دردمند دل کی حفاظت فرمائے۔

میرے مضمون میں چونکہ بیدل کا ذکر تھا اس لیے انھوں نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔ انھوں نے بتایا کہ بیدل کا یہ مصرعہ بہت قیمتی سرمائے کی طرح ان کے ذہن میں محفوظ ہے وہ مدت سے دوسرے مصرعے کی تلاش میں ہیں سبطِ حسن مرحوم کے پاس بیدل کا دیوان تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تلاش کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا کچھ اور حضرات کی طرف رجوع کیا مگر کامیابی نہ ہوئی مصرعہ یہ ہے:

واکرد نقاب از رخ و بر چشم جہاں بست

اس مصرعے کو وہ صحافت پر دورِ ضیاء الحق کی گرفت کے سلسلے میں استعمال کرنا چاہتے تھے جب صحافت پر سے بیرونی دباؤ اٹھا کر اندرونی احتساب کی کڑی شرط عاید کر دی گئی تھی اور اس طرح صحافت کی رہی سہی آزادی بھی ختم ہو گئی تھی۔ حکومت کے عملے کی گرفت سے بچنا آسان تھا لیکن مدیر کے احتساب سے بچنا مشکل تھا۔ دوسرے مصرعے کی تلاش کا وعدہ تو میں نے کر لیا، لیکن کامیابی کی مجھے کم اُمید تھی۔ ایک ہفتے بعد میں دیوان بیدل لے کے بیٹھا تو وہ غزل بھی مجھے مل گئی اب سنیے بیدل کا شعر اس کا تعلق آزادیِ صحافت کے سلب ہونے سے نہیں ہے لیکن دوسرے مصرعے کو یقیناً اس معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے، اس میں محبوبِ ازلی کی غیرتِ ناز کا ذکر ہے جس نے یہ گوارا نہ کیا کہ ہر کس و ناکس کی نگاہیں اس کے حسن کو دیکھیں:

از غیرتِ ناز است کہ آں حسنِ جہاں تاب
واکرد نقاب از رخ و بر چشم جہاں بست

یہ دراصل غیرتِ ناز کا تقاضہ تھا کہ اُس حسنِ جہاں تاب نے اپنے چہرے سے نقاب اُتاری تو اُسے اہلِ جہاں کی آنکھوں پہ باندھ دیا۔

بابا ذہین شاہ صاحب یہ شعر سنتے تو وجد میں آ جاتے۔ ممکن ہے یہ غزل خانقاہِ تاجیہ کے نصابِ سماع میں شامل ہو جاتی۔ اس غزل کے دو اور شعر سن لیجیے اور بیدل کی بصیرت کی داد دیجیے۔

شہرت طلباں غرہ بہ اقبال مباشید
سر ہاست دریں جا کہ بلندی بسناں بست

اے نام و نمود کے طلب کرنے والو، اقبال کے گھمنڈ میں نہ رہنا یہاں بہت سے سر ایسے ہیں جن کے لیے بلندی کو نوکِ سناں سے وابستہ کر دیا گیا ہے

ساماں کمال آنہمہ برخویش مچینید
انبوہیِ ہر جنس کہ دیدیم دکاں بست

کمال کے ساز و سامان کا انبار اپنے چاروں طرف مت اکھٹا کرو، ہم نے تو یہی دیکھا کہ کسی جنس کی غیر ضروری بہتات دکان کے بند ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

پاکستان کے ماضی قریب کی تاریخ میں کیسی سربرآوردہ شخصیتیں چند گز یا چند ہزار گز کی بلندی پر لقمۂ اجل بن گئیں اور حصولِ وسائل یا حصولِ اقتدار کی کوشش میں کتنی دکانیں بند ہو گئیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس مضمون میں ان ممتاز لوگوں کے تاثرات لکھوں جو بابا صاحب سے ملتے رہے تھے۔ یہ کام میں اگلے مضمون کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں ہوا یہ کہ میرے واجب الاحترام دوست حضرت کے ہاں ایک ادبی محفل ہوئی جس میں مجھے بابا صاحب کے ایک معنی خیز جواب سے آگاہی ہوئی۔ اس سے مجھے بہت سی

باتیں یاد آگئیں۔ موضوع بہت نازک ہے۔ شاید میں اس پر لکھنے کی کبھی ہمت نہیں کرتا۔ لیکن اس غیر متوقع معلومات سے یسا لگا کہ جیسے باباصاحب خود چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ لکھا جائے۔ چونکہ باباصاحب کا جواب غالب کے حوالے سے تھا لہٰذا میں بھی غالب کے ایک شعر سے اس جسارت کا جواز حاصل کر رہا ہوں:

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

س محفل میں میزبانِ خصوصی "حضرت محل" تھیں اور ان کے چھوٹے بھائی جو بہت سی محفلوں کی زینت ہوتے ہیں خاموشی سے معاون میزبان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب نماز مغرب اور چائے کا وقفہ ہوا تو بہت سے لڑکے اور لڑکیاں میزبانی میں مصروف نظر آئے حضرت نگراں میزبانِ اعلیٰ کے منصب پر فائز تھے ایک میزبان مہمان اطوار جو شاید سب سے بعد میں محفل میں آئے تھے چائے سے فارغ ہو کے مجھ سے کہنے لگے کہ وہ جب باباصاحب کے پاس پہلی دفعہ گئے تو وہ محبت میں گرفتار ایک نوجوان تھے، انھوں نے اپنی مشکل بیان کی تو باباصاحب نے پوچھا آپ نے غالب کو پڑھتا ہے جب انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو بابا صاحب نے غالب کے ایک مصرعے کا چھوٹا سا ٹکڑا پڑھا "نہ زیاں تھا، نہ سود تھا" جوانی کی محبتیں خواب ہی تو ہوتی ہیں آنکھ کھلتے ہی خواب کا نشہ زائل ہو جاتا ہے سود و زیاں کا احساس تک نہیں رہتا۔ لوگ طرح طرح کے مسائل لے کر باباصاحب کے پاس آتے تھے بعض خاندانی جھگڑوں میں مبتلا ہوتے تھے۔ بعض مالی مشکلات میں گرفتار بعض اپنے افسرانِ بالا کے ہاتھوں تنگ ہوتے تھے، اور بعض محبت کے ہاتھوں زندگی سے عاجز۔ ویسے تو وہ سب پر ہی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن دل کے ماروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہ دل کے مارے بڑی رازداری سے باتیں کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کے راز افشا ہو جاتے تھے۔ ان میں مرد بھی ہوتے تھے، عورتیں بھی۔ شاید عشق کے ماروں کے اس گزرتے ہوئے کارواں کو دیکھ کر ہی باباصاحب نے یہ شعر کہا ہے:

عالمِ عشق میں ہم نے تو یہ دیکھا ہے ذہین
کوئی کتنا ہی بگڑ جائے سنور جانا ہے

وہ عشق اور وقتی وارفتگی میں بڑی آسانی سے امتیاز کر لیتے تھے ایک بڑی خوبی ان کی محفل کی یہ تھی کہ سمجھنے والوں کو شعر کی زبان میں سماع کے دوران جواب مل جاتا تھا۔ بابا انور شاہ صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ ایک شخص کی باباصاحب کی محفل میں آمد سے وہ بہت کبیدہ خاطر رہتے تھے باباصاحب اس پہ خاص شفقت فرماتے تھے۔ یہ شفقت انھیں اور بھی ناگوار گزرتی تھی، اس لیے کہ اس شخص کے کردار میں بڑی خرابیاں تھیں۔ ایک دن باباصاحب کی ایک غزل قوال پڑھ رہے تھے مقطع شروع ہوا تو وہ شخص انور شاہ صاحب کو ساتھ لے کر باباصاحب کی خدمت میں نذر پیش کرنے پہنچا۔ مقطع یہ تھا:

خاک ہوں، پاک ہوں، ادنیٰ بھی ہوں، اعلیٰ بھی ذہین
خود پہنچ جائے گی جو چیز جہاں سے آئی

جب نذر پیش ہوئی تو باباصاحب نے انور شاہ صاحب کو بہت معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرائے وہ سمجھ گئے کہ یہ میری شکایت کا جواب ہے اور پھر کچھ عرصے وہ شخص خود بخود سلسلے سے خارج ہو گیا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک صاحب جو محبت میں سرشار تھے اپنی محبوبہ کو لے کر خانقاہ تاجیہ میں محفل سماع میں شریک ہونے خری شعر جس پہ محفل ختم ہوئی وہ باباصاحب کا یہ مقطع تھا:

رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے ذہین
چند اُڑتے ہوئے سائے تھے گریزاں نکلے

انھوں نے تو کچھ محسوس نہیں کیا لیکن ان کی محبوبہ کے دل میں یہ شعر بہت کھٹکا۔ چنانچہ محفل کے بعد انھوں نے شکایت کی کہ یہ شعر تو محبت پہ ایک طنز ہے۔ انھوں نے مجھ سے بات کی تو کہا کہ اس شعر کا رخ اپنی طرف موڑنے کی کیا ضرورت ہے اس میں تو ایک عمومیت ہے لیکن ان خاتون کے دل کی کھٹک بالکل بجا تھی اس لیے کہ واقعی یہ ہوا کہ ایک سال میں وہ ایک سایہ گریزاں کی طرح ان صاحب کی زندگی سے نکل گئیں بغیر کسی ناخوشگوار حادثے یا لڑائی جھگڑے کے۔ اس واقعے کی نوعیت ویسی ہی تھی جس میں نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

اس کے برعکس ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں جن میں رہائی کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ ایک روز ایک صاحب جو مجھ سے بہت بے تکلف تھے اور جن کی محبت سے باباصاحب خوب واقف تھے بڑے دکھے ہوئے دل کے ساتھ آئے اور بولے کہ آج میں باباصاحب سے صاف کہہ دوں گا کہ مجھے اس محبت کے عذاب سے نجات دلائیں۔ میں نے کہا محفلِ سماع کے بعد بات کرنا۔ ممکن ہے باباصاحب خود ہی اس موضوع پر گفتگو شروع کر دیں۔ یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ بعض لوگ بیقراری میں سماع کے دوران ہی باباصاحب کو اپنی بپتا سنانا شروع کر دیتے تھے۔ اور وہ بہت تحمل سے ان کی پوری روئیداد سن بھی لیا کرتے تھے محفل کے اختتام سے پہلے آخری چیز جو قوالوں نے شروع کی وہ حافظ کی غزل تھی۔ مقطع کی تکرار نے میرے دوست کا مسئلہ حل کر دیا:

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگانِ کمند تو رستگار اند

حافظ کو اس زلفِ تابدار سے کبھی رہائی حاصل نہ ہو۔ کیوں کہ آزاد تو دراصل وہ ہی ہیں جو تیری کمند میں گرفتار ہیں۔

باباصاحب کے وصال تک تو انھیں رہائی حاصل نہیں ہوئی تھی، بعد میں معلوم نہیں کیا ہوا۔ ایک صاحب جو بہت محتاط تھے محبت میں گرفتار ہوئے انھیں یہ پریشانی تھی کہ نہ جانے یہ محبت کس روحانی تجلی کا نتیجہ ہے یا ہوائے نفسانی کا وہ باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے باباصاحب کا قوال مدن جو ہر وقت ان کے گھر پہ رہتا تھا پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنا اضطراب مٹانے کے لیے ایک نعت سننے کی درخواست کی باباصاحب نے اجازت دے دی۔ انھوں نے ایک خاص نعت کی فرمائش کی مدن نے اس نعت کے بجائے باباصاحب کی ایک اور نعت شروع کی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

دل کا معاملہ ہے ہر رنگ میں انہی سے
ہر طرزِ دل رُبا میں ہیں دل رُبا محمد

نعت ختم ہونے کے بعد وہ نہایت مطمئن باباصاحب کے ہاتھ کو بوسہ دے کر لوٹ گئے بعد میں انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ عجیب محفل ہے، یہاں شعروں سے الجھنیں دور کی جاتی ہیں مجھے کیا معلوم تھا کہ میری محبت کا سلسلہ حضور تک پہنچے گا۔

باباصاحب نے مجھے بے تکلفی سے اپنے مسائل ان کی خدمت میں پیش کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ کبھی تو مسکرا کے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے، کبھی کسی غلط خیال پہ فوری تنبیہ کرتے، کبھی کوئی پابندی عاید کر دیتے، کبھی حافظ کے کسی مصرعے سے پابندی اُٹھا لیتے، کبھی صرف یہ کہتے، آپ دعا کرتے رہیے، اب یہ لکھتے ہوئے حافظ کا وہ بے نظیر شعر یاد آ رہا ہے:

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس

وزنندِ این مباش کہ نشنید باشنید

حافظ تیرا وظیفہ تو صرف دعا کرنا ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ اُسے سنا گیا یا نہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی فرماتے کہ اپنے فلاں بھائی کے لیے دعا کیا کرو۔ میں سمجھ جاتا کہ وہ کسی جذباتی الجھن میں گرفتار ہیں انھیں دعا کی بھی ضرورت ہے اور ہمدردی کی بھی۔ وہ اپنی شفقت اور توجہ سے اپنے مریدوں کی جذباتی الجھنیں دور کرتے رہتے تھے عشق و محبت اور اس کے نتیجے میں رشک و رقابت کے بے شمار مقدمے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے اس شعر میں انھوں نے شاید یہی بات کہی ہے:

زمین راہِ جنوں وہ مقام ہے جس سے
ہزار عشق و محبت کے کارواں گزرے

چند مہینے پہلے حضرت بابا یوسف شاہ کا عرس ہوا تو ہمارے پیر بھائی محمد رمضان صاحب نے عابدہ پروین کو اسلام آباد سے مدعو کیا۔ اہتمام یہ تھا کہ تمام قوالوں سے پہلے وہ اپنا پسندیدہ کلام سنائیں اور جب تک جی چاہے سنائیں۔ چونکہ وہ عارفانہ کلام بہت ڈوب کر پڑھتی ہیں لہٰذا بابا انور شاہ صاحب نے یہ اعلان کروا دیا کہ اس دوران کوئی نذر نہ پیش کی جائیں چنانچہ جس لگن سے عابدہ نے عارفانہ چیزیں سنائیں اُسی توجہ اور محویت سے اہلِ محفل نے انھیں سنا۔ ہمارے دوست فاروق احمد صاحب نے جو تصوف اور انتظامی امور دونوں میں دستگاہ رکھتے ہیں اس خیال سے کہ کہیں عرس کی محفل میں ایک خاتون کی شرکت پر کچھ روایت پرستوں کو اعتراض نہ ہو یہ اعلان کیا کہ آج جو محترم خاتون سماع کا آغاز کر رہی ہیں اس بزم میں ان کی شمولیت سے ہم ایک نئی روایت کی بنیاد ڈال رہے ہیں اور پھر انھوں نے مجھے دعوت دی کہ آغازِ سماع سے پہلے میں صاحبِ عرس حضرت بابا یوسف شاہ کی زندگی پر ایک مختصر تقریر کروں۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ شاید فاروق صاحب کو یہ یاد نہیں رہا کہ صوفی عبدالکریم صاحب کو یوسف بنانے میں بابا تاج الدّین نے ایک زلیخا کو ان کی زندگی میں شامل کیا تھا اور وہ نغمہ سرائی میں آپ اپنی نظیر تھیں۔ فاروق صاحب خود مجھے ایک ایسے صاحب سے متعارف کرا چکے تھے جنھوں نے خانقاہ میں ایک خاتون سے قوالی سنی تھی۔ جن واقعات کا میں نے اجمالاً اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

بابا تاج الدّین سے وابستہ ہونے کے بعد بابا یوسف شاہ صاحب کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب آیا تھا۔ ان کا نام عبدالکریم تھا۔ دینی تعلیم کی تکمیل انھوں نے اعلیٰ حضرت احمد رضا خان جیسے جلیل القدر عاشقِ رسول کے مدرسے میں کی تھی۔ حصولِ علم کے بعد روح کی پیاس انھیں اجمیر شریف لے گئی جہاں وہ حضرت صوفی عبدالحکیم کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس بیعت سے انھیں صابریہ، چشتیہ اور قادریہ نسبتیں حاصل ہو گئیں۔ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے جب ایک خاص مقام پر پہنچے تو ان کے پیر و مرشد نے غریب نواز کی خدمت میں پیش کیا۔ وہاں بوسہ دینے کے لیے جھکے تو ٹوپی سر سے گر گئی، باہر نکلے تو جوتا غائب تھا۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں درگاہ سے برآمد ہوئے یہ اشارہ تھا اس موڑ کی طرف جو ان کی زندگی میں آنے والا تھا۔ صوفی عبدالحکیم صاحب نے انھیں حکم دیا کہ جاؤ بابا تاج الدّین کی خدمت میں حاضری دو۔ وہاں گئے تو ایک بالکل مختلف دنیا نظر آئی۔ دل میں خیال آیا کہ یہ بزرگ باشرع نہیں ہیں مرشد نے کہاں بھیج دیا۔ یہ خیال آنا تھا کہ بابا تاج الدّین نے ڈانٹ کے کہا "مولوی کو یہاں سے نکال دو" خدام نے حکم کی تعمیل کی۔ صوفی عبدالکریم پہ سخت انفعال طاری ہوا ایک دن بابا تاج الدّین درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ عقیدت مند پاؤں دبا رہے تھے، صوفی عبدالکریم نے بھی بیعت کر کے پاؤں دبانے کی کوشش کی بابا تاج الدّین نے فوراً اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور اپنا جبہ اتار کے ان کی طرف پھینکا اور کہا "تیری شریعت تجھے ہی مبارک" خدام نے بابا کو

دوسرا جبہ پہنایا۔ جو جبہ صوفی عبدالکریم صاحب کی طرف پھینکا تھا اسے پہنتے ہی ان کی دنیا بدل گئی جذب و مستی کا عالم طاری ہو گیا۔ حجابات مرتفع ہو گئے تمام عبادات سے فارغ ہو گئے، تن بدن کا ہوش نہیں رہا، ایک دیوانگی میں ننگے سر، ننگے پاؤں میلوں بادیہ پیمائی کرتے جب اس عالم میں ایک زمانہ گزر گیا تو بابا نے نگاہِ ترحم کی اور ایک باؤلی میں بٹھا کے چلہ کرایا۔ جذب و شوق کے اس چلے سے برآمد ہوئے تو بابا نے خوش ہو کر اپنے شیدائی کا نام محمد یوسف رکھا۔ یہ تمام حالات تو "تاج الاولیا" میں درج ہیں لیکن ایک بہت اہم بات جو درج نہیں ہے اور جس کا علم مجھے بابا ذہین شاہ صاحب کی گفتگو سے ہوا یہ تھی کہ صوفی عبدالکریم کو یوسف بنانے سے پہلے ہی بابا تاج الدین کے دربار میں ایک زلیخا کی تربیت ہو رہی تھی۔ ایک خاتون جو جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی تھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بابا کے در پہ آ پڑی تھیں۔ انھیں خدا نے بہت پرسوز آواز دی تھی وہ عارفانہ کلام نہایت والہانہ انداز میں پڑھتی تھیں کنویں سے برآمد کر کے بابا تاج الدین نے اپنے یوسف کو زلیخا کی طرف متوجہ کر دیا اور اس شعر کو ایک حقیقت بنا دیا:

عمرے کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثارِ بت پرستے کر دی

(اس عمر کو جو آیات و احادیث کے مطالعے میں گزری تھی ایک بُت پرست پہ نثار کر دیا)

اور پھر یہ عالم ہوا کہ وہ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی چیزیں گاتی تھیں اور یوسف شاہ صاحب ڈھولک پہ ان کی سنگت کرتے تھے۔ بابا صاحب اس منظر سے بہت خوش ہوتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے یوسف اور زلیخا کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ جب یہ خبر بابا یوسف شاہ صاحب کی زوجہ کو پہنچی تو وہ فریاد کرتی ہوئی بابا تاج الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے بہت ہمدردی سے کہا "اماں وہ تو تیرا ہی ہے یہ تھوڑے دن کی بات ہے" زلیخا چند ہی سال میں معرفت کی منزل طے کر کے اپنے خالق سے جا ملیں اور بابا تاج الدین کا فرمان پورا ہوا۔

بابا صاحب نے ان واقعات کو "تاج الاولیا" میں شاید اس لیے شامل نہیں کیا کہ سلسلے کا عام مرید جن کا رشتہ صرف عقیدت اور احترام کا ہو تا ان کی معنویت کو نہیں سمجھ سکتے اور مجھے ممکن ہے اس لیے مطلع کیا ہو کہ میری تحریر سے اہلِ ذوق بابا یوسف شاہ صاحب کے روحانی سفر کی اس دل آویز جہت سے واقف ہو جائیں۔

ایک اور خاص بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ اس چند سالہ ازدواجی رفاقت میں دونوں پر جذب و کیف کی حالت طاری رہی۔ کبھی یہ جذب کے عالم میں نکل جاتے تھے اور وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں۔ اور کبھی وہ نکل جاتی تھیں اور یہ انھیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کیا خوب رفاقت تھی۔ دونوں اپنی ذات میں گم ہو کر ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہ تاریخ محبت کا ایک بے نظیر باب ہے۔

ایک دفعہ مجھے کسی سرکاری دورے کے سلسلے میں پشاور جانا تھا میں بابا صاحب سے رخصت ہونے کے لیے گیا۔ بابا صاحب نے کہا کہ پشاور میں درانی صاحب سے مل لینا عبداللہ درانی صاحب کو میں علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ بڑی دل آویز شخصیت کے مالک تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں وہ انجینئرنگ کالج میں پڑھاتے تھے۔ جب میں پشاور میں ان سے ملا تو وہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کئی سال کام کر کے ریٹائر ہو چکے تھے ان کے گھر کے برآمدے میں عقیدت مند نوجوان بیٹھے ہوئے تھے جب درانی صاحب برآمد ہوئے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ تیس سال گزرنے پر بھی ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ بڑی محبت سے ملے اور تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہاں بابا تاج

الدین کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی تب میری سمجھ میں آیا کہ بابا صاحب نے مجھے ان کے پاس کیوں بھیجا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اُن سے پوچھا کہ انھیں بابا تاج الدین سے کیا نسبت ہے ان کا جواب کچھ اس طرح کا تھا کہ ان کی نسبت کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور پھر انھوں نے اپنے شیخ قادر الاولیا کا ذکر کیا جو بابا تاج الدین کے چہیتے خلیفہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بتایا کہ جب وہ علی گڑھ میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے اور ان کی عمر صرف تیرہ چودہ سال کی تھی تو ایک پردہ کرنے والی لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کے اس پہ وہ ایسے فریفتہ ہوئے کہ اس کے خیال میں ہر چیز سے بیگانہ ہو گئے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ پڑھنے لکھنے سے بے نیاز ہو گئے۔ جب موسم گرما کی چھٹیوں میں ان کے والد مدراس سے انھیں لینے کے لیے آئے تو ان کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گئے۔ واپسی میں ناگپور اُتر گئے اور اپنے بیٹے کو لے کر بابا تاج الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے درّانی صاحب کو کسی بزرگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسی لڑکی کے خیال میں گم تھے۔ ان کے والد نے زبردستی انھیں بابا صاحب کے آگے جھکا دیا۔ اب جو انھوں نے سر اُٹھایا تو بابا تاج الدین کے بجائے وہی لڑکی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے فوراً اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا، اور اس وقت تک سر نہیں اٹھایا جب تک بابا تاج الدین نے سر پہ ایک چپت مار کے اوپر نہیں اُٹھایا۔ اس طرح ان کی تمام محبت کا رخ بابا صاحب کی طرف مڑ گیا۔ لیکن ایک کامل سالک مجذوب کی چپت رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ درّانی صاحب لڑکپن میں ہی مجذوب ہو گئے۔ ان کے والد کچھ عرصے بعد پھر اپنے بیٹے کو بابا تاج الدین کے پاس لائے اور درخواست کی کہ میرا بیٹا مجھے واپس دے دیجیے بابا صاحب نے شفقت فرمائی اور پیار سے سر پہ ہاتھ پھیر کے جذب کی کیفیت کو دور کر دیا۔

کچھ تذبذب کے بعد اپنا ایک اور تجربہ بیان کیا جس کی نوعیت ذرا سنگین تھی۔ تذبذب کا سبب یہ تھا کہ ان کا عقیدت مند ایک پٹھان نوجوان جو انھیں بڑی محبت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا سامنے بیٹھا تھا۔ پھر یہ کہہ کے کہ اس بچے سے کیا پردہ وہ واقعہ سنایا۔ وہ لندن میں ایک سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہاں انھوں نے اپنے کندھے پر بابا تاج الدین کا ہاتھ دیکھا، اور ہوش میں آ گئے۔

میں نے بابا ذہین شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ میں ان کی محفل سماع میں شریک ہوا، قوالوں نے ان کی غزل شروع کی مجھے لگا کہ ایک ایک کر کے میرے تمام راز سر محفل بیان کیے جا رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے چیخ کر ان سے کہا "آپ یہاں لوگوں کو ننگا کرتے ہیں" انھوں نے جواب دیا "جو خود ننگا ہو اسے کون ننگا کر سکتا ہے" پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرا سر ان کے زانو پر ہے اور وہ ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے دے رہے ہیں۔

درّانی صاحب سے یہ ملاقات بہت اہم تھی کچھ عرصے بعد ان میں ایک بہت نمایاں تبدیلی ہوئی وہ قادر الاولیا کے خلیفہ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں سلسلۂ تاجیہ کے فیوض و برکات کا مظہر بن گئے انھوں نے سوات میں قادر نگر بسایا اور اپنے پیچھے سلسلہ قادریہ تاجیہ کے شیدائیوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑی جو ان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

بابا ذہین شاہ صاحب کی محفلوں میں شرکت کے لیے سر پہ رومال باندھ کر بیٹھنا نامناسب لگتا تھا۔ چنانچہ میں نے فاروق احمد صاحب سے کہا کہ مجھے کسی ایسی دوکان میں لے چلیے جہاں ہلکی ٹوپیاں مل جائیں جنھیں تین چار گھنٹے تک سر پہ رکھنا بار نہ ہو، فاروق صاحب اہل دل آدمی ہیں، وہ صدر میں اپنے ایک ہم مشرب ٹوپی والے کی دوکان پہ لے گئے۔ جب میں ٹوپیاں پہن پہن کر دیکھ رہا تھا تو فاروق صاحب دوکان کے مالک سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ مجھے ٹوپی کی ضرورت بابا ذہین شاہ صاحب

دوسرا جبہ پہنایا۔ جو جبہ صوفی عبدالکریم صاحب کی طرف پھینکا تھا اسے پہنتے ہی ان کی دنیا بدل گئی جذب و مستی کا عالم طاری ہو گیا۔ حجابات مرتفع ہو گئے تمام عبادات سے فارغ ہو گئے، تن بدن کا ہوش نہیں رہا، ایک دیوانگی میں ننگے سر، ننگے پاؤں میلوں بادیہ پیمائی کرتے جب اس عالم میں ایک زمانہ گزر گیا تو بابا نے نگاہِ ترحم کی اور ایک باؤلی میں بٹھا کے چلّہ کرایا۔ جذب و شوق کے اس چلّے سے برآمد ہوئے تو بابا نے خوش ہو کر اپنے شیدائی کا نام محمد یوسف رکھا۔ یہ تمام حالات تو "تاج الاولیا" میں درج ہیں لیکن ایک بہت اہم بات جو درج نہیں ہے اور جس کا علم مجھے بابا ذہین شاہ صاحب کی گفتگو سے ہوا یہ تھی کہ صوفی عبدالکریم کو یوسف بنانے سے پہلے ہی بابا تاج الدّین کے دربار میں ایک زلیخا کی تربیت ہو رہی تھی۔ ایک خاتون جو جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی تھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بابا کے در پہ آ پڑی تھیں۔ انھیں خدا نے بہت پرسوز آواز دی تھی وہ عارفانہ کلام نہایت والہانہ انداز میں پڑھتی تھیں کنویں سے برآمد کر کے بابا تاج الدّین نے اپنے یوسف کو زلیخا کی طرف متوجہ کر دیا اور اس شعر کو ایک حقیقت بنا دیا:

عمرے کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثارِ بت پرستے کر دی

(اس عمر کو جو آیات و احادیث کے مطالعے میں گزری تھی ایک بُت پرست پہ نثار کر دیا)

اور پھر یہ عالم ہوا کہ وہ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی چیزیں گاتی تھیں اور یوسف شاہ صاحب ڈھولک پہ ان کی سنگت کرتے تھے۔ بابا صاحب اس منظر سے بہت خوش ہوتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے یوسف اور زلیخا کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ جب یہ خبر بابا یوسف شاہ صاحب کی زوجہ کو پہنچی تو وہ فریاد کرتی ہوئی بابا تاج الدّین کے پاس [illegible]۔ انھوں نے بہت ہمدردی سے کہا "اماں وہ تو تیرا ہی ہے یہ تھوڑے دن کی بات ہے" زلیخا چند ہی سال میں معرفت کی منزل طے کر کے اپنے خالق سے جا ملیں اور بابا تاج الدّین کا فرمان پورا ہوا۔

بابا صاحب نے ان واقعات کو "تاج الاولیا" میں شاید اس لیے شامل نہیں کیا کہ سلسلے کا عام مرید جن کا رشتہ صرف عقیدت اور احترام کا ہوتا ان کی معنویت کو نہیں سمجھ سکتے اور مجھے ممکن ہے اس لیے مطلع کیا ہو کہ میری تحریر سے اہلِ ذوق بابا یوسف شاہ صاحب کے روحانی سفر کی اس دل آویز جہت سے واقف ہو جائیں۔

ایک اور خاص بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ اس چند سالہ ازدواجی رفاقت میں دونوں پر جذب و کیف کی حالت طاری رہی۔ کبھی یہ جذب کے عالم میں نکل جاتے تھے اور وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں۔ اور کبھی وہ نکل جاتی تھیں اور یہ انھیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کیا خوب رفاقت تھی۔ دونوں اپنی ذات میں گم ہو کر ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہ تاریخ محبت کا ایک بے نظیر باب ہے۔

ایک دفعہ مجھے کسی سرکاری دورے کے سلسلے میں پشاور جانا تھا میں بابا صاحب سے رخصت ہونے کے لیے گیا۔ بابا صاحب نے کہا کہ پشاور میں درانی صاحب سے مل لینا عبداللہ درانی صاحب کو میں علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ بڑی دل آویز شخصیت کے مالک تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں وہ انجینئرنگ کالج میں پڑھاتے تھے۔ جب میں پشاور میں ان سے ملا تو وہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کئی سال کام کر کے ریٹائر ہو چکے تھے ان کے گھر کے برآمدے میں عقیدت مند نوجوان بیٹھے ہوئے تھے جب درانی صاحب برآمد ہوئے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ تیس سال گزرنے پر بھی ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ بڑی محبت سے ملے اور تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہاں بابا تاج

الدین کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی تب میری سمجھ میں آیا کہ باباصاحب نے مجھے ان کے پاس کیوں بھیجا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اُن سے پوچھا کہ انھیں باباتاج الدین سے کیا نسبت ہے ان کا جواب کچھ اس طرح کا تھا کہ ان کی نسبت کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور پھر انھوں نے اپنے شیخ قادر الاولیا کا ذکر کیا جو باباتاج الدین کے چہیتے خلیفہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بتایا کہ جب وہ علی گڑھ میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے اور ان کی عمر صرف تیرہ چودہ سال کی تھی تو ایک پردہ کرنے والی لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کے اس پہ وہ ایسے فریفتہ ہوئے کہ اس کے خیال میں ہر چیز سے بیگانہ ہوگئے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ پڑھنے لکھنے سے بے نیاز ہوگئے۔ جب موسم گرما کی چھٹیوں میں ان کے والد مدراس سے انھیں لینے کے لیے آئے تو ان کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوگئے۔ واپسی میں ناگپور اُتر گئے اور اپنے بیٹے کو لے کر باباتاج الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے درّانی صاحب کو کسی بزرگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسی لڑکی کے خیال میں گم تھے۔ ان کے والد نے زبردستی انھیں باباصاحب کے آگے جھکا دیا۔ اب جو انھوں نے سر اُٹھایا تو باباتاج الدین کے بجائے وہی لڑکی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے فوراً اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اور اس وقت تک سر نہیں اٹھایا جب تک باباتاج الدین نے سر پہ ایک چپت مار کے اوپر نہیں اُٹھایا۔ اس طرح ان کی تمام محبت کا رخ باباصاحب کی طرف مڑگیا۔ لیکن ایک کامل سالک مجذوب کی چپت رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ درّانی صاحب لڑکپن میں ہی مجذوب ہوگئے۔ ان کے والد کچھ عرصے بعد پھر اپنے بیٹے کو باباتاج الدین کے پاس لائے اور درخواست کی کہ میرا بیٹا مجھے واپس دے دیجیے باباصاحب نے شفقت فرمائی اور پیار سے سر پہ ہاتھ پھیر کے جذب کی کیفیت کو دور کر دیا۔

کچھ تذبذب کے بعد اپنا ایک اور تجربہ بیان کیا جس کی نوعیت ذرا سنگین تھی۔ تذبذب کا سبب یہ تھا کہ ان کا عقیدت مند ایک پٹھان نوجوان جو انھیں بڑی محبت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا سامنے بیٹھا تھا۔ پھر یہ کہہ کے کہ اس بچے سے کیا پردہ وہ واقعہ سنایا۔ وہ لندن میں ایک سخت آزمائش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہاں انھوں نے اپنے کندھے پر باباتاج الدین کا ہاتھ دیکھا، اور ہوش میں آگئے۔

میں نے بابا ذہین شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ میں ان کی محفل سماع میں شریک ہوا، قوالوں نے ان کی غزل شروع کی مجھے لگا کہ ایک ایک کر کے میرے تمام راز سر محفل بیان کیے جا رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے چیخ کر ان سے کہا "آپ یہاں لوگوں کو ننگا کرتے ہیں" انھوں نے جواب دیا "جو خود ننگا ہوا سے کون ننگا کر سکتا ہے" پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرا سر ان کے زانو پر ہے اور وہ ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے دے رہے ہیں۔

درّانی صاحب سے یہ ملاقات بہت اہم تھی کچھ عرصے بعد ان میں ایک بہت نمایاں تبدیلی ہوئی وہ قادر الاولیا کے خلیفہ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں سلسلۂ تاجیہ کے فیوض و برکات کا مظہر بن گئے انھوں نے سوات میں قادر نگر بسایا اور اپنے پیچھے سلسلہ قادریہ تاجیہ کے شیدائیوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑی جو ان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

بابا ذہین شاہ صاحب کی محفلوں میں شرکت کے لیے سر پہ رومال باندھ کر بیٹھنا نامناسب لگتا تھا۔ چنانچہ میں نے فاروق احمد صاحب سے کہا کہ مجھے کسی ایسی دوکان میں لے چلیے جہاں ہلکی ٹوپیاں مل جائیں جنھیں تین چار گھنٹے تک سر پہ رکھنا بار نہ ہو، فاروق صاحب اہل دل آدمی ہیں، وہ صدر میں اپنے ایک ہم مشرب ٹوپی والے کی دوکان پہ لے گئے۔ جب میں ٹوپیاں پہن پہن کر دیکھ رہا تھا تو فاروق صاحب دوکان کے مالک سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ مجھے ٹوپی کی ضرورت بابا ذہین شاہ صاحب

کی محفل سماع کی وجہ سے پڑی ہے وہ میرے پاس آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کافی عرصے باباصاحب کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ ایک واقعہ انھوں نے دلچسپ سنایا کہنے لگے ایک دفعہ میں خانقاہ گیا تو دیکھا کہ دو تین قوالوں کے بعد ایک خاتون قوال آئی اور اس نے آرام سے جم کر عارفانہ کلام سنانا شروع کیا مجھے ایک عورت کا مردوں کے درمیان بیٹھ کر قوالی سنانا عجیب سالگا۔ خیال تھا کہ وہ ایک چیز پڑھ کے اُٹھ جائے گی جب وہ نہیں اُٹھی تو مجھے بہت ناگوار گزرا اور دل میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ باباذہین شاہ کیسے شفیع ہیں کہ ایک عورت سے قوالی سن رہے ہیں۔ یہ خیال دل میں آنا تھا کہ باباصاحب نے اس خاتون کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ اب وہ ساری محفل سے بے نیاز ہو کر میری طرف مڑ گئی اور مجھ پر نظریں گاڑ کے گاتی رہی۔ جب وہ ان بولوں پر آتی:

تیری روئی میں چار بنولے۔ پہلے ان کو چن چن چن

تو مجھے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے چننے کے عمل کی تصویر کشی کرنے لگی ایسا لگا کہ جیسے دل کی رگیں ٹوٹ رہی ہوں۔ آب وآتش، باد و خاک۔ تیری روئی میں چار بنولے

پہلے ان کو چن چن چن

جب وہ اپنے ہاتھوں سے چننے کا عمل دکھاتی تو دل پہ قیامت گزر جاتی۔ میں سمجھا کہ اس محفل سے زندہ نہیں جاسکوں گا۔ میری حالت بگڑنے لگی تو باباصاحب نے اشارے سے اُسے روک دیا۔ بمشکل تمام میں گھر آیا۔ اور پھر ایسا ڈرا کے خانقاہ کا رخ نہ کیا۔ یہ قصہ سنا کے انھوں نے ایک ٹوپی مجھے تحفتاً دی۔ ایک ٹوپی میں نے خریدی عجیب دلچسپ انکشاف ہوئے ٹوپی خریدنے اور درّانی صاحب سے ملاقات کے نتیجے میں۔ ان باتوں کا اجمالاً میں نے اپنی تقریر میں حوالہ دیا چنانچہ عابدہ پروین کے گانے کو لوگوں نے سلسلے کی روایات کا تسلسل سمجھ کر بہت توجہ اور انہماک سے سنا۔ اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں محبت کی عجیب کرشمہ سازیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ تصوف یا شاید محبت کی حقیقت سے ناواقفیت کے باعث عزیز احمد مرحوم نے "تصور شیخ" میں جس دل کی فراخی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اس سے اس سلسلے کے مزاج کو سمجھنے والے نا آشنا نہیں ہیں۔ لیکن یہ نازک موضوع ہے۔ محبت کرنے والوں پر جو باباصاحب کی شفقت تھی اس میں جتنی وسعت تھی اتنی گہرائی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر داستان محبت کے وسط میں وہ خود براجمان ہوں۔ ان کے یہ شعر اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

محبت کسی نے کسی سے بھی کی ہو
مگر اس محبت کی غایت ہمیں ہیں
ادھر دیکھ حق کو اگر دیکھتا ہے
خدا نے محبت کی صورت ہمیں ہیں

پس نوشت۔ آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ جس ادبی محفل میں اس مضمون کی تحریک ہوئی اور جہاں میزبانوں کی اتنی بڑی تعداد تھی اور جن کے درمیان فرق مراتب کا اتنا اہتمام تھا کیا وہاں کوئی مہمان نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ میزبان صرف ایک دوسرے کی تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ یہ میزبان ہر صنفِ ادب پہ اتنا عبور رکھتے ہیں کہ اپنے سایل سے اپنے لیے ہر مہینے ایک ادبی محفل منعقد کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے کہ ایسا کرتے بھی ہوں۔ لیکن اس دن جتنے میزبان تھے کم از کم اتنے ہی مہمان بھی تھے۔ اور اس محفل کے مہمان خصوصی میرے دیرینہ کرم فرما جناب جمیل الدین عالی۔ یہ تو سنا تھا کہ اہل سخن کبھی ایک شعر سے مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ لیکن اس دن یہ دیکھا کہ عالی صاحب نے اپنی نثر کے ایک خاکے سے محفل لوٹ لی۔

اسلوبیات.... ایک وضاحت

قاضی قیصر الاسلام

اسلوبیات..... "اسلوب کو پرکھنے کی سائنس ہے۔" یہ جدید لسانیات کی ایک شاخ ہے اس سائنس کے تحت ادبی اسلوب (LITERARY STYLE) کا تفصیلی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یا اس سلسلے میں ایک اور بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اسلوبیات ایک ایسی سائنس ہے جس کے تحت بولنے والے (SPEAKERS) اور لکھنے والے (WRITERS) دونوں "لسانی انتخاب" سے کام لیتے ہیں۔ اسلوبیات کی اس مختصر سی تعریف میں لفظ "اسلوب" قابل توجہ ہے۔ اسلوبیات جدید لسانیات کا ایک شعبہ ضرور ہے تاہم اسلوبیات کی اصطلاح جس قدر نئی ہے اس کے برعکس لفظ "اسلوب" خود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ زبان یا لسان اپنے ماخذ میں ہوسکتے ہیں۔ لفظ اسلوب اپنی تمام تر قدامتوں کے باوجود اپنی نوعیت معنی کی سطح پر اگر اسے دیکھا جائے تو اس کے معنی کا تعین ماہرین زبان کے لیے آج بھی ایک ٹیڑھی کھیر بنا ہوا ہے۔ ادبی تنقید کے میدان میں اسلوب کی تعریف کے تعین کے مباحث آج سے نہیں بلکہ ارسطو یا پھر اس سے بھی پہلے چھیڑے جاتے رہے ہیں مگر ہنوز اس لفظ کی کوئی تسلی بخش یا جامع تعریف ممکن نہیں ہوسکی ہے۔ کیونکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ "اسلوب" کا ایک استعمال جو آج ہو رہا ہے کل یہ استعمال متروک قرار دیدیا جاتا ہے..... یعنی عمل تنقید کسی ایسے قطعی تیقن سے متعلق نہیں ہے جس کے تحت یہ باور کیا جاسکتا ہو کیونکہ بعض مصنفین یا کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا کوئی ایک اسلوب ہوتا ہو (یعنی یہ STYLISH ہوں) اور بعض لکھنے والے یا بعض کتابیں ایسی ہوتی ہوں کہ جن کا کوئی اسلوب ہی نہیں ہوتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلوب اپنے مفہوم یا معنی کے اعتبار سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے یا یہ کہ اس کی موزونیت اپنی نوعیت میں نزاعی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ تمام تحریری متن (TEXTS) کسی نہ کسی اسلوب کے مظہر ہوتے ہیں، کیونکہ اسلوب تو ایک ایسی چیز ہے کہ جو پوری کی پوری زبان پر محیط ایک معیاری خدوخال کی حیثیت رکھتا ہے... اور یہ کہ اسلوب نہ تو ادب سے مخصوص کوئی فاضلانہ (DE - LUXE) خصوصیت اور

ہے اور نہ ہی اسلوب کو کسی قدر ادب کی کوئی صورت قرار دیا جاسکتا ہے۔
گویا معلوم ہوا کہ اسلوب اظہار کا ایک انداز ہے۔ جسے لسانی حدود میں بیان کیا جاسکتا ہے ..... یعنی ایسی لسانی حدود جن کو غیر لسانی عوامل کے اعتبار سے بیش قیمت اور حق بجانب قرار دیا جانا ممکن ہوسکتا ہے۔ اظہار کے انداز کا یہ تصور گویا ایک متنازع سی صورت حال ہے۔ مگر اسلوب کی تعریف کے دوسرے دو اجزا متنازع نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ بیان کے کسی پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے جس کے لفظی اوصاف کے مقابلے میں ... ذاتی یا ثقافتی اعتبار سے اپنی ایک متعینہ اہمیت ہے۔ تنقید سے متعلق بعض مورخین ادب پر فکری دسترس کی صورتِ حال کو جس نام سے موسوم کرتے ہیں اُس فکری صورت حال کے تحت زبان کے مختلف پہلوؤں پر عمیق نظری سے کام لیتے ہوئے، اُس کے اندر موجود امیجری (IMAGERY) آواز کی ساخت (SOUND STRUCTURE) اور، نحویات (SYNTAX) وغیرہ کی صورتوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اور اس طرح اپنی زبان میں سلوبیات (STYLISTICS) کے مذکورہ پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی بھی تحریری متون (WRITTEN TEXTS) کے اسلوب کا تجزیہ کیا جاتا ہے ______ مگر تنقید سے متعلق مورخین ادب کی یہ دسترس فکر بڑی حد تک گمراہ کن لری صورت حال ہے۔ اور یہ گمراہ کن اس لیے ہے کہ اسلوبیات کا شعبہ تنقیدیات یا انتقادیات کے شعبے کا ایک ایسا تقسیم پذیر حصہ ہے جسے تاریخی طور پر ہمیشہ سے بالکل جدا شعبہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اور یہ کہ اس شعبے کے اپنے بالکل ہی الگ اصول اور منہاجات ہوا رتے ہیں۔ عصر حاضر کی جدید ترین تنقید کا فکری طالع (VERBALLY ORIENTED) لفظیاتی تنقید پر مبنی ایک ایسا بحان تنقید رکھتا ہے جس میں اصولوں کا فقدان ہوتا ہے اور یہ کہ جس رجحان فکر کی مثالیں ہمیں اور باخ، کرال اور اسپائزر ______ (AUERBACH, CROLL, SPITZER) کے تنقیدی عمل میں، طریقیاتی اور فکری جانبداری کی صورتوں میں نظر تی ہیں ..... لہٰذا جب صورت حال یہ ہو تو ایسی صورت میں اس رجحانِ فکری کو اسلوبیات کا نام دینا گویا تنقیدی عمل کو منہ جانے کے مترادف کسی عمل سے تعبیر کرنا ہے۔ اسلوبیات لسانیات کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں بکھراؤ یا پھیلاؤ کی بڑی بائش ہے۔ اس میں عمومی تنقیدی عمل کے تقابل میں رکھ کر پرکھا جائے۔ بالکل اسی نہج پر لفظ اسلوب (STYLE) فی ذاتہٖ بتاً تیکنیکی تعبیرات کا حامل لفظ ہے یعنی اسلوب کی تعبیرات کی کچھ ایسی صورتیں مثلاً ..... لب و لہجہ (TONE) یا عمومی طور پر ے خطابیہ (RHETORIC) بھی کہہ سکتے ہیں۔
کسی لسانی صورت کو قطعی طور پر اُن تصورات کے زیرِ دام لا کر جن کا اظہار ہم چاہتے ہیں گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ ناصات کو الفاظ میں ڈھالنے کی متبادل صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان متبادل صورتوں کے انتخاب کئے جانے کا عمل غیر لسانی ولوں کے تحت انجام پاتا ہے ..... مثلاً ذرا ان جملوں پر ہی غور کیجیے۔ یعنی اگر میں یہ جملہ کہوں کہ "SHUT THE DOOR!" دروازہ بند کردو۔ تو اس میں تحکم کا لہجہ اور تاثر پایا جاتا ہے۔ اور پھر اس بات کو اس جملے میں کہوں کہ ___ WONDER IF YOU WOULD MIND CLOSING THE DOOR, PLEASE گویا کہیے مگر کہیں برا نہ مان جائیے گا ..... ازراہ کرم ذرا دروازہ بند کر دیجیے ... گا .... تو اس جملے میں درخواست اور التجا کا لہجہ اور تاثر ملتا ہے۔ دونوں جملوں میں "منشائے بیان" تو ایک ہی ہے تاہم دونوں جملوں میں لہجہ و تیور ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے اور م و التجا" (ORDER/REQUEST) کے تعین کا انحصار جملوں میں استعمال کیے جانے والے الفاظ سے کہیں زیادہ ان ل کے "طرزِ ادا" (STYLE) کا مرہون منت ہے ..... یعنی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ابلاغ و اظہار کے وقوع کی تشکیلی نوعیت (STRUCTURIN) کہ جو کسی جملے کا بجائے خود ایک جزو لازم ہی ہوا کرتی ہے ... اس ابلاغی تشکیلی وقوعہ کی پوری ساخت کا

ماجرا کسی شخص کی ذاتی صورت حال سے وابستہ حقائق، یعنی اُس کی ادائیگیٔ اظہار یا طرزِ ادائے مطلب کے اُس کے اپنے خاص زاویہ پر مبنی ایک صورت ہوتی ہے۔ گویا اسلوبیات "اظہار و ابلاغ" (EXPRESSION/ COMMUNICATION) کا ایک ایسا باضابطہ منظم ڈسپلن (DICIPLINE) ہے جو یہ فریضہ انجام دیتا ہے کہ جس کے تحت "اسلوب" (STYLE) کا مہتم بالشان شہزادہ بحیثیت ایک سوار کے، رہوارِ متن (TEXTUALY RIDDEN) کو بطور ایک سواری (VEHICLE) کے (اُس متن کو) استعمال کرتا ہے اور یوں گویا یہ یعنی اسلوب، متن سے علاوہ یا متن سے فاضل (EXTRA-TEXTUAL) ایک چیز تو ہوتا ہے مگر یہ اپنے اثرات متن پر کچھ اس طرح چھوڑتا ہے کہ خود متن (TEXT) بھی مہتم بالشان ہی کسی شے کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور یوں یہ متن خود بھی توقیر و تعظیم کی حامل ایک چیز بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح اسلوبیاتی نظام لسانی تزئین و تنظیم کی صورتوں کو تشکیل دے لیتا ہے ـــــ یعنی کچھ ایسی لسانی صورتوں کی تزئین و تشکیل جو بجائے خود باضابطگی کے حامل اوصاف سے مزین اور زیادہ اہم نوعیت کی ہوتی ہیں ـــــ ان میں فاضل لفظیاتی عوامل کے مخصوص اعراض یا علامتی سیلنوں کا ظہور عمل میں آتا ہے اسلوب کی یہ متعینہ صورت ایک ایسے سیاق (CONTEXT) میں رہ کر کام کرتی ہے کہ جس کی ایک جہت کو اگر ادب کی "طرفِ خارجی" (OUTSIDE LITRATURE) کا نام دیا جا سکتا ہے تو اس کی دوسری جہت کو ادب کی "طرفِ داخلی" (INSIDE LITRATURE) کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ادب کے ان ہر دو قطبین (POLES) کو ہم بہ الفاظ دیگر ادب کی ظاہری ساخت (SURFACE STRUCTURE) اور بطنی ساخت (DEEP STRUCTURE) کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر ادب کی طرفِ خارجی اور طرفِ داخلی سے مراد کیا ہے تو آئیے ہم ادب کی ان ہر دو جہتوں کو رولاں بارتھ کے مضمون تاریخ یا ادب میں دیے گئے ذیل کے اقتباس سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

> "رے سائن (RACINE) خود کو کئی زبانوں کا مرہونِ منت سمجھتا ہے۔ ان میں تحلیل نفسی، وجودی، المیہ اور نفسیاتی زبانیں شامل ہیں (ان زبانوں کے علاوہ بعض زبانیں ایجاد کی جا سکتی ہیں اور بعض تو ابھی ایجاد کی جائیں گی) ان زبانوں میں سے کوئی زبان بھی ایسی نہیں کہ جسے بے داغ (INNOCENT) کہا جا سکے۔ مگر رے سائن سے متعلق کسی زبان میں ایسی کوئی بھرپور صلاحیت کار موجود نہیں کہ وہ اس کے بارے میں پوری سچائی، کے ساتھ کچھ بتا سکے ـــــ چنانچہ زبان کی اس بے بضاعتی اظہار کو اگر تسلیم کیا جانا مقصود ہے تو پھر بالآخر ٹھیک ٹھیک طور پر سب سے پہلے ادب کی کسی مخصوص حیثیت یا اس کے مرتبہ کا تعین کیا جانا از بس ضروری ہے۔ مگر ادب کی کسی ایسی حیثیت کے تعین کا یہ ماجرا اپنے پس پُشت ایک نہ ایک مغالطے کو شامل رکھتا ہے ـــــ یعنی وہ ایک چیز جسے ادب کہتے ہیں اپنی مجموعی حیثیت میں قوانین و ضوابط، معروضات تکنیکی صورتوں کے علاوہ ان ادب پاروں پر مشتمل کوئی چیز یا ایک صورت حال ہے، جس کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہمارے معاشرے کی عمومی طور پر اجتماعی تنظیم و ترتیب کا بنیادی کام انجام دیتا ہے ـــــ گویا کسی معاشرے کو ٹھیک طور پر اس کی موضوعی صورت حال سے نکال کر اس کو

ایک ادارے کے پیکر میں (INSTITUTIONALISED SUBJECTIVITY) ڈال دینا ہے۔ لہٰذا اس فکری تحریک کی تقلید اگر مقصود ہو تو نقاد کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے بجائے خویش "تناقص فکری کے عمل سے گزرتے ہوئے گویا خود کو مقدر کی بازی جیتنے یا ہار جانے کے خطرناک کھیل سے وابستہ رکھتے ہوئے، رے سائین کے بارے میں پوری سچائی کے ساتھ کچھ کہنے کے لیے، صرف اور صرف ایک ہی راہ پر چلتے رہنے کا عزم صمیم باندھے اور وہ یہ نہ کرے کہ کبھی یہ راہ تو کبھی وہ راہ اختیار کر کے خود تذبذبِ فکری کا شکار ہو جائے ـــــ اور وہ (نقاد) ایسا صرف اس لیے کرے کہ بالاخر وہ بھی تو ادب کی دنیا سے ہی وابستہ ایک فرد ہوتا ہے ـــــ"

رولاں بارتھ نے اپنے مضمون "تاریخ یا ادب" میں رے سائن [1] (RACINE) کے حوالے سے مذکورہ بالا اقتباس میں ادب کی دو مختلف جہتوں کے درمیان واضح اور مخصوص امتیاز قائم کرنے کے لیے اساس فراہم کرنے کی سعی کی ہے۔ ادب کے اس پورے محیط میں ادب کی ان ہر دو جہتوں کے درمیان ایک واضح بنیاد قائم کیے جانے کی ضرورت اُس کو اس لیے پیش آئی کہ ادب کا پورا محیط ایک طویل عرصے سے جس الجھاؤ یا تذبذبِ فکری کا شکار چلا آ رہا ہے اس کو اس الجھن سے نجات دلائی جا سکے ـــــ اور وہ الجھاؤ یہ ہے کہ ادب کی تاریخ کی یہ صورت حال کہ یہ، یعنی ادب کی تاریخ کی ادب سے وہ وابستگی جو بحیثیت ایک ادارے کے اس کے ساتھ ہو (LITERATURE AS AN INSTITUTION) اور ادب کی دوسری جہت اس کی تخلیقی نوعیت (LITERATURE AS A CREATION) کا ماجرائے دِگر ہے، اور ادب کی ہر دو صورتیں ہدفِ تنقید بنتی ہیں۔

جہاں تک اول الذکر جہت (ادب بحیثیت ادارے کے) کا تعلق ہے، اس سلسلے میں بارتھ استدلال کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ادبی تاریخ کو اگر نہایت موزوں اور ٹھیک طور پر عقل کے زیر دام لا کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا مقصود ہو تو پھر بجائے خود ادبی تاریخ کو کچھ ایسے ادبی وظائف کا تعلق پیداوار، ابلاغ، ترسیل، عمل تصریف کے علاوہ اس کے تمام وظائف کے حالات یا شرائط کار کے متعین کیے جانے سے ہوتا ہے بہ الفاظ دیگر اس کے کہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ "ادبی تاریخ" کی تشکیل و ترتیب، اُس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ یہ خود کو اُس پورے معاشرے سے وابستہ و پیوستہ نہ بنائے رکھے جس معاشرے میں کہ خود یہ ادب پیدا ہوتا یا پروان چڑھتا رہا ہوتا ہے۔ گویا رولاں بارتھ کے نزدیک ادب معاشرتی یا اداراتی سرگرمیوں کی پیداوار ہوتا ہے انفرادی صلاحیتوں کا ماحصل نہیں ہوتا اس کا کہنا ہے کہ ادب کو تاریخی، ادبی اور وظائفی سطح پر لا کر اگر دیکھا جائے تو گویا ادب کا وجود بنیادی طور پر ایک وجودِ منقلب (RADICALLY TRANSFORMED) ہی ٹھہرتا ہے۔ بارتھ کہتا ہے کہ جب ادب ایک وجودِ منقلب کی صورت حال قرار پاتا ہے تو ایسی صورت میں یہ، یعنی ادب اپنے معروض یا مقصد کو تحلیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ادب کا مطالعہ ـــــ قوانین و ضوابط، رسوم و روایات اور اجتماعی ذہنیتوں کا مطالعہ قرار پاتا ہے ـــــ کسی فرد کی انفرادی تخلیقی مساعی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ ادب کی ان ہر دو جہتوں کا تعلق جن دو صورتوں سے ہوتا ہے اُن میں سے ایک صورت تو ادب کا وہ مقام ہے، جسے ہم ادب کی "طرفِ داخلی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور ادب کی یہ طرفِ داخلی اپنے محیط میں رہتے ہوئے، حسب دستور رسوم و

(۱) RACINE.... ایک مشہور المیہ نگار فرانسیسی شاعر ہے۔ جس کو المیہ نگاری کے میدان میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (مصنف)

روایات کے مطابق اپنی کارآوری انجام دیتا رہتا ہے کہ جن روایات کے تحت موضوعیت کی مختلف صورتوں کی تشکیل کا پہلو نکلتا ہو ـــــ اور اس کی (ادب) دوسری صورت وہ ہے جس کے تحت ادب، ادب کی "ظرف خارجی" کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ تاکہ یہ (یعنی ادب) اپنی تاریخ کچھ اس طرح سے لکھ سکے کہ جیسے یہ خود ادب کے وظائف، قوانین و ضوابط، تکنیکی صورتوں کے علاوہ اداروں کی کوئی تاریخ ہو ـــــ مختصراً یہ کہ یہ تاریخ ادب گویا خود اپنی ہی سطحی یا واضح صورتوں کی کوئی ایسی تاریخ ہو ـــــ جس کی اپنی کوئی پوشیدہ گہرائیاں نہ ہوں یا ایسا کوئی باطنی داخل نہ ہو کہ جس میں پایاب جانا ممکن ہی نہ ہو سکے۔

غرض یہ کہ مندرجہ بالا وضاحتوں سے معلوم یہ ہوا کہ کسی سیاق (CONTEXT) کے ہاتھوں کسی اسلوب کا تعین کیا جانا ایک ایسا عمل ہے جو ادب کی ظرفِ خارجی اور ظرفِ داخلی کے ہر دو قطبین یا ہر دو جہات کے اندر رہتے ہوئے ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب میں اسلوب کی مذکورہ صورت حال کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں کہ اسلوب کی مختلف صورتوں کے اوصاف کو اگر دیکھا جانا ممکن ہے تو ان اوصاف کو کسی مخصوص مصنّف یا ادب، کی ایک عہد یا پھر کسی مخصوص ترغیب و تحریک، یعنی کسی ایک صنفِ ادب کے حوالے میں زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ادبی اسلوب نگار حضرات عموماً جو طریقۂ نگارش اختیار کرتے ہیں اس کے تحت یہ لوگ جن مفروضات کو پرکھتے ہیں ان کی نوعیت کچھ یہ ہے :۔ مصنّف کے اسالیبِ نگارش، لسانی نشاناتِ انگشت (LINGUISTIC FINGERPRINTS) وغیرہ۔ اس صورت حال کو ہم جن تعمیمی صورتوں کے تحت ظاہر کر سکتے ہیں، اُن میں کچھ تو مخصوص طور پر مصنفین یہ ہیں۔ سیسرو، سینکا اور اٹیک (CICERONIAN, SENECAN, ATTIC) مذکورہ مصنفین اور اٹیک کے علاقائی طرزِ اسلوب کو ہم جن اسالیبِ نگارش کے تحت لا سکتے ہیں ان کو ہم BAROQUE یعنی بے ضابطہ یا ناقص اسلوب، MANNERED۔ یعنی با سلیقہ اسلوب، GRAND۔ عظیم الشان اسلوب، MIDDLE۔ اوسط اسلوب، LOW۔ پست اسلوب، TERSE۔ مختصر و جامع اسلوب، EXPANSIVE۔ وسعت پذیر اسلوب، FLORID۔ آراستہ و مزیّن اسلوب، PERIODIC۔ عہدوار اسلوب کے مختلف ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

سطور بالا میں اسلوب کے جو مختلف لیبل زیر بحث آئے ہیں، وہ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ادبی مطالعہ کے دوران اسلوبیات (STYLISTICS) ایک درجہ بند حیثیت کی حامل چیز ہے جس کے تحت مختلف تقسیمی معیارات (TAXONOMIC CRITERIA) کی بنیاد پر متن کی مختلف درجہ بندیاں کی جاتی ہیں ـــــ اور یہ درجہ بندیاں عموماً سانی/صوری، فاصل لسانی/ یا پھر دیگر صورت احوال کے تحت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

اسلوب کا انحصار، نمایاں پیش منظر کے بعض مخصوص خدوخال پر ہوتا ہے ـــــ یا اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب ظاہرہ لسانی ساخت کے نمایاں پیش منظر (FORE-GROUNDING) کے تحت تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ سی اسلوب کی اپنی ایک مخصوص بندشِ الفاظ (DICTION) ایسی ہو جو پورے متن میں بہت نمایاں ہو۔ اس اسلوب کی اپنی یک متواتر اور مستقل رواں موزونیت تحریر ہو ـــــ یا پھر اس میں اس کی اپنی نحویاتی ترتیب و تنظیم (SYNTACTIC ORGNIZATION) کے اندر کوئی تکراری صورت حال نفوذ پذیر ہو سکتی ہے۔ اسلوب کی یہ ثقل نوعی (DENSITY) بان کے ایک جزو کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ہماری شعوری توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ صورت حال ہمارے اندر اپنا ایک مخصوص اسلوبیاتی تاثر تو بہرحال چھوڑ سکتی ہے۔ اور ہمیں بہرکیف یہ محسوس تو ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں متن کسی مخصوص مصنف یا کسی مخصوص معاشرتی ثقافتی ماحول کی ایک نمایاں جھلک اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسلوب کا یہ ثقلِ نوعی (DENSITY) زیر احتساب کچھ اس طرح پر لایا تو جا سکتا ہے کہ یہ یعنی اسلوبیات بلاشبہ (لسانیات کے برعکس) مضراتی طور پر

اپنی نوعیت میں مقداری (QUANTITATIVE) ہے بلکہ اسلوبیات کی یہ صورت حال بسا اوقات تصریحی طور پر بھی اپنی ماہیت میں مقداری ہے۔ چنانچہ اگر ہم مقداری اسلوبیات (QUANTITATIVE STYLISTICS) کی انتہا پسندانہ مثالیں دیکھنا چاہیں تو ہمیں جی۔ یو۔ یلز (G.U.YULES) کی ادبی لغت سے متعلق شماریاتی تحریروں میں مل سکتی ہیں اور عصر حاضر کے قریب ترین زمانوں میں تصنیفی انکشافات کے ضمن میں کیے جانے والے وہ مطالعاتی نتائج جو کمپیوٹر کی مدد سے منظر عام پر لائے جا رہے ہیں غرضیکہ ان مطالعاتی نتائج سے بات واضح طور پر سامنے آتی جا رہی ہے۔ یہاں پر استحساب کی یہ صورت حال دریافت کی جانب رجوع کرتی نظر آتی ہے۔ یعنی ہم عموماً مفروضوں کی توثیق کرتے ہیں ـــــ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی صورت حال میں ایک ایسا نحوی یا لغوی رجحان پایا جاتا ہے کہ جس رجحان کے تحت ایک مخصوص عہد کے اسلوب سے متعلق ہمارے ادراک کی توجیہہ ہوتی ہے ایک ایسے ادراک کی واضح مثال ہمیں جوزفین مائل (JOSEPHINE MILE) کی تحریروں میں ملتی ہے۔

اسلوب کے اس تصور میں انتخاب کا تصوّر کچھ اس طرح سے شامل ہوتا ہے کہ اس کے دوران ایک ہی طرح کی نوعیت فکر میں اظہار کے مساوی طریقہ ہائے کار کارفرما ہوتے ہیں لہٰذا نئے ناقدین کے نزدیک اس طرح کی کوئی تجویز یا منصوبہ قابل قبول نہیں ہوا کرتا ـــــ کیوں کہ ان ناقدین کے نزدیک کسی متن میں لفظ کی تبدیلی گویا لازمی طور پر معنی و مفہوم کی تبدیلی خیال کی جاتی ہے اور جملوں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قضایاتی مافیہہ تو وہی ہوتا ہے مگر اس کا اظہار دوسرے مختلف طریقوں سے ہوتا ہے تاکہ معنی و مفہوم سے متعلق قاری کی تفہیم کا طریقۂ کار واضح طور پر معنی کا تعین کر سکے۔ رچرڈ اوہامان (RICHARD OHMANN) نے معنیاتی مافیہہ (SEMANTIC CONTENT) اور اسلوبیاتی یا خطابیہ صورت کے مابین اس طرح کے واضح امتیاز کی تجویز پیش نظر رکھی ہے۔ تاکہ واضح امتیاز کے اس طریقۂ کار کی توجیہہ ایک ایسی تقسیم کے تحت کی جا سکے کہ جہاں GENERATIVE لسانیات میں موجود اس کی ظاہری یا بیرونی ساخت اور اس کی اندرونی گہری ساخت دونوں کی تشریح کی جانی ممکن ہو سکے۔ نظریۂ اسلوب پر لسانیات اور انتقادیات کے درمیان مفاہمت کی جدید ترین صورت نہایت ہی موزوں اور متناسب طریق پر کی گئی ہے۔ کیوں کہ اسلوبیات تو اکادمک نوعیت کا ایک ایسا موضوع ہے جو اس وقت معرض وجود میں آیا کہ جب جدید لسانیات منظر عام پر آئی اور جدید لسانیات نے آج بھی لسانیات کی بعض تیکنیکی صورتوں کو اختیار کر رکھا ہے۔

چارلس بیلے (CHALES BALLY) ایک مشہور فرانسیسی اسلوب نگار گزرا ہے جو ساسیر کا شاگرد بھی تھا۔ بیلے نے اسلوبیات کے موضوع پر جو کام کیا ہے اس ماہر زبان کے کام آگے بڑھانے کا سہرا لیو اسپیزر (LEO - SPITZER) کے سر جاتا ہے۔ اسپیزر نے لسانیات اور ادبی تاریخ کے مابین موجود خلیج کو پُر کرنے کی مستحسن کوششیں کی ہیں۔ اسپیزر کے بعد دوسرا بڑا نام اسٹیفین اُلمان (STEPHEN ULMANN) کا ہے جو نہ صرف یہ کہ معنیات (SEMANTICS) کے مجیسے کا ماہر تھا بلکہ یہ فرانسیسی فکشن کے میدان میں بھی اسلوب نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوا ہے۔

اسلوبیات (STYLISTICS) یا جسے لسانی اسلوبیات کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ایک ایسا شعبۂ زبان ہے جس کا اصل فریضہ یہ ہے کہ یہ ادب کا تحلیلی مطالعہ اس طرح سے کرتا ہے کہ اس مطالعہ کے دوران جدید لسانیات کے تیکنیکی طریقوں اور اس سے متعلقہ تصورات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات زیادہ مناسب اور قابل ترجیح ہے کہ اس اصطلاح کو اسلوب کے لسانی مطالعہ تک محدود رکھا جائے ـــــ یعنی اسلوب کا ایک ایسا محدود مطالعہ جس کا تذکرہ ہم ابھی سطور بالا میں کر چکے ہیں اور لسانیات کے دیگر ادبی اطلاقات کے ضمن میں بعض دوسری موزوں اصطلاحات وضع کر لی جائیں۔

"ممد بھائی" ..... ایک مطالعہ

امتیاز احمد

ممد بھائی کیا ہے؟ کیا وہ غنڈہ ہے؟ دوسروں کا ہمدرد غم گسار اور شریف آدمی ہے؟ کمزور دل کا آدمی ہے؟ وہ مونچھیں کیوں رکھتا ہے؟ اُس کی مونچھیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟ پورے افسانے میں ممد بھائی کے ساتھ اس کی مونچھیں کیوں چھائی ہوئی ہیں؟ مونچھیں کٹوانا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا محض زبان دانی کے اظہار کے لیے اس محاورہ کا استعمال ہوا ہے؟ اُس کی شخصیت کی گتھی کیا ہے؟ وہ غنڈا اور دادا ہونے کے باوجود کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا، ایسا کیوں ہے؟ وہ غنڈا ہونے کے باوجود کچہری سے کیوں ڈرتا ہے؟ اور افسانہ نگار نے اُسے افسانے کا موضوع کیوں بنایا ہے؟ مونچھوں اور خنجر کا کیا تعلق ہے؟ کیا وہ ممد بھائی کی شخصیت کے تضاد کو دکھانا چاہتا ہے؟ کیا وہ اس معاشرہ پر طنز کرنا چاہتا ہے جو ایک شریف اور دردمند دل رکھنے والے آدمی کو ایسی صورت میں کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ہو محض ایک مفروضے کی بنا پر سزا دیتا ہے؟ کیا یہ IDENTITY CRISES کا افسانہ ہے؟ کیا مونچھیں ممد بھائی کی شخصیت کی شناخت، کے طور پر سامنے آتی ہیں جن کے ختم ہو جانے کے بعد ممد بھائی کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ اسی کے الفاظ میں "سالا اب ممد بھائی ہی نہیں رہا؟" ممد بھائی کا خنجر، مونچھوں اور فارس روڈ سے کیا تعلق ہے۔ کیا تینوں ممد بھائی کی پہچان ہیں؟ تینوں سے ممد بھائی کا رشتہ ایک ہی ساتھ کیوں ختم ہوتا ہے؟ کیا اوّل الذکر دونوں ممد بھائی کی اور آخرالذکر کی خود ممد بھائی پہچان ہے..... آخرالذکر یعنی فارس روڈ جہاں آٹھ آنے سے آٹھ روپے اور آٹھ روپے سے سو روپے تک کی عورتیں ملتی ہیں۔ جو بمبئی کا بدنام ترین علاقہ ہے۔ گندگی اور غلاظت سے بھرپور، بدمعاشی اور غنڈہ گردی کا اڈہ..... ممد بھائی ان سب کا ایک طرح سے نمائندہ اور سردار ہے۔ واحد متکلم راوی کے الفاظ میں "اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی ہے۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔" "اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا سپر مانتی تھیں چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا اس لیے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا۔" یعنی فنکار اس دادا (ممد بھائی) کی غنڈہ گردی کے عمل میں اشتداد کے ذریعے اس تضاد کو نمایاں کرنا چاہتا ہے جو اس کے ضمیر کی سادگی، صفائی اور پاکیزگی میں ہے اور ان سب کے ذریعے اس پورے طبقے کی ممد بھائی شناخت ہے ضمیر کی پاکیزگی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے..... وہی تضاد جو اس کے اصل چہرے اور اس کی مونچھوں میں ہے۔ راوی کے الفاظ میں "مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا" اور

جو "در حقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔"

یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ مونچھیں کٹوانے کے بعد راوی جب اس سے افسردگی کا سبب پوچھتا ہے.... "کیا بات ہے مد بھائی؟" تو وہ جواب میں ایک بڑی سی گالی دے کر کہتا ہے۔ "سالا اب مد بھائی ہی نہیں رہا" مد بھائی کے خاتمہ کے اس اعلان سے پہلے یہ مشہور غنڈہ اپنا وہ بد نام زمانہ خنجر پھینک چکا ہوتا ہے اور اسے "تڑی پار" کا حکم مل چکا ہوتا ہے۔ وہ علاقہ، وہ خنجر اور وہ مونچھ جس نے اس کی ظاہری شخصیت کی تعمیر کی تھی، اس کا ہیبت طاری کر رکھا تھا ختم ہو چکا ہے اور اب مد بھائی بمبئی چھوڑنے والا ہے۔ اُسے افسوس ہے کہ اُسے اگر بمبئی چھوڑنا ہی تھا تو اپنی شناخت کے ساتھ چھوڑتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ اپنی اس شناخت کے ساتھ بمبئی نہیں چھوڑ سکتا تھا؟ کیا فارس روڈ، خنجر، اور مونچھوں میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتی تھی؟ افسانے کا آخری جملہ ہے:

"اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس کے مونچھوں کے بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔"

کیا یہ ندامت، افسردگی، شرمندگی اور پشیمانی کے آنسو تھے؟ آخر کس چیز پر پشیمانی کے؟

(۲)

ملامتیہ فرقہ کے لوگ اپنے زہد کو ظاہر نہیں کرتے، تقوی کی طاقت کے اظہار سے پرہیز کرتے ہیں اور گندم نمائی وجو فروشی کے بجائے جو نمائی و گندم فروشی کا رویہ اپناتے ہیں۔ وہ شریعت اور ظاہری اعمال پر اصرار کرنے والوں کے نزدیک شرک و کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ محبوب حقیقی کی ذات کا حصّہ بننے کے لیے اپنے آپ کو فراموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا محبوب حقیقی کی ذات کا حصّہ بن چکے ہونے کے سبب اپنی ذات کو فراموش کر کے اناالحق کا نعرہ بلند کرتے اور کوئے یار سے سوئے دار کا سفر کرتے ہیں۔ وہ تقویٰ کے پردے میں اپنے کفر و شرک کو چھپانے سے بہتر اپنے زہد و تقویٰ کو کفر و شرک کے پردے میں چھپانا سمجھتے ہیں۔ وہ خودی اور انانیت کے شہر پر حملہ کر کے اُسے تاخت و تاراج کر ڈالتے ہیں تاکہ معبود کی انانیت کے شہر میں پہنچیں اور نفسانیت کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں تاکہ حق تعالیٰ کی تجلیات کے تمام مناظر کو اپنی ذات میں دیکھیں وہ فنا کی کشتی میں سفر کرتے ہیں تاکہ بقا کے ساحل تک پہنچیں اور خود کو خدا کی ذات کا حصّہ بنا لیں افسانے کے آخر میں راوی کے ہنسنے پر مد بھائی آگ بگولا ہو کر کہتا ہے "سالا تم کیسا آدمی ہے منٹو صاحب..... ہم سچ کہتا ہے قسم خدا کی ہمیں پھانسی لگا دیتے۔ پر بے وقوفی تو ہم نے خود کی.... آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا..... سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ راوی کو بغیر مونچھوں کے چہرے پر اُس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کا جوڑ مناسب بیٹھتا ہوا معلوم نہیں ہوتا جب کہ دونوں اپنی ذات کے انکار اور بے بسی ولاچاری کو ظاہر کرتے ہیں۔ نامناسب اور بے جوڑ بات تو اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی خوفناک مونچھوں کے ساتھ روتا ہوا نظر آتا۔ اور رونے کا عمل اُس وقت ہوتا ہے جب اُس سے دولت، حکومت اور طاقت سبھی چھن چکے ہوتے ہیں۔ انانیت کا شہر پوری طرح تاراج ہو چکا ہوتا ہے لیکن معبود کی انانیت کے شہر میں پہنچنے میں کوئی اور چیز حائل ہو جاتی ہے۔

(۳)

۱۔ مونچھیں مردانگی کی پہچان ہوتی ہیں۔ اسی لیے مونچھیں کٹوانا باعث شرمندگی ہوتا ہے۔ جنسی کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ عورتوں کی مونچھیں نہیں ہوتیں۔

۲۔ یہ بہادری کی نشانی ہوتی ہیں۔ بہادری جس کا اکھڑ پنے اور انگھڑ پنے سے دیرینہ رشتہ ہوتا ہے۔ اسی لیے انسان کی ابتدائی قبائلی زندگی میں اس چیز کو جتنی اہمیت حاصل تھی آج نہیں ہے۔ مہذب معاشرہ جسمانی طاقت کے بجائے ذہنی طاقت پر انحصار کرتا ہے۔

۳۔ یہ غرور کی نشانی ہوتی ہیں جنھیں عموماً دولت و امارت اور حکومت کے آب حیات سے سینچا جاتا ہے۔

۴۔ چونکہ یہ سب ظاہری صورت ظاہری اعمال اور افعال سے متعلق ہوتا ہے اس لیے مونچھیں بھی لباس فاخرہ کی طرح انسان کے ظاہر کا اشاریہ ہوتی ہیں۔

مد بھائی کا ظاہر اُس کی غنڈہ گردی، اس کا دادا ہونا، اس کے شاگرد، اس کا چھوٹا سا تانگہ گھوڑا، کنکے اور نبوٹ کا ماہر ہونا، پورے علاقے کا اس سے تھر تھر کانپنا اور اُس کا باطن نادار عورتوں کی مدد، کسی کو تکلیف میں نہ دیکھ سکنا، بہو بیٹیوں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، رنڈیوں کا اس کو سپر ماننے کے باوجود اُس کا اُن سے کوئی تعلق نہ ہونا، کورٹ کچہری کے معاملات سے خوف کھانا وغیرہ ہے۔ مختصر یہ کہ اُس کا ظاہر مونچھوں والا خوفناک چہرے ہے اور باطن بغیر مونچھوں والا رحم دل اور مغموم چہرہ۔ پورا افسانہ دونوں کی کش مکش کی داستان ہے۔ دونوں کی کشمکش جاری رہتی ہے اور آخر میں اُسے اپنی ظاہر داری کا پردہ ہٹا دینا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی حکومت (علاقہ) اور دولت (نیزہ) بھی ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور وہ اپنی اصلی حالت میں رہ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے عمل کا محاسبہ کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر (مونچھوں) سے ڈر گیا ہے۔ اُس نے اس خوف سے مونچھیں کٹائی ہیں کہ اس کی وجہ سے کہیں اُسے سزا نہ ہو جائے اور اس طرح ظاہر داری کے فریب سے نکلنے کے عمل میں وہ اسی فریب کا شکار ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس رویے کے خلاف ہے اُس کا باطن (پاکیزہ ضمیر) اُس کے ظاہر (مونچھیں.... جن کے سبب سزا ہونے کا خدشہ تھا) شکار ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہے۔ اور اس پشیمانی میں کہ اس کا ضمیر بھی آلودہ ہو گیا ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ وہ اپنی مونچھوں کے کٹنے پر افسوس نہیں کرتا بلکہ افسوس اس بات پر کرتا ہے کہ وہ اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔ مونچھوں کی وجہ سے سزا ہو جانے کا خوف اس پر مسلط ہو گیا۔ اُسے تو سزا کو خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔ زہر کے پیالے اور پھانسی کے پھندے کو چومنا چاہیے تھا تاکہ وہ اپنے باطن کو اور بھی منور رکھ سکے۔ اپنے ضمیر کی پاکیزگی کو منزہ رکھ سکے۔ اس میں احتساب کا یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ صاف باطن آدمی کسی سے ڈرتا نہیں، خوف نہیں کھاتا، پھر وہ مونچھوں سے کیوں ڈر گیا؟ اب وہ دوسروں کی نظر میں قابل نفرین بن کر بندگان خدا کی مدد کیسے کرے گا۔

اس نقطۂ نظر کو اس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ مد بھائی کے یہاں اپنے اچھے اعمال کو پوشیدہ رکھنے میں اس قدر شدت ہے کہ وہ جن نادار عورتوں کی مدد کرتا ہے اُن کے یہاں خود کبھی نہیں جاتا بلکہ اپنے شاگردوں کو بھیجتا ہے تاکہ کسی طرح اُس کا عمل ظاہر نہ ہو راوی اپنی مدد کے سلسلہ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا یہ تو میرا فرض تھا۔" وہ جس طرح بات بات پر گالی بکتا ہے اس سے بھی اپنے اعمال صالحہ پر پردہ ڈالنا ہی مقصود ہے آخر میں رونے کا عمل جہاں مذکورہ پشیمانی کو ظاہر کرتا ہے وہیں اُس کے اندر کی دردمند اور حقیقی شخصیت کو بھی سامنے لے آتا ہے اور اس کا بغیر مونچھوں کا چہرہ اس کے لیے واضح پس منظر مہیا کرتا ہے۔

(۴)

پورے افسانے میں جہاں بھی مد بھائی کے چھری مارنے کی مہارت کا ذکر ہے راوی اس شک کا اظہار کرتا ہے کہ پتہ نہیں

اس نے کبھی کسی کو چھری ماری بھی ہے یا نہیں؟ آخر مرتبہ جب وہ ایک بڑھیا کی فریاد پر اس کی بیٹی کی عصمت دری کرنے والے کو چھری مار کر ہلاک کر دیتا ہے اور گرفتاری کے بعد چھوٹ کر آتا ہے تو اُس کی مونچھیں جھک جاتی ہیں اور جس طرح وہ کورٹ، کچہری، وکیل اور گواہوں سے گھبراتا ہے اس سے اس کے ناتجربہ کار ہونے کا اندیشہ پختہ ہو جاتا ہے۔ چاقو مارنے میں بھی اس کی مہارت سامنے نہیں آتی جس کی وہ یہ کہہ کر توجیہ کرتا ہے کہ "ہاتھ ٹیڑھا پڑا لیکن وہ بھی اسی سالے کا قصور تھا۔ ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا لیکن مر گیا۔ ذرا تکلیف کے ساتھ جس کا مجھے افسوس ہے۔"

اس میں تین نکات اہم ہیں (۱) اپنی ناتجربہ کاری کو چھپانے کے لیے DEFENCE-MECH A NISM کام کر رہی ہے (۲) ضمیر کی پاکیزگی کے سبب اس شخص کی موت پر افسوس ظاہر ہو رہا ہے۔ (۳) اور ناتجربہ کاری کے سبب بین السطور میں خوف کی پرچھائیاں لرزتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں جو راوی کے پوچھے بغیر مجرم (ممد بھائی) سے تفصیل بیان کروا رہی ہے کہ اس سے یہ خون برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ اسے ہی خون کا سر چڑھ کر بولنا بھی کہتے ہیں۔

یہاں اُس کے خنجر کا نیفے میں ننگا اڑسا ہوا ہونا اپنی معنویت ظاہر کرتا ہے۔ ننگا خنجر اُس ماہر مجرم کی طرح ہوتا ہے جو کسی کی فکر نہیں کرتا۔ لیکن ممد کا خنجر اس کی فکر کرتا ہے جیسے وہ ناتجربہ کار ہونے کے سبب اپنے مقتول کی موت پر افسوس محسوس کرتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو تیغ بے نیام بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ اس کے اپنے باطن کو محفوظ رکھنے اور اپنے اعمال صالحہ سے پردہ نہ اٹھنے دینے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح نیفے میں اڑسا ہوا بے نیام خنجر جو چاندی کی طرح چمکتا ہوا اور شفاف ہے الگ سے کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ممد بھائی ہے جو تیز ہے، بے نیام ہے لیکن چاندی کی طرح چمکتا ہوا اور شفاف ہے اور بے نیام ہونے کے باوجود نقصان نہیں پہنچاتا۔ ظاہر ہے ممد بھائی کا افسوس اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ خنجر یعنی خود ممد بھائی ایک قتل میں آلودہ ہو چکا ہے جو وہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اس خنجر کو سڑک پر پھینک دیتا ہے۔ خنجر کو سڑک پر پھینکنا خود اپنے آپ کو سڑک پر پھینکنے کے مترادف ہے۔ جیسے مونچھیں کٹوانا تھا یہ دونوں عمل اُس نے خود کیا اور تیسرا عمل یا اس کی شخصیت کا تیسرا حصّہ جو اس کا علاقہ تھا وہ جج کے حکم سے اس سے چھوٹ گیا۔ نتیجہ کے طور پر ممد بھائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ افسانے کے آخری جملہ میں ایک ایسا آدمی نظر آتا ہے جسے ہم نہیں پہچانتے۔ جو فارس روڈ کا ممد بھائی نہیں کوئی اور ہے۔

تلفّظ کے چند رجحانات

منظور علی

اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ زبانوں میں ٹوٹ پھوٹ تعمیر و تخریب، ترمیم و تنسیخ، بناؤ بگاڑ اور تغیر و تبدل غرضیکہ وہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے جو ایک جاندار جسم میں ہوتا ہے۔ الفاظ، ترکیبات، محاورات، تشبیہات، استعارات پیدا بھی ہوتے ہیں تخلیق بھی کیے جاتے ہیں، درآمد بھی کیے جاتے ہیں لیکن تغیرات کے دستبرد سے کوئی محفوظ نہیں رہتا۔ ان پر گرم و سرد زمانہ کا بھی اثر ہوتا ہے۔ امتدادِ زمانہ بھی انھیں چین نہیں لینے دیتا۔ ان میں سے بعض شدائد کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے دم توڑ دیتے ہیں۔ بعض نسبتاً سخت جان ہوتے ہیں زد و خورد سے مقابلہ کرتے ہیں اور کچھ دنوں تک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہ کر سفرِ آخرت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض اتنے توانا اور صحت مند ہوتے ہیں کہ انھیں بقائے دوام کی سند مل جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منوں مٹی میں دبے ہوئے مغفور و مرحوم الفاظ و ترکیبات بڑی کاوشوں سے باہر نکالے جاتے ہیں۔ انھیں نہلا دھلا کر حیاتِ نو کا خلعت پہنا کر منصۂ شہود پر جگہ دی جاتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد قبولِ عام کا تاج بھی ان کے سر پر جگمگانے لگتا ہے۔

مگر ان تحولات پر قابو پانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ نہ کوئی انھیں بروئے کار لا سکتا ہے اور نہ کوئی ان کی پیش رفت روک سکتا ہے۔ بعض رجحانات و میلانات ایسے ہوتے ہیں جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زبان کس راستے پر جا رہی ہے۔ ان میں صحت مند بھی ہوتے ہیں اور علیل بھی، منفعت بخش بھی ہوتے ہیں اور مضرت رساں بھی۔ انھیں ابھارا بھی جا سکتا ہے اور دبایا بھی جا سکتا ہے۔

اس قسم کے رجحانات زبان کے ہر شعبہ میں نظر آتے ہیں۔ وہ ادائے معانی ہو یا الفاظ کا محلِ استعمال، محاورات ہوں یا ضرب الامثال، علم بیان ہو یا علم معانی، لہجہ ہو یا تلفظ مگر تلفظ چونکہ افہام و تفہیم اور ابلاغ و تبلیغ پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے اس کے رجحانات و میلانات پر خاص طور سے نظر رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس مضمون میں تلفظ کے چند رجحانات کی نشاندہی کروں مگر اول تو بحر بیکراں کا احاطہ ممکن نہیں ہے دوسرے یہ کہ نہ میں وسیع المطالعہ ہوں نہ وسیع المعاشرت (سوشل) اس لیے مجھے ہر طبقہ اور ہر علاقے کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے اس لیے میری یہ ایک حقیر سی کوشش ہے ممکن ہے کسی صاحبِ علم کے لیے محرک ثابت ہو۔

تلفظ میں دو طرح سے خلل واقع ہو سکتا ہے۔ حروف کو صحیح مخرج سے ادا نہ کرنے سے یا حروف کی حرکات بدل دینے سے۔

جہاں تک حروف کے مخرج کا تعلق ہے اردو میں اس کی اہمیت بہت کم ہے۔ صرف چند حروف ایسے ہیں جن کی آواز بدلنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً (ز) اور اس کے ہم آواز حروف (ذ ض ظ)، ش، ق اور غ۔ "ز"، "ج" سے بدل جاتی ہے۔ "ش"، "س" سے تبدیل ہو جاتی ہے اور "غ"، "گ" سے مگر یہ رجحان صرف ایسے طبقے میں پایا جاتا ہے جو تعلیم یافتہ یا صحبت یافتہ نہیں ہے۔

بعض علاقے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بعض آوازیں بالکل اجنبی ہوتی ہیں اور وہاں کے باشندے ان آوازوں کو ادا کرنے والے حروف کو صحیح مخرج سے نکال نہیں سکتے۔ مثلاً سرحد کی علاقائی زبانوں میں ہندی کے مرکب حروف کا وجود نہیں ہے اس لیے وہاں کے باشندے ان کو صحیح مخرج سے ادا نہیں کر سکتے مجبوراً "گھر" کو "گر"، "پتھر" کو "پتر" اور "پڑھ" کو "پڑ" کہتے ہیں۔ اسی طرح سے پنجاب کی علاقائی زبانوں میں "ق" کی آواز مانوس نہیں ہے اس لیے اہل پنجاب (ق) کی بجائے (ک) بولتے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے اس لیے کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ (ق) عربی زبان کا ایک اہم حرف ہے اور ایک خاص مخرج سے ادا ہوتا ہے۔ کلام پاک میں بکثرت آیا ہے۔ اگر تلاوت کے وقت صحیح مخرج سے ادا نہ کیا جائے تو کلام پاک میں تصحیف ہو جاتی ہے اور کوئی مسلمان اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کلام پاک کی تلاوت کے وقت اہل پنجاب بھی اسے صحیح مخرج سے ادا کرتے ہیں بس اتنا کافی ہے۔ اردو میں اگر (ق) کو (ک) کہا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض مواقع پر البتہ بدنما معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ٹی۔ وی سے مرزا غالب پر ایک فیچر نشر ہوا تھا۔ اس میں جس فنکار نے مولانا الطاف حسین حالی کا کردار ادا کیا تھا وہ مسلسل (ق) کی جگہ (ک) بولتا رہا۔ میرا خیال ہے حالی کی روح تڑپ گئی ہوگی۔ ایسے موقعوں پر احتیاط لازم ہے۔ اس سے زیادہ توہین آمیز نعت شریف میں اس فقرے کی ادائیگی ہے "آپ قلب ابراہیم کی دعا ہیں" نعت خواں حضرات اسے "کلب ابراہیم کی دعا" پڑھتے ہیں۔ کس قدر توہین آمیز ہے یہ فقرہ میرا خیال ہے کہ اگر بالقصد پڑھا جائے تو کفر کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ یقیناً پروڈیوسر کی غفلت کا نتیجہ ہے ورنہ اہل پنجاب کو خداوند عالم نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ وہ دنیا کا ہر کام بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ قاری و اہل علم صحیح تلفظ ادا کرتے ہیں یا نہیں۔

اردو تلفظ کا سب سے زیادہ عجیب و غریب اور دلچسپ رجحان ہندی کے مرکب حروف میں جو ہائے دوچشمی سے ترکیب پاتے ہیں نظر آتا ہے۔ ان کے تلفظ میں تقدیم و تاخیر کا عمل حیرت انگیز طریقے سے دخل انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے کہ مرکب حروف میں ہائے دوچشمی بعد میں آتی ہے اور اصل حرف پہلے مثلاً کھ، گھ، جھ، دھ وغیرہ میں اصلی حروف ک، گ، ج، اور د پہلے آتے ہیں یعنی مقدم ہیں اور ہائے دوچشمی بعد میں آتی ہے یعنی موخر ہوتی ہے۔ لیکن تلفظ میں مقدم موخر ہو جاتا ہے اور موخر مقدم مثلاً لکھتے ہیں پتھر، بگھار، چوتھا لیکن بولتے ہی پھتر، بھگار، اور چھوتا۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ عجیب و غریب مثال دھیان کی ہے۔ یہاں خلاف قیاس "ی" کو ہائے دوچشمی پر مقدم کر کے بولتے ہیں یعنی دیہان۔ جو مثالیں پہلے آچکی ہیں ان ہائے دوچشمی کو اصلی حرف پر مقدم کر کے اس کے ماقبل سے مخلوط کر دیا گیا ہے مثلاً پتھر کی ہائے دوچشمی کو (ت) کے ماقبل سے مخلوط کر دیا گیا ہے لیکن دھیان میں مرکب حرف (دھ) کے مابعد یعنی (ی) کو ہائے دوچشمی اور اصل حرف کے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔

یہ رجحان صرف دوچشمی ہا تک محدود نہیں بلکہ ہائے ہوز تک تجاوز کر جاتا ہے اس کی ایک بہت عام مثال "باہر" کی ہے۔ باہر میں ہائے ہوز کا ماقبل الف ہے لیکن تلفظ میں الف موخر ہو جاتا ہے یعنی ہائے ہوز الف کے پہلے آجاتی ہے۔ اور باہر کو بھار بولتے ہیں اس میں شک نہیں کہ الف کچھ قصیر ہو جاتا ہے یعنی صرف دو تہائی، مجھے ابھی تک ایک ہی مثال مل سکی ہے مگر ممکن ہے

آہن کو اہان اور خواہر کو خہان بولنے لگیں۔ اس رجحان کو آسانی سے روکا جاسکتا ہے بشرطیکہ اساتذہ تھوڑی سی توجہ دیں اور اس طرح کا تلفظ کرنے والے تلامذہ کو ٹوک دیا کریں۔

اب میں جس رجحان کا ذکر کرنے والا ہوں وہ اس قدر عام ہے کہ ہر چھوٹا بڑا، ہر خواندہ ناخواندہ، ہر عام و خواص بلا جھجک بولتا ہے اس لیے اسے غلط العام کی سند دینی پڑے گی۔

وہ رجحان یہ ہے کہ حرف علت (ا، و، ی) کے بعد تلفظ میں نون غنہ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً لکھتے ہیں دنیا اور بولتے ہیں دنیاں۔ اسی طرح سے بچو اور دوستو، کاپی اور کراچی کے بجائے دستوں، بچوں، کانپی اور کرانچی بولتے ہیں۔ پراٹھا اور پرانٹھا، سیکڑہ اور سینکڑہ تلفظ کرتے ہیں۔ اور حد تو یہ ہے کہ جہاں الف کا شائبہ بھی ہوتا ہے وہاں بھی تلفظ میں نون غنہ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً گیارہ میں الف ہے مگر مختفی ہے الف کی معمولی سی آواز پیدا ہوتی ہے اس لیے یہاں بھی نون غنہ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور گیارہ بارہ تیرہ چودہ وغیرہ کو گیاراں، باراں، تیراں اور چوداں تلفظ کرتے ہیں اور میرا قیاس تو یہ کہتا ہے کہ پھینکنا، چھینکنا، چھانٹنا، بانٹنا، جھانکنا وغیرہ بھی اسی رجحان کا نتیجہ ہیں یعنی دراصل یہ پھیکنا، چھیکنا، چھاٹنا، باٹنا، جھاکنا تھے۔ ان میں نون غنہ کا اضافہ کر کے متبادل الفاظ بنا لیے گئے۔

میں یہ واضح کر دوں کہ صرف میرا قیاس ہے۔ میرے پاس اس کے شواہد موجود نہیں ہیں۔ البتہ ایک لفظ "پاؤں" بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اصل لفظ پاؤں ہے یعنی نون واؤ سے موخر ہے یعنی واؤ کے بعد ہے اور اس کا ثبوت قائم کا یہ شعر ہے:

تو کرتا ہے پاؤں سے سر کی تمیز
ہے اپنی جگہ پاؤں سر سے عزیز

پہلے مصرعے میں پاؤں اس طرح نظم ہو گیا ہے کہ اگر نون موخر نہ کیا جائے تو مصرع موزوں نہیں ہوتا۔ تلفظ کے مذکورہ بالا رجحان کے باعث الف کے بعد نون غنہ بولتے وقت اضافہ کر دیا گیا اور پانوں بولا جانے لگا۔ یہ واضح رہے کہ نون اضافی ہے اصل لفظ میں موجود نہیں تھا لیکن صرف اس کا تلفظ کیا جاتا تھا لکھتے پاؤں ہی تھے۔ معلوم ہوتا ہے غلط فہمی سے کسی نے پانوں صحیح سمجھ کر لکھ دیا اور یہی رائج ہو گیا لیکن اہل علم کو یہ احساس تھا کہ پانوں میں ایک ہی نون ہے اور پھر واو سے پہلے یا بعد میں ہونے کی بحث چھڑ گئی۔

اہل دہلی قائل ہیں کہ نون واو سے مقدم ہے یعنی ان کے خیال میں اصل لفظ پانو ہے پاؤں نہیں۔ چنانچہ غالب نے اپنی مشہور غزل کفن کے پاؤں اور چمن کے پاؤں واو کی ردیف میں لکھی ہے اور املا پانو لکھا ہے حیرت ہے کہ اب بھی کچھ اہل علم غالب کی تقلید میں (پانو) پر اصرار کرتے ہیں اور تلفظ کے اس رجحان کو نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ پانوں اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس سے میرے قیاس کو تقویت ضرور پہنچتی ہے۔

دوسرا عام رجحان تغیر حرکات کا ہے۔ یعنی اصل لفظ کا اعراب کچھ ہوتا ہے اسے بدل کر تلفظ میں کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ (۱) زبان کا فطری میلان (۲) غلط فہمی، (۳) عدم واقفیت (۴) تقلید

اردو کا فطری میلان یہ ہے کہ سہ حرفی الفاظ کے درمیانی حروف پر سکون نہیں ہونا چاہیے۔ ممکن ہے یہ پراکرت سے ورثہ میں ملا ہو۔ اگر سہ حرفی الفاظ کا درمیانی حرف مجزوم ہے تو بولنے میں اس کو مفتوح کر دیتے ہیں۔ یعنی تخت کو تخت، بخت کو بخت،

طرح کو طَرح اور گرم کو گَرم تلفظ کرتے ہیں۔ اہل علم اس سے احتراز ضرور کرتے ہیں لیکن بہ تکلف۔ اس سے باز رہنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔

غلط فہمی عموماً عربی الفاظ میں ہوتی ہے بعض الفاظ لکھے تو جاتے ہیں ایک سے لیکن اعراب کی تبدیلی سے ان میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اقدام کو لے لیجیے۔ اقدام بکسر الف مصدر ہے باب افعال کا اور اس کے معنی ہیں قدم آگے بڑھانا۔ اردو میں مصادر کا استعمال کرنا کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے اقدام کرنا آگے بڑھنے کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اقدام بفتح الف جمع ہے قدم کی اور اردو میں قدم اٹھانا کوشش شروع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لیے اقدام اٹھانا بھی بول جاتے ہیں۔ بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اقدام بکسر الف اٹھانا کے ساتھ بولتے ہیں حالانکہ اقدام بفتح الف بولنا چاہیے۔

غلط فہمی کی ایک مثال مثبت ہے جب منفی کے ساتھ بولا جائے۔ اس کا تلفظ تین طرح سے کرتے ہیں۔ مثبت بضم میم و فتح با یعنی مثبت یہ مفعول ہے اثبات سے۔ یا بضم میم و کسر با یعنی مُثبِت یہ اسم فاعل ہے اثبات کا یا مثبت بضم میم و با یعنی مُثُبت... شاید اسے اثبات سے ظرف زمان تصور کرتے ہیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ افعال مزید فیہ کا ظرف اس کے مفعول کے وزن پر ہوتا ہے۔ چونکہ منفی مفعول ہے نفی کا اس لیے اس کے ساتھ اثبات کا بھی مفعول ہی استعمال ہونا چاہیے۔ یعنی مُثبَت منفی بولنا چاہیے لیکن یہ واضح رہے کہ منفی کے ساتھ ہی یہ تلفظ درست ہوگا۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ حکومت نے بروقت مثبت اقدام کیا تو اس جملے میں مثبت مفعول نہیں بلکہ فاعل ہے اور مُثبِت یعنی بضم میم بکسر با بولنا چاہیے۔ اس موقع پر مشعل کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اردو والے اسے اسم آلہ قرار دے کر بکسر میم یعنی مِشعل بولتے ہیں لیکن عربی میں بفتح میم تلفظ کرتے ہیں یعنی اس کو ظرف مکان تصور کرتے ہیں یعنی شعلہ کی جگہ۔

(۲) عدم واقفیت کی بنا پر تلفظ میں غلطی کا رجحان بکثرت ہے۔ ان الفاظ کو لے لیجیے جو (بین) اور (حتی) سے ترکیب پاتے ہیں جیسے بین الصوبائی، بین السطور اور حتی الامکان، حتی المقدور وغیرہ عربی میں بین اور حتی مبنی بفتح ہیں یعنی ان کے آخر حرف پر ہمیشہ اور ہر حالت میں زبر ہوگا۔ کوئی اور حرکت ہو ہی نہیں سکتی اردو والے ان کے مرکبات میں ان کے آخر حرف پر پیش دیتے ہیں یعنی بینُ الصوبائی اور حتیُ المقدور بولتے ہیں حالانکہ تلفظ بینَ الصوبائی اور حتیَ المقدور یعنی بفتح نون و بفتح تا ہونا چاہیے۔

مُنحصِر بصاد مکسور کو مُنحصَر بصاد مفتوح بولتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کو انحصار کا مفعول سمجھتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ باب انفعال فعل لازم ہے اس کا فاعل تو ہوتا ہے لیکن مفعول نہیں ہوتا اس لیے منحصر بفتح صاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس باب کا فاعل ہی ہوتا ہے اس لیے ان کے آخری حرف کا ماقبل ہمیشہ مکسور ہوگا جیسے منکسِر، مندمِل، منفعِل، منقطِع، منہضِم، مندرِج، مندرِجہ، منقسِم وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ واضح رہے کہ منتظر اس باب سے نہیں ہے بلکہ انتظار یعنی افتعال سے ہے۔ یہ اگر فاعل ہو یعنی انتظار کرنے والے کے معنی میں بولا جائے تو ظائے مکسور سے ہوگا اگر انتظار کیے جانے والے کے معنی میں ہو تو ظائے مفتوح سے ہوتا۔ علامہ اقبال کے اس مصرع میں رع: کبھی اے حقیقت منتظر.... الخ منتظر انتظار کیے جانے والے کے معنی میں ہے اس لیے بظائے مفتوح ہے۔

باب افتعال کے بہت سے مصادر ایسے ہیں جن پر باب انفعال کا دھوکا ہوتا ہے مثلاً انتقال، انتقام، انتصار، انتظار، انتساب، انتشار، انتقام انتقاد وغیرہ وغیرہ لیکن باب افتعال کی شناخت مشکل نہیں ہے۔ افتعال میں ایک (ت) ضرور ہوتی ہے۔ اگر وزا

فتعال یا انفعال کا ہو اور ت بھی موجود ہو تو وہ باب افتعال ہے اس کا فاعل اور مفعول دونوں ہو سکتا ہے یعنی اس کے حرف آخر کا ماقبل مکسور بھی ہو سکتا ہے اور مفتوح بھی اور اگر (ت) نہ ہو تو وہ باب انفعال ہے اور اس کا صرف فاعل ہوگا اور اس کے حرف آخر کا ماقبل مکسور ہوگا۔

(۳) مختصَر بصاد مفتوح کو مختصِر بصاد مکسور بولتے ہیں۔ مختصِر بصاد مکسور فاعل ہے اور اس کے معنی ہیں مختصر کرنے والا، کم یا کوتاہ کرنے والا اور مختصَر بصاد مفتوح مفعول ہے۔ اس کے معنی ہیں مختصر کیا ہوا، کم یا کوتاہ کیا ہوا۔ جب ہم مختصر کتاب یا مضمون کہتے ہیں تو اس سے فاعل مراد نہیں ہوتا بلکہ مفعول یعنی کم تا کوتاہ کیا کیا ہوا مقصود ہوتا ہے کوئی کتاب یا کوئی مضمون کم کرنے والا نہیں ہو سکتا البتہ کم یا کوتاہ ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن مختلف مقتدِر، مخترِع، منتشِر جن کے حرف آخر کا ماقبل مکسور ہے صحیح ہیں اس لیے کہ فاعل ہیں اور منتخَب (چنا ہوا) جس کے حرف آخر کا ماقبل مفتوح ہے صحیح ہے اس لیے کہ مفعول ہے۔

(۴) مکمَّل (بفتح میم دوم) کو مکمِّل بکسر میم ثانی بولتے ہیں۔ مکمَّل بفتح میم ثانی مفعول ہے اس کے معنی ہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہوا، پورا کیا ہوا اور مکمِّل بکسر میم ثانی فاعل ہے اس کے معنی ہیں پورا کرنے والا۔ کام مکمَّل بفتح میم ہو سکتا ہے۔ بکسر میم نہیں ہو سکتا ہے اسی طرح سے مکمل مضمون، مکمل کتاب مکمل تعلیم وغیرہ وغیرہ میں مکمل کے حرف آخر کا ماقبل یعنی میم ثانی مفتوح ہی ہو سکتا ہے مکسور نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو میں مکمل بطور مفعول ہی مستعمل ہے۔ فاعل اگر استعمال ہوتا بھی ہے تو فارسی تراکیب میں اس لیے ہمیں مکمَّل بفتح میم ثانی بے جھجک استعمال کرنا چاہیے۔

(۵) متوقَّع بفتح قاف کو متوقُّع بضم قاف بولتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ عربی میں فاعل یا مفعول کے حرف آخر کا ماقبل کبھی مضموم ہوتا ہی نہیں۔

ان چند مثالوں سے رجحانات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ غلطی سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ عربی کے میم مضموم سے شروع ہونے والے الفاظ پر غور کر کے اندازہ لگایا جائے کہ وہ بطور فاعل استعمال ہوئے ہیں یا بطور مفعول اگر فاعل ہیں تو ان کے حرف آخر کا ماقبل ہمیشہ مکسور ہوگا۔ اگر مفعول ہیں تو ان کے آخر کا ماقبل مفتوح ہوگا۔ یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے لیکن اکثر و بیشتر الفاظ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اُردو تلفظ میں ایک رجحان تقدیم و تاخیر حروف کا بھی ہے۔ یعنی جو حرف موخر ہے اس کو مقدم کر دیتے ہیں جیسے نُسخہ کو نخسہ، مزاج کو مجاز اور رجحان کو رجان بولتے ہیں۔ مگر یہ عوامی رجحان ہے۔ خواص اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ مگر ایک لفظ قفلی جو اسی رجحان کا شکار ہو کر قلفی میں بدل گیا ہے عوام و خواص سب کی زبان پر ہے۔

ایک عجیب و غریب رجحان (ل) کو (ن) سے تبدیل کرنے کا ہے۔ مگر شکر ہے کہ یہ ابھی تک (لیے) کو (نئے) بولتے ہیں مگر نون کے ساتھ لام کی بھی قدرے آمیزش موجود ہوتی ہے۔ یہ تغیر کیوں واقع ہوتا ہے بظاہر اس کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ حیرت یہ ہے کہ تلفظ کی یہ تبدیلی خواص سے مخصوص ہے عوام اس میں ملوث نہیں ہیں۔

اردو میں ایک شدید رجحان یہ بھی ہے کہ ہندی الفاظ میں آخری حرف کے ماقبل مکسور کو مفتوح کر دیتے ہیں مثلاً مندِر (بدال مفتوح بولتے ہیں اسی طرح جوگن، دھوبن، پابن، ناگن وغیرہ کو جن کے نون کا ماقابل اصولاً مکسور ہے اور ہندی میں بھی مکسور ہی بولا جاتا ہے بالفتح تلفظ کرتے ہیں یعنی نون کے ماقبل حروف پر زبر دیتے ہیں اور یہ رجحان اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ بعض لوگ عربی کے افعال ثلاثی مجرد کے فاعل کو بھی مفتوح بولنے لگے ہیں مثلاً خادم خالد وغیرہ کے آخری حرف کے ماقبل کو زبر

کے ساتھ بولتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رجحان خطرناک ہے اگر ممکن ہو تو اس کو روک دینا چاہیے۔

ایک معمولی سا رجحان یہ بھی ہے کہ مشدّد حروف کو تخفیف ادا کرتے ہیں۔ مثلاً مادّہ کو مادہ اور اتّحاد کو اتحاد کہتے ہیں مگر قوی احتمال یہ ہے کہ یہ رجحان علاقائی اثرات کے سبب سے پیدا ہوا ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے زبان دخیل الفاظ و محاورات کو اپنے مزاج کے موافق ڈھال لیتی ہے۔ اس زدو خورد میں کبھی الفاظ کی ساخت میں فرق آجاتا ہے کبھی معانی بدل جاتے ہیں کبھی حرکات تبدیل ہو جاتی ہیں کبھی تلفظ بدل جاتا ہے۔ زبان کے ادیبوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ ان تبدیلیوں کو دل سے قبول کر لیں اور ان کے نشاۃ ثانیہ کی کوشش ترک کر دیں ورنہ عوام میں ایک بے اطمینانی اور ادب میں افراتفری پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اردو میں موسم بفتح سین اور مشعل بکسر میم رائج ہے اردو میں باب مفاعلتہ کا عین کلمہ مکسور بولتے ہیں مثلاً مشاعرہ مقابلہ وغیرہ یہ الفاظ اسی تلفظ سے زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ ان لفظوں کا تلفظ غلط ہے تو لوگ مضطرب ہو جائیں گے روانی مفقود ہو جائے گی اور ان الفاظ کی ادائیگی میں زبان لڑکھڑا جائے گی۔

اس طرح کی لغزش اور لکنت کی واضح مثال جدوجہد کی ادائیگی میں ملتی ہے پہلے جَدو جَہد بفتح ہر دو جیم بولا جاتا تھا۔ عوام و خواص سب بے تکلفی سے بولتے تھے۔ کسی قسم کا تکلف یا تصنع لہجے میں نہیں پایا جاتا تھا۔ مگر کسی عالم نے ڈھونڈ نکالا کہ عربی میں جد بکسر جیم ہے اور جہد بضم جیم ہے۔ بس پھر کیا تھا ریڈیو اور ٹی وی والوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا اور حد یہ ہے کہ ایک مرحوم سربراہِ مملکت کو بھی اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا، یہ کوشش کہاں تک بارور ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے مرحوم کو ٹی وی پر ہکلاتے ہی ہوئے نہیں بلکہ بوکھلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بہر حال میں نے کوئی مقرر، کوئی عالم کوئی سیاست داں ایسا نہیں دیکھا جو اس خار زار سے دامن بچا کر نکل گیا ہو۔

صحیح تلفظ کا انکشاف کرنے والا قابل ستائش ضرور ہے مگر اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں جید علما بھی شامل تھے انھیں عربی اور فارسی پر عبور بھی حاصل تھا ان کو یہ ضرور معلوم رہا ہوگا کہ ان الفاظ کا صحیح تلفظ کیا ہے لیکن انھوں نے کبھی اس کی نشاندہی نہیں کی۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ضرور ہونی چاہیے۔

اس چشم پوشی کا اصلی سبب اردو کا مزاج ہے۔ اردو میں ہم فتح کرتے ہیں تعظیم کرتے ہیں۔ تسلیم کرتے ہیں یعنی ایسے موقعوں پر ہم مصادر سے کام لیتے ہیں اسم سے نہیں۔ اس کا ایک بین ثبوت حج ہے۔ حج مصدر ہے اس کا اسم حِجہ ہے اسی لیے مہینہ کا نام ذی الحجہ ہے یعنی حج والا۔ اردو میں ہم حجہ نہیں کرتے بلکہ حج کرتے ہیں یعنی ہم اردو میں اسم سے کام نہیں لیتے بلکہ مصدر سے کام لیتے ہیں جَدو جَہد (بفتح ہر دو جیم) مصادر ہیں۔ ایک کا اسم جد بکسر جیم ہے اور دوسرے کا اسم جُہد (بضم جیم) ہے اردو کے مزاج کے مطابق ہم سیکڑوں برس سے جَدو جَہد (مصادر) کرتے آئے ہیں۔ اب اگر اس اصول کو بدل دیں تو زبان میں لغزش ضرور پیدا ہوگی۔

قومی زبان کا مطالعہ ہر گھر کی ضرورت ہے

ظفر علی خان کی نعت گوئی

کلثوم طارق برنی

مسلمان چھٹی صدی عیسوی میں اپنے انقلاب آفریں عقائد کے ساتھ عرب کی سرزمین سے نکلے اور بہت جلد دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ جہاں جہاں وہ گئے اس سے انکار نہیں کہ وہاں کی علاقائی تہذیبوں کا اثر بھی انھوں نے قبول کیا۔ لیکن جس چیز نے اُن کی تمدنی زندگی کو دوسروں سے ممتاز رکھا۔ وہ توحید و رسالت پر ان کا عقیدہ تھا آنحضرت ﷺ کو اللہ کا رسول ﷺ برحق تسلیم کرنے کا اُن کی زندگی کی پیروی کا، اور پیروی سے بھی پہلے اُن کی ذات و صفات سے اس والہانہ عقیدت کا جس کے بغیر توحید کا عقیدہ اسلام میں بے معنی ہوجاتا ہے۔ بقول اقبال

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولہبی است

نعت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اور تمام لغات میں اس کے معنی تعریف یا وصف بیان کرنے کے ہیں۔ مثلاً فارسی کے اس شعر میں

جاوید ہی باش بہ ایں نعت بدیں وصف
پاکیزہ با خلاق و پسندیدہ بافعال

دنیا کے تمام مُسلم شعرا اپنے کلام کا آغاز حمد سے کرتے ہیں اور حمد کے بعد رسول ﷺ کی نعت کو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ نعت کے لفظ کی خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اصطلاحاً نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے سوال یہ ہے۔ کہ نعت گوئی کا آغاز کس نے کیا تو خود خدائے بزرگ و برتر نبی ﷺ کی نعت کا آغاز قرآن پاک میں کرتے ہیں

یَاَیھَا المزمّل
یَاَیھَا المدثر
خاتم النبیین
رحمتہ للعالمین

اور پھر قرآن میں ہی فرمایا "ورفعنالک ذکرک"
نعت دراصل ایک موضوع سخن ہے جس سے ہمارے جذبہ عقیدت کی تسکین ہوتی ہے۔ نثر میں بھی مضمون اسی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے بھی نعت کہتے ہیں اردو میں نعت گوئی کا فن عربی اور فارسی کے زیر اثر آگے آیا عربی کے ممتاز نعت گو شاعر حسان بن ثابتؓ اور کعب بن زہیرؓ ہیں۔ کعب بن زہیرؓ کا قصیدہ "بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے۔ اور علامہ بوصیری کا قصیدہ "بردہ" اپنے سوز و گداز اور عشق و محبت کی بناء پر ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ معنوی حیثیت سے اردو نعت گوئی نے عربی سے زیادہ فارسی کا اثر قبول کیا ہے یوں تو فارسی کے اکثر شعراء کے یہاں نعت کے نمونے ملتے ہیں لیکن اردو نعت کو شیخ سعدی، امیر خسرو، مولانا جامی اور قدسی وغیرہ نے بطور خاص متاثر کیا ہے۔ سعدی کے درج ذیل چار مصرعے اردو داں طبقے میں بہت مقبول ہیں۔

بلغ العلا بکماله
کشف الدجے بجماله
حسنت جمیع خصاله
صلو علیه واله

قدسی کی نعت

مرحبا سیدی مکی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین سلسلہ دور امیر مینائی اور محسن کاکوروی سے شروع ہوتا ہے دونوں قال اللہ قال الرسول کے پابند تھے محسن اور مینائی کے بعد ایک بڑا نام حالی کا ہے ان کی مشہور نعت

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

آج بھی مقبول خاص و عام ہے۔ حالی کے بعد ایک نام عاشقان رسول میں جو ممتاز ہے وہ نام سر محمد اقبال کا ہے۔ نبی کریم کو مخاطب کر کے اقبال نے کہا

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاث و جستجو عشق حضور و اضطراب

بیسویں صدی کے اردو شعراء میں نعت گو کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خان کا نام حالی و اقبال کے بعد سب سے سب زیادہ اہم ہے۔ ظفر علی خان سچے مسلمان، شعلہ بیان مقرر، ایک انقلاب پسند ادیب، ایک ہمہ گیر شاعر، اور ایک سخت گیر و آزاد خیال صحافی تھے۔ انھوں نے ہنگامہ خیز زندگی بسر کی بقول ڈاکٹر ذوالفقار حسین صاحب ایک زمانے تک ہماری سیاست اور ادب میں اُن کی آواز کی گونج شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی۔
ظفر علی خاں ہماری ادبی تاریخ میں نہایت محترم شخصیت ہیں جس زمانے میں مولانا نے شاعری کا آغاز کیا۔ اس وقت تک

ہماری شعری روایت میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ ایک طرف قومی و ملی شاعری کو اردو میں جگہ مل چکی تھی۔ اور دوسری طرف حقیقت نگاری اور فطرت نگاری شروع ہو چکی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا رشتہ قومی و ملی شاعری کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں شروع ہی سے مولانا کے ہاں قومی، ملی، سماجی موضوعات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ بعض ناقدین ظفر علی خاں کی شاعری اور نثر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن ان کی شاعری میں نعتیہ حصے کو کوئی بھی ناقد نظرانداز نہ کر سکا اور نہ آئندہ کر سکے گا۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا نعتیہ لہجہ اُن کے مجموعہ کلام "خیالستان" میں پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ خیالستان کا مرکزی دائرہ نعت گوئی کا ہے اور اس کے حوالے سے ظفر کی نعت کا انداز بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ نعتیہ شاعری کے لیے نقادوں نے جن شرائط کو ضروری قرار دیا ہے اُن میں سب سے بنیادی چیز رسول مقبول کی سیرت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی ہے۔ دوسری چیز قرآن و حدیث کا بہتر علم ہے۔ تیسری چیز اسلامی تاریخ کا شعور ہے اور ان باتوں کے ساتھ ہی فنی شعور بھی لازمی ہے۔

نعت کے لیے ایک بڑا محرک جذبہ عشق ہے ظفر علی خان کی شاعری میں جذبے کے خلوص، عقیدت کے رنگ اور حقیقت کے پاس نے اُن کے اس شعری سرمائے کو موثر اور پُر کیف بنا دیا ہے۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلّی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں

نعت گوئی میں سراپا نگاری کے موضوع کو اردو نعت گوئی میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے مولانا ظفر جب "سراپا محمدؐ" بیان کرتے ہیں تو گویا اس سراپے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں:

تیری جبیں سے آشکار پر توِ ذات کا فروغ
اور ترے کوچہ کا غبار سرمۂ چشم کائنات

ظفر کے ہاں احساس عبودیت اپنے عروج پر ہے۔ اس احساس کے باوجود وہ نبی کی ذات سے ایسی باتیں نہیں جوڑتے جو خلاف عقل ہوں یا دینی عقائد کے خلاف ہوں:

عرب کے واسطے رحمت عجم کے واسطے رحمت
وہ آیا لیکن آیا رحمتہ للعالمین ہو کر

محمد ﷺ سے محبت اُن کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے:

بتا دوں گا کہ خاک ہند یوں اکسیر بنتی ہے
میری پلکوں کو جاروبِ حریم مصطفےٰ کر دے

ظفر نے احادیث اور قرآنی آیات کو بھی منظوم کیا۔ اُن کے ہاں احادیث کے سلسلے میں ماں باپ کا ادب، رشتہ اسلام، دین کی لم، اسلام کی شناخت وغیرہ کے عنوانات سے احادیث کو منظوم کیا ہے۔

رشتہ اسلام:

ہٹے بالشت بھر بھی تم اگر ملت کے دامن سے

تو کٹ کر گر پڑے گا رشتہ اسلام گردن سے

اعظم الجہاد:

بے لاگ بات برابر لگی نہ رکھ
فرما گئے ہیں حضرت خیر البشر یہی
اظہار امرحق میں نہ ہو خوف دار و گیر
ہے اعظم الجہاد بحکم خبر یہی

ظفر کے ہاں مناجات کا انداز بھی ملتا ہے شاعر زوال پذیر مسلم معاشرے پر کُڑھتا ہے اور نبی کی سیرت کو نجات دہندہ تصوّر کرتا ہے۔ ساتھ ہی قوم کے لیے دعا گو ہوتا ہے:

سارے جہاں کی حکمتیں تیرے کلام پر نثار
سارے جہاں کی دولتیں تیرے نظام پر نثار
ہم تیری ذات پر فدا، ہم تیرے نام پر نثار
تیری گلی میں ہوں مقیم، تیرے مقام پر نثار
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشہ چشم التفات

فریاد کرتے ہیں:

بپتا سنائیں جا کے تمھارے سوا کسے
ہم بے کسانِ ہند کے ملجا تمھیں تو ہو

"امت کے حق میں پیغمبر کی دعا" میں نبی کی صفات کے بیان کے بعد گریز اور پھر دعا میں سوز و درد کی اجتماعی کیفیت پیش کرتے ہیں۔

برے ہیں یا بھلے ہیں پھر بھی یہ تیرے ہی بندے ہیں
مری امت ترے ہی کعبہ کی یارب ہے شیدائی

ظفر کے ہاں احساس عبودیت اور درد مندی کے علاوہ الفاظ کی بھی کمی نہیں ہے۔ الفاظ کا چناؤ ایسے ہے گویا کسی کاوش کے بغیر ہی نعت مکمل ہو گئی:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو
دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمھی تو ہو

ظفر نے صرف قصیدے کی ہیئت ہی کو نعت کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اُن کے ہاں رباعی، غزل اور کبھی نظم کا کوئی

دوسرا انداز بھی سامنے آتا ہے۔ ظفر داخلی قافیے استعمال کرتے ہیں اور نعت گوئی میں بھی موسیقیت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نعتیں اپنے مخصوص آہنگ میں پڑھی جاتی ہیں اور بہت مقبول ہیں:

رونق بزم دودۂ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
خواجہ گیہان سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
جادہ شناس منزل وحدت جلوہ نمائے نور حقیقت
ہادی اکبر، مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نعت میں صلی اللہ علیہ وسلم کی تکرار سے خاص غنایت پیدا کی ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

"ظفر علی خان کی مشہور دل آویز نعت "صلی اللہ علیہ وسلم" جس کا ہر شعر گوہر آبدار کی حیثیت رکھتا ہے اردو کی نعتیہ شاعری میں بلند درجہ رکھتی ہے...... اس نعت کی اشاعت پر ملک بھر میں ظفر علی خان کی نعتیہ شاعری کا شہرہ عام ہو گیا اور آج بھی اس کے مصرعے برگہائے گل تر کی مانند معتبر و معطر ہیں۔"

اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ظفر کی شاعری کو ان کے جوش اور ولولے نے تباہ کیا مگر یہی جوش اور ولولہ ان کے نعتیہ کلام کی لذت کو دوچند کر گیا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب "ظفر علی خان" میں ظفر کی حمد و نعت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

"ظفر علی خان نے حمد اور نعت میں خلوص و محبت اور حقیقت و واقعیت کو اس دل آویز پیرائے میں پیش کیا کہ ان کی شاعری کا یہ حصہ مشرقی ادبیات میں قابلِ قدر مقام حاصل کر گیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ظفر علی خان کی تخلیقی صلاحیتیں اُن کی نعتیہ شاعری میں اپنی ساری جمالی اور جلالی خصوصیات کے ساتھ بروئے کار آئی ہیں ان کی شاعری کا یہ حصہ ہنگاموں اور اجتماعوں سے الگ ان کے خلوت خانہ دل کا ترجمان ہے یہاں جذبے اور تخیل کے سہارے وہ اچھوتی اور لطیف فضاؤں میں سرگرم سیر ہوتے ہیں۔ اظہار و بیان میں اردو فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں، جذبے اور احساس کے مطابق سبک، شیریں اور پُر شکوہ الفاظ اپنے اپنے موقعوں پر آتے ہیں۔

بقول ظفر علی خان:

جب نبی کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
کیسے کیسے خوشنما موتی پروتا ہے قلم

مولانا ظفر علی خان کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی دوسری قسم شاعری میں تو ممکن ہے کہ مولانا کی شہرت و عظمت کسی وقت ناقدری کا شکار ہو جائے لیکن اُن کی نعتیہ شاعری ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور ان کا نام زندہ رکھے گی۔

بنگلہ دیشی کہانی

کرشن چوڑا

بشیر الہلال / ترجمہ احمد سعدی

دل اگر جواز تلاش کرے تو جواز مل جاتا ہے۔
لیلیٰ کی مدد کرنے کے لیے فطرت نے پیش قدمی کی تھی۔ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کے یہاں جب لڑکا تولد ہوتا تو ان کے آنگن میں انار کے درخت میں ایک نئی شاخ پھوٹ نکلتی تھی۔ جوں جوں لڑکا بڑا ہوتا، وہ شاخ بھی بڑھتی رہتی۔ آخر میں جب لڑکے کی عمر بھیڑوں کو لے کر چرانے کے لیے میدان میں جانے کی ہوتی تو اس شاخ کو کاٹ کر یعقوب علیہ السلام اس کی چھڑی بنا کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ یہ بھی بڑی حد تک اسی طرح کا معاملہ تھا۔ ہاں، محبت اور دھمال لڑکوں کی طرح ہی تو ہوتا ہے۔ نہ جانے جسم میں کتنی قلابازیاں کھاتا رہتا ہے!

محبت کے حق میں جواز مہیا کر کے فطرت نے دو بار پیش قدمی کی تھی۔ دو دو بار سامنے آئی تھی۔

وہ جو کرشن چوڑا کا پیڑ ہے گذشتہ سال پہلی ہی کال بیساکھی میں شاخیں ٹوٹ جانے کے سبب لنڈ منڈ ہو گیا تھا۔ بستی کے غریب لوگ ٹوٹی ہوئی شاخیں اُٹھا کر لے گئے تھے اور انھیں سکھا کر ایندھن بنا کر بھات پکایا تھا۔ ہفتہ دو ہفتہ تک آسمان کو تکتا ہوا وہ پیڑ بھوتوں کی طرح زمین پر کھڑا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ نئی نئی شاخیں نکل آئیں۔ نئے نئے سبز پتے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان شاخوں پر سرخ سرخ پھول بھی کھل اُٹھے تھے۔

اس بار بھی کال بیساکھی میں اس کی دو شاخیں ٹوٹ گئی تھیں۔ پیڑ لنڈ منڈ ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا جیسے کوئی سر کٹی ہوئی چڑیل کھڑی ہو۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی نرم و نازک سبز سبز پتے لبادے سے سر نکال کر جیسے مسکرا رہے تھے۔ جو بھی ہو مگر اس مسکراہٹ میں بے حیائی شامل تھی۔ لیلیٰ بڑے دکھ اور درد سے سوچ رہی تھی۔ آخر بار بار آندھی آکر اسی ایک پیڑ کو ہی نقصان کیوں پہنچا رہی تھی؟ تو کیا محبت بے حیا بھی ہے، محبت آندھی بھی ہے۔

فطرت نے گذشتہ سال بھی اس کے حق میں جواز فراہم کر دیا تھا اور اس سال بھی فراہم کر دیا ہے۔ اس کے دل نے جواز تلاش کیا تھا شاید اسی لیے اُسے جواز مل گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جو کچھ چاہتی ہے اُسے مل جائے گا؟

انسان اور پیڑ میں کیا بہت زیادہ فرق ہے؟

ضیاالحق نے نہ جانے کون سا سگریٹ پیا تھا کہ اس کی تلخ، تیز خوشبو اب تک ہوا میں گھلی ہوئی تھی۔ ایک تلخ اور حسین جلن اس کے ہونٹوں پر اب بھی زن زن بج رہی تھی۔

ضیاالحق ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ پیار کے عوض اُسے پیار نہیں ملا تھا۔ اسی لیے وہ ناراض ہو کر چلا گیا تھا..... ضیاء، ممکن ہے تم اپنے دماغ میں نشہ سمیٹے ہوئے یہاں سے واپس چلے گئے ہو۔ پیار کے عوض تمہیں میں نے پیار نہیں دیا اس لیے ناراضگی کے عالم میں تم کسی میخانے میں بیٹھے ہوئے وسکی کے تلخ گھونٹ میں اپنی ہتک کے احساس کو بہلانے کی کوشش کر رہے ہو گے۔ تمہیں دہائی دیتی ہو۔ ضیاء تم آج اتنی زیادہ پی جاؤ کہ کوئی حادثہ کر بیٹھو۔ تمہاری گاڑی گیرج میں چلی جائے اور تم ہسپتال پہنچ جاؤ اور وہاں پہنچ کر آخری سانس لے کر مر جاؤ تو مجھے رہائی ملے۔

ضیاء کے دل و دماغ پر وہ نشہ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اسی لیے لیلیٰ کو اعتراض تھا۔ ایسی بات نہ تھی۔ مرد کا نشہ جیسے چڑھتا ہے ویسے ہی اتر جاتا ہے اس کے لیے بھی نہیں۔ سوال یہ تھا کہ لیلیٰ کے لیے اب محبت کا کھیل کھیلنا مناسب تھا!

اس کا پہلا شوہر بری فوج میں افسر تھا۔ وہ کتنا سخت مزاج اور کھرا تھا یہ بات لیلیٰ سے بہتر اور کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ جنگ میں حب الوطنی اور بہادری دکھانے کے سبب شہید ہو گیا تھا۔ سانپ کے ہاتھوں جس طرح سپیرے کی موت ہوتی ہے جنگ میں سپاہی کی موت بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی لیلیٰ غم سے نڈھال ہو گئی تھی اور درد سے کراہ اٹھی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی اور لیلیٰ تھی۔

ادھر ایک اور واقعہ رونما ہوا تھا۔ جنگ میں جان دی کس نے اور بہادری کا تمغہ ملا کس کو۔ ریڈیو ٹیلیویژن اور اخباروں میں ہر طرف لیلیٰ کا ہی ذکر تھا۔ وہ ایک ہی دن میں بہادر خاتون بن گئی تھی۔ شوہر کو یاد کر کے اُسے کتنی تکلیف ہوتی تھی، کتنا صدمہ ہوتا تھا۔ یہ اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھتا تھا۔ اسے اس بات کا صدمہ نہیں تھا کہ شوہر اس سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ بلکہ اسے غم اس بات کا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کو اس کی محبت کو بھلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ اپنے دونوں لڑکوں کو دیکھتی تھی تو اسے اپنا سینہ شق ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

بیوہ لیلیٰ سے شادی کرنے کے لیے جانے انجانے کم از کم پچاس جگہوں سے پیغام آئے تھے۔ لیلیٰ بے حد خوبصورت تھی۔ یہ بات سچ تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کسی پر ترس کھانا مرد کی فطرت ہوتی ہے اور مشہور عورت کے جسم کے بارے میں بھی مرد حریص ہوتے ہیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد رشتہ داروں اور عزیزوں کے مشورے سے اپنے ایک رشتہ دار قمر الحسن سے شادی کر لی تھی۔

ایک سال گزرتے ہی قمر الحسن امریکہ چلا گیا لیلیٰ کو پتہ تھا، قمر الحسن کے لیے پانے سے زیادہ نہ پانے کا بوجھ وزنی ہو گیا تھا اس نے لیلیٰ کو سرخی مائل آم کی طرح چوس چوس کر اپنی پیاس بجھائی تھی۔ اس کی پیاس میں بڑی شدت تھی۔ شاید شدید پیاسے مرد ہی ایسی عورتوں سے شادی کرتے ہیں، اس کی پیاس نہ مٹنا تھی نہ مٹی۔ لیلیٰ نے سوچا چلو اچھا ہی ہوا جان بچی۔ پہلے شوہر کی طرح تمہاری یاد بھی میرے سینے میں محفوظ رہے گی۔ تم دونوں نے مجھے کچھ نہیں دیا ہے۔

قمر الحسن کے اندر ایک خامی تھی۔ یہ خامی تقریباً تمام مردوں میں ہوتی ہے۔ اس کی ہمت ترس کھانے کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ لیلیٰ کے دل میں سمائے ہوئے درد کو اس نے اپنے سینے کی سختی سے دبانا چاہا تھا۔ لیلیٰ کی ہرن جیسی دونوں آنکھیں ان دنوں رو رو کر سوج گئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے ان اشکوں کو وہ اپنے ہونٹوں سے خشک کرنا چاہتا تھا۔ مردوں کی

ٔبت میں بہادری کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اپنی لڑائی کا زعم ہوتا ہے۔ قمرالحسن نے اپنی وسیع زندگی میں لیلی کو داخل کر کے جو کچھ محسوس کیا، وہ یہ تھا کہ لیلی محبت کی بھوکی نہیں تھی۔ اس کی اپنی ایک دنیا تھی۔ اس کا اپنا ایک وجود تھا۔ صرف محبت سے ں کے دل کو جیتنا مشکل تھا۔ ترس کھا کر یا رحم کھا کر اس کا دل جیتنا تو خیر ناممکن ہی تھا وہ اپنے پہلے شوہر کی یاد میں جو اتنے آنسو بہاتی تھی وہ اس لیے نہیں کہ اس نے اس سے شدید محبت کی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کی بے لوث حب الوطنی اور دلیرانہ مردانگی کے آگے اس کا اپنا وجود شکست کھا گیا تھا۔ وہ شخص اپنی اولاد کو فریب دے کر بھی اس سے جدا نہ تھا۔

لیلی کو ان دنوں کچھ سکون مل سکتا تھا۔ اگر آزادی کے بعد کے دنوں میں نراجیت، قتل، راہزنی، عورتوں کا اغوا، اسلحوں کی ریل پیل اور لیڈروں کی سیاسی بے راہ روی اس طرح زندگی میں در نہ آئی ہوتی۔ اُسے سکون نہیں ملا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے یہ سب کچھ دیکھ کر اس کا شہید شوہر قبر میں بے چین ہو رہا ہو، رو رہا ہو۔ کہیں سے گولی کی آواز سنائی دیتی تو لیلی چونک اٹھتی کبھی خوف سے اس کا سارا جسم تھر تھر کانپنے لگتا۔ قمرالحسن اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر سیراب کرنے کی کوشش کرتا۔ قمرالحسن کو اپنی بہادری دکھانا مقصود ہوتا۔ ویسے بھی تمام مردوں کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ بہادری یا دلیری لیلی کو پسند نہ تھی۔ ایسی بات بھی نہ تھی۔ آخر کار اس دلیری اور بہادری جیسی شے کی پناہ میں اُسے سکون ملتا تھا۔

لیلی، قمرالحسن کے ساتھ خوش تھی۔ اس کے دونوں لڑکوں نے بھی اُسے تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن قمرالحسن زیادہ دنوں تک اس سے نباہ نہ کر سکا اس کے نزدیک لیلی کا وجود شراب کی بھری ہوئی بوتل کی مثال تھا۔ اگرچہ بوتل بھی شراب ہی کی طرح خوبصورت تھی لیکن شراب ختم ہونے کے بعد کوئی بوتل کو منہ نہیں لگاتا۔ بوتل منہ میں لگانے سے ہونٹوں میں چوٹ لگتی ہے اور اس سے پہلے کہ یہ چوٹ شدید سے شدید تر ہو جائے وہ امریکہ فرار ہو گیا تھا۔

لیلی کا دل اور جسم اُجاڑ ہو کر رہ گیا۔ اس نے سوچا وہ کتنی جلدی بوڑھی ہو گئی تھی، اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ مسکرا دی۔ بوڑھی ہو جانا ہی بہتر ہے۔ جوانی کی خواہشات تو بے کراں سمندر کی طرح ہوتی ہیں۔ کشتی کو موجوں کے سپرد کر کے کنارہ پانے کی بڑی بھیانک ضد ہوتی ہے۔ لیکن کنارہ نہیں ملتا۔ لیلی نے اپنے دل میں کہا.... گرچہ میں اب بھی قیمتی ہوں، مگر اب پرانی اور علیحدہ کی ہوئی ساڑھی کی طرح وارڈروب کے ایک کونے میں بے مصرف پڑی رہنا چاہتی ہوں۔

پہلے شوہر کی کار اب بھی اس کے پاس تھی۔ پیٹرول کی قیمت بھی بڑھ گئی تھی اور اب باہر گھومنے کی خواہش بھی نہیں رہی تھی اس لیے فروخت کر دیا۔ نوجوان ڈرائیور بیکار ہو گیا تو اس کا بھی اس نے ایک ذریعہ پیدا کر دیا تھا۔

لیلی کے یہاں جو لڑکی ملازمہ تھی اس کی بھی ایک چھوٹی سی تاریخ تھی۔ اس کا نام نورجہاں تھا۔ بوٹا سا قد، گول مٹول گداز جسم، تندرست و توانا، سریلی آواز، کھانا پکانے میں ماہر، مگر اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ حاملہ ہو گئی تھی لیلی نے اس کا حمل ضائع کرا دیا تھا کہا تھا..... "خبردار کبھی کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا کہ تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا ورنہ میں جو تمھیں گاؤں سے یہاں لے آئی ہوں سب بیکار ہو جائے گا۔"

اس نے ڈرائیور کے ساتھ نورجہاں کی شادی کر دی تھی اور اپنے شوہر کے رفیق کار ریٹائرڈ میجر احسن اللہ صاحب کے کارخانے میں نوکری دلا دی تھی۔ وہ دونوں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ لیلی کو پہلے سے اس کا یقین بھی تھا۔ کیوں کہ مہذب خاتون کی طرح نورجہاں کا اپنا کوئی وجود نہ تھا اور ڈرائیور کو کسی پر ترس کھانے کی بیماری بھی نہیں تھی۔

لیلی کا چہرہ بے حد خوبصورت تھا، جسم بھی گداز اور خوبصورت تھا، قد لانبا اور متناسب تھا۔ وہ دن بدن دبلی ہوتی جا رہی

تھی۔ پھل لگنے کے بعد کدو کی بیل کی طرح سوکھی بنجر زمین پر جیسے وہ جسم پر خاک ملے ہوئے پڑی ہوئی تھی۔ نہ لباس کا کوئی شوق تھا نہ سر میں تیل ڈالتی تھی۔ گالوں پر پف کرنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پاس اب لباس سے چھپانے کے لیے رکھا ہی کیا تھا؟ جسم میں کیا اب کچھ باقی رہ گیا تھا۔ جب جوانی رہتی ہے تو جسم کے بوجھ کا بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب تو اس کا جسم اتنا ہلکا ہو گیا تھا کہ چلتی تھی تو اس کی چال پر رقص کرنے کا گمان ہوتا تھا۔ اسی سے اس کے جسم کے وزن کا اندازہ ہوتا تھا۔ لیلی کو اب اپنی تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔

یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ اب وہ شراب پینے لگی تھی۔ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے کے مصداق وہ معمولی سا ہلکا سا سرور چاہتی تھی۔ چپ چاپ تنہائی میں سب سے الگ ہو کر وہ یہ شغل کرتی تھی۔ پکڑے جانے کے خوف سے اس نے اپنے لڑکوں کو پیار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا تھا۔ لیکن سال ختم ہوتے نہ ہوتے یہ نیا واقعہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

ضیاالحق گزشتہ کل امریکہ سے آیا تھا (ایک شخص گیا اور دوسرا آ گیا تھا) وہ بہت زیادہ بے قرار تھا۔ اسی لیے آج ہی ملاقات کرنے چلا آیا تھا۔ دو چار باتوں کے بعد ہی اس نے کہا... میں تم سے شادی کروں گا۔

لیلی کو اب کسی بات پر بھی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنی لغت سے لفظ حیرت کو مٹا دیا تھا۔ ضیا عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ جب لیلی کی یہاں شادی ہوئی تھی۔ وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ اُسے تھوڑا تھوڑا پڑھا بھی دیتی رہتی تھی۔ اب موقع ملتے ہی بدلہ لینے آ گیا تھا۔ وہ سب کچھ نہیں۔ وہ اپنی ناکام آرزو کو کامیاب بنانے آیا تھا۔ چھی چھی۔ کتنے شرم کی بات تھی مجھے اس نے طوائف سمجھ رکھا ہے؟ عمر ہے یا نہیں، جسم اس کے لیے تیار ہے یا نہیں، کیا کچھ بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اس کا ایک بار دل چاہا تھا کہ سینڈل اتار کر اس کے منہ پر دے مارے لیکن ضیا دیکھنے میں بے حد شکیل ہے۔ توانا جسم خمار آلود آنکھیں۔ اس کا یہ کیسا نشہ تھا؟ امریکہ میں تو نہ جانے کتنی لڑکیوں سے اس کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ کیا پھر بھی اس کا نشہ نہیں اُترا تھا؟ اس کی مکتی جودھا کی طرح بڑی بڑی زلفیں نہیں تھیں۔ یہ دیکھ کر لیلی کو بڑا سکون ملا تھا لیکن قمرالحسن کی بڑی بڑی زلفیں تھیں۔

"جاؤ، پاجی کہیں کے۔" لیلی نے جواب دیا تھا۔

"میں اسی لیے اسٹیٹس سے آیا ہوں۔" ضیا نے کہا تھا... "تمہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔"

"اے سنو، میرے ہاتھ میں ایک اچھی سی لڑکی ہے۔" لیلی نے کہا تھا۔

لیکن کہتے وقت اس کے دونوں گال شرم کی آگ میں ایسے سرخ ہوئے کہ اس کی آنچ اس نے اپنے دونوں کانوں تک محسوس کی تھی۔ لیلی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی زبان سے بے ساختہ ایسا جملہ نکل جائے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی تھی۔ ضیا مدہوش نگاہوں سے اس کے دونوں گالوں پر چھائی ہوئی سرخی کو دیکھتا رہا۔ اس کے جسم کی بے ترتیبی کو دیکھتا رہا۔ محرم کے بغیر اس کے سرخ و سفید سینے کی ہڈیوں کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا، پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔

"میں بہت دُور سے آیا ہوں لیلی۔"

"میں بہت دُور جا چکی ہوں ضیا۔" لیلی نے جواب دیا تھا۔ "اب مجھے پکڑنا آسان نہیں چھوڑو۔"

ضیا نے اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر دی۔ وہ بے حس بیٹھی رہی۔ جب ضیا اپنی سی کوشش کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے اُسے چھوڑ دیا۔ بولا..... تم میرے ساتھ اتنی سرد مہری سے پیش آؤ گی میں دنیا کے دوسرے کنارے سے کیا اسی لیے آیا ہوں۔

س کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن اصل میں وہ اُس پر ترس کھا رہا تھا۔ محاورے کی طرح اس کا مفہوم الٹا لینا ہوگا۔ لیلی نے کہا تھا تم چلے جاؤ ضیا، گھر جا کر چائے پینا، آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا، جاؤ۔

حیرت ہے! ضیا سخت پریشان تھا۔

پھر وہ چلا گیا تھا۔ لیکن لیلی جانتی تھی کہ وہ پھر آئے گا بہت دنوں کے بعد وہ پھر آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اس نے اپنا سراپا دیکھا۔ اس نے بلوز اتار کر مرہم پہنا اور دوسرا بلوز پہن لیا۔ الجھے ہوئے بالوں کو بل دے کر جوڑا باندھا اور برآمدے میں آکر کرشن چوڑا کی ٹوٹی ہوئی شاخوں کو دیکھنے لگی اس نے دیکھا، ٹوٹی ہوئی شاخوں میں نئے نئے سبز پتے نکل آئے تھے۔ اُسے یہ پتے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ وہ دیر تک جی بھر کے ان پتوں کو دیکھتی رہی۔ لیکن اس کے دل میں ایک نئی ہوک کیوں سر ابھار رہی تھی؟ اس کا دل جواز تلاش کر رہا تھا۔

وہ گھر کے اندر واپس آکر پھر آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی آنکھوں کے حلقوں میں ہلکی ہلکی سیاہی جھلک رہی تھی۔ ضیا نے اس کی آنکھوں کی ویرانی کو شاید محسوس نہیں کیا تھا۔ لیلی نے سوچا کوئی ایک واقعہ رونما ہو ہی جائے۔ یا تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے یا تو پھر اس کے قہقہوں کی گونج سے آئینہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔

اس کے دونوں لڑکے واپس آ گئے تھے۔ ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد آکر انھوں نے کمرے میں جھانکا۔ آیا نے ان کے بھیگے کپڑے بدل دیے تھے اور بکھرے بالوں کو سنوار دیا تھا۔

انجو، رنجو! لیلی نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا... جاؤ تم لوگ پڑھو جا کر۔

وہ دونوں دھب دھب کرتے ہوئے چلے گئے۔

لیلی نے اچانک دراز کھول کر سنگار کا سامان الٹ پلٹ کرنا شروع کیا۔ آخر میں لپ اسٹک لے کر اپنے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ یکایک اُسے یاد آیا کہ اس کے پینے کا وقت گزر گیا ہے۔ اُف اللہ تو کیا یہ اس سے بھی بڑا نشہ ہے؟

شراب کی بوتل وہ ہمیشہ الماری میں بند رکھتی تھی۔ چابی لے کر آگے بڑھتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

ٹیلیفون پر ضیا تھا۔ ضیاالحق کو ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیلیفون پر لیلی رو رہی ہو۔

آخر میں لیلی نے کہا.... "میں راضی ہوں۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے۔ ضیا نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تم نے تو مجھے بھگا دیا تھا۔"

لیلی نے ٹیلیفون کے ریسیور کو چوم لیا۔ چک کی ایک شیریں آواز ابھری اور ضیا کے کانوں میں تحلیل ہو گئی ضیا نے کہا میں ابھی آتا ہوں۔

اتنی دیر میں اندھیرا ہو چکا تھا برآمدے پر آکر اس نے کرشن چوڑا کے پیڑ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پیڑ اندھیرے کے پردے میں چھپ گیا تھا (ملک بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا) اس پیڑ نے اُسے جواز فراہم کر دیا تھا۔ زندگی میں طوفان آتے ہیں شاخیں ٹوٹتی ہیں، لیکن ان تنوں پر پھر شاخیں نکل آتی ہیں۔

لیکن یہ کرشن چوڑا کا پیڑ کب تک اُسے جواز فراہم کرتا رہے گا؟

جاپانی ہائیکو

عبدالعزیز خالد

(یہ ترجمے ہیں از رُوئے مفہوم فقط
پابندی ہیئت کی ہوئی مجھ سے، نہ میں
ملحوظ ہی رکھ سکا شمارِ ارکان!)

(۱)

اس جہانِ بے بقا میں
ایک ننھا سا پرندہ بھی
کرے تعمیر اپنا آشیاں

(۲)

راج ہنسو! راج ہنسو!
نکلے تھے جب تم سفر پر
تھی تمھاری عمر کیا؟

(۳)

بے عمق سے تہی بہار ابھی
کر رہی ہے سفر ہوا ہی فقط
پیڑ سے پیڑ تک بحدِّ نظر

(۴)

شام کی خنکی، خبر اس کو
نہیں مطلق کہ دیتا ہے گجر
ہم کو پیغام وداعِ زندگی!

(۵)

ناشپاتی میں شگوفے
ایک عورت چاندنی میں
پڑھ رہی ہے ایک خط

(۶)

خزاں کی شام
اک مرجھائی ٹہنی پر
بسیرا ایک کوّے کا

(۷)

وہ بھی بوڑھا ہو گیا
پیڑ جو میں نے صنوبر کا لگایا تھا
شامِ خزاں!

(۸)

دوج کا چاند
ناؤ میں بیٹھے
چاندنی ہمکنار ہے مجھ سے!

(۹)

ہوا سے بھرے بادلوں کے سفینے!
ہے کیوں اس قدر گرم جولاں
تو اس ماہتابِ خزاں میں؟

(۱۰)

جا رہی ہے بہار، اور
باہوں پہ بوجھ میرے
بربط کا بڑھ گیا ہے

(۱۱)

کس قدر قابلِ ستائش ہے
جو نہ سوچے: ہے زندگی گزراں
جب وہ بجلی کو کوندتا دیکھے

(۱۲)

ابتدا ہے خزاں کے موسم کی
یہ سمندر ہے وہ زمرد دھان
ایک ہی سبز رنگ دونوں کا

(۱۳)

اپنے قیلولے میں، میں سنتا ہوں
زمزمہ دھان بونے والوں کا
اور ہوتا ہوں خود سے شرمندہ!

(۱۴)

فُجی پربت
پہ چڑھ گھونگھے
مگر آہستہ آہستہ!

(۱۵)

"میں اکیلا ہوں" میں نے بتلایا
اس نے کھاتے میں اندراج کیا
سرد ہے کتنی رات پت جھڑ کی

(۱۶)

پرانا ایک جوہڑ
مارتا ہے اس میں اک مینڈک چھلانگ
آواز پانی کی

(۱۷)

ایک تالابِ قدیم
ایک مینڈک اس میں کودے
جلترنگ!

(۱۸)

ایک تتلی نے چھوڑا
خزاں کے پہاڑوں
پہ تنہا مجھے

(۱۹)

لڑکیاں
دھان بو رہی ہیں، صرف
گیت ان کا بچا ہے کیچڑ سے!

(۲۰)

چاند اور میں ہی پل پر
بس رہ گئے اکیلے
سردی کا لطف لیتے!

امریکہ سالگرہ مبارک!

مصنّف: کلاڈ میکے (CLAUDE MCKAY)
ترجمہ: ادیب سہیل

اگرچہ وہ مجھے تلخ روٹی کھلاتی ہے
اور میرے منہ میں شیر کے دانت ڈال دیتی ہے،
میری زندگی کے سانس کو چُرا کر
مجھے اس کا اعتراف ہے
میں اس کے مہذب دوزخ میں رہتا ہوں
جہاں میری جوانی کا زیاں ہو رہا ہے!
اس کی توانائی میرے لہو میں موجزن ہے
جو مجھے اس کی نفرت کے خلاف سینہ تنے کھڑے رہنے کی طاقت بہم کرتی ہے
اُس کا بڑاپا میرے ہونے کو سیلاب کی طرح بہا لے جاتا ہے
اس کے باوجود اس کی چہار دیواری کے اندر
ایک ریاست کے بادشاہ کے مقابل
ظلم، خُبث اور تمسخر کے خوف کے بغیر ایک باغی کی طرح کھڑا ہوں
میں بہ غور آنے والے دنوں،
اس کی طاقت اور اس کے گرینائٹ کے عجوبے کو دیکھتا ہوں
جو وقت کے اٹل ہاتھ کے نیچے
ایک بے قیمت خزانہ کی طرح ریت میں پوشیدہ ہے

میں بھی گاتا ہوں امریکہ

میں تیرا سیاہ فام بھائی ہوں
وہ مجھے باورچی خانے میں کھانے کے لیے بھیج دیتے ہیں
جب اُن کے احباب آتے ہیں۔
لیکن میں ہنستا ہوں
اچھی طرح کھاتا ہوں
اور تنومند ہوتا ہوں۔ کہ آنے والا کل میرا ہوگا
میں میز پر ساتھ بیٹھوں گا
جب احباب آئیں گے
پھر کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ مجھے کہہ سکے
"جاؤ باورچی خانے میں جا کر کھاؤ"

تب وہ
دیکھیں گے کہ میں کتنا خوبصورت ہوں
اور اُنھیں شرمندگی ہوگی.....
میں بھی امریکہ ہوں۔ !

جدید ایرانی ادب سے

عشق کی دردناک کہانی

منیرو روانی پور / شاہدہ عالم

یہ عشق کی دردناک کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو دہرائی جاتی رہے گی۔ جب تک زمانے کا بلوری گیند موجود ہے اور جب تک یہ بلوری گیند دوسرے زمانوں کے کسی سیارے، کسی ستارے سے ٹکرا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اور پھر آخر کار شاید وقت اندر سے ٹوٹ پھوٹ جائے، انھیں دردناک کہانیوں سے جو دہرائی جاتی ہیں اور وقت کے حجم کو بھر دیتی ہیں۔ اور وقت جب محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، دبے ہوئے غم و غصّے سے اور فریاد کناں تنہائی سے بھر جاتا ہے تو اس کی بلوری دیوار ٹوٹ جاتی ہے .... لیکن ہر رومانوی داستان یقینی طور پر اس بلوری گیند کے بکھرے ہوئے ذرّوں میں گھر بنا لیتی ہے اور خود ایک نیا وقت تخلیق کرتی ہے اور شاید ایک دن ایسا بھی آئے کہ ابدیت اور جو کچھ خلیق ہوا ہے اور جو کچھ تخلیق نہیں ہوا اس میں سے کچھ بھی نہ بچے سوائے وقت کے بلوری ذرّوں کے، جن کے دل میں عشق کی دردناک کہانیوں کا بویا ہوا عشق کا بیج ہو۔ اس وقت، وقت لمحوں کے بلبلے میں سویا ہوا ایک جوڑا ہوگا، یا ایسی کہانیاں جن کا انجام اتنا یکساں بھی نہیں ....

عورت کو اس کہانی کی وجہ سے اب بہت سے لوگ پہچانتے ہیں اور اس کا نام لینے سے کچھ نہیں بدلے گا، وہ عورت جو خود اپنی ہی داستان کو کہانیوں میں لکھتی تھی اور مرد بھی ایسا ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کیونکہ کوئی اسے نہیں پہچانتا۔ اور یہ کہ وہ کیسے آشنا ہوئے .... یہ بھی کچھ زیادہ اہم نہیں، جب کوئی داستان تشکیل پاتی ہے تو اپنے راستے خود ہی بنا لیتی ہے، کسی مقصد کو پانا، کوئی کہانی پڑھنا، کسی داستان کو چھپوانا۔ ان باتوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

وہ ایک سادہ سی عورت تھی جس کے ذہن، زبان اور دل کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ اس کی باتیں بالکل اس کی سوچوں اور احساسات جیسی تھیں اور عشق کے معاملے میں وہ وقت کی بہت زیادہ قائل نہیں تھی۔ ہمیشہ منزلِ عشق پر تھی اور ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو لمحے بھر کے لیے عشق کرتے ہیں پھر بھلا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جب پہلی بار اس آدمی کو دیکھا تو بولی:

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔ آئیں آپس میں دوستی کر لیں...... میں بہت تنہا ہوں!"

آدمی میز کے دوسرے کنارے بیٹھا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے بال اڑے اڑے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے حیران ہو کر عورت کی طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔ عورت کی حرکات و سکنات اور رویہ ایسا تھا کہ اس نے اور کچھ نہ سوچا سوائے اس کے کہ

عورت ایک بچی ہے اور اسے ایک ناول نگار بنایا جا سکتا ہے۔

اس نے عورت کے افسانے پڑھ رکھے تھے اور یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے اس کے کام سے دلچسپی ہو۔ اس نے عشق کے موضوع پر بات کیے بغیر طے شدہ موضوعات پر گفتگو کی۔ عورت نے جان لیا کہ اگر اس نے اچھی کہانیاں لکھیں تو وہ اس آدمی کو اپنا بنا لے گی۔

دن گزر رہے تھے اور آدمی کی ہلکی سی مسکراہٹ قائم تھی۔ اس مسکراہٹ سے وہ ساری چیزوں کو مشروط اور ہوا میں معلق کر دیتا۔ عورت بھی پہلے جیسی تھی۔ کمرے میں آتی، کتابوں کو الٹ پلٹ کرتی تمام کاغذوں کو میز پر بکھیرتی پھر جمع کرتی اور پھر دوبارہ بکھیر دیتی.......

عورت کے ہر قدم، ہر بات سے بے قراری ٹپکتی تھی اور ایک دن جب اُس نے سب کچھ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ مرد کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور بولی:

"ہاتھ.... ذرا میں تمہارا ہاتھ تو دیکھوں۔"

آدمی بولا:

"چھوڑو جب تم مصنفہ بن جاؤ گی......"

عورت کہنے لگی:

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھوں۔"

وہ مسکرا کر پوچھنے لگا:

"کیوں؟"

کہنے لگی:

"میں چاہتی ہوں تمہارے ہاتھ سے اپنے سر کو سہلاؤں۔"

وہ ہنس دیا اور بولا:

"پگلی"

لیکن اس نے اپنا ہاتھ نہیں پکڑایا۔

میں اس کہانی کو جلدی جلدی لکھ رہی ہوں ڈرتی ہوں کہ کہیں کوئی آنہ جائے اور کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے سوال نہ کر بیٹھے کہ:

"کام کہاں تک پہنچا"

میں سب کی نظروں سے دور یہ کہانی لکھ رہی ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کوئی اسے مکمل ہوئے بغیر پڑھ لے، اسی لیے میں جگہوں کی بھی نشاندہی نہیں کر رہی کیونکہ جگہوں، شہروں اور عمارتوں کے نام لکھنے میں نہ صرف میرا وقت صرف ہوگا...... وقت جو میرے پاس نہیں ہے.... بلکہ اس سے کچھ واضح بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ یہ سب واقعات وقت کی اس بلوری گیند میں پیش آئے۔

وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اسے چاہتا ہو اور اس جیسی عورت کو وہ وقت محض وقت کے معنی میں رکھتا تھا۔

س کے لیے ایک سیکنڈ اور ایک سال میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ جہاں کہیں ہوتی وقت کا رس نکالتی رہتی تاکہ اس تک پہنچے اس لمحے تک جب اس کو صرف ایک مرد کی حیثیت سے دیکھے اور خود کو صرف اور صرف ایک عورت. اور کچھ نہیں!

یہی سوچ کر اس نے کام شروع کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لفظوں میں جان ڈالنے کے لیے اپنے وجود سے مدد لے رہی ہے۔ جیسے لفظ اس کی روح اور جسم کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کہانیاں لکھتی چلی گئی ایک کے بعد ایک. اور سب کی سب رومانوی۔ آدمی ان کو پڑھتا اور سر ہلا دیتا۔ وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔ کبھی کبھی عورت کہانی مکمل کر کے آدمی کو پڑھ کر سناتی اور پھر کہتی:

"میں تھک گئی ہوں آؤ ذرا مل کر WALK کریں!"

آدمی مسکرا کر سر ہلا دیتا اور عورت جان جاتی کہ ابھی وقت نہیں آیا جب آدمی اس کے قدم سے قدم ملا کر لوگوں کا سامنا کرے. وہ فاصلے کو سمجھ جاتی اور اپنے کام کے متعلق مشکوک ہو جاتی، وہ چلی جاتی، پڑھتی اور پھر لکھتی!

وقت گزرتا گیا اور عورت کی کتابیں ایک ایک کر کے چھپتی گئیں۔ آدمی نے اپنا تمام وقت اس کی کتابیں پڑھنے میں لگا دیا۔ وہ روز پہلے سے زیادہ اس کے ہوش و حواس اس کی طرف کھنچتے یا اگر میں حقیقت بیان کروں تو کہانیوں کی ہیروئن کی طرف۔ آدمی باتا. اس کے کمرے میں بیٹھتا اور عورت اِدھر سے اُدھر اڑتی پھرتی۔ ایک عرصے سے وہ الجھی الجھی. بکھری بکھری باتیں کرنے لگی تھی اور یہ پریشانی اس کی باتوں میں روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی کچھ یوں کہ آدمی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ افسانوں کی ہیروئن کب بات کر رہی ہے اور کب عورت۔ عورت کی تمام باتوں کی تان اِس پر آکر ٹوٹتی:

"تمھیں مجھ سے محبت ہے؟"

آدمی ہمیشہ ہنس دیتا اور کہتا:

"کام کہاں تک پہنچا۔"

اور وہ اچانک سمجھ جاتی۔ اپنے حواس مجتمع کرتی اور آدمی کو اپنے ہاتھ دکھاتی جن پر پن اور بال پوائنٹ کے نشان پڑ چکے تھے۔ اور آدمی کہتا:

"کام ایسے ہی ہوتا ہے!"

عورت دوبارہ کام میں جُت جاتی۔

کتنا وقت گزر گیا، کتنا عرصہ یہاں تک کہ تبدیلیاں عورت کے جسم و جاں میں اترتی گئیں وہی عورت کہ شروع میں جس کے ہوش و حواس دروازے کی طرف لگے رہتے کہ آدمی آئے اور کہانیاں پڑھے اور بعد میں وہ ڈرتی کہ دروازہ کھلے. کوئی آئے اور لفظوں سے سیاہ ہو جانے والے کاغذوں پر جھکے۔

عورت کی زندگی میں وقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی اگر کوئی بیج بو یا جاتا، کوئی عشق کا بیج، تو کوئی چیز بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی لیکن آدمی آہستہ آہستہ دیکھ رہا تھا کہ عورت اس جوش و جذبے کا اظہار نہیں کرتی اگر اسے آواز دی جاتی تو وہ سر اٹھا کر آہستہ سے اس کی طرف موڑتی، جیسے اپنی تخلیق میں غرق ہو۔ اس کی نظروں میں وہ عاشقانہ چمک نہیں تھی وہ بچوں جیسا لاابالی پن نہیں تھا، اگرچہ اس کے افسانوں کی ہیروئن کی آنکھیں چمکتیں، وہ محبت سے دیکھتی، اس کا رویہ اور اس کا کردار زیادہ سے زیادہ بچکانہ جوش و خروش لیے ہوتا۔

قومی زبان (۷۰) ستمبر ۱۹۹۳ء

آدمی ہر روز، چھپنے سے پہلے اور چھپنے کے بعد وہ کہانیاں پڑھتا اور عورت سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوتا چلا گیا اس عورت سے جو افسانوں میں اپنا خون دوڑتا محسوس کرتی تھی۔

عورت سے زیادہ سے زیادہ لکھوانے اور افسانوں کی رومانوی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے وہ موسیقی کا انتظام کرتا، اس کے بدن کی سستی دور کرنے کے لیے اس کے لیے جوس بناتا، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتا، لیکن عورت ان تمام مہربانیوں کی طرف توجہ نہ دیتی۔ بس لکھتی رہتی اور ایک دن جب آدمی نے کہا:

"تم تھک گئی ہو آؤ ذرا WALK کریں!"

تو عورت کمزور آواز، اور مضبوط اور سپاٹ نظروں سے بولی:

"نہیں نہیں مجھے کام ہے۔"

اور وہ نہیں گئی۔ اسے تنقید اور ان رسالوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ جنھوں نے آپس میں اس کے متعلق گفتگو کا مقابلہ شروع کر رکھا تھا۔ حتٰی کہ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کتابیں کتنی تعداد میں چھپ رہی ہیں۔ آدمی اخبارات پکڑے اس کے سامنے کھڑا رہتا وہ اس کی گرمجوشی کے مقابلے میں معمولی سے ردّعمل کا بھی اظہار کرتی وہ روز بروز سست سے سست تر ہوتی چلی گئی۔

ایک دن جب آدمی سو کر اٹھا تو وہ دل ہی دل میں ہنس دیا اس طرح وہ پہلے کبھی نہیں ہنسا تھا وہ بھی آپ ہی آپ! اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے عورت کی تمام فطری شوخیاں یاد آگئیں وہ بچکانہ حرکتیں جو وہ کرتی تھی، شروع شروع کے دنوں میں اس کی گفتگوؤں کا آخری جملہ جسے وہ اکثر دہراتی:

"تمھیں مجھ سے محبت ہے؟"

آدمی زیر لب گنگنانے لگا۔ وہ عورت کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ آخر وہ پھولوں کی ایک دوکان پر گیا، ایک گلدستہ خریدا اور چل پڑا۔ عورت ہمیشہ کی طرح لکھنے میں مصروف تھی۔ لگتا تھا کسی افسانے کا آخری جملہ لکھ رہی ہے۔ صرف اس کا ہاتھ حرکت کر رہا تھا اور اس کا تمام جسم پتھر کے کسی مجسمے کی طرح تھا۔ وہ ہر چیز حتٰی کہ وقت تک سے بھی دور تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے صرف ہاتھ ہی ہاتھ ہو جو تیزی سے لکھتا جا رہا تھا۔ آدمی نے گلدستہ گلدان میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ عورت نے دیکھا تک نہیں وہ اپنی تحریر میں محو ہو چکی تھی وہ پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ آخری جملے پر پہنچ گئی ہو۔ آدمی نے دیکھا کہ اس نے فل سٹاپ ڈالا اور اس کا ہاتھ اسی طرح لکھے ہوئے صفحات پر بے حرکت رہ گیا۔ آدمی نے آہستگی سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے کاغذ باہر نکالے، کہانی کا عنوان پڑھا "عشق کی دردناک کہانی" عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور دیکھتا رہ گیا عورت اب عورت نہیں رہی تھی۔ لفظوں کا ایک بُت بن چکی تھی اس نے اپنے اطمینان کے لیے اس کے شانے کو جھنجھوڑا اور اچانک ہزاروں الفاظ زمین پر بکھر گئے اور ان ہزاروں لفظوں میں اسے یہ الفاظ بھی نظر آئے:

"آپ بہت خوبصورت ہیں........ آئیں دوستی کریں........ میں بہت تنہا ہوں!"

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

اُردو واسوخت

شمیم صبائی متھراوی

صفحات ۲۰۶ قیمت ۸۰/- روپے

پبلشر سیماب اکادمی پاکستان رجسٹرڈ

"واسوخت، غزل، قصیدہ، مثنوی کی طرح ایک صنف سخن ہے جس کا موضوع غزل کی طرح عشقیہ مضامین ہے۔ لیکن غزل میں عموماً عاشق کی نیاز مندی اور عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اس کے علاوہ اب اس میں اور بھی مضامین شامل ہو گئے ہیں خاص طور پر فلسفہ، تصوف اور اخلاقیات مگر واسوخت کلیتاً عشق کے دائرہ میں محدود ہے۔ چنانچہ مولانا حالی مقدمہ شعرو شاعری میں فرماتے ہیں کہ "واسوخت تو عشق کی نسل ہی سے پیدا ہوا ہے۔" گویا اس میں عشقیہ مضامین کے علاوہ اور کسی چیز کی سمائی نہیں مگر اس صنف میں عاشق عجز و نیاز کی منزل سے گزر کر اور محبوب کی وفاداری سے مایوس اور اس کی بے اعتنائی سے مجبور ہو کر اس کو طعن و تعریض کا ہدف بناتا ہے۔

دیگر اصناف سخن کی طرح اردو میں واسوخت بھی فارسی سے درآمد کی گئی ہے۔ فارسی میں اس صنف کا موجد وحشی یزدی کو بتایا جاتا ہے۔ اردو میں میر، مومن اور امانت کو اس سلسلہ میں زیادہ شہرت نصیب ہے۔ ان شعرا کے یہاں بھی اس صنف کا ذکر ضمناً آجاتا تھا۔ اور ابھی تک کوئی علیٰحدہ اور مستقل تذکرہ اس موضوع پر نہیں لکھا گیا تھا اور اگر لکھا بھی گیا تھا تو اس کو شہرت عام نہیں تھی۔ زیر تبصرہ کتاب غالباً اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے جو اس اہتمام سے لکھی گئی۔ مصنف موصوف شمیم صبائی متھراوی نے بڑی کوشش و کاوش اور محنت و لگن سے یہ مواد جمع کر کے وقف عام کیا ہے۔ جس میدان میں ابھی تک چند افراد ہی دکھائی دیتے تھے وہاں انھوں نے ایک جم غفیر اکھٹا کر دیا ہے انھوں نے ایسے ۷۶ شعرا کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ شروعات شاہ مبارک آبرو سے ہوتی ہے اور آخری شاعر سجاد لکھنوی ہیں۔ ان سب کے مختصر حالات زندگی اور واسوخت کے نمونے دیے ہیں اور یہ بہت اہم کام ہے جس میں انھیں یقیناً اولیت نصیب ہے۔ غالباً ان کی نظر سے میر حسن کا تذکرۂ شعرا نہیں گزرا جس کی وجہ سے وہ آبرو کے ایک ہمعصر محتشم علی خان حشمت کو چھوڑ گئے ہیں۔

بہرحال شمیم صاحب کی یہ کوشش ہر طرح لائق ستائش ہے کہ انھوں نے اردو کی ایک ایسی صنف شاعری کی طرف توجہ کی جو دوسرے ادیبوں کی بے توجہی کا ہدف بنی ہوئی تھی۔

(ثناء الحق صدیقی)

افکار برق

برق اجمیری
صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۲۰/- روپے
جے سنز انٹر نیشنل ۲۱۶-۲۱۵ سنٹرل ہوٹل عبداللہ ہارون روڈ کراچی

"افکار برق" حضرت برق اجمیری کا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں اُن کی غزلیں، نظمیں شامل ہیں۔ حضرت برق کا شمار بزرگ شعرا میں ہوتا ہے، ان کی جائے پیدائش اجمیر شریف ہے اور اس وقت ان کی عمر ۸۱ سال ہے۔ اس عمر تک دوسرے مشاغل کے ساتھ پرورش لوح و قلم کرتے رہنا زندگی، زندہ دلی اور شاعری سے سچے شغف کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ پرورش لوح و قلم کا ذکر یہاں یوں آ گیا کہ جناب برق کے ہاں فیض احمد فیض کے کلام و افکار سے مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس بات کی نشاندہی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب کے دیباچے میں کی ہے حوالے کے طور پر انہوں نے غزل کے چند اشعار اور جناب برق کی دو نظموں "میرے ہمدم میرے دوست" اور "اے دلِ بے تاب ٹھہر" کے اقتباسات پیش کیے ہیں ایک بڑی اچھی بات جو ان کے کلام میں دیکھی جاتی ہے وہ یہ کہ برق صاحب نے شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ کلاسیکی انداز و ادراک کے باوجود موجودہ دور کی لسانیات سے بھی ہم آہنگ ہے۔ برق صاحب کے ہاں فیض کے ساتھ غزلوں میں بیگانہ کا تیور بھی دیکھا جا سکتا ہے:

حسن ہی سے پنا ہے عشق زندگی اپنی
دل میں روشنی آئی اُن کے مسکرانے سے

میں نہیں تو ان کو پھر کون دیکھ سکتا ہے
اُن کی جلوہ آرائی ہے غریب خانے سے

برق صاحب کے ہاں بہت سے ایسے اشعار مل جائیں گے جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ مسائل حیات سے بے خبر نہیں گزرے۔ عصر کو نگاہ میں رکھا، اور کوائفِ عصر کو حسب توفیق اشعار میں ڈھالا کیے۔ ایک شعر دیکھیے:

کتنی عجیب صورتِ حالات ہو گئی
سورج چمک رہا ہے مگر رات ہو گئی

یہ ایک ایسے زمانے کی منظر کشی ہے جب سورج کی روشنی یکسر تاریکی کی گرفت میں آ گئی ہے۔ برق صاحب کا یہ شعر فیض کے داغ داغ اجالا والے شعر کی قبیل میں آتا ہے لیکن یہ اپنی فضا تیقن اور سہل ممتنع کی کیفیت رکھتا ہے۔
کتاب دیدہ زیب چھپی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا۔ ر)

کلامِ صدیق

صدیق حسن مارہروی
صفحات ۱۲۰ قیمت ۴۰/ روپے
زبیر پبلیشرز بی ۳۹۔ علامہ اقبال ٹاؤن ڈبلیو بلاک شمالی ناظم آباد کراچی

"کلام صدیق" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جناب صدیق حسن صدیق مارہروی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اسے ان کے لائق نواسے ،روف افسانہ نگار جناب جمیل زبیری نے شائع کیا ہے۔ اس طرح صاحب کتاب کا بکھرا ہوا کلام یکجا ہو کر دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو گیا ہے۔ جمیل زبیری کی یہ ادبی خدمت لائق تحسین ہے کتاب کے پیش لفظ اور جناب قمر ہاشمی کے تعارفی کلمات سے جو معلومات ،اہم ہوتی ہیں وہ یہ کہ جناب صدیق داغ اسکول کے شاعر تھے اور داغ کے شاگرد جناب احسن مارہروی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور جناب احسن مارہروی کا شمار ادبی دنیا میں ایک بلند پایہ محقق و نقاد، عالم اور شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

جناب صدیق مارہروی پر داغ کے رنگِ خاص کا اثر پڑنا لازمی تھا کیوں کہ وہ شاگردی کے حوالے سے اسی تسلسل میں آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور میں دوسرے غزل گوؤں کو بھی داغ ہی کا رنگ بھایا تھا۔ غزل محبوب سے گفتگو کا دوسرا نام ہے اور داغ کے رنگ میں یہ گفتگو خوب خوب نکھرتی ہے اس رنگ میں اُستاد قمر جلالوی کو بھی خاصی شہرت ملی۔ ادب کے پارکھ کا خیال ہے کہ صدیق حسن مارہروی اور قمر جلالوی کے کلام میں اس درجہ مماثلت تھی کہ بعض اوقات پڑھنے والے کے لیے یہ بتانا مشکل ہو جاتا کہ جو کلام وہ پڑھ رہا ہے وہ صدیق حسن مارہروی کا ہے یا اُستاد قمر جلالوی کا۔ جگر مرادآبادی بھی صدیق حسن مارہروی اور استاد قمر جلالوی کو ایک درجہ پر سراہتے تھے۔ داغ کے اس رنگِ خاص میں صدیق حسن صاحب کے چند اشعار سنیے:

اس پر نظر گئی کبھی اُس پر نظر گئی
اس کشمکش میں عمر ہماری گزر گئی

کوئی تو ہجر میں پُرسانِ حال ہوتا ہے
جو تم نہیں تو تمھارا خیال ہوتا ہے

یہ بھی کوئی روٹھنے کی بات تھی
اتنا پوچھا تھا کہاں تھے شام سے

اچھا ہوا کہ آپ نے دیوانہ کہہ دیا
یہ اور عاشقی کی سند مل گئی مجھے

مرزا غالب کی طرح اپنے دورِ ناسپاس کے جناب صدیق حسن مارہروری بھی شاکی نظر آتے ہیں:

اس دور میں کسی کا کوئی قدرداں نہیں

صدیق اب تو عزتِ اہلِ ہنر گئی

پھر آپ ہی یہ کہہ کر تسکین کا پہلو نکال لیتے ہیں:

صدیق مجھ میں سب سے بڑا یہ کمال ہے
اہلِ کمال جانتے ہیں بے ہنر مجھے

اس میں کسی بھی دور کے ایسے صاحب ہنر پر گہرا طنز ہے جو اپنے معاصر کے اعتراف سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

(ا۔س)

گلہائے خنداں

محمد ذکی الدہلوی

صفحات ۴۶۴ قیمت =/۱۷۰ روپے

ایوان علم وادب ۳ ڈی ۲۳/۶ ناظم آباد کراچی

کتاب کا نام بذات خود اس بات کی گواہی ہے کہ اس میں ہنسنے ہنسانے اور زیر لب تبسم کرنے کی باتیں ہوں گی۔ اس کے مندرجات تک رسائی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۱۰ مشاہیر عالم کے عالمی و ادبی اور سچے لطائف و ظرائف یکجا کر دیے گئے ہیں، ساتھ ہی اس کے صفحات کو ان مشاہیر کی تصاویر اور اُن کے مختصر حالاتِ زندگی سے بھی آراستہ کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو دوگونہ لطف حاصل ہو۔

اگر انسانی زندگی سے مزاح، لطائف وظرائف اور بذلہ سنجی کو یکسر نکال دیا جائے تو یہ اُجاڑ ہو کر رہ جائے گی۔ کتاب کے مؤلف جناب ذکی الدہلوی نے صبح سے شام تک گوناگوں مشاغل کی زد و کوب میں مبتلا افراد کو اس کتاب کے ذریعے مسکرانے اور اذیتوں کو کم کرنے کے لمحات فراہم کر دیے ہیں۔ یہ کتاب تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے احسان کا درجہ رکھتی ہے مزاح، لطائف و ظرائف کی قدامت کا رشتہ اُن پہلے انسانوں سے جوڑا جا سکتا ہے جب کسی ایک نے اپنے اشارے کنائے سے دوسرے کو بے ساختہ ہنسنے کا موقع فراہم کیا ہوگا۔

اس کتاب میں مزاح کی اسلامی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ فیثا غورث اور سقراط سے لے کر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تک اکابر کا ذکر کیا گیا ہے درمیان میں عصر حاضر کے نامی گرامی مزاح نگار رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، انشاء جی، مجید لاہوری، وغیرہ مذکور ہیں۔ اس تسلسل میں کئی اہم نام نظر انداز ہو گئے ہیں جن میں انجم مان پوری، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا کئی دوسرے....

اب سے پچاس برس پہلے اردو طنز و مزاح میں شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" اور انجم مان پوری کی "میر کلو کی گواہی" کی بڑی دھوم تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تالیف و تصنیف کے کام میں ہر کس و ناکس تک ہر شخص کی رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک دلچسپ کتاب ہے اور صوری و معنوی اعتبار سے وقیع ہے۔

(ا۔س)

افسانہ اور علامتی افسانہ

علی حیدر ملک
صفحات ۱۲۸ قیمت -/۱۰۰ روپے
وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔ کراچی

"افسانہ اور علامتی افسانہ" جناب علی حیدر ملک کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں لکھتے رہے ہیں اس میں زیادہ تر افسانوی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اُن کا خاص موضوع ہے جناب علی حیدر ملک خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں، اب سے چند سال پہلے اُن کے افسانوں کا مجموعہ "بے زمیں بے آسماں" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے افسانہ نگاری ہی اُن کی اوّل و آخر پہچان ہے۔

جناب علی حیدر ملک فکشن کے موضوع پر جماؤ کے ساتھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کے لیے ان کا مطالعہ "اپ ٹو ڈیٹ" اور ذہن بھی سازگار و مستعد ہے لیکن زیر مطالعہ کتاب میں کہیں موضوع کو محض مس کر کے گزر گئے ہیں کہیں اس کی چٹکی لی ہے اور کہیں چھیڑ خوانی کا لطف بھی حاصل کیا ہے۔ اس کے باوجود بہ حیثیت مجموعی ان کے یہ مضامین فکشن کے باب میں مختلف جہات سے سمت نمائی کا فرض انجام دیتے ہیں۔

جناب علی حیدر ملک کی تحریروں کی طرف قارئین کے دل کھنچتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ اُن تحریروں کا رواں دواں اور شگفتہ ہونا ہے۔ اتنی رواں تحریر کا ملکہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ روانیٔ تحریر اگر غیر ضروری طوالت اور بے مغزی کا پستارہ بن جائے جیساکہ اکثر مضمون نگاروں کے ہاں دیکھا جاتا ہے تو اس سے قاری کو اکتاہٹ کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے لیکن اگر تحریر کی روانی میں اختصار کے ساتھ جرأت اظہار شامل ہو جائے تو یہ تحریر دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بن جاتی ہے۔ بعض وقت جرأت اظہار کی کمی کی وجہ سے بھی آواز کمزور اور بے رس ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں صرف ایک مثال اپنی باتوں کی تقویت کے لیے پیش کرتا ہوں۔

> "فن داستان گوئی" اردو تنقید میں ایک اہم اور منفرد کتاب تھی۔ اس کے بعد امید بندھی تھی کہ کلیم الدین احمد ناول اور افسانے کی طرف توجہ کریں گے لیکن وہ پھر شاعری کی طرف مراجعت کر گئے۔ اور تاریخ و تحقیق اور عملی تنقید میں کھو گئے۔ ممتاز شیریں کو چند مضامین لکھنے کے بعد اچانک چُپ لگ گئی یہاں تک کہ اسی چپ کے عالم میں وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ محمد حسن عسکری شاعری اور فکشن کی تنقید میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے کرتے تصوّف کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ آخر میں احسن فاروقی کو بھی قافیہ پیما حضرات اٹھا کر اپنے خیمے میں لے گئے۔ حالانکہ فکشن ہی ان کا اصل میدان تھا اور وہ اپنے تمام ہم عصروں میں فکشن پر لکھنے کی شاید سب سے زیادہ اہلیت رکھتے تھے۔"

("فکشن اور تنقید کا پرنالہ")

بات یہاں ختم کی جاتی ہے کہ جو "طرز فغاں" اس کتاب میں ایجاد کی گئی اُس میں اختصاص کی صورت پیدا ہوئی ہے اگر صاحبان سیف و قلم کو اپنے اپنے میدان میں یہ اختصاص حاصل ہو جاتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ گویا اُن کی تگ و دو سپھل ہوئی۔ اس لئے

سے "افسانہ اور علامتی افسانہ" بہت حد تک کامیاب ہے۔
کتاب نفاست سے شائع ہوئی ہے اور قابل مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

تراشے

مرتب: انصاف قریشی
صفحات ۲۵۶ قیمت ۔/۷۵ روپے
دبستان فکر و ادب ۴۴۲/۸ فیڈرل بی ایریا کراچی۔ ۷۵۹۵۰

کتاب کا نام "تراشے ہے" لاحقہ میں "جو زندہ رہیں گے" استعمال کیا گیا ہے "تفریحی ادب" کی یہ کتاب معلومات کا انسائیکلوپیڈیا بھی کہی جاسکتی ہے۔ آفرین ہیں وہ لوگ جو عمر بھر پسندیدہ تحریروں کو جمع کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک وقت میں یکجا کر کے قارئین کی دلچسپی اور لطف کے لیے کتابی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ تخلیق کے درجے پر فائز تو نہیں لیکن اس کی ترتیب و تدوین تخلیق سے زیادہ مشکل اور صبر آزما ہے۔

اس کتاب میں رسائل و اخبارات کی دل کو چھو جانے والی خبریں کتابوں میں شائع ہونے والی مختصر مگر خوبصورت تحریریں، فکر انگیز اقتباسات، طنز و مزاح، لطائف، اہل قلم کی خوش گفتاریاں، پھلجھڑیاں، پٹاخے، کرمک شب تاب، نخلستان غرض تحریر کی شکل میں ہر وہ شے جو انسان کو محظوظ کر سکتی ہے اور جس سے ذہن و دل میں تراوش علم ہو سکتی ہے، اس میں موجود ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر لحمہ اس طرح منظر و موضوع بدلتے رہتے ہیں کہ پڑھنے والا جیسے نیرنگ زمانہ کی سیر کر رہا ہوتا ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری تفریح اور علم کو شانہ بشانہ دیکھتا ہے دیسی محاورہ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ جناب انصاف قریشی نے اس کتاب کو بارہ مسالے کی چاٹ بنا دیا ہے آخر میں یہ گزارش ہے کہ مرتب موصوف کی برس ہا برس کی محنت رائگاں نہیں گئی ہے۔
کتاب کی طباعت اور مواد قابل مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

علامہ اقبال اور مولانا محمد علی

مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری،
صفحات ۱۳۸ قیمت ۔/۴۵ روپے
مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی کراچی ۷۵۸۰۰

علامہ اقبال اور مولانا علی تاریخ اسلامیان ہند کی عظیم شخصیات تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے نہایت قدردان تھے اور دونوں میں سیاسی میدان میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف بلکہ دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے سوائے اس کے کہ دونوں ملت کے درد مند اور بہی خواہ تھے اور اپنے اپنے انداز سے دونوں مصروف خدمت ملی تھے۔

۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن اور مولانا محمد علی "ہمدرد" کے ایڈیٹر تھے۔ دونوں کی راہیں جدا جدا

اور خدمت ملی کا درد مشترک تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک تقریر میں پولیس اور انتظامیہ میں انگریز افسروں کے اضافے کی حمایت کی تو مولانا محمد علی بھڑک اٹھے کہ ان کی ڈور شملہ سے ملائی جارہی ہے۔ مولانا محمد علی نے لگاتار ایک دو نہیں مسلسل پانچ مضامین علامہ اقبال کے خلاف لکھ ڈالے اور علامہ اقبال کی شاعری، ان کے فکر اور ان کی سیرت کے بارے میں ایسے لولوئے لالہ بکھیرے کہ وہ شاید آپ کو کہیں اور تحریر ملیں۔ علامہ اقبال کی تعریف بھی بہت ہوتی ہے اور ان کی شاعری اور ان کے فکر پر تنقیدیں بھی بہت آتی ہیں لیکن مولانا محمد علی نے اقبال کی شاعرانہ فکر کی عظمت اور سیاسی سیرت کی جو تصویر کشی کی ہے وہ مولانا محمد علی کی ان تحریروں اور مضمونوں کے سوا شاید اور کہیں نہ ملے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کی ترتیب و تہذیب نے ان مضامین کو ایک مستقل کتاب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور ان کے عندیہ نے دونوں بزرگوں کے اختلاف و اشتراک کے پہلوؤں اور فکر و سیرت کے خصائص و خصائل کو اور نمایاں اور دلچسپ بنادیا ہے۔

مکاتیب سر محمد اقبال بنام سیّد سلیمان ندوی

مرتب: سیّد شفقت رضوی

صفحات ۱۲۴ قیمت =/۶۰ روپے

ادارہ تحقیقات افکار و تحریکات ملی کراچی ۴۱

تاریخ مسلمانان ہند پاکستان میں علامہ اقبال کا فکر اسلامی کے لحاظ سے بلند مقام ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ علوم اسلامیات میں وہ کسی بڑی شخصیت کے مالک نہ تھے۔ بعض علوم اسلامی مثلاً حدیث، فقہ، اصول، تصوف وغیرہم میں انھیں بنیادی باتیں اور کتب کا علم نہ تھا

انھوں نے ان کے لیے وقت کے علماء سے رجوع کیا ہے یا ان سے ان علوم کے ماخذ دریافت کیے ہیں جیسا کہ ان خطوط کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے اس کے باوجود اس دور کی بہت بڑی انقلابی فکری شخصیت تھے۔ انھیں نظر انداز کر کے ان کے فکر اسلامی کی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔

علامہ اقبال کے وہ خطوط جو انھوں نے مولانا سیّد سلیمان ندوی کو لکھے تھے علمی اور تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل تھے یہ خطوط اگرچہ "معارف" (اعظم گڑھ) اور "اقبال نامہ" (لاہور) میں چھپ چکے تھے۔ لیکن اب یہ دونوں ماخذ اہل علم اور شائقین کی دسترس سے باہر تھے۔ ان پر مفصل حواشی بھی نہ تھے۔ نہ ان میں رجال مکاتیب کے تراجم شامل تھے اور نہ مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے علمی تعلقات و روابط کی تاریخ و تفصیل پر ان سے کوئی روشنی پڑتی تھی۔ اس لیے سابقہ دونوں ماخذ میں ان کی وہ اہمیت نمایاں نہ ہوسکی تھی جو اس مجموعے میں مفصل حواشی، تراجم مکاتیب رجال اور مقدمہ کے اضافوں کے بعد نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔

اس لیے یہ مجموعہ نہ صرف باطن کے حسن اور معنوی اہمیت کے لحاظ سے نیز ظاہری زیبائش اور ترتیب و تہذیب اور تصحیح متن کے لحاظ سے بالکل ایک انکشاف اور بازیافت کی شکل میں سامنے آیا ہے اس لیے امید ہے کہ نہ صرف اقبال و سلیمان کے عقیدت کیش اور ارادت مند بلکہ برصغیر پاک و ہند میں تاریخ علوم و معارف اسلامی کے شائقین اور عام اہل علم اور ادب کا ذوق

رکھنے والے بھی اس مجموعے کو نظرانداز نہ کر سکیں گے۔
یہ مجموعہ سفید کاغذ پر کمپیوٹر کی خوبصورت طباعت اور رنگین پلاسٹک کوٹڈ مضبوط جلد میں شائع ہوا ہے۔

گرد و پیش

بابائے اردو کی یاد میں ایک جلسہ

۱۶ اگست کی شام نیپا آڈیٹوریم میں بابائے اردو کی ۳۲ ویں برسی کے موقع پر انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک شایانِ شان جلسے کا انعقاد ہوا۔ جلسے کی صدارت انجمن کے صدر جناب نورالحسن جعفری کو کرنا تھی لیکن ناسازیِ طبع کی وجہ سے وہ نہ آسکے لہٰذا اُن کی جگہ انجمن کے متولی جناب مختار زمن کو یہ عہدہ سنبھالنا پڑا مہمانِ خصوصی کے طور پر پڑوسی ملک ہندوستان سے آنے ہوئے نامور محقق اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر مختار الدین احمد موجود تھے۔ ان کے علاوہ مجلس صدارت میں انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی بھی تشریف رکھتے تھے۔

جلسے کا آغاز جناب شاہ مصباح الدین شکیل کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا بعد میں انھوں نے اس آیت کی شانِ نزول پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی نے اپنے مضمون میں کہا کہ بابائے اردو کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنے پیش رو سرسیّد احمد اور مولانا حالی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۱۲ء میں بابائے اردو نے جب انجمن کی ذمہ داری سنبھالی تو اُن کے حصے میں ایک لکڑی کا بکس آیا۔ پھر انھوں نے کتب کے ذخیرے کو اتنا باثروت بنایا کہ اُس کی تصدیق کراچی کے انجمن کے کتب خانہ خاص و عام کو دیکھ کر کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا کہ سرسید نے جس سلیس نثر نگاری کی طرح ڈالی اُس کو بابائے اردو نے مزید سادہ بنایا اور سادہ نثر لکھنے کے بادشاہ کہلائے .... بابائے اردو سچ مچ بابائے اردو تھے۔

ڈاکٹر حنیف فوق کا مقالہ جامع اور تفصیلی تھا۔ اس میں بابائے اردو کی ادبی خدمات اور جن حالات میں اُن کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ وہ اپنے تمام تناظر کے ساتھ سامعین کے گوش گزار ہو جاتی ہیں۔ یہ بہرحال ایک عالمانہ مقالہ تھا۔ ڈاکٹر فوق نے کہا کہ بابائے اردو کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کو صرف اردو کے حوالے سے یاد رکھنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس ہمہ گیر شخصیت کو دیکھنے کے لیے ہمہ گیر نگاہ کی ضرورت ہے آخر میں انھوں نے کہا کہ ادب کی جمہوریت کے بابائے اردو ایک بہت بڑے رہنما تھے۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا کا مختصر مضمون ڈاکٹر اسلم فرخی نے پڑھ کر سنایا وہ جلسے میں موجود تھے بوجوہ نہ پڑھ سکے۔ پروفیسر زیبا کے مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی جامع کمالات شخصیت کی علمی ادبی و تحریکی خدمات کا احاطہ کرنے

کے لیے ضروری ہے کہ اہل قلم کی ایک ٹیم مرتب کی جائے۔ اس میں وہ بھی ہوں جن کی علمی استعداد مسلم ہے اور وہ بھی ہوں جنھیں بابائے اردو کے قریب رہنے کے مواقع ملے ہوں اور پھر ان کے تعاون سے بابائے اردو کی علمی و ادبی شخصیت کے تمام گوشوں پر الگ الگ کام کرنے کی ابتدا کی جائے۔ پروفیسر زیبا نے کل نو تجاویز پیش کیں۔

پشاور سے آئے ہوئے مہمان مقالہ نگار پروفیسر خاطر غزنوی نے "خاکہ نگاری اور مولوی صاحب" کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ مقالہ نہایت شگفتہ انداز میں لکھا گیا تھا بلکہ فاضل مقالہ نگار نے شگفتگی کے باب میں بابائے اردو کی مثال سامنے رکھی ہے۔ اپنے مقالے میں جناب خاطر غزنوی نے بابائے اردو کے خاکے کو مثالی بتاتے ہوئے کہا "کسی شخصیت کی زندگی کے اہم واقعات کو سبھی خاکہ نگار یکجا کر ہی دیتے ہیں کہ یہ فن کا تقاضا ہے لیکن حالات و واقعات کو سلیقے اور تناسب یا سمٹری SYMMETRY کے ساتھ تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دینا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔" جناب خاطر غزنوی نے کہا کہ مولوی صاحب کے خاکے محض افسانوی حسن و اختصار ہی کے حامل نہیں ان میں ڈرامائی عنصر اور لوازم فن بھی بدرجہ اتم موجود ہیں آخر میں انھوں نے کہا کہ خاکہ نگاروں کے فن کے ستونوں میں مولوی عبدالحق نمایاں ہیں۔

سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنے مقالے میں بابائے اردو کی علمی و ادبی خدمات کا مختصراً جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ بابائے اردو، اردو کے ایسے فدائی تھے کہ آخر دم تک اپنی ہر شے اردو پر قربان کرتے رہے انجمن سے مولوی صاحب نے پایا کچھ نہیں البتہ اس کے لیے لٹایا سب کچھ۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کا مضمون چند تجاویز اور اردو میں رائج اغلاط کی نشاندہی پر ختم ہوا۔

انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی نے کہا آج کے دن کا مقصد بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کرنا تھا، لیکن جناب شجاع احمد زیبا اور ڈاکٹر نجم الاسلام کے مضامین میں پیش کی گئی تجاویز نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ اس حوالے سے انجمن کے بارے میں کچھ گفتگو کی جائے عالی صاحب نے کہا کہ جناب زیبا کی نو تجاویز اخلاص پر مبنی ہیں لیکن یہ تجاویز ایسی آئیڈیل ہیں کہ ان پر فوری عمل درآمد کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ ہاں ان میں سے چند ایک پر کچھ پر ضروری اقدام کیا جاسکتا ہے۔

عالی صاحب نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا کہ انجمن پر ایک نامساعد دور آیا کہ وہ اندرونی خرخشے اور خلفشار میں پڑ گئی اور اس اندر کے تناؤ اور تضاد سے انجمن کا نقصان یہ ہوا کہ اس کی بیس ہزار سالانہ کی گرانٹ گھٹ کر ڈھائی ہزار ہو گئی۔ وہ تو خیر سے انجمن کی رگوں میں تازہ حیات پھونکنے اور انجمن کو سنبھالا دینے کے لیے قدرت اللہ شہاب آگے آئے اور انجمن میں مولوی صاحب کی سابق پوزیشن بحال ہوئی۔ اس کی تفصیل خود مولوی صاحب نے اپنے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں تحریر کی ہے۔

عالی صاحب نے ایک بڑی اچھی بات کہی کہ دراصل جو عمر بھر رضاکارانہ کام کرتا ہے اور کسی کاز کے لیے خود کو وقف کرتا ہے لازماً وہ دوسروں سے بھی وہی کچھ کی توقع رکھتا ہے اور جب وہ توقعات دوسروں کی طرف سے پورے نہیں ہوتے تو اُس کے ہاں متشددانہ رویّہ آجاتا ہے۔ مولوی صاحب بھی ایسے ہی ایک مخلص اور سچے رضاکار تھے انھوں نے کہا کہ ایسے وقت میں جناب اختر حسین کا صدر انجمن کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لینا انجمن کے حق میں بڑا سود مند ثابت ہوا۔ اُن میں بھی رضاکارانہ کام کرنے کی قدرت نے بڑی صلاحیت دی تھی، وقت پڑنے پر انجمن کے لیے ذاتی جمع پونجی صرف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

مخطوطے کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے عالی صاحب نے کہا کہ یہ سوچنا کہ انجمن کے ڈھائی ہزار مخطوطے قومی عجائب گھر کی ملکیت میں چلے گئے ہیں غلط ہے دراصل ڈاکٹر اجمل صاحب سے درخواست کر کے عارضی تحفظ کے [illegible]

ہم اپنی نئی عمارت میں اس کے تحفظ کا جدید نظام قائم کریں گے یہ مخطوطے انجمن کی تحویل میں آجائیں گے۔

عالی صاحب نے "اردو ڈکشنری" کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ہم نے بابائے اردو کے قابلِ فخر کارنامہ اردو ڈکشنری، پاپولر ڈکشنری" اور "اسٹوڈنٹ پاکٹ ڈکشنری" کے کام کو آگے بڑھایا ہے اب تک ان تمام ڈکشنریوں کے کئی کئی ایڈیشن چھاپ چکے ہیں۔ یہ انجمن کا اوریجنل کام ہے انشاء اللہ جلد ہی پندرہ ہزار الفاظ کے اضافے کے ساتھ اردو ڈکشنری شائع ہوگی۔

عالی صاحب نے اپنی تقریر کا اختتام کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے بابائے اردو کی شکل میں بہت بڑے آدمی کی LEGACY ہے، ہم اُس مقام تک نہیں پہنچ سکتے لیکن ہمیں اس بات کی طمانیت ہے کہ ہر شعبے میں انجمن کا کام آگے بڑھا ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف بھی ہے کہ ہم نے بہت کچھ نہیں کیا مگر کچھ نہ کچھ کیا ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر مختار الدین احمد کے اظہار خیال سے پہلے ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ کہتے ہوئے ان کا تعارف کرایا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد غالب کے حوالے سے اردو میں جانے پہچانے جاتے ہیں اردو اور عربی کے محقق ہیں ان دنوں اردن میں جس کمیٹی کے تحت عربی زبان کی انسائیکلوپیڈیا تیار کی جارہی ہے اُس کے وہ رکن خاص ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین نے بابائے اردو سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کا تفصیلی ذکر کیا پہلی ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی جب انجمن ترقی اردو پٹنہ میں بابائے اردو اپنے صوبہ بہار کے دورے کے موقع پر آئے تھے اس وقت انجمن ترقی اردو پٹنہ کے معتمد قاضی عبدالودود تھے اور آخری ملاقات علی گڑھ میں قیام پاکستان سے چند سال پہلے ہوئی تھی۔

ڈاکٹر مختار الدین نے انکشاف کیا اور کہا کہ بابائے اردو کا اردو یونیورسٹی کا خواب شرمندۂ تکمیل ہوتا نظر آتا ہے حکومت ہند نے اصولی طور پر اردو داں طبقے کے اردو یونیورسٹی کے مطالبے کو مان لیا ہے اور اس سلسلے میں ابتدائی کام کے لیے ایک کروڑ روپے کی خطیر رقم بھی مہیا کردی ہے اس کے لیے جگہ کا انتخاب ہونا باقی ہے۔

آخر میں صاحب صدر جلسہ جناب مختار زمن نے اپنے مختصر صدارتی خطاب میں الٰہ آباد میں بابائے اردو سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا۔ یہ ملاقات جناب عبدالستار صدیقی کی قیام گاہ پر ہوئی تھی، صدر نے کہا کہ بابائے اردو کی ظرافت کا اظہار عام گفتگو میں ہوتا تھا۔ ایک دن بابائے اردو کہنے لگے "شیخ چلی بُرا تو نہیں تھا بس اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ عالم باعمل نہیں تھا۔" بابائے اردو کی طرف سے یہ ایک اچھا اشارہ تھا کہ اصل اہمیت عمل کی ہے۔ انھوں نے کہا عالی صاحب کی باتیں درست ہیں کہ انجمن ہر اعتبار سے آگے آئی ہے ہم نے بہت کچھ نہیں کیا لیکن کچھ نہ کچھ کیا ضرور ہے۔ اگرچہ ہمارا جذبہ صادق ہے تو انشاء اللہ ہم اپنے پیارے وطن پاکستان میں بھی جلد یا بدیر بابائے اردو کا اردو یونیورسٹی کا خواب پورا ہوتے دیکھیں گے۔

اس موقع پر معروف آرٹسٹ جناب سکندر نے بابائے اردو کا ایک پورٹریٹ پیش کیا اور پروفیسر خاطر غزنوی نے بابائے اردو کی بستر علالت پر دراز ایک بڑے سائز کی تصویر پیش کی یہ تصویر مری کے دوران قیام کی آخری تصویر ہے۔

انجمن میں قرآن خوانی

بابائے اردو کے ۳۲ ویں یوم وفات کے موقع پر روایت کے مطابق انجمن کے پرانے دفتر میں قرآن خوانی و فاتحہ خوانی کی گئی صبح نو بجے اہالیان کراچی کی طرف سے بلدیہ عظمیٰ کراچی کے ایڈمنسٹریٹر جناب سید مسعود عالم رضوی نے بابائے اردو کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی اس کے بعد انجمن کی طرف سے پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور قرآن خوانی ہوئی۔ وفاقی اردو کالج (فنون اور

سائنس) کے اساتذہ وطلبہ اور دیگر اداروں کی طرف سے بھی بابائے اردو کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں اور فاتحہ خوانی کی گئی۔ کراچی کے اخبارات نے بابائے اردو کی علمی وادبی خدمات سے متعلق مضامین چھاپے۔

"خفتگانِ خاک لاہور" کی رونمائی

گزشتہ دنوں ہمدرد فاؤنڈیشن کے ذیلی ادارے جہان دوست یا فرینڈ انٹرنیشنل کی جانب سے نیپا آڈیٹوریم میں پروفیسر محمد اسلم کی تازہ کتاب "خفتگانِ خاک لاہور" کی رونمائی منعقد ہوئی جلسہ کی صدارت ڈاکٹر ریاض الاسلام نے فرمائی اور موجودہ گورنر سندھ جناب حکیم محمد سعید مہمان خصوصی تھے تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس موقع پر جن حضرات نے تحریر و تقریر کے ذریعے اظہار خیال کیا ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی، جناب شجاع احمد زیبا، ڈاکٹر احمد نبی خان اور جناب مسعود احمد برکاتی کے علاوہ صاحبِ کتاب پروفیسر اسلم بھی تھے۔

مسعود احمد برکاتی صاحب نے اپنے مقالے میں کہا کہ فاضل مؤلف پروفیسر اسلم کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انھوں نے مزار بہ مزار کتبہ خوانی کی مشقت جھیلی اور خفتگانِ خاک لاہور کو دریافت کر کے انھیں ایک کتاب میں آنے والی نسلوں کی واقفیت کے لیے یکجا کر دیا

جناب حکیم محمد سعید نے اپنے کلمات ابتدائیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے میں ڈاکٹر ریاض الاسلام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس پروقار جلسے کی صدارت قبول فرمائی کتاب کے مؤلف پروفیسر اسلم باہمت ہیں کہ "خفتگانِ کراچی" کے بعد رُکے نہیں اور "خفتگانِ خاک لاہور" لکھی ویسے خفتگانِ خاک کا یہ سلسلہ شہر در شہر ہے اب دیکھیے موصوف کس شہر کا انتخاب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے کہا کہ عام قبرستانوں سے تاریخ مرتب کرنے کا یہ کام جو منفرد بھی اور مشکل بھی ہے اُسے پروفیسر اسلم نے آسان کر دکھایا۔ لاہور عمائدین، ولیوں اور بزرگانِ دین کا شہر ہے۔ انھیں کتبے جمع کرنے کے علاوہ ہزاروں صفحات کھنگالنے پڑے اور کتنے ہی لوگوں تک رسائی کرنی پڑی ہے ڈاکٹر اسلم فرخی نے آثار قدیمہ اور بالخصوص قبرستانوں کا حال احوال بیان کرتے ہوئے کہا کہ قبرستان کا ایک بڑا حصہ آسمان خراش عمارتوں میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔

کتاب کی رونمائی کا طریقہ یہ دیکھنے میں آیا کہ اُسے جناب حکیم محمد سعید اور صدر جلسہ نے پھولوں کے ڈھیر میں سے نکالا۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا نے کہا "خفتگانِ خاک لاہور" ہمدرد فاؤنڈیشن کی معارف پروری کی مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کا تاریخ دانی اور تاریخ نویسی اوڑھنا بچھونا ہے اس سلسلے کی ان کی پہلی کتاب "وفیات مشاہیر پاکستان" تھی۔ "خفتگانِ خاک لاہور" میں پانچ سو باکمالوں میں ہر شعبۂ حیات کے افراد ہیں جو تہہ خاک آسودہ ہیں۔

ڈاکٹر نبی احمد خان نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر اسلم کا نقش ثانی یقینی نقش اول سے بہتر ہے اور ایک طرح سے مکمل ہے۔ ہمیں ان کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ٹی وی اسٹار طاہرہ نقوی، کشور ناہید کے شوہر یوسف کامران کے مزار کے کتبے اور ایسے ہی بہت سے دیگر کتبات اردو فارسی ادبی چاشنی رکھتے ہیں انھوں نے ایک تجویز پیش کی کہ ہمدرد یونیورسٹی ایک ایسا ادارہ قائم کرے جہاں فارسی اور عربی ماخذات کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کا انتظام ہو۔

پروفیسر اسلم نے قدرے تفصیل سے "خفتگانِ خاک لاہور" کے حوالے سے بات کی انھوں نے کہا کہ مجھے "کتبے" پڑھنے کا

ذوق پروفیسر شجاع الدین مرحوم کی معیت میں ہوا میں نے پروفیسر موصوف کے زمانے ہی میں کتبے جمع کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس کتاب کے لیے ۹۰۰ مشاہیر کے کتبے منتخب کیے تھے لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے بادلِ نخواستہ تین سو کتبوں کو کتاب سے خارج کرنا پڑا۔ پروفیسر اسلم نے "قومی سوانحی لغت" کی تیاری کی تجویز بھی پیش کی۔

صدر جلسہ ڈاکٹر ریاض الاسلام نے فرمایا کہ علم تاریخ میں مسلمانوں کو جس شعبہ نے سب سے زیادہ اپنی طرف راجع کیا وہ علم الرّجال تھا۔ دنیا کی کسی قوم نے اتنا بڑا ذخیرہ علم الرّجال کا نہیں چھوڑا اس باب میں ابن خلکان کا نام نمایاں ہے اس کے علاوہ تذکرہ "صوفیان مدفون، دہلی" میں مدفون صوفیا کا احوال ہے۔ "تاریخ محمدی" اٹھارہویں صدی میں زیبِ قرطاس ہوئی۔ اس میں اسلام کے آغاز سے اٹھارہویں صدی تک کے تمام اہم مسلمان اکابر کا ذکر ہے پروفیسر اسلم کی کتاب "خفتگانِ خاکِ لاہور" سوانح بھی ہے تاریخ بھی ہے اور ماخذ کی تلاش کی ایک اچھی مثال بھی .... وہ ایک عرصے سے تاریخ اور ملفوظات پر کام کر رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے کام میں وہ بڑے سرگرم اور مخلص ہیں۔

جلسے کی نظامت کے فرائض جناب تصور حسین حمیدی نے انجام دیے۔

افسر ماہ پوری کے شعری مجموعہ "نگارِ ماہ" کی تقریب

۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو اردو کے معروف شاعر جناب افسر ماہ پوری کے شعری مجموعے "نگارِ ماہ" کی تقریب رونمائی زیر اہتمام کاشانۂ احباب کراچی نیپا آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر اسلم فرخی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی سابق شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر منظور الدین احمد تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر علی حیدر ملک نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز قاری سید حبیب اللہ حبیب کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ جناب جمیل یوسفی نے افسر صاحب کی نعت پڑھ کر سنائی۔ اس موقع پر محترمہ رعنا اقبال، جناب مسلم شمیم، پروفیسر عثمان رمز اور پروفیسر نظیر صدیقی نے سامعین کو مقالات اور خاکے سے نوازا۔

رعنا اقبال نے کہا کہ افسر صاحب نے مظاہر و مناظر کے حوالے سے انسان کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جناب مسلم شمیم نے اپنے مقالے "افسر ماہ پوری شخصیت اور شاعر" میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا اُن کا خیال ہے کہ افسر صاحب کی شاعری میں وہی ٹھہراؤ اور توازن ہے جو اُن کی زندگی کا خاصہ ہے۔

پروفیسر عثمان رمز نے اپنا مقالہ "افسر ماہ پوری کی شاعری میں دل و دماغ کی کشمکش" پڑھ کر لوگوں کے فکر کو مہمیز لگا دی تھی۔ انھوں نے کہا "سائنس، دل کے معاملے میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ وہ دماغ کے مقابلے میں ابھی دل کو اہمیت نہیں دیتا لیکن کیا عجب ہے کہ آنے والا زمانہ اس کی الٹ سمت میں چل پڑے افسر صاحب نے اپنی شاعری میں دماغ پر دل کو ترجیح دی ہے ان کے مشاہدات کا کینوس بڑا ہے وہ عشق کے بناؤ بگاڑ کے کھیل سے زیادہ زندگی کے بناؤ بگاڑ کے کھیل کھیلتے ہیں پروفیسر رمز نے اپنے موضوع کو ایسے جامع انداز میں پیش کیا تھا کہ ہر شخص اس کے حلقۂ اثر میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر نسیم اعظمی اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو کہا کہ ابھی تک میں سابق مقالہ نگار کے "دل و دماغ" کے فلسفے کے اثر میں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری سے علامت کو خارج کیا ہی نہیں جا سکتا افسر صاحب کی تقریباً تمام نظمیں علامت کو سمیٹے ہوئے ہیں البتہ نظم کی مناسبت سے اُن کی صورت اور نوعیت جدا جدا ہیں۔

جناب برگ یوسفی اور جناب انور فرخی نے افسر صاحب کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے خاکے میں افسر ماہ پوری سے ۴۵ سالہ رفاقت بلکہ دوستی کا ذکر کیا اور کہا کہ اب یہ دوستی عمر بھر کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ افسر صاحب میں میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جو اعتدال اور توازن دیکھا اس میں آج تک ذرہ برابر فرق نہ آیا یہ بڑی بات ہے کہ ان سے مل کر دوبارہ ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی کے بعد صاحب کتاب جناب افسر ماہ پوری کو کلام سنانے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے ایک نظم "ستاروں کی برات" اور ایک غزل سنائی۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر منظور الدین نے کہا عموماً یہ ہوتا ہے کہ اچھا غزل گو اچھا نظم گو نہیں ہوتا اور اچھا نظم گو اچھا غزل گو نہیں ہو پاتا لیکن افسر صاحب کے شاعرانہ سنگم میں دونوں کامیابی سے ساتھ ساتھ رواں ہیں۔

صدر کے خطاب سے پہلے معروف شعرا جناب سیف الدین سیف، جناب قمر ہاشمی اور جناب پروفیسر مظفر حسین رزمی اور مشہور نقاد پروفیسر شمیم احمد کے سلسلے میں تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا لہٰذا صدر جلسہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنا مقالہ پڑھنے کے بجائے چند جملوں میں اظہار خیال پر اکتفا کیا۔ انھوں نے کہا کہ جو شاعر "نام کے حوالے" جیسی نظم لکھ سکتا ہے وہ عصر حاضر کا بڑا شاعر ہے...."

"دیدہ تر" کی تقریب رونمائی

۴ اگست ۱۹۹۳ء کو ادارہ مصنفین پاکستان صوبہ سندھ کراچی کی جانب سے بزرگ شاعر جناب سلیم منظر کے مجموعہ کلام "دیدہ تر" کی تعارفی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی جلسے کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمائی نظامت کے فرائض انجمن مصنفین کے اعزازی سیکریٹری جناب امراؤ طارق نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز معروف شاعر جناب سرشار صدیقی کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے جناب منظر سلیم ایک عرصے تک نیکی کر دریا میں ڈال کے مصداق شاعری کرتے رہے لیکن انھوں نے کبھی کوئی شعری مجموعہ شائع کرنے کا نہیں سوچا۔ اللہ بھلا کرے منظر سلیم صاحب کی بیگم کا جنھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر ان کا شعری مجموعہ "دیدہ تر" کے نام سے شائع کر کے اُن کے بکھرے کلام کو یکجا کر دیا۔

جناب سحر انصاری نے کہا کہ منظر سلیم صاحب بلاشبہ ایک اچھے شاعر ہیں ان کی ایک نظم "منڈی" اردو کی اچھی نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے "دیدہ تر" پر مزید بات کرنے کی گنجائش تھی لیکن مجھے اُن پر بات کرنے کے لیے کتاب کے بجائے چند نظموں کے فوٹو اسٹیٹ مہیا کیے گئے اس لیے خاطر خواہ گفتگو مشکل ہو گئی۔

جناب شان الحق حقی نے کہا کہ جو کچھ میں اس مجموعے کے بارے میں کہنا چاہتا تھا، اس کا احاطہ کم و بیش سحر صاحب نے کر دیا ہے فی الوقت "دیدہ تر" کی آمد کا خیر مقدم کرتا ہوں اور ادبی حلقے میں اس کی پذیرائی کا خواہاں....!

جناب جمیل الدین عالی نے کہا بیسویں صدی کی غزلیہ شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے ایک ناقد نے صرف تین غزل گو کا ذکر کیا ہے جن میں ایک یگانہ اور دو اور شاعر ہیں یہ ایک عصر کے غزل گوؤں کے ساتھ انصاف نہیں یہ تین کے ہندسے کی روایت کا ادبی محاسبے میں در آنا مناسب نہیں اس سے اُن کے دوسرے معاصرین کی حق تلفی ہوتی ہے۔

عالی صاحب نے مزید کہا کہ پچھلے دس سال سے "گلڈ مرکز" کی طرف سے صوبوں کو کسی قسم کی کوئی امداد نہیں ملی اس کے باوجود سندھ زون کی گلڈ کے چند اراکین مجلس عاملہ جن میں سرشار، اور نسیم درانی وغیرہ ہیں اسے زندہ رکھا اور اب جبکہ اس کا احیا کراچی میں ہوا ہے تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ نئے لوگ خاص طور پر نو منتخب سیکریٹری امراؤ طارق اور اُن کے رفقاء اسے ہر طرح فعال بنانے کی کوشش کریں گے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کراچی منی پاکستان ہے یہاں پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ رہتے بستے ہیں اور ظاہر ہے کہ اردو زبان کے علاوہ اُن کی اپنی علاقائی زبانیں بھی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے آپس کے تال میل سے اردو میں نئی لفظیات کا اضافہ ہو رہا ہے یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کی بڑھوتری کے لیے یہ میل جول نیک فال ہے زبانوں میں اسی طرح وسعت آتی ہے۔ ادب کے عصری مسائل پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آپ کو اپنے ادباء شعرا اور اہل علم و دانش کی علمی و ادبی خدمات کا تعین خود کرنا ہوگا۔ آنے والے وقت پر اس فیصلے کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ صاحب صدر نے جناب جمیل الدّین عالی کی شاعری کے حوالے سے کہا کہ عالی صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے ان کی ایک شناخت دوہے ہے لیکن پاکستان جب تک قائم ہے ان کا دعائیہ گیت "جیوے جیوے پاکستان" زندہ رہے گا یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس گیت میں دوسرے بہت سے قومی گیتوں کے مقابلے میں ایک جداگانہ بندش کا احساس ہوتا ہے۔ یہی اس کی انفرادیت ہے۔

دبستانِ جگر کا تیسرا یومِ تاسیس منایا گیا

دبستانِ جگر کے تیسرے یوم تاسیس کے موقع پر گلشن اقبال میں ایک مشاعرہ زیر صدارت شان الحق حقی منعقد ہوا جس میں پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر عبدالصمد انصاری، ساقی جاوید، اطہر ضیائی، مختار اجمیری، نجمہ خان، پروفیسر عطا شاد، منیر سیفی، عارف عثمانی، شبنم صدیقی، انوار احسن صدیقی، حسین مجروح، راشد نور، مشہود حسن رضوی، جاوید وارثی کے علاوہ انوار فخری نے اپنا کلام پیش کیا۔

مشاعرہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پروفیسر عطا شاد نے ہدیہ نعت پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دبستان جگر کے جنرل سیکریٹری اطہر ضیائی نے دبستانِ جگر سے متعلق ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ماہ ستمبر میں یوم جگر کے موقع پر دبستان جگر ایک کتاب "جگر شخصیت اور شاعری" شائع کر رہا ہے۔ مشاعرہ سیّد سرفراز غوری کے مکان پر نہایت دل آویز طریقے پر منعقد ہوا قبل کلام پر تکلف طعام سے مہمانوں کو نوازا گیا اختتام مشاعرہ پر سیّد سرفراز علی غوری نے تمام شعرا کرام اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

واشنگٹن کی سیکلر گیلری میں خطاطی کے اسلامی فن پاروں کی نمائش

کلام الٰہی کو فن اسلامی میں جو اوّلیت حاصل ہے اس کی ایک جھلک۔ "اسلام کا الہامی کلام" کے عنوان سے منعقد ہونے والی اس نمائش میں ملتی ہے جو ۴ جولائی ۱۹۹۳ء سے اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کی آرتھر ایم سکلر گیلری میں شروع ہوئی۔

اس نمائش میں ۱۷ فن پارے رکھے گئے ہیں جس میں قرآن پاک کا ایک مجلد قلمی نسخہ، جلد کے بغیر نسخوں کے متفرق صفحات، دعاؤں کی ایک کتاب اور پتھروں پر کندہ مزاروں کے کتبے کے نمونے بھی شامل ہیں، فن کے یہ نایاب نمونے جو مصر،

ایران اور ترکی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔
نمائش کی ناظمہ ماریانہ شریو سیمپسن (MARIANA SHREVE SIMPSON) نے بتایا کہ صدیوں سے مختلف طرز کی خطاطی اور رنگوں اور سونے کے تاروں سے قرآن مجید کے قلمی نسخوں کو سجانے کا کام لیا جاتا رہا ہے فن کی مختلف اقسام کے ارتقا کو اس نمائش میں مختلف نمونوں کے ذریعے بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔
سمپسن نے کہا کہ یہ نمائش پانچ صدیوں کے فن پاروں پر محیط ہے۔ کیوں کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں بھی کلام الٰہی کو خوبصورت بنانے میں اتنی دلچسپی لی گئی جتنی ساتویں صدی میں لی گئی تھی انھوں نے کہا کہ نمائش کا سب سے نمایاں فن پارہ چودھویں صدی کے اواخر سے تعلق رکھتا ہے یہ مصر سے آیا ہوا ایک قلمی نسخہ ہے جسے مملوک دور کے کمانڈر امیر التمش البجاسی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔
خطاطی کے فن پاروں کی یہ نمائش جنوری ۱۹۹۴ء تک جاری رہے گی۔

("خبر و نظر" اسلام آباد ۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء)

معین احسن جذبی، نریندر لوتھر اور رشید حسن خان کو ہریانہ اردو اکادمی کا ایوارڈ

ہریانہ اردو اکادمی نے اردو کے نامور محقق جناب رشید حسن خان کو قومی حالی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ قومی سطح کا یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور سندِ توصیف پر مشتمل ہے اردو اکادمی کا ایوارڈ اردو کے مشہور رسالہ "شاعر" بمبئی کو دیا جائے گا جس نے اپنی اشاعت کے ۶۴ سال پورے کر لیے ہیں۔ یہ ایوارڈ پانچ ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور سندِ توصیف پر مشتمل ہے۔
کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ حیدر آباد (دکن) کے جناب نریندر لوتھر کو دیا گیا یہ ایوارڈ بھی پانچ ہزار روپے، شال اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔ ہریانہ کی سماجی ثقافتی شناخت کا ایوارڈ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر معین احسن جذبی کو دیا گیا جنھوں نے "حالی کا سیاسی شعور" نامی کتاب لکھی ہے یہ ایوارڈ بھی پانچ ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔
ریاستی ایوارڈ بھی دیے گئے ہیں جن میں ایس ایم ایچ برنی ایوارڈ آتش بھالپوری سونی پت کو دیا گیا ہے جنھوں نے ہریانہ میں اردو شاعری کو فروغ دیا ہے یہ ایوارڈ ۱۰ ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور ایک سندِ توصیف پر مشتمل ہے۔
خواجہ احمد عباس ایوارڈ ڈاکٹر کمار پانی پتی کو دیا گیا ہے یہ ایوارڈ دس ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔ ادبِ اطفال ایوارڈ ڈاکٹر راجندر روتسی اور جناب بیتاب علی پوری کو دیا گیا۔ دونوں ادیبوں کو مشترکہ دس ہزار روپے کا ایوارڈ دیا جائے گا۔ اردو انسٹرکٹر کا ایوارڈ ڈاکٹر ایس راج سُپرا کو دیا گیا جنھوں نے شاہ آباد مرکنڈا میں غیر اردو داں عوام کو اردو سکھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے یہ ایوارڈ بھی پانچ ہزار روپے، شال، یادگار تختی اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔

(ہماری زبان، ۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء)

حمیرا رحمان کے اعزاز میں

اردو کی معروف شاعرہ اور شمالی امریکہ میں ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی روح رواں محترمہ حمیرا رحمان کی پذیرائی کے لیے مصنفین کے ایک اشاعتی مرکز "ہمارا ادارہ" کراچی نے سرشار صدیقی کی رہائش گاہ واقع کے ڈی اے اور سیز بنگلوز گلستان جوہر کراچی

میں ۲۹ جولائی ۱۹۹۳ء کو ایک استقبالیہ عشائیے اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ محفل شعر کی صدارت ممتاز و بزرگ شاعر حضرت تابش دہلوی نے فرمائی اس نشست میں جمیل الدین عالی، حنیف اسعدی، احمد ہمدانی، شبنم رومانی، نگار صہبائی، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، جمال پانی پتی، پروفیسر رئیس علوی، نجمہ خان، سلیم منظر، سعدیہ صدیقی، مختار حیات، پروفیسر وقار حسین اور سرشار صدیقی کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، امراؤ طارق، اطہر عباس ہاشمی، نسیم درانی، پروفیسر منوبہ شیخ، جمشید رضا، رفیق چوہدری، اقبال علوی، سید جاوید حسن، شہامت علی شاہ، مرغوب حسین اور طارق سرشار وغیرہ نے شرکت کی۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

فارسی زبان و ادب

مصنف	عنوان	ماخذ
آصفہ زمانی، ڈاکٹر	دربارۂ فردوسی و شاہنامہ او	دانش، اسلام آباد ۲۸۲/۹۲ء ص ۶۵
آصفہ زمانی، ڈاکٹر	خواجوی کرمانی اور حدیثِ عشق	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۳۰۳
آفتاب اصغر، دکتر	اسیر خسرو نخستین و بزرگترین مقلد نظامی،	دانش اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۱۵۱
شرف شاہین قیصرانی	بلوچستان میں فارسی کا دینی ادب	دانش اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۱۶۹
ام سلمیٰ	آغا احمد علی اصفہانی ڈھاکا کے مشہور فارسی داں	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۱۸۷
پرویز اذکائی،	قرابادین شیرازی	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۱۷
جمیل جالبی، ڈاکٹر	حکیم ابوالقاسم منصور فردوسی	دانش اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۲۹۷
جمیل نقوی،	اردو روزمرہ میں مستقل فارسی	اخبار اردو، اسلام آباد نومبر ۹۲ء ص ۸
رضا ہمدانی	فارسی زبان کے ایک جدید شاعر و ادیب خاور درانی	دانش اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۲۰۱
رمضان انور	خالصہ دربار کی سرکاری زبان فارسی	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۳۷
سید سبط حسن رضوی، ڈاکٹر	شاہنامہ یا کتاب اخلاق	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۳۱۹
سید علی رضا نقوی، ڈاکٹر	فرہنگِ اقبال فارسی	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۱۹۹
شریف چودھری	اقبال پرچمدار وحدت اسلامی	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۹۱
شیخ امان اللہ	نظری در شاہنامہ فردوسی	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۱۲۹
صدیق شبلی، دکتر	امتیاز فردوسی	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۹۹
طلحہ رضوی برقی، پروفیسر	نیشاپوری شیخ از حیث رباعی گو	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۷۱
ظہور الدین احمد، دکتر	داستانہائے عشقی شاہنامہ	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۴۷
عباس کی منش، دکتر	نظری باشتراک مضامین خواجو و خواجہ	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۹
عطش درانی، دکتر	فارسی اصطلاحات سازی ایک مختصر تکنیکی جائزہ	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۱۷۵
علوی مقدم، دکتر	اخلاق در شاہنامہ فردوسی	دانش، اسلام آباد ۲۵، ۲۷/۹۲ء ص ۵

مصنف	عنوان	ماخذ
علی رضا نقوی، دکتر	عطاءاللہ خاں عطا یکے از فارسی گویان پاکستان	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۳۱
غلام مجتبیٰ انصاری، دکتر	روابط درویش حسین والہ ہروی با امرای دولت جہانگیر و شاہجہان	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۸۱
گوہر نوشاہی، دکتر	دو نقش مہم در ترجمہ شاہنامہ بزبان اردو	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۱۱۵
مجیب مائل ہروی،	تصوف در طریق طبیعی شعر فارسی	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۵۹
محمد حسین تسبیحی، دکتر	انیس شناسی در ایران	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۱۰۳
محمد ریاض، ڈاکٹر	فارسی افسانے کے بانی سید محمد علی جمال زادہ	ادبیات، اسلام آباد ۲۱/۹۲ء ص ۲۹
محمد ریاض، ڈاکٹر	فارسی افسانے کے بانی سید محمد علی جمال زادہ کا انٹرویو	ادبیات، اسلام آباد ۲۱/۹۲ء ص ۳۸
محمد ریاض، دکتر	شمہ ای از تاثیر شاہنامہ در ادبیات فارسی	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۳۰/۹۲ء ص ۷۷
محمد ریاض، دکتر	اقبال شناسی از حسن شادروان ناشر، مرکز چاپ و نشر	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۱۳۱
محمد ظفر خان، دکتر	مخزن اسرار نظامی گنجوی	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۱۷۱
محمد علی صوتی، دکتر	شاہنامہ ہا در کتابخانہ گنج بخش	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۵۹
محمودہ ہاشمی خانم، دکتر	مقام زن در شاہنامہ فردوسی	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۹۲ء ص ۷۵
منظر امام	خواجہ میر درد کی فارسی رباعی گوئی	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۵۹
مہر نور محمد خاں، دکتر	نمونہ ای از نفوذ فردوسی در شبہ قارۂ پاکستان و ہند	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۲۸/۲۹ء ص ۱۱۲
وحید اشرف، پروفیسر	رباعیات امیر خسرو	دانش، اسلام آباد ۳۱/۹۲ء ص ۳۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	سچل سرمست آشکار کی فارسی شاعری	انول، حیدرآباد سندھ اگست ۹۲ء ص ۲۱
وفا راشدی، ڈاکٹر	فارسی ادب میں سچل سرمست کا مقام	آگہی، کراچی اکتوبر نومبر ۹۲ء ص ۲۴

اردو زبان و ادب

مصنف	عنوان	ماخذ
ارشد اویسی	پنجاب اسمبلی میں اردو	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۳۳
ارشد اویسی	پنجاب اسمبلی میں اردو	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳۳
اشفاق احمد	اردو میں سائنسی تعلیم	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۱۶
افتخار امام صدیقی	اردو رسم الخط کا تحفظ ایک نیا منشور ایک نئی تحریک	شاعر، بمبئی ۱/۹۲ء ص ۴
افضل الدین اقبال، ڈاکٹر	اردو ڈرامے کے ارتقاء میں انگریزوں کا حصہ	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵۱
الطاف رسول	اردو سے بے اعتنائی کیوں	اخبار اردو، اکتوبر ۹۲ء اسلام آباد ص ۱۱
ایس ایم شفیق	دفاتر میں اردو کا ارتقاء	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۹
پرویز مسعود	اردو، اردو نامہ کے لیے	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۱
تسنیم نورانی	اردو زبان کی اہمیت	اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۷
جمیل آذر	اردو انشائیہ اور عہد جدید	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء
ریاض صدیقی، پروفیسر	نفاذ اردو کا مسئلہ	اخبار اردو، اسلام آباد ستمبر ۹۲ء ص
سمیع الوری	قومی زبان سے روگردانی عظیم قومی نقصان ہے	الانسان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۸
صفدر ہمدانی	جاپان میں ریڈیو کی اردو سروس	اخبار اردو، اسلام آباد جولائی ۹۲ء ص
عارف نوشاہی	صوفیائے بیجاپور کے ایک قدیم فارسی تذکرے میں اردو جملے	اخبار اردو، اسلام آباد اکتوبر ۹۲ء ص ۷
عشرت علی شاہ	نفاذ اردو کے لیے مجلس زبان دفتری کے علمی اقدامات	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۳

عطش درانی، ڈاکٹر — اردو میں پیشہ وراں کی مقامی اصطلاحات کا ذخیرہ — اخبار اردو، اسلام آباد ستمبر ۹۲ء ص ۹

عطش درانی، ڈاکٹر — اردو میں عسکری اصطلاحات — اخبار اردو، اسلام آباد اکتوبر ۹۲ء ص ۱۷

عطش درانی، ڈاکٹر — اردو اصطلاحات کا مکتب فکر — اخبار اردو، اسلام آباد دسمبر ۹۲ء ص ۱۳

مختار زمن — دکن اور اردو — سب رس، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۱۳

مخمور سعیدی — اردو جمہوریت کی پاسدار — کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۳

مصباح العین خان، ڈاکٹر — اردو پرتگالی مماثلت — اردو نامہ، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۵

مظہر امام — اردو ادب میں اولیت کے سہرے — صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۷

وحید قریشی، ڈاکٹر — کچھ دفتری زبان کے بارے میں — اردو نامہ، لاہور نومبر ص ۱۰

ہاشم علی اختر — جامعہ عثمانیہ اور اردو — اخبار اردو، اسلام آباد نومبر ۹۲ء ص ۱۹

ادب مسائل و مباحث

احمد الیاس — صلائے عام — طلوع افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳۹

انجم عثمانی — نیا معاشرہ اور آج کی کہانی — شاعر، بمبئی ۶۳/۷، ص ۳۷

پٹر بخسل، ترجمہ: منیر الدین احمد — کہانیاں جنہیں زندگی لکھتی ہے — ادبیات، اسلام آباد ۲۰/۹۲ء ص ۲۴۹

جاوید احمد — تجریدی افسانہ آخر کیوں؟ — ماہ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳۹

خاور اعجاز — آزاد غزل کے بعد — صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۳۰

دُردانہ قاسمی — داستان، ناول اور افسانہ — قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵۵

راشدہ قاضی — اردو ناول کی روایت اور سیاسی و سماجی تغیرات — ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۲

رب نواز مائل — ادب اور عصری تقاضے — صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۹

رب نواز مائل — موضوع اور اصلیت یا اور بجنیلشی — صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۲۸

ریاض صدیقی — جہان تازہ کی افکار تازہ سے نمود — اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۴۳

زوار حسین — فطرت کا جمالیاتی تکلم — ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۷

سجاد حیدر ملک — ادب اور ادب کا مطالعہ — ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۱۱

شمس الرحمٰن فاروقی — کلاسیکی غزل کی شعریات کا تعارف ۲۰۰۰ — فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۳۰

ف۔ س۔ اعجاز — کویتا یا کچھ اور — انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۳

فہیم اعظمی، ڈاکٹر — ادب میں محاذ آرائی کے حدود — صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵

فہیم اعظمی، ڈاکٹر — فن پارے کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا مسئلہ — صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۵

فہیم اعظمی، ڈاکٹر — ادب کو کتنا ایلائٹ یا مخصوص بنایا جائے؟ — صریر، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۵

کرشن ادیب، اسلم حنیف، احسان آوارہ — غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ — شاعر، بمبئی ۹۲/۲ء ص ۷

محمد علی صدیقی — ادب اور سماجی عقوبت خانہ — افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۲

ناصر بشیر — چند نئے ادبی مسائل — ماہ نو، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۸۸

نرجس بخاری — حقیقت نگاری کا مفہوم انیسویں صدی تک — ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۳

نرجس بخاری	حقیقت نگاری کا مفہوم اردو ادب کے حوالے سے	ماہ نو، دسمبر ۹۲ء ص ۳۳
نصر ملک	ہندوستان ادب، ڈنش زبان میں	انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۹

لسانیات

آغا سہیل، ڈاکٹر	دبیر کی شعری لسانیات	اردو، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۱ء ص ۹۹
ابو محمد سحر	حرکات و سکنات کا مسئلہ	شاعر، بمبئی ۲۳/۷ ص ۲۳
اکمل ایوبی	ترکی زبان، ایک مطالعہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۲۰۶
رشید ملک	انڈالوجی - ۸ آریا اور آریائیت - ۳	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۳۳
عتیق احمد صدیقی	اردو کا ذخیرۂ الفاظ	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۴۳
قدرت نقوی	ہنّتر	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۳۵
کبیر احمد جائسی، پروفیسر	ایران کا ایک سنگین مسئلہ زبان	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۹۷
وقار زیدی	آواز کا مطالعہ	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۶۸

تحقیق و تنقید

آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر	خمریاتِ داغ	اردو، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۱ء ص ۱۰۹
اختر حسین رائے پوری	صبا اکبر آبادی کی شاعری	شاعر، بمبئی ۹۲/۲ء ص ۱۱
افتخار اجمل شاہین	ے تازگی فکر تو لہجہ بھی ہے نیا	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۴۴
انور سدید	نحرفِ آب سے ایک تحریر آزاد گلاٹی کے حوالے سے	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۱۶
ایم انیس عالم، ڈاکٹر	تکنیکی حل کی سماجی مزاحمتیں	ارتقا، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۴۴
بشریٰ خاں	مسدس حالی کے فکری عناصر	ماہ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۴۱
جاوید اختر بھٹی	ڈاکٹر انور سدید اور موضوعات	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۳۹
جمیل جالبی، ڈاکٹر	طلسم ہوشربا کے بارے میں	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۳
خالد حسین خاں	سیماب اکبر آبادی بحیثیت غزل گو	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۷۵
پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی،	جالی نقوی اور کان شیشے کا	تحریریں، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۳
رؤف پاریکھ، ڈاکٹر	مزاح تعریف اور نظریات	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۴۷
رئیس احمر	جدید مرثیہ اور اس کا مستقبل	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۸
ریحانہ خاتون، ڈاکٹر	دارا شکوہ قومی یکجہتی کا ترجمان	دانش، اسلام آباد ۲۹، ۹۲/۳۰ء ص ۱۶۱
زاہد منیر عامر	محمد میر سوز، تبدیلیٔ تخلص کا مسئلہ	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۴۱
سلیم خان گمی	پنجاب کا ایک سانسی	ماہ نو، دسمبر ۹۲ء ص ۳۵
سیّد حسنین کاظمی	فردوسی اردو، میر انیس	دانش، اسلام آباد ۲۷، ۹۲/۲۸ء ص ۳۳۱
سیّد محمد عقیل، ڈاکٹر	بھنا واجد علی شاہ کا راجہ اندر بہ تحقیق قرۃ العین حیدر	طلوع افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۲۱
شان الحق حقی، ڈاکٹر	پروفیسر حامد حسن قادری اور تاریخ گوئی	تحریریں، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۲
شاعر اللہ خاں رامپوری	سرمایۂ وحشت رام پور میں	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۲۸

صباحت مشتاق	حمد کا اوّلین تصوّر	ماہِ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۴
طاہر تونسوی، ڈاکٹر	مسعود حسن رضوی ادیب کا ادبی مقام	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۴۹
ظہیر انور	جاترا، بنگال کی اہم روایت	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۴۱
عبدالباقی عباسی	آزادیِ نسواں پر اکبر الٰہ آبادی کا خوابِ پریشاں	ماہِ نو، اگست ۹۲ء ص ۲۵
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	ہائیکو کا فن اور اردو میں اس کی روایت	طلوعِ افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۲۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، پال ورلین	صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۶۶
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، ایچ جی ویلز	صریر، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵۸
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	رائدین جدیدیت، فرڈ نینڈ ڈی ساسر	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۶۳
کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر	ڈاکٹر عندلیب شادانی، بحیثیت افسانہ نگار	قومی زبان، دسمبر ۹۲ء ص ۳۱
کلیم سہسرامی، ڈاکٹر، پروفیسر	مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے کا پس منظر	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۱۴
کلیم سہسرامی	صفیر بلگرامی کی ایک بیاض	ماہِ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۳
مجتبیٰ حسین ابراہیم	حضرت خواجہ نظامی کی خاکہ نگاری	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۳۴
محمد احمد سبزواری	اصطلاحات عمرانیات	اخبارِ اردو، اسلام آباد نومبر ۹۲ء ص ۱۳
مسلم شمیم	روس میں اردو کا ایک عظیم خاور شناس پروفیسر سخا چوف	اخبارِ اردو، اسلام آباد ستمبر ۹۲ء ص ۱۵
مصطفیٰ کریم	یورپ اور امریکہ میں اردو افسانہ نگاری، مسائل اور فن	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۵۰
مقصود حسنی	اچھے تحقیقی مقالے کے اوصاف	صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۸
مقصود حسنی	اچھے تحقیقی مقالے کے خصائص	اخبارِ اردو، اسلام آباد اکتوبر ۹۲ء ص ۱۲
نعیم الرحمان، پروفیسر	قاموسِ تلمیحات (تیسری قسط)	اردو، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۱ء ص ۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	جدید ریختی کا شائستہ روپ	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۱۹
وفا راشدی، ڈاکٹر	حیرت الٰہ آبادی اور کشکولِ وفا	تحریریں، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۷

ماہنامہ قومی زبان کراچی

اکتوبر ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۱۰

مضمون نما

بابائے اردو... زبان اور زبان سے آگے	ڈاکٹر حنیف فوق	۵
خاکہ نگاری اور مولوی عبدالحق	خاطر غزنوی	۱۵
بابائے اردو اور اردو کا ایک معرکہ	الیاس عشقی	۲۳
غالب کے دو شعر	شان الحق حقی	۳۷
غالب کا وہی شعر	افتخار احمد عدنی	۴۱
چند اور اکابر چند اور معاصر	پروفیسر نظیر صدیقی	۴۷
جلیل مانکپوری حیدرآبادی	شفقت رضوی	۵۱
تحقیق ادبی تحقیق اور شعبۂ اردو....	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	۵۸
گلہائے رنگ رنگ		
مینا خوف اور خاموشی	نادر ابراہیمی / معین نظامی	۶۷
نظمیں	شکیل فاروقی / معین دانش۔ عزیز چترالی	۷۱
"	موہن سنگھ / ارشد محمود ناشاد۔ سموئیل بیکٹ / ادیب سہیل	۷۲
کھوڈل کی بات	ایڈگر ایلن پو / امہ جبیں قیصر	۷۳
رفتار ادب	.....	۸۸
گرد و پیش	.....	۸۲
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۹۳

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ـــــ ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرون ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

قومی زبان (۳) اکتوبر ۱۹۹۳ء

"ہر کہ آمد وزارتِ نو ساخت" اس مقولے کا اطلاق ہمارے ملک میں بار بار ہوا ہے۔ موجودہ نگراں حکومت پر بھی یہ مقولہ صادق آتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ نگراں حکومت کے اختیارات سنبھالنے کے بعد ملکی حالات میں بہتری کی کیا کیا صورتیں پیدا ہوئیں لیکن نگراں وزیر اعظم کے انگریزی میں قوم کو خطاب کرنے سے نہ صرف قوم کے اُس جذبے کو ٹھیس لگی ہے جو وہ قومی زبان کے لیے اپنے دل میں رکھتی ہے بلکہ اُس نیک مقصد پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں جس کے تحت، سرکاری دفاتر اور دیگر متعلقہ اداروں میں قومی زبان کے نفاذ کا کام جلد از جلد تکمیل پانا ہے۔ تاکہ دنیا کے سامنے یہ کہا جا سکے کہ کاروبارِ مملکت میں ہم بھی اپنی ایک "قومی زبان" رکھتے ہیں۔

ممکن ہے وزیر اعظم کو قومی زبان کے بجائے انگریزی زبان میں قوم سے خطاب کرنے کی چھوٹ اس لیے ملی ہو کہ انھیں قومی زبان میں گفتگو کرنے کی عادت نہیں رہی، لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ دیکھا دیکھی دوسرے تمام وزرا بھی انگریزی ہی میں ریڈیو اور ٹی وی پر تقریر کرتے دیکھے جا رہے ہیں اور تو اور ٹی وی پر جو ڈرامے یا دیگر چیزیں دکھائی جاتی ہیں اُن کے سرنامے اور کرداروں کے اعلانات جو اب سے پہلے تک صرف قومی زبان میں پیش ہوا کرتے تھے اب اُن میں اردو کے پہلو بہ پہلو انگریزی کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس اچانک بدلتی ہوئی صورتِ حال میں بہت سے ذہنوں میں کئی طرح کے شکوک و شبہات اور خدشات جنم لینے لگے ہیں۔ وہ لوگ حکومت اور اس کے ذرائع ابلاغ کے اس روّیے کو قومی زبان کے نفاذ کے حق میں مضر خیال کرتے ہیں۔

اربابِ حل و عقد سے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ قومی زبان کے نفاذ کا جو کام حکومتی سطح پر قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس میں خلل واقع نہ ہونے دیا جائے۔ یوں بھی سربراہانِ مملکت کو قومی زبان ہی میں قوم سے خطاب کرنا زیب دیتا ہے بعد میں بے شک کوئی صاحب اس کا انگریزی میں ترجمہ سُنا دیں۔

امورِ مملکت میں "قومی زبان" کی غایت اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قائداعظم جب اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ صرف اور صرف اردو ہی ملک کی قومی زبان ہوگی تو پھر انھوں نے ہمیشہ قوم کو خطاب قومی زبان ہی میں کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ بابائے قوم کو اس میں کتنی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ سربراہانِ مملکت اور وزرا میں تقریباً سبھی کے پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں یہ زبان ممد و معاون رہی ہے۔ اس رشتے سے ان کے دلوں میں قومی زبان کا احترام بھی کچھ کم نہیں۔ پھر یہ کیسی ہوا چلی ہے جو اس پھولتے پھلتے پودے کو پژمردہ کرنا اور تناور درخت بننے سے روکنا چاہتی ہے۔ اگر یہ عمل دانستہ یا کسی سمجھی بوجھی پالیسی کے تحت ہے تو بہت ہی خطرناک ہے اور اگر نادانستہ ہے تو بھی یہ کوئی اچھی بات نہیں، ملکی مفاد کے صریحاً خلاف جاتا ہے!

قومی زبان (۴) اکتوبر ۱۹۹۳ء

بہار ہو کہ برسات صافی آپ کی جلد کو شاداب و شگفتہ رکھتی ہے

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
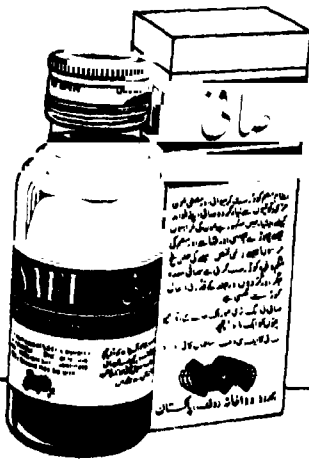
موسموں کی تبدیلی فطرت کا تقاضا ہے لیکن
اس تبدیلی سے خون میں پیدا ہونے والے
فاسد مادّے امراضِ جلد کا سبب بنتے ہیں۔

صافی میں شامل مفید و مؤثر جڑی بوٹیاں
خون کو قدرتی طور پر صاف اور صحت مند
رکھتی ہیں اور آپ کی جلد نرم، ملائم اور
چمکدار رہتی ہے۔

ہمدرد

Adarts-SAF-1/93

قومی زبان (۵) اکتوبر ۱۹۹۳ء

بابائے اُردو..... زبان اور زبان سے آگے

ڈاکٹر حنیف فوق

بعض اوقات ہم کسی لکھنے والے کی تحریر کے ایک رنگ سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے موضوع کی نیرنگیوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور کبھی کسی شخصیت کا ایک رُخ ایسی امتیازی شان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اس شخصیت میں تب و تاب پیدا کرنے والی بجلیوں سے قطع نظر کر لیتے ہیں۔ بابائے اُردو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کی اُردو سے محبت ایک وسیع منظر کا جزو تھی۔ لیکن اکثر لوگوں کی توجہ اسی جزو پر مرکوز رہی ہے۔ بابائے اُردو کے لیے اُردو ایک ایسی وسیع شاہراہ تھی جو حالات کے پیچ و خم میں زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک رہ نمائی کرتی تھی۔ اُردو سے شیفتگی ان کی ذہنی آزادی اور جمہور پسندی کا روشن عکس ہے۔ پیالہ بنانے والا جانتا تھا کہ اس سے شراب داری اور مشروب خوردگی کا کام لیا جاتا تھا لیکن ہم پیالے کے نقش و نگار میں منہمک ہو گئے ہیں۔

زبان و ادب کے بارے میں بابائے اُردو کی ترجیحات اتفاقی نہیں تھیں۔ ان میں اُن کی سوچ حقائق کا احاطہ کرتی اور بدلتی ہوئی صورت حال کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اُن کی تحریریں اُن کے فکر کی آئینہ داری کرتے ہوئے تاریخی عمل کی محرک بن جاتی ہیں۔ صرف سنگین دیواروں ہی سے زنداں تعمیر نہیں ہوتے، ذہنی دیواریں بھی انسانی حوصلے اور آرزو کو مقید کر لیتی ہیں۔ بابائے اُردو نے ذہنی حبس کے موسم میں تازہ ہواؤں کے لیے اُردو کے دریچے کھولنا چاہے ہیں۔ سچائی، علم، عقلیت، آزادی، جگر داری اور عام لوگوں کی ضرورتوں سے تعلق وہ اوصاف ہیں، جو ان کی فکر و جستجو کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ نئے دور کے گِل گامش ہیں جو اپنا پشتم کی تلاش اس لیے کر رہے ہیں کہ سب کی خاطر علم کے آبِ حیات کی جستجو کر سکیں۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ جس طرح آبِ حیات گِل گامش کو نصیب نہ ہوا، اسی طرح اب تک اس علم کی عام لوگوں تک رسائی نہیں ہوئی۔ اُردو کے دشمن اور اُردو کے بھی خواہ دونوں ان کے مقصد کی تکمیل میں حائل رہے ہیں۔ کیوں کہ دونوں کی نظر ان کی مرکزی کاوش پر رہی ہے، کاوش کے مرکز پر نہیں۔

بابائے اُردو کی رنگا رنگ شخصیت، ان کی تصنیفات و تالیفات اور فروغِ اُردو کے لیے ان کا عزم و استقلال، اب تاریخ کا حصّہ ہیں۔ لیکن بابائے اُردو کی اُردو سے محبت، زبان و ادب کے حدود سے آگے بڑھ کر سماجی اور تمدنی وسعتوں میں، ترقی اور روشنی کی آرزو سے عبارت ہے۔ حالات کے تصادم اور خیالات کی کش مکش میں وہ رجعت پسندی کی صفوں میں نہیں، مستقبل کی قوتوں

کے ساتھ ہیں۔ تمام ادبی اور ذہنی رجحانات انسان کے لیے کسی نہ کسی راستے کا اشارہ کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی بڑائی یہ ہے کہ وہ رجحانات کی تعبیر اور انتخاب کرتے ہوئے، بہتر انسان اور بہتر دنیا کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ آج جب انھوں نے بعض ادبی رجحانات، ادب کو ناانسانی بنانے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر رہے ہیں، بابائے اُردو کے مجادلۂ اُردو میں انسانی عنصر نئی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔

انسانی معاشرہ سیاسی اور تہذیبی فیصلوں کے ذریعہ آگے بڑھا ہے اور بابائے اُردو کی اُردو سے محبت بھی ایسا ہی ایک سیاسی اور تہذیبی فیصلہ ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے تاریخی عوامل کے ادراک کے ساتھ ان کی تاریخ آفریں نظر کا اعتراف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک خطبے میں کہتے ہیں کہ جب تک "زبان عوام کی بولی کا ساتھ دیتی ہے، وہ زندہ اور چونچال رہتی ہے۔" ایک دوسرے خطبے میں وہ زبان کے خالص ہونے کے خیال کو بھی لسانی نہیں سیاسی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "زبان میں یہ ہٹلری جائز نہیں۔" ان بیانات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق زبان سے آگے بڑھ کر معاشرتی وسعتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور زندگی تو کجا، زبان میں بھی تعرض و تعدی کے مخالف ہیں۔ ان کا انتخاب تہذیبی جبر اور سیاسی بے صدائی کی بجائے جمہوریتِ اظہار اور انسانی اقدار کے حق میں ہے۔ بابائے اُردو کی اصل اہمیت ذہنی تاریکی اور تہذیبی آمریت سے برسرپیکار ہوتے ہوئے، عہدِ جدید کی عقلی، تجرباتی اور جمہوری سچائیوں کو آگے بڑھانے کی ان کوششوں میں ہے جن کے لیے اُردو زبان ایک وسیلہ بن گئی تھی۔

بابائے اُردو کی استحکام زبانِ اُردو کی کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو آزادی سے پہلے سیاسی آزادی کی جدوجہد کے ساتھ رجعت اور بازماندگی کے رجحانات بھی برسرکار نظر آتے ہیں۔ جن کے درمیان ان کے تہذیبی تصورات کی صحیح معنویت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی فکر ماضی کے ورثے کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی، مستقبل کی سمتوں کا تعین کرتی ہے اور ان کا تاریخی تبدیلیوں کا احساس، ماضی کو مستقبل پر مسلط کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ پھر مستقبل کی سماجی اور سیاسی زندگی کی تشکیل میں مولوی عبدالحق نے چند جذباتی مواقع اور بعض استثنائی صورتوں کے علاوہ جمہور سے اشتراکِ عمل کو ضروری سمجھا ہے۔ انھوں نے تاریکی، تعصب اور قدامت پسندی کے مقابلے میں ہمیشہ آزادی خواہی، آزاد خیالی اور تغیر پسندی کا ساتھ دیا ہے۔ مولوی عبدالحق اُردو زبان کو سیاست کے خارزاروں میں گھسیٹ کر نہیں لے گئے لیکن جب ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اسے سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا تو وہ سیاسی تنگ نظری اور تہذیبی بے بصری کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ ان کی آواز زبان و ادب کے امکانات و معیارات کی وضاحت کرتے ہوئے، بہ حیثیتِ مجموعی، ایک ایسے سماجی شعور کی آواز تھی جو محدود حلقوں کے تنگ دائروں کو توڑ کر علم و تہذیب کی دولت کو عام کرنا چاہتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اُردو ایک تہذیبی اقلیت کی زبان نہیں، ایک ایسا ورثہ تھی جسے مختلف علاقوں اور مختلف قومیتوں نے پروان چڑھایا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ سیاسی تنگ نظری اور تہذیبی کم بینی نے وہ سلوک کیا کہ بالآخر اسے ابھرتی ہوئی آزادی کی جدوجہد میں اپنے لیے ایک آزاد فضا اور ایک علیحدہ خطۂ ملک کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جنوبی ایشیا میں متعدد ثقافتی نشانات ملتے ہیں، لیکن اُردو زبان ایک ایسا تہذیبی نشان تھی، جہاں مختلف تہذیبی دھاروں نے مل کر ایک وسیع صورت اختیار کی تھی اور اُردو ادب کے فروغ میں کثیر الجہات تہذیبی حیثیتوں نے حصہ لیا تھا۔ پھر ملک میں ایک بیرونی سامراج کی سیاسی ہی نہیں، تہذیبی حکمرانی بھی تھی۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ آزادی کی جدوجہد، بیرونی سامراج کے ساتھ ساتھ سائنس، ادب، فکر اور

سماجی علوم کے اس وسیع سرمائے کو رد کرنے کی نہ سوچے، جس کے دروازے ہم پر سامراجی حکومت کے دوران کُھلے تھے، لیکن جو نئی صنعتی زندگی اور نئے ذہنی اکتسابات کا نتیجہ تھا۔ آزادی کے بعد ایک جانب، ماضی کی طرف بازگشت کی آوازیں آرہی تھیں اور دوسری جانب اسی بیرونی سامراج کا پروردہ ایک ایسا طبقہ بھی تھا، جسے جمہور کی ترقی سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے اور اسی لیے وہ اس زبان و ادب کے فروغ کا مخالف تھا، جو ملک کے تمام خطّوں کو قومی مقاصد، وسیع یکجہتی اور جمہوری ترقی کی راہوں پر مجتمع کر سکے۔ مولوی عبدالحق کی بڑائی یہ ہے کہ وہ ہر محاذ پر اُردو زبان کے وسیلے سے تہذیبی ارتقاء، روشن خیالی اور اجتماعی سرفرازی کے لیے صف آرا رہے۔ ان کے بعض خیالات اور بعض رویّوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی آوازیں کئی صدیوں کے تہذیبی امتزاج کی شیرینی اور ان کے عمل میں جمہوری آرزوؤں کی توانائی ملتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تحریریں اور ان کے افکار اپنے تہذیبی ورثے کے تحفظ کی جانب سرگرم عمل رہنے کے باوجود، دورِ حاضر کی عملی زندگی میں کہنہ پرستی سے پاک اور منوّر الفکری سے معمور ہیں۔

برصغیر میں اُردو کی مخالفت اس تعصب سے پیوست تھی، جس کی جڑیں سیکڑوں سال کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ اس کی وہ سیاسی، تہذیبی اور معاشی بنیادیں بھی تھیں، جن کا اس وقت کے حالات سے گہرا تعلق تھا۔ جبر و تعدّی کی اساس پر قائم ایک نوآبادیاتی نظام نے سیاسی تفریق اور تہذیبی مغائرت کو اپنا حربہ بنایا تھا۔ اُردو نہ صرف سیاسی حریت کی زبان بن گئی تھی بلکہ اس کے متعدد ادیب اور شاعر جنگ آزادی کی صفِ اوّل میں شریک تھے۔ اس زبان کے بخشے ہوئے آزادی اور انقلاب کے نعرے ملک کے طول و عرض میں گونج رہے تھے اور وسیع تر اتحاد کی راہیں مضبوط کر رہے تھے۔ بیرونی سامراج نے اپنے بہت بڑے مخالف ٹیپو کی موت کے ساتھ ہی فورٹ ولیم کالج کے ذریعے جس لسانی تفریق کی بنیاد رکھی تھی اسے نئے حالات میں مختلف کوتاہ فکر حلقوں کی جانب سے ہوا دینے کی ہر ممکن کوشش جاری تھی۔ لیکن جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آتی جارہی تھی اُردو کی مخالفت کے نئے اسباب بھی پیدا ہوتے جارہے تھے۔ اُردو کو تہذیبی اقلیت سے وابستہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سماجی ترقی اور سیاسی حقوق میں یہ گروہ اپنا جائز حق نہ حاصل کر سکے۔ پھر اُردو چونکہ عام لوگوں کی زندگی کی ترجمان تھی اور سرکاری یا درباری سرپرستی سے زیادہ اس نے اپنا مقام گلی کوچوں، بازاروں اور سیاسی مجمعوں سے حاصل کیا تھا۔ اس لیے ملک میں ابھرتے ہوئے تاجرانہ اور صنعتی مفادات اُردو کی مخالفت کو مختلف وسیلوں سے فروغ دے کر عوامی بیداری کی وسیع لہروں کو محدود کرنا چاہتے تھے کہ کہیں برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے استحصالی ذرائع وسیع قومی بیداری کی زد میں نہ آجائیں۔ اُردو زبان کی [illegible] میں اس کے رسم الخط کی مخالفت بھی شامل ہو گئی تھی کہ اس مخالفت کے ذریعے مقدّس اوہام کا سہارا لے کر ان کا کام [illegible] تھا۔ ان کوششوں نے جس لسانی تعصب کو جنم دیا، وہ اس نسلی تعصب سے کم نہ تھا، جس کے تحت اب بھی جنوبی افریقہ میں نسلی علیٰحدگی کو قانونِ الٰہی کے طور پر پیش کرنے والے مذہبی گروہ اور سیاسی رہنما موجود ہیں۔ اسی تعصب نے متمدن یورپ میں، تمام ذہنی ترقیوں کے باوصف آج بھی نسل کشی کو روا رکھا ہے۔ چنانچہ اُردو کی مخالفت تاریخ سے بیزاری کے ساتھ، اس جمہوری عمل سے روگردانی تھی، جس سے زبانیں بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ عبدالحق اُردو زبان کی حمایت میں آواز بلند کر کے، دراصل اس اجتماعی عمل کی بڑائی کو پیش کر رہے تھے، جو ماضی کو حال اور مستقبل سے ملا دیتا ہے۔ ان کوششوں کے باوجود جب یہ نظر آنے لگا کہ تاریخ کے مسلسل بہاؤ میں رخنے پڑ گئے ہیں تو اُردو ہی مسلم آرزوؤں کی ایسی زبردست ترجمان بن گئی کہ بابائے اُردو نے کہا کہ قصرِ پاکستان کی سب سے پہلی اینٹ، اُردو زبان نے رکھی ہے۔

قومی زبان (۸) اکتوبر ۱۹۹۳ء

آزادی کے بعد تعلیم کے فروغ، غربت کے خاتمے، معاشی ترقی اور اپنی تہذیبی اقدار کے اثبات کے ساتھ ساتھ، بہتر وصفِ زندگی کے لیے قومی ترقی اور بین الاقوامی ارتباطِ باہمی کی جو امیدیں بندھی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ ان مقاصد کے حصول کے بغیر محض سیاسی آزادی ناکافی رہتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کی گرفت سے نکلے ہوئے کسی ترقی پذیر ملک کے لیے معاشی ترقی اور جمہوری ادارے بہت ضروری ہیں۔ لیکن ان کے فروغ اور استحکام کے لیے قومی شعور کی وہ بیداری شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے جو زبان و ادب کے ذریعے اقوام عالم کی برابری اور افرادِ ریاست کے مساوی امکانات ترقی کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ پرانے سامراجی مفادات نئے جال بھی تیار کرتے رہتے ہیں۔ جو کبھی بظاہر معصوم و بے ضرر شیوہ ہائے فکر کی صورت میں بھی سامنے آتے ہیں۔ ان سے باخبر رہنا بھی عصری آگہی کا حصّہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی ترقی کے نئے ذرائع بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ تکنیک، سائنس، منطق، فلسفہ، نفسیات، سماجیات، بین الاقوامی تعلقات غرض یہ کہ تمام علوم کی حدود وسیع ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے خارجی دنیا سے نئی مناسبتیں قائم کرنے کے لیے روایتی اندازِ نظر کی تبدیلی بھی ناگزیر ہو گئی ہے۔ آزادی کے بعد کے تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سامراجی نظام کے اپنی مصلحتوں کے تحت قائم کیے ہوئے انتظامی ڈھانچے میں بڑی تبدیلیوں کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اسی طرح ملکی ضرورتوں کے تحت بین الاقوامی تعلقات میں نئے مفاہیم کی جستجو باقی ہے۔ لیکن ہر تبدیلی میں روایتی اندازِ فکر مزاحم ہوتا ہے۔ پھر اس مزاحمت سے نئے تصادمات اور نئے تنازعات وجود میں آتے ہیں۔ فکر و نظر کے تمام ہنگاموں میں قومی زبان، قومی زندگی کی بہترین ترجمانی کر سکتی ہے۔ کسی ایک ریاست میں متعدد زبانوں کی موجودگی کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایک ایسی مملکت میں جہاں قومیت کی تشکیل کا کام ابھی نامکمل ہو، یہ فریضہ رابطے کی کسی اجنبی زبان کے ذریعے پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ترقی یافتہ قومی زبان سماجی حرکت اور ذہنی تبدیلیوں سے تعلق رکھتے ہوئے، قومی سالمیت کے ساتھ ساتھ عالمی خیالات کی نقل و حرکت کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی شعور کی نئے سطحوں کا ادراک بخشتی ہے۔ البتہ اسے استحصالی مفادات سے بالاتر رہ کر دوسری زبانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تہذیبی اشتراک سے تنازعات کو کم کرتے رہنا ہے۔ اگر نزاع کے بغیر قومی زبان کی ضرورت ہو تو اُردو میں قومی شکل سازی کی صفات موجود ہیں۔ اس کی تہذیبی کثیر الاطرافی مختلف نقوش جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر اس کا ملک میں فروغ سماجی اور معاشی زندگی کی ترقی کے لیے بھی ایک نئے تحرک کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں وسیع المشربی کے جو اجزاء ملتے ہیں وہ بین الاقوامی تہذیبی خصوصیات سے متصادم نہیں، متصادف ہیں۔ مزید برآں اس کا آزادی کی تحریکوں سے جو تعلق رہا ہے، وہ قومی زندگی ہی نہیں، عالم انسانیت کے لیے ایک موثر غایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صورتِ حال کے باوجود تعلیمی اور سرکاری طور پر ایک غیر ملکی زبان کے تسلّط نے نہ صرف یہ کہ علم کی روشنی کو بعض قلیل گروہوں تک محدود کر دیا ہے بلکہ ان گروہوں کو معاشی و معاشرتی بالادستی کے ساتھ اپنے مفادات کو سب سے مقدم جاننے کا سبق بھی سکھایا ہے۔ ایک ملک میں مختلف زبانوں کی موجودگی قومی شعور میں سدِّ راہ نہیں، لیکن قومی روایت و مزاج سے مختلف کسی اجنبی زبان کا تسلّط یقینی طور پر اس کے فروغ میں رخنہ انداز ہے۔ پھر یہ نہیں کہ کسی اجنبی زبان کی تحصیل و تعلیم غیر مفید سمجھی جائے لیکن اس تحصیل و تعلیم کا ملکی تقاضوں اور بین الاقوامی ضرورتوں سے تعلق قائم رہنا چاہیے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے جب پاکستان میں حمایتِ اُردو کی تحریک شروع کی تو وہ اس زبان کی تہذیبی قوتوں سے اتحاد و یکجہتی کے رابطوں کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ وہ کسی زبان کے مخالف نہیں تھے اور ذہنی پس ماندگی دور کرنے کے لیے تمام ممکن

قومی زبان (۹) اکتوبر ۱۹۹۳ء

ذرائع اختیار کرنے کے حامی تھے لیکن ماضی کے سامراجی اثرات دور کرنا بھی ان کا مقصد تھا۔ وہ ایک آزاد مملکت میں جمہوری زندگی کے تقاضوں کا شعور رکھتے تھے اور اُردو کو اس شعور کا امانت دار بنانے کے حق میں تھے کہیں کہیں اُردو کی محبت کی وجہ سے ان کے قلم میں جذبات کی آمیزش ضرور ہو گئی اور انھوں نے بعض جگہ معروضی شرائط کو دھیان میں نہ رکھا۔ مثال کے طور پر سابق مشرقی پاکستان کے باشندوں کی سریع الحسی ان کے ملحوظِ خاطر نہ رہی لیکن دیکھا جائے تو اس سریع الحسی کے اسباب بھی لسانی نہیں، سیاسی اور معاشی تھے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنی کتاب "پاکستان میں اُردو کا مسئلہ" میں صاف طور پر کہتے ہیں کہ "میرے خیال میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ اُردو کا مسئلہ نہیں یا اگر ہے بھی تو ایک ظاہری وجہ ہے۔ اصلی وجہ سیاسی ہے۔" پھر واضح طور پر ڈاکٹر عبداللہ نے بتایا ہے کہ سیاسی سے مراد اقتدار و اختیارات کی جنگ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب مسئلہ سیاسی بن جائے تو اسے سیاسی طور پر حل کرنے کی ضرورت ہے، لیکن شاید اس طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔

مجموعی اعتبار سے مولوی عبدالحق کی آواز نہ صرف یہ کہ لسانی اور تہذیبی آمریت کے خلاف آزادی و حریت کی آواز تھی بلکہ وہ خود اُردو ادب کے اندر نئے تجربوں اور اُردو زبان کے سرمایۂ اظہار میں نئے اضافوں سے، نئے جمہوری رشتوں پر یقین رکھتے تھے۔ وہ قومی شعور کی تنظیم کے قائل اور پارہ پارہ کیے جانے کے خلاف تھے۔ ارباب اقتدار نے تین ناموں کا استعمال کرتے ہوئے سرکاری زبان، ریاستی زبان اور قومی زبان کی جو تفریق روا رکھی تھی، اس پر بابائے اُردو نے سخت تنقید کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ سبق دیتے تھے کہ "نئی چیزوں اور نئے خیالات کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں۔" وہ اس وقت کے اور بعد کے بعض تنگ نظروں کی طرح مغرب سے بیزار نہ تھے اور نہ مشرقی اقدار کا نام لے کر انھوں نے، انھیں ذاتی یا گروہی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنایا تھا۔ مرحوم دہلی کالج کے بارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا تھا کہ "یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا۔ ایک ہی چھت کے نیچے، ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم اور ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا۔ ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی، جس میں سے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنّف نکلے۔ جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔" مولوی عبدالحق نے معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار کا احساس کیا اور ادب کو پیش رو جمہوری مزاج سے آشنا کرنا چاہا۔ وہ زبان اور تہذیب کی وسعتوں کا جو تصوّر رکھتے تھے، اس نے اُردو کی ثروتوں میں اضافہ کیا اور آج وہ اپنا عالمی کردار ادا کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کی جمہوریت میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق ایک بڑے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بابائے اُردو کو اُردو زبان سے منسوب کرنا ناکافی سہی کچھ ایسا غلط نہیں لیکن اُردو ان کے لیے دیوبانی نہیں تھی۔ وہ اسے کسی صنم کدے یا اندراسن کا درجہ نہ دیتے تھے بلکہ قومی اور انسانی ترقی کے ذریعوں میں شاید سب سے اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان غایتوں کو نظر انداز کر کے جن کے لیے اُردو زبان ایک وسیلہ تھی، مولوی عبدالحق کی ترقیٔ معاشرہ اور ترقیٔ انسانیت کے بجائے صرف فروغِ اُردو کے حوالے سے یاد کرنا، شاید ان کی جامع شخصیت کے لیے کچھ زیادہ قرینِ انصاف نہیں۔ فروغِ زبانِ اُردو کی اس تحریک کے متعدد سیاسی اور سماجی عواقب تھے۔ پھر خود مولوی عبدالحق کا زبان یا ادب کا تصور تہذیبی صفات رکھتا، جدید علوم اور سائنس سے ہم آہنگی قائم کرنے پر زور دیتا، دانش پژوہی کا دم بھرتا اور انسانی خدمت کے معیارات متعین کرتا تھا۔ وہ زندگی کے لیے (اقبال کے لفظوں میں) "تخلیقِ مقاصد" کے قائل تھے اور ان کی زندگی میں فروغِ اُردو کا مقصد بھی دوسرے مقاصد سے وابستہ تھا۔ چنانچہ اسلامیہ کالج لاہور کی بزم فروغِ اُردو کے جلسے میں بابائے اُردو نے کہا "اُردو کو آپ معمولی زبان نہ سمجھیں اس میں ہماری

ثقافت، مذہب اور قومی روایات کا سرمایہ محفوظ ہے۔" لیکن مولوی عبدالحق کا تہذیب و روایت کا تصور جامد نہیں تھا۔ چنانچہ تحریک علی گڑھ کی خدمات گنواتے ہوئے، مولوی عبدالحق نے سنجیدہ مضمون نویسی، جدید علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے، سائنٹی فک سوسائٹی کے قیام اور بے لاگ تنقید سے ادب میں انقلاب پیدا کرنے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ "علی گڑھ اُردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا، جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی۔" مولوی عبدالحق کے لیے اُردو صرف اُردو ہونے کی وجہ سے مقدس نہیں تھی۔ بلکہ وہ زبان و ادب کے سلسلے میں لسانی حد بندیوں کے منکر اور ذہنی معیارات کے ماننے والے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بڑے وثوق سے کہا کہ "ایک مبتذل اور ادنیٰ درجے کی تصنیف سے ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف کا ترجمہ بدرجہا بہتر ہے۔" (ادبی تبصرے ص ۳۰۲) مولوی عبدالحق اُردو کی آزادانہ حیثیت کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور اس کی لسانی خود مختاری کے اس حد تک قائل تھے کہ وہ اسے عربی و فارسی سے الگ زبان سمجھتے اور اس کے مزاج کو دوسری زبانوں سے جن میں انگریزی بھی شامل ہے، مختلف پاتے تھے۔ چنانچہ وہ "دریائے لطافت" کو اسی لیے سراہتے ہیں کہ اس میں اُردو کی جداگانہ حیثیت کا پرچم بلند کیا گیا تھا۔ وہ مقدمہ دریائے لطافت میں کہتے ہیں کہ "سیّد انشاء پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے، تو وہاں زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔" وہ پھر کہتے ہیں کہ "سیّد انشاء اُردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھ کر یا گھس پس کر یا اختلافِ لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے، وہ اب اُردو کے لفظ ہو گئے ہیں۔ انھیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں جو کچھ صورت ان کی پیدا ہو گئی ہے اور جس طرح وہ زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں وہی ان کی صحیح صورت ہے، اصل زبان سے وہ خواہ کیسے متبائن اور مختلف کیوں نہ ہوں۔"

اُردو کی جداگانہ حیثیت کا قائل ہوتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق دوسری زبانوں سے ترجمے، استفادے اور میل جول کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی یا دہلی ورنکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں، اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا بہت کچھ اثر ہے۔" بابائے اُردو اُردو میں علمی نثر کی ترقی کے لیے دوسری زبانوں اور نئے علوم کا مطالعہ ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن صحیح اور موزوں اظہار کے لیے وہ اپنی زبان سے واقفیت کو بنیادی شرط قرار دیتے تھے۔ ترجمے کو نہایت اہم سمجھتے ہوئے بھی وہ تصنیف کے نام سے ترجمے کی بددیانتی اور پھر بُرے ترجمے کی بدذوقی کے نکتہ چیں ہیں۔ اسی طرح مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چاری اُردو کی گردن پر ڈال دینے کو بھی بُرا بتاتے ہیں۔ وہ ادب میں عجلت نہیں، محنت و ریاضت کے قائل ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب 'اُردو شہ پارے' پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اُردو کہتے ہیں کہ "بعض نوجوان انشاء پردازوں کو مصنّف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ ان کے کاموں میں ایسی قابلِ افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں جو صرف محنت اور غور سے رفع ہو سکتی ہیں۔ مولوی عبدالحق اسی اصول کو زندگی پر منطبق کرتے ہیں اور محنت کو ادبی تخلیق کے لیے ہی نہیں قومی آزادی کے لیے بھی ضروری سمجھتے ہوئے، اپنے خطبات میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ "جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ غلام رہیں گے۔ اگرچہ ان کے ہاتھوں میں آزادی کے منشور کیوں نہ ہوں۔" مولوی عبدالحق قوموں کی آزادی کی طرح ادب کی آزادی کو بھی مستحسن جانتے ہیں۔ وہ قوموں کے آزادانہ قیام اور زبانوں کے آزادانہ استحکام کو ترقی کی راہ میں مانع نہیں بلکہ تہذیبی رواداری، انسانی دوستی اور روشنیٔ فکر کا حامل پاتے ہیں۔ اسی اہم نکتے کے بارے میں وہ مرہٹی زبان پر فارسی کا

...بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جس طرح قومیں مختلف تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح زبانوں میں بھی ایک دوسرے سے رشتے ناطے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا جب کہ دنیا کی تمام قوموں کو نوعِ انسانی کے حلقے میں آکر ایک ہونا پڑے گا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا۔ یہ تخیل کی جولانیاں ہیں جو آئندہ کی تاریکی میں پنہاں ہیں اور ان کے ظہور کی پیش گوئی کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زمانہ ایک روز آئے گا، جب بنی نوعِ انسان ایک قوم ایک ذات ہوں گے اور تمام سفیہانہ اور شرمناک اختلافات جو اس وقت ادنیٰ خود غرضیوں کی بدولت بہت اہم نظر آتے ہیں، مٹ جائیں گے۔ لیکن زبانوں کا اختلاف پھر بھی باقی رہے گا۔ لیکن یہ اختلاف معاندانہ یا منافقانہ نہ ہوگا، بلکہ تمدّن اور علم و تہذیب کو فروغ دے گا اور ایک زبان دوسری سے تقویت اور روشنی حاصل کرے گی۔" سطور بالا میں مولوی عبدالحق، بابائے اُردو سے زیادہ روشن خیال اور عقلیت کے امام، انسانی محبت کے مبلغ اور تہذیبوں کی مجموعی وحدت کے پیامبر نظر آتے ہیں۔

تحریکِ اُردو کے فروغ میں بابائے اُردو کے علمی اور تصنیفی کارناموں نے اہم حصّہ لیا ہے اور یہ کارنامے اسے بھی ثابت کرتے ہیں کہ وہ اُردو کو نہ صرف دورِ حاضر کی ترقی یافتہ زبان بنانا چاہتے تھے بلکہ ماضی سے مستقبل تک اسے تمام فکری، سماجی، تہذیبی اور سیاسی اکتسابات کے شانہ بشانہ دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ وہ اُردو کو صحیح طور پر مختلف عناصرِ تہذیب کا امتزاج سمجھتے تھے۔ لیکن جب ذہنی تعصبات نے اس پر کشادگی کے دروازے بند کرنا چاہے تو انھوں نے اسے بتانے میں بھی تامل نہ کیا کہ پاکستان کی بنیادوں کو جس ثقافت نے مضبوط کیا ہے، اس کی بہترین ترجمان اُردو زبان رہی ہے۔ ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں، حالات کے تفاوت کا عکس ہے۔ آج بھی اُردو دو ہمسایہ ملکوں میں محبت کی سفیر بن سکتی ہے، کیوں کہ ایک ملک کی قومی زبان دوسرے ملک میں اب تک مختلف ذہنی دھاروں سے تعلق رکھنے والے، مختلف عقائد سے وابستہ، مختلف مزاجوں کے حامل بڑے گروہوں کی تخلیقی و تصنیفی زبان ہے اور بول چال کی سطح پر اب بھی وہاں کی گلیوں، کوچوں، بازاروں میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔

بابائے اُردو نے ایک جانب اُردو کے ملک کے تاریخ و تہذیب سے دیرینہ تعلق کی دریافت میں، قدیم ادبی کارناموں کی جستجو و تحقیق سے کام لیا اور بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی اس محنت سے ادب کی تاریخ ہی میں نہیں ہماری سماجی بصیرت میں بھی اضافہ ہوا۔ دوسری جانب وہ تجدید و بیداری کے پیامبر سر سیّد احمد خاں کی تحریک کے سب سے اہم نہیں تو سب سے فعال فرد رہے ہیں۔ وہ اس مہک کے بھی قائل ہیں جو سر سیّد احمد خاں کے طفیل علی گڑھ میں موجود تھی اور جس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس بیدار کرنے میں مدد دی۔ سر سیّد ہی کے اثر سے وہ مغربی علوم اور جدید ذہنی ترقیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کا مسئلہ ہو یا اُردو کو سائنس کے لیے ذریعۂ تعلیم بنانے کی ضرورت، وہ دل اور نظر کشادہ رکھتے ہیں۔ وہ حالی کے بھی معتقد ہیں جن کی مسدس میں مسلم تاریخ کے روشن کارناموں کی بازیافت بھی سر سیّد کے اعمالِ حسنہ میں گنی جاسکتی ہے۔ مولوی عبدالحق حال کے لیے مستقبل و ماضی کی دونوں جہتوں کے پیشِ نظر، "نہ اپنے اسلاف سے شرمندہ ہوں اور نہ جدید علمی ترقی سے درماندہ۔" کا کلیہ وضع کرتے ہیں۔ سر سیّد ہی کی طرح مولوی عبدالحق نے ترقی کے لیے ترجمے کی ضرورت کا احساس کیا کہ عربوں نے یونانی علوم کے ترجموں سے ذہنی ترقیوں کا سامان کیا تھا۔ پھر ان ترقیوں ہی کا فیض تھا کہ یورپ میں ذہنی بیداری کے آثار نمایاں ہوئے جنھیں سائنسی انکشافات و ایجادات نے نئی وسعتیں بخشیں۔ مولوی عبدالحق نے بھی حیدر آباد کے دارالترجمہ کے ذریعہ اور ادبیات و علوم کے ترجموں کی سرپرستی کر کے، اُردو میں نئی فضا پیدا کی۔ سر سیّد ہی کی طرح بابائے اُردو رفقاء کے گروہ سے کام لینے اور ان

میں ذوق کی صفات پیدا کرنے کا گُر جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد لکھنے والوں کے تخلیقی اور علمی کام ان کی سرپرستی میں انجام پائے، جن سے اُردو ادب کے سرمائے اور مجموعی ادبی بصیرت میں اضافہ ہوا۔

تحریک اُردو سے وابستگی کے ساتھ مولوی عبدالحق نے زبان کے بنیادی کاموں کو فراموش نہیں کیا۔ لغت نویسی اور قواعد نگاری میں بھی وہ رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کی تاریخ، کردار، بدلتی ہوئی سیرت اور محاورات و مرکبات کی نقش آفرینی پر نظر رکھتے ہوئے، متن کی معنوی احتیاجات اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت بدلتے ہوئے مفاہیم کے قائل ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی لغت نویسی بہتا ہوا دریا ہے، بند کنواں نہیں۔ لفظوں پر یہ نظر ہی تھی کہ وہ زود نویسی کے بجائے، تحریر کے لیے کبھی کبھی ایک صحیح لفظ کی تلاش ہی کو ادبی جستجو کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ قواعد اُردو لکھتے ہوئے وہ اُردو کو ہندی نژاد اور قدیم ہندی یا پراکرت کی سب سے شائستہ صورت مانتے ہیں۔ وہ اسے دنیا کی جدید زبانوں میں گنتے ہیں۔ قواعد کے اعتبار سے بھی وہ اُردو کی خود مختاری کے قائل ہیں۔ اس لیے وہ عربی اور سنسکرت کے قواعدی اصولوں کی فیض رسانی کو تسلیم کرتے، لیکن ان کے اتباع سے گریز کرتے اور انگریزی سے بعض صورتوں میں استفادے کو جائز سمجھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق قواعد کے سلسلے میں بھی زبان کے رجحانات کا ساتھ دینے کے حق میں ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زبان اور قواعد زبان کو زندگی کی طرح تغیر پذیر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "جس طرح اس ملک کی معاشرت و سیاست میں وقتاً فوقتاً مختلف قدرتی اسباب سے تغیرات پیدا ہوئے اور آج انھیں کی وجہ سے جدید حالت نظر آتی ہے اسی طرح زبان میں بھی قدرتی اثرات اور رجحانات اور مختلف واقعات سے تغیرات ظہور میں آئے۔" وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "دنیا میں کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی اور جب ہم ایک حالت پر نہ رہے تو ہماری زبان کیوں رہنے لگی۔" گویا مولوی عبدالحق اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ زبان کے اصولوں کی تلاش مسلسل جاری رہتی ہے۔ ان کا زبان کا تصور بھی ان کے زندگی کے متحرک و ترقی پذیر تصورات سے منسلک ہے۔

بابائے اُردو کی تحقیقی دریافتوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ زبانِ اُردو کی تاریخ اور سرمائے میں اضافہ ضرور کرتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے سماجی اور تمدنی زندگی کے بہت سے خطوط آشکار ہوتے ہیں۔ عبدالحق کی یہ تحقیقات اس طرزِ تحقیق سے مختلف ہیں، جن میں زبان و ادب کے زندگی سے تعلق کے شعور کو مستحکم کرنے کے بجائے ساری محنت ترتیب یا تالیف یا غیر ضروری فروعات میں صرف کر دی جاتی ہے۔ غالب نے تو مردہ پروری کو کارِ نامبارک بتایا تھا۔ اگرچہ تحقیق میں ایک حد تک اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر مولوی عبدالحق اپنی ماضی کی جستجو سے حال کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ الیٹ نے اس بات کا کہ مردہ مصنف ہم سے فاصلہ رکھتے ہیں کیوں کہ ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں، یہ جواب دیا تھا کہ ہاں وہی تو ہیں جو ہم جانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے ماضی اور حال کے تسلسل میں تنقیدی نظر کی گرفت ملتی ہے جہاں تک ان کی تنقید کا تعلق ہے، اس سے وہ حال کی ذہنی راہوں کو روشن کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ تنقید کو حال کی ضرورتوں سے منقطع، دور از کار اور بعید و مستعار تنقیدی نظریات کی بازی گری بنا کر اپنی دکان چمکانے یا گزاف گوئی سے کام لینے کے بجائے، حاصل شدہ فکری نتائج کو اپنے دور سے مربوط کرنے کا فن جانتے ہیں۔ اس طرح ادب اور سماجی حقائق کی بصیرت کو وہ زیادہ گراں مایہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے تنقیدی اصول اُن کی عملی تنقید سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سادہ لیکن مؤثر زبان کے استعمال کے ساتھ اس زبان کی تغیر پذیری اور عام انسانوں کی زندگی سے تعلق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ "زبان کا عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں لازم

ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے، ورنہ مردہ ہو جائے گی۔" بابائے اُردو نے اسی لیے ہندی کے بعض حامیوں کی طرح اُردو کو احیاء پرستی کا وسیلہ نہیں بنایا وہ اُردو کو جو بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے مٹا کر، ہندی کے نام پر اس مصنوعی زبان کو رواج دینے کے خلاف تھے جو احیائی رجحانات کے تحت پیدا کی جا رہی تھی۔ لیکن ہندی کے ایسے الفاظ کو جو عام لوگوں کی زبان پر ہیں وہ خود اُردو کا حصّہ بنانا چاہتے تھے۔ دراصل یہ ہندی کی مخالفت نہیں تھی بلکہ دو مختلف تہذیبی تصوّرات کی کش مکش اور سیاسی اغراض کا تصادم تھا کہ مولوی عبدالحق اُردو کے نگہدار بن کر سامنے آئے اور اس زبان کی مخالفت کی (گاندھی جی کی تعریف کے مطابق) "جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں" خود پریم چند نے کہا تھا کہ "مہاتما گاندھی ہندی کے خدا نہیں اور نہ ان کی تاویل ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ پریشد کی زبان ہندوستانی ہونی چاہیے۔" پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر تارا چند بھی اس معاملے میں گاندھی جی سے متفق نہیں تھے لیکن یہ تفریق ایسی گہری تھی کہ مفاہمت کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ احتشام حسین نے "اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں جہاں یہ اعتراف کیا ہے کہ مولوی عبدالحق نے "اپنی انتھک محنت سے اُردو زبان کو ہر دل عزیز بنایا" اور "وہ زبان کو ناموزوں فارسی و عربی لفظوں سے بوجھل نہیں ہونے دیتے۔" وہاں یہ شکایت بھی کی ہے کہ "ان کے نامناسب جوش سے اُردو ہندی قضیے کو بڑھاوا ملا۔" دراصل اُردو ہندی قضیہ محض لسانی نہیں، تاریخ و تہذیب سے تعلق کے دو مختلف رویوں کا قضیہ تھا۔

مولوی عبدالحق کی بعض تحریروں کے جذباتی پہلوؤں کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، فن کا زبان کے علاوہ ادب سے بھی تعلق رہا ہے۔ مثال کے طور پر دبستان لکھنؤ سے ان کا کھنچاؤ ایک جذباتی پہلو رکھتا ہے۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" جدید اُردو تنقید کا سنگ بنیاد ہے لیکن اس کی سخت گرفت سے لکھنؤ کے بعض حلقوں کو جو غلط فہمی ہوئی اس کا سنجیدہ و شریفانہ اظہار و جواب مسعود حسن رضوی کی کتاب "ہماری شاعری" میں مل جاتا ہے، لیکن "اودھ پنچ" نے سرسیّد اور حالی کے خلاف جو معرکہ آرائی کی تھی، اس سے نری مذمت مقصود تھی۔ اگرچہ مولوی عبدالحق کی شخصیت میں اپنی تمام وسعتِ نظر اور ذوقِ عمل کے ساتھ لکھنؤ کے بانکوں کے جلال اور جی داری کی کچھ نہ کچھ آمیزش نظر آتی ہے، لیکن ان کا حالی سے جذباتی تعلق دبستانِ لکھنؤ کے بعض اہم کارناموں کو نظر انداز کرنے کا سبب بن گیا۔

مجموعی طور پر مولوی عبدالحق کی ہوش مندانہ کاوشیں تو استدلال کی قوت اور دقّتِ نظر سے ترتیب پاتی ہیں لیکن ان کے جنون میں بھی خرد پروری کی شان تھی چنانچہ نئی مملکت میں، ایک غیر زبان کی آمریت کے خلاف انھوں نے جو آواز اٹھائی اس میں اُردو کی محبت ہی نہیں ایک سلسلۂ تہذیب کے تحفظ کی کاوش اور ایک نئے مستقبل کی تشکیل کے خواب بھی شامل تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے۔" اس لحاظ سے بابائے اُردو کی تنقید کا بنیادی نکتہ، تہذیبی حریت خواہی ہے، جس میں عقلیت پسندی اور روشن خیالی کو رہنما اصولوں کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ بابائے اُردو اس تنگ نظر قومیت کے بھی قائل نہیں جو تہذیبی لین دین کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

بابائے اردو اپنے زمانے کے تہذیبی عمل سے مختلف سطحوں پر وابستہ رہے۔ انھوں نے زبان کو نئے سانچوں میں ڈھلتے اور ادب کو نئے تصوّرات کی نمائندگی کرتے دیکھا۔ وہ آگے بڑھتے رہنے پر یقین رکھتے تھے اور رجعت پسندی کی جانب میلان انھیں گوارا

نہ تھا۔ ایک تاریخ ساز دور میں سانس لے رہے تھے اور اس تاریخ کے بنانے میں ان کا بھی حصّہ ہے۔ وہ ادب میں لذت و زیبائی کے علاوہ معاشرے کی اصلاح اور فکر و روح کی تربیت کے بھی خواہاں تھے۔ افکار و نظریات، تخلیقی قوت اور ادبی اظہار کے کتنے ہی جلوے ان کے پیش نظر تھے۔ وہ عملی طور پر تخلیقی اور علمی کارناموں کی رہنمائی کرتے رہے اور زبان و ادب کے عناصر کی عملی گرفت نے بھی ان کی عالمانہ اور ناقدانہ نظر کی تکمیل کی ہے۔ انھیں زیادہ وسیع النظر بنایا ہے۔ ان کی عملی تنقید کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ متعدد کتابوں پر ان کے مقدمات اپنی ادبی بصیرت اور جامع نظری کے باعث اب ادبی تاریخ میں غیرفانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی تبصرے سلاست الفاظ اور ایجاز معنی کا کمال دکھاتے ہیں اور ستائش و نکتہ چینی دونوں میں کم کہہ کر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں کتنے ہی لکھنے والے ہیں جو ان کے انداز تحریر یا ان کی عقلیت پسندی سے متاثر ہوئے ہیں۔ کچھ کے یہاں رومانیت اور منطقیت کے رجحانات اگرچہ ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے لیکن ادب کی روشن خیالی کی روایت کو بڑھانے میں وہ بھی ہم سفر رہے ہیں۔ عبدالحق کی انسان دوستی اور ذہنی مستعدی کی بہترین کیمیا گری ہمیں ان کے شخصی خاکوں اور سیرت نگاری میں ملتی ہے۔ جہاں نہ صرف یہ کہ جزئی بیان سے وہ مجموعی کردار کی گرفت پر قادر ہیں بلکہ متعلقہ ماحول کو بھی زندگی بخش دیتے ہیں۔ بابائے اردو کی تحریروں میں، مجموعی اعتبار سے محبت کی خوشبو، زندہ دلی کی بہار اور پیرایۂ اظہار کی شگفتگی نے دل کشائی کے جادو جگائے ہیں۔ ان کے مکاتیب میں بھی ان کی انسانی شخصیت کی رنگارنگی کے کرشمے ملتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کام کے دھنی اور بڑے عملی آدمی تھے لیکن وہ خواب دیکھنے والوں کے قبیلے سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اردو یونیورسٹی کا قیام بھی ان کا ایسا ہی ایک خواب ہے لیکن ان کی زندگی بھر کا خواب عام لوگوں میں تہذیبی وسعتوں کی رسائی علوم کی معنوی کارفرمائی اور فکری روشنی کی جلوہ آرائی ہے۔ وہ خواب بینی اور تطبیق آمادگی کو یکجا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہمیں مستند جامع لغات اور انسائیکلو پیڈیائیں لکھنی ہوں گی۔ استناد کی کتابیں تالیف کرنی ہوں گی، فلسفہ و سائنس، تاریخ و معاشیات کی کتابوں کے انبار لگانے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں دنیا کی امہات کتب کے ترجمے کرنے ہوں گے۔ یہ انقلابی اور عہد آفریں کتابیں ہمارے خیالات میں روشنی پیدا کریں گی اور رہ نمائی کا کام کریں گی۔

قومی زبان (۱۵) اکتوبر ۱۹۹۳ء

خاکہ نگاری اور مولوی عبدالحق

خاطر غزنوی

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت قدیم تذکروں میں ملتی ہے۔ پرانے تذکرہ نگار شعرا کے بارے میں عام طور پر چند سطریں لکھتے اور ان سطور میں اکثر اوقات شعرا کا حلیہ، چہرے کے خدوخال، مزاج کا سرسری جائزہ یا معاشرے میں ان کے مقام کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسے ابتدائی تذکرہ نگاروں میں میر تقی میر، میر حسن، قدرت اللہ قاسم وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تذکرہ نگاروں کا انداز کہیں بے حد مختصر محض ایک آدھ شعر کے اندراج سے آگے نہ بڑھا اور بعض جگہوں پر پسندیدہ شخصیات کے بارے میں دل کھول کر لکھتے ہیں۔ تفنن طبع کے لیے ایک ہی شخصیت پر میر تقی میر اور قدرت اللہ قاسم کی تحریریں ملاحظہ ہوں۔ شخصیت ہے میر عبدالحیٰ تاباں..... میر لکھتے ہیں:

"بہت دلچسپ نوجوان تھے، نجیب الطرفین سیّد تھے، شاہجہاں آباد ان کا وطن ہے، بہت خوش فکر، حسین، خوش خُلق، پاکیزہ کردار اور عاشق مزاج معشوق ہیں۔ اب تک شعرا کے فرقے میں ان کا سا خوبصورت شاعر باطن عدم سے عالم وجود میں جلوہ گر نہیں ہو سکا۔ ان کی رنگین زبان برگ گل سے بھی زیادہ صاف اور ستھری ہے اور آپ گلستان سخن کے نازک دماغ بلبل ہیں، ان کی رنگینی فکر کا رہوار باد بہار کے گلگوں سے قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے، حالانکہ ان کا میدان سخن صرف گل و بلبل کے الفاظ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی بہت رنگین انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے کلام کا رنگ دیکھ کر میری زبان سے برجستہ ان کے کمال کی تعریف نکل جاتی ہے۔ ان کے اشعار کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے استاد اُن کے شاگرد کے برابر بھی نہیں ٹھہرتے۔ کثرت شراب نوشی کا شکار ہو کر فوت ہوئے۔ وہ بھی عالم شباب میں۔

اب اسی شاعر کے بارے میں قدرت اللہ قاسم کی تحریر ملاحظہ ہو:

"تاباں تخلص، جوانِ زیبا، نازک اندام، عبدالحیٰ نام، طبقۂ سوم کے شعرا میں سے ہیں

عاشق پیشہ اور معشوق مزاج تھے۔ کہتے ہیں کہ خوبانِ جہاں ان سے طریق دلبری اور شیوہِ ستمگری اور آئینِ حسن ورسم محبوبی سیکھتے تھے۔ وہ بزرگ جن کے دل کذب سے عاری اور افترا کی آلودگی سے پاک تھے کہا کرتے کہ آخری دنوں میں شیریں اداو سادہ رو ملاحت آگیں لونڈے اُن کے گھر میں آراستہ و پیراستہ ہوتے اور امرائے قزلباش کی فرمائش پر محافے میں بیٹھ کر راتوں کو مہمانی کا شرف حاصل کرتے، بد قسمتی سے اس طرح کے کردار ناہنجار کے سبب حضور دہلی پہنچے وہاں کیا پہنچے نعوذ باللہ من سرور انفسنا و من سیات اعمالنا۔ القصہ وہ جوان رعنا، حسن کی جوئبار سے سیراب ہوتے اور بوستان محبوبی میں سربلندی حاصل کرتے، مگر افسوس کہ عین عنفوان شباب و ریحان جوانی میں ان کی زندگی کا نہال اپنے ہی ہاتھوں ظلم اور صرصر فنا کا شکار ہوا اللہ ان پر رحم کرے۔ ان کا حسن عالم سوز اور وہ شہرہ آفاق تھے۔ چشم وابرو کے حسن میں یکتا و طاق، شیخ ظہور الدّین حاتم علیہ الرحمہ نے انھیں اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے شاگردوں میں شمار کیا ہے لیکن دراصل محمد علی حشمت کے شاگرد رہے۔ ممکن ہے دونوں اساتذہ کی نظر سے کلام گزرتا ہو۔ ہر شعر آبدار اور عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر رہتا، کیفیت، ایمانی چاشنی اور دلربائی سے مملو کلام تھا۔"

ان تذکرہ نگاروں کی ایک ہی شخصیت کے خاکے اور کلام پر رائے میں ایک مشترک قدر وضع داری کی ہے اور اس وضع داری میں زم بمایشبہ المدح کا پہلو بھی نمایاں ہے۔

آج کے دور میں مدح بمایشبہ الذم بھی خاکہ نگاری کے فن میں در آیا ہے۔ یہ خصوصیت اُن خاکہ نگاروں کے فن کا حصّہ ہے جو سنجیدہ طبع لوگ ہیں۔ بات کہنا چاہتے ہیں انھیں ماحول اور زمانے کی ناسازگاری کا احساس بھی ہوتا ہے غرض وہ فنی موشگافیوں اور باریکیوں کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ خاکہ نگاری کا فن تار پر چلنے والے بازیگر کا فن ہے۔ محض ایک بانس سے توازن برقرار رکھنا ہی کمال ہے، خاکہ نگاری کا فن بھی بانس سے توازن برقرار رکھنے کا فن ہے۔ اس بحر کے غوّاص پانی میں بھی تیرنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو چھینٹوں سے بھی بچانا چاہتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے فن کی یہ ایک بنیادی شکل ہے۔

ہم اردو ادب میں خاکہ نگاری کے فن کا جائزہ لیں تو پہلی مرتبہ بھرپور انداز میں تذکرہ تاریخ اور خاکہ نگاری کے امتزاج پر مبنی ایک مبسوط کتاب "آبِ حیات" کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر انشااللہ خاں انشا کی کتاب "دریائے لطافت" میں بھی خاکہ نگاری کے بعض لطیف پہلو نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد کے بعد ایک نہایت اہم اور بھرپور خاکہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ مولوی نذیر احمد کی کہانی "کچھ ان کی کچھ میری زبانی" ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے لافانی قلم کی دین ہے۔

خاکے کے فن سے میرا اچانک خاکے کی تاریخ کی طرف پھلانگنے کا ایک مقصد تھا۔ جس کا ذکر خاکہ نگاری کے فن کا جائزہ لینے کے لیے حوالہ کے طور پر پیش نظر رکھنے کے لیے کیا گیا۔

انگریزی میں خاکے کے لیے کیری کیچر کا لفظ موجود ہے، کیری کیچر اصل تصویر سے کم تر چیز ہوتی ہے، لیکن کیری کیچر

میں اس شخصیت کے بعض نمایاں خدوخال کو اس طرح اُبھارا جاتا ہے کہ اس شخص کی صورت کے تمام اہم پہلو عطر کی طرح کشید ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ یوں ہم خاکے کو سوانح سے کمتر چیز کہہ سکتے ہیں، لیکن کیا عطر کو ہم پھول سے کمتر چیز سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے اسی طرح خاکے سوانح کی نسبت اخبار کی خبر کی سرخیوں کی طرح شخصیت کے اہم ترین پہلوؤں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ سوانح اور خاکے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ناول اور افسانے کا.... ناول جزئیات اور تفصیل کا نام ہے ایک پوری حویلی کی داستان ہو سکتا ہے لیکن افسانہ حویلی کے ایک کمرے کا.... یا حویلی کی ایک شخصیت کا.... خاکہ نگاری کے فنی لوازم میں افسانے کے فن کے لوازم پوری طرح کارفرما ہوتے ہیں، یعنی خاکے کو افسانے کی طرح مختصر اور یوں افسانے کی وحدتِ تاثر کا حامل ہونا چاہیے اگر خاکہ طویل ہو جائے تو وہ طویل مختصر افسانے کی فنی ذیل میں آئے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مولوی نذیر احمد کا خاکہ.... اس خاکے کی طوالت اسے سوانح کے قریب ضرور لاتی ہے لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کا منفرد انداز تحریر اور جزئیات کی اختصار نویسی نے اسے سوانح بننے سے بچالیا ہے اور اسے طویل مختصر خاکہ کی حد میں رکھ کر خاکہ نگاری کے فن کا بول بالا کیا ہے۔

مولوی عبدالحق کے خاکوں میں طویل ترین خاکہ سرسیّد، شمس العلماڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی اور نواب عماد الملک یعنی مولوی سیّد حسین بلگرامی کے ہیں۔ خاکے تو ایک ہی خاندان کی دو شخصیتوں کے ہیں جنھوں نے اپنے علم و فضل اور کارناموں کی بنا پر اعلیٰ ترین رُتبے، بہترین شہرت اور لوگوں کے دلوں کی محبت پائی، ان شخصیات کے خاکوں میں مولوی عبدالحق ایک ایسے خاکہ نگار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں جنھیں شخصیات سے بہت قرب، ان کی عادات سے نہایت واقفیت، ان کے خاندان سے تاریخی نسبت، ان کی نفسیات کا علم، ان کی اندرونی زندگی اور کیفیات کے محرم ہونے کا شرف حاصل رہا۔

اتنے قرب اور احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی مولوی صاحب نے خاکہ نگاری کی ایک خصوصیت یعنی حقیقت پسندی کو قطعی طور پر ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جہاں اس خاندان کی عزت مجروح ہوتی تھی وہاں وضع داری اور آداب کے تمام تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل ایسے الفاظ تک لکھنے سے دریغ نہ کیا نواب عماد الملک کے خاکے میں یہی بات قابلِ غور ہے:

> "بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے اس خاک سے ایسے جلیل القدر، عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحّر اور علم و فضل کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سیّد حسن کے دادا سیّد کرم حسین کو انگریزی توسّل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدّین حیدر بادشاہ اودھ سرکار اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے کے گورنر جنرل (لارڈ بینٹنک) کے دربار پہنچے ان کی اولاد سیّد زین العابدین حسین (والد سیّد حسین) اور سیّد اعظم الدّین حسین نے وارن ہسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جب کہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا، انگریزی بھی سیکھی، یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور انگریزی تعلیم حاصل کی۔"

اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ جو سندھ سے متعلق ہے مولوی سیّد حسین بلگرامی کے حوالے سے لکھ کر پھر بے خوفی کے ساتھ ساتھ تفنن طبع کا سامان بھی پیش کرتے ہیں اور خاکے کو سوانح کی سنجیدہ حدوں سے خاکے کی ہلکی پھلکی دنیا میں کھینچ لاتے ہیں، اور اپنی حسِ مزاح کا ثبوت دیتے ہیں:

"چونکہ امیرانِ سندھ اپنے ہاں انگریزوں کا آنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے چچا سیّد اعظم الدّین حسن خان کو دریائے سندھ کی نگرانی تفویض ہوئی، یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو ملنی محال تھی۔ اعظم الدّین خان کے انتخاب سے ان کی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سیّد حسین بلگرامی) برسبیل تذکرہ فرماتے ہیں کہ جب اہل سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سیّد ہیں تو ان کے بنگلے پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے اور بیماروں کے لیے تعویذ مانگنے آتے تھے۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ فرصت کے وقت عربی کے اشعار، یا قرآن کی آیات جو اس وقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکریوں میں ڈالتے جاتے تھے اور دوسرے روز لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے، اور ان میں سے اکثر مریض اچھے بھی ہو جاتے تھے، انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی کہ لوگ بدگمان نہ ہو جائیں، مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے چونکہ بہت وجیہہ گورے چٹے تھے لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ دراصل یہ انگریز ہے، لیکن مسلمان بنا ہوا ہے، اس لیے وہاں عام طور پر برہمی پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انھیں بھی اس کی اطلاع ہو گئی اور یہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔"

مولوی عبدالحق کے خاکوں میں بھی سارے فنی پہلو اپنے تمام تر حسن کے ساتھ نمایاں ہیں مزاح کا عنصر بعض واقعات کے حوالے سے خاکے میں زندگی ڈالتا ہے، مولوی سیّد علی بلگرامی ہی کے تذکرے میں ان کی کتاب سے بے پناہ محبت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

"مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین تھے مرحوم (سیّد علی بلگرامی) سے ایک کتاب بغرض نقل مستعار طلب کی، کتاب تھی نادر، مرحوم کو دینے میں تامل تھا مگر مروّت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب خیال رہے کہ کتاب تو بے شک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے، مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً "لاحول، ولاقوۃ" کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔"

ایک اور واقعہ خاکے میں تازگی برقرار رکھتے ہوئے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

"ایک بار خواجہ معین الدّین چشتی کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آ گھیرا مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہو میں تو وہابی ہوں۔ یہ

کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے۔"

ان دنوں طویل خاکوں میں انھوں نے اسی طرح کے دلچسپ چٹکلے شامل کر کے انھیں ایسا دلکش اور دلچسپ بنایا کہ ان خاکوں کی طوالت کا احساس ہی نہیں رہتا اسی طرح جیسے دلچسپ طویل مختصر افسانہ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

ان ہی مثالوں سے واضح طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولوی صاحب شخصیت کے گرد معلومات کا ایک روشن ہالہ بنا دیتے ہیں جس میں وہ شخصیت کی مثبت اور منفی تمام تر نمایاں خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں یہ ان کی تحریر کی عظمت اور کمال ہے کہ منفی خصوصیت کو بھی مثبت بنا دیتے ہیں یہ قاری کی نظر پر منحصر ہے کہ وہ شخصیت کی کمزوریوں کو پڑھ لے۔

مولوی صاحب نے بڑے بڑے لوگوں، جانے پہچانے لوگوں، مفید لوگوں، ادباء، شعرا، دانشوروں، افسروں، علی گڑھ اور حیدر آباد کے چاند ستاروں، اسلامی تحریک کے کارکنوں کے علاوہ ان لوگوں کے خاکے بھی لکھے ہیں جن کی حیثیت صفر تھی، جنھیں نہ معاشرے میں کوئی جانتا نہ ماحول میں اس کی اہمیت نہ گھر تا باہر لیکن مولوی صاحب کی باریک بیں نظروں، دور رس نگاہوں اور جزرسی کی صلاحیت نے ایسے بے حیثیت لوگوں میں ایسی خوبیاں نکال کر لوگوں کو دکھائیں کہ نظریں حیران اور عقل دنگ رہ جاتی ہے، میں ایسے لوگوں کی مولوی صاحب کی بنائی ہوئی چند لکیروں کی تصویروں میں ان کو لازوال اور امر بنا دیا۔

کسی شخصیت کے زندگی کے اہم واقعات کو سبھی خاکہ نگار یکجا کر ہی دیتے ہیں کہ یہ فن کا تقاضا ہے لیکن حالات و واقعات کو سلیقے اور تناسب یا سمٹری (SYMMETRY) کے ساتھ تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دینا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔

بلگرامی کا خاکہ کیری کیچر ہے جس میں تصویر کے بنیادی اور اہم پہلو، چہرے کی پہچان کے زاویے، سائے اور روشنی کی لکیروں کے غیر محسوس سٹروکس کے ساتھ، ان کے بلا کے حافظے کے بعض نکات کی چاشنی، ان کی علمیت کی بھاری بھرکم دستار کے پیچوں کی گتھیوں، ان کا کتابوں سے عشق، ان کا علم سے بے پناہ علاقہ، ان کا غریب اہل علم کا احترام، ان کا علماء سے عقیدت کا جذبہ، ان کا مطالعے سے چشم و چشمے کا واسطہ، ان کا صاحبان علم کا خادم بن جانا... سب باتیں بطریق احسن، مختصر اور دلکش واقعات سے مزین خاکے کی زینت ہیں۔ یہی عالم سرسیّد کے طویل ترین خاکے کا ہے مولوی صاحب کے خاکے محض افسانوی حسن و اختصار کے حامل ہی نہیں ان میں ڈرامے کے فن کے لوازم بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، ڈرامے کے فن کا ارتقا، کلائمکس، سسپنس، یعنی نقطۂ عروج اور حیرت و استعجاب بھی انھوں نے ڈرامے سے مستعار لیا ہے اور اچھے خاکہ نگاروں کی طرح انھوں نے خاکے کے فنی لوازمات کی تخلیق کی اور آنے والی نسلوں کو خاکے کا مفہوم دیا۔

ان کے خاکوں میں غزل کے شعر کے سے اختصار میں تکمیل اور ایمائیت پائی جاتی ہے۔ ایسا شعر جس کی تشریح نہیں ہو سکتی، جس کی حرف لذّت لی جاتی ہے، جس کی کیفیت کو ذہن و دل میں جذب کیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت ان کے خاکوں میں موجود ہے ان کے خاکے تاریخ بھی ہیں اور انسانی جغرافیہ بھی۔

منٹو خاکہ نگاری میں جراحی کرتا تھا، شوکت تھانوی نے شیش محل میں ہر آئینے سے قہقہے حاصل کیے، رشید احمد صدیقی نے ارہر کے کھیتوں کی کھلی فضائیں اور باغوں کی خوشبوئیں بانٹیں، ساحر لدھیانوی نے شہزادوں کو عوام کا محبوب بنا دیا، محمد طفیل نے بزرگوں اور دوستوں کی صف میں احترام اور حفظِ مراتب کی دلکش درجہ بندی کا نور دیا، آپ، جناب، صاحب، مکرم، محترم، معظم ان کے مخاطب کا حسن تھا، رحیم گل نے شخصیتوں کے تضادات تلاش کیے لیکن ان تضادات سے بلیک میل کرنے سے اجتناب کیا،

فارغ بخاری نے بے تکلفی کی پچکاریاں چھوڑ کر دوستوں اور گوپیوں کے مابین ہولی کھیلی، شاہد احمد دہلوی نے احترام اور رکھ رکھاؤ کی فضا کے آگے سر جُھکایا، ضمیر جعفری اور عطا الحق قاسمی نے مزاح کی چاشنی عام کی۔ ایسی شخصیات میں نام دیو مالی اور گدڑی کا لال نور خاں ایسے خاکے شامل ہیں یہی وہ لازمی تحریریں ہیں جن کے سبب نام دیو اور نور خاں لافانی ہو گئے ہیں یہ کمال کمتر خاکہ نگاروں میں ہے کہ گمنام لوگوں کو شہرت دوام کا تاج پہنادیں۔

خاکہ نگاری کا ایک اہم اور بنیادی وصف انسان دوستی ہے۔ یہ دونوں خاکے انسان دوستی کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خاکہ ہوتا ہی انسانوں کا ہے۔ بس انسانوں کے نام بدل جاتے ہیں، کام بدل جاتے ہیں، پیشے بدل جاتے ہیں، لباس بدل جاتے ہیں، کہیں وہ شاعر اور ادیب کی صورت خاکے کا موضوع بنتے ہیں، کہیں اداکار، کہیں صداکار، کہیں ہدایت کار، کہیں کلرک، کہیں جرنیل، کہیں سپاہی، کہیں قائد، کہیں سیاستدان، کہیں تاجر، کہیں افسر، کہیں استاد، کہیں وکیل۔ غرض وردیوں، اعلیٰ لباس، یونیورسٹی کے گاؤن اور رنگ رنگ کے اصلی اور نقلی لباس کے اندر ایک ہی حلیے کا انسان ہوتا ہے، ..... انھیں پر خاکے لکھے جاتے ہیں، خاکے لباس کے بارے میں نہیں ہوتے، ہاں لباس ایک جزوی حیثیت یا شخص کی جزوی پہچان ضرور ہوتا ہے اصل چیز لباس کے اندر گوشت پوست کی مورت ہوتی ہے مورت سے بھی زیادہ اس شخصیت کا باطن اور اس باطن کا اظہار مختلف شکلوں اور صورتوں میں خاکے کا موضوع بنتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے اہل قلم ہی نے حاتم طائی کے گھوڑے، شہزادہ جان عالم کے طوطے، ہتوپدیش کے برہمن کے شیر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جیل کی چڑیوں کو حیاتِ دوام بخش دی۔

لیکن مولوی عبدالحق تو انسان دوست ہیں، وہ انسان اور اس کی انسانیت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنانے کا عزم لے کر، انسانوں کو انسانوں اور زبان سے محبت کرنے اور اس کی خدمت کرنے کا جذبہ لے کر اٹھے تھے، اس لیے انھوں نے خاکہ نگاری میں انسان دوستی کے جذبے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔

مولوی صاحب نے بعض خاکوں ہی میں خاکہ نگاری کے بعض سنہری اصول بھی دیے، اس فن میں اپنے خاکے کے مجموعے "چند ہم عصر" میں ہم عصر ہونے کو خاکہ نگاری کے لیے محل نظر گردانا۔ چنانچہ سرسیّد کے خاکے کی ابتدا ہی میں اس بنیادی خصوصیت کے مثبت منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تصویر جس قدر بڑی، شاندار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہوسکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہوسکے، یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کیے ہیں ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی۔ (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کیے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی، رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے، ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

خاکہ نگاری کا یہ اہم اصول انھوں نے واضح کیا اور اسے سرسید کے خاکے میں برتا، انھوں نے اس اصول کی توجیہہ کرتے ہوئے فرمایا:

> "سرسید احمد خاں ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں ان کی وفات کو اس وقت (یہ اس وقت اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کا سنگم ہے) ان کی وفات کو پچاس سال سے اوپر ہوئے ہیں اور اگر ان کے ملکی یا قومی کام کی مدت کو بھی جوڑ لیا جائے (جو "آثار الصنادید" کی تصنیف سے شروع ہوتی ہے) تو ایک صدی ہوتی ہے اب نہ وہ عقیدت مند ہی رہے جو ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف جو ان کے ہر کام کو ریا کاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے اس لیے بے لاگ مورخ کے لیے موقع ہے کہ وہ اُس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔

پھر اسی خاکے میں خاکہ نگاری کے دوسرے اصول یعنی قرب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس خاکے کی تحریر کا جواب دیتے ہیں:

> "میں نے اس نیت سے قلم نہیں اٹھایا، یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں، لیکن چونکہ مجھے کئی سال تک ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انھیں کیسا پایا اور وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔

مولوی صاحب صرف اردو زبان ہی کا بول بالا کرنے کا عزم لے کر آئے تھے وہ اردو ادب کے نئے نئے گوشوں کی تخلیق و تعمیر کا فریضہ ادا کرتے رہے، خاکہ نگاری کے فن کی انھوں نے آبیاری کی اور اس کی لذت آفرینی، افادیت، تاریخی شواہد، ظاہر و باطن کے حقائق کے چھینٹے اور شخصیت کی قد و قامت کی حقیقت کا عرفان پھیلایا۔

خاکہ نگاری کے فن کے ستونوں میں مولوی عبدالحق نمایاں ترہیں۔

Energy Supports Life

Our track record portrays a spectacular success story of energy exploration in Pakistan.

We've completed with satisfaction four decades of our dedicated services in the vital energy sector of the country.

We're Pakistan's premier petroleum exploration and production company; discoverers and producers of the country's largest gas field—Sui and pioneers of gas industry in Asia.

Our daily production of natural gas exceeds energy equivalent of 110,000 barrels of furnace oil. And we also produce substantial quantities of oil and LPG.

We have stepped up petroleum exploration through a number of joint ventures with leading oil companies.

Pakistan Petroleum Ltd.

NATIONAL PPL. 1..91-R

"بابائے اردو اور اردو کا ایک معرکہ

الیاس عشقی

اپنی ذات کا حوالہ نہ آسان ہے نہ کوئی بات لیکن موضوع کچھ ایسا ہے یہ کڑوا گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑ رہا ہے۔ جب بھی کہیں بابائے اردو کا ذکر آتا ہے تو مجھے ان سے پہلی بار ملنا یاد آیا ہے ویسا ہی فخر محسوس ہوتا ہے جیسا اس ملاقات کے بعد ہوا تھا اس لیے کہ مجھے ان کی خدمت میں پنڈت کیفی دتاتریہ نے پیش کیا تھا جنھیں والد مرحوم ہمیشہ مولانا کیفی کہا کرتے تھے وہ جے پور سے (جہاں تاسیس پاکستان سے قبل ہمارا خاندان ڈیڑھ دو سو برس سے آباد تھا) دہلی تشریف لے جا رہے تھے جہاں انھیں مولوی عبدالحق صاحب سے ملنا تھا میں ان کے ساتھ ہولیا تھا مولوی صاحب والد مرحوم کے حوالے سے بڑی شفقت سے پیش آئے تھے انجمن کا دفتر دہلی آ چکا تھا اس کے بعد جب دہلی جانا ہوتا تو میں ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا پھر کتابوں کی ایک نمائش اور ریاست جے پور میں اردو کے قضیے کے سلسلے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا اور یہی قضیہ جس میں بابائے اردو ہر اردو دشمن سانحے کی طرح سینہ سپر ہو گئے تھے اس مقالے کا عنوان ہے۔

۱۹۷۰ء میں جب سید مصطفیٰ علی بریلوی کی کتاب "انگریزوں کی لسانی پالیسی" بازار میں آئی تو میں نے خرید لی اس لیے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب میری نظر سے نہ گزری تھی فطری طور پر مجھے راجپوتانہ کی ریاستوں میں اردو سے متعلق باب سے دلچسپی تھی اور اس میں خاص کر جے پور اور اردو کے بارے میں جن حالات سے ہم گزرے تھے اس کی تلاش تھی لیکن وہی بات جس کے متعلق بابائے اردو نے ایک اردو کتابچہ اور اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر کے برصغیر کے ہر تعلیمی اور سیاسی ادارے اور تمام اہم شخصیتوں کو بھیجا تھا لیکن سارے فسانے میں اس کا ذکر نہ تھا اگرچہ اس سے قبل کے سب واقعات موجود تھے اس لیے کہ جن صاحبان سے وہ مواد حاصل کیا گیا تھا اس قضیے میں ان کا کردار منفی رہا تھا اس لیے کہ دونوں کشتیوں میں سوار رہنا چاہتے تھے اور ریاست کے ملازم بھی تھے اور ہر قسم کی سیاست میں بھی حصّہ لیتے تھے اور کبھی کبھی اپنی ملازمت کو بچانے کے لیے ریاست کو ضروری معلومات بھی فراہم کر دیتے تھے جے پور کی سیاست اور اردو کے قضیے میں بھی ایسا ہی ہوا اور انھوں نے بڑی چالاکی سے نواب بہادر یار جنگ کے خطوط کے اقتباسات دے کر اپنے نزدیک اس داستان کو معتبر بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نواب صاحب مغفور نے جو ریاستی مسلم لیگ کے صدر تھے صحیح حالات معلوم ہو جانے کے بعد سارے لیڈروں کو نظر انداز کر کے طالب علموں کی ایک کمیٹی بنادی تھی جو ان کو ریاست کے حالات سے مطلع رکھتی تھی اور جس کا ایک رکن یہ خاکسار بھی تھا۔ اسی وقت سے اس موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ تھا مگر کوئی مناسب موقع نہ ملا چنانچہ آج بابائے اردو کے اس نایاب کتابچے

سے متعلق مختصراً کچھ باتیں حاضرین محترم کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کتابچے کا عنوان "ریاست جے پور اور اردو زبان" ہے جو ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا گیا تھا ابتداً "التماس" کی سرخی دی ہوئی ہے جس میں مولوی صاحب نے جے پور اور اردو کے موضوع پر مختصر بیان جاری کیا تھا اسے بعض اخبارات نے شائع کیا اور بعض ایسے اخبارات نے اسے شائع نہ کیا ظاہر ہے کہ ریاست نے معروف طریقوں سے ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم سر مرزا اسمٰعیل تھے جو نیشنلسٹ خیالات کے لیے مشہور تھے۔ خود کہا کرتے تھے کہ ملک کی سیاست میں صرف تین اشخاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے مفاد کی حفاظت کے لیے گاندھی، مسلمانوں کے لیے مسٹر جناح اور ریاستوں کے سلسلے میں خود۔ یہ ان کی ریاست میسور کی خدمات کے مدنظر درست بھی معلوم ہوتا تھا مگر ریاست جے پور اور حیدرآباد دکن میں ان کے کردار نے اسے غلط ثابت کر دیا مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اس پمفلٹ کو شائع کرنے میں اس لیے حق بجانب ہیں کہ اردو کے خلاف اپنے اقدام کے اثرات سے وہ واقف نہیں ہیں یا پھر وہ حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے فرقہ وارانہ ذہنیت اور اردو دشمنی کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ قصہ بنگال اور بہار سے شروع ہوا جہاں انگریزوں کی حکومت پہلے قائم ہوئی اور پھر دہلی کے صدر مقام مقرر ہونے کے بعد یوپی اور دوسرے صوبوں میں یہ زہر خود انگریزوں نے پھیلایا تھا ریاست جے پور کے فرمانرواؤں اور خاص کر مہاراجہ رام سنگھ آنجہانی نے اس زہر کو اپنی ریاست میں نہ پھیلنے دیا اس لیے کہ وہ مغل روایات اور راجپوتوں کی شان کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں انھوں نے جے پور میں اصلاحات کا آغاز کیا اور اُردو ریاست کی زبان رہی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی کے شرفا اور اہل علم و ادب جب ملک میں منتشر ہوئے تو جے پور نے بھی کھلے دل سے ان کا خیر مقدم کیا اور ریاست میں انھیں ان کے شایان شان عہدے اور مکانات دیے اور بقول مولوی صاحب کے اسی ریاست سے فارسی اور اردو زبانیں راجپوتانہ میں عام ہوئیں۔ مشاعرے اور ادبی محفلیں عام ہوئیں اور خود مہاراجہ رام سنگھ اپنے محلوں میں مشاعرے منعقد کراتے تھے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ مہاراجہ نے کبھی اردو ہندی قضیے کو برداشت نہ کیا اس لیے کہ وہ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی قابلِ قدر نشانی سمجھتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں حامیان ہندی اردو کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اور اس کے ایک مشکل زبان ہونے کے چرچے ہونے لگے تھے اس لیے مہاراجہ رام سنگھ نے ۱۸۸۴ء میں یہ حکم جاری کیا کہ "عدالتوں میں اردو بہت صاف اور شستہ لکھی جائے اور عربی فارسی اور انگریزی کے نامانوس الفاظ بالکل نہ لکھے جائیں" بابائے اردو لکھتے ہیں کہ اس پروانے کے بعد ریاست کی عدالتوں اور دفتروں میں زبان کا معیار بہت بلند ہو گیا اور ؟؟ میں شعر و ادب کے عام ہو جانے کے سبب اردو زبان محاورہ اور روزمرہ کی صحت کی وجہ سے زبان منجھ کر ایسی شستہ اور صاف ہو گئی تھی کہ راجپوتانہ میں جے پور کو چھوٹی دلّی کہا جاتا تھا اس لیے کہ دہلی کے اساتذہ میں سے ظہیر دہلوی ان کے بھائی انور دہلوی، نواب مرزا آگاہ، راقم دہلوی، میر مہدی مجروح اور میرزا مائل دہلوی جیسے اہل زبان اس کشت اردو کی آبیاری میں لگے ہوئے تھے اس لیے مولوی صاحب کے نزدیک جے پور کا یہ لقب درست تھا۔

مہاراجہ رام سنگھ کے بعد مہاراجہ مادھو سنگھ حاکم ہوئے وہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن مدبّر تھے اور انتہا درجہ کے روایت پرست حالانکہ مذہبی خیال رکھتے تھے مگر ہندو مسلمانوں کی تفریق کے مخالف اور سخت مخالف اور روایات ریاست کے محافظ! لیکن اردو کے مخالفین لگاتار دبی دبی آوازوں میں اردو کے خلاف قضیے برپا کرتے رہتے تھے ان کے بعد آخری مہاراجہ مان سنگھ تھے جنھیں مہاراجہ مادھو سنگھ نے گود لیا تھا کیوں کہ وہ لاولد تھے مہاراجہ مان سنگھ کم عمر تھے اس لیے ایجنسی کاؤنسل مقرر ہوئی۔ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے فرقہ پرستوں

نے پھر کوشیش شروع کیں اس لیے کہ زمانہ بدل رہا تھا ریاستوں کے باہر زور شور سے اردو کی مخالفت ہو رہی تھی لیکن ایجنسی کے زمانے میں اس قضیے کو یہ کہہ کر التوا میں ڈال دیا گیا کہ یہ اہم فیصلہ مہاراجہ خود با اختیار ہونے کے بعد کریں گے لیکن فرقہ پرست افسروں کو جو زیادہ تر ریاستوں میں اکثر باہر سے آتے اور ملازم رکھ لیے جاتے تھے پہلی انھیں کامیابی یہ ہوئی کہ انھوں نے ریجنسی کاؤنسل سے اپنی ایک درخواست پر یہ جواب حاصل کر لیا تھا۔

"تحریراتِ ہندی و اردو میں کوئی فرق نہیں ہے راج کو ہندی تحریرات بھیجنے کا اختیار ہے دیگر محکمہ جات سے جو تحریرات ہندی اور اردو میں آئیں وہ راج لے لیا کرے۔"

گویا دیوناگری رسم الخط چور دروازے سے نظام حکومت میں داخل کر دیا گیا یہ حکم ۱۷ جنوری ۱۹۲۲ء کو جاری ہوا تھا۔ لیکن زبان اردو ہی رہی صرف رسم الخط کی حد تک "ہندی" تحریریں قبول کی جانے لگیں اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اس سے قبل صرف محکمۂ حساب میں ہندسوں کی حد تک ہمیشہ سے ہندی چلی آتی تھی مگر کوئی تحریر سوائے اردو کے اس محکمے میں بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔ ایجنسی کاؤنسل کے صدر مسٹر آر آر کلانسی پہلے یہ کہہ ہی چکے تھے کہ زبان کا مسئلہ مہاراجہ خود طے کریں گے مگر ۱۹۲۵ء میں ہندی حروف کی اجازت مل گئی اور اب اردو کے ختم کر دینے کی کوششیں باقاعدہ شروع ہو گئیں لیکن ریاست کے خاص ہندو باشندے اب بھی اردو کے حامی تھے بابائے اردو کو اس سلسلے میں ضروری مواد ہم لوگ فراہم کرتے رہتے تھے چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو پنڈت گردھاری لال ایڈووکیٹ کا یہ بیان مولوی صاحب نے اس سلسلے میں درج کیا ہے:

> "آج کل مدبران جے پور ملک کے دو فرقے ہیں ایک فرقہ جس میں دولت مند لوگ شامل ہیں ہندی کا طرفدار ہے اور پبلک کو ہندی کی طرف توجہ دلا کر اس امر کی تحریک کرتا ہے کہ وہ اس امر پر زور دیں کہ زبان ہندی عدالت میں قرار دی جائے۔"
>
> "دوسرا فرقہ زبانِ عدالت میں کسی تبدیلی کا خواہش مند نہیں ہے حالتِ موجودہ کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہے اس جدید تحریک سے اہلِ ہنود اور اسلام میں کچھ خلش پیدا ہو گئی ہے۔"

آگے چل کر یہی پنڈت جی لکھتے ہیں:

> "تاریخ اس امر کا پتہ نشان دیتی ہے کہ دیوناگری (ہندی) یا برج بھاشا راجپوتانے کی مادری زبان نہیں تھی۔ اگر ہو سکتی تھی تو مارواڑی زبان جے پوری (ڈھونڈھاری) مادری زبان۔ زبان کی تعریف میں داخل نہیں محض بول چال ہے۔ جے پور میں اہلِ ہنود کے بہت کم کنبے ایسے ہیں جن کی مستورات دیوناگری (ہندی) مادری زبان رکھتی ہوں اگر کوئی رکھتی بھی ہیں تو وہ یہاں متوطن نہیں ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ ان کی اصل مادری زبان جے پوری زبان سے واسطہ واتحاد نہیں رکھتی۔"

اس کے بعد پنڈت جی نے ان دقتوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا ہے جو دیوناگری رسم الخط کے رواج سے پیدا ہو جائیں گی:

"نام آوری کے لیے رعایا کو اکسانے کی تحریک اسی طرح کی گئی ہے کہ حکومت کو تو یہ دکھانا مقصود ہے کہ عام رعایا ہندی کی خواہشمند ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے کیوں کہ سبھا (ہندی پرچارنی سبھا) کے قائم ہونے سے قبل عام رعایا کی خواہش کا اظہار نہیں ہوا۔ اب رعایا کے دستخط لیے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف رعایا کو اس جہل بسیط میں مبتلا رکھا گیا ہے کہ ہماری کوشش عام لوگوں کے نفع اور فوائد پر مبنی ہے۔"

"میرے خیال میں ہندی کا سوال عدالت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہندی پرچارنی سبھا کے لیے بقائے دوام اور شہرت دوام کا اچھا خاصہ ذریعہ کامیابی اور ناکامیابی ہر دو صورتوں میں موجود ہے۔ لیکن یہ خیال کہ اس سے رعایا کی بہبودی ہے۔ نہایت لغو ہے۔ برخلاف اس کے اردو زبان میں اس وقت تک کاروبار جاری ہے اس کی وجہ سے کوئی ہرج اور رکاوٹ انصاف میں نہیں ہے۔ بے شک عام رعایا کی خواہش نہیں کہ زبان تبدیل کر دی جائے یا حرف بدل دیے جائیں۔

اس تحریر کا اختتام یوں ہوتا ہے:

"اگر اردو ہندی کا سوال ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کا ہو تو یہ ناواجب ہے کہ جے پور کی رعایا کے اتحاد و ارتباط میں خلل ڈال دیا جائے اردو ہندوستان کی زبان ہے دنیا کے اور کسی خطے میں رائج نہیں اہل ہنود نے پہلو بہ پہلو سینہ بہ سینہ اس میں کمال حاصل کیا ہے۔"

اس کے باوجود ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں فرقہ پرستی کا جو طوفان برطانوی ہند میں اٹھا اس کے زیر اثر عام لوگوں کی مرضی کے خلاف ۱۹۲۵ء میں اردو اور ہندی کو رسم الخط کی حد تک ہم پلہ قرار دے دیا گیا۔

۱۹۴۳ء تک عدالتوں میں اردو اور ہندی ہم پلہ رہیں مگر زبان کی حد تک تو اردو زبان ہی رائج رہی اور رسم الخط بھی زیادہ تر اردو ہی تھا۔ اردو زبان ایسی خوبیاں رکھتی ہے کہ ۱۹۴۳ء تک ریاست کے دفتروں میں غالب رہی ہر چند کہ دونوں رسم الخط جاری تھے اسی سن میں سر مرزا اسمٰعیل کا تقرر وزیر اعظم کی حیثیت سے جے پور میں ہوا یہ اس سے پہلے میسور کے وزیر اعظم تھے یہ صاحب کثرت رائے کے فیصلوں ہی کو جمہوریت سمجھتے تھے۔ ان کے آتے ہی زبان کا فتنہ پھر جاگا تو انھوں نے بقول مولوی صاحب "فوری انقلاب کو مناسب سمجھتے ہوئے ایک بزرگ پنڈت رامچندر شرما نے اس نیت سے مرن برت رکھا کہ جب تک ریاست جے پور کی عدالتوں، دفتروں اور مدرسوں میں اردو کی جگہ ہندی رائج نہ ہو جائے گی وہ برت نہ توڑیں گے اور جان دے دیں گے۔"

راجپوتانہ اور جے پور میں ہندو سبھاؤں نے شدت سے ان کی حمایت کی اور پرزور شورش پھیلائی سر مرزا نے اس دھمکی میں آکر ۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء کو ایک میمورینڈم شائع کیا جس کی معنوی خصوصیات کے علاوہ ظاہری خصوصیت یہ تھی کہ وہ جے پور ریاست کی قدیم روایات کے خلاف انگریزی اور دیوناگری میں چھپا تھا مگر اردو کا کہیں کوئی حرف نہ تھا اسی میمورینڈم کی (جو چھپتے ہی واپس لے کر تلف کر دیا گیا تھا) ہندی عبارت جو ایک اردو دوست ہمدرد افسر کے ذریعے ملی تھی اور مولوی صاحب کو اردو رسم الخط میں بھیج دی گئی تھی درج ہے:

میمورینڈم

تاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء

گورنمنٹ کے دفتروں اور عدالتوں میں استعمال ہونے والی لیپی کے سمبندھ میں گورنمنٹ سے حال میں بھودھا نویدن کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ موجودہ ویاستھا میں شریمان مہاراجہ صاحب بہادر کی ادھکانشک پرجا کو کٹھنائی ہوتی ہے۔

شریمان مہاراجہ صاحب کی گورنمنٹ جنتا کی واجب شکایتوں کے بارے میں مہانو بھتی کے ساتھ وچار کرنے کے لیے ہمیشہ اُتسک ہے۔

ابھی بھی دیو ناگری لیپی کے استعمال پر کسی بھی پرکار کی رکاوٹ نہیں ہے اور دراصل اس ریاست میں راجیہ کے ادھی کانش دفتروں اور عدالتوں میں یہ لیپی کام میں لائی جارہی ہے۔

شری مہاراجہ صاحب بہادر کی ادھی کانش پرجا دیوناگری لیپی استعمال کرتی ہے اس لیے گورنمنٹ کی یہ منشا ہے کہ تمام دفتر اور عدالتوں میں دیوناگری لیپی کا پریوگ کریں تاکہ سمبندھت جنتا کو کسی قسم کی اسودھا نہ ہو۔ مگر اس آرڈر کی منشا یہ نہیں ہے کہ یہ دیوناگری لیپی ٹھیک طرح نہ جاننے والوں کے لیے اردو لیپی استعمال کرنے پر کسی قسم کی رکاوٹ ہے۔"

جی پی بھٹاچاریا
فور چیف سیکریٹری ٹو دی گورنمنٹ آف جے پور

مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ "اس میمورینڈم میں اگرچہ یہ ظاہر کردیا گیا ہے کہ حکومت کی منشا دیوناگری حروف کے اجرا کی ہے لیکن کوئی صراحت ایسی نہ تھی جس سے اردو کو ممنوع قرار دیا جاسکے اس لیے حامیان ہندی اس سے پوری طرح خوش نہ ہوسکے بلکہ صرف انھیں اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ حوصلے بڑھ گئے اور انھیں یقین ہوگیا کہ شور و ہنگامہ اور برت کی دھمکی وغیرہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے کوئی مقصود بھی موجودہ جے پور گورنمنٹ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اور دباؤ ڈالا کچھ پبلک کے نام سے اور کچھ بااثر سرمایہ داروں کی درونِ پردہ ریشہ دوانیوں کے ذریعے بالآخر چند کاپیاں بااثر اور ہنگامہ کرنے والوں تک پہنچا کر ان کے ردِّ عمل کے خوف سے یہ میمورینڈم ضائع کر دیا گیا اور ہمیں اس کی نقل بصد دشواری حاصل ہوسکی) بالآخر جے پور گورنمنٹ کی کمزوری سے انھیں کامیابی ہوئی۔" (ادھر اردو رسم الخط نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں اور اردو کے حامی ہندوؤں کے ردِّ عمل کے خوف سے) حکومت کی طرف سے دوسرا نوٹ ۸ فروری ۱۹۴۳ء کو پبلسٹی افسر کے دستخط سے شائع ہوا اس میں انگریزی اس کے نیچے ہندی اور آخر میں اردو میں اعلان ہے۔" اس اعلان کی ایک کاپی شائع ہونے سے قبل ہی اُسی ذریعے سے جس سے پہلا میمورینڈم حاصل ہوا تھا پریس سے فوٹو کاپی کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ پہلے جن ذرائع کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے ذریعے حکومت کو یہ

معلوم ہوگیا کہ نقل اجرا سے قبل باہر نکل چکی ہے اور سارے انفرمیشن ڈپارٹمنٹ اور گورنمنٹ پریس کے عملے کو مورد الزام ٹھہرا کر انکوائری کی گئی مگر ثابت کچھ نہ ہوسکا اور یہ میمورینڈم جو اردو حروف میں بھی تھا درج ذیل ہے:

نوٹ

(مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۳ء)

"جے پور سرکار کے دھیان میں یہ بات لائی گئی ہے کہ راج کی طرف سے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں دیوناگری کے استعمال کے بارے میں جو حکم حال میں ایک میمورینڈم کے ذریعے لگایا گیا ہے اس میں آئے ہوئے لفظ "منشا" سے یہ مطلب صاف نہیں ہوتا کہ سرکار کا یہی فیصلہ ہے، پبلسٹی افسر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ظاہر کردے کہ اس تحریر کا صاف مطلب یہی ہے کہ سرکار کی یہی مرضی اور فیصلہ ہے۔"

"میمورینڈم کے آخری جملے میں آئے ہوئے لفظوں و "دیوناگری لپی ٹھیک طرح نہ جاننے والوں کے لیے" سے سرکار کا مطلب یہ ہے کہ جلدی سے جلدی سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں دیوناگری کا عام استعمال ہونا چاہیے۔"

مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ "احکام بالا اور تصریحات کو دیکھ کر ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ محض ابن الوقت حکومت ہے جو "گپت عبارتوں" اور مبہم الفاظ کے ذریعے اردو دانوں کو طفل تسلی دینا اور ناگری والوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔ ادھر اردو کے بھی خواہ یہ سمجھیں کہ اردو کے استعمال کی ممانعت نہیں ہے ادھر فرقہ پرست ناگری پرچارک اپنا کام کرتے رہیں۔" اور صراحت کے ساتھ یہ مطلب بیان کیا جائے کہ اردو حروف کی ممانعت ہوگئی۔

جو واقعات اور تشریحات مولوی صاحب نے اس کتابچے میں پیش کی ہیں کے مد نظر بقول مولوی صاحب "ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ محض ابن الوقت حکومت ہے جو "گپت عبارتوں" اور مبہم لفظوں کے ذریعے اردو والوں کو طفل تسلیاں دینا اور ناگری والوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے حکومت جے پور کی ان کارروائیوں سے جے پور اور بیرون جے پور اردو دنیا میں پریشانی پیدا ہوئی۔"

اس کے بعد بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے اپنے ایک نمائندے سید صلاح الدین جمالی صاحب کو ایک خط لے کر بھیجا جو سر میرزا اسمٰعیل کے نام تھا وہ جے پور گئے ان سے ملے خط ان کو دیا اور اس قضیے کے سلسلے میں انجمن اور مولوی صاحب کے تاثرات سے آگاہ کیا۔ اس خط اور ترجمے کی ایک نقل الگ مع سر مرزا اسمٰعیل کے سیکریٹری کے ایک خط کی نقول کے جو اس مقالے کے ساتھ منسلک ہیں جن سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ مولوی صاحب نے ریاست اور اس کے وزیراعظم کی فریب کاریوں کو پوری طرح بے نقاب کردیا ہے یہ خط ۱۰ فروری کو پیش کیا گیا۔ سر مرزا اسمٰعیل نے وعدے کے مطابق پبلسٹی افسر کا وہ نوٹ جو مولوی صاحب کو پہلے ہی مل چکا تھا اور جس کا ذکر انھوں نے کسی وجہ سے نہیں کیا تھا کہ ایسا کرنے سے اردو کے کچھ بھی خواہوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اپنے سیکریٹری کے خط کے ساتھ مولوی صاحب کو بھیجا اس نوٹ کی نقل بھی مسٹر ڈی کرسٹا کے خط کے ساتھ منسلک ہے۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"تلف کردہ اور بعد کے شائع شدہ نوٹوں کے آخری جملے قابلِ غور ہیں اردو والوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کے لیے اپنے منشا کو اس پیرائے سے بیان کیا ہے کہ سرسری طور پر پڑھنے سے کچھ فرق نہ معلوم ہوگا۔ تلف شدہ نوٹ میں لکھا ہے:

"جو لوگ دیوناگری حروف سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ سرکاری عدالتوں اور دفتروں کے کاموں میں اردو حروف استعمال کر سکتے ہیں۔"

اس کے بعد جو نوٹ شائع کیا اس میں یہ الفاظ ہیں:

"وہ لوگ جو دیوناگری سے واقف نہیں ہیں سرکاری کاموں میں اردو حروف استعمال کر سکتے ہیں۔"

ان دونوں میں بہت فرق ہے اور بڑی عیاری سے کام لیا گیا ہے پہلے نوٹ کے تلف کرنے کے کیا معنی؟ پہلے جملے کا مطلب ہے کہ جو لوگ دیوناگری پر اس قدر قدرت نہیں رکھتے کہ عدالتی اور دفتری کام کر سکیں اس میں اردو والوں کے لیے ایک سہولت نکلتی ہے۔ لہٰذا اسے منسوخ کر کے دوسرا جملہ تحریر کیا گیا ہے یعنی "جو لوگ دیوناگری سے واقف نہیں ہیں ظاہر ہے محض حروف شناسی دفتری کاموں کے لیے ضروری نہیں ہے لہٰذا تقریباً سب اہل کار سرکاری کام دیوناگری میں کرنے کے لیے مجبور ہیں۔"

مولوی صاحب اپنے خاص انداز میں ان سرکاری نوٹوں یا نوٹسوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مندرجہ بالا احکام کے بعد جن میں سے بعض متن و شرح اور بعض ناسخ و منسوخ کا درجہ رکھتے ہیں افسران سررشتہ نے دفتر میں اردو حرفوں کے استعمال کی آفس آرڈروں کے ذریعے ممانعت کر دی۔"

اس کے بعد مولوی صاحب نے سر مرزا اسمٰعیل سے اپیل کی ہے کہ وہ اس معاملے میں انصاف کو مد نظر رکھیں اور آخر میں واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ اردو ان کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی چنانچہ ۱۹۴۷ء تک جے پور کی عدالتوں اور دفتروں میں اردو زبان ہی دیوناگری میں لکھی جاتی تھی۔

سر مرزا نے جے پور میں بعض اچھے کام بھی کیے تھے لیکن اس ایک اقدام نے ان کو جے پور کے اصل ہندوؤں اور مسلمانوں میں نامقبول کر دیا اور ان کے وہاں سے حیدر آباد جانے میں اس اقدام کو بھی ایک وجہ سمجھا گیا اور ان کو بے نقاب کرنے میں بابائے اردو کے معرکے کا بڑا اثر تھا۔

ریاستِ جے پور

اور

اُردُو زبان

شایع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردُو [ہند] دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء
(جیّد پریس دہلی)

میمورنڈم

تاریخ ۲۸ ر جنوری ۱۹۴۳ء

"گورنمنٹ کے دفتروں اور عدالتوں میں استعمال ہونے والی لپی کے سمبندھ میں گورنمنٹ سے حال میں بہودھا نویدن کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ موجودہ ویاستھا میں شریمان مہاراجا صاحب بہادر کی ادھیکانش پرجا کو کٹھنائی ہوتی ہے۔

شری مہاراجا صاحب بہادر کی گورنمنٹ جنتا کی واجب شکایتوں کے بارے میں ہانوبھوتی کے ساتھ وچار کرنے کے لیے ہمیشہ اتسک ہے۔

ابھی بھی دیوناگری لپی کے استعمال پر کسی بھی پرکار کی رکاوٹ نہیں ہے اور درحقیقت اس ریاست میں راجیا کے ادھیکانش دفتروں اور عدالتوں میں یہ لپی کام میں لائی جاتی ہے کیونکہ شری مہاراجا صاحب بہادر کی ادھیکانش پرجا دیوناگری لپی استعمال کرتی ہے۔

اس لیے گورنمنٹ کی یہ منشا ہے کہ تمام دفتر اور عدالتوں میں دیوناگری لپی کا پریوگ کریں تاکہ سمبندھت جنتا کسی قسم کی اسوبیدھا نہ ہو۔ مگر اس آرڈر کی منشا یہ نہیں ہے کہ دیوناگری لپی ٹھیک طرح نہ جاننے والوں کے لیے اردو لپی استعمال کرنے پر کسی قسم کی رکاوٹ ہے

بی۔ جی۔ بھٹیاچاریا

فور چیف سکریٹری ٹو دی گورنمنٹ آف جے پور

نوٹ

(مورخہ ۸ر فروری ۱۹۴۳ء)

"جے پور سرکار کے دھیان میں یہ بات لائی گئی ہے کہ راج کی طرف سے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں دیوناگری کے استعمال کے بارے میں جو حکم حال میں ایک میمورنڈم کے ذریعے نکالا گیا ہے، اس میں آئے ہوئے لفظ "منشا" سے یہ مطلب صاف نہیں ہوگا کہ سرکار کا یہی فیصلہ ہے، پبلسٹی افسر کو یہ اختیار دیا گیا کہ یہ ظاہر کر دے کہ اس تحریر کا صاف مطلب یہی ہے کہ سرکار کی یہی مرضی یا فیصلہ ہے۔"

میمورنڈم کے آخری جملے میں آئے ہوئے لفظوں "دیوناگری لپی ٹھیک طرح سے نہ جاننے والوں کے لیے" سے سرکار کا مطلب یہ ہے کہ جلدی سے جلدی سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں دیوناگری کا عام استعمال ہونا چاہیے۔

پبلسٹی آفیسر

۸ر فروری ۱۹۴۳ء

Phone
6290

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
I, Daryaganj, Delhi,
8th February 43.

Dear Sir Mirza,

Excuse me for troubling you, but such an agitation has flared up in Urdu circles regarding the reported decision of your Government to replace Urdu by Hindi and Devnagri script throughout Jaipur State (cutting from 'Hindustan Times' dated 6/2/43. herewith enclosed), that I had to send the bearer of this letter, Mr. Syed Salahuddin Jamali, as representative of the Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India) to Jaipur to make enquiries on the spot and try to see you personally and impress upon the Jaipur Government, as far as possible how impolitic, not to say risky, any such action may prove to be. For a long time Urdu enjoyed the distinction of being the court language in Jaipur which was known to be as one of the centres of the so called common Indo-Muslim culture as well as of Urdu poetry in Rajputana. Why it should turn against an all-India language built up by the united efforts of Hindus and Muslims of this country and having very great literary potentialities for future development is an unpleasant dilemma which I find myself unable to solve. Even assuming that it is a communal problem (which it is certainly not) I fail to see how any Government in India that have to rule a mixed population could afford to lean towards a particular community without incurring the resentment of others. I must say that if the facts are such as some newspaper reports would lead us to believe then Jaipur may well prepare itself to weather a storm which will not be localised and may very well take the shape of an all-India agitation.

Yours sincerely,
Abdul Haq.

Sir Mirza Ismail, Kt.,
Prime Minister, Jaipur State,
Jaipur.

ڈاکٹر عبدالحق آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)
کا خط بنام
آنریبل سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب دیوان ریاست جے پور

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

۹ ر فروری ۱۹۴۲ء

ڈیر سر مرزا

مجھے تکلیف دہی کے لیے معاف فرمائیے گا۔ اردو دنیا میں آپ کی حکومت کے اس مبینہ فیصلہ سے کہ تمام ریاستِ جے پور میں اُردو کی بجائے ہندی اور دیوناگری حروف جاری کر دیے جائیں" ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے، اخبار ہندستان ٹائمز دہلی مورخہ ۶ ر فروری ۱۹۴۲ء کا تراشہ اِس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ اس ہیجان کی وجہ سے میں حامل مکتوب مولوی سید صلاح الدین صاحب جمالی کو انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے بھیج رہا ہوں تاکہ وہاں مقامی طور پر تحقیقات کریں اور آپ سے ملاقات کر کے آپ پر اور آپ کی حکومت پر جہاں تک ممکن ہو سکے پوری طرح واضح کر دیں کہ اس قسم کا اقدام کس طرح غیر سیاسی اور خطرناک ثابت ہوگا۔

ایک مدت سے اُردو کو جے پور میں سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہا ہے، راجپوتانہ میں ہندی اسلامی تہذیب اور اُردو شاعری کا مرکز جے پور ہی کو کہا جاتا ہے۔ کیا سبب ہے کہ جے پور ایک ایسی عام کُل ہند زبان کے خلاف عمل پیرا ہو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے بنی اور مستقبل میں ادبی ترقیوں کی گوناگوں صلاحیتیں رکھتی ہے، یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے میں حل نہیں کر سکتا۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ ایک فرقہ وارانہ مسئلہ ہے (حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے) پھر بھی میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندستان کی کوئی حکومت جس کی رعایا میں مختلف فرقے موجود ہوں بغیر دوسرے فرقے کو نقصان پہنچائے کس طرح کسی ایک فرقے کی جانبداری کر سکتی ہے۔

اگر واقعہ یہی ہے جیسا کہ مختلف اخبارات سے معلوم ہوتا ہے تو میں یہ باور کرنے پر مجبور ہوں کہ جے پور ایک ایسے ہنگامے سے دوچار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے جو مقامی نہیں بلکہ ایک کُل ہند ایجیٹیشن کی صورت اختیار کرے گا۔

آپ کا مخلص

عبدالحق

نوٹ

مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۴۳ء

(جو بعد طباعت منسوخ کر دیا گیا)

چوں کہ جے پور گورنمنٹ کی توجہ اس طرف دلائی گئی ہے کہ بعض حلقوں میں میمورنڈم مورخہ

۲۸ر جنوری ۱۹۴۳ء اور نوٹ پبلسٹی آفیسر مورخہ ۰ فروری ۱۹۴۳ء کا یہ غلط مطلب نکالا جا رہا ہے کہ ان کے ذریعے سے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو حروف کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے، اس لیے یہ صاف کر دینا ضروری ہے کہ جملہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو حروف کے استعمال پر کسی قسم کی روک لگانے کا منشا نہیں ہے اور نہ یہ منشا ہے کہ اردو حروف میں لکھا ہوا کوئی کاغذ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں صرف اس لیے نہ لیا جاوے کہ وہ اردو میں لکھا ہوا ہے۔

میمورنڈم مذکورۂ بالا میں صاف طور پر منشا ہے کہ جو لوگ دیوناگری حرفوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، وہ سرکاری عدالتوں اور دفتروں کے کاموں میں اردو حروف استعمال کر سکتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دیوناگری حروف عام طور سے استعمال ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے کہ صرف یہی حروف کام میں آویں گے

تاریخ ۱۲ر فروری ۱۹۴۳ء

پبلسٹی آفیسر جے پور

No. 375/G.R./P.M.C.

جے پور

۱۳/۱۹ فروری سنہ ۱۹۴۳ء

ڈیر مسٹر حق

مجھے وزیر اعظم نے ہدایت کی ہے کہ آپ کے خط مورخہ ۸ فروری کی رسید دیتے ہوئے
آپ کو مطلع کروں کہ وزیر اعظم کے خیال میں آپ کا خط غلط فہمی پر مبنی ہے ریاست کے
دفاتر اور عدالتوں میں اردو حروف کے ممنوع قرار دینے کا کوئی خیال نہیں ہے۔

میں اس خط کے ساتھ آپ کی اطلاع کے لیے ایک کاپی اس نوٹ کی بھیج رہا ہوں
جو پبلسٹی آفیسر کی طرف سے شایع کیا جا رہا ہے، مجھے امید ہے کہ اس نوٹ سے اس مسئلے
سے متعلق تمام غلط فہمیاں صاف ہو جائیں گی۔

اس خط کے ساتھ آیا ہوا نوٹ

نوٹ

مورخہ ۱۵ فروری سنہ ۱۹۴۳ء

گورنمنٹ میمورنڈم مورخہ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء اور نوٹ پبلسٹی آفیسر مورخہ ۸ فروری سنہ ۱۹۴۳ء کا

کچھ حلقوں میں یہ غلط مطلب نکالا جا رہا ہے کہ اُن کے ذریعے سے سرکاری دفتروں اور عدالتوں
میں اردو حروف کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے اس لیے یہ صاف کر دینا ضروری ہے کہ
سرکار کا ارادہ دفتروں اور عدالتوں میں دیوناگری عام طور سے استعمال ہونے والے حروف
بنانے کا ہے لیکن اردو حروف میں لکھے ہوئے کوئی کاغذات اس بنا پر نامنظور نہیں کیے
جائیں گے کہ وہ اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔

میمورنڈم مذکورۂ بالا میں صاف طور پر مندرج ہے کہ وہ لوگ جو دیوناگری حرفوں
سے واقف نہیں ہیں وہ سرکاری کاموں میں اردو حروف استعمال کر سکتے ہیں۔

تاریخ ۱۵ فروری سنہ ۱۹۴۳ء

پبلسٹی آفیسر جے پور

غالب کے دو شعر

شان الحق حقی

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

یہ عمرِ انسانی کے مختصر ہونے اور مرگِ طبعی کا ذکر ہے، جان بازی سے فرار یا سر فروشی سے گریز نہیں۔ موت سے خائف ہونا زندگی سے گہرے لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے، اور اگرچہ شاعر نے اسے اپنے ذاتی قول یا اپنے تجربے کے طور پر باندھا ہے، لیکن یہ زندگی کی ایک عام حقیقت ہے کہ انسان موت سے خائف رہتا ہے۔ مقابلے کے لیے دیکھیں کیٹس کی نظم "TERROR OF DEATH" جس کا میں نے منظوم ترجمہ کیا تھا (خوفِ مرگ)

یاد آتا ہے مجھے جب اپنا وقتِ واپسیں
سہمتا ہوں جب خیالِ مرگِ بے ہنگام سے
سوچتا ہوں ناشگفتہ ہی نہ رہ جائیں کہیں
یہ شگوفے آہ میرے گلشنِ تخئیل کے
پھونک دے برقِ فنا شاید مری کشتِ حسیں
پیشتر اس سے کہ میرا خامہ گلچینی کرے .... الخ

زندگی کے ساتھ گہرا لگاؤ غالب کی شاعری کا عام مزاج ہے۔ وہ اس کے تمام عیش و غم کے ساتھ اسے مٹانے کے قائل ہیں اور رہنے کی جگہ زندگی کو استقامت کے ساتھ برتنے اور بھگتنے کے حوصلے ہی کا دم بھرتے ہیں اس غزل کے مطلع سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے:

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

مردانگی یہ نہیں کہ نومید ہو کر جان دے دی جائے، بلکہ غم و آلام کو جھیلا جائے۔ بقول میر:

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یا بقول غالب:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

بلکہ یہ مضمون غالب کی تمام شاعری میں گھلا ملا ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذّت آزار بھی نہیں
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

غالب کا شکوہ یہی ہے کہ ہم تو زندگی کو اس کی تمام آزمائشوں کے ساتھ ہی بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر فرصتِ ہستی بہت محدود ہے۔ موت کا سایہ جو سر پر ہر وقت منڈلا رہا ہے اس بطن حیات میں کھنڈت ڈال دیتا ہے۔ خوف جو ہے وہ مرنے کا نہیں ان آزمائشوں سے محروم ہو جانے کا ہے جن سے زندگی عبارت ہے اور ہم ان سے نبٹنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غالب نے موت کا "دھڑکا" نہیں "کھٹکا" کہا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ دھڑکا سہم کو ظاہر کرتا ہے۔ کھٹکا صرف خدشہ ہے خوف نہیں۔ نہ معلوم موت کب آجائے اور سارے مشاغل دھرے رہ جائیں جن سے ہم نے دل لگایا ہے۔ خصوصاً کاروبار عاشقی جو آزمائشوں کا ایک سلسلہ ہے مضمون غزل کے قافیے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ "زرد" کے قافیے سے جس مضمون کی طرف غالب کا خیال راغب ہوا وہ ان کی عام روش خیال کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲)

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

سوال یہ ہے کہ غالب دھول دھپے میں پہل کر بیٹھے تھے یا یہ کوئی اور حرکت یا حد سے تجاوز تھا جس پر اُس کی طرف سے اس

دھول دھپے کی پہل ہوئی۔ بظاہر غالب ہی کی طرف سے دھول دھپے کی پہل ہوئی۔ دوسرا سوال یہ کہ اُس کو "سراپا ناز" کیوں کہا گیا یہ محض بھرتی کا لفظ ہے، لیکن جب تک اس کے مفہوم اور استعمال کے جواز پر غور نہ کر لیا جائے۔ فالتو قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس سے شعر کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ کہ غالب کی طرف سے دھول دھپے کی نوبت اس کے نخوت زدہ ہونے ہی کی بنا پر آئی جسے غالب سہار نہ سکے اور ایک اضطراری کیفیت میں ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ مگر وہ تو سراپا ناز ہی ٹھہرا، کیوں کر سہہ جاتا۔ جواب دیا ور وہ بھی سیر کو سوا سیر۔ کاروبار عاشقی میں دبنا عاشق ہی کو پڑتا ہے اور محبوب ہی وار رہتا ہے۔

مطلع بھی اسی مزاج کا ہے اور اس سے بھی اسی مضمون کو تقویت ملتی ہے:

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

جو سراپا ناز ہوگا وہ آسانی سے خالیٔ بالطبع نہ ہوگا۔ غالب چاہتے تھے کہ وہ کُھل کر ملے۔ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ غالب کا محبوب کوئی رئیس صاحب دربار یا رئیس زادہ نہ تھا۔ جس پر ہاتھ اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔ فقط محبوب ہی تھا۔ مضمون عام مطالب غزل سے ہٹا ہوا اچھوتا اور چونکا دینے والا ہے۔

کیٹس کی نظم جس کا ذکر اوپر آیا۔ اپنی جگہ ایک بڑی دلنشین اور برگزیدہ نظم ہے اس کے باقی بند بھی دوہرانے کے قابل ہیں:

دیکھتا ہوں جب گھنے تاروں کی سیمیں چھاؤں میں
دور پُرحیرت رفیع الشان رومانوں کے خواب
سوچتا ہوں دیکھیے کب ان کی تعبیریں ملیں
کھول سکتا کاش ان موہوم افسانوں کے باب

...........*****............

اور جب یہ سوچتا ہوں اے مری تسکینِ جاں
ڈھل اک دن ہے تجھ پر بھی نگاہ آخری
آہ پھر الفت کا یہ آغوش فردوسی کہاں
خاک میں مل جائے گا اک دن یہ کیفِ عشق بھی

...........*****............

تب میں ساحل پر محیط دہر کے تنہا کھڑا
دُور ہو کر این و آں سے غور کرتا ہوں ذرا
رفتہ رفتہ محو ہو جاتا ہے ہر سود اے خام
ہیچ رہ جاتے ہیں سب، کیا عشق کیا پروائے نام

...........*****............

یہ وہی مضمون ہے جسے بہادر شاہ ظفر نے خلاصتہً یوں باندھا ہے:

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچمداں ہیچ

اس کے برخلاف غالب مصر ہیں:

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

انجمن کے معتمدِ اعزازی جناب جمیل الدین عالی کے مکان کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے

نیا پتہ یہ ہے

A۶۰۲ - بون وستا اپارٹمنٹ

L-F۱۴ - بلاک ۲، شفا کلفٹن کراچی

قومی زبان (۴۱) اکتوبر ۱۹۹۳ء

غالب کا وہی شعر

افتخار احمد عدنی

اپنی قہقہہ انگیزی اور فکر افروزی کے ساتھ

آج بروز پیر، بتاریخ ۵ جولائی ۱۹۹۳ء دن کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے امتیازی صاحب نے مجھے فون کیا۔ وقت، دن اور تاریخ کی اہمیت اس لیے ہے کہ جس طرح میرے غالب شناس دوست نے کلامِ غالب میں اپنے شیوۂ قہقہہ اندازی کے جواز میں ایک شعر تلاش کیا تھا، اسی طرح امتیازی صاحب نے فون کر کے میری وہ مشکل آسان کر دی جس پر میرے غالب شناس دوست نے مجھے مامور کیا تھا۔ جب غالب کے دو مصرعوں میں وہ خاطر خواہ ربط تلاش نہ کر سکے تو انھوں نے تنگ آ کر کہا تھا۔ شعر میں نے دریافت کر لیا ہے۔ معنی تم دریافت کرو۔

امتیازی صاحب ایک نہایت ثقہ اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ کسی مسئلے کے ہر ممکن پہلو کا جائزہ لیے بغیر اس پر اظہارِ خیال نہیں کرتے۔ چنانچہ انھوں نے غالب کے اس شعر کو ہر زاویے سے دیکھا۔

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقت قہقہہ

کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے

اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہاتھ پر ہاتھ مارنے کا مفہوم کسی صورت میں بھی تالی بجانا نہیں لیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں وہ اردو کی لغات کو چھان چکے تھے۔ ان کے خیال میں غالب جیسے قادر الکلام شاعر کے لیے یہ کون سی مشکل بات تھی کہ وہ بجائے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی بے ڈھب ترکیب کے سیدھے سیدھے تالی بجانے کا ذکر کر دیتے۔ میں نے کہا یہ تو آپ نے بڑے پتے کی بات کہی۔ انھوں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اگر بفرضِ محال یہ مان لیا جائے کہ ہمارے یار نے بوقت قہقہہ تالیاں بجائیں تو پھر ایک اہم سوال یار کی جنس کے تعین کا پیدا ہوتا ہے۔ آج سے پونے دو سو سال پہلے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی شائستہ خاتون غالب کے سامنے قہقہے لگاتی اور تالیاں بجاتی۔ یہ عمل اس زمانے کی تہذیبی اقدار کے منافی ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے میں اہلِ ذوق گانا سننے کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے تھے اور ان کے لیے قہقہے لگانا اور تالیاں بجانا ایک عام سی بات تھی۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی طوائف کے ایک عام سے بزم آرائی کے طریقے پر چاند اتنا خوش کیوں ہوتا کہ وہ جگنو کی طرح ایک متوازن چال سے اپنی روشنی کی جھلکیاں دکھاتا ہوا فضا میں پرواز کرتا۔

امتیازی صاحب کی توجہ چونکہ حقی صاحب کی تشریح پر مرکوز تھی اس لیے انھوں نے کہا کہ اگر حقی صاحب یہ کہیں کہ تالی

بجانے والی کوئی طوائف نہیں بلکہ غالب کی محبوبہ تھی تو ان کے اپنے ہی استدلال سے اس کی نفی ہوجاتی ہے۔ انھوں نے کہا "کسی اور کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا آداب محبت اور آدابِ مصاحبت کے خلاف تھا" اگر یہ بات ہے تو ایک محبوبہ کا قہقہہ لگانا اور وہ بھی تالیاں بجا سکے اور بھی زیادہ آداب محبت کے خلاف ہے۔ اگر غالب کا محبوب قہقہے لگانے والا ہوتا تو غالب کا کلام قہقہوں سے پُر ہوتا اور ہمارے غالب شناس دوست اس شعر کو ایک دریافت کا مرتبہ نہ دیتے۔ غالب کی محبوبہ تو صرف تبسم یا خندہ زیر لب پہ اکتفا کرتی تھی۔ غالب کے لیے تو اس کا تبسم ہی قیامت تھا۔

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

یہاں تو تبسم میں بھی اتنی احتیاط ہے کہ صرف تبسم کا شائبہ نظر آتا ہے جسے غالب تبسم پنہاں کہتے ہیں۔ اب اگر غالب نے یار کا لفظ نہ محبوبہ کے لیے استعمال کیا ہے نہ کسی طوائف کے لیے تو پھر آخر وہ کون ہے جو قہقہے بھی لگائے اور ساتھ ہی تالیاں بھی بجائے۔ اس قسم کی حرکت تو کوئی مخنّث ہی کر سکتا ہے لیکن کسی مخنّث کو غالب کا یار قرار دینا ایسی بڑی گستاخی ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ غالب کا یار کوئی مرد ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارنا اور قہقہے لگانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ لیکن اس بے تکلفی کی اجازت غالب کسی البیلے الھڑ، کم سمجھ نوجوان کو تو دے سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے تکلفی کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا تھا جو غالب کے نزدیک اس بے تکلفی کا حقدار ہو۔ جو ان کے اشعار کو سمجھتا ہو، جو ان کے برمحل استعمال پر قدرت رکھتا ہو، جو ان کے اشعار میں ایسے مطالب نکال کے غالب کو حیران کر دیتا ہو، جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ اور جو ہاتھ پہ ہاتھ مار کے داد وصول کرتا ہو۔ چنانچہ میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہاں یار کا لفظ محبوب کے لیے نہیں بلکہ دوست کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اب آپ یہ مصرعہ پڑھیے۔ "ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقت قہقہہ" کیا یہ مصرعہ ہمارے غالب شناس دوست پر نہیں ہے۔ کوئی اُن جیسا غالب کو مل گیا ہوگا۔ اور اسی پر غالب نے یہ شعر کہا ہوگا۔ یہ تشریح سُن کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے کہا سبحان اللہ آپ کا تجزیہ اور استدلال کمال کا ہے۔ آپ نے جنس اور عمر کے تعین کے جو نکتے اٹھائے ہیں ان کا جواب نہیں ہے۔ یہ تو طے ہوگیا کہ پہلا مصرعہ صرف ہمارے غالب شناس دوست یا ان کے کسی پیش رو پر کہا گیا ہے، اب صرف مرحلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے دوسرے مصرعے سے کیا ربط ہے۔ انھوں نے کہا یہ کام میں آپ پر چھوڑتا ہوں، غالب شناسوں پر مضامین لکھنے کی وجہ سے کچھ غالب شناسی کا بوجھ آپ کو بھی اٹھانا چاہیے۔

یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ میرے غالب شناس دوست نے شعر کی دریافت پر سارا زور پہلے مصرعے پر دیا اور دوسرے مصرعے کے مفہوم کا تعین مجھ پر چھوڑ دیا اور اسی طرح حقی صاحب کے بیان کردہ مطلب سے اختلاف کرتے ہوئے امتیازی صاحب نے غضب کا تجزیہ کیا لیکن اُسے صرف پہلے مصرعے تک محدود رکھا اور دوسرے مصرعے تک اس کے منطقی نتیجے کو لے جانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔

اب میں اسلم فرخی صاحب کی ترجمانی کرتے ہوئے اس شعر کا وہ مطلب بیان کرتا ہوں جو انھیں پسند ہے، میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اسے لکھ ڈالیں۔ لیکن وہ وعدہ کرنے کے باوجود ابھی تک لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ غالباً حقی صاحب کے احترام میں اُن سے اختلاف کرنے سے احتراز کر رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی ترجمانی کی خدمت مجھے تفویض کردی ہے۔

اسلم فرخی صاحب کا خیال ہے کہ اس شعر میں تالی بجانے کا ذکر نہیں ہے، اس میں ہمارے غالب شناس دوست کی طرح ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی بات ہے۔ یار جب انبساط کے عالم میں ہنستے ہوئے غالب کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتا ہے، تو چاند جو خود ان کے محبوب کی محبت میں گرفتار ہے اس منظر کی تاب نہیں لاسکتا۔ چنانچہ وہ جگنو کی طرح اپنا روشن چہرہ چھپا لیتا ہے۔ جس رشک نے اسے چہرہ چھپانے پر مجبور کیا تھا وہی رشک اسے دوبارہ اس منظر کو دیکھنے کے لیے بے اختیار کردیتا ہے وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ محبوب غالب کو چھوڑ کے چلا گیا یا اسی طرح ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسنے میں مشغول ہے۔ رشک کی اس اضطراری کیفیت کو جو جگنو کی طرح چاند کو بے نور اور روشن کرتی رہتی ہے غالب نے پر افشانی سے تعبیر کیا ہے۔ اسلم فرخی صاحب کے بتائے ہوئے مطلب کو ہمارے غالب شناس دوست نے بہت پسند کیا۔ اب صورت یہ ہے کہ وہ اس شعر کی شرح لکھنے میں خود مصروف ہیں۔ معلوم نہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ فرخی صاحب سے اتفاق کرتے ہیں یا حقی صاحب سے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میری درخواست پر مشفق خواجہ صاحب بھی اس شعر کی تشریح پر آمادہ ہوگئے تھے۔ پہلے انھیں تالی بجانے کے مفہوم پر سخت اعتراض تھا، لیکن اب انھوں نے اُسے تسلیم کرلیا ہے۔ اور انھوں نے بھی مجھے ہی اس بات پر مامور کیا ہے کہ جو مطلب وہ سمجھے ہیں اُسے میں سپردِ قلم کردوں لیکن وہ مطلب میں سب سے آخر میں بتاؤں گا، کیونکہ وہ بہت منفرد ہے۔

اب میں امتیازی صاحب کی تشریح کی طرف لوٹتا ہوں۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا تھا کہ یار کا تعلق صنفِ نازک سے نہیں ہے۔ یار مرد ہے لیکن کوئی الھڑ کم عقل نوجوان نہیں ہے، بلکہ ایک باشعور، شعر فہم، زندہ دل اور قہقہہ انداز غالب شناس ہے۔ وہ غالب سے ملتا ہے، مالی مشکلات نے جن سے غالب تمام عمر گھرے رہے انھیں افسردہ کردیا ہے۔ وہ لطیفے سنا کے انھیں بحال کردیتا ہے، جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ زندگی کے ہر غم کا مداوا ان کے کسی شعر سے کرتا ہے، وہ اس کی غالب شناسی پر حیران رہ جاتے ہیں وہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش انھیں بھی اپنے اشعار کو سمجھنے کی ایسی صلاحیت مل جاتی وہ غالب کے احساس محرومی کو دور کرنے کے لیے خوش دلی سے قہقہے لگاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ہاتھ پہ ہاتھ مارتا ہے، اس کے قہقہے غالب کے خون کی گردش تیز کردیتے ہیں، جب وہ ہاتھ پہ ہاتھ مارتا ہے تو توانائی کی ایک برقی رو ان کے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ غالب جو اپنے محبوب سے یہ شکایت کرتے تھے کہ، "بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات" یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس نووارد کے قہقہوں کی گونج نے ان کے ثقلِ سماعت کا علاج کردیا، جب وہ ہاتھ پہ ہاتھ مارتا ہے تو وہ بجائے یہ شکوہ کرنے کے کہ، گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے، یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ ہاتھ بڑھا کے جام اٹھا لیتے ہیں اور خوش ہو کے کہتے ہیں "سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں۔" اس غالب شناس کی آمد ان کی ہر محرومی کا مداوا ہوگئی۔ اس پس منظر میں اب دیکھیے کہ اس مصرع کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے چاند جو چشمِ فلک ہے مسلسل غالب جیسے نابغۂ روزگار کو دیکھتا رہتا ہے کیونکہ صدیوں کے بعد ایسی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ وہ شخص جس کے رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ حاکمانِ وقت کی ذرا سی بے رخی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جو بندگی میں بھی اس قدر آزاد و خودرو تھا کہ درِ کعبہ بند ہو تو الٹے قدم واپس آجاتا تھا آخر وہ کس طرح ایک نووارد کو اس بات کی اجازت دے رہا ہے کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ کے قہقہے پر قہقہے لگائے اور ساتھ ہی ہاتھ پہ ہاتھ مارتا جائے۔ یہ منظر اتنا غیر متوقع ہے کہ چاند حیرت سے اپنی آنکھ بند کرلیتا ہے چاند کے آنکھ بند کرتے ہی تاریکی ہوجاتی ہے۔ پھر یہ خیال کر کے کہ شاید وہ منظر ایک واہمہ ہو وہ آنکھ کھولتا ہے، دنیا روشن ہوجاتی ہے پھر وہی منظر نظر آتا ہے تو حیرت سے آنکھ بند

کر لیتا ہے۔ جب تک یہ غالب شناس نوادر غالب کے پاس بیٹھا قہقہے لگاتا رہتا ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ مارتا رہتا ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ مار کے داد وصول کئے جاتا ہے چاند کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آتی وہ پٹ بیجنے کی طرح آنکھ بند کرتا اور کھولتا رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ آپ یہ اعتراض کریں کہ یہ غزل غالب نے ۱۸۱۶ء میں کہی تھی اور ہمارے غالب شناس دوست کی پیدائش میں ایک صدی سے زیادہ کا وقفہ باقی تھا اور ثقل سماعت اور ہاتھ میں جنش نہ ہونے کی شکایت غالب کے آخری حصہ عمر کے عوارض تھے تو آپ کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ شاعر کا ضمیر ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں مستقبل کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے اپنی اس مشہور غزل میں جس کے ذریعے انھوں نے اپنے آنے والے زمانے میں اپنی مقبولیت کا اعلان کیا تھا قیامت تک پیش آنے والے واقعات کا ذکر کر دیا ہے۔ ان کے لیے اپنے آخری ایام کی بیماریوں اور پونے دو سو سال بعد اپنے کمال کو پہنچنے والے غالب شناس کا مشاہدہ کیا دشوار تھا۔ غالب نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ وہ دوست جو قہقہہ لگا کے ہاتھ پہ ہاتھ مارے گا ابھی موجود نہیں ہے۔ اس کے آنے میں کافی وقت باقی ہے۔ اگر وہ دوست موجود ہوتا تو غالب پہلا مصرعہ یوں کہتے "ہاتھ پر جب ہاتھ مارے یار وقت قہقہہ" لیکن چونکہ ابھی دوست کا وجود نہاں خانۂ امکان میں تھا اس لیے انھوں نے "گر" کا لفظ استعمال کر کے ایک تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود انھیں یہ یقین تھا کہ اس تمنا کے بر آنے کی صورت میں چاند اس حیرت انگیز منظر پر کبھی آنکھ بند کرے گا اور کبھی کھولے گا۔

خدا کرے دوسرے مصرعے کی یہ تعبیر امتیازی صاحب کی طبع نازک پر گراں نہ ہو۔

اب میں مشفق خواجہ صاحب کی تشریح بیان کرتا ہوں پہلے تو انھیں حقی صاحب کے بیان کردہ مطلب سے سخت اختلاف ہوا۔ انھوں نے کہا ہاتھ پہ ہاتھ مارنا کب سے تالی بجانے کا مترادف ہو گیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو آئندہ لوگ یہ کہا کریں گے کہ جلسے میں فلاں مقرر کی تقریر سے متاثر ہو کے سب نے ہاتھ پہ ہاتھ مارنا شروع کر دیے یعنی خوب تالیاں بجائیں اور جب تقریر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی تو پاکستان کہہ کے زور دار قہقہے لگائے یعنی پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے اگر خواجہ صاحب اس انداز میں شعر کا تجزیہ کرتے تو غالب کا بھی وہی حشر ہوتا جو بیچارے بہادر شاہ ظفر کا ہوا تھا۔ "ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا۔" لیکن خوش قسمتی سے خواجہ صاحب ایک نقاد اور انشائیہ نگار ہونے کے علاوہ ایک شاعر بھی ہیں بعض وقت ان کے تاثرات میں بڑی نزاکت آجاتی ہے۔ نہ جانے انھیں لڑکپن میں دیکھا ہوا پنجاب کی دیہاتی زندگی کا کون سا منظر یاد آگیا کہ وہ اپنی جارحانہ تنقید کو بھول کے ایک حسرت اور تمنا کی تصویر بن گئے۔ انھوں نے کہا کہ دیہات میں خرمن کی رکھوالی پر لڑکیاں مامور ہوتی ہیں جو اناج کو پرندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تالیاں بجا کر انھیں اُڑاتی رہتی ہیں۔ مرد کھیتوں میں کام کرتے ہیں ہل چلاتے ہیں، اور فصلیں کاٹتے ہیں۔ لڑکیاں ہنس ہنس کر تالیاں بجاتی ہیں اور پرندوں کو اُڑاتی ہیں۔ اسی منظر کو غالب نے اپنے پہلے مصرعے میں بیان کیا ہے ہوسکتا ہے کسی الھڑ کو لاچہ پہنے ہوئے تالیاں بجا کے پرندوں کو اُڑاتے ہوئے ہمارے شاعر نے دیکھا ہو اور یہ آرزو کی ہو کہ کاش وہ ایک طائر ہوتا اور بار بار ان تالیوں کی تمنا میں خرمن کے گرد منڈلاتا رہتا۔ چنانچہ دوسرے مصرعے کا مطلب خواجہ صاحب نے یہ بتایا کہ جب محبوب ہنس ہنس کے تالیاں بجا کر پرندوں کو اڑاتا ہے تو چاند بھی اس کی دلداری کی خاطر ایک پرندے کی طرح اُڑنے لگتا ہے اور جگنو کی طرح اڑنے میں یہ مصلحت ہے کہ جب وہ کبھی روشن اور کبھی تاریک ہوگا تو محبوب حیرت سے اُسے دیکھے گا ورنہ اگر چاند معمول کے مطابق چمکتا رہے تو کون اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس مفہوم میں بلا کی ندرت اور نزاکت ہے۔ اس گفتگو کے دوران خواجہ صاحب ایک ایسے کیف میں تھے کہ میں نے پوچھنے کی جسارت نہیں کی کہ رات کے وقت کون سے پرندے اُڑتے ہیں۔

اس ایک شعر کی رنگارنگی کا اندازہ کیجیے ہمارے غالب شناس دوست نے اس شعر سے اپنے شیوۂ قہقہہ اندازی اور دست زنی کی سند حاصل کی۔ حقی صاحب نے محبوب کی تالی پر سرخوشی کے عالم میں چاند کو جگنو کی طرح محو پرواز دیکھا۔ امتیازی صاحب نے ایک قیامت کا تجزیہ کیا اور جنس اور عمر کے تعین سے اس شعر کو غالب کے کسی منفرد قدردان کی ذات پر مرکوز کر دیا۔ اسلم فرخی صاحب نے اس شعر میں اس جذبہ رشک کا نظارہ کیا جس سے غالب کا کلام بھرا پڑا ہے، اور مشفق خواجہ صاحب کو اس میں دیہاتی زندگی کا ایک ایسا حسین منظر نظر آیا جس نے چاند کو جگنو بنا دیا۔ جو چاہے یار کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

سٹیلا نامی ایک خاتون اردو شاعری پر کام کرنے کی خاطر آج کل پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ عالی صاحب نے انھیں "قومی زبان" کا جولائی کا شمارہ دیا انھیں غالب کے اس شعر پر حقی صاحب کا مضمون بہت پسند آیا خصوصاً جگنو میاں والا شعر جب وہ عالی صاحب کے ساتھ میرے ہاں آئیں تو انھوں نے ہم دونوں سے یہ درخواست کی ہم اس شعر کے مطالب پر روشنی ڈالیں نہ عالی صاحب اس پر آمادہ ہوئے نہ میں یہ مضمون اگر وہ پڑھ لیں تو انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ اہل نظر غالب کے اشعار میں کیسے کیسے مطالب دیکھ لیتے ہیں اور اگر وہ حقی صاحب کے مضمون کے ساتھ اس کا بھی ترجمہ کر دیں تو آسٹریلیا والے غالب کے کلام میں معنی کی رنگارنگی سے واقف ہو جائیں گے۔

غالب کے ایک شعر میں اتنے مختلف مطالب نکل سکتے ہیں تو دیوان غالب کو خاطر خواہ طور پر سمجھنے کے لیے تو سیکڑوں نسخہ ہائے وفا کی تالیف ضروری ہے مجموعہ خیال ابھی فرد فرد ہے۔

وضاحت:

جو لوگ "قومی زبان" میں عدنی صاحب کے مضامین پڑھتے رہتے ہیں، انھوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ موصوف اپنی باتیں دوسروں سے منسوب کرنے کے فن میں بے مثال ہیں۔ وہ یہ کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ جس سے کوئی بات منسوب کی جاتی ہے، وہ بھی یقین کر لیتا ہے کہ یہ بات اُسی نے کہی ہوگی۔ میرے ساتھ یہ واقعہ کئی مرتبہ پیش آ چکا ہے کہ میری ذرا سی بات کو عدنی صاحب نے اپنے خوبصورت اسلوب میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ میں خاموش رہا کہ مجھے "کہیں سے کہیں پہنچی ہوئی" اپنی بات اچھی لگی۔ اب کے بھی میں خاموش رہتا لیکن اتفاق سے مضمون کا مسودہ میں نے دیکھ لیا، اور یہ ضروری سمجھا کہ غالب کے زیر بحث شعر کے سلسلے میں عدنی صاحب سے میں نے جو کچھ کہا تھا اُسے اپنے الفاظ میں بیان کر دوں میں نے عرض کیا تھا:

> "عموماً یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب کسی بات پر بے اختیار قہقہہ لگاتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر قریب بیٹھے ہوئے پرندوں کو بھی اُڑایا جاتا ہے۔ غالب کے "یار" نے جب بوقتِ قہقہہ ہاتھ پر ہاتھ مارا تو چاند نے یہ سمجھا کہ اُسے اُڑنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ وہ اُس کی شمع حسن کا پروانہ ہے۔ لہٰذا چاند، کرمکِ شب تاب کی طرح پرافشانی کرنے لگا۔ چاند کی پرافشانی کا تصور اُس منظر سے کیا جا سکتا ہے جس میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے درمیان چاند محوِ سفر نظر آتا ہے اور بادل ساکت دکھائی دیتے ہیں۔"

بس اتنی سی بات تھی جسے عدنی صاحب نے ایسی تفصیل سے پیش کیا ہے کہ میرا اصل مدعا پرافشانی کرتا ہوا اور ہاتھ سر پر مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

(مشفق خواجہ)

ایک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا
۱۹۹۱-۹۲ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر
۲٫۲۵ روپے
فی یونٹ منافع کا اعلان
اپنے یونٹ یافتگان میں ۳٫ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔
سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔
یونٹ واروں کے لیے فوائد
سال خریداری | آغاز سال پر قیمت | منافع | گزشتہ قیمت پر اضافہ | کل یافت | فی صد
۱۹۹۱ | ۱۲٫۵۰ | ۲٫۲۵ | ۰٫۵۰ | ۲٫۷۵ | ۲۲٪
۱۹۹۰ | ۱۲٫۲۰ | ۲٫۲۵ | ۰٫۸۰ | ۳٫۰۵ | ۲۵٪
۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت خریدکردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ
NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED
United
PID-1-7/9.2

چند اور اکابر
چند اور معاصر

پروفیسر نظیر صدیقی

جلیل قدوائی صاحب برصغیر کے بزرگ ترین اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۹ سال ہے۔ اس کے باوجود ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک جاری ہیں۔ کوئی سولہ سال پہلے انھوں نے "چند اکابر چند معاصر" کے نام سے تقریباً دو درجن نادر روزگار شخصیتوں پر اپنے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ پچھلے سال (۱۹۹۲ء) جب انجمن ترقی اردو پاکستان نے اپنی موجودہ روایت کے مطابق قدوائی صاحب کے ساتھ ایک شام منائی تو مجھے ان کی اسی کتاب پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ چونکہ اب وہ کتاب نایاب ہو چکی ہے اس لیے میں نے اس مجموعے کا دوسرا اور بہترین ایڈیشن شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جلسے کے اختتام پر حاضرین میں سے کئی اور اصحاب نے بھی میری خواہش کی تائید کی۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ قدوائی صاحب کے پاس ایسی ہی بلند پایہ اور گراں مایہ شخصیتوں پر لکھے ہوئے اور مضامین موجود ہیں جو اب تک کتابی شکل میں مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ ورنہ میں پہلے مجموعے کے دوسرے اور بہتر ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دوسرے مجموعے کی طباعت پر بھی اصرار کرتا۔ بہرحال قدوائی صاحب کی قائم کردہ راس مسعود سوسائٹی (جس کے معتمد اعزازی خود قدوائی صاحب ہیں) کے صدر ایس ایس جعفری صاحب کو یہ بات معلوم تھی۔ چنانچہ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ بقیہ مضامین کا مجموعہ "چند اور اکابر، چند اور معاصر" کے نام سے شائع کیا جائے۔ یہ اردو ادب کے قارئین کی خوش نصیبی ہے کہ قدوائی صاحب نے جعفری صاحب کی تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ کتاب کو دیکھ کر دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا قدوائی صاحب کی عمر کو اور دراز کرے تاکہ اس قسم کے گنج ہائے گراں مایہ جو اُن کے پاس رہ گئے ہیں وہ بھی ہم لوگوں کو نصیب ہو جائیں۔

زیر بحث کتاب شخصیتوں کی جگمگاہٹ کے اعتبار سے کسی طرح پہلی کتاب سے کم نہیں ہے۔ اگر پہلی کتاب میں منجملہ اور شخصیتوں کے علامہ اقبال، سر شاہ محمد سلیمان، سر راس مسعود، مولانا عبد الماجد دریابادی، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، غلام السیدین، سر رضا علی اور پروفیسر اے بی حلیم جیسے اکابر شامل تھے تو زیر بحث کتاب میں لیاقت علی خاں،

مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ہادی حسن، خواجہ منظور حسین، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، جوش ملیح آبادی اور چراغ حسن حسرت جیسے LEGENDARY FIGURES موجود ہیں۔ جو شخصیتیں ان سے چھوٹی ہیں وہ بھی اپنی حدود میں آفتاب و ماہتاب سے کم نہیں۔

قدوائی صاحب کی خوش نصیبیوں کی فہرست حد درجہ رشک انگیز ہے۔ انھیں نہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی کے بہترین دور میں پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے بلکہ اس یونیورسٹی میں پڑھانے کا بھی۔ ایک استاد کی حیثیت سے انھیں نہ صرف یہ شرف حاصل رہا ہے کہ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر خواجہ منظور حسین اور ڈاکٹر ہادی حسن جیسے اساتذۂ علی گڑھ کے رفقائے کار میں رہے ہیں بلکہ وہ سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، شان الحق حقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جاں نثار اختر اور جی اے مدنی (پاکستان کے ایک عظیم ایڈمنسٹریٹر) جیسے ناموران برصغیر کے اُستاد رہے ہیں۔ ان خوش نصیبوں سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ ان کی ایک امتیازی خوش نصیبی یہ ہے کہ انھیں طویل زندگی پانے کی بدولت بیسویں صدی کے ہندوستان اور پاکستان کی مایہ ناز شخصیتوں میں سے بیشتر کو نزدیک یا دور سے دیکھنے کے مواقع ملے ہیں۔ ان سے متعلق اہم واقعات و مشاہدات اب بھی ان کے مضبوط حافظے میں موجود و محفوظ ہیں۔ اکابر اور معاصر کی دونوں جلدیں اُن کی ان تمام خوش نصیبیوں کی یادگاریں ہیں۔

میں ان دونوں کتابوں کو شخصی خاکوں کے مجموعے کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ شخصی خاکے کا فن تفصیل کے ساتھ شخصیت نگاری کا فن ہے جس کا حق رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالحق، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عصمت چغتائی اور محمد طفیل وغیرہ نے ادا کیا ہے۔ قدوائی صاحب کے ہاں نہ ایسی تفصیل ہے نہ ایسی جامعیت انھوں نے تو شخصیتوں سے متعلق اپنی کچھ یادوں کو سپرد قلم کر دیا ہے ان یادوں سے متعلقہ شخصیتوں کی کچھ تصویریں ضرور بنتی ہیں لیکن کیا ان تصویروں کو PORTRAIT کہا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں کہا جاسکتا تو کیا ہم ان تصویروں کو PROFILE یا SILHOUETTE کے خانے میں رکھ سکتے ہیں؟ اگر رکھ سکتے ہیں تو ان کے لیے ادبی اصناف کے اعتبار سے اردو میں کون سی اصطلاحات استعمال کی جائیں؟ اردو ادب میں کئی جگہ اصطلاحات کا معاملہ خاصا گڑبڑ ہے۔ ہم ابھی تک قلمی خاکہ (PEN - SKETCH) کہہ کر (PEN - PORTRAIT) مراد لے رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں کچھ فرق کرنا چاہیے۔ قدوائی صاحب کی شخصیت نگاری کو شاید PEN - SKETCH یا PROFILE یا SILHOUETTE کہنا مناسب ہوگا۔ مگر یہ تو انگریزی اصطلاحات ہیں۔ اردو میں کیا کہا جائے؟

خیر اردو میں کچھ بھی کہہ لیجیے اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ قدوائی صاحب کے اندر شخصیت نگاری کی ایک خاص صلاحیت موجود ہے جسے انھوں نے پورے طور پر استعمال نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں کسی کی پوری شخصیت نہیں دکھاتے شخصیت کی صرف جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ دو چار ملاقاتوں میں خود وہ چند جھلکیوں سے زیادہ نہ دیکھ سکے۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ جتنا جانتے ہیں اتنا بتانے پر آمادہ نہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ بتانے میں لکھنے کی زحمت خاصی ہے۔

شکر ہے کہ اردو ادب میں جن اصناف ادب کو بڑے لکھنے والوں کی توجہ حاصل رہی ہے ان میں شخصیت نگاری بھی ہے اور یہ صنف اب تو اردو ادب کی ممتاز اصناف میں سے ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی کہ اردو میں شخصیت نگاری کے فن کی ترقی کے باوجود بعض LEGENDARY شخصیتوں کے بارے میں یا تو کچھ نہیں لکھا گیا یا بہت کم لکھا گیا۔ مثلاً

علی گڑھ یونیورسٹی کے اساتذہ میں ڈاکٹر ہادی حسن، خواجہ منظور حسین اور رشید احمد صدیقی ایسی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے تذکرے سینہ بہ سینہ چلتے رہے ہیں لیکن ابھی تک ان کی شخصیتوں کے مرقعے تحریروں میں نہیں آئے۔ ڈاکٹر ہادی حسن پر میں پہلی مرتبہ قدوائی صاحب کی موجودہ کتاب میں مضمون دیکھ رہا ہوں۔ وہ اردو ادب میں شاید اس لیے بھی نظر انداز ہوئے کہ فارسی ادب کے آدمی تھے۔ ویسے قدوائی صاحب نے ان کے بارے میں یہ بتا کر اور بھی حیران کر دیا ہے کہ

"ڈاکٹر صاحب ابتدا میں چند دن کیمسٹری کے استاد رہے۔ بعد میں فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے جو ان کی اصل لائن تھی۔ "ایرانی جہاز رانی کی تاریخ" ان کی ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع تھا۔ اور ان کا انگریزی زبان میں یہ مقالے بڑے سائز کی ایک ضخیم کتاب کی شکل میں آرٹ پیپر پر باتصویر شائع ہوا تھا۔ فردوسی کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر یونیورسٹی کی طرف سے ایران گئے تھے اور وہاں اپنی قابلیت کا لوہا منوا کر اور اپنے حُسنِ تقریر کے جھنڈے گاڑ کر واپس آئے تھے مگر وہ اپنی قابلیت سے قطعی بے خبر تھے۔ غرور ان میں نام کو بھی نہیں تھا ایران سے واپسی پر انھوں نے اسٹریچی ہال میں ایک شام تہران میں اپنی کارگزاری اور فردوسی کے یادگاری جشن پر نہایت فاضلہ تقریر کی تھی۔ ایک ہی وقت میں اہل زبان کی ایرانی اور انگریزی میں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریر کے خاتمے پر مجمع نے ان سے اپنی شیفتگی کے اظہار میں ہلہ بول دیا تھا اور نہ جانے کتنوں نے ان کے خوب خوب بڑھ بڑھ کے بوسے لیے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے دونوں گال چومے جانے کے لیے پیش کرتے رہے۔

ہال سے باہر نکلنے پر کسی نے پوچھا کہ اپنی تقریر کے بارے میں خود ان کی کیا رائے تھی تو مسکراتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی سے انگریزی زیرو کی شکل کا ہوا میں ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا جس کا مطلب تھا کہ ایک فضول اور بے معنی سی تقریر۔

ان کی بیگم کشور جہاں صاحبہ جنھیں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ڈاکٹریٹ کا مطبوعہ مقالہ معنون کیا تھا صورت شکل میں ان کے برعکس تھیں۔ مگر حسن اخلاق میں ان سے کم مالا مال نہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک سنگین علالت میں موصوفہ نے بے لوث خدمت کی تھی جس کی بناء پر وہ انھیں دل دے بیٹھے اور ہمیشہ کے لیے انھیں کے ہوگئے تھے۔ ابتدائی ایجاب و قبول کی شان بھی زالی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ مجھ سے کیا تحفہ لینا پسند کریں گی؟ موصوفہ بولیں میں آپ کو لینا پسند کروں گی۔ ان کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے اپنے سارے خاندان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔"

قدوائی صاحب نے حسبِ معمول ڈاکٹر ہادی حسن پر بھی مختصر ہی مضمون لکھا ہے لیکن مندرجہ بالا اقتباس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی بہت سی متضاد و متصادم خوبیوں کا ذکر کر دیا ہے۔ کیمسٹری کا استاد اور فارسی کا پروفیسر ڈاکٹریٹ کے لیے تاریخی موضوع کا انتخاب فارسی اور انگریزی پر اہل زبان کی سی قدرت تحریر و تقریر دونوں کے دھنی نہ اپنے حسن کے معاملے میں حساس نہ اپنی خوبیوں سے باخبر حسین اتنے کہ تقریر کی داد دینے کے بہانے لوگوں نے ان کے گال چومے۔ سادہ دل اتنے کہ وہ اپنے گال چومے جانے کے لیے پیش کرتے رہے۔ جس تقریر نے انھیں اتنا مقبول بنایا اسے بھی ان کا ز[illegible]ار دینا اپنی ہیچ مدانی کی انتہا ہے۔ آدمی بے حد حسین تھے لیکن شادی ایک بد صورت لڑکی سے صرف اس لیے کر لی کہ ایک سنگین علالت میں اس نے ان کی بے لوث تیمارداری کی تھی۔ اس کے ساتھ اُن کی وفاداری بشرط استواری تھی۔ اتنی خوبیوں کا انسان زندگی میں تو کتابوں میں بھی نہیں ملا کرتا۔ قدوائی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے ایسی حسین و عظیم شخصیت سے ملا دیا اس شخصیت کا بیان قدوائی صاحب کے حسن بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی نثر میں نہ کہیں تکلف ہے نہ تصنع ان کے ہاں بول چال کی دل پذیر سادگی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ باقی باتیں پھر کبھی۔

جلیل مانکپوری حیدر آبادی

شفقت رضوی

جلیل حسن جلیل ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۳ء/ ۱۸۶۴ء میں قصبہ مانک پور ضلع پرتاب گڑھ، یو پی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ عبدالکریم دین دار اور صوفی منش تھے۔ قصبے کے لڑکوں کو دینیات پڑھا کر جو کچھ معاوضہ ملتا اس پر گزر بسر کرتے تھے۔ جلیل کی تعلیم کا آغاز حسب روایت زمانہ قرآن شریف اور عربی، فارسی اور درسیات سے ہوا۔ گیارہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تحصیل علم کے شوق میں لکھنؤ گئے۔ وہاں عالموں، مشائخ بالخصوص علمائے فرنگی محلی سے مستفیض ہوئے۔

دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی اپنے بڑے بھائی خلیل حسن خلیل کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنانے لگے۔ ان دنوں دنیائے شاعری میں امیر مینائی اور داغ دہلوی کے چرچے تھے۔ جلیل بیس برس کے تھے انھیں مشورہ سخن کی حاجت محسوس ہوئی۔ نظر انتخاب امیر پر پڑی جو رامپور میں مقیم تھے۔ وہاں جانا ان کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگے۔ استاد نے ان کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے خاص توجہ کی زبان کی صحت، اصول بلاغت اور فنِ شاعری کے حوالہ سے ان کی رہنمائی کی۔ استاد کے بتلائے ہوئے ہر نکتہ کو انھوں نے حرز جان بنایا۔ چند سالوں میں انھوں نے ان امور پر استادانہ مہارت حاصل کی۔ جیسے جیسے ان کی استعداد بڑھتی گئی امیر کی ان سے محبت بھی بڑھتی گئی۔

جب جلیل کو کسبِ معاش کی فکر ہوئی تو انھوں نے امیر سے سعی و سفارش کی استدعا کی۔ امیر مینائی "امیر اللغات" کی تدوین و ترتیب میں مصروف تھے انھیں معاونین کی ضرورت تھی اس لیے جلیل کی ملازمت کے لیے کسی سے سفارش کرنے کے بجائے انھیں اپنے پاس بلالیا اور دفتر امیر اللغات کا سیکریٹری بنا دیا۔ جلیل نے رامپور میں انھیں کے پاس قیام کیا۔ دن رات کی قربت، ایک ایک لفظ کے معنوں پر سوچ بچار اور بحث مباحث نے جلیل کی زبان دانی میں بے حد اضافہ کیا۔ استاد کے فیض صحبت سے ان کی شاعری میں بھی نکھار آیا اور دن بدن ان کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

امیر اور داغ کی معاصرانہ چشمک اپنی جگہ، دونوں اساتذۂ سخن صحیح معنوں میں تہذیبی نمائندے تھے۔ وہ آپس میں رشتۂ اخلاص میں بندھے ہوئے اور ایک دوسرے کا بے حد احترام کرنے والے تھے۔ رامپور میں امیر کو لغات مکمل کرنے میں مشکل کا سامنا تھا۔ مالی مسائل درپیش تھے ایسے میں امیر نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا جلیل ان کے ہمراہ گئے جہاں داغ فرمانروائے وقت نواب میر محبوب علی خاں آصف کے استاد تھے، عزت، خوشحالی اور فارغ البالی میں زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امیر اور جلیل کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت و احترام سے مہمان بنائے رکھا۔ امیر کی خواہش تھی کہ ریاست کی جانب سے مالی

اجازت کی کوئی صورت نکلے۔ اسی انتظار میں انھوں نے ۱۳/اکتوبر ۱۹۰۰ء (م ۱۳۱۸ھ) رحلت کی۔ جلیل نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

امیر کشورِ معنی امیر مینائی
خدا کے عاشقِ صادق، درِ نبی کے فقیر
گئے جو خلد بریں کو تو ان کی تربت پر
جلیل نے کہا "روضۂ جناب امیر"

۱۳۱۸ھ

امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض خیر آبادی، مضطر خیر آبادی، وسیم خیر آبادی، جگر بسوانی، حفیظ ہوشیارپوری، دل شاہجہانپوری، شفق عماد پوری جیسے معروف شعرا تھے ان میں ہر ایک منصب استادی پر فائز تھا۔ امیر مینائی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین کا مسئلہ پیدا ہوا تو ان سب نے بالاتفاق جلیل کو جانشین امیر تسلیم کر لیا اور اس کے اعتراف میں قطعات بھی کہے۔

امیر کے انتقال کے بعد جلیل کچھ دنوں داغ کے ساتھ قیام پذیر رہے بعد میں وہ ایک کرایہ کا مکان لے کر وہاں منتقل ہو گئے ان کا قیام بھی اسی امید پر تھا کہ روزگار کی کوئی صورت نکل آئے۔ کئی برس امید و بیم میں گزر گئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو حیدرآباد کے معاشرے کا حصّہ بنانے اور وہاں کی تہذیب اپنانے کی سعی جاری رکھی۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے جس سے انھیں متعارف اور مقبول ہونے میں مدد ملی۔ ان کے اشعار کی دل پذیری لوگوں کو متاثر کرنے لگی۔ مشاعروں میں داغ کے بعد انھیں کی پذیرائی ہوتی تھی۔

حیدرآباد میں حضرت فیض کے عرس کے موقع پر شاندار مشاعرہ کا اہتمام ایک قدیم روایت تھی ۸/ نومبر ۱۹۰۰ء کو منعقد ہونے والے مشاعرہ میں جلیل بھی شریک ہوئے۔ اپنی وہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے
او شوخ چشم، پھونک دے برق نگاہ سے

غزل بے حد پسند کی گئی۔ اسی مشاعرہ میں ان کی ملاقات شعرا نواز، امیر و وزیر مہاراجہ کشن پرشاد شاد سے ہوئی جو ان کے بہتر مستقبل کے لیے نیک شگون ثابت ہوئی۔ کشن پرشاد نے آئندہ ہر مرحلہ پر ان کی امداد کی۔

حضرت فیض کے عرس کے مشاعرے میں داغ کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے انھوں نے جلیل کی غزل کی تعریف سنی تو خود ان کے گھر گئے اور فرمائش کر کے غزل سنی۔ یہ جلیل کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

ابراہیم خان تجلی کا مشاعرہ بھی حیدرآبادی تہذیب کی دیرینہ روایت کا حصّہ تھا۔ مشاعرہ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ فرمانروائے وقت نظام سادس جو آصف تخلص فرماتے تھے اس کے لیے مصرعہ طرح مقرر کیا کرتے تھے۔ جلیل نے بھی مصرعہ طرح پر طبع آزمائی کی اور مشاعرہ میں غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

جلیل کا مطلع پڑھنا تھا کہ محفلِ مشاعرہ میں داد و تحسین کا شور بلند ہوا جو آسمان تک جا پہنچا۔ لوگوں کی فرمائش پر انھوں نے

بار بار پڑھا۔ مطلع حاصلِ مشاعرہ رہا یا نہیں لساتذۂ فنِ تنقید کا کہنا ہے کہ جلیل کا نام زندہ رکھنے کے لیے یہ ایک شعر کافی ہے ویسے اسی غزل کے دوسرے شعر نے بھی خاصی داد پائی:

پیے بغیر چڑھی رہتی ہے حسینوں کو
وہاں شباب ہے کیا کم، اگر شراب نہیں

شہر میں ان اشعار کی دھوم مچی رہی۔ محفلوں میں ان کی بازگشت کئی دنوں تک سنائی دیتی رہی۔ خاص و عام کی زبان پر یہی اشعار تھے جو سینہ بہ سینہ نظام سادس آصف تک پہنچے۔ انھوں نے پسند خاطر کا اظہار کیا اور اپنا کلام داغ کے علاوہ کبھی کبھی جلیل کو بھی دکھلانے لگے۔ جلیل کو توقع سے بڑھ کر اعزاز مل گیا لیکن معاش کی کوئی صورت نہ نکلی۔ جلیل آس لگائے بیٹھے رہے۔

۱۹۰۵ء میں داغ دہلوی کی وفات ہوئی۔ جائے استاد شاہ خالی ہوئی پھر جلیل کا تقرر نہ ہوا۔

۱۹۰۶ء میں نواب میر محبوب علی خاں آصف نظام سادس کی تخت نشینی کی سلور جوبلی منائی گئی جشن کے سلسلہ میں کشن پرشاد شاد کی ڈیوڑھی میں مہتم بالشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ۲۷ شعرائے کرام نے شرکت کی۔ مولانا الطاف حسین حالی خاص اس مشاعرہ میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے تھے۔ جلیل بھی مدعو تھے۔ انھوں نے نظام سادس کی مدح میں قصیدہ پیش کیا۔ مطلع تھا:

جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا
ساغرِ عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

مشاعرے میں پابندی تھی کہ گیارہ اشعار سے زائد نہ پڑھے جائیں۔ قصیدہ کا رنگ دیکھ کر جلیل کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا انھوں نے اپنا طویل قصیدہ سنایا حاضرین نے توجہ سے سنا ہر شعر پر داد دی۔ نظام سادس نے بھی پسند فرمایا اور انھیں "جلیل القدر" کا لقب عطا کیا لیکن نوکری کا پروانہ جاری نہ ہوا۔ نظام سادس کا اصول تھا کہ ملازمت کے خواہش مند سے کئی کئی برس "امیدواری" کرواتے۔ اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوتی تو بالاخر سلک ملازمت میں شامل کر لیتے یہ ان کی UNDECLARED POLICY تھی۔ نظام سابع کے عہد میں یہ پالیسی باضابطہ بن گئی تھی۔ کسی محکمہ میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہاں امیدواروں کی فہرست میں نام شامل کروایا جائے اور بغیر کسی معاوضہ کے کام شروع کر دیا جائے جب کوئی جگہ خالی ہوتی تو امیدواروں کی کارکردگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے مستقل کر دیا جاتا جلیل کی "امیدواری" کا زمانہ طویل تر ہوتا گیا وہ بھی قدم جمائے رہے۔

ستمبر ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں زبردست طغیانی آئی جس نے نصف سے زائد شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا سیکڑوں افراد پانی کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، ہزاروں پختہ مکانات مسمار ہوگئے، کروڑوں کی املاک سیلاب کی نذر ہوئی۔ جلیل بھی اسی کی زد سے نہ بچ سکے۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بیاض سینے سے لگائے پناہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ اس بے سروسامانی اور پریشان حالی میں کشن پرشاد شاد نے دستگیری کی۔ انھیں اپنی ڈیوڑھی میں مہمان رکھا۔ جب حالات معمول پر آگئے تو جلیل کی غیرت نے وہاں مزید قیام مناسب نہ سمجھا۔ پرانی حویلی کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے کر وہاں منتقل ہوگئے۔

بالآخر ۱۵ شوال ۱۳۲۷ھ (م ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ء) ان کی "امیدواری" کی مدت پوری ہوئی، قسمت نے یاوری کی برسوں جس آرزو کو سینے سے لگائے جی رہے تھے بر آئی۔ نظام سادس نے ان کی تقرری کا حکم دے دیا۔ وہ داغ کی جگہ استادِ شاہ مقرر ہو گئے۔ نظم سابع کے فرمان کے بموجب دفتری مراسلہ جاری ہوا:

"منجانب نواب تہور جنگ منصرم معتمد

اطلاع دفتر تنخواہ محلات مبارک بشرف صدور فرمان ۱۵ شوال ۱۳۲۷ھ بایں حکم کہ "جلیل حسن صاحب جلیل کے نام داغ صاحب کی جائیداد میں سے پانچ سو روپیہ حالی ماہوار صرفِ خاص سے جاری کیا جائے" ترقیم ہے کہ جس پر عمل کیا جائے۔

(۱۶ سوال ۱۳۲۷ھ)

داغ کو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتے تھے یہ رقم خزانہ عامرہ سے بمد متفرقات حاصل کر کے صرفِ خاص میں جمع کر دی جاتی اور وہاں سے داغ کو ایصال ہوتی تھی۔ اس حکم کے بعد حسب سابق خزانہ عامرہ سے ہزار روپیہ صرف خاص میں منتقل ہوتے رہے لیکن جلیل کو صرف پانچ سو ادا کیے جاتے تھے۔

۱۹۱۱ء میں نظام سادس کا انتقال ہو گیا نواب میر عثمان علی خاں نظام سابع تخت نشین ہوئے تو جلیل ایک مرتبہ پھر تذبذب کے شکار ہوئے۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ نئے حکمران کو ان کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ اس وقت بھی مدار المہام کشن پرشاد شاد نے ان کی مدد فرمائی اور جلیل کی خدمات جاری رکھنے کی تحریری استدعا کی جس کے جواب میں فرمان ہوا کہ:

نقل فرمان: "۱۳ صفر ۱۳۲۹ھ

حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کی ماہوار کی نسبت آپ کی عرض داشت مورخہ ۲۸ محرم الحرام ۱۳۲۹ھ ملاحظہ کی گئی جلیل صاحب کی ماہوار پانچ سو روپے اسی طرح اسی مد سے ادا کی جائے لی جس مد سے اور جس طرح داغ صاحب کو ماہوار ادا ہوتی رہی یعنی پانچ سو روپیہ ماہوار متفرقات سے جاری کر کے ماہانہ صرف خاص کو بھیج دیا جائے جو صرف خاص کے ذریعہ جلیل صاحب کو ایصال ہوتی رہے گی۔

اس حکم کی ایک نقل اطلاعاً معتمد صاحب صرف خاص کے پاس بھیج دی جائے۔"

اسی فرمان میں خزانہ عامرہ سے بمد متفرقات پانچ سو روپیہ ماہوار صرف خاص کو منتقل کرنے کا ذکر ہے۔ اس میں سہو ہوئی ہے عملاً داغ کی تنخواہ یعنی ایک ہزار روپیہ منتقل ہوتے تھے اور جلیل کو پانچ سو روپیہ ادا ہوتے تھے۔

نظام سابع نواب میر عثمان علی خاں بھی شاعر تھے عثمان تخلص کرتے تھے۔ انھیں بھی مشورہ سخن کی ضرورت تھی۔ جلیل یہ فرض ادا کرنے لگے۔ نظام سابع کا کلام بعد اصلاح مقامی اخبارات میں صفحہ اوّل پر شائع ہوتا تھا جس میں "رائے استاد جلیل" بھی شامل ہوتی تھی۔ جلیل کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ آئے دن نظام سابع پڑھنے کے لیے ان کا تازہ کلام طلب فرماتے۔ اس کرم فرمائی کی وجہ سے جلیل کو طبیعت پر زور دے کر ہر روز ایک دو غزلیں ضرور کہنا پڑتیں۔

کچھ ہی عرصہ میں جلیل استاد شاہ کے علاوہ مصاحب خاص کے منصب پر بھی فائز ہو گئے۔ کنگ کوٹھی میں ہر روز ان کی

حاضری لازم ہوگئی۔ وہ دربار شاہ میں باریاب ہوتے۔ اہم تقاریب میں بلائے جاتے۔ سرکاری ضیافتوں میں مدعو کیے جاتے۔ اس دور کی بے شمار تصاویر شاہد ہیں کہ انھیں ہر موقع پر نظام سابع کے قریب معزز درجہ پر جگہ دی جاتی تھی۔ دوران سفر جلیل کو نظام کی ہمرکابی کا شرف بھی حاصل رہا ۱۹۱۱ء میں جب نظام خواجہ بندہ نواز کے مزار پر حاضری دینے گلبرگہ گئے تو جلیل ساتھ تھے۔ اسی سال نظام نے دہلی کا سفر کیا جارج پنجم کی تخت نشینی کے جلسہ میں شرکت کی تو جلیل ان کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے دو مرتبہ نظام کے ساتھ خواجہ اجمیری کے دربار میں بھی حاضری دی تھی۔

جلیل کے استاد شاہ مقرر ہوئے ایک ہی سال گزرا تھا کہ وہ خطاب سے بھی نوازے گئے۔ ۸ جمادی الاول ۱۳۳۰ھ کو سالگرہ کے موقع پر نظام سابع نے متعدد حضرات کو خطابات دیے تھے ان میں جلیل شامل نہیں تھے۔ دس روز بعد ۱۸ جمادی الاول ۱۳۳۰ھ (م ۵ جون ۱۹۱۳ء) کو مدارالمہام کشن پرشاد کے نام حکم جاری ہوا کہ:

نقل حکم "سالگرہ مبارک کی تقریب میں خطابات
حکم مصدرہ ۸ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ میں صاحبان ذیل کے خطابات لکھے جانے کے زیر تجویز تھے اب ان میں شریک کر لیے جائیں۔
میرے استاد مولوی انواراللہ صاحب، فضیلت جنگ
معتمد صاحب صرف خاص رائے مرلی دھر صاحب، عثمان نواز ونت بہادر
مہتمم توشک خانہ و مددگار محلات مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب، حاکم جنگ بہادر
شاعرِ خاص حافظ جلیل حسن صاحب جلیل، فصاحت جنگ

نظام سان کے شاعرِ خاص ہونے کے تین سال بعد جلیل کی ماہوار پر نظر ثانی کے لیے کشن پرشاد مدارالمہام نے عرضداشت پیش کی جس پر ۹ آذر ۱۳۲۴ فصلی ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ م ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۴ء روز چہار شنبہ فرمان صادر ہوا کہ:

نقل فرمان: "جلیل صاحب کی ماہوار صماء میں دو سو روپیہ کا اضافہ
عرضداشت امروزہ ملاحظہ کی گئی جلیل صاحب کو پانچ سو روپیہ ماہوار میں غرہ آبانی ۲۴ فصلی سے اور دو سو روپیہ کا اضافہ کیا جائے"

جلیل ۱۹۲۰ء میں سخت علیل ہوگئے۔ علالت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ علاج معالجے اور دیکھ بھال کے لیے شاہی طبیب کو مقرر کیا گیا اور انھیں خاص توجہ سے علاج کرنے کی ہدایت کی گئی۔ باوجود ہر تدبیر کے افاقہ نہیں ہوا۔ نقاہت بڑھتی ہی گئی تو انھیں حاضری سے مستثنٰے قرار دے دیا گیا۔ بعد میں تبدیلی آب و ہوا کے لیے وطن جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ انھیں مانک پور گئے دو ماہ ہوئے تھے کہ ان کی طلبی ہوئی۔ کامل افاقہ نہ ہونے کے باوجود وہ حیدر آباد لوٹ گئے۔ انھیں گھر میں آرام کرنے کی اجازت مل گئی اور نظام سابع کا کلام اصلاح کے لیے ان کے گھر بھیجا جانے لگا۔

اسی بیماری کے دوران ان کی آنکھ کا آپریشن ۱۹۳۴ء میں ہوا۔
اس سے چند ماہ قبل ان کی ماہوار میں اضافہ کر کے وہی رقم معین کر دی گئی جو داغ کو ملا کرتی تھی۔

نقل فرمان: "۴ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ (م ۲۵ ستمبر ۱۹۳۳ء)

جلیل صاحب المخاطب فصاحت جنگ کے اضافہ ماہوار کی نسبت دیوانی سے ہر ماہ جو ایک ہزار روپیہ حالی صرفِ خاص میں بنام ماہوار جلیل صاحب المخاطب فصاحت جنگ آیا کرتے ہیں جس میں سے پان صد بمد امانت صرف خاص میں رکھ کر صرف پانچ سو ان کو ایصال ہوا کرتے ہیں اس کے متعلق حکم دیتا ہوں کہ یکم آذر ۱۳۴۳ فصلی سے بعوض پانچ سو سالم ماہوار ایک ہزار روپیہ ماہ بماہ جلیل صاحب کو ایصال ہوا کریں۔

۲۔ اب تک وضعات سے متعلق جس قدر قسم بمد امانت اس وقت صرف خاص میں جمع ہے وہ اسی طرح جمع رہے جس کے متعلق جو کچھ حکم مناسب دینا ہوگا بروقت دوں گا۔

اس حکم کی اطلاع جلیل صاحب کو دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ راست میرے دفتر سے ان کو اضافہ سے متعلق اطلاع دے دی گئی ہے۔ یعنی کہ یکم آذر سے ان کو بعوض پانچ سو ایک ہزار ملا کریں گے۔"

(فرمان میں کہا گیا ہے کہ اس وقت جلیل کو ماہوار پانچ سو روپیہ مل رہے تھے درست نہیں نظام سابع کو یاد نہیں رہا کہ ان کی یافت میں پہلے دو سو روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا گیا تھا)

جلیل کو باقی عمر ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتے رہے اس زمانے کے لحاظ سے یہ خاصی معقول رقم تھی جس سے شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکتی۔ جلیل سادہ مزاج اور قناعت پسند تھے انھوں نے ظاہری شان کی جانب کبھی توجہ نہیں کی البتہ وہ آسودہ حال رہے۔ انھوں نے محلہ دار الشفاء میں عزاخانہ زہرہ کے قریب راؤ رسبھا کی ڈیوڑھی سے متصل ایک مکان خرید لیا تھا اور اس کا نام "جلیل منزل" رکھا تھا۔ اس میں انھوں نے خاموش اور پُرسکون زندگی گزاری یہ تقاریب اور ضیافتوں میں شرکت سے اجتناب برتتے تھے جب بھی نظام سابع کا کلام آتا اصلاح دے کر اپنا فرض ادا کرتے۔ زیادہ تر اوقات عبادت یا مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ "جلیل منزل" کے باب الداخلہ کے سامنے ان کا دیوان خانہ تھا صبح اور شام کے اوقات میں وہ دیوان خانے میں ایک صوفہ پر خاص انداز میں بیٹھے نظر آتے۔ کوئی ملاقاتی آ جاتا تو اس کی پذیرائی کرتے ورنہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ اسی مکان میں ۱۹۴۲ء میں نظام سابع ان کی عیادت کے لیے آئے تھے۔

حکمرانوں کی طرف سے خطابات دینے کا رواج عام رہا ہے۔ کسی فرمانروا کو فرد یا افراد کی جانب سے خطاب یا لقب کی روایت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ جلیل نے ایک جلسہ میں نواب میر عثمان علی خان نظام سابع بانیِ جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں یکم امرداد ۱۳۵۱ھ (م ۱۹۴۲ء) استدعا کی تھی کہ وہ اپنے بہی خواہ اہل علم کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے "سلطان العلوم" کا لقب اختیار کریں۔ نظام سابع نے اسے شرف قبولیت بخشنے کا فرمان جاری کیا جو روزنامہ "صبح دکن" میں ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ (م ۱۹۴۲ء) شائع ہوا۔ اس خوشی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت شہزادہ معظم جاہ شجیع نے فرمائی۔ جلیل باوجود علالت اور نقاہت کے اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔

جلیل کی بیماری کا جو سلسلہ ۱۹۲۰ء میں شروع ہوا اور برسوں جاری رہا انھیں کامل صحت کبھی نہ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ آنکھ کے آپریشن کے باوجود بینائی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر

انھیں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء شب دوشنبہ ساڑھے دس بجے جسمانی اور دنیاوی تکالیف اور اذیتوں سے نجات ملی انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے انتقال پر اہل علم، شاعر اور ادیب سوگوار ہوئے۔ نماز جنازہ میں عمائدین، امراء، شعراء، ادیبوں اور عام لوگوں کے علاوہ نواب میر عثمان علی خاں نظام سابع نے بھی شرکت کی۔ انھوں نے استاد مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"ایک باکمال شخص اٹھ گیا نہ صرف شعر و سخن کی دنیا میں وہ فرد تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی بے مثل تھے۔ میں نے جلیل سے ربع صدی سے زیادہ استفادہ کیا اور اعلیٰ حضرت مرحوم بھی داغ کے بعد ان سے اصلاح کرتے تھے۔"

نظام سابع نے قطعہ تاریخ وفات کہا جو لوح مزار پر کندہ ہے:

نشاط آورچہ جام زنجبیلے
عجب مستی بجام سلسبیلے
بگفت عثمان کہ اوشد واصل حق
دکن گفت "آہ استاد جلیلے"

۱۳۶۵ھ

حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر حضرت امجد نے بھی یہ قطعہ کہا:

شاعرِ بے نظیر و بے ہمتا
آنکہ عمرش گزشت در تخئیل
بادب سال اصلتش گفتم
"پیش ربِ جلیل رفت جلیل"

۱۳۵۵ھ

تحقیق، ادبی تحقیق اور شعبہ اردو
اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

ابتدائے آفرینش میں جب خالقِ کائنات نے ... مٹی کے سیاہ پتلے میں اپنی روح پھونکی تو قدرتی طور پر جہاں اُسے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا وہاں کرید، کھوج، تلاش اور جستجو کی فطری قوت اور توانائی بھی عطا کی۔ عرفان و آگہی اور انکشافِ ذات کے بعد، جاننے کی خواہش نے انسان کو زندگی اور کائنات کی لامتناہی حیرت کی طرف متوجہ کیا۔ تجسس سے پیدا ہونے والی اس تحریک نے جہاں اُسے جذباتی طور پر پریشان کیا وہاں اُس کی ذہنی قوتوں کو جلا بخشی۔ زندگی وحدت سے لے کر اربعیت تک کسی نہ کسی حوالے سے تہذیب و تمدن کے تابع رہی ہے۔ یہ انسان کی سوچ اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہی تھی کہ زندگی ارتقائے حیات اور ارتقائے تمدن کے سفر پر رواں دواں ہے۔ انسان سوچنے اور غور و فکر کا عادی ہے۔ زندگی کے عمومی مسائل یا پھر وہ مسائل جو اُس کی دلچسپی کا محور و مرکز ہوں وہ اُن کے بارے میں سوچنے اور بہتر سے بہتر سوچنے پر مجبور ہے۔ ہر لمحہ گزرتی اور آگے بڑھتی زندگی اور اُس کا ارتقاء، مسائل، اور ان کی نوعیت اور اُن کے نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پرانے مسائل کی جگہ نئے مسائل اور پرانے نتائج کی جگہ نئے نتائج لے لیتے ہیں۔ شک سے یقین کے اس ذہنی سفر میں انسان کسی حتمی اور سائنٹیفک نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے وہ مبہم اور غیر معین باتوں کو منظم اور مستحکم کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہی دراصل تحقیق و تنقید کی ابتدا ہے۔

آج کی دنیا بیش بہا علوم کی دنیا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ نئی دریافتیں، نئے حقائق اور نئے انکشافات منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ علمی دنیا میں یہ ترقی اس بنا پر پیدا ہوئی ہے کہ انسانی ذہن مسلسل کوشش و کاوش، تلاش و جستجو میں مصروف ہے، انسان کے جذبۂ تحقیق نے سچائی کا سراغ لگاتے ہوئے حقیقتوں کی تصدیق کی ہے، مختلف علوم و فنون میں افہام و تفہیم بھی پیدا کی ہے، تحقیق ایک جامع عمل ہے جس میں کوئی نتیجہ حرفِ آخر نہیں، افکار و نظریات کی نشو و نما اور ارتقاء اسکے مرہونِ منت ہے، تحقیق نئے اسرار و رموز کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ غلطیوں اور خامیوں کو دُور کر کے مسائل کی گتھی سلجھاتی اور آئینِ نو کا احترام سکھاتی ہے۔ یوں مختلف علوم و فنون کی ترقی کی بنیاد انسان کا جذبۂ تحقیق ہے۔

"تحقیق" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھوٹے کھرے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا ہے۔ یہ مطالعے کی اُس طرز کا نام ہے جس کے تحت ہم موجود حقائق کو جانچتے اور پرکھتے ہوئے مثبت اور منفی نتیجے پر پہنچتے ہیں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"تحقیق ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات

کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔"(۱)

یوں تنقید ایک دشوار گزار اور محنت طلب فن ہے۔ جو صداقت، دیانت، خلوص، غیر جانبداری اور احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ تحقیق نئی حقیقتوں کی تلاش کا نام ہے۔ پہلے سے کہی ہوئی باتوں میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے جیسا کہ عندلیب شادانی کا کہنا ہے:

"تحقیق یعنی ریسرچ کا یہ مطلب ہے یا تو نئے حقائق دریافت کیے جائیں یا پھر معلومہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تفسیر پیش کی جائے کہ اس سے ہماری معلومات میں معتد بہ اضافہ ہوجائے۔"(۲)

معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ نئی حقیقتوں کا تجزیہ بھی انتہائی باریک بینی کے ساتھ کیا جاتا ہے تحقیق میں نئی باتیں اور نکتے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

زندگی کے ہر شعبے میں تحقیق کی کار فرمائی نظر آتی ہے چونکہ زندگی کے مسائل مختلف النوع اور متنوع ہیں اس لیے تحقیق کے موضوعات میں بھی تنوع ہے۔ ہم اپنی آسانی کے لیے انھیں دو خانوں میں رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ علمی تحقیق۔ جس میں ہر طرح کے علوم و فنون، ادب اور لٹریچر، شامل ہیں جس کا مقصد علوم و فنون سے متعلق نت نئے تحقیقی افکار و نظریات کو پیش کرنا ہے۔

۲۔ عملی تحقیق۔ جو خالصتاً سائنسی موضوعات اور طب سے متعلق ہے جس میں تجربہ گاہوں میں تجربات کے بعد نتائج سامنے لائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انھیں خالص تحقیق اور اطلاقی تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔

خالص یا علمی تحقیق نئی دریافت یا نئی تلاش کا نام ہے۔ محقق کسی بھی موضوع سے متعلق ہر پہلو اور ہر زاویے سے نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ پہلے سے موجود مواد کی جانچ پڑتال بھی کرتا ہے اس طرح تنقید و تجزیے کے بعد اپنا نقطۂ نظر سامنے لاتا ہے۔ جب کہ عملی اور اطلاقی تحقیق میں معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ نتائج کا عملی اطلاق بھی کیا جاتا ہے جو بعض اوقات ہر جگہ ممکن نہیں ہوتا۔ تحقیق مختلف موضوعات کے حوالے سے اپنے دائرہ کار اور طریق کار کا تعین کرتی ہے لیکن بنیادی طور پر کسی بھی موضوع پر تحقیق کے لیے تین اہم اُمور سامنے رکھے جاتے ہیں۔

۱۔ انٹرویوز یا سوال ناموں کے ذریعے سے معلومات حاصل کرنا

۲۔ ماہرین یا عام لوگوں کی آراء سے نتائج اخذ کرنا۔

۳۔ پہلے سے موجود مواد کا مطالعہ۔

سوال نامہ یا انٹرویو محقق کے لیے معلومات حاصل کرنے کا زبانی وسیلہ ہے اس کا عام طریق کار یہ ہے کہ اہم شخصیات یا موضوع کے ماہرین سے سوال و جواب کیے جاتے ہیں۔ ماضی میں محقق اس ضمن میں یا تو اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتا تھا یا اہم نکات نوٹ کرلیتا تھا مگر ریکارڈ کرنے کی سہولت نے بہت سے مسائل یوں حل کردیئے ہیں کہ سوال و جواب اپنے اصل متن کے ساتھ محفوظ ہوجاتے ہیں اور غلط فہمی کا امکان بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ اس طرح محقق کسی بھی موضوع کے حوالے سے کوئی سوال نامہ مرتب کرکے علماء و مفکرین یا عام لوگوں سے جواب حاصل کرکے اُن کی روشنی میں اہم نتائج اخذ کرلیتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ محقق

پہلے سے موجود مواد سے مدد لیتا ہے اُسے صرف کتابی شکل میں منظرِ عام پر آنے والی معلومات ہی سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ مقالے جو کالج اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں موجود ہیں اُن کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے تاکہ نتائج اور نئے امکانات کی نشاندہی ہو سکے۔ خاص طور پر ادبیات کی دنیا میں تحقیق کے ان اقدامات کے بغیر آگے بڑھنا مشکل سا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ زبان اور لسانی تغیرات ایک طرف کسی خاص عہد کے کلچر اور تہذیبی رویّوں کو سامنے لاتے ہیں تو دوسری طرف ادب کی بدلتی ہوئی اقدار اور موضوعات کے لیے اپنے دائرے کو وسعتیں بخشتے چلے جاتے ہیں اس طرح کلاسیکی زبان و ادب کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے اور نئے عہد میں ان کے امکانات اور نئے انداز کی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔ سائنس ہو یا ادبیات کی دنیا تحقیق کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل امور کو خاص طور پر سامنے رکھنا ہوگا:

۱۔ موضوع کا انتخاب
۲۔ تحقیقی خاکہ
۳۔ ماخذات کی تلاش
۴۔ موضوع سے متعلقہ مواد کا انتخاب
۵۔ تنقید و تجزیہ
۶۔ مقالہ نگاری

تحقیقی عمل میں سب سے پہلے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ محقق کو اپنی پسند، ذوق، دلچسپی، مطالعے اور معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے موضوع منتخب کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنے عہد اور علاقائی ضروریات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر بہاول پور کا باسی یہاں کی تاریخ، تہذیب، زبان اور ادب پر یوں بہتر طور پر کام کر سکتا ہے کہ اُسے ماخذات تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ ہمیں ہر جگہ اور ہر مقام پر بے شمار ایسے موضوعات مل جاتے ہیں جن پر یا تو سرے سے لکھا ہی نہیں گیا یا بہت کم لکھا گیا ہے یا اُس خاص حوالے سے نہیں لکھا گیا جس کو محقق نے منتخب کیا ہے یا پھر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں نئے پہلوؤں کی گنجائش موجود ہے۔ پرانے اور فرسودہ موضوعات میں، نئی تحقیق، نئے نکات اور نئے امکانات کی تلاش بھی کی جا سکتی ہے اس سلسلے میں محقق کو ماہرین اور اساتذہ سے بھی ضرور مشورہ کرنا چاہیے۔ گویا محقق کو موضوع کا انتخاب بہت احتیاط سے کرنا چاہیے۔ وہ اپنی افتادِ طبع اور طرزِ فکر کو ضرور سامنے رکھے ورنہ حوصلہ افزا نتائج سامنے نہ آسکیں گے جیسا کہ ڈاکٹر ش۔ اختر کا کہنا ہے:

> "اگر اسکالر نے اپنی صلاحیت، مذاق اور اپنی پسند کی روشنی میں موضوع کا انتخاب نہیں کیا تو اُس کی تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوگی، اور اگر مکمل ہو بھی گئی تو اُس سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ دانش گاہوں میں تحقیقی صورت حال اسی لیے ابتر ہے جو اسکالر شعر موزوں نہیں پڑھ سکتا وہ عموماً شعرائے کرام کے دیوان کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔"
>
> (۳)

موضوع کے انتخاب کے بعد محقق کو اپنے موضوع سے متعلق خاکہ بنانا ہوگا۔ کہ اُسے کیا کام کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مرحلے پر وہ اپنے کام کے لیے مختلف ابواب کا تعین کرے گا۔ محقق کو ابواب کی تقسیم یوں کرنا چاہیے کہ اس میں زمانی لحاظ سے [illegible]

خاص تعبیر و ربط موجود ہو۔ اس طرح یہ بات بھی اُس کے سامنے رہے گی کہ اُسے کس موضوع پر کن کن زاویوں سے کام کرنا ہے۔
گویا موضوع کے انتخاب کے بعد ماخذات کی تلاش تحقیق کی اساس و بنیاد ہے۔ محقق اگر پہلے اپنے موضوع سے متعلق کتابیات کی فہرست مرتب کر لے تو اُس کا کام آسان ہو سکتا ہے۔ اُسے مستند کتب کے ساتھ ساتھ مخطوطات مختلف رسائل اور اخبارات میں چھپنے والے مواد و مضامین کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ متعلقہ موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُس کا براہ راست مطالعہ کیا جائے۔ ماخذات کے اہم نکات کے سلسلے میں محقق کو خود بھی سوچ بچار کرنا ہو گی۔ ذاتی نقطۂ نظر کے اظہار کے ساتھ ساتھ اُسے تحقیق کی مزید گنجائش بھی دیکھنی چاہیے۔ یوں تنقید و تجزیے سے وہ مفید معلومات کو اور مفید و بہتر بنا سکتا ہے۔ محقق کا کام محض معلومات جمع کرنا اور مواد کی فراہمی ہی نہیں بلکہ اُس کے نتائج اور اثرات دکھانا بھی ضروری ہیں کیوں کہ تحقیق محض تاثرات، جذبات یا قیاس آرائی کا نام نہیں بلکہ یہ ٹھوس اور سائنٹفک رویّے کا نام ہے جو نئے حقائق کی تلاش کی ترغیب دلاتا ہے۔ محقق میں شوق، محنت، دلچسپی، متعلقہ موضوع کا مطالعہ قوتِ استدلال اور قوتِ اختراع کا ہونا بہت ضروری ہے۔

عام طور پر ہمارے محقق قوتِ اختراع، محنت اور جانفشانی سے کام نہیں لیتے کسی بھی موضوع سے متعلقہ موجود مواد کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں۔ یہ بات طالب علموں کی سطح پر بہت زیادہ دیکھنے میں آئی ہے۔ وہ کتب اور غیر مطبوعہ مقالہ جات کا مطالعہ کرتے ہیں اور جملہ افکار و نظریات کو من و عن لکھ دیتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم انھیں اپنی ذاتی طرز و انداز اور اسلوب سے تو ضرور کام لینا چاہیے۔ تحقیقی سلیقے کا شعور پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کمیّت کی بجائے معیار اور کیفیت کو اہمیت دی جائے۔ ایک اور عنصر جو دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ کہ مقالہ جات میں تاریخی یا سماجی پس منظر کے ابواب شامل کیے جاتے ہیں جن میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی محض تاریخی واقعات کو بار بار دوہرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی اسکالر اردو افسانے کے کسی افسانہ نگار پر تحقیقی کام کر رہا ہے تو وہ افسانے کی ابتدا، اُس کا ارتقاء، پہلے سے موجود انداز میں لکھ دیتا ہے۔ یوں یہ باتیں متعلقہ موضوع سے تعلق رکھنے والے ہر تحقیقی کام میں موجود ہوں گی۔ یہ انداز پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح پر بھی موجود ہے حالانکہ ان تاریخی واقعات سے نئے نتائج نکالنا ضروری امر ہے۔ جیسا کہ پروفیسر محمد حسن کا کہنا ہے:

> جب تک ان حالات و واقعات سے نتائج نکالنا مقصود نہ ہو اس وقت تک ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ حقائق کی مناسب توجیہ اور ان کے عواقب اور متعلقات پر غور و فکر کرنا فن کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن کے لیے اکتساب اور ریاضت اور مشق شرط ہے۔

تحقیق کے طریق کار کا آخری مرحلہ مقالہ لکھنا ہے۔ مقالہ نگار کو انفرادی اسلوب کے ساتھ ساتھ لفظوں کے استعمال کا فن آنا چاہیے لفظ سادہ، خوبصورت اور مؤثر ہونا چاہئیں۔ چمکیلے بھڑکیلے الفاظ کی بھرمار مقالے کا حجم تو بڑھا سکتی ہے مگر کوئی اہم نتیجہ سامنے نہ آ سکے گی۔ علاوہ ازیں غیر ضروری تفصیلات اور طوالت سے گریز کرنا چاہیے۔ اقتباسات اور حوالہ جات کے سلسلے میں بہت احتیاط ہو گی اور ان کا ماخذ جو بھی ہو اُس کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔

تحقیق اور ادبی تحقیق کے ان ضوابط کی روشنی میں شعبۂ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی ادبی تحقیقات کا جائزہ لیجیے تو ایک خوشگوار و خوش آئند اور حوصلہ افزا فضا سامنے آتی ہے بہاول پور یونیورسٹی ایک کم عمر یونیورسٹی ہے اس کا شعبۂ اردو و اقبالیات ...٦ ۔١٩ء میں عمل میں آیا ہے ابتدا میں باقاعدہ اساتذہ کی تعداد صرف تین تھی۔ چنانچہ مختلف کالجوں سے جزوقتی اسا

تعلیم و تدریس کے لیے بلائے گئے۔ اور اب ۱۹۹۳ء میں شعبے میں سات اساتذہ موجود ہیں۔ جن میں چار پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور باقی تحقیقی کام کا آغاز کر چکے ہیں۔ طالب علموں کی سطح پر تحقیقی کام کا باقاعدہ آغاز پہلے تعلیمی سال ہی سے ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں آٹھ مقالہ جات، ۱۹۸۱ء میں ایک، ۱۹۸۲ء میں آٹھ، ۱۹۸۳ء میں چھ، ۱۹۸۴ء میں نو، ۱۹۸۵ء میں آٹھ، ۱۹۸۶ء میں چودہ، ۱۹۸۷ء میں چھ. ۱۹۸۸ء میں سات، ۱۹۸۹ء میں اٹھارہ، ۱۹۹۰ء میں تیرہ، ۱۹۹۱ء میں آٹھ، ۱۹۹۲ء میں دس مقالے لکھے گئے اور اسی سال یعنی ۱۹۹۳ء میں سات طالب علم مختلف موضوعات پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

عام طور پر محققین نے اپنے مقالے کو پانچ یا چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے لیکن چند مقالے ایسے بھی ہیں جن میں ابواب کی تعداد موضوع کی محدودیت کے پیشِ نظر تین ہے۔ تین ابواب سے کم کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا مقالے کی ضخامت اور حجم سے زیادہ موضوع کی اہمیت اور اُس کو پیش کرنے میں ایجاز و اختصار کے حسن و خوبی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اوسطاً صفحات کی تعداد ۱۵۰ سے لے کر ۳۵۰ تک ہے۔

۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک لکھے جانے والے مقالوں کی تعداد ۱۱۷ ہے۔ ان میں اردو ادب کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور بہاول پور ڈویژن کے علاقائی ادب کو متعارف کرانے کے لیے مقامی شخصیات پر بھی پُر مغز مقالے لکھے گئے۔ انگریزی کتب کے تراجم اور مختلف اصناف پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔

طالب علموں کی توجہ کا مرکز زیادہ تر "شخصیت و فن" کا موضوع رہا ہے۔ اس حوالے سے مجموعی طور پر اب تک ۷۳ مقالے لکھے گئے۔ ان میں ۳۱ مقالہ جات شاعری کے حوالے سے اور ۴۲ مقالہ جات افسانوی ادب کے حوالے سے لکھے گئے۔ مختلف اصناف کے اعتبار سے مرثیہ نگاری، مسدّس، نظم گوئی، انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری، نثریہ ڈرامے اور خاکہ نگاری پر مقالے لکھے گئے نسیم حجازی کے ناولوں کا فکری و فنی تجزیہ (آخری چٹان، خاک و خون، یوسف بن تاشفین، شاہین، اندھیری رات کا مسافر، کلیاں اور آگ، معظم علی اور تلوار ٹوٹ گئی) آٹھ مقالہ جات لکھے گئے۔

مختلف ناولوں کے فکری و فنی تجزیہ کے ضمن میں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول "شام اودھ" اور "سنگم" کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

تراجم کے اعتبار سے انگریزی سے اردو ترجمہ میں لان جائی نس کے رسالے "ON THE SUBLIME" اور ای۔ ایم فاسٹر کی کتاب "ASPECTS OF NOVEL" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں روڈیارڈ کپلنگ کے ناول "کِم" اور محمد اسماعیل احمدانی کے سرائیکی ناول "چھولیاں" کا ترجمہ "لہریں" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

اشاریہ سازی اور وضاحتی فہرست کے اعتبار سے بارہ مقالے لکھے گئے "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" کے شارحین پر بھی دو مقالے لکھے گئے۔

بہاول پور کے حوالے سے "بہاول پور کے ادب کا تاریخی و تنقیدی مطالعہ"، "بہاول پور شہر کا ادب"، "بہاول پور میں ادبی رسائل و جرائد"، "بہاول پور ڈویژن کی علمی و ادبی انجمنیں"، بہاول پور میں اردو نثر قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد" اور "بہاول پور میں اردو نظم گوئی" چھ مقالے لکھے گئے۔

خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری اور کلامِ فرید کے اردو تراجم کا تنقیدی و تقابلی جائزہ، حسن عسکری کی تنقید اور "غبارِ خاطر" کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

جموعی اعتبار سے ان مقالہ جات کا معیار خاصا اچھا اور حوصلہ افزا ہے۔ شاعری کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، جاں نثار اختر، مظفر وارثی، قتیل شفائی، ظہور نظر، سہیل اختر، نقوی احمد پوری، مرتضیٰ برلاس، عزیز حاصل پوری، عبدالحق شوق اور پروین شاکر پر گراں قدر کام کیا گیا۔ مقالہ نگاروں نے شخصیت کے باب میں ان اہم شخصیات کی درون خانہ اور داخلی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو عام طور پر عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ ان کے شخصی اوصاف اور نفسیاتی عوامل و محرکات کے فن پر اثرات بھی پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں خود اُن سے سوالات اور انٹرویوز نے شخصی تاثر کو حقیقی رنگ بخشتے ہوئے مزید دلچسپی پیدا کی ہے۔ ان شعراء کے کلام کے فکری و فنی تجزیے کے ساتھ ساتھ مقالہ نگاروں نے مختلف اصناف غزل، نظم، نعت، گیت نگاری کا تاریخی اور تدریجی ارتقاء بھی پیش کیا ہے اگرچہ ان کا انداز روایاتی ہے۔ اضافوں اور ترامیم کی طرف توجہ نہیں کی گئی تاہم ان اصناف سے متعلق اہم معلومات میسر آجاتی ہیں۔ طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کی تحقیق و تنقید کے سلسلے میں یہ مقالے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانوی ادب کے حوالے سے فضل کریم فضلی، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، الطاف فاطمہ، نسیم حجازی، شمس آغا اور طارق اسماعیل ساگر پہ بہت اچھے مقالے تحریر کیے گئے۔ نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کے ساتھ ان کی مزاح نگاری پر بھی بہت محنت سے مقالہ لکھا گیا۔

"اردو ناول میں تصور انسان" اس حوالے سے منفرد انداز میں پیش کیا گیا کہ اس میں انسان اور آدمی، دیو مالائی تصور انسان، سیاسی تصورِ انسان، اور مذاہب میں تصور انسان کے ساتھ ساتھ جدید دور کے اہم ترین ناولوں "سنگم"، "اُداس نسلیں" اور "آگ کا دریا" میں تصورِ انسان کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگاروں نے احمد ندیم قاسمی، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، الطاف فاطمہ اور طارق اسماعیل ساگر سے انٹرویوز کے دوران ناول، افسانہ اور خاکہ سے متعلق اُن کے خیالات اور اہم فنی نکات پوچھے اور پیش کیے۔ مثال کے طور پر ممتاز مفتی کا بیان کہ وہ خاکہ نگاری کے لفظ "خاکہ" سے متفق نہیں۔ خاکے میں تضحیک کا پہلو یا پھر خاکہ محض آؤٹ لائن کا نام ہے لہذا اس صنف کے لیے شخصیت نگاری کا لفظ استعمال ہونا چاہیے۔

اصناف کے فن اور تدریجی ارتقاء پر براہِ راست کام نسبتاً کم ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مقالہ نگاروں کی پسند کا محور و مرکز ادبی شخصیات کے حوالے سے، اصناف کا جائزہ، تخصیص کے ساتھ رہا ہے۔ کسی صنفِ سخن کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے محقق کو زیادہ باریک بینی اور جانفشانی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ اہم ادبی شخصیات سے ملنا اور مختلف حوالوں سے گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پھر بھی "اردو میں شخصی مرثیہ نگاری" "انشائیہ نگاری اور "اردو افسانہ سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں" بہت اچھے مقالے لکھے گئے۔ شخصی مرثیہ نگاری کے تحت اہم فنی مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ مذہبی مرثیہ، قومی اور شخصی مرثیہ نگاری پر فنی بحث کے ساتھ ساتھ غالب، مومن، حالی، شبلی، اقبال، جوش، حفیظ جالندھری، فیض، عبدالعزیز خالد اور مصطفےٰ زیدی کے شخصی مرثیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ انشائیہ نگاری کے موضوع کو ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری تک محدود کر دیا گیا ہے تاہم انشائیہ کے فن، روایت اور آغاز و ارتقاء پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تخلیقی و تنقیدی اعتبار سے اس مقالے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ سہ ماہی "الزبیر" نے مارچ ۱۹۸۹ء میں اس مقالے کو وزیر آغا نمبر کی حیثیت سے شائع کیا۔ سانحہ مشرقی پاکستان ہماری تاریخ کا وہ المناک باب ہے جس نے ادب اور اس کے جملہ رجحانات و موضوعات کو یکسر بدل دیا۔ افسانے نے جذباتی شدت اور اختصار کی بنا پر سب سے زیادہ اثرات قبول کیے۔ چنانچہ مقالہ نگار نے سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب کا سائنٹفک

انداز سے جائزہ لینے کے بعد افسانے پر اس کے اثرات کا تجزیہ انتہائی غور و خوص سے کیا ہے۔

نسیم حجازی تاریخی ناول نگاری کی دنیا میں ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ان کے اہم ترین ناولوں پر جس انداز میں کام کیا گیا ہے پاکستان کی کسی اور جامعہ میں شاید ہی اس نوعیت کا کام کیا گیا ہو نسیم حجازی سے دلچسپی رکھنے والے اور ان کے محقق ان کی سوانح، تاریخی ناول کی روایت اور ان کے ناولوں کے فکر و فن کا مطالعہ بھرپور انداز میں کر سکتے ہیں۔

ترجمہ نگاری کی روایت بہت اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ جس سے علم و ادب کی اعلیٰ اور معیاری کتابوں کا لین دین کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں تنقیدی اعتبار سے لان جائی نس کے رسالے "ON THE SUBLIME" کا بہت اچھا ترجمہ کیا گیا ہے۔ لان جائی نس کے عہد سے پہلے کے تنقیدی رویوں کا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے لسانی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اسلوب کے تحت ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس ای۔ ایم فاسٹر کی کتاب "ASPECTS OF NOVEL" کے ترجمے میں محض لفظ بہ لفظ بٹھانے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ترجمہ نگاری پہ مقالہ جات کی حوصلہ شکنی یوں ضروری ہے کہ طالب علم خود محنت نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے یہ کام کرا لیتے ہیں۔

وضاحتی فہرست کے حوالے سے دو مقالے سنٹرل لائبریری اور مبارک لائبریری صادق آباد کی کتب کی اشاریہ سازی اس طور پر بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ مقالہ نگاروں نے لائبریریوں میں موجود کتب اور قلمی نسخوں کی فہرست انتہائی محنت سے مرتب کی ہے۔ کوئی بھی محقق کسی بھی موضوع سے متعلق کتب اور مخطوطات کے سلسلے میں ان سے مدد لے سکتا ہے۔

بہاول پور میں صحافت کی تاریخ خاصی روشن ہے۔ "العزیز"، "الفرید" اور "الزبیر" کی وضاحتی فہرست اور خاص نمبروں کا تذکرہ کر کے مقالہ نگاروں نے مستقبل کے محققین کے لیے کافی آسانی کر دی ہے۔ "الفرید" اور "العزیز" کے بعض پرچے نہیں مل سکے اور مقالہ نگاروں نے زیادہ تگ و دو بھی نہیں کی جتنے شمارے دستیاب ہو سکے انھیں ہی مرتب کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے سلسلے میں شائع ہونے والے رسائل اور اقبال پہ لکھے گئے مضامین کی فہرست اقبال کے شائقین کے لیے قابل توجہ ہے۔

شعبے کے تحت تحقیقی کام میں خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ دی گئی ہے کہ بہاول پور ڈویژن کی علمی ادبی خدمات تحقیقی کام کو ترجیح دی جائے۔ اس اعتبار سے یہاں سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام شعراء اور ادباء پہ کام کیا جا چکا ہے۔ بہاول پور میں اردو شاعری اور اردو نثر کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہاں کی علمی ادبی انجمنوں کا جائزہ بھی لیا جا چکا ہے تاکہ اس خطے کے حوالے سے اگر کوئی بڑا تحقیقی کام کرنا چاہے تو بہتر طرح کا مواد میسر آ سکے۔

یوں تو طالب علموں کی سطح پر یہ تحقیقی کام بہت حوصلہ افزا ہے تاہم طالب علموں میں تحقیق کی صحیح روح اجاگر کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بات کی حوصلہ شکنی ہونا چاہیے کہ مقالہ صرف نمبروں کے حصول اور اچھے نتائج کے لیے لیا جائے۔ اس امر کے لیے ضروری ہوگا کہ معروضی طرز کے ٹسٹ لیے جائیں تاکہ وہی لوگ اس میدان میں قدم رکھ سکیں جو واقعی پڑھنے لکھنے اور تحقیق کا ذوق رکھتے ہوں۔ ریاضت اور مشق کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ تحقیقی مراکز قائم کیے جائیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں ادبی تحقیق کے سلسلے میں کوئی زیادہ تگ و دو نہیں کی گئی۔ مرکزی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو، اردو اکیڈمی سندھ، مقتدرہ قومی زبان اور اردو اکیڈمی بہاول پور چند ایسے اہم تحقیقی مراکز ہیں جنھوں نے واقعی اپنے فریضے سے صحیح معنوں میں انصاف کیا ہے۔

اعلیٰ اور معیاری تحقیق کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر جامعہ میں تحقیقی مراکز قائم کیے جائیں کیوں کہ یونیورسٹی کی سطح پر ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں صرف پنجاب یونیورسٹی اور جامعہ کراچی میں یہ مراکز باقاعدگی کے ساتھ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تاریخی، سیاسی، مذہبی، سائنسی تحقیق اور جملہ موضوعات پر کتب کی اشاعت خاصی حوصلہ افزا ہے۔

ادبی تحقیق کے ضمن میں رسائل و جرائد بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کے اس دور میں اگرچہ ادبی رسائل کی اہمیت نہیں رہی۔ ڈائجسٹوں نے اپنی سنسنی خیزی سے ادبی رسائل کا استحصال کیا ہے۔ تاہم افکار، نقوش، فنون، اوراق، رسالہ اردو اور نگار نے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان رسائل کو باقاعدگی کے ساتھ یونیورسٹی لائبریری میں آنا چاہیے تاکہ طلبہ ان کے تحقیقی مواد سے استفادہ کر سکیں۔

ادبی تحقیق کے فروغ کے لیے ضروری ہوگا کہ نادر و نایاب کتب کا از سر نو جائزہ لے کر ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ ہمارے ہاں لاتعداد ایسی قیمتی کتب موجود ہیں جو اپنے پہلے ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد دستیاب نہیں ہوتیں۔ مخطوطات اور خاص طور پر یونیورسٹی سطح پر ہونے والے تحقیقی کام کی وضاحتی فہرست کو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہنا چاہیے تاکہ پتا چلتا رہے کہ کس ادارے میں کس نوعیت کا کام ہو چکا ہے عام طور پر مشترکہ نوعیت کے موضوعات میں اسکالر محنت و جانفشانی سے کام نہیں کرتے۔ طالب علم یا تو پورے کا پورا مقالہ نقل کر لیتے ہیں یا پھر تھوڑا بہت رد و بدل کر کے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں علاقائی ادب اور اس ورثے سے تعلق رکھنے والوں کی علمی ادبی خدمات پر تحقیقی کام دیا جائے تو اس تکلیف دہ صورت حال سے بچا جا سکتا ہے۔

تحقیقی کام کے سلسلے میں صحیح موضوع کا انتخاب بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع طالب علم کے ذوق کے مطابق ہونا خاص طور پر نثر اور شاعری کے موضوعات کی تخصیص بہت ضروری ہے یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ شاعری کے موضوعات پر ان طالب علموں نے بھی تحقیقی کام کیا جو ایک شعر تک صحیح طور پر نہ پڑھ سکتے تھے۔ یوں موضوعات پر طالب علموں اور ان اساتذہ کا مباحثہ اور گفتگو بہت ضروری ہے اور ابتدا ہی میں اگر طلبہ کو فنِ تحقیق کے اصول و قواعد اور متعلقہ موضوعات پر ان کے مختلف انداز پر لیکچر دیے جائیں تو بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ علاوہ ازیں تعلیمی سال کے آغاز ہی میں اگر طلبہ کو موضوعات دے دیے جائیں اور وقتاً فوقتاً ان کے کام کا جائزہ بھی لیا جاتا رہے تو وہ زیادہ وقت تحقیق کو دے پائیں گے اور اس طرح بہتر کام کر سکیں گے۔

بعض اوقات بہت اچھے اور ذہین طالب علم اخراجات کی وجہ سے مقالہ نہیں لکھ پاتے جامعات اور درس گاہوں کو ان کی مالی معاونت کرنا چاہیے اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ کسی ایک جامعہ میں تحقیقی کام ہونے والے موضوع پر دوسری جامعہ میں کام نہ ہو۔ طالب علم بعض اوقات مقالہ جات ہو بہو نقل کر لیتے ہیں یا پھر بیشتر مواد نقل شدہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے اگر جامعات میں باہمی ربط و تعلق رکھتے ہوئے موضوعات کی فہرستیں ایک دوسرے کو بھجواتی رہیں تو اس افسوسناک صورت حال پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک موضوع پر مختلف جامعات میں ہونے والے تحقیقی کام کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو بھی تحقیقی معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ عام طور پر طلبہ متعلقہ موضوع کے مواد کو کتب یا دوسرے مقالہ جات سے اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ خود سوچنے، تحقیق کرنے یا اختلاف کرنے کی گنجائش ہی محسوس نہیں کرتے۔ یا پھر اقتباسات پہ اقتباسات

پیش کیے چلے جاتے ہیں۔ اس انداز کو بھی ختم کرنے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ طلبہ زیادہ سے زیادہ ذاتی نقطۂ نظر کو سامنے لائیں۔ شعبہ جاتی کتب خانوں اور مرکزی کتب خانوں میں ہر سال چھپنے والی تمام کتب موجود ہونی چاہئیں تاکہ طلبہ نئے افکار اور نئی تحقیق کی روشنی میں نہ صرف کام کر سکیں بلکہ اپنے کیے ہوئے کام کی جانچ پڑتال بھی کر سکیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی تینوں سطحوں پر اپنے اپنے معیار کے لحاظ سے تحقیقی کام ہونا چاہیے اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تحقیقی مراکز کا قیام بہت ضروری ہے تاکہ نئی تحقیقات کی روشنی میں علوم و فنون کے نئے زاویے سامنے آئیں اور ان نئے زاویوں کے لیے ہمیں محض یورپ کو ہی نہ دیکھنا پڑے۔

حوالہ جات

۱۔ اردو میں اصول تحقیق۔ جلد اول مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطان بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۔ اردو میں اصول تحقیق جلد دوم۔ ایضاً

۳۔ تحقیق کے طریق کار۔ ڈاکٹر ش۔ اختر

۴۔ مقالہ جات۔ ایم۔ اے۔ شعبہ اردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

(٭) شعبہ اردو! اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

(۱) "تحقیق و تنقید" نیا دور، ۵۔۶۔۱۹۵۶ء

(۲) "تحقیق اور اس کا طریق کار"

(۳) "تحقیق کا طریق کار" ص ۵ طبع اول دہلی ۱۹۸۵ء

(۴) اردو میں اصول تحقیق ص ۱۳۱۔ مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش طبع اول ۱۹۸۸ء

ایرانی کہانی

"مَینا، خوف اور خاموشی"

نادر ابراہیمی / مُعین نظامی

(کتاب "آرش در قلم و تردید" سے انتخاب)

ایک تھکا ماندہ نوجوان پنجروں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اُس نے کندھے اوپر کو اُٹھا رکھے تھے۔ پرندہ فروش کافی دیر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ باجرے سے بھرا ہوا پیالہ زمین پر رکھ کر آگے بڑھا:

..... "کون سا پرندہ چاہیے؟"

..... "کوئی بھی نہیں، میں تو صرف دیکھ رہا ہوں!"

پرندہ فروش کہنے لگا: "بہت سے لوگ پہلے "صرف" دیکھتے ہیں، پھر "صرف" بھاؤ تاؤ کرتے ہیں اور آخر کو پوچھتے ہیں: "انھیں کیا کیا کھلایا جائے؟" دیکھ لیجیے گاہکوں کا کتنا رش ہو گیا ہے! جو دیہاتی یہاں پڑھنے آتے ہیں، ان کی ہمّت بہت جلد جواب دے جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں عورت ہر وقت تو دلچسپی کا باعث نہیں ہوتی نا! میں نے بہت سے دیہاتی لڑکوں کو خوبصورت پرندے بیچے ہیں۔"

نوجوان نے ذرا آگے بڑھ کر پوچھا: "پرندے بھلا کیا کر سکتے ہیں؟"

پرندہ فروش نے سر اُٹھا کر چھت کی طرف دیکھا:

..... "میاں مٹھو! ابھی تھکے نہیں ہو؟"

..... "نہیں! میں کبھی نہیں تھکوں گا!"

..... "تمھارا کیا خیال ہے ان صاحب کو کسی ایسے پرندے کی ضرورت نہیں ہے جو ان کا دل لُبھا سکے؟"

..... "کیوں نہیں ہے! ہر شخص کے لیے دل لُبھانے والی کوئی چیز تو ہونی چاہیے۔"

..... "میاں مٹھو! کیا خیال ہے عورت دلچسپی کی اچھی چیز ہو سکتی ہے؟"

..... "اوہ، نہیں بُری بات ہے۔ عاشق لوگ بھی تو ہمیشہ اُداس ہی رہتے ہیں۔ آدمی کو غم سے زیادہ خوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

نوجوان دبی دبی ہنسی کے ساتھ اوپر دیکھ رہا تھا۔ طرح طرح کے رنگوں کے چھوٹے بڑے کئی طوطے، اپنے اپنے پنجروں میں بند، چھت سے لٹک رہے تھے۔

نوجوان نے ہولے سے کہا: "میاں مٹھو! ابھی تھکے نہیں ہو؟"

..... "نہیں! میں کبھی نہیں تھکوں گا!"

..... "سچ آپ نے کیا منتر پھونکا ہے کہ یہ پرندہ یوں محبوبانہ انداز میں باتیں کرنا سیکھ گیا ہے؟ میں نے سُنا ہے کہ پرندوں کو باتیں سکھانے کے لیے بہت اذیتیں دی جاتی ہیں۔ یقیناً اس بیچارے نے بھی ڈھیروں تکلیفیں سہی ہوں گی، جبھی تو یہ پیاری پیاری باتیں سیکھ گیا ہے۔"

..... "نہیں، خدا کی قسم نہیں! اس نے یہ چند باتیں ایک اور پرندے سے سیکھی ہیں۔ ہاں ایک بات ہے "غم" کا لفظ اسے پہلے دن سے ہی آتا تھا، جسے میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کرا پایا۔ اس کے اُستاد پرندے کا نام "مَینا" ہے، جسے میں خود ہندوستان کے دور دراز کے جنگلوں سے پکڑ لایا ہوں۔ دیکھیے تو (پرندہ فروش نے ایک کونے سے ایک پنجرہ اُٹھالیا) ہاں تو صاحب میری مَینا ہی نے ان سب طوطوں کو باتیں سکھائی ہیں، لیکن اسے اس لیے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ یہ کبھی تلخ باتیں نہیں کرتی۔"

..... "مَینا! آج کا دن اچھا گزرا؟"

..... "ہمیشہ کی طرح، بہت اچھا!"

نوجوان نے تعجب سے پوچھا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں کا آزاد پنچھی ایک چھوٹے سے پنجرے میں خوش رہے؟ مَینا شاید ان لفظوں کا مطلب نہیں جانتی۔"

پرندہ فروش کہنے لگا: "صاحب اسے اپنا پنجرہ جنگل سے زیادہ پسند ہے۔ آپ کو ہندوستان کی جنگلی بلّیوں کا پتہ نہیں ہے مَینا یہاں خوش ہے۔ میں اگر پنجرے کا دروازہ کھول دوں تو بھی وہ کہیں نہیں جائے گی۔ مَینا! ان صاحب سے کہو کہ اگر یہ تمھیں خرید لیں تو تم ان کی بہترین دوست ہوگی!"

مَینا اپنی موٹی موٹی خوبصورت سی آنکھوں سے کچھ دیر نوجوان کو دیکھتی رہی۔ اُس نے اپنے پنجے سے گردن کے پَر سہلاتے ہوئے ایک بار پھر اُسے دیکھا۔ نوجوان اُس کے قریب ہوگیا دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

..... "اچھا، یہ مجھے دے دو اور بتاؤ میں اِسے کھانے کے لیے کیا دیا کروں؟"

پرندہ فروش نے کہا: "باجرہ یا کچھ اور، جو بھی آپ چاہیں!"

O

مَینا نوجوان کی تنہا راتوں کو تروتازہ کہانیوں سے سجاتی رہی۔ نوجوان کو اُس کی خوابناک کہانیوں کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہتا: "تنہائی کی ان طویل راتوں میں کوئی میری مَینا کی جگہ لے سکے گا؟"

O

قومی زبان (۶۹) اکتوبر ۱۹۹۳ء

اُڑے ہوئے رنگ والا تھکا ماندہ نوجوان بستر پر گر پڑا۔ اُس نے کتابیں فرش پر پٹخ دیں اور مینا کی طرف دیکھنے لگا:
..... "مینا! مجھے کوئی کہانی سناؤ، اُنھی کہانیوں جیسی کوئی کہانی جو دکھوں کا گرد و غبار دھو دیتی ہیں، جو غمِ تنہائی سے نجات دلاتی ہیں۔ آج مجھے کوئی خوش کر دینے والی کہانی سناؤ۔"

مینا نے پنجرے کی سلاخوں سے چونچ باہر نکالی: "کیا میں نے آپ کو اُس ہندوستانی لڑکی کی داستانِ محبت سنائی ہے؟"

..... "نہیں مینا، تم نے ابھی نہیں سنائی!"

..... "اُس زمانے میں، میں ہندوستان میں تھی۔ ابھی پرندہ فروش نے مجھے پنجرے کا عادی نہیں بنایا تھا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ پھولوں سے لدے ہوئے اناروں کے ایک باغ میں، ایک راجہ کی بیٹی چوری چھپے ایک غریب لڑکے سے مل رہی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ آپ کو پتہ ہے محبت کتنی میٹھی ہوتی ہے؟"

..... "نہیں! ابھی میں کسی سے محبت نہیں کر سکا۔"

..... "سچ..... سچ..... آپ کتنے تنہا ہیں! محبت ہو تو زندگی اپنی ساری الجھنوں سمیت اچھی لگتی ہے۔"

..... "مینا! کہانی سُناتی رہو!"

..... "اچھا تو وہ جو تھے نا، دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے، ہوتے ہوتے بوڑھے راجہ کو بھی اُن کی محبت کی بھنک پڑ گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ شہزادی کے لیے طلائی شیشوں کا ایک قید خانہ تیار کیا جائے اور اس کے ارد گرد رات دن پہرہ رہے! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی رات دن زار و قطار روتی رہتی۔ بوڑھا راجہ خدا شناس آدمی تھا۔ وہ مغموم دل کے ساتھ ساری ساری رات محرابِ عبادت میں گڑگڑا کر خدا سے مدد مانگتا اور سوچتا رہتا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ دونوں مرتے دم تک بھی محبت سے چھٹکارا نہیں پا سکیں گے۔

میری ماں پنجرے سے بھاگا ہوا پرندہ تھی۔ اُسی نے مجھے انسانوں کی زبان سکھائی تھی۔ ایک رات میں راجہ کے پردہ محراب کے پیچھے بیٹھ گئی جب اُس نے خدا کو پکارا تو میں نے جواب دیا: "ہاں اے بوڑھے راجہ! کہو کیا چاہتے ہو؟"

راجہ ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے پھر خدا کو پکارا۔ جواب میں، میں بولی: "اے میرے بندے، بتاؤ تمھیں کس نے دکھ دیا ہے؟"

راجہ کہنے لگا: "اے میرے پالن ہار! تو اتنے دن کہاں تھا؟ میں کئی راتوں سے تیرے دربار میں حاضر ہوں، تو نے میری باتیں نہیں سُنیں؟"

میں نے کہا: "خبردار! اپنی چادر سے پاؤں باہر مت نکالو۔ میں کچھ تھک گیا تھا۔ تھکن نے مجھے سلا دیا۔ آج فرشتوں نے میرے سرہانے آ کے بتایا ہے کہ تم بہت پریشان ہو، بولو، کیا چاہتے ہو؟"

راجہ نے کہا: "کیا تو نے ایک غریب لڑکے سے میری بیٹی کے عشق کی داستان سُنی ہے؟"

..... "ہاں سنی ہے!"

..... "تو بتاؤ اُن کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

"تم نے سنا نہیں ہے کہ غریبوں کے لیے میری جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ تم ناحق ہلکان ہوتے رہے ہو۔ تم نے خواہ مخواہ میری نیند بھی خراب کی، اب یہ ہے کہ کل ہی اُن دونوں کے لیے بہت بڑا جشن برپا کرو!"

راجہ خوش ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو آزاد کر دیا۔ اگلی رات، میں اُن کے یادگار جشن میں گیت گاتی رہی۔ نوجوان! کیا

آپ جانتے ہیں کہ کسی تک پہنچ جانے میں کتنی لذّت ہوتی ہے؟"

..... "نہیں مَینا! میں ابھی تک کہیں بھی نہیں پہنچا۔"

..... "آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، بالکل اُس خدا کی طرح جو میں نے راجہ کے لیے گھڑا تھا۔ اب ساری زندگی تو ایک بیچارے چھوٹے سے پرندے کے ساتھ نہیں گزاری جاسکتی نا! اگر آپ کوشش کریں تو آپ کو بھی زیادہ بڑی خوشیاں مل سکتی ہیں اور آپ کی مَینا بھی اپنے بہت بڑے جنگل اور اپنے اناروں کے باغ کو واپس جاسکتی ہے..... کل میں آپ کو ایک ایسی کہانی سناؤں گی کہ بس آپ خوش ہوجائیں گے!"

O

آدھے خوش اور آدھے اُداس نوجوان نے اپنے آپ کو بستر پر گرادیا۔

..... "اچھی مَینا! مجھے کوئی ایسی کہانی سناؤ جو برداشت کی کڑواہٹ ختم کردے۔ مجھے ہندوستان کے دور دراز کے جنگلوں سے سیکھی ہوئی کوئی کہانی سناؤ۔ اب مجھے بھی ایک بہت بڑی خوشی ملنے والی ہے اور تم بھی آزاد ہونے والی ہو۔ مَینا! مجھے کوئی خوش کر دینے والی کہانی سناؤ!"

مَینا نے اپنی موٹی موٹی خوبصورت سی آنکھیں نوجوان کی طرف پھیریں: "مجھے ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے!"

نوجوان بستر سے اُچھل کر پنجرے کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے پنجرہ نیچے کر کے کہا: "مَینا! کیا کہا ہے؟ شاید میں نے غلط سُنا ہے! کیا کہا؟"

..... "مجھے ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے!"

نوجوان چلّایا: "نہیں، مَینا نہیں، پرندہ فروش تو کہتا تھا تم کبھی تلخ باتیں نہیں کرتی ہو۔ میں نے اپنے سارے خوف کے باوجود تمھیں خرید لیا تھا۔ میری زندگی میں خوف کے سوا ہے ہی کیا؟ نہیں، مَینا! نہیں۔ اب یہ الفاظ منہ سے نہ نکالنا!"

..... "مجھے ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے!"

نوجوان مشتعل ہوگیا۔ زخم خوردہ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اُس نے پنجرے کو جھٹکا دیا اور چلّایا: "مَینا! یہ بات تمھیں کس نے سکھائی ہے؟ میں تو جاتے ہوئے سب کھڑکیاں دروازے اچھی طرح سے بند کر کے جاتا تھا۔ میں نے تمھیں کسی سے گپ شپ بھی نہیں لگانے دی۔ میں نے تمھارے لیے تنہائی کا بہت بڑا قلعہ بنایا۔ خبردار اگر تم نے پھر ایسی بات کی! خدا کی قسم میں اپنے ہاتھوں سے تمھاری گردن مروڑ دوں گا۔ اچھا اب ذرا بتاؤ آج کا دن اچھا گزرا؟"

..... "مجھے ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے!"

غصّے سے نوجوان کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ اُس نے پنجرے کا دروازہ کھول کر مَینا کو باہر کھینچ لیا۔ اُس کی گردن پہ دو انگلیاں رکھ کر اُس نے اتنا دبایا کہ تیز جھکڑ چلنے کی آواز سُنائی دینے لگی.....

پھر اُس نے مَینا کا مُردہ جسم کمرے کے فرش پر پھینک دیا۔

اُڑے ہوئے رنگ والا تھکا ماندہ نوجوان بستر پر گر پڑا۔ اُسے یوں لگا جیسے کوئی کھڑکی کو ہلا رہا ہے۔ اُس نے مُڑ کے دیکھا ایک موٹا تازہ کالا بلا شیشے سے زور آزمائی کر رہا تھا اور موٹی موٹی ڈراؤنی آنکھوں سے اُسے دیکھے جاتا تھا۔

نوجوان دھیرے سے کراہا: "مجھے ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر لگ رہا ہے!"

انگریزی نظم

"گڑیا کا خط مرحوم دادا کے نام

شکیل فاروقی ترجمہ/معین دانش

نسلوں کے ان داتا
دادا
کیسے ہیں؟
کچھ تو بتائیں....؟
دل کہتا ہے، خیر سے ہوں گے، اچھے ہوں گے
خواہش ہے
میں آپ کو دیکھوں
زندہ بھی اور زندہ تر بھی
اور
نئی کہانی ہوتی
ظلمت میں اجیالوں کی
آئیں.....
اک دن، پاس ہمارے
جب ہفتے کی چھٹی ہو
دن بھر شہر میں قیام کریں
اور پھر کھیلیں تو....
میرے ساتھ
بھول نہ جائیں، لانا
اپنے سنگ

مجھ کو یقین ہے
ایسے کھلونے اور کہاں ہو سکتے ہیں
ان انمول کھلونوں کا، احساس یہی ہے... پاس یہی ہے۔
نظروں کی اب پیاس رہے گی
آس رہے گی
آپ کی ننھی منّی گڑیا
خیر اندیش!

چترالی نظم

کھوار

شاعر و مترجم: رحمت عزیز چترالی

کرائے کے مکان میں بھی
مجھے آج ڈر لگ رہا ہے
عمارت تو پکی ہے لیکن
مجھے تو کھنڈر لگ رہا ہے

پانی کا ایک قطرہ بھی
آج مجھے سمندر لگ رہا ہے

کل تک جو غلام تھا عزیز
آج معتبر لگ رہا ہے

پنجابی نظم

"ماں"

موہن سنگھ/ارشد محمود ناشاد

ماں جیسا
کوئی شجر سایہ دار
مجھ کو نظر نہ آئے
لے کر جس سے چھاؤں ادھار
رب فردوس بنائے
باقی کل جہان کے پودے
جڑ سوکھے، مرجھائیں
پر پھولوں کے کملانے سے
یہ پودا، مرجائے۔

محبّت کی دیوی

سیموئیل بیکٹ/ادیب سہیل

وہ میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے
اور اُس کے بال میرے بالوں میں۔
وہ میری آنکھ کے رنگ جیسی ہے
اس کا بدن میرے ہاتھ کا مرہون۔
وہ میری چھاؤں کے ہالے میں ایسے ہے
جیسے پتھر کے گرد آسماں!

وہ اپنی آنکھیں کبھی بند نہیں کرے گی
اور وہ مجھے سونے نہیں دیتی ہے
اور روشن دن میں اس کے خواب
سورجوں کو الوپ کر دیتے ہیں
اور میں ہنستا ہوں، چلاتا ہوں اور ہنستا ہوں
اور بولتا تب ہوں جب بولنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا!

(۱۹۲۴ء)

قومی زبان (۷۳) اکتوبر ۱۹۹۳ء

"کہو دل کی بات"

ایڈگر ایلن پو/ مہ جبیں قیصر

یہ درست ہے کہ میں بہت ہی خوفناک حد تک اعصابی تناؤ کا شکار رہ چکا ہوں ... اور ہوں .... مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہوں؟ یہ اور بات ہے کہ بیماریوں نے مجھے ذکی الحس بنا دیا تھا.... مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میرے تمام احساسات یکسر ختم ہو گئے ہوں۔ یا تھک گئے ہوں۔ گو کہ میری حسِ سماعت دوسری حِسوں کے مقابلے میں بہت تیز ہو گوی تھی۔.... میں نے "عالم بالا" اور اس زمین پر موجود بہت سی اشیا کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور یہی نہیں میں تو "عالم اسفل" کی بھی بہت سی چیزوں کو جانتا تھا۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ میں پاگل ہوں؟ ذرا توجہ سے سننا! اور دیکھنا کہ میں کیسے کسی صحت مند انسان کی طرح سکون کے ساتھ تمھیں اپنی پوری کہانی سناؤں گا۔

یہ سب کچھ ہی کتنا غیر یقینی سا لگتا ہے کہ جب پہلی بار "وہ خیال" میرے ذہن میں سمایا تھا۔ لیکن پھر وہ خیال ایک بار میرے ذہن میں چپک گیا تو میں دن رات اس خلفشار کا شکار رہا تھا۔ اس خیال میں نہ تو کوئی شے ہی تھی اور نہ ہی جذبات تھے۔ تم یقین کرو کہ میں بوڑھوں سے پیار کرتا ہوں۔ اور پھر اس نے مجھے کبھی بھی بُرا نہیں کہا تھا اور نہ ہی کبھی بے عزتی کی تھی، اور نہ ہی مجھے اس کی زر و دولت کے حصول کی خواہش تھی میرا خیال ہے کہ شاید یہ بات صرف اس کی آنکھ کی تھی۔ اس کی آنکھ سے میں حد درجہ خوف زدہ تھا۔ ہاں! یہ اس کی آنکھ ہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل گدھ سے مشابہ تھیں بد رونق نیلی جھلی دار آنکھ ... جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ... اور پھر یوں بتدریج .. بہت آہستہ آہستہ ... میں نے اپنے ذہن کو بوڑھے سے سمجھوتہ کرنے پر تیار کر لیا تھا۔ اور یہ سمجھوتہ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ سے خوف کچھ کم ہو گیا تھا۔

اور اب یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے ... یہ تمھارا وہم ہی تو ہے جو تم مجھے پاگل سمجھتے ہو ... لیکن شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ پاگل آدمی کچھ نہیں جانتا.. مگر تم نے مجھے دیکھا ہے ... اور تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ میں کتنی عقلمندی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں کتنی دور بینی کے ساتھ اور کتنی منافقت کے ساتھ میں نے تمام کاموں کو انجام تک پہنچایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس بوڑھے پر کبھی بھی مہربان نہیں رہا گو کہ اُسے مارنے میں میں نے پورا ایک ہفتہ خرچ کیا تھا۔ اس عمل کو شروع کرنے کے لیے پہلی مرتبہ رات کو میں نے اس کے دروازہ بند کرنے کا پھر کی دار ہینڈل موڑا اور بہت ہی شرافت سے اسے کھولا تھا اور اس کے بعد پھر میں نے ہر رات کو ایسا ہی کیا تھا.... دروازہ کھولنے کے بعد ذہنی طور پر میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا کہ کرے

میں ایک طرف چراغ رکھا تھا جو دھیمی لو سے جل رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ اور کم کر دیا تھا تاکہ روشنی باہر نہ جاسکے۔ پھر مجھے ذہنی طور پر جھٹکا سا محسوس ہوا۔ میں نے دروازہ کیسے کھولا؟ یہ جان کر تم ہنسو گے۔ میں نے بہت چالاکی سے دروازہ کھولا اور بہت آہستگی کے ساتھ آگے بڑھا تاکہ بوڑھے کی نیند خراب نہ ہو۔ اور میں پورا ایک گھنٹہ اس جگہ پر رہا تھا۔ اس گھر میں میری ذہنی کیفیت خاصی تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں جب تک اس بوڑھے کو دیکھتا رہا وہ اپنے بستر پر جوں کا توں لیٹا رہا کیا تم نے کبھی اتنا عقلمند پاگل دیکھا ہے؟۔ اور جب میں ذہنی طور پر اس کمرے میں مانوس ہوگیا تو میں نے چراغ کو بالکل ہی کم کر دیا۔ یہ کام میں نے بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ بہت ہی ہوشیاری سے .... میں نے اُسے اتنا کم کر دیا تھا کہ چراغ کی صرف ننھی اور بہت مریل سی کرن اس گدھ نما آنکھ پر پڑ رہی تھی .... اور ایسا میں نے سات طویل راتوں تک کیا تھا۔ ہر رات بالکل اس پہلی رات کی طرح مگر وہ آنکھ مجھے ہمیشہ بند ملی اور اسی لیے میں اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا پارہا تھا.... حالانکہ وہ بوڑھا شخص ایسا نہیں تھا کہ جو مجھے تنگ کرتا مگر اس کی شیطانی آنکھ .... اُف!..... دن نکلنے کے بعد ہر صبح میں اس کے کمرے میں کمال بہادری سے گھس جاتا اور بلا کسی خوف و تردُد کے اس سے گفتگو کرتا اور پھر یہی نہیں بلکہ میں اپنی تمام تر حلاوت و شیرینی گھلی آواز میں اسے اس کے نام سے پکارا کرتا اور یہ تحقیق کرتا کہ اس نے رات کیسے گزاری .... تم نے دیکھا وہ کتنا جید اور معتبر بوڑھا رہا ہوگا بیشک ہر رات ٹھیک بارہ بجے مجھے اس پر شک ہوا کرتا تھا۔ اور جب وہ سورہا ہوتا تھا تو اس شکار پر میں پُراشتیاق نگاہ ڈالتا تھا۔

آٹھویں رات کو مقابلتاً اور راتوں کے میں دروازہ کھولنے میں خاصا محتاط تھا...... تھوڑا سا بلکہ یوں سمجھیں چند ثانیے کے لیے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس رات سے پہلے اپنی عقلمندی اور طاقت کا اندازہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ میری یہ شدید خواہش شاید ہی کبھی کامیاب ہو سکے۔ سوچو! میں اس کا دروازہ کھول رہا تھا آہستہ آہستہ اور اُسے میرے اندرونی خواب اور مخفی خیالات و عمل کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں اپنے خیالی منصوبے پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا.... اور شاید اس نے میری آہٹ کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ اچانک ہی اس نے بستر پر کروٹ بدلی تھی جیسے کہ وہ چونک گیا ہو اب تم یہ سوچ رہے ہوگے کہ شاید میں اپنے ارادہ سے باز آگیا ہوں..... مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کے کمرے میں تارکول کے گہرے سیاہ رنگ جیسا اندھیرا ہو رہا تھا۔ اور دروازے ڈاکوؤں کے ڈر کی وجہ سے جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا میرا خیال تھا کہ شاید اس نے دروازہ کھولتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے دروازے کے پٹوں کو برابر سے دباؤ ڈال کر دھکا دیا اور سر اندر ڈال کر پھر میں نے سوچا کہ چراغ کی لَو کو تھوڑا سا بڑھالیا جائے اور اسی ارادے کے تحت چراغ اٹھانے کی کوشش میں میرا انگوٹھا ٹین کے چراغ سے ٹکرا گیا۔ بوڑھا اس آواز کو سن کر بستر پر اُچھل پڑا اور چلّایا "یہاں کون ہے؟"

میں نے ابھی تک بالکل چُپ سادھ رکھی تھی اور کچھ بھی نہیں بولا تھا پورے ایک گھنٹے تک اپنے جسم کو ساکت کئے رکھا اور اس اثناء میں میں نے نہ تو اسے خاموش ہی ہوتے سنا اور نہ ہی لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ اب بھی بستر پر پڑا لیٹا ہوا تھا اور اس کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے ..... بالکل جیسے کہ میں کچھ کرنے والا ہوں اور وہ رات کے گزرتے ہوئے لمحوں میں دیوار پر نظریں گاڑے ہوئے موت کی آتی چاپ کو بغور سن رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک نحیف سی کراہ سنی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کراہ موت کی جان لیوا خوف کی وجہ سے تھی۔ یہ کراہ نہ تو کسی درد کی وجہ سے اور نہ ہی کسی دکھ کی تھی ..... اوہ! نہیں .... یہ آواز تو کرخت اور گھٹی ہوئی تھی۔ اس طرح کی کہ جیسے روح کی گہرائیوں سے ایک بار پھر جنم لے رہی ہو جس میں ضرورت سے زیادہ رعب بھی شامل ہو میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

کئی ایک گزری ہوئی راتیں بالکل اسی پہلی رات کی طرح کہ جب پورا عالم محو خواب تھا۔ میرے سینے کے اندر بھی اتھاہ گہرائیوں میں اسی طرح خوف سے بھری بازگشت گونجی تھی۔ اس خوف نے کچھ دیر کے لیے میری توجہ اصل مسئلہ سے ہٹادی تھی.... مگر میں کہتا ہوں کہ بوڑھے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت بوڑھا کیا سوچ رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یقیناً لیٹا ہوا جاگ رہا ہوگا اور جب اس نے بستر پر کروٹ بدلی ہوگی تو یہ کمزور سی آواز اس وقت نکلی ہوگی۔ اور شاید وہ اب تک خوف پر غلبہ پاچکا ہو اور یقیناً ان تمام بے سبب واہموں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا.... مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا.... وہ خود ہی اپنے طور پر سوچ رہا تھا کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ چمنی سے نکلنے والی ہوا کی آواز ہے.... یا پھر یہ چوہا ہوگا جو ابھی فرش پر گزرا ہوگا... یا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ محض ایک جھینگر کی آواز ہو کہ جس نے چیں چیں کی آواز نکالی ہو؛.... ہاں!... وہ اپنے انھی مفروضوں سے خود کو سکون دینے کی کوشش کر رہا تھا... مگر یہ تمام باتیں ہی اس کے لیے بے بنیاد ثابت ہوئی تھیں.... تمام چیزیں بے حقیقت تھیں کیونکہ موت اپنی سیاہ چادر پھیلائے اور سینہ تانے اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے نزدیک تر ہوتی جارہی تھی اور یہ اندوہ ناک اثر یا نامعلوم سایہ تھا؟ اس لیے کہ وہ ان تمام اسباب کو بخوبی محسوس کر رہا تھا گو کہ نہ اس نے کبھی دیکھا اور نہ ہی سنا تھا۔ حالانکہ اس کمرے میں اسے صرف سر ہی دکھائی دیا تھا۔

میں نے بہت صبر و سکون کے ساتھ ایک طویل عرصہ انتظار میں گزارا تھا مگر اس وقت تک مجھے اس کے لیٹنے کی آہٹ نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے پھر چراغ کو تھوڑا سا بڑھانے کا ارادہ کیا.... بہت تھوڑا سا لہٰذا میں نے اسے کھولا چراغ میں بہت چھوٹی سی درز ہوئی۔ تم تصور نہیں کرسکتے کہ میں نے اسے کتنی چالاکی سے کھولا تھا۔ بالآخر ایک باریک سی مریل کرن مکڑی کے جالے کے تار کی مانند چراغ کی درز سے باہر نکلی اور اس کی گدھ نما آنکھ پر پھیل گئی۔

اس کی آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ پوری کی پوری اور یہ دیکھتے ہی میں غصہ سے کھول گیا۔ میں نے اسے گھورا اور پوری توجہ سے دیکھا اس کی آنکھ پر پھیکا نیلے رنگ کا پردہ چھایا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے اپنی ہڈیوں کا گودا بھی جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا میں نے اس بوڑھے شخص کے چہرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا باوجود یکہ میں نے ایک ننھی سی کرن براہ راست اس پر ڈالی تھی مگر یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ کرن سیدھی اُس منحوس حصہ پر پھیل گئی یعنی اس کی خوفناک آنکھ پر۔

اور کیا میں نے تمھیں پاگل پن کے بارے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ تمھیں کیسا دھوکا ہوا ہے۔ اب میں یہ کہتا ہوں کہ میرے کانوں میں تھکی ہوئی دھیمی اور جاندار آوازیں آتی ہیں کسی ایسی گھڑی کی آواز کی طرح کہ جسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح آوازیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ یہ آواز بوڑھے کی دل کی آواز تھی۔ اور اسی آواز نے میرے خوابیدہ جذبوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جس طرح کہ ڈھول کی تھاپ سپاہیوں کے جوش و ولولہ بڑھادیتے ہیں۔

لیکن اس وقت تک میں ضبط کرنے پر مجبور تھا اور میں بے حس و حرکت چراغ پکڑے ہوئے تھا اس لیے میں نے بہ مشکل ہی سانس لی اور اس آنکھ پر پڑنے والی ننھی کرن کو باقاعدگی سے سنبھالے رکھا اور اس دوران دل کی دھڑکن کو بڑھانے کے لیے اپنا سینہ تھپ تھپایا اور وہ تیزی سے حرکت کرنے لگا اور لحہ بہ لحہ دھڑکن بڑھتی گئی اور اب بوڑھے کا خوف بھی انتہائی حدود کو پہنچ چکا تھا پھر یہ خوف کچھ اور بڑھا میں کہتا ہوں کہ ہر لحہ ہی تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا.... کیا تم مجھے ان حالات میں بہتری کی کوئی علامت بتاسکتے ہو؟ میں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں خوف زدہ تھا اور اب گزری ہوئی یہ رات اور اس پرانے مکان کا خوف زدہ

ماحول... اور پھر ایک اجنبی آواز ایسے وقت اور اس ماحول میں مجھے برانگیختہ کیا کہ جس پر قابو پانا مشکل بلکہ ناممکن تھا اور میں اسی مناسب وقت کے انتظار میں اب تک بیتاب ہوتا رہا تھا۔ اور ابھی تک میں ضبط کئے کھڑا تھا مگر دل کی دھڑکن تھی کہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اب دل ضرور پھٹ جائے گا اور اس بات سے میں ایک نئے اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آواز اتنی تیز تھی کہ ساتھ والا بھی بخوبی سن سکتا تھا۔ اس تیز دھڑکن کی آواز یقیناً بوڑھے نے بھی سنی ہوگی۔ میں نے کھلا ہوا چراغ پھینک دیا اور پھر باہر سے اندر کی جانب چھلانگ لگادی۔ میں نے اسے ایک بار جھرجھری لیتے ہوئے دیکھا۔ صرف ایک مرتبہ .... اور اسی ایک لمحہ میں میں نے اسے بستر سے گھسیٹ کر فرش پر ڈال دیا اور پھر وزنی بستر کھینچ کر گرادیا اور پھر میں زندہ دلی سے مسکرایا .... یہ وہ کام تھا کہ جس کو کرنے کا ارادہ میں نے باندھا تھا مگر دبی دبی آواز کے ساتھ دل اب تک دھڑک رہا تھا۔ بہرحال یہ باتیں میرے لیے پریشان کن نہیں تھیں۔ یہ تمام ہی باتیں دیوار کی دوسری جانب نہیں سنائی دی ہوگی۔ بالآخر میں نے اسے چھوڑدیا اور وہ بوڑھا اب مرچکا تھا۔ میں نے پہلے بستر صاف کیا اور پھر لاش کو بغور دیکھا ہاں! وہ پتھر ہی تو تھا۔ اور پتھر مرگیا تھا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ اس کے دل کے اوپر رکھا اور کچھ دیر کے لیے اسے پکڑے رکھا، مگر اس میں اب کوئی حرکت موجود نہیں تھی۔ وہ پتھر کی طرح بے جان ہوچکا تھا اس کی آنکھ نے مجھے بہت زیادہ پریشان نہیں کیا۔

اور کیا تم مجھے اب بھی پاگل کہو گے؟ مگر تم بہت دیر تک ایسا نہیں سوچ سکتے اس لیے کہ میں تمھیں بہت ذہانت اور احتیاط سے بتاؤں گا تو سنو! میں بوڑھے کے مردہ جسم کو بہت ہی رازداری سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ رات گزرتی جارہی تھی اس لیے خاموشی سے جلدی جلدی میں نے تمام کام ختم کیا پہلے میں نے لاش کے ٹکڑے کئے پھر میں نے سر علیحٰدہ کیا پھر بازو اور پھر ٹانگیں اس کے بعد میں نے فرش سے تین تختے اکھاڑے اور تمام حصّوں کو ایک چھوٹے تختے کے بیچ رکھ دیا اور بہت ہوشیاری سے ان تمام تختوں کو دوبارہ جمادیا۔ اس طرح میں نے تمام کام چالاکی سے کر ڈالا وہ انسانی آنکھ بالکل نہیں تھی یہاں تک وہ اس بوڑھے کی آنکھ بھی نہیں تھی کسی برے کام کا سراغ لگانا اتنا آسان بھی نہیں ہوا کرتا یہی وجہ تھی کہ کسی بھی نامعلوم شخص کے لیے اس جگہ کچھ بھی تو نہ تھا نہ ہی کسی قسم کی گندگی تھی اور نہ خون کا دھبّہ تھا..... اس کام کو کرنے کے لیے میں نے خاصی احتیاط برتی تھی اور اس خاص جگہ پر ایک بڑا ٹب رکھ دیا تھا ہا.....ہا

جب میں نے یہ تمام کام ختم کیا تو صبح کے چار بج چکے تھے اور ابھی تک گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے آدھی رات کا گمان ہورہا تھا۔ جونہی رات گزرنے کا الارم ہوا تو باہری دروازے پر دستک ہوئی میں نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا اس وقت تک میرا دل ٹھہر چکا تھا۔ کیا میں اب خوف زدہ تھا؟ دروازے پر تین آدمی کھڑے تھے وہ سب اندر داخل ہوگئے اور ان لوگوں نے بہت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ اپنا تعارف بحیثیت پولیس افسران کے کروایا مجھے گمان ہوا کہ رات کو یقیناً پڑوسیوں نے میری چیخ کی آواز سنی ہوگی پھر اسے بوڑھے کو مار ڈالنے کا شبہ ہوا ہوگا اور اس نے پولیس کو اطلاع کرنے کی غرض سے رات یقیناً آفس میں گزاری ہوگی اور کیس ان لوگوں کے (پولیس افسران) سپرد کردیا ہوگا کہ اس کی تحقیق کرکے مقدمہ چلایا جاسکے۔

میں مسکرایا کیا ان وجوہ کی بناء پر میں خوف زدہ ہوگیا تھا؟ میں نے ان شریف لوگوں کو خوش آمدید کہا اور انھیں بتایا کہ وہ "چیخ" دراصل میرا اپنا خواب تھا بوڑھے کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے انھیں بتایا کہ وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ پھر میں نے اپنے مہمانوں کو پورا گھر گھما پھرا کر دکھایا اور میں نے ان سے تلاشی لینے کو کہا۔ خوب اچھی طرح تلاشی ..... اور بالآخر میں پورے کمرے میں ان کی رہنمائی کرتا رہا میں نے بلا کسی خوف و تردّد کے اس کے وہ تمام مال و دولت دکھائی کہ جسے چھوا تک نہیں تھا اور اس جذبہ

میں میرا اعتماد شامل تھا اسی لیے میں کمرے میں کرسیاں لے آیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ یہاں کچھ دیر بیٹھ کر آرام کرلیں جبکہ میں خود اپنی وحشیانہ دلیری کی مکمل فتح مندی کے احساس سے سرشار تھا۔ جس جگہ میری نشست تھی وہاں ایک بڑا نشان تھا جہاں قربان کی ہوئی لاش محو آرام تھی۔

تمام افسر مطمئن ہو چکے تھے میرے طور طریقوں کو دیکھ کر انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی واردات نہیں ہوئی میں بالکل انوکھے انداز سے آرام کر رہا تھا وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور میں بہت ہوش مندی سے ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا جبکہ وہ لوگ گھریلو چیزوں کے بارے میں ہی گپ شپ کر رہے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ گفتگو طویل ہوتی میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا رنگ اُڑتا جا رہا ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ یہ لوگ جلد از جلد چلے جائیں کیوں کہ میرے سر میں شدت سے درد ہو رہا تھا اور لگتا تھا کہ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی ہیں۔ مگر وہ لوگ ڈٹے بیٹھے تھے اور بات چیت میں مصروف تھے اور میرے کانوں میں سیٹیوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں اور یہ آوازیں مستقل آرہی تھی اور یہی نہیں بلکہ یہ آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ میں ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان لوگوں کی باتوں میں خود کو محو کرنا چاہا مگر وہ آوازیں ایک تو مسلسل آرہی تھیں دوسرے یہ کہ بہت واضح تھیں۔ یہاں تک کہ بالآخر مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ آنے والی آوازیں میرے اندر کی تھی۔

بلاشبہ میں اب بہت زرد ہو گیا تھا۔ پھر میں نے تسلسل کے ساتھ اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں اور وہ آوازیں بہت بڑھ چکی تھیں .... مگر میں نے کیا کیا؟ یہ ایک ہلکی تھکی اور اونچی آواز تھی .... اور بڑی حد تک اس گھڑی کی ٹک ٹکاہٹ سے ملتی جلتی کہ جسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا ہو ..... اب میری سانس بھی پھولنے لگی تھی۔ یہ آوازیں ابھی تک افسران تک نہیں پہنچی تھیں۔ میں بہت جوش کے ساتھ تیز تیز باتیں کرنے لگا تھا۔ مگر وہ آوازیں مزید بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ لوگ کیوں نہیں جانا چاہتے؟ میں نے فرش پر ایک قدم رکھا اور پھر مضبوطی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اشتعال اور طیش میں ان لوگوں کی طرف غور سے دیکھا۔ مگر وہ آوازیں مسلسل تیز ہوتی جا رہی تھیں اوہ خدایا! میں کیا کروں؟ .... میں پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھا جا رہا تھا۔ میں شیخی خور ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں! میں جس کرسی پر بیٹھا تھا اُسی پر جھول رہا تھا اور آوازیں چاروں طرف گونج رہی تھیں اور مستقل بڑھتی جا رہی تھیں اور اب کافی اونچی ہو چکی تھیں .... اونچی .... اونچی .... اونچی ..... اور اونچی اور وہ لوگ ابھی تک خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں پھر مسکرایا۔ کیا اس بات کا یقین کیا جا سکتا تھا کہ یہ آوازیں انھوں نے نہ سنی ہوں؟ اے خداوند برتر! نہیں... نہیں! انھوں نے بھی سنا ہے انھیں شک ہے .... وہ جانتے ہیں.... وہ سب میرے خوف کو دیکھ کر مضحکہ اڑا رہے تھے۔ اُسے میں نے محسوس کر لیا۔ اور اس کے بارے میں سوچا بھی ہے اور اس ذہنی الجھن سے تو کوئی دوسری چیز ہی بہتر تھی۔ اس تضحیک سے تو کوئی دوسری بات زیادہ قابل برداشت ہو گی اب میں مزید ان کی مکارانہ مسکراہٹ کو نہیں برداشت کر سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے اب میں ضرور چیخ پڑوں گا یا پھر مر جاؤں گا! اور اب ایک بار پھر!..... میں نے بغور سنا اونچی! اونچی! اونچی۔

"یہ سارے بدمعاش ہیں"! میں چیخ پڑا "میں اب زیادہ دیر تک نہیں چھپا سکتا! میں نے اپنے اس فعل کو تسلیم کر لیا ہے! پھر میں نے تختہ لوح کو اکھاڑ ڈالا یہاں! یہاں! یہ آنے والی آواز اُس (بوڑھے) کے دل کی خوفناک دھمک تھی۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

کھٹے میٹھے انار

شاہ محی الحق فاروقی
صفحات ۱۸۴ قیمت -/۱۰۰ روپے
۵ - اے، ۴/۶ ناظم آباد - کراچی

"کھٹے میٹھے انار" ایک نشست میں پڑھنے والی کتاب ہے۔ اس کو پڑھنے میں میری محویت کا یہی کچھ عالم ہوا۔ جو اس کو ہاتھ میں لیا تو پھر اسے ختم کر کے ہی شیلف میں واپس رکھا اس کتاب کی اہم خوبی یہی ہے ہے ورنہ اکثر کتابوں کا حال یہ ہے کہ آدمی انھیں چھوکر رکھ دیتا ہے یا مطالعہ کرتے ہوئے آدھے پونے راستے ہی میں ہمت ہار بیٹھتا ہے۔

کتاب کے نام کی وجہہ تسمیہ میں صاحبِ کتاب نے کئی حوالے دیے ہیں وہ اپنی جگہ قابل اعتنا ہیں لیکن اگر اس کے نام کا جواز "انار چھوٹنا" جیسے محاورے میں تلاش کیا جائے تو کتاب کے متون میں انار کی طرح چھوٹتے ہوئے بر محل فقروں اور مصرعوں کی شگفتگی مارے خوشی کے تالیاں بجانے لگتی ہے۔

تحریر میں شگفتہ بیانی اور روانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسے بالالفاظ دگر اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسی سہیلیاں ہیں کہ انھیں کسی پل ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں۔ اس کا بہترین مظاہرہ "کھٹے میٹھے انار" کے بیشتر دانوں (مضمونوں) میں ہوا ہے۔

ایک گاچھ کے سبھی دانے، دانے ہوتے ہیں لیکن دانے دانے کا بھی فرق ہوتا ہے، کچھ دیدہ زیب و خوش ذائقہ، کچھ گوارا اور کچھ ناقص.... صاحبِ کتاب کی دانش و بینش نے کسی دانے کو بھی ناگوار بننے نہیں دیا۔

"پے جمع نون = "پن" میرے نزدیک سجیلا قرار پاتا ہے۔ اس میں تحریر کی رفتار تیز اور رواں ہے۔ بڑھتی ہے تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تا آنکہ رفتار ایک مقام پر یکسر رک جاتی ہے اور قاری کا جی چاہتا ہے کہ یہ کہانی ابھی کچھ اور چلتی رہے۔

"مرزا غالب" داور محشر کے حضور میں".... میں بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی سو فیصد صلاحیت موجود ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ صاحبِ کتاب کا مطالعۂ غالب بڑا وسیع ہے۔ خواب میں داور محشر کے روبرو غالب کا پیش ہونا، فرشتے کا غالب دشمنی کا لہجہ اختیار کرنا اس کے باوجود فرشتے کے الزامات سے غالب کا بری الذّمہ ہو کر رحمتِ خداوندی کے آگے سرخرو ہونا اس طرح کہ اس کا جواز شروع سے آخر تک غالب کے اشعار سے حاصل ہو، یقینی صاحبِ کتاب کی حقیقی غالب پرستی پر دال ہے۔ کون جانے یہ تحریر داور محشر کے آگے غالب کے سلسلے میں مزید عفو و درگزر کا وسیلہ بن جائے۔

طنزیہ جملے، فقرے اور مصرعے تو اس آسمان میں چار چاند کے مصداق ہیں، لیکن "ہم ہیں پرائیوٹ سیکریٹری" ایک مکمل

طنزیہ ہے۔ اس کی آنچ دھیمی ہے یہ اُن محکمہ جات پر طنز ہے جہاں علم اور جہل کا اجتماعِ ضدین اس صورت میں ہوتا ہے کہ ایک شخص ملک کا سب سے اہم مقابلے کا امتحان پاس کر کے آیا ہوا ہے اور دوسرا اس کے اوپر "SO,SO" قسم کا وہ شخص بٹھا دیا جاتا ہے جو انتخابی حلقے میں کامیابی کی بنا پر اس حق کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ اس شخص کا حال یہ ہے کہ دنیا کے علم و ادب حتٰی کہ سیاست تک سے نابلد لیکن چاہتا ہے کہ دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھے۔ ایسی صورت میں اجتماعِ ضدین کی کشمکش کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے....: اور رحم کرنے والا پروردگار ہے!

اس کتاب میں بعض جگہ بے ساختہ ہنسنے اور بعض جگہ زیرِ لب مسکرانے کے مواقع آتے ہیں۔ یہ مواقع قاری کو کہیں بریکٹ میں بند ایک لفظ کی مدد سے کہیں ایک جملے اور کہیں ایک مصرعے کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں۔

لفظ کی مدد سے:...... منگلو، بدھو، عیدو اور بفاتن وغیرہ بھی غالباً اسی سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں (کڑیاں کے کاف پر زبر ہے۔ آپ اسے پیش نہ پڑھ دیجیے گا)

مصرعے کی مدد سے:...... بہرحال میں اس اودھ کے بانکے کا سارا بانکپن نکال دوں گا۔ یا تو اپنے وحشی اور جنگلی مرغ کے ساتھ یہ کمینہ اس محلے میں رہے گا یا پھر ہم اس محلے میں رہیں گے بیوی کے رُخ پر شوہر کے اس طنطنہ سے مسرت اور اطمینان کی ایک واضح لہر دوڑ گئی "یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے"

جملے کی مدد سے:...... وہ پاگل بہت زور سے ہنسا اور بولا "ماشاء اللہ کیا بات کہی ہے۔ چاول کے کھیت، چاول کے درخت یہی بات میں کہتا ہوں تو لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ میرے گھر پر ایک چیز ہے میں اسے دودھ کا کھیت کہتا ہوں تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں اسے بھینس کہو...."

کئی ایسے شگفتہ قلم نظر سے گزرے ہیں، جنھیں دیکھو تو حُلیے بُشرے سے معلوم ہوگا کہ بیچارے نو جانتے ہیں چھے جانتے ہی نہیں۔ لیکن جب وہ قلم پکڑ لیں تو پڑھنے والوں کو اپنی بذلہ سنجی سے کبھی ہنسنے، کبھی زیرِ لب مسکرانے اور کبھی بے ساختہ قہقہہ لگاتے لگاتے لوٹ پوٹ ہو جانے پر مجبور کریں، اور جب ہنسی کا دورہ ختم ہو تو معلوم ہو کہ لکھنے والا ہنسی ہنسی میں کچھ علم بھی دے گیا ہے۔ میرے نزدیک شاہ محی الحق فاروقی ایسے ہی ایک شخص ہیں!

کتاب اچھی چھپی ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔

(ا۔ س)

دستک اُس دروازے پر

ڈاکٹر وزیر آغا

صفحات ۱۹۲ قیمت ۵۰/- روپے

مکتبہ فکر و خیال ۱۹۲ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

وزیر آغا کی تازہ کتاب "دستک اُس دروازے پر" کا ادبی صنف متعین کرنا دشوار پڑ رہا ہے۔ اس کی بہت سی جہتیں ہیں۔ فارم کے اعتبار سے، مکالمے سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور مکالمے پر اختتام اس میں دو کردار ہیں "تو" اور "میں" گویا صنف کے اعتبار سے ڈراما کے قریب ہوا۔ اس مکالمے میں "تو" کا تخاطب کئی مخاطب رکھتا ہے ایک مخاطب اُس کا INNER SELF ہے یعنی "میں"

کا ایک اور روپ "تو"۔ ایک اور صورت سفرنامے کی بھی اُبھرتی ہے۔ یعنی ایک شخص کسی دوست کے پاس آتا ہے، نو دن قیام کرتا ہے اور پھر واپس چلا جاتا ہے، یہ کتاب اُس مسافر کے نو دن کے سفر کی روداد ہے۔ مکالمات کے توسط سے جو موضوعات اور مسائل زیرِ بحث آتے ہیں اُس میں سائنس کی کھُردری باتیں، تصوف کی ادق گتھی، رقص کی رمِ حیات و کائنات پر پُر معنی تطبیق، غرض کہ ان سب موضوعات کے مبادیات کو لطیف پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دور از کار مثالوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تو متن میں نثری شاعری کا لطف بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ (SINGULARITY) والا ذکر یہاں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے)

وزیر آغا کی اس وقیع کتاب میں مختلف النوع مباحث کے ذریعے فکر انگیزیوں اور فکر ارائیوں کا سنگم ملن ہوا ہے، جن پر تمام عمر وزیر آغا سوچتے، بحث کرتے اور کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کرتے رہے ہیں۔

اس کتاب میں لاتعداد ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوال اور اُس کے جواب "تو" اور "میں" کی زبانی پیش ہوتے جاتے ہیں، زمانہ بہر سمت ارتقا پذیر ہے اور وقت تیز رفتاری سے اپنی منزلیں طے کرتا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں کائنات پرت در پرت انسان پر کھُلتی جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی راگنی کا پھیلاؤ دھیرے دھیرے ہو اور نتیجے میں راگنی کی ساری جہتیں ظاہر ہو جائیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک ساتھ جو بہت سے ادبی نظریات سامنے آئے وزیر آغا نے اُن پر بھی اپنے لطیف پیرائے میں بحث کی اور سوال در سوال کے ذریعے ایک موضوع کو دور بہت دور تک دیکھنے کی سعی کی ہے۔ بلیغ باتیں اور اشارے مکالے کی زبان میں اس طرح دبے پاؤں در آتے ہیں کہ ان کے در آنے کا موقع تو نظر سے اوجھل رہا لیکن ان کی موجودگی دل و دماغ کو تازہ دم کیے دے رہی ہے۔

"دستک اُس دروازے پر" میں نو دنوں میں ہر دن کا سفر نظم سے شروع ہوتا ہے۔ نو دنوں کا سفر جس آخری مکالے پر ختم ہوتا ہے وہ یہ ہے:

تو: ...... اچھا اب میں تم سے ایک آخری سوال پوچھتا ہوں سوال یہ ہے کہ ....."

میں: ...... نہیں برادر تم آخری سوال مت پوچھو کیوں کہ آخری سوال کا کوئی جواب نہیں ہے ....."

دراصل سوال ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ کہا جاتا ہے پرَلے (قیامت) ہر شے کا انت ہے۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے، جب دنیا میں "جیو" یعنی ہستی کا وجود ہی نہیں رہے گا تو سوال کون کرے گا۔ لیکن حیات بعد الممات بھی تو ایک سوال ہے!

کتاب کا نام "دستک اُس دروازے پر" بڑا معنی خیز ہے۔ انسان عمر بھر گیان کے آخری سرے تک پہنچنے کے لیے دستک دیتا رہتا ہے دروازہ کے اُس پار کیا ہے، کسی کو نہیں معلوم۔ علم کی تمام تگ و دو دستک دیتے رہنے میں ہے یہ دستک دیتے رہنا بھی تو لو لگائے رکھنے سے کسی طرح کم نہیں، اس سے دل کے ساتوں در کھل جاتے ہیں۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

کپل وستو کا شہزادہ

اے۔ خیام
صفحات ۱۱۱ قیمت ۱۰۰/۰ روپے
منظر پبلی کیشن اے ۳۶، واحد اسکوائر گلشن اقبال کراچی

"کپل وستو کا شہزادہ" اے۔ خیام کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ کپل وستو کا شہزادہ ہی ہے جس نے اپنا راج پاٹ تیاگ کر کے دنیا کے دُکھ ہرنے کی تدبیر کے لیے اب سے ہزاروں برس پہلے نکل پڑا اور بودھ گیا کے ایک برگد کے نیچے بیٹھ کر گیان دھیان میں غرق ہو گیا۔ جہاں چاہ وہاں راہ ہے سو اس کا گیان دھیان سپھل ہوا۔

"کپل وستو کا شہزادہ" کا مصنف اُسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے جہاں اس "شہزادے" کو گیان حاصل ہوا۔ گیان اور گیان سے حاصل شدہ علم وہاں کے لوگوں کی سرشت میں داخل ہے۔ چنانچہ اے۔ خیام کے افسانوں میں بھی اس کا عمل دخل صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

خیام کے افسانے دولیک پر بڑھتے ہیں ایک لیک باہر کی طرف ہے آپ اُسے افسانے کا آبجکٹیو (خارجی) اور دوسرے کو سبجیکٹیو (داخلی) رُخ بھی کہہ سکتے ہیں، شروع میں دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ دونوں ایک جگہ جا کر گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور اس گڈمڈ کے بعد جو شکل بنتی ہے بسا اوقات وہی افسانے کا انجام ہوتا ہے۔

کون ذات کی تطہیر نہیں چاہتا دیکھا جائے تو ساری دنیا کے تخلیق کاروں کے اندر ایک گوتم چھپا رہتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ کون اس کو اپنے اندر کتنا رچا بسا سکتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو عظیم جرمن ناول نگار ہرمن ہسے کو سدھارتھ لکھنے کی کیا ضرورت پڑتی اور ہر دوسرے فنکار کا موضوع نروان کیوں بنتا اپنے آپ کو پالینے کی خواہش اور ساری دنیا کو اس آئینے میں دیکھنے دکھانے کی تمنا ہی تو "سدھارتھ" لکھواتی ہے۔ اس کتاب کے کہانی کار کو مٹی کے حوالے سے ویسے بھی گوتم کے تتبع کا حق پہنچتا ہے۔ پہلا کہانی کار بھی تو آخر کپل وستو کا شہزادہ ہی تھا، جاتک کہانیاں اُسی دور کی یادگار ہیں۔

کتاب میں شامل ایک کہانی "ویرانہ" ہے۔ اس میں مصنف نے خود اپنے ارد گرد ایک دائرہ بنا لیا ہے۔ وہ باہر نکلنے کی سعی بھی کرتا ہے لیکن دائرہ کا اندرون اتنا قوی ہے کہ وہ پھیر پھیر کے خود کو وہیں پاتا ہے۔ صاف الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گوتم کے نروان کا شہر گیا کا تعاقب اس قدر قوی ہے کہ کہانی کار کا ہمزاد کہیں بھی اس سے بچ نہیں پاتا اور خود کو اُسی برگد کے پیڑ کے نیچے پاتا ہے۔

ایک اور افسانہ "نقطۂ دائرہ ہیولا" کے ذریعے جو بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، اس کام کا حُسن اپنے وقت پر ہو جانے میں مضمر ہے۔ اور عمر گریزاں اس وقت کے تابع ہے۔ ورنہ اس میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے اور اس خرابی کی ایک انتہا موت ہے۔ جس نے اس بات کو مدِ نظر رکھا وہ کامراں ہے، کامرانی کی خواہشات، خوف زدگی، ڈرلانے پن کا احساس، تنہائی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر نوع کرب کی۔ اے۔ خیام کے افسانے میں نمود میرے خیال کو کافکا تک لے جاتی ہے۔ دراصل اے۔ خیام کی نسل کے بیشتر اردو کے لکھنے والوں کو کافکا کے اسلوب نے اپنی طرف راغب کیا ہے کافکا کا اسلوب بظاہر بیانیہ لیکن معنویت کے اعتبار سے تہہ دار اور کثیر الجہات ہے اور داخلی رو بھی رکھتا ہے۔

کہتے ہیں تخلیق کے لیے کسی قدر ناسٹلجیا بھی ضروری ہے۔ یہ تخلیق میں معاون ہوتا ہے، لیکن اس کی حیثیت دال میں نمک کے برابر ہونی چاہیے۔ ذرا زیادہ ہوا اور دال کا ذائقہ خراب، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے فن کی بے پناہ مقبولیت کی بہت سی وجوہ میں ایک ناسٹلجیا بھی ہے۔ اس ناسٹلجیا نے اے۔ خیام کے افسانے کو بھی تقویت پہنچائی ہے۔

(ا۔س)

ہم اجنبی ہیں

اشفاق حسین

صفحات ۲۰۶ قیمت ۔/۱۵۰ روپے

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کا قول ہے کہ ایک شخص ہجرت کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جاتا ہے، وہ جگہ اُسے ہر طرح آسودگی بھی فراہم کرتی ہے اس کے باوجود تمام عمر وہ ذہنی اعتبار سے مہاجرت میں رہتا ہے، یہی ہر ہجرت کرنے والے کا مقدر ہے اور یہی اشفاق حسین کے سوال کا جواب بھی جس کا انھوں نے نثر و نظم کے ذریعے اپنی کتاب "ہم اجنبی ہیں" کے صفحات پر کیا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

"نہ میں جلاوطن کیا گیا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی سیاسی جبر کے نتیجے میں نقل مکانی کی ہے۔ تو پھر میرے ہاں ہجرتوں کا دکھ، وطن بدری کا کرب، غریب الوطنی کی کیفیت اور نقل مکانی کی اذیتیں۔ یہ سب کچھ کیوں؟ یہ سوال خود اپنے آپ سے میں گزشتہ گیارہ برس سے کر رہا ہوں۔"

"ہم اجنبی ہیں" مختلف عنوانات میں تقسیم ہے۔ ایک عنوان "ہجرت کا ثمر" اس کے تحت آنے والے کلام میں اجنبیت کا احساس شدید ہے اور سچ پوچھیے تو آدمی کو ہجرت کر کے اجنبیت کے لق و دق صحرا سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کا احساس بالکل مختلف تہذیبی و ثقافتی اور لسانی فضا میں اور بھی شدید ہوتا ہے۔ اشفاق حسین کی ایک غزل کا مطلع ہے:

ہم اجنبی ہیں یہاں پر، مگر وطن سے کم
دھواں دھواں سا ہے منظر مگر وطن سے کم

بہ ظاہر یہ شعر سیدھا سادہ ہے، لیکن غور سے دیکھیں تو یہ بہت بڑے المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ صاحب شعر کی پیدائش سنہ اکیاون کی ہے یعنی پیدائش کے اعتبار سے اُس کا وطن پاکستان ہے۔ اسی وطن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی مٹی کا ہر ذرہ دیوتا ہے۔ کسی نے یوں بھی کہا ہے کہ اس کی ایک مٹھی خاک کے بدلے جنت بھی ملے تو ہم قبول نہ کریں۔ پھر اس شاعر کو پیدائش کی سرزمین سے نکل کر ایسا کیوں احساس ہوتا ہے کہ وہ غیر خاک میں اجنبی ہے مگر وطن سے کم۔ یہ کیسا وطن اور کیسی اجنبیت ہے کہ پیدائش کے باوجود اسی مٹی سے اس کا وہ رشتہ قائم نہ ہو سکا جو اس کے آباء کا اپنی جنم بھومی سے ہے، یہ ایک اہم سوال ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ غیر شعوری طور پر ہم اپنے آباء کی زبان میں بول رہے ہیں اور انھیں کے منطقے میں ہیں!

اشفاق حسین نئی نسل کے شاعر ہیں، اس لیے اُن کے کلام میں نیا پن اور وہ تازگی احساس موجود ہے جوان کے عصر کی دین ہے۔ اس کے علاوہ اس رنگ میں لمحہ بہ لمحہ نئی سرزمین میں ہونے والے تجربات بھی شامل ہوگئے ہیں۔ ہجرت اور سیاحت کا مثبت رُخ یہ ہے کہ آدمی جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو اس کی قوتِ مدرکہ و متخیلہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اشفاق حسین کے ہاں بھی یہ وصف پیدا ہوا ہے مثال کے لیے نظم "اپنے ہونے گمان دیکھیے ا

مجھے سارے پرندے اچھے لگتے ہیں
مگر شاخوں پہ سر نیہوڑائے
بھیگی شام سے ڈرتے ہوئے
جو بھی پرندے ہیں مجھے اچھے نہیں لگتے
کہ اُن میں اور مجھ میں
فرق کچھ بھی تو نہیں ہے
میں سر نیہوڑائے شاخِ زندگی پر
اپنے ہونے کا گماں اوڑھے ہوئے ہوں
یقین کے خوف سے سہما ہوا ہوں

گردوپیش

انجمن میں ڈاکٹر صغرا مہدی کی آمد

پچھلے دنوں پڑوسی ملک ہندوستان سے ڈاکٹر صغرا مہدی کراچی تشریف لائیں تو انھیں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں مدعو کیا گیا اور ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ تقریب کی صدارت انجمن کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی ان کے ساتھ ہی محترمہ ادا جعفری بھی تشریف فرما تھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن نے مہمان کا یہ کہتے ہوئے تعارف کرایا کہ ڈاکٹر صغرا مہدی دہلی کی معروف لکھنے والی ہیں۔ اکبرالہ آبادی پر پی ایچ ڈی کی ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ سے منسلک ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے تعارفی کلمات کے بعد ڈاکٹر فہیم اعظمی نے ڈاکٹر صغرا مہدی سے گزارش کی کہ آپ ایک عرصے سے افسانے لکھ رہی ہیں افسانے کے ارتقا پر اظہار خیال فرمائیں۔ جواباً صغرا مہدی صاحبہ نے کہا اردو میں فکشن کی باضابطہ داغ بیل پریم چند سے پڑتی ہے پھر ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی افسانے کی ایک متوازی تحریک جس کے روح رواں نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری تھے چل رہی تھی، جو ترقی پسند تحریک کے پہلے سے متعارف تھی۔ پھر ساٹھ کی دہائی میں افسانہ نگاری میں جدید رجحان آگیا انھوں نے کہا کہ ادب میں داخل ہونے والی ہر تحریک ادب کو کچھ نہ کچھ دے جاتی ہے۔ جب نئی چیز رواج پاتی ہے تو اُس میں رطب و یابس کا آجانا غیر متوقع بات نہیں جہاں تک میرے افسانے کا تعلق ہے میں نے کسی خاص تکنیک کو ارادتاً نہیں اپنایا۔ بلراج منیرا کو میں رجحان ساز سمجھتی ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں تجریدیت کے تتبع میں ایک افسانہ "چھپکلی" لکھا تھا۔ ہندوستان میں اب ہر طرح کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ تجریدیت پر کوئی خاص زور نہیں۔

ڈاکٹر صغرا مہدی نے انکشاف کیا کہ بمبئی کے افسانہ نگاروں کا الگ دبستان ہے جس میں انور خاں اور ساجد رشید قابلِ ذکر ہیں۔ جناب شہاب قدوائی کے ایک سوال پر کہ آپ کے ہاں افسانے میں علاقائیت فروغ پا رہی ہے؟ ڈاکٹر صغرا مہدی نے کہا کہ ہاں یہ صورت حال ہے۔

فاطمہ حسن کے اس سوال پر کہ ہندوستان میں اردو افسانہ نگاری اور ناول نگاری، میں خواتین کی نمائندگی کس نہج پر ہے؟ ڈاکٹر صغرا مہدی نے کہا کہ اردو اور خواتین پر کام تو بہت ہو رہا ہے لیکن خواتین کی نئی نسل لکھنے کی طرف نہیں آرہی ہے۔

فکشن کے حوالے سے جو گفتگو ہو رہی تھی اس میں وقفے وقفے سے صدر تقریب جناب نورالحسن جعفری، محترمہ ادا جعفری، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فہیم اعظمی، جناب اشرف سلیم، قاضی قیصر الاسلام اور محترمہ مہ جبیں نے حصّہ لیا۔

ایلیٹس کالج عالمی اردو کانفرنس ۱۹۹۳ء کے مندوبین کی انجمن میں آمد

۶ ستمبر ۱۹۹۳ء کی شام کو ایلیٹس کالج عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے آنے والے غیر ملکی مندوبین کو انجمن کے نئے دفتر میں انجمن کی طرف سے ایک عصرانہ دیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے مہمانان گرامی کو انجمن کی کارکردگی، اس کی مطبوعات اور یہاں سے نکلنے والے جریدے "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" کے بارے میں قدرے تفصیل سے بتایا۔ اس کے بعد اردو کے ممتاز شاعر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر گرامی جناب جگن ناتھ آزاد سے خطاب کی درخواست کی گئی۔ جناب جگن ناتھ آزاد صدر انجمن ترقی اردو (ہند) نے فرمایا کہ اُن کا تعلق انجمن ترقی اردو سے ۱۹۳۵ء کے آس پاس قائم ہوا جب مولوی عبدالحق صاحب کے ایما پر راولپنڈی میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا اور اس کے پہلے سیکریٹری معروف شاعر جناب عبدالعزیز فطرت مقرر ہوئے۔ دوران گفتگو جناب جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ میرے لیے سب سے تاریخی موقع وہ تھا جب میں مولوی صاحب کی دعوت پر انجمن ترقی اردو کی "گولڈن جوبلی" تقریب پر کراچی آیا۔ اس کے مشاعرے میں شرکت کی اور کراچی کے چودہ پندرہ دن کے قیام میں مولوی صاحب کے قریب تر رہا۔

آخر میں انجمن ترقی اردو کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے انجمن میں تمام مندوبین کی آمد کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجمن کی کارکردگی کا تفصیل سے ذکر کیا جناب جگن ناتھ آزاد تو زندہ تاریخ ہیں انجمن ترقی اردو پاکستان اور ہند دونوں کے حوالے سے انھوں نے مزید کہا کہ انجمن کے پلیٹ فارم سے اردو کی ہم جو کچھ خدمت کر سکتے ہیں، اپنے انداز سے کیے جا رہے ہیں۔ ایلیٹس کالج عالمی اردو کانفرنس کے منتظمین اور بالخصوص جناب شوکت زیدی مبارک باد کے مستحق ہیں انھوں نے وہ کام کر دکھایا جو حکومت کے کرنے کا ہوتا ہے۔

انجمن کے اس عصرانے میں جن غیر ملکی مندوبین نے شرکت کی ان میں جناب جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر قمر رئیس، ایم حبیب خان (ہندوستان سے) ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز، اُن کی بیگم ایل، میتھوز، جناب رضا علی عابدی اور ساقی فاروقی (لندن سے) جناب سلور برائن (امریکہ سے) محترمہ تھانگ منگ شنگ، جناب شان یون، جناب چانگ شی شوان (چین سے) جناب خالطر زائف، جناب آزاد نصرالدین شاتوف اور محترمہ نادرہ فادروف (ازبکستان سے) جناب کلیم سہسرامی اور ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر (بنگلہ دیش سے) جناب یم یونگ کیو (کوریا سے) محترمہ اسٹیلا رائی لینڈ (آسٹریلیا سے) جناب اظہار حیدر (ابوظبی سے) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن کی طرف سے تمام غیر ملکی مندوبین کو انجمن کی مطبوعات کے تحائف دیے گئے اور ان کی تواضع ایک پُر تکلف عصرانہ سے کی گئی۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے "کلام شاہ عبداللطیف بھٹائی" کے تعارف کی تقریب

۱۵ اگست کو ایک مقامی ہوٹل میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے "کلام شاہ عبداللطیف بھٹائی" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت سندھ کے گورنر جناب حکیم محمد سعید نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض اکادمی ادبیات کے ناظم اعلیٰ

جناب افتخار عارف نے انجام دیے۔ تقریب کا آغاز قاری شاکر قاسمی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب افتخار عارف نے کہا کہ بلاشبہ اجتماعی دھاروں کے فروغ میں یہ تراجم ممدومعاون ثابت ہوں گے۔ "شاہ جو رسالو" وہ چشمہ سیر ہے جس سے متمتع ہونا ہم سب کے لیے از بس ضروری ہے، جناب افتخار عارف نے کہا کہ شاہ صاحب کے کلام کے ترجمے اردو میں پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ شیخ ایاز، حفیظ ہوشیار پوری، ابن انشا اور جناب آفاق صدیقی قابل ذکر ہیں۔ لیکن "شاہ جو رسالو" کے ترجمے کی اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ہے جس کے ساتھ آج ہم شام منا رہے ہیں۔ اس کے لیے پروفیسر ایاز احمد قادری اور ڈاکٹر وقار احمد رضوی قابل ستائش ہیں، جنھوں نے نہایت عرق ریزی سے ترجمے کے اس مشکل کام کو انجام تک پہنچایا۔

جناب غلام ربانی آگرو نے کہا کہ میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کرتا ہوں انھوں نے بتایا کہ وطن عزیز کے مشاہیر شعرا خوش حال خاں خٹک، سیّد وارث شاہ، جام درک اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ منصوبہ یہ ہے کہ سردست ان میں سے ہر شاعر کا کلام ملک کی تمام زبانوں میں ترجمہ کرا کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ جناب غلام ربانی آگرو نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کو سندھ کا روحانی راجہ کہا... اور جناب حکیم سعید کے بارے میں کہا کہ "سندھ کو پہلی بار علم پرور گورنر حکیم سعید کی صورت میں ملا ہے۔"

محترمہ مہتاب اکبر راشدی نے کہا کہ شاہ کے کلام کو سمجھنے کی سب سے پہلے انگریز نے کوشش کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ٹرمپ کا نام لیا جو شاہ کو سندھ کا حافظ کہتا تھا۔ انھوں نے شاہ کے کلام کی تشریح کے سلسلے میں جرمنی کی مستشرق این میری شمل کا نام لیا ساتھ ہی جناب جی الانہ کی انگریزی تصنیف "FOUR CLASICAL POET" کا ذکر کیا۔

محترمہ ثاقبہ رحیم الدّین نے اپنے مضمون میں انکشاف کیا کہ "شاہ جو رسالو" کے چالیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، بین اللسانی تراجم کا سلسلہ بھی چل پڑا ہے۔ شاہ صرف محنتوں کے شاعر تھے۔ ان کے کلام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ محترمہ ثاقبہ رحیم الدّین نے مزید کہا کہ شاہ لطیف کے فن میں شاعری اور موسیقی یک جان دو قالب ہو گئی ہے۔ شاہ لطیف نے انتقال کے وقت گوئٹے کی طرح روشنی روشنی تو نہ کہا، لیکن موسیقی موسیقی ضرور کہا ہوگا اور موسیقی بھی تو روشنی ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے زیر بحث کتاب کے حوالے سے کہا کہ اس میں ۱۸۹ وائیاں اور دو ہزار چھ سو انیس ابیات ہیں لیکن "شاہ جو رسالو" کے ۵۵ دستیاب نسخوں کی مدد سے جو تقابلی مطالعہ کر رہے ہیں اس کی بناء پر وائیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور ابیات کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ تک بڑھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ آج تک اردو میں جتنے تراجم شاہ کے کلام کے شائع ہوئے ہیں اُن کے مقابلے میں زیر بحث کتاب ترجمے کے اعتبار سے اصل متن سے قریب تر ہے۔

جناب نثار علی میمن وزیر اطلاعات و نشریات نے کہا شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انھوں نے زمان و مکاں سے ماورا شاعری کی ہے جس کی بنیاد عالم گیر اخوت پر ہے۔

آخر میں گورنر سندھ جناب حکیم محمد سعید نے فرمایا کہ حضرت شاہ عبداللطیف کی باوقار مجلس میں شریک ہونا میرے لیے سعادت کا درجہ رکھتا ہے اس مقام تک پہنچنے کے لیے شاہ نے شب و روز ریاضت کی شاہ صاحب عالم جوانی میں برسوں سیر و سفر میں رہے، درویشوں اور بزرگوں کی صحبت سے خوب فیض حاصل کیا.... توحید و رسالت کو اوّل جانا اور اپنے کلام کو انھیں کا آئینہ بنایا ....شاہ صاحب ہمارے لیے ایک مثالی کردار ہیں، ہمیں ان کے نقش قدم پر چل کر مفاخر ہونا چاہیے۔

قومی زبان (کراچی) اکتوبر ۱۹۹۳ء

افکار برق کی تقریب تعارف

۲۶ اگست ۹۳ء کو "افکار برق" کی تقریبِ تعارف، الفکر ادبی کمیٹی اور ذیشان اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام بہاپا آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمائی، مہمان خصوصی ڈاکٹر فہیم اعظمی تھے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشرف احمد نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز جناب انصار الحق کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں صاحب کتاب جناب برق اجمیری کی نعتیں جناب انور اور جناب محمد شکیل نے سنائیں۔

ڈاکٹر مشرف احمد نے اپنے مضمون میں کہا کہ کوئی ادیب و شاعر نہ تو ظلم و ستم کی حمایت کر سکتا ہے اور نہ ہی تاریکی کو روز روشن کہہ سکتا ہے۔ انھی معنوں میں ہر لکھنے والا محترم ہوتا ہے۔ جناب برق اجمیری کی شاعری اس سے مختلف نہیں اس اضافے کے ساتھ کہ نعت گوئی کو وہ توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔

جناب مختار اجمیری نے کہا کہ حضرت برق اجمیری اُن شعرا میں سے ہیں جو صرف اور صرف شاعری کے لیے ہی عدم سے وجود میں آئے ہیں، "افکار برق" میں شعری محاسن کی روایات تمام و کمال مجتمع نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی نے اپنا مقالہ "منفرد رنگ کا قابلِ قدر شاہکار" پڑھا انھوں نے مقالے میں کہا کہ جناب برق اجمیری محدود سے لامحدود کی جانب فکر کی پرواز کی دعوت دینے والے شاعر ہیں، ان کی شاعرانہ روش قطرے میں سمندر اور ذرے میں آفتاب دیکھ لیتی ہے میں انھیں پچیس برس سے جانتا ہوں۔

پروفیسر قمر ساحری نے اپنے وقیع مقالے میں کہا کہ آج سے ساٹھ سال پہلے کا زمانہ نہ صرف شعری عروج کا زمانہ تھا بلکہ تحریک آزادی کے عروج کا بھی زمانہ تھا، یہ حقائق کے برملا اظہار کا دور تھا، جناب برق اجمیری کیسے زمانے کی صدا پر کان بند کر سکتے تھے۔ سواُن کی شاعری میں لبیک کہنے کا انداز پیرایۂ بیان کی تازگی کے ساتھ جا بجا ملتا ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کہا ربیع الاوّل میں قصیدہ و نعت خوانی اور محرم میں مرثیہ خوانی کا رواج ایک زمانے سے چلا آرہا ہے یہ ہماری تہذیبی روایت کا حصّہ ہے چنانچہ اس میں آج بھی کمی نہیں ہوئی ہے۔ نعت و مراثی پر کتابیں آتی ہی رہتی ہیں انھوں نے ایک انگریزی ناقد کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اُس نے ایسی شاعری کو تقدیس کی یا عقیدت کی شاعری کہا ہے اور اسے تخلیق کے ہم پلّہ قرار دیتا ہے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمایا کہ "افکار برق" اور صاحب افکار برق کے بارے میں بہت کچھ سن چکے۔ ان کے بارے میں جتنا کچھ جانتا تھا سب کچھ کتاب کے دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔ اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ آفریں وہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں جو اپنے والدین کے مزاج داں ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے والدین کس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر خوشی ہے کہ جناب برق صاحب کے بیٹے جاوید نے اپنے باپ کے مزاج کو سمجھا اور اُن کی خواہشات کو مقدم جانا، جس کے نتیجے میں "افکار برق" آج آپ کے سامنے ہے۔

جناب برق اجمیری کے صاحبزادے جاوید جب اظہار تشکر کے لیے مائیک پر آئے تو انھوں نے کہا "افکار برق" میرا خواب تھا، خدا کا شکر ہے کہ یہ خواب بہ احسن تکمیل کو پہنچا اس خواب کو تمام و کمال پورا کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور

ڈاکٹر مشرف احمد اور ان کے ساتھ الظفر اور ذیشان اکیڈمی کراچی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی و معاونت کی۔

اس موقع پر صاحب تقریب جناب برق اجمیری نے دو قطعات اور اپنی نعتیہ نظم "ظہور قدس" کے چند بند سنائے۔ جناب صابر براری نے قطعہ تاریخ کی صورت میں منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ جناب دلاور فگار کا منظوم خراج تحسین اُن کی عدم موجودگی میں جناب وقار فاروقی نے سنایا اور ڈاکٹر ہلال جعفری نے بھی منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

اس تقریب کی ایک اور خصوصیت سو صفحات کا ایک خوبصورت مجلہ جس میں جناب برق اجمیری کے فن و شخصیت پر لکھے منثور و منظوم مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے ایک اور بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ ہلا امتیاز "افکار برق" اور مجلہ ایک ساتھ تقسیم کیا گیا۔

تقریب کا اختتام پر تکلف عشائیہ پر ہوا۔

ایلیفنس کالج عالمی اردو کانفرنس ۱۹۹۳ء

ایلیفنس کالج عالمی اردو کانفرنس ۹۳ء، ۵ ستمبر تا ۷ ستمبر دبھا آڈیٹوریم میں جاری رہی اس سہ روزہ کانفرنس کا انعقاد بزم ثقافت ایلیفنس کالج کراچی پاکستان کی جانب سے کیا گیا تھا۔

کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۵ ستمبر صبح نو بجے شروع ہوا۔ اجلاس کی صدارت بھارت کے مندوب ڈاکٹر قمر رئیس نے فرمائی۔ مہمان خصوصی جناب حکیم محمد سعید گورنر سندھ تھے۔ نظامت کے فرائض جناب نقاش کاظمی نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز قاری ظاکر قاسمی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ سپاس نامہ جناب ظفر مہدی پرنسپل ایلیفنس کالج نے پیش کیا کانفرنس کے انعقاد کا خیر مقدم محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام نے خیر مقدمی کلمات سے کیا۔ جناب شوکت زیدی سرپرست اعلیٰ ایلیفنس کالج نے مندوبین گرامی کو خوش آمدید کہا، مندوبین کی جانب سے خیر مقدم کا شکریہ جینی مندوب جناب شی شوانگ نے ادا کیا۔

آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس نے حاضرین سے خطاب کیا اس کے بعد مہمان خصوصی عزت مآب حکیم محمد سعید گورنر سندھ نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ اختتامیہ کے طور پر جناب شوکت زیدی نے کلمات تشکر پیش کیے۔

۵ ستمبر کا اجلاس اوّل

ازبکستان کے مندوب جناب تش مرزا نے صدارت فرمائی، مہمان خصوصی اور نظامت کے فرائض جناب رضوان صدیقی نے انجام دیے۔ اس اجلاس کا کلیدی مقالہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے پیش کیا۔ ان کے علاوہ چین کے مندوب پروفیسر تھانگ منگ شنگ صدر شعبۂ اردو بیجنگ یونیورسٹی اور کوریا کے مندوب کیم یونگ کور نے اردو میں اپنے مقالے پڑھے۔ آسٹریلیا کی نمائندہ محترمہ ڈاکٹر پروفیسر اسٹیلا ڈرائی لینڈ نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا۔

۵ ستمبر ۹۳ء کا اجلاس دوم

صدارت بنگلہ دیش کے نمائندہ ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے فرمائی مہمان خصوصی کی حیثیت سے لندن کے مندوب جناب رضا

علی عابدی تشریف رکھتے تھے۔ نظامت کے فرائض جناب سرور جاوید نے انجام دیے۔ کلیدی مقالہ جناب سحر انصاری نے پڑھا۔ مقالے کا موضوع "جامعہ کراچی میں غیر ملکی طلبہ کی اردو تدریس" تھا۔ اس کے علاوہ جن دوسرے مندوبین نے مقالات پڑھے ان میں چین کے پروفیسر شاو، سیانگ، انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر جناب جگن ناتھ آزاد، بنگلہ دیش کی محترمہ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر اور ازبکستان کی محترمہ نادرہ قادروف تھیں۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے اپنے خطاب میں، اجلاس میں پڑھے گئے مقالات کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ پیش کیا۔

۶ ستمبر اجلاس اوّل

صدارت امریکہ کے مندوب پروفیسر ڈاکٹر سلور برائن نے فرمائی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب ہاشم رضا سابق سیکریٹری حکومت پاکستان تشریف رکھتے تھے۔ نظامت کے فرائض جناب حمایت علی شاعر نے انجام دیے۔ اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ کلیدی مقالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پیش کیا مقالے کا موضوع "اردو بین الاقوامی اُفق پر" تھا۔ اس کے بعد جناب حمایت علی شاعر نے اعلان کیا کہ روسی مندوب ڈاکٹر لُدمیلا واسی لیوا تشریف نہ لاسکیں۔ انھوں نے اپنا مقالہ بھجوادیا ہے یہ مقالہ اُس کتاب میں شامل ہوگا جس میں کانفرنس کی مکمل روداد چھپے گی۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں بھارت کے ڈاکٹر قمر رئیس، برطانیہ کے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، ازبکستان کے پروفیسر آزاد نصر الدّین شماتوف کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ صدارتی مقالہ ڈاکٹر سلور برائن نے پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر سلور برائن نے مقالے کا آغاز غالب کے شعر سے کیا اور ختم بھی غالب کے شعر پر ہی کیا (اُن کے تھیسس کا موضوع "غالب کی اردو شاعری") ۔۔۔۔ اس موقع پر مہمان خصوصی جناب سیّد ہاشم رضا نے بھی اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو محظوظ کیا۔

۶ ستمبر ۹۳ء کا اجلاس دوم

صدارت ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے فرمائی ۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر فرمان فتح پوری تھے۔ ان کے ساتھ ہی اسٹیج پر غیر ملکی مندوبین میں جناب ترغیب بلند نقوی، جناب اظہار حیدر اور جناب اشفاق حسین تشریف رکھتے تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر آفاق صدیقی نے انجام دیے۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں پولینڈ کی محترمہ یوانا کولان چسکا، برطانیہ کے جناب رضا علی عابدی چین کے پروفیسر لیوشیوشیانگ، ازبکستان کے جناب تش مرزا خرمی رضاوف بھارت کے جناب ایم حبیب خاں اور بنگلہ دیش کے ڈاکٹر کلیم سہسرامی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اس موقع پر جناب راغب مرادآبادی نے فی البدیہہ منظوم تہنیتی کلام پیش کیا۔

۶ ستمبر کو شام کے اجلاس کے ساتھ مقالات کا سلسلہ ختم ہوا اگلے روز یعنی ۷ ستمبر کا اجلاس قراردادوں کے لیے مختص تھا۔ جس میں صرف مندوبین کو شرکت کرنا تھی۔

۹ ستمبر کو بزم ثقافت ایلینٹس کالج کی طرف سے ۱۹۹۳ء کا پانچواں عالمی مشاعرہ جدوجہد آزادی کے رہنما اور اردو کے عہد ساز غزل گو مولانا سیّد فضل الحسن حسرت موہانی کے نام نامی سے معنوں ہوا۔ واضح رہے کہ بزم کی طرف سے برپا کیے جانے والے اس سے پہلے کے چار مشاعرے رئیس امروہوی (۱۹۸۹ء) فیض احمد فیض (۱۹۹۰ء) شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی (۱۹۹۱ء) اور اُستاد قمر جلالوی

(۱۹۹۲ء) کے نام سے معنون کیے گئے تھے۔

پانچواں مشاعرہ ساسی گراؤنڈ کراچی میں منعقد ہوا ملکی و غیر ملکی شعرا کی ایک بڑی تعداد نے اس میں حصّہ لیا۔

انجمن میں میلاد شریف

ربیع الاوّل کے موقع پر یکم ستمبر ۹۳ء کو ہر سال کی طرح اس سال بھی انجمن ترقی اردو کے دفتر میں محفل میلاد برپا کی گئی مدحتِ رسول مقبول ﷺ کے لیے مولانا خالد فاخری کو مدعو کیا گیا تھا، مولانا کے خطاب سے پہلے جناب شبیر احمد شاہ نے نعت سنائی۔ اس موقع کے لیے مولانا فاخری نے "حُب رسول ﷺ" کا موضوع انتخاب کیا تھا قرآن و حدیث کے حوالے سے مولانا نے اس موضوع پر عالمانہ گفتگو کی۔ میلاد کے بعد شیرینی کی تقسیم کا بھی انتظام تھا۔

اہلِ قلم کے لیے اعزازات

یوم آزادی کے موقع پر جن شخصیات کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے حوالے سے صدارتی ایوارڈز کا اعلان کیا گیا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ہلال امتیاز
۲: میر خلیل الرحمن (مرحوم) ستارۂ امتیاز
۳: عبدالحئی مشفق خواجہ۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۴: پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۵: طفیل ہوشیارپوری (مرحوم)۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۶: پروفیسر حسن عباس حسن رضوی۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۷: غلام رسول خاں جانباز جتوئی (سرائیکی شاعری) حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۸: جمال الدین علی خاں ابڑو (سندھی ادب) حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۹: سید آل احمد رضوی۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ
۱۰: اخونزادہ مختیار علی۔ حسن کارکردگی، صدارتی ایوارڈ

پروفیسر شوکت واسطی کے شعری مجموعے "خلد خیال" کی تعارفی تقریب

گزشتہ دنوں انجمن ترقی اردو شاخ ہزارہ ڈویژن ایبٹ آباد اور "بزم علم و فن" کے اشتراک سے پروفیسر شوکت واسطی کے نئے شعری مجموعے "خلد خیال" کے سلسلے میں ایک تعارفی تقریب گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی۔ تقریب کا آغاز قاری مشتاق احمد نے تلاوت کلام الٰہی سے کیا اس کے بعد نوجوان نعت خواں جنید مصطفٰے نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کلام پروفیسر شوکت واسطی کا تھا۔ تقریب کے دو دور ہوئے پہلے دور کی صدارت جناب سیّد واجد رضوی نے کی اور اس میں "خلد خیال" کے حوالے سے مقالے اور مضامین پڑھے گئے۔ پروفیسر صادق زاہد نے تعارفی کلمات میں شوکت

واسطی کی ادبی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر صوفی عبدالرشید، پروفیسر سید یونس گیلانی، قاسمی عارف حسین، پروفیسر طاہر فاروق اور عبدالحفیظ اثر نے اظہار خیال کرتے ہوئے نصف صدی سے زائد عرصے پر پھیلے ہوئے شوکت واسطی کے ادبی سفر کو مرحلہ وار پیش کیا۔ آخر میں شوکت واسطی نے اظہار خیال کیا صدر محفل سیّد واجد رضوی نے شوکت واسطی کی ادبی خدمات کو سراہا اور انھیں ایک بہترین انسان قرار دیا۔ دوسرا دور مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ مشاعرہ کی صدارت کے فرائض جناب عبدالحفیظ اثر نے انجام دیے۔ مشاعرے کا آغاز جناب کریم بخش آعوان کے ایک خوبصورت گیت سے ہوا ان کے علاوہ جن مقامی وغیر مقامی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں شبیر احمد شبیر، قندیل حسین قندیل، ذکاالرشید، عامر سہیل، ماجد حسین بادل، شعیب آفریدی، ڈاکٹر قاسم محمود، امتیاز الحق امتیاز، ڈاکٹر ضیاء الرشید، حیدر زمان حیدر، پروفیسر محمد صادق، عبدالرشید رشید ہزاروی، ازور شاہین، طاہر اعوان، قدیر جاوید، تنویر حیدر، صوفی عبدالرشید، عبدالحفیظ اثر اور پروفیسر شوکت واسطی شامل ہیں۔

(رپورٹ عبدالقادر ساجد)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد متفقہ طور پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر منتخب ہوگئے

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ اطلاع مسرت سے سنی جائے گی کہ بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر، نقاد، محقق اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد متفقہ طور پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر منتخب ہوگئے ہیں۔ انجمن کی صدارت کا عہدہ جناب سیّد حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت انجمن کی میعاد مکمل ہونے پر خالی ہوا تھا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت کے عہدے پر سیّد حامد سے قبل جو برگزیدہ ہستیاں فائز رہ چکی ہیں وہ ہیں: پروفیسر آرنلڈ (علامہ اقبال کے استاد) نواب عماد الملک بلگرامی، سر سیّد راس مسعود، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ہردے ناتھ کنزرو، کرنل بشیر حسین زیدی، جسٹس آنند نرائن مُلّا اور جناب مالک رام۔

جگن ناتھ آزاد اُس زمانے سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے ساتھ وابستہ چلے آرہے ہیں جب ڈاکٹر مولوی عبدالحق اس کے سیکریٹری تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جگن ناتھ آزاد نے مرحوم عبدالعزیز فطرت کے ساتھ مل کر اپنے شہر راولپنڈی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی تھی اور اُس شاخ کے زیر اہتمام باقاعدہ جلسوں کے علاوہ علامہ اقبال کی زندگی میں جلسۂ اعزاز اقبال منعقد کیا گیا جو علامہ اقبال کی زندگی میں منعقد کیے ہوئے چار اولین جلسہ ہائے اعزاز میں شمار ہوتا ہے۔ اس سہ روزہ جلسے کی صدارت شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے کی تھی۔ اس شاخ کے زیر اہتمام ایک اور بڑا جلسہ پریم چند کے انتقال پر "یوم پریم چند" کے نام سے منعقد کیا گیا جس کی صدارت تلوک چند محروم نے کی۔ اور جس میں ہندوستانی اہل قلم حضرات کے علاوہ تین نامور امریکی پروفیسروں ڈاکٹر آر۔ آر۔ اسٹوارٹ، ریورنیڈ جے۔ بی۔ کننگز اور پروفیسر ڈبلیو جے ڈاؤنز نے منشی پریم چند کو خراج عقیدت پیش کیا۔

پاکستان بننے کے بعد جب انجمن ترقی اردو (ہند) ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگئی تو ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی گولڈن جوبلی کی تقریب میں آنجہانی جوش ملسیانی، ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم اور روش صدیقی مرحوم کے ساتھ جگن ناتھ آزاد نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔

۱۹۷۷ء میں پہلی بار جگن ناتھ آزاد کو پانچ برس کے لیے انجمن ترقی اردو (ہند) کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں

انجمن کے ہفتہ وار جریدے "ہماری زبان" کے ایڈوائزری بورڈ کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں دوبارہ اور ۱۹۸۸ء میں تیسری بار وہ پانچ پانچ برس کے لیے انجمن کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں وہ انجمن کے نائب صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں انھیں متفقہ طور پر انجمن کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔

نظم و نثر میں آزاد صاحب کی ترپن (۵۳) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سیمیناروں، توسیعی لیکچروں کے لیے اور مشاعروں میں شرکت کے لیے وہ یورپ، امریکہ اور مشرقی وسطیٰ کے بیشتر ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر تین طلبہ نے ہندوستان اور دو نے پاکستان میں تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ اب تک ان پر چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(ایم حبیب خان) (شمیم جہاں) اسسٹنٹ سیکریٹریز

ڈاکٹر سیّد اختر امام کا انتقال

گزشتہ مہینے عالمی شہرت کے حامل اسکالر ڈاکٹر سیّد اختر امام دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انھیں سخی حسن کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر امام لنکا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ خانہ فرہنگ ایران، پاکستان کی دعوت پر ایک سیمینار کی صدارت کرنے کے لیے اسلام آباد آئے تھے۔ وہاں سے وہ یکم ستمبر ۹۳ء کو کراچی اپنے بھائی سے ملنے آئے۔

ڈاکٹر امام ۱۰ جولائی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۳ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہار میں پیدا ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں عربی میں ایم اے کیا۔ اسی سال بون، جرمنی اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ بون یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور اسلامیہ کالج کلکتے میں عربی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور پاکستان کی طرف سے مختلف ممالک کے سفارت خانے میں بہ حیثیت فرسٹ سیکریٹری مامور رہے۔ تقریباً بیس برس پہلے یہاں سے سری لنکا چلے گئے جہاں وہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ریٹائرڈ زندگی وہیں گزار رہے تھے۔ اللہ مغفرت کرے........

جمیل نظر رحلت کر گئے

پچھلے دنوں جناب جمیل نظر کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک معروف شاعر تھے۔ اُن کا ایک شعری مجموعہ .... کئی برس پہلے منظرِ عام پر آکر مقبول ہوا۔ اُن کی ایک نثری تصنیف "سحر و ساحری" ادبی حلقہ میں تادیر موضوعِ گفتگو رہی۔

ادارہ "قومی زبان" بارگاہِ ایزدی میں اُن کی مغفرت کے لیے دست بدعا ہے۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

تنقید فن تنقید

مصنف	عنوان	ماخذ
آفاق صدیقی، پروفیسر	مہران نقش پر ایک نظر	اہل قلم، ملتان ۹۲/۱۲ء ص ۱۶
ابوالکلام قاسمی،	اختر الایمان کا طنزیہ اور علامتی اسلوب	قومی زبان، کراچی، دسمبر ۹۲ء ص ۱۹
احسان اکبر	پرتو روہیلہ کی آواز	فنون، لاہور، جنوری، اپریل ۹۲ء ص ۵۹
ادیب سہیل،	انشائیہ کے خدوخال،	صریر کراچی، سالنامہ جولائی ۹۲ء ص ۳۰۰
ادیب سہیل،	دوہے کا ایک نیا روپ،	اوراق، لاہور، سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۴۷
اکرم عتیق،	یزدانی جالندھری کی نظم گوئی،	ماہ نو، لاہور، اگست، ۹۲ء ص ۴۲
الیاس عشقی، ڈاکٹر،	رسالہ تحقیق پر ایک نظر	دانش، اسلام آباد ۹۲/۳۱ء ص ۱۳۶
امام اعظم، ڈاکٹر	آزاد غزل ایک دانشورانہ ہیئتی تجربہ	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۶۳
امجد طفیل	اردو نفسیاتی تنقید کا جائزہ	اوراق، لاہور، سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۹۲
انور مسعود	سرفراز شاہد کی شاعری ایک تیغ شگفتہ نیام	فنون، لاہور، جنوری اپریل ۹۲ء ص ۶۳
بشیر سیفی، ڈاکٹر	اردو شاعری میں حالی کا مقام	سالنامہ صریر، کراچی جون جولائی ۹۲ء ص ۵۳
جسارت خیالی	بیدل کانپوری کا ایک تغزل	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۴۱
جیلانی کامران	لہو کا خراج بخش لائلپوری کی غزل	تحریریں، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۹
حفیظ صدیقی، پروفیسر	جان کاشمیری کی غزل	تحریریں، لاہور ستمبر، ص ۲۷
خیال رومانی،	پھول کھلے یا نہ کھلے، شجاعت علی راہی کی نظموں کا ناقدانہ جائزہ	ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۳۳
رام لعل	خواجہ احمد عباس کی کہانی ان کے مکاتیب کی روشنی میں	ادب لطیف، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۵
رانا غلام شبیر	ممتاز حسین ایک جرئ نقاد	ادب لطیف، لاہور، دسمبر ۹۲ء ص ۵
رشید امجد، ڈاکٹر	اختر ہوشیارپوری کا سمت نما	ماہ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۲
رئیس امروہوی	پیش گفتار کچھ وفا براہی کی غزل کے بارے میں	دائرے، کراچی جولائی ستمبر، ۹۲ء ص ۳۸
زبیر خالد	حفیظ ہوشیارپوری کی غزل کا عروضی پہلو	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۲
ستیہ پال آنند، ڈاکٹر	دست برگ اور صنف غزل کے بارے میں،	طلوع افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۵۳
ستیہ پال آنند، ڈاکٹر	دست برگ اور غزل کے بارے میں	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۴۴
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ادب ایک جائزہ	نیرنگ خیال، راولپنڈی نومبر ۹۲ء ص ۹
سرور انبالوی	مہران نقش ایک مطالعہ	تحریریں، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۱

مصنف	عنوان	ماخذ
سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر	پر تو روہیلہ کے دو ہے	تحریریں، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۱
شاہد واسطی	اقبال ساجد اور اس کا اثاثہ	اہل قلم، ملتان ۱۳/۹۲ء ص ۲۲
شرف کمالی	قمر نعمان کی شاعری	اہل قلم، ملتان ۱۳/۹۲ء ص ۲۷
شمیم حنفی، ڈاکٹر	جوش کی طنزیہ شاعری	افکار، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۲۶
شیبا رضوی	سعادت منٹو افکار و اظہار کے آئینے میں	طلوع افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۴
شیبا رضوی	سعادت حسن منٹو، افکار و اظہار کے آئینے میں	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۳۵
عارف بٹالوی	حالی کی شاعری	محفل لاہور جولائی ۹۲ء ص ۹۵
عبدالرحمٰن خالد	شعری عیوب و محاسن اور اصلاح کی صورتیں	ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۱۴
عبدالرحمٰن عابد قاضی	تین آوازیں فنی و فکری تجزیہ انشعاب	ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۴۳
عبداللہ خاور	مسدس نگاری میں ایک نیا موضوعی تجربہ	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۱۰۷
عرش صدیقی	ناصر بشیر اور ہائیکو	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۰
عنبر بہرائچی	زیب غوری کی شاعری میں رومانیت کے عناصر	ادب لطیف، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۹
عنوان چشتی، ڈاکٹر	عظمت اللہ خاں کا نظریہ اور شاعری	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۳۱
غلام شبیر	ن م راشد اور علامتی شاعری	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۲۵
فاروق عثمان	غلام عباس کا افسانہ حمام میں	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۲۱
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	تخیل پاکبازانہ مگر انداز رندانہ	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۶
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ساختیات فہمی اور ساختیاتی تنقید	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۲۲
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ساختیات فہمی، ساختیات کی بنیادی باتیں	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۱۳
قاضی قیصر الاسلام	پس ساختیات	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵۹
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	قاری اساس تنقید، مظہریت قسط نمبر ۲	صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۸
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	قاری اساس، تنقید، اینگلو سیکسن، قسط نمبر ۳	صریر، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۸
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	سخنے چند در ساختیات	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۹
ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر	شور و سلیم کے کلام پر اعتراضات حقی و شمس کا جائزہ	طلوع افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳۵
مجید بیدار، ڈاکٹر	شاعری میں صوتی آہنگ اور نغمگی کی روایت	صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۷۰
محمد حسن رام لعل، زاہدہ زیدی ساجدہ زیدی	غزل پر تنقیدی مکالمہ	شاعر، بمبئی ۱/۹۲ء ص ۸
محمد رضا کاظمی	نقد حرف	غالب، کراچی ۶، ۱۰/۹۲ء ص ۲۶۹
مظفر حنفی، پروفیسر	معرکۂ تخلیق و تنقید	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۶۶
معراج جامی	ساحر شیوی اور ذات کا دکھ	اہل قلم، ملتان ۱۳/۹۲ء ص ۳۷
مقصود حسنی	کرشن چندر کی کردار نگاری	تحریریں، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۹
ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر	گاڑی، ایک تجزیہ	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۵۶
ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر	ناول دریا کے سنگ، ایک تجزیہ	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۷
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ساختیاتی تنقید پر ڈاکٹر فہیم اعظمی سے مصاحبہ	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۴۱
منصور ملتانی	بلوشمال کی فلسفیانہ سرگوشی	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۲۴

نسیم شاہد، پروفیسر — اشرف جاوید، اردو غزل کا مستقبل — ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۳۵
وزیر آغا، ڈاکٹر — ساحل احمد کی غزلیہ شاعری — انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۵
وزیر آغا، ڈاکٹر — ڈی کنسٹرکشن یا ساخت شکنی — صریر، کراچی، سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۱۲
وزیر آغا، ڈاکٹر — منٹو کے افسانوں میں عورت — اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۱۱
یونس احمر — وفا براہی کی شاعری کے کئی رنگ — نیرنگ خیال، راولپنڈی اگست ۹۲ء ص ۷

ترجمہ، فنِ ترجمہ

سعید الظفر چغتائی — وضع اصطلاحات اور ترجمے — کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۱۰
طاہر تونسوی، ڈاکٹر، مختار علیم — سرائیکی زبان میں تراجم — ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۷
عطش درانی، ڈاکٹر — اردو میں فن ترجمہ اور ترجمہ کاری کی تربیت — اخبار اردو، اسلام آباد نومبر ۹۲ء ص ۶

بچوں کا ادب

محمود الرحمٰن، ڈاکٹر — ڈاکٹر جمیل جالبی، بہ حیثیت بچوں کے ادیب — ماہ نو، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۱
وزیر آغا، ڈاکٹر — بچوں کے لیے ادب — قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۹

خود نوشت

آغا سرخوش قزلباش — بیتے ہوئے دن — غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۴۸
آغا بابر — ناٹک سے وابستگی — ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۲۱۰
آفتاب احمد، ڈاکٹر — جوش ملیح آبادی یادوں کی برات — افکار، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۲۳
افتخار احمد عدنی — یادوں کا سفر، جگر مراد آبادی — قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵۷
افتخار احمد عدنی — یادوں کا سفر، جگر مراد آبادی — قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۲۷
ایم ایم حسن، ڈاکٹر — جڑواں شہر — نیرنگ خیال، راولپنڈی اگست ۹۲ء ص ۳۷
جلیل قدوائی — حیاتِ مستعار — غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۸۹
جمیل زبیری — یادوں کے خزانے — نیرنگ خیال، راولپنڈی اگست ۹۲ء ص ۴۰
جیون خان — ڈائری سے ایک ورق — اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۹
سلمیٰ شان الحق حقی، پروفیسر — شہیدانِ وفا کا خوں بہا کیا — غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۱۱۳
شان الحق حقی، ڈاکٹر — بام دنیا کا پھیرا — افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر — اختر حسین کی شادی (آٹھویں قسط) — افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر — میرے عہد کی سیاست (نویں قسط) — افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر — جاں نثار اختر (قسط نمبر ۱۰) — افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۱۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر — حجابت سے معیشت اور شامتِ اعمال تک (قسط نمبر ۱۲) — افکار، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۱۷
شاہ محی الحق فاروقی — مرزا صاحب، رخشِ ایام کو قرار کہاں — قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۶۵
شاہ محی الحق فاروقی — پرنسپل صاحب اور شبلی کالج اعظم گڑھ — دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۹۷
گیان چند، ڈاکٹر — میری بے رنگ زندگی کی بے کیف داستان — طلوع افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۹
مسعود مفتی — [illegible] — [illegible]

ناصر بغدادی	دوستووسکی کی ڈائری	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۸۷
نصرت علی	ابھی خواب زندہ ہیں	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۳۳
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا، کلکتے کا جو ذکر کیا....	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۶۰

سفر نامہ

اعزاز احمد آذر	مدینہ سفر ناموں کے آئینے میں	ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۷
افسر ساجد	اجنبی اپنے دیس میں/ شوکت علی شاہ	اہلِ قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۱۰۰
انوار فیروز	نیا کولمبس	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۳۵۶
انور مسعود	اسلم کمال اوسلو میں	ماہ نو لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۸۹
انور نذیر علوی، پروفیسر	سفر نامہ اور اردو ادب	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۸
حسین شاہد	ضرورت اگر پڑے... امریکہ اور یورپ	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۲۲۸
سعید الظفر چغتائی	چین پر پہلی نظر	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۲۰۲
سہیل عامر	دیارِ غیر (کینیڈا) کی باتیں	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۷
طیب منیر، پروفیسر	نانگا پربت، سفر نامہ	نیرنگ خیال، راولپنڈی اگست ۹۲ء ص ۱۰
کنول نین پرواز چیکر	.... اور ہیگ سے آگے	ادب لطیف، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۳
محمد اشرف، چوہدری	گردشِ رنگِ چمن	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۹
محمد اشرف، چوہدری	سرنگاپٹنم، سرنگاپٹنم	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۱
محمد عارف، ڈاکٹر	میخانۂ یورپ	اردو نامہ، جولائی ۹۲ء ص ۱۴
محمد عارف، ڈاکٹر	در حبیب ﷺ	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱۳
محمد عارف، ڈاکٹر	دلاویزیٔ افرنگ	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۲
محمد عارف، ڈاکٹر	دلاویزیٔ افرنگ (گزشتہ سے پیوستہ)	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۰
محمد عارف، ڈاکٹر	دلاویزیٔ افرنگ (گزشتہ سے پیوستہ)	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۳
مظفر الدین فاروقی، ڈاکٹر	شکاگو سے شکاگو تک	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۸

نومبر ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۱۱

مضمون نما

اقبال اور تصوّر پاکستان — خالد اقبال یاسر — ۵
کلامِ اقبال پر اکابر ملّت کے افکار.... — سید انکسار علی پاکستانی — ۹
ایک زمین، تین غزلیں — افتخار احمد عدنی — ۱۷
اسم باسمّی، ناسخ — ڈاکٹر سلیم اختر — ۲۹
فرید پور کے قاضی خاندان کی اردو فارسی خدمات — ڈاکٹر اُمِ سلمیٰ — ۳۷
برصغیر میں اردو صحافت کی ابتدا — گربچن چندن — ۴۵
بچوں کے لیے کہانیاں اکیسویں صدی میں — طاہر مسعود — ۴۹

گلہائے رنگ رنگ

پگھلاہٹ — طاہرہ ریاستی / معین نظامی — ۵۳
ہائیکو — بوسن / محسن بھوپالی — ۵۷
نظمیں — الطاف قریشی / ارشد محمود ناشاد — ۵۸
حادثہ — سیمین دانشور / محمد سلیم مظہر — ۵۹
رفتارِ ادب — ثناء الحق صدیقی ڈاکٹر وفا راشدی، ا۔ س — ۶۹
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ — ڈاکٹر انور سدید — ۷۵
گرد و پیش — ... — ۸۱
حروفِ تازہ — ..... — ۸۶
نئے خزانے — ڈاکٹر وفا راشدی — ۸۹

ادارۂ تحریر
ادا جعفری
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ
مدیر
ادیب سہیل

بدلِ اشتراک
فی پرچہ ——— ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق، ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

قومی زبان (۳) نومبر ۱۹۹۳ء

نومبر علامہ اقبال کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ اس موقع پر اندرون ملک اور بیرون ملک علامہ کی یاد منائی جاتی ہے۔ اُن کی مجموعی قومی و ملی خدمات پر کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ یادگاری تقاریب منعقد کر کے، علامہ کے فکری، علمی و ادبی کارناموں پر مقالات و مضامین پڑھوائے جاتے ہیں۔ اس طرح سال بہ سال علامہ سے متعلق ادبیات میں اضافے کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں علامہ اقبال پر بے شمار کتب و مضامین شائع ہوئے ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بیشتر ایک ناخوشگوار تکرار کے حامل ہیں۔ ایسی کتابیں کم لکھی گئی ہیں جو علامہ اقبال کے فکر و فن کے نئے گوشہ کو سامنے لائیں۔ یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن پر سیر حاصل کام نہیں ہوا ہے۔ مثلاً اقبال کی کلیاتِ نظم کی طرح اُن کی کلیاتِ نثر بھی شائع ہونی چاہیے۔ جس کے مرتّب کرنے کا کام اہل علم کی ایک جماعت کے سپرد ہو۔ اس سلسلے میں دوسرا کام جو نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ ایک اقبال انسائیکلوپیڈیا مرتّب کیا جائے جس میں اقبال کی زندگی اور فن نیز اُن کے معاصرین سے اُن کے تعلقات کے بارے میں تمام ضروری مواد لغت کی ترتیب سے جمع کیا جائے۔

قومی زبان (۵) نومبر ۱۹۹۳ء

اقبال اور تصوّر پاکستان

خالد اقبال یاسر

ہمارے مورّخ عام طور پر اس امر کے قائل ہیں کہ اقبال تصوّر پاکستان کے خالق ہیں اور انھوں نے ہی یہ عظیم خواب دیکھا تھا۔ اور ان کا کہنا شاید درست بھی ہے۔ لیکن ہماری قومی تاریخ میں علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار حضرت شاہ ولی اللہ، غالب اور سرسیّد کی ارتقائی صورت ہیں۔ سیاسی محاذ پر پہلے پہل وقت کی نبض کو پہچانتے ہوئے سرسیّد نے ہندو مسلم اتحاد کی مساعی میں ناکام ہو کر ہندوؤں کے تیور دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی گروہ کی بجائے مسلم قوم کے الفاظ استعمال کیے۔ انھوں نے ہی بنارس کے کمشنر سے زبان کے مسئلے پر ہندوؤں کے تعصب کے رد عمل میں پیش گوئی کی تھی کہ ہندو اور مسلمان اکٹھا نہیں رہ سکیں گے وہ یہ نہیں دیکھ سکیں گے لیکن آئندہ نسلیں یہ دیکھیں گی۔

عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی اور محمد علی جوہر نے بھی اپنی تقریروں میں اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کیا اور تو اور لالہ لاجپت رائے نے سی۔ آر۔ داس کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ "اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ ہندو مسلم ایکا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔" انھوں نے مسلم قائدین کو ہندو مسلم اتحاد میں نیک نیت سمجھتے ہوئے بھی یہ حقیقت پسندانہ اور تاریخی شعور سے معمور نتیجہ نکالا کہ "ان کا مذہب اس اتحاد میں مطلق حارج ہے۔ کیا کوئی مسلمان قرآن سے انحراف کر سکتا ہے؟(۱)

مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہند کی ایک تجویز عبدالجبار خیری نے بھی ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہوم کی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں پیش کی تھی۔ مگر ان سب سے زیادہ واضح طور پر عبدالقدیر بدایونی نے گاندھی کو ایک کھلے خط میں مخاطب کرتے ہوئے ہندوستان کی تقسیم کی باقاعدہ اسکیم پیش کی تھی اس کے نمایاں نکات اس طرح سے تھے:

۱۔ ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بنا پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کا بڑے سے بڑا حصّہ .... اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصّہ اس قوم کا حلقہ اثر قرار پائے مثلاً مسلمانوں کے لیے حسب ذیل تین صوبہ جات بنائے جا سکتے ہیں:

(الف) صوبہ سرحدی و مغربی پنجاب کے دس اضلاع، راولپنڈی، اٹک، جہلم، گجرات، شاہ پور، میانوالی، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، اور ملتان کو یکجا کر کے ایک صوبہ بنایا جائے۔

(ب) بنگال میں بوگرہ، رنگ پور، دیناج پور، جیسور ندیا، فرید پور، ڈھاکہ، راجشاہی، میمن سنگھ، باقر گنج، نواکھالی اور پٹنہ کے اضلاع کو دوسرا صوبہ بنایا جائے۔

(ج) سندھ کو بمبئی ریذیڈنسی سے جدا کر کے تیسرا صوبہ بنایا جائے۔

(۲) یہ بات اصولاً تسلیم کر لی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لیے کیا جائے گا۔" (۲)

اس تحریر میں تفصیلاً قلیل التعداد رعایا کے مذہبی حقوق اور اسلامی تمدن کے تحفظ کے لیے تجاویز پیش کی گئی تھیں بلکہ تبادلہ آبادی کے لیے بھی سہولتیں مہیا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

عبدالقدیر بدایوانی کی یہ اسکیم مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء (ذوالقرنین بدایوں) میں چھپی تھی اور بعد ازاں اسے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ نے بھی شائع کیا تھا۔ (۳)

علامہ اقبال اگر تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ہندوستان کی سیاسی تنظیم نو اور مسلم قومیت کا نظریہ ۱۹۳۰ء میں پیش کرنے کے قابل ہوئے تو اسی لیے کہ اس عہد میں ہمارے اسلاف، سیاسی قائدین اور بیدار مغز مفکرین اس برصغیر کی خاک سے اپنے لیے ایک نیا عالم تخلیق کر چکے تھے۔ اس آفرینش میں اقبال کا مقام یقیناً بہت بلند ہے۔ اقبال انقلاب کے آغاز اور نشاۃ سے وابستہ رہے۔ ان کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ اپنی جدوجہد کی عملی تفسیر اور انصرام و انجام اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اقبال نے ابتداء میں مسلمان عامتہ الناس کو ایک بے وطن قوم بننے کا سبق دیا تھا اور وہ ملت اسلامیہ میں ایک وطن ناشناس قومیت کی آبیاری کرتے رہے تھے۔ بلکہ قائد اعظم محمد علی جناح کی طرح وہ بھی ہندو مسلم اتحاد کو برصغیر کی ترقی، سیاسی اُٹھان اور آزادی کے لیے بنیادی شرط سمجھے ہوئے تھے لیکن زندگی بھر کے تجربے اور ہندو تہذیب کے مطالعے اور مشاہدے سے ان کی نظر مسلم تمدن سے اس کے تضادات کی طرف گئی اور انھوں نے مسلم تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے ہندوستان کے دو قومی نظریے کی بنیاد پر جغرافیائی تقسیم کی تجویز پیش کی۔ وہ پاکستان کو ایک ایسے خطۂ زمین کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے جہاں وہ اسلام کے جلال و جمال کو ظہور کرتا ہوا دیکھیں۔ اور جو اسلام کے ان آفاقی اصولوں کی نشو و نما کے لیے ایک عظیم تجربہ گاہ کا کام دے سکے جو اسلام کی اصل منتہا ہیں۔ تحریک پاکستان اسلامی تہذیب کی بقا اور توسیع کی حیثیت رکھتی تھی۔ بالادست اکثریتی ہندو ریاست کی بجائے ایک علیٰحدہ ریاست ہی مسلم قوم کو اس کی بقاء کی ضمانت کر سکتی تھی۔ چنانچہ اسی خیال سے علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ "پنجاب شمال مغربی صوبے سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک ہی ریاست میں مدغم کر دیا جائے، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب میں یا اس کے باہر حکومت خود اختیاری اور شمال مغربی مسلم ریاست آخر کار مسلمانوں کا مقدر ہے۔ (۴)

بعد میں انھوں نے بنگال کو بھی اپنے اس منصوبے میں شامل کر لیا اور ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم کے نام خط میں انھوں نے اپنے اس خیال کی مکرر توثیق کی۔ (۵)

اقبال اس سے پہلے دین الٰہیہ کی تشکیل جدید پر خطبات دے چکے تھے اور شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ایک اجتماعی قومی نصب العین کے لیے عملی جدوجہد پر مائل کرنے میں مصروف رہے تھے۔ اس مشہور خطبے سے دو سال پہلے بھی وہ تقسیم ہند کے بارے میں تحریری کام کا آغاز کر چکے تھے۔ ۹،۸،۷ دسمبر ۱۹۲۸ء کے انقلاب میں علامہ اقبال کی ترغیب پر اور رہنمائی میں ایک سلسلہ مقالات شائع ہوا۔ ان مقالات کے عنوانات تھے۔

(۱) مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سیاسی زندگی، فکر و عمل کے انتشار کا دردناک مظاہرہ۔

(۲) مسلمانانِ ہند کا سیاسی نصب العین، برادرانِ وطن، کی روش کا موازنہ۔

(۳) مسلم ہندی کے لیے وطن کی ضرورت، ہندوستان کی سیاسی الجھنوں کا واحد حل۔

ان مضامین کے عنوانات سے ظاہر ہے کہ ان میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی و ثقافتی تشخص کی بنیاد پر ان کے لیے علیحدہ خود مختار ریاست کے قیام پر زور دیا گیا تھا اقبال ۱۹۰۸ء میں اپنے لندن کے قیام کے دوران ہی لندن کی مسلم لیگ شاخ کے رکن بن گئے تھے۔ جو سیّد امیر علی نے قائم کی تھی۔ یہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کے لیے ہی کوشاں تھی۔ اقبال نے اپنے خطبات مدراس میں آزادی کے مقصد کو دین اسلام کے اساسی عقائد اور بنیادی رویوں کے بیان سے ثابت کیا، ان کا زور اس بات پر تھا کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اسے حرّیت فکر ودیعت کی ہے۔ انھوں نے فقہ اسلامی کی ازسر نو تدوین اور اجتہاد کے اصول اسی نقطہ نظر سے بیان کیے کہ مسلمان اسلام کے دائمی اصولوں سے مستفید ہوں اور انھیں اپنے ضمیر سے ہم آہنگ کر کے اپنے مستقبل کی راہیں متعین کر سکیں۔ وہ آزادی کو مذہبی فرضیت کا درجہ دیتے ہیں کہ اس کے بغیر معاشرتی نظام صحت مند بنیادوں پر قائم نہیں ہوسکتا۔ اقبال کے خطبہ الہ آباد میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ روحانی اور دنیاوی زندگی کی اکائی کو ثابت کرتے ہوئے رجعت پسند مذہبی تعلیمات کا تدارک کیا گیا تھا جس کی بنیاد پر غیر ملکی حکومت سے مسلمانوں کی وفاداریوں کا جواز گھڑا گیا جاتا تھا۔ اقبال نے فلسفیانہ پس منظر اور دلائل کے ساتھ زیادہ جامع نظریہ قومیت پیش کیا تھا جو دائمی قدروں کا حامل ہے۔

علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد سالماتی نظریہ قومیت کی مفکرانہ اور کلاسیکی توضیح و تشریح ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہندوستانی قوم کی وحدت کی تلاش کثرت کی نفی میں نہیں بلکہ اس کثرت کے توافق اور تعاون میں کرنی چاہیے۔ حقیقتیں خواہ وہ کیسی ہی ناگوار معلوم ہوں صحیح تدبران کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ عملی راہ یہ نہیں کہ ہم اشیاء کی ایسی حالت فرض کریں جو ناپید ہو بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کو ایسا ہی تسلیم کریں جیسے کہ وہ واقعتاً ہیں پھر اس کے ذریعے سے خیر کثیر کے لیے کوشش کریں۔ (۶)

اصول جمہوریت اور خود ارادیت کا اصول مسلمان سیاسی مدبرین کو وفاق میں صورت پذیر ہوتا نظر آتا تھا۔ ۱۹۲۴ء ہی میں مسلم لیگ نے وفاقیت کو وحدت قومی کی آئینی شکل قرار دیا تھا۔ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبہ بھی اسی اصول کی شرح و بسط سمجھا جاتا ہے۔

اقبال عملی سیاستدان نہیں تھے بلکہ ایک سیاسی مفکر تھے یہی وجہ تھی کہ وہ گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نظر کو اجمالاً پیش کر کے مایوس ہو کر خاموش رہے تاہم اقبال اور جناح کے روابط مسلمان قوم کے لیے بہت خوش آئند ثابت ہوئے۔ ان کے درمیان خط و کتابت میں ہمیں اقبال کے تصور پاکستان کی وضاحت ملتی ہے اس ضمن میں ۲ مارچ ۱۹۳۷ء کا خط بنام جناح بہت اہم ہے۔ طوالت کی وجہ سے اقتباس درج کرنے سے گریز کرتے ہوئے یہ کہنا کافی ہو گا کہ اس میں ۱۹۳۰ء کی تجویز کے ساتھ ۱۹۳۵ء کے آئین کا تجزیہ بھی تھا اور اپنی فلسفیانہ بصیرت کی بنا پر اقبال نے فیڈرل اسکیم کے نفاذ کے بارے میں امید قائم کرتے ہوئے اس کی خاطر جدوجہد کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

اقبال ایک روشن خیال مفکر تھے۔ انھوں نے نظریہ قومیت کو سالماتی اور نامیاتی حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ مسلم قومیت کی بنا پر برصغیر کی تقسیم کا (RATONALE) انھوں نے فراہم کیا۔ اور نظریہ پاکستان کی دستوری پیچیدگیوں کو بھی حل کیا اور وہ پاکستان کی حدود کے اندر ایک ہمہ امتزاج قوم کی تشکیل چاہتے تھے۔

حوالہ جات

(۱) بحوالہ عبدالحمید کمالی، جناح اقبال اور تصور پاکستان / منتخب مقالات، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۳ء ص ۲۷۷

(۲) ایضاً ص ۱۸۰-۲۸۱-

(۳) ایضاً ص ۲۸۳

(۴) اقبال: دی پاکستان آئیڈیا، ابراہیم سنز پبلشرز (کتابچہ) لاہور ص ۷

(۵) بحوالہ اقبال اور پاکستان / "ماہِ نو" ستمبر ص ۳۰۶

(٦) اقبال: کتابچہ مذکور، ص ۷

کلام اقبال پر اکابر ملّت کے افکار اور احیائے اسلام کی تحریکوں کے اثرات

سیّد انکسار علی پاکستانی

کلام اقبال اور شخصیت اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُن اکابرِ جدوجہد آزادی ہند اور برصغیر ہندوپاک میں ملّت اسلامیہ کے نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں چلائی جانے والی انقلاب پرور اور عہد آفرین تحریکوں کا مطالعہ کریں جو علامہ اقبال کی فکر اور کلام پر براہ راست اثر انداز ہوئی۔

اقبال کی فکر میں ہمیں جو بھی ہمہ گیریت اور گیرائی نظر آتی ہے وہ یقیناً اقبال کے عمیق مطالعہ اور برصغیر کے مسلمان علماء و فلاسفہ کے نظریات و افکار کا گہرا عکس اور پرتو ہے۔ ان تحریکوں اور شخصیات میں شاہ ولی اللہ کی شخصیت، وہابی تحریک، سنوسی تحریک، علی گڑھ تحریک اور علامہ جمال الدین افغانی کی شخصیت بڑی نمایاں ہے۔ کلام اقبال کو ان ہی مقتدر شخصیات کے افکار اور تحریکوں کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اپنی فکر کی بنیاد اسلام کے عقائد اور فلاسفۂ اسلام کی حکمت پر رکھی لہٰذا افکارِ اقبال کا محور اسلامی تحریکیں اور اسلام کے درخشاں اصول اور عقائد ہیں۔

وہابی تحریک

وہابی تحریک کا مقصد مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی اصلاح تھا اور مسلمانوں کو واپس اسلام کے قرونِ اولیٰ کی طرف لے جانا تھا۔ یہ تحریک اپنے دور کے پر آشوب حالات کا فطری تقاضہ تھی جو کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے منسوب ہے جن کی ولادت ۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ ان کی پیدائش تک دنیائے اسلام اپنے اخلاقی انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ تصوف کے غیر اسلامی شعائر اور فرسودہ توہمات کی کثرت نے اسلامی توحید کو پس پشت ڈال کر قوم تعویذ گنڈوں اور پیروں، فقیروں کے چکر میں پڑ چکی تھی مزارات پر غیر شرعی رسوم ادا کی جارہی تھیں۔

عبدالوہاب نے مسلمانوں کو ان بدعات سے روکا اور انھوں نے اسلامی توحید اور دینِ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی طرف راغب کیا انھوں نے قوم کی اخلاقی اصلاح کے لیے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کی تحریک کا آغاز کیا اور دعوت تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔

عبدالوہاب بلند پایہ عالم دین اور فقیہ تھے اور وہ صحیح معنوں میں حضرت امام بن حنبل اور امام بن تیمیہ کے پیروکار تھے انھوں نے توحید اور قرآن حکیم کی اصل تعلیمات اور خالص سنت رسول ﷺ کو اختیار کرنے پر زور دیا اور ہر طرح کے شرک سے بچنے اور قرآن حکیم کے متصوفانہ اور اعتزالی تفاسیر شرح پر توجہ دینے کے بجائے سیدھے سادے متن اور اس کے معنوں کی طرف

رجوع کرنے کی تاکید کی انھوں نے مسلمانوں کو نماز روزہ زکوۃ اور حج ادا کرنے کی ترغیب دی اور یہ تعلیم دی کہ غیر اللہ اور بدعات سے بچ کر اپنے آپ کو قرآن کی تعلیمات اور سنت رسول ﷺ سے وابستہ کریں۔

اقبال کی تعلیمات میں ہمیں عبدالوہاب کی تحریک کا عکس دکھائی دیتا ہے اور اقبال ان کی تحریک سے کافی حد تک متفق بھی تھے۔ "اقبال نامہ" میں وہ رقمطراز ہیں:

"زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدّین افغانی ہے مصر ایران و ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور جمال الدّین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔"

ایک جگہ اقبال نے اس تحریک کو دنیائے اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال میں:

"ایک چنگاری تھی جس سے عالم اسلام میں کہیں تقلید اور کہیں استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اُٹھی صدیوں کا جمود ٹوٹا قوائے علم و عمل شل ہو رہے تھے ان میں پھر حرکت پیدا ہوئی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلّب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہیے۔" بحوالہ سیّد نذیر احمد نیازی "اقبال کے حضور")

اقبال وہابی تحریک کے بعض نظریات و مقاصد سے پوری طرح ہم خیال تھے مثلاً وہ نظریہ توحید اور اجتہاد کے ضمن میں عبدالوہاب سے پوری طرح ہم رائے دکھائی دیتے ہیں جس کا اظہار ان کے کلام میں ہوتا ہے:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتاں وہم و گماں لاالہ الااللہ
یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لاالہ الااللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کے آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لاالہ الااللہ

اقبال نے اجتہاد پر بڑا زور دیا ہے اور وہ فکر و نظر کے اُفق کو درست کرنا چاہتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ صدیوں کے فقہی جمود سے مسلمان کی سیاسی، سماجی، معاشرتی زندگی محدود ہو کر رہ گئی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ قوم کے افراد دل کی گہرائیوں سے اور دماغ کی صلاحیتوں سے اپنے آپ کو نئے تصورات و نظریات سے روشناس کریں۔ اقبال کے خیال میں وہابی تحریک فی الحقیقت ابن تیمیہ کے تجدیدی کارناموں کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ مسلمانوں کی صدیوں کی ذہنی پستی کے تدارک کا اصل اصول اجتہاد کو ہی سمجھتے تھے۔ جہاں اقبال وہابی تحریک کی تعریف کرتے ہیں وہاں انھوں نے اس تحریک پر تنقید بھی کی ہے ان کا خیال ہے کہ داخلی طور پر اس کا خراج سرتاسر قدامت پسندانہ تھا۔

وہابی تحریک کے سیاسی پہلو کے ضمن میں اقبال کا نقطہ نظر تھا "اس سے نجد و حجاز میں باہم جنگ کی نوبت آئی۔ اس سے عالم اسلام کے اتحاد اور استحکام کو خاصا ضعف پہنچا.... میرے نزدیک وہابیت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا عقائد میں تشدد اور ظواہر پر اصرار ہے۔ بحیثیت ایک نظام مدنیت اس نے اسلام کے سیاسی اجتماعی نصب العین کا کوئی تصوّر قائم کیا نہ اس تصوّر کی رعایت سے اُمّت کی۔ وہ کس طرح کی ہیئت اجتماعیہ ہے یعنی آج کل کی اصطلاح میں ہم یہ کہیں گے کہ قوم ہے تو کن معنوں

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی تحریک احیائے اسلام

اس تحریک کا دور بھی وہی ہے جب دنیائے اسلام میں اصلاحی اور انقلابی تحریکیں اُبھر رہی تھیں اور غیر اسلامی اور غیر شرعی حکومتوں کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ نجد کی وہابی تحریک اس کی معاصر تھی دونوں تحریکوں کے درمیان مذہب میں شدید احتیاط پسندی اور سیاست میں انقلاب پسندی مشترک تھی۔ لیکن دونوں کے فکر و عمل میں کئی لحاظ سے شدید اختلاف تھا مثلاً وہابی علماء صرف شریعت کے قائل تھے اور انھوں نے طریقت یا تصوّف کو غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا تھا مگر ولی الٰہی تحریک کے علماء شریعت و طریقت دونوں پر عقیدہ رکھتے ہیں اور دونوں میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی حیثیت برصغیر میں قرون وسطیٰ اور دور جدید کے عالم اسلام میں ایک پُل کی سی ہے ان کی تحریک کے شروع ہونے سے یہ بات قریب قریب طے پا چکی تھی کہ اب ہندوستان کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر مختلف غیر اسلامی طاقتوں کے عروج کو روک سکے اور مستحکم حکومت کا قیام عمل میں لا سکے۔ اس صورت حال سے برصغیر کے مسلمان بڑے پریشان اور مضمحل تھے انھیں اپنا سیاسی معاشی اور معاشرتی مستقبل مزید تاریک ہوتا نظر آ رہا تھا۔

اس پُر آشوب دور میں اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کو فرشتۂ رحمت بنا کر سرزمین ہند میں بھیجا جنھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں برصغیر کی ملّت اسلامیہ کے احیاء میں صرف کیں انھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتّب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

شاہ ولی اللہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے انحطاط کے بنیادی اسباب پر غور و فکر کیا اور ان کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کی وہ سمجھتے تھے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا سبب خود ان کی اسلام سے عدم واقفیت ہے۔ ان کے خیال میں قرآن حکیم کے اصولوں پر عمل کرنے سے ان کی معاشرتی، معاشی و سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے اس کے لیے انھوں نے متعدد کتب لکھیں جس میں "حجتہ اللہ البالغہ" ان کی معرکتہ آلارا تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن حکیم کا عربی ترجمہ کیا شاہ صاحب نے حدیث کے احیاء کے لیے بھی کئی کتب تحریر کیں اور تعلیمات حدیث و سنت کو سمجھنے کے لیے ایک "دار الحدیث" کا سنگ بنیاد بھی رکھا جس کو بعد میں ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے بام عروج تک پہنچایا۔

علامہ اقبال شاہ ولی اللہ کے افکار اور ان کی تحریک سے بخوبی واقف تھے اور ان کے ہم نوا بھی تھے۔ سیّد محمد سعید الدّین جعفری کے نام ایک مکتوب مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء میں لکھتے ہیں:

> "ایشیاء کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانۂ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پُرانے مفسّرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے۔ مگر ان کی تصنیف میں بہت سی باتیں ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔"

(خطوط اقبال)

دوسری جگہ اقبال فرماتے ہیں

"..... ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ فکر از سر نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی۔"

مولانا محسن علی ندوی نومبر ۱۹۳۷ء میں اقبال سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سلطان محی الدین عالمگیر کی بڑی تعریف کی اور فرمایا میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدوجہد نہ ہوتی تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا۔"

(نقوش اقبال)

اقبال کے نظام فکر میں زمان و مکاں کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک دونوں اضافی اور حقیقی ہے لیکن دونوں میں سے زماں زیادہ اساسی اہمیت رکھتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں محدود اور لامحدود خودی کے باطنی پہلو کا زماں خالص اور خارجی پہلو کا زماں مسلسل سے تعلق ہے۔ زمان ایزدی اور زمان کائناتی مختلف ہیں اگرچہ تمام اشیاء میں زمان و مکاں دونوں موجود ہیں لیکن ان کا باہمی تعلق ایسا ہے جیسا جسم اور ذہن کا یعنی زماں ذہن ہے مکاں کا... اپنے تصور کی اساس کے لحاظ سے یہ نظریہ شاہ ولی اللہ کے تصور سے مختلف نہیں:

زندگی ما را بقا از مدعا است
کار دانش داد را از مدعا است
مدعا را از بقائے زندگی
جمع اسمائے قوائے زندگی

اقبال بھی حیات بعد الممات کی انتہا پر جنت اور دوزخ کو محض ایک مدتِ زمانی بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کی تائید میں ایسا ہی خیال پیش کرتے ہیں کہ زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لیے انسان بھی اس ذات لامتناہی کی نوید نو کی تجلیات کے لیے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا جائے گا۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

سنوسی تحریک

سنوسی تحریک نے مسلمانوں کے ذہن و فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا اس کے اثرات اپنے عہد کے عالم اسلام پر سیاسی اور مذہبی اعتبار سے بڑے دوررس تھے۔ عرب، مصر، سوڈان، الجزائر، فرانس، لیبیا اور افریقہ کے کئی علاقوں میں اس کے اثرات بالخصوص دیکھے جاسکتے ہیں اس تحریک نے ایک طرف مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جب کہ دوسری طرف مغربی اور اطالوی استعمار کا مقابلہ کیا۔

اس تحریک کے بانی سید محمد ابن علی السنیوسی (۱۷۸۷-۱۸۵۹) تھے۔ یہ مستعالم کے نواح میں جوالجزائر کے علاقے میں واقع ہے پیدا ہوئے۔ تاس میں تعلیم حاصل کی ۱۸۱۸ء حج کیا ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۳ء تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ سنوسی تحریک کا صدر مقام ۱۸۵۵ء سے ۱۸۹۵ء تک جغبوت میں رہا اس کے بعد کفرہ میں منتقل ہوگیا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد کتاب وسنت کی اساس پر عالم اسلام کا مکمل دینی احیاء تھا ان کے نزدیک دو باتیں اہم ہیں پہلی بدعات کا خاتمہ اور دوسری اجتہاد۔

سنوسی الکبیر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ تمام باتیں جن کی سند قرآن وسنت میں نہ ملے ان کو ترک کر دیا جائے اور اس اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو دور اوّل میں روبہ عمل ہے اس طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجتہاد کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں اپنے اس نظریہ میں سنوس زیادہ تر امام احمد ابن جنبل امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کی تعلیمات سے متاثر ہیں۔

اقبال بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام اپنے تمام لوازم میں ایک آفاقی مذہب ہے جو اپنی داخلی روحانی قوت کی وجہ سے یقینی طور پر ایسی اہلیت رکھتا ہے کہ تمام بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکے ان کی نظر میں اجتہاد ایک ایسا عنصر ہے جو اسلام کی ہیئت ترکیبی کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے۔ اقبال کے مطابق مسلمانوں کا ایک مرکز ناگزیر ہے کیوں کہ اس سے اجتماعی وحدت برقرار رہتی ہے اور تمدن میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سنوسی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ایک اسلامی دولتِ مشترکہ قائم کی جائے جو کہ نظام اسلام کی تجدید اور احیاء کا کام کرے لیکن واضح رہے کہ اقبال کے ہاں دنیائے اسلام کے ایک مرکز کا تصور بنیادی طور پر مذہبی اور تمدنی ہے نہ کہ سیاسی!

سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسیّد احمد خان ہیں جنھوں نے برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شکست خوردہ مسلمانوں میں اپنے تدبر فراست اور جدید تعلیم کے ذریعہ نئی روح پھونکی اور انھیں برطانوی سامراجیوں سے نبرد آزما ہونے کا نیا جوش و ولولہ عطا کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی، اصلاحی و فلاحی تحریک کا آغاز کیا انھوں نے برصغیر کے اونچے اور متوسط طبقے کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں کو بھی ازحد متاثر کیا اور ان میں انقلابی جذبہ بیدار کر کے علیحدہ تشخص کی برقراری اور جداگانہ آزاد وطن کے قیام کے لیے بھرپور جذبہ اور حوصلہ بخشا۔ سرسیّد نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے مختلف ادارے قائم کیے انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ جدید تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم ضرور حاصل کریں بغیر مغربی تعلیم کے حصول کے نہ تو وہ ترقی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی سامراجی غلامی سے آزادی۔

اقبال اور سرسیّد دونوں اپنے مقاصد اور فکر و عمل کے لحاظ سے بے حد قریب نظر آتے ہیں اقبال سرسیّد احمد خاں کے بعد وہ پہلے مفکر ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ فرسودہ رسوم سے خلاصی حاصل کریں اور اسلام کے حقیقی اور عملی نظریات کو اپنائیں اور اپنی زندگیوں کو زمانے کے حالات اور تقاضوں میں ڈھالیں۔ اسلامی شریعت اسی عمل کو اجتہاد کا نام دیتی ہے اقبال

سرسیّد کے تمدنی معاشرتی اور تعلیمی نظریات سے پوری طرح متفق تھے لہٰذا اقبال لکھتے ہیں:

سرسیّد عصرِ جدید کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دور کی خصوصیت ہے انھوں نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا مگر سرسیّد احمد خاں کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرم ہوگئے ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی حسّاس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردِّ عمل کیا۔"

سرسیّد کی طرح اقبال بھی تعلیم کے اصول اور نظام میں دین و دنیا کا مناسب امتزاج پسند کرتے ہیں اقبال مغربی تہذیب و تمدن اور جدید نظام تعلیم کے نقائص و مضرات پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس سے مبرا نہ تھے۔ اس لیے وہ فرماتے ہیں:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد کے ساتھ
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

سرسیّد نے ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جب کہ دوسری طرف اقبال نے اپنی شاعری کو زندگی کے مسائل کا ترجمان بناتے ہوئے مسلمانوں کے قومی اور سیاسی شعور کو بیدار کیا اور ان میں ایک اضطراب پیدا کیا اقبال فرماتے ہیں:

"میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسیّد احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔"

(گفتار اقبال ص ۷۳)

علامہ سیّد جمال الدّین افغانی

علامہ افغانی ایک مذہبی معلم، روشن فکر مفکر اور سیاسی رہنما تھے۔ ان کے پُرجوش اور حکیمانہ ذہن نے ان مسائل اور حالات کو بخوبی سمجھ لیا تھا جن سے گرد و پیش کی دنیا دوچار ہو رہی تھی۔ ان کے دل پر مسلمانوں کے انحطاط کا بڑا گہرا اثر تھا چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں سیاسی استقلال اور دستوری حکومت کے لیے مذہبی و فکری اصلاحات کے تحت جو جدوجہد ہوئی اس کے بڑے محرک یہی ثابت ہوئے۔

آپ ۱۸۳۹ء میں افغانستان میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ ایران اور افغانستان کے مختلف مقامات پر حصول علم میں مصروف رہے۔ جس کے بعد ہندوستان آگئے اور ڈیڑھ سال مقیم رہ کر انھوں نے مغربی علوم اور کسی قدر انگریزی میں استعداد

حاصل کرلی وہ افغانی، فارسی، عربی اور ترکی تو پہلے ہی جانتے تھے اور عالم اسلام کے مختلف ممالک کے علاوہ انھوں نے انگلستان، جرمنی، فرانس، روس میں مغربی علوم و تہذیب کا مطالعہ کیا۔ ۷ مارچ ۱۸۹۷ء قسطنطنیہ میں ان کا انتقال ہوا۔

علامہ افغانی نے اپنی تحریک میں اسلام کے احیاء کو سب سے زیادہ اولیت اور اہمیت دی اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف عالم اسلام کو مخاطب کیا بلکہ تمام مشرقی اقوام کو بھی ان کے تمام سیاسی انحطاط سے متنبہ کیا اور انھیں مغرب کے جارحانہ اثر و رسوخ کے خلاف متحد ہونے کی تلقین کی ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی ریاستیں ایک مرتبہ بیرونی تسلط اور سامراجی اقوام سے آزاد ہو جائیں اور ان کے سماجی اور معاشی شعبوں میں اسلامی تعلیمات اور اصلاحات نافذ کر دی جائیں تو پھر مسلمان اقوام خود اعتمادی اور خود انحصاری سے دیگر اقوام کی مدد کے بغیر اپنی ترقی و خوشحالی کی منزل کو پہنچ سکتی ہیں علامہ افغانی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور اذہان کو ضعف الاعتقادی اور اوہام پرستی ترک کر دینی چاہیے اور ان کو اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات دی جائیں۔
علامہ افغانی نے اپنے عہد کے ادب کو بھی خاصا متاثر کیا اور انھوں نے ادب کو عام زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کا ذریعہ قرار دیا آپ تمام عالم اسلام کو متحد دیکھنے کے خواہاں تھے۔

علامہ اقبال کی یہ خواہش تھی کہ تمام عالم اسلام ایک مرکزی اسلامی حکومت کی وحدت کے ماتحت متحد ہو جائے جس کا سربراہ ایک ہو جس طرح اسلام کے پُرافتخار دور میں تمام عالم اسلام ایک تھا علامہ افغانی کی سرگرمیاں عملاً سارے عالم اور ان مغربی ممالک میں بھی جاری تھیں جو مسلمانوں سے وابستگی رکھتے تھے۔

اقبال بھی عالم اسلام کی وحدت کے قائل تھے انھوں نے علامہ افغانی کے اس تصور کو قبول کیا کہ مکہ معظمہ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز رہے گا چونکہ اقبال علامہ افغانی سے بے حد متاثر تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ علامہ افغانی اپنے زمانے میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے موسس اور اپنے عہد میں سب سے بڑے باشرع بلکہ سب سے بڑے مسلمان تھے وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کرنا چاہتے تھے۔

اقبال اور افغانی دونوں میں پوری طرح ان مسائل کا احساس تھا جن سے سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے باعث اسلام کو دوچار ہونا پڑا تھا وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ مسلمان جدید علوم حاصل کریں اور سائنس کی خصوصی تعلیم پر توجہ دیں تاکہ اس سے ان کا مذہب اور ان کی سالمیت کا دفاع ہو سکے اقبال نے کتاب و حکمت دونوں پر خصوصیت سے زور دیا:

برگ سازِ ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتبار ملت است

علامہ اقبال علامہ افغانی سے اس حد تک متاثر تھے کہ جب انھوں نے "جاوید نامہ" میں ایک تصوراتی اسلامی مملکت کا خاکہ پیش کیا تو اس کے لیے انھوں نے علامہ افغانی کو اس کا ذریعہ اظہار بنایا علامہ اقبال فرماتے ہیں:

سید السادات مولانا جمال
زندہ از گفتار او سنگ و سفال
عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظار قم ہنوز

شام او روشن تر از صبح فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دل مومن کرانش نا پدید
عالمے رعنا کہ فیض یک نظر
تخم او افگند در جانِ عمرؓ
باطن او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دمے
اندرون تست آں عالم نگر
می دہم از محکمات او خبر

انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی کے مکان کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے

نیا پتہ یہ ہے

A۶۰۲۔ بون وسٹا اپارٹمنٹ

L-F۱۴۔ بلاک ۲۔ کلفٹن۔ کراچی

ایک زمین - تین غزلیں

افتخار احمد عدنی

بہت عرصہ ہوا ن - م راشد کی ایک تحریر نظر سے گزری تھی جس میں انھوں نے غزل پر یہ تنقید کی تھی کہ بیچارہ غزل گو قافیے کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ اگر قافیہ میخانہ ہے تو وہ اس کے لوازمات کا ذکر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ بادہ و ساغر و صراحی کا قیدی ہو جاتا ہے۔ عام شاعروں کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے جو شاعری کو ایک شغل یا ایک پیشے کے طور پر اختیار کرتے ہیں. لیکن ایک بڑا شاعر لفظ کا اسیر ہونے کے بجائے لفظ کو اپنے خیال کا تابع کر لیتا ہے۔ صوفیائے کرام کی تربیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی کو اپنی نوازش کے لیے منتخب کرتے ہیں تو اسے ایسی آزمائشوں اور سختیوں سے گزارتے ہیں کہ اس کا وجود خاک ہو جاتا ہے اور جب وہ مصائب کی چکی میں پس کر بالکل ہی ناامید ہو جاتا ہے تو وہ اُسے التفاتِ خاص سے نوازتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی مراد پا لیتا ہے۔ اوّل تو اتنے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں بیان کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ دوسرے اس کو ادا کرنے کے لیے "میخانہ" جیسا قافیہ چُننا اور بھی اس کام کو کٹھن بنا دیتا ہے. میخانہ تو سرور، مستی، بیخودی، خمار کا مسکن ہوتا ہے. لیکن بابا ذہین شاہ صاحب نے اس قافیے کے سانچے میں اس پورے مضمون کو دو مصرعوں میں سمو دیا ہے۔

کب التفاتِ ساقی مجھ پر ہوا ہے دیکھو
جب میں زمینِ خاکِ میخانہ ہو گیا ہوں

غالب نے بھی ظرفِ تنگنائے غزل کی وسعت سے محرومی کی شکایت کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی جدّت طرازی نے اُسے وہ وسعت بخشی کہ ان کے مصرعوں کے چند الفاظ فیض جیسے جدید شاعر کے مجموعہ ہائے کلام کے عنوان بن گئے۔ گویا فیض احمد فیض نے اپنی تمام نظموں کا حاصل جو عصری فکر کے ساتھ مستقبل کے خوابوں کی عکاس ہیں غالب کے کسی ایک مصرعے کی جھلک میں ... یہ جدید فکر کا غالب کو اور غالب کے حوالے سے غزل کو ایک بہت بڑا خراج ہے۔ یہ غزل کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ ... تعینات کے باوجود ایک بڑے شاعر کا آئینہ بن جاتی ہے۔ اور اس کی انفرادیت کو اجاگر کرنے میں کسی عجز کا شکار نہیں ہوتی۔ اس مضمون میں غالب، اقبال اور ذہین جیسے مختلف الخیال شاعروں کی ان غزلوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی جو ایک ہی زمین میں ہیں۔

غالب:

ابتدا ہم غالب کی معنی سے لبریز غزل سے کرتے ہیں جس کا مطلع ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اس غزل میں غالب نے کمالِ بلاغت سے تخلیقی عمل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے، اور اس خوبصورتی سے تخلیق کے محرکات، تخلیق کے کرب، تخلیق کے سود و زیاں اور تخلیق کی آسودگی کا ذکر کیا ہے کہ اسے تخلیقی تنقید کا ایک شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

آئیے پہلے تخلیق کے محرکات کا جائزہ لیتے ہیں۔ غالب جیسا دردمند دل رکھنے والا جب اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی فضا میں زندگی کی درماندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے کوئی منظر ایسا نہیں دکھائی دیتا جس سے اُسے سکون نصیب ہو۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہر طرف ہنگامہ ہے، شور و غوغا ہے، نالہ و فغاں ہے، اس منظر کو وہ "غبارِ وحشتِ مجنوں" قرار دیتا ہے۔ اور اسی کو زندگی کی ناقابلِ تردید حقیقت سمجھ کر نوعمری کی خوش خیالی اور تصور آرائی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ کاش ہمارے دور کے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے غالب کے اس شعر پر کچھ توجہ دی ہوتی۔

صحرا غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

نامساعد حالات، معاشرت کے ظلم اور وسائل کی کمی کا مداوا وہ محبت میں تلاش کرتا ہے، لیکن محبوب کی سرد مہری اور بے توجہی اُسے مایوس کر دیتی ہے:

سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

جب عالمِ کون و فساد فتنوں سے معمور ہو، اور دلدار سے کوئی اُمیدِ وفا نہ رہے تو ہر طرف سے مایوس ہو کر انسان محبوب حقیقی کی جانب رخ کرتا ہے۔ لیکن جب اُدھر سے بھی نگاہ ناکام لوٹے تو پھر کیا اُمید رہ جاتی ہے:

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہنگامۂ عالم کے آگے انسان کی بے بسی، محبت میں غیر متناہی انتظار اور محبوبِ حقیقی تک نہ پہنچ سکنے کا غم، یہ ہیں وہ محرکات جو "وحشتِ طبیعتِ ایجاد" بن کر شاعر کو تخلیق پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن تخلیق سے پہلے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان میں آنسو بہانا، سر پیٹنا، اور رگِ خار کو خونِ دل سے رنگین کرنا بھی ہیں۔ یہ سب غم شاعر کے باطن میں پکتے رہتے ہیں، اور جب وہ ناقابلِ برداشت ہوجاتے ہیں تو زخمِ دل میں ایک شگاف نمودار ہوتا ہے۔ وہ شگاف گویا زخم کا دہن ہے۔ اب اگر شاعر اپنے درد کے اظہار کے لیے کوئی بات کہتا ہے تو وہ ہونٹوں سے نہیں دہانِ زخم سے ادا ہوتی ہے اور اسی صورت میں یار سے اور یار کی وساطت سے آنے والی نسلوں سے "راہِ سخن" وا ہوتی۔ اور جب سخن "دہانِ زخم" سے ادا ہوتا ہے تو زمانہ گوش بر آواز ہوجاتا ہے اور سخن کی گونج صدیوں پہ پھیل جاتی ہے غالب نے جو اپنے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ مطلعے میں نظم کیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے وہ جن مراحل سے گزرے ان کا ذکر بعد کے شعروں میں ہے، لہذا غزل کو ختم کرتے ہوئے وہ مقطعے میں پھر اس حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں جو عمل تخلیق کا جوہر ہے تاکہ بات قاری کے سر سے نہ گزر جائے۔ اب مطلع پھر پڑھئے۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اس شعر میں غالب نے ہمیں ادب عالیہ کا کیسا ہمہ گیر کُلیہ دیا ہے۔

اب دیکھیے کہ غالب نے تخلیق کے سود و زیاں کا کیا نقشہ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ صرف غم اور افسردگی میں ڈوبنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اگر التفات یار کی راحت مطلوب ہے تو درد بن کے اس کے دل میں جگہ بنانا ضروری ہے۔ اپنے غم کا اظہار اس انداز سے کسی شعر یا افسانے یا فن پارے میں کرنا چاہیے کہ وہ درد بن کے دل میں اُتر جائے اس انداز اظہار سے اس کا حلقہ اثر یار سے گزر کر ہر صاحبِ احساس اور اہلِ نظر کو اپنے حصار میں لے لے گا۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

یہ تو ہوا تخلیق کا منفعت بخش پہلو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غالب کو شاعر کے غم اور اس کے اظہار کی بے بضاعتی کا احساس بھی خاصہ شدید تھا:

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

صدموں سے جگر چاک ہو گیا۔ لیکن کسی کو احساس تک نہ ہوا۔ نہ یار نے پرسش کی۔ نہ دوستوں نے غمخواری۔ ایسی صورت میں جنوں کے ہاتھوں امن کو تار تار کرنے سے کیا حاصل، نالہ وشیون سے کیا فائدہ، غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے کا کیا نتیجہ۔ سب بے حاصل ہے نہ جیب و دامن کو چاک کرنے سے کچھ بنے گا نہ خون کے آنسو بہانے سے۔

لختِ جگر سے ہے رگِ پُرخار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

شاعر نے ہر کانٹے کو خونِ دل سے سینچ کے رنگین کر دیا۔ لیکن اس وسیع صحرا میں جو بے شمار کانٹوں سے بھرا ہوا ہے ایک دل کا خون کہاں تک کفایت کرے گا۔ دل کی کیا بساط ہے کہ اس صحرائے ناپیدا کنار کی باغبانی کا حق ادا کر سکے۔ شاعر کچھ ہی کہتا رہے، کتنی ہی تمناؤں کے خون ہونے کی دل گداز داستانیں سناتا رہے یہ خار زار حیات اس کی مساعی سے کبھی گلزار نہیں ہو گا۔ معاشرے کی سطح پر بے مصرف ہونے کے باوجود تخلیقی عمل سے شاعر کے لیے گریز ممکن نہیں ہے۔ آنسو بہانے سے۔ اظہارِ غم سے۔ یعنی تخلیقِ فن کی لگن سے کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ بجائے خود بہت بڑی بات ہے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

یہ سب کہنے کے بعد غالب اس شعر پہ آتے ہیں جو تخلیقی عمل پہ شاعر کے مجبور ہونے اور پھر اس کے بعد طاری ہونے والی کیفیت کے بیان میں اس غزل کا نقطۂ عروج ہے۔

ہے وحشتِ طبیعت ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ایک بے چینی، ایک اضطراب، ایک وحشت شاعر کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے، اس کے باطن کا درد اُسے ایک اذیت سے گزار کے اظہار کا پیکر اختیار کر لیتا ہے، ایک فن پارہ وجود میں آتا ہے، لیکن اس اظہار کے بعد وہ کسی کامرانی کے احساس سے ہم کنار نہیں ہوتا، اُسے کوئی مہم سر کرنے کی خوشی نہیں ہوتی۔ بس یہ ہوتا ہے کہ اُسے ایک طرح کا سکون مل جاتا ہے وہ سکون جو نااُمیدی اور یاس کے عالم

میں حاصل ہوتا ہے۔ اور اسے ہی وہ اپنے غم کا مداوا سمجھتا ہے۔ طبعیتِ ایجاد کی وحشت طرب انگیز ہونے کے بجائے یاس خیز ہے، ایک درد ہے، لیکن ایسا درد جس کے بغیر شاعر رہ بھی نہیں سکتا۔ "یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی" تخلیق کے موضوع پر سب کچھ کہنے کے بعد غالب غزل کے آخری شعر میں اسی بات کا اعادہ کرتے ہیں جو انھوں نے مطلعے میں کہی تھی:

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

جو بات دہانِ زخم سے شروع ہوئی تھی وہ دل گداختہ پہ ختم ہوئی۔ تخلیق کے موضوع پر اردو میں اس غزل کی نظیر نہیں ہے۔

اقبال:

آئیے۔ اب یہ دیکھیں کہ اسی زمین میں اقبال کی غزل کا نمایاں تاثر کیا ہے۔ نو شعروں کی غزل میں پانچ اشعار شاعر کے شوق دیدار کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں تین کا تعلق جلوۂ حق سے ہے اور دو کا جلوۂ یار سے اور ان دونوں میں قافیہ ہے "دیکھا" دیکھا کرے کوئی" کی ترکیب میں بڑا حسن ہے۔ حیرت ہے کہ بارہ اشعار کی غزل میں غالب نے دیکھا، کا قافیہ نہیں باندھا اور ایک شعر میں بھی ذوقِ دیدار کا ذکر نہیں کیا۔ ان کی تمام تر توجہ اپنی داخلی کیفیات پر رہی۔ اقبال ان کے برعکس اس غزل میں داخلی مسائل سے فارغ نظر آتے ہیں۔ انہیں کوئی ذاتی الجھن دامن گیر نہیں ہے۔ ان کا جذبہ ایک طرف جلوہ حق کو دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے اور دوسری طرف حسنِ یار پہ نظریں جمانے کا طالب ہے وہ غزل کو اس شعر سے شروع کرتے ہیں:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اقبال نے یہ شعر یونہی نہیں کہا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی سچائی ہے۔ ایک ایسی سچائی جس کا ادراک ان کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا، اور جس نے مرورِ وقت کے ساتھ ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ان کی فکر کے ارتقا میں اُن کی رہنمائی کی۔ حق کی نشانیوں کو اپنے باطن میں دیکھ کر ہی وہ حق کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ اور ان نشانیوں کو دیکھنے میں چشمِ ظاہر کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ دیدۂ دل کو وا کئے بغیر حق کو دیکھنا ناممکن ہے۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

صوفیائے کرام کی طرح ہر منظرِ ہستی پہ آنکھوں کے دریچے بند کر کے ڈوب جانے ہی کو وہ دیدارِ حق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقبال کا تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اقبال اگر خلاف تھے تو اس انحطاط پذیر نظام خانقاہی کے جس نے مشیتِ الٰہی کی غلط تعبیر سے ملت کو عمل سے بیگانہ کر دیا تھا انھیں اختلاف تھا تو اُن نظریات سے ان کے انقلاب آفریں فلسفۂ خودی سے متصادم تھے اگر وہ تصوف کے منکر ہوتے تو پیرِ روم کے آگے زانوائے تلمذ کیوں طے کرتے اور اگر وہ تصوّف کے فیضان سے محروم ہوتے تو رسول ﷺ کی محبت کا دریا اُن کے دل میں کیسے موجزن ہوتا۔ رسول ﷺ کی محبت صرف کتابی علم اور اصلاح کے نسخوں کی تجویز سے نہیں پیدا ہوتی۔ اس کی اساس ایک گہری وابستگی اور روحانی تجربے پر ہوتی ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کے سلسلے میں ان کا یہ قطعہ تو اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی نا گزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اقبال نے اپنی گناہ گاری پر جس شرمندگی کا اظہار کیا ہے وہ جامی جیسے عاشقِ رسول ﷺ کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتی ہے۔
اقبال کے کلام میں فیضانِ تصوّف کی داخلی شہادتیں بہت ہیں یہاں میں اُن کے صرف دو فارسی اشعار کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کروں گا:

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی
ولیکن سوے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

نہ تو حرم میں سماتا ہے، نہ بتخانے میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے، لیکن جو تیرے چاہنے والے ہیں ان کی طرف تو کس اشتیاق سے لپکتا ہے۔ یہاں غیر ارادی طور پر اقبال نے اس حدیثِ قدسی کا مفہوم بیان کر دیا ہے جس میں اعلانِ باری ہے کہ بندہ اُس کی طرف ایک قدم اُٹھاتا ہے تو وہ دس قدم اس کی طرف بڑھتا ہے۔ دوسرا شعر ہے۔

قدم بیباک تر نِہ در حریم جان مشتاقاں
تو صاحب خانۂ آخر چرا دُزدانہ می آئی

عاشق کے حریمِ جان میں بے خطر قدم رکھ۔ تو ہی اس گھر کا مالک ہے تجھے چوروں کی طرح دبے پاؤں آنے کی کیا ضرورت ہے۔
شوقِ دیدار کی نزولی جہت میں اقبال جلوۂ حق سے جلوۂ یار کی طرف سفر کرتے ہیں۔ لیکن یار کی طرف نظر اُٹھانے سے پہلے منظرِ دید کی اس تبدیلی کی ایک بہت خوبصورت توجیہ پیش کرتے ہیں:

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

جب حسنِ یار خود جرمِ محبت کا تقاضا کرے تو پھر حشر میں کسی تازہ عذر تراشنے کی کیا ضرورت ہے اس شعر میں وہ روانی اور حسنِ ادا ہے کہ شاید اسی قسم کے اشعار کو دیکھ کر داغ نے اقبال سے کہا ہوگا کہ اب آپ کو کسی صلاح اور مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔
جرمِ محبت کے اس جواز کے بعد وہ روئے یار کو اس اشتیاق سے دیکھتے ہیں کہ دل کی بیقراری چھپائے نہیں چھپتی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشین
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی

اس شعر میں اشتیاق اور بے صبری کا ذکر ہے۔ جب دیدار یار سے وہ بیقراری رفع ہوجاتی ہے تو جمال کی تمکنت اس طرح نگاہوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ شاعر کو پلک کا جھپکنا تک گوارا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ نرگس کی طرح بغیر پلک جھپکائے مسلسل اُسے دیکھتا رہے:

نظارگی کو جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

دل تیرے دیدار میں اس طرح محو ہے کہ جنبش مژگاں کا بھی روادار نہیں، صرف نرگس کی آنکھ سے تیرے جلوے کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ یہاں مجھے مدتوں، پہلے کہیں دیکھے ہوئے یہ الفاظ یاد آرہے ہیں۔

AN ETERNITYIS NEEDED TO GAZE AT THE FOREHEAD

نو اشعار کی اس غزل میں دو شعر ایسے بھی ہیں جن میں روایتی معنی آفرینی کی جھلک نظر آتی ہے:

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پہ کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

اس غزل میں اہمیت کے حامل دراصل وہی شعر ہیں جن کا تعلق شوق دیدار سے ہے۔ اسی شوق دیدار نے اقبال کی فکر و نظر کو ان ارتقائی منازل سے آشنا کیا جن کا مشاہدہ ہم ان کے کلام میں کرتے ہیں ان کی نگاہ انفس و آفاق میں بکھری ہوئی نشانیوں سے کبھی نہیں ہٹی، وہ بڑے غور سے ان کا مطالعہ کرتے رہے۔ یہی مطالعہ ان کو ملکی مسائل کا حل تلاش کرنے کی دعوت دیتا رہا۔ اسی مطالعے نے ابتدا میں انھیں قومیت کا داعی بنایا۔ اور اسی مطالعے اور مشاہدے نے انھیں ملکی مسائل سے عالمی مسائل کی طرف متوجہ کیا اور ایک آفاقی پیغام کا علم بردار بنایا۔ یہی ذوقِ مشاہدہ تھا جو "جاوید نامے" میں انہیں کرۂ ارض سے عالم بالا کے سفر پر لے گیا ان دو غزلوں کے مطالعے سے ہمیں اقبال اور غالب کی فکر و نظر کا فرق بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اقبال کا سفر اپنی ذات سے خارج کی طرف تھا۔ اپنی ذات سے قوم، قوم سے ملت، اور ملت سے انسانیت کی طرف اپنے وطن سے جہان اور جہان سے فضائے لامتناہی کی طرف۔ کسی مقصد اور نصب العین سے وابستگی انسان کو اس کی ذات کے دکھوں سے بے پروا کردیتی ہے۔ اس کا غم بدل کے غمِ دوراں ہوجاتا ہے۔ غالب پر اپنی ذات اور اپنے غم سے فرار کے دروازے بند تھے۔ وہ معاشرے کی شکست و ریخت کے تماشائی بھی تھے اور شکار بھی۔ ان کے لیے کوئی حل تلاش کرنا مشکل تھا ایسا لگتا ہے جیسے شاعری کے سفر میں وہ اپنی ذات کی صلیب کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔ اگر انھیں کسی نظریئے کا سہارا مل جاتا تو زندگی آسان ہوجاتی۔ بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی اُمید کے وہ زندگی کی تلخیاں سہتے رہے۔ ایک حساس طبع اور ذہن رسا کے اجتماع نے انہیں وہ بصیرت عطا کی کہ شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو:

تابادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگد ازم آبگینہ و درساغر افگنم

اقبال کو اس کے برعکس وہ توانائی حاصل ہوئی کہ وہ ملت کے لیے نشاۃ ثانیہ کا پیغام بن گئے۔

ذہین:

اب ہم غالب اور اقبال دونوں سے بالکل مختلف مزاج اور مشرب والے ایک شاعر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بابا ذہین شاہ تاجی ایک صوفیِ صافی تھے وہ سلطان التارکین حضرت حمید الدین ناگوری کی اولاد میں تھے، ان کے خاندان میں ولایت تواتر سے چلی

آرہی تھی۔ ان کے والد کو چار سلاسل کی خلافت حاصل تھی۔ انھوں نے خود سلسلۂ تاجیہ سے وابستگی حاصل کر کے سجادہ نشینی کا منصب پایا تھا ان کی مثال ہمیں خواجہ میر درد کی شخصیت میں ملتی ہے جو سلسلۂ نقشبندیہ کی سربراہی کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی تجربات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہتے تھے۔ شعر کی زبان میں اپنے احوال سنانا رومی، عطار اور سنائی کی میراث ہے کوئی اہلِ حال شاعر اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔

اس زمین میں بابا صاحب کی غزل پر نظر ڈالنے سے پہلے ان سے متعارف ہونا مناسب ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ تعارف ان کے اپنے اشعار کے ذریعے ہو۔ وہ کہتے ہیں:

بہارِ باغِ گلستانِ سرمدی ہم ہیں
خدا کے ساتھ ہیں دایم وہ آدمی ہم ہیں

جس انجمن میں دلوں کے چراغ جلتے ہیں
اس انجمن میں چراغوں کی روشنی ہم ہیں

یہ واقعہ ہے کہ سب کچھ ہے تو ہی تو اے دوست
یہ اور بات کہ جو کچھ ہے تو وہی ہم ہیں

ان تین اشعار سے شاعر کا بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔ وہ شخص جو معیت الٰہی سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہو بہارِ باغِ سرمدی بن جاتا ہے اور اس کے فیضان سے دلوں کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔ وہ نورِ الٰہی کا پرتو بنکر اس انجمن میں چراغوں کی روشنی بن جاتا ہے جہاں دلوں کے چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک بلیغ اشارہ ہے منصب سجادگی کی طرف اور جسے عرفان ذات وہ آگاہی بخشتا ہے کہ وحدت الوجود میں گم ہو کر وہ اپنے آپ کو خدا سے الگ سمجھنے سے قاصر ہے۔

اس تعارف کے بعد اب ہم بابا ذہین شاہ تاجی کی غزل پہ نظر ڈالتے ہیں۔

مطلع ہے:

آنکھیں بچھائے کوئی کہ سجدہ کرے کوئی
تم سامنے جب آؤ تو کیا کیا کرے کوئی

تصوف کی دنیا میں محبت کی شدت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ محبوب کے علاوہ کسی اور کے وجود کی روادار ہی نہیں ہوتی ہے۔ مولانا روم نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

چوں تو ذات شیخ را کردی قبول
ہم خدا بینی د راں وہم رسول

جب تو نے شیخ سے سچی وابستگی حاصل کر لی تو پھر خدا کا جلوہ بھی تجھے اسی ذات میں نظر آئے گا اور رسول کا بھی۔ یہی سبب ہے کہ صوفیا کے سلسلوں میں لوگ اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار میں شیخ کے ہاتھ کو بوسے دیتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں اس کے قدم چومتے ہیں، سجدے کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں سیری حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب اس تربیت سے انھیں مجاز میں

حقیقت کو دیکھنے کی اہلیت حاصل ہوجاتی ہے تو وہ محبوب کو دیکھ کر بھی ایک جذبۂ سپردگی سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ "تم سامنے جب آؤ تو کیا کیا کرے کوئی" یہ کیفیت شیخ کو دیکھ کر بھی ہوسکتی اور محبوب کو دیکھ کے بھی، بلکہ شاید محبوب کے محبوب کو بھی، مولانا روم کی مثنوی سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرے شعر میں بابا ذہین شاہ صاحب نے صوفیا کے نزدیک مشاہدۂ حق کی سب سے بڑی شرط کا ذکر کیا ہے۔

کیوں آنکھ کو خرابِ تماشا کرے کوئی
تیری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

صوفیائے کبار اس بات پر متفق ہیں کہ حق کا مشاہدہ حق کی نظر ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ انسان کی نظر کس طرح اس کی متحمل ہوسکتی ہے، جب حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر جلوۂ الٰہی کی تاب نہ لاسکے تو کسی عارف کی کیا مجال ہے کہ وہ جمال الٰہی کو اپنی نظر سے دیکھ سکے۔ حق کا مشاہدہ صرف حق کی مرضی سے اور حق کی نظر سے کیا جاسکتا ہے۔ "جلوۂ حق ہم بچشم حق نگر" ایسی صورت میں کوئی عارف کیسے اپنی آنکھ پر تہمتِ نظارہ لگانے کی ہمت کرسکتا ہے، اس بات کو کہنے کے لیے آنکھ کو خرابِ تماشا کرنے کی ترکیب اپنے حسن میں بے مثال ہے۔ بابا ذہین شاہ کی غزل میں شوق دید اقبال کے ذوق نظارہ سے مختلف ہے، اقبال کو ہر حسین منظر دعوتِ نگاہ دیتا تھا۔ صوفی کی نظر پرتو آئینہ جمال بن جائے تو اسے ہر منظر جلوۂ الٰہی نظر آتا ہے۔ بلکہ حق کے علاوہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ بابا صاحب کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

وہ جہاں جلوۂ جاناں کے سوا کچھ بھی نہیں
ہم نے کچھ اور نہ دیکھا تو خطا کچھ بھی نہیں

جب صورت حال یہ ہو پھر شاہد و مشہود میں کوئی حجاب نہیں رہتا۔ نگاہ خود آئینہ جمال بن جائے تو پھر کیسا پردہ،

میری نظر ہے پرتو آئینہ جمال
پردہ کرے کوئی کہ نہ پردہ کرے کوئی

اپنی نظر کو پرتو آئینہ جمال کہنے سے مراد یہ ہے کہ میں اب جلوۂ حق کو چشم حق سے دیکھ رہا ہوں اسی غزل میں آگے چل کر بابا صاحب مشاہدے کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں انہیں آنکھ اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ان کا خیال دوست کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ جب دوست بے دیکھے سامنے ہو تو آنکھ کو زحمتِ نگاہ کون دے۔ وہ اس کے جلوے کی محویت میں اس طرح گم ہوتے ہیں کہ آنکھ کھولنے کی فرصت تک نہیں ہوتی۔

اب عالمِ خیال ہے جلوہ گہ جمال
فرصت کہاں کہ آنکھ بھی اب وا کرے کوئی

میں نے بابا صاحب کو اس عالم میں دیکھا ہے کہ ان کے لیے آنکھ کھولنا مشکل ہوجاتا تھا۔ تنہائی میں کئی دفعہ یہ کیفیت دیکھی لیکن کبھی کبھی محفل سماع میں بھی یہ صورت پیش آجاتی تھی اس وقت کسی کو نذر پیش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی صوفی جب جمالِ حق میں محو ہو تو اس کی محویت میں مخل ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں بابا صاحب نے مجھے بتایا۔ ایک دفعہ ان کے شیخ حضرت بابا یوسف شاہ استغراق کے عالم میں تھے کہ ایک شخص جسے مرید ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی سماع کے دوران نذر لے کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب دیر تک بابا صاحب نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اس نے

اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں سے لگائے اس لمس سے انھوں نے چونک کے آنکھیں کھولیں، اور اس نظر سے دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی دنیا میں آگئے ہوں۔ ان کی محویت میں مخل ہونے والا مرید اُن کی نگاہ کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی نذر تو قبول ہوگئی لیکن اسے اس جلد بازی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، وہ محفل سے نڈھال اُٹھا۔ اور چند روز بیمار رہ کے چل بسا۔ سالک مجذوب کی نظر کبھی مرحمت ہوتی ہے اور کبھی تازیانہ،

خیال جب جلوہ گاہ دوست بن جائے تو اس کی پہنائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز پر محیط ہوجاتا ہے۔ خیال کو ہر حقیقت کا ادراک حاصل ہوجاتا ہے، میرے ایک دوست ہیں جو کافی عرصے بابا ذہین شاہ صاحب سے نبرد آزمار ہے، وہ اس طرح کے باالارادہ وہ ان کے مشوروں کے خلاف عمل کرتے رہے، وہ اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے ان کی ہدایت کے خلاف کچھ کر دکھانا چاہتے تھے، کئی مہینے تک مقابلہ کرنے کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر وہ باباصاحب کے ایسے معتقد ہوئے کہ اپنے ہر دوست رشتہ دار کے مسائل لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے یہ دیکھا باباصاحب کی بتائی ہوئی باتیں کچھ وقت گزرنے کے بعد حقیقت بن کے سامنے آجاتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے باباصاحب سے پوچھا "یہ بتائیے کہ آپ کو آنے والی باتوں کی آگاہی پہلے سے کس طرح ہوجاتی ہے" انھوں نے مسکرا کے کہا میں آنکھ بند کر کے اپنی سوچ کا عمل ختم کر دیتا ہوں، پھر میرے ذہن پہ کسی اور کا تصرف ہوتا ہے، ایسی صورت میں جو چیز وارد ہوتی ہے اس میں میری فکر کی آمیزش نہیں ہوتی، پھر خیال آنے والے واقعات کا آئینہ بن جاتا ہے، باباصاحب کی بیان کردہ اس تشریح کے بعد اب غزل کا مقطع دیکھیے

پاتا ہوں اب خیال کو میں واقعہ ذہین
اب دیکھ کر خیال میں آیا کرے کوئی

خیال میں اور واقعے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہر خیال ایک حقیقت بن کے سامنے آجاتا ہے، جہاں کسی کی یاد آئی اُسے سامنے حاضر کر دیا گیا، یہی وہ تصرف ہے جس سے رومی اور شمس تبریز کی زندگی مالامال تھی۔ اور یہی وہ تصرف ہے جو اہلِ حال کا امتیاز ہوتا۔ دیکھا آپ نے ایک ہی زمین میں یہ تین غزلیں کتنی منفرد ہیں ان کے پیچھے جو شخصیتیں ہیں وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں غالب غمِ حیات اور تخلیق کے کرب کی ایک درد انگیز اور بے مثال داستان سناتے ہیں۔ اقبال انفس و آفاق میں بکھری ہوئی نشانیوں کو اس اشتیاق سے دیکھتے ہیں کہ ماضی کے منظر اور مستقبل کے خاکے سب سامنے آجاتے ہیں اور بابا ذہین شاہ ان مقامات کی سیر کراتے ہیں جہاں بغیر آنکھ کھولے سب کچھ دیکھ لیا جاتا ہے اور جہاں حقیقت میں اور خیال میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

پس نوشت: کچھ جملہ ہائے معترضہ دستک دے رہے ہیں۔ ان سے اغماض اپنی تحریروں سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔ میرے دوست امجد علی صاحب فنِ مصوّری کے مانے ہوئے نقاد ہیں۔ ڈاکٹر انور دل ہم دونوں کے مشترک دوست ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ہماری دوستی اُن ہی کی مرہونِ منت ہے، جب وہ پاکستان آتے ہیں تو اپنے ایک تیس سالہ منصوبے کی چکی میں اپنے دوستوں کو پیسنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ اس چکی میں پستے پستے امجد علی صاحب نے فریاد کی کہ غالب کا شعر بیدل کے اس شعر سے بہتر ہے جس کا حوالہ میں نے اپنے ایک مضمون میں دیا تھا۔ میں نے مشینوں کے شور میں جس سے ایلیٹ پریس کے در و دیوار گونج رہے تھے پوچھا کون سا شعر۔ ڈاکٹر انور دل، کو جن کی کتاب کی طباعت کے سلسلے میں ہم ایلیٹ پریس گئے تھے غالب اور بیدل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ پریس کے مالک جمیل صاحب سے جو انھیں اپنے والد کی خطاطی کے نمونے دکھا رہے تھے محو گفتگو رہے امجد علی صاحب نے کہا غالب کا یہ شعر بیدل کے شعر سے بہت بہتر ہے۔

جب وہ جمالِ دلفروز، صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

مجھے حیرت ہوئی کہ بیدل پر لکھتے ہوئے مجھے یہ شعر کیوں یاد نہیں آیا۔ بہرحال میں نے امجد علی صاحب سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ ابھی چکی میں پس رہے ہیں، جب ان کی مشکل آسان ہوجائے گی تو اُن سے اختلاف کروں گا۔

اس سلسلۂ مضامین کے نتیجے میں گاہے ماہے کسی نہ کسی غیر معمولی ردعمل سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ حضرت کی تنقید کا ہدف بننا تو ان کے ہر دوست کے لیے ایک معمول کی چیز ہے، اس دفعہ غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ ان کی شریکِ حیات نے احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا آپ نے ہمارے گھر کی محفل کا ذکر کرتے ہوئے حضرت کو نگراں میزبانِ اعلیٰ کیا صرف اس مناسبت سے لکھا ہے کہ آج کل نگراں حکومت کا دور دورہ ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ میں نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ میں نے نگراں کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ حضرت اپنی چشم و ابرو کے اشاروں سے چھوٹے بڑے میزبانوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ اگر اس لفظ کے استعمال سے کوئی غلط تاثر پیدا ہوا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ انھوں نے میری معذرت قبول کرتے ہوئے کہا، حضرت کے بزرگ بتاتے ہیں کہ انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے وہ سارے خاندان کی نگرانی کر رہے ہیں، اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا اب تو سارا معاشرہ اُن کی نگرانی کی زد میں ہے۔ ان کی نگرانی نہ چند روزہ ہے، نہ بے ضابطگیوں کی نشاندہی تک محدود ہے۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے، نہ منصب سے متاثر ہوتے ہیں، نہ کسی کی عمر اور تجربے سے گفتگو بہت دلچسپ ہوچکی تھی۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ مثالوں کی فرمائش کی۔ انھوں نے جو مثالیں دیں ان میں ایک خاصی تاریخی اہمیت کی حامل ہے، حضرت کے ایک غیر سرکاری مورخ کی حیثیت سے اُسے محفوظ کرنا میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ حال ہی میں وہ ایک ایسے صاحب سے ملنے گئے جو بہت ممتاز مناصب پہ فائز رہ چکے ہیں۔ انھوں نے فخریہ انداز میں وہ شعر پڑھا جو ان کے حوالے سے موضوعِ گفتگو بنا رہا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

میکدے میں شراب ختم ہوگئی تو کیا ہوا، پیر مغاں کا ہاتھ اتنا دراز ہے کہ وہ رگِ تاک سے مے ناب حاصل کر کے ہر ایک کو حیرت میں ڈال سکتا ہے، اور واقعی پیر مغاں نے رندوں کو اپنی کرشمہ سازی سے حیران کردیا تھا۔ حضرت اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور "گماں مبر" کے الفاظ کی معنویت کی تعریف کر کے انھوں نے نہایت معصومیت سے یہ شعر سنایا۔

گماں مبر کہ چو توبگذری ہمہ بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

حضرت میں کمال یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے بے تکلف دوستوں کو اپنی بے رحم تنقید سے لہولہان کردیتے ہیں تو دوسری طرف جن لوگوں سے تعلقات میں رکھ رکھاؤ کا پاس ضروری ہو تلخ سے تلخ بات اس خوش مذاقی سے کرتے ہیں کہ وہ اُسے لطیفہ سمجھ کے مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے بعد میں اُن پہ جو گزرے وہ اُن کی قسمت۔ مکیدے کی رونق پیر مغاں کے دم سے ہے، بالکل اسی طرح جیسے انجمن کی رونق شمع کے نور سے ہو، لب اس شعر کو حالات کے تناظر میں دیکھیے خاص طور پر "گماں مبر" کی معنویت پہ زور دینے کے بعد۔ یہ نہ سمجھ کہ تیرے ختم ہوتے ہی سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ ہزاروں شمعوں کے گل ہونے کے بعد بھی انجمن کی رونق میں

کوئی فرق نہیں آتا،

حضرت کی شریک حیات نے اگر لفظ "نگراں" کے استعمال پہ احتجاج نہ کیا ہوتا تو ہمیں ان دو اشعار کے تاریخی تصادم کا علم کیسے ہوتا۔ پاکستان میں بہت سی چیزوں کی کمی ہے، وسائل کی، اقدار کی، کردار کی، لیکن ایک چیز کی مایہ ناز افراط ہے، ہر دوسرے تیسرے سال کی کوئی ایسی صورت حال پیش آجاتی ہے کہ جس پر اردو اور فارسی کے شاہکار اشعار کا اطلاق اس خوبی سے ہوتا کہ یہ گماں ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم نے اس ملک کو ادب عالیہ کے حیرت انگیز اشعار کی تشریح کے لیے ہی تو نہیں بنایا تھا۔

اب آخری جملۂ معترضہ۔ مشفق خواجہ صاحب نے ایک وضاحت کے ذریعے غالب کے ایک متنازعہ شعر کے اُس مطلب سے دستبردار ہو کے جس سے انھوں نے مجھے نوازا تھا میرا دل خوش کر دیا مجھے خوشی ہے کہ میں نے ان کی بات کو کہیں سے کہیں پہنچا کے انھیں تحقیق کے نہاں خانے سے نکل کے قومی زبان کی انجمن میں شرکت پہ مجبور کر دیا۔ یہ بڑے ستم کی بات ہے کہ "قومی زبان" کے قاریوں کو وہ اپنی شگفتہ تحریر سے محروم رکھتے ہیں، اگر انھیں لکھنے کی تحریک مہیا کرنے کے لیے کسی بے احتیاطی کی ضرورت ہے، تو مجھے اُمید ہے کہ میں انھیں مایوس نہیں کروں گا۔ میرے غالب شناس دوست کا خیال ہے کہ ان کے دریافت کردہ شعر کے اُن مطالب میں جو خواجہ صاحب نے اپنے الفاظ میں بیان کئے ہیں اور جو میں نے ان کی طرف سے لکھے ہیں کوئی خاص فرق نہیں، اس سے کہیں زیادہ فرق ان مطالب میں ہوتا ہے جو شعر کہتے وقت غالب کے ذہن میں ہوتے تھے اور جو مختلف موضوعات پر تقریر کرتے وقت ان پر وارد ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال ہے کہ تھوڑی سی اونچ نیچ سے شعر کے حسن میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ اس کی رعنائی میں اضافہ ہوتا ہے میرے غالب شناس دوست کا یہ نادر کلیہ تنقید عالیہ کو ایک عجب نشاط انگیز وسعت سے آشنا کرتا ہے، اور ساتھ ہی کلام غالب کی ان حیران کن تاویلوں کا جواز بن جاتا ہے جن سے دلی کے ایک سیمینار میں انھوں نے غالب کو انتظامیات، اقتصادیات اور نفسیات کا ایسا ماہر ثابت کر دیا تھا جس کے نظریات کے سائے میں یہ تمام علوم پروان چڑھ رہے ہیں۔

,United

PID-1-7/92

اسم بامسمی، ناسخ

ڈاکٹر سلیم اختر

اگرچہ ہر عہد کے اساتذۂ سخن اپنے لسانی شعور کے مطابق مختلف الفاظ متروک قرار دیتے رہے ہیں تاہم اس ضمن میں اساتذۂ لکھنؤ مصحفی، آتش اور ان کے بعد ناسخ نے خصوصی شہرت حاصل کی، لکھنؤ اس عہد میں تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اور درد کی استثنائی مثال سے قطع نظر دہلی کے بیشتر نامور شعراء لکھنؤ آ چکے تھے۔ میر، سودا، درد، مصحفی نے لکھنؤ کی بزم سخن کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ ادھر لکھنؤ کے جدت پسندوں نے بھی ہر معاملہ میں حسن، لطافت اور نزاکت کو ملحوظ رکھا۔ اہل دہلی سے خود کو ممتاز اور منفرد رکھنے کی شعوری یا لاشعوری سعی کے نتیجہ میں اہل لکھنؤ کے لیے جب محاورہ شاہجہان آباد مستند نہ رہا تو پھر دلی کے روڑوں کی سطح پر آ گیا اہل لکھنؤ نے زبان کو رندے پر چڑھایا اور الفاظ کی تراش خراش کے جس عمل کا آغاز کیا اس کا لسانی شعور سے تو تعلق تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نفسیاتی نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ وہ خود کو دہلی سے بلند سمجھتے تھے بلند سمجھنے کے اس ذہنی رویہ نے مثبت کے مقابلے میں منفی صورت میں زیادہ تر اظہار پایا تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس تہذیب اور تمدن کی اساس بھی مثبت اقدار پر استوار نہ تھی۔ چنانچہ لباس، آرائش خانہ، آدابِ مجلس، گفتگو غرضیکہ ہر معاملہ میں خود کو اہل دہلی سے منفرد کرنے کے نفسیاتی رویہ کی زندگی کے تمام امور میں کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے دہلی کے شعراء دل کی بات کرتے اور اندازِ بیان میں سادگی اپناتے۔ اسی طرح تزئین اسلوب کے لیے تشبیہہ اور استعارہ تو تھا مگر یہ صرف طرزِ ادا کی آرائش کو تھا مقصود بالذات نہ تھا۔ جب کہ لکھنؤ میں اس کے برعکس خیال پر لفظ کو اور جذبہ پر طرزِ ادا کو ترجیح دی گئی جس کے باعث شاعری لفظ پرستی میں تبدیل ہو گئی میر اور آتش کے ان اشعار سے دہلی اور لکھنؤ کے شعری رویے کو سمجھا جا سکتا ہے:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتہ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

میر اور درد کے ہاں سادہ بیانی سے جادو جگایا جاتا ہے۔ سادہ تشبیہہ اور سامنے کے استعارے اسلوب کا وصفِ خاص تھے بالعموم

طویل ردیفوں سے پرہیز کرتے اور چھوٹی بحروں کو ترجیح دیتے میر نے اگر طویل بحر استعمال کی تو ترنم اس میں نیا مزا پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن لکھنؤ میں اس کے برعکس ہوا پُر شکوہ الفاظ اور زیادہ سے زیادہ قوافی بلکہ کوشش کرتے کہ ہر لفظ کا قافیہ بندھ جائے گویا صورت حال نواب سیّد محمد خاں رند کے بقول یہ تھی:

کہہ لیے رند نے سب قافیے کوئی نہ چُھٹا
انگریزی مگر اک قافیۂ فیر (۱) تو ہے

ناسخ نے بھی اسی انداز کے دو شعر کہے:

معانی قل ہو اللہ احد کے ہیں عیاں ناسخ
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے م احمد کا

گر یہ ہی ترسا بچّوں کے غم میں ناسخ جوشِ اشک
کیا تعجب غرق ہو جائے جو لندن آب میں

اظہار فن یا قادر الکلامی کے لیے مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں غزل دو غزلہ اور سہ غزلہ تک کہا جاتا تھا۔ جیسے ناسخ نے ایک غزل کے مقطع میں گریز کے طور پر سہ غزلہ پیوست کرنے کے لیے مقطعوں میں یہ انداز اختیار کیا:

اور لکھنی ہے جنوں انگیز اب مجھ کو غزل
داغ سودا کے رکھے روشن دل دیوانہ شمع
اور لکھتا ہوں شبِ تاریک فرقت میں غزل
ہے مری آتش زبانی پیرِ خلوت خانہ شمع

ناسخ اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں اور اگر اس نے سنگلاخ زمین میں جی لڑا دیا تو یہ عصری تقاضوں کے عین مطابق تھا:

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہی زمیں ہو سنگلاخ
خامہ تشبیہ ناسخ کوہ کن سے کم نہیں
کہیے جو طویل اس کو سزاوار ہے ناسخ
جس بحر میں اس زلف کا مضمون بندھا ہے
اس زمین میں ناسخ اب مستانہ پڑھیے چند شعر
ہے بغل میں شیشۂ مے ہاتھ میں پیمانہ ہے
جوششِ مضموں سے طوفاں زا ہوئی ناسخ یہ بحر
کشتیٔ طبع رواں کو ہم نے اب لنگر کیا

اس شاعرانہ رویہ کی تشکیل میں تہذیبی اور تمدنی امور بھی کار فرما تھے۔ دہلی، آگرہ اور شاہجہان آباد میں جس تمدن نے مغلوں کے زیر اثر فروغ پایا تھا۔ وہ لکھنؤ میں چراغ کی آخری بھڑک تھا۔ اہل لکھنؤ کو یہ احساس نہ تھا کہ مستقبل نے انھیں کیا کچھ دکھانا ہے وہاں تو امن خوشحالی اور قدر دانی کی فضا میں اہل لکھنؤ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر امورِ زیست میں بھی جدّت و اختراع سے

اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دینے کے لیے سعی کناں تھے۔ لکھنؤ مرکزِ علم و ادب تھا تو مشاعرہ تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز۔ مقبول اساتذہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں یوں بیٹھتے جیسے ستاروں کی محفل میں چاند، ادبی چپقلشیں بزبان غزل اظہار پاتیں۔ اعتراضات ہوتے، سندی دی جاتی اور اچھے شعر پر باذوق سامعین داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ یہی وہ فضا تھی جس میں ناسخ نے متروکات کی صورت میں اصلاحِ زبان کا آغاز کیا۔ اہلِ لکھنؤ کو اپنے باکمال ہونے کا احساس تھا۔ لہٰذا انھوں نے جہاں اپنے ہنر کا اظہار کیا وہاں ہر معاملے میں دہلی سے خود کو برتر اور افضل ثابت کرنا بھی شعار ٹھہرا۔ اُن کی اجتماعی نرگسیت کا تقاضا تھا کہ شعر و فن کے آئینہ میں اپنے تخلیقی خدوخال کے نظارہ سے خوش ہوں۔ ادھر دہلی کی قدیم اور عظیم روایات اُن میں جس طرح کا احساس کمتری پیدا کرتی ہوں گی اس سے عہدہ براہی کے لیے وہ خود کو اہلِ دہلی سے ہر معاملے میں برتر منفرد اور ممتاز سمجھنے پر مجبور تھے۔ یوں دیکھیں تو اہلِ لکھنؤ کی تخلیقی مساعی ایک طویل تعلی کی صورت اختیار کر لیتی ہے واضح رہے کہ تعلی بالعموم مقطع ہی میں کی جاتی ہے۔ "دلی کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی) اور "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح لکھنؤ میں دہلی کے لاتعداد برمحل الفاظ محض اس لیے متروک قرار پائے کہ وہ اساتذہ دہلی کے ہاں عام تھے۔ اسی طرح میر امن کا خود کو "دلی کا روڑا کہنا"، رجب علی بیگ سرور کو کیوں بُرا لگا؟ اتنا کہ اس کے جواب میں "فسانۂ عجائب" لکھ کر دیباچہ میں "قصیدہ در مدحِ لکھنؤ" قسم کی تحریر لکھنا پڑی تو اس کا محرک بھی یہی احساس برتری تھا۔ حالانکہ وقار عظیم کے الفاظ میں تو یہ میر امن کی محض "بے ضرر سی تعلی" تھی۔

تو یہ ہے وہ ذہنی فضا اور تخلیقی ماحول جس میں شیخ امام بخش ناسخ (وفات ۱۵ اگست ۱۸۳۸ء) نے متروکات کے عمل کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر کے اردو زبان کو صاف کیا۔ محاوروں کی نوک پلک سنواری اور یوں "لکھنویت" کا اثبات کیا۔ اگرچہ بعض جدید محققین جیسے (مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی) نے متروکات کے ضمن میں ناسخ کے بے لچک رویہ کو پسند نہیں کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی میں اس کام کو بہت اہمیت دی گئی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بقول صفیر بلگرامی:

> "غالب سے ایک دن کچھ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہ چھوڑ گیا۔" (۲)

لاتعداد شاگردوں کے علاوہ ناسخ کے اپنے تین دیوان بھی ان کے فنی شعور اور لفظ کے حسنِ استعمال کے گواہ ہیں۔ بحیثیت شاعر ناسخ کی تخلیقی شخصیت میں ایک طرح کا تضاد بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے:

> شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی کا
> آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مگر اس اعتراف کے ساتھ اسلوبِ میر کے بعض عناصر کو متروک قرار دینے سے بھی نہیں چوکتا اور حکیم نجم الغنی ("بحر الفصاحت" لکھنؤ ۱۹۱۷ء) سے یوں داد پاتا ہے:

"[illegible]"

ناسخ نے اصلاحِ زبان کے لیے جو سعی کی آج ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی باضابطہ کتاب تحریر نہیں کی۔ اگر حاتم کی مانند ناسخ نے بھی کسی دیوان کے مقدمے یا دیباچے میں اپنے لسانی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی روشنی میں فصاحت، الفاظ اور متروکات کی بحث کی ہوتی تو اس سے ہاں ناسخ کی تنقیدی حِس کا اندازہ ہو سکتا تھا وہاں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کسی لفظ کو وہ کس وجہ سے متروک قرار دے دیتے تھے۔ متروکات کا سارا انحصار اصلاحِ شعر پر تھا اور ظاہر ہے کہ تمام تلامذہ کے تمام اشعار کی اصلاح اور ان سے وابستہ جملہ امور کا اب سراغ لگانا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ سلسلہ زبانی ہوتا تھا اگر غالب کی مانند ناسخ کے بھی تمام خطوط دستیاب ہوتے تو اُن سے ہی متروکات، تذکیر و تانیث" واحد جمع اور اسی نوع کی دیگر معلومات کے حاصل ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اس نقطۂ نظر سے کلیاتِ ناسخ کا مطالعہ کیا کہ شاید اس انداز کے کچھ اشعار بھی مل جائیں جس سے اس کی تنقیدی حِس اور لسانی شعور کا کچھ اندازہ ہو سکے مگر اس انداز کے اشعار بھی نہ ملے۔ ناسخ سے زیادہ تو آتش کے ہاں ایسے "تنقیدی اشعار" مل جاتے ہیں جن سے اسلوب بلکہ زبان کے بارے میں اُن کا رویہ باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ناسخ کے ہاں تعلی کے روایتی مضامین تو بہت ملتے ہیں میر کا احترام اور سودا کے حوالے سے بھی کچھ اشعار مل جاتے ہیں کہیں کہیں بحروں کے بارے میں لکھتا ہے اور بس ایسے ہی اشعار مل سکے اگر ان سے کچھ بات بن جائے تو:

چونک اُٹھے خوابِ لحد سے سن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخ فقط اعجاز ہے

ناسخ یہ وہ غزل ہے جنوں زا کہ سنتے ہی
سودا کفن کو پھاڑ کے نکلے مزار سے

کلامِ غیب ہے ناسخ سنا جو پہ بہ پہ ناسخ
پسند آیا اسے ناسخ کلام استاد کامل کا

کیجے جو طویل اس کو سزاوار ہے ناسخ
جس بحر میں اُس زلف کا مضمون بندھا ہے

کوئی کچھ کہتا ہے دنیا میں کوئی کہتا ہے کچھ
معنئ اشعارِ مہمل خواب کی تعبیر ہے

کیا ہوا گر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیۂ منسوخ کیا موجود قرآں میں نہیں

معنی، ثمر، حروف، ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخ ہے کلکِ فکر نہالِ سخن کی شاخ

بس یہی وہ اشعار ہیں جن سے ناسخ کی تنقیدی حِس اور "لسانی شعور" کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ متروکات کے نقطۂ نظر سے، مواد کی عدمِ فراہمی کے باعث اس امر کا تعین وثوق سے نہیں ہو سکتا کہ ناسخ نے متروکات سے واقعی زبان کی خدمت کی یا الفاظ کے معاملے میں آمریت کا ثبوت دیتے رہے اور اصلاحِ شعر سے معرضِ وجود میں آنے والا اُن کا لسانی رویّہ صحت مند تھا یا برعکس، تاہم اتنا

[illegible]

تک کے ذریعہ سے اُن کی اصلاحات کے مثبت (یا منفی) اثرات نظر آتے رہے۔ مولانا حسرت موہانی نے "اربابِ سخن" (۱۹۲۹ء) میں ناسخ کے بیالیس شاگردوں کے اسماء درج کیے ہیں اُن میں سے ۱۱ کے دیوان مطبوعہ ہیں۔ جب کہ صرف چھ کی استثناء سے بقیہ سبھی صاحب دیوان تھے۔ ان کے چند نامور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ مرزا محمد رضا خاں صاحب فتح الدولہ برگ، میر اوسط علی رشک، خواجہ محمد وزیر، شیخ امداد علی بحر، محمد علی خاں مسیحا، مرزا مہدی علی خاں قبول، مرزا مہدی کوثر اور میر کلو عرش۔ (۳)

ناسخ کے شاگردوں میں سے برق، رشک، وزیر اور بحر وغیرہ خود بھی اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ برق کے آٹھ، رشک کے ۲۵، وزیر کے ۱۵ اور بحر کے ۷ شاگردوں کا احوال ملتا ہے۔ میر کلو عرش کے ۳، مولوی محمد بخش شہید کے ۵، شیخ امان علی سحر کے ۴، حاتم علی مہر کے ۷ شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ بعض شعرا کے ایک ایک دو دو شاگرد بھی تھے۔ پھر برق کے شاگردوں میں میر ضامن علی جلال خاصے نامور تھے۔ خود اُن کے ۱۶ شاگرد تھے۔ (۴) جن میں سیّد انور حسین آرزو لکھنوی جیسے مشہور شاعر بھی شامل ہیں۔ شاگردوں اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد درج کرنے کا مقصد اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ ایک استاد زبان و بیان اور لفظ و معنی کے بارے میں شاگردوں کی صورت میں شعرا کی کئی نسلوں کو متاثر کر سکتا ہے پنڈت کیفی نے اس ضمن میں دلچسپ بات لکھی ہے:

> "رشک نے چالیس پنتالیس کے قریب الفاظ متروک قرار دیے تھے۔ جن سے اُن کا تیسرا دیوان پاک تھا۔ لیکن وہ دیوان افسوس کہ چھپا نہیں رشک مرحوم اُن متروکات کے دفتر کو ہمیشہ مقفل رکھتے تھے اور اپنے خاص شاگردوں کے سوا کسی کو مستفید نہیں ہونے دیتے تھے۔" (۵)

متروکات کی اہمیت کے بارے میں ہمارے ناقدین اور محققین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جس کا اندازہ "نقد متروکات" مطبوعہ "نقوش" ادبی معرکے نمبر ا (ستمبر ۱۹۸۱ء) کی بحث کے شرکاء کے خیال سے لگایا جاسکتا ہے۔ شرکاء پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، احسن مارہروی اور منوہر لال زتشی ہیں۔

متروکات کی افادیت یا عدم افادیت کے بارے میں اختلاف رائے درست ہے کیوں کہ بعض الفاظ کے بارے میں واقعی یہ سمجھا نہیں جاسکتا کہ آخر انھیں ترک کرنے کی کیا وجہ تھی؟ کیا محض دلّی کے روڑوں کی یا استادی کے زعم میں"؟ متروکات کا عمل لفظ کی جمالیات پر استوار تھا یا محض ایجادِ بندہ والی بات تھی۔ اس لیے مولوی عبدالحق اس خیال کا اظہار کرتے ہیں تو اس کی معقولیت میں شبہ نہیں ہوسکتا:

> "بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک کر دیے ہیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کیے۔ اُن کے شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس طرح متروکات کی تعداد بڑھتی گئی ہماری رائے میں کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے الفاظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے بڑھتے گھٹتے ہیں صورت بدلتے ہیں حیثیت میں فرق آجاتا ہے بعض نام پیدا کرتے ہیں۔ بعض گم نام ہو جاتے ہیں شریف سے رذیل ہو جاتے ہیں اور بعض ایک مدّت کے بعد مر جاتے ہیں۔ لیکن دانستہ گلا گھونٹنے کا حق کسی کو،

حاصل نہیں ہے تعجب ہے کہ اس کی ابتدا شعرا. کی طرف سے ہوئی حالانکہ شاعر ہی کو ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور بعض دفعہ یہ الفاظ کلام میں حُسن پیدا کر دیتے ہیں مثلاً یہ (لیکن کے معنی میں) متروک کر دیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے ہر لحاظ سے لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اسے بلا تکلف استعمال کر سکتا ہے بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور بھانا وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے کہتے ہیں کر پرے (۵) کا لفظ بھی متروک ہے۔ مگر جب عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ اُدھر مگر پرے اور اُدھر کے معنی میں بہت فرق ہے اُدھر صفت کو بتاتا ہے اور پرے بات کا اظہار کرتا ہے۔ مت بھی متروک سمجھا گیا ہے حالانکہ اس کے معنی خاص ہیں۔ نہ یہ کام نہیں دے سکتا۔ نہ افعال کی عام نفی کے لیے ہے اور مت نہیں کے واسطے مخصوص ہے۔ اسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر، سو، تو، ناؤ، مند جانا، بھلا (بمعنی اچھا) کانٹھ وغیرہ وغیرہ متروک قرار دیے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے ان کا لکھنا ترک کر دیا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔" (۶)

پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی نے بھی اس طرز عمل پر شدید احتجاج کرتے ہوئے لکھا:

"جتنی قیدیں نظم کہنے والوں پر عائد کی گئی ہیں وہ جابرانہ اور ناجائز ہیں .... نہ اس سے زبان کی ترقی ہوگی اور نہ تخیل شاعرانہ کی توسیع ایسی کا جو بھوجو زبان جو ہمارے نقاد اور غیر منصب ادب بنانا چاہتے ہیں سرسبز نہیں ہو سکتی ہمارا دستور العمل یہ ہونا چاہیے:

مصلحت بیں وکار آسان کُن

ورنہ خوف ہے کہ اگر اس خرج بحرج اور ترکِ تیرک کی لے یوں ہی بڑھتی گئی تو مرزا غالب کا یہ قول ہمارے حال کی مصداق نہ ہو جائے۔ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں۔"

شاید ابتدا میں متروکات کی ضرورت ہوگی کہ زبان تخلیقی اعتبار سے نشوونما پا رہی تھی لیکن جب زبان ہر طرح کے اظہار و مقاصد پر قادر ہو جائے اور قد آور شخصیات تخلیقی امکانات سنوار چکی ہوں تو متروکات کا عمل زبان کو "دیو بانی" بنانے کے مترادف ہوتا ہے۔ جس کے تہہ میں یہ نرگسی رویہ ملتا ہے کہ یہ ہماری زبان ہے اور ہم اس کی حرمت کے رکھوالے ہیں، لیکن زندہ زبان کو قواعد و ضوابط کے تالوں میں یوں مقید نہیں کیا جا سکتا زبان تو ہوا کی مانند آزاد ہے جس میں الفاظ پھولوں کی خوشبو کی مانند ہوتے ہیں پھولوں پر گیت گانے والی بلبل کو تو قفس میں ڈالا جا سکتا ہے مگر پھولوں اور ہوا کو نہیں۔

حواشی

(۱) یہ انگریزی لفظ FARE/FAIR تو نہیں ہو سکتے میرے خیال میں FIRE ہے جسے عوامی تلفظ کے مطابق فیر باندھ دیا۔ اس غزل کے دیگر قوافی دیر اور خیر ہیں۔

(۲) بحوالہ "کلیاتِ ناسخ" جلد اوّل مقدمہ یونس جاوید ص ۴۲ صغیر بلگرامی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے "غالب اور صفیر بلگرامی" از مشفق خواجہ (کراچی ۱۹۸۱ء)

(۳) حسرت نے عرش کو ناسخ کا شاگرد لکھا ہے جب کہ معاملہ برعکس تھا۔ یعنی "عرش سے ناسخ استفادہ کرتے تھے اور عرش کو استاد کہا کرتے تھے اور اُن ہی کے صلاح و مشورے سے ناسخ زبان میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ ناسخ کے بعض شاگردوں نے مشہور ہی نہیں کیا بلکہ "سراپا سخن" کے مؤلف سید محسن علی محسن نے اپنے اس تذکرہ میں عرش کو ناسخ کا شاگرد لکھ دیا۔ ("آبِ بقا": ص ۷۲) اس پر دونوں میں ٹھن گئی (ملاحظہ کیجیے "تلامذۂ میر" از امداد صابری۔ ص ۶۹)

(۴) "نگار پاکستان" کراچی جولائی ۱۹۸۸ء

(۵) "منشورات" ص ۱۲۸

(۶) کیا میر کے اس شعر کا جواب ممکن ہے:

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کر صاحب پرے پرے

(۷) "تنقیداتِ عبدالحق" ص ۱۶۶-۱۶۷

حاشیہ از راقم

بنگلہ دیش

فرید پور (بنگلہ دیش) کے قاضی خاندان کی

اردو- فارسی خدمات (انیسویں صدی)

ڈاکٹر اُم سلمٰی

انیسویں صدی میں بنگلہ دیش میں اردو فارسی کی شمع روشن کرنے اور اس کی لَو کو تیز کرنے والوں میں ڈھاکہ کے "خواجہ خاندان" اور سلہٹ کے "مجموعہ دار خاندان" کی مانند فرید پور کے قاضی خاندان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ بنگلہ دیش کی ادبی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اِس خاندان کے افراد نے اس ماحول اور فضا میں جنم لیا جو اردو کے مراکز یعنی دِلی اور لکھنؤ سے بہت دُور تھا مگر اردو فارسی کی دولت کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور جہاں تک ممکن ہوا ان زبانوں کی خدمت انجام دی اور اپنے ادبی کارناموں سے ثابت کر دکھایا کہ بنگلہ دیش کے عوام بھی اِن مقبول عام زبانوں سے اُنس رکھتے ہیں اور تحریر و تقریر کی صلاحیت اُن میں بھی کم نہیں۔

اس خاندان کے مشہور مصنف عبدالغفور نسّاخ نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا شجرہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس خاندان کا سلسلۂ نسب اکتیسویں پشت میں حضرت خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔ نسّاخ کے اجداد میں شاہ عین الدین ۱۰۲۳ھ/۱۶۶۳ء میں بغداد سے دہلی آئے۔ اُن کے بیٹے قاضی عبدالرسول کو شہنشاہ ہند شاہ جہاں نے سند قضائی سرکار فتح آباد چکلہ بھوسنہ ضلع فرید پور درمیان ممالک بارہ بھوٹیاں بنگالہ کی عطا کی۔ قاضی عبدالرسول نے فرید پور میں آکر موضع لشکر دیہ کے قطب دانشمند کی صاحبزادی سے عقد کیا اور وہیں بارہ کھادہ زمین لاخراج موضع سکھپال دیا میں حاصل کر کے بسنے کا ارادہ کرلیا۔ ان کے صاحبزادے قاضی عبدالوہاب نے شہنشاہ دہلی اورنگ زیب عالمگیر سے مزید بارہ کھادہ زمین لاخراج موضع راجہ پور میں حاصل کی۔ یہی راجہ پور نسّاخ کا وطن تھا[۱] ذیل میں نسّاخ اور ان کے اہل خاندان کی اردو فارسی خدمات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں:

اس خاندان کے نامور لکھنے والوں میں فقیر محمد ہیں۔ جو نسّاخ کے والد تھے۔ یہ راجہ پور میں سکونت پذیر تھے بعد ازاں ۱۸۱۹ء میں کلکتہ چلے گئے اُن کی مشہور تصنیف کا نام "جامع التواریخ" ہے جیساکہ نام سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا موضوع تاریخ ہے۔ فقیر محمد نے اس کو بہت سی تاریخی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھا تھا۔ مصنف نے اپنی کوشش اور محنت کا ذکر یوں کیا ہے:

سالہاسال در انتخاب آں دود چراغ خوردہ بہ چہار فصول مرتب و بہ "جامع التواریخ" موسوم گردانید[۲]

"جامع التواریخ" فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اس کتاب کے بارے میں F.B.BRADELY-BIRT کہتے ہیں:

"THE STUDY OF HISTORY EXERCISED FOR HIM AN ABSORBING FASCINATION AND THE RESULT OF HIS RESEARCHES WAS A UNIVERSAL HISTORY WRITTEN BY HIM IN PERSIAN AND ENTITLED JAMIUL. TAWARIKH. IT WAS PUBLISHED IN 1836 AND MET WITH CONSIDERABLE SUCCESS."(۳)

ڈاکٹر صدر الحق فرماتے ہیں:

"قاضی فقیر محمد کو علم و فن سے کافی شغف تھا۔ بالخصوص تاریخ سے اچھی واقفیت تھی اور فرصت کے اوقات زیادہ تر کتب بینی میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ اسی والہانہ ذوق کا نتیجہ ان کی فارسی کتاب "جامع التواریخ" ہے۔"(۴)

"جامع التواریخ" ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں منشی ارادت کلکتہ پریس سے چھپی تھی۔ قاضی فقیر محمد کے انتقال کے بعد دوبارہ ۱۸۷۱ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے اور تیسری مرتبہ پھر نولکشور پریس لکھنؤ سے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ فقیر محمد نے "منتخب النجوم" نامی ایک اور فارسی کتاب بھی لکھی تھی جو اب ناپید ہے۔(۵)

قاضی فقیر محمد کے بیٹے خان بہادر نواب عبداللطیف ہیں جنھوں نے اگرچہ اپنی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی۔ مگر انھوں نے بنگال کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری خصوصاً انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا اور اس کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کی اہمیت کو بھی عوام کے سامنے اُجاگر کیا اور ان زبانوں کے سیکھنے کا پرچار جاری رکھا۔ لارڈ رپن گورنر جنرل ہند نے ۱۸۸۲ء میں برٹش انڈیا کی تعلیمی حالت کا عموماً اور مسلمانوں کی تعلیم کا خصوصاً جائزہ لینے کے لیے ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی سرکردگی میں جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا اس میں شہادت دیتے ہوئے نواب عبداللطیف نے اردو، فارسی اور عربی کی اہمیت کا ذکر یوں کیا:

"انگریزی تو مسلمان ضرور پڑھیں گے اس میں تو کلام ہی نہیں کیوں کہ اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم آمدنی اور سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے میں اس کی ضرورت ہے .... لیکن مذہبی علوم اور تمدنی ضروریات کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں کو اپنی سوسائٹی میں عزت بحال رکھنے کے لیے اردو کی اچھی قابلیت۔ فارسی میں اچھی مہارت چاہیے اور اگر ممکن ہو تو کچھ عربی سیکھنا بھی ضروری ہے۔"(۶)

۱۸۶۱ء میں بنگال کے لفٹیننٹ گورنر جان پیٹر گرانٹ کی درخواست پر ہوگلی میں حاجی محمد محسن کے عربی مدرسہ کی از سر نو تنظیم کے موقع پر ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"UNLESS A MAHOMEDAN IS A PERSIAN AND ARABIC SCHOLAR, HE CANNOT ATTAIN A RESPECTABLE POSITION IN MAHOMEDAN SOCIETY, I.E. HE WILL NOT BE REGARDED OR RESPECTED AS A SCHOLAR AND UNLESS HE HAS SUCH A POSITION, HE CAN HAVE NO INFLUENCE IN THE MAHOMEDAN COMMUINTY.

CONSEQUENTLY A MAHOMEDAN WHO HAS RECEIVED AN ENGLISH EDUCATION, AND HAS OMITTED THE STUDY OF PERSIAN AND ARABIC, IS LITTLE ABLE TO IMPART THE BENEFITS OF THAT EDUCATION TO THE MEMBERS OF HIS COMMUNITY.(۷)

نواب عبداللطیف کے بھائی، عبدالغفور نسّاخ، انیسویں صدی کے اُن بڑے ادیبوں میں سے ہیں جنھیں فی الواقع جامع الکمالات اور کثیر الجہات کہا جانا چاہیے۔ وہ اردو کے اہم ستونوں میں شمار ہوتے ہیں۔(۸) ان کی ذات نے غالب سے بھی یوں خراجِ تحسین حاصل کیا:

"شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بصیغہ بے مبالغہ نسّاخ ہیں تم دانائے رموزِ اُردو زبان ہو۔ سرمایۂ نازشِ قلمرو ہندوستان ہو۔" (۹)

عبدالغفور نسّاخ کی تصانیف کا مختصر ذکر اس طرح کیا ہے:

۱۔ دفتر بے مثال: "دفتر بے مثال" نسّاخ کا پہلا دیوان ہے اس کا سال ترتیب ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء اور سال طباعت ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء ہے۔ یہ مظہر العجائب پریس، کلکتہ سے طبع ہوا۔ نسّاخ نے "دفتر بے مثال" پر نظرثانی کی اور دوبارہ نولکشور پریس، کلکتہ سے رمضان ۱۲۹۱ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء میں شائع کرایا۔

۲۔ اشعار نسّاخ: یہ نسّاخ کا دوسرا دیوان ہے۔ یہی اس کا تاریخی نام ہے جس سے تاریخ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء نکلتی ہے۔ سال اشاعت رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ/ مطابق ۱۸۷۴ء ہے۔

۳۔ ارمغان: نسّاخ کا یہ تیسرا دیوان ہے۔ "ارمغان" اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے تاریخ ۱۲۹۲ھ برآمد ہوتی ہے۔ یہ دیوان ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں مطبع نظامی کانپور سے طبع ہوا۔

۴۔ ارمغانی: یہ نسّاخ کے چوتھے دیوان کا نام ہے۔ یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے تاریخ ۱۳۰۲ھ نکلتی ہے۔ یہ دیوان صفر ۱۳۰۴ھ مطابق اکتوبر ۱۸۸۶ء میں مطبع نظامی لکھنؤ سے طبع ہوا۔

۵۔ چشمہ فیض: یہ فارسی کے مشہور شاعر مولانا فرید الدّین عطار کے "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ سال اشاعت ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء اور مطبع کا نام منشی نولکشور، لکھنؤ ہے۔

۶۔ کنج تواریخ: "کنج تواریخ" کا سال ترتیب ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء ہے اور سال اشاعت ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء ہے۔

۷۔ کنز تواریخ: یہ ضمیمۂ "کنج تواریخ" ہے "کنز تواریخ" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء تاریخ نکلتی ہے۔ مطبع کا نام نظامی کانپور ہے لیکن سال اشاعت درج نہیں۔

۸۔ شاہد عشرت: یہ مثنوی معشوق کے سراپے کا مختصر بیان ہے۔ نام تاریخی یہی ہے۔ شاہد عشرت ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئی۔

۹۔ مرغوب دل: یہ نسّاخ کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اور یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ سال ترتیب ۱۲۸۲ھ اور رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ/ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء میں نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۱۰۔ مظہر معمّا: فارسی معمات پر مشتمل یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ "مظہر معمّا" اس کا تاریخی نام ہے۔ سال ترتیب ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء اور سال اشاعت ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء ہے مقامِ اشاعت مطبع بحرالعلوم، لکھنؤ ہے۔

۱۱۔ ترانۂ خامہ: "ترانہ خامہ" تاریخی نام ہے سال ترتیب ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء اور سن اشاعت بھی یہی ہے۔ یہ نسّاخ کی اردو رباعیوں کا مجموعہ ہے۔

۱۲۔ باغ فکر: یہ نسّاخ کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ "باغ فکر" تاریخی نام ہے۔ سن ترتیب ۱۳۰۳ھ/ اور سن اشاعت ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء ہے اور مقام اشاعت مطبع نامی لکھنؤ ہے۔

۱۳۔ قطعۂ منتخب: "قطعہ منتخب" تاریخی نام ہے جس سے تاریخ ۱۲۷۶ھ نکلتی ہے سال طباعت جمادی الاولیٰ ۱۲۹۱ھ مطابق جولائی ۱۸۷۴ء ہے اور مقام اشاعت مطبع نول کشور، لکھنؤ ہے۔

۱۴۔ سخن شعراء: اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ سخن شعرا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۲۸۱ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے سال طباعت ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء ہے اور مطبع کا نام منشی نول کشور لکھنؤ ہے۔

۱۵۔ تذکرۃ المعاصرین: یہ فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ "ع" کی ردیف تک پہنچنے پایا تھا کہ نسّاخ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا یہ نامکمل مجموعہ غیر مطبوعہ حالت میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

۱۶۔ قند پارسی: یہ مختلف جدید و قدیم فارسی گو شعراء کے کلام کا مجموعہ ہے جو مطبع منشی نولکشور سے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں طبع ہوا۔

۱۷۔ انتخابِ نقص: مرزا دبیر اور مرزا انیس کے کلام میں موجود فنی نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سال ترتیب ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء اور سال طباعت ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء ہے۔

۱۸۔ منتخباتِ دواوینِ شعرائے ہند: یہ اردو کے چند شعراء کی غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو کیپٹن ولیم ناسولیس نے تصحیح کر کے کالج پریس کلکتہ سے ۱۸۶۴ء میں شائع کروایا۔

۱۹۔ زبان ریختہ: "زبان ریختہ" اردو زبان کی تاریخ سے متعلق ایک مختصر رسالہ ہے اور یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے تاریخ ۱۲۷۵ھ نکلتی ہے۔ یہ رسالہ پہلی مرتبہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ اور دوسری مرتبہ پھر اسی مطبع سے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں طبع ہوا۔

۲۰۔ نصرۃ المسلمین فی الرّد علی غیر المقلدین: یہ رسالہ وہابی تحریک کی رد میں لکھا گیا تھا۔ مطبع حامی الاسلام دہلی سے ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں طبع ہوا۔

۲۱۔ نصاب زبان اردو (حصّہ دوم): کلکتہ یونیورسٹی کے اردو زبان کے امتحان کا نصاب ہے اس کی تصحیح ولیم ناسولیس نے کی تھی اور کلکتہ کالج پریس سے ۱۸۶۳ء میں شائع کروایا۔

۲۲۔ خودنوشت سوانح عمری عبدالغفور نسّاخ: یہ نسّاخ کی آپ بیتی ہے۔ جو کافی دنوں تک غیر مطبوعہ حالت میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں پڑی رہی۔ ڈاکٹر عبدالسبحان نے اسے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۹۸۶ء میں شائع کروایا۔

عبدالحمید تخلص حمید، عبدالغفور نسّاخ کے بڑے بھائی تھے۔ راجہ پور (فریدپور) میں ان کی پیدائش ہوئی۔ لیکن علم متداولہ کی تحصیل مدرسۂ عالیہ، کلکتہ سے کی۔ فضائل علمی اور کمالاتِ انسانی سے متصف تھے۔ گاہے گاہے فارسی اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ ان کے چند فارسی اشعار یوں ہیں:

حمدست تمام برخدا را
منت ہمہ ذات کبریا را

تاچند کنم دعا باسقام
بفرست خدا بمن شفارا

یارای برابری نہ باشد
باخاک در تو کیمیارا

برفرق شہاں نمی زند پای
خوانے بدرت اگر گدارا

دادی تو برای رنج رنجور
تاثیر دعا و ہم دوا را

کیستم چیستم نمی دانم
بدتر از نیستی ست ہستی من[۱۰]

عبدالباری صید، عبدالغفور نسّاخ کے بھائیوں میں تیسرے تھے۔ مولوی رشید النبی وحشت کے شاگرد اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں زبان انگریزی کے مدرّس تھے۔ ہر دو زبان یعنی اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے مگر کلام ان کا ضائع ہوگیا۔[۱۱] شعر و شاعری اور قدرت گفتار میں بے بدل تھے۔ ان کے چند فارسی اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

دلم بردہ حسینی نازنینی
حسینی نازنینی مہ جبینی

برو گلشن، بقامت سروبستان
بموسنبل، بعارض یاسمینی

پری رخسارۂ، غلمان نہادی
فرشتہ خصلتے، حور اجنبینی

دلِ بشکستہ ام را کے پسندد
کہ اہل بینش ست و خوردہ بینی

نیاز صید شد قربان نازش
زہی نازک بدن ناز آفرینی [۱۲]

حفیظ الدین تخلص شہید: عبدالغفور نساخ کے پھوپھی زاد بھائی تھے وہ لالہ کھیم نرائن رند کے شاگرد تھے ان کا ایک دیوان تھا جو دست بردزمانہ ہوگیا۔[۱۳] اشعارِ فارسی ان کے نہایت نمکین و شیریں ہوتے تھے کہا جاتا ہے مرزا غالب کے قیام کلکتہ کے دوران ایک بزم مشاعرہ میں شہید بھی حاضر تھے۔ شہید نے بھی اپنی غزل پڑھی جب مقطع میں تخلص شہید آیا تو مرزا غالب نے ان کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا تم کب شہید ہوئے؟ حاضر جواب تو تھے برجستہ جواب دیا جب کفر غالب ہوا۔ مرزا غالب ان کے اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور انھیں اپنے پہلو میں بٹھالیا۔[۱۴] شہید فکر بلند اور طبع ارجمند رکھتے تھے۔[۱۵] ان کا ایک اردو شعر یوں ہے:

تھی مرنے کی خواہش تو شب وصل میں' افسوس
نکلا نہ شب ہجر میں بھی ارمان ہمارا [۱۶]

چند فارسی اشعار حسبِ ذیل ہیں:

از گریۂ خود سر بدہم سلک گہر را
در زمزمہ آدم ز سخن مرغ سحر را

باز آئی شہید از غم کلکتہ چہ کا ہے
کابش خور مقسوم کشد نوع بشر را [۱۷]

نساخ کے بیٹے، ابوالقاسم محمد تخلص شمس بھی ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت فطری طور پر شاعری کے لیے مناسب واقع ہوئی تھی۔ زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ مضمون میں شوخی اور متانت کی گھلاوٹ تھی اردو کے مشہور شاعر جرأت کا مذاق شاعری انھیں بہت پسند تھا۔ پُرگو اور زود گو شاعر تھے۔[۱۸]

شمس کے کلام کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کرتے تو ہندوستان کے منفرد اور بڑے شاعروں کی صف میں آسانی سے جگہ پا سکتے تھے۔ لیکن ان کے مزاجِ عاشقانہ اور جذباتِ والہانہ نے انھیں اپنے گرد و پیش کی کراہتی اور سسکتی بلکتی زندگی کو محسوس کرنے کی مہلت نہ دی اور غزل کی رنگین خیال دنیا میں بھٹکتے

رہ گئے۔ ان کے چند اردو اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ہم اور شکوۂ غم ہجراں غلط غلط
افسوس ہے کہ آپ کا ایسا خیال ہے
خوبانِ روزگار کے پڑتے ہو پاؤں شمس
کچھ اپنی آبرو کا بھی تم کو خیال ہے
دل حسینوں کو نہ دینا اے شمس
یہ دغاباز بُرے ہوتے ہیں [۱۹]

شمس کا دیوان ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ نیشنل لائبریری کلکتہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ تقریباً دو سو صفحات میں ان کی غزلیں، رباعیات اور قصیدے پھیلے ہوئے ہیں۔ [۲۰]

شمس کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں رضا علی وحشت، حبیب النبی صولت، دلیل الدّین حسرت، اکمل حسین اکمل، خان بہادر محمد، یوسف رنجور، منشی عبدالکریم چھپروی وغیرہ مشہور ہیں اور بالخصوص حضرت وحشت نے اردو شاعری میں کافی شہرت حاصل کی۔ [۲۱]

ابومعین محمد عضد الدّین عضد، کا تعلق اگرچہ فرید پور کے قاضی خاندان سے نہ تھا مگر نسّاخ کی بڑی بہن کے بیٹے ہونے کے ناتے اُن کا نسّاخ سے قریبی رشتہ تھا۔ عضد کے والد کا نام مولوی حمید الدّین تھا جو وکیل عدالت عالیہ صدر دیوانی کلکتہ تھے اور شہباز پور ضلع ٹپرا کے رہنے والے تھے۔ عضد کی فارسی منظوم تصنیف کا نام "یادگار اجداد" ہے جو ان کے خاندان کے حالات پر مبنی ہے۔ "عروض والقوافی" بھی اُن کی دیگر فارسی تصنیف ہے جو مطبع نورالآفاق کلکتہ سے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں علم عروض و قافیہ پر بحث کے علاوہ آخر میں ایک قصیدہ بنام "بنگالہ" بھی درج ہے۔ [۲۲]

مندرجہ بالا جائزے سے عیاں ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں اردو و فارسی کی خدمات انجام دینے والوں میں فرید پور ضلع کے قاضی خاندان کے اصحاب نے نمایاں کردار ادا کیا خصوصاً عبدالغفور نسّاخ نے اپنے کارناموں سے اردو کی ادبی دنیا کو چونکا دیا اور شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

حواشی

۱۔ عبدالغفور نسّاخ، خود نوشت سوانح حیات نسّاخ (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۸۶ء) ص ۱
۲۔ مقدمۂ جامع التواریخ، (لکھنؤ، مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۹۷ء) ص ۳
۳۔ F.B, BRADLEY, TWELVE MEN OF BENGAL، (کلکتہ، S.K.LAHIRI CO., 1960) ص ۱۱۲
۴۔ ڈاکٹر صدرالحق، نسّاخ، حیات و تصانیف، (کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۹ء ص ۴۲
۵۔ ایضاً ص ۴۲
۶۔ عبدالسّتار، تاریخ مدرسۂ عالیہ، (ڈھاکہ، مدرسۂ عالیہ، ۱۹۵۹ء) ص ۲۱۱
۷۔ A MINUTE ON THE HOOGHLY MUDRUSSAH, (CALCUTTA MUNICIPAL PRESS, ALIPORE, 1877) ص ۴۔ ۵

۸۔ نساخ حیات و تصانیف۔ ص ۲
۹۔ وفا راشدی۔ بنگال میں اردو (حیدر آباد مکتبۂ اشاعت اردو ۱۹۵۵ء) ص ۴۱
۱۰۔ عبدالغفور نساخ، تذکرہ المعاصرین (غیر مطبوعہ) ص ۹۱
۱۱۔ عبدالغفور نساخ۔ سخن شعراء۔ (لکھنؤ نول کشور ۱۸۹۴ء) ص ۲۸۶
۱۲۔ تذکرہ المعاصرین۔ ص ۱۵۵
۱۳۔ سید نورالحسن، نگارستان سخن (بھوپال، مطبع شاہ جہان ۱۸۷۹ء) ص ۵۱
۱۴۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، بانگلا دیشے فارسی شاہتیہ (بنگلا) (ڈھاکہ، اسلامک فاؤنڈیشن ۱۹۸۳ء) ص ۳۲۲
۱۵۔ تذکرہ المعاصرین۔ ص ۱۴۸
۱۶۔ سخن شعراء۔ ص ۲۶۰
۱۷۔ نگارستان سخن۔ ص ۵۹
۱۸۔ لالہ سری رام، خم خانۂ جاوید، لکھنؤ، نولکشور ۱۹۵۸ء) ص ۲۲۰
۱۹۔ ڈاکٹر جاوید نہال، بنگال کا اردو ادب (کلکتہ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء) ص ۲۸۱
۲۰۔ ایضاً ص ۲۸۰
۲۱۔ نساخ حیات و تصانیف، ص ۸۹
۲۲۔ بنگلا دیشے فارسی شاہتیہ۔ ص ۳۵۵

برصغیر میں اردو صحافت کی ابتدا

گربچن چندن

دیسی اخباروں کی مبادیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے "ہسٹری آف انڈین جرنلزم" کے مؤلف جے۔ نٹ راجن نے لکھا ہے کہ ان اخباروں کی تاریخ لکھتے وقت ایک بڑی رکاوٹ یہ پیش آتی ہے کہ ابتدا اور ارتقاء کے بارے میں مضبوط اور پختہ ریکارڈ نہیں ملتا۔

اردو صحافت جو بنگالی کے بعد برصغیر کی سب سے قدیم لسانی صحافت ہے اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے مؤرخ اور محقق اپنی نگارش کے لیے جب کسی مثنوی یا دستاویزی ریکارڈ تک نہ پہنچ سکے تو انھوں نے قیاسات، مفروضات یا سنی سنائی باتوں پر تکیہ کیا لیکن یہ میدان تحقیق کی فروگزاشت اور خود سری سے خالی نہیں ہے۔

برصغیر کا اردو کا اوّلین مطبوعہ اخبار "جامِ جہاں نما" اسی بے نیازی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے ایک بنگالی من چلے ہری ہردت نے جاری کیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں محرر کی ایک اسامی پر فائز تھا۔ یہ اخبار تقریباً ستر سال تک زندہ رہا۔ ابتدا میں اس کی طباعت ایک انگریزی تجارتی کوٹھی کے ذمے تھی لیکن اپنی پیدائش کے چھ ہی سال بعد یہ صاحبِ مطبع ہوگیا۔ ہمارے تمام مورّخوں نے اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام کا معاون اور حاشیہ بردار کہا ہے اور اس نظریے کے ثبوت میں یہ دلیل دی ہے کہ وقت پیدائش اس کی پیشانی پر برطانوی حکومت کی مہر کے دو عکس شائع ہوئے۔ پھر کئی مورّخین نے تو اس کے وجود ہی سے انحراف کیا ہے۔ مثلاً مولوی محمد حسین آزاد نے کہا کہ ان کے والد مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" (جو ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا) اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ مولوی ذکاءاللہ نے کہا کہ سیّد محمد خاں کے "سید الاخبار" کو (جو ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا) اردو صحافت میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

اسی طرح کے کچھ دعوے اور بھی ہیں جو "جامِ جہاں نما" کی ہستی یا اہمیت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

بہرحال اس اخبار اور اس کے زمانے کے اور جنل ریکارڈ کے مطالعے سے دریافت ہوا ہے کہ متذکرہ مفروضات ناقابلِ دفاع ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج میں نے اپنی کتاب میں پیش کیے ہیں جو "جامِ جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا" کے عنوان سے حال ہی میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کے ادارے سے شائع ہوئی ہے۔ میں نے اس کے لیے دو سال تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی کا ریکارڈ کھنگالنے کے علاوہ برٹش لائبریری، لندن کے اورینٹل سیکشن سے بھی نادر معلومات حاصل کیں۔

حاصل شدہ حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ مورّخوں نے اردو صحافت کی پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھی۔ انھوں نے اس معمارِ اوّل کو

ایک بے وقعت اخبار قرار دیا تھا۔

مجھے اپنی تحقیق سے ایک ایسا "تبصرہ" ملا جو حکومت کے اس وقت کے چیف سیکرٹری مسٹر ولیم بٹروتھ بیلے نے اس کے اوّلین چھ ماہ کے شماروں کے مطالعہ سے مرتب کیا تھا۔ اس تبصرے میں انھوں نے کہا کہ یہ اخبار "سنگین شرانگیزی کا انجن" بن سکتا ہے۔

اس تبصرے کی فائل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ریکارڈ میں مستور تھی اور ہمارے کسی مورّخ کو اس سے سابقہ نہ پڑا۔ جناب محمد عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)" میں ولیم بٹروتھ بیلے کا سرسری ذکر تو کیا تھا لیکن ان کے تبصرے کے مشمولات سے کوئی بحث نہیں کی۔ اس تبصرے میں اس دور کی انگریزی، فارسی اور بنگلہ صحافت کی توضیح کی گئی ہے اور اس کے کل ۷۷ صفحات میں تقریباً ۱۵ صفحات جامِ جہاں نما پر صرف کیے گئے ہیں۔ مسٹر بیلے نے اخبار کی ناگوار خبروں کی متعدد مثالیں دیں اور بڑی صراحت سے یہ تاثر قائم کیا کہ یہ اخبار سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کرنے والا اور برٹش سامراج کے استحکام کے خلاف خطرے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ اسی تبصرے کی بنیاد پر گورنر جنرل جان ایڈم نے ۱۸۲۳ء میں کمپنی کی حکومت کا اوّلین پریس آرڈی ننس جاری کیا اس آرڈی ننس کے خلاف راجا رام موہن رائے نے قانونی احتجاج کیا جس سے دیسی صحافت کو زبان بندی کے قانون کے خلاف آواز اٹھانے کا شرفِ اوّلیت ملا۔

مطبوعہ اردو صحافت کی ابتدا سے قبل فارسی کے قلمی اخباروں یا اطلاعاتی مراسلوں نے اس کے لیے جو زمین تیار کی اس پر بھی آج تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اردو صحافت کوئی اجرا محض یا اتفاقی چیز نہیں تھی بلکہ فارسی کی اس قلمی صحافت کی جانشین کی حیثیت سے نمودار ہوئی جو سیکڑوں برس سے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں رائج تھی۔ یہ صحافت حکمران اور امیرِ اقتدار کے لیے مخصوص تھی لیکن اس کے کارکن وہی کام کرتے تھے جو ایک مطبوعہ اخبار کے صحافی یا نامہ نگار کر سکتے تھے۔

سلاطین دہلی کے زمانہ میں ان مراسلہ نگاروں کو برید اور مغلوں کے زمانے میں حسبِ مراتب وقایع نگار، سوانح نگار اور خفیہ نویس کہا گیا۔

جامِ جہاں نما کی پیدائش سے قبل یہ وقایع نگار پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور مطبوعہ صحافت کے آغاز سے قبل یہ اہل قلم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریذیڈنٹوں اور دیگر حکام اور دیسی سربراہوں کے درمیان اطلاع دہندوں اور پیغام رسانوں کا کام کرتے رہے اور جب یورپین ناشروں نے اپنے اوّلین انگریزی اخبار جاری کیے تو یہی وقایع نگار ان کے لیے مطلوبہ خبریں بھی فراہم کرتے رہے۔ کتاب میں اس دور کے ممتاز نامہ نگاروں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیکریٹریٹ سے وابستہ تھے۔

فارسی اور اردو اخبار جاری ہونے کے بعد یہ وقایع نگار براہ راست دیسی صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ گویا یہ ذہنی سفر صدیوں سے جاری تھا اور ہری ہردت کا جامِ جہاں نما اور رام موہن رائے کا مرأۃ الاخبار ہمارے علمی سفر کی وہ نئی منزل تھی جو چھاپے کی ایجاد سے سامنے آئی۔ فارسی کی قلمی صحافت انگریزی اور دیسی صحافت کی پیدائش سے تقریباً تین سو سال قبل سے ہندوستان میں رائج تھی۔ اس صحافت کے ہزاروں بلکہ لاکھوں نمونے قلمی اخباروں کی صورت میں ملک کے مختلف آرکائیوز میں موجود ہیں۔ جن پر اردو میں آج تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا زیر نظر کتاب میں سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے قلمی اخباروں سے متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں اور ان کے خبری مواد کی نشان دہی کی گئی ہے۔

ان اخباروں کے صحافی آج کل کی کسوٹی پر شاید پورے نہ اتریں لیکن اگر آج کے صحافی کے سامنے وہی مواد آجائے جو ان مراسلوں میں پیش کیا گیا ہے تو وہ یقیناً اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اگر اس زمانے میں ہندوستان کے بازاروں میں چھاپہ خانے کی خدمات میسر ہوتیں تو ہماری مطبوعہ صحافت کی وہیں ابتدا ہوگئی ہوتی۔

جامِ جہاں نما کے ذرائع میں انگریزی اخباروں اور سرکاری رپورٹوں کے علاوہ بیشتر فارسی کے یہی مراسلہ نگار تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے اسے وقایع بھیجتے رہے۔ لہٰذا جامِ جہاں نما ہماری دیسی صحافت کی وہ اوّلین دستاویز ہے جس میں آج کے اخبار کی شکل اور تقطیع، اردو صحافت کی نثر، خبروں کی تحریر، کالموں کی ترتیب، سرورق کے مشمولات اور رائے زنی کے انداز کی پَو پھٹی۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں جاری ہونے والے اردو کے بیشتر اخبار اسی کے نقوش پر چلے۔

امرِ واقع یہ ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے کے اخباروں اور مشاہدوں نے جامِ جہاں نما سے استفادہ کیا۔ حکومت کے ایک سیکریٹری مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ نے تو اسے اپنے وقت کا "ذی فہم محتاط اور بہترین" اخبار قرار دیا۔

شمالی ہند کا پہلا اور اس دور کا جادہ ساز "دہلی اردو اخبار" جامِ جہاں نما سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ تشکیل و ترتیب کے اعتبار سے یہ دونوں اخبار ایک دوسرے کے بہت نزدیک تھے۔ "دہلی اردو اخبار" میں "جامِ جہاں نما" ہی کی طرح خبر بالعموم اس عبارت سے شروع کی جاتی تھی۔ "وہاں کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے" یا "اخبار سے دریافت ہوتا ہے" دہلی اردو اخبار کے خبروں میں جامِ جہاں نما کا نام آتا تھا۔ جامِ جہاں نما کی خبروں کے عنوان مختصراً ان کے شہروں کے نام پر دیے جاتے تھے۔ جیسے "لاہور کی خبر"، "لکھنؤ کی خبر" دہلی اردو اخبار نے بھی اس انداز کو قدرے اختصار سے اختیار کیا اور صرف شہر ہی کا نام عنوان میں رکھا جیسے "لاہور"۔ "پشاور"۔ "مصر"۔ جامِ جہاں نما انسانی دلچسپی کے کسی واقعے کو اگر "خبر عجیب" کے عنوان سے شائع کرتا تھا تو دہلی اردو اخبار نے ایسی ہی خبر کو "حیرت افزا" کا عنوان دیا۔ کتاب میں دونوں کے مماثل اوراق کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔

مدراس کے اوّلیں اخبار "جامع الاخبار" اور "امیر الاخبار" اپنے کالموں میں "جامِ جہاں نما" کی منتخبہ خبریں نقل کرتے رہے۔

"جامِ جہاں نما" کی اشاعت سے قبل اردو نثر یا ہندوستانی لوگوں کی بول چال میں تو رائج تھی لیکن تحریر میں موجود نہیں تھی۔ مولوی محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے۔

"سید میر انشاالله خاں کے زمانے تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعتِ زبان اردو فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ امرا و اہلِ دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریحِ طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی کیونکہ کارروائی مطالبِ ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔"

اس دور کے سنگلاخ ماحول میں جو نئے برطانوی سامراج کی پابندیوں اور سختیوں سے عبارت تھا، ایک ایسی زبان میں اخبار نکالنا جو صدیوں سے بول چال ہی کی سرحد پر کھڑی پر تول رہی تھی، ایک کٹھن اور صبر آزما تجربہ تھا۔ ہری ہردت جس نے سب سے پہلے اس تجربے کا خواب دیکھا اور اسے عملی جامہ پہنایا یقیناً ایک جرّی اور آتشِ نمرود میں کودنے والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ "میں خالص ہندوستانی میں ایک ایسا اخبار نکال رہا ہوں جو قارئین کی تفریحِ طبع اور ذہنی تسکین کا سامان پیش کرے گا۔"

اس نے اس اخبار کا لائسنس دو زبانوں فارسی اور ہندوستانی کے لیے لیا تھا لیکن آغاز ہندوستانی سے کیا۔ اردو قارئین کا حلقہ بنانے میں ابتدا میں اسے ناکامی ہوئی۔ چنانچہ اجرا کے قریب دو ماہ بعد اس نے اسے یکسر فارسی ایڈیشن میں بدل دیا لیکن اردو سے

اس کی محبت مسدود نہیں ہوئی۔ ایک سال بعد اس نے پھر اردو کی طرف رجوع کیا اور تقریباً پانچ سال تک فارسی ایڈیشن کے ساتھ چار اوراق کا ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کیا۔

اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ اردو ضمیمہ ایک آزاد حیثیت کا مالک تھا۔ فارسی ایڈیشن میں سرکاری تقررات، تبادلوں اور عدالتی فیصلوں کی کثرت نظر آجاتی تھی لیکن اردو ضمیمہ عمومی خبروں اور انسانی دلچسپی کے واقعات سے لبریز ہوتا تھا۔ اس میں تاریخ کی کئی کتابوں کے خلاصے بھی پیش کیے گئے جو عصری حالات اور ذوق سے بے تعلق نہیں تھے۔ ان کے متن میں گاہے گاہے ایڈیٹر کی آرا یا چٹکیاں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اخبار کا اردو ضمیمہ اپنے فارسی ایڈیشن سے الگ بھی بکتا تھا۔ اس کے عمومی وتیرے میں اپنی آزادی، علم دوستی اور تجربہ پسندی روا تھی۔

اخبار کے بانی ہری ہردت ہیں، جو ناشر اور مدیر دونوں کے اوصاف کے حامل تھے۔ پیشے کی عزت اور کردار کی جرأت کے خصائص تھے۔ انھوں نے ڈاک کے محصول کے بارے میں جو اس زمانے میں کسی اخبار کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا، انگریزی اور دیسی اخباروں میں فرق کرنے کی حکومت کی امتیازی پالیسی کے خلاف تحریری احتجاج کیا اور تمام اخباروں سے مساوی سلوک کا مطالبہ کیا۔ یہ نمائندگی نامہ اردو صحافت کی تاریخ کی اپنی اوّلین مجاہدانہ دستاویز ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے مورّخوں نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس مراسلے میں انھوں نے حکومت کے ایک سیکریٹری سائمن فریزر کو لکھا۔

"میں اپنے اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لیے انتہائی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن ڈاک کی پوری شرح کی ادائی اس کی اشاعت کی توسیع میں حائل ہے.... (سیرام پور کے مشنریوں کا) بنگلہ "اخبار سماچار درپن" اور "فارسی جریدہ" اخبار "سیرام پور" انگریزی اخباروں کی طرح اس محصول کا صرف چوتھا حصّہ ادا کرتے ہیں۔..... میرا اخبار ان سے کسی طور کمتر نہیں.... مجھے امید ہے کہ آپ خود ان کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ اندازہ کرلیں گے۔ اور حکومت سے یہ سفارش کریں گے کہ ڈاک کی شرح کی ادائی کے معاملے میں میرے اخبار کو ان کے برابر تسلیم کیا جائے۔"

یہ احتجاج کامیاب ہوا گو بعد میں حکومت نے اپنی مالی دشواریوں کے عذر پر یہ رعایت منسوخ کردی۔

اس اخبار نے دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ فرانس ہاکنز کے مغل بادشاہ کے دربار میں رعونت اور گستاخی سے کام لینے پر ایک خصوصی رپورٹ شائع کی جس پر ریذیڈنٹ مذکور نے کلکتہ میں مقیم حکومت کے سیکریٹری کو اس کی شکایت اور اخبار کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کو کہا۔

اس مقدمے کے بارے میں صحافت کی ہماری تاریخوں میں کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ اس کی مدد سے "جام جہاں نما" کے حقیقی مؤقف اور کردار کا بڑے مثبت انداز سے ادراک کیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کی تفصیل برٹش لائبریری لندن سے حاصل کی جو کتاب میں شامل ہے۔

اس زمانے میں ایک ریذیڈنٹ کے خلاف جو فرنگی سرکار کے وقار اور سامراج کی علامت تھا، ایسی رپورٹ شائع کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن "جام جہاں نما" نے حسبِ موقع اپنی جرأت کردار سے بڑے مہذب طریقے سے کام لیا۔

دراصل ہمارے مورّخوں نے اس اخبار کو ایک خود دار رکن کی حیثیت سے پرکھا یا دیکھا ہی نہیں اور اس اعتبار سے ہمارا یہ اوّلین اخبار ہماری صحافت کا مظلوم ترین رکن ہے۔ ان مورّخوں نے اسے ایک بے وقعت طفیلی اور کاسہ لیس اخبار مان کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ بہر حال دستاویزی حقائق سے، جو اب سامنے آئے ہیں، پتہ چلتا ہے کہ یہ اخبار ایک آزاد، باکردار اور صحافت شناس اخبار تھا اور علم و آگہی کے ہمارے نئے قافلے کے ہراوّل دستے کا جری رکن تھا۔

بچوں کے لیے کہانیاں اکیسویں صدی میں

طاہر مسعود

میرا موضوع ہے کہانیاں اور وہ بھی اکیسویں صدی کی کہانیاں۔ وقت کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ کل کی بات بھی ایک صدی پُرانی لگتی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ ہم اکیسویں صدی کی سرحد عبور کر رہے ہوں گے۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا، مگر مسائل کی گرانباری یہی ہوگی، شاید اس سے بھی پیچیدہ ہو۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک جب ہمارا معاشرہ جماجمایا تھا، پرانی تہذیبی اقدار و روایات کی خوشبو گھروں میں باقی تھی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیلتے ہی اور چراغ میں بتی پڑتے ہی بچے دادی اماں کو گھیر لیا کرتے تھے: دادی اماں کوئی کہانی سنائیے۔ پریوں والی کہانی "نہیں وہ چڑیا چڑے والی کہانی"

"اچھا تو بھئی سنو کہانی .... لیکن شرط ہے۔" دادی اماں کہتی تھیں۔ "بیچ میں کوئی ٹوکے گا نہیں۔" دادی اماں کی یہ شرط بھی عجیب ہی تھی۔ کہانی کے بیچ میں بولنے سے کیا ہوجاتا ہے۔ کہانیوں کے شہزادے راستہ بھول جاتے ہیں یا کہانی کی روانی میں خلل پڑتا ہے .... اور بچے بھی خوب تھے، وعدے کے بعد ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے ... دادی اماں کی ہر کہانی یوں شروع ہوتی تھی:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے"

کہانیاں مختلف ہوتی تھیں لیکن ہر کہانی کی ابتدا اسی فقرے سے ہوتی تھی کتنی تازگی ہے اس فقرے میں، جب سنو نیا محسوس ہوتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ اس جے جمائے صدیوں پرانے معاشرے کے تار و پود بکھر گئے۔ تہذیبی اقدار و روایات بدل گئیں، رہنے سہنے، سوچنے اور محسوس کرنے کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی آگئی۔ اب شام آتی ہے تو چراغ میں بتّی نہیں پڑتی، چمنیوں سے دھواں نہیں اٹھتا.... دادی اماں بھی اب کہانیاں نہیں سناتیں ٹی وی کے آگے تخت بچھائے، ناک پہ عینک ٹکائے "فلیش" دیکھتی ہیں .... ٹی وی، وی سی آر، ڈش انٹینا، ویڈیو گیمز .... کہتے ہیں سائنسی ایجادات نے نئی صورت حال کو جنم دیا ہے۔ تہذیبِ حاضر کے سامنے نت نئے اور نہایت گمبھیر قسم کے مسائل ہیں۔ فاصلوں کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ اور بقول مارشل میکلوہن دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس نئے عہد نے پوری نسل انسانی کو متاثر کیا ہے۔ علم اب فضا میں رچ بس گیا ہے۔ وہ معصومیت اور بھولپن جو بچپن کے چہرے کا طرۂ امتیاز تھا، اب محض ماضی کی بھولی بسری یاد ہے۔ بچے اس قدر چالاک ہوگئے ہیں کہ انھیں کوئی چیز ڈراتی ہے اور نہ حیرت زدہ کرتی ہے۔ اس کائنات کے بھید جب ابھی پردۂ راز میں تھے تو فطرت کہانیوں کی تخلیق کا راستہ سجھاتی تھی۔ چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخا کاتتی تھی اور زمین کو بیل نے اپنی سینگوں پہ اٹھا رکھا تھا، سینگ بدلنے سے زلزلہ آجاتا تھا۔ یہ اور کتنی ہی کہانیاں تھیں جو سینہ در سینہ گشت کیا کرتی تھیں۔ اب

بچّے خوب جان گئے ہیں کہ چاند کا باطن تاریک ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جو کہانیوں میں شہزادے اور شہزادیوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو یہ خیالی ہے۔ اور بادشاہ کا اپنی صحت یابی کے خوشی میں خزانے کا منھ کھول دینے کا اعلان اُس دور کی باتیں ہیں جو لد چکا ہے۔

شفیق الرحمٰن نے کہیں لکھا تھا کہ بچّوں میں بس ایک ہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ بڑے ہوجاتے ہیں.... آج کل کے بچّے تو بڑے ہونے کا انتظار بھی نہیں کرتے، بچپن ہی میں بڑے ہوجاتے ہیں۔ تو صاحبو ایسی صورت میں جبکہ پورے عہد کا مزاج بدل چکا ہے، سوال یہ ہے کہ اس میں پرانی دھرائی کہانیوں کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ پھر اسی مسئلے سے ایک دوسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اب جبکہ بیسویں صدی کی سائنس اُکھڑنے والی ہے اور اکیسویں صدی سر پہ کھڑی ہے، ہمیں بچّوں کو کیسی کہانیاں سنانی چاہیں۔ کیونکہ دادی امّاں تو اپنی کہانیوں کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ کہانیوں کے پرانے کردار دیو، جادوگر، ڈائن، کٹنی، چڑیلیں، رستم، افراسیاب، نوشیرواں عادل اور کہانیوں کی وہ فضا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے زمین آسمان سونے کے بن جاتے تھے، جس میں جانور انسانوں کی طرح باتیں کرتے تھے، کیا ہم ان کہانیوں، ان کے کرداروں اور ان کے مجموعی ماحول اور فضا کو مصنوعی اور از کار رفتہ سمجھ کر ترک کردیں اور ان کی جگہ ٹھوس سماجی حقیقتوں کی کہانیاں لکھیں کہ یہی کہانیاں اکیسویں صدی کے تقاضوں پر پوری اتریں گی۔ یہ مسئلہ بظاہر ایک ٹیڑھی لکیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ٹھہریے... کیوں نا ہم پہلے یہ دیکھ لیں کہ وہ کہانیاں جنھیں ہم فرسودہ کہہ رہے ہیں، ان کی معنویت کیا تھی اور ساتھ ہی اس پہ غور کریں کہ جدید عہد کہ بچّوں کے لیے بھی ان کہانیوں میں کوئی معنویت نکلتی ہے یا نہیں۔

قصّہ یہ ہے کہ پچھلے زمانے میں جو حکایتیں اور کہانیاں لکھی جاتی تھیں، ان کا بنیادی مقصد بچّوں کو علم اور اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنا تھا انھیں زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف کرانا تھا۔ شہزادے اور دیو کی کہانی میں محض تفریح اور وقت گزاری کا پہلو نہیں تھا۔ کہانیوں میں فائدے اور نقصان کا حسابی تصوّر تو جدید ذہن کی پیداوار ہے۔ وگر نہ کہانیوں کو تو ہمیشہ پند و نصیحت اور اخلاق تعلیم کا سب سے عمدہ ذریعہ سمجھا گیا ہے "پنج تنتر" جو کہانیوں کی قدیم ترین کتاب ہے اور صدیوں سے دنیا کے ایک مختلف زبانوں میں مقبول رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ایک راجہ نے اپنے چار عدد بیوقوف اور جاہل بیٹوں کو راج پاٹ کے طریقے سکھانے اور اخلاقیات کی تعلیم دلانے کے لیے اس زمانے کے ایک پنڈت سے لکھوائی تھی۔ پنڈت جی نے جانوروں کی وساطت سے انسانی خصوصیات اور سماجی معاملات کی حقیقت اور اس کی پیچیدگیوں کی تشریح و توضیح کی تھی۔ اس طرح شیخ سعدی کو بھی جب پند و نصیحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے بھی حکایات ہی کا سہارا لیا۔ وجہ اتنی سی کہ کہانیوں کا وصف ہی یہ ہے کہ خشک بے مزہ اور بے رنگ نصیحتوں کو بھی کہانیوں میں پُرلطف اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ پرانی کہانیوں میں ہمیں جتنے کردار ملے ہیں ان سب کی علامتی معنویت ہوتی تھی اور یہ ہماری حقیقی زندگی کی تخیلاتی سطح پہ نمائندگی کرتے تھے۔ سارے کردار اچھے اور برے نیک اور بد کے خانوں میں منقسم ہوتے تھے۔ کہانیاں پڑھتے ہوئے بچّوں کی اچھے کرداروں سے ذہنی مناسبت ہوجاتی تھی اور وہ کسی نہ کسی طور ان کے کارناموں میں اپنی جھلک دیکھ لیتے تھے۔ جب کوئی مہم جو شہزادہ ظالم اور خونخوار دیو سے لڑکر شہزادی کو چھڑا لاتا ہے تو کہانی پڑھنے والا بچّہ خود کو اس شہزادے کے حوالے سے IDENTFIY کرتا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کا غیر مرئی حقیقتوں اور غیر مادّی قدروں پہ یقین پیدا کرنے میں بڑا زبردست حصّہ رہا ہے۔ اوائل عمری میں جب بچّوں کے ذہن پہ یہ نقش قائم کردیا جائے کہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جو ما ورائے حواس ہیں۔

دوسرے لفظوں میں حقیقت صرف وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے یا جسے سنا، سونگھا اور چکھا جاسکتا ہے بلکہ اس دنیا سے پرے ایک اور دنیا بھی ہے جو ہمارے دائرہ ادراک سے باہر ہے۔ یہ یقین زندگی بعد از موت کے عقیدے پر ایمان کو پختہ کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا تھا نیز بچوں کے تخیل کو مہیز کرنے، ان میں تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بھی ان کہانیوں کی اپنی اہمیت تھی جسے ہم نظر انداز کرتے جارہے ہیں۔

اب رہا سوال ان کہانیوں میں بچوں کی دلچسپی کا تو ایک ماہر نفسیات پیٹر سنیڈ فورڈ کا کہنا ہے کہ بچہ بالعموم چھ سے دس سال کی عمر میں دنیا میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ لوگوں کو، ان جانے مقامات کو اور چیزوں کی حقیقت کو سمجھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے اندر کا یہی جذبۂ تجسس اور تحیر اول اول اسے کہانیوں کی جانب راغب کرتا ہے سائنس کی ترقیاں اپنی جگہ لیکن بچے میں جو اپنی ایک معصوم ذہنی دنیا بسانے کی جو آرزو ہوتی ہے، اسے زوال نہیں ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے بچے جاسوسی کہانیوں میں یا پھر سائنسی فکشن میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ یعنی ایسی کہانیوں میں جہاں ناممکن، ممکن ہوجاتا ہو، محیر العقول واقعات پیش آتے ہوں۔ میں تو سائنس فکشن کو بھی ان ہی پرانی کہانیوں کی توسیع سمجھتا ہوں کیونکہ آخر جادوئی قالین اور سیاروں کو تسخیر کرنے والے راکٹ میں فرق ہی کیا ہے؟ اب آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی نئی کہانیاں اگر پرانی کہانیوں کی ہی بدلی ہوئی شکل ہیں تو پھر شکایت کیا ہے؟ میری تشویش صرف اتنی سی ہے کہ نئی کہانیوں میں خواہ وہ جاسوسی کہانیاں ہوں، سماجی حقیقتوں کی کہانیاں یا سائنس فکشن، بالعموم یہ اخلاقی تاثیر سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کے ذہن ان کی شخصیت اور کردار پہ وہ دیرپا اور گہرا تاثر قائم نہیں کرتیں جو پرانی کہانیوں کا امتیاز تھا بچپن کی پڑھی ہوئی کتنی کہانیاں ایسی ہیں جو آج بھی ہمیں یاد ہیں اور جن کا اثر ہم اپنے ذہن اور مزاج پر محسوس کرتے ہیں.... کیا ہم آج کی کہانیوں کے بارے میں یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ کہانیاں بھی ہمارے عہد کے بچوں کا زیادہ، عرصے تک ساتھ دے سکیں گی تو گویا اصل مسئلہ یہ نکلا کہ ہم نئی کہانیوں کو بچوں کی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے کس طرح زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی تعلیم سے ہم آہنگ کریں۔ یہی سوال ہے جس کا جواب دیے بغیر ہم اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے۔

(بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبۂ "بچوں کے ادب" کے تحت منعقدہ مذاکرے میں پڑھا گیا۔)

جدید ایرانی ادب سے

"پگھلاہٹ"

طاہرہ ریاستی/معین نظامی

کئی برسوں کے بعد، شاید کئی صدیوں کے بعد! یہ پہلا موقع تھا کہ عورت کو اپنے سر پر روشنی کا دائرہ دکھائی نہ دیا اور اُس کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے رات کے اُس لفظ میں جان پڑ گئی، جو بہت پُرانے زمانوں سے اُس کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیرا کسی عظیم ہیولے کی طرح ہر چیز پر چھایا ہوا تھا:

"اِس میں واقعیت ہر گز نہیں ہو گی!" وہ زیر لب دُہرائے جاتی تھی۔

"یہ بھی چکرا دینے والے انھی وہموں میں سے کوئی ہے!"

کیوں کہ اُسے بہت طویل عرصے سے، رات دن کی تشخیص کے بغیر، ہر جگہ روشنی کے اذیت ناک دائروں کو دیکھنے کی عادت ہو چکی تھی۔ ہر جگہ! حتیٰ کہ بہت دور دراز کے خوابوں میں بھی! اور اتنے طویل زمانوں سے کہ جن کا آغاز یاد کرنے کے لیے بھی برسوں کے غور و فکر کی ضرورت تھی۔ اُس کے آفس میں، چھوٹے سے آہنی کیبن کی چھت سے لٹکتا ہوا بہت بڑا بلب، بڑی بے دردی سے ہر چیز پر چمکتا، نیند میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا اور اُس کے خوابوں تک کو پگھلا دیا کرتا۔

اب بھلا وہ کیسے یقین کر لیتی کہ یہ ہمہ گیر اندھیرا سچ مچ کا ہے۔ اُس نے لڑکھڑاتے ہوئے چند قدم اُٹھائے لیکن جلد ہی اُس کے ہاتھ سامنے والی موٹی آہنی دیوار سے جا ٹکرائے۔ اُس نے ہولے ہولے دیوار پر ہاتھ پھیرے۔ دیوار پر اُبھرے ہوئے نوکیلے دانے اُس کی انگلیوں پر خراشیں ڈال رہے تھے۔ دیوار گھٹی گھٹی سی اور مسلسل تھی اس میں کوئی دراڑ، کوئی سوراخ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگی ہوئی صرف تین سلاخیں، باہر سے اُس کے رابطے کا اکلوتا ذریعہ تھیں، اور وہ بھی دیوار میں یوں گڑی ہوئی تھیں کہ بالکل سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ان کے نیچے، کھنچے ہوئے کواڑوں والی کوئی چھوٹی سی کھڑکی بھی ہو سکتی ہے!

برسوں دیوار کو دیکھتے رہنے کی وجہ سے وہ جانتی تھی کہ سلاخوں تک ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ اگر روشنی کی باریک سی لکیر بھی دکھائی دے جاتی تو شاید وہ مرد کی نظروں سے اندازہ لگا لیتی کہ کیا ہوا ہے! اُس نے اگلا قدم بڑھایا یا ہاتھ اوپر اٹھائے، لیکن اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھ خلا میں ہل رہے ہیں ایک قدم اور .... اور اب اس کا بدن دیوار سے ٹکرائے بغیر کسی خلا میں تھا، حالانکہ دیوار کو تو ہر جگہ ہونا چاہیے تھا!

یہ بہت بڑی مسرت تھی۔ دیوار میں شگاف پڑ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ بے ارادہ اوپر نیچے، دائیں بائیں حرکت کرنے لگے لیکن راہداری میں مرد کی لکڑی کی کرسی کے گرنے کی آواز، پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے کم نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آواز مستطیل راہداری

میں چکراتی پھر رہی ہو وہ جو اِس سارے عرصے میں محض گنتی کی چند آوازوں سے آشنا تھی، اُس کے لیے شاید یہ دوسرا دھماکہ تھا! لیکن مرد کی عدم موجودگی اتنی اہم تھی کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی۔ اذیت ناک روشنی کے دائرے کے غائب ہونے سے لے کر اِس آہنی سرد خانے کا مکمل اور بے مثال اندھیرا اور کیبن کے دروازے کا کُھلا ہونا، سب کچھ مرد کی غیر موجودگی کے سامنے بے حیثیت ہوا جاتا تھا!

وہ مستطیل راہداری میں دوسری بار چل رہی تھی ایک بار صدیوں پہلے، اور اب دوسری بار، وہ اس گھرے اندھیرے میں اس راہداری میں داخل ہوئی، جس میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی شخص گزر سکتا تھا۔ یہ راہداری بھی اس سرد خانے کی طرح لوہے سے بنی ہوئی تھی اور اتنی لمبی تھی کہ اس کے اختتام پر صرف ایک چھوٹا سا نقطہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ گزشتہ برسوں میں کوشش کرتی رہی تھی کہ کبھی کبھار ہی سہی، اس راہداری کو دیکھ لیا کرے! کیونکہ نہ صرف یہ کہ پنجوں کے بل کھڑے ہونے اور ایک مستطیل ٹونٹی کو..... جس میں صرف مٹیالا رنگ دوڑتا رہتا تھا..... دیکھنے میں اس کے لیے کوئی لذّت نہیں تھی، بلکہ وہ مرد کی تیز نظروں سے بھی نہیں بچ سکتی تھی اِسی لیے وہ ہمیشہ اس سے صرفِ نظر کرتی، کیونکہ وہ یہ مان چکی تھی کہ اُس کی زندگی کے باقی سال اسی آہنی کیبن میں گزرنے چاہئیں۔

شروع شروع میں اُس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ بھلا دن یا رات کا کون سا پہر ہے، لیکن بعد میں وہ وقت کے احساس سے عاری ہو گئی تھی۔ اور اب اُسے یقین ہو رہا تھا کہ مرد جا چکا ہے، آہنی کیبن کا دروازہ کُھلا ہوا ہے اور اگر وہ راہداری عبور کر لے تو بھاگ سکتی ہے طویل عرصے کے بعد اس کے ذہن میں پھر فرار کا خیال آیا۔ وہ کئی بار اچھی طرح اس موضوع پر سوچ چکی تھی اور اب یہ خیال اس کے لیے ایک خالی غبارے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اُسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس زیرِ زمین سرد خانے میں دفن ہو چکی ہے تو اُس نے یہ غبارہ لاانتہا فضا میں چھوڑ دیا تھا لیکن اب برسوں بعد وہ غبارہ اس لاانتہا فضا سے واپس آ گیا تھا اور اُس کے ذہن کے میلے پن میں کسی کبوتر کی طرح چکّر کاٹ رہا تھا وہ ایک کھلم کھلا خوف سے کانپ رہی تھی اور اس کے گھرے اندھیرے میں بھی اسے مرد کی آنکھیں دِکھائی دے رہی تھیں جو ٹکٹکی باندھے اُسے گھورے جاتی تھیں!

عورت نے یہ آنکھیں ہمیشہ سلاخوں کے پار سے دیکھی تھیں مرد کی کالی کالی بھنویں کسی چھتری کی طرح اس کی نظروں کے کچھ حصّے پر سایہ کیے رہتی تھیں۔

راستہ اتنا لمبا تھا کہ وہ نااُمید ہو گئی اچانک کسی چیز سے ٹکرا کر وہ بُری طرح گر پڑی۔ یہ زمین نہیں تھی جب اس نے اسے چھو کے محسوس کیا تو اسے سیڑھیاں اور پہلا دن یاد آیا، جب مرد اُسے گھسیٹتے ہوئے وہاں لایا تھا۔ سیڑھیاں اتنی زیادہ تھیں کہ اُس دن اُسے یقین تھا کہ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے وہ مر جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی..... اب پتہ نہیں یہ خیال صحیح تھا بھی یا نہیں ..... وہ اوپر چڑھنے لگی۔ اتنے بھرپور اندھیرے میں یہ کام بہت مشکل تھا وہ سیڑھیوں پر گھسٹتی ہوئی اپنے جسم کو اوپر لیے جاتی تھی۔ اس کے خیال میں اوپر جانے کا یہی واحد طریقہ تھا لیکن چھوٹی سی لغزش بھی اُسے پھر پہلی جگہ پر پہنچا دیتی، کافی دیر تک یہی صورتِ حال رہی آخر وہ سیڑھی پر پہنچ گئی۔ وہ چلاّئی ..... اُس کی آواز تاریک فضا میں غوطے لگاتی ہوئی مستطیل راہداری کی آہنی دیواروں سے ٹکرائی اور کہیں کھو گئی۔ اپنی آواز سن کر اُسے بہت تعجب ہوا پھر وہ ذرا زور سے چلاّئی، اتنا چلاّئی کہ اسے محسوس ہوا کہ اب اس کے پاس کسی قسم کی کوئی آواز باقی نہیں بچی وہ سیڑھیوں کے اوپر تھی، اس کے بعد دروازہ تھا اور اس کے بعد رہائی!

اس نہ گہرا سانس لیا۔ اُسے اپنی جلد کے نیچے تکلیف دِہ سُستی محسوس ہوئی! وہ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں۔ اچانک سیڑھیوں پر روشنی کی ایک باریک سی کرن چمکی اور پھر غائب ہوگئی وہ مسکرا دی۔ چند لمحوں بعد روشنی کی کرن دوبارہ چمکی اور ذرا دیر تک چمکتی رہی۔ روشنی کو دیکھ کر پہلے اُس پر طاری ہونے والی سستی جاتی رہی اُسے اطمینان تھا کہ اُس نے دروازہ دیکھ لیا ہے وہ رہا ہوجائے گی اپنے شہر کے گلی کوچوں میں بھاگتی پھرے گی سب عزیزوں سے ملے گی!

یہ سوچ کر اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں وہ کافی دیر سیڑھیوں کے اوپر موٹی آہنی دیوار سے لگی رہی بے یقینی سے اُس نے کئی بار قدم بڑھائے مگر پھر کھینچ لیے۔ کرن پھر دکھائی دی۔ عورت کو روشنی کے باریک ذرّوں میں مرد کی آنکھیں دکھائی دیں مرد کی نظریں اُس کی جلد کے اندر تک دھنسی جاتی تھیں اُس کی ٹانگیں ہمیشہ کی طرح بے جان ہوگئیں سرد آہنی دیوار نے اُس کی پیٹھ چھیل دی اُسے اپنی ٹانگیں ذرہ ذرہ پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

مرد کی نظروں کے بعد وہ ہمیشہ یہی ڈراؤنا خواب دیکھا کرتی تھی وہ سیڑھیوں پر گر پڑی۔ مرد کی نظریں دروازے کی جھری سے اندر آگئیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح پسینے سے شرابور ہوگئی آہنی کیبن پسینے سے بھر گیا تھا۔ وہ تیزی سے بار بار اپنا منہ کھولتی اور بند کرتی رہی۔ پسینے کی نمکینی اُس کا حلق جلا رہی تھی وہ ہر ممکن حد تک ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن اُسے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقی ہے یا خیالی؟

کچھ دیر بعد اُس نے اپنے کانوں کے پاس مرد کی سانسیں سنیں۔ مرد کا چہرہ بہت قریب دکھائی دے رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں وہ بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اس میں ہمت نہیں تھی۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ مرد اپنی نظروں کے ذریعے اُس کے جسم میں اُترتا چلا جارہا ہے جلد کے نیچے اس کا بدن حرکت کر رہا تھا مرد اُس کے خلیوں میں داخل ہو کر بڑی تیزی سے اُس کی رگوں میں دوڑنے لگا تھا وہ خود کو بہت بوجھل محسوس کر رہی تھی ایک ہاتھ بھی ہلاتی تو یوں لگتا جیسے دو ہاتھ ہلا رہی ہے یہ بوجھل پن اُسے دانتوں کی جڑوں تک محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اُس نے اپنے آپ کو مڑی تڑی حالت میں آہنی کیبن کے ایک کونے میں پڑا ہوا پایا وہ نہیں جانتی تھی کہ کتنا وقت لگا! اُس کی لمبی سفید قمیض اُس کے بدن سے چپکی ہوئی تھی اُس نے اُٹھ کر سلاخوں تک پہنچنا چاہا۔ مرد ہمیشہ کی طرح کیبن کے باہر لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

اُس نے سیڑھیوں کو تھام لیا اب وہ روندی ہوئی، کچلی ہوئی، سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مرد کی آنکھوں کا دکھائی دینا محض ایک موہوم خیال تھا۔ بلب کا بجھ جانا، کُرسی کا گر پڑنا، اُس کا مستطیل راہداری عبور کر لینا اور سیڑھیوں پر موجود ہونا..... ان سب باتوں سے ظاہر تھا کہ مرد جا چکا ہے۔ اُس نے گھسٹتے ہوئے پوری توانائیوں سے آہنی دروازے کو دھکیلا۔ وہ مطمئن تھی کہ دروازے کے پار اُسے اپنا شہر ملے گا اُس نے بڑی احتیاط سے باہر دیکھا۔ سُرخ مٹی والا ایک صحرا اُس کے سامنے تھا!

صحرا کے بیچوں بیچ ڈھانچوں سے بکھرا ہوا ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ اُجڑی ہوئی آنکھوں اور آدھ کھلے، خالی مونہوں والے کئی ڈھانچے ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر تھے وہ ایک طرف ہوگئی دروازہ خشک سی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ وہم انگیز تاریکی دوبارہ چھا گئی اب کے اس نے دروازے کے ساتھ چپک کر اپنی پوری قوت لگا دی اُس کے ذہن میں کئی خیال آتے اور محو ہوجاتے دُور کہیں صحراؤں میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے آسمان سے گاڑھا دُھواں اُٹھ رہا تھا شاید ستارے جل رہے تھے! آگ کے

پاس ایک لمبی قطار میں کچھ عورتیں کھڑی تھیں سب کی سب اُس کی ہم شکل تھیں۔ وہ خود بہت سی عورتیں بن چکی تھی اشعلے اُن کے جسموں سے آر پار ہو رہے تھے۔ اُن کی رگوں، دلوں اور آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی اُن کے پستانوں کی نوک سے سُرخ رنگ کا گاڑھا مادہ ٹپک ٹپک کر زمین پر گہرے داغ ڈال رہا تھا کچھ بچے اُن کی شل اور خون آلود چھاتیوں پر ہاتھ مار رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہوتے جا رہے تھے، مرد بنتے جاتے تھے۔ اُبھرے ہوئے پٹھوں والے مضبوط مرد! پھر آگ کے شعلے اُن کی طرف لپکتے اور اُن کی ٹانگیں ذرّہ ذرّہ ہو کر پگھل جاتیں ٹانگوں سے محروم مردوں کی ایک لمبی قطار! اب صحرا میں ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے عورت نے اپنے بدن پر نظر ڈالی اُس کی جلد کے نیچے اُس کا دل کتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا اُس نے اپنے پیٹ کی باہر کو نکلی ہوئی جلد پر نگاہ دوڑائی۔ ایک مُڑا تُڑا بچہ پیٹ کی دیواروں پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ بچہ اک سرخ اور لیس دار مادّے میں غوطے لگا رہا تھا۔

بے پناہ درد نے اُسے سیڑھیوں پر ہی ڈھیر کر دیا اُسے بہت دُور کے گزرے ہوئے سال یاد آئے، جب وہ ایک بہت بڑے دھماکے کی اکیلی تماشائی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ دھماکے کے بعد بہت تیز آندھیاں چلی تھیں گاڑھے کالے دھوئیں نے کسی بہت بڑی کھمبی کی طرح پورے شہر پر چھتری سی تان دی تھی اور سب کچھ مرکزِ ثقل کی طرح اس بڑے گڑھے میں جذب ہوا جاتا تھا، جس سے دھوئیں کے الاؤ اُٹھ رہے تھے۔ جڑوں سے اکھڑے ہوئے تمام درخت، گھر، لوگ، سب کچھ!

عورت کو بس اتنا یاد تھا کہ کچھ دیر کے بعد وہ اس مرد کو بہت دُور کسی جگہ پڑی ہوئی ملی تھی، جہاں سے اسے اپنے شہر کی پگلاہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ مرد اسے گھسیٹتا ہوا اس زیر زمین کال کوٹھری میں لے آیا تھا۔ لوہے کے بہت بڑے دروازے اور ہزاروں سیڑھیوں والی کال کوٹھری میں!

درد دوبارہ انتہا کو پہنچ گیا، عورت چلّائی ایک نرم اور پلپلا سا جسم اُس کی ٹانگوں سے ٹکرایا۔ اُس نے اپنے آپ کو کچھ پیچھے کھینچ لیا۔ بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی ایک بہت بڑے بگولے نے دروازہ کھولا عورت نے لمحہ بھر کے لیے بچّے کو دیکھا وہ سرخ گوشت کے لوتھڑے کی طرح سیڑھیوں پر پڑا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھائے۔ بگولہ آہنی دروازے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا جب وہ بچے کو اُٹھانے لگی تو سیڑھیوں پر لمحہ بھر کے لیے چمکنے والی سورج کی سنہری روشنی میں اُس نے دیکھا کہ بچے کی ٹانگیں نہیں ہیں!

عورت کی چیخ بہت بلند تھی مرد دروازے کے چوکھٹے میں دکھائی دیا کچھ دیر بعد عورت کو سیڑھیوں سے اپنی ہڈیاں ٹکرانے کی آواز سنائی دی ہر طرف بچے کی رونے کی آواز تھی اور مرد عورت کو گھسیٹ کر آہنی کیبن میں لیے جاتا تھا!

(افسانوی مجموعے "شطِ خیال" سے)

ہائیکو

جاپانی شاعر۔ بوسن (۱۷۱۶ء۔ ۱۷۸۴ء)

ترجمہ/محسن بھوپالی

طوفاں ۔۔ ڈر سے
واپس آتے ہوئے سور سے
ٹھوکر کھائی ہے

ساون کی بوندیں
نرسل اور بنفشہ کا
بوسہ لیتی ہیں

برف آلود سحر
گھر سے اٹھتا ہوا دھواں
دل خوش کن منظر!

آنے کی پہچان،
پہلے پتوں کی آواز
پھر قدموں کی چاپ

جب لالہ کا پھول
ریزہ ریزہ ہو کے گرا
کیا باقی تھا حسن؟

اُف ری تنہائی
لاٹھی رکھ کر بھول گیا
آئی خزاں کی شام

سردی کی یہ رات
آرا چلنے کی آواز
غربت کا ہے ہاتھ

برف کی صورت اوس
جھاڑی کے ہر کانٹے پر
شبنم کا قطرہ

بانہہ سرہانا ہے
مجھ کو خود سے عشق ہوا
چاند کے سائے میں!

پنجابی نظمیں

الطاف قریشی / ارشد محمود ناشاد

جن ناگوں کو میں نے اپنے خوں کے دودھ سے پالا
آج وہی ڈستے ہیں مجھ کو
میں بے بس ہوں
اپنے ہاتھوں،
محنت سے پروان چڑھے، ان ناگوں کو
اب میں ختم نہیں کر سکتا
اپنی یہ مجبوری
اب میں اپنے رب، سوا
اور کسے بتلاؤں؟

(۲) دوسری موت

اک مدت کے بعد ملے تھے
تو بھی چپ تھی
میں بھی چپ تھا
تیری آنکھ سے آنسو نکلے
میری آنکھ سے آنسو نکلے
تو نے کب دیکھا تھا ان کو؟
میں نے کب دیکھا تھا ان کو؟
ہم دونوں کی آنکھ کے آگے لاکھوں راتوں کے سائے تھے

(۳) "رب کی حکمت"

غم بانٹیں تو گھٹ جاتا ہے
سکھ بانٹیں تو بڑھ جاتا ہے
حکمت میرے رب کی ہے

ایرانی

حادثہ

سیمین دانشور / محمد سلیم مظہر

ہماری بد بختی اُس وقت سے شروع ہوئی جب ساتھ والے گھر کی ہمسائی صدیقہ خانم نے کار خریدی اور سفید دستانوں اور کالی عینک کے ساتھ سٹیرنگ پر بیٹھنے لگی۔ اُس دن صبح جب میں گھر سے نکلا تو اُسے دیکھا۔ اُس نے گاڑی میں بٹھانے کی پیشکش کی۔ سوار ہوئے بغیر میں نے آئندہ پیش آنے والے واقعات سے بچاؤ کے لیے، کہ جو اُسی روز دو بجے سے شروع ہو گئے، اشھد..... پڑھی مگر جب گھر پہنچا تو بیوی روٹھی بیٹھی تھی۔ میرے سوالات کے مختصر جوابات دیتی رہی، بس ہاں یا نہیں۔ وہی خاتون، پہلے جب گھر آتا تھا، کہتی تھی! "غور سے سنو، سارے دن کی رپورٹ تمھیں دینا چاہتی ہوں۔ خواہ تم سنو یا نہ، میں بولتی رہوں گی اس لیے اپنی بے عزتی نہ کراؤ اور سن لو۔" اور خبریں سنانا شروع کر دیتی کہ اُس دن اُس نے جو قدم بھی اٹھایا ایک حادثہ تخلیق کیا اور صدیقہ خانم نے یوں کیا تھا اور ووں کیا تھا۔ لیکن اُس دن بیگم صاحبہ کا رویہ ایک مشینی انسان کا تھا۔ کھانا لائی جو ہم نے خاموشی کے ساتھ کھایا۔ پہلی دفعہ اُس نے سگریٹ سلگایا اور ناواقفوں کی طرح بے نیازی سے منہ میں رکھا اور کہنے لگی! تسلی سے بیٹھو. ایک بات جناب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتی ہوں۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور ڈرنے لگا۔ اُس نے کہا تمھیں میرے لیے ایک کار خریدنی ہوگی، اور تم جانتے ہو کہ بالآخر خریدو گے۔ میں نے عرض کیا "میری جان کیوں ڈب شدہ فلموں کی اداکاراؤں کی طرح مکالمے بول رہی ہو" اُس نے کہا بچاؤ کی کوشش بے سود ہے، گاڑی تو خریدو گے ہی؛ میں نے کہا: "میری جان تم تو ڈرائیونگ بھی نہیں جانتیں....."

اُس نے کہا: "وہ میں نے صدیقہ خانم سے معلومات لے لی ہیں۔ لائسنس کے حصول تک ڈرائیونگ سیکھنے کا خرچ پانچ سو تومان ہے۔ یہ تم اپنے بھیک منگے محکمے سے ایڈوانس لے لو۔ اگر گاڑی قسطوں پر لیں تو اس میں بچت نہیں ہے اور اگر نقد لیں تو تیس ہزار تومان کی آئے گی۔ کچھ چلی ہوئی سستی ہے لیکن اُس کا بھی فائدہ کوئی نہیں تیل پھونکتی ہے اور بار بار ورکشاپ لے جانی پڑتی ہے۔ تم بھی تو ماشااللہ اپنی بیوی کے لیے ایک قدم اُٹھانے کو تیار نہیں خود مجھے بار بار ورکشاپ لے جانی پڑے گی، میں مستریوں کی منتیں کرتی پھروں اور وہ مجھ سے دھوکے کرتے رہیں۔ بس نئی گاڑی ہی لے لو۔"

وہ پھر ہمیشہ والی عورت بن گئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے شروع سے باتونی، اشتہار دار اور خوبصورت دانتوں والی عورت اچھی لگتی تھی اور اسی بنا پر نادرہ سے شادی کی۔ البتہ جب میں نے اُسے پسند کیا وہ نادرہ تھی لیکن نکاح کے وقت خود اُس کے اصرار پر ہم نے اُس کا نام بدل کر نادیہ رکھا۔

میں نے کہا: "خاتون تمھیں پتہ ہے کہ بتیس ہزار تومان زبان سے کہنا آسان ہے لیکن میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں۔ تمھیں معلوم بھی ہے کہ میری تنخواہ سے بس گزارہ ہو پاتا ہے۔ پھوٹی کوڑی تک ہمارے پاس نہیں ہے۔ نرسری میں پڑھنے والے دو بچوں اور آمد ورفت کے اتنے اخراجات کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے۔"

کہنے کو یہ سب کچھ میں کہہ گیا، لیکن معاملہ بس سے باہر ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے کہا جی ہاں جناب میں بھی اسی آمد ورفت کے اخراجات کی وجہ سے گاڑی لینا چاہتی ہوں۔ تمھیں صبح دفتر پہنچا آؤں گی اور واپس لے آؤں گی۔ بچوں کو نرسری چھوڑ آؤں گی .... ہمارے اخراجات میں خاصی کمی آجائے گی۔"

میں نے کہا۔ "بیگم شاید تمھاری عقل جواب دے گئی ہے۔ ایک آدمی کے پاس کھانے کو روٹی نہیں تھی اور وہ پیاز رکھنے کے لیے کمرہ خالی کر رہا تھا۔"

اُس نے کہا۔ "کمرہ تو تھا اُس کے پاس .... وہی گروی رکھ دیتا۔ میری جان ہم بھی اپنا گھر گروی رکھ دیں۔ آج کے دور میں اگر انسان کے پاس گاڑی ہے تو گویا سب کچھ ہے تم قرض دینے والے بینک میں ہو اور طریق کار جانتے ہو" میں نے کہا "بیگم ہمارا سارا سرمایہ بس یہی ایک گھر ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ میرے باپ نے کتنے ارمانوں سے اسے مکمل کیا اگر ہم نے یہ گروی رکھ دیا تو اسے چھڑانے کے پیسے کہاں سے لائیں گے۔"

اُس نے کہا "اُس وقت تک خدا کریم ہے ......" کھنکار کے گلا صاف کیا اور کہنے لگی: "دیکھ میری جان تجھ سے محل کی خواہش کی؟ یورپ کی سیر کرانے کو کہا؟ حتٰی کہ تم نے تو ہماری شادی کی تقریبات بھی ڈھنگ سے نہ کیں۔ سفید لباس اور سفید جالی کے ارمان میرے دل ہی میں رہ گئے۔"

ذرا سا سوچا اور پھر شروع ہو گئی۔ "اچھی طرح یاد ہے ایک دفعہ نزلہ ہو گیا تھا، کہا تھا کہ چرمی کوٹ لے دو، تم نے کہا تھا کریسیڈین ڈی کھالو۔" اور اُس نے ہونٹ بھینچے، اس خیال سے کہ کہیں رونا شروع نہ کردے، میں نے کہا۔ "اچھا ذرا آرام کر لینے دو پھر سوچتے ہیں کیا کیا جاسکتا ہے۔ شاید تیرے لیے قسطوں پر گاڑی خرید سکوں ....."

اُس نے کہا: "قسطوں پر لینے کی بات نہ کرو۔ اُس صورت میں ہو جائیں گے قسط کے غلام۔ ضروریات کے بوجھ تلے تو دبے ہوئے ہیں، قسطوں کے بوجھ تلے بھی آجائیں گے۔" یہ باتیں اُس کی اپنی نہیں تھیں صدیقہ خانم کی سوچ سے بھی ماوراء تھیں۔ کیا میری بیوی کی سوچ بلند ہو گئی تھی؟۔ میری بیوی خدانخواستہ ..... میری زبان گنگ......

اُس نے کہا، "کس سوچ میں پڑ گئے ہو، میری جان گھر کی فکر بھی نہ کرو "زرگندہ" کوئی رہنے کی جگہ ہے اور وہ بھی اس خراب ماحول میں۔"

خدا اباجان کو سلامت رکھے، لیکن اُنھوں نے نوح جیسی عمر تو نہیں گزارنی، بالآخر بہمن کے کھجور کے باغات میرے حصے میں آتے ہیں پہلوی روڈ پر ایک اچھا سا گھر لیں گے۔ اس بارے میں بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ "زعفرانیہ" میں "باغ فردوس" کے پیچھے۔

میری بیوی اھواز کا تحفہ تھی۔ سن چالیس میں عید کے موقع پر دوستوں کے ساتھ اھواز گئے ہوئے تھے۔ شہر کی قابل دید جگہوں کو عید ہی کے دن دیکھ لیا اور رات کو بوریت کی وجہ سے سوچنے لگے کہ کیا کریں، ہمت کی اور سینما چلے گئے۔ ہمارے آگے اسکول لڑکیوں کا ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لڑکیاں بار بار پیچھے مڑتیں، ہمیں دیکھ کر کھسر پھسر کرتے ہوئے ہنستی تھیں۔ سن

چالیس کی نادرہ اور آج کی نادیہ نے بالکل پیچھے نہ دیکھا۔ ہم نے فلم نہ دیکھی۔ نہ ہم نے اور نہ اسکول کی لڑکیوں نے گیتوں، پیپسی اور شیونگ بلیڈ کے اشتہارات کے بعد آئندہ پیش کئے جانے والے پروگراموں کا کچھ حصہ دکھا رہے تھے کہ اچانک فلم کی نمائش منقطع کردی گئی۔ لائٹیں روشن ہوگئیں اور چند لمحے بعد پھر سے گانے چلائے گئے اور اعلان ..... فلم کی نمائش منقطع ہونے اور سب کچھ نئے سرے سے دکھانے کا سلسلہ تین دفعہ چلا۔ تیسری دفعہ نادرہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور نعرہ لگایا کہہ رہی تھی کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی نئے آنے والے کے لیے فلم کے ابتدائی حصے نئے سرے سے نہیں دکھائے جاتے۔ اُس کی آواز ریڈیو تہران کی ایک معروف اناؤنسر کی آواز کی طرح تھی یا پھر وہ اُس کا انداز اختیار کر رہی تھی۔ بس کیا بتائیں ہم بھی شیر ہوگئے اور اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ نعرے لگائے اور بلبل کی طرح آوازیں نکالیں۔ فلم کا شو ناکام ہوگیا اور ہم سب کو پیدل تھانے لے گئے۔ تھانے میں اُس نے مجھے اور تھانیدار صاحب کو اپنا دیوانہ بنالیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہر دفعہ جو فلم نئے سرے سے شروع کی جاتی ہے، وہ ڈپٹی کمشنر، کمشنر یا شہر کے مئیر میں سے کسی کے خوبرو کی تشریف آوری کی وجہ سے تھی۔

میں نے بیوی سے کہا: "بہتر ہے اپنے باباجان کو خط لکھو کہ تمھیں علی الحساب ......" کہ اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ اُسے چپ کرانے کے لیے میں نے کہا اچھا اب ہم نے گاڑی خرید لی لیکن تم بغیر گیراج کے اس چھوٹے سے گھر میں اُسے کہاں کھڑی کروگی؟ اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا "مجھے پتہ تھا تم خریدوگے، تم اچھے انسان ہو، بس ذرا ڈرپوک ہو۔ میں نے گاڑی ٹھہرانے کی جگہ کے بارے میں بھی سوچ لیا ہے۔ ایک زنجیر لے لوں گی۔ گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے بجلی کے سیمنٹی کھمبے سے باندھ دیں گے۔ پہلا کھمبا ہماری گاڑی کے لیے۔ دوسرا کھمبا صدیقہ خانم کی گاڑی کے لیے۔

تین ہفتے کھینچا تانی رہی، آخر کار میں نے ہار مان لی۔ کیونکہ وہ اداس رہنے لگی تھی، کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں گلی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوجاتی، حسرت سے صدیقہ خانم کی گاڑی کو دیکھتی اور آہیں بھرتی رہتی۔ میں نے اپنے محکمے سے پانچ سو تومان ایڈوانس لیے بیگم صاحبہ ڈرائیونگ سیکھنے لگیں۔ پھر تصدیق نامہ بقول اُس کے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کی باری تھی والدہ صاحبہ کے حکم پر میں نے کتاب "مفاتیح الجناں" خریدی اور شروع سے آخر تک اس کی ورق گردانی کی تاکہ اس میں مشق کے وقت لوگوں کے احمق ہوجانے یا ڈرائیونگ کے امتحان میں فیل ہونے کا وظیفہ تلاش کرسکوں۔ ظاہر ہے ایسی دُعا نہ "مفاتیح الجناں" میں تھی، نہ کسی اور کتاب میں۔ خود والدہ صاحبہ نے ختم قرآن کیا اور منت مانی کہ اگر یہ شیطان جو گاڑی کے نام سے میری بیوی کے دماغ میں داخل ہوچکا ہے، اُس کے سر سے نکل جائے تو وہ ابوالفضل کے نام کا کھانا دے گی۔ لیکن طے تھا کہ اس قسم کے شیطان کو کسی جادو ٹونے سے نہیں بھگایا جاسکتا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ تحریری امتحان میں پاس ہوگئیں۔ [illegible] رہی تھی کہ میں نے ٹیسٹ کے تمام سوالات کے صحیح جوابات کی نشاندہی کی انسپکٹر صاحب کو بہت اچھا لگا اُس نے مجھے کہا: "خاتون آپ نے جنوب کی تمام دھوپ اپنی ذات میں ذخیرہ کی ہوئی ہے۔" کیونکہ میری بیوی خاصی سانولی تھی۔

اور پھر جناب انسپکٹر نے مجھ سے دریافت کیا، اگر برف پڑچکی ہو اور سڑک پر تہہ جما چکی ہو، پیچھے کی طرف جاتے ہوئے بریک لگاؤ اور گاڑی نہ رُکے تو تم کیا کروگی؟

میں نے جواب دیا: "جناب عالی میں ایسے موسم میں اپنی نازنین گاڑی کو گیراج سے باہر ہی نہیں نکالوں گی۔ انسپکٹر صاحب نے ہاتھ اپنے دل پہ رکھے اور خوب ہنسے۔"

پتھروں کے درمیان میں سے گاڑی گزارنے کے امتحان میں بھی پاس ہوگئی۔ بتاتی تھی "اکبر آقا، فوکس ویگن کے مالک،

ماری چل پڑی لیکن مجھے تو معلوم نہیں تھا، ڈر کے مارے میرا دل گویا سینے میں نہیں تھا۔ اس کا نقصان کہاں سے ادا کرتی؟ بہرحال جو قیصر چوک پر پہنچی تو اشارہ بند تھا۔ میں فوکسی والے کے برابر جا رکی۔ شریف آدمی نے فوراً شیشہ نیچے کیا میرے دل نے کہا ابھی تجھ سے نقصان کی تلافی کا کہتا ہے۔ لیکن اُس نے کہا بہت ممنون ہوں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے بھی بڑے اعتماد اور ادب آداب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، کوئی بات نہیں، ہم گاڑی چلانے والوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ جب گھر پہنچے گا تو پتہ چلے گا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ لیکن اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

.....سچ بتاؤں پیارے، مجھے گھر میں چھوٹا سا انقلاب لانا پڑا، وہ شیشے والی میز جس کا شیشہ آئے دن ٹوٹتا رہتا تھا، تمھاری آرام کرسی اور دروازے کے آگے ڈالنے والا قالین جو کہ اب گھس پٹ چکا تھا کو تین سو ساٹھ تومان میں فروخت کر دیا۔ کیا بتاؤں ایک دن گاڑی کی ہینڈ بریک گرانا بھول گئی اور بریک لگی حالت میں تمھاری خالہ کے پاس "ورامین" چلی گئی۔ تم پر کوئی احسان نہیں جتا رہی۔ اس لیے گئی کہ گاڑی چلانے کی مشق کروں اور سمت کو اچھی طرح سمجھ سکوں اور اسٹیرنگ پر میرا ہاتھ مضبوط ہو۔ بریک لیدر اور بیرنگ جل گئے۔ تین سو پچاس تومان خرچ ہو گئے۔

میری ڈیوٹی ختم ہو گئی اور تہران واپس آگیا۔ معلوم ہی تھا کہ گھر مسجد بنا ہو گا۔ بیگم صاحبہ کے انقلابات خطرناک تھے اور سمت سمجھنے کے نام کی حس تو اُس میں بالکل نہیں تھی۔ میں نے خود اُس میں سمت سمجھنے کی حس پیدا کرنے کی بہت کوشش کی ڈرائیونگ کے آغاز میں اپنے دفتر سے تہران کا نقشہ چھپا کر لے آیا۔ لیکن نقشے سے کسی طرح بھی کوئی چیز اُس کے پلے نہ پڑی۔ میں جان گیا کہ اُس سے چاروں سمتوں کا تعین نہیں ہو پاتا۔ میں نے کوشش کی کہ سورج اور اُس کے رُخ سے کم از کم شمال کی سمت کا اُسے پتہ چل جائے۔ بازو تان کر شمال کی طرف منہ کر کے اُسے کھڑا کر دیا اور کہا، اب تمھارا دایاں ہاتھ مشرق کی طرف اور بایاں مغرب کی طرف، سامنے شمال اور پیچھے جنوب ہے۔ بالکل اُسی طرح سے جیسے ہم نے چھٹی جماعت میں سیکھا تھا۔ اُس نے کہا میری جان رات کو سورج نہیں ہوتا اور پھر بادلوں والے دنوں میں کیا کروں گی؟ رات کا مسئلہ تو دبِ اکبر سے حل کیا، لیکن وہ کسی دُب سے کچھ نہیں سمجھتی تھی نہ اکبر سے اصغر سے۔ اُس کے لیے وضاحت کی کہ قبلہ جنوب کی طرف ہے اس لیے مساجد شمالاً جنوباً بنائی جاتی ہیں۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ساری عمر کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ بتایا کہ گرجا گھروں کے دروازے مشرق کی طرف ہیں لیکن تمام سڑکوں پر گرجا گھر نہیں تھے۔ آخر کار اُس میں تجسس پیدا کرنے کے لیے، میں نے معلوم نہیں کہاں پڑھا تھا یا شاید سنا تھا کہ چیونٹیاں اپنی بلیں اور گھونسلے شمال کے رخ پر بناتی ہیں، شاید خود ہی بنا لیا تھا۔ یہ بات اُسے بہت اچھی لگی۔ ڈرائیونگ کے لیے نہیں، بس ویسے ہی جہاں کہیں بھی جا رہے ہوتے، چیونٹوں کے راستوں پر رک جاتی اور کہتی شمال کی طرف جا رہی ہیں کیونکہ ان کی بلیں اور گھونسلے شمال کی رُخ پر بنے ہوئے ہیں۔ اُس کے لیے ایک "رزم آرا" قطب نما خریدا، اس قدر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی کہ خراب کر ڈالا۔

گھر پہنچا تو بیوی بچے مکڑے اور تنکے کی طرح نحیف و لاغر ہو چکے تھے۔ گاڑی کی خرابیوں کے بارے میں بیگم صاحبہ کی وضاحتیں اس قدر فنی ہو چکی تھیں کہ میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ مثلاً بال بیرنگ ایکسل میں گھس گیا تھا، یا اس کے برعکس، مین وائر پھٹ گئی تھی، ڈائنمو کرنٹ نہیں دے رہا تھا، کلچ پلیٹ ٹیڑھی ہو گئی تھی، غرض اسی طرح بس سنتے جاؤ۔ بیگم صاحبہ بچوں کو پہنچا کر واپس لوٹتی اور امریکیوں کی طرح ایک نیلی سی پینٹ پہن لیتی، سرخ رنگ کی بالٹی خرید رکھی تھی اُسے پانی سے بھرتی، پانی میں دھلائی کا پوڈر ڈالتی اور ہاتھوں پر پلاسٹک کے دستانے چڑھا کر گاڑی کے پیچھے پڑ جاتی "۔ ہر دفعہ ایسے دھلائی

ہوتی جیسے پھر نہ چلانا ہو، ساتھ ساتھ گنگناتی بھی رہتی۔ اس کام میں اُس کی مہارت گاڑی سروس کرنے والوں سے بھی بڑھ چکی تھی۔ گاڑی کو اس طرح چمکا دیتی کہ انسان اپنا منہ اُس میں دیکھ لے۔ گاڑی کے لیے ایک ریڈیو بھی خریدا ہوا تھا اور دکان سے بجلی کا پنکھا بھی بھلا شدید سردیوں میں پنکھے کی کیا ضرورت تھی اور پھر گرمیوں کا ابھی نام و نشان بھی نہ تھا۔

میں نے بیوی کے ساتھ خاصا جھگڑا کیا۔ حتٰی کہ اُس کی مار پٹائی بھی کرنی چاہی لیکن وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور رنگ شدہ لباس یوں اُس کا حال زار بیان کر رہا تھا کہ میرا دل بھر آیا۔

پھر سے کوئی ملازمت تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اتنا بھاگ دوڑ کی کہ شاید مایوسی اور غم کی وجہ سے نڈھال ہو کر گھر میں پڑ رہا۔ بیوی نے میری تیمارداری میں انتہا کر دی۔ والدہ ہر صبح پیدل چل کر آتی اور میرے لیے سوپ تیار کر دیتی۔ ہر شام بیوی اُسے گھر پہنچا آتی اور جب واپس لوٹتی تو گاڑی کی چابی کو انگلیوں میں گھماتی آتی اور بتانے لگتی کہ وہ کن کن راستوں سے گئی تھی اور لوگوں سے کیا کچھ سنا تھا۔ ایک رات اُس نے دیر کر دی۔ میرا دل اتنا دھڑکا کیا بتاؤں۔ نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف سے بیگم کی اس قدر خوفزدہ آواز سنائی دی کہ دل ڈر گیا۔

"میری جان ڈرنے کی کوئی بات نہیں، بس حادثہ ہو گیا۔"

حادثہ؟

ہاں

کس کے ساتھ

ایک ٹریفک آفیسر کے ساتھ

ٹریفک آفیسر کے ساتھ؟ اے خدا، دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی، تمام جہاں کو چھوڑ کر انسان ٹریفک آفیسر کو ٹکر جا مارے، کیا نجات کی اُمید ہو سکتی ہے؟

"خود اُس کے ساتھ نہیں اُس کی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹکر ہوئی۔ گھر میں جتنے پیسے ہیں لے آؤ۔ میرا ڈرائیونگ لائسنس بھی۔ لائسنس سلائی مشین کے بکس میں ہے۔ تھانے لے آؤ، تھانہ تو نچانہ میں فریق ثانی تین ہزار تومان کی بات کرتا ہے۔"

میں نے غنڈوں جیسی وضع قطع اختیار کی، سرخ ٹائی لگائی چرمی کوٹ پہنا، سر پہ ٹیڑھی ٹوپی رکھی اور تھانے میں داخل ہوا۔ اس وقت میرا درجۂ حرارت ۳۹ پر تھا۔ بیگم نے بتایا تھانے میں تمہارے داخل ہونے کے انداز نے کمال ہی کر دیا۔

میں نے کہا: حضرات! میری بیوی نے کیا کیا ہے؟ کوئی قتل کر دیا ہے؟ بیگم صاحبہ کونے میں پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس قدر ڈری، سہمی اور بد نصیب لگ رہی تھی کہ میرا دل کھول اُٹھا مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک آئی اور وہ کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی خدا کی قسم میرا کوئی قصور نہیں، منشی نے رپورٹ میں بھی لکھا ہے تمہاری ماں کو پہنچا کر واپس آتے ہوئے وزارت بہبود کے سامنے مجبوراً رکنا پڑا، ٹریفک جام تھی۔ کیونکہ جناب برژنف اپنے وفد کے ہمراہ ہلال احمر گئے ہوئے تھے۔ یہ سارجنٹ صاحب، میں نے اُس کے کندھے کے بیجز کو دیکھا، افسر ہی تھا، جناب برژنف کے حفاظتی دستے میں شامل تھا، اُسے اُن کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ اپنی بڑی سی موٹر سائیکل کو سڑک کے بیچ میں کیوں پارک کیا۔ جب ٹریفک کھلی تو ایک ٹرک نے میرے سامنے آ کے موڑ کاٹی، میں بھی بائیں طرف کو مڑی اور جناب کی موٹر سائیکل کے ساتھ جا ٹکرائی۔ تمہیں کیا بتاؤں لوگوں نے میرا کیا حشر کیا، ایسا لگتا تھا جیسے میری بوٹی بوٹی کر ڈالیں گے۔

سڑک پہ کھڑے ہوئے کرائے کے خوشامدی کہ جنھیں وہ خود (حکومت) لائے تھے تاکہ جناب برژنف کے لیے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائیں .... کہے جارہے تھے، دلکش خاتون .... کیا بتاؤں، "دلکش خاتون" بھی اُن کے اچھے الفاظ تھے۔ کیسی بری بری باتیں بھی اُنھوں نے ایک دوسرے سے کیں۔" اور رونے لگی۔

سارجنٹ صاحب نے کہا: ہم ہیں اور ہماری یہ موٹر سائیکل۔ سڑکوں کے اصلی مالک بھی ہم لوگ ہی ہیں جہاں ہمارا جی چاہا پارک کر دیتے ہیں اور ..... خاتون بغیر ڈرائیونگ لائسنس کے گاڑی چلارہی تھی" ....."اس کا جرم......"

میں نے سارجنٹ کی بات کاٹی، بیگم کا لائسنس جیب سے نکالا اور اُس کے آنکھوں کے سامنے کر دیا، اس نے لائسنس جھپٹ لیا، میں ڈرا کہ کہیں دست و گریباں نہ ہوجائیں۔ دراصل میں ڈرائیونگ اور ٹریفک سارجنٹ سے ڈرتا ہوں، آخر اپنے بس میں تو نہیں ہے۔ بیگم نے کہا "آفرین ہے تیری غیرت پر، وہ لائسنس جو میں نے خون دل دے کے حاصل کیا، تو نے کھودیا" اور پھر رونے لگی۔

ایک افسر جس کے ہاتھ میں منشی کی رپورٹ تھی آگے آیا، اُس نے کہا: آپس میں صلح صفائی کرلو اور مسٹر تم سارجنٹ صاحب کو موٹر سائیکل کے وہ پرزے جو ٹوٹ گئے یا ٹیڑھے ہوگئے، خرید دو اور سارجنٹ صاحب خاتون کا لائسنس واپس دے دیں۔

ہم نے قبول کرلیا۔ بیگم صاحبہ اسٹیرنگ پر بیٹھ گئی، اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر اور سارجنٹ صاحب ہمارے پیچھے۔ ہم نے "چراغ برق روڈ" کی تمام سپیئر پارٹس کی دکانیں دیکھ ڈالیں تب کہیں سامنے والا شیشہ، ہیڈ لائٹ اور ہینڈل کا نیا دستہ تلاش کر سکے اور تمام وقت میری بیوی جناب سارجنٹ کو نصیحت کرتی رہی کہ وہ کیوں ظاہر داری اور موٹر سائیکل کو نیا کرنے اور چمکانے کی فکر میں ہے۔ کہنے لگی: اہم ترین وہ ہے جو انسان کے باطن میں ہے یعنی عقل و شعور، یہ ظاہری چمک دمک کس کام کی۔ حتّی کہ کہا۔ پسماندہ قوموں کی خاصیت یہی ہے کہ اُن کے افسران شان و شکوہ کے مالک ہیں اور خواتین بھی صرف اُن کی ظاہری شان پر جاتی ہیں اور رنگ روغن، ٹیکسیاں، آرائش گاہیں اور مشروب فروشی اس ملک میں کتب فروشی سے زیادہ ہوچکی ہے ..... یہ ایک اچھی لوری تھی، لیکن یہ الفاظ میری بیوی کے نہ تھے، یعنی میری بیوی......

ہم بھرپور تلاش کے باوجود کمپنی کا مونوگرام حاصل نہ کر سکے اسے اگلے روز کی صبح تک ملتوی کردیا، صبح میرا بخار ختم ہوچکا تھا اور بیگم صاحبہ اور سارجنٹ صاحب کے ساتھ گیا اور امیر کبیر روڈ کے تمام ڈائی بنانے والوں کی دکانوں کو چھان ڈالا لیکن مونوگرام نہ مل سکا۔ سارجنٹ صاحب فرماتے تھے جب تک مونوگرام نہیں ملے گا وہ میری بیوی کا لائسنس بھی واپس نہیں کریں گے۔ بیگم نے قسم کھائی کہ وہ کمانڈر کے پاس جاتی ہے اور کہا: منشی کی رپورٹ کے مطابق تمھیں جناب برژنف کے حفاظتی دستے کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔

سارجنٹ صاحب کے چہرے کا رنگ اڑگیا اور اُس نے لائسنس واپس دے دیا۔ ہمارے دوسو تومان خرچ ہوچکے تھے۔ بیگم صاحبہ اگر پہلے ہی کمانڈر صاحب کے پاس جانے کی دھمکی دے دیتی تو یہ دوسو تومان بھی ہماری جیب سے نہ نکلتے۔

میں بھی تھک کر نہ بیٹھا، حتّی کہ پھر ایک کام تلاش کرلیا، لیکن اب کی بار "بندر شاہ" جانا پڑا۔

بیگم صاحبہ کے خطوط مختصر اور بے معنی ہوتے تھے، نہ گاڑی کے بارے میں کوئی بات ہوتی نہ گھر میں کسی نئے انقلاب کی خبر، مجھے آہستہ آہستہ امید پیدا ہونے لگی کہ گاڑی کا بھوت اُس کے سر سے اُتر چکا ہے اور ہماری زندگی پھر سابقہ ڈگر پر چل پڑے گی۔ میں بہت خوبصورت اور دلکش خطوط اُس کو لکھے۔ اھواز کے تھانے میں گزرنے والی رات کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ کہ اُسی ایک

رات کو اُس نے مجھے اپنا دیوانہ بنادیا اور اُس دن کی صبح کا قصہ لکھا کہ جب ہم بلیوارڈ میں ریل گاڑی کی پٹڑی کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے اور میری بیوی بتا رہی تھی۔ میرا پسندیدہ رنگ "نیلا" اور پسندیدہ کتاب "زیر سایۂ درختان زیر فون" (زیر فون کے درختوں کے سائے میں) ہے اور پھر اُس کی پسندیدہ کتاب جاتی رہی۔ اور یہ کہ نکاح کے دن اُس نے نیلا لباس پہنا ہوا تھا اور فوراً "ہاں" کہہ دی اور قاضی کو تین دفعہ خطبہ پڑھنے کی زحمت سے بچایا آہستہ آہستہ اپنے خطوط میں تیسرے بچے کے بارے میں اشارے کرنے لگا حتیٰ کہ جرأت کر کے گاڑی فروخت کرنے کا ذکر بھی لے آیا اور کہا کہ اس طرح ہم چند قسطیں آگے نکل جائیں گے۔ بیگم صاحبہ نے اچانک خاموشی اختیار کرلی واپس جواب والے تار بھیجے، جواب آیا کہ زندہ ہیں نادیہ۔ اور پھر خاموشی۔

میں نے چھٹی لی اور تہران آگیا۔ ضرابخانہ چوک پر سخت حادثے کا شکار ایک گاڑی عبرت کا سامان بنی پڑی تھی۔ اگرچہ گاڑی چکنا چور ہوچکی تھی، اس کے باوجود میں نے پہچان لی، یہ میری بیوی کی "پیجو" تھی۔ یقیناً اب تک میری بیوی مر چکی ہوگی، ہاں جس کی گاڑی اس طرح سے ریزہ ریزہ ہوچکی ہو، بے شک اس کے جسم کا کوئی عضو بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔ میں نے ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا یہ گاڑی کب سے اس حالت میں یہاں پڑی ہے۔ اس نے کہا ایک مہینہ ہونے والا ہے۔ میں نے پوچھا کچھ پتہ ہے اور اس کے چلانے والے پر کیا گزری؟ اُسے علم نہیں تھا۔

گھر پہنچتے پہنچتے میں آدھا بوڑھا ہوگیا۔ دروازے کھٹکھٹایا بیگم نے دروازہ کھولا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور کالی جالی بھی سر پر ڈال رکھی تھی میں نے پوچھا کون مر گیا ہے؟ والدہ بچے؟ کہا ڈرو نہیں کوئی نہیں مرا ہے۔ میں نے پوچھا پھر سیاہ لباس کیوں پہنا ہے۔

بڑی بے نیازی سے کہا "ایک خوفناک حادثہ کیا ہے چھوٹی سڑک سے بڑی سڑک پر آرہی تھی، ایک کرنل صاحب کو ٹکر جاماری۔" آواز اس کی اپنی ہی تھی، کسی اور کا انداز اختیار نہیں کر رہی تھی، نہ ریڈیو تہران کی اناؤنسرز کا اور نہ ڈب شدہ فلموں کی اداکاراؤں کا۔

میں نے کہا "اس صورت میں مجھے سمجھ نہیں آئی کہ تم نے ماتمی لباس کیوں پہنا ہے۔"

اُس نے بتایا: "ایک مہینے سے کرنل صاحب ہسپتال میں پڑے ہیں بیچارے سر سے پاؤں تک پٹیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میں ہر روز فوجی ہسپتال جاتی ہوں تاکہ معافی نامہ حاصل کرلوں۔ حال ہی میں ڈاکٹروں نے اُن کی ایک آنکھ سے پٹی اُتاری ہے۔ ابھی ابھی ہسپتال سے آرہی ہوں۔ کرنل صاحب سے کہا ہے کہ میں بیوہ عورت ہوں اور میرا شوہر حال ہی میں فوت ہوا ہے، اسی وجہ سے کالا لباس پہنا ہے اور سیاہ جالی ڈالی ہوئی ہے تاکہ اُس کو مجھ پر رحم آجائے اور معافی نامہ دے دے۔ وگرنہ خدا جانتا ہے کتنی ہزار تومان نقصان کے ادا کرنے پڑیں گے۔ ہم کمرے میں گئے۔ میں نے پوچھا "بچے کہاں ہیں"

اُس نے کہا: "صدیقہ خانم کے گھر" اور سچ کہتی تھی، گئی اور انہیں لے آئی اگلے روز صبح پھر بیگم صاحبہ نے کالا لباس پہنا اور کالی جالی سر پر ڈالی، بچوں کو بھی کالے کپڑے پہنائے اور کرنل صاحب کی طرف فوجی ہسپتال چلی گئی۔ بچوں کو سمجھا دیا کہ جونہی اُن کی نظریں کرنل صاحب پر پڑیں وہ رونا پیٹنا شروع کردیں لیکن کسی صورت میں بھی کوئی بات منہ سے نہ نکالیں۔

میری چھٹی ختم ہورہی تھی اور جیسا کہ بیگم صاحبہ بتاتی تھی کرنل صاحب کی حالت بھی سنبھل رہی تھی اور ڈاکٹروں نے اب اُس کی دونوں آنکھوں سے پٹیاں اُتار دی تھیں، وہ بیت الخلا بھی خود چل کر گئے تھے اور بیگم بہت ہی خوش تھی۔

چھٹی کی آخری رات تھی، میں نے تیسرے بچے کے موضوع کو پھر سے چھیڑنا چاہا کہ بیگم صاحبہ بھڑک اُٹھیں اور کہا

"میری بات غور سے سنو، ایک مسئلہ جناب کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں" میرا دل دہل گیا۔ واقعتاً مجھ سے ایک اور گاڑی نہیں خریدی جاسکتی تھی۔ اُس نے کہا "میری جان تم جانتے ہو میں ازدواجی زندگی کی بقا اور دوام کے خلاف ہوں۔ شادی بورژوا طبقے کے لوگوں کے چونچلوں میں سے ہے۔" یہ الفاظ میری بیوی کے نہ تھے، کرنل صاحب کے بھی نہیں ہوسکتے تھے، صدیقہ خانم کے بھی بالکل نہیں تھے۔ کسی ایسے آدمی کے تھے، جسے اخراجات اقساط، پسماندہ اقوام، ٹیکسی، چمک دمک، افسروں کی شان و شوکت اور خواتین کی پسند و ناپسند کے بارے میں علم تھا، میں نے ہمت کی اور کہا۔

"مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہو۔"

وہ مسکرائی اور کہا: "ہاں، خوب سمجھے ہو اور تم جانتے ہو کہ بالآخر مجھے طلاق دے دو گے، پس اپنی عزت خراب نہ کرو اور جلد ہی یہ کام کر ڈالو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "تم اُس آدمی کی بیوی بننا چاہتی ہو جس نے بورژوا طبقے کی باتیں کیں....."؟

اُس نے کہا: "نہیں، وہ شادی اور اس قسم کے بکھیڑوں میں پڑنے والا نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا: "بڑے عرصے سے اُسے جانتی ہو؟" ساتھ ہی میرا خون بھی کھول رہا تھا۔

اُس نے کہا: "نہیں، صرف چند بار صدیقہ خانم کے ہاں ملاقات ہوئی۔" میں نے پوچھا: "پھر طلاق کس لیے لینا چاہتی ہو؟ میرا کوئی ہرج نہیں مگر بچے اُجڑ جائیں گے"

اُس نے کہا: "یہ میرا مسئلہ ہے۔"

ہم میں خاصا جھگڑا ہوا، اور دسترخوان پر میں نے بیوی کی خوب پٹائی کی، بچے بیچارے بالکل دو یتیموں کی طرح روتے رہے۔ اس قدر اصرار کیا اور لکھتی رہی کہ میں اپنا کام چھوڑ چھاڑ تہران آگیا اور اُسے طلاق دے دی۔

تین مہینے گیارہ دن بعد میری بیوی نے سفید لباس اور سفید جالی کے ساتھ کرنل صاحب سے شادی کر لی۔ بچے میری والدہ کے پلے پڑے۔ میں رہ گیا، میرا خشک دماغ اور بینک کی اقساط،

کرنل صاحب نے بھی نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کیا۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

اشراف عرب

سیّد نجم الحسن
صفحات ۷۲۰ قیمت =/۱۵۰ روپے
جاجیسنری اکیڈمی، ۱۰۸ای، جہانگیر روڈ غربی، کراچی ۷۴۸۰۰

زیر تبصرہ کتاب فی الحقیقت معلومات کا خزانہ ہے۔ مگر جب اس میں اولاد نوشیرواں عادل، اولاد امیر تیمور، قائم خانی راجپوت پٹھان یا فاتحان، جمشید، نریمان، سام، زال، رستم، سُہراب، بخت نصر وغیرہ کے تذکرے دیکھتے ہیں تو کتاب کا نام "اشراف عرب" کچھ بے میل سا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شروع میں جو کتابیات بعنوان "فہرست کتب جن سے استفادہ کیا گیا" دی گئی ہے اُس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مواد کی فراہمی میں کس قدر تلاش و کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ اتنی تعداد میں رجال اور مشاہیر کو مع اُن کے مختصر حالات یکجا کر دینا اور اُن کے شجروں کو ترتیب دے کر شامل کتاب کر دینا یقیناً مؤلف موصوف کی محنت و عرق ریزی پر دلالت کرتا ہے۔ لائق مؤلف اپنی اس سعی و کوشش کے لیے قابل تحسین ہیں۔ لیکن اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ کام جتنا بڑا ہے اُسی کی نسبت سے اس میں تسامحات اور اغلاط بھی وافر مقدار میں دکھائی دیتی ہیں۔ اُن سب کی نشاندہی تو اس مختصر تبصرہ میں ممکن نہیں البتہ نمونہ کے لیے چند پیش ہیں۔

صفحہ ۹۹ پر قاضی محب اللہ بہاری کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "اُن کو شاہ عالم (اوّل) کے عہد میں ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا ہوا اور فاضل خاں کا خطاب ملا۔" اور اُس کے فوراً بعد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ "(اُن کا) ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں انتقال ہوا۔" کیا اس بیان سے قاری یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہیں ہوگا کہ قاضی القضاۃ کا منصب اور فاضل خاں کا خطاب، علامہ محب اللہ بہاری کو اُن کے انتقال کے پانچ سال بعد ملا۔

صفحہ ۵۵۹ پر امیر تیمور کا جو شجرہ نسب دیا گیا ہے اس میں سلطان ابو سعید کا باپ میراں شاہ کو بتایا گیا ہے جب کہ تزک بابری یا بابر نامہ میں ابو سعید کے باپ کا نام سلطان محمد مرزا اور دادا کا نام میراں شاہ درج ہے۔

صفحہ ۵۵۸ پر بہادر شاہ ظفر کے حالات لکھتے وقت پہلی سطر میں تحریر کیا گیا ہے کہ "شاہ عالم کی وفات کے بعد ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی مسند نشین ہوا۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر یہ لکھ دیا گیا ہے کہ شاہ عالم کی وفات ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء میں ہوئی.... معلوم ہوتا ہے کہ بے خیالی میں اکبر شاہ ثانی کی جگہ شاہ عالم لکھا گیا۔

زابلستان کے پہلوانوں سہراب اور رستم کے شجرہ کو روایتی تاریخ ایران کے پیش ادیان خاندان کے فرمانرواؤں کیومرث، سیاک، ہوشنگ، جمشید کے شجرہ سے ملا دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۶۶)

اگرچہ مؤلف موصوف نے عرضِ حال میں یہ لکھ کر اپنا دامن بچالیا ہے کہ "شجروں کا مرتّب کرنا ایک نہایت کٹھن کام ہے اس لیے کہ اس میں پشت در پشت کڑیاں ملانی پڑتی ہیں جو، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس قسم کے موضوعات میں ازراہِ بشریت سہو کا امکان ہے۔" لیکن جس نوع کے سہو کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اس اعتذار کی روشنی میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایک بات جو اصول موضوعہ کے طور پر مان کی گئی ہے اور ہمارے مورخین اُس کو تواتر سے بیان کرتے چلے آ رہے ہیں وہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کثرتِ ازدواج کی روایت ہے۔ کتاب زیر تبصرہ میں بھی یہی تحریر ہے کہ آپ نے نوے عقد کیے جب کہ آپ کی عمر صرف ۴۶۔ ۴۷ سال بتائی گئی ہے (ولادت ۳ھ، وفات ۴۹ھ یا ۵۰ھ) بلوغت کا سن ۱۷، ۱۸ سال سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ کی کل عمر میں سے ۱۷، ۱۸ سال نکال دیے جائیں تو شادیاں کرنے کی مدت ۳۰، ۳۱ سال رہ جاتی۔ کیا اتنی کم مدّت میں نوے شادیاں کرنا غلو کی حد سے بھی بڑھ کر کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ یقیناً روایت اُن کوفیوں کی گھڑی ہوئی ہے جنھوں نے اس مقدس ہستی کو "مُذل المومنین" کہہ کر اعمال نامہ سیاہ کیا تھا طبیعت اس بات کو کسی طرح گوارا نہیں کرتی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسے اور صحابی، شادیاں کرنے اور طلاقیں دینے ہی کو اپنا نصب العین حیات بنالیں۔

بہرحال اس طرح کی باتیں پرانے مصنفین کی روایت پرستی کی بنیاد پر شہرت پا گئی ہیں۔ اس لیے مؤلف کتاب ہذا بھی اس سے اپنا دامن نہ بچاسکے۔ مجموعی طور پر اُن کی کوشش داد و ستائش کی مستحق ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر ان غلطیوں کا ازالہ کر دیا گیا تو یہ کتاب اردو ادب میں گرانقدر اضافہ سمجھی جائے گی۔

(ثناء الحق صدیقی)

تعلیم مقاصد و مسائل

حکیم محمد سعید

صفحات ۸۸ قیمت مجلّد = /۳۰ روپے پیپر بیک = /۲۰ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

"تعلیم، مقاصد و مسائل" حکیم محمد سعید صاحب کی کتاب ہے جو حال ہی میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام نہایت جاذبِ نظر و دلکش انداز میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہے اس کتاب میں حکیم صاحب کی تقاریر سمیت ۲۴ مقالات ہیں۔ حکیم صاحب نے تعلیم کی ضرورت، اس کے مقاصد کی اسلامی و سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگی اور مسائل و مباحث پر نہایت واضح اور آسان الفاظ میں اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی بحث کے ہر پہلو میں قرآن واحادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ مدلل و مؤثر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تعلیمی بحران کا بنیادی سبب ناقص نظام تعلیم ہے۔ فاضل مصنّف نے اپنی تحریروں میں جہاں تعلیم کے اہم مقاصد بیان کیے ہیں وہاں ان کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے حل کی نشاندہی بھی کی ہے اور اس کتاب کے تقریظ نگار جناب مسعود احمد برکاتی کے الفاظ میں "قومی مقاصد سے تعلیمی نظام کی عدم مطابقت اور تربیت کی اہمیت کو نظرانداز کرنے کے نقصانات کا بیان بھی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دینی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے حصول کو بھی ایک متوازن نظام میں سمویا جاسکتا ہے یہ کتاب اسی فکر اور جذبے کی ہم آہنگی کی مظہر ہے۔"

حکیم صاحب کی زبان صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ ان کا اسلوب دلپذیر و دلنشین ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی ذہنوں کو بالیدگی و تازگی بخشتی ہے۔ تحریر و تقریر میں اس قدر روانی و برجستگی ہے کہ قارئین کے لیے فکر و نظر کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تعلیمی و تحقیقی اداروں کے کتب خانوں میں اس کتاب کی موجودگی تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے استفادہ کا سبب بن سکتی ہے۔ تعلیم' مقاصد و مسائل جیسی معلوماتی اور کارآمد کتاب کی تصنیف پر ہم محترم حکیم محمد سعید صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر فاراشدی)

کس سے کہے وہ

وقار بن الٰہی
صفحات ۲۸۰ قیمت =/۹۰ روپے
۴۳۔ ماڈل ٹاؤن، کہوٹہ روڈ اسلام آباد

ایک عرصے سے وقار بن الٰہی بغیر جزا و سزا کے افسانے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اُن کے افسانے سر سے گزر جاتے ہیں۔ افسانے کی دنیا میں وہ نیک نام ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو چونکاتے ہیں۔ اُن کے اندر ہمدردی کے چراغ روشن کرتے ہیں اور کہانی بیان کرنے کا مخصوص انداز آغاز ہی سے قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایک بات اور ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ دور از کار باتیں کی گئی ہیں، یا ان کے موضوعات مکسوب، آوردہ یا مصنوعی ہیں۔ جہاں تک وقار بن الٰہی کے طرز بیان کا تعلق ہے وہ عرف عام میں بیانیہ کی تعریف میں آتا ہے اور پیشکش کے اعتبار سے اپنے بزرگ افسانہ نگاروں کے نقش قدم پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

میں اب تک چند افسانے ہی پڑھ سکا ہوں، "انتظار"، "اپنا گھر اپنی آگ"، "کس سے کہے وہ"، "اکیلا" اور "پاگل مودی"، وغیرہ اوّل الذکر تینوں افسانے بالخصوص "اپنا گھر اپنی آگ" اور "کس سے کہے وہ" بڑی بے رحم حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتے ہیں، ان افسانوں میں انسان اپنی گراوٹ کے آخری سرے پر کھڑا ہے اور انسانی رشتہ لہو لہان نظر آتا ہے مثلاً "اپنا گھر اپنی آگ" میں ایک باپ اپنے بیٹے دیقے کا گھر بساتا ہے تاکہ دیقے کی ماں کے مرنے سے گھر میں جو بے رونقی آئی ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ خلوتِ عروسی کو حیلے بہانے سے بیٹے کی جگہ خود آباد کر لیتا ہے اور بیٹے کے مقدر میں پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرنا لکھا جاتا ہے۔

کہانی "کس سے کہے وہ" کی ہیروئن بھی اس قسم کے المیے سے دوچار ہوئی جو "اپنا گھر اپنی آگ" کے دیقے کی نوبیاہتا کے سر ہو گیا اور تب سے اب تک وہ گو ہم مشکل و گر نہ گو ہم مشکل کے مرحلے میں ہے اور کتنے آغوش اور ٹھکانے بدل چکی ہے، آخری ٹھکانہ ایک پولیس انسپکٹر ہے' وہ جہاں جاتا ہے اس عورت کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ نان و نفقہ کا خاص خیال رکھتا ہے۔ لیکن اُسے نکاح میں لے آنے کے لیے تیار نہیں۔ کس مپرسی اور بہ حالت مجبوری استحصال کا یہ نیا طریقہ اُسے راس آگیا ہے۔

کہانی "اکیلا" یکسر مختلف فضا رکھتی ہے۔ یہ کیرکٹر اسٹڈی کی ایک اچھی مثال ہے۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے قاری اس کے ایک کردار داؤد کے بارے میں مزید جاننے کے لیے بے چین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کہانی داؤد کے لیے احباب کی نفرت سے شروع

ہوتی ہے۔ احباب اس کے ناپسندیدہ اور غلیظ حلیے بشرے پر لعنت ملامت کرتے ہیں، اپنے درمیان اُسے دیکھ کر پریشان بھی ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے چند اک اس کے لیے اپنے اندر نرم گوشے بھی رکھتے ہیں، اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو انسان بہ ظاہر قابل نفرت نظر آتا ہے۔ وہ اندر سے کس قدر ایثار پیشہ اور محبت بھرا ہوتا ہے کہانی کے آخر میں داؤد اسی بات کی درخشندہ مثال بن کر اُبھرتا ہے اور اس کے احباب اس کے اُجلے پن کے سامنے سیاہی کا بے تکا ڈھیر معلوم ہوتے ہیں۔ داؤد کے کردار کو پڑھتے ہوئے شاعر صدیقی کا بار بار خیال آیا ہے۔

"پاگل مودی" کی کہانی ایک بچے کے گرد گھومتی ہے۔ بچہ نئے شادی شدہ بھائی اور بھابھی کی انکھوں کا تارا ہے، بھائی اپنی بے بضاعتی کے باوجود ننھے بھائی کی اس خواہش کے لیے کہ اُسے ایک سائیکل چاہیے ہر مہینے بیس روپے جمع کرتا جاتا ہے اور پانچ مہینے بعد جب اس کے پاس سائیکل خریدنے کے لیے سو روپے کی رقم جمع ہو جاتی ہے تو بچہ پر انکشاف ہوتا ہے کہ روپے چوری ہو گئے ہیں دراصل بچے کی خواہش پر بچے کی نئی نویلی بھابھی کی خواہش غالب آجاتی ہے۔ اس کا بھائی اسی روپیہ سے سائیکل کے بجائے بیوی کا گرم کوٹ لے آتا ہے۔

تبصرے میں اختصار کا خیال پیش نظر رکھتے ہوئے بھی یہ قدرے پھیل ہی گیا ہے۔ سرِدست اس میں مزید گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ وقار بن الٰہیٰ کے ہاں بے زبان مخلوق یعنی عورت کے لیے دردمندی کا جو رویہ اوّل الذکر تینوں افسانوں میں ملتا ہے، وہ دردمندی منٹو کے افسانوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے اس دردمندی کو کسی اور عنوان سے راجندر سنگھ بیدی اور "رئیس خانہ" کے مصنف احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وقار بن الٰہیٰ کا اپنا ایک اسٹائل ہے جو بنتے بنتے بنا ہے، جس میں ریاضت و ذہانت دونوں کا دخل ہے۔

(ا۔ س)

لہو لہو ہے کربلا

محبت خان بنگش

صفحات ۹۶ قیمت = /۵۰ روپے

ادارۂ علم و ادب اُردو منزل، بہزادی چکر کوٹ کوہاٹ

"محبت خان بنگش" ادب کے مراکز سے دور کوہاٹ کے گوشۂ عافیت میں بیٹھے لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول اور اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اور ہر سال اپنی تازہ تصنیف سے ذخیرہ ادب میں اضافہ کرتے رہتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔

"لہو لہو کربلا" سے پہلے محبت خان بنگش صاحب کا ایک نعتیہ مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ "زیر بحث کتاب" مرثیے کی صنف سے تعلق رکھتی ہے اور امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام کے حضور ایک نذرانہ عقیدت کا درجہ رکھتی ہے۔ ظاہر ہے اس میں شامل کلام کا تعلق دلی جذبات و کیفیات سے ہے اور واقعہ کربلا کی روکشی کرتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد سے آج تک اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ شمار مشکل اور ابدالاباد تک یہ سلسلہ اسی شد و مد سے جاری رہے گا۔ آسمان مرثیہ پر میر انیس و مرزا دبیر سے لے کر محبت خاں بنگش تک بے شمار بڑے چھوٹے ستارے درخشندہ ہیں۔ جذبۂ احترام و عقیدت کے دربار میں سب کی قدر و قیمت ایک سی ہے۔ قدیم و جدید مرائی نگاروں کو جو ایک دوسرے سے مختلف کرتا

ہے۔ وہ زمانی بعد اور طرز احساس ہے انھیں معنوں میں "لہو لہو ہے کربلا" تازہ تصنیف کہے جانے کی مستحق ہے۔ عقیدت کے باب میں ایک چراغ اور روشن ہوا ہے۔

(ا۔ س)

کاوشیں

ڈاکٹر یونس حسنی

صفحات ۱۴۳ قیمت = /۴۵ روپے

رباب پبلی کیشنز دہلی کالونی نمبر ۲ کراچی

"کاوشیں" ڈاکٹر یونس حسنی کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کتاب میں پندرہ مضامین شامل ہیں۔ سب کے سب تنقیدی نوعیت کے ہیں، لیکن چونکہ حسنی صاحب کا بنیادی مزاج محققانہ ہے اس لیے کوئی تنقید، تحقیق سے خالی نہیں۔ اس چھتنار کے سائے میں چلتی ہے ۔ باتیں سند کے ساتھ کہی گئی ہیں۔

پہلا مضمون "اردو اصناف سخن کا تقابلی مطالعہ" ایک اچھا مطالعہ ہے، اس میں شعری اصناف ادب، غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور رباعی کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھا گیا ہے اور اس سے جو نتیجہ مضمون نگار نے اخذ کیا ہے وہ یہ کہ "یہ اصناف سخن ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے پر اپنی خصوصیات کا سایہ ڈالتی نظر آتی ہیں۔"

اس کے علاوہ اس کتاب میں جن اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے وہ "داستان کا فن"، "سوانح نگاری فنی اعتبار سے"، "خاکہ نگاری کا فن" اور چند ہمعصر، "گلزار نسیم ایک مطالعہ"، "سودا کی قصیدہ نگاری"، "زبان اور اُس کی ماہیت"، مہدی الافادی کی نثر"، حالی اور یادگار غالب"، "میر امن اور امیر خسرو"، "سراج میر خاں سحر بھوپالی"، "مجاز لکھنوی"، "بسمل سعیدی"، "اختر شیرانی کی نثر نگاری اور اختر شیرانی اور سانیٹ" یہ سارے موضوعات ایسے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ایجاز و اختصار کے ساتھ کچھ ان کہی کو کہہ دینے کا ہنر ملتا ہے۔

اس ذکر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ "کاوشیں" میں شامل بیشتر مضامین "قومی زبان" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
توقع ہے کہ ڈاکٹر یونس حسنی کی یہ کاوشیں ادبی حلقے میں پذیرائی حاصل کریں گی۔

(ا۔ س)

اندھیرے کے جگنو

شمس آغا

صفحات ۲۰۸ قیمت = /۱۰۰ روپے

جنگ پبلیشرز، ۱۳ سر آغا خاں روڈ لاہور

"اندھیرے کے جگنو" شمس آغا کی اول و آخر تصنیف ہے۔ وہ ۱۹۴۴ء میں اپنا پہلا افسانہ "خواب" لے کر منظر عام پر آئے اپنی انفرادیت قائم و مستحکم کی اور ۱۹۴۵ء میں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے گویا کرمک شب تاب کی طرح پل بھر کو چمکے اور غائب ہو گئے۔

شمس آغا کے متعلق، کتاب مذکور کے دیباچے میں مولانا صلاح الدّین نے جتنا کچھ لکھ دیا ہے اگر کوئی اور لکھنا چاہے تو اس دائرہ اثر سے نکلنا محال ہوگا۔ بہر حال اپنی سی کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔

"خواب" شمس آغا کی کہانی ہے جو اُن کی شہرت کا سنگ میل ثابت ہوئی یہ کہانی بچپن کی معصوم خواہشات، کھیل اور دھما چوکڑی سے شروع ہو کر اپنے قارئین کو اس کھیل میں شریک کرتی ہوئی اُس منزل تک لے جاتی ہے جہاں باجی فہمیدہ اور جاوید کھڑے کسی نادیدہ بہار کی دھمک اپنے اندر محسوس کر رہے ہیں۔ پھر یہ کہانی دبے پاؤں بابا مالی کی طرف مڑ جاتی ہے، اور جاوید پر نہایت سادگی سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ بابا مالی نے پے بہ پے تین بیویاں اپنے گھر میں بٹھائیں، دوسری بیوی پہلی کے مرجانے کے بعد، تیسری بیوی دوسری کے مالی کے بھتیجے کے ساتھ فرار ہو جانے پر.... ! اور تیسری کو بابا مالی نے خود تین دنوں بعد ایک جاٹ کے ہاتھ جتنے میں خریدا اُسی قیمت پر بیچ دیا۔ اس خرید و فروخت میں بابا مالی کو سات روپے کا خسارہ اس لیے برداشت کرنا پڑا کہ تیسری بیوی تین دنوں کے اندر سات روپے کی افیم کھا گئی۔

دیکھیے اس کہانی میں غیر محسوس طور پر کس طرح غم جاناں کے پہلو بہ پہلو غم دوراں ہے، اور جب کہانی کا ہیرو جاوید دونوں جگہ سے مایوس لوٹتا ہے تو ردِّ عمل میں اس کے سامنے تیسری سمت کا باب وا ہو جاتا ہے ——————
BEING AND NOTHINGNESS کا باب جہاں سوال در سوال کی یورش ہے! غالب ایسے ہی ماحول سے گھبرا کر بول اٹھا تھا

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے .... وغیرہ

اس کہانی میں "خواب" کا فائدہ اٹھا کر اس کی ساخت کو غیر مربوط —— رکھا گیا ہے چنانچہ "خواب" کی فضا کچھ ایسی ہی بے ترتیبی سے مرتّب نظر آتی ہے۔ ایک "خواب" پر ہی کیا موقوف شمس آغا کی کہانی "شکست" اور دوسری کہانیوں کو غور سے دیکھیں تو غم جاناں اور غم دوراں ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں زمانے نے جو محرومیاں شمس آغا کی جھولی میں ڈالیں ان کا اظہار از خود کہانیوں میں ہوتا رہتا ہے۔

شمس آغا کی کہانیوں کا مجموعہ "اندھیرے کے جگنو" پہلی بار جنوری ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا دوسری بار جنوری ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا پہلے ایڈیشن میں تعارف کے طور پر "شمس آغا کی یاد میں" مولانا صلاح الدّین نے اور "ٹوٹا ہوا تارہ" ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا تھا۔ کتاب کے نئے ایڈیشن میں اول الذکر شامل ہے لیکن آخر الذکر شامل نہیں۔ اس کی کمی شدت سے محسوس ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون شمس آغا کی ذات کے حوالے سے ہے شمس آغا کا فن سرتاسر اُس کی ذات ہے اور شمس آغا کی ذات کی پر اسراریت اسی مضمون سے کُھلتی ہے۔

ایک فرق اور ہے پرانے اور نئے ایڈیشن میں نئے ایڈیشن میں شمس آغا کی کئی کہانیوں کا اضافہ ہوا ہے آخر میں عرض یہ ہے کہ شمس آغا قتیل غم جاناں اور غم دوراں تھے۔ اس حقیقت کا ادراک ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون سے ہوتا ہے جو "اندھیرے کے جگنو" کے پہلے ایڈیشن میں شامل ہے۔ کتاب کا سرورق معنی خیز اور کتاب کی اشاعت دیدہ زیب ہے اور ذاتی لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔

(ا۔س)

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

کلیاتِ مکاتیبِ اقبال مرتبہ سیّد مظفر برنی

سیّد مظفر حسین برنی ۱۹۸۹ء کے اوائل میں بھارت سے مکاتیبِ اقبال کی کلیات چار جلدوں میں چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اس کی پہلی جلد جو دسمبر ۱۹۱۸ء تک کے خطوط پر مشتمل ہے چھپ کر سامنے آگئی تو بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں خوشی کا بے پایاں اظہار کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ برنی صاحب نے اقبال کے خطوط کو زمانی اعتبار سے مرتّب کر دیا تھا اور بہت سے خطوط کا متن جو تھا وہ اقبال کے اپنے قلم سے لکھا ہوا تھا۔ اس سے خطوط کی صحت سامنے آئی۔ دوسرے جو اغلاط مکاتیب کے مختلف مجموعوں میں کاتب مرتب اور کتابت خوان کی سہو نظر سے راہ پا گئی تھیں وہ رفع ہو گئیں۔ لیکن دوسری وجہ نسبتاً زیادہ اہم تھی اور وہ یہ کہ خطوط کے ساتھ ضروری تعلیقات بھی پیش کی گئی تھیں اور ان کے حواشی بھی درج کر دیے گئے تھے اور یہ اتنا دشوار کام تھا جسے تکمیل تک پہنچانا کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر مختار الدّین احمد نے فرمایا کہ "ایسے کام کو انجام تک پہنچانا.... جب تک توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہو بہت دشوار ہے۔" پاکستان کے ایک ممتاز اقبال شناس ڈاکٹر صابر کلوروی نے انھیں "متنِ اقبال" کی صحت کے حوالے سے داد دی اور لکھا کہ برنی صاحب کا کام گیان چند کے کام سے بدرجہا بہتر اور معیاری ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت نے اس کام کی ستائش کی کہ اس سے علامہ اقبال کا بکھرا ہوا علمی اثاثہ مرتب صورت میں سامنے آگیا تھا۔ ایک اور صاحب نے اس کام سے بھارت کی اقبال شناسی اور اقبال دوستی کا زاویہ تلاش کیا۔ اقبال کے شائقین نے اس قیمتی مجموعے کی قدر کی اور برنی صاحب کی گراں قدر خدمت کو دل کھول کر سراہا۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ مبدءِ فیاض انھیں توفیق دے کہ تین مجوزہ جلدیں بہ تعجیل چھپ جائیں، اہلِ ادب ان سے استفادہ کریں اور اس دن تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا جب قلند آباد میں ڈاکٹر کلوروی نے مجھے بتایا کہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کی دوسری جلد چھپ گئی اور وہ اسے دہلی سے اپنے ساتھ لائے ہیں میں نے ان کے کتب خانے میں بیٹھ کر اس کتاب کی زیارت کی۔

کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کی دوسری جلد جنوری ۱۹۱۹ء سے لے کر دسمبر ۱۹۲۸ء تک کے خطوط پر مشتمل ہے۔ اس دور میں علامہ اقبال نے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے موضوع پر اپنے یادگارِ زمانہ خطبات لکھے تھے اور ان خطبات کی تکمیل اور موضوعات کی توضیح و تشریح کے لیے وہ نہ صرف متعدد علما اور فضلائے ہند سے مراسلت کرتے تھے بلکہ مواد کی فراہمی اور کتابوں کی تلاش میں بھی

سرگرداں رہتے تھے۔ چنانچہ "خطوطِ اقبال" کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے علامہ اقبال کی علمی لگن اور فکر و نظر کے زاویوں کی تالیف و ترتیب کا منظر بھی سامنے آتا ہے اور یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ علامہ اپنی علمی اور فکری گتھیاں سلجھانے میں کتنی محنت کرتے اور کس قدر سرگرداں رہتے تھے۔ مثال کے طور پر سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ "زمان خدا ہے" بخاری میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے۔ "لا تسبوالدہر الخ...." کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملے گی؟

قرونِ وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے میمون قرطبہ میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں رہا غالباً بارہویں صدی کے آخر میں اس نے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور تمام عمر مسلمانوں ہی کی ملازمت کرتا رہا۔ متکلمین کے خیالات پر اس نے جرح قدح بھی خوب کی ہے۔ میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے۔ اگر آپ کے علم میں یہ بات ہو تو مہربانی کر کے مطلع فرمائیے میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں، جس کا عنوان یہ ہے:

"زمان کی حقیقت فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں"

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا اور اس خط کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد ملے گا۔"

اس کے بعد ایک اور خط میں "زمان" ہی کے سلسلے میں استفسار کو آگے بڑھاتے ہیں اور مولانا سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"نوازش نامہ مل گیا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ ایک زحمت دیتا ہوں، معاف فرمائیے گا۔ "مباحثِ شرقیہ" لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ "زمان" کے متعلق امام رازیؒ کے خیالات کا خلاصہ قلم بند کر کے مجھے ارسال فرما دیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا۔ صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہو گا۔

کتابوں کی تلاش کے سلسلے ہی میں عبداللہ چغتائی کو لکھتے ہیں:

"ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی (DIVINE COMEDY) کالج لائبریری سے لے کر ایک دو روز کے لیے بھجوائیے۔ پرگٹیری (PURGATORY) اور "دوزخ" (HELL) کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کتاب کے خطوط پڑھ کر ہمارے سامنے وہ اقبال آتا ہے جسے "رحمتہ اللہ علیہ" کی کھونٹی میں لٹکانے کے بجائے ایک انسان کے طور پر قبول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ مکاتیب سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال اپنی جملہ خوبیوں اور خامیوں کے باوجود ایک صاحبِ کردار انسان تھے۔ اور اعترافِ حقیقت کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ۱۹۲۳ء کے سالِ نو پر حکومت کی

طرف سے "نائٹ ہڈ" (سر) کا خطاب ہے۔ اس کی عطائیگی پر اقبال کو سیکڑوں خطوط اور تار آئے لیکن یہ مرد درویش حیران تھا کہ لوگ اس خطاب کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ اقبال کی آزادیِ اظہار، جرأت افکار اور حرّیتِ نظر اب پہلے جیسی نہیں رہے گی اقبال نے میر سیّد غلام بھیک نیرنگ کو ایک خط لکھا:

"میں آپ کو اس اعزاز کی اطلاع خود دیتا۔ مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں ہر قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں، سیکڑوں خطوط اور تار آئے اور آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ اس قسم کی چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔

باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاالله

اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں۔ لیکن اس کا دل مومن ہے۔

واضح رہے کہ اقبال اپنی شاعری کی کتابوں میں فکرِ عظیم کو فنِ لطیف میں ڈھالنے والے شاعر نظر آتے ہیں، اپنے خطبات میں وہ مفکّر اور دانشور اور مجتہد کے طور پر روشناس ہوتے ہیں، اپنے شذرات میں وہ انسانی فطرت اور قدرتی مناظر کے عبادت گزار ہیں۔ لیکن خطوط میں اقبال اپنے اصلی رنگ اور حقیقی روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، ان میں اقبال کی شعری جگر کاوی بھی سامنے آتی ہے اور تحقیق کے لیے ژرفِ پژوہی بھی لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خطوط میں اقبال ایک انسان کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں ۴۳۱ خطوط شامل ہیں، ۱۱۲ خطوط کے عکس دیے گئے ہیں، ۲۳ انگریزی خطوط کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ ایک خط بنام شمس العلما حکیم خواجہ شمس الدّین غیر مطبوعہ ہے۔ سوانحی خاکوں کے لیے متعدد ماخذات پر انحصار کر کے مستند مواد فراہم کیا گیا ہے۔ شخصی تاثرات کے علی الرغم یہ مکتوبات اس دور کی ہنگامہ خیز تاریخ کے ماخذ بھی ہیں اور اقبال ان میں ایک سچے مسلمان اور اپنے نظریے کے مضبوط داعی نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کاش! مکتوبات کے اس قسم کے کلیات دوسرے عظیم لوگوں مثلاً شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحق، الطاف حسین حالی کے بھی چھاپ دیے جائیں۔ یہ قیمتی کتاب اردو اکادمی دہلی کی پیشکش ہے۔

اقبال کا ذہنی و فنّی ارتقا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی

ڈاکٹر عبدالمغنی کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ وہ بھارت میں دفاعِ اقبال کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، بہت عرصہ قبل کلیم الدّین احمد نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اقبال پر نظر ڈالی تو انھیں ایک بے حد معمولی شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کلیم الدّین احمد کی تنقیدی جانبداری مغنی صاحب کو کھٹکی تو انھوں نے کلیم الدّین احمد کے اعتراضات کا جواب لکھنا شروع کیا جو بڑھتے بڑھتے کتاب کی صورت اختیار کر گیا اور پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی انھوں نے ۱۹۸۴ء میں ایک کتاب "اقبال کا نظامِ فن" پیش کی۔ ۱۹۸۹ء میں "اردو میں اقبال کا نظریہ خودی" اور انگریزی میں "اقبال دی پوئیٹ" شائع کی۔ اب اقبال کی شاعری ان کی تنقید کا ایک خاص موضوع بن چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء میں ان کی کتاب "تنویر اقبال" شہر اقبال لاہور سے شائع ہوئی، زیر نظر کتاب "اقبال کا

ذہنی اور فکری ارتقا" حال ہی میں یہاں پہنچی ہے۔
ڈاکٹر عبدالمغنی نے اقبال کے ذہن و فکر کا ارتقائی جائزہ لینے کے لیے تین ادوار مقرر کیے ہیں لیکن یہ سر عبدالقادر کے معیّن کردہ ادوار سے مختلف ہیں۔ پہلا دور ابتدا سے لے کر ۱۹۲۴ء تک ہے اس وقت "بانگِ درا" شائع ہوئی تھی، دوسرا دور "بالِ جبریل" کی اشاعت (۱۹۳۵ء) تک ہے۔ تیسرا دور ۱۹۳۸ء تک یعنی "ضربِ کلیم" اور "ارمغان حجاز" کی شاعری تک ہے۔
مغنی صاحب نے اس کتاب میں دو باتوں پر زیادہ زور دیا ہے ایک ، یہ کہ اقبال ایک منظم شاعر ہیں اور ان کے فکر کی ہمواری و استواری ان کے فن کی عظمت کا باعث ہے۔ دوسری یہ کہ کلام اقبال میں فکر اور فن ہم آہنگ ہو گئے ہیں تو اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اقبال کا ذہن اپنے فنی ارتقا کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دو نکات پر پوری کتاب لکھنے کا خیال اس لیے آیا کہ ان دنوں بھارت میں تحقیقِ اقبال کے نام پر جو کام ہو رہا ہے اس میں اقبال کے ذہن کو مختلف مراحل پر متضاد خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس کا غلط اثر اقبال کے پیامِ زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ بات بلند آواز میں کہی کہ۔
"اقبال صرف ایک صاحبِ فکر نہیں بلکہ مفکر شاعر تھے اور ان کا ایک باضابطہ فلسفی اور سیاستدان ہونا بلاوجہ نہیں۔"
یہ آخری بات اس لیے اہم ہے کہ بھارت کے اقبال شناس ان کی شعری عظمت کو تو قبول کرتے ہیں لیکن ان کی فکری عظمت سے بالعموم صرفِ نظر کرتے ہیں، ڈاکٹر عبدالمغنی نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ اقبال کے کلام و پیام کی عظمت کا ایک راز اس کا مسلسل و مربوط فکری و فنی ارتقا بھی ہے جو بجائے خود شاعری کی تاریخ میں ایک بے نظیر نمونہ کمال ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن یہ فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے موضوع کو پھولوں کی چھڑی سے چھیڑا ہے اور معانی کے خیابانوں کی خوشبو چہار جانب بکھیر دی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی ہے۔

آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم حنفی

سوانح نگاری یا کسی شخص کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے اس کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی خدمات کی مربوط جائزہ نگاری اردو میں گراں قدر ادبی خدمت شمار ہوتی ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں مصنّف ایک ایسے آئینے کا متبادل ہے جو صرف ممدوح کی صورت اور سیرت دکھانے میں مصروف ہے۔ لیکن "خاکہ" "ایک چیزے دیگر ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، عصمت چغتائی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو اور احمد بشیر کے چند معروف خاکے دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ مصنّف فوٹو گرافر نہیں بلکہ ایکس رے اتارنے والا ماہر آپٹیشن ہے اور وہ خوبیوں پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ اپنے شائستہ انداز اور دلکش سلیقے سے مصنّف کی خامیاں بھی اجاگر کرتا چلا جاتا ہے اور خوبی کی بات یہ کہ وہ جس کا خاکہ لکھ رہا ہے اس سے محبت کا رشتہ دوچند کر رہا ہے۔ اس ضمن میں یہاں مولوی نذیر احمد، دوزخی، میراجی اور ممتاز مفتی جیسے چند عمدہ خاکوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔
زیر نظر خاکوں کی کتاب "آزادی۔ کے بعد دہلی میں اردو "خاکہ" جسے ڈاکٹر شمیم حنفی نے اردو اکادمی دہلی کے لیے مرتّب کیا ہے ایک ایسی کتاب ہے جو زمانی اور مکانی لحاظ سے اس صنفِ سخن کے ایک چھوٹے سے مدار کو منظر عام پر لاتی ہے۔ چنانچہ فاضل مؤلف کو اس وضاحت کی ضرورت پڑ گئی کہ اس کتاب میں ۱۹۴۷ء سے تا حال کی دلّی میں اردو خاکہ نگاری کی روایت کا ایک مختصر تعارف کرایا گیا ہے اور یہ روایت کے ارتقا کی تفصیل نہیں ہے۔ اس وضاحت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اس میں خواجہ حسن نظامی، مالک رام، آغا حیدر حسن، محمد مجیب، فکر تونسوی، خلیل انجم، نثار احمد فاروقی، مجتبیٰ حسین، صالحہ عابد حسین اور متعدد ایسے

ادیبوں کے لکھے ہوئے خاکے شامل کیے گئے ہیں جن کا قلم تہذیب کے معیار کو پہچانتا ہے، اور پھر شخصیات کو بازیافت کرنے میں مصنفین نے خود اپنی اعلیٰ تہذیبی شخصیت کا معیار بھی پیش کر دیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ جب ہم آصف علی، بیگم نیڈو اور راس مسعود کے بارے میں پڑھتے ہیں تو ان شخصیات کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن اور خواجہ غلام السیدین بھی ہر لمحہ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں اور ذہن پر دلّی کا ایک دلکش نقش چھوڑتے جاتے ہیں۔ میں اس دلّی کی تلاش میں دو مرتبہ بھارت گیا۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ چاندنی چوک اور کناٹ پیلس میں میری ملاقات اپنے لاہور ہی سے ہوتی رہی۔ عرصے کے بعد اصلی، سچی اور حقیقی دلّی سے ملاقات آج شمیم حنفی نے کرائی ہے اور ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ کتاب شریف الحسن نقوی کے اہتمام سے دلّی اکادمی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سحر البیان	ڈاکٹر احمد سجّاد	۱۶۰/-
مضامین غلام ربّانی	غلام ربّانی	۱۰۰/-
اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ/ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ و لیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نور الحسن منصور	۸۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدّین ابو الحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۶۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۲۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیر/شان الحق حقّی	۱۲۰/-
جوامع الحکایات ولوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	۱۶۵/-
نوادر الالفاظ	سراج الدّین علی خاں آرزو	۱۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
تنقید عقل محض	امانوئل کانٹ ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین	۱۸۰/-
سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۳۰/-
حرفے چند (حصّہ اوّل)	جمیل الدّین عالی	۱۰۰/-
حرفے چند (حصّہ دوم)	جمیل الدّین عالی	۱۲۵/-
غالب کے خطوط (حصّہ اوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	(زیر طبع)
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/-
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/-
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/-
جدید اردو شاعری (حصّہ اوّل)	عزیز حامد مدنی	۱۲۰/-
جدید اردو شاعری (حصّہ دوم)	عزیز حامد مدنی	(زیر طبع)
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	۸۵/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

گرد و پیش

نوبیل انعام حاصل کرنے والی پہلی سیاہ فام امریکن

جمعرات ۶ اکتوبر کو معلم و مصنف افریقی نژاد امریکن خاتون انٹونی موریسن کو ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔ سوئیڈش اکادمی نے باسٹھ سالہ انٹونی موریسن کو ۸۳۷۰۰۰ ڈالر کی انعامی رقم تفویض کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے اپنے چھ ناول اور بہت سے دوسرے مضامین میں اپنی رزمیہ صلاحیت کا اظہار کیا اور ارد گرد ہوتے ہوئے مکالموں پر کان دھرے رکھا ان سے بے خبر نہیں رہی۔

نیویارک پبلشرز نے انٹونی موریسن کے حوالے سے جو بیان جاری کیا ہے اُس میں وہ کہتی ہے کہ میرے لیے یہ غیر متوقع خوشی نہیں تھی میں نے علی الصبح ہی یہ خبر "پرنسٹن" کے ایک رفیق کار سے سن لی تھی۔ بلاشبہ یہ اعزاز "حق بہ حق دار رسد" کے مصداق ہے۔ لیکن جو شے ذاتی طور پر میرے لیے تعجب خیز ہے وہ یہ کہ آخر کار یہ انعام ایک افریقی نژاد امریکن کے حصے میں آیا اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس خوشی کے دن کو دیکھنے کے لیے میری ماں زندہ ہے۔

موریسن کی یہ کامیابی ایک تعجب خیز واقعہ کی طرح لوگوں کے سامنے آئی۔ اس لیے کہ اکادمی دو سال سے مسلسل اس اعزاز کے لیے اُن لکھنے والوں کو منتخب کر رہی ہے جو "بلیک کلچرل" قدر و قیمت کو اُجاگر کرتے آ رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ کی ناڈائن گورڈیمر (۱۹۹۱ء) اور ویسٹ انڈین شاعر ڈیرک والکوٹ (۱۹۹۲ء) اس کی مثال ہیں۔

اگرچہ نوبیل انعام کے امیدواروں کے نام نہایت خفیہ رکھے جاتے ہیں لیکن سوئیڈش ذرائع ابلاغ نے اس بات کا عندیہ دے دیا تھا کہ اس بار پھر یہ انعام کسی غیر انگریزی اہل قلم کو ملے گا۔

سوئیڈش اکادمی کے سیکریٹری اسٹر الن (STURE ALLEN) نے اکیڈمی کے اسٹاک ہوم آفس سے انٹونی موریسن کی کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "وہ سیاہ فام لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہے، وہ جیسے ہیں بالکل اُسی طرح اُس کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

انٹونی موریسن لورین اسٹیل ٹاؤن کو لے انتھونی وافورڈ میں پیدا ہوئی، جو اوہیو (متحدہ امریکہ) میں واقع ہے۔ وہ اپنے والدین کے چار بچوں میں سے دوسری ہے۔ اُس نے ۱۹۷۰ء میں بحیثیت ایک ناول نگار خود کو متعارف کرایا اور جلد ہی اُس نے اپنی رزمیہ شعری اور اظہاری صلاحیتوں کے سبب لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

پرنسٹن یونیورسٹی پرنسٹن میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرری کے دوران انٹونی کو اُس کی ادبی خدمات پر کئی انعام پہلے بھی مل چکے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں اُس کے ناول "BELOVED" کو پُلٹزر انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

شعری مجموعہ "رباب صحرا" کی رونمائی سعودی عرب میں

۹ ستمبر ۱۹۹۳ء "بزم احبابِ سخن" عرعرشمال، سعودی عربیہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری مجموعہ "رباب صحرا" کی رسم اجرا معروف پاکستانی شاعر "خواجہ رحمت اللہ جری (مقیم عرعر) کے ہاتھوں عمل میں آئی اس پورے منطقہ میں مقیم پاک و ہند کے اردو بولنے والے طبقے نے بہت بڑی تعداد میں بڑے ذوق و شوق سے حصّہ لیا، صدارت کے فرائض شہر عرعر کی معتبر ہستی جناب اشرف علی نے انجام دیے، جہاں نعیم احمد قاسمی نے نظامت کے فرائض خوبصورتی سے نبھائے وہیں خالد پرویز و سراج الدّین قادری نے اس سے متعلق تمام امور بخوبی انجام دیے۔ رحمت اللہ جری اور حافظ محمد یوسف صاحب نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

رحمت اللہ جری، نعیم احمد قاسمی، خلیل الرحمٰن قاسمی، عبدالملک ذاکر وغیرہ نے اپنے اپنے مقالات اس موقع پر پیش کیے۔ اپنے تنقیدی جائزے میں جناب سیّد قمر حیدر قمر (ریاض) نے کہا کہ حنیف ترین کی شاعری انسانی زندگی کی ایکسرے ہے۔ جب کہ کاوش عباس نے حنیف ترین کی شاعری کو دلوں کو شانت کرنے والی جدید تر شاعری قرار دیا۔ (فیکس) جناب امتیاز اعظمی اور مرزا امتیاز بیگ، حنیف ترین کی غزلیں ترنم سے پیش کیں۔ "بزم احباب سخن" کے کارکنان غلام بن شاکر، نعیم احمد قاسمی، ظل الرحمان قاسمی، حافظ محمد یوسف، نذیر احمد قاسمی، غوث محی الدّین، عبدالرزاق، محمد ملک ذاکر اور پیر محمد صاحب نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کی کوششیں کیں شب کے آخری حصّہ میں جناب صدر محترم اشرف علی صاحب نے حاضرینِ بزم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

(رپورٹ نعیم احمد قاسمی "بزم احباب سخن" عرعر سعودی عربیہ)

۱۹۹۳ء کا خدا بخش سیمینار ہند ازبک رشتوں کی کھوج لگائے گا

تصّوف، طب، قرآنیات، مولانا آزاد، اردو ادب کے سیمیناروں کے بعد ۱۹۹۳ء کا خدا بخش سیمینار ہند ازبک رشتوں کی کھوج لگائے گا خدا بخش لائبریری نومبر میں ایک بین الاقوامی سیمینار کر رہی ہے جو ہندوستان اور وسط ایشیا کے تعلقات کے موضوع پر ہوگا جس میں سمرقند اور بخارا کا ذکر ہوگا۔ کشان آرٹ ہوگا، بخاری شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، خواجہ نقشبند، باقی باللہ، مجدد الف ثانی ہوں گے۔ تیمور اور بابر ہوں گے، البیرونی، بوعلی سینا، ریاضی داں الخوارزمی، فقیہہ ابواللیث سمرقندی ہوں گے۔ تاشقند کا شاعر بدر چاچ ہوگا۔ خدا بخش لائبریری کی تاریخ خاندان تیموریہ ہوگی، نیشنل میوزیم کا بابر نامہ ہوگا۔ ملّا نصیر الدّین (ٹی وی سیریل) ہوگا، پردیسی (فلم) ہوگا۔ مہ و سال آشنائی (فیض احمد فیض کا ازبکستان کا سفرنامہ) اور دوسرے سفرناموں کا ذکر ہوگا۔ جس میں ابن بطوطہ بھی ہوں گے و یمبری بھی۔ اس سیمینار میں اردو، تواریخ، اسلامک اسٹڈیز، آرٹ، مذہب، عربی، فارسی، طب، تصوف اور دوسرے متعلقہ میدانوں کے ماہرین شرکت کریں گے یہ سیمینار نومبر کے اواخر میں منعقد ہوگا وزیر اعظم اس کا افتتاح کریں گے۔

جمیل الدین عالی کے ساتھ ایک شام

متحدہ عرب امارات کے خوبصورت اور سرسبز و شاداب شہر العین میں مقیم پاکستانیوں نے بزمِ شعر و ادب کے زیر اہتمام مستان شریف صاحب کی قیادت میں بروز جمعرات مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ء "جمیل الدین عالی کے ساتھ ایک شام" کا اہتمام کیا اس تقریب کا اہتمام پاکستان سینٹر العین کے وسیع و عریض ہال میں مرکز کے تعاون سے کیا گیا تھا۔

مشہور کالم نگار، شاعر اور ادیب جمیل الدین عالی ان دنوں متحدہ عرب امارات کے دورے پر آئے ہوئے ہیں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شعر و ادب کے پروانوں نے ابو ظہبی، دبئی اور العین میں کئی شعری نشستوں کا اہتمام کیا جس میں العین کی نشست ایک یادگار نشست تھی جس میں اہل دانش اور شعرائے کرام نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جمیل الدین عالی کو ان کی شاعری کالم نگاری اور سفر نامہ کے حوالے سے شاندار خراجِ تحسین پیش کیا۔

محترمہ سعدیہ روشن، کبیر خاں، ہارون پاشا، پیر عاصم گیلانی اور مرکز کے صدر انیس صاحب نے اردو ادب و شاعری میں جمیل الدین عالی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر پُر مغز مقالے پڑھے اور تقاریر کیں، جن شعرا نے اپنی نگارشات اور کلام کے ذریعے جمیل الدین عالی کے لیے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ان کے نام یہ ہیں۔

خورشید خاں خورشید، عرض محمد شیخ، جاوید اکبر، شاہ زمان کوثر، تسنیم عابدی، اسلام اعظمی، حسن ہما، ظہور الاسلام، جاوید میر تنہا یوسفی، سید جعفری، شفیق سلیمی، مستان شریف۔

آخر میں جمیل الدین عالی صاحب نے اپنی پذیرائی پر اہل العین کا شکریہ ادا کیا اور اپنے دوہے اور نظمیں سنا کر داد وصول کی۔ رات گئے تک جاری رہنے والی اس نشست میں حاضرین کے جذبات اس وقت قابلِ دید تھے جب عالی صاحب نے اپنے قومی نغمے خاص کر "جیوے جیوے پاکستان" سنایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورے ہال پر وجد کی کیفیت طاری ہے اور سامعین وطن عزیز کی محبت سے سرشار وطن کے گیت سن کر اس پر نچھاور ہونے کو تیار ہیں، سامعین کا جوش و جذبہ دیکھ کر خود عالی صاحب بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے کلام کی پذیرائی پر دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

(رپورٹ علی اکبر : مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

جدہ میں ایک نئی ادبی تنظیم کا قیام

گزشتہ دنوں جدہ میں مقیم معروف پاکستانی شاعر جناب شاہ محمد سبطین شادانی کی قیام گاہ پر ہونے والے ایک اجلاس میں ایک نئی ادبی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے بنیادی مقاصد میں شعر و ادب کا فروغ، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے باہمی روابط کی ترویج اور ادب میں پاکستانیت اور اسلامی روایات کا فروغ شامل ہیں۔ اس تنظیم کا نام ممتاز روحانی پیشوا اور استاد حضرت صوفی محمد حبیب اللہ حادی مرحوم سے نسبتِ خاص کی بناء پر "حادی لٹریری سرکل" تجویز کیا گیا اور باہمی اتفاق رائے سے حضرت حادی کے دینی اور ادبی جانشین شاہ محمد سبطین شاہ جہانی کو اس کا بانی صدر مقرر کیا گیا جب کہ ممتاز شاعر نسیم سحر اس کے جنرل سیکریٹری ہوں گے۔ مجلس عاملہ کے اراکین میں نور محمد جرال، ظفر بدایونی، کلیم اللہ فاروقی، محمود جعفر، مسعود جعفر اور مرزا سعید بیگ کے نام شامل ہیں۔ نائب صدر کے عہدے کے لیے احمد سعود قاسمی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ حادی لٹریری سرکل کی طرف سے مختلف مذہبی و ادبی تقاریب کے ایک مربوط سلسلہ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

"کڑوی باتیں" کی رونمائی

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کی شام کو آرٹس کونسل کی سماعت گاہ میں جناب تنویر کاظمی کی کتاب "کڑوی باتیں" کی رونمائی کی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت عدالت عالیہ کے جج جناب نظام احمد نے فرمائی مہمان خصوصی شیخ الجامعہ کراچی جناب پروفیسر ڈاکٹر سیّد ارتفاق علی تھے۔ نظامت کے فرائض جناب طاہر مسعود نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز مفتی انیس الحق کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جناب طاہر مسعود نے کہا کہ کتاب لکھنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اُس سے زیادہ اس کا چھاپنا مشکل اور اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل اس کی رونمائی کی تقریب مرتب کرنا ہے صاحب کتاب جناب تنویر کاظمی کمال خوبی سے ان تینوں مراحل سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

جناب معین قریشی نے اپنی مختصر باتوں میں تقریب کے "سہ منزلہ پروگرام" کی تفصیل بتائی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ کتاب کا نام "کڑوی باتیں" کی بجائے "سچی باتیں" ہونا چاہیے تھا۔ آخر سچی باتیں بھی تو کڑوی ہی ہوتی ہیں۔

پروفیسر حسن عسکری فاطمی نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ پتھروں میں جو حیثیت نگوں کی ہے بعینہ وہی حیثیت تحریروں کے ہجوم میں طنز و مزاح کی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ڈیڑھ دو سو برس کا جائزہ لیا جائے تو طنز و مزاح نگار کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

جناب حسن عابدی نے اپنے مضمون میں کہا کہ ہنسی انبساط کی وہ کیفیت ہے جو اندر سے پھوٹتی ہے اور چہرے پر روز روشن بن کر نمودار ہوجاتی ہے۔ مزاح نگار بھی اسی پیمانے پر ماپے جاسکتے ہیں مزاح نگار اپنی تحریروں سے لوگوں کے لیے ایسے ہی مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک شرط کے ساتھ کہ اس میں کوشش کر کے ہنسانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہوگا کہ کسی کو گدگدی کر کے ہنسایا جائے۔

جناب سیّد محمود حسین (ایڈیشنل سیکریٹری بلدیہ) نے کہا کہ ان دنوں پڑھنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔ اخباروں میں لوگ خبروں کی بجائے سرخیاں پڑھتے ہیں، طلبہ ٹیکسٹ بک کی جگہ گائڈ بک یا نوٹس لے کر کام چلاتے ہیں، اکثر اساتذہ کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے، حتیٰ کہ سرکاری دفاتر میں متون پڑھنے کی بجائے نوٹ پڑھتے اور نوٹ لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شمس الدین نے کہا کہ فکاہی کالم ایک طرح کی خوشبو اور مٹھاس رکھتی ہے جناب تنویر کاظمی نے اپنی کڑوی باتوں میں ایسی ہی مٹھاس کا احساس دلایا ہے۔ انھوں نے کتابوں سے محبت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کتاب علم کا نور پھیلاتی ہے اور جہاں علم کا نور ہوتا ہے وہاں بارود نہیں ہوتی۔

پرنسپل وفاقی اردو آرٹس کالج جناب رفیع عالم نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا کہ طنز کو اخلاقی حد میں رکھنے کے لیے مزاح کو ڈھال بنانا پڑتا ہے اور پھر مزاح کا رول ڈھال ہی کا رہنا چاہیے وہ ڈھول کا کردار نہ ادا کرنے لگے۔ ویسے بھی قہقہہ مزاح کا تاثر بگاڑتا ہے۔

اس موقع پر رئیس جامعہ کراچی ڈاکٹر سیّد ارتفاق علی نے تنویر کاظمی کی کتاب کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ فکاہیہ کالموں کا اس طرح کتابی صورت میں پیش کر دینا ایک بڑی اچھی روایت ہے۔ اس سے ان کالموں کی عمر طویل ہوجاتی ہے۔

آخر میں صدر جلسہ نے پہلے صاحب کتاب جناب تنویر کاظمی اور تقریب کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا پھر کہا کہ فکاہیہ کالم اخبار کے لیے ضروری ہے اتنی بہت سی دہشت گردی، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کی خبروں کو پڑھنے کے بعد قارئین کے اوسان کو بحال رکھنے

میں یہ کالم بہت معاون ہوتے ہیں۔
جناب تنویر کاظمی کے اظہارِ تشکر کے ساتھ تقریب کا یہ حصّہ اختتام کو پہنچا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا انتقال

اردو کے ممتاز ادیب جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ء کی رات آٹھ بج کر دس منٹ پر کلکتہ میں انتقال کر گئے وہ پچھلے کئی ماہ سے بیمار تھے انتقال کے وقت مرحوم ۶۳ سال کے تھے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے ہیں۔
شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو ضلع فرید پور میں پیدا ہوئے جو اس وقت بنگلہ دیش میں ہے انھوں نے تعلیم حیدر آباد دکن میں حاصل کی مرحوم صحیح معنوں میں اردو کی شیدائی تھے پچھلے دس سال میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی سرگرمیوں میں غیر معمولی حصّہ لیا اس کی مجلس عام اور ادبی کمیٹی کے رکن رہے۔
"مغربی بنگال اردو اکادمی" کے قیام کے لیے مرحوم کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں وہ ایک سچے انسان اور گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد کثیر ہے ۲۸ کتابیں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں جن میں نمایاں "مغربی بنگال میں اردو زبان کے مسائل"، "مختصر تاریخ بنگلہ ادب"، "مولانا ابوالکلام آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل"، "بنگالیوں کی اردو خدمات" (ٹیگور انعام یافتہ) اور "کلکتہ اور غالب" وغیرہ ہیں۔
مرحوم کی ادبی خدمات کے اعتراف میں میر اکادمی لکھنؤ اور ساہتیہ اکادمی نے انعامات سے نوازا۔
انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہنامہ "قومی زبان" کے قلمی معاونین میں سے تھے۔ ادارہ "قومی زبان" ان کی وفات پر ان کی روح کو شانتی ان کے پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

ہرمزی جلیل قدوائی کی رحلت

محترمہ ہرمزی جلیل قدوائی کا ۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو جہلم میں انتقال ہوا۔ ۸ اکتوبر کو کراچی میں تدفین ہوئی مرحومہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتی تھیں اور دونوں زبانوں میں لکھا کرتی تھیں انھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں گزاری۔
ادارہ جناب جلیل قدوائی کے غم میں شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

حروف تازہ

کتابیں

دائمی مسرت کا حصول
مضامین ۱۹۹۳ء

برٹرینڈ رسل ترجمہ جمیل زبیری
صفحات ۱۷۵ قیمت =/۹۹ روپے
مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

کس سے کہے وہ
افسانے

وقار بن الٰہی
صفحات ۲۸ قیمت =/۹۰ روپے
۳۴۳ ماڈل ٹاؤن کہوٹہ روڈ، اسلام آباد

اُتر نا دریا میں

وفاق بن الٰہی
صفحات ۱۵۷ قیمت =/۷۰ روپے
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز ۲۵ لوئر مال لاہور

پاکستان کے نعت گو شعرا
نعت ۱۹۹۳ء

سیّد محمد قاسم
صفحات ۳۶۸ قیمت =/۲۰۰ روپے
ہارون اکیڈمی، اورنگی ٹاؤن کراچی

لہو لہو ہے کربلا
مراثی ۱۹۹۳ء

محبت خاں بنگش
صفحات ۹۶ قیمت =/۵۰ روپے
ادارۂ علم و ادب، اردو منزل بہزادی چکر کوٹ کوہاٹ

راہ میں اجل ہے
افسانے ۱۹۹۳ء

زاہدہ حنا
صفحات ۳۰۴ قیمت = /۱۵۰ روپے
مکتبۂ دانیال وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

عکسِ بے خیال
افسانے ۱۹۹۳ء

رشید امجد
صفحات ۹۶ قیمت = /۵۰ روپے
دستاویز مطبوعات، کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو اسپتال لاہور

کاغذ کی فصیل
افسانے ۱۹۹۳ء

رشید امجد
صفحات ۱۰۸ قیمت = /۶۰ روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو اسپتال لاہور

چہروں سے بھری آنکھیں
شاعری ۱۹۹۳ء

نوید مرزا
صفحات ۱۲۸ قیمت = /۶۰ روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو اسپتال لاہور

ایک موسم کے پرندے
شاعری ۱۹۹۳ء

سہیل احمد خاں
صفحات ۱۰۰ قیمت = /۵۰ روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو اسپتال لاہور

بے آب آئینوں کے شہر میں
شاعری ۱۹۹۳ء

سعید احمد
صفحات ۱۱۰ قیمت = /۸۰ روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو اسپتال لاہور

جریدے

فنون
شمارہ ۳۸

احمد ندیم قاسمی
صفحات ۳۵۲ قیمت = /۷۵ روپے
۱۹ [illegible]

اوراق
شمارہ ۲۸
وزیر آغا، سجاد نقوی
صفحات ۴۰۸ قیمت = /۴۰ روپے
دفتر اوراق ۳/۱۱۵ سرور روڈ لاہور چھاؤنی

ماہنامہ افکار
شمارہ ۴۹۵
صہبا لکھنوی، محمد علی صدیقی، نکہت بریلوی
صفحات ۸۴ قیمت = /۱۰ روپے
۱۰۵۔ نیشنل آٹو پلازہ۔ مارسٹن روڈ، کراچی

ماہنامہ صریر
سالنامہ ۱۹۹۳ء
فہیم اعظمی
صفحات ۴۲۴ قیمت = /۶۵ روپے
سی ۲۰/۱۴ فیڈرل بی ایریا کراچی

تحقیق
شمارہ ۶
مرتبین ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، مسز رابعہ اقبال، ڈاکٹر نجم الاسلا
صفحات ۴۴۸ قیمت = /۶۰ روپے
شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی

ابلاغ
سہ ماہی شمارہ ۴
سیدہ حنا، نسرین سروش، حامد سروش
صفحات ۱۱۲ قیمت = /۲۵
الحنا بی ۶۹ اے ایس کالونی سی نوشہرہ

سیپ
شمارہ ۶۰
مدیر نسیم درانی
صفحات ۲۵۸ قیمت = /۳۰
سیپ پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ کراچی ۷۵۷۳۰

عصمت
ستمبر ۹۳ء
مدیران آمنہ نازلی، طارق الخیری، صائمہ خیری
صفحات ۵۶ قیمت = /۷ روپے
دفتر عصمت الاکوہاؤس کمپاؤنڈ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

(گزشتہ سے پیوستہ)

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

خطوط

آغا افتخار حسین، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۵۵
آغا سہیل، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۷۰
آغا ناصر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۹۳
آل احمد سرور، پروفیسر	بنام ڈاکٹر حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء
ابن انشاء	بنام ڈاکٹر حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۰۶
احمد ندیم قاسمی	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۷۵
اسلم خٹک، پروفیسر	بنام ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۶۹
انور سدید، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۵۱
انور عنایت اللہ	بنام اعجاز صدیقی	شاعر، بمبئی ۲/۹۲ء ص ۵
جاوید اقبال، جسٹس	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۰۳
جگن ناتھ آزاد بنام	ڈاکٹر ملک حسن اختر	فیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۸۳
جمیل الدین عالی	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۳۵
حمید اللہ خاں	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گواجرنوالہ خطوط نمبر جون نمبر ۹۲ء ص ۳۳
خالد حسن قادری، ڈاکٹر	مکتوبہ قادری	اردو، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۱ء ص ۳۹
خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۶۲
ذوالفقار احمد تابش	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۸۶
رئیس امروہوی	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۵۳

ریاض حسین، پروفیسر	سلطان ٹیپو کے نام نپولین کا خط	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۹
سبط حسن	بنام مخدوم محی الدین ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء	سب رس، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۸
سعید احمد اکبر آبادی مولانا	بنام علامہ سیماب اکبر آباد	شاعر، بمبئی ۹۲/۱ء ص ۶
سلطان محمود حسین ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۱۲ء ص ۱۵۹
سیّد عبداللہ، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۴۸
شام بارکپوری	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۹۵
شورش کاشمیری	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۷۲
عابد علی عابد	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۲۶
عاشور کاظمی	لندن سے ایک خط اہل قلم رفیقوں کے نام	افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۲۳
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۲۴
عبدالماجد دریابادی	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۴۹
غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۵۴
قیوم نظر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۰۸
کشور ناہید	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۴۱
ماہر القادری	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۱۱
مجتبیٰ حسین	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۹۸
محمد ریاض، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۲۳
محمد سلیم الرحمٰن	مشاہیر کے خطوط، (بلونت،	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۹۷
محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۴۵
محمد طفیل	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء
محمد ظفر الحسن	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۸۴
محمد معیز الدین، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۶۱
محمد نسیم فاروقی، پروفیسر	بنام پروفیسر کبیر احمد جائسی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص
مشفق خواجہ	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۴۸
میرزا ادیب	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۲۸
نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۱۹۲
وحید قریشی، ڈاکٹر	بنام ڈاکر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۴۴
وزیر آغا، ڈاکٹر	بنام ڈاکٹر ملک حسن اختر	مفیض، گوجرانوالہ خطوط نمبر جون ۹۲ء ص ۷۸

ملاقات

آصف زمانی، ڈاکٹر	پروفیسر گوپی چند نارنگ سے گفتگو	طلوع افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۵
شیخ رحمٰن اکولوی	سلسلہ سوالوں کا، ڈاکٹر انور سدید سے	الشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۵۴
مشرف احمد، ڈاکٹر	ابوالفضل صدیقی سے گفتگو	ماہ نو، لاہور اگست ۹۲ء ص ۵۳
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ڈاکٹر قمر رئیس سے ایک انٹرویو	ادب لطیف، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۰

غالبیات

افتخار احمد عدنی	غالب شناسی کے کرشمے	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳۷
اکبر حیدری کاشمیری، پروفیسر	نوادرِ غالب	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۲۹
اکبر علی خاں عرشی زادہ	مکتوب غالب بنام حکیم ظہیر الدین دہلوی	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۹
انور سدید، ڈاکٹر	عہد غالب کے چند مسائل	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۲
انیس ناگی، ڈاکٹر	محکمہ تعلیم اور غالب	اردو نامہ، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۵
شان الحق حقی، ڈاکٹر	غالب کے دو شعر	قومی زبان، کراچی، نومبر ۹۲ء ص ۲۵
شان الحق حقی، ڈاکٹر	غالب کے دو شعر	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۱۰
شمس الرحمٰن فاروقی	غالب کے ایک انتخاب کی ضرورت	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۷۳
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	ہم عصر سماجی و تہذیبی تبدیلیوں کا ادراک اور غالب	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۲
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	تصوف اور غالب	نگار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳
قدرت نقوی	انتخابِ دیوان غالب از مولانا امتیاز علی عرشی	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۱۲
کلیم سہرامی، ڈاکٹر	ایک ایرانی دانشور بنگال میں بحوالہ غالب	طلوع افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۱
محمد امین، ڈاکٹر	غالب شناسی کا ایک اور پہلو غالب تب اور اب کے حوالے سے۔ ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۹۲	
محمد مصطفیٰ صابری	غالب اور تصوف	نگار، کراچی جولائی ۹۱ء ص ۵ - ۶۴

سر سیّد احمد خان

آفاق صدیقی، پروفیسر	بانی دو قومی نظریہ	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۲
الطاف حسین ندوی	سر سیّد اور مذہب	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سر سیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۵۰
الف واؤ جیم	سر سیّد علیہ الرحمتہ	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۴
انیس ناگی	جلیل القدر، بزرگ سر سیّد احمد خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۳۸
این ایچ بجی	تحریک علی گڑھ	اسلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۹
این ایچ بجی	تحریک علی گڑھ	تہذیب الاخلاق لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۶
خسرو چانسلر	علی گڑھ یونیورسٹی کی روایات اور اقدار	تہذیب الاخلاق، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۰
خلیق احمد نظامی	عصر حاضر اور سر سیّد	دائرے، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۷
سر سیّد احمد خاں	انسان کے خیالات	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۰
سر سیّد احمد خاں	عورتوں کے حقوق	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۴۵
سر سیّد احمد خاں	تہذیب اور اس کی تاریخ	تہذیب الاخلاق لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۱
سر سیّد احمد خاں	ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۵
سعید صدیقی	سر سیّد احمد خاں کا جہادِ علم	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۲
سلیم انور عباسی	سر سیّد کی بہترین تحریریں	تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۴
شان محمد	سر سیّد اور سیاستِ وقت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سر سیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۸۵
شجاع الدین فاروقی	سر سیّد کے رسالہ اسباب بغاوت ہند ایک مطالعہ	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۲۲
ع . الم ق شر . . وفیسر	اکر یہ ہم ، علگڑھ تھا	سائنس میگزین، کراچ جولائی ۹۲ء ص ۴۳

عبدالمجید قریشی، پروفیسر	راجہ غلام حسین مولانا محمد علی جوہر.......	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۵
عتیق احمد صدیقی، پروفیسر	معمارِ قوم سرسیّد	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۰
عشرت رحمانی	سرسیّد احمد خاں مسلمانوں کا بانی	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۶
عشرت علی قریشی	ڈاکٹر سر ضیاء الدّین احمد علی گڑھ کا ایک مایہ ناز سپوت	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۲
علی اختر خاں	سرسیّد تعلیم اور قومی یکجہتی	تہذیب الاخلاق علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۵
غیاث اللہ حکیم، چوہدری	علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں	تہذیب الاخلاق، اگست ۹۲ء ص ۳۰
غلام معین الدین صابری	سرسیّد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	تہذیب الاخلاق، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳۰
فرخ جلالی، پروفیسر	سرسیّد کے ساتھی، حاجی محمد اسمٰعیل خان	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۸۹
فرخ جلالی	غیاث اللہ خاں شروانی سرسیّد کے ایک ساتھی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۱۴
فضل قدیر	سرسیّد کا پینی تھیٹر	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۰
فوق کریمی، ڈاکٹر	سرسیّد کی قومی فکر	تہذیب الاخلاق لاہور اگست ۹۲ء ص ۴۹
محمود علم خان، چوہدری	محسنِ ملت سرسیّد احمد خاں	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۹
مشرف علی	سرسیّد کا کارنامہ	تہذیب الاخلاق لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۷
مظفر عباس نقوی، پروفیسر	مولانا وحید الدین سلیم سرسیّد کے لٹریری اسسٹنٹ	تہذیب الاخلاق، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۴۳
مکرم حسنین کاظمی	سرسیّد احمد خاں کی قومی خدمات	تہذیب الاخلاق، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۴
نادر علی خاں	سرسیّد کے اساسی افکار	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۸
نجم حسین نجمی	سرسیّد کی علی گڑھ تحریک	تہذیب الاخلاق لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۶
نورالحسن نقوی، پروفیسر	سرسیّد کے کارنامے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۱
وفا راشدی، ڈاکٹر	سرسیّد اور کلکتہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۱۳

اقبالیات

ابوالجلیب	علامہ اقبال اور سرراس مسعود	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۹
اسلوب احمد انصاری	مسعود مرحوم (نظم) سرراس مسعود کی یادیں	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۱
الف واؤ جیم	اقبال اور ریاست حیدر آباد	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۴
افتخار احمد، پروفیسر	تاریخ تصوف اقبال کی ایک نامکمل کتاب	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۶۵
این میری شمل، ڈاکٹر	اقبال کا تصورِ عقل و عشق	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۲۸۵
حبیب اللہ اوج	علامہ اقبال ایک لافانی شاعر	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۵
حبیب اللہ اوج	مفکرِ پاکستان	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۵
حسنین کاظمی، پروفیسر	اقبال اور عشقِ رسول	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۲۰
خواجہ احمد فاروقی	اقبال شاعرِ مشرق	دائرے، اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۸
ذکی تالگانوی	ڈاکٹر اقبال کی خود اپنے کلام پر اصلاحیں	محفل، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۱۹
شفیق عجمی	تحقیق اور اقبالیاتی تحقیق	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۹
محمد امین، ڈاکٹر	اکیسویں صدی میں اقبال کے خواب کی تعبیر	ماہِ نو، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۸
طاہر علی زیدی	اقبال اور حدیثِ رسول ﷺ	ماہِ نو، لاہور نومبر ص ۲۳

قومی زبان (۹۳) نومبر ۱۹۹۳ء

طیب منیر	علامہ اقبال اور چراغ حسن حسرت	ماہِ نو، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۲
عبداللہ شاہ ہاشمی	اسفارِ اقبال مقاصد اور اہم واقعات	ماہِ نو، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۷
عشرت علی	علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی افکار و خیالات ایک تجزیہ	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۱
محمد ریاض، ڈاکٹر	علامہ اقبال کی تنقید ادب	ماہِ نو، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۴
محمد منور، پروفیسر	علامہ اقبال ایک نظریاتی شاعر	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۴
محی الدّین قادری ذاکر، ڈاکٹر	مولانا روم اور علامہ اقبال	سب رس، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۹
معین الدّین عقیل، ڈاکٹر	دو نوادر بسلسلہ اقبال	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۵
منظور حسین بھٹی، پروفیسر	اقبال بطور ماہر تعلیم	اردو نامہ، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۱۸
نثار احمد مرزا	اقبال اور فرنگ	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۱۳
نظر برقی	اقبال کے کلام میں طنز	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۴۷
وفا راشدی، ڈاکٹر	اقبال کا نظریۂ حیات	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۰

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر	بابائے اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ.....	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۳
انور سدید، ڈاکٹر	بابائے اردو کے نام، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام.....	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۵
ثناء الحق صدیقی	مولوی عبدالحق بابائے اردو کیوں؟	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۷
خلیق انجم، ڈاکٹر	چار روز مولوی عبدالحق سیمینار کی روداد.....	نگار پاکستان، کراچی مولوی عبدالحق نمبر اگست ۹۲ء ص ۱۲ - ۷۸
رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر	مکاتب عبدالحق	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۵
سحر انصاری، ڈاکٹر	مولوی عبدالحق بحیثیت معلم خطوط نویس	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۳۷
عقیل ملک، ڈاکٹر	بابائے اردو ایک عظیم انسان	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۵۵
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	بیاد مولوی عبدالحق	نگار، کراچی مولوی عبدالحق نمبر اگست ۹۲ء ص ۵
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	دہلی میں چار روزہ مولوی عبدالحق سیمینار تاریخ ساز یادگار	نگار، کراچی مولوی عبدالحق نمبر اگست ۹۲ء ص ۷
محمد ظفیر الحسن، ڈاکٹر	بابائے اردو منزل بہ منزل ۱۹۴۱ء	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۹

مولانا ابوالکلام آزاد

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر	مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی	الولی، حیدر آباد سندھ اگست ۹۲ء ص ۱۸
ابوسلمان شاہجہانپوری	مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی	الولی، حیدر آباد سندھ ستمبر ۹۲ء ص ۲۷
ابوالکلام آزاد مولانا	اکبر اعظم اور مسیحی حرم ایک انگریز پروفیسر کی تاریخ دانی	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۶۷
اسلم شیخوپوری مولانا	مولانا ابوالکلام آزاد کا بچپن	جریدہ الاشرف، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۲
اسلم شیخوپوری مولانا	مولانا ابوالکلام آزاد کا بچپن (گذشتہ سے پیوستہ)	جریدہ الاشرف، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۳
اکرام چغتائی	مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نایاب تحریر	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۵۷

حسرت موہانی

فردوس انور، ڈاکٹر	حسرت موہانی اور ان کا اسلوب	ماہِ نو، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۱
سری نیواس لاہوٹی	حسرت موہانی	ارتقا، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۰۴

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر	فرد کی نوائے سوختہ کون سنے گا اور کون سنائے گا	افکار، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۲
اویس توحید	ہمارے بانیوں کو خراج تحسین اختر حسین رائے پوری	مطالعہ پاکستان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۸۹
یونس احمر	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی یادوں کے چند نقوش	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۳۸

حافظ محمود شیرانی

احسان الٰہی رانا	حافظ محمود شیرانی ایک صاحبِ کمال شخصیت	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۱
عبدالغفار شکیل	محمود شیرانی اور مسئلہ زبان اردو	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۱۰

علامہ جمیل مظہری

آفاق صدیقی، پروفیسر	علامہ جمیل مظہری کی شخصیت	آگہی کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۰
رضا کاظمی	خدا بخشے جمیل مظہری کو	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۹
سحر انصاری	جمیل مظہری غزل کے آئینے میں	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۱۰
سردار نقوی	جدید مرثیہ اور جمیل مظہری	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۶
شاہ حسن	مثبت قدروں کے بھرپور اظہار کا شاعر	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۰
علیم اللہ حالی	جمیل مظہری فریاد جواب فریاد کے آئینے میں	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۲
ممتاز حسین، پروفیسر	جمیل مظہری چند تاثرات	آگہی، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶

فیض احمد فیض

آغا سہیل، پروفیسر ڈاکٹر	فیض کی انقلابی شاعری	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۵
آمنہ مشفق	عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۸۵
فیض احمد فیض	دو غیر مطبوعہ خط بنام چوہدری نذیر احمد	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۴۶
فیض احمد فیض	۳۵ غیر مطبوعہ خطوط بنام عفت زکی	غالب، کراچی ۶/۱۰/۹۲ء ص ۴۹

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

غلام معین الدین صابری	آہ! کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	تہذیب الاخلاق، لاہور اگست ۹۲ء ص ۴۲
کشمیری لال ذاکر	کہاں سے کوئی ہمارا جواب لائے گا......	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۴۳

عصمت چغتائی

ابوالکلام قاسمی	عصمت چغتائی کے افسانوں میں کردار نگاری	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ص ۶۴
اکرام بریلوی	کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۸
انور قمر	عصمت چغتائی اپنے ذہن کے سربستہ راز کھولتی ہے	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۶۱
حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر	عصمت چغتائی شخصیت اور فن کے آئینے میں	آگہی، کراچی اکتوبر نومبر ۹۲ء ص ۶
شمس الحق عثمانی	ٹیڑھی لکیروں کا تعزیت نامہ	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۵۹

شہزاد منظر	عصمت چغتائی	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۷

جلیل قدوائی

احمد ہمدانی	حضرت جلیل قدوائی کی شاعری	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۲۵
اسلم فرخی، ڈاکٹر	قدوائی صاحب	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۱۷
جلیل قدوائی	اظہار تشکّر	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۷
شاد انجم	جلیل قدوائی کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۳۱
نظیر صدیقی، پروفیسر	جلیل قدوائی صاحب	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۲۰

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

آفتاب حسین	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی سے گفتگو	ماہِ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۸۲
آفتاب حسین	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی سے گفتگو	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۹
انور سدید، ڈاکٹر	سجاد باقر رضوی کے لیے تعزیت	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۱
سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر	باتیں	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۵
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی یادیں اور باتیں	صریر، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۶۱

پروفیسر ممتاز حسین

ادارہ	پروفیسر ممتاز حسین، ناقدین کی نظر میں،	قومی زبان، کراچی ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۹
اسلم فرخی، ڈاکٹر	قصہ ممتاز	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۵
اسلم فرخی، ڈاکٹر	بیاد ممتاز	قومی زبان، اگست ۹۲ء ص ۵
سید حسن عسکری	خطوط بنام ممتاز حسین	قومی زبان، جولائی ۹۲ء ص ۱۰
ڈاکٹر زیڈ اے ڈیسائی		
شکیل نوازش رضا	ترقی پسند تنقید اور ممتاز حسین	طلوع افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۵
عتیق احمد، پروفیسر	پروفیسر ممتاز حسین کا تنقیدی نقطۂ نظر	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۲۳
مجتبیٰ حسین، پروفیسر	نقدِ حرف	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۲
ممتاز حسین، پروفیسر	معروضات	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۷
ممتاز حسین، پروفیسر	مارکسی جمالیات مطالعہ اور امکانات	طلوع افکار، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۲
ممتاز حسین، پروفیسر	قومی بیداری میں اکبر کا حصّہ	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۱

(جاری ہے)

قومی زبان دسمبر ۱۹۹۳ء جلد: ۶۵ شمارہ: ۱۲

مضمون نما

سنگت یاراں	اعجاز حسین بٹالوی	۹
حمید نسیم ایک تعارف	ضیا جالندھری	۱۷
حمید نسیم کی شخصیت اور	ضمیر علی بدایونی	۲۹
ادب اور عوام	ڈاکٹر جمیل جالبی	۳۵
جاپانی ہائیکو کا ابتدائی دور	رفیق سندیلوی	۳۹
امجد حیدر آبادی	حمایت علی شاعر	۴۵
وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی	جعفر بلوچ	۴۹
کہانیاں رنگ رنگ		
گمشدہ قبر (امریکی کہانی)	برناڈ مالموڈ / ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۶۳
اور میں جیتا ہوں () اُس سے	سُریش دُلال / ترجمہ شکیل فاروقی	۶۱
مزدور (ہندی)	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اشہاب قدوائی	۶۳
آرمینی شاعر پارو ئیر سیواک سے گفتگو	کیرن کلنتار / سہیل احمد صدیقی	۷۱
رفتار ادب	......	۷۷
گرد و پیش	......	۸۱
نئے خزانے	ڈاکٹر وفا راشدی	۸۹

بدل اشتراک
فی پرچہ ـــــ ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰ - فون: ۴۶۱۴۰۶

"قومی زبان" کے اس شمارے کی اشاعت کے ساتھ ۱۹۹۳ء کا سال ختم ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہے کہ پورے سال "قومی زبان" پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان کی جانب سے وقتاً فوقتاً بزرگ اہلِ قلم کے اعزاز میں جو تقریبات منعقد کی گئیں اور ان مواقع پر جو مضامین و مقالات پڑھے گئے اُن سے "قومی زبان" میں ان بزرگ اہلِ قلم کے گوشے مرتب کیے گئے۔

اندرون ملک اور بیرون ملک کی ادبی سرگرمیوں سے قارئین کو باخبر رکھنے کے لیے "گرد و پیش" کے عنوان سے رپورٹیں شائع کی گئیں اور ماہ بہ ماہ علاقائی اور غیر ملکی ادب کے تراجم پابندی سے چھپتے رہے۔

علاوہ ازیں اس امر کا خیال رکھا گیا کہ "قومی زبان" کے ہر شمارے میں قارئین اور اہلِ علم و ادب کے لیے کچھ نیا مواد ضرور شامل ہو۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے قلمی معاونین نے اس میں بڑی معاونت کی، ہم خاص طور پر اُن قلمی معاونین کے شکر گزار ہیں جنھوں نے سال بھر "قومی زبان" کو اپنے رشحات گرامی سے نوازا اور قلمی معاونت جاری رکھی۔ اس شکر گزاری کے ساتھ ہم یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین کا تعاون آئندہ بھی اسی طرح قایم رہے گا۔

جناب احمد نسیم

جناب نورالحسن جعفری، صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

جناب جمیل الدین عالی، معتمد اعزازی

جناب اعجاز حسین بٹالوی

جناب ضیا جالندھری

ڈاکٹر اسلم فرخی، (مشیر علمی و ادبی) جناب احمد ہمدانی، جناب ضمیر علی بدایونی

ضیا جالندھری، اعجاز حسین بٹالوی، حمید نسیم، نورالحسن جعفری، جمیل الدین عالی، اقبال فریدی

سنگت یاراں

اعجاز حسین بٹالوی

شمالی پنجاب کے گاؤں میں اکتارے والے درویش کھڑی شریف کے میاں محمد صاحب کا ایک بیت بڑی پُرسوز لے میں پڑھتے ہیں۔ اس بیت میں انسانی زندگی کے ان رشتوں کا تذکرہ ہے جو زندگی کی اساس ہوتے ہیں۔ ان قوتوں کا ذکر ہے جن سے زندگی اپنا رس حاصل کرتی ہے مگر بیت کے دونوں مصرعوں میں ایک اٹل حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ زندگی کے ان اساسی رشتوں کو دوام حاصل نہیں، آنی جانی چیزیں ہیں مگر یہ بات کسی تاسف کے بغیر کہی گئی ہے۔ صرف اسی لیے کہی گئی ہے کہ یہ نعمتیں جب تک میسر ہیں ان کی قدر کرو۔ ان سے لطف حاصل کرو:

سدا نہ حسن، جوانی، مایے، سدا نہ سنگت یاراں
سدا نہ باگیں بلبل بولے، سدا نہ باغ بہاراں

زندگی میں والدین کا سایۂ حسن اور جوانی اور صحبتِ یاراں ہمیشہ رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ یعنی باغ بھی ہو، بہار بھی ہو اور نغمۂ بلبل بھی ہو تو یہ قران السعدین ہے۔ جب تک ہے اس سے لطف حاصل کرو۔ شاعر کو "باغ بہاراں" کا قافیہ کیسا اچھا ملا "سنگت یاراں" یعنی یاروں کی سنگت سدا رہنے والی چیز نہ بھی ہو تو زندگی کی اساسی حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ اس بیت کو غور سے پڑھیے تو اس میں موسیقی کی ایک پوشیدہ رمز بھی نظر آنے لگتی ہے۔ گانے والے کے ساتھ سازندے سنگت کرتے ہیں۔ طبلہ اور سارنگی سنگت نہ کریں تو موسیقی کا لطف آدھا رہ جائے۔ خود گانے والا پریشان ہو جائے۔ تو "سنگت یاراں" زندگی کی موسیقی ہے۔ ہم حمید نسیم کی سنگت کرنے والے لوگ ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ زندگی میں دو پودے ایسے ہیں جن پر ہر موسم میں برابر کا پھل نہیں آتا۔ نہیں آتا تو کئی موسم بے برگ و بار گزر جاتے ہیں اور جب آتا ہے تو درخت پھولوں سے ایسے لہلہانے لگتے ہیں کہ ان کی بہار دیدنی ہوتی ہے۔ ایک پودا دوستی کا ہے۔ دوسرا تخلیقی عمل کا۔ تخلیقی عمل کا پودا زیادہ پراسرار ہے، اس پر پھل پھول کب اور کس طرح آتے ہیں، اس کے اسرار و رموز پرپیچ ہیں۔

دوستی کے پودے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے ملاقاتوں کے پانی سے سیراب کرنا چاہیے مگر میر تقی میر اس سلسلے میں ملل اور راز سے واقف تھے۔ جبھی تو کہا:

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

میں حمید نسیم صاحب کے لیے اس شامِ سپاس میں ایسی ایک ملاقات کے ذکر کے لیے حاضر ہوا ہوں جس کا سلسلہ نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس نصف صدی میں یہ ملاقات نیازمندی سے چل کر دوستی اور گزشتہ چند برسوں میں دوستی سے چل کر یاری تک پہنچی۔

جب میں فرسٹ ایئر کے طالب علموں کی مخصوص جھینپ اور جھجک کے ساتھ کالج میں داخل ہوا تو حمید نسیم ایم اے کے طالب علم تھے۔ شاید ایک ایم اے کر چکے تھے اور اب دوسرے ایم اے میں مبتلا تھے۔ یہ اس صدی کی چوتھی دہائی کا آغاز تھا۔ لاہور اس زمانے میں بڑا غنچہ شہر تھا۔ اس شہر کی ادبی اور مجلسی زندگی کا شہرہ سارے ہندوستان میں تھا۔ لاہور کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں حمید نسیم کا طوطی بولتا تھا۔ شعر گوئی اور شعر شناسی کی محفلوں میں ان کی گونج تھی۔ ابھی اردو شعر کا قدیم ادارہ یعنی مشاعرہ اپنی پوری آب و تاب سے زندہ تھا۔ حمید نسیم خوب سجا کر غزل کہتے اور ترنم سے پڑھتے تھے۔ ان کی آواز میں جو طنطنہ تھا وہ ان کے ترنم میں پُرسوز لے بن جاتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی کے مباحثوں میں کبھی جیتتے، کبھی ہارتے مگر مشاعرہ ہمیشہ لوٹ لیتے بزرگوں کی صحبت اٹھائی تھی، استادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کی جوانی غزل خوانی سے مرصع تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بات سے بات نکالنے اور حریفِ بذلہ کو حاضر جوابی سے مات کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، لفظ پر تصرف حاصل کرنے کا شوق تھا۔

اس زمانے میں علی گڑھ کا آل انڈیا مباحثہ مقرر کے ہوٹ ہونے کی قوتِ برداشت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ جو چار فقرے خاموشی سے بول گیا وہی جیت گیا ایک سال جب لاہور کے بحث بازوں کا گروہ آل انڈیا مباحثے میں شرکت کے لیے علی گڑھ پہنچا تو علی گڑھ کے کچھ سینئر طالب علم انھیں لینے کو اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان میں ایک صاحب دوسروں سے ذرا الگ کھڑے تھے اپنی ذات سے مطمئن، اپنے وجود میں قائم، چہرے پر مسکراہٹ، ہاتھ میں پائپ، مصافحہ پورے یقین کے ساتھ کرتے۔ تعارف ہوا۔ یہ راز مراد آبادی تھے فقرہ چست کرنے میں وہ بھی پہل کرتے تھے۔ یہیں ریلوے اسٹیشن پر چند منٹ کے اندر اندر حمید نسیم اور راز مراد آبادی کا پہلا "مچاٹا" ہوا۔ (اس لفظ کے معنے مجھے نہیں آتے مگر میرے خیال میں اس لفظ کے معنے اس کی صوتیات ہی میں پوشیدہ ہیں) دونوں گفتگو کے دھنی ساری شام لفظوں کے گتکے لیے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہے۔ آخر رات گئے تک دونوں طرف سے حسب خاطر طبع آزمائی کے بعد صلح ہو گئی اور ہم نے سوچا اچھا ہوا۔ اب اصلی مباحثے کے لیے کچھ وقت مل جائے گا۔

جس عہد کا ذکر ہو رہا ہے اس وقت برصغیر پر انگریز کی حکومت تھی۔ سرسیّد نے قوم کو کالج کی راہ دکھادی تھی۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے بقول اکبر الہ آبادی اگر ڈپٹی کلکٹر ہو جائیں تو گویا زندگی کی معراج تھی۔ مگر جس زمانے میں ان نوجوانوں کے گروہ نے ایم اے کی ڈگریاں لیں، ملازمتوں کا قحط تھا۔ فوج میں البتہ "لفٹیننی" کے دروازے کھلے تھے وہ بھی جنگ کے خاتمے پر بند ہو گئے۔ طالب علمی میں تو چوگان ہستی آنکھوں کے سامنے دور تک پھیلا ہوتا ہے اور گوئے سبقت سب کو نظر کر رہی ہوتی ہے۔

مگر آٹے دال کا بھاؤ تو کالج سے باہر نکل کر معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ آئی سی ایس کے امتحان میں فیل ہو جاؤ تو آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کر لو مگر آئی سی ایس کے امتحان میں فیل ہونا آسان تھا۔ ریڈیو میں نوکری ملنا مشکل تھا۔

پطرس بخاری، آغا عبدالحمید اور سید رشید احمد نوجوانوں کو یوں پرکھتے تھے جیسے نوکری نہیں دے رہے، سات پشتوں کا علمی ادبی حساب لے کر قسمت کے ستاروں کا حال بتا رہے ہیں۔

لیکن ایک بات ضرور تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں کا رجحان آل انڈیا ریڈیو کی طرف تھا آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ ایک طرف تو کرشن چندر، غلام عباس، حامد علی خاں، سعادت حسن منٹو، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی اور راجندر سنگھ بیدی ریڈیو میں جا پہنچے اور دوسری طرف آغا اشرف، ن۔ م۔ راشد، حفیظ ہوشیارپوری، حفیظ جاوید، محمود نظامی اور حمید نسیم نے اس پڑاؤ میں ڈیرے ڈال دیے اور پھر ۱۹۴۶ء کے آتے آتے الطاف گوہر، ضیا جالندھری، ظہور آذر اور یہ نیاز مند اسی درخت کی شاخوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگے۔

اس وقت ریڈیو کی ملازمت کا ایک فائدہ یقیناً ہوتا تھا۔ بولے جانے والے لفظ کی توقیر اور لکھے ہوئے لفظ کی موزونیت کا احساس پوری شدت سے ہونے لگتا تھا۔ حرفِ موزوں کے رنگ اور حرفِ ناموزوں کے گورکھ دھندے صاف نظر آنے لگتے تھے۔ اچھا نثر کار لفظوں کو فضول شے سمجھ کر لٹاتا نہیں۔ جنسِ گرانمایہ سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ یہ خوش بختی تھی کہ ہم سب کو یہ تربیت اسی ادارے میں رہ کر نصیب ہوئی۔ مجھے اور ضیا جالندھری کو دہلی میں، الطاف گوہر اور حمید نسیم کو پشاور میں۔

پھر ہوا یوں کہ ہم سب جو حمید نسیم کے بعد ریڈیو میں آئے تھے اور ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے ایک ایک کر کے اس درخت کی شاخوں سے اڑے اور زیادہ ہرے بھرے درختوں کی پھننگ پر جا بیٹھے۔ الطاف گوہر نے پہل کی، پھر ظہور آذر، پھر ضیا جالندھری، یہ سب سول سروس آف پاکستان میں چلے گئے، افضل اقبال فورن سروس میں جا چکے تھے۔ میں نے ریڈیو کو خدا حافظ کہا اور بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان چلا گیا۔ واپس آیا تو حمید نسیم وہیں تھے یعنی کراچی ریڈیو اسٹیشن پر۔ ذوالفقار بخاری سے حمید نسیم کا رشتہ آویزش الفت موج است و کنار" والا تھا یعنی "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے تو کانٹے چبھوتے، دور جاتے تو قریب آنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اس زمانے میں ذوالفقار بخاری صاحب میرے لیے صوفی تبسم کے بعد دوسرا مکتب تھے۔ میں ان کی محفل میں شعر شناسی اور لفظ کی پرکھ خاموشی سے سیکھتا رہتا تھا۔ وہ لفظ کے پیچھے جا کر لفظ میں چھپی ہوئی قوت کو اس طرح تلاش کرتے تھے جیسے ایٹم کے سائنس دانوں نے ذرّے کے پیچھے ایٹمی قوت دریافت کی تھی۔ میں کراچی آتا تو بخاری صاحب میرے لیے شام کو احباب کی محفل کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ مگر اکثر اوقات ان کے اور حمید نسیم کے درمیان شام کے کسی حصے میں وہی ہوتا جو علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر حمید نسیم اور راز مراد آبادی کے درمیان ہوا تھا یعنی "مچاٹا" یہ مچاٹا کبھی مختصر ہوتا کبھی طویل۔

میں ہر بار ایک سوال دل میں لے کر جاتا کہ حمید نسیم نے ریڈیو کی ملازمت ترک کیوں نہ کی مگر اس کا کوئی جواب میرے پاس نہ ہوتا البتہ یہ جانتا ہوں کہ اسی طرح کا سوال ایک ازلی استفہام کی صورت میں ایک نہایت اچھے شعر میں موجود ہے لیکن اس شعر سے میری ایک گہری وابستگی بھی ہے اور میری زندگی کا ایک اہم واقعہ بھی اس سے وابستہ ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اس واقعے کے تذکرے کے بغیر وہ شعر آپ کی نذر کروں۔

ہوا یوں کہ جب میں بیرسٹری کی تعلیم ختم کر کے پانچ ساڑھے پانچ برس بعد واپس آیا تو یہاں پہنچ کر مجھے اپنا نیا گھر یعنی لندن بہت یاد آتا تھا۔ پاکستان میں میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ میں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے لندن میں وکالت شروع کر دی تھی۔ اچھی خاصی رقم بی بی سی کے پروگراموں میں شمولیت سے مل جاتی تھی۔ بیرسٹری سے کچھ پیسے آنے لگے تھے۔ دامن

قومی زبان (۱۲) دسمبر ۱۹۹۳ء

دل لندن میں اٹکا ہوا تھا۔ جی کہتا تھا یہیں ٹک جاؤ، مگر پھر پاکستان کی کشش پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ آخر اس کشمکش سے تنگ آکر میں نے لندن کی بساط سمیٹ دی اور "سرو" بن کر سوئے "بوستاں" مراجعت کی مگر یہاں پہنچ کر جانِ مجنوں کو دوگونہ عذاب ہوا۔ جو تھا نہ رہا اور جو سامنے تھا وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک رازداری کی بات ہے جو کسی کو نہیں بتائی۔ وہ یہ کہ بیٹھے بٹھائے سب چھوڑ چھاڑ کر بیرسٹری کرنے کا خیال اس لیے بھی آیا تھا کہ واپس آکر ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لوں گا۔ اب واپس آکر سیاست اور سیاست گروں کو قریب سے دیکھا تو سوائے کراہت کے کچھ اور نہ ملا۔ وکالت کا پیشہ بھی یہاں جان لیوا معلوم ہوا۔ دل تنگ ہوا اور طبیعت ہمہ وقت واپس لندن جانے، پر مائل نظر آئی۔ میری اس بے یقینی سے میرے دوست بہت افسردہ اور مشوش تھے۔ انھیں اندیشہ رہتا کہ میں رسی تڑا کر پھر بھاگ جاؤں گا۔

یہی زمانہ تھا کہ میں مختصر قیام کے لیے کراچی آیا ہوا تھا۔ آخری شام تھی اور اگلے روز مجھے لاہور واپس جانا تھا۔ ایک دوست کے ہاں دعوت کا اہتمام تھا یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں اکل و شرب پر کوئی پابندی نہ تھی دعوتِ شام جب نصف شب کے قریب پہنچی تو محفل میں کسی نے کہا کلفٹن چلنا چاہیے۔ کلفٹن اس زمانے میں ایک ویرانے کا نام تھا۔ میٹروپول ہوٹل سے کلفٹن تک دس بارہ گھر آباد تھے باقی صحرا تھا۔ احباب کا قافلہ کلفٹن پہنچا۔ کلفٹن کا منظر ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔ سمندر کے اوپر آسمان پر نصف شب کا چاند، ساحل پر حد نظر تک پھیلا ہوا ریگ زار اور سمندر کی ہلکی سی آواز جو خاموشی کو مزید گہرا کرتی تھی میرے یاروں میں اداسی کچھ اس لیے بھی زیادہ تھی کہ میں پھر انگلستان کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا۔ کسی نے تجمل حسین سے کہا "غزل سناؤ" ان دنوں راجہ تجمل حسین اور جمیل الدّین عالی کی سنگت یاراں بہت تھی۔ تجمل گانے میں سریلے اور ترنم میں بہت اچھے تھے۔ انھوں نے عالی کی ایک نئی غزل سنانا شروع کی اور سماں باندھ دیا۔ پھر غزل میں وہ شعر آیا جو گویا چوکھٹا حافظے کی دیوار پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہے:

جانے کیوں اُس در و دیوار کا پابند ہوا
میں کہ منسوب کیے جاتے تھے صحرا مجھ سے

میں ریگزارِ ساحل پر نیم دراز تھا، سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا "یارو جہاں ایسے شعر کہے جا رہے ہوں میں اس ملک کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا" پھر دمادم کہا اور رقص مستی شروع کر دیا۔ اب تمام احباب کلفٹن کے ساحل پر رقصِ درویشاں میں مصروف تھے کہ تجمل حسین نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "سب کے سامنے اعلان کرو کہ تم اب واپس انگلستان نہیں جاؤ گے۔" میں نے اعلان کیا تو پھر جو رقص درویشاں ہوا اس کے نشان پاریگِ ساحل پر تو نہیں البتہ اس ریگِ رواں میں ضرور محفوظ ہیں جو اس جسم و جاں کا حصہ ہے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جب کراچی آتا ایک سوال اپنے ساتھ لے کر جاتا کہ حمید نسیم نے ریڈیو کی ملازمت ترک کیوں نہ کی۔ پھر عالی کا شعر ذہن میں گونجنے لگتا "میں کہ منسوب کیے جاتے تھے صحرا مجھ سے" آہستہ آہستہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے ریڈیو پاکستان اور حمید نسیم کا رشتہ کچھ ایسا ہے جیسے مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا میں خانم صاحب اور میرزا جی کا تھا۔ آپ کو شاید وہ ٹکڑا یاد ہو، پھر بھی سن لیجیے:

"خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں؟ پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے۔
ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہ فہمائش کہا "جاؤ چھوکریو، نہیں معلوم اس زمانے کی

محبتیں کس قسم کی ہیں، ایک ہمارا زمانہ تھا۔ پھر میرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو ایک یہی مرد بیٹھے ہیں، جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی آپ مانجھے کا جوڑا پہن کر مجھے دکھانے آئے میں نے مانجھے کے جوڑے کے پُرزے پُرزے کر دیے۔ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا۔ آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو کوئی ہے ایسا تمھارا بھی۔"

سب نے یہ سن کر سر جھکالیا۔"

ریڈیو پاکستان نے حمید نسیم کے مانجھے کے جوڑے کے پُرزے پُرزے تو نہ کیے البتہ ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا کہ اب تو نہ جانے دیں گے لیکن میرے خیال میں اس میں کمال ریڈیو پاکستان کا نہیں حمید نسیم کا تھا اور اس صورتِ حال پر از سرِ نو غور کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے پیچھے قدرت کا ایک اٹل اور بامعنی فیصلہ تھا۔ حمید نسیم کا جوہر ہی ایسا تھا کہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک ہی آستانے کے ہو رہیں۔ اس سے انھیں جم کر پڑھنے لکھنے کا موقع میسر آیا اپنے مطالعے کو ترتیب دینے اور مشاہدے کو مرتب کرنے کا وقت ملا۔ کراچی کی مٹی نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور یہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنا وہ ذہنی کمپیوٹر تیار کیا جو اس وقت ان کا اور ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کمپیوٹر میں انھوں نے عمر بھر کا شعری اور ادبی مطالعہ جمع کر لیا۔ پھر فلسفہ، مابعدالطبیعیات، قرآنی تعلیمات، حدیث، فقہ، تصوف، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، یہودیت، مسیحیت اور بدھ مت کے مطالعے اس کمپیوٹر میں گئے۔ پھر ذاتی ترجیحات، تعصبات، مذہبی اور جذباتی واردات اس کا حصہ بنے اور سب سے بڑھ کر ازلی حقیقتوں کا وہ حصہ جو ان کا مقدر ہوا تھا اس میں جمع ہوئے۔ وہ لوگ جو اس سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ اس میں کیا کیا کچھ ہے۔ آج کل اس کمپیوٹر کی بہار دیدنی ہے۔ بہت سی چند اہم شعری اور نثری تصنیفات سے ہم بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ بہت سی زیرِ طبع ہیں اور بہت سی اس کمپیوٹر سے برآمد ہونے کے لیے مچل رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہیں اس شہر ریگزار کراچی میں حمید نسیم کے مقدر میں اس خدا رسیدہ بزرگ سے ایک ملاقات طے تھی جس ایک ملاقات نے ان کو الکتاب تک اور ہمیں "تعارف لفرقان" تک پہنچادیا۔

حمید نسیم نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا:

> "تعارف الفرقان میں نے خود نہیں لکھی تھی میری یہ اوقات کہاں تھی۔ ایک خدارسیدہ آدمی نے مجھ سے کہا تھا یہ کام تمھیں کرنا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی رضا یہی ہے۔ میں نے صرف تعمیل کی۔ پھر خدا شاہد ہے۔ صرف ہاتھ میرا تھا قلم سے لکھتا کوئی اور تھا شاید وہی بزرگ لکھتے تھے۔"

برسوں سے میری اور حمید نسیم کی ملاقات کا ذریعہ صرف ایک ہے، محکمہ ڈاک ویسے یہ ملاقات محکمہ ٹیلی فون کے توسط سے بھی ہو سکتی ہے مگر کیا کیا جائے کہ ڈاک سے جو ملاقات دس روپے کے ٹکٹ سے ہوتی ہے وہ شاید ٹیلی فون پر ہزار دو ہزار کے بل سے ہو سکے۔ میرے پاس حمید نسیم کے کوئی سو سوا سو خط موجود ہیں۔ ضیا جالندھری کے پاس شاید ڈھائی تین سو خط ہوں گے بولا ہوا لفظ دراصل ہوا کی امانت ہو جاتا ہے۔ لکھا ہوا حرف تاریخ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اب ان کے ایک خط کے اقتباس اور اپنے جواب پر ختم کلام کرتا ہوں۔ حمید نسیم کا خط اسی سال کی تین مئی کا لکھا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے دو دن پہلے ایک کتاب تصوّف پر پڑھی تھی حسین حضرت جنید بغدادی کا شاگرد تھا۔ ایک بار حضرت جنید نے حسین کو تنبیہ کی جب اس نے صحو اور سکر کے عالم کا ذکر کیا کہا کہ تم صحو اور سکر کے معنی ابھی نہیں سمجھے ہو پھر ایک مختصر توضیح ان مقامات کی فرمائی از آں بعد جب حسین کی عقوبت کا آغاز ہوا تو حضرت والا بے تعلق رہے۔ میں نے یہ وارداتیں پڑھیں تو دو راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں کہ میں اپنے دل میں حسین منصور کے لیے ایک عجیب تڑپ اور ایک ربط خاص محسوس کرتا تھا۔ پرسوں رات ایک اور کتاب پڑھی جس میں اس کے مصلوب ہونے کا ذکر تھا۔ اسے مقتل میں لایا گیا جب اس نے صلیب اور زنجیریں دیکھیں تو اتنا ہنسا کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اس پر جلاّد نے اس زور کا گھونسا اس کے منہ پر مارا کہ اس کی ناک اور منہ سے خون جاری ہوگیا۔ شبلی یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئے۔ منصور نے نماز پڑھی دو رکعت نفل، پھر دعا مانگی اے اللہ، میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو مجھے اس فضل و کرم کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو تو نے میرے حال زار پر کی۔ تیرا کرم یہ ہے کہ تو نے مجھے روئے تاباں کی وہ ضو دکھائی جو تو نے اوروں پر ظاہر نہیں کی اے اللہ تیرے بندے جو مجھے تیرے دین کی حمایت میں قتل کرنے آئے ہیں اور مجھے قتل کر کے تیری خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں معاف فرمادے اور ان پر رحم کر۔ کیوں کہ اگر تو ان پر وہ حقیقت ظاہر کر دیتا جو تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے تو یہ لوگ وہ کام نہ کرتے جو کریں گے اور اگر تو مجھ سے اسے پوشیدہ رکھتا تو میں اس آزمائش میں مبتلا نہ ہوتا۔ جلاّد نے ایک اور گھونسا مارا۔ اس کے چہرے سے خون ٹپکتے دیکھ کر شبلی نے چیخ ماری کپڑے پھاڑ ڈالے اور غش کھاگئے۔

پھر مجھے حضرت مسیح اور حسین بن منصور کی آزمائش کی مماثلت نے دوگونہ عذاب میں مبتلا رکھا لیکن حضرت مسیح کے ہاتھ اور پاؤں صلیب پر لٹکانے سے پہلے نہیں کاٹے گئے تھے۔ یہ اضافی اذیت مسلمان ذہن کی ایجاد تھی۔"

اسی خط میں آگے چل کر حمید نسیم لکھتے ہیں:

"اعجاز، اب یہ ایک سراسر سچا اعتراف ہے میں نے محسوس کیا کہ یہ سب واقعہ مجھ پر گزرا ہے اور پھر یکایک ایک آواز میرے اندر سے آئی ناپاک، پاک بندوں میں خود کو تحلیل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی روسیاہی کو دیکھ اور ڈوب مر۔ ساری رات کرب میں گزری آنکھوں سے آنسو برابر گرتے رہے پھر میرا وجود پتھر کی طرح ہوگیا۔ جان عزیز، مجھ پر یہ لمحے بڑے کٹھن آتے ہیں۔ اب لکھ رہا ہوں تو آنسو پھر ٹپکنے لگے ہیں حسین بن منصور کی تقدیس دروں پر اور اپنی کم اوقاتی پر۔ چوبیس برس سے زیادہ مدت ہوگئی خود کو ہر رات ملامت کرتے۔ شاید تم میرے ساتھ دو تین روز دن رات رہو تو تمھاری آنکھوں کی رو مجھ کو میری مخفی

ناپسندیدہ شخصیت صراحت سے دکھا دے جسے جان کر میں اسے تج سکوں۔ یا شاید تمھاری آنکھیں مجھے یہ بتادیں کہ میں بے وقوف اور سادہ لوح تو ہوں مگر جھوٹا اور فریب کار نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ میرے مالک نے میرے نفس کو مٹا دیا تو میں وہی کہتا ہوں جو مجھے محسوس ہوتا ہے لیکن میں اس امکان سے غافل نہیں کہ یہ اندر کا مشاہدہ بھی میری روح کی آنکھ نہیں میری نخوت کی آنکھ دیکھ رہی ہو جسے میں ابھی اندھا نہیں کر سکا۔ خاصی دیر سے ایک ملامتی صوفی بنا ہوا ہوں صوفی بہت کم ملامتی بہت زیادہ۔"

یہ چھ صفحے کا خط میرے لیے ایک خاص طرح کے روحانی کرب کی نوید تھا۔ جس میں میں کئی دن تک مبتلا رہا۔ تین چار روز تک یہ خط پڑھتا رہا۔ اداس ہو جاتا تو میز پر رکھ دیتا سوچتا اس کا جواب کیا لکھوں۔ اس کے جواب میں کوئی بہت سنجیدہ خط لکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ چوتھے روز ہمت ہوئی تو انھیں خط لکھنے بیٹھا۔ جی چاہتا تھا کہ ایسا خط لکھوں جسے پڑھ کر وہ روئیں نہ اور اگر ہو سکے تو شاید مسکرا دیں:

"حمید نسیم اتنے گناہ تو نہ تھے جتنا احساس گناہ ہوا۔ یہ کیا کہ بندہ خواہ مخواہ جان کو ہلکان کرے جب وہ خود بار بار رحمت کی نوید دیتا ہے۔ یہ بندے کی زیادتی ہے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنا چاہتا ہے اور جو کل ہونے والا ہے اسے آج دیکھنا چاہتا ہے۔ خود ہی فتووں کا بازار گرم کرتا ہے۔ پھر اپنا قاضی بن کر اپنے خلاف فیصلہ دیتا ہے اور پھر خود کو کوڑے لگانے لگتا ہے۔

مولانا عین ممکن ہے کہ وہاں یہ سب کچھ نہ ہو اور پیغام بھی شاید یہی ہے کہ اس دنیا میں نیکی سے اپنی روح کو مطمئن کر لو تو وہاں بھی خوش رہو گے۔ تو پھر اپنی جان ناتواں کو عذاب میں کیوں ڈالتے ہو۔ وہ جو بخش دینے والوں میں سب سے بڑا ہے۔ وہ جو معاف کر دینے والوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ جو بندے کی ایک ادا پر لاکھ گناہ معاف کر دیتا ہے اس کی بشارت پر کیوں نہ کان دھریں، عذاب اور عقوبت سے ڈرانا ملا کا کام ہے۔ صوفی ہمیشہ اس کی رحمت پر نظر رکھتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بنی نوع کے لحاظ سے منصور حلاج بھی میں تھا۔ گوتم بھی میں تھا مسیح مصلوب بھی میں ہی تھا مگر وہ بڑے میں چھوٹا میرے خواب چھوٹے، میرے کام چھوٹے، شاید میرے عذاب بھی چھوٹے میں اپنا مقابلہ ان سے کیوں کروں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ انھوں نے جو کیا مجھے اس کی معرفت کسی حد تک عطا کر دی گئی۔ میں اسی میں مست ہوں کہ ان کی نوع میں ہوں ورنہ کوا ہوتا تو ہر وقت منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا۔ مینڈک ہوتا تو رات بھر ٹراتا اور مچھلی ہوتا تو ساری عمر پانی میں تیر کر بسر کر دیتا۔ خوش ہوں کہ اب نوع بشر میں ہوں جس کی سوچ کا دھارا اتنا عظیم اور ماضی ایسا قدیم ہے اس کا متلاشی بھی ہوں اور اپنی تلاش میں اور اس کی بندگی میں ہمہ تن مشغول اور میں تو

اس کارواں کا بہت ناچیز مسافر ہوں اور خود اس نے کہہ رکھا ہے کہ وہ میرے کندھوں پر اتنا ہی بوجھ ڈالے گا جتنا وہ اٹھا سکیں۔ مولانا، ناکردہ گناہوں کی حسرت ہی کافی ہے ان کا بوجھ نہ اٹھاؤ۔

یہ جسم کی حسیات، یہ ذائقہ اور خوراک، یہ شامہ اور خوشبو، یہ قوت سامع اور موسیقی، یہ جسم کی طلب اور ملاقاتوں کے موسم، یہ سب اسی کی عطا تھے ساری عمر اس کی نعمتوں کی شکر گزاری میں بسر ہوئی اور باقی بھی اسی طرح بسر ہو کہ وہاں بھی اس کی نعمتیں میسّر ہوں تو مولانا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ جیسا گناہ گار کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا اور تم تو خدا کے نیک بندے ہو۔ میں تو صرف یہ کرتا ہوں کہ جن چیزوں کے کرنے سے دل پشیمان ہوتا ہے ان سے اجتناب کرتا ہوں اور جن کے کرنے سے دل مطمئن ہوتا ہے ان کے لیے آمادہ رہتا ہوں۔ "ربا میرے حال دا محرم توں" مولانا: خدا تمھیں خوش رکھے مگر خوشی کی طمع سے بچائے۔"

ہوا یہ کہ حمید نسیم کے ذہن پر جب بہار آئی اور تخلیقی عمل اپنے شباب پر ہوا تو ان کا جسم بیماری کے پہ بہ پہ حملوں سے نزار ہو گیا۔ ٹیلی فون پر مختصر سی گفتگو پر وہ ہمیشہ مجھے اپنی موت سے ڈراتے ہیں اور میری طرف سے یہ مختصر گفتگو ہمیشہ ایک ہی فقرے پر ختم ہوتی ہے "حمید نسیم ابھی مرنا نہیں۔" آج بھی یہ عرضِ کلام اسی تاکید اور دعا پر ختم کرتا ہوں۔

قومی زبان (۱۷) دسمبر ۱۹۹۳ء

حمید نسیم ایک تعارف

ضیا جالندھری

میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ مجھے اس تقریب میں شمولیت کا موقع دیا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی یہ روایت لائق تحسین ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے خدمت گزاروں کی عزت افزائی اور قدردانی کے طور پر انھیں نشانِ سپاس پیش کرتی ہے اور آج کا اجلاس تو خصوصی طور پر ہمارے شکریے کا مستحق ہے کیوں کہ یہ ایک بڑی ہمت کی بات ہے۔ یہ اجلاس ایسے وقت میں منعقد ہو رہا جب محبی مشفق خواجہ اپنے برادر نسبتی کے صبر کن حادثے کی آزمائش کی گھڑی سے گزر رہے ہیں اور ہمارے دوست اسلم فرخی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسپتال میں گزار کر آئے ہیں۔

آج ہم جس ادیب کو نشانِ سپاس کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور کئی رنگ۔ ان میں سے ہر ایک ایسا کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست مجھے تو اس عہد میں کوئی دوسرا شخص ایسا کثیر الجہات نظر نہیں آتا اکثر پرانے جاننے والوں پر بھی ان کی ذات کی پرتیں ظاہر ہوتی ہیں تو وہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ماضی قریب میں ہوا پاکستان ٹیلی ویژن پر اُن کی اوّلین تصنیف "تعارف الفرقان" کی پہلی جلد کا تعارفی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ اس کتاب پر اظہارِ خیال کے لیے تین اصحاب کو دعوت دی گئی تھی۔ مصنّف بھی اس پروگرام میں موجود تھے۔ کتاب پر گفتگو کرنے والوں میں ایک مشہور صحافی بھی تھے جن کا ادب سے بھی سرسری سا تعلق تھا۔ وہ حمید نسیم کو برسوں سے جانتے تھے۔ وہ اس پروگرام میں شروع سے آخر تک کبھی استہزا اور تمسخر سے، کبھی حیرت سے بار بار اس بات کا اظہار کرتے رہے کہ حمید نسیم جیسا شخص ایسی مذہبی، عالمانہ اور ثقہ کتاب کا مصنّف کیسے ہو سکتا ہے۔ ہر چند جناح کیپ سر پر سجائے، اچکن کسے، اور داڑھی ترشوائے حمید نسیم مجسم متشرع مولوی نظر آ رہے تھے مگر وہ جس حمید نسیم کو جانتے تھے اس کی ساری عمر تو اور طرح کے رنگ اور رونق میں گزری تھی وہ حمید نسیم تو ایک خوش مزاج شاعر تھا۔ ریڈیو کا ایک افسر تھا جس کی ساری عمر ڈرامہ آرٹسٹوں اور گانے والوں اور گانے والیوں کے درمیان گزری تھی جس نے گانے کی دھنیں بنانے اور موسیقی کو فروغ دینے میں زندگی صرف کر دی تھی جس کے گرد خواتین کا ہجوم ہمیشہ حلقہ کیے رہتا تھا۔ جن کی محبتوں کے قصے زبان زدِ عام تھے۔ جو کئی سال تک پی آئی اے کی طرف سے رقاصاؤں کے طائفے ساتھ لے کر ملکوں ملکوں پاکستانی ثقافت کی نمائندگی کرتا رہا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک غیر ملکی خاتون اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے وطن سے یہاں تک آ گئی تھی بھلا ان خوبیوں کا شخص وہ کیسے ہو سکتا ہے جس نے اتنی اہم کتاب تصنیف کر دی کہ قرآن کی تفاسیر میں اُسے ایک اہم مقام دیا جانے لگا اور جس کی پذیرائی نہ صرف اخباروں، رسالوں میں ہوئی

بلکہ علماء کے ایک بڑے حلقے نے بھی اس کو ایک مستند تفسیر جانا۔ حمید نسیم انھیں سمجھاتے رہے کہ بھئی میں ایک "تائب مسلمان" ہوں۔ مگر ان کی حیرت تھی کہ جاتی ہی نہ تھی وہ کہے جا رہے تھے کہ حمید نسیم صاحب آپ تو دیکھیے نا آپ تو، وغیرہ وغیرہ ان کی سمجھ میں شاید لفظ تائب کا پورا مفہوم نہ آ رہا تھا۔ حمید نسیم یہ کہنا چاہتے تھے کہ بھئی ہم ایسے گناہگاروں کو زندگی کے ایسے بہت سے رنگ دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے جو اوّل سے آخر تک نیک اور پرہیزگاروں کو غالباً نہیں ملتا اس لیے کچھ ایسے زاویے بھی ہم پر روشن ہو جاتے ہیں جو یکسو زندگی گزارنے والوں کی نظر سے چھپے رہتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں سے اکثر کا ذکر حمید نسیم نے اپنی خود نوشت سوانح "ناممکن کی جستجو" میں بڑی صداقت، جسارت اور بے تکلفی سے کیا ہے۔ اس لیے یہاں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اور ان تبصرہ کرنے والے نقاد کی حیرت بھی بجا تھی کہ اس وقت تک حمید نسیم کی خود نوشت بھی شائع نہیں ہوئی تھی اور انھیں حمید نسیم کی شخصیت کے ایک اہم پہلو سے واقفیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ مگر حمید نسیم کو جاننے والوں میں سے اکثر کو اس بات پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایسے صاحب کمال کی زندگی کے ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر تک کوئی ایک کتاب بھی شائع نہ ہوئی تھی اور پھر جب ان کی کتابیں شائع ہونے لگیں تو حیرت انگیز تیزی رفتار سے سامنے آنے لگیں۔ تفسیر کی پہلی جلد وسط ۱۹۸۷ء میں چھپی۔ اس وقت سے اب تک محض پانچ چھ برس کے عرصے میں ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تین چار زیر طبع ہیں۔ تعارف الفرقان کی پانچ ضخیم جلدیں، غزلوں کے دو دیوان دودِ تحیر اور جستِ جنوں، اور خود نوشت سوانح "ناممکن کی جستجو" تو طبع ہو چکیں اور جو کتابیں زیر طبع ہیں ان میں ایک کتاب اقبال کے کلام کے تنقیدی جائزے کی ہے ایک پانچ جدید شعرا پر تنقیدی مضامین کی ہے اور غالباً تیسرا دیوان بھی تیاری کے مرحلوں میں ہے ان کے علاوہ ان کی اسلام پر ایک کتاب بھی انگریزی زبان میں تھی شائع ہو رہی ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ کتابیں زندگی کے کسی پہلے دور میں لکھ رکھی تھیں اور شائع ہونے کی نوبت اب آئی ہے نہیں یہ سب کتابیں انہی پانچ چھ سال میں لکھی گئی تھیں۔ حیرت ہے کہ جو شخص اتنی صلاحیتوں کا مالک ہے اُس نے عمر بھر کتاب لکھنے یا چھپوانے سے گریز کیوں کیا۔ خصوصاً ایسے زمانے میں جب بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے کئی شاعر صاحبِ دیوان ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بعض تو میر و غالب سے اپنا موازنہ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے یہ اور بات ہے کہ حمید نسیم نے اپنی غزل گوئی کے جوہر کو اس وقت ہی منوا لیا تھا جب اُن کے ہم عمر صحیح طور پر شعر پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے جب پہلی بار حمید نسیم کو دیکھا تو وہ پندرہ سولہ برس سے زیادہ کے نہیں تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں کوئی دو تین برس بڑے ہیں ان دنوں میں اسلامیہ اسکول جالندھر میں پڑھتا تھا ہر چند ہمارے ہیڈ ماسٹر مستنصر باللہ اقبال کے عاشق تھے اور طلبہ کو جمع کر کے اقبال اور دوسرے شعرا کا کلام سناتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔ ہمیں شاعری سے اتنا لگاؤ نہیں تھا جتنا کرکٹ سے تھا۔ شعر کا بس تھوڑا سا چسکا تھا۔ اتنا کہ جب سُنا کہ جالندھر کے کمپنی باغ میں شام کو مشاعرہ ہے تو کچھ دوستوں کے ساتھ وہاں جا پہنچے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جو میں نے دیکھا اور سنا۔ اس میں کچھ شاعر دوسرے شہروں سے بھی آئے ہوئے تھے اور مقامی اساتذہ بھی موجود تھے۔ اس مشاعرے کی دو ایک باتیں جو یاد رہ گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس مشاعرے میں فیض احمد فیض کا کلام سنا تھا۔ انھوں نے وہاں اپنے وہ مشہور قطعے بھی پڑھے تھے جو بعد میں بچے بچے کی زبان پر رواں تھے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

یا

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

س مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر کو بہت داد ملی آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ شاعر حمید نسیم تھا۔ غزل مرصّع اور اُس پر ترنم نہایت عمدہ آواز کھنکتی ہوئی اور دلکش، غرض اُس نوجوان نے مشاعرہ لوٹ لیا اب یقین سے تو نہیں کہہ سکتا جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر یوں ہے کہ:

بھڑک اُٹھتی ہے شمع نیم جاں جیسے دم آخر
تمنا بڑھ رہی ہے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

سامعین کی بے تحاشا داد سے میں اور میرے ساتھی بھی مرعوب ہوئے اور مشاعرے سے واپسی پر راستے میں اس نوجوان شاعر کے بارے میں باتیں بھی کرتے رہے۔

اس کے بعد ایک عرصہ حمید نسیم سے ملنے یا اُسے دیکھنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ میں میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا کالج کے ان چھ برسوں میں حمید نسیم کو دو ایک بار دیکھا مگر اجنبیوں کی طرح ان دنوں حمید نسیم زیادہ تر امرتسر میں اپنے والدین کے ساتھ رہے اور پھر ریڈیو میں ملازمت ملنے پر پشاور چلے گئے۔ ان کا ذکر اکثر سننے میں آتا۔ وہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مباحثوں کے جانے پہچانے ڈیبیٹر تھے اور ہمارے کالج کے اور حلقۂ اربابِ ذوق کے ساتھی اور دوست الطاف گوہر اور اعجاز حسین بٹالوی بھی ان مباحثوں میں شرکت کرتے تھے۔ وہ اکثر مباحثوں سے واپسی پر حمید نسیم کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں حمید نسیم مشاعروں میں بھی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ ہنوز طرحی مشاعروں کا رواج بھی تھا۔ ان کو چراغ حسن حسرت، تاثیر اور فیض کا قرب حاصل تھا اور اکثر انہی کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

ایک مشاعرہ کا حال جو انھوں نے ہمیں سنایا دلچسپی سے خالی نہیں۔ آپ بھی سن لیں۔ یہ ان دنوں اپنی تعلیم مکمل کر کے امرتسر میں اپنے والدین کے پاس تھے۔ وہ تنگی کا زمانہ تھا ان دنوں گھر کے مالی حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ ان کے والد ملازمت ختم ہونے کے بعد گھر ہی میں ہوتے تھے۔ حمید نسیم کو بھی ابھی کوئی ملازمت نہ ملی تھی۔ ایسے میں حمید نسیم کو لاہور سے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے دعوت نامہ ملا جس میں یہ نوید بھی تھی کہ مشاعرے میں شرکت کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ حمید نسیم نے جھجکتے جھجکتے اپنی ماں سے لاہور تک کا کرایہ مانگا۔ جو ماں نے کسی نہ کسی طرح انھیں مہیا کر دیا انھیں اطمینان تھا کہ لاہور میں اپنے ایک بزرگ شاعر دوست کے گھر ٹھہریں گے اور معاوضے کے پیسے لا کر ماں کے حوالے کر دیں گے یہاں میں اس بزرگ شاعر دوست کا نام نہیں بتا سکتا کیوں کہ حمید نسیم نے ان کا پردہ رکھنے کے لیے اپنی خود نوشت سوانح میں اس پورے واقعے کا ذکر تک نہیں کیا۔ خیر یہ اس دوست کے گھر دوپہر کے کھانے کے بعد پہنچے تھے لہٰذا دوپہر کو بھوکے رہے۔ رات کو وہ دوست اپنی بیوی کے ساتھ کہیں کھانے پر مدعو تھے گھر میں رات کا کھانا پکا ہی نہیں۔ یہ بغیر کھانا کھائے رات بھر سونے کی کوشش کرتے رہے صبح کا ناشتہ آیا تو اتفاق دیکھیے کہ یہ ابھی غسلخانے میں دانت ہی صاف کر رہے تھے کہ ان سے ملنے ان کے دوست عبداللہ ملک آ گئے جن کے نام کی مہر ناشتے کے سب دانوں پر لگی ہوئی تھی۔ اب یہ تین وقت کے فاقے کے ساتھ اپنے اور ہمارے مشفق اُستاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے گھر پہنچے۔ صوفی صاحب نے حال پوچھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اس کے بعد

قومی زبان (۲۰) دسمبر ۱۹۹۳ء

صوفی صاحب نے صرف اتنا پوچھا کہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو جواب ملنے پر وہ اٹھ کر اندر گئے اور ذرا سی دیر میں گرما گرم قیمے والے پراٹھے آنے شروع ہو گئے ادھر یہ کھاتے جاتے تھے اور روتے جا رہے تھے ادھر صوفی صاحب کی آنکھیں ان کی حالت دیکھ کر نم تھیں۔ بہر حال رات کو مشاعرے کے بعد جب ان کو معقول معاوضے کا لفافہ ملا تو اس میں مبلغ پانچ روپے تھے۔ جن سے بہ مشکل تانگے اور ریل کا کرایہ ادا کر کے اپنے گھر واپس پہنچ سکے۔

پھر حمید نسیم کو پشاور ریڈیو اسٹیشن پر ملازمت مل گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ میں ابھی کالج میں تھا جب اچانک مجھے پشاور ریڈیو اسٹیشن سے ایک مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کے کرتا دھرتا حمید نسیم تھے۔ میں پشاور گیا تو وہاں قیام بھی انہی کے گھر ہوا۔ جہاں میرے علاوہ عبدالمجید بھٹی اور ظہیر کاشمیری بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دو اور اصحاب بھی تھے جن کے نام اب یاد نہیں۔ ان دو تین دنوں میں پہلی بار حمید نسیم کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ خیالات کا تبادلہ اس گرما گرمی سے ہوا کہ لگتا تھا ابھی سر پھوٹنے کی نوبت آجائے گی۔ گرمجوشی کا یہ حال کہ جیسے برسوں کے بچھڑے ملے ہوں غرض وہ ایسے دن تھے جن کی یاد عمر بھر ساتھ رہتی ہے۔ یہیں پر حمید نسیم کی مہمان نوازی اور فیاضی کا پتہ چلا یہیں ان کی بے باکی، صاف گوئی اور گہرے علم اور مطالعے کے شوق کا پتہ چلا۔ ان دنوں حمید نسیم سے ان کا کچھ کلام سننے کا بھی موقع ملا۔ حمید نسیم کی بہت سی غزلیں اس زمانے میں بہت مشہور تھیں۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ حمید نسیم بیس بائیس برس کی عمر میں کیسی غزل کہتے تھے ان کی ایک غزل کے کچھ شعر سناتا ہوں یہ غزل ۱۹۴۳ء کی ہے۔ آپ دیکھیں کہ کلام میں کس قدر پختگی ہے اور کس سطح کی غزل ہے:

ناکام حسن حاصلِ دوراں بھی ہو تو کیا
دل کامیاب غم ہے پریشاں بھی ہو تو کیا
اب سطحِ رنگ و بو سے نگاہیں بلند ہیں
اب کوئی صد بہار بداماں بھی ہو تو کیا
اب مٹ چکا نظر سے جفا و وفا کا فرق
اب اپنے دل میں کوئی پشیماں بھی ہو تو کیا
اب شوق ہی نہیں ہے کہ آئے کوئی یہاں
اب اپنا گھر جو بے سرو ساماں بھی ہو تو کیا
تکمیلِ عشق ہے طلب محض کا شعور
اب ذوق وصل ہی نہیں آساں بھی ہو تو کیا

یہ عشق کی وہ روحانی منزل ہے جو رومانی شعرا کی ارفع خیالی کی مظہر ہے اور اُس افلاطونی محبت کی نمائندہ جس میں اُداسی ہے، بے نیازی ہے، تقدس ہے اور اپنے آپ پر بھروسہ ہے حمید نسیم کے طالب علمی کے زمانے کی ایک اور غزل جو ان دنوں بہت مشہور تھی اس کا مطلع ہے:

یوں التفات دوست میں اب بھی کمی نہیں
لیکن وہ ابتدا میں جو اک بات تھی نہیں

یہ مطلع تو "دودِ تہہ" میں موجود ہے مگر اس غزل کا ایک اور شعر مجھے یاد ہے وہ یہ ہے:

لب پر نہیں سوال نظر ملتجی نہیں
ہم تشنہ لب ضرور ہیں ننگِ خودی نہیں

مگر یہ شعر شاید کتاب میں اس خیال سے درج نہیں کیا گیا کہ خودی کا لفظ اقبال سے اس طرح منسوب ہو چکا ہے کہ اب اس لفظ کا استعمال کسی اور شاعر کے بس کی بات نہیں رہا اور حمید نسیم تو ہمیشہ کسی دوسرے شاعر کے خیالات یا ڈکشن کے استعمال سے دامن بچاتے رہے ہیں۔ حمید نسیم کے جوہر شناسوں میں حفیظ جالندھری بھی تھے جنھوں نے یہ سن کر کہ حمید نسیم کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی ہے حمید نسیم کے والد صاحب کو جو ان کے دوست بھی تھے لکھا کہ دیکھو یہ غضب نہ کرنا حمید نسیم کو ریڈیو میں ملازمت نہ کرنے دینا۔ قدرت نے اُسے ایسا جوہر عطا کیا ہے کہ وہ محنت کرے تو ایک دن اپنے عہد کا غالب بن سکتا ہے۔ یہ خط ابھی تک حمید نسیم کے پاس ہے۔ شاید حفیظ کے یہی جملے حمید نسیم کے لیے ترکِ شعر گوئی کا بہانہ بن گئے۔ حمید نسیم ریڈیو پر گیا تو پھر اُسی کا ہو رہا اور ساتھ ہی یہ سمجھ بیٹھا کہ اب ملازمت کر لی ہے تو شعر میں مقام مقصود حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ سو بیکار کی کوشش سے کیا فائدہ اور وہ سب کچھ بھول کر ریڈیو کے پروگرام بنانے میں ایسا مصروف ہو گیا کہ اُسے نہ اپنا ہوش رہا نہ ریڈیو سے باہر کی دنیا کا۔ اصل میں روزگار کے مسئلے کے علاوہ ایک دشواری اور بھی ہے ابلاغ عامہ کے محکمے میں یوں لگتا ہے جیسے کوئی تخلیقی کام ہو رہا ہو۔ اور اظہار کی خواہش کی تسکین کے مواقع میسّر آ رہے ہوں۔ اس طرح فن کی تخلیق کی پیاس رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگتی ہے اور ہوتے ہوتے بجھ سی جاتی ہے اور تخلیقی قوتیں استعمال نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہونے لگتی ہیں۔ شاید حمید نسیم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے اُن سے شعر گوئی ترک کرنے کی شکایت کی تو انھوں نے کہا کہ دیکھو میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے میں اگر غالب نہیں بن سکتا، حافظ نہیں بن سکتا تو پھر جھک مارنے سے فائدہ؟ کمتر درجے کے شعرا کا پہلے ہی یہاں بہت بڑا ہجوم ہے۔ میں ان میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر حمید نسیم نے اپنے آپ کو ریڈیو کے ایک افسر کے طور پر یگانہ ثابت کرنے کی طرف اپنی تمام توجہ مبذول کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ریڈیو کے لیے اُس نے ایسے پروگرام لکھے اور نشر کیے کہ ریڈیو کے نامی گرامی ڈائریکٹر جنرل ذوالفقار بخاری بھی اعتراف کرنے لگے کہ ریڈیو میں حمید نسیم سے پہلے یا اس کے بعد پھر ایسا ریڈیو پروگراموں کو سمجھنے والا اور پروڈیوس کرنے والا نہیں آیا۔

۱۹۴۵ء میں میرا تقرر بھی ریڈیو کے محکمے میں ہو گیا تھا۔ آزادی کے وقت میرا اور اعجاز حسین بٹالوی کا دلّی سے لاہور تبادلہ ہو گیا اور حمید نسیم بھی پشاور سے لاہور بلائے گئے تھے وہ قیامت کے دن تھے حمید نسیم نے ریڈیو اسٹیشن کے ایک غسلخانے کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ لوگ لٹے پٹے آتے ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے پیغام لکھتے۔ ان کی روداد سن کر روتے اور پھر ان کے پیغام اس امید پر نشر کرتے کہ شاید کوئی سن لے اور اپنے عزیزوں سے آ ملے۔ پھر حمید نسیم کو نسبت روڈ پر ایک چھوٹا سا گھر مل گیا جہاں اس کا کل خاندان گورداسپور سے لٹ لٹا کر جانیں بچا کر آ بسا۔ سال بھر کے بعد ہم دونوں کو لاہور سے کراچی تبدیل کر دیا گیا جہاں ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے دارالسلطنت سے ایک نئے اسٹیشن کا آغاز ہونا تھا۔ میں ریڈیو میں زیادہ دیر تو نہیں رہا مگر کراچی میں حمید نسیم کے ساتھ میرا قرب کوئی اٹھارہ بیس سال رہا دن رات کے اس ساتھ کا ذکر حمید نسیم نے اپنی خود نوشت میں اس طرح کر دیا ہے کہ اب میرے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اسی دوران میں ایک عجیب بات ہوئی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں حمید نسیم نے اچانک پھر غزلیں کہنا شروع کر دیں اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۷ء تک کوئی پچیس تیس غزلیں کہیں اور مزید یہ کہ ان

میں سے بہت سی غزلیں مختلف رسالوں میں خصوصاً "سات رنگ" کراچی میں چھپ بھی رہیں۔ ان غزلوں کے چھپتے ہی ملک بھر میں بلکہ باہر بھی حمید نسیم حمید نسیم ہونے لگی۔ مجھے یاد ہے کہ کئی احباب نے مجھ سے کہا کہ حمید نسیم کو کسی طرح راضی کر کے اس کی غزلوں کا ایک مجموعہ شائع کروا دیا جائے۔ حمید نسیم یہ بات سننے کو تیار ہی نہ تھے اور پھر ان کی بے پروائی سے ان میں سے کچھ غزلیں تو نہ جانے کدھر گئیں جو چھپ گئی تھیں وہ البتہ محفوظ رہیں اور اب ان کی غزلوں کی پہلی کتاب دودِ تحیر میں ان میں سے ۱۹ غزلیں شامل ہیں اور پھر جس طرح ان کی طبیعت میں یکایک اُبال آیا تھا اسی طرح طوفان اتر بھی گیا اور ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۷ء تک بیس سال انھوں نے شاعری کی طرف رخ نہیں کیا۔ لیکن ان کی غزل گوئی کے تیسرے دور تک آنے سے پہلے ذرا دیر اس دوسری غزل پر دم لے لیں اور ان کی اس دور کی غزلوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔ اس دور کی شاعری کا پہلا شعر ہمیں ان کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے:

حافظ کو گلگشتِ معلیٰ، غالب کو خورشید جمال
ہم کو ملے مضمون غزل کے دودِ تحیر گردِ ملال

دیکھیے ان شعرا کے اور اپنے زمانوں کے حالات کا کیسا بھرپور موازنہ ہے اور آج کے فنکار اور اس زمانے کے فنکار کے مضامین کا ہی نہیں بلکہ ان کی مجبوریوں اور اقدار تک پر کیا سیر حاصل تبصرہ ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ ان پر بات کرنے کی بجائے وہ غزلیں اُن سے سنتے رہیں اور لطف اندوز ہوں کہ اس سے بہتر ان غزلوں پر اور کوئی تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ مگر یہاں وقت کی کمی کے باعث ان میں سے صرف چند ایک شعر سنانے پر اکتفا کروں گا۔ یہ غزلیں ان کی ابتدائی غزلوں سے یوں مختلف بھی ہیں کہ اب ان میں عنفوانِ شباب کی فسردگی نہیں ہے اور روایتی غم پیچھے کو سرک گیا ہے۔ اُس کی جگہ پختہ فکر نے لے لی ہے اعلیٰ انسانی اقدار نے لے لی ہے اب غزلوں میں ایک نوع کی رجائیت اور امید بھی ہے ہمت اور حوصلہ بھی ملاحظہ کریں:

کب تک یوں اے روحِ زمانہ ہستی کا یخ بستہ جمود
ڈھونڈ کہیں سے ناوکِ آتش برق کوئی دامن سے نکال
شہر طرب سنسان پڑا ہے کوچہ کوچہ ویراں ہے
آئے کہیں سے نعرہ یا ہو ایسا بھی کیا قحطِ رجال

اس دور کی غزلوں میں اور بھی بہت سے گہرے رنگ ہیں۔ مارشل لاء کے جبر کی داستانیں ہیں۔ انسانوں کے دکھ سکھ کی باتیں ہیں۔ محبت کے معاملات، احساس کی نزاکتیں، نفسیات کی باریکیاں، ادبار کے غم غرضیکہ پورا جہان اس دیوان میں آباد ہے اور پھر جس حسن اور خوبی سے حمید نسیم کی غزلوں میں یہ سب کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل منفرد ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کا وقار اور ذاتی پندار ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ کہا تھا کہ اچھی شاعری میں شاعر اپنی شخصیت کے اظہار سے گریز کرتا ہے مگر یہ بات صرف وہی شاعر کر سکتا ہے جس کی شخصیت ہو۔ حمید نسیم کے غم کا بیان بھی کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے وہ اپنی ذات کو ذرا دور ہٹ کر دیکھ رہا ہو۔ مجھے تو اکثر یوں لگا کہ جہاں دوسرے شاعر لفظوں سے جھونپڑیاں یا مکان تعمیر کرتے ہیں حمید نسیم الفاظ سے قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ان کی غزلوں میں لفظ اتنے پائیدار معلوم ہوتے ہیں جیسے اہرام کے پتھر ہوں یہاں ان کی ایک غزل کے کچھ شعر سنانے کی اجازت دیجیے:

یہ تاروں کی مدھم لو ہے یہ جنگل کی وحشی آگ
پل پل اس کا رُوپ جدا ہے زیست ہے گُپت سروں کا راگ
روپ ہی روپ ہو ارض و سما میں ایسا کوئی سواد نہیں
ناچیں مور اور پنکھ دکھائیں پاس ہی شور مچائیں کاگ
جاگی مٹی کی خوشبو سے ہر امکاں کو نمود ملی
ساون سیر مچلتے دھارے مہکی پروا بپھرے ناگ
خیر اور شر تو دو لہریں ہیں زیست کے بہتے دریا کی
دو لہریں دریا تو نہیں ہیں دریا رنگ لگن ہے نہ لاگ
آج اتار دیے ہیں میں نے دکھ اور سکھ کے پیراہن
اب میں ازل کی عریانی ہوں یہ عریانی سدا سہاگ

اس قدرتِ کلام کے باوجود حمید نسیم کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ مکمل ابلاغ ممکن نہیں۔ اس موضوع پر ان کے چند ایک شعر ملاحظہ کریں:

عمر بھر لفظ سجائے لیکن
ان میں یہ حسن خدوخال کہاں
تجھکو دیکھا تو کھلا دل پہ یہ راز
کتنی بے مایہ ہے توفیق بیاں
عمر گنوا کر اب جانا ہے بے حاصل تھی سعیِ ہنر
اپنی حقیقت سے ناواقف اور لفظوں کا صورت گر
اپنے پھیکے رنگ دکھا کر اکثر مجھ پر ہنستے ہیں
کانچ کے ٹکڑے جن کو میں نے جانا تھا انمول گہر

اس دور کی سب غزلیں تو یہاں سنانا ممکن نہیں ہاں غزل کے اس پورے دور پر ان کے تبصرے کے طور پر ایک شعر ضرور سن لیجیے:

زیست سہی اک تیرہ شبستاں لیکن یارو شعلۂ عشق
اک دو نفس تو ایسا بھڑکا طور مثال تھا دل کا دیار

مگر یہ طور بھڑک کر ایک بار پھر بجھا تو بتیس برس تک بجھا رہا۔ یہ لمبی چپ اصحابِ کہف کی نیند کی طرح ان پر چھائی رہی۔ لیکن یہ نیند صرف شعر کی حد تک تھی یوں وہ ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ ریڈیو پی آئی اکیڈمی دنیا بھر کے ممالک میں بکار سرکار گھومنا، موسیقی، رقص، قومی اور بین الاقوامی عشق، بیوی۔ بیوی سے سالہا سال کی دوری، تنہائی میں شدید جملات کے صدمے، بیوی کی گھر واپسی، غرضیکہ ہر طرح کے تجربوں کے باوجود شاعری سے سختی سے پرہیز کرتے رہے اور ۱۹۸۷ء میں پھر ایک بار دفعتاً اس اولین محبوبہ یعنی شاعری نے اپنی کشش کا ثبوت دیا اور حمید نسیم نے پھر غزل کہنا شروع کی اور اب تک یہ سلسلہ تاحال جاری ہے اگرچہ بیچ میں وقفے آئے مگر وہ ایسے وقفے تھے کہ دھارا کے مکمل طور پر سوکھنے کی نوبت نہیں آئی اور اس دفعہ ایک اور حیرت انگیز

قومی زبان (۲۴) دسمبر ۱۹۹۳ء

بات یہ ہوئی کہ حمید نسیم اپنی غزلوں کا مجموعہ شائع کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ اب اُن پر کسی ہمہ وقتی ملازمت کی پابندی نہیں تھی سوچنے اور شعر کہنے کی فرصت زیادہ تھی۔ وہ شعر جلد بازی میں نہیں کہنا چاہتے تھے۔ جب وقت میسّر آیا اور انھیں اپنی اس محبوبہ کی طرف دھیان دینے کا موقع ملا تو انھوں نے بھرپور توجہ دی۔ کیا مصروفیت میں اپنی محبوبہ یاد نہیں رہتی، یہ عجیب و غریب سوال ہے مگر شاید یہ کسی حد تک درست بات بھی ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ چناں قحط سالی شدا اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق۔ اگر قحط سالی عشق کو فراموش کرواسکتی ہے تو زمانے کے کچھ ایسے دکھ بھی ہیں جو بقول فیض محبت سے بھی سوا ہیں۔ ہومر نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جنگ کے بعد ہم لوگ واپس آئے، کھانا کھایا، آگ تاپی اور پھر بیٹھ کر مرنے والے ساتھیوں کو یاد کیا اور ان کی یاد میں روئے۔ سو دوستوں کی یاد میں رونے کے لیے بھی زمانے کے دھندوں سے فارغ ہونا پڑتا ہے۔ اگر رونا خلوص سے ہو ورنہ ٹسوے تو ہر وقت دکھانے کے لیے بہانے جا سکتے ہیں اور پھر جنازے پر بیٹھے بیٹھے ہی لطیفے بھی سنے سنائے جا سکتے ہیں مگر حمید نسیم بہت مخلص اور سنجیدہ آدمی ہیں وہ شعر کی محبوبہ کی طرف اسی وقت مائل ہوئے جب وہ اُسے پوری توجہ دے سکتے تھے اور جیسا کہ ہمارے مرحوم دوست سلیم احمد نے کہا ہے شاعری بھی عورت کی طرح پورا آدمی مانگتی ہے اُسے کسری آدمی سے نفرت ہے مگر یہ سب تو میرے اندازے ہیں۔ اس سلسلے میں خود حمید نسیم نے بھی وضاحت کی ہے۔ آئیے ان کی بات بھی سنیں اپنے دوسرے دیوان "جست جنوں" کے دیباچے میں کہتے ہیں۔

> شاعری میرے اندر موجود تھی۔ اسے صرف نشتر سے چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ جو کلام ۱۹۴۴ء تک کہا تھا اسے جس بیاض میں لکھا تھا وہ پشاور کے سہ سالہ قیام میں کھو گئی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۷ء تک کے زمانے میں میں نے بیس پچیس غزلیں کہی تھیں۔ وہ دستیاب تھیں۔ پہلے کلام میں سے تین چار غزلیں یاد میں محفوظ رہ گئی تھیں پھر ۱۹۸۷ء کے دوران میں کچھ مسلسل مربوط غزلیں ہو گئی تھیں۔ اس سارے مواد کو جمع کیا تو محسوس ہوا کہ اس سے تو قابلِ لحاظ مجموعہ مرتب نہ ہو سکے گا کہ کلام کی سطح نہیں ضخامت بھی اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ طبیعت آپ ہی یکسو ہوئی اور رواں ہو گئی۔ اور دسمبر ۱۹۹۱ء سے اگست ۱۹۹۲ء کے عرصے میں متواتر شعر کہتا رہا اگست ۱۹۹۲ء کے اواخر میں سو غزلوں پر مشتمل مجموعہ تیار ہو گیا۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ قصور صرف فرصت کا نہیں تھا۔ اس آگ کا بھی تھا جو اندر ہی اندر کہیں سلگ رہی تھی اور بجھنے نہ پائی تھی اور جس کے باہر نکلنے کے راستے حمید نسیم نے بڑی سختی سے بند کر رکھے تھے۔ یہ راستے بند کرنے کی بات میں نے اس لیے کی کہ یہ حمید نسیم کے مزاج کا ایک بہت اہم حصّہ ہے۔ یہ دفعتاً اپنے آپ پر بعض دروازے بند کر لینا ان کا پرانا وتیرہ ہے نوجوانی میں فیصلہ کیا کہ مشاعروں میں شرکت نہیں کروں گا۔ پھر عمر بھر مشاعروں میں نہ گئے حالانکہ جب انھوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑا ہے ان کی بہت زیادہ مانگ تھی۔ اور جب مشاعروں میں جاتے تھے تو داد سے جھبیں بھر لایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مشاعروں میں رفتہ رفتہ غزلوں کے معیار میں فرق آتا جا رہا ہے۔ لوگوں کا ذوق کمزور پڑتا جا رہا ہے فلمی گیتوں نے ان کی عادت بگاڑ دی ہے۔ شعرا پبلک کی نظر میں اربابِ نشاط کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ بلوچ شعروں پر اور گھٹیا شاعروں کو آسمان پر اٹھا لیا جاتا ہے بس ایک بار طے کر لیا تو پھر مشاعروں میں نہ گئے۔ اسی طرح کسی بات پر ٹیلی وژن سے ناخوش ہوئے تو فیصلہ کر لیا کہ

قومی زبان (۲۵) دسمبر ۱۹۹۳ء

ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام میں شرکت نہیں کریں گے اور اس بات پر ایسے اڑے کہ کسی قسم کی ترغیب، کوشش، دوستی، دھمکی کام نہ آئی۔ جب ٹیلی ویژن سے میرا تعلق تھا تو میں نے بار بار انھیں راضی کرنے کی کوشش کی مگر بے سود یہ کفر صرف ایک بار ٹوٹا اور وہ بھی ان کی اپنی کتاب "تعارف القرآن" کی پہلی جلد کے تعارفی پروگرام کے وقت اُس میں بھی میرا خیال ہے بات کلام خدا کی تفسیر کی تھی اس لیے ٹال نہ سکے۔ ورنہ کم از کم اس کے بعد تو جانا شروع کر دیتے اور گزشتہ پانچ چھ سال میں ایک آدھ بار تو ٹی وی پر نظر آجاتے۔ جن کا اُن سے واسطہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بات دو ٹوک کرتے ہیں لگی لپٹی نہیں رکھتے باتیں اتنی خوبصورت اور دلکش کرتے ہیں کہ دشمن بھی گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اتفاق رائے ہو یا نہ ہو ان کے حسن بیان کا قائل ہونا پڑتا ہے یہ خود اپنی بات پر اتنے محکم ہوتے ہیں اور اتنے باخبر کہ ان کو دوسرا شاید ہی کبھی قائل کر سکے۔

بات ان کی شاعری کے تیسرے دور کے آغاز کی ہو رہی تھی تو یہ چشمہ بیس برس بعد پھر پھوٹا اور ذہن شعر کے سیراب کر گیا اور اب کے انھوں نے اپنا دیوان چھپوانے کا بھی فیصلہ کر لیا اور باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ کوئی سو غزلیں جمع ہو گئیں تو پہلا دیوان شائع کیا اور پھر اگست ۹۲ء سے دسمبر ۹۲ء تک چار پانچ ماہ کے اندر اتنی غزلیں کہیں کہ ۶۴ غزلوں کا دوسرا دیوان بھی تیار ہو گیا اور شائع کروا دیا گیا۔

نئے دور کا جس غزل سے آغاز ہوا ہے یوں لگتا ہے کہ وہ اس وقت کے مارشل لاء کے جبر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ چند شعر سنیے:

ہوں منتظرِ صبح تمنا کئی دن سے
یہ روز کا سورج نہیں دیکھا کئی دن سے
کس سحر سے ناپید ہوئے زیست کے آثار
اک نقش بدیوار ہے دنیا کئی دن سے
ناچیں گے بگولے سرِ ہر طاق در و بام
اس سمت بڑھا آتا ہے صحرا کئی دن سے
اب شیخ حرم شہ کا مصاحب ہے تو دیکھو
موقوف ہے ہر قتل کا دعوے کئی دن سے
اُبھرے افق جاں سے کوئی مہر جہاں تاب
رہتا ہے دیا دل کا بجھا سا کئی دن سے

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ شاعر کے یہاں ایک قسم کی رجائیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ سطوت ارباب ستم ہے کوئی دن اور
ان طرفہ خداؤں کا بھرم ہے کوئی دن اور
بدظن ہوئی ہر خرقۂ تزویر سے مخلوق
پابوسیٔ پیرانِ حرم ہے کوئی دن اور
ہوا ہے شہر میں کل شب جو قتل عام کا جشن

گلی گلی میں ہے آج اس کے انتقام کا جشن
جہانِ غیب سے آیا ہے دل زدوں کو سلام
روش روش پہ سجا صبحِ لالہ فام کا جشن

اس دور کی غزلوں میں بے شمار رنگ ہیں حمید نسیم کی ذات ہی کی طرح مگر یہاں ان سب پر بات کرنا ناممکن ہے یہ تو حمید نسیم کا ایک سرسری تعارف ہے اس میں اس کی شخصیت کے بھی بہت کم پہلوؤں پر بات ہو سکی ہے۔ اب ایک مدت سے ان پر جو فقر و تصوف کا دور گزر رہا ہے اس کی بھی کوئی بات نہ ہو سکی ان کی نظم و نثر کی تخلیقات پر تو نقاد تفصیلی مقالے، مضامین اور کتابیں لکھیں گے۔ یہاں فی الحال ان کی غزل کے ایک اور پہلو پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ حمید نسیم نے غزل کی ہیئت میں کچھ نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ یوں تو غزل کے احیا کے اس دور میں غزل میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ اس کے موضوعات میں بہت وسعت آئی، اس کی علامتیں اور پیکروں نے نئی صورتیں اختیار کیں، مطالب، اشارات بدلے حتٰی کہ اس کی صورت میں بھی بعض اصحاب نے تبدیلی لانے کی کوشش کی اور آزاد غزل کے نام سے غزلیں کہیں۔ مگر حمید نسیم نے جو تجربے کیے وہ ان سے ذرا مختلف ہیں ایک تجربہ تو یہ کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں کچھ ایسی بحریں استعمال کیں جو اردو میں رائج نہیں تھیں۔ اگرچہ وہ بحریں فارسی میں استعمال ہو چکی تھیں اور خود رومی جیسے بڑے شاعر نے کی تھیں۔ اقبال کی ایک مشہور نظم "مسجد قرطبہ" کی بحر ہے مفتعلن فاعلات، مفتعلن فاعلات، فارسی میں اس بحر کے ایک رکن میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک بحر استعمال ہوئی ہے جس کا وزن ہے مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ بحر اردو میں اس سے پہلے استعمال نہیں ہوئی حمید نسیم کے اس زمین میں کچھ غزلوں کے مطلعے سنیے:

صبح ہوئی شاہ فلک زینتِ اورنگ ہوا
آنکھ کے آگے کا سماں منظرِ ارژنگ ہوا

شعلہ فشاں جاں میں ہے دل میں شرر ریز ہے تو
اور ابھی اے حشر طراز آتشِ نوخیز ہے تو

محرم احوال مرا مونس و غمخوار مرا
اس کا تصور تھا شبِ ہجر میں دلدار مرا

ایک دوسری بحر ہے جس میں ایک ذرا سی تبدیلی اور کی گئی ہے یعنی بحر کے ارکان ہیں مفتعلن فاعلات مفتعلن مفتعلن اس میں ایک غزل کا ایک شعر سنیے:

ارض و سما پر محیط شوق جہاں تاب رہا
شب مرے قدموں میں سب عالم اسباب رہا

بعض دوستوں کو شبہ گزرا کہ یہ بحریں اردو میں اس لیے رائج نہ ہوئیں کہ وہ یہاں کی موسیقی کے مزاج کے مطابق نہیں تھیں۔ مگر حمید نسیم کی تو عمر غزلوں کی دھنیں بناتے گزری ہے اور موسیقی سے وہ گہرا شغف رکھتے ہیں ان کو جتنی موسیقی کی سمجھ ہے اچھے

اچھے استادوں کو نہیں اس لیے یہ ماننا مشکل ہے کہ انھوں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ان کی بہت خوبصورت دھنیں بن سکتی ہیں جو یہاں مقبول بھی ہو سکتی ہیں۔ ہم ان سے توقع کریں گے کہ وہ کبھی ہمیں ان کی دھنیں بنا کر سنوائیں۔ ان کا دوسرا تجربہ بھی روایت کی حدود کے اندر ہی ہے وہ یہ کہ انھوں نے غزلوں کا مقطع کہنے کی بجائے آخری شعر میں بھی مطلع کی طرح دونوں مصرعے ہم قافیہ کر دیے ہیں۔ یہ تجربہ انھوں نے اپنے پہلے دیوان کی چند ایک غزلوں میں مگر دوسرے دیوان کی تقریباً تمام غزلوں میں کیا ہے "جستِ جنوں" کی دو ایک غزلوں کو چھوڑ کر تمام غزلوں میں آخری شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ وہ مقطع میں اپنا تخلص بھی استعمال نہیں کرتے اس طرح غزل کو بھی گیت کی طرح ایک چوکھٹا سا مل جاتا ہے جو خوبصورت لگتا ہے۔

آخر میں مجھے صرف ایک بات کہنا ہے یہ وہی سوال ہے جو میں نے شروع میں اٹھایا تھا کہ جو شخص تقریباً پینسٹھ برس کی عمر تک ایک کتاب بھی شائع نہ کر سکا بلکہ شائع کرنا تو کیا لکھ بھی نہ سکا اور عمر بھر میں صرف پچیس تیس غزلیں کہہ کر آرام سے بیٹھ گیا تھا وہ دفعتاً پانچ سال کے اندر دس بارہ ضخیم اور اس بلند سطح کی کتابیں کیسے لکھ گیا اور پھر ان کو شائع بھی کروا دیا یہ ایک معجزے سے کم نہیں اور یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر یہ شخص تمام عمر اسی انداز سے لکھتا رہتا تو ہمارے لیے کیا کچھ چھوڑ جاتا اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے اب سے کوئی پینتالیس برس پہلے کراچی میں کتاب خانہ زوار سے میں نے ایران میں چھپی ہوئی کلیات شمس تبریزی خریدی وہ بھاری بھرکم کتاب تھی ہر چند باریک ٹائپ میں چھپی تھی اور بڑے سائز کی یعنی پھر بھی کوئی ڈیڑھ ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی اس کو ذرا سی دیر ہاتھ میں اٹھانے سے کلائی درد کرنے لگتی تھی راستے میں جناب ذوالفقار علی بخاری مل گئے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے پھر اچانک برس پڑے کہنے لگے تم لوگ نہایت بیہودہ ہو نکمے ہو، نالائق ہو، بیکار ہو، سست ہو، آرام پسند ہو، وقت ضائع کرتے ہو وغیرہ وغیرہ میں حیران کہ کیا قصور ہوا پھر خود ہی کہنے لگے دیکھو اس دیوان کی طرف رومی نے اس کے علاوہ ایک طویل مثنوی بھی لکھی اور کس پائے کی لکھی پھر وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے درس بھی دیتے تھے کتنے کام کرتے تھے وہ لوگ ہم ان کی تخلیقات نقل کرنے بیٹھ جاؤ تو عمر بھر نہ کر سکو۔ دیکھو یہ لوگ کیا کچھ تخلیق کر گئے اور آج کل کے نوجوان لکھنے کے معاملے میں کتنے سست ہیں اور پھر خود کو ادیب اور شاعر کہلاتے ہیں تم لوگوں کو شرم نہیں آتی ڈوب مرو بخاری صاحب نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا یہ اور بات ہے کہ پلٹ کر میں نے یہ پوچھنے کی گستاخی نہیں کی کہ حضور آپ نے اب تک کتنی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے تو ایک دیوان کی حسرت رہی ہم کو جو آج تک ان کے ورثاء یا احباب بھی پوری نہ کر سکے خیر کہنا صرف یہ تھا کہ یہ شخص، یہ حمید نسیم جو پانچ چھ برس کے عرصے میں ہمیں اس پائے کی نثر اور نظم کی درجن بھر کتابیں عطا کر سکتا تھا اگر عمر بھر اسی کام میں صرف کرتا تو پیچھے کتنے خزانے چھوڑ جاتا لوگو اس کی قدر کرو اور دعا کرو کہ خدا اسے طویل زندگی دے اور یہ اسی طرح اسی رفتار سے لکھتا رہے۔ حفیظ جالندھری کی باتوں کو لوگ توجہ اور سنجیدگی سے نہیں سنتے تھے مگر شاید اس ایک معاملے میں وہ ٹھیک کہہ گیا تھا کہ اس شخص کو سرکاری ملازمت نہیں کرنی چاہیے تھی اور زندگی ادب کے لیے وقف کر دینا چاہیے تھی۔

میں انجمن ترقی اردو کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع دیا اور خواتین و حضرات آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنے صبر و تحمل سے میری گزارشات سننے کی زحمت گوارا کی۔

قومی زبان (۲۹) دسمبر ۱۹۹۳ء

حمید نسیم کی شخصیت اور شاعری کے بعض پہلو

ضمیر علی بدایونی

حمید نسیم صاحب نے آج سے چند روز پیش تر جب مجھ سے یہ کہا کہ انجمن ترقی اُردو پاکستان نے میرے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا ہے اور آپ کو میرے بارے میں ایک مضمون پڑھنا ہے تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خوشی اس بات کی کہ حمید نسیم صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انجمن نے شام منانے کا اہتمام کیا ہے اور حیرت اس امر پر کہ مجھے بھی ایک مضمون حمید نسیم صاحب کے حوالے سے پڑھنا ہے۔ حیرت کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں عام طور سے تقریبات میں مضمون پڑھنے سے گریز کرتا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حمید نسیم صاحب کا حلقۂ احباب بے حد وسیع ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مجھ سے بہتر لوگ اس ملک میں اور اس شہر میں بھی موجود ہیں۔ جنھیں ان کے ساتھ ریڈیو میں طویل رفاقت کا اعزاز بھی رہا ہے۔ اور جو ان کی شاعری، شخصیت اور فن کے رمز شناس بھی ہیں اور اس میدان میں شہرت بھی رکھتے ہیں۔ اور تقریباتی ادب میں ان کی فتوحات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ بہر حال حمید نسیم صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کے مشترکہ حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ میں نے اس مضمون میں حمید نسیم صاحب کی شخصیت اور ان کے تخلیقی وجدان کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیے یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن سب سے پہلے ایک وضاحت اور ایک معذرت۔

عموماً اس طرح کی تقریبات میں مضمون نگار اپنے ممدوح کو میر غالب، دانتے اور گوئٹے اور بادلیر اور ٹی ایس ایلیٹ سے کم مقام دینے پر رضامند نہیں ہوتے اور مبالغے کی آخری حدوں کو چھونے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تقریبات میں شرکت کے عادی خواتین و حضرات کو میرے اس مضمون سے کسی قدر مایوسی ہوگی کیونکہ مدلل مدّاحی کے کیف و سرور سے میرا مضمون خالی ہے اور حمید نسیم صاحب کو جس طرح میں نے محسوس کیا ہے اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ غالباً ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ حمید نسیم صاحب کو میں نے پہلی بار حلقۂ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی۔ حمید نسیم صاحب ضیاء جالندھری صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو میں دانتے سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ تک کافی اہم حوالے موجود تھے۔ لاشعور اور آرٹ کے باہمی رشتہ پر حمید نسیم صاحب روشنی ڈال رہے تھے اور ایلیٹ کی FOUR QUARTETS اور ایزرا پاؤنڈ کی MOBER LAY بھی آپ کی گفتگو کا حصہ تھیں۔ حمید نسیم صاحب کے انداز گفتگو میں جو متانت اور گہرائی تھی اس نے خاصہ متاثر کیا یہ حمید نسیم صاحب کے بارے میں میرا پہلا تاثر تھا یہ وہ زمانہ تھا جب حلقۂ ارباب ذوق اپنے پورے شباب پر تھا ن م راشد، ضیا جالندھری، پروفیسر ممتاز حسین، ابو الفضل صدیقی، کمانڈر انور، سلیم احمد، قمر جمیل،

صہبا اختر، افضال شیروانی، مشرف احمد، اطہر نفیس، ساقی فاروقی، عبید اللہ علیم، احمد ہمیش، انجم اعظمی، سحر انصاری، اور بہت سے ممتاز ادیب و دانشور اس میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ تخلیقات پر علمی اور ادبی گفتگو اور مباحث ہوا کرتے تھے۔ پرانے اور نئے لکھنے والوں کی اس ملی جلی محفل میں ادب کا چراغ ہمیشہ روشن رہتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے لیکن انداز جارحانہ یا مخاصمانہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ علمی اور معروضی ہوتا تھا۔ تحسین و تنقید کی اس ملی جلی کیفیت میں جب اجلاس ختم ہوتا تھا تو شرکاء محفل کے چہروں پر بے حاصلی کی بے رنگی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ کچھ حاصل کرنے کی خوشی بلکہ سرور محسوس ہوتا تھا۔ اس فورَم میں بے شمار ادبی اور فلسفیانہ موضوعات زیر بحث آئے اور حلقۂ ارباب ذوق کا فیض عام ایک عرصے تک جاری و ساری رہا۔ افسوس کہ اب کوئی ایسا فورَم اس وسعت آباد شہر کراچی میں موجود نہیں جہاں نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت ہو سکے اور لوگ ایک دوسرے کے زاویۂ نظر سے واقف ہوسکیں۔ ادیب، شاعر اور دانشور اب بھی اس شہر میں موجود ہیں اور آرٹس کونسل کی خوبصورت عمارت بھی جہاں طلعت حسین اور یاور مہدی جیسے ادب نواز منتظمین بھی موجود ہیں لیکن حلقۂ ارباب ذوق کا فورَم باقی نہیں رہا جس کی تجدید کی شدید ضرورت ہے۔

بات ہو رہی تھی حمید نسیم صاحب کی اور پہنچ گئے ہم حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس تک لیکن بات ابھی ادھوری ہے دوسری بار میں نے حمید نسیم صاحب کو ریڈیو پاکستان کراچی میں دیکھا۔ میں قمر جمیل صاحب سے ملنے کبھی کبھی ریڈیو جایا کرتا تھا۔ وہاں حمید نسیم صاحب اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔ قمر جمیل صاحب پروگرام پروڈیوسر، سلیم احمد صاحب اسٹاف آرٹسٹ اور احمد ہمدانی ڈیوٹی آفیسر تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے بعد ریڈیو کی کینٹین دوسرا ادبی فورَم تھا۔ جہاں ادیب، دانشور، فنکار اور دیگر اہل کمال جمع ہوتے تھے۔ اور اپنے اپنے دائروں میں ادب اور فنون پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ حمید نسیم صاحب کا کمرہ بھی ادبی مباحث کا مرکز تھا۔ جہاں دانشور اور فنکار ہر قسم کے موضوع پر اظہار خیال کرتے تھے۔ اور حمید نسیم صاحب کی تنخواہ کا بیش تر حصّہ چائے کی نذر ہوجاتا تھا۔ ریڈیو سے نکل کر لوگ زیلن کافی ہاؤس کا رخ کرتے وہاں اگر ایک گوشے میں حفیظ ہوشیار پوری کسی ادیب کے ساتھ بیٹھ کر تبادلۂ خیالات میں مصروف نظر آتے تو دوسرے کسی گوشے میں نوجوان طلعت حسین بھی پاکستان میں تھیٹر کے مستقبل کے تانے بانے بنا کرتے تھے۔ یہاں شہر کے کئی اہم ادیب باقاعدگی سے آتے تھے اور کبھی کبھی حمید نسیم اور ضیاء جالندھری اور صادقین مرحوم بھی آیا کرتے تھے۔ ریڈیو سے زیلن کافی ہاؤس کا فاصلہ بھی گفتگو ہی میں طے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں حمید نسیم صاحب کے دو شعر بہت مشہور ہوئے۔

ہو کسی رنگ سے اثبات حیات
جشن دارائی ظلمت ہی سہی

لیکن سب سے زیادہ شہرت اس شعر کو ملی

حافظ کو گلگشتِ مصلیٰ غالب کو خورشید جمال
ہم کو ملے مضمون غزل کے دودِ تحیر گردِ ملال

اس شعر میں حمید نسیم صاحب کی شخصیت کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں امکانی طور پر موجود ہیں۔ دودِ تحیر ان کی ساری شاعری میں پھیلا ہوا ہے۔ اور گردِ ملال آج بھی روئے سخن پر موجود ہے۔ حافظ و غالب نے ان کے روایتی شعور کو گہرا اور وسیع کرنے میں بیحد اہم کردار ادا کیا ہے حمید نسیم صاحب روایتی شاعر نہیں روایتی شعور کے شاعر ہیں۔ اردو کی شعری روایات کا بڑا زندہ

وتابندہ شعور رکھتے ہیں۔ اور اپنی انفرادی صلاحیت کو روایت کے عظیم دریا میں گم ہونے سے بچالیتے ہیں۔ اور دودِ تحیر اور گرد ملال کو اپنی شناخت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ دو بنیادی استعارے ہیں جنھوں نے حمید نسیم صاحب کی شاعری کے سارے استعاروں کو جنم دیا ہے ساختیاتی تنقید کی زبان میں ہم انھیں MASTER SIGNI FIERS بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو ہر دال یعنی SIGNI FIERS کی تہہ میں کار فرما ہوتے ہیں۔ دریدا نے ادب کو لامحدود استعاریت (ENDLESS METAPHORCITY) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ہر استعارہ دوسرے استعاروں کو جنم دینے کے لامحدود عمل میں گرفتار ہے۔ حمید نسیم کے تخلیقی وجدان نے دو استعاروں کو جنم دیا دودِ تحیر اور گرد ملال اور ان دو استعاروں کی تخلیقی قوت سے حمید نسیم کا فن وجود میں آتا ہے۔ اور وہ لامحدود استعاریت کے سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن جو چیز حمید نسیم کے دریائے تخلیق کی روانی کو متوازن رکھتی ہے اور کناروں سے بہنے نہیں دیتی وہ ان کا پختہ روایتی شعور ہے جو ان کے بنیادی ادراک کو مضمحل اور زخمی ہونے سے بچاتا ہے۔ اور ان کی وحشی تخلیقی قوت کو اعتدال اور توازن سے آشنا کرتا ہے ان کی شاعری کے افسوں کو گہرا اور ادبی متن کو معنویت سے لبریز کر دیتا ہے اور ان کا ہر شعر ان کے تہذیبی روپ کا ترجمان بن جاتا ہے۔

لمحۂ خوش ہے علاجِ غمِ تنہائی کر
یادِ یار آتی ہے اٹھ اور پذیرائی کر
ایک ہی رنگ ازل سے وہی ظلمت وہی ضو
اب کہیں اور نئی دھج سے خود آرائی کر

حمید نسم صاحب کا شعری سفر داخلیت کے حصار سے باہر نہیں وہ انسان کو فطرت اور مظاہر فطرت سے بلند تر مقام دیتے ہیں۔ فطرت ان کے دل کی آگ کو روشن کرنے میں ناکام نظر آتی ہے۔

ہے کہاں وہ آگ جو روشن رکھے دل کا الاؤ
برقِ جولاں محض چشمک، شعلۂ گل محض رنگ

وہ اپنی شناخت فطرت میں نہیں انسانی رشتوں میں تلاش کرتے ہیں۔

مری شناخت جو بھی تھی ترے حوالے ہی سے تھی
یہ ربطِ خاص ہی مرے وجود کا مدار تھا

بیکرانی صرف مظاہرِ فطرت ہی میں نہیں ہوتی انسانی رشتے بھی وقت کی طرح بیکراں ہوتے ہیں۔

یہ دھیان ہی کسے تھا اس گھڑی کہ بیکراں ہے تو
میں اپنے کیف و سر خوشی میں تجھ سے ہمکنار تھا

حمید نسیم کی شاعری تین مرحلوں میں ارتقائی مدارج طے کرتی ہے۔ پہلا مرحلۂ شوق جمالیاتی ہے جب حمید نسیم فطرت کو نغمہ بار محسوس کرتے ہیں۔ اور حسن ودلکشی کا ایک دلاویز مرقع

جاگی مٹی کی خوشبو سے ہر امکاں کو نمود ملی
ساون سیر مچلتے دھارے مہکی پروا بھیرے ناگ

وہ فطرت اور انسان دونوں کو اپنے احساس کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی دکھاتے ہیں۔ وہ فطرت کی قصیدہ خوانی پر

قانع نہیں ہوتے بلکہ فطرت اور مظاہر فطرت سے آگے بڑھ کر انسانی فطرت تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ان کا تخلیقی سفر یہاں ختم نہیں ہوتا۔ اب ان کا شعری وجدان انھیں مقدس فطرت (HOLY NATURE) اور ماورائی حقائق کی دنیا میں لے جاتا ہے اور اس طرح ان کا تخلیقی سفر اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے جس کی تنسیل آپ کو آئندہ صفحات میں نظر آئیگی۔

دوسرا مرحلہ حمید نسیم کی شاعری کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ جسے خود انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اعتبار اٹھ گیا ہر سچ کا کہوں کیا تم سے
ٹوٹ پھوٹ اب کے ہوئی ہے مرے اندر کیا کیا

جھوٹ کا چلن اتنا عام ہوگیا کہ سچ بھی اپنی شناخت کھو چکا ہے بقول اطالوی ڈرامہ نگار لوئی پیراندیلو کے "ہاں یہ ٹھیک ہے کہ تم سچ پر ہو اپنے خیال میں لیکن یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

ایسی صورت حال میں اقدار کو غالب کرنے کی ضرورت ہے حمید نسیم ہر جگہ سچ کو جھوٹ سے مغلوب دیکھتے ہیں اور صرف غمگین و پریشان اور افسردہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ سچ بولنے کی قیمت اور سچ کہنے کی ضرورت دونوں سے واقف ہیں،

جھوٹ کی دھوم ہے شہروں شہروں جھوٹ بڑا بلوان میاں/سچ بولیں اور مارے جائیں عیسیٰ سے انسان میاں۔لیکن غمِ جاناں سے انھوں نے وہ قوت اور تربیت حاصل کی کہ مظلوم انسانوں کے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔

ترے غم کی ہے وہ تربیت کہ جہاں کا ڈر ہے نہ غم کوئی
ہوا جب بھی سامنا ظلم کا مرے لب پہ بات کھری رہی

وہ انسان اور اس کے امکانات سے مانوس نہیں ہیں بلکہ انھیں یقین ہے کہ ایک دن انسان اسیرِ گردش حال ہونے کے باوجود رخِ کائنات کو بدل دے گا۔

کبھی اس کی ایک نگاہ نے رخِ کائنات بدل دیا
وہی آدمی کہ نہاد میں ہے اسیر گردش حال کا

وہ انسان کو اعلیٰ تر منصب پر فائز دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ لوگ جو صرف اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں انھیں وہ مولانا روم کے لفظوں میں دام و دد کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا صحیح منصب یہ ہے۔

نئی چھب دکھا کوئی خیر کی کوئی رخ نکھار جمال کا
جو رہے ہیں عمر کے چار دن کوئی کام سطحِ کمال کا

اپنے اس شعری اور معاشرتی رویہ کی وضاحت کرتے ہوئے حمید نسیم لکھتے ہیں۔

ہمارے بڑے شاعر رومی، سعدی، حافظ، نظیری، عرفی، صائب میر، سودا، غالب سب نے اپنے اپنے دور کی نمائندگی اور ترجمانی کی۔ جہاں انکار/رد احتجاج کی ضرورت تھی وہاں برملا انکار، رد اور احتجاج کیا۔ یہ سب دل زندہ و بیدار رکھتے ہیں۔ کسی کو ذرا تکلیف پہنچتی دیکھتے تو تڑپ اٹھتے تھے۔ آج کل جو حالات سے آنکھیں بند کر کے دروں بینی یا دور دیس کی کتھائیں بیان کرنے کی روش چل نکلی ہے اور جسے بالعموم میراجی اور فراق گورکھپوری کی فکری اور تخلیقی ردا کے پیچھے رکھ کر تحفظ دیا جاتا ہے۔ وہ کسی پاکستانی اندھے کابل کے کام تو آسکتی ہے لیکن وہ کسی اعتبار سے سچا ادب نہیں ہے کہ سچا ادب اپنی فکری اور معاشرتی حقیقت سے لاتعلق اور الگ تھلگ رہ کر تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ (اقتباس جستِ جنوں گفتند کہ برہم زن)

"سوال حمید نسیم صاحب نے صحیح اٹھایا ہے لیکن شاید مثالوں سے ہمیں اتفاق نہیں۔ میراجی اور فراق گور کھپوری دونوں گہرا سماجی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کی نمائندگی بھی کی ہے اور ناانصافیوں کی نشاندہی بھی کی ہے یہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ میراجی کی نظم "کلرک کا نغمہ محبت" اور فراق گور کھپور کی نظم "آدھی رات" کو سماجی سیاسی اور تاریخی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ن م راشد کی شاعری میں اپنے عہد کے مسائل کا شعور بہت واضح ہے۔ اور راشد جمالیاتی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ لیکن یہاں میں میراجی، فراق گور کھپوری اور ن م راشد کا تقابلی مطالعہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ حمید نسیم صاحب کے موقف کی وضاحت میں بات کچھ طول اختیار کر گئی۔ اور سخن گسترانہ ہوتے ہوتے بچ گئی۔

کیر کے گار نے انسانی شخصیت کے ارتقاء کے تین مرحلے بتائے ہیں۔ پہلا مرحلہ جمالیاتی، دوسرا اخلاقی اور تیسرا مذہبی حمید نسیم صاحب کی شخصیت بھی ان تینوں مراحل سے گذرتی نظر آتی ہے۔ پہلے انھوں نے اپنی شناخت اپنے غم میں تلاش کی۔ اور پھر معاشرتی حقیقتوں میں اور آخر میں زندگی کی آفاقیت ان کی شناخت بن جاتی ہے۔

میں ہوں روحِ زندگی۔ گو پیکرِ فانی میں ہوں۔

لیکن حمید نسیم کا شعری سفر یہاں مکمل نہیں ہوتا وہ مقام بقا میں باقی رہنا نہیں چاہتے۔ اور مقامِ فنا کا شعور ان میں بیدار ہو جاتا ہے۔

کیا خبر میرا سفر ہے اور کتنی دور کا
کاغذی اک ناؤ ہوں اور تیز رو پانی میں ہوں

مولانا روم نے انا الحق کو مقام انکسار قرار دیا۔ جب انا ختم ہو جاتی ہے اور صرف حق باقی رہ جاتا ہے۔ اور انا حق میں ضم ہو جاتی ہے۔ حمید نسیم بھی اپنے سفر کے آخری مرحلے میں اسی مقامِ انکسار کی جانب رواں ہیں پوری غزل اسی کیفیت میں ڈوبی ہوتی ہے۔ جسے میں نے شروع میں مقدس فطرت کہا تھا۔

اٹھی محرابِ دل سے جب اذاں اللہ ہی اللہ ہے
صدا ہر سمت سے آئی کہ ہاں اللہ ہی اللہ ہے

فطرت سے انسانی فطرت اور انسانی فطرت سے عالمِ قدس میں انجذاب کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

محیط عرصۂ کون و مکاں اللہ ہی اللہ ہے
جو خود میں ڈوب کر دیکھوں یہاں اللہ ہی اللہ ہے
مجسم کردیا موہوم کو ذوق تماشا نے
ہر اک شے ورنہ لاشے ہے۔ یہاں اللہ ہی اللہ ہے
فراق جسم و جاں کا لمحہ جب بالیں تک آپہنچا
کہا مجھ سے کسی نے ناگہاں اللہ ہی اللہ ہے
رہا میں بندۂ فرماں بہر عالم بہر عنوان
مرا قالب مرا دل میری جان اللہ ہی اللہ ہے

حمید نسیم صاحب کی شاعری اور شخصیت کے بعض پہلو میں نے اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حمید نسیم

شاعری اور ادب کے ایک بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے علامہ اقبال کی بانگِ درا کا ایک تنقیدی جائزہ ماہنامہ علامت میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب کا پہلا حصّہ ہے جس کے بارے میں جیلانی کامران صاحب "POST FRONTIER" میں تبصرہ کیا ہے۔ جس میں انھوں نے حمید نسیم صاحب کے بعض نکات سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے بارے میں حمید نسیم صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں انفرادیت، ندرت اور تازگی ہے میرے خیال میں حمید نسیم صاحب نے اقبال پرستی کی اس فضا میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ اور اس طرح اقبال فہمی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ابھی صرف بانگِ درا کا جائزہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس میں حمید نسیم صاحب نے اقبال کے پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اور داغ دہلوی اور اقبال کے رشتے کو نئے تناظر میں دیکھا ہے جو حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس مضمون میں حمید نسیم صاحب نے خالص فنی نقطۂ نظر سے کلام اقبال کا جائزہ لیا ہے جو اقبال شناسی کی تاریخ کو نئی سمت سے آشنا کرنے میں معاون ہوگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بعض حلقوں کی جانب سے حمید نسیم صاحب کی اس تنقیدی جرأت کو نشانہ بنایا جائے لیکن حمید نسیم صاحب کا روایتی شعور ان کی کسی تحریر کو غیر متوازن نہیں ہونے دیتا۔ اس لیے اقبال پر آنے والی اس کتاب سے بھی ہمیں خوشگوار توقعات وابستہ رکھنی چاہیے۔ اور اقبال کی شاعری کے بارے میں نئی بصیرت اور نئے نقطہ نظر کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کیونکہ حمید نسیم صاحب کی نیت تو یہ ہے کہ ادبی اور جمالیاتی اقدار کا فروغ ہو۔ اور اقبال کی فکر و فن کی جملہ جہات زیادہ واضح اور روشن ہو کر ہمارے سامنے آئیں اور اقبالیات میں ایک نئے تناظر اور ایک نئے زاویۂ نظر کا اضافہ ہو۔

قومی زبان (۳۵) دسمبر ۱۹۹۳ء

ادب اور عوام

ڈاکٹر جمیل جالبی

انسان کی آفرینش کے سلسلے میں مختلف عقائد و مذاہب میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ آدم و حوا کی داستان سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن چینی روایت بھی بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ نوک وا ایک دیوی تھی جس کا چہرہ انسان کا اور بدن سانپ کا تھا۔ نوک وا کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ دن رات میں ستر رُوپ دھار سکتی تھی۔ یہ وہ دَور تھا جب دُنیا میں انسان پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف سمندر جیسے بڑے بڑے دریا تھے۔ گھنے جنگل ایسے کہ جن میں رینگ کر چلنا بھی دشوار تھا۔ ہر طرف قسم قسم کے جان دار تھے لیکن دنیا بے رونق اور خالی تھی۔ نوک وا کی خواہش تھی کہ دنیا میں رونقوں کا اضافہ ہو۔ وہ اسی سوچ میں گم ایک تالاب کے کنارے آ بیٹھی۔ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ اچانک اس کی نظر اپنے عکس پر پڑی جو پانی میں نظر آ رہا تھا۔ عکس کو دیکھا تو وہ مسکرائی۔ مُسکراتا ہوا یہی عکس اسے پانی میں نظر آیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کی اُداسی دور ہوگئی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے روٹھنے والا منھ بنایا تو اس کا عکس بھی پانی میں نظر آیا۔ مسکراہٹ اور روٹھنے کے عمل نے ذرا دیر کے لیے نوک وا میں رونقوں کا احساس پیدا کر دیا۔ وہ پھر سوچنے لگی کہ دنیا میں بہت بھانت بھانت کے جاندار تو موجود ہیں لیکن میری شکل و صورت کا کوئی بھی دوسرا موجود نہیں ہے۔ میں کیوں نہ اپنے جیسے اور پیدا کروں؟ یہ سوچ کر پانی کی تہ میں سے اس نے مٹھی بھر گیلی مٹی لی اور اس سے انسان کا جسم بنایا اور پیر لگا کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ جیسے ہی اسے زمین پر کھڑا کیا اس کے جسم میں جان پڑ گئی اور وہ زندہ ہو کر حرکت کرنے لگا۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس سے وہ اتنا خوش ہوئی کہ کیف و سرمستی کے عالم میں گیلی مٹی سے سینکڑوں انسان بنا ڈالے۔ اس طرح روز جب وہ انسان بنا بنا کر تھک گئی تو سوچنے لگی کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ ذرا سی دیر میں بے شمار انسان پیدا کیے جاسکیں۔ معاً اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے انگور کی بیل توڑی اور اسے گیلی مٹی میں لَت پَت کر کے ہاتھ سے جھٹکنا شروع کیا۔ جھٹکنے کے اس عمل سے ذرا سی دیر میں سینکڑوں انسان نمودار ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسانی آبادی بڑھنے لگی۔ روایت ہے کہ جو انسان گیلی مٹی کو گوندھ کر ہاتھ سے بنائے گئے تھے وہ "خواص" کہلائے اور جو انگور کی بیل جھٹک کر پیدا کیے گئے تھے وہ "عوام" کہلائے۔

وہ دن اور آج کا دن یہ فرق چلا آتا ہے۔ رسولوں، پیغمبروں، نبیوں اور مفکروں نے اس فرق کو مٹانے کے لیے نئے نئے مذاہب و عقائد کو جنم دیا لیکن یہ فرق کچھ ہی عرصے میں پھر لوٹ آیا۔ انسانی سماج کا ابتداء سے لے کر آج تک یہی بنیادی مسئلہ رہا ہے کہ کس طرح اس فرق کو دُور کیا جائے اور عدل و مساوات سے معاشرے میں ایک نئی روح پھونکی جائے۔ جو معاشرے اس مسئلے

کو کسی حد تک حل کر لیتے ہیں، اپنی زندگی کے زرّیں دَور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے معاشرے میں آزادی سے پہلے بھی یہ مسئلہ موجود تھا اور آزادی کے بعد بھی یہ مسئلہ اسی طرح موجود ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو مسائل پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں وہ خواص و عوام کی اسی تفریق سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک طرف "خواص" ہیں جو ملک کے سارے وسائل، اختیار و اقتدار پر قابض ہیں اور اپنے مفادات کی پوری طرح نگرانی کر رہے ہیں اور دوسری طرف "عوام" ہیں جو بھک منگوں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اپنے معاشرے پر نظر دوڑایے تو آپ کو ہر طرف جبر و استحصال کے مارے، دکھ اور تکلیف سے کراہتے ہوئے انسان نظر آئیں گے۔ ایک محدود طبقے نے ان پر ایسا قبضہ جما رکھا ہے اور ایک ایسے نظام کی جیل میں انھیں قید کر رکھا ہے جس کی دیواریں اونچی اور دروازے بھاری آہنی سلاخوں کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ بڑی محبت سے عدل و مساوات کا نام لیتے ہیں لیکن فی الحقیقت مساوات قائم کرنے کے عمل سے کوسوں دور ہیں۔ ترقی پسندوں نے پہلی بار عوام کو اپنی فکر میں شامل کیا تھا لیکن جلد ہی جماعتی حکمت عملیوں اور مصلحتوں نے انھیں راستے سے ہٹا کر دور کر دیا۔ سوویٹ روس کا انتشار فلسفۂ عوام کا زوال نہیں ہے بلکہ یہ اس نظام کا زوال ہے جس نے پرولتاری آمریت اور اس کے ذریعے سوشلزم قائم کرنے کے بجائے ایک ایسی جماعت کو جنم دیا جو طبقۂ خواص بن کر اسی طرح عوام کا استحصال کرنے اور ان کی آزادیِ فکر و اظہار کو جبراً روکنے میں لگ گئی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ نیا نظام وضع کیا گیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر وہ نظام جو عوام سے دُور ہو گا اور ہر وہ فِکر جو اُن کا استحصال کرے گی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ آج بھی جبر و استحصال کے مسائل، دکھ بھوگتی انسانیت کے مسائل، بھوک، بیماری اور افلاس سے سسکتے عوام، بے روزگاری اور جہالت سے مضطرب و لاچار انسان، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں، خوانین، چودھریوں اور سرداروں کے قدموں تلے روندے جانے والے عوام اسی طرح ہمارے معاشرے کے اندر بے کسی و بے بسی کے عالم میں کراہ رہے ہیں۔ نہ اسلام کے نعرے عوام کی آرزوؤں، تمناؤں اور ضرورتوں کو آسودہ کر رہے ہیں اور نہ اُن کے ووٹ سے مسندِ اقتدار پر بیٹھنے والے ان کے بنیادی مسائل کو حل کرنے پر توجہ دے رہے ہیں۔ یہ کام اب پھر نئی فِکری قُوت اور نئی تخلیقی توانائیوں کے ساتھ ادب کو کرنا چاہیے تاکہ وہ تبدیلی کے عمل کو، نیا شعور پیدا کر کے، معاشرے کے اندر زندہ کر سکے۔ ہزاروں کہانیاں، مسائل کے اس جنگل میں جس میں ہم رہتے ہیں، نئے تخلیقی ذہن کا انتظار کر رہی ہیں، ہزاروں نظمیں ان کے اندر چھپی بیٹھی ہیں۔ ہزاروں ڈرامے زندگی کے اسٹیج پر دکھائے جانے کے لیے بے چین ہیں، لاتعداد ناولوں کے پلاٹ سسکتے اور دکھ اٹھاتے عوام کی زندگیوں میں دُبکے بیٹھے ہیں۔ متعدد فلسفے ان مسائل کی کوکھ سے جنم لینے کے لیے تیار ہیں۔ یہی وہ حقیقی راستہ ہے جس سے آپ "نئے ادب" کو جنم دے سکتے ہیں اور یہی وہ راستہ ہے جس سے آپ سسکتے، دم توڑتے ادب کے منہ سے آکسیجن کی نلکی نکال کر اسے نئی اور توانا زندگی بخش سکتے ہیں۔ علامت نگاری اور ابہام پسندی بہت ہو چکی۔ ادبی اشراف پسندی کی پتنگیں بھی ہم بہت اڑا چکے۔ اب اس نئے راستے پر بھی ادب کو لے چلنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا بیشتر ادب اب تک اپنے رویوں میں خواص پسندی یا اشراف پسندی کا حامل رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے عوامی شاعری کی تو نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے نظیر کو شاعروں کی صف ہی سے خارج کر دیا اور لکھا کہ "اس کا کلام بہت ہے جو بازاریوں (عوام الناس) کی زبان پر جاری ہے اور اسے شاعروں میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔" فسانۂ عجائب میں بھی یہی رویہ کام کر رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرور ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بس کہ یہ بستی ویران، پوچ و لچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں اور جو ہوں گے

تو گوشہ نشین، عزلت گزیں، مگر چھوٹی اُمت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ
وحشت منزل اس مقام سے سخت گھبرایا۔"

یہی "چھوٹی اُمت" انسانیت کا مستقبل ہے۔ یہی چھوٹی امت نئی تخلیقی توانائیوں کا منبع و مخرج ہے اور یہی چھوٹی امت منتشر، شکستہ پا اور بھٹکی ہوئی بیسویں صدی کی باگ سنبھالے ہمیں اکیسویں صدی میں حقیقی مساوات اور حقیقی عدل کے نئے اور توانا تصورات کے ساتھ داخل کر سکتی ہے۔ اسلام جب تک صرف و محض طبقۂ خواص کے ہاتھ میں رہے گا اسی طرح چھوٹی امت کے استحصال کا وسیلہ بنا رہے گا۔ اسلام کو اس طبقۂ خواص سے آزاد کرانے اور اس کے استحصالی خونیں چنگل سے چھڑانے کی ضرورت ہے۔

یہ جو ہمارا قومی دھارا بدبودار اور میلا گدلا ہوگیا ہے وہ عوام کی توانائیوں اور چھوٹی امت کے غلبے ہی سے صاف اور خوشبودار ہوسکتا ہے۔ ادب پر اسی طرح نئی بہار آسکتی ہے۔ آپ اپنے قلم سے، اپنی سچائیوں کے اظہار سے، اپنی تخلیقی قوتوں کو چھوٹی امت کی طرف موڑنے سے نہ صرف تبدیلی کے عمل کو تیز کریں گے بلکہ خود اپنے ادب کو بھی ایک نئی زندگی دیں گے۔ شاعر میر کا یہی تخلیقی رویہ تھا اور اسی لیے وہ کل بھی عظیم تھے، آج بھی عظیم ہیں اور کل بھی عظیم رہیں گے۔ میر کا یہ تخلیقی رویہ ان کے اس شعر سے واضح طور پر سامنے آتا ہے اور یہی ہمارا نیا ادبی رویہ ہوسکتا ہے:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اسی رویے اور اندازِ نظر سے ہم تخلیقی و فکری ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کرا سکتے ہیں اور نوک وا کی روایت کو بدل کر دُنیا میں حقیقی رونقوں کو جنم دے سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی بھی ہم سے یہی کہہ رہی ہے:

اب تک جو ہم کرتے رہے
تھیں وہ بَناوٹ کی باتیں
اب ان سے سَر دُکھتا ہے
جن کو بچّے بھی سمجھیں
اور سادہ دیہاتی بھی
اب وہ باتیں کریں ہم۔

(داؤد رہبر)

انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی کے مکان کا پتہ تبدیل ہوگیا ہے

نیا پتہ یہ ہے

A۶۰۲۔ بون وسٹا اپارٹمنٹ

L-F۱۴۔ بلاک ۲۔ کلفٹن۔ کراچی

جاپانی ہائیکو کا ابتدائی دور

رفیق سندیلوی

یہ جاننا آسان نہیں کہ موسموں کی شاعری "ہائیکو" کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ شاید تخلیق کائنات کے ساتھ ہی معرض وجود میں آگئی ہوگی، جب صبح کے ستارے جھلملاتے تھے اور تمام دیوتا خوشی سے دیوانہ وار جھومتے تھے یا کم از کم اس کی ابتدا اس وقت ہوئی ہوگی جب پہلا جاپانی جاپان کی سرزمین میں وارد ہوا ہوگا۔ آیا وہ جنوب کے باشندے تھے یا شمال کے، کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون اپنے ساتھ حاسۂ شاعری لے کر آیا اور فطرت کے بطون میں موجود چہار گانہ مسرت سے آشنائی حاصل ہوئی. مسرت جو معصوم صفت تھی، فنکارانہ تھی، مذہبی تھی، معروضی تھی، جذباتیت رومانیت اور فلسفے سے بے نیاز تھی. ایسا ہی تاثر جاپان کے قدیم شعری مجموعے "مان یوشو" میں دکھائی دیتا ہے۔ "مان یوشو" شاعری کی تین اصناف پر مشتمل ہے۔ اوّل "چوکا" جس میں ۵-۷-۵-۷-۵ ارکان اور دوم "تانکا" جس میں ۵-۷-۵-۷-۷ ارکان اور سوم "سیڈوکا" جس میں ۵-۷-۷-۵-۷-۷ ارکان ہوتے ہیں شاید قدیم جاپانیوں کے ہاں باری باری پانچ یا سات سلیبل کی تکرار سے مراد فطرت کی باقاعدگی اور بے قاعدگی کا اظہار تھا۔ ہائین عہد (۱۱۸۵-۷۹۴ء) میں تانکا طبقۂ اشراف کی محبوب صنف سخن تھی مگر اس کے خاتمے پر رینگا ایک مشہور صنف کے طور پر ابھری۔ وہ احساس جس نے رینگا کو جنم دیا وہ دو افراد میں باہم مقابلے کی فضا تھی۔ نویں صدی کے اوائل میں ایسے کئی کھیل موجود تھے جن میں موازنے اور مقابلے کی فضا پائی جاتی تھی۔ مثلاً گھاس کی پتیوں کا موازنہ" جس نے بعد ازاں "جڑوں کے موازنے" کو جنم دیا۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے والے پودوں کی جڑوں کو جمع کرتے اور پھر اپنی اپنی جمع شدہ جڑوں کی لمبائی کا موازنہ کرتے تھے۔ اسی سے بعد ازاں گل داؤدی کے مقابلے، کوکنار یا گل لالہ کے مقابلے، سمندری سیپیوں کے مقابلے، عام استعمال کے برتنوں کے مقابلے اور پنکھوں کے مقابلے منصۂ شہود پر آئے۔ بہر کیف ہائیکو کا ماخذ و منبع رینگا ہے لہذا ایک تو اس بنا پر رینگا کی اہمیت مسلم ہے. دوسرا یہ کہ گذشتہ آٹھ سو سالوں سے ہائیکو کے پہلو بہ پہلو اس کا تخلیقی سفر جاری رہا ہے۔ باشو، بوسن اور اسا بھی رینگا کے اساتذہ تھے، رینگا ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، رینگا ایک جڑی ہوئی نظم ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے ۲۱ اور ۱۴ ارکان کے کڑیوں سے ایک مسلسل زنجیر بناتی ہے۔ ہر کڑی کو علیحدہ طور پر نظم کیا جاتا ہے لیکن اسے پہلے کی کڑی سے مختلف معنوی زاویوں سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ بذاتِ خود رینگا کا ماخذ اکلوتا "تانکا" ہے جس کو دو افراد مل کر مکمل کرتے ہیں، کہ ایک شخص پہلا تانکا باندھتا ہے جبکہ دوسرا اگلا تانکا باندھتا ہے، اس طرح دو اشخاص کے تانکوں سے ایک رینگا نظم بن جاتی ہے۔ اب ایک تانکا نظم دیکھیے جس میں ہائیکو کی روح موجود ہے۔

لوگ کہتے ہیں
ہم بے حس ہیں
مگر ہم بالکل درست سماعت سے بہرہ ور ہیں
لہٰذا ہم بادِ صبا کو سنتے ہیں
باغ کے صنوبروں میں

بہر کیف ایک خیال یہ ہے کہ پہلا ہائیکو جسے رینگا سے الگ کر کے لکھا گیا، غالباً شہنشاہ ہوری کاوا (۱۰۸۷-۱۱۰۷ء) کا تھا۔ ملاحظہ کیجیے۔

بانسری نواز "کورواتوکو"
بانسری بجاتا ہے
"کورودو" کے نزدیک

"کورودو" محل کا شمالی حصّہ تھا، کیونکہ یہ شاہی مطبخ کے نزدیک تھا اس لیے اس کو کالا دروازہ کہا جاتا تھا۔ "کورواتوکو" کا مطلب ہے کالا آدمی۔ اس ہائیکو میں اگر کوئی نقطہ ہے تو بس یہی کہ اس میں کمزور طریقے سے صنعت ایہام کا مزاحیہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ امر نامعلوم ہے کہ ہائیکو کی ابتدا کس نے کی مگر امکان اغلب ہے کہ ہائیکو سب سے پہلے گوتابا کے عہد میں لکھا گیا مثلاً فیوجی واراسادائی کا یہ ہائیکو دیکھیے جس کا شمار ابتدائے کار ہائیکو میں ہوتا ہے۔

طوفان
بکھرے ہوئے پھولوں کے
تعاقب میں ہے

بہر کیف پہلے تانکا کے قالب میں مقیم رہا پھر رینگا میں چلا آیا۔ بعد ازاں رینگا کی صنف ہائیکو میں بدل گئی، اس تبدیلی کے عقب میں ثقافتی، معاشرتی اور شخصی رویے کار فرما تھے جداگانہ سطح پر بھی اور امتزاجی سطح پر بھی سولھویں صدی کے آخر میں رینگا اپنی شہرت و طاقت کھو چکی تھی، بس جس چیز نے اس کی روح کو تھوڑا بہت سہارا دے رکھا تھا وہ مزاح، ایہام، طنز و تضحیک، کہاوتیں اور متناقضات وغیرہ کا استعمال تھا۔ رینگا کے بعد ہائیکائی کا چلن عام ہوا۔ یہ رینگا کی مشہور ہئیت تھی جس کے ضابطے عام آدمیوں کے لیے پیچیدہ تھے۔ دراصل یہ ایک طویل نظم تھی جس کو اجتماعی طور پر مکمل کیا جاتا تھا ۵ - ۷ - ۵ ارکان پر مبنی اس کے ابتدائی حصّے کا نام "ہوکو" تھا جس کی بنیاد موسم کے اختصاص پر قائم تھی، بعد میں یہی حصّہ الگ ہو کر ہائیکو کہلانے لگا۔ ہائیکائی سنجیدہ صنف نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرح کا شعری تماشا تھا جس میں شریک ہو کر شاعر کی انفرادی صلاحیت مختلف مزاجوں اور آہنگوں میں دب جاتی تھی سو ہائیکو کی جداگانہ ہئیت کے قیام کے پس پشت جاپانی شعرا کی انفرادی شناخت کی طلب بھی موجود ہے۔

باشو سے پہلے شاعروں میں سوگی، سوکان اور موری تاکے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تینوں ہائیکائی کے مخترع اور بنیاد ساز شاعر تھے۔ ہائیکو کی تاریخ میں سوگی (۱۴۲۱ تا ۱۵۰۲ء) کا مقام یہ ہے کہ اس نے ہائیکو کو الگ اور آزاد صنف بتانے کے رُجحان پر زور دیا۔ اُس نے کئی ایک ہوکو لکھے جن کو رینگا اور ہائیکائی کے پہلو بہ پہلو ہائیکو کہنا درست ہے۔ سوگی کو بابائے ہائیکو کہا جاسکتا ہے مگر ایک

لاپروا بابائے ہائیکو۔ سوگی ان معنوں میں باشو کا پیشرو ہے کہ وہ سفر پسند ہے، خلوت سے محبت کرتا ہے اور شاعری کو لمحات آگہی کا اظہار سمجھتا ہے تاہم اس میں باشو جیسی انسانی مہر و محبت کی کمی ہے عالم ضعیفی میں سوگی کو اس بات کا غم تھا کہ اُس نے اشیائے دُنیا کی وابستگی میں اپنی زندگی گزار دی اور حیات آئندہ کے تصور کو بھلا کر فریضۂ رہبانیت ادا نہ کیا۔ سوگی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مواد اور ہئیت پرندے کے دو پر ہوتے ہیں جن میں توازن پایا جاتا ہے فن کا حسن اسی توازن سے عبارت ہے۔ تاہم اگر مواد و ہئیت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو مواد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ سوگی کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجیے۔

طوفانی جھونکوں نے
جنگلی چیری کے پھولوں کو نہیں بتایا
کہ موسم گرما آگیا ہے

پہاڑوں پر جنگلی شاہ دانے کے پھول اپنی چھب دکھا رہے ہیں۔ ان کو ابھی تک موسم گرما کے آنے کی اطلاع نہیں ملی۔ سوگی نہیں چاہتا کہ اواخر بہار کی شدید ہوائیں ان پھولوں کو بکھیر دیں۔

سوکان (۱۴۵۸ تا ۱۵۴۶ء) سمورائی خانوادے میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنی زندگی ایک خانقاہ میں سادہ انداز سے گزار دی۔ درج ذیل نظم دیکھیے جس میں بذلہ سنجی اور مزاح کی چاشنی موجود ہے۔

ممکن ہے تمہارا بدن ٹھنڈا ہو
مگر تم خود کو آگ مت تاپنا
اے برف کے بدھا!

ایسی ہی ہائیکو نظموں کی بنیاد پر سوکان ہائیکو سے بھی زیادہ سن رایو کا پیشرو دکھائی دیتا ہے۔

موری تاکے (۱۴۷۲ تا ۱۵۴۹ء) عمر میں سوکان سے بڑا تھا۔ وہ زندگی بھر ایک خانقاہ "اِسے" میں شنتومت کے پادری کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ وہ ایک ہنرمند رینگا شاعر اور عالم فاضل شخص تھا۔ باشو سے پہلے کے دیگر شعرا کی طرح موری تاکے نے ذومعنی الفاظ کا سہارا بھی لیا ہے مثلاً یہ ہائیکو:

ہانا یوری مو
ہانائی آری کے او
نائی او کانا
رسیلی خوشبو
اتنی زیادہ پھول میں نہیں
جتنی کہ ناک میں

ہانا کا مطلب ناک بھی ہے اور پھول بھی۔ یہ لفظ قدیم وقتوں سے مزاحیہ ایہام کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس ہائیکو میں موری تاکے نے لفظی کھیل تماشے کی انتہا سے خوشبو کی انتہا تک پہنچنا چاہا ہے۔ اس کا ایک اور ہائیکو ملاحظہ کیجیے

تڑکے میں
موسم خزاں کی بارانی بوندیں

ہائے! کس قدر شاعرانہ ہیں

اب موری تاکے کی اک نظم دیکھیے جو اُس نے بسترِ مرگ پر لکھی۔

افسوس کہ میرا وقت آخر

آج ظہور پذیر ہوسکتا ہے

طلوعِ سحر کی طرح

موری تاکے کے بعد تائمن دبستان کے بانی تائی توکو (۱۵۷۰ تا ۱۶۵۳ء) کی اہمیت مسلّم ہے۔ اُس نے واکا اور رینگا کی تعلیم یوسائی جیسے استادِ فن سے حاصل کی جس نے ایک دن اُس سے کہا تھا کہ "اگر اس ملک میں شاعری بہت زیادہ ہر دلعزیز ہوگئی تو تم بہت شہرت کماؤ گے۔" تائی توکو نے جواباً کہا تھا کہ میں بہت خوش ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو میں معاشرے میں داخل ہوجاؤں گا۔" اس مکالمت سے تائی توکو کے کردار کی منکسر المزاجی عیاں ہوتی ہے۔ اُس نے ۲۹ برس کی عمر تک آرام دہ اور خوش باش زندگی کاٹی۔ بعد ازاں اس کی بینائی میں کوئی نقص پیدا ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں تکلیف رہنے لگی جس کا اظہار اس نے ایک نظم میں بھی کیا ہے۔

سمندر کی یہ تاریک رات

مجھے اُمید ہے کہ میرے سرہانے سے

سحر طلوع ہوگی

اور آنکھیں

لوگوں کو دیکھ سکیں گی

تائی توکو کے بعد سوئن (۱۶۰۴ تا ۱۶۸۲ء) کا نام آتا ہے جس نے ہائیکائی شاعروں کا ایک نیا گروپ منظم کیا جسے ڈنرن سکول کہتے ہیں اور جو تائمن سکول کا مخالف ہے۔ سوئن سمورائی تھا اور ادب دوست شخص تھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں وہ راہب بن کر کیوتو کے نزدیک رہنے لگا جہاں اُس نے رینگا کا مطالعہ کیا۔ وہ تائی توکو کے مشہور اور مروج اسلوب سے نامطمئن تھا۔ سو اس نے سوکان اور موری تاکے کی طرف رجوع کیا۔ وہ ہائیکو کو آزاد، الگ اور دلچسپ صنف کے طور پر تشکیل دینے کا خواہش مند تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر قسم کی لفظیات و مواد کے استعمال کی اجازت دے دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعروں نے ابتذال، سوقیت اور ناشائستگی تک سے گریز نہ کیا۔ اس ضمن میں سائیکا کو کا کلام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ آزادی اور کھلی چھٹی تائمن اسکول کے منافی تھی سو تائمن اور ڈنرن سکول کا تنازعہ طیش و غیظ کی حدوں کو چھو گیا اور نتیجتہً بغرض استدلال دونوں دبستانوں کی طرف سے بہت سی کتب لکھی گئیں۔ سوئن کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجیے۔

گیلاس کے شگوفوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے

میری گردن کی ہڈی

دُکھنے لگتی ہے

سوئن یہاں صداقت کا پورا چہرہ دکھا رہا ہے "واکا" (تانکا) کے شاعر زندگی کے ناخوشگوار، قبیح اور غیر شاعرانہ حقائق سے دامن بچاتے ہیں لیکن یہاں "گردن کے درد" نے شاعرانہ دلچسپی کے لیے ایک عمدہ امکانی شہادت فراہم کی ہے اور ہائیکو کی گہری اور

ماورائی سطح کو نمایاں کر دیا ہے اور یہ کہ درد محبت ہے اور محبت درد ہے۔ اس ہائیکو کی اساس "شن کوکن شو" میں سائی گیو کی ایک واکا نظم پر رکھی گئی ہے مثلاً

مسلسل تکتے ہوئے، مسلسل تکتے ہوئے
چیری کے پھولوں کو
میرے محسوسات کیا ہیں!
لیکن جب یہ گر جاتے اور رخصت ہو جاتے ہیں
میں کتنا غمزدہ ہو جاتا ہوں

ڈنرن اسکول کے ایک شاعر سائی جن کا ایک ہائیکو دیکھیے جو ۱۷۰۹ء میں فوت ہوا اور جس نے شاعری کی تربیت سوئن اور سائیکا کو سے پائی۔

چیری کے پھولو
امشب بکھر جائیں گے
نئے چاند کی کلہاڑی تلے

ڈنرن دبستان کے اختتام اور باشو دبستان کے آغاز کے درمیان بہت سے شاعر ہو گزرے ہیں جن میں تاکاماسا اور سائیکا کو نمایاں ہیں۔ تاکاماشا کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجیے۔

چوہا بدھ کی قربان گاہ میں جاتا ہے
اُس کا سر آراستہ ہے
بنفشے کے پھولوں سے

اس نظم پر اس حوالے سے تنقید کی گئی ہے کہ آیا یہ چوہے سے متعلق کوئی ہائیکو ہے یا بنفشے کے پھولوں سے۔

سائیکا کو (۱۶۴۳ تا ۱۶۹۳ء) اپنے عہد کی ہائیکائی دنیا میں اہم حیثیت کا حامل شاعر ہے۔ اُس کے ہاویکو اسلوب پر نہ صرف یہ کہ تائمن اسکول نے چوٹ کی بلکہ باشو سکول نے بھی اسے ہدف ملامت بنایا۔ اُس کا ایک ہو کو دیکھیے۔

گرما کی بارش میں
چھوٹے سے پُل کے نیچے لالٹین لٹک رہی ہے
دریائے "یودوگاوا" پر

یہ ہائیکو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ڈکنز نے لندن کا نہیں "ایدو" کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

باشو کے عہد میں اونتسورا (۱۶۶۰ تا ۱۷۳۸ء) بھی اچھے ہائیکو کہہ رہا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ سوئن سکول میں داخل ہوا۔ پچیس برس کی عمر میں اُس نے اچانک محسوس کیا کہ ہائیکائی کی صداقت، ایک کامل صداقت کا نام ہے اور صداقت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کا ایک ہائیکو دیکھیے جو اُس نے اپنے بیٹے کی موت پر لکھا۔

اُس کو میں مٹی میں دفن تو کر دیتا ہوں
لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے

کہ بچہ اُس میں سے اُگ آئے گا

اونتسورا جو "ماکوتو" یعنی خلوص کو دُنیا کا اہم عنصر قرار دیتا ہے، اپنی زندگی کے آخری سالوں میں مبلّغ ہوگیا اور بالآخر اُس نے مذہبی پیشوا کا منصب اختیار کرلیا۔ اس کا ایک عمدہ ہائیکو پڑھیے۔

ہوا سیٹی بجاتی ہے
آسمان میں
سرما کے گل ہائے نعمان

یہاں صاف ستھری بے رنگت ہوا اور بڑے بڑے سرخ پھولوں کے مابین تضاد کو اور سرما کے تند جھونکوں اور پونی یا نعمان کے پھولوں کے درمیان طاقت کے تقابل کو بیان کیا گیا ہے۔ اب اس کا ایک اور ہائیکو دیکھیے۔

ٹھنڈی ہوا
بہشت کا تہہ خانہ بھر گیا ہے
صنوبر کی آوازوں سے

اونتسورا کے ہاں باشو جیسا تعمّق تو نہیں ہے لیکن اخلاص و صداقت اُس کے محبوب روّیے ہیں اور انہی کو وہ مقصد حیات کا درجہ دیتا ہے۔

باشو کے پیشرو ہائیکائی شعرا نے ہائیکو کے لیے ایک فضا ہموار کردی تھی۔ چنانچہ باشو نے آگے بڑھ کر ہائسکائی کے طویل اور اجتماعی نظمیہ آہنگ سے نجات حاصل کر کے "ہوکو" کو ایک الگ اکائی کے طور پر قبول کرلیا۔

امجد حیدر آبادی

(ادب میں صوفیانہ فکر کا ایک نیا زاویہ)

حمایت علی شاعر

حیدر آباد دکن کی ایک تاریخ تو وہ ہے جو نظام الملک آصف جاہ اول سے شروع ہوتی ہے اور میر عثمان علی خاں آصف سابع پر ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن دوسری تاریخ وہ جو شعر و ادب سے عبارت ہے۔ ہر چند کہ اس کا آغاز بھی ایک بادشاہ کے نام سے ہوتا ہے مگر وہ بادشاہ صرف حکمران نہیں تھا بلکہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ حیدر آباد دکن کی تاریخ اسی شاعر یعنی قلی قطب شاہ سے شروع ہوتی ہے اور امجد حیدر آبادی پر اپنا ایک دور ختم کر کے مخدوم محی الدین کے نام سے ایک نئے دور میں داخل ہوجاتی ہے۔

یہ تین نام دراصل تین فکری رویوں کے نام ہیں۔

قلی قطب شاہ کی شاعری میں جو عشق، مجازی حدود میں حُسن و صداقت کا متلاشی رہا وہ امجد حیدر آبادی تک آتے آتے عشق حقیقی کا استعارہ بن گیا۔ اور مخدوم کی شاعری میں اپنے عہد کی ایک سماجی اور سیاسی حقیقت۔ فی الحال مجھے قلی قطب شاہ اور مخدوم کی شاعری سے بحث نہیں۔ گفتگو صرف حضرت امجد سے متعلق ہے جن کا موضوع سخن تصوف ہے۔ وہ خود بھی اپنی شاعری کو ایک صوفیانہ عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہر مرتبہ آئینہ دل دُھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کُھلتا ہے

حضرت امجد کی ساری شاعری تصوف کی معرفت، خدا، انسان اور کائنات کی ہم رشتگی کو دریافت کرنے کی ایک کوشش سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ وہ بلاشبہ صوفیانہ فکر کے سب سے بڑے اور آخری شاعر ہیں۔

انھوں نے اپنے افکار کی ترجمانی کے لیے رباعی کو منتخب کیا اور اس صنف میں وہ کمال حاصل کیا کہ دور دور تک اُن کا ثانی نظر نہیں آتا۔ اُن کے ہم عصروں میں جوش، یگانہ اور فراق یقیناً بڑے اور اہم رباعی گو تھے مگر ان کے موضوعات مختلف رہے ہیں۔ تصوّف کے مسائل جس انداز میں حضرت امجد نے بیان کیے ہیں شاید خواجہ میر درد کے بعد اتنے فکر انگیز پیرائے میں کم ہی کسی نے

بیان کیے ہوں۔ حضرت امجد کو رباعی پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ گلستان سعدی کے تراجم میں بھی انھوں نے رباعی ہی سے کام لیا ہے۔

رباعی کو انھوں نے تصوّف کے علاوہ دوسرے موضوعات کے لیے بھی اپنایا مگر ہر موضوع زبان کے مسلک کی روشنی میں اس طرح ڈھلا کہ تصوف ہی کا کوئی زاویہ نمایاں ہوگیا دراصل انھوں نے زندگی کی ہر حقیقت کا ایک ہی زاویے سے مطالعہ کیا ہے۔ حتی کہ اُن مسائل کا بھی جن کا تعلق سائنسی آگہی سے ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

خط اور نقطے کو حرف بنتے ہی بنی
ابر اور پانی کو برف بنتے ہی بنی
غیریت کا گمان مٹانے کے لیے
مظروف کو عین ظرف بنتے ہی بنی

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے
باقی ہی کی آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط، روح جدا، جسم جدا
جو برف کی شکل ہے، وہ پانی بھی تو ہے

فطرت کا تقاضا ہے کہ کوشش میں رہے
دلچسپی عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تودۂ خاک پھر رہا ہے دن رات
خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

ایک سماجی اور طبعیی حقیقت کا مطالعہ یوں پیش کیا ہے۔

دو دل اک ہوں تو نخل جاں پھلتا ہے
دل، گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
سچ یہ ہے کہ برقی روشنی کے مانند
دو تار سے، زیست کا دیا جلتا ہے

بات یہ ہے کہ حضرت امجد، دو زمانوں کے درمیان سانس لے رہے تھے، اُن کا تصوّف طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرتا ہے جو زندگی کو رد بھی کرتا ہے تو ایک مخصوص اندازِ قبولیت کے ساتھ... وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مابین فکر کا سفر طے کر رہے تھے۔ وجودی صوفیا، ہندوستان میں جس طرح ویدانت سے متاثر ہوئے اور ترک کی منزل تک پہنچ گئے، شہودی صوفیا نے اُس سے گریز کیا اور طلب کی ایک خاص منزل کو اپنایا۔ حضرت امجد بھی کہیں کہیں اسی منزل پر نظر آتے ہیں۔ وہ وجودی بھی ہیں اور شہودی بھی، وہ کسی کو یکسر رد نہیں کرتے، یہ رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

یہ فکر کسی دماغ سے نکلی ہے
یہ مئے بھی کسی ایاغ سے نکلی ہے
تو نور ہی نور .. میں سراپا ظلمت
کالک بھی مگر چراغ سے نکلی ہے

حسنِ مطلق، مقیدِ طور نہیں
خورشید کا عالم میں کہاں نور نہیں
مخلوق سے کچھ الگ نہیں ہے خالق
معنی کا وجود، لفظ سے دور نہیں

اور اب یہ رباعی ملاحظہ کیجیے۔

ہیں مستِ مئے شہود، تو بھی میں بھی
ہیں مدعیِ نمود، تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں، یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو دو وجود تو بھی، میں بھی

تصوّف کی زبان میں اسے فنا فی اللہ کہیں کہ بقا باللہ...... حضرت امجد ہر امکان کو اپناتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس صدی نے زندگی اور کائنات کا جو نیا ادراک دیا ہے۔ اُس کی پرچھائیں بھی حضرت امجد تک پہنچ چکی تھی وہ حقائق کو کھلی آنکھوں بھی دیکھ رہے تھے اور اُس تشکیک سے دور بھی رہنا چاہتے تھے جو اس عہد کی دین ہے۔ چنانچہ وہ علم و جہل کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ہم صحبت بے خرد، پریشان رہا
نا فہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

اُن کے نزدیک بنیادی حقیقت انسان ہے۔ قائم چاند پوری کا ایک شعر ہے۔

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

حضرت امجد نے اس خیال کو اپنی رباعی میں یوں بیان کیا ہے۔

مغموم کے قلب مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے

رونا تو یہ ہے کہ تونے دل کو توڑا

انھوں نے ساری شاعری میں انسانی مسائل ہی کی ترجمانی کی ہے۔

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو، عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہیو، تحمید یہ ہے
مخلوقِ خدا ہے سب، خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو، توحید یہ ہے

اس روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت امجد کی شاعری کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے جو صوفیانہ بھی ہے اور سائنسی آگہی سے قریب تر بھی، اس مختصر سے مضمون میں اُن کی شاعری کے ہر پہلو سے بحث نہیں کی جاسکتی اس لیے میں بات کو مختصر کرتے ہوئے حضرت غلام قادر گرامی کے اس خراجِ عقیدت پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں کہ سرمد بھی ایک دور کی رندہ حقیقت تھے اور امجد بھی...... حضرت گرامی کہتے ہیں۔

امجد بہ رباعی است فردِ امجد
کلکِ امجد، کلیدِ گنجِ سرمد
گفتم کہ بود جوابِ سرمد امروز
روحِ سرمد گفت، امجد امجد

وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی

جعفر بلوچ

جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی (متوفیٰ ۱۹۲۴ء) حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے معاصرین میں سے تھے۔ آپ نے صحافت و ادب کے میدان میں یکساں نیک نامی حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ان کے اٹھ جانے کے بعد قوم نے ان سے بھی سنگدلانہ فراموشی کا رویّہ اختیار کیا۔

جناب وجاہت صدیقی جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، ماجد مولوی محمد مخدوم لاہور میں فنانشل کمشنر پنجاب کے دفتر میں محافظ دفتری تھے۔ جناب وجاہت ابھی چار ہی سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ فروری ۱۸۹۳ء میں انھوں نے جھنجھانہ کے اُردو مڈل اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا اب انھوں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور تحصیل دیو بند میں مستقل طور پر نقل نویس ہوگئے۔ لیکن چار سال بعد انھوں نے یہ نوکری بوجوہ چھوڑ دی۔ ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ۳ مئی ۱۹۰۳ء کو جھنجھانہ کا خانگی کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کر کے وہ لاہور آگئے اور ادارت و تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ کچھ عرصہ سیّد ممتاز علی (شمس العلماؒ) کے ساتھ بطورِ معاون کام کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اپنا ماہنامہ "اصلاحِ سخن" جاری کیا جس میں اکبر الہ آبادی اور حضرت علامہ اقبال کی طرحی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے آپ روزنامہ "زمیندار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے۔ مولانا ظفر علی خاں ولایت تشریف لے گئے تو زمیندار کے ادارت کی فرائض مولانا وجاہت حسین ہی انجام دیتے رہے۔ پھر انھوں نے "ستارۂ صبح" میں بھی کام کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انھو نے اپنا روزنامہ "آفتاب" جاری کیا۔ مولانا سیّد حبیب مدیر "سیاست" کی قید کے زمانہ میں "سیاست" کا بارِ ادارت وجاہت صاحب نے اٹھایا۔ لیکن اس دوران میں ان کی صحت خراب ہوگئی۔ وہ اپنے وطن جھنجھانہ چلے گئے اور وہیں ۳ اپریل ۱۹۲۴ء کو واصل بحق ہوئے۔

جناب وجاہت حسین صدیقی کی تصنیفات و تالیفات میں فتوح عبد الحمید خاں (۱۸۹۹ء) اختلاف اللسان (۱۹۰۴ء) انور پاشا (۱۹۲۱ء) مصطفےٰ کمال پاشا (۱۹۲۱ء) جنگِ ترکی و یونان (۱۹۲۳ء) سیرتِ بلالؓ (س ن) اور مقدمہ سیّد حبیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سر سیّد احمد خاں کی وفات پر کہے جانے والے مرثیوں، قطعات اور نظموں وغیرہ کو انھوں نے بہ راویت جناب عبد اللہ قریشی سر سیّد کا ماتم کے نام سے مرتب کیا۔ اور سفر نامۂ بمبئی میں ان اہلِ قلم حضرات کے حالات قلم بند کیے جن سے اس سفرِ بمبئی کے دوران میں ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔

جناب وجاہت بہت خوش گو شاعر بھی تھے اور حضرت داغ سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا کوئی مجموعہ کلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی طرح تاریخی و ادبی موضوعات پر لکھے ہوئے ان کے متعدد قابلِ قدر مضامین بھی ابھی تک تدوین و اشاعت کے منتظر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت حسین صدیقی اور مولانا ظفر علی خاں میں صحافتی سیاسی اور ادبی حوالے سے قریبی مراسم تھے۔ مثلاً وجاہت صاحب کے ماہنامہ "اصلاحِ سخن" کے جنوری ۱۹۰۹ء کے شمارے میں مولانا ظفر علی خاں کی مشہور نظم "فریادِ ظفر المعروف بہ شورِ محشر" پر وجاہت صاحب کے قلم سے، ایک تبصرہ ہمیں ملتا ہے۔ موسیٰ ندی، حیدر آباد دکن کی ایک نہایت خطرناک ندی تھی اس ندی میں وقفوں وقفوں سے بعض نہایت تباہ کن سیلاب آئے جن کی تفصیلات حیدر آباد دکن کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی نظم میں جس طغیانی کا ذکر ہے وہ غالباً ۱۹۰۸ء میں آئی تھی۔ مولانا کی نظم حیدر آباد کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں پڑھی گئی تھی اور پھر اسے کتابچے کی شکل میں چھاپا گیا تھا۔ جناب وجاہت نے اس معرکہ آرا نظم پر ذیل کا مختصر تبصرہ کیا۔ موسیٰ ندی کی طغیانی حیدر آباد دکن میں غضب ڈھا گئی اس کے صدمے سے کم و بیش ہر شخص متاثر ہوا۔ شعرائے حیدر آباد نے خصوصیت سے بحرِ طبع کی روانی دکھائی اور اس حادثہ پر خوب خوب نظمیں موزوں کیں۔ فریادِ ظفر منشی ظفر علی خاں صاحب بی اے اڈیٹر دکن ریویو کی قابلِ قدر و موثر نظم ہے۔ یعنی اس کی شاعری بھی اچھی ہے اور واقعات بھی وضاحت سے قلم بند کیے ہیں۔

۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خاں کا "ستارۂ صبح" خاص اہتمام سے چھپنے لگا تو مولانا نے ۸ اگست ۱۹۱۷ء کے ایک شذرہ میں اپنے حلقۂ ادارت کا تفاخر آمیز ذکر بھی کیا یہ حلقۂ ادارت چھ مددگاروں اور ایک مددگارِ خاص پر مشتمل تھا۔ چھ مددگاروں کے نام ترتیب وار یہ تھے۔

علامہ عبداللہ العمادی، سیّد وحید الدّین سلیم، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولوی خواجہ عبد الحق سابق مدیر اقدام، مرزا امان اللہ خاں اور مرزا سعید بیگ مدیر "پنجاب"۔ مددگارِ خاص جناب اختر علی خاں کو قرار دیا گیا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی سے یہ حلقہ بہت جلد منتشر ہو گیا بلکہ عبداللہ العمادی اور مولانا ظفر علی خاں میں تو نہایت ناگوار قسم کا قلمی محاربہ بھی شروع ہو گیا لیکن ان حالات میں جناب وجاہت کے پائے، استقلال میں لغزش نہ آئی وہ مسلسل مولانا کے ساتھ رہے۔ "ستارۂ صبح" کے اجرا پر وجاہت صاحب نے جو نظم کہی تھی وہ حسنِ بیان اور زورِ کلام کے لحاظ سے خود مولانا ظفر علی خاں کے رنگِ سخن کی یاد دلاتی ہے۔ بیس اشعار کی یہ نظم ۲۸ اگست کے "ستارۂ صبح" میں شائع ہوئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نئی ادا سے ہوا جلوہ گر ستارۂ صبح
پئے ظفر ہے نشانِ ظفر ستارۂ صبح
چمک دمک ہے کچھ ایسی کہ لوگ کہتے ہیں
بنا ہے رو کشِ شمس و قمر ستارۂ صبح
ستارے اور بھی ہیں آسمان پر لیکن
ہوا طلوع برنگِ دگر ستارۂ صبح
حریم ملتِ بیضا کی اس سے رونق ہے

بنا ہے روشنیٔ بام و در ستارۂ صبح
ہے نور ارض و سماوات کی جھلک اس میں
ہے شمعِ محفلِ خیر البشر ستارۂ صبح
کہے گا اُٹھ کے زمیندار شب کو پچھلے پہر
چمک رہا ہے مرے کھیت پر ستارۂ صبح
ہے اشتیاق ترا دیدۂ بصیرت کو
ابھر ابھر ابھی کچھ اور ابھر ستارۂ صبح
جھلک جھلک کہ ہے قدوسیوں کی جانب سے
ہماری قوم کا تو نامہ بر ستارۂ صبح
خدائے جلّ و علا سے یہ ہے دُعا اپنی
کہ روز نکلے بصد کروفر ستارۂ صبح

۴ مئی ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگِ عظیم کے سلسلے میں پنجاب سے فوجی بھرتی کرنے کے لیے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے زیرِ صدارت ایک جلسہ لاہور یونیورسٹی ہال میں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں حضرت علامہ اقبال کو بھی مجبوراً شریک ہونا پڑا تھا اور وہاں انھوں نے وہ نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

حضرت اقبال کی یہ مکمل نظم باقیاتِ اقبال، میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر، اگرچہ مولانا کے قیام دکن کے زمانہ سے مولانا کا مخالف و معاند چلا آرہا تھا لیکن ان دنوں وہ مولانا کے نرم سیاسی رویّہ کی وجہ سے مولانا پر کچھ مہربان تھا بلکہ "ستارۂ صبح" کے اجرا کی اجازت بھی اسی کی مرہونِ منت تھی۔ چنانچہ "ستارۂ صبح" نے ایک نوٹ میں اس تقریر کو سراہا جو سر مائیکل نے متذکرہ بالا جلسہ میں کی تھی۔ اور ۸ مئی ۱۹۱۸ء کے ایک ادارتی نوٹ میں لکھا گیا۔

"ہز آنر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی تقریر بہ لحاظ خیالات و معلومات ایک معرکہ آرا تقریر ہے جس نے جنگ کے تمام پہلوؤں پر نہایت عمدگی و صفائی سے پوری روشنی ڈال دی۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم سلطنتِ برطانیہ کی فصاحت و بلاغت کا خاص شہرہ ہے لیکن ہز آنر کی یہ تازہ ترین تقریر بھی غیر معمولی وقعت و اہمیت رکھتی ہے اور ہم بلا خوفِ تردید یہ کہ سکتے ہیں کہ ہز ایکسیلینسی وائسرائے نے پچھلے دنوں دہلی کانفرنس میں جو تقریر فرمائی تھی اس سے ہز آنر کی تقریر زیادہ مبسوط و مشرح ہے۔"

فوجی بھرتی کے موضوع پر "ستارۂ صبح" کے ۸ مئی کے شمارہ میں جناب وجاہت کی بھی ایک نظم شائع ہوئی تھی اور اس میں بھی سر مائیکل کی متذکرہ بالا تقریر کی طرف تحسین آمیز اشارہ ملتا ہے۔ ممکن ہے سر مائیکل اوڈوائر کی تقریر کے بارے میں "ستارۂ صبح" کا متذکرہ بالا نوٹ بھی خود وجاہت صاحب نے لکھا ہو۔ وجاہت صاحب کی اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اپنے خُطبے میں نمایاں کیے جوہر اچھے
وائسرائے سے تو لفٹننٹ گورنر اچھے

ظلم بھولے سے کسی پر نہیں ہونے پاتا
واقعی بات ہے انگریز ہیں افسر اچھے
بر خلاف اس کے ہیں جرمن بڑے وحشی ظالم
ان کے بے رحم دلوں سے تو ہیں پتھر اچھے
روس کی صلح سے دشمن نے یہ موقع پایا
ایشیا میں بھی رہے اس کے نہ تیور اچھے
ہند نے جنگ میں معقول اعانت کی ہے
ہر جگہ بھیج دیے لڑنے کو لشکر اچھے
ان کی قوت نے بڑا کام بڑا نام کیا
سب یہ کہتے ہیں کہ ہندی ہیں دلاور اچھے
امتحاں گاہِ شجاعت میں ہوئے دھوم سے پاس
جنگِ یورپ میں بھی حاصل کیے نمبر اچھے
اب ہے سرکار کو درکار زیادہ امداد
مثلِ سابق نہیں حالات برابر اچھے
اُٹھتی ہیں جانب پنجاب نگاہیں سب کی
یہی صوبہ تو جواں رکھتا ہے اکثر اچھے
شیر دل کہتے ہیں پنجاب کے باشندوں کو
زور و قوت کے انھیں میں تو ہیں جوہر اچھے

جناب وجاہت اور مولانا ظفر علی خاں کے مراسم کے ضمن میں یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ ایک بار وجاہت صاحب کی ایک نظم جس سے سر مائیکل اوڈوائر کے بارے میں شاید تعریض کا کوئی پہلو نکلتا تھا، سنسر کی زد میں آگئی اور شائع نہ ہوسکی۔ نظم کے سنسر ہونے کا یہ واقعہ جب وجاہت صاحب نے حضرت مولانا کو سنایا تو انھوں نے اس واقعہ کو وجاہت صاحب کی طرف سے نظم کردیا اور ایک توضیحی نوٹ کے ساتھ ۱۵ اپریل ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں بعنوان "آفتاب، بکوریٔ چشمِ سنسر" شائع کردیا۔ اب یہ نظم مولانا کے مجموعۂ کلام "بہارستان" کی زینت ہے۔ مولانا کا نوٹ اور نظم درج ذیل ہیں:

"عزیز مکرم مولوی وجاہت حسین صدیقی صاحب ایڈیٹر "آفتاب" بھی ایک عرصہ تک جناب حضرت سنسر کے ناوکِ بیداد وجفا کا تختہ مشق رہ چکے ہیں۔ آپ کی جو شامت آئے، آپ نے ہز آنر سر ایڈورڈ میکلیگن کی شان میں ایک بہاریہ قصیدہ لکھا۔ میکلیگن کے ساتھ ایک قافیہ گلشن بھی بندھ گیا تھا۔ نظم جب سنسر کے پاس پہنچی تو ان لال بھجکڑ نے یہ سمجھ کر کہ اس سے سر مائیکل اوڈوائر کا باغ خارستان ہوا جاتا ہے، بیچارے ایڈیٹر "آفتاب" کی نظم کی اشاعت روک دی۔ ہم نے ان سے یہ واقعہ سُن کر انھیں کی طرف سے اسے نظم کر ڈالا۔ ملاحظہ ہو۔

دل ہو تو ایک اور حکایت نئی سنو

آزادیٔ خیال کے عہدِ عذاب کی
سرمائیکل سے جائزہ جب لے لیا گیا
جس وقت ختم ہوگئی مدت جناب کی
ہم سمجھے آگئی چمنِ علم میں بہار
چھائی ہوئی تھی جس پہ خزاں احتساب کی
لیکن خمارِ دیشبہ ٹوٹا نہ تھا ہنوز
بوتل میں بند تھی ابھی مستی شراب کی
سنسر کے ہاتھ سے ابھی چھوٹا نہ تھا قلم
جس نے ادب کی خوب ہی مٹی خراب کی
پنجاب کی صحافت مسکین وکس مپرس
شاکی تھی آپ کے ستم بے حساب کی
اک روز میں نے مدح سر ایڈورڈ میں کہی
اک نظم جو ہے جان وفا کی کتاب کی
اس کو بھی کردیا نظری دیکھنے کے ساتھ
کیا بات ہے جناب رقابت ماب کی
گلشن کے ساتھ قافیہ میکلیگن آگیا
سب سے بڑی خطا تھی یہی "آفتاب" کی
ازبسکہ زلہ خوار تھے عہدِ قدیم کے
مجھ کو دکھائی شان پُرانے عتاب کی
کہنے لگے کہ لکھ کے قصیدہ یہ آپ نے
"پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی"
سر پیٹ کردیا انھیں میں نے بھی یہ جواب
"جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی"

ادارۂ "زمیندار نے جناب وجاہت کی وفات پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ۱۱ اپریل ۱۹۲۴ء کو لکھا:

"ہمیں مولانا وجاہت حسن صدیقی صاحب کی وفات حسرت آیات کا دو گونہ رنج ہے۔ ایک تو اس لیے کہ مدت تک ان کا زمیندار کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ دوسرے اس لیے کہ انھوں نے ادبی اور سیاسی دُنیا میں نمایاں خدمات انجام دیں اور ان کے انتقال سے ملک و قوم کے خادموں کی صف میں ایک قابلِ افسوس کمی واقع ہوگئی۔"

جناب وجاہت کی نگارشاتِ نظم و نثر ان کے اپنے جاری کردہ جرائد کے علاوہ ملک کے دیگر موقر جرائد مثلاً زبان، دہلی، مخزن

لاہور، کمال دہلی، ستارۂ صبح وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ان کی نظموں میں اپنے زمانے کے سیاسی و معاشرتی حالات کا رنگ اور قومی وملی جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ فطرت نگاری اور ظریفانہ رنگ سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ غزل میں وہ زیادہ تر اپنے استاد حضرتِ داغ کے زیر سایہ رہے۔ ان کی زبان میں روز مرّہ اور محاورہ کا چٹخارہ ہے اور ان کے مضامین غزل میں شوخی، نکتہ آفرینی اور بانکپن کے عناصر بہار آفرینی کرتے ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کی چند غزلوں کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

مہرباں غیر پر نہ ہوجائے
وہ اِدھر سے اُدھر نہ ہوجائے
دیکھتا رہوں انھیں تو کہتے ہیں
دیکھ مجھ کو نظر نہ ہوجائے

(زبان دہلی۔ جنوری ۱۸۹۴ء)

سُن کر سوالِ وصل کہو کچھ تو ہاں، نہیں
چپ کیوں ہو گیا، تمھارے دَہن میں زبان نہیں
ایمان کی کہیں گے وجاہت حسین ہم
دہلی سے بڑھ کے اور کہیں کی زبان نہیں

(زبانِ دہلی مئی ۱۸۹۴ء)

روز ازل سے مست ہیں کیفِ شراب میں
پیتے ہیں بھر کے ہم قدح آفتاب میں
شیرازہ دل کا عشقِ بتاں میں بکھر گیا
ثابت نہیں ہے ایک ورق اس کتاب میں

(زبانِ دہلی جولائی ۱۸۹۵ء)

عجب ادا ہے، ادا میں ادا نکلتی ہے
ستم میں لطف و کرم میں جفا نکلتی ہے
ہماری آنکھ سے دیکھے تجھے کوئی اے بُت
کہ تجھ میں نام خدا بات کیا نکلتی ہے
مری تو جان نکلتی ہے تو بتا شبِ غم
نہیں نکلتی ہے کم بخت یا نکلتی ہے
ہماری منزل ہستی سے نیستی دراصل
اسی سڑک سے تو راہِ فنا نکلتی ہے
تمھاری چال، قیامت، ہیں دونوں چیزیں ایک
مگر یہ کم ہے وہ اس سے ذرا نکلتی ہے

رہے گا دل میں وجاہت خیالِ زلفِ سیاہ
کہیں نکالے سے اب یہ بلا نکلتی ہے؟

(اصلاحِ سخن، جنوری ۱۹۰۹ء)

یہ خوب چھیڑ چھاڑ ہے جب میں نے آہ کی
اس کے جواب میں بُتِ کافر نے واہ کی
میں جانتا ہوں اصل ہے جو مہر و ماہ کی
دونوں یہ ٹوپیاں ہیں کسی کج کلاہ کی
محشر میں دل بھی ان کا طرفدار ہوگیا
نیت بدل گئی ہے ہمارے گواہ کی

(کمال دہلی، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

جہاں تک جناب وجاہت کی نثری نگارشات کا تعلق ہے، لسانیات کے موضوع پر ان کی تحریریں مرورِ وقت کے ساتھ اپنی اہمیت بہت کچھ کھوچکی ہیں۔ بلکہ ان کی کتاب، اختلاف اللسان، تو ان کے اپنے زمانہ میں بھی متنازعہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک صاحب نقاد لکھنوی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ "زمانہ" (شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء) میں لکھا تھا:

"دہلی و لکھنؤ کی زبان اب کوئی جُداگانہ زبان نہیں ہے اور مدت ہوئی کہ پورب پچھم کا ناگوار فرق مٹ چکا ہے۔ تاہم منشی وجاہت حسین صاحب صدیقی نے اس بحث کو تازہ کرنا ضروری خیال فرمایا ہے .... صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کتاب دلی والوں کے طرفدار ہیں۔ اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ چونکہ مولف صاحب، کو زبان لکھنؤ سے ادبی واقفیت بھی نہیں لہذا جتنے محاورات لکھنؤ سے منسوب کیے گئے ہیں، ان میں بیشتر غلط اور عدیم الوجود ہیں۔ جن محاورات کی شعرائے لکھنؤ کے کلام سے سند دی گئی ہے، انھیں متروک ہوئے مدت ہوچکی۔ اس طرح تو قدیم شعرائے دہلی کے کلام سے بھی بہت مہمل محاورات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مگر بحث صرف زبانِ حال سے ہونا چاہیے۔"

جناب وجاہت کی دیگر نثری تصانیف میں ادب و تاریخ کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور موجود ہے اور ان کتاب "سیرتِ بلالؓ" تو مستقل اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت اپنے لوازمے کو فنکارانہ سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی تحریر عموماً سادہ اور موثر ہوتی ہے ہم کہیں کہیں ان کے یہاں خطیبانہ انداز بھی پیدا ہوجاتا ہے جس سے نثر کے انضباط کو نقصان پہنچتا ہے۔

وجاہت کے اسلوبِ نثر نگاری کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی سطوت و جلالت مشہور ہے۔ مگر حضرت بلالؓ کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے، اس باب میں صاحب اسد الغابہ کا حسب ذیل قول ملاحظہ طلب ہے، "حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ ہمارے سردار تھے اور انھوں نے ہمارے سردار

یعنی بلالؓ کو آزاد کیا۔"

جب حضرت عمرؓ جیسا باجبروت خلیفہ حضرت بلالؓ کو سردار، کے لفظ سے یاد کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ بلالؓ صرف ایک کے غلام تھے اور باقی سب کے آقا، بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کو اسلام میں سب سے پہلے اذان دینے کا فخر حاصل ہوا۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنھوں نے راہِ خدا میں بڑی بڑی کڑیاں اُٹھائیں۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جو سفر و حضر میں ہمیشہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنھوں نے اسلام اور خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کی صدائے اذان سے صحابہ عظامؓ کے قلوب اور گرد و نواح کی زمین میں زلزلہ آجاتا تھا۔ بلالؓ وہ مؤذن تھے جو محض حجرہ نشینی ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ سر بکف اور شمشیر بدست ہو کر غزوے اور ہر معرکہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کو اسلام کی بدولت غلامی سے آزادی حاصل ہوئی اور انجام کار مسلمانوں کے سردار بن گئے۔ سبحان اللہ حضرت بلالؓ رسول ﷺ خدا کی غلامی کس درجہ شرف و اعزاز کا باعث ہے۔

منم غلام غلام تو یا رسول اللہ
دلم فدائے بنام تو یا رسول اللہ

(سیرت بلالؓ، ص ٦-۷)

کم معروف مگر اہم اہلِ قلم کے حالاتِ حیات اور آثارِ قلم کی تحقیق و تنقید اور تالیف و تدوین میں ہمارے لیے برکت و سعادت کے متعدد پہلو ہیں۔ اس طرز عمل سے اگر ایک طرف ہمیں مختلف ادوار کے علمی و ادبی ارتقاء کو زیادہ معروضی انداز میں پرکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف ان اکابر کے قلمی ترکہ کا انتقاد و استحسان قومی سطح پر ہمارے فکری و وجدانی اثاثے میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی ،وران کے دیگر ممتاز معاصرین کے احوال و آثار بھی اہلِ نظر سے التفات و اعتناء کے متقاضی ہیں۔

کتابیات

(۱) اخبار نویسوں کے حالات مرتبہ منشی محمد الدین فوق
(۲) فرہنگ عامرہ مرتبہ عبد اللہ خاں خویشگی
(۳) پنجاب میں اُردو اخبار نویسی از مسکین علی حجازی (پروفیسر) مقالہ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
(۴) باقیاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدلواحد معنی و محمد عبد اللہ قریشی آئینۂ ادب لاہور۔ ۱۹۷۸ء
(۵) سیرتِ بلالؓ از وجاہت حسین صدیقی (س ن)
(٦) اختلاف اللسان۔ از وجاہت حسین صدیقی (۱۹۰۴ء)
(۷) ماہنامہ اصلاح سخن لاہور۔ بابت جنوری ۱۹۰۹ء
(۸) ستارۂ صبح۔ لاہور مختلف شمارے
(۹) ماہنامہ زبان دہلی۔ مختلف شمارے
(۱۰) ماہنامہ کمال دہلی بابت اکتوبر ۱۹۱۰ء

قومی زبان (۵۷) دسمبر ۱۹۹۳ء

امریکی کہانی

گمشدہ قبر

برناڈ مالموڈ/ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بوڑھا ہیکٹ عام طور پر دیر سے بیدار ہوتا تھا۔

ایک دن جبکہ ابھی رات ہی تھی اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ بارش کی بوندیں کھڑکیوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے سوچا بارش کا پانی اس کی نوجوان بیوی کی قبر میں بھی پہنچ رہا ہوگا۔ یہ سوچ عجیب و غریب تھی اس لیے کہ کئی برسوں تک اس نے اسے یاد ہی نہیں کیا تھا اسے محسوس ہورہا تھا گویا سیلیا کی قبر کھلی پڑی ہو اور پانی کا ریلا چاروں طرف سے آکر اس کے مردہ جسم پر یلغار کر رہا ہو۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ اس وقت کس قدر غیر محفوظ ہوگی؟ یہ سوچ سوچ کر وہ بے چین ہوا جارہا تھا۔

سیلیا سے جب اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ عمر میں اس سے کافی بڑا تھا۔ اس نے خیال ہی خیال میں اس کی قبر کو ڈھک دیا۔ اسے یاد آیا کہ قبر کے اطراف میں زیادہ پھول نہ تھے حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں برابر اپنی ذمہ داریاں نبھائے گا۔ قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا۔ اسی لیے خیال میں بھی اسے قبر کا محل وقوع تلاش کرنے میں دشواری ہوئی۔ اسے اس عمل میں کئی گھنٹے لگ گئے لیکن وہ سیلیا کی قبر تلاش نہ کرسکا۔ آخر اس کی قبر کہاں گئی؟ اس کے حساب سے وہ اسی قبرستان میں دفن تھی۔ وہ سوچ کی دنیا سے باہر آگیا۔

اگلی صبح وہ اٹھا اور تیار ہوکر زمین دوز ٹرین کے ذریعے جمیکا روانہ ہوگیا۔ اس قبرستان میں وہ برسوں سے نہیں آیا تھا۔ اب وہ پینسٹھ سال کا ہوگیا تھا اور ماضی کے واقعات کو اکثر یاد کرنے لگا تھا۔

جب وہ قبرستان پہنچا تو اس کے پاس کوئی تحریری ریکارڈ نہ تھا۔ اسٹیشن آنے سے قبل اس نے اپنے کاغذات کے انبار میں تدفین سے متعلق دستاویزات ڈھونڈنے کی کوشش کی بھی لیکن اُسے کچھ نہیں ملا تھا۔ پھر بھی وہ قبرستان میں کافی دیر تک قبر ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ ناکام ہوگیا تو نوجوان سیکریٹری سے رابطہ قائم کیا جس نے اس کا اور سیلیا کا نام کمپیوٹر میں ڈالا اور پھر اسے مختلف سمتوں میں واقع قبروں کے متعلق بتایا جس سے مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آیا۔ اسے بڑی کوفت محسوس ہوئی۔ اس نے نوجوان سیکریٹری سے کہا۔

"دیکھیے محترمہ اس مشین سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا بلکہ اگر اور تاخیر ہوئی تو میرے ضبط کا پیمانہ چھلک جائے گا۔ میرا خیال ہے کوئی اور عملی تدبیر اختیار کرنے سے سیلیا کی قبر کا پتہ نشان مل سکتا ہے........ سمجھیں آپ؟"

"عملی تدبیر کے علاوہ میں اور کیا کر رہی ہوں؟"

ہیکٹ نے جواب دیا۔ "آپ کی یہ مشین غالباً زنگ آلود ہو گئی ہے یا اس کے اندر کے حصے کام نہیں کر رہے ہیں مجھے یہ احساس ہے کہ میں اپنے ساتھ متعلقہ کاغذات نہیں لایا تاہم مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس نام نہاد کمپیوٹر نے ہمیں کوئی اطلاع دی ہی نہیں!"

نوجوان سیکریٹری تنک کر بولی۔ "اس کمپیوٹر نے یہ اطلاع دی ہے کہ آپ کی بیوی کی قبر کی نشاندہی میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔"

"یعنی زیرو تفریق زیرو برابر زیرو" ہیکٹ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ گمشدہ قبر منگنی کی گمشدہ انگوٹھی کی طرح نہیں ہے کہ واپس نہ ملے۔ یہ قبر ہے اس کا ایک پلاٹ تھا۔ ایک خاص روش میں یہ بنائی گئی تھی اس کا ایک خاص نمبر تھا اور اس قبر میں میری چہیتی بیوی دفن ہوئی تھی۔

نوجوان و حسین سیکریٹری نے اسے گڈمین نامی افسر کے پاس بھیج دیا۔ گڈمین نے اسے کرسی کی پیشکش کی اور خود نارنگی کا جوس گلاس میں انڈیلنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا آپ جوس پینا پسند فرمائیں گے؟ دراصل اس وقت اپنا حلق تر کرتا ہوں۔"

"جی نہیں شکریہ" ہیکٹ نے جواب دیا "دراصل میں یہاں اپنی بیوی کی قبر پر آیا تھا جس کی نشاندہی نہیں ہو رہی ہے آپ کی نوجوان سیکریٹری بھی میری مدد نہیں کر سکی۔ حالاں کہ اس نے کمپوٹر بھی استعمال کیا۔ اب یوں سمجھیے میری بیوی کی گمشدہ قبر آپ کو ڈھونڈ کر دینا ہے۔"

گڈمین بولا.... "لفظ گمشدہ کا استعمال یہاں مناسب نہیں ہے مسٹر ہیکٹ.... یہاں میں اٹھائیس سال سے ہوں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قبر گم ہو گئی ہو۔"

ہیکٹ خاموش رہا۔ پھر گڈمین نے اپنے کمپیوٹر کو استعمال کیا اور اسکرین پر آئے ہوئے ہندسوں اور الفاظ کو ایک جگہ نوٹ کیا اور اسے بتانے لگا کہ ماضی میں ایچ نامی حرف تہجی سے شروع ہونے والے ناموں کا رجسٹر علیحدہ تھا۔ جنہیں بعد میں کمپیوٹر میں ڈالا گیا۔ اتفاق سے وہ سیریز اس وقت سامنے نہیں آرہی ہے شاید اس سیریز میں آپ کی بیوی کے کوائف درج ہوں؟

"یہ بات بھی آپ کی نوجوان سیکریٹری نے مجھے بتادی تھی"۔

"وہ میری سیکریٹری نہیں بلکہ میری سیکریٹری کی نائب ہے"

"بہت بہتر جناب مگر اب کیا کیا جائے؟"

گڈمین نے چند لمحے کچھ سوچا اور پوچھا "اچھا جناب یہ بتائیے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو آپ دونوں کی پوزیشن کیا تھی؟"

"وہ مجھ سے علیحدہ ہو چکی تھی لیکن اس کا اُس کی قبر سے کیا تعلق ہے؟"

گڈمین نے وضاحت کی۔ "میں نے اس لیے پوچھا تاکہ آپ کا حافظہ زیادہ روشن ہو جائے اور آپ صحیح محل وقوع بتا سکیں۔ مثال کے طور پر جس قبرستان میں آپ بیٹھے ہیں وہ ماونٹ جیر بوم کہلاتا ہے۔ اکثر لوگ ماونٹ ہیبرون کے بجائے ادھر چلے آتے ہیں۔"

ہیکٹ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب.... میری مراد ماونٹ جیر بوم کے قبرستان ہی سے ہے۔

اس کے بعد ہیکٹ نے جلدی جلدی تمام تفصیلات گڈمین کو بتانا شروع کردیں۔ جناب عالی جب وہ زندہ تھی تو اس نے مجھے دوبار چھوڑا اور دونوں بار ہم ایک ہوگئے۔ جس وقت اسے موت آئی تو ہم دونوں میں علیٰحدگی ہوچکی تھی۔ وہ بیماری کے سبب مری لیکن اسے سرطان نہ تھا۔ گوکہ ہم دونوں میں علیٰحدگی واقع ہوچکی تھی پھر بھی میں نے اس کی تجہیز و تکفین میں حصّہ لیا۔ انتقال سے قبل وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن تجہیز و تکفین میں نے ہی کی۔ اب میں پینسٹھ سال کا ہوں اور میرے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ میں اپنی بیوی کی قبر پر پرانی یادیں تازہ کروں مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا آفس میری مدد نہیں کرپارہا ہے....."

یہ سن کر گڈمین کھڑا ہوگیا۔ وہ پانچ فٹ کا آدمی تھا اس نے اسے یقین دلایا کہ وہ تحقیق کر کے اس کے مسئلے کو ضرور حل کرے گا۔

"لیکن ذرا جلدی........." ہیکٹ نے بیتابی کے ساتھ اس سے درخواست کی۔

گڈمین نے اسے تسلی دی کہ وہ جلد از جلد اسے مطلع کرے گا اور اس بارے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔ ہیکٹ نے یہ سب کچھ بڑی دھیرج سے سنا اور وہاں سے چلا آیا۔

اس رات پھر بارش ہوئی۔ ہیکٹ نے حیرانی سے دیکھا کہ اس کا گدّا ایک جگہ سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ہڑبڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ پھر قبرستان چلا آیا ویسے راستے بھر وہ اپنے حافظے پر زور دیتا رہا تاکہ اسے قبر کا محل وقوع یاد آجائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اسے صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے آخر ایک نہ ایک دن اسے قبر کا نشان مل ہی جائے۔

اسی اثنا میں ایک ماہ گزر گیا۔ ایک دن اسے گڈمین کی جانب سے ایک خط ملا۔ وہ اس کے پاس خوشی خوشی پہنچا گڈمین نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیا آپ خوش خبری سننے کے لیے تیار ہیں؟"

"جی بالکل"

گڈمین اُسے بتانے لگا۔ ہم نے آپ کی مرحوم بیوی کا پتہ چلالیا ہے۔ وہ اس جگہ ہے جہاں کمپیوٹر اسے نہیں تلاش کرسکا۔ آپ کی بیوی ایک دوسرے صاحب کے ساتھ قبر میں محوِ استراحت ہے۔

"دوسرے صاحب! کون شخص ہے یہ؟" ہیکٹ نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ جانتے ہیں اس کا قانونی شوہر تو میں ہی تھا۔

گڈمین نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ جناب عالی، یہ وہ شخص ہے جو آپ کی بیوی کے ساتھ آپ سے علیٰحدگی کے بعد آکر رہا کرتا تھا۔ جس میں آپ کا ظاہر ہے کوئی قصور نہیں دراصل جب وہ اس دنیا سے سدھاری تو اس شخص نے عدالت سے ایک حکمنامہ حاصل کر کے اسے دوسری قبر میں منتقل کرادیا۔ پھر جب اس کا انتقال ہوا تو ہم نے اس حکمنامہ کے تحت اسے بھی سیلیا کے ساتھ دفن کردیا۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس نے جج کو یقین دلایا تھا کہ وہ سیلیا سے بے تحاشہ پیار کرتا ہے۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ اس نے سیلیا سے شادی نہیں کی تھی۔"

ہیکٹ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ چیختے ہوئے کہنے لگا۔ وہ نابکار کس طرح سیلیا کو دوسری قبر میں منتقل کراسکتا تھا جبکہ اس کا قانونی شوہر تو میں تھا اور میں نے اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی برداشت کیے تھے؟"

گڈمین نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ مسٹر ہیکٹ اصولی طور پر تو آپ ہی کا نام کیلان کی جگہ ہونا چاہیے تھا لیکن میں

سوائے افسوس کے کر بھی کیا سکتا ہوں؛ تاہم آپ کو یہ خوشی تو ہوئی ہوگی کہ قبر کا معمہ حل ہوا۔

"بے شک بے شک" ہیکٹ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ اچھا میں چلوں۔"

جب وہ جانے لگا تو گڈمین نے آخری وار کیا۔ "مسٹر ہیکٹ۔ خدا آپ کو لمبی عمر دے لیکن یاد رکھیے گا کہ آپ کے لیے اس قبرستان میں ایک قبر محفوظ ہے جس میں کوئی دوسرا فرد نہیں گھس سکتا۔"

"بہت بہتر جناب عالی۔" ہیکٹ نے اسے آخری بار دیکھا اور باہر نکل گیا۔"

اور اس دن کے بعد ہیکٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہرگز اپنے آپ کو رنڈوا تصور نہیں کرے گا۔

(گجراتی)

اور میں جیتا ہوں

سُریش دلال / شکیل فاروقی

مر گیا ہوں میں
موت سے پہلے
اور رہتا ہوں
اپنے بھوت کے ساتھ
حسرتوں کی
اُجاڑ بستی میں

سردیوں کی
اُداس شاموں میں
غم کے سائے
نڈھال پھرتے ہیں
خون بن بن کے
اشک گرتے ہیں

رات بھر
کربناک تنہائی
میرے پہلو میں
کلبلاتی ہے
اور پھر ساتھ مردہ خواب لیے
ایک منحوس
صبح آتی ہے!

دن
فقط ایک
مردہ گاڑی

شہر ہے
ایک قبر کی مانند

اور میں
روح ڈھونڈتا اپنی
در بدر
مارا مارا پھرتا ہوں

جنم کے باوجود
ناموجود
موت سے پہلے
مر گیا ہوں میں!

(گجراتی)

اس سمے

سُریش دَلال / شکیل فاروقی

میرے دل میں
کھڑا ہوا ہے کہیں
ایک بوڑھا پہاڑ
صدیوں سے /

میری آنکھوں میں
بہہ رہی ہے کہیں
ایک بوڑھی ندی
خموشی سے /

ذہن میں میرے
اُگ رہا ہے کہیں
ایک لانبا درخت
برسوں سے /

گر ہی جائے گا
ایک دن وہ پہاڑ
خشک ہوجائے گی
ندی اک روز /

اک نہ اِک روز
گردشِ دوراں
پیڑ کو بھی
اُکھاڑ پھینکے گی /

اُس سمے میں
بھلا کہاں ہوں گا /

قومی زبان (٦٣) دسمبر ۱۹۹۳ء

مزدور

مصنف ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ترجمہ اشہاب قدوائی

یہ ہندی کہانی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے طالب علمی کے دور ۱۹۳۳ء میں لکھی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ کہانی ان کے ہندی مجموعہ "آگ اور آنسو" میں شامل ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کو اردو میں منتقل کیا جارہا ہے۔

کلکتہ کے ایک روزنامہ کے کسی گزشتہ شمارہ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ "ہوڑہ" کی ایک گلی میں کل ایک دردناک واقعہ ہوگیا۔ ایک مزدور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اپنی کوٹھری میں مردہ پایا گیا۔ خودکشی کا شک ہوتا ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔

اس تین سطری خبر کے اوپر کسی رئیس کے بیٹے کی سالگرہ کا حال آدھے کالم میں تھا۔ اس لیے کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کو نہ دیکھا۔ پھر بھی اس سانحے کا سارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایک بارہ فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی تنگ کوٹھری، جس کے دروازہ پر سورج کی کرنیں صبح کے وقت لمحہ بھر منڈلا کر اوجھل ہوجاتی تھیں! جس کی چوکھٹ پر ہوا کے جھونکے بے سُدھ ہو کر پلٹ پڑتے تھے۔

اُس گلی سے ہو کر ہی محلہ کی نالی نکلتی تھی۔ کیچڑ اور بدبو اور کیڑے! کمرہ کی دیوار سیل سے منڈھی ہوئی، جس میں چوہوں کے بل اور چھت پر چمگادڑوں کے اڈے!

برسات میں گلی میں اکثر پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی نالی سے نکل کر دو چار سانپ دیوار پر رینگتے تھے اور چھت کی کمانیوں سے لٹک کر کوٹھریوں کے رہنے والوں کو حیرت بھری آنکھوں سے تاکا کرتے تھے۔ تب بھولا منہ اندھیرے کام پر جانے سے پہلے بلوں میں کپڑے جما کر ٹھونستا اور سوتے ہوئے بچوں پر سانپ سے بچنے کا منتر پھونک کر نکل کھڑا ہوتا۔ پانچ بچے.... ایک، دو، تین، چار، پانچ! اس کی بیوی مُنیا نے پانچ سال میں پانچ بچے جَن دیے تھے اب ننگے! بھوکے! پیلے اور روگی!

فرش پر ایک پھٹی چٹائی بچھی تھی! پڑوسی جمن کے مرنے سے بھولا کو صرف اتنا فائدہ ہوا تھا۔ چٹائی پر بوریے اور بوریے پر

پھٹی ہوئی دولائی اور ان پر بھولا، منیا اور ان کے بچے۔

دوسرے کونے میں چولہا اور مٹی کے برتن۔ الگنی پر کئی پھٹے پرانے کپڑے لٹکے ہوئے۔ لکڑی کے صندوق میں گلٹ کے گہنے، بچیوں کے تعویذ اور بھولا کی رامائن! سامنے دیوار پر ہنومان جی کی ڈرا دینے والی تصویر جس کو بچے صبح اٹھ کر سہمے سہمے پرنام کرتے تھے۔ یہ تھا اس کمرے کا سارا نقشہ۔

منہ اندھیرے "سوراج مل" کی سیٹی کی ہولناک آواز پورے ماحول کو کپکپا دیتی تھی۔ بھولا چونک کر اٹھ بیٹھتا اور کپڑے پہن کر بھاگا بھاگا مل کی طرف چل پڑتا تھا۔

کپڑے؟ ہاں؟ ہاں بھولا کے پاس کپڑے بھی تھے! اس کے بچے ننگے تھے مگر اس کے پاس کپڑے تھے؟ مل کے اسٹور سے وہ اپنے لیے دھوتی اور منیا کے لیے ساریاں خرید لایا تھا۔ سیٹھ جی نے اس کو ایک پیسہ فی گز چھوٹ دی تھی بھولا انھیں دعائیں دیتے ہوئے کپڑے اٹھا لایا تھا۔ بچوں کے لیے بھی اس نے پانچ جوڑے کپڑے ایک سال پہلے بنائے تھے اور وہ اب پھٹ گئے تھے۔ سیٹھ جی نے اس کو کپڑے ادھار دے دیے تھے صرف دو پیسے فی گز سود پڑا ہاں، تو بھولا کپڑے پہنے ٹھیک چھ بجے مل کے پھاٹک پر پہنچ جاتا تھا۔ صبح چھ بجے سے شام چھ بجے تک بھولا مشینوں سے جٹا رہتا تھا۔ بیچ میں دو گھنٹے کی چھٹی ملتی تھی۔ جس میں رام بھروسہ سے ستو خرید کر وہ کھا لیتا اور اس کی دوکان کے اندر ہی تھوڑی دیر لیٹ رہتا تھا۔

پھر وہی مشینوں کی گڑگڑاہٹ! ان کے کل پرزوں کا خوفناک جانوروں کی طرح اینٹھنا، تلملانا، بل کھانا اور اپنے سوئے ہوئے حصوں کو مزدوروں کی طرف پھیلانا۔

مزدوروں کا خون پسینہ بن کر نکلتا اور مشینوں پر ٹپکتا تھا اور مشینیں اپنے مزاج کی طرح کبھی گرتی تھیں کبھی اچھلتی تھیں! کبھی انسانی مشینوں کو اپنا زر خرید غلام سمجھ کر قہقہے لگانے لگتی تھیں۔

شام کو مل کے سب مزدور تھکاوٹ سے چور نکلتے تھے۔ پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے چپ سر سے پاؤں تک دھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے اور کپڑے تیل و تارکول میں لت پت۔ ان میں سے کچھ ڈھیٹ. ٹھرہ کے ادھے منہ سے لگائے گندی گالیاں بکا کرتے تھے اور سب ہنسنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ہنسی انسانی ڈھانچوں کے خوفناک قہقہوں کی طرح تھی۔ بھولا کی گلی کے نکڑ پر سڑک دھونے کے لیے فٹ پاتھ پر میلے پانی کا ایک نل لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے بیٹھ کر روز شام کو وہ نہایا کرتا تھا۔ اس کے بچے اپنے میلے اور سوکھے ہوئے ہاتھ اس کے بدن پر رکھ کر اپنی مرجھائی ہوئی آواز میں دد اکھا کرتے تھے۔ تب بھولا کو احساس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے گرم آنسو کی بوندیں نکل کے میلے پانی میں مل رہی ہیں۔

نہا کر وہ اپنی کوٹھری میں نہ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت منیا کھانا پکا رہی ہوگی۔ دھوئیں کے بھبکے نکاس کی راہ نہ پا کر کوٹھری میں پر تولتے تھے۔ آنکھوں میں، کان میں، ناک میں سانس کے ساتھ دھواں گھس جاتا تھا۔ منیا آنکھیں پوچھتے ہوئے کھانستے ہوئے روٹیاں پکایا کرتی تھی۔ ہر ہفتے کو بھولا کو دس آنے روز کے حساب سے تین روپے بارہ آنے مل جاتے تھے۔ بھولا روپیوں کو ٹھوک بجا کر دیکھتا اور گانٹھ میں باندھ لیتا تھا۔

خاندان کے لیے وہ تیوہار کا دن ہوتا تھا۔ بھولا بچوں کے لیے گڑ کی جلیبیاں اور منیا کے لیے سڑے ہوئے آموں میں سے چھانٹ کر کچھ ادھ سڑے آم خریدتا۔ ہنومان جی کی تصویر کو دھونی دینے کے لیے اگربتی خریدنا بھی وہ نہ بھولتا تھا۔

اس دن بھولا کی اداسی دور ہو جاتی تھی۔ کنتو ساو کے وہاں بیٹھ کر وہ تاڑی بھی پی لیتا تھا۔ بھولا کبھی کبھی خوش بھی ہو

سکتا۔

اس سانحہ سے ایک دن قبل کی بات ہے۔ گھور جاڑے کے دن تھے اور دنیا کُہاسے اور اندھیارے کی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ مل کی سیٹی بجتے ہی بھولا اُٹھا اور چپکے سے دیا جلا کر مُنیا کے پاس گیا، جو دولائی اوڑھے زمین پر پڑی سو رہی تھی۔ منہ پر روشنی پڑتے ہی مُنیا نے بڑی تکلیف کے ساتھ سانس بھری اور بیچارگی سے بھولا کی طرف دیکھا۔

چھ مہینے سے وہ بسترِ علالت پر پڑی تھی اور اب بسترِ علالت، بسترِ مرگ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بھولا نے دھیرے سے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر اوہ کہہ اٹھا۔ ماتھا جلتے توے کی طرح تپ رہا تھا۔ بھولا نے خیراتی اسپتال کی دوا مُنیا کے منہ میں انڈیلی۔ اپنے بڑے لڑکے کو جگایا اور سیدھا مل کی طرف بھاگا۔ زمین اس کے پیروں کے نیچے سے کھسک رہی تھی چھ مہینے؟ ہاں مُنیاں چھ مہینے سے بیمار تھی! ایک دن کھانا پکاتے پکاتے کھانسی کے ساتھ اس کے منہ سے خون آگیا تھا۔ تب سے اس کو بخار رہنے لگا تھا۔ خون برابر آتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ تین ماہ سے دو قدم چلنا بھی دوبھر تھا۔

بھولا اس کو رکشا میں لاد کر ڈاکٹر سین کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مریض کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد بھولا سے کہا اُس کو تپِ دق ہو گئی ہے۔ مرض ابھی لاعلاج نہ تھا۔ کسی پہاڑی جگہ..... صفائی..... روشنی.... دودھ اور پھل..... ڈاکٹر نے یہی تو کہا تھا۔

بھولا اس کے ہاتھ میں پانچ روپے پکڑا کر اپنی بیوی کو چپ چاپ اسی کوٹھری میں واپس لے آیا تھا۔ تب سے وہ ہر رات کو سوتے میں بڑبڑایا کرتا تھا۔ دودھ اور پھل.... روشنی اور ہوا.... ڈاکٹر کی..... مُنیا کو تھوک میں خون.... بچے اس کو چاٹتے .....

سچ مچ اس کے خواب بڑے ڈراؤنے اور گھناؤنے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ دیکھتا تھا کہ مُنیا کا کلیجہ اس کے منہ سے نکل پڑا۔ اس میں لمبی لمبی کلیاں ہیں جو سرسراتی ہوئی بچوں کے کانوں میں گھس رہی ہیں۔

تب بھولا چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ کڑکتی ہوئی سردیوں میں بھی وہ پسینہ سے شرابور ہو جاتا۔ دل کی تیز دھڑکن کی آواز وہ صاف سُن سکتا تھا۔

مُنیا کے بستر کے پاس ایک مٹی کا پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں وہ تھوکتی تھی۔ بچے صبح شام پیالے بدل دیا کرتے تھے۔ مکھیاں تھوک ملے خون پر بیٹھتی تھیں پھر اپنے جسم میں اُسے لپیٹ کر بچوں کے منہ پر بھن بھناتی تھیں۔

چولھے کے پاس بیٹھ کر چھوٹی منی کی مدد سے روٹیاں پکاتا تھا اور تینوں بچے باہر گٹر میں کھیلتے تھے۔ گٹر میں کوڑے کرکٹ کے ساتھ کبھی کبھی پھلوں کے چھلکے اور مٹھائی کی جھوٹن نکل آتی تھی۔ بچے گٹر میں اتر کر اچھی طرح اس کی تلاشی لیتے اور جب کبھی کھانے کی کوئی چیز ملتی تھی کل کاری مار کر میلے پانی کے نل کے نیچے پہنچ کر اس کو دھوتے اور پھر بانٹ کر اس کو کھا جاتے۔ سڑک کے موڑ پر کسی صراف کی اونچی حویلی تھی جس کے پیچھے کی کوٹھری میں ایک کُتا بندھا رہتا تھا۔ اس کی جھبری دار دُم اور ملائم بالوں میں نوکر روزانہ بُرش کیا کرتا تھا۔ دونوں وقت اس کے لیے دودھ اور شوربا آتا تھا۔ بچے اس شاندار کُتے کو دیکھتے کبھی بچے ہوئے دودھ کو للچائی آنکھوں سے تاکتے اور سوچا کرتے کہ کاش ہم کُتے ہوتے۔

ننھا سرجو ایک بار ہمت کر کے اونگھتے ہوئے کُتے کے سامنے سے دودھ کا پیالہ کھسکا لایا تھا۔ تینوں بچوں نے دودھ کو چکھ کر دیکھا تھا۔ اس پر کیسی موٹی ملائی پڑی ہوئی تھی۔ تب سے بچے سوچا کرتے تھے کہ صراف کے کُتے ہوتے تو کتنا مزا آتا۔

مُنیا کو دوا پلا کر اس کا شوہر کام پر چلا گیا۔ چھجو نے اُٹھ کر چولہا جلایا اور دودھ گرم کر کے اپنی ماں کے پاس لے آیا۔ کوڑھی خانہ کا نوکر یہ دودھ دو آنے سیر بیچا کرتا تھا۔ مُنیا وہی دودھ پیتی تھی۔ پھر چھجو آٹا اور لکڑی لینے کے لیے بازار چلا گیا۔ بچوں کے شور کی آواز باہر گلی سے آرہی تھی۔ مُنیا نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھوں میں گزرے وقت کی یادیں خواب کی صورت میں تیرنے لگیں کبھی وہ بھی جوان تھی۔ ہر ہر عضو سے شباب پھوٹتا تھا، اور بھولا؟ کیا سجیلا جوان تھا۔ کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر جب وہ بانسری بجاتا تھا تب مُنیا کی گگری خود بخود کیسے چھلکنے لگتی تھی۔

پھر ایک دن بھولا نے سنسان ارہر کے کھیت میں اس کی بانہہ کیسے تھام لی تھی۔ چاروں طرف ہریالی، اوپر آسمان اور دن کا اُجالا اور کھیتوں کے درمیان کسان کا اظہارِ عشق۔ مُنیا کو وہ دن خوب یاد تھا۔

مگر شادی ہوتے ہی ان کی گرہستی پر جیسے سنیچر سوار ہو گیا۔ لگاتار تین سال پانی نہیں برسا۔ بھولا نے لاکھ جتن کیے مگر زمیندار نے اس کو تقاوی نہ ملنے دی۔ بات یہ تھی کہ زمیندار مُنیا پر ریجھ گیا تھا۔ دو ایک بار راہ چلتے چھیڑ خانی بھی کی تھی۔ پتا چلتے ہی بھولا گنڈاسہ لے کر زمیندار پر دوڑ پڑا تھا۔ تقاوی کا بدل تھا عورت کی عزت۔

بھولا اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ بنیے سے ایک آنہ روپیہ سود پر رقم لے کر وہ لگان دے آیا تھا مُنیا کی منہ پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس کو وہ دن یاد آیا جب بنیا پولیس کی مدد سے انھیں زمین سے بے دخل کر رہا تھا اور اُدھر زمیندار ان کا سامان جھونپڑی سے نکلوا رہا تھا۔

بھولا کی پوری شخصیت پتھر کی طرح سخت ہو گئی۔ مُنیا اپنے دونوں بچوں کو گود میں لیے اپنے سامان کو دیکھتی اور روتی تھی۔

اس کے بعد اس کی جوانی اس اندھیری، بدبودار کوٹھری میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گئی۔ گرمی میں ابلنا، جاڑے میں ٹھٹھرنا، برسات میں بھیگنا! سانپ، بچھو اور مچھر اور کھٹمل۔

مُنیا کا دل اندر سے چیخ اٹھا۔ پہلے اس کا شوہر دنیا کے لیے اناج پیدا کرتا تھا۔ وہ کسان تھا۔ اب وہ کپڑے کے مل میں کام کرتا ہے۔ وہ مزدور تھا۔ پھر بھی وہ سب ایک ایک مٹھی اناج کو کیوں ترستے تھے۔ ایک ایک گرہ کپڑے کو کیوں محتاج تھے؟ مُنیا اس راز کو نہ سمجھ سکی۔ پھر بھی اس دنیا کے خلاف اس کے دل میں گہری نفرت پیدا ہو گئی۔

سامنے ہنومان جی سکون کے ساتھ اپنی دُم ہلا رہے تھے۔ مُنیا کا جی چاہنے لگا کہ وہ اس تصویر کو توڑ کر چولہے میں جھونک دے۔ کتنی اگر کی بتیاں سونگھی تھیں ہنومان جی نے پھر بھی بھوک، بیماری اور دکھ تھے کہ بڑھتے ہی جاتے تھے۔

باہر گٹر کے پاس بچے خوشی سے چلّا رہے تھے۔ "وہ دیکھ کیلا ثابوت ہے۔ نیچے سے سڑا ہے اور وہ امرود....."

اس دن شام کو جب بھولا مل سے لوٹا تو پیر ایک ایک من بھاری ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے آگے ہر چیز اڑی اڑی سی جان پڑتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی آگ کے جھرنے میں تیر رہا ہے۔

ایک مہینے پہلے سوراج مل کی انتظامیہ نے ۲۵ فیصد مزدوری کم کرنے کا نوٹس دیا تھا۔ آج نوٹس کی میعاد پوری ہونے پر مزدوروں نے ہڑتال کی دھمکی دی۔ جس کے جواب میں غیر معینہ مدت کے لیے مل بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

بھولا ۳ روپے بارہ آنے مٹھی میں دبائے جیسے موت کی طرف جا رہا تھا۔ تین روپے بارہ آنے وہاں جانے کا کرایہ تھا!

بھولا مُنیا کی بیماری، بچوں کی بھوک اور اپنی بیکاری سب کچھ بھول گیا۔ ابھی اس کے سامنے رحمان کابلی کی صورت قضا

کی طرح گھوم رہی تھی۔

مُنیا کے علاج کے لیے بھولا نے تین مہینے پہلے پچاس روپے اُدھار لیے تھے ایک آنے روپیا سود کے حساب سے اور ایک روپیہ ہر ہفتہ دینے پر بھی اصل جوں کا توں بنا ہوا تھا۔ تین مہینے کا وعدہ کئی دن پہلے ختم ہو چکا تھا۔ لاکھ ٹال مٹول کرنے پر بھی کابُلی کی برہمی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بھولا چور کی طرح آگے پیچھے دیکھتا چلتا تھا۔ دل ہی دل میں درگا کو یاد کر رہا تھا کہ آج تو زہ نہ ملے۔ آج کی رات جوں کی توں گزر جائے۔

مگر واہ ری قسمت گلی کے موڑ پر ہی کابلی موت کے فرشتے کی طرح کھڑا تھا۔ خون، گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جو مشین سے بھی زیادہ بے رحم تھا۔

بھولا خوف سے کانپ اُٹھا۔ پٹے ہوئے کتّے کی طرح وہ کابلی کے آگے ٹھٹھک گیا۔ کابلی کے منہ پر جنگلی گھاس کی طرح داڑھی کے بال اُگے ہوئے تھے۔ دانت بھیڑیے کی طرح پیلے اور تیز تھے۔ اس نے لاٹھی پر زور دے کر کہا۔ "روپی نکالو بھائی روپی۔ ام زیادہ بات نہیں مانگتا۔ اڑتالیس روپی چار آنہ۔"

بھولا نے سٹپٹا کر کہا "آغا صاحب اب تک تو کوئی انتظام نہیں ہو سکا گھر والی کی بیماری کی وجہ سے کسی بھائی بند کے گھر نہ جا سکا۔ ایک ہفتہ کا اور وقت دے دیجیے آج کے ہی دن تک کوئی انتظام ضرور ہو جائے گا۔ کابلی نے اپنے بڑے بڑے پنجے پھیلا کر کہا، "روپی روپی! ام گھر والی کوئی نہیں جانتا۔ جب وہ اچھا تھا تب سالا روپی نئی مانگا۔ پھر توام معاف کر دیتا۔

بھولا کے ٹھنڈے خون میں کچھ گرمی آگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ واقعہ گھوم گیا جب وہ گنڈاسہ لے کر زمیندار پر ٹوٹ پڑا تھا۔ پل بھر بعد وہ اپنے حالات کو سمجھ گیا۔ بڑی منت سماجت کر کے اس نے دو دن کے لیے خاں کو ٹھنڈا کیا۔ خان گالیاں بکتا ہوا ایک وبا کی طرح لاٹھی سے زمین ناپتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

بھولا کچھ دیر تک تو حیرت کی تصویر بنا وہیں کھڑا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر محلہ کے پارک کی طرف چل پڑا ایک سنسان کونے میں وہ گھاس پر گر پڑا۔

اس کے چاروں طرف کیسی چہل پہل تھی۔ کیسی اٹھکھیلیاں، کیسی رنگ رلیاں تھیں، دولت مندوں کے بچے اپنی آیاؤں کے ساتھ کیسے ہنس کھیل رہے تھے۔ آسمان میں تارے نکلے ہوئے تھے، زمین پر پیڑ اور پرندے بھی مگن تھے۔ سب ہی خوش تھے ایک کے سوا اور وہ ابھاگا مزدور تھا۔ اپنی پوری زندگی اس کو آنسوؤں میں تیرتی دکھائی دی۔ اس کی زندگی کی بساط صرف ایک آہ اور ایک آنسو۔

یہ بچے کتنے صحت مند اور خوش تھے۔ ان کا جسم مخمل کی طرح ملائم تھا۔ مگر بھولا کے بچوں نے کیا گناہ کیا تھا؟ اگر بھوکے ہی مرنا تھا تو وہ پیدا کیوں ہوئے؟

بھولا خود کو دھتکارنے لگا۔ اس نے ان بچوں کو کیوں پیدا کیا؟ دنیا کا کون سا سکھ چین ان کے لیے تھا؟ پیدا ہونے کے بعد ہی کتوں کے ساتھ گٹر میں کھیلا کیے بڑے ہونے کے بعد وہ کیا کریں گے؟ بھیک یا جیب کتری اس کے سوا وہ کیا کریں گے؟ بیمار ہونے کے بعد وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بھولا دنیا، سماج اور بھگوان سب کو پڑا پڑا کوسنے لگا۔ ایک بے بس، کمزور بوڑھے کی طرح وہ سب کو کوسنے لگا۔

کل صبح ہو گی مُنیا پھر خون تھوکے گی۔ بچے بھوک بھوک چلائیں گے۔ کابُلی روپی روپی کا شور مچائے گا۔ مل بند ہو گی۔ اس پر موت کا سناٹا ہو گا۔

موت۔ مل کی؟ نہیں بیکار مزدور کی۔ بھولا کی۔ اس کی بیمار بیوی کی اس کے بچوں کی۔

موت! بیماری! بھوک! بیکاری!

بھولا کو چاروں طرف بیماری کے کیڑے اور ملک الموت اڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے آس پاس اتھاہ گہرے گڑھے تھے جن میں دنیا کا سارا دھن دولت سما رہا تھا!

موت! بیماری! بھوک! بیکاری! ان سے کہیں چھٹکارا نہ تھا۔

رات کو جب بھولا گھر لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ایک بڑا سا دونا تھا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں الٹی پڑتی تھیں اور منہ سے شراب کی بدبو نکل کر دھوئیں، کُہاسے اور نالی کی سڑاندھ کو اور بھی تکلیف دہ بنا رہی تھی۔

زندگی میں اس نے پہلی بار شراب پی تھی۔ پوری ایک بوتل۔ بہت دنوں کے بعد وہ اتنی ساری مٹھائی لایا تھا۔ ایک سیر اور وہ بھی روپے سیر والی۔

اس کے شلوکے کی جیب میں ایک شیشی تھی جسے وہ بڑی احتیاط سے چھپائے ہوئے تھا۔ بھوکے بچے روتے روتے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ مٹھائی کا دونا دیکھتے ہی وہ بڑی بے صبری سے اس پر ٹوٹ پڑے۔ بھولا نے انھیں چمکار پچکار کر روکا اور مُنیا کے سر پر جھک گیا وہ اسے بیچارگی سے تاک رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک دونوں چپکے چپکے نہ جانے کیا کہتے رہے۔ بچوں نے صرف اتنا دیکھا کہ بھولا کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں نکل کر ان کی ماں کی آنسو بھری پلکوں پر گر پڑیں۔

آنسو بغاوت کی زبان ہے! خون بغاوت کی روشنائی ہے! تھوک بغاوت کا قلم ہے! آنسو، خون اور تھوک اس اندھیری کوٹھری میں سماج کے ظلم کے خلاف سازش کر رہے تھے۔

دوسرے دن دوپہر کو اس کوٹھری میں ایسی بدبو اٹھنے لگی کہ پڑوسیوں کے دماغ تلملا اُٹھے۔ نالی میں روز مرے ہوئے چوہے سڑا کرتے تھے۔ اس کی بدبو سہنے کی انھیں عادت ہو گئی تھی۔ مگر بھولا کی کوٹھری سے جو بدبو آ رہی تھی اس میں کوئی خاص بات تھی۔ ساری گلی کی ہوا جیسے زہریلی ہو گئی ہو۔

بدبو بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اگر اُسے روکا نہ گیا تو وہ دنیا بھر میں پھیل جائے گی اور سارا انسانی معاشرہ اس میں سانس لے کر گھٹ کر مر جائے گا۔

کوٹھری کا دروازہ توڑا گیا۔ اندر پانچوں بچے ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے۔ مُنیا اور بھولا کے ہونٹ بھڑے ہوئے تھے اور ان پر موت کی مسکان کھیل رہی تھی۔ ہر چیز کالی، دھندلی اور اداس جان پڑتی تھی۔ ہنومان جی کے ہمیشہ سے مسرور چہرے پر بھی سرخی نظر آ رہی تھی۔

پولیس کو فوراً اطلاع کی گئی پولیس والوں نے ناکے بندی کر کے کمرے کو ایک لمحے دیکھا۔ مٹھائی کے دونے اور شیشی کو دیکھ کر سر ہلایا۔ پڑوسیوں سے دو چار باتیں پوچھیں اور واپس چلے گئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد دو مہتر مردہ ڈھونے والی گاڑی لیے ہوئے آئے اور ساتوں لاشوں کو اس پر لاد لیا۔

موڑ پر صراف اپنے مکان کی دیوار کے پاس کھڑا چیونٹیوں کو چینی کھلا رہا تھا۔ ایک موٹا سانڈ وہیں پڑا ہوا کبھی پوریوں کو کھاتا، کبھی اگلتا تھا۔ کتا دودھ پی پی کر اکتا گیا تھا اور اپنے جبڑوں کو چاٹ رہا تھا۔ صراف مردہ گاڑی کو دیکھ کر چبوترے پر چڑھ گیا۔

جمعدار، کس کی لاش ہے؟

اسی گلی میں کوئی بھولا مزدور رہتا ہے، سیٹھ جی! ماں، باپ، پلے سب زہر کھا کر مر گئے۔ سیٹھ نے توند سہلاتے ہوئے کہا، ہوں! اکتے کو بہت تنگ کرتے تھے یہ پلے۔ ارے چھوٹو چبوترے پر گنگا جل چھڑک دے ایسے لوگوں سے تو ہمارے جانور اچھے ہیں۔

اونچے اونچے مکانوں اور بند راستوں سے الجھتی ہوئی ہوا گنگناتی جاتی تھی۔ کچھ نہیں ہے! کچھ نہیں ہے!

قومی زبان (۱۷) دسمبر ۱۹۹۳ء

آرمینی شاعر پاروئیر سیواک سے گفتگو

تحریر: کیرن کلنتار (KAREN KALANTAR)

ترجمہ: سہیل احمد صدیقی

تعارف: پاروئیر سیواک (پیدائش ۱۹۲۴ء) ایک ممتاز آرمینی شاعر اور کئی مجموعہ ہائے کلام کے مصنف ہیں۔ انھوں نے خصوصاً اپنی عظیم غنائیہ ایپک (EPIC) "سدا خاموش گھنٹا گھر" اور مجموعۂ منظومات "ہتھیلی میں انسان" سے بھرپور شہرت حاصل کی۔ سیواک اٹھارہویں صدی کے عظیم آرمینی شاعر سیات نووا (SAYAT NAVA) پر تحقیقی مقالہ کے مصنف بھی ہیں۔ زیر نظر انٹرویو میں سیواک نے شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

س: آپ کا مقالہ "سیات نووا" کی زندگی اور فن کے، برسوں پر محیط، مطالعہ کا ثمر ہے۔ یہ فرمائیے کہ اس شخصیت میں آپ کو کیا کشش نظر آئی؟ کیوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے آپ کبھی بھی عوامی سطح کے "بھاٹوں" کی شاعری کے خاص مداح نہیں رہے؟

ج: سیات نووا ایک انوکھی شخصیت ہے۔ اس کے ہم پایہ کسی ایسے شاعر کا نام لینا بھی دقت طلب ہے، جس نے تین اقوام کی زبانوں میں لکھا اور جسے ہر قوم اپنا عظیم شاعر مانتی ہو۔ وہ شاعر کے ساتھ ایک موسیقار، نغمہ نگار (COMPOSER) اور گلوکار تھا۔ ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں (بھاٹوں کے حوالہ سے): یہ بات حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ میں سیات نووا کے بارے میں اس قدر ضخیم کام کا مصنف ہوں! یقیناً میں ابتدائے نگارش سے، اُس شاعری کا مخالف رہا ہوں جو "بھاٹوں" نے نظم کی: اگر کوئی اس سے اُن اصنافِ سخن کی مراد لیتا ہے جو صدیوں پہلے مقرر بندشوں میں رائج تھیں۔ مگر بات تو یہ ہے کہ سولھویں، اٹھارہویں اور حتیٰ کہ انیسویں صدی کی شاعری تک "بھاٹ" طرز ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ میرے خیال میں، صرف ہمارے دور میں وہ ناقابلِ برداشت اور دقیانوسی بن گئی۔ میں ہمیشہ سیات نووا کی غیر معیاری تخلیقات سے کراہت محسوس کرتا رہا ہوں۔ باوجودیکہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا مخترع تھا۔

س: کیا میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کروں کہ آپ کو "سیات نووا" کی اختراعات نے اپنی جانب متوجہ کیا؟

ج: آپ خود فیصلہ کیجیے۔ ہم ایسے چار سو سے زائد آرمینی "بھاٹوں" کے نام جانتے ہیں جنھوں نے غیر تحریری ضابطے کے تحت

ترکی زبان میں بے تحاشا لکھا۔ سیات نووا نے اپنی رسائی اور اپنے معاصرین کی شہادت پر اس قدیم روایت کو منقطع کر دیا۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ بہت سے "بھاٹ پیدائشی نابینا تھے اور اسی بناء پر انھیں حسنِ فطرت اور نسائی جمال کا ذرّہ برابر اندازہ نہ تھا، پھر بھی ان کی تخلیقات کا ایک ڈھیر فطرت اور نسائی حُسن کی مدح میں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے شاعری نہیں کرتے تھے۔ سیات نووا اپنے اسلاف سے قطعاً مختلف تھا صرف یہی نہیں، وہ بینا بھی تھا۔ وہ ایک "شخصیت" تھا، اُس نے بڑے جوش و جذبے اور انفرادیت کے ساتھ غنائیہ کلام تخلیق کیا۔ سچا شاعر تھا۔ یہ کوئی حیران کُن بات نہیں۔ سچا فنکار اختراع پسند ہی ہوتا ہے فن کی تاریخ سوائے جدّت و اختراع کی تاریخ کے کچھ نہیں۔ بعض عصری انشا پرداز حضرات کے برعکس، ایک مخترع کو ہر ایک سے چلا کر "نہیں" کہنے کی ضرورت نہیں، مخترع کہتا ہے: "ہاں ..... لیکن ....."۔ وہ اپنے عصر کی بات روحِ عصر کے مطابق کہتا ہے۔

س: بیانیہ شاعری (NARRATIVE POETRY) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ شاعری کی کون سی اصناف کو سب سے زیادہ پائیدار سمجھتے ہیں؟

ج: اگر بیانیہ شاعری سے کوئی وہ کام مراد لیتا ہے جو کسی مخصوص واقعہ یا سلسلۂ واقعات پر استوار ہے تو میرے خیال میں اس مقصد کے لیے ایپک کی صنف ہمیشہ موجود رہی ہے اور وہ اس قسم کی شاعری کے لیے خاص جائے پناہ ہے عصرِ حاضر کی ایپک نظم کہیں کہیں نثر سے جاملتی ہے؛ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نثر اور نظم کے مابین ربط کا ذریعہ (INTERMEDIARY LINK) ہے۔
مگر میں اس بات کا شدت سے قائل ہوں کہ خالص شاعری (GENUINE) ادب کا ایک مخصوص فارم نہیں بلکہ اس کی اپنی ایک جنس (GENDER) ہے، اگر عورت ایسا کرنا چاہے تو ممکن ہے پاجامے کی نمائش پر منتج ہو۔ مگر جس بات کا اظہار نثر میں لازماً کرنا ہو، شاعری میں نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے کہ شعر میں ایسی کہانی کے لکھنے کی کوشش جس کی کسی نثر پارہ کی بنیاد بننے میں کوئی خرابی نہ ہو، دقیانوسیت اور وقت کا خواہ مخواہ ضیاع ہے۔ شاید آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا میں اس امر کا اپنی تحریر میں لحاظ کرتا ہوں تو جواب اثبات میں ہے۔ میری نظم "سدا خاموش گھنٹا گھر" میں تقریباً سات ہزار مصرعے ہیں لیکن کسی کے لیے سات منٹ میں اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ بہ طور ادبی فارم یہ سوال صرف نظم کی خصوصیات کے حوالے سے ہے کوئی نظم جو میرے خیال میں ایپک، غنائیہ، ڈراما اور المیہ کے عناصر کی حامل ہو اور جو ظاہری اعتبار سے موجودہ ادبی تحقیق کی درجہ بندی کے مطابق ہو، اُسے غنائیہ ایپک میں شمار کرنا چاہیے جو لگی بندھی بیانیہ شاعری سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔

تمام تاریخ ادب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مخصوص اہم واقعات پر مبنی منظومات کی تقویم پرانی اور دوسری اصنافِ نظم کی بہ نسبت بہت قدیم ہے۔ بارہویں صدی میں، سیات نووا کے دور سے بھی ۶۰۰ برس قبل، ایک آرمینی شاعر ہو گزرا ہے جس کو کئی اعتبار سے اُس کا پیش رو سمجھا جاسکتا ہے۔ میرا اشارہ نرسس "شنورالی" NERSES SHNORALI (شنورالی "فرحت بخش") کی طرف ہے۔ صدیوں تک اس کا کمالِ فن اس کی نظم "ایڈیسا کا نوحہ" (LAMENT OF EDESSA) کو سمجھا جاتا رہا، یہ پُر شکوہ بندش کی حامل نظم ہے جو قدیم شہر ایڈیسا (۱) کی تباہی کے واقعہ سے متعلق ہے۔ علاوہ ازیں نرسس شنورالی کی متعدد مختصر منظومات ہم تک پہنچی ہیں.... "سامس" (PSALMS) کے متون جنھیں نہ اس کے عہد میں نہ بعد کے عہد میں شاعری کے جواہر شمار کیا گیا۔ مگر آج ہم اس سخنور کو بہت سراہتے ہیں اور یہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ یہ مشہور شہ پارہ فقط وہ لوگ پڑھتے ہیں

جنھیں علم اللسان کے شعبہ میں آرمینی ادبیات کا امتحان دینا ہو۔ دورِ جدید کے قارئین کو شہر ایڈیسا کے انجام یا اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ کب اور کیسے تباہ ہوا بہت سے مضامین جو وقت کی گردش میں ہم سے پیچھے رہ جاتے ہیں وہ ہمارے لیے غیر دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ مگر آج ہمارے لیے شنورالی کا ہر ایک مذہبی نغمہ (مناجات) ایک مختصر سا شہ پارہ ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ مستقبل میں بھی ان کی تازگی برقرار رہے گی۔ یہ دراصل خدا کی جناب میں، ..... مگر یہ بات آج ہم نہیں مانتے۔ تابندہ قصائد (ODES) ہیں۔ مگر یہاں جو بات اہم ہے وہ یہ نہیں کہ اس کا مخاطب کون ہے بلکہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ایک زندہ روح کی تمنا ہے۔

مختصر یہ کہ بہ حیثیت قاری میں ان منظومات کو کسی مخصوص موضوع سے متعلق کرنے کے حق میں نہیں ---- یاد کیجیے پیگاسُوس صدیوں تک شاعری کی علامت (SYMBOL) رہا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے وہ کوئی (PEGASUS) معمولی گھوڑا نہیں بلکہ پروں والا گھوڑا تھا.....

آپ پوچھ سکتے ہیں "مثال کے طور پر ہومر کی الیاڈ (ILIAD) کے بارے میں کیا خیال ہے" ہاں .... اوّل تو ہر کلیہ میں استثنا ہوتا ہے اور دوم .... میں ایک اور مثال دوں گا کسی شعری جینئس (POETIC GENIUS) کے فن کی مثال لیں جیسے فردوسی کا شاہنامہ جو انسانی محبت کا دیوقامت ثمرہ ہے۔ اس کے ساتھ فردوسی کے معاصر عمر خیام کے سیدھے سادے شعروں کو ملا کر دیکھیے اور مجھے بتائیے کہ ہمارے لیے کون زیادہ "لائقِ مطالعہ" ہے، عمر خیام جو فردوسی سے ایک ہزار برس بعد منصۂ شہود پر آیا۔ عمر خیام کی تصنیف یا ضخیم شاہنامہ؟

یہ اندازہ کرنا آسان نہیں کہ آئندہ سو برس کی مدت میں شاعری کی شکل کیا ہوگی مگر ماضی سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ غنائیہ اور فلسفیانہ شاعری فوائد کے اعتبار سے ایک پر فوقیت رکھتی ہیں۔ آپ کچھ بھی کہیں رزمیہ شاعری بہت حد تک بیانیہ اور آرائشی ہوتی ہے۔

س: نام نہاد "دانشورانہ شاعری" (INTELLECTUAL POETRY) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: میں، یقیناً فکر و دانش سے معمور نگارش کا حامی ہوں۔ بہرحال شاعری کو مجرد خیالات کے بجائے محسوسات کے اظہار کا کرہ سمجھیے مگر آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے احساسات استدلالی ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں ہمیشہ فکر موجود ہوتی ہے، مگر دوسری طرف یہ بھی ہے کہ شاعری وہ نہیں ہے جسے آپ کسی علمی مقالہ، کسی مضمون یا کسی مقبول سائنسی پمفلٹ میں پڑھتے ہیں مختصر یہ کہ دانشورانہ شاعری میں بھی بعض اوقات خطا کا امکان ہے۔

یاد کیجیے کہ اٹھارہویں صدی جس نے دنیا کو "سیات نووا" دیا، استدلال و بصیرت کا عہد کہلائی اور ہمارے لیے بے اندازہ روحانی مال و متاع چھوڑا اُس میں حیرت انگیز طور پر، سچی شاعری کے بعض نمونے بھی دستیاب ہیں۔ صدیوں کی مظلومیت کے بعد آخر کار ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے آزاد، مذہبی عقائد اور عصبیت کو جھٹک کر انسانی عقل، انسانی روح کے ان حلقوں تک رسائی میں کامیاب ہوئی جو اس سے متعلق بھی نہ تھے۔ تب اُس صدی کو شاعروں سے کہیں زیادہ مقررین اور فنکاروں سے کہیں زیادہ مبلغین کی ضرورت تھی مگر ہمارے عہد کو کسی دیگر عہد کے برعکس، بلاشبہ دو عناصر عقلی اور جذباتی، گہری تخیلی اور حقیقی شعریات کی ضرورت ہے۔

س: کیا آپ نے کبھی "قومی شاعر" کے تصور کے بارے میں سوچا؟ آپ کے خیال میں اس خطاب کے حصول کا حقدار ثابت کرنے

کے لیے کسی شاعر میں کن خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہے؟"

ج: یہ مشکل سوال ہے..... ہر شے سوائے ادب کے، غیر قومی سمجھی جا سکتی ہے۔ حد تو یہ کہ اگر کوئی معاملہ قومی نہ ہو، تب بھی اس کا اظہار کرنے والا (مصنف) اور ذریعۂ اظہار (زبان) ہمیشہ قومی ہوتے ہیں۔ بصورتِ دیگر ادب کا وجود نہیں۔ وطن دوستی سے مضبوط تر کوئی جذبہ نہیں اور ایک سچے شاعر سے بڑھ کر کون اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔ مگر..... بعض اوقات وطن پرستی ناقابلِ اعتبار سائیکلوپس (۳) (CYCLOPS) کی مانند ہو جاتی ہے جو دنیا کو فقط ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہ جعلی وطن پرستی ہے جو قومی تنگ نظری اور قومی خودرائی پہ مبنی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ حقیقی وطن پرستی اور جعلی وطن پرستی میں بعض اوقات حدِ فاصل کھینچنا دقت طلب ہو جاتا ہے، جیسی کہ دو ممالک کے مابین ہوتی ہے اور سرحدی محافظ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس مشکل سے قطع نظر، قومی تنگ نظری اور قومی وقار حقیقت میں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے دھنک کسی سانچے سے مختلف نظر آتی ہے۔ حالانکہ مؤخرالذکر بھی کبھی کبھی دھنک کے مماثل دکھائی دیتا ہے۔

قومی شاعر ہونے کا مطلب بنیادی طور پر، جیسا میں سمجھتا ہوں، عظیم محبِ وطن ہونا ہے۔ مگر سوال کا ایک رُخ اور بھی ہے ایک سچا شاعر اس سوچ کے پرچار میں کوئی مدد نہیں کر سکتا کیوں کہ اقوام ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، ان میں مطابقت کم کم ہوتی ہے وہ قومی شاعر عظیم ہوتا ہے جو کرۂ ارض کے باشندوں کی خوشی، آزادی مساوات اور بھائی چارہ کی راہ مسدود کرنے والے سے کسی حال میں سمجھوتہ نہ کرتا ہو۔۔۔۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ایسے افراد اور ایسے نظام سے کسی قیمت پر مصالحت نہ کرے۔

س: آپ کے خیال میں عصرِ حاضر میں شاعری کا کیا مقام ہونا چاہیے؟

ج: ہم اپنے دور میں حیران کن قولِ محال (PARADOX) کے مقابل ہیں ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کے ثمرات کے طفیل، ہمارا سیارہ سکڑ کر کسی اسکول روم کے گلوب کے برابر ہو گیا ہے۔ مگر دوسری طرف یہی ثمراتِ تمدن لوگوں کو ان کے گوشوں میں رکھ کر انھیں ایک قسم کا "فردیت پسند" (INDIVIDUALIST) بنا دیا ہے طیارہ میں سفر کے دوران میں ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ اپنے ہم بازو شخص کا نام دریافت کریں نتیجہ یہ ہے کہ کسی دوسرے موقع پر بھی لوگوں میں اسی قسم کا اشتراک یا انتشار ہوتا ہے یہاں بھی شاعری ہماری روحانی تکالیف، ہماری گہری سوچوں اور تجربوں کی بہترین ترجمانی کر سکتی ہے۔

الفاظ بھی استعمال سے بنتے ہیں، مگر نظ، امن گرچہ ہر قدم پر دہرایا گیا ہے، ان میں شامل نہیں۔ ہماری "پریشان" صدی میں جنگ کی دھمکی تمام تہذیبوں کی بربادی کی دھمکی ہے۔ چنانچہ شاعری کی خدمت کر کے ہم ایک اور مقصد کی بھی خدمت کرتے ہیں۔

دنیا بھر کے شعرا کو انسانی دلوں کے درمیان مکالمات کرنا چاہیے تاکہ جنگ کو روزِ حشر تک کے لیے روکا جا سکے۔

س: آپ بہ حیثیت شاعر اپنا مقام کیا متعین کرتے ہیں؟

ج: لوگ کہتے ہیں کہ شاعر بعض اعتبار سے ہمیشہ بچہ رہتا ہے، شاید یہ سچ ہے، ایک دن ماہرینِ نفسیات بچوں کی نرسری میں گئے اور بچوں سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ کون سا جانور بننا پسند کریں گے۔ ایک نے جواب دیا کہ وہ بندر بننا پسند کرے گا تاکہ چھری کانٹے کے بغیر کھا سکے، دوسرے نے کہا وہ ہرن بننا چاہتا ہے تاکہ وہ فادر فروسٹ (FATHER FROST) کو بہ سرعت یہاں لا سکے، تیسرے نے زیبرے کو چُنا، تاکہ اسے کبھی دھاری دار پاجامہ اُتارنے کی نوبت نہ آئے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جاتا تو میں لق لق بننا پسند کرتا

لوگ کہتے ہیں کہ جب لق لق سے پوچھا گیا کہ وہ ہمیشہ ایک ٹانگ پر کیوں کھڑا ہوتا ہے تو اُس نے جواب دیا: "زمین کے بوجھ کو کچھ ہلکا کرنے کے لیے" کیا وہ بھولا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاعر کو کچھ اُس مہربان لق لق سے مشابہ ہونا چاہیے....... بہر حال میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنی منظومات میں سے ایک نظم کے اختتامی مصرعے میں لق لق کے جواب کے اس منشا کا اظہار کر دیا ہے جو میری حیات اور فن کا بھی نصب العین ہے۔

(سوویت لٹریچر، ماسکو بابت اپریل ۱۹۶۰ء سے ماخوذ)

حواشی

(۱) ایڈیسا EDESSA: یونانی ریاست مقدونیہ کا ایک شہر
(۲) سیسلی میں پائے جانے والے اساطیری، یک چشمی جنات کی نسل کا نام ہے۔

NIT

ایک بار پھر سب سے اعلیٰ سب سے بالا

۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے ہمیشہ سے بڑھ کر

۲٫۲۵ روپے

فی یونٹ منافع کا اعلان

اپنے یونٹ یافتگان میں ۳٫ ارب روپے کا مجموعی ڈیویڈنڈ تقسیم کیا جائے گا۔

سرمایہ کاری کی کوئی بھی اسکیم این آئی ٹی کا مقابلہ نہیں کرتی۔

یونٹ داروں کے لیے فوائد

سال خریداری	آغاز سال پر قیمت	منافع	گزشتہ قیمت پر اضافہ	کل یافت	فی صد
۱۹۹۱	۱۲٫۵۰	۲٫۲۵	۰٫۵۰	۲٫۷۵	۲۲٪
۱۹۹۰	۱۲٫۲۰	۲٫۲۵	۰٫۸۰	۳٫۰۵	۲۵٪

۱۹۹۰ء سے پہلے اور مجموعی سرمایہ کاری منصوبہ (سی آئی پی) کے تحت خرید کردہ یونٹوں پر منافع اور بھی زیادہ

صدر دفتر:

شاخیں:

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

چند اور اکابر چند اور معاصر

حکیم محمد سعید دہلوی

صفحات ۱۷۶ قیمت =/۵۰ روپے

راس مسعود ہوسائٹی سی ۵/ کوزی ہومز گلشن اقبال، کراچی

جلیل قدوائی صرف ایک بزرگ شاعر ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب کے ایک خاص دور کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی دستاویز بھی ہیں۔ وہ اپنے عہد کے متعدد نامور افراد کے حلقہ احباب میں شامل رہے ہیں۔ اس طرح ان کو ان افراد کے ذاتی اور شخصی پہلوؤں کے مطالعے کا بھی موقع ملا ہے۔ انھوں نے ان نامور افراد سے تعلقات کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان افراد کے بارے میں نہایت مفید تفصیلات کو اپنی تحریروں میں محفوظ کر دیا۔ ان کی یہ تحریریں ہماری علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ میں عصری شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اب سے کوئی سولہ سال پہلے جلیل قدوائی نے تقریباً دو درجن نامور افراد کی تاثراتی تصویریں "چند اکابر چند معاصر" کے نام سے لکھی تھیں۔ اب سولہ سال بعد مزید اکیس شخصیات کی حسی تصاویر "چند اکابر اور چند معاصر" کے نام سے شائع کی ہیں۔ ہم ان حسی تاثراتی تصاویر کو دیکھنے کے بعد انھیں "شخصی خاکوں" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جناب جلیل قدوائی کے ان شخصی خاکوں سے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور شاہد احمد دہلوی خاکہ نگاری میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ جناب جلیل قدوائی نے شخصی خاکے کسی کے مقابلے میں ہرگز نہیں لکھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تاثراتی تصاویر خاکہ نگاری کے طور پر لکھی بھی نہیں ہیں کیونکہ اس سلسلے میں ان کا خود بیان ہے "کم و بیش ۱۶ برس ہوئے راقم نے "چند اکابر اور چند معاصر" کے نام سے کوئی دو درجن ایسی نادر روزگار علمی، ادبی قومی نیز دیگر لحاظ سے اہم شخصیتوں پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا جن میں بیشتر سے راقم کو قریبی وابستگی اور ہم نشینی حاصل رہ چکی تھی۔ ایسے مضامین کو عرف عام میں شخصی خاکے کہا جانے لگا ہے۔" گویا انھوں نے تو یہ سب کچھ عام مضامین کے طور پر لکھا تھا لیکن بعد میں انھیں احساس دلایا گیا کہ یہ شخصی خاکے ہیں۔ بہر حال انھیں مضامین کہیے یا خاکے یہ ہماری تہذیبی تاریخ کا مستند حوالہ ضرور ہیں۔

جناب جلیل قدوائی کے ان مضامین یا شخصی خاکوں کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ انھوں نے مختلف شخصیات کے بارے میں صرف ایسی خصوصیات یا ایسے واقعات ہی کا انتخاب کیا ہے جو ان شخصیات کے اصل کردار یا ان کی شخصیت کے جوہر کو اجاگر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان مضامین میں بیان کردہ واقعات کے جلیل قدوائی صاحب چشم دید گواہ ہیں لہذا ان کے صحیح اور قابل اعتبار ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ جناب جلیل قدوائی صاحب نے اپنے عہد کی مشہور شخصیات کے بارے میں مفید معلومات

فراہم کر کے بلاشبہ قومی خدمت انجام دی ہے۔

تحفظ دستاویزات و کتب خانہ

اشرف علی

صفحات ۳۲۴

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

علم انسانیت کی میراث اور پہچان ہے۔ یہ ہمارے اسلاف کی امانت ہے اور اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ علم کتابوں، مخطوطات اور دستاویز کی صورت میں ہے۔ ان کو محفوظ کرنا۔ آئندہ آنے والی نسلوں کو محفوظ کرنے کے مترادف ہے۔ زیر تبصرہ کتاب تحفظ دستاویز و کتب خانہ مصنف نے اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر لکھی۔ مصنف جناب اشرف علی ڈپٹی ڈائریکٹر نیشنل آرکائیوز آف پاکستان اسلام آباد میں طویل عرصے سے خدمات سر انجام دے رہے ہیں اور دستاویزات و مخطوطات اور کتب خانہ کے مواد کی حفاظت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس موضوع پر کئی سیمینار اور تربیتی ورکشاپس کا انعقاد بھی کر چکے ہیں۔ نایاب کتابوں، دستاویزات اور مخطوطات کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنا ایک مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ جس طرح انسانی امراض کے بچاؤ کے لیے ماہرین کام کرتے ہیں اسی طرح ماہرین نادر مخطوطات کو بچانے کے لیے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ اسی کاوش کو مصنف نے زیر تبصرہ کتاب کی صورت دی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اکیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں دستاویزات و مخطوطات کی تعریف، مختلف کتب خانہ جات کے نایاب مواد، آرکائیوز کے پاکستان بھر میں ادارے، ایسے ریکارڈ کی درجہ بندی و ترتیب اور پاکستان ہسٹاریکل ریکارڈ اینڈ آرکائیوز کمیشن کا قیام اور اس کی غرض و غاصیت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں پنجاب پبلک لائبریری، دیال سنگھ لائبریری پشاور ریکارڈ آفس، پنجاب ریکارڈ آفس اور ہمدرد فاؤنڈیشن وغیرہ جیسے اہم اداروں پر بھی بحث کی گئی ہے اور قومی کتب خانہ کے مقاصد کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں موجود معروف شخصیات کے ذاتی ذخیرہ نایاب کتب کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

کتاب میں نایاب مخطوطات اور دستاویزات کے مرمت کے طریقہ کار پر اور اس کی درجہ بندی اور حفاظت پر بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کو وضاحت کے لیے تصاویر کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔

مصنف نے اردو میں لائبریری سائنس کے طلبہ، تاریخ کے طلبہ اور کتب کا ذخیرہ رکھنے والوں کے لیے قابل تحسین کاوش کی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب جاذب نظر ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی کاوشوں کو بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(حافظ حبیب احمد)

مفتی محمد رضا انصاری، شخصیت اور جذبات

خواجہ رضی حیدر

صفحات ۷۴ قیمت درج نہیں

سورتی اکیڈمی۔ ۲ ڈی ۱۶/۵ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

خواجہ رضی حیدر کی یہ کتاب ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مختصر کتاب میں تاثرات کی شکل میں جو مواد موجود ہے اس کے سبب سے یہ کتاب حقیقیتاً بعض بہت ہی ضخیم کتب پر بھاری ہے۔ اس کے صفحات پر مفتی رضا انصاری فرنگیؒ کے تعلق سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ بہتوں کے لیے یکسر نئی ہونگی۔

مفتی رضا انصاری کا خانوادہ علمائے عظام سے بھرا پڑا ہے۔ مفتی صاحب کو بھی اسی تسلسل میں شمار کیجیے۔ ان کی تصانیف و تالیف کی تعداد کثیر ہیں۔ ان کی بہت سی جہتیں ہیں۔ مفتی صاحب کی شخصیت بھی ہمہ جہت ہونے کا ثبوت ادبی تاریخ کے وسیلے سے مہیا کرتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں یعنی ترقی پسند تحریک کے آغاز میں اُن کا شمار تحریک کے رفقاء میں ہوتا تھا۔ اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ۱۹۳۸ء میں جب لکھنؤ سے رسالہ "نیا ادب" ترقی پسند تحریک کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہوا تو مجلس ادارت میں سیّد سبط حسن، مجاز لکھنوی اور علی سردار جعفری کے ساتھ مفتی رضا انصاری فرنگی محلی کا نام بھی شامل تھا۔

مفتی رضا انصاری کی کتابِ زندگی اس قدر ہمہ جہت اور ان کا علمی و فکری سفر اتنے موڑ کاٹتا رہا ہے کہ سب کا احاطہ یہاں مشکل ہے۔ مفتی صاحب کی مراجعت جب دُنیا سے دین کی طرف ہوئی اور ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ میں دینیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تو وہاں موافق ماحول نصیب ہونے پر انھوں نے اپنے خانوادے کے معروف عالم ملّا نظام الدّین محمد بانیٔ درس نظامیہ پر ایک طویل مقالہ لکھا جو بعد ازاں (۱۹۷۳ء) بانیٔ درس نظامی کے نام سے کتابی صورت میں چھپا علاوہ ازیں انھوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب ادب الجاہلی کا اردو ترجمہ "جاہلی ادب" شائع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں مفتی عبد القادر فرنگی محلی کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ "فتاویٰ فرنگی محلی" کے نام سے مرتب کیا۔ چند سال اُدھر مفتی رضا انصاری فرنگی محلی انجمن ترقی اردو میں تشریف لائے تھے۔ حاضرین میں سے جن لوگوں نے مفتی صاحب کے کتُب پڑھ رکھے تھے انھوں نے دیکھ کر دو گونہ لطف اٹھایا

(ا۔س)

دائمی مسرت کا حصول

تصنیف: پروفیسر برٹرینڈ رسل ترجمہ جمیل زبیری

صفحات ۱۷۵ قیمت -/۹۹ روپے

مکتبۂ دانیال۔ عبد اللہ ہارون روڈ۔ کراچی

دنیا کے بڑے لوگوں کی بڑی کتابوں کے ترجمے کا کام ابتداً دار الترجمہ حیدر آباد دکن اور انجمن ترقی اردو نے انجام دیا۔ جن میں یہ کام مولوی عبد الحق کی معتمدی و سرپرستی میں کیا گیا۔ بعد ازاں جب ترجمے کی افادیت و اہمیت ادبی حلقے پر روشن ہوئی تو برصغیر پاک و ہند میں ایسے کئی اشاعتی ادارے قائم ہوگئے جہاں سے غیر زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا آغاز ہوا۔

غیر زبانوں کے ادب اور بالخصوص بڑے ادب کے ترجموں سے کسی زبان اور اس کے اہل علم و دانش کی فکری و ذہنی تربیت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور وہ اس بات سے باخبر رہتے ہیں کہ دوسری زبانوں میں کیا کچھ لکھا جارہا ہے۔ اور کس نہج پر لکھا جارہا ہے۔ دراصل تراجم کے ذریعے ایک ادب سے دوسرے ادب کی جان کاری احسان کا درجہ رکھتی ہے اور ایک ادب کو دوسرے ادب سے متعارف کرانے والا محسنی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جناب جمیل زبیری نے عصر حاضر کے ایک بڑے فلسفی اور صاحب طرز ادیب برٹرینڈرسل کی مشہور کتاب "CONQUEST OF HAPPINESS" کو دائمی مسرت کا حصول کے نام سے منتقل کر کے یہی احسان کیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کتاب کے بارے میں سیّد محمد تقی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے جو خود بھی عالمانہ ذہن اور فلسفیانہ مزاج رکھتے ہیں۔

چونکہ جناب سیّد محمد تقی نے کتاب کے مصنف اور مترجم پر بہت کچھ کہہ دیا ہے اس لیے اس کے بعد کچھ لکھنا تکرار محض ہوگا۔ جمیل زبیری صاحب کی اس کتاب کو پڑھ کر یہ تاثر لینا بجا ہے کہ اس کی زبان بہت رواں اور ہموار ہے۔ اس کی قرأت کے درمیان مترجم کا عجز کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔

مکتبہ دانیال نے بڑی کتاب کے ترجمے چھاپنے کی ایک اچھی طرح ڈالی ہے۔ اس کا تسلسل برقرار رہنا چاہیے۔ کتاب صاف ستھری اور سلیقے سے چھاپی گئی ہے۔

ا۔ س

گرد و پیش

انجمن کی جانب سے جناب حمید نسیم کے اعزاز میں تقریب

۱۱ نومبر ۹۳ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے جناب حمید نسیم کی طویل علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب نیپا آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی۔ دستور کے مطابق تقریب کی صدارت صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی اسٹیج پر صدر کے علاوہ مہمانانِ خصوصی جناب حمید نسیم، جناب اعجاز حسین بٹالوی، جناب ضیا جالندھری اور انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی تشریف فرما تھے۔ نظامت کے فرائض جناب اقبال فریدی نے انجام دیے۔

تقریب کے باضابطہ آغاز سے پہلے جناب جمیل الدّین عالی نے اپنی معروضات پیش کیں۔ انھوں نے خود ہی تلاوت کلام پاک کی سعادت حاصل کی۔ انھوں نے کہا کہ بزرگ ادیب کی خدمات کے اعتراف کے اس سلسلے کی ابتدا صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری کے صائب مشورے سے ہوئی اور اب یہ باضابطہ روایت اختیار کر گئی ہے۔ اس موقع پر ہم ملک کے ایسے بزرگ اہل قلم کا انتخاب کرتے ہیں جن کی علمی خدمات کثیر ہوں اور پھر ان کی علمی و ادبی خدمات پر اظہار خیال کرنے کے لیے ہم ایسے ادبا کو دعوت دیتے ہیں جو اس بزرگ اہل قلم کے ذہنی ارتقاء سے بہتر طور پر واقف ہوں۔

عالی صاحب نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ حمید نسیم کی شاعرانہ ابتدا شہرت سے ہوئی۔ درمیان میں ایک دور تعطل کا آیا اور سمجھا گیا کہ وہ میدانِ ادب سے چلے گئے لیکن نہیں اُن کی CREATIVITY دوسری صورت میں جاری رہی۔ بھائی سلیم احمد سے لے کر ریڈیو پاکستان کراچی کا کون سا ادیب ایسا ہے (اس وقت ریڈیو پاکستان میں اہل قلم کا اجتماع تھا) جو تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کے ذریعے حمید نسیم کے علم سے مستفید نہ ہوا ہو، انھوں نے کہا بھائی سلیم احمد نے جس تفاخر سے جناب حمید نسیم کی تحسین کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب نسیم کے وہ مہ و سال جن کو ہم تعطل کا زمانہ سمجھ رہے تھے اُن میں انھوں نے نئی نسل کے ادیبوں کی ذہنی تربیت کی۔ "ناممکن کی جستجو" جیسی خود نوشت لکھی اور کم سے کم اتنی غزلیں ضرور کہہ لیں جن سے دو مجموعہ کلام "دودِ تحیر" اور "جستِ جنوں" ترتیب دیے جا سکیں۔

عالی صاحب کے اظہار خیال کے بعد جناب اقبال فریدی نے ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن کا نام پکارا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ایک خاکہ پڑھا۔ اس خاکے کے ذریعے جناب حمید نسیم کے بہت سے اوجھل گوشوں پر روشنی پڑتی تھی۔ سامعین کو اس کی

بدولت جناب حمید نسیم کی پہلو دار شخصیت سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے بعد جناب احمد ہمدانی نے مقالہ پڑھا، انھوں نے اپنے مقالے میں جناب حمید نسیم کے علمی مشاغل اور شاعرانہ نکتہ وری کا ذکر کیا اور اس سلسلے میں جناب حمید نسیم کے اشعار سے مثالیں بھی پیش کیں۔ انھوں نے کہا جناب نسیم محض ایک فرد نہیں بلکہ نیرنگیٔ حیات کے جامع ہیں۔ اُن کے وجود کا خمیر صرف محبت اور رواداری سے اٹھا ہے۔

جناب ضمیر علی بدایونی نے اپنے مقالے کا آغاز اس بات سے کیا کہ ہمیں خوشی ہے کہ انجمن نے جناب حمید نسیم کی علمی و ادبی خدمات کو نظر میں رکھا اور ان کے اعتراف میں آج یہ بزم سجائی ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق جو ضیا جالندھری کی قیادت میں، کبھی فعال ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں ن۔ م۔ راشد، غلام عباس، حمید نسیم، ممتاز حسین، شان الحق حقی، سلیم احمد اور دوسرے صاحبان علم کی ادبی نشست میں شرکت نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت میں معاون ہوتی تھی۔ وہ عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے۔

جناب ضمیر علی بدایونی نے مزید کہا کہ حمید نسیم کے فکری مراکز ثقل حافظ اور غالب ہیں۔ وہ روایتی شاعر نہیں بلکہ روایتی شعور کے شاعر ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری دودِ تحیر اور گردِ ملال کے درمیان شاعرانہ قوت پاتی ہے۔ وہ اپنی شناخت فطرت میں نہیں انسانی رشتوں میں تلاش کرتے ہیں اور سچ کہنے کی قیمت اور ضرورت دونوں سے باخبر ہیں۔

جناب ضیا جالندھری نے اپنے مضمون کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے حمید نسیم پر اظہار خیال کی دعوت دے کر دوگونہ مسرت سے نوازا۔ انھوں نے کہا حمید نسیم کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں، مجھے تو فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ایسی کثیر الجہات شخصیت دوسری نظر نہیں آتی۔

ضیا صاحب نے انکشاف کیا کہ حمید نسیم کی شاعرانہ زندگی میں ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک تعطل رہا ہے۔ لیکن پھر پانچ چھ سال کے عرصے میں انھوں نے اتنا کچھ لکھ ڈالا کہ اس تعطل کی مدت کی ساری کمی پوری ہو گئی۔ بارہ تیرہ عالمانہ شان کی کتابیں لکھ ڈالیں، جن میں کچھ شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔ ضیا جالندھری نے مزید کہا کہ دوسرے شعرا لفظوں کی جھونپڑیاں اور مکانات تعمیر کرتے ہیں حمید نسیم نے حقیقی معنوں میں قلعہ تعمیر کیا ہے۔

جناب اعجاز حسین بٹالوی نے اپنے مقالے کا آغاز بڑے اچھے اسلوب سے کیا اور حاضرین تقریب کو اپنی باتوں میں جلد ہی محو کر لیا۔ انھوں نے کہا ایک پودا دوستی کا ہے اور دوسرا تخلیقی عمل کا۔ تخلیقی عمل کا پودا زیادہ پراسرار ہے۔ اس پر پھول پھل کب اور کس انداز سے آتے ہیں، اس کے اسرار و رموز پُر پیچ ہیں۔ دوستی کے پودے کو ملاقاتوں کے پانی سے سیراب کرتے رہنا چاہیے۔ اسی کلیۂ محبت کے تحت آج میں یہاں حاضر ہوا ہوں اپنی نصف صدی کی دوستی کو سیراب کرنے کے لیے۔

اعجاز صاحب نے اپنے انگلینڈ نہ جانے اور ترک وطن نہ کرنے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں کراچی آیا دوبارہ انگلینڈ چلے جانے اور وہاں بود و باش اختیار کر لینے کے لیے لیکن جانے سے پہلے کراچی کے "یارانِ نجد" نے الوداعی جشن کے طور پر کلفٹن کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اس وقت کلفٹن کا بیشتر علاقہ اس طرح آباد نہیں تھا جیسے کہ اب ہے۔ ریگ زار کا سلسلہ نظر آتا تھا۔ وہیں تجمل حسین نے ترنگ میں کسی کی فرمائش پر ایک غزل سنائی۔ غزل عالی جی کی ہے جب اُس نے یہ شعر پڑھا۔

جانے کیوں اِک در و دیوار کا پابند ہوا
میں کہ منسوب کیے جاتے تھے صحرا مجھ سے

ہمیں نہیں کہہ سکتا اس وقت اس شعر کو سُن کر مجھ پر کیا اثر ہوا کہ رقص کرنے لگا اور اُسی عالم میں میں نے بار بار اعلان کیا کہ جہاں ایسے شعر سُننے کو ملتے ہیں اُس سرزمین کو چھوڑ کر کون جا سکتا ہے بعد ازاں تمام یاران نجد نے اسی خوشی میں دھمال شروع کر دیا۔ اور میں نے انگلینڈ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

صدر انجمن نے جناب حمید نسیم کی طویل اور بے مثال علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انجمن کی طرف سے ایک سپاس نامہ پیش کیا اور انھیں پھول کا ہار پہنایا۔

پھر حاضرین کی درخواست پر جناب حمید نسیم نے اپنی کئی تازہ غزلیں سنائیں۔ انھوں نے غزل سنانے سے پہلے کہا کہ اس محفل میں اتنی خوبصورت باتیں ہو چکی ہیں کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں۔ میں صرف یہ کہہ کر اپنی باتوں کو ختم کرتا ہوں کہ میرے دو یار جانی ضیا جالندھری اور اعجاز حسین ہیں شعر و سخن اور علم و ادب کی طرف میری دوبارہ مراجعت میں ان کی مساعی کا بڑا دخل ہے۔ شاعری ضیا اور دوسری تحریریں اعجاز لکھواتا ہے ان تحریروں میں جو کوتاہی دکھائی دے وہ میری سمجھیے اور جو خوبیاں نظر آجائیں وہ ان دونوں کی مرہون منت ہیں۔

حمید نسیم صاحب نے کئی غزلیں سنائیں۔ ایک غزل کے چند اشعار سنیے:

لاؤں کہاں سے مثال کیا کہوں کیسا ہوں میں
شہر میں رہتا ہوں اور لالہ صحرا ہوں میں

ایک زمانے سے میں اپنے تعاقب میں ہوں
لوگوں کو حیرت ہے کیا ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں

اب بھی دکھاتی ہے دل اپنے قبیلے کی یاد
ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج ہوں تنہا ہوں میں

آخر میں صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے پہلے جناب حمید نسیم اور ان معزز مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے انجمن کی طرف سے جناب حمید نسیم کی علمی خدمات کے اعتراف میں منعقد کی جانے والی اس تقریب میں اپنے گرانقدر مقالات پڑھے۔ پھر کہا کہ میں اپنے معزز مہمان جناب حمید نسیم کو جانتا تو تھا پہلے سے، لیکن اتنا اور اس انداز سے جاننے کا آج موقع ملا ہے۔

معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی چند معروضات پیش کرنے کے لیے دوبارہ کھڑے ہوئے اور کہا میں حمید نسیم کو پچاس برس سے جانتا ہوں وہ ادب کی معتبر شخصیت کے طور پر ابھرے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے بیچ میں ایک طویل عرصہ تعطل کا آیا لیکن اعجاز حسین کے بہ قول اس پورے عرصے میں حمید نسیم کے اندر کا کمپیوٹر کام کرتا رہا کبھی غافل نہیں ہوا اور پھر ایک وقت آیا کہ اس کمپیوٹر نے حمید نسیم کو "تعارف الفرقان" اور دوسری کتب کی صورت میں لوٹا دیا تعارف الفرقان ایک ایسا کارنامہ ہے کہ رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا اور بخشائش کا وسیلہ بھی بنے گا۔

عالی صاحب نے کہا کہ ہم سب کے لیے حمید نسیم، ضیا جالندھری اور اعجاز حسین کی یہ دوستی قابل رشک ہے۔ ہمیں ان کی دوستی نبھانے کے اس جذبے سے سبق لینا چاہیے۔

انھوں نے کہا میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہم کراچی والے جتنا حُب دلی سے باہر کے لکھنے والوں کو یاد کرتے اور اس کا اظہار ان کے اعزاز میں تقریب برپا کر کے برملا کرتے ہیں کراچی سے باہر کے ادبی مراکز میں بھی ایسی ہی ادبی مجلسیں مرتّب کر کے کراچی کے بزرگ ادیب شاعر، مثلاً پروفیسر علی احمد، شان الحق حقّی اور دیگر ادیب و شاعر کے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کی رسم بلا تخصیص زبان شہر و علاقہ ڈالنی چاہیے یہ کار خیر ہم ادیب ہی کر سکتے ہیں اور اس میں ہم ادیبوں ہی کا بھلا ہے۔

وزیر اعلیٰ سندھ جناب عبداللہ شاہ کا سندھی اردو سمپوزیم سے خطاب

سندھ کے وزیر اعلیٰ اور مہمانِ خصوصی جناب عبداللہ شاہ نے مہران رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام سندھی اردو سمپوزیم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سندھ کی مٹی میں نفرت نہیں پنپ سکتی۔ یہاں کی مٹی اور پانی میں نفرت اور کدورتیں نہیں محبتیں پروان چڑھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں ایک آبادی نہ دوسرے کو ختم کر سکتی ہے نہ نکال سکتی ہے لہٰذا جیو اور جینے دو کے اصولوں پر زندہ رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان تو ایسی چیز ہے جسے کوئی قوم بدل نہیں سکتی مذہب تو انسان بدل بھی سکتا ہے۔ لہٰذا زبان کی بنیاد پر کوئی جھگڑا اور اختلاف بے معنی ہے۔ سندھ میں جب قدیم ترین زبانیں میگواڑ، بھیل اور کوہی اب بھی رائج ہیں تو دوسری زبانیں کیسے ختم ہو سکتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ سندھ نے کہا کہ ہمیں اس بارے میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے انھوں نے شعرا ادبا اور علما پر زور دیا کہ انسانی ہم آہنگی کے لیے اپنے کردار ادا کریں، وزیر اعلیٰ نے اس بات کو زور دے کر کہا کہ سندھ کو یہ فخر ہے کہ اردو زبان نے اس صوبے سے جنم لیا جس طرح یہاں کا ایک عام دیہاتی اردو سمجھ لیتا ہے۔ اُسی طرح ایک عام شہری کو بھی سندھی سمجھنا چاہیے اس طرح محبتیں بڑھیں گی، محبتیں بڑھیں گی تو ہر طرح کے رشتے اُستوار ہوں گے۔

سمپوزیم سے حاجی شفیع اسٹیل والا، ڈاکٹر عالیہ امام، تاج محمد بلوچ، فہمیدہ حسین، شان الحق حقّی، عبدالقادر توکل، علامہ عباس حیدر عابدی، طلعت ترین اور سلیمان شیخ نے بھی خطاب کیا۔

مہران رائٹرز گلڈ کی طرف سے منعقد کی جانے والی سندھی اردو سیمپوزیم کی صدارت جسٹس صلاح الدّین مرزا نے فرمائی۔

(روز نامہ "جنگ" ۷ نومبر ۱۹۹۳ء)

سادات جاجنیری (شجرہ) کی تقریب اجرا

۹ نومبر ۹۳ء کو کراچی کے ایک مقامی ہال میں جناب قیوم چواروی کی مرتّبہ کتاب "ساداتِ جاجنیری" کی تقریب رونمائی ہوئی جس کی صدارت ممتاز علم داں جناب سیّد محمود احمد برکاتی نے فرمائی، نظامت کے فرائض جناب محمد امین نے ادا کیے۔ تقریب کا آغاز حافظ سیّد عون احمد نظامی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ نعت قاری کریم الدّین نے پڑھی۔

جناب قیوم چواروی نے اپنی مرتّب کردہ کتاب "سادات جاجنیری" کی اشاعت کے مقاصد بیان کیے، پھر اس طرح کتاب کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالی، اس موقع پر جناب امین کتاب الانساب "اشرافِ عرب" کے مؤلف جناب نجم الحسن اور سیّد قیام الدّین نظامی نے گرانقدر خیالات کا اظہار مختصر مضمون کے ذریعے کیا۔

بعد ازاں رضا دارُوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے کتاب مذکور کے مرتّب جناب قیوم چواروی سے اس کی ترتیب کے دوران کہا تھا کہ آپ اپنے ترتیب و تالیف کے کام کو سادات جاجنیری ہی تک محدود رکھیں ورنہ زیادہ پھیلے تو مشکلات کا

سامنا کرنا پڑے گا۔ کتاب الانساب مرتب کرنا گویا تلوار کی باڑھ پر سے گزرنا ہے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب حکیم سیّد محمود احمد برکاتی نے کہا کہ میں جلسہ جلوس میں جانے سے گریز کرتا ہوں۔ لیکن یہاں آنے کی دعوت اس لیے قبول کی کہ ہمارا تعلق بھی سیّد احمد جاجنیری کے خاندانی سلسلے سے ہے۔ انھوں نے کتاب مذکور کے حوالے سے کہا کہ یہ کتاب بہت اہم اور وقیع اس لحاظ سے ہے کہ آنے والی نسل جب اس کے اوراق الٹ کر دیکھے گی تو اس کی ملاقات اپنے پیش رووں سے ہوگی اور ان کے توسط سے خود اس کا سلسلۂ ماضی بھی سامنے آجائے گا۔

نیویارک میں بین الاقوامی مشاعرہ

نیویارک میں بین الاقوامی مشاعرہ یونائیٹڈ مشاعرہ کمیٹی کے تعاون سے خیبر سوسائٹی آف امریکہ نے منعقد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر شمیم سامان بنت ڈاکٹر سامان فتحپوری نے کی جب کہ پاکستان سے تشریف لائے ہوئے عالمی شہرت یافتہ شاعر احمد فراز مہمان خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض بالترتیب نگہت شفیق، ڈاکٹر جمال قادری اور ڈاکٹر صبیحہ صبا نے انجام دیے۔ مشاعرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ٹکٹ ہونے کے باوجود ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔

محفل مشاعرہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کا شرف قاری محمد حنیف کو حاصل ہوا جب کہ نعت رسول مقبول ﷺ کا شرف ہما حنیف کو حاصل ہوا جن شعرائے کرام نے اس عالمی مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا ان میں احمد فراز، تسنیم سید، اشفاق حسین، پروفیسر انوار سیّد، مطلوب حسین، سیّد حنیف اخگر، ڈاکٹر ناصر حسن زیدی، سیّد عزیز الحسن، رشیدہ عیاں، عاقل ہوشیار پوری، طلعت اشارت، ڈاکٹر صبیحہ صبا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد، شہاب کاظمی، زریں یسٰین، ڈاکٹر شفیق، ڈاکٹر جمال قادری، خوشنود امروہوی، شیخ علاء الحسین آزاد لکھنوی، انوار قادری، ڈاکٹر تقی عابدی اور افراسیاب کامل شامل تھے۔ تمام شعرائے کرام نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد حاصل کی نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

ڈاکٹر صبیحہ صبا....

سجا کر چار سو رنگین محفل تیرے خیالوں کی
تری یادوں کی رعنائی میں زیبائی میں جیتے ہیں

طلعت اشارت....

شہرِ وفا کا کیا پوچھو ہو اک تپتا ویرانہ ہے
اہل جنوں سے درد کا رشتہ صدیا سال پرانا ہے

عاقل ہوشیار پوری....

اک وہ کہ دیا تونے جنھیں ذوقِ تبسم
اک ہم کہ ہوئے رونے پہ مجبور مری جاں

رشیدہ عیاں....

یوں تو ساری زیست ہے جیسے اک جنگل سنسان
تنہا رات میں یاد کی چڑیاں بولنے لگتی ہیں

سیّد عزیز الحسن.....

جو ستارے تھے تری مانگ میں افشاں کی طرح
اب پریشاں ہیں تری زلف پریشاں کی طرح

مطلوب حسن.....

یارو وہ فتنہ ساز مداوا کرے گا کیا
قاتل جو ہے مسیحا کا دعویٰ کرے گا کیا

پروفیسر انوار سیّد.....

یہ سب غلط کہ جذبۂ دل میں اثر نہیں
وہ آ گئے ہیں بہرِ ملاقات دیکھیے

نسیم سیّد.....

زرد پتّوں کی یہ رُت کیا کیا نہ سمجھائے مجھے
ہر تھکا ہارا شجر آئینہ دکھلائے مجھے

سیّد حنیف اخگر.....

صورت اشک نہ محفل میں عیاں ہونا تھا
درد کو اور نہاں اور نہاں ہونا تھا

احمد فراز.....

اے خدا جو بھی مجھے پند شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے
تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

اس تقریب سے یونائیٹڈ مشاعرہ کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر رفیق جان، سیکریٹری جنرل محمد یٰسین زبیری اور خیبر سوسائٹی کے کنوینر ڈاکٹر محمد شفیق اور پاکستان لیگ آف امریکہ کے صدر ڈاکٹر شفیع بیزار نے خطاب کیا جب کہ مہمانِ خصوصی احمد فراز نے اردو کی خدمت کے سلسلہ میں سیّد عزیز الحسن اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کو اعزازی شیلڈ پیش کی اور آخر میں ڈاکٹر شمیم سلمان نے صدارتی خطبہ پیش کیا اس طرح یہ خوبصورت محفل مشاعرہ رات گئے اختتام کو پہنچی۔

جدّہ میں حاوی لٹریری سرکل کے زیر اہتمام دوسرا نعتیہ مشاعرہ

گزشتہ دنوں ماہ ربیع الاوّل کی مناسبت سے جدّہ میں حاوی لٹریری سرکل کے زیر اہتمام اس کے نائب صدر جناب نور محمد جرّال کی قیام گاہ پر ایک پُروقار نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شاہ محمد سبطین شاہجہانی صاحب نے کی۔ مہمانِ خصوصی محمد رفیع صاحب تھے۔ ابتدائی کلمات راقم الحروف نے ادا کیے اور نظامت نور محمد جرّال نے نہایت خوبصورتی سے کی۔ حافظ محمد

عبداللہ صاحب نے تلاوتِ کلام پاک کی سعادت حاصل کی۔ مشاعرے میں پیش کیے جانے والے نعتیہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

میں عالمِ ہستی میں بھٹکتا ہوا تنکا
تو ختمِ رسالت کا نگیں سیّد عالم

نور محمد جرال

شوق جنّت کا نہیں مجھ کو بروز محشر
بس وہاں ہوں جہاں سرکارؐ نظر آتے رہیں

ڈاکٹر سیّد فضل کریم

آپ سے فریاد ہے اے شارحِ دینِ مبین
چشمِ رحمت کیجیے اے رحمت اللعالمین

کلیم اللہ فاروقی

تُو وقت کے پیمانے سے سوچا نہیں جاتا
موجود فقط عہدِ رواں میرے لیے ہے
حاصل تجھے ہر ایک حقیقت کا یقیں ہے
اور اپنی حقیقت بھی گماں میرے لیے ہے

نسیم سحر

ظلمتوں میں بھی محبت کی روایت لکھنا
روشنی بن کے محمدؐ کی یہ عادت لکھنا
خاکِ طیبہ ترے ذرّے ہوں لہو میں شامل
اور پھر حرفِ دُعا تو بھی بصارت لکھنا

اطہر نفیس عباسی

یوں بھی ہو خوں رگوں میں رقص کرے
دل میں سیلِ سرور بھر جائے
گر نہ کر پائے مدحِ فیضِ رسولؐ
شاعر تشنہ کام بن جائے

سجّاد بابر

اندھیری شب ہے ستارہ گری کی بات کرو
تجلیاتِ جمالِ نبیؐ کی بات کرو
ضیائے مہر ہے جب ذکرِ شاہِ ارض و سما
تو بھول کر بھی نہ تیرہ شبی کی بات کرو

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

مہمانِ خصوصی محمد رفیع اور صاحبِ صدر سبطین شاہجہانی صاحبان نے اس موقع پر نثر میں بھی خطاب فرمایا اور بڑی فکر انگیز باتیں کہیں۔

(رپورٹ نسیم سحر۔ جدہ)

عرعر سعودی عرب میں "ربابِ صحرا" کی تقریب

۹ ستمبر ۹۳ء کو بزمِ احبابِ سخن عرعر (سعودی عرب) کی جانب سے ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری مجموعے "ربابِ صحرا" کی تقریب پذیرائی منعقد کی گئی۔ صدارت جناب اشرف علی نے فرمائی ڈاکٹر حنیف ترین مہمانِ خصوصی تھے۔

تقریب کے رپورٹر جناب محمد عبدالمالک ذاکر کے لکھنے کے مطابق عرعر جیسے دور دراز کے علاقے میں ایسی بزم آراستہ کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کے اردو دانوں کی مشترکہ مساعی، اور تعاون نے یہ مرحلہ آسان کر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ عرعر میں اس قسم کی بزم آرائیاں تواتر سے ہوا کریں گی۔

ڈاکٹر حنیف ترین کی کتاب "ربابِ صحرا" کی تقریب رونمائی کے ایک سرگرم کارکن میں پاکستانی شاعر جناب رحمت اللہ جعفری کا نام بھی آتا ہے۔

بھارت میں میرزا ادیب کے کام پر دو پی ایچ ڈی اور ایم فل

برصغیر کے سینئر اور نامور ادیب میرزا ادیب نے اردو ڈرامہ نگاری کے میدان میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، ان کا اعتراف دوسرے ممالک کے علاوہ بھارت میں خالص علمی سطح پر بھی ہونے لگا ہے۔ بھارت سے موصول ہونے والی ایک اطلاع کے مطابق ایل این میتھلا یونیورسٹی دربھنگا نے پی ایچ ڈی کے لیے ایک پروجیکٹ منظور کیا ہے جس کا عنوان ہے "میرزا ادیب بطور ایک ڈرامہ نگار" اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے محترمہ زہرہ شمائل ایم اے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر رہی ہیں۔ زہرہ شمائل کے تحقیقی کام کی نگرانی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر شاکر خلیق کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ اس سے قبل بھی بھارت میں میرزا ادیب کے کام پر جمیل اختر کمال ایک اور پہلو سے پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق میں مصروف ہیں۔ پی ایچ ڈی کی ایک تھیسس کا عنوان "اردو افسانے کے ارتقاء میں میرزا ادیب کا حصّہ ہے" مارواڑی کالج بھاگلپور شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اس تحقیقی کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ قبل ازیں عثمانیہ یونیورسٹی بھارت کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست کی زیر نگرانی محمد تاتار خان "میرزا ادیب کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ۱۹۸۷ء میں ایک تھیسس لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

چوہدری برکت علی

احمد ندیم قاسمی	ایک ادب دوست	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۹
حمید اختر	نصف صدی کی بات ہے	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۳
حمید اکملی	چوہدری برکت علی اور ادب لطیف	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۷
ظفر معین بلے	چوہدری برکت علی	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۷
عبدالسلام خورشید، پروفیسر	چوہدری برکت علی، چند تاثرات	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲۱
فخر الدّین بلے	محسن اردو، چوہدری برکت علی	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۹
ممتاز مفتی	چوہدری برکت علی	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۱۴
میرزا ادیب	بانیٔ ادب لطیف، کچھ شخصی جھلکیاں	ادب لطیف، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۱

تابش دہلوی

تابش دہلوی	مشاعروں کی کہانی	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۳۵
شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر	تابش دہلوی، فکر و فن	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۲۲
محشر بدایونی	تابش دہلوی، نفیس انسان، منفرد شاعر	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۲۰
محمد عزیز، ڈاکٹر	حضرت تابش دہلوی کی دید باز دید میں شخصیت نگاری	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۱۳
مسلم شمیم	تابش دہلوی	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۷

عبدالغنی خان

عبدالکافی ادیب	عبدالغنی خاں سے گفتگو	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۱۵۱
غلام ربانی آگرو	غنی خان، شاعر، فنکار، ادیب	ادبیات اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۱۶۱
غنی خاں	ایک واقعہ	ادبیات اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۱۷۲

افضل منہاس

انوار فیروز	افضل منہاس، شخصیت کے آئینے میں	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۳۵
رشید نثار	بیکراں آسماں	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۴۲
شوکت واسطی	افضل منہاس، بے کراں آسماں	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۳۹
نجمی صدیقی، پروفیسر	افضل منہاس کی غزل	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۱۴۵

اختر حسین جعفری

آفتاب حسین	تیری محرومی کا دکھ ہے، ایک گفتگو	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۸۵
احمد ندیم قاسمی	اختر حسین جعفری	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۲۷
اختر حسین جعفری	ادب میں عصر کی اہمیت	قومی زبان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۲۹

حیدر گردیزی

اطہر ناسک	حیدر گردیزی کی کہانی کہاں سے شروع کروں	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۸۶
جاوید اختر بھٹی	ہمارے شاہ صاحب، حیدر گردیزی کی باتیں	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۹۰
رضی الدین رضی	اسلم یوسفی اور حیدر گردیزی	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۸۳

علامہ تاج محمود امروٹی

محمد عبدالمعبود، علامہ	حضرت مولانا تاج محمود امروٹی	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۲ء ص ۱۶
محمد اشرف سموں	حریت و آزادی کے علمبردار، علامہ تاج محمود امروٹی	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۲ء ص ۲۳

دیگر علمی، ادبی، تعلیمی شخصیات

آغا آفتاب قزلباش	آغا سرخوش قزلباش	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۴۳
آفتاب احمد، ڈاکٹر	غلام عباس کی یاد میں	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۱۶۵
آل احمد سرور، پروفیسر	ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص
ابوالمعانی عصری	ڈاکٹر وفا راشدی کا تشخص تحقیق و تنقید کے آئینے میں	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۵
ابوسعید قریشی	حفیظ ہوشیارپوری	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۱۹۵
ابوسعید قریشی	ابوالاثر حفیظ جالندھری	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۰۱
احسان ملک	محسنِ اردو ڈاکٹر سیّد عبداللہ	ماہ نو، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۹
اسلم اطہر کمال پوری، پروفیسر	مولانا کرم الٰہی نکودری	محفل، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۳
اسلم فرخی، ڈاکٹر	بیاد ڈاکٹر یاور عباس	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۸۶
اقتدار حسین	نذر سجاد حیدر	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۵۳
اکرم سعید	گارسین دتاسی	ادب لطیف، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۵
امام راشدی	حضرت سیّد حزب اللہ شاہ مکین راشدی	دانش، اسلام آباد ۹۲/۲۱ء ص ۱۸۱
انور رومانی، پروفیسر	ڈاکٹر انعام الحق کوثر ایک تعارف	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۴۷

قومی زبان (۹۱) دسمبر ۱۹۹۳ء

انور سدید، ڈاکٹر	خواجہ محمد شفیع دلی کا آئینہ دار	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۶۵
جمیل احمد، ڈاکٹر	پریم چند بحیثیت افسانہ نگار	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۲۶
جیمنی سرشار	تلوک چند محروم	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۵۲
جی ایم جگنو	ایک ہشت پہلو شخصیت، ستیہ جیت رے	انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء ص ۱۱
حبیب خان	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۵۷
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۲۱
حمایت علی شاعر	عزیز قیسی	سب رس، کراچی دسمبر، ۹۲ء ص ۱۲
خواجہ حمید الدّین شاہد	سیّد احمد حسین امجد حیدرآبادی	سب رس، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱
خواجہ حمید الدّین شاہد	اختر علی اختر حیدرآبادی	سب رس، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۹
خواجہ حمید الدّین شاہد، پروفیسر	عبدالقیوم خاں باقی حیدرآبادی	سب رس، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۹
خواجہ حمید الدّین شاہد	بشیر النساء بیگم بشیر حیدرآبادی اور ان کا انتخاب کلام	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۶۵
خورشید رضوی، ڈاکٹر	نجیب محفوظ ۱۹۸۸ء کا پہلا نوبل یافتہ عرب ادیب	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۱ء ص ۴۸
دلیپ سنگھ	ایک خاکہ نگار کا خاکہ، مجتبیٰ حسین	شاعر بمبئی ۹۲/۲ء ص ۳۷
ذکی دہلوی	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۲۷
راؤ عبداللہ عزمی	اشتیاق طالب	محفل، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۲۹
زاہد حسن	عباس تابش	تحریریں، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۶
زاہد حسن	اطہر صدیقی	تحریریں لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۴
زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی	سید معراج جامی افق شاعری پر ایک ابھرتا ہوا نام	تحریریں، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۳
زہرہ نقوی	یہ ہیں مہتاب راشدی	مطالعہ پاکستان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۶۵
سبط حسن رضوی، ڈاکٹر	سیّد محمد محیط طباطبائی استاد اقبال شناس	دانش، اسلام آباد ۹۲/۳۱ء ص ۱۶۳
سعداللہ خان بٹلر	حافظ الوری شخصیت اور فن	صحیفہ، لاہور جون ۹۲ء ص ۸۳
سلمیٰ زمن، پروفیسر	ابّا جان	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۱۷۶
سہیل احمد صدیقی	نوبل انعام یافتہ ڈیرک والکوٹ، جزیرہ کا سچا ترجمان	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶۵
سہیلہ فاروقی	ناصر کاظمی کی انفرادیت	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۲
سیّد انور	شکیلہ رفیق ادب کے نئے موڑ پر	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۲ء ص ۶۸
شاہ بلیغ الدّین	شیفتہ بستر مرگ پر	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۶
شبیر قادری	خلیق قریشی کی شگفتہ بیانیاں	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۴۵
شفیق احمد، ڈاکٹر	سیّد شہاب دہلوی کی علمی و ادبی خدمات	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۵۹
صابر اکبر آبادی	علامہ مکیش اکبر آبادی	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۱۰۵
عارف نسیم، پروفیسر افہیم سرحدی	اردو زبان کا قدیم ترین پشتون شاعر......	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۴۷
عبدالحمید اعظمی	پطرس بخاری سوانحی خاکہ	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۲۸۹
ظفر عمر زبیری، پروفیسر	الحاج محمد زبیر ایک روشن کتاب	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۰
عبدالسلام، ڈاکٹر	ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی	سائنس میگزین، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۱۴
عبدالقوی دریاآبادی	مولانا عبدالسلام ندوی جن سے میں نے اردو سیکھی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۱۰

قومی زبان (۹۲) دسمبر ۱۹۹۳ء

مصنف	عنوان	ماخذ
علی محمد خاں، ڈاکٹر	مولانا علم الدین سالک اور ان کی ادبی خدمات	ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۷
عنوان چشتی، پروفیسر	مخمور سعیدی شخص اور شاعر	انشاء، کلکتہ نومبر ۹۲ء ص ۱۶
فضل قدیر	میر ولایت حسین	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۸
کلیم سہسرامی، ڈاکٹر	پنڈت کیفی اردو کے محسن	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۱۱
محمد ادریس حافظ	اک چراغ اور بجھا مولانا چراغ دین	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۳۹
محمد بن علی	محمد احمد خاں	سب رس، کراچی دسمبر ۹۲ء
محمد عباس نقشبندی	مولانا سید حسین احمد مدنی افکار و تاثرات	الولی، حیدر آباد سندھ جولائی ۹۲ء ص ۲۲
محمد عثمان، پروفیسر	اقبال اور پاکستان پس منظر اور پیش منظر	تہذیب الاخلاق، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۹
محمود رحیم	اکٹیویو پاز، نوبل انعام یافتہ	صریر، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶۳
محمود واجد	آذر حفیظ باطن کا سفیر	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۲۶
مختار الدین احمد، ڈاکٹر	دیوانہ بکار خویش ہشیار احمد شفیق	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۰[…]
مختار مسعود	پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۲[…]
مسرت حسن	سید کامل القادری	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۷۰
مسعود احمد برکاتی	ہوش محمد شیدی	دائرے، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۲۶
مسعود احمد ہاشمی	فاخر ہریانوی	دائرے، کراچی اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۸۸
مسود عالم قاسمی	مولانا محمد تقی امینی	تہذیب الاخلاق علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۵۰[…]
مختار احمد خاں، ڈاکٹر	غلام عباس بحیثیت افسانہ نگار	سب رس، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۸
منیر عامر	میر سوز درویش یا اداکار؟	قومی زبان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۶۳
نجم السحر	مولوی سعید حسین بلگرامی	سب رس، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۱۱
نور الحسن جعفری	رقعۂ صادقین	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۱۸
وزیر آغا، ڈاکٹر	فکر تونسوی	ادب لطیف، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	سندھ کی برگزیدہ شخصیت	الولی، حیدر آباد سندھ جون ۹۲ء ص ۲۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	مفتی عبد الغفور ہمایونی	الولی، حیدر آباد سندھ اکتوبر ۹۲ء ص ۳۱
وفا راشدی، ڈاکٹر	مخدوم امین محمد ثالث امین ہالدی	الولی، حیدر آباد سندھ نومبر ۹۲ء ص ۲۲
وفا راشدی، ڈاکٹر	افسر صدیقی امروہوی کی یاد میں	دائرے، کراچی اکتوبر نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۸۴
یوسف سرمست	یگانہ اور حیدر آباد دکن	غالب، کراچی ۶، ۹۲/۱۰ء ص ۲۰۶
یوسف ناظم	نیند بیزار شاعر شہریار	شاعر بمبئی، ۹۲/۱ء ص ۳۶
یونس شیخ، ڈاکٹر	الیگزانڈر پشکن جدید روسی ادب کا باوا آدم	صحیفہ لاہور جون ۹۲ء ص ۶۰

علمی ادبی سوانح و تذکرے

مصنف	عنوان	ماخذ
کالی داس گپتا رضا	کچھ تلامذۂ داغ کے تعلق سے نوح، جوش ملسیانی......	شاعر، بمبئی ۳۶/۷، ص ۱۱
محسن بھوپالی	ادا جعفری، اردو کی عہد آفریں شاعرہ	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۳۰
نیر مسعود، ڈاکٹر	سید مسعود حسن رضوی ادیب کی ادبی زندگی	طلوع افکار کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۹
یوسف تقی	بنگال کا پہلا نظم گو شاعر بدر الزماں بدر کلکتوی	روح ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۲۰

تعلیم و تدریس مسائل و مباحث

ابوالمعانی عصری	قومی زبان میں تعلیم و تدریس کا مسئلہ	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۲ء ص ۳۵
افتخار احمد	بے روزگار اور ہمارا نظامِ تعلیم	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۲۷
افتخار الدّین خواجہ، ڈاکٹر	تدریسِ زبان اردو کیوں؟	اخبار اردو، اسلام آباد دسمبر ۹۲ء ص ۱۹
اکبر رحمانی، پروفیسر	خاندیس کے مسلمانوں کی تعلیم ترقی کا جائزہ	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۷۶
الطاف رسول	ملک میں جدید تقاضوں کے مطابق بہتر نظامِ تعلیم....	اردو نامہ، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۸
خان زادہ سمیع الوری	ضلع جیکب آباد کی تعلیمی سرگرمیاں	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۴۸
ریاض الدّین احمد	تعلیم	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۸۴
سیّد قاسم محمود	کیا شرح خواندگی بڑھ رہی ہے؟	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۳
کرامت علی، ڈاکٹر	عصری تقاضے اور تعلیم پالیسی	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۵۶
محمد اسحاق	تعلیم، منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۷۵
محمد اسحاق	کون سا ذریعہ تعلیم مناسب ہے	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۳۶
محمد مختار اصلاحی	نقل کرنے کی بری عادت	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۷۳
مظفر حسن ملک، ڈاکٹر	برصغیر میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ	اخبار اردو، اسلام آباد دسمبر ۹۲ء ص ۷
مظفر حسین چودہری	اسلامی نظامِ تعلیم کا مفہوم	حکمتِ قرآن، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۵
نظام الدّین گوریکر	علامہ شبلی کے تعلیم افکار	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۱۵
نور احمد چودھری	طلبہ میں نشہ آور اشیاء کا استعمال	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۷۶

علمی ادبی تعلیمی ثقافتی فلاحی ادارے اور تحریکیں

رعنا اقبال	اکادمی ادبیات کے زیر اہتمام شام ملاقات.....	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۸۲
روبینہ رانا (اوسلو)	اوسلو (ناروے) میں سیمینار.....	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۵۲
سلیم منعم رخالد	پاکستانی یونیورسٹیاں چند حقائق	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۱۴۷
سہراب اسلم	ترقی پسند تحریک اور فحش ادب	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۲۱
ظفر الاسلام	مولانا فراہی اور دار المصنفین	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ نومبر ۹۲ء ص ۲۷
عبد الرحیم قدوائی	تعلیمی ادارے، جرائم کی تربیت گاہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۷۸
عبد المتین	مسلم طالبات کے لیے یونیورسٹی	تہذیب الاخلاق علی گڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۴۳
عدنان عدیل	تعلیمی ادارے یا؟ ایک اہم قومی مسئلہ	مطالعہ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳۸
ف س اعجاز	علی صدیقی اردو ادارہ انشاء کلکتہ	انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳
لطف اللہ	اسکندریہ کا کتب خانہ	سائنس میگزین، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۲۸
مظفر حسین غزالی	مدارس کی اصلاح کی تجویز	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ دسمبر ۹۲ء ص ۴۸
نظام الدّین رضوی مفتی	اسلامی درسگاہوں کے زوال اور ان کا علاج	تہذیب الاخلاق علی گڑھ سرسیّد نمبر اکتوبر ۹۲ء ص ۱۵۹
ظہور الاسلام صدیقی	تعلیمی اداروں میں نظم و نسق کی بحالی کا مسئلہ	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۴۰

سیاست صحافت امورِ مملکت

احمد رشید	افغانستان کی نسلی تقسیم	مطالعۂ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۳۰
اقبال احمد صدیقی	مولانا ظفر علی خان کا اسلوبِ صحافت	سب رس، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶
حسن مجتبیٰ	سندھ کا مسئلہ اور سندھی صحافت	مطالعۂ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۶۷
حسن مجتبیٰ	سندھ کے صحافی	مطالعۂ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۷۰
حسنین کاظمی، پروفیسر	اسلامی اقدار اور انتظامِ حکومت	دائرے، کراچی جولائی ستمبر ۹۲ء ص ۲۵
خرم مراد	اشارات	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۹۲ء ص ۲
راحت سعید	نظم حکمرانی کا بحران	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۵
رحیم اللہ یوسف زئی	افغانستان ایک نئی تاریخ کا آغاز	مطالعہ پاکستان، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵۶
سید حامد	وعدہ خلافی یا غفلت کا خمیازہ	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ اگست ۹۲ء ص ۸
سید سبط حسن	تحکمانہ نظام اور خرد	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۱۳۱
عدنان عادل،	پاکستان کی سیاسی جماعتیں......	مطالعۂ پاکستان، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۱۵
محمد حنیف	زرد صحافت میں انقلاب	مطالعۂ پاکستان، کراچی اگست ۹۲ء ص ۷۷
مصطفٰے علی بریلوی	ایران سندھ کے زمانے میں امن عامہ کی حالت	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۳۳
میاں محمد ابوالفتح	ہم اور قانون	اردو نامہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۲

موسیقی، مصوری، خطاطی، دیگر فنون

انیس ناگی	جدید مصوروں کے اردو افسانے پر اثرات ایک مذاکرہ	ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۳
ڈاکٹر انور سجاد، اسلم کمال، شمینہ پرویز، پروین ملک		
زوار حسین	دنیائے تصویر کی تحریری جمالیات	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۱۴۵
عابد حسین قریشی	کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۴۱
مقبول بیگ بدخشانی، پروفیسر	امیر خسرو نغمہ زار میں	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۲۷
میاں فیض کریم	صورتیں اور مورتیں	اردو نامہ، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳۷

مخطوطات و نوادرات

توفیق احمد چشتی قادری امروہوی	کتاب غنیۃ الطالبین کا ایک خطی نسخہ	الولی، حیدر آباد سندھ جولائی ۹۲ء ص ۳۴
سلیم الدین احمد	شاہ ولی اللہ دہلوی کے مخطوطات خدا بخش لائبریری میں	الولی، حیدر آباد دسمبر ۹۲ء ص ۱۲
عبدالمبین ندوی	کتب خانہ دارالمصنفین کے چند اہم مخطوطات	المعارف، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۰۹
نسیم احمد، ڈاکٹر	کلام سودا کے چار قلمی نسخوں کا تعارف	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۵۱

مطالعہ کتب

ابن اکبر	تحقیق نامہ / مشفق خواجہ	سب رس، کراچی اگست ۹۲ء ص ۴۵
اسرار احمد سہاوری، پروفیسر	شہر بدر / اکبر حمیدی کا چوتھا شعری مجموعہ	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۴۱
اسرار احمد سہاوری، پروفیسر	باقیاتِ غالب / اثر فاضلی	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۸۹

اسلم شیخوپوری، مولانا	مولانا عبید اللہ سندھی علوم و افکار.....	جریدہ الاشرف، کراچی جولائی ۹۲ء ص ۶۳
اکبر حمیدی	سلگتے خواب حیدر قریشی کا شعری مجموعہ	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۳۸۰
الیاس عشقی، ڈاکٹر	ڈاکٹر نجم الاسلام کی کتاب مطالعات پر ایک نظر	قومی زبان، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۳۹
امجد طفیل	شجرِ ممنوعہ / منیر الدّین احمد	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۳۴۱
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ......	قومی زبان، جولائی ۹۲ء ص ۷۹
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ......	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۸۵
انور سدید، ڈاکٹر	شکستِ رنگ پر تو روہیلہ کا شعری مجموعہ	اوراق، لاہور نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۳۷۷
اے حمید	کالی نکاح / خالد طور کا پہلا ناول	ماہ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۸۸
تاراچرن رستوگی، ڈاکٹر	دست برگ شعری مجموعہ ستیہ پال آنند	انشاء، کلکتہ جون جولائی ۹۲ء ص ۴۱
ثمینہ شوکت، ڈاکٹر	آوازِ دوست / اختار مسعود	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۱۵
جعفر شیرازی	خواب خواب آنکھیں آثم فردوس کا مجموعہ کلام	محفل، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۳۰
حسین سحر	در و بست / خالد اقبال یاسر	اہلِ قلم ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۱۰۲
حسین سحر	رچنا / علی اکبر عباس	اہلِ قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۱۰۷
حفیظ صدیقی، پروفیسر	مہران نقش تنقید و تحقیق......	تحریریں، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۶۹
حفیظ صدیقی پروفیسر	عفت غزل / ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی.....	تحریریں، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۷۰
خواجہ حمید الدّین شاہد	شعاع نو، مجموعہ کلام وفا براہی	سب رس، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۵
رشید امجد، ڈاکٹر	اپنی اپنی صلیب / اختر عثمانی	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۱ء ص ۴۱۶
رشید امجد، ڈاکٹر	دوشِ فردا / اکرم حیدری	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۱ء ص ۴۵۹
رشیدیہ رضویہ	جرسِ گل / گلنار آفریں	اہلِ قلم ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۹۷
رعنا اقبال	مہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل.....	آگہی، کراچی اکتوبر نومبر ۹۲ء ص ۳۲
رفیق سندیلوی	چھک اُٹھی لفظوں کی چھاگل پر چند باتیں	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۰۵
رفیق سندیلوی	جپسی، مستنصر حسین تارڑ	انشعاب، ملتان اکتوبر ۹۲ء ص ۲۹
ئیس احمد جعفری	لہو ترنگ شعری مجموعہ / ارشد احسن	روحِ ادب کلکتہ جون ۹۲ء ص ۱۵۶
رور اکبر آبادی، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ادب......	محفل، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۳۱
ہیل احمد خاں، ڈاکٹر	جنگ و امن، ایک تعارف طالسطائی کے ناول.....	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۴۱
ید قومی احمد، پروفیسر	آہنگِ ظفر / مرتبہ ڈاکٹر وفا راشدی	آگہی، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۳۴
ید معراج جامی	کوکن کے افسانے	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۴۴
نعیب انصر	قفس رنگ / احزیں صدیقی	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۳۴۲
غیق احمد شفیق	لمحوں کی دہلیز پر جمیل زبیری کی کہانیوں کا مجموعہ	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۴۰
لیل نوازش رضا، ڈاکٹر	جرم و سزا.....	طلوع افکار، کراچی اگست ۹۲ء س ۷۹
لیل نوازش رضا، ڈاکٹر	کرنل سیّد نواب عالم بارہوی کی دو تصانیف.....	طلوع افکار، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۷۶
س الرحمن فاروقی	ساختیات، ساخت شکنی اور ساختیاتی تنقید کے چند پہلو	صریر، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۸
ہر تونسوی، ڈاکٹر	تخاطب / حسین سحر	اہلِ قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۹۲
یر کاشمیری	تلخاب، ڈاکٹر خیال امروہوی کا مجموعہ کلام	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۲۳

عاصی کرنالی، پروفیسر	بدحواسیاں / بہزاد سحر	اہلِ قلم، ملتان ۹۲/۱۳ء ص ۸۷
عنوان چشتی، پروفیسر	اشتیاق طالب کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ	کتاب نما، دہلی اگست ۹۲ء ص ۲۷
غلام سرور کرنل	نگہت حرا راسخ عرفانی کی نعتوں کا مجموعہ	محفل، لاہور نومبر ۹۲ء ص ۹۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	قرضِ شجر / احسان رانا	صریر، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۴۳
فیروز عابد	سنسان جنگلوں کا راستہ.....	روحِ ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۱۵۹
کلیم رحمانی	شجرِ ممنوعہ.....	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۳۸
کلیم رحمانی	تطہیر اطہر ضیائی کا پہلا مجموعہ	صریر، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۸
کلیم رحمانی	آتشِ چنار / شام بارک پوری کا ناول	صریر، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۴۲
محمد اسحاق بھٹی	پبلک لائبریری اور اس کا نظم و نسق.....	المعارف، لاہور اگست ستمبر ۹۲ء ص ۱۵۳
محمد امین	ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں اردو شاعری.....	روحِ ادب، کلکتہ جون ۹۲ء ص ۱۵۴
محمد خان کلیم	اقبال کا سیاسی سفر.....	محفل، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۸۷
محمد علی صدیقی	سالانہ رپورٹ.....	العلم، کراچی جون ۹۲ء ص ۱۱۳
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	دیے کی آنکھ / مقبول عامر	طلوعِ افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۷۵
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	سوکھے ساون.....	ادبیات، اسلام آباد ۹۲/۲۰ء ص ۳۲۰
مختار احمد خان، ڈاکٹر	لہو کے پھول ایک تجزیہ.....	ارتقاء، کراچی اگست ۹۲ء ص ۲۳۲
منظور الدّین احمد، ڈاکٹر	مہران نقش / ڈاکٹر وفا راشدی	ماہِ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۹۴
میرزا ادیب	ترکی کے زندہ جاوید صوفی شاعر یونس ایمرے.....	ماہِ نو، لاہور جولائی ۹۲ء ص ۱۷
میرزا ادیب	نسرین قریشی کا افسانوی مجموعہ گلی نمبر ۹	ماہِ نو، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۲۳
ناصر عباس نیّر	باگھ ایک مطالعہ	صریر، کراچی سالنامہ جون جولائی ۹۲ء ص ۳۶۹
نجمہ خاں	منّے بھائی ایک مطالعہ مرتب: پروفیسر عتیق احمد	طلوعِ افکار، کراچی اکتوبر ۹۲ء ص ۵۴
نظیر صدیقی، پروفیسر	دیوان غالب کامل.....	قومی زبان، کراچی نومبر ۹۲ء ص ۴۳
وحید قریشی، ڈاکٹر	لمحوں کا قرض / زاہد منیر عامر	اوراق، لاہور سالنامہ نومبر دسمبر ۹۲ء ص ۳۷۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	کشکولِ وفا شعری مجموعہ حیرت الہ آبادی	ماہِ نو، لاہور اکتوبر ۹۲ء ص ۹۵
ہیرالال چوپڑہ، ڈاکٹر	اردو شاعری میں عورت کا تصور.....	انشاء، کلکتہ اگست ستمبر ۹۲ء ص ۴۹

Regd M.No. 270 Phone: 461406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ
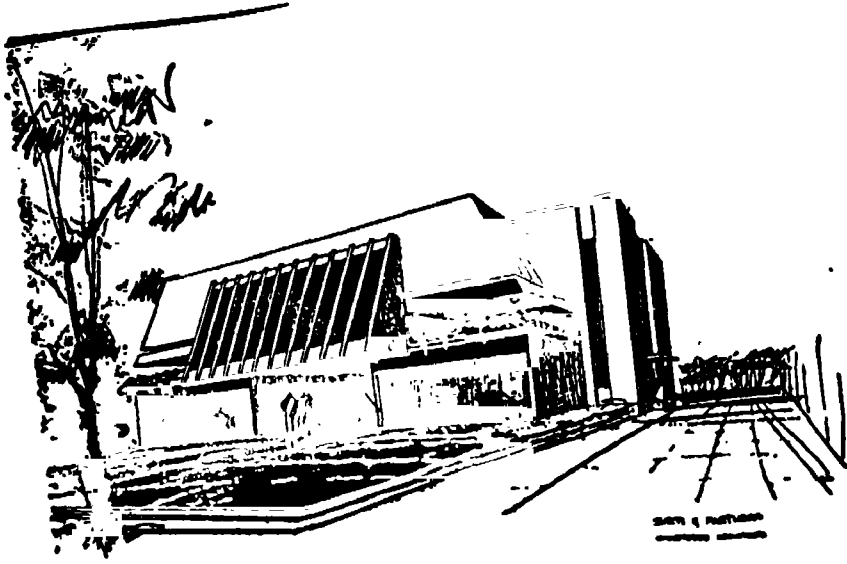
ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: مشہور آفسٹ پریس، مقامِ اشاعت: انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی-۱۵۹- بلاک (۷) گلشن اقبال